مشیر
جنوری
۱۹۵۰ء
قیمت فی پرچہ، پاکستان
0-8-0
بھارت:
مرتبہ
عبدالغفور بیگ
THE MUSHIR KARACH

آپ تندرست ہیں اِس لئے کامیاب!
اچھی صحت اور طاقت کامیابی کے راز ہیں
سلورین پلز کے بلاناغہ استعمال سے
اپنی طاقت کو بڑھائیے اور صحت کو قائم رکھئے!
سلورین پلز. مردوں کے لئے ایک اچھا متوازن اور آج کل کا آزمودہ جنرل
ٹانک ہے جو بھوک کو بڑھاتا ہے. جسم میں تازہ اور سرخ خون پیدا کرتا ہے اور قوت اور
طاقت بڑھاتا ہے اور آپ کو یہی صحت حاصل رکھنے میں مدد دیتا ہے جو کامیاب زندگی کا راز ہے۔
سلورین پلز پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں سب بڑے دوا فروشوں سے مل سکتی ہیں یا براہ راست
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی سے طلب کیجئے۔
مفصل فہرست اردو میں مفت طلب کریں

ٹیلی فون : ٧٩٢٣

جلد: ٧ شمارہ: ١

جنوری ١٩٥٦ء

مرتبہ

عبدالغفور بیگ

بدل اشتراک : فی پرچہ : آٹھ آنے

سالانہ : پانچ روپے

بھارت میں ترسیلِ زر کا پتہ :

پندرہ روزہ "الحسنات" رامپور (یوپی)

بھارت

پرنٹر و پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر

دفتر رسالہ "شمع" ... سے شائع کیا۔ ... لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سبدِ گل

اس عنوان کے تحت نومبر ۱۹۵۵ء کے "مشیر" میں ہم نے ادب کی فکری اور فنی حیثیتوں کا مختصر سا جائزہ لیکر یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ جب ادیب اور ادب نواز مختلف الفکر ہوں تو مختلف ادبی تحریکوں اور گروہوں کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک ابہام کو دور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انسان اپنے مزاج۔ مذاق اور ذہن کے لحاظ سے مختلف الفکر ضرور ہے۔ مگر چند بین الانسانی قدریں ایسی بھی ہیں جو مختلف مکاتیبِ فکر میں ابتدا ہی سے مشترک چلی آتی ہیں۔ جس طرح ایک ہی ماں باپ کی اولاد شکل و صورت، عادات و خصائل۔ مزاج و طبیعت ہر چیز اور ہر پہلو سے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود کچھ ایسی مشترک مشابہات ضرور رکھتی ہے جو اس کے ایک ہی خونی اور نسلی رشتہ میں منسلک ہونے کی بیّن دلیل ہوتی ہیں اسی طرح نوعِ انسانی کے مختلف الفکر ہونے کے باوجود کچھ روحانی اور اخلاقی قدریں ایسی بھی ہیں جو جزئیات سے قطع نظر عموماً ساری نوعِ انسانی میں مشترک ہیں۔ مثلاً بہادری اور شجاعت، عزم و استقلال، عدل و انصاف، عصمت و عفت۔ اتفاق و اتحاد۔ وفاداری اور ایفائے عہد۔ ظلم و جور کی مذمت۔ مظلوم و ستم رسیدہ کی حمایت۔ علیٰ ہٰذا القیاس ان مشترک اقدار پر جب بھی مختلف الفکر ادیب خامہ فرسائی فرمائیں گے تو ان کی تخلیقات میں ایک ہم آہنگی ضرور نظر آئے گی۔ جو بعینہٖ ایسی ہی ہوگی جیسی کہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد کے صوری اور ذہنی اختلاف کے باوجود نسلی طور پر پائی جاتی ہے۔ ان مشترکہ اقدار کے ہوتے ہوئے بھی نوعِ انسانی کی مختلف الفکری ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ نوعِ انسانی کے فکری اختلاف کی جہاں اور بہت سی زمانی اور مکانی وجوہات ہیں وہاں ایک بڑی وجہ نظریات اور معتقدات کا وہ تفاوت بھی ہے جو نوعِ انسانی میں تاریخ کے ہر دور میں پایا جاتا رہا ہے۔ اور آج بھی موجود ہے چونکہ انسانی فکر براہِ راست نظریات اور معتقدات سے متاثر ہوتی ہے اس لئے کسی سماج میں اٹھنے والی مختلف نظریات اور معتقدات پر مبنی تحریکیں اس سماج کے ادیبوں کی فکری صلاحیتوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اس وقت بھی اگر ہم اپنے ملک کی ادبی فضا کا بغور جائزہ لیں تو ہمیں نمایاں طور پر اپنے ادیب اور ادب نواز مختلف گروہوں میں بٹے ہوتے نظر آتے ہیں۔ "وحدت ادب" کے بڑے بڑے دعوؤں کے علی الرغم ادب کی فکری تقسیم سے کسی حال میں مفر نہیں ہے۔ آخر یہ قدامت پسند یا ادب برائے ادب۔ ترقی پسند یا اشتراکی ادب۔ تعمیری یا اسلامی ادب کے نعرے ادیبوں کے فکری اختلاف کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہیں۔ دیکھنا باقی صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ہمیں اپنی زیرِ تعمیر ریاست، زیرِ تشکیل معاشرے اور اپنی تہذیبی اور سماجی زندگی کی تعمیرِ نو کے لئے کس نوعیت کے ادب کی ضرورت ہے۔ وہ کون سی فکری قدریں ہیں جو ہمارے ادب میں سمویا جانا چاہئیے۔

قدامت پسند ادب یا ادب اور آرٹ میں جس فکر کو پائیداری کا نام دیتے ہیں اس کا تعلق اس اوپری خول سے ہے جو صدیوں تک

ہے۔ اس اعتبار سے یہ حضرات یقیناً قدامت پسند کہلانے کے مستحق ہیں۔ یہ حضرات پائیداری۔ استقلال اور صالحیت کے الفاظ سے تو خوب آشنا ہیں۔ مگر ان کا مفہوم ان کے نزدیک صرف اوپری پائیداری سطحی استقلال۔ اور خارجی صالحیت تک محدود ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں سرے سے تغیر کو تسلیم ہی نہ کرنا دراصل اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھکر روشنی سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ یہ بزرگانِ کرام فنی مہارت اور دعوائے استادی کے باوجود فکری جمود کے اس گنبد سے باہر نکلنے کے لئے تیار نہیں ہیں جہاں صرف قدیم استادانِ فن کی پرستش۔ زبان کی پرستش اور محاورے کی پرستش کے سوا اس آج کے دور کی زندگی کا کوئی مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکتا۔ فکری اجتہاد ان کے ہاں صرف مکروہ ہی نہیں بلکہ حرام و متروک ہے۔

دوسرا گروہ ترقی پسند حضرات کا ہے انہیں اگر "جدیدیت پسند" کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ حضرات چونکہ فکری طور پر اشتراکی نظریۂ حیات اور مارکسی معتقدات سے متاثر ہیں۔ اس لئے ان کا فرمانا ہے کہ انسانی سماج ارتقاء کر رہا ہے۔ اس لئے انسان بدل گیا ہے۔ اس کے مطالبات۔ ضروریات۔ اور خواہشات میں تغیر آچکا ہے۔ لہٰذا کوئی بات چاہے وہ کتنی ہی اچھی ہو، اگر وہ قدیم ہے تو اس زمانے کے لئے قطعاً ناکارہ ہے۔ وہ صرف اسی منزل کے لئے کارآمد تھی جب انسان ترقی کے کسی نچلے زینے پر کھڑا تھا۔ اب جبکہ وہ کئی زینے اوپر چڑھ آیا ہے گذری ہوئی بات کو دہرانا سراسر حماقت ہے۔ اس لحاظ سے یہ حضرات "جدیدیت پسند" کہلانے کے پورے پورے مستحق ہیں۔

تیسرا گروہ تعمیر پسند یا اسلام پسند حضرات کا ہے۔ یہ لوگ چونکہ اسلام کے نظریۂ حیات اور اس کے معتقدات سے متاثر ہیں۔ اس لئے ان کا کہنا یہ ہے کہ انسانی سماج میں تغیر ضرور ہوا ہے مگر جو کچھ تغیر ہوا ہے وہ اس کے پھیلاؤ یا مختلف اشیا کے استعمال میں ہوا ہے۔ تغیر انسانی ضروریات یا مطالبات میں نہیں ہوا صرف ان کی تکمیل کے ذرائع اور وسائل میں ہوا ہے۔ انسان کے اندر کوئی خواہش۔ کوئی جذبہ اور کوئی امنگ ایسی نہیں ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ یکسر بدل گئی ہو۔ انسان پہلے بھی کھاتا تھا اور آج بھی کھاتا ہے۔ لیکن پہلے کسی اور طریقہ سے کھاتا تھا اور آج کسی اور طریقہ سے کھاتا ہے۔ انسان پہلے بھی سفر کرتا تھا۔ آج بھی سفر کرتا ہے مگر پہلے وہ چھکڑے اور بیل گاڑی پر سفر کرتا تھا اور آج موٹر ریل اور ہوائی جہاز پر سفر کرتا ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ تغیر کس میں ہوا ہے۔ مسافر میں یا ذرائع سفر میں۔ ظاہر ہے کہ تغیر صرف ذرائع سفر میں ہوا ہے۔ اور ہوتا رہے گا۔ اس لئے وہ تغیر کو مانتے ہیں مگر صرف تمدن کے اوپری خول کے بدل جانے کی حد تک وہ جائز قسم کی قدامت پسندی اور جائز قسم کی تغیر پسندی ہر دو کے قائل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ادب میں فکر و عمل کی وہ کوتاہیاں جو آج ہمارے معاشرے کے لئے ایک عذاب بنی ہوئی ہیں وہ اسی قدامت پسندانہ کوتاہ بینی اور جدیدیت پسندانہ سطح بینی ہی کا نتیجہ ہیں۔ آج ہمیں جس ادبی فکر کی ضرورت ہے۔ وہ ایسا ہونا چاہئے جو ایک طرف فرد، سماج اور نظام کے لئے ایک جامع۔ مستقل اور اٹل ضابطہ کو اپنی ہر کاوش اور ہر خیال کا جز بناتا ہے اور دوسری طرف اسے بدلتے ہوئے تمدنی ذرائع و وسائل کے اعتبار سے نئے نئے لباس اور لبادے پہناتا ہے۔

(ادارہ)

پروفیسر محمد منور

باتیں

انسان کی 'منطقیانہ' تعریف یہ ہے کہ وہ حیوانِ ناطق ہے یعنی باتیں کرتا ہے۔ مگر پرندے، درندے چوپائے سبھی باتیں کرتے ہیں ہم نہ سمجھیں تو یہ الگ بات ہے۔ انسانوں نے حقیقتاً زیادتی کی ہے۔ جانوروں کی باتوں کو محض آوازیں فرض کر لیا ہے۔ شیر دھاڑتا ہے۔ ہاتھی چنگھاڑتا ہے۔ پرندے چہچہاتے ہیں۔ مینڈک ٹرّاتے ہیں۔ غرض ہر جاندار کچھ نہ کچھ ضرور کہتا ہے۔ اس کے باوجود حیوانِ ناطق فقط انسان ہی ہے۔ کیا پتہ کبوتر آپس میں باتیں کرتے ہوں یہ کہتے ہوں کہ ان کے سوا باقی تمام کائنات، مع انسانوں کے گونگی ہے۔ اس لحاظ سے حیوانِ ناطق فقط انسان ہی کو کہنا نادرست سی بات ہے۔ بہرحال جن "باتوں" کے بارے میں کچھ "باتیں" کرنا چاہتا ہوں، وہ خالص انسانی باتیں ہیں

باتیں انسانی شعور کا پرتو ہیں۔ جوں جوں شعور بڑھتا جاتا ہے باتیں بھی ترقی پذیر ہوتی جاتی ہیں۔ تحریر کی نوبت باتوں کے بعد آتی ہے ہماری اکثر تحریریں ہماری باتوں ہی کا مجموعہ ہیں۔ خطبے، تحریریں۔ مواعظ درس، مقالے، لیکچر۔ مکالمے۔ شعر۔ ڈرامے۔ غرض انسانی شعور کی ترجمانی کرنے والی ہر تحریر بالعموم باتوں ہی کی کوئی نہ کوئی قسم ہے۔ جبھی تو گفتگو سے آدمی پہچانا جاتا ہے ——— کیوں؟ محض اس لئے کہ باتیں اس کے ذہن شعور، علم تہذیب اور عقل کا آئینہ ہیں۔ ان پڑھ آدمی کی گفتگو پڑھے لکھے سے مختلف ہوتی ہے۔ کاروباری آدمی کا طرزِ تکلم ایک ادیب کے طرزِ تکلم سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ سعدیؔ کہتے ہیں ؎

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

یعنی جب تک کوئی آدمی بات نہ کرے اس کے عیب و ہنر چھپے رہتے ہیں اسی مضمون کو ذرا سی تبدیلی کے ساتھ ایک عرب شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

وکاِن تری من صامت لک معجب • زیادتہٗ او نقصہٗ فی التکلم

کتنے ایسے خاموش انسان ہیں کہ جب وہ بولنے پر آتے ہیں تو کسی کے بارے میں تم یہ چاہتے ہو کہ کاش وہ مختصر بات کرے اور کسی کے متعلق یہ پسند کرتے ہو کہ وہ بولتا رہے ——— ظاہر ہے کہ باتوں، باتوں میں فرق ہوتا ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ایک کیفیت یہ ہے جو غالب نے بیان کی اور ایک وہ کہ تلواروں کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں مگر زبان کے زخم مندمل نہیں ہوتے۔ جریر نے کیا خوب کہا ہے ؎

ولیس لسیفی فی العظام بقیۃٌ
وللسیف اشوی وقعۃً من لسانیا

دشمنوں کی ہڈیوں میں میری تلوار نے کوئی اثر نہیں چھوڑا۔ سچ یہ ہے کہ میری تلوار کی ضرب، میری زبان کی ضرب سے بہت ہی بودی ہے۔

حق یہ ہے کہ باتیں کرنا بہت بڑا فن ہے اور جو بات نہ کر سکے کاش کہ اسے یہ علم بھی ہو کہ وہ کتنا بڑا اور دہ سہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ بات کر سکتا ہے۔ ہاں وہ بولتا ضرور ہے مگر بات تو بہرحال بات ہے کوئی ہی کوئی بنا سکتا ہے۔ میرؔ نے اپنے معاصر شعرا پر چوٹ کی تھی کہ شعر گھڑ لینا کون سا کمال ہے، شعر میں کوئی بات پیدا کرنا ذرا مشکل سا معاملہ ہے ؎

بات بنانا مشکل سا ہے شعر سبھی کہہ لیتے ہیں
فکر بلند سے یاروں کو اک ایسی غزل کہلا دو

بعض قومیں من حیث المجموع بڑی باتونی ہوتی ہیں۔ مثلاً۔ پٹھان

[عر]ب بھی زیادہ باتیں کرتے ہیں۔ ایرانی بھی بہت باتیں کرتے [ہیں۔ جا]پانی نسبتاً کم گو ہیں۔ عورتوں کو بھی دیکھا ہے مشکل ہی سے چپ [رہتی ہیں]۔ انگریز اپنی بے تکلف محفلوں میں بھی اتنی باتیں نہیں کرتے جتنی ہم پنجابی تکلفات کی تہمد بند کے باوجود کر ڈالتے ہیں۔ شاید کوئی جغرافیائی احوال اثر انداز ہوتے ہوں لیکن خالی جغرافیائی عناصر ہی اس امر کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔ عام ذہنی، علمی اور عقلی سطح بھی کسی حد تک اس بات کا سبب ہو سکتی ہے۔ خیر اس کا تجزیہ بے مزہ سا معاملہ بن جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ بات ذرا دور چلتی رہے۔ ہاں تو بعض بعض قومیں دوسری قوموں کے مقابلے میں زیادہ باتونی ہوتی ہیں اسی طرح بعض افراد نسبتاً بہت زیادہ چرب زبان ہوتے ہیں گویا ان کی قسمت کا ستارہ بھی متکلم ہی ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا منصب باتیں، ان کی حیات کا اہم ترین مشغلہ باتیں، اور ان کی تمناؤں کا سب سے بڑا رہبر یا راہزن باتیں ہی ہوتی ہیں۔

زندگی کی شاہراہوں پر مختلف انسانوں سے ملاقات ہوتی ہے اور پھر نتیجۃً بات بھی ہوتی ہے۔ مگر جس قسم کے انسانوں کی طرف ابھی ابھی اشارہ کیا گیا ہے وہ کئی قسموں میں منقسم ہیں ایک وہ جو بے تحاشا باتیں کرتے ہیں مگر وہ باتیں عقل کے مس سے عاری اور اکثر دلچسپی سے خالی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو احمقانہ باتیں کرتے ہیں مگر ان میں کم از کم سننے والوں کے لئے سامانِ طرب ضرور ہوتا ہے۔ ایک وہ جو بڑی منافقانہ اور مکارانہ باتیں کرتے ہیں جن کے الفاظ واضح ہوتے ہیں اور مفہوم مبہم۔ ایک وہ جن کی باتوں میں عقل کو بھی دخل ہوتا ہے۔ ظرافت کو بھی۔ یہ لوگ بڑے زندہ دل اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ موخر الذکر قسم کے لوگوں میں سے ایک کی دوستی کا شرف مجھے حاصل رہا ہے۔ نام اس لئے نہیں لیتا کہ مبادا میری محبت کو طنز سمجھ لیا جائے۔ کیونکہ قارئین کرام ان میں سے اکثر انہیں جانتے ہیں۔ وہ صاحب کہا کرتے تھے کہ بات وہ جو "فی البدیہہ" ہو۔ یہ فی البدیہہ والی اصطلاح میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ عملاً انہوں نے آخر سمجھا دیا۔ اب میں بھی تشریح کر سکتا ہوں۔ مثلاً کوئی شخص اگر آپ سے پوچھے کہ کھانسی کے لئے کوئی مفید ترین پیٹنٹ دوائی کون سی ہو سکتی ہے۔ تو آپ فوراً کہہ دیں کہ "گیومیلیس" مگر ساتھ ہی یہ فقرہ بھی چپکا دیں کہ ابھی نئی نئی ایجاد ہوئی ہے

نہ جانے سرگودھا یا لاہور تک پہنچی بھی ہے یا نہیں۔

ان صاحب کی فی البدیہہ گفتگو کا ایک اور نمونہ ہے کہ لاہور میں ہم تین چار احباب گھوم رہے تھے۔ ایک نے پوچھا۔

"کراچی میل لاہور سے کتنے بجے گذرتی ہے؟" کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ صاحب فوراً کہنے لگے "آپ میں سے کسی کو معلوم نہیں؟" ہم نے کہا نہیں تو بولے: "سیدھی سی بات ہے کہ کراچی میل پونے [نو بجے] چلتی ہے"

اکثر محفلوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر بات آخر میں ایک بحث کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس موضوع کے حامی و مخالف یوں بپھر جاتے ہیں کہ بس "تخت یا تختہ" والی بات بن جاتی ہے۔ گویا اب منہ سے جو نکل چکا ہے اسے منوا کر چھوڑیں گے ورنہ جان دے دیں گے۔ مخالف بھی کہ وہ بھی مدافعت پر تلے بیٹھے ہیں۔ جان جائے مگر بات نہ جائے گی۔ کوئی پوچھے کہ "یہ کشت و خون زندگی کے کون سے اہم فیصلہ کی خاطر ہو رہا ہے؟" تو اکثر اوقات یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ موضوع کیا تھا۔ ایک کہے گا "بات یہ تھی کہ ...." دوسرا بولے گا "نہیں اصل قصہ یوں ہے کہ" گویا پھر بحث چل پڑے گی۔ اس موضوع پر کہ موضوع کیا تھا؟ اسی قسم کی صورتِ حال ہے جسے سر سید مرحوم نے اپنے مشہور مضمون بحث و تکرار میں قلم بند کیا تھا۔

کشتی لڑنے کے لئے بڑے داؤ پیچ سے کام لینا پڑتا ہے اسی طرح آپ نے دیکھا ہوگا کہ لوگ باتیں کرتے ہوئے بھی پینترے بدلتے ہیں۔ کئی لطیفے جو اکثر بے محل ہوتے ہیں اور کئی شعر جو بالعموم بے موقع ہوتے ہیں بطور قطعی فیصلہ کے صادر ہوتے ہیں۔ اور تو اور بعض نیم پڑھے لکھے لوگوں کو فی البدیہہ جواب دینے کے شوق میں دیکھا ہے کہ فرضی کتابوں کے فرضی مصنفوں کے جعلی اقوال بصد آن بان پیش کر دیتے ہیں۔ لاہور کے ایک علمی مباحثہ میں ایک صاحب نے بڑے طمطراق سے کہہ دیا کہ آپ بے شک "جامع اللغات" دیکھ لیں۔ "افصح البیان" کی ورق گردانی کر لیں۔ "فرہنگ قادری" کا مطالعہ کریں۔ "لغت کبیر" ملاحظہ کریں۔ فراغت کا مطلب ہے جان بوجھ کر۔ دیدہ و دانستہ۔ بالارادہ وقت کو ضائع کرنا ...."

اب سمجھے آپ "جامع اللغات" کے سوا باقی ناموں کی کون سی اردو لغتیں

ہمارے یہاں موجود ہیں ؟ مگر میں دیکھ رہا تھا کہ مباحثین ان کے مونہہ سے اتنی فرہنگوں کے بھاری بھرکم نام سنکر سہم گئے اور وہ صاحب اپنی بات منوانے میں کامیاب ہوگئے۔

بعض اوقات فریق مخالف کو چپ کرانے کا یہ طریقہ بھی ہوتا ہے کہ بعض منچلے لوگ اس قسم کے الفاظ مخالف کے بھیجے پر دے مارتے ہیں اور وہ چکرا کر رہ جاتا ہے۔ خواہ وہ الفاظ کتنے ہی بے موقع اور بے معنی کیوں نہ ہوں۔ ایک بار میں نے بھی ایسی شرارت کی تھی۔ میٹرک کا امتحان دے چکا تھا۔ بذریعہ ریل راولپنڈی سے لالہ موسیٰ کی جانب آرہا تھا۔۔۔ ریلوے کے ایک ملازم سے نہ جانے کون سی بات شروع ہوئی جو آخر سیاست تک پہنچ گئی اور پاکستان اور اکھنڈ بھارت پر گفتگو ہونے لگی۔ وہ صاحب کوئی "لالہ" تھے ان کی باتوں سے یہ ظاہر ہوا۔ میں میٹرک تک پڑھا ہوا تھا ظاہر ہے کہ جتنا علمی لب ہوں اس سے کہیں زیادہ گیا گزرا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ لالہ جی سے باتیں کرتے کرتے ایک موقع پر میں نے بڑے فیصلہ کن انداز میں یہ الفاظ کہہ دیئے۔ "آپ یہ علم مابعد الطبیعات کا مسئلہ ہے۔ جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ میں" لالہ جی ٹھٹھک گئے۔ اور بحث ختم ہوگئی ۔۔۔۔۔ یہ فقرہ یا اسی قسم کا کوئی فقرہ میں نے پطرس کے مضامین میں پڑھا تھا۔ جزو ذہن میں رہ گیا۔

لیکن یہ بحثیں ان پڑھوں کی ہیں۔ پڑھے لکھوں کا انداز جدا گانہ ہے مگر پڑھے لکھے جنہیں صحیح معنوں میں پڑھے لکھے کہا جا سکتا ہو وہ ہیں کتنے؟ اور کیا وہ دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے؟ تاہم عالم بالا سے سروکار نہیں جیسے بعض اوقات بڑی بڑی سلجھی ہوئی ادبی محفلوں کو بھی مچھلی بازار بنتے دیکھا ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ وہ مجالس سرگودھا سے تعلق رکھتی ہوں، لاہور کی بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن میں نے کہا نہ کہ ان سے ہمارا کیا واسطہ؟ وہ سرکاروں کی باتیں ہیں۔ میں تو اپنی اور اپنے جیسے دوسرے "خاک نشینوں" کی باتیں کر رہا ہوں۔

ایک بات جو میں نے بچپن میں سنی تھی۔ اور جس نے مجھے بڑی مدت تک الجھن میں ڈالے رکھا۔ یہ تھی کہ میں نے ایک ریڑھی والے کو کسی گاہک یا کسی واقف کار سے بحث کرتے دیکھا۔ بحث "اسلام" پر تھی۔ ریڑھی والے نے جو آخری گولا پھینکا وہ یہ تھا کہ "تم کیا جانو! جاؤ کسی ان پڑھ سے بات کرو مجھے پہلے یہ بتاؤ کہ تم مسلمان ہو یا مسلمین؟" میں نہ جانے کیا خرید رہا تھا۔ یہ الفاظ میرے کان میں بھی پڑے! تک میری سمجھ میں نہ آیا کہ آیا وہ آدمی مسلمان تھا یا مسلمین؟

بات میں سے بات نکلنا تو آپ نے سنا ہوگا۔ یہ معاملہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ہم نے باتیں کرتے وقت کبھی غور نہیں کیا کہ ہم کہاں سے شروع ہو کر کہاں جا رہے ہیں۔ جیسے کہ مضمون کے آغاز میں کہیں عرض کر آیا ہوں۔ ڈاکٹر ظلہ حسین نے اپنے ناول "وادیب" میں اپنے ایک دوست۔۔۔ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک بات سے دوسری بات اور ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف بلا سبب یوں منتقل ہوتا تھا جیسے کوئی آدمی بغیر پل یا کسی دوسرے سہارے کے ندی کے ایک کنارے سے پھلانگ کر دوسرے کنارے پر جا پڑے لیکن ڈاکٹر صاحب کو اس کے خلاف سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ یوں بلا سبب اور بے اندازہ زقندیں بھرنے کے باوجود وہ پھر اپنے موضوع کی طرف لوٹ آتا تھا۔ یہ بات بڑی تکلیف دہ ہے۔ حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری سے مجھے بھی یہی شکایت ہے کہ وہ ادھر اُدھر دور تک چلے جانے کے باوجود، موضوع تقریر کی جانب رجوع کئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے لیکن ایسے لوگ شاذ و نادر ہیں۔ بالعموم دیکھا ہے کہ اصل موضوع بے چارہ اس مصرعہ کا مجسمہ بن کر رہ جاتا ہے ؎

وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گذار کے ۔۔۔۔۔۔۔۔

مثلاً جب میں ایم اے اردو میں پڑھتا تھا۔ تو میرے ایک استاد مکرم نے دکھنی دور کے اردو ادب کی تاریخ پر تقریر شروع کی۔ مگر جب پیریڈ ختم ہوا تو ان کی زبان پر یہ فقرہ تھا کہ پیرزادہ عبدالستار بڑے اچھے رقاص ہیں ایسے درجنوں واقعات سے تقریباً ہر آدمی دوچار ہوتا ہے کوئی کہاں تک بیان کرے۔ ایک مثال اور درج کرتا ہوں:۔

"آج سے کوئی چار سال پہلے کی بات ہے کہ مرحوم انور ہوٹل پر احباب جمع تھے اور "الکیٹ والشیٹ قرارة المغز" کا دور چل رہا تھا۔ اتفاقاً مولانا مودودی کی رہائی کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ وہ اسی دن رہا ہوئے تھے۔ حکومت نے گرفتار کیوں کیا تھا؟ اب رہا کیوں کر دیا ہے وغیرہ۔ بات بڑھتی گئی۔ بڑھتی گئی۔ اور آخر کار جب محفل برخاست ہوئی تو ہم سب تقریباً متفق تھے کہ مشرِ سلطانہ واقعی اچھا گاتی ہے۔"

[کبھی یہ] معاملہ بڑا خوش طلب ہوتا ہے مثلاً ایک آدمی جو اس امر [کا خواہشمند ہو کہ] فقط اپنی کہے۔ دوسرے کو بولنے کا موقعہ ہی نہ دے وہ ہر [اس شخص کو] باتونی اور بدتمیز سمجھتا ہے جو ہر آدھ پون گھنٹہ کے بعد "قطع کلامی معاف" کہہ کر [کچھ] بیان کرنا چاہے۔ میرے دو تین رفقائے کار اس ضمن میں بڑے [بدقسمت] واقع ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تینوں بڑے سخت باتونی ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک دوسرے دونوں سے نالاں ہیں۔ تصادفاً اگر وہ تینوں کہیں اکٹھے ہو جائیں تو ان میں سے ہر ایک گفتگو کے لئے جذبۂ بے اختیاری کی وجہ سے بے چین رہا ہوتا ہے کوئی چوتھا آدمی جو پاس کھڑا ہو کر اس میں ذوق اور تحمل ہے تو یہ فقرہ ہر دو منٹ کے بعد سننے میں آئے گا۔ "آپ کی بات قطع ہو رہی ہے۔ میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ......" آپ ایک گھنٹہ سنتے رہیں۔ جب اس ساری گفتگو کا لب لباب.. نکالیں گے تو یہی فقرہ ہوگا: "آپ کی بات قطع ہو رہی ہے۔ میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ......"

باتیں کرنا تو خیر ایک بات ہوئی۔ باتیں سننا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ براؤننگ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ سرِ راہ ایک دوست کو پکڑ کے کھڑا ہو گیا۔ باتیں شروع کر دیں۔ دوست کے کوٹ کا بٹن.. انگوٹھے اور انگشتِ شہادت میں لئے پھیرتا رہا اور کھو گیا۔ حتیٰ کہ اس کا دوست تنگ پڑ گیا اس نے اس کی محویت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بٹن کے تاگوں کو کاٹ دیا۔ بٹن براؤننگ کے ہاتھ میں اسی طرح گردش کرتا رہا [باتیں] اسی طرح جاری تھیں مگر دوست جا چکا تھا۔

بسیار گو آدمی کی نظروں میں اچھی گفتگو کرنے والا آدمی فقط وہی ہے جو اسے نہ ٹوکے۔ جو ٹوکے وہ باتونی اور برا۔ غالب کا شعر یاد آتا ہے ؎

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے

ایک طرف تو یہ اصرار کہ ایک شخص کوٹ کا بٹن پکڑ کر تو گفتگو کرے۔ دوسری طرف یہ تعریف کہ کسی نے کہا ہے "موسیقی کے بعد بلند ترین پیرایۂ اظہار خاموشی ہے۔" ایک اور انگریزی مقولہ ہے کہ "الفاظ چاندی ہیں تو خاموشی سونا۔" علامہ اقبال نے بھی بارہا خاموشی کو تقریر سے موثر قرار دیا ہے مگر حق یہ ہے کہ وقت وقت کی بات ہوتی ہے — تقریر اور خاموشی میں اعتدال کا ہونا ضروری اور موقعہ و محل کا لحاظ لابدی ہے۔ انیس نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے
خال زیبا ہے فقط عارضِ خوشرو کے لئے سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لئے

داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقعہ و ہر نقطہ مقامے دارد

(بشکریہ "کامران")

مشیر کراچی

عمران انصاری

قصیدۂ عقل و عشق

نہ مجھے موقعۂ سوال دیا   صرف تقریر کرکے ٹال دیا
نقد دل لیکے پھر رسید نہ دی   مال تو رکھ لیا، ملال دیا
زلف کی گتھیاں سلجھ نہ سکیں   کیسی الجھن میں مجھکو ڈال دیا
باطل آیا مجھے نہ راس کبھی   سارے کنبہ کو حق نے پال دیا
ہاتھ میں لیکے اپنا ہاتھ عمرآن   گر رہا تھا مجھے سنبھال دیا
عقل نے اک نیا خیال دیا   عشق نے عزم بے مثال دیا
عقل نے لاکھ اشتعال دیا   عشق نے صرف ہنس کے ٹال دیا
عقل سنگِ صلیب تک پہنچی   عشق نے پرچم ہلال دیا!
عقل نے دی ندائے بولہبی   عشق نے جذبۂ بلال دیا
عقل آثارِ عشق سے محروم   عشق نے عقل کا مآل دیا
عقل نے وصل کا کیا وعدہ   عشق نے مژدۂ وصال دیا
عقل نے دی گناہ کی ترغیب   عشق نے جوشِ انفعال دیا
عقل نے منتشر کیا دل کو   عشق نے زندگی کو ڈھال دیا
عقل امکانِ کُن سے رو گرداں   عشق نے حلِ ہر محال دیا
عقل پابندِ گردشِ دوراں   عشق نے دَورِ ماہ و سال دیا
عقل آہنگِ رستم و سہراب   عشق نے زورِ پیرِ زال دیا
عقل نے غم دیا، دیا، نہ دیا   عشق نے باحدِ کمال دیا
عقل آساں مزاج و سہل پسند   عشق نے مشکلوں میں ڈال دیا
عقل نا مطمئن ز مستقبل   عشق نے اضطرابِ حال دیا
عقل سے جب بنائے کچھ نہ بنی   عشق نے بات کو سنبھال دیا
عقل نے جو دیا بقیدِ حیات   عشق نے بعد انتقال دیا

عقل عمرآن محمد کو کیا دیتی
عشق نے کارِ لازوال دیا

م۔ نسیم

نورالٰہی

میں پہلی بار اُس سے بس میں جاتے ہوئے ملا بمبئی میں مانسون شروع ہو چکی تھیں۔ فلورا فاؤنٹین جانے کے لئے میں بس اسٹاپ پہ پہنچا تو بہت دیر ہو گئی تھی اور لائن میں میں آخری شخص تھا۔ تھوڑی دیر بعد بارش ہونے لگی۔ اتنے میں ادھیڑ عمر کا ایک شخص آکر میرے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ میں مڑ کر اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اس نے اپنی پرانی سی برساتی کے آخری دو بٹن لگاتے ہوئے مجھے دیکھا اور مسکرا کر ہاتھ سے سلام کیا۔ میں نے خندہ پیشانی سے جواب دے کر اُسے قدرے غور سے دیکھا اور پھر پہچاننے کی کوشش کی۔ شاید وہ میرا کوئی جان پہچان والا تھا۔ مگر غور کرنے پر بھی کچھ یاد نہیں آیا۔

" میں آپکے نیچے والے ملے میں رہتا ہوں۔ میرا نام نورالٰہی ہے "

" اوہ "

" آپ نے پہچانا نہیں تھا مجھے۔ آپ ادھر ابھی نئے آئے ہیں نا؟ "

" جی ہاں۔ میں نیا آیا ہوں "

" میں نے پہلے بھی سوچا تھا آپ سے ملوں۔ مگر نام نہیں معلوم "

" کیا کرتے ہیں آپ؟ "

" میرا لائف چلتا ہے۔ الوپر۔ آج آپ سے آپ ہی آپ ملنا ہو گیا بڑی خوشی ہوئی " —— اس نے ہاتھ نہیں ملایا —— شاید وہ کچھ جھجک رہا تھا۔

" آپ کہاں سے آئے ہیں یہاں؟ "

" دادر سے۔ وہاں ایک فلیٹ ملا ہوا تھا مگر جن دوست سے لیا تھا، اب وہ پھر بمبئی آگئے ہیں "

" یہیں بمبئی میں کام کرتے ہیں آپ "

" ہاں۔ فورٹ میں۔ لائبریری میں کام کرتا ہوں "

" لائبریری میں۔ اس میں تو ہزاروں لاکھوں کتابیں ہوتی ہیں آپ وہاں کیا کرتے ہیں؟ کیا پڑھتے ہیں؟ "

میں وقت کاٹنے کے لئے کسی قدر مزے لے لے کر لائبریری کے کام اور اس کا نقشہ سمجھاتا رہا اور کیٹلاگر کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے یہ بتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ کرب کے آثار نظر آئے۔ مگر میں نے دیکھا وہ میری بات بڑی دلچسپی اور انہماک سے سنتا رہا۔

" میں سمجھ گیا مجھے وہاں جانے کا بڑا شوق ہے۔ مگر میں پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ —— مہربانی سے ذرا آپ اپنا پاؤں اٹھائیں "

اس نے ہاتھ سے نیچے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے نیچے جھک کر دیکھا کہ میرے جوتے کی ایڑی اس کے کینوس شو کے پنجے پر رکھی ہے مگر میں نے اپنا پاؤں ہٹا لیا۔ میں نہ معلوم کب سے اسی طرح کھڑا اس کا پاؤں کچل رہا تھا۔ انتہائی شرمندگی کے ساتھ میرے منہ سے نکلا " ارے! اوہ۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ نے پہلے کیوں نہ بتا دیا مجھے بالکل معلوم نہ ہوا "

" آپ بات کر رہے تھے نا۔ ہمارے حضور کسی کی بات نہیں کاٹتے تھے۔ پوری بات سن کر پھر کچھ بولتے تھے "

اس کے لہجے میں اتنا یقین اتنی سادگی اس قدر معصومیت تھی کہ کسی کو بھول کر بھی بناوٹ یا شیخی کا خیال نہیں آسکتا تھا۔ میں اس کی بات سن کر بہت متاثر ہوا۔ مگر اور باتیں ہونے سے پہلے بس آگئی۔ اور لائن آگے بڑھنے لگی۔

بس میں نیچے کی جگہ قریباً بھر گئی تھی۔ ایک سیٹ خالی تھی میں نے نورالٰہی کو آگے بڑھا کر اس جگہ بٹھا دیا اور خود اوپر کے حصے میں چلا گیا۔ فلورا فاؤنٹین پہنچ کر جب میں نیچے اترا تو نورالٰہی نے مڑ کر مجھے دیکھا میں مسکرایا اور ہاتھ کے اشارے سے سلام کر کے اتر گیا۔

لائبریری تک میں اسی کے متعلق سوچتا ہو گیا۔ بے تعجب سا تھا

کہ کوئی ایسا سادہ لوح شخص بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی بمبئی کی زندگی میں۔
مگر شاید ایسا ہونا بمبئی ہی میں ممکن تھا لیکن شام کو میں جب باہر نکلا تو مجھے
اس بات کا خیال نہ تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس لائبریری میں، کتاب کے
صفحوں میں لوگ اپنے آپ کو اس در کی قسمت کو اس دنیا کی نجات کو،
ڈھونڈنے آتے ہیں لیکن شام کو میری طرح خالی ذہن کے ساتھ باہر نکلتے
ہیں۔

کچھ دن گزر گئے۔

اتوار کے دن میں کھڑکی کے پاس آرام کرسی پر لیٹا سگریٹ پی رہا
تھا۔ گہرے بادل بدستور چھائے ہوئے تھے مگر پھر بھی دن خوشگوار تھا
بادلوں کی تابناکی اور مشرق کی سُرخی سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ سورج
نکل چکا ہے۔ سامان لانے کا ایک ٹرک سڑک چھوڑ کر ہماری طرف آرہا
تھا۔ میں اسے دیکھنے لگا۔ ہماری بلڈنگ کے پاس آ کر رک گیا۔ ڈرائیور
نے ہارن بجایا اور تھوڑی دیر بعد نور الٰہی اس کے پاس کھڑا تھا.....
سلام کے بعد ڈرائیور سے اس نے کچھ باتیں کیں۔ پھر بلڈنگ کی طرف
منہ کر کے اشارہ کیا۔ مجھے کھڑکی میں دیکھ کر اس نے ہاتھ سے سلام کیا اور
مسکرا دیا۔ دو تین بچے دوڑتے ہوئے آئے اور والہانہ نور الٰہی سے چمٹ
گئے۔ اتنے میں میری بیوی کی آواز آئی۔ کمرے کے دروازے میں وہ دونوں
بچوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ بولی آج نور الٰہی بلڈنگ کے سب بچوں کو سیر
کے لئے لیجا رہے ہیں۔ کیا ہم اپنے بچوں کو بھی بھیجدیں۔ بچے میرے پاس
آ کر ضد کرنے لگے۔ میں نے اجازت دیدی۔ وہ اچھلتے غل مچاتے لوٹ گئے
مجھے معلوم ہوا کہ سب شام تک لوٹیں گے۔ اس لئے میں اپنی
بیوی کو ساتھ لے کر ایک دوست کی بیوی سے ملانے لے گیا۔

تقریباً سہ پہر تک ہم لوٹے۔ زینے پر چڑھتے ہوئے دوسرے
مالے پر کسی کے تیز تیز بولنے اور بُرا بھلا کہنے کی آواز آئی۔ میری بیوی نے ہاتھ
کے اشارے سے بتایا یہی نور الٰہی کا فلیٹ ہے۔ اور یہ اس کے لڑکے کی
آواز ہے۔ جو گودی میں قلیوں کا ٹھیکیدار ہے۔ کافی کماتا پیتا ہے پر شادی
ہو چکی ہے مزاج کا تیز ہے۔ ماں باپ سے اتوار کی چھٹی میں ملنے آتا ہے ہر
بار کوئی نہ کوئی بات ایسی ہی ہوتی ہے۔ باپ سے کچھ لیتا دیتا نہیں بس
یہ جھگڑا چلتا ہے کہ روپیہ جمع کرو بینک میں رکھو۔ باپ مانتا نہیں۔ وہ
بھی بڑا سخت ہے۔

دروازے تک پہنچتے پہنچتے یہ سب باتیں سنکر میں نے بیوی
سے تعجب کے ساتھ پوچھا تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا۔ مسکرا کر وہ بولی "کچھ
نہیں میں ذرا پڑوسیوں سے ملنے گئی تھی ان کے ہاں بھی سلام دعا ہو گئی"
یہ سنکر مجھے اطمینان ہو گیا کیونکہ عورتیں سات پشتوں کی معلومات حاصل
کرنے کو سلام دعا ہی کے نام سے یاد کرتی ہیں ـــــ اور میری بیوی
ایک عورت ہی تھی۔ مگر میری نظر میں ایک سیدھے ملنسار شخص اور شفیق
باپ کی صورت تھی اور یہ باتیں اس تاثر کے برعکس تھیں۔ مجھے کچھ الجھن
سی ہونے لگی۔ اپنی بیوی سے میں نے کہا اچھا اور باتیں معلوم ہوں تو
ضرور بتانا۔ یہ سن کر وہ کھل اٹھی اور میری اس فراخ دلی سے خوش ہو کر
چائے بنانے چلی گئی۔

کچھ دن اور گذر گئے۔

میری بیوی اکثر اوقات نور الٰہی کے ہاں گذارتی رہی اور تعلقات
بڑھتے رہے۔ لائبریری کی کتابیں اس دوران پہلے سے بھی زیادہ وقت
لیتی رہیں مگر کچھ نہیں ملتا تھا۔ سوائے لگی بندھی تنخواہ کے ــــ میں
روپیوں کے لئے کافی پریشان تھا۔ کیونکہ چھوٹا بچہ اچانک بیمار ہو گیا
تھا اور ڈاکٹر کے انجکشن آدھی سے زیادہ تنخواہ جذب کر چکے تھے۔ ایک
دن دفتر سے آیا تو بچے کے پلنگ کے پاس میز پر ایک تھیلی میں پھل رکھے
تھے۔ مجھے کچھ غصہ آیا۔ میں نے آواز دی۔ بیوی آئی تو میں نے پوچھا اتنے
سارے پھل کیوں لے آئیں۔ وہ میرے لہجے کا رد کھا پن دیکھ کر کچھ رکی پھر
بولی "وہ آپ کے پڑوسی نور الٰہی آئے تھے اسلم کو دیکھنے۔ وہی لائے
تھے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ اتنے پھل کیا ہوں گے" یہ سن کر میرے غصے کا پارہ
اتر گیا۔ کوٹ اتار کر چائے پیتے ہوئے میں نے پوچھا ان کو کیسے پتہ لگا کہ اسلم
کی طبیعت ٹھیک نہیں؟ بیوی نے کہا "ان کی بیوی ذرا آکر جھانک گئی
تھیں ان سے سلام دعا میں ذکر آ گیا" میں یہ سنکر مسکرانے لگا۔ اور نور الٰہی
کے متعلق سوچتے ہوئے میں نے یہ اندازہ کیا کہ آدمی اچھا ہے۔ پھر دو دن کے
بعد پھلوں کی ایک اور تھیلی آئی۔ میں نے دوسرے دن ایک دوست کے
ہاں سے آتے ہوئے سب آم اس کے پاس بھجوا دیئے۔ بولی میرے سر سے
کچھ بوجھ اتر گیا۔

میلاد کی تعطیل تھی۔ میں کہیں سے گھر واپس آیا تو زینے پر نور الٰہی آہستہ آہستہ ایک آدمی کے ساتھ چڑھتا جا رہا تھا۔ آواز اور اُس دوسرے شخص کا انداز دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہی نور الٰہی کا بیٹا ہو دوسرے منزل پر مڑتے ہوئے نور الٰہی کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ رک کر اس نے بڑے تپاک سے مجھے سلام کیا۔ میں نے کسی قدر شرمندگی کے ساتھ جواب دیکر معذرت کی کہ اس سے اتنے دنوں تک نہ مل سکا۔ وہ خود معذرت کرنے لگا کہ رات بہت دیر میں آنے کے سبب وہ خود بھی کبھی ملنے نہیں آسکا۔ بیٹا بے تعلق نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ نور الٰہی نے میری طرف اشارہ کرکے کہا: "یہ ہمارے ادھر کے نئے پڑوسی ہیں" ہاتھ کے اشارے سے اس نے سلام کیا۔ نور الٰہی اصرار کرکے مجھے اپنے گھر میں لے گیا۔ کمرے میں بٹھا کر وہ دوسری طرف چلا گیا۔ میں نے اس کے بیٹے سے رسمی طور پر بات چیت شروع کر دی۔ جب اسے اندازہ ہوا کہ میں اس کے متعلق کچھ پہلے سے بھی جانتا ہوں تو وہ خندہ پیشانی سے باتیں کرنے لگا۔ میں بولا: "کچھ دن ہوئے میں ادھر جا رہا تھا تب آپ گھر میں کچھ خفگی سے باتیں کر رہے تھے آج بھی آپ دونوں میں کچھ تیز تیز گفتگو ہو رہی تھی کیا معاملہ ہے۔ کچھ بات ہو گئی ہے؟" ایسا معلوم ہوا جیسے دل کا بخار نکالنے کے لئے اسے کسی ایسے پوچھنے والے ہی کا انتظار تھا۔ باپ کے متعلق وہ شکایتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی شکایتیں عجیب بھی تھیں اور ٹھیک بھی۔ اس کا باپ اپنا روپیہ بینک میں جمع نہیں کرتا تھا۔ کہتا تھا سود لینا دینا دونوں حرام ہیں۔ پھر کہاں جاتا تھا۔ روپیہ۔ یہ بتاتا نہیں۔ گھر میں ضرورت بھر کا فرنیچر تک نہیں ہے۔ ماں کے پاس جو زیور تھا وہ شادی کے بعد گروی رکھ کر سٹے میں ختم کر دیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد توبہ کی۔ اور چار ساڑھے چار سال سے لانچ کا کام کر رہا ہے۔ پہلے کلینر بنا پھر کچھ روپے جمع کرکے ایک لانچ میں حصہ دار ہو گیا اور اب ساڑھے چار سال سے اپنے تین لانچ چلاتا ہے۔ کافی آمدنی ہے۔ مگر چھٹی کے دنوں میں بھی روز کے ہی ریٹ سے سواری بٹھاتا ہے۔ سارے لانچ والے خفا ہیں۔ اچھا چلئے کوئی بات نہیں۔ مگر گھر میں لاتے نا جو کچھ کماتے۔ ماں کو تب سے ایک زیور بھی بنوا کر نہیں دیا۔ خالی لگا بندھا خرچ دیتا ہے ماں کو اور بس خلاص۔ آخر ساری رقم کہاں جاتی ہے۔ کئی بار پوچھا کچھ نہیں بتاتا سیدھی بات تو یہ ہے۔ توبہ یونہی کر لی تھی۔ سٹے کی لت ابھی تک نہیں چھوٹی ہے۔ نہیں تو پھر کیا بات ہے کوئی شوق ہے نہیں پینے پلانے کا جوئے بازی کا ریس کا بدمعاش کا۔ پھر کیا بات ہے آس پاس کے لوگوں کے پاس روز نہ روز کچھ نہ کچھ بھیجتا رہتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں اچھا آدمی ہے۔ پر آدمی اچھا تب ہی ہے جب گھر والوں کے لئے اچھا ہو۔

میں یہ سب باتیں سنکر بڑا رنجیدہ ہوا۔ ایک سیدھا سادہ شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے مجھے خیال آیا کہ اب کی بار اگر واقعی پھلوں کی تھیلی آئی تو واپس کر دوں گا۔ ویسے اسلم کی طبیعت بھی اب پہلے سے اچھی تھی۔ میں نے پوچھا "آج کیا بات ہوئی؟"

"سیٹھ۔ میں آپ کو کیا بولوں۔ ایسے آپ دیکھیں گے تو نماز روزہ بہت کرتا ہے مگر ابھی دیکھئے۔ آج میلاد شریف ہے۔ شہر میں اتنا روشنی ہوئیگا رات کو کہ بس" تب میں بولا "بابا آج گھر میں تھوڑا روشنی کر دو۔ ہمارا اسلامی دن ہے۔ پر نہیں مانتا۔ کہتا ہے۔ یہ سب ادھر نہیں چلے گا۔ مگر نہیں مانتا۔ ایسا نماز روزہ سے کیا ہوگا۔ یہ بالکل گول مال ہے" افسوس سے وہ سر ہلانے لگا۔

اتنے میں نور الٰہی اندر آیا۔ اس کے پیچھے چائے کی ٹرے لئے بارہ سالہ لڑکا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے افسوس کیا تم نے ان سے بھی سب باتیں کہہ دیں! مگر اس کے بیٹے کی آنکھوں میں شرمندگی پیدا نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ وہ شکایت کرنے میں حق بجانب تھا۔

میں نے چائے کے سلسلے میں کچھ تکلف کیا۔ مگر نور الٰہی نے بہت اصرار کرکے پلائی۔ ایک پیالی اس نے اپنے بیٹے کو بھی دی۔

"اب سیٹھ آپ ہی پوچھ لیجئے" اس نے باپ کی طرف نظر کرکے کہا۔ "کیا میں گناہ کا بات بولا ہوں ادھر میلاد شریف میں ساری دنیا کا مسلمان خوشی کرتا ہے روشنی کرتا ہے کیا کوئی بُرا بات ہے یہ؟"

میں نے نور الٰہی کی طرف دیکھا۔ وہ گھبرا گیا۔ اس نے بیٹے کو... شکوہ سنج نظروں سے دیکھ کر کہا "ایسے بیکار پیسہ پھونکنے سے کس کا بھلا ہوگا رے۔ غریب کو کھانا کھلاؤ اس سے تو"

"تو پھر کھانا ہی کھلا دو نا بابا!" اس کا بیٹا فوراً بولا "ادھر نیچے میدان

کے پاس خیمہ قنات لگے گا۔ میں ادھر کی چالی کے سب لوگوں کو بلا...
لاؤں گا۔ بس۔ تم بولو تو۔"

"ملو پھر تو بہت سے آدمی لوگ تماشا دیکھیں گے۔ باہر کے سارے
لوگ بھی آجائیں گے۔" وہ کچھ گھبرایا۔

"قنات گھیر کر کھلا دینا۔ نہیں تو ادھر گھر میں کھلا دینا۔ ارے
کیسے بھی ہو سکتا ہے: دوسرا جو آئے گا ان کو روک دیں گے۔ بس خلاص"

"نہیں ایسے ٹھیک نہیں۔ سب کو کھلاؤ نہیں تو دکھاؤ مت۔
ہمارے حضور نے ایسا ہی کیا ہے۔"

اس بار مجھے اس کی آواز کی سادگی کے پیچھے بناوٹ کی جھلک لگ
نظر آئی۔ اوہ۔ میں نے سوچا ایک آدمی اپنی برائی چھپانے کے لئے کیسا
عمدہ ناٹک کرتا ہے اور وہ بھی کیسے پاک نام کے پردے میں۔ کچھ دیر بعد
میں چلا آیا۔

پھر کچھ دن گذر گئے۔

ایک صبح کام پر جانے کے لئے میں بس میں بیٹھ چکا تھا کہ سڑک
کے اس سائڈ پر ایک وکٹوریہ میں نور الٰہی کا بیٹا گذرتا ہوا نظر آیا۔ وہ
شاید کسی مریض کو اپنی گود میں لٹائے ہوئے تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اب
آج پھر کچھ جھگڑا ہوگا۔ شام کو واپسی میں بچوں کے لئے کچھ مٹھائی لے کر
میں لوٹا تو زینے کے پاس کچھ لوگ کھڑے سرگوشیاں کر رہے تھے اور کبھی
کبھی نظر اٹھا کر اوپر بھی دیکھ لیتے تھے۔ مجھے خیال آیا ضرور کوئی حادثہ ہو گیا
ہے۔ ذرا تیز قدموں سے میں اوپر چڑھنے لگا۔ دوسری منزل پر پہنچتے
ہی نور الٰہی کے دروازے پر کچھ اور لوگ کھڑے ملے۔ میں رکا۔ نور الٰہی
کا بیٹا باہر نکل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے سلام
کیا۔ اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر میں ٹھٹکا۔ اتنے میں وہ بھرائی ہوئی آواز
میں بولا" بابا مر گئے۔"

اس قدر اچانک اور تحیر خیز یہ خبر تھی کہ میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا
مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ مگر ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم ایسی ہی
خبریں اور سنتے ہیں تو کچھ زیادہ حیرانی یا افسوس نہیں ہوتا اور جب
اپنے قریب ہی میں کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے تو اعتبار نہیں آتا کہ ایسا
بھی ہو سکتا ہے۔ نور الٰہی کل ہی تو موجود تھا بلکہ آج بھی موجود تھا اور اب
نہیں ہے وہ مجھے اندر لے گیا۔ غسل دیا جا چکا تھا اور کفن میں لپٹا ہوا
نور الٰہی آخری نیند سو رہا تھا۔ اس کا بیٹا میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔ دو
ایک اور آدمی بھی وہیں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا" یہ سب کیسے ہوا؟"
وہ بولا" رات کو کوئی آدمی پورا لانچ دن بھر کے لئے کرائے پر لینے آیا تھا۔ بابا
سے بات کر کے پیسہ ٹھیک کر لیا۔ پھر بولا ہم پوچھ کر ابھی تم کو بولتا ہے تم
ادھر بولو ہم ابھی آتا ہے۔ بابا نے وعدہ کر لیا۔ اودھر وہ آیا نہیں۔ ساری
رات پورا لو پر لانچ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ رات بارش بہت ہوا۔
بالکل بھیگ گیا۔ صبح دوسرے لانچ والوں نے مجھے جاکر بتایا۔ میں گیا
تو دیکھا بابا آگ کے موافق گرم ہے۔ گھر لایا۔ تبھی سے دو ڈاکٹر آئے۔ بولے
ڈبل نمونیہ ہو گیا ہے دو تین سوئی لگایا۔ اس سے بابا نے آنکھ کھولی
تھوڑی دیر کچھ بولا۔ تب ہی یہ سب بات معلوم ہوا۔ میں بولا" بابا تم
نے پیسہ کے لئے اپنی جان کھو دی"۔ تب بابا نے غصے سے کہا" روپے
کے لئے نہیں۔ میں نے اس سیٹھ سے وعدہ کیا تھا۔ تبھی ہمارے حضور
نے ایک آدمی کے لئے تین دن انتظار کیا تھا۔ وعدہ کر کے گڑبڑ کرنے والے
آدمی سیدھا جہنم میں جائے گا۔ میں یہ سنتا رہا۔ یہ سب باتیں کیا
ہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہو یا بڑھاپے سے
اس کی عقل میں فتور آگیا تھا۔ اس کا بیٹا پھر بولا:

"سیٹھ آپ بولئے کیا ہمارا حضور نے ایسا اپنی جان کھو دینے کو
بولا ہوگا۔" میں کچھ بولا نہیں۔ میرے دل پر اس بات کا بڑا شدید اثر
ہوا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک آگیا۔ جنازہ نیچے لیجا کر اس میں رکھا گیا۔ میں
نے ایک لڑکے کے ہاتھ مٹھائی گھر بھجوا کر کہلوا دیا کہ قبرستان جا رہا ہوں

قبرستان سے واپسی پر راستے میں اس کا بیٹا مجھ سے باتیں کرتا
رہا۔ بولا" بابا دوپہر کو آپ کو بہت یاد کیا تھا۔ بولا تھا کچھ باتیں کہنا ہیں
مگر اتنی جلدی خلاص ہو گیا۔ اللہ کی مرضی۔ آپ کے لئے ایک کتاب
دیکر بولا تھا یہ سیٹھ کو دیدینا۔ وہ کتاب گھر پہ ہے۔ ابھی چل کر دیدونگا
میں چپ بیٹھا رہا۔

نور الٰہی کے فلیٹ سے وہ کتاب لیکر جب میں اوپر چڑھ رہا تھا
تو میرا دل بہت ہی غمگین تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اپنا کوئی عزیز
مر گیا ہو اس کی بزرگی اور معصومیت یاد آرہی تھی۔

مگر اگر پتہ لگا کہ بیوی نور الٰہی کی بیوی کے پاس گئی ہوئی ہے۔ بچے کمرے میں ایک طرف کھیل رہے تھے میں چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور کتاب کھول کر دیکھنے لگا۔ یہ بڑے سائز کی ایک نوٹ بک تھی جس میں مختلف جگہ پتے۔ کچھ عدد۔ اور ان کے سامنے رقمیں لکھی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں کسی تاریخ کے نیچے کھلونا فٹ بال اور دوسری کھیل کی چیزوں کے نام لکھے تھے جن میں سے کچھ کٹی ہوئی تھیں کہیں کسی اسکول کا نام اور پتہ تھا۔ ان کے آگے بھی کچھ عدد تھے۔ کتاب کے آخر میں بہت ساری حدیثیں ترتیب وار کبھی نیلی کبھی کالی سیاہی اور موٹے پتلے قلم سے لکھی ہوئی تھیں ساری نوٹ بک میں پنسل سے جگہ جگہ پتوں پر اور کچھ حدیثوں پر بھی ایسے ✗ نشان کچھ بے ڈھنگے انداز سے بنے تھے۔ نوٹ بک کے آخری صفحے میں دو رسیدیں رکھی تھیں ایک کسی اسکول کی فیس کی رسید تھی اور دوسری کچھ کتابوں اور کاپیوں کی۔ بہت دیر الٹنے پلٹنے پر بھی میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کس لئے ہے۔ میرے نام نہ اس میں کوئی خط تھا نہ بات تھی۔ پھر معلوم نور الٰہی نے اسے مجھے دینے کی ہدایت کیوں کی سوچتے سوچتے میرے ذہن میں اک ایسا خیال آیا جس سے میں واقعی چونک پڑا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نور الٰہی واقعی سٹہ کھیلتا ہو اور یہ اس کی یادداشت ہو۔ تحریر یقیناً کسی دوسرے کے ہاتھ کی تھی۔ نور الٰہی پڑھا لکھا نہیں تھا۔ اس نے اپنے بیٹے سے یہ بات چھپا لینے کے لئے مجھے یہ کتاب دلائی ہو گی۔ ذہن میں ایک عجیب گھٹن سی پیدا ہونے لگی۔ نہ اس خیال سے پیچھا چھوٹتا تھا اور نہ اس پر یقین کرنے کو جی چاہتا تھا۔ پھر بھی کتاب کے اندر پتوں کے ساتھ مختلف حدیثیں کو سچ سمجھنے کی طرف مائل کرتے تھے۔ میں نے پریشان ہو کر نوٹ بک الماری میں رکھ دی جیسا بھی ہو، دوسری دنیا کے ہر باسی کے لئے اب کوئی رائے قائم کرنا بے کار ہے۔ یہ سوچ کر میں نے دوسرے کاموں میں اپنے آپ کو الجھا لیا اور یہ بات ذہن میں دھندلا گئی۔

پھر اس واقعے کو قریب قریب ایک ہفتہ ہو گیا۔

میں صبح چائے پی رہا تھا کہ دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ میں نے اٹھ کر کھولا تو ایک دبلا پتلا نوجوان مغموم چہرے کے ساتھ کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سلام کیا اور بولا میں نور الٰہی صاحب کے گھر گیا تھا وہاں سے مجھے آپ کے پاس بھیج گیا ہے۔ میں نے کہا اندر آ جائیے وہ کمرے میں آ کر چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا لب و لہجہ بمبئی والوں کا سا نہ تھا اس لئے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مقامی رہنے والوں میں سے نہیں ہے۔ میں نے چائے پیش کی اس نے معذرت کی پھر کچھ رک کر بولا "میں نور الٰہی صاحب کا ایک جاننے والا ہوں وہ میرے پاس آیا کرتے تھے اس بار نہیں گئے تو مجھے فکر ہوئی۔ انتظار کے بعد کچھ جو سے پتے کے ذریعے یہاں پہنچا۔ آیا تو پتہ لگا کہ کیا ہوا۔ اللہ اُن پر اپنی رحمتیں نازل کرے اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بولا اپنے باپ کے مرنے کا رنج نہیں ہوا مجھے تب میں بہت چھوٹا تھا۔ مگر ان کے مرنے نے مجھے بتا دیا کہ باپ کا مر جانا کیا ہوتا ہے۔ رومال سے آنسو پونچھ کر وہ بولا: معاف کیجئے گا میرا آپ سے کوئی تعارف نہیں ہے میں نے یہ خبر سننے کے بعد یہ معلوم کیا تھا کہ میرے نام ان کا کوئی خط یا پیغام ہے۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا صرف اتنا معلوم ہوا کہ آپ کے پاس ان کی دی ہوئی ایک نوٹ بک ہے۔ اس لئے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ کیا اس میں میرے لئے کچھ ہے۔ میں نے جواب دیا اس میں تو پتوں وغیرہ اور دو رسیدوں کے سوا کچھ اور نہیں۔ وہ بولا کیا آپ مہربانی کر کے مجھے وہ نوٹ بک دکھا دیں گے مجھے تامل ہوا۔ میرے ذہن میں معاً وہی سٹے والی بات گھوم گئی۔ کیا یہ لڑکا اسی سٹے کا دلال تو نہیں جو نوٹ بک دیکھ کر باقی رقمیں جا کر وصول کر لے۔ میں بولا "معاف کیجئے گا جب تک آپ اسے دیکھنے کا مقصد یا یہ نہیں بتائیں گے کہ آپ کا اور نور الٰہی صاحب کا کیا تعلق تھا اس وقت تک میں کیسے فیصلہ کر سکتا ہوں کہ مرحوم کی کوئی چیز آپ کو دینا ٹھیک ہے یا نہیں۔ وہ تھوڑی دیر چپ چاپ کچھ سوچتا رہا۔ اس کے انداز میں ایسا اضطراب تھا جو مجبوراً کسی راز کو ظاہر کرنے والے میں ہوتا ہے۔ پھر اس نے کہا میں آپ سے اس امید میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ شاید اس سے کچھ فائدہ ہو ــــــــــــ

"نور الٰہی صاحب سے سب سے پہلے میں چار سال ہوئے ملا تھا میں فلمی دنیا کے شوق میں کانپور سے آیا تھا مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ اس شوق کا پورا ہونا کتنا مشکل ہے۔ چند دن میں بالکل جیب خالی ہو گئی اور گھر بے حد یاد آنے لگا۔ ایک دن ڈاکخانے میں پوسٹ کارڈ لیکر میز کے پاس کھڑا خط لکھ رہا تھا۔ ایک شخص بڑے پیار سے بولا "بیٹا ذرا

بھے پاس خیمہ قنات لگے گا۔ میں ادھر کی چالی کے سب لوگوں کو بلا...
لاؤں گا۔ بس۔ تم بولو تو۔"

"چلو پھر تو بہت سے آدمی لوگ تماشا دیکھیں گے۔ باہر کے سارے لوگ بھی آجائیں گے۔" وہ کچھ گھبرایا۔

"قنات گھیر کر کھلا دینا۔ نہیں تو ادھر گھر میں کھلا دینا۔ ایسے کیسے بھی ہو سکتا ہے۔ دوسرا جو آئے گا ان کو روک دیں گے۔ بس خلاص"

"نہیں ایسے ٹھیک نہیں۔ سب کو کھلاؤ نہیں تو دکھ دو مت۔ ہمارے حضور نے ایسا ہی کیا ہے۔"

اس بار مجھے اس کی آواز کی سادگی کے پیچھے بناوٹ کی جھلک الگ نظر آئی۔ اوہ۔ میں نے سوچا ایک آدمی اپنی برائی چھپانے کے لئے کیسا عمدہ ناٹک کرتا ہے اور وہ بھی کیسے پاک نام کے پردے میں۔ کچھ دیر بعد میں چلا آیا۔

پھر کچھ دن گذر گئے۔

ایک صبح کام پر جانے کے لئے میں بس میں بیٹھ چکا تھا کہ سڑک کے اس سائڈ پر ایک وکٹوریہ میں نور الٰہی کا بیٹا گذرتا ہوا نظر آیا۔ وہ شاید کسی مریض کو اپنی گود میں لٹائے ہوئے تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اب آج پھر کچھ جھگڑا ہوگا۔ شام کو واپسی میں بچوں کے لئے کچھ مٹھائی لے کر میں لوٹا تو زینے کے پاس کچھ لوگ کھڑے سرگوشیاں کر رہے تھے اور کبھی کبھی نظر اٹھا کر اوپر بھی دیکھ لیتے تھے۔ مجھے خیال آیا ضرور کوئی حادثہ ہوگیا ہے۔ ذرا تیز قدموں سے میں اوپر چڑھنے لگا۔ دوسری منزل پر پہنچتے ہی نور الٰہی کے دروازے پر کچھ اور لوگ کھڑے ملے۔ میں رکا۔ نور الٰہی کا بیٹا باہر نکل رہا تھا مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر میں ٹھٹکا۔ اتنے میں وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا" بابا مر گئے۔"

اس قدر اچانک اور تحیر خیز یہ خبر تھی کہ میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ مگر ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم ایسی ہی خبر کہیں اور سنتے ہیں تو کچھ زیادہ حیرانی یا افسوس نہیں ہوتا اور جب اپنے قریب ہی میں کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے تو اعتبار نہیں آتا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ نور الٰہی کل ہی تو موجود تھا بلکہ آج بھی موجود تھا اور اب نہیں ہے وہ مجھے اندر لے گیا۔ غسل دیا جا چکا تھا اور کفن میں لپٹا ہوا نور الٰہی آخری نیند سو رہا تھا۔ اس کا بیٹا میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔ دو ایک اور آدمی بھی وہیں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا" یہ سب کیسے ہوا؟" وہ بولا" رات کو کوئی آدمی پورا لانچ دن بھر کے لئے کرائے پر لینے آیا تھا۔ بابا سے بات کر کے پیسہ ٹھیک کر لیا۔ پھر بولا ہم پوچھ کر ابھی تم کو بولتا ہے تم ادھر بولو ہم ابھی آتا ہے۔ بابا نے وعدہ کر لیا۔ اودھر وہ آیا نہیں۔ ساری رات اپولو پر لانچ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ رات بارش بہت ہوا۔ بالکل بھیگ گیا۔ صبح دوسرے لانچ والوں نے مجھے جا کر بتایا۔ میں گیا تو دیکھا بابا آگ کے موافق گرم ہے۔ گھر لایا۔ تبھی سے دو ڈاکٹر آئے بولے ڈبل نمونیہ ہوگیا ہے دو تین سوئی لگایا۔ اس سے بابا نے آنکھ کھولی تھوڑی دیر کچھ بولا۔ تب ہی یہ سب بات معلوم ہوا۔ میں بولا" بابا تم نے پیسہ کے لئے اپنی جان کھو دی" تب بابا نے غصے سے کہا" روپے کے لئے نہیں۔ میں نے اس سیٹھ سے وعدہ کیا تھا۔ تبھی ہمارے حضور نے ایک آدمی کے لئے تین دن انتظار کیا تھا۔ وعدہ کر کے گڑبڑ کرنے آدمی سیدھا جہنم میں جائے گا۔ میں یہ سنتا رہا۔ یہ سب باتیں کیا ہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہو یا بڑھاپے سے اس کی عقل میں فتور آگیا تھا۔ اس کا بیٹا پھر بولا:

"سیٹھ آپ بولتے کیا ہمارا حضور نے ایسا اپنی جان کھونے کو بولا ہوگا۔" میں کچھ بولا نہیں۔ میرے دل پر اس بات کا بڑا شدید اثر ہوا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک آگیا۔ جنازہ نیچے لیجا کر اس میں رکھا گیا۔ میں نے ایک لڑکے کے ہاتھ مٹھائی گھر بھجوا کر کہلوا دیا کہ قبرستان جا رہا ہوں

قبرستان سے واپسی پر راستے میں اس کا بیٹا مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ بولا" بابا دوپہر کو آپ کو بہت یاد کیا تھا۔ بولا تھا کچھ باتیں کہنا ہیں مگر اتنی جلدی خلاص ہوگیا۔ اللہ کی مرضی۔ آپ کے لئے ایک کتاب دیکر بولا تھا یہ سیٹھ کو دیدینا۔ وہ کتاب گھر پر ہے۔ ابھی چل کر دیدونگا
میں چپ بیٹھا رہا۔

نور الٰہی کے فلیٹ سے وہ کتاب لیکر جب میں اوپر چڑھ رہا تھا تو میرا دل بہت ہی غمگین تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اپنا کوئی عزیز مر گیا ہو اس کی بزرگی اور معصومیت یاد آرہی تھی۔

مگر آکر پتہ لگا کہ بیوی نور الٰہی کی بیوی کے پاس گئی ہوئی ہے۔
بچے کمرے میں ایک طرف کھیل رہے تھے میں چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور کتاب کھول کر دیکھنے لگا۔ یہ بڑے سائز کی ایک نوٹ بک تھی جس میں مختلف جگہ پتے۔ کچھ عدد۔ اور ان کے سامنے رقمیں لکھی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں کسی تاریخ کے نیچے کھلونا فٹ بال اور دوسری کھیل کی چیزوں کے نام لکھے تھے جن میں سے کچھ کٹی ہوئی تھیں کہیں کسی سکول کا نام اور پتہ تھا۔ ان کے آگے بھی کچھ عدد تھے۔ کتاب کے آخر میں بہت ساری حدیثیں ترتیب وار کبھی نیلی کبھی کالی سیاہی اور موٹے پتلے قلموں سے لکھی ہوئی تھیں ساری نوٹ بک میں پنسل سے جگہ جگہ پتوں پر اور کچھ حدیثوں پر بھی ایسے نشان کچھ بے ڈھنگے انداز سے بنے تھے۔ نوٹ بک کے آخری صفحے میں دو رسیدیں رکھی تھیں ایک کسی اسکول کی فیس کی رسید تھی اور دوسری کچھ کتابوں اور کاپیوں کی۔ بہت دیر الٹنے پلٹنے پر بھی میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کس لئے ہے۔ میرے نام نہ اس میں کوئی خط تھا نہ بات تھی۔ پھر نامعلوم نور الٰہی نے اسے مجھے دیدینے کی ہدایت کیوں کی سوچتے سوچتے میرے ذہن میں اک ایسا خیال آیا جس سے میں واقعی چونک پڑا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نور الٰہی واقعی سٹہ کھیلتا ہو اور یہ اس کی یادداشت ہو۔ تحریر یقیناً کسی دوسرے کے ہاتھ کی تھی۔ نور الٰہی پڑھا لکھا نہیں تھا۔ اس نے اپنے بیٹے سے یہ بات چھپانے کے لئے مجھے یہ کتاب دلائی ہوگی۔ ذہن میں ایک عجیب گھٹن سی پیدا ہونے لگی۔ نہ اس خیال سے پیچھا چھوٹتا تھا اور نہ اس پر یقین کرنے کو جی چاہتا تھا۔ پھر بھی کتاب کے اندر پتوں کے ساتھ مختلف حدیثیں کو سچ سمجھنے کی طرف مائل کرتے تھے۔ میں نے پریشان ہو کر نوٹ بک الماری میں رکھدی جیسا بھی ہو، دوسری دنیا کے ہی باسی کے لئے اب کوئی رائے قائم کرنا بےکار ہے۔ یہ سوچ کر میں نے دوسرے کاموں میں اپنے آپ کو الجھا لیا اور یہ بات ذہن میں دھندلا گئی۔

پھر اس واقعے کو قریب قریب ایک ہفتہ ہوگیا۔

میں صبح چائے پی رہا تھا کہ دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ میں نے اٹھکر کھولا تو ایک دبلا پتلا نوجوان مغموم چہرے کے ساتھ کھڑا تھا۔ مجھے دیکھکر اس نے سلام کیا اور بولا میں نور الٰہی صاحب کے گھر گیا تھا وہاں سے مجھے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے۔ میں نے اُسے اندر بلا لیا وہ کمرے میں آکر چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا لب و لہجہ بمبئی والوں کا سا نہ تھا اس لئے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مقامی رہنے والوں میں سے نہیں ہے۔ میں نے چائے پیش کی اس نے معذرت کی پھر کچھ رک کر بولا: "میں نور الٰہی صاحب کا ایک جاننے والا ہوں وہ میرے پاس آیا کرتے تھے اس بار نہیں آئے تو مجھے فکر ہوئی۔ انتظار کے بعد لکھے ہوئے پتے کے ذریعے یہاں پہنچا۔ آیا تو پتہ لگا کہ کیا ہوا۔ اللہ ان پر اپنی رحمتیں نازل کرے اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بولا اپنے باپ کے مرنے کا رنج نہیں ہوا مجھے تب میں بہت چھوٹا تھا۔ مگر ان کے مرنے نے مجھے بتا دیا کہ باپ کا مرنا کیسا ہوتا ہے۔ وہاں سے آنسو پونچھکر وہ بولا: معاف کیجئے گا میرا آپ سے کوئی تعارف نہیں ہے میں نے یہ خبر سننے کے بعد یہ معلوم کیا تھا کہ میرے نام ان کا کوئی خط یا پیغام ہے۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا صرف اتنا معلوم ہوا کہ آپ کے پاس ان کی دی ہوئی ایک نوٹ بک ہے۔ اس لئے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ کیا اس میں میرے لئے کچھ ہے۔ میں نے جواب دیا اس میں تو پتوں وغیرہ اور دو رسیدوں کے سوا کچھ اور نہیں۔ وہ بولا کیا آپ مہربانی کرکے مجھے وہ نوٹ بک دکھا دیں گے مجھے تامل ہوا۔ میرے ذہن میں معاً وہی سٹے والی بات گھوم گئی۔ کیا یہ لڑکا اسی سٹے کا دلال تو نہیں جو نوٹ بک دیکھکر باقی رقمیں جاکر وصول کرے۔ میں بولا: "معاف کیجئے گا جب تک آپ اسے دیکھنے کا مقصد یا یہ نہیں بتائیں گے کہ آپ کا اور نور الٰہی صاحب کا کیا تعلق تھا اس وقت تک میں کیسے فیصلہ کر سکتا ہوں کہ مرحوم کی کوئی چیز آپ کو دینا ٹھیک ہے یا نہیں۔" وہ تھوڑی دیر چپ چاپ کچھ سوچتا رہا۔ اس کے انداز میں ایسا اضطراب تھا جو مجبوراً کسی راز کو ظاہر کرنے والے میں ہوتا ہے۔ پھر اس نے کہا میں آپ سے اس امید میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ شاید اس سے کچھ فائدہ ہو ——————

"نور الٰہی صاحب سے سب سے پہلے میں چار سال ہوئے ملا تھا میں فلمی دنیا کے شوق میں کانپور سے آیا تھا مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ اس شوق کا پورا ہونا کتنا مشکل ہے۔ چند دن میں بالکل جیب خالی ہوگئی اور گھر بے حد یاد آنے لگا۔ ایک دن ڈاکخانے میں پوسٹ کارڈ لیکر میز کے پاس کھڑا خط لکھ رہا تھا۔ ایک شخص بڑے پیار سے بولا: "بیٹا ذرا

یہ پتہ لکھ دو۔ میں نے مڑکر منی آڈر فارم اس سے لیکر اس کی نوٹ بک سے پتہ نقل کر دیا۔ پندرہ روپے کا منی آرڈر تھا۔ بھیجنے والے کا پتہ پوچھا تو وہ بولا اس ڈاکخانہ کے پوسٹ ماسٹر کی معرفت لکھ کر نور الٰہی لکھ دو۔ میں کچھ حیران ہوا مگر پھر لکھ دیا۔ وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا کسے خط لکھ رہے ہو۔ میں نے کہا اپنی ماں کو وہ کچھ ٹھہر کر باتیں کرنے لگا۔ پوچھنے پر میں نے سارا حال بتا دیا۔ وہ بولا اچھا خط لکھ کر یہیں ٹھہرو۔ منی آرڈر دے کر وہ پھر آیا اور مجھے ساتھ لیکر اپولو بندر آیا۔ وہاں ایک لانچ میں بیٹھکر اس نے میری باتیں سنیں پھر مجھے بہت سی باتیں بتائیں۔ بہت کچھ سمجھایا میں اس کے کہنے سے کچھ کام کرنے پر آمادہ ہو گیا یہ تھی ان سے میری پہلی ملاقات ؟"

" کچھ روز میں نے ان کے لانچ میں کام کیا۔ مگر مجھے سمندر میں گھومنے سے قے ہو جاتی ہے تب وہ ایک سائیکل والے دوست کے پاس لے گئے وہاں میں سائیکل مرمت کا کام سیکھنے لگا۔ اب مرمت کرنے کے علاوہ میں سائیکل کے پرزوں کا ہول سیل کام بھی کرتا ہوں۔ ماں کو بھی خرچ بھیجتا ہوں۔ ایک زینے کے نیچے کوٹھری میں میں نے دوکان بھی کھول لی ہے نور الٰہی صاحب میرے پاس شروع سے ہر ہفتے آتے ہیں۔ انھوں نے مجھے کچھ زیادہ روپے نہیں دیتے تھے۔ شروع میں کچھ دن میرے کھانے کا بندوبست کیا تھا۔ اور بس۔ مگر انہوں نے مجھے روپیوں سے زیادہ بڑی چیز دی انھوں نے مجھے اپنی عزت کرنی سکھائی ایک شریف آدمی کی طرح رہنے کا طریقہ بتایا ورنہ بھی اس شہر میں جہاں صرف اسی طرح رہنا ممکن نہیں ہے۔ میں نے کبھی بھی ان کے کسی کام آنا ان کے گھر جانا یا ان کے کسی عزیز سے ملنا چاہا تو انہوں نے ہر بار مجھے منع کیا بس سالے عرصے ہفتے کے ہفتے آکر کچھ پتوں پر وہ پندرہ پندرہ روپے منی آرڈر کراتے تھے " وہ کچھ دیر رُکا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا:۔

"کیا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ پتے کس کے ہوں گے ؟ شروع میں مجھے بہت سے شبہے ہوتے بہت سے بُرے بُرے خیال آئے ــــــ یہ بدمعاشوں کے دوست نہ ہوں۔ یہ بری عورتوں سے نہ ملتے ہوں۔ لیکن آہستہ آہستہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ سلسلہ کیا ہے۔ شاید بمبئی میں ایسا عجیب آدمی کبھی نہ ہوا ہو۔ جیسا یہ شخص تھا۔ وہ اسی علاقے کی نہ معلوم کتنی غریب اور لاوارث عورتوں کو چپکے چپکے یہ روپے بھیجتے تھے۔ بہت سے سکول کے بچوں کی فیس وہ بغیر بتلائے ادا کرتے تھے۔ ان کی آمدنی بہت کافی تھی پھر بھی اتنی نہیں کہ جتنے پتے ان کے پاس تھے سب کو بھیج سکیں اس لئے وہ ہر مہینے کچھ پتوں پر نشان لگا کر ان ہی میں سب روپے برابر برابر بھیج دیتے تھے۔ مدد تو بہت لوگ دوسروں کی کرتے ہیں مگر یہ عجیب انداز کی مدد تھی جس میں دنیا کے کسی انسان کو خبر نہ تھی کہ کس نے دیا کس نے لیا۔ اگر وہ پڑھے لکھے ہوتے تو شاید مجھے بھی عمر بھر یہ بات نہ معلوم ہوتی ان پتوں میں سے کچھ ان کے تھے جن کو وہ جانتے تھے۔ کچھ کے قریب وہ رہتے تھے۔ کچھ عورتوں کو انہوں نے دیکھا تک نہ تھا اور کچھ کے صرف بچوں سے واقف تھے۔ یہ بات مجھے شروع میں اس طرح معلوم ہوئی کہ ایک بار۔ منی آرڈر واپس آیا۔ لکھا تھا۔ پانے والا کہیں اور چلا گیا ہے۔ ان کو معلوم ہوا تو بڑی دیر افسوس کرتے رہے۔ میں نے پوچھا۔ کون تھی۔ کہنے لگے یہ نہیں معلوم ایک بہت ضرورت مند تھی ایک لانچ والے نے بتایا تھا دیکھا نہیں۔ مجھ سے کھانے مٹھائیاں پھل منگواتے اور منی آرڈر لکھوانے کے بعد، وہ سب چیزیں لیکر کہیں چلے جاتے۔ بعض دفعہ دیر ہو جانے پر، اتنا اُن کے منہ سے ضرور نکلا بچے راہ دیکھ رہے ہوں گے میں سمجھتا اپنے بچوں کے لئے کہہ رہے ہیں۔ مگر ابھی نیچے آکر پتہ چلا کہ ان کا صرف ایک لڑکا ہے اور اس کی شادی بھی ہو چکی ہے۔"

وہ چپ ہو گیا۔ شاید یہ باتیں بھی اس نے اس طرح کہی تھیں جیسے اس کا ذکر بھی کرنا اسے ان باتوں کی توہین معلوم ہوتا ہے۔

کھڑکی سے آسمان نظر آرہا تھا۔ پریشان بادل کسی کو ڈھونڈتے... پھر رہے تھے۔ وہ پھر بولا:۔

" میں کبھی ان کے متعلق کچھ نہ جان سکا۔ میں ان پتوں میں سے بھی کسی پر کبھی نہ پہنچا۔ مجھے معلوم تھا ان کو بہت دکھ ہوگا۔ مجھے ان کا دل دکھانا کسی قیمت پر منظور نہ تھا۔ بہت دن تک انہوں نے اپنے گھر کا پتہ تک نہیں دیا اور دیا تو تاکید کی کہ آنا نہیں۔ اپنی نوٹ بک وہ میرے سامنے بیٹھکر صرف منی آرڈروں پر پتے لکھنے کیلئے دیتے تھے منی آرڈر خود ہی جاکر کرتے تھے۔ شروع شروع میں وہ ہر ہفتے مجھ سے ایک حدیث نوٹ بک میں لکھواتے، جیسے وہ کسی سے زبانی یاد کر کے آتے تھے۔ پھر یہ سلسلہ

بند کر دیا۔ پوچھنے پر کہا اب سب یاد ہو گئی ہیں۔ ان پر چلنا باقی ہے۔ کوئی نئی حدیث اس کے بعد انہوں نے کبھی نہیں لکھوائی۔ پہلے میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مگر اب خیال آتا ہے شاید اس لئے کہ ابھی وہ ان سب پر چل نہ پاتے ہوں گے۔"

کھڑکی سے موٹروں کے ہارن مدہم چیخوں کی طرح سنائی دیتے تھے میں سوچ رہا تھا یہ کون مر گیا۔ جس کے مرنے پر زمین کا سینہ شق نہیں ہوا آسمان ٹوٹ کر نہیں گرا لیکن معلوم کتنے انسانوں کی زندگی میں پہلی بار پتہ لگا ہوگا کہ اپنوں کے علاوہ کسی غیر مرد کے مرنے سے بھی آنسوؤں کے سوتے ابل پڑتے ہیں اور الم دھاڑیں مار مار کر روتا ہے۔ مگر ابھی کتنی یتیموں کو معلوم نہیں ہوا تھا کہ وہ دراصل آج یتیم ہوئے ہیں۔ بہت سی بیکس بیواؤں کو دوسری بار اپنے سہاگ کے اجڑنے کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ کچھ بوڑھے باپ ابھی اس آخری بیٹے کے دلدوز خاتمے سے لاعلم تھے۔ اور یوں۔ کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بمبئی ویسا ہی تھا۔

"میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ اس نوٹ بک میں اگر کوئی پیغام میرے نام نہیں ہے تب بھی آپ اسے مجھے دیدیں۔ مجھے ان پتوں پر یہ اطلاع دینی ہے کہ وہ شخص اب کہاں ہے جو ان کا کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ تھا۔"

اب میرے پاس بھلا کیا جواب تھا۔ چپ چاپ اٹھ کر میں نوٹ بک لایا اور اس کے سامنے رکھ دی لیکن کچھ پس و پیش کے بعد میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ان پتوں کو آپ اس کام نہ لائیں تو بہتر ہے۔ کیوں نہ آپ اس شخص کی داستان یونہی رہنے دیں جو شاید اپنے وقت سے پہلے پیدا ہو گیا تھا ——"

"مگر میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ وہ آج ہی کے لئے تھے۔ اگر وہ کل کے لئے ہوتے تو خدا ان کو اس وقت پیدا نہ کرتا —— مگر آپ کی یہ رائے ٹھیک ہے کسی کو اطلاع نہ دینا ہی اچھا ہے لیکن پھر بھی آپ مجھے یہ نوٹ بک عنایت کر دیں۔"

"اب اس سے کیا فائدہ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "نور الٰہی کے ختم ہو جانے سے اب تو یہ بھی ختم ہو گئی۔"

"نہیں" سر جھٹک کر مضطربانہ وہ بولا: "یہ نوٹ بک ختم نہ ہوگی کیا میں اتنا بد قسمت ہوں کہ ایک ایسے شخص کی روایت بھی زندہ نہیں رکھ سکتا جس نے زندگی سے کچھ مانگا نہیں۔ بلکہ صرف دیا۔" نوٹ بک کھول کر اندر کے پتوں کو دیکھتے ہوئے وہ بولا: "جیسے بھی ہوگا میں ان میں سے کسی کو بھی یہ احساس نہیں ہونے دوں گا کہ نور الٰہی مر گیا ہے۔"

میں نے اس نوجوان کی طرف نگاہ کی تو اس کے وجود کے پیچھے مجھے ایک اور نور الٰہی جنم لیتا نظر آیا۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ واقعی نور الٰہی اب نہیں مر سکتا۔

(بشکریہ "نئی نسلیں")

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری جنوری ۱۹۵۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے، برائے مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں، یا بذریعہ خط کے ذریعے اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی۔ پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ منتظر کرم، منیجر منیر کراچی

۹۹۶ منشی اللہ بخش صاحب۔ مظفر گڑھ
۲۲۷۱ دار المطالعہ مسجد شریف۔ مظفر آباد (آزاد کشمیر)
۲۲۷۴ عطاء اللہ صاحب، کراچی ۱۲
۲۲۷۹ خواجہ محمد یوسف صاحب۔ ڈیرہ غازی خاں
۲۲۷۵ شیخ محمد یوسف صاحب کراچی ۱۲
۲۲۸۳ بیگم ہیڈ ماسٹر طاہر قریشی صاحب، لاہور
۲۲۸۸ بشیر احمد صاحب۔ رحیم یار خاں
۲۵۰۵ انچارج الہلال لائبریری، راولپنڈی شہر

ماہر القادری •

نو بہ نو

میکدے بھی وہی رقص خانے بھی ہیں! کچھ نئے بت ہیں اور کچھ پرانے بھی ہیں
وہ یہ کہتے ہیں ہم بھی ہیں اہلِ وفا اس حقیقت میں شامل فسانے بھی ہیں
اُن کے جور و جفا، اُن کے ظلم و ستم یاد رکھنے بھی ہیں، بھول جانے بھی ہیں
اے مرے ساتھیو! اے مرے دوستو! راہ چلنی بھی ہے، زخم کھانے بھی ہیں
بندگانِ شکم کی جبیں کے لئے ــــ! بارگاہیں بھی ہیں، آستانے بھی ہیں
ہم نشینو! غنیمت ہے اس دور میں سَو قفس ہیں تو چار آشیانے بھی ہیں

اللہ! اللہ! مرے سازِ دل کی نوا
اس میں نالے بھی ہیں اور ترانے بھی ہیں

(بشکریہ "فاران")

ابوالحسن نغمی ●

واہ کیا پابندیٔ اوقات ہے!

میں نے ایک صاحب سے دریافت کیا: "آپ کی گھڑی میں کیا بجا ہے؟" انہوں نے کلائی کو گھما کر اس طرح وقت دیکھا کہ میری نظر ان کی گھڑی پر پڑگئی۔ نو بجکر انتیس منٹ ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے فرمایا۔ "ساڑھے نو بجے ہیں" پانچ منٹ گذر گئے ایک اور صاحب آئے انہوں نے بھی اتفاقاً ان سے وقت پوچھا۔ انہوں نے انہیں بھی "ساڑھے نو بتائے" تھوڑی دیر بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور میں نے اُن سے کہا "اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے" انہوں نے کلائی گھما کر وقت دیکھا اب ان کی گھڑی میں نو بجکر اڑتیس منٹ ہوچکے تھے لیکن انہوں نے مجھ سے فرمایا: "بیٹھئے۔ ابھی جلدی کیا ہے، چلے جائیے گا ابھی ساڑھے نو ہی تو بجے ہیں"

مجھے ان پر اتنا غصہ آیا کہ میرا جی چاہا کہ ان کی گھڑی لیکر پتھر سے چکنا چور کر دوں۔ میں نے خون کا گھونٹ پی کر ان سے کہا "بھائی وقت کوئی جامد شے تو نہیں ہے۔ آپ نو منٹ سے برابر یہی کہے جارہے ہیں کہ ساڑھے نو بجے ہیں"

وہ بے پروائی سے بولے "نو دس منٹ کا فرق ہی کیا" میں ان سے بحث کرکے وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا تھا اس لئے میں نے ان سے کہا "لیکن میرا تو ایک ایک منٹ قیمتی ہے"

انہوں نے بڑے طنز سے کہا "جی ہاں! آپ بڑے آدمی جو ٹھہرے" میں نے ان کے اس فقرے کا جواب دینا بھی تضیع وقت سمجھا اور مصافحہ کرکے رخصت ہوا۔ بس اسٹاپ پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک نمبر کی بس ابھی ابھی گئی ہے۔

جون کا مہینہ تھا، دھوپ میں تیزی آچکی تھی۔ بس کا انتظار کرنے کے لئے کوئی شیڈ بھی نہ تھا۔ مجھے ہندوستان کا ویزا حاصل کرنے کے لئے نہر کے پل تک جانا تھا کافی دیر بس کا انتظار کیا لیکن بس ندارد۔ دو نمبر کی کئی بسیں آئیں اور گزر گئیں لیکن ایک نمبر کی بس کا کوسوں پتا نہ تھا۔ ایک نمبر کا انتظار کرنے والوں کا اچھا خاصا مجمع ہوچکا تھا۔ میں نے سوچا اب اگر بس آئے گی بھی تو اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ ہوگی۔ بہتر ہے کہ پیچھے کی طرف چلو پچھلے بس اسٹاپ سے سہولت رہے گی چنانچہ میں ضلع کچہری کے بس اسٹاپ پر پہنچا۔ وہاں بھی کافی دیر انتظار کیا مگر بے سود۔ میں نے سوچا اب اس سے بھی پچھلے اسٹاپ پر چل کر انتظار کرنا چاہیئے۔ چنانچہ میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر والے بس اسٹاپ پر کھڑا ہوا۔ مگر بس ندارد۔ آپ اسے مبالغہ سمجھیں گے لیکن یقین کیجئے میں پاؤں پیدل سکریٹریٹ گیا۔ وہاں سے جیسپبہ بائی اسکول وہاں سے نیلی پارکنگ اور بالآخر بس ٹرمینس پر پہنچ گیا یعنی وہ مقام جس کے آگے ایک نمبر کی بس نہیں جایا کرتی۔ میں نے دیکھا کہ ایک نمبر کی بس کھڑی تھی اور بس کے کنڈکٹر اور ڈرائیور ایک دکان میں بیٹھے سوڈا واٹر پی رہے تھے۔ اب آپ خود ہی اندازہ کرسکتے ہیں کہ غصہ کی وجہ سے میرے اعصاب پر کتنا زور پڑا ہوگا مگر میں پھر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

قائدِ اعظم کے حجام نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ایک بار جب میں قائدِ اعظم کی حجامت بنانے کے لئے گورنر جنرل ہاؤس میں داخل ہوا تو مجھے ایک منٹ کی دیر ہوگئی تھی۔ قائدِ اعظم نے حجامت بنوانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اس ایک منٹ کا اثر تمام دن کے پروگرام پر پڑے گا۔

ایک ہم ہیں کہ ہمارے نزدیک نو دس منٹ کا فرق کوئی فرق ہی نہیں ہے۔

فلم ایکٹرسوں کے متعلق سنا ہے کہ ان کی عمر دس دس سال تک جامد رہتی ہے۔ وہ کئی سال تک اپنی عمر اکیس سال بتاتی رہتی ہیں۔ لیکن ہمارے ملک کے لوگ کئی کئی منٹ تک ساڑھے نو ہی بجایا......

کرتے ہیں۔

منٹوں کا فرق تو رہا ایک طرف، ہمارے یہاں گھنٹوں کا فرق بھی معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔

"اچھا جی تو کل کے بجے آ رہے ہو"

"بس یہی کوئی نو دس بجے"

جی ہاں یہی کوئی نو دس بجے ـــــ گویا ایک گھنٹے کا فرق کوئی فرق ہی نہیں ہے۔

حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار سے میری خاص بے تکلفی ہے میں نے ایک بار اُن سے دریافت کیا "آپ ٹھیک وقت پر دفتر کیوں نہیں جاتے؟"

انہوں نے جواب دیا "ٹھیک وقت پر جانے میں کچھ کم ظرفی سی محسوس ہوتی ہے"

"ایک منٹ" اور "ایک سیکنڈ" کا محاورہ تو دن بھر سنتے ہی رہتے ہیں۔

"ارے بھئی مجھے بٹھا کے تم کہاں جا رہے ہو؟"

"بس میں ایک منٹ میں واپس آیا"

اور ایک منٹ کا وعدہ کرنے والا شخص اگر پانچ منٹ میں واپس آجائے تو آپ سمجھ لیجئے کہ وہ گیا ہی نہ تھا۔

میں جس اخبار کے دفتر میں پہلے ملازم تھا وہاں میرے ایک رفیق کار خبروں کا ترجمہ کرنے سے بہت گھبراتے تھے۔ چنانچہ وہ اکثر و بیشتر مفقود الخبر رہا کرتے۔ ایک آدھ چھوٹی سی خبر کا ترجمہ کرکے وہ اٹھ کھڑے ہوتے، میں پوچھتا "کہاں چلے؟"

وہ خالص پنجابی لہجے میں فرماتے "بس میں ہنے آجاواں گا ـــــ اک سیکنڈ وچ۔"

اور وہ دو گھنٹے غائب رہا کرتے۔ میں ان سے کہا کرتا "سیکنڈ وچ" تو آپ ضرور آئیے گا لیکن گرین وچ ٹائم کے بموجب نہیں۔

علامہ آزاد سبحانی نے مجھے بتایا کہ لندن میں وہ ایک انگریز مصنف سے ملنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اُسے خط لکھا کہ "میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں" تو جواب آیا کہ آپ ۹ مارچ کو بدھ کے روز سہ پہر کو تین بجے ملئے میں آپ سے چار بجے تک گفتگو کروں گا"

علامہ سبحانی کا بیان ہے کہ جب میں تین بجے مصنف کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہ میرا منتظر بیٹھا تھا۔ ایک گھنٹے تک اس نے ایسی میٹھی میٹھی باتیں کیں کہ معلوم ہوتا تھا وہ میرے کانوں کے ذریعے میرے حلق میں قند اُتار رہا ہے۔ ایک گھنٹے تک وہ خلق مجسم بنا رہا۔ لیکن جیسے ہی گھڑی نے چار بجائے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دانت نکوس کر بولا ـــــ

"آل رائٹ، تھینک یو فار یور کائنڈ وزٹ" (All right, thank you for your kind visit)

اور مصافحہ کرکے برابر والے کمرے میں چلا گیا۔

ہمارے یہاں اگر کوئی اس قسم کا مظاہرہ کرے تو پرلے درجے کا بداخلاق: مغرور اور بے مروت کہلائے۔

ایک مبالغہ آمیز کہانی مشہور ہے کہ ایک شخص کسی سے ملنے کے لئے گیا۔ جب رخصت ہونے لگا تو میزبان رسم مشایعت کیلئے بڑھا۔ تھوڑی دور تک رخصت کرنے آیا تھا لیکن باتیں کرتے کرتے مہمان کے گھر تک چلا گیا۔ اب گویا جو میزبان تھا وہ مہمان بن چکا تھا اور جو مہمان تھا وہ میزبان۔ جب وہ رخصت ہونے لگا تو میزبان (جو پہلے مہمان تھا) مہمان کو ـــــ رخصت کرنے پھاٹک تک آیا لیکن باتیں کرتے کرتے مہمان کے گھر تک چلا گیا ـــــ غرض تمام رات یہی سلسلہ جاری رہا۔ صبح دونوں بیہوش ہو کر گر پڑے۔

ایشیائی معشوق کی جملہ صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ جس وقت آنے کا وعدہ کرتا ہے اس وقت نہیں آتا ـــــ

چنانچہ دلّی شاہجہاں پوری کا ایک شعر ملاحظہ ہو ـ

نہ وہ آرام جاں آیا نہ موت آئی شب وعدہ
اسی دھن میں ہم اللہ اللہ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں

اور یہ شعر غالباً آپ نے سنا ہی ہوگا ـ

کسی کا شام کا وعدہ لئے معاذ اللہ
جھجک جھجک کے ستاروں میں روشنی آئی

جو لوگ وقت کے پابند نہیں ہوتے، میں انہیں بغیر رعایت "معشوق" کہتا ہوں۔

شاعری اور ادب ہماری زندگی کا آئینہ ہے ـــــ جیسے ہم ویسی ہماری شاعری ـــــ اختری فیض آبادی کی گائی ہوئی ایک غزل ریڈیو پاکستان لاہور سے وقتاً فوقتاً نشر ہوا کرتی ہے۔ اس غزل کا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے اور مجھے رخصت کیجئے کہ میں نے ایک شخص سے ملنے کا دعوا کیا ہوا ہے میں کم از کم ان کا "معشوق" نہیں بننا چاہتا۔ وہ شعر یہ ہے:-

نزع کا وعدہ تھا محشر میں ملے
واہ کیا پابندیٔ اوقات ہے

(بشکریہ "الحمرا")

افتخار اعظمی

○

فیضِ ساقی نہ سہی، ساغر و مینا نہ سہی
مستئ شوق سہی، نشۂ صہبا نہ سہی

چشمِ نمناک میں ہیں کتنے ستارے روشن
ظلمتِ شب میں فلک پر کوئی تارا نہ سہی

کیوں نہ ہم رنگِ گلستاں سے کریں کسبِ جمال
جلوۂ گل ہی سہی، جلوۂ سینا نہ سہی

آہِ پرسوز تو ہے، نالۂ پُر درد تو ہے!
دل قتیلِ نگہۂ نرگسِ شہلا نہ سہی

بزمِ گیتی میں تو روشن ہوا بھی شمعِ حرم
گر نہیں روشنئ دیر و کلیسا نہ سہی

سر میں سودائے جنوں قیس کے مانند تو ہے
نہ سہی دل میں اگر شورشِ لیلا نہ سہی

اُسکے جلوؤں سے منور ہے مری بزمِ خیال
بر سرِ عام اگر — انجمن آرا نہ سہی

نفسِ شوق سے غنچوں کو ملا ذوقِ نظر
گلشنِ دہر میں اعجازِ مسیحا نہ سہی

لالہ و گل کی طرح تازگئ حسن تو ہے
میرے اشعار میں رنگینئ صہبا نہ سہی

پھر بھی موہوم سی اک یاد مرے دل میں تو ہے
نگہۂ یار کا آنور وہ تقاضا نہ سہی!

ترجمہ: نجمی بی۔ اے

نیل کا گودام

جین پور سے اعظم گڈھ جانے والی پختہ سڑک پر دو آدمی چلے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک مرد تھا جس کا نام ثابت تھا۔ دوسری اس کی بیوی رحیماں تھی۔ ثابت کی عمر لگ بھگ پچاس سال کی ہوگی کمر تھوڑی سے جھک گئی تھی ورنہ ویسے وہ کافی تندرست اور توانا لگتا تھا۔ اس کا نصف سے زیادہ چہرہ گھنی؟ مونچھوں اور ڈاڑھی میں چھپا ہوا تھا اور پکے ہوئے سیب کی طرح سرخ نظر آتا تھا۔ سر پر اس نے میلے سے کپڑے کی بڑی سی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ چارخانے نما کپڑے کا ڈھیلا ڈھالا کرتا۔ اور میلی سی دھوتی جو صرف گھٹنوں تک آتی تھی۔ پہنے تھا۔ اور پیر میں دیسی ساخت کے جوتے تھے جن پر جمی ہوئی سیاہی مائل گرد کی تہیں صاف بتا رہی تھیں کہ انہیں خوب اچھی طرح تیل میں چپڑ لگیا ہو۔

اور فربہی مائل رحیماں اپنے شوہر سے تقریباً چار سال چھوٹی تھی وہ ایک بہت کافی گھیر والا پرانی وضع کا لہنگا پہنے ہوئے تھی جس پر لگے ہوئے مختلف رنگوں کے پیوند اس کی عجوبیت میں اور بھی اضافہ کر رہے تھے۔ اور ایک "نیم آستین" جس میں بجائے بٹن کے تاگے کی گھنڈیاں لگی تھیں اور گہرے گلابی رنگ کا دوپٹہ سر اور شانے سے ہوتا ہوا نیچے کی طرف لٹک رہا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکے اسے کبھی آگے کر دیتے اور کبھی پیچھے۔ پشت پر ایک بڑی سی گٹھری تھی۔ جس کے ایک سرے کو اس نے گردن کے داہنی طرف شانے کے اوپر سے لیجاکر، اور دوسرے کو بائیں بغل کے نیچے سے لاکر خوب مضبوطی سے باندھ لیا تھا۔ اس بوجھ کی وجہ سے وہ کچھ جھکی ہوئی چل رہی تھی۔۔۔ بظاہر اس میں چیتھڑے ہی نظر آتے تھے مگر ذرا بھی غور سے دیکھنے پر معلوم ہو جاتا تھا کہ اس میں ان کی روزآنہ ضروریات کی ساری چیزیں تھیں۔؟ کھانے پکانے کی چیزیں، المونیم کا چھوٹا سا لوٹا۔ کچھ کپڑے، چھوٹی سی ایک کلہاڑی، اور بہت سی چیزیں تھیں۔

"اب تو پیر میں درد ہونے لگا۔" رحیماں نے اپنے شوہر سے کہا۔

"شاید تھوڑی دیر میں پانی برسے۔" نیچے جھکے آتے ہوئے آسمان کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

اگست کا مہینہ تھا اور شام کا وقت۔ وہ شمال مشرق کی طرف سے تیز و تند ہوائیں بہت زور شور سے چل رہی تھیں۔ یہ ہوائیں گرد کے بگولوں کو شاید زبردستی اپنے ساتھ لیجانا چاہتی تھیں۔ کیونکہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں اور گرد و غبار تھوڑی دور جاکر راہگیروں کے چہروں اور جسموں کو ٹکرا کر گر پڑتے تھے۔ اور اتنی ہی تیزی سے گھرے آتے ہوئے سیاہی مائل بادل شاید ہواؤں کو ان کی سرکشی کی سزا دینے کی فکر میں تھے ——— اور یہ سب دیکھکر بیچارا سورج جلدی سے چھپ جانے کی سوچ رہا تھا۔

"تو اب رات کو ٹکنے کے لئے کیا ہوگا؟" رحیماں نے پوچھا۔

"ایک جگہ تو بنک ہی ہے مگر یہاں سے پکا دو کوس ہوگا" اس کے شوہر نے جواب دیا۔

"باتیں نہ بناؤ۔ اب تک چھ سات کوس چل چکے ہیں لو۔ پانی بھی آ رہا ہے" اس نے کچھ غمگین آواز سے کہا۔

"تو پھر ادھر ہی کہیں رک جائیں گے" ثابت نے بہت نرمی سے کہا۔ "اچھا اب کچھ دیر سستا لو"

"ہاں کچھ دیر دم لے لوں" اور وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر چلنے کے لئے کھڑی ہوئی۔ تو ثابت نے کہا:

"لاؤ گٹھری میں باندھ لوں، تب جلدی چل سکوگی" اور رحیماں نے گٹھری کھول دی ——— اس کے بعد وہ خاموشی سے کچھ دیر چلتے رہے۔

اور کچھ دیر بعد بارش کی اِکّا دکی بوندیں لگاتار زمین میں جذب ہونے لگیں۔ رحیماں نے چاروں طرف دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے بولی:

"ہم لوگ شاید اس گودام کے نزدیک آ گئے ہیں۔ ہے نا؟ دیکھو وہ کیا داہنی طرف گاؤں ہے اور پاس ہی نالہ۔ وہ کیا پانی چمک رہا ہے ———

کیا نام ہے گاؤں کا۔ ہاں۔ آں۔ ارے ٹھیک ہے "اسرف پور"۔ وہ پانچ برس پہلے تو وہیں تھا۔ جب ہم لوگ سارہ کے ساتھ جا رہے تھے اور اگر اس مدت میں پست نہ ہو گیا ہو تو اس میں دو گھر بھی ہیں رہنے کے قابل اور ہاں، احاطے میں کنواں بھی ہے ——"

ثابت جیسے کچھ یاد کر رہا تھا۔ چار پانچ منٹ بعد اس نے کہا: "ہاں سارہ کی ماں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بالکل ٹھیک۔ بس اب ہم ایک آدھ گھنٹے میں پہنچتے ہیں" پانی تیز ہوتا جا رہا تھا۔ انہوں نے اپنے قدم اور تیز کر دیئے۔ رحیماں کو اپنے پیروں میں درد کا شدید احساس ہو رہا تھا اور پہلے سے اس کا خیال تھا کہ وہ مسلسل بارہ میل کبھی نہیں چل سکتی۔ حالانکہ جوانی کے عالم میں اس کی دوگنی مسافت بھی اس کے لئے کوئی چیز نہ تھی۔ اور پھر اس وقت تو اس کے پاس بچے رہتے تھے۔ ایک تو ہر وقت اس کے سینے سے چمٹا رہتا اور دوسرا بھی اس کے ہی سہارا چلتا۔ اور جب یکایک دور سڑک کے کنارے پر اسے ایک گری پڑی عمارت کے کونے نظر آئے تو وہ خوش ہو گئی۔

"بس یہی ہے" اس نے یکایک کہا "یہی وہ نیل کا گودام ہے مجھے یاد تھا کہ وہ یہیں کہیں ہے۔ حالانکہ ہم اس وقت آئے تھے۔ جب سارہ اور اس کا "آدمی" ہمارے ساتھ تھے۔ یاد ہے نا۔ ہم لوگ ادھر ہٹ کر اسرف پور میں ٹکے تھے"

ثابت نے سر ہلا دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سڑک سے چکر کاٹ کر چلنے کے بجائے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا کوئی راستہ مل جاتا تو رحیماں کو اور کم تکلیف ہوتی۔ جلد ہی اسے قدموں کے نشان، گودام کی طرف جاتے ہوئے مل گئے اور وہ دونوں آگے پیچھے چلنے لگے، اور چند منٹ کے بعد احاطے میں داخل ہو گئے۔

پکی اینٹوں کی بنی ہوئی متعدد کمروں کی یہ کھنڈر نما عمارت اس زمانے کی یادگار تھی جب اس طرف نیل کی کاشت زوروں پر تھی۔ اور جرمنی نے مصنوعی رنگ نہیں ایجاد کئے تھے۔ چنانچہ نیل اکٹھا کرنے کے لئے جگہ جگہ سرکاری گودام بنائے گئے تھے۔ پھر جب کاشت ختم ہو گئی تو یہ گودام بھی ویران ہوتے گئے۔ اور رفتہ رفتہ کھنڈر میں تبدیل ہوتے گئے۔ یہ عمارت بھی انہیں میں سے ایک تھی۔

"اس طرف وہ گھر ٹھیک رہے گا" رحیماں نے اپنے سامنے کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اور وہ دو تین کمروں کے کھنڈروں سے گزرتے ہوئے دائیں طرف والے کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرہ سوکھی پتیوں۔ اور گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں سے پانی کی بوچھاریں آ رہی تھیں اور مکڑی کے جالوں کی ایک مصنوعی چھت مع جھالروں کے تیار ہو رہی تھی۔

اچھا تو تم اسے ٹھیک کر کے رہنے کے قابل بناؤ۔ لاؤ میں تھوڑا سا پانی لیتا آؤں" رحیماں نے چھوٹی سی بالٹی نکال کر دیدی۔ اور پھر کمرہ کو جھاڑ پونچھ کر سامان ٹھیک سے ادھر ادھر رکھنے میں مشغول ہو گئی ——

بدنما سی سوزنی کو اس نے نئے ٹاٹ کے ایک بستر پر رکھ دیا۔ ایک طرف دیوار میں ایک الماری کی یادگار رہ گئی تھی۔ اس نے اس میں ٹین کی تشتریاں، المونیم کے پیالے اور ایک چھوٹا سا چاقو رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے فخریہ انداز میں گرد اور جالوں کے درمیان ہی کارنس پر ایک تصویر نکال کر رکھ دی۔ ان کاموں سے فراغت حاصل کر کے وہ ہاتھ پیر صاف کر کے اطمینان سے بیٹھنے جا رہی تھی کہ یکایک کچھ آہٹ پا کر چونک سی گئی۔

خالی عمارتیں اکثر اس قسم کی آوازوں سے بھری ہوتی ہیں —— اور رحیماں کو اس کا اچھی طرح تجربہ تھا۔ محض چوہوں کی بھاگ دوڑ، جھینگروں کی آواز، چمگادڑوں کی پھڑ پھڑاہٹ، یا ہوا کی سرسراہٹ اسے اس طرح نہیں چونکا سکتی تھی۔ اسے یقین سا ہونے لگا تھا کہ یہ آواز کسی انسان کی تھی۔ قدموں کی آواز —— انسانی قدموں کی آواز —— جو ساتھ کے کمرے میں حرکت کر رہے تھے۔ وہ سانس روک کر سننے لگی —— دوسرے ہی لمحہ اسے صاف سنائی دینے لگا۔ یہ سرسراہٹ انسانی آوازیں تھیں تب اس نے کھڑکی کھولے بغیر تھوڑا سا جھانک کر ثابت کو اشارہ کیا جو پانی سے بھری ہوئی بالٹی لئے آ رہا تھا۔ اس اشارہ سے وہ اور بھی خاموش اور محتاط ہو کر تیز تیز چلنے لگا۔ یہ اس کا فوری قسم کا جواب تھا۔ آپس کی رفاقت کی اس طویل زندگی میں انہوں نے اکثر ایک دوسرے کی مدد کی تھی۔ چنانچہ جب تک وہ کمرہ میں واپس نہ آ گیا کچھ بولا نہیں۔

"کچھ لوگ ہیں" رحیماں نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا "یہاں کچھ

ہیں؟" "کیسے معلوم؟ ——— کہاں ———؟"
وہ اس طرف، ادھر کے کمرے میں۔" اس نے ایک طرف اشارہ
ہیں نے آوازیں سنی ہے۔ سنو!"
اور وہ دونوں سننے لگے۔ بغل کے کمرے سے چلنے کی آوازیں برابر
ں، اور باتیں کرنے کی بھی۔
وہ ہیں؟" رحیماں نے کہا۔ "کون ہو سکتا ہے۔ ہماری ہی طرح کوئی
اور کون یہاں ———"
ہو سکتا ہے کہ کوئی اپنی ہی جان پہچان کا ہو۔ جانتی ہو آج کل
ے کے گھر والے ادھر ہی ہیں۔"
نہیں وہ نہیں ہوں گے۔" رحیماں نے یکایک کہا۔ "کسی نے اس
یا ہو گا اور مرمت کرنے آئے ہوں گے۔"
نہیں نقیر کے گھر والے نہ ہوں۔ سنا ہے آجکل وہ وہاں رونق سے
ہیں۔"
ثابت نے جواب دیا۔ "جب ہم دوپہری سننے چلے گئے تو ان کے بارے
ہوا کہ یہ تھی۔"
ہاں یہ راہی لوگوں کا ٹھکانہ۔ اونہہ۔" رحیماں نے کہا "جاؤ
ز۔ کوئی بھی ہو۔ مگر اسے اتار کر۔ ہاں! ٹھیک ہے۔"
ثابت نے جلدی سے جوتا اتارا۔ اور انتہائی احتیاط سے کمرے سے
وہ اتنی آہستگی سے چل رہا تھا کہ صرف اسی قسم کے لوگ اس طرح
ہیں۔
رحیماں اپنے کان لگائے سنتی رہی۔ آوازیں آرہی تھیں لیکن اس
یہی معلوم کیا۔ اسے خیال ہوا کہ اس نے سسکیوں کی آواز بھی
۔ وقت گزرتا گیا۔ ثابت بہت خوبی سے بغیر آہٹ کئے ان کی
تا رہا۔ اور پھر اتنی خاموشی سے واپس آیا کہ خود بیچاری بوڑھی
ی اچھل پڑی۔
ڈرو نہیں۔" ثابت نے بہت دھیمی آواز سے کہا۔ "دو ہی مگر
ب طرح کے آدمی۔"
آئیں! یہ کیسے؟"
لڑکی نے آنکھوں پر چشمہ لگا رکھا ہے۔ اور لڑکا بہت خوبصورت ہے

مگر نکال دینا چاہیے۔"
"نہیں، میں نہیں چاہتی۔ کتنے کپڑے پانی میں ...... مگر وہ
کیا کہہ رہے ہیں؟"
"وہ جھگڑ رہے ہیں۔" ثابت نے کہا۔ "لڑ رہے ہیں۔ جلد ..."
"ہاں چنا چیٹ میں نے بھی سنی تھی۔"
"لڑکی رو رہی ہے۔ صفحہ ایک رومال سے چھپتے ہے۔ اس کے
پاس ایک نیلا، سفید، نیلا، رومال ہے جس کا نیلا کنارہ ہے۔"
"تو کیا وہ بڑے لوگ ہیں؟"
"ہاں، ہاں، بڑے آدمی۔ ان کا کپڑا بہت اچھا ہے۔ لیکن وہ
میرے خیال میں اس گھر کے بارے میں نہیں آئے۔"
"تب کیا کر رہے ہیں؟"
"ہماری ہی طرح پانی سے بچنے، اور میرے خیال میں ان کے پاس
کافی روپیہ پیسہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ لوگ ... کی
بہت باتیں کر رہے ہیں۔"
"تو آپ جھگڑا اس بات پر ہے کیا؟"
"نہیں! جہاں تک میں جان پایا ہوں، وہ یہ ہے کہ یا تو وہ لڑکی
سے بیاہ کرنا چاہتا ہے اور وہ نہیں چاہتی۔ یا دونوں کا بیاہ ہو چکا ہے اور
لڑکی چونکہ ناچاہتی ہے اور وہ نہیں رہتا۔"
"نہیں، نہیں، ہم کو ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔" رحیماں نے جلدی
سے کہا۔
"اونہہ" ہو سکتا ہے کہ وہ میاں بیوی ہوں۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ
مگر چپ، چپ، وہ ادھر ہی آرہے ہیں!"
نیم پختہ فرش پر قدموں کی آواز قریب تر آتی جا رہی تھی۔ رحیماں
نے جلدی جلدی سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ کہ چھپالے، کون جانے کیسے
لوگ، مگر ثابت نے اسے روک دیا۔
"نہیں، ڈرو نہیں۔ میں نے انہیں سمجھ لیا ہے۔ وہ کچھ نہیں کر سکتے"
اور اس لمحے دروازے میں ایک نوجوان نمودار ہوا۔ وہ دبلا اور اکہرے
بدن کا نوجوان تھا اور عمدہ قسم کے سوٹ میں ملبوس۔ اس کے چہرے پر
بے پناہ معصومیت تھی۔ شاید ابھی طرح جوان نہیں ہوا تھا۔ اس کے

پیچھے تاریکی میں ایک لڑکی کا ترشا ہوا سا چہرہ اس کے اچھی طرح اور ـــــ خوبصورتی سے سنوارے ہوئے بالوں کے بیچ میں جیسے فریم کر دیا گیا تھا اس کے معصوم کی حامل آنکھیں کچھ خوفزدہ سی تھیں۔

"ہوں" نوجوان نے سختی سے کہا: "تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ثابت نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا اور کہا: "یہ جگہ جتنی تمہاری ہے اتنی ہماری بھی۔"

"بلکہ تم سے زیادہ ہی" رحیماں نے حق رفاقت ادا کیا: "ہم لوگ تو سڑک پر ہی رہنے والے ہیں اور تم لوگ گھروں میں رہنے والے۔ ان کا یہاں کیا کام؟"

"ٹھیک" نوجوان نے قدرے معضوطی سے کہا: "مگر میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارا یہاں کیا کام ہے؟"

"ہمارا کام یہ ہے کہ اس پانی برستی رات میں یہیں ٹھہریں گے ـــــ کھائیں گے، سوئیں گے اور اگر تم ادھر ادھر کی باتیں نہ کرو تو کچھ نہ کہیں گے یہاں ہم سب کے لئے کافی جگہ ہے۔"

"ٹھیک تو ہے شمو" لڑکی نے کہا: "چلو واپس چلیں۔" اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، آنکھیں نمناک تھیں۔ اور پلکوں کے کنارے کچھ سوجے ہوئے سے تھے۔

اب رحیماں یکایک پیشہ وارانہ انداز اختیار کر گئی۔

"میں کسی بھی شریف آدمی کو اور بڑے آدمی کو نہیں لوٹتی۔" اس نے اپنے مخصوص لہجہ میں کہا جو صرف ایسے ہی خوش پوش لوگوں کے لئے وقف تھا۔ کہنے لگی: "میں جانتی ہوں کہ آپ بڑے گھر کی ہیں۔ اگر آپ ایک چونی دیں۔ تو میں آپ دونوں کے بارے میں کچھ اچھی اور فائدہ کی باتیں بتاؤں ـــــ اس سے زیادہ کہ آپ لکھنؤ کے ٹکٹ کی قیمت ـــــ اور۔"

لڑکی نے ایک متعجبانہ اور جھجکتی ہوئی نگاہ اپنے ساتھی پر ڈالی۔

"آئیے۔ بی بی" رحیماں نے بڑے پیار سے کہا: "میں آپ کو ... شوہروں کے بارے میں بھی بتاؤں گی۔"

لڑکی بڑھتی ہوئی تمتماہٹ اور غصہ کے ساتھ نوجوان کی طرف مڑ گئی ـــــ "میں یہ سب بیہودگی برداشت نہیں کر سکتی۔" اس نے جھلا سے کہا: "چلو چلیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے" نوجوان نے کہا: "مگر ابھی کرو سب سے اچھا یہ ہے کہ ہمارے والے میں تو چھت کے درازوں سے مسلسل پانی ٹپک رہا ہوگا۔"

"آپ کو پہلے ہی اس میں آنا چاہئے تھا مگر اب ہم لوگ یہاں آگئے ہیں تو یہیں رہیں گے۔" ثابت نے کہا: "میری بوڑھی عورت بھیگ گئی ہے اور اگر میرے ہوتے ہوئے بھی ـــــ سوکھی جگہ نہ ملے تو"

"بہت بہتر آؤ" نوجوان نے کہا: "ہو سکتا ہے کہ رات سے پہلے بارش ختم ہو جائے۔ ہم لوگ روانہ ہو جائیں گے۔"

وہ اور لڑکی واپس چلے گئے۔ ثابت اور رحیماں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"سڑکوں پر عجیب عجیب چیز ملتی ہے" رحیماں نے کہا: "لیکن آخر کیا رہتے ہیں وہ لوگ۔ میں یہی سوچ رہی ہوں۔"

"تم بیوقوف ہو" ثابت نے جواباً کہا: "ہر چیز کے پیچھے پڑ جاتی ہو عورت ہو نا؟ میں اس کے بارے میں دوبارہ نہیں سوچتا۔ نہ تم ہی سوچو چلو آگ جلائیں، تمہارے کپڑے بھیگے ہیں۔"

وہ زنبیل نما گٹھری کی طرف مڑا اور اس کی گہرائیوں میں سے اس کا بقیہ خزانہ بھی نکال لیا۔ لکڑی کے ٹکڑے اور سوکھی ٹہنیاں تھیں۔ یہ لوگ اس طرح کے گٹھے ہمیشہ ہی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ بڑھاپے میں ان کو اس سے بہت آرام ملتا تھا۔

جلد ہی آگ جلائی اور پانی سے بھری ہوئی ایک "پتیلی" رکھدی گئی، پہلے تو چمکدار شعلہ بھڑکا پھر جب انہوں نے باہر سے اکٹھا کی ہوئی نم لکڑیوں کو بھی رکھدیا تو کچھ دھواں اٹھنے لگا۔ کمرہ گرم ہو گیا اور رحیماں کے کپڑوں سے بھاپ نکلنے لگی۔ اس کے شوہر نے اپنی چادر اتار کر اس کے کندھے پر ڈال دی۔

"لے اوڑھ لو سارہ کی ماں۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ موسم تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ تمہیں اپنی حفاظت کرنی چاہئے۔"

انہوں نے چار بنائی اور دن میں پکائی ہوئی روٹی کے ساتھ پیٹ بھر کر کھایا۔ باہر بارش زور دل سے ہو رہی تھی۔ تیز ہوا درختوں اور پتیوں سے ٹکرا کر عجیب سا شور پیدا کر رہی تھی۔

"ان کے کمرہ میں بہت ٹھنڈ ہوگا" رحیماں نے آہستہ سے کہا "آگ

بھیجتی جارہی تھی مگر ثابت کی ہمت نہ پڑی کہ باہر جاکر اور لکڑی لائے۔ پھر کچھ سوچ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلوں دیکھوں کوئی لکڑی گری پڑی اِس طرف مل جائے؟" اور باہر نکل کر دھکّے ہوتے شہتیروں کے ٹکڑوں کو نکالنے ہی والا تھا کہ اس نے اس نوجوان کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

"کرے" نوجوان نے اسے مخاطب کیا: "ہم لوگ آپ سے زیادہ بھیگ گئے ہیں۔ کمرے میں بہت زیادہ پانی جمع ہوگیا ہے۔ میں یہ کہنے جارہا تھا کہ بارش رکنے تک تمہارے کمرے میں آجائیں۔ پھر فوراً چلے جائیں گے۔"

"ہم لوگ "غریب" ہیں۔" ثابت نے جواب دیا: "بنا پیسہ کے اپنی آگ سے فائدہ نہیں اٹھانے دیں گے۔"

"نہیں میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اس خاتون کو کسی خشک جگہ بیٹھ جانے دو۔ اتنے کے لئے شاید تم ایک کتے کو بھی اجازت دیدوگے۔"

"نہیں، میں کسی کتے کو کبھی پاس نہیں بٹھا سکتا۔" ثابت نے فوراً جواب دیا۔ "میری عورت اور میں کبھی کتوں کو پاس نہیں بٹھاتے ہم کو معلوم ہے کہ ان کے پسو ہوتے ہیں اور ایسی چیزوں سے ہم کو کیا مطلب؟"

نوجوان شخص نے کچھ اس طرح ثابت کا جائزہ لیا جیسے وہ خود بھی اسی کیڑے کی قسم سے تعلق رکھتا ہو۔

"خیر اگر تم روپیہ ہی چاہتے ہو تو میں دوں گا۔" اس نے کہا۔

"ایک روپیہ ہی کافی ہوگا نا؟"

"ایک روپیہ بہت ہوگا۔" ثابت نے قدرے سوز سے کہا۔ "اور اس میں آگ بھی شامل ہے۔ ہم نے بہت سی آگ جلا رکھی ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" نوجوان نے باہر آتے ہوئے دھوئیں کے اثر سے کھانستے ہوئے کہا۔ لیکن ثابت اور رحیماں کا کمرہ حالانکہ دھوئیں اور پرانے چیتھڑوں کی بو سے بھرا ہوا تھا پھر بھی ان کے ٹپکتے ہوئے کمرے سے تو اچھا ہی تھا۔ جہاں وہ اور شاہدہ اشرف گھنٹوں سے کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح اپنے کو خشک اور گرم رکھ سکیں۔ اور اب شاہدہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ رحیماں کے پاس آگ کے نزدیک احتیاط سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ اب گلابی نہ رہا تھا۔ بلکہ نیلا پڑ گیا تھا۔

"اچھی بی بی، میرے ہاتھ پر ایک چونی رکھو۔" رحیماں نے بغیر... کسی شرمندگی کے کہا، "اور میں آپ کی قسمت کا بہترین حال بتاتی ہوں۔"

"میں جھوٹی باتیں نہیں چاہتی۔" اس نے غصے سے جیسے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

"جھوٹ! بی بی، میں کبھی جھوٹ نہیں کہتی۔ اگر میں جھوٹ کہوں تو ابھی مر جاؤں۔"

"میری عورت بہت سچی ہے۔" ثابت نے کہا۔ "بہت اچھا ہو اگر آپ جھوٹا نہ کہتیں۔"

شاہدہ کو ایسا محسوس ہوا کہ اسے ملامت کی گئی ہے۔ حالانکہ اسے یقین تھا کہ اس نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔

چنانچہ اس نے کہا: "مجھے افسوس ہے۔ خیر اگر تم کہتی ہو تو میرا ہاتھ دیکھ سکتی ہو۔ مگر میرے پاس صرف ایک دونی ہے۔"

"کوئی بات نہیں بی بی، خوش رہو، تمہاری عمر بڑی ہو۔ دونی سے میں تو کسی بڑے پہ چائے خرید لونگی اور پھر آپ کو دعا دیکر پی لوں گی۔ مجھے چائے بہت پسند ہے بی بی۔"

شاہدہ نے اپنا نرم و خوبصورت ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"مجھے دھول لگے ہاتھ بہت پسند ہیں کیونکہ ان میں لکیریں خوب دکھائی دیتی ہیں ——

تو اب جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہاں میں ریل کی ایک پٹری دیکھ رہی ہوں اور اس پر ایک ریل گاڑی لکھنؤ جا رہی ہے اور آپ اور ایک شریف آدمی ساتھ بیٹھے ہیں۔ اور جب آپ لکھنؤ پہنچتے ہیں تو میں دیکھ رہی ہوں کہ بہت سے لوگ اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے کھڑے ہیں۔ ایک مولوی صاحب ہیں جو بیٹھے ہیں، اور خوب اچھے اچھے کھانے ہیں۔ پلاؤ، متنجن اور سب کچھ ہے۔ اور پھر —— اس کے بعد آپ ہیں اور اتنی اچھی جیسے پری اور آپ کے ساتھ ایک نوجوان آدمی بھی ہیں۔ پھولوں کا ہار پہنے، بڑی بڑی آنکھیں، اور نرم ملائم بال والے ——"

لڑکی نے اپنا ہاتھ غصہ سے الگ کھینچ لیا: "مہربانی کرکے یہ سب بیہودگی بند کرو۔ میں یہ سب نہیں سن سکتی۔"

"آپ بیاہ کرنا نہیں چاہتیں؟"

"نہیں میں نہیں چاہتی۔ گویا کہ میں .... چھوڑ دیجئے..."

مولوی صاحب .... ہندی .... اس کی آواز میں نفرت ابھر آئی۔" اور پھر پھولوں کی بارش اور مبارکباد۔" رحیماں نے ہمت بڑھائی "میں زیادہ سننا نہیں چاہتی۔ دیکھو تم قسمت کا حال بتانے والی ہو، ہو نا۔ میرے خیال میں میں پہلی لڑکی ہوں جس سے تم ملی ہو اور جس نے اپنی شادی کے بارے میں سننا پسند نہیں کیا؟"

"ہاں، اگر میں سچ سمجھ لوں۔" رحیماں نے کہا جو ایسی باتیں سُن کر اپنا مخصوص لہجہ بھول گئی تھی۔

"ہاں تم کو یقین کر لینا چاہیئے۔ میں شادی کرنا نہیں چاہتی —— میں شادی وغیرہ پر یقین نہیں رکھتی" —— اور اس نے رحیماں پر نہیں بلکہ نوجوان شخص پر ایک ترچھی نگاہ ڈالی۔

"لیکن کوئی لڑکی اکیلے کیسے گزارا کر سکتی ہے۔ ایسا کیسے —— ؟"

"اور یہ ٹھیک بھی تو نہیں۔" ثابت نے اضافہ کیا۔ "مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ میری عورت کئی بار مصیبت میں پڑ گئی ہوتی اگر میں اس کی فوراً مدد نہ کرتا۔" یا تیار نہ رہتا اور صحیح راستہ نہ دکھاتا۔"

"میرا مطلب اکیلے رہنے کا نہیں،" لڑکی نے کہا، "میں ان دونوں پر یقین نہیں رکھتی۔ جس سے میں نفرت کرتی ہوں وہ شادی کی غلامی ہے اور ریاکاری ہے ——" اس کی آواز اونچی اور تیز ہوتی گئی۔ اور وہ قدرے تقریر کرنے کے انداز سے کہنے لگی: "یہ! یہ اپنی آزادی کھو دینے کا سوال ہے جسے میں برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر صدیوں سے عورتیں غلام نہ رہی ہوتیں تو کوئی بھی نہ کرتی جب میں اپنا ساتھی چنوں گی تو ہم دونوں ہی آزاد ہوں گے —— محبت کرنے اور الگ ہونے میں —— اندر کا گوداسڑ جانے پر ہم باہر کا چھلکا برقرار نہیں رکھیں گے۔"

ثابت اور رحیماں کھلے ہوئے منہ کے ساتھ خاموشی سے اسے تک رہے تھے اور نوجوان شخص بے چین نظر آرہا تھا۔

"تم میرے اس دوست کو دیکھتی ہو۔" شاہدہ نے تقریر جاری رکھی۔ "اور تم بھی جو ایک عورت ہو فوراً رائے قائم کر لیتی ہو کہ ہم شادی کرنے جا رہے ہیں۔ تمہارا خیال بالکل غلط ہے۔ ہم لوگ شادی کرنے والے ہوتے تو اس طرح بھاگ کر نہیں جاتے۔ بلکہ گھر بیٹھے شادی کے تحفوں کا جائزہ لیتے ہوتے ہم اپنی زندگیاں ساتھ گزارنے جا رہے ہیں مگر آزادی کے ساتھ۔ کسی بندھن میں بندھ کر نہیں۔ ہم جب چاہیں گے ایک دوسرے کو چھوڑ سکیں گے آزادی سے کام کریں گے جو بھی چاہیں گے آزادی سے کر سکیں گے ——۔"

"اونہہ!" رحیماں نے کہا، "میں الگ ہونا نہیں چاہتی۔ اور ان کی مرضی کے خلاف بھی نہیں چلتی۔ اس لئے تمہارے کہنے کا مطلب سمجھ رہی ہوں، ہمارے بیاہ کو چالیس برس ہو گئے۔ اور ہماری بیٹی سارہ بیس برس ہوئے بہت اچھے آدمی سے بیاہی گئی تھی وہ اس وقت چمڑے کا بیوپار کرتا ہے وہ بہت اچھے گھر میں رہتے ہیں۔ جس میں ایسی ہی کھڑکیاں ہیں چھوٹے بڑے پانچ بچے اور بڑا تو جوان ہو رہا ہوگا۔ ہمارا ایک لڑکا بھی ہے جس کی اسی شہر میں ایک بڑی سی چائے والے کی دوکان ہے۔ وہ ایک کے بعد دوسرا بیاہ کر چکا ہے۔ ہم کو اپنے بچوں پر فخر ہے۔ لیکن وہ ہم سے کافی دور ہو گئے اور اگر ہم دونوں نہ ہوتے تو بھلا کیسے گزرتی۔"

"یہ اپنے بچوں سے بہت پیار کرتی ہے۔" ثابت نے کہا، "بڑی لڑکی سارہ اکثر ہمارے پاس آتی ہے مگر پھر ہم دونوں اکیلے رہ جاتے ہیں۔"

"اور پھر بڑھاپے میں جوانی سے زیادہ مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔" رحیماں نے کہا، "میں اب بوڑھی ہوں اور بہت سے کام نہیں کر سکتی۔ اگر میں ان کے ساتھ نہ ہوتی تو کون کرتا۔ اتنے دن ساتھ رہنے کے بعد اگر الگ ہو جائیں تو جینا اجیرن ہو جائے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"تم ایک دوسرے سے لگتا جاتے ہو۔" ثابت نے کہا، "اگر مجھے ان سڑکوں پر اکیلے چلنا پڑ جائے تو میں پریشان ہو جاؤں اور کچھ نہ کر سکوں۔"

"اور اگر میں تم کو ان سڑکوں پر کسی دوسرے کے ساتھ دیکھ لوں تو۔"

"نہیں بڑھیا ایسا نہیں کر سکتا۔" ثابت نے محبت آمیز شوخی سے اس کی اوڑھنی اس کی آنکھوں پر سرکاتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے۔ ارے۔" اس نے کہا۔ "یہ کیا۔" لیکن وہ خوش نظر آرہی تھی اور قدرے مفتخر بھی۔

بارش طوفان کی شکل اختیار کر چکی تھی اور تیز اور پر غضب ہواؤں کے جھونکے اس نیل کے گودام سے ٹکرا رہے تھے۔ سوکھی پتیاں اور ٹہنیاں تیزی سے ادھر اُدھر آ جا رہی تھیں اور احاطے میں چھوٹا سا گڑھا جھیل کی شکل اختیار کرنے لگا تھا۔ لیکن آگ کے نزدیک چاروں طرف گرمی بھی تھی اور خشکی بھی۔ بل کھا کر اٹھتا ہوا سلگوں دھواں شاہدہ کا دم گھونٹے دے رہا

اس کی آنکھوں میں عجیب سے آنسو آگئے ——— واقعی وہ دھوبن ہی تھا۔ اسے فخر کا احساس ہوا اور پھر کانپ گئی۔ آخر کار وہ آزاد ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی شو کو بھی بچا لیا تھا ورنہ وہ بھی غلاموں میں شامل ہو کر ان کی سب خصوصیات کا حامل ہو جاتا۔

"اور آآ۔ اوں۔ آں۔ آآآآ" ایک پُر شور جماہی نے اسے چونکا دیا۔

"میں۔ مجھے نیند آ رہی ہے" ثابت نے بات کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر سو کیوں نہیں جاتے۔ مجھے یہ سب پسند نہیں۔ اور میرے خیال میں بی بی بھی اپنے سب خراب خیال کے ہوتے ہوئے پسند نہ کریں گی ——— سو جاؤ"

"ہاں اب سوؤں گا" ثابت نے جواب دیا۔

"تب یہ چادر لے لو۔ میں تو اس کو اوڑھنے کی وجہ سے خوب گرم ہو گئی ہوں"

"نہیں مجھے چادر نہیں چاہیئے۔ میں ویسے ہی سوکھی لکڑی کی طرح گرم ہوں"

"نہیں اوڑھ لو۔ تمہیں جاڑا لگے گا" "لاؤ دو"

اور پھر ایک دوستانہ قسم کی ہلکی سی ہاتھا پائی ہوئی اور ثابت نے چادر لے لی۔ اس کی بیوی نے اپنے پھٹے پرانے کپڑوں کے اوپر سے ٹاٹ نما بستر اوڑھ لیا۔ انہوں نے پھر اس کے بعد شاہدہ اشرف اور شمیم ناصر کا کوئی خیال نہیں کیا۔ اور جلد ہی، بالکل ان جانوروں کی طرح جو اپنے دشمنوں میں گھرے ہو کے بھی اطمینان کی نیند سوتے ہیں۔ خاموش اور متعجب کن ..... نیند سو گئے۔

"عجیب بوڑھا جوڑا" شمیم نے ہلکی سی سانس لیکر کہا "مجھے افسوس ہے کہ تمہیں یہ سب کچھ سننے کے لئے آنا پڑا۔ شاہی۔ لیکن اس کرے کے دلدل میں پھنسنے سے تو یہ بہتر ہی تھا"

"لوہ، وہ ٹھیک ہیں۔ بلکہ مجھے پسند ہیں۔ حالانکہ دراصل وہ دھوکہ دیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے لئے بہت اچھے ہیں جو غیر معمولی بات ہے۔ میں تو سوچا کرتی تھی کہ اس قسم کے لوگ اپنی بیویوں کو ٹھوکریں لگایا کرتے ہیں"

"مرد اتنے کم ظرف اور آوارہ گرد نہیں ہوتے جتنا تم سوچتی ہو" اس نے قدرے تنگ مزاجی سے کہا کیونکہ اس خطرناک سفر کے تلخ حصہ کا اسے اچھی طرح احساس ہو رہا تھا۔ باہر ویرانے میں طوفانی جھولوں کے جھکڑ اور موسلادھار بارش اور اندر کمرے میں یہ اچھا ناخوشگوار دھواں۔ لیکن اسے تعجب ہوا کہ اس کے چیلنج کا جواب نہیں دیا گیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی گوشے میں یکجا سوتے ہوئے جوڑے کو تک رہی تھی۔

"یہ محبت ہے جو دونوں کو جوڑے ہوئے ہے" اس کی متفکرانہ آواز سرگوشی کی سی آہستگی اختیار کر چکی تھی "صرف شادی نہیں" اس کا جواب تھا۔

"میں جانتا ہوں" اس نے سختی سے کہا "مجھے یقین ہے کہ اگر ان کی شادی نہ ہوئی ہوتی تو وہ اس طرح اکٹھا نہ ہوتے ——— کم از کم اس طرح جیسے یہاں"

"کیوں نہیں۔ محبت کرنے والے مخلص نہیں ہوتے؟"

"میں تم سے سینکڑوں بار کہہ چکا ہوں کہ یہ اس سے مختلف چیز ہے۔ خصوصاً اس وقت جب بڑھاپا آئے گا، جوانی اور ادھیڑ عمر کے متعلق میں نہیں کہتا۔ مگر وہ بوڑھے ہیں اور بہت سے موقع آئے ہوں گے جبکہ وہ محبت کرتے کرتے تھک گئے ہوں گے اور زندگی سے عاجز آ گئے ہوں گے اور اگر ایک دوسرے سے بندھے ہوئے نہ ہوتے تو کبھی اس طرح زندگی نہ گزارتے"

"یہ تو ٹھیک ہے ——— اس وجہ سے کہ وہ بندھن میں جکڑے ہوئے تھے"

"اور بندھن نے انہیں خراب موقعوں پر بھی جوڑے رکھا یہ تو اس رسّے سے بندھنے کی مانند ہے جو پہاڑ پر چڑھنے والے باندھے رہتے ہیں ——— جب ایک یا دوسرا گرنے لگا تو اس نے روکے رکھا اور پھر جب وہ کھڑے ہو گئے تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ جو لوگ شادی شدہ نہیں ہیں۔ خواہ آپس میں کتنی ہی محبت کرتے ہوں کسی نہ کسی طرح آخر وقت میں ضرور ہی پریشان ہوتے ہیں۔ تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ اگر ان کی زندگی ٹھیک نہ گذرے تو فوراً الگ ہو جاتے ہیں۔ کیوں تم بھی تو کہتی ہو کہ تم تمام زندگی ایک آدمی کی ہو کر نہیں رہو گی۔ تم ایک خاص عمر چاہتی ہو اور بس۔ پھر اسے ہمیشہ ساتھ رہ کر خراب نہیں کرنا چاہتیں جیسے

خیال میں اس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، میں نے تم سے بیسوں بار کہا
ہوگا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

بجھتی ہوئی آگ کی روشنی میں بیٹھا ہوا وہ بہت ہی کم عمر لگ رہا
تھا۔ ورنہ وہ ان کے ساتھ نہ آیا ہوتا، کم از کم ان حالات میں۔ وہ نوجوان
تھا مگر وہ بھی ثابت کی طرح بوڑھا ہو جائیگا۔ یہ سنہرے بالوں کا خوبصورت
گچھا سفید ہو جائیگا۔ اس کا تر و تازہ چہرہ سوکھ کر جھری دار ہو جائیگا
تو کیا وہ اس وقت بھی اسے پسند کرے گی۔ یا تب وہ الگ ہو کر اپنا راستہ
لیں گے۔ پھر اس وقت وہ کیسے رہیگا۔ ثابت کی طرح مہربان، شفیق،
اور محافظ، اور اس وقت بھی محبت کرنیوالا؟ ساتھ ہی بوڑھے ہو جانا۔
ایک ساتھ نہ صرف آغاز میں بلکہ زندگی کی آخری منزل تک۔ لیکن بندھے
ہوئے۔ ایسے ہی جیسے ثابت اور رحیماں بندھے ہوئے تھے۔ جانفشانیوں
اور کشمکش کی یادوں میں بھی ساتھ، زندگی کی صعوبتوں میں ہاتھ بٹاتے
ہوئے، زندگی کے اس لمبے سفر میں ایک دوسرے کی رفاقت میں اپنے
بچوں کی محبت اور یاد میں۔

اس نے یکایک اپنا سر جھکا لیا۔ ہاتھوں پر آنسوؤں کے قطرے
گر کر مچلنے لگے ——— "شاہدہ پیاری، یہ کیا؟ بتاؤ!"

اور شاہدہ نے اپنا سر اس کے کندھے پر لٹکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"شمو۔ شمو —— کیا تم مجھے ہمیشہ چاہو گے ——— جب ہم
بوڑھے ہو جائیں گے تب بھی؟

"سچ مچ میں تم سے ہمیشہ محبت کروں گا۔"

"اتنی زیادہ جتنی کہ وہ —— ؟" اس نے اپنا ہاتھ بے خبر
پڑے ہوئے ثابت اور رحیماں کی طرف اٹھا دیا۔

"یقیناً۔ میں ایسی ہی امید کرتا ہوں۔" شمو نے قدرے اطمینان
سے کہا۔

"تب۔ شمو ——— چلو واپس چلیں۔"

"واپس چلیں، کہاں؟"

"گھر۔ میں چاہتی ہوں کہ ہماری شادی ہو جاتے۔"

"میری ننھی شاہدہ، لیکن تم نے تو کہا تھا کہ ——"

"میں انہیں دیکھ رہی ہوں۔ وہ کتنے خوش و خرم ہیں۔ وہ کتنے
اچھے ہیں۔ وہ گندے ہیں۔ بے شرم بوڑھے ہیں مگر وہ خوش ہیں۔ ان کے
پاس وہ سب کچھ ہے جو ہمارے پاس نہیں۔ اور جو ہم کبھی نہیں پا سکتے
جب تک کہ شادی نہ کریں۔"

اس نے اتنی عقلمندی یہاں کی کہ شاہدہ کو اپنے سینے سے لپٹائے
بغیر کچھ کہے سنتا رہا۔

"چلو گھر واپس چلیں۔ ابھی نو بھی نہیں بجے ہیں۔ ہم امی سے بآسانی
کہہ سکتے ہیں کہ راستہ میں بارش کی وجہ سے رک گئے تھے اور بارش ختم
ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کچھ نہیں جانیں گی۔"

"اور ہم شادی کریں گے؟"

"ہاں ——— حالانکہ وہ ہم کو وہ سب کچھ کرنے پر مجبور نہ
کریں گی ——— مہندی، نکاح، اور سب کچھ ——"

"کوئی بات نہیں! یہ اس عورت کی بتائی ہوئی باتوں کو۔ سچ
ثابت کر دے گی۔"

دونوں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"ہم کب روانہ ہوں گے؟"

"اوہ، جلد ہی ——— ابھی۔"

"لیکن بارش ہو رہی ہے۔"

"کوئی بات نہیں ——— ہم گھر سے صرف ۲۰ منٹ کی
مسافت پر ہیں، اور ہم کو علیگڑھ تک چلنا اور پھر لکھنؤ کے لئے روانہ تو
ہونا نہیں ہے۔"

وہ کانپ اٹھی، اور شمیم نے اس کو جیسے کسی خطرناک چیز سے
بچانے کے لئے اپنے سے قریب کر لیا۔

"مجھے تم کو نہیں آنے دینا چاہئے تھا۔ میں بیوقوف ہو گیا تھا۔ میں
اس پر یقین نہیں رکھتا تھا پھر بھی تمہیں روک نہ سکا۔ مجھے ڈر تھا کہ تمہیں کھو نہ
دوں۔ مجھے خود اپنے حواس پر قابو رکھنا چاہئے تھا اور بجائے اس کے کہ تمہارے
راستہ پر چلوں، تم کو ہی لے چلنا چاہئے تھا۔"

"تو یہی تم آئندہ کرنے جا رہے ہو؟"

"ہاں۔ کیونکہ تم ایک ننھی منی نادان ہو؟"

وہ اپنا منہ اس کے قریب کر کے ہنس پڑی۔

اور پھر شمیم کو فوری عمل کا احساس ہوا۔

"آؤ چل دیں، ورنہ اتنی دیر ہو جائے گی کہ کچھ کہتے نہ بن پڑے گا کیا تم تیار ہو؟"

"بالکل ——— میں خوش ہوں کہ ہم کوئی سامان نہیں لاتے سوائے اور کوٹ اور پرس کے ورنہ اس کے متعلق صفائی دینا بہت مشکل ہوتا کہ کیوں ہم مع دو عدد سوٹ کیسوں کے ٹہلنے گئے تھے۔"

وہ خوشی سے ہنس پڑے اور پنجوں کے بل چلتے ہوتے باہر نکل گئے وہ چلتے گئے مگر ابھی وہ گودام کے احاطے کے اندر ہی تھے کہ شاہدہ نے محسوس کیا کہ اس نے کوئی کام کئے بغیر چھوڑ دیا ہے۔

"شمو، ہمیں ان سے کہہ دینا چاہیے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ --- جان جائیں۔"

"خدا کے لئے واپس جا کر انہیں جگاؤ مت۔ تم چاہتی کیا ہو؟"

"یہی کہ ہم شادی کرنے جا رہے ہیں۔"

"مبتی، تو اس سے ان سے کیا مطلب۔"

"اونہہ، کچھ نہیں۔ لیکن میں نے سوچا کہ ——— ذرا اپنی پاکٹ بک میں سے ایک ورق توڑ دینا۔ ایک کام ہے۔"

اس نے دیدیا اور شاہدہ نے اس پر گھسیٹ دیا: "ہم شادی کرنے جا رہے ہیں۔" اور پھر کمرے میں جا کر اس نے لڑکے اور لڑکی کی تصویر کے پاس رکھدیا۔

"اور ہاں دیکھو" اس نے پھر کہا: "اب جبکہ ہم لکھنو نہیں جا رہے ہیں ہمیں اپنے ٹکٹ کی قیمت انہیں دیدینا چاہیے۔ ان کا بہت کام چلے گا۔"

"ممکن ہے اس سے فضول خرچی کریں۔"

"خیر کرنے دو۔ میں ایسے لوگوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی جن کے پاس ڈھنگ کے جوتے بھی نہ ہوں۔"

آگ کی مدھم روشنی ثابت کے پھٹے ہوئے گندے جوتے کے ساتھ بہت بدتمیزی سے کھیل رہی تھی۔

"اور نہ میں ہی۔ خیر یہ روپیہ ہے۔ جاگنے پر ان کے لئے بہت تعجب کی چیز ہوگی۔"

اس نے روپیہ کو کارنس پر رکھے ہوئے کاغذ پر رکھدیا۔ اور دونوں باہر چلے گئے۔

جب ثابت اور رحیماں بیدار ہوئے تو دن اچھی طرح نکل آیا تھا طوفان ختم چکا تھا۔

"ارے وہ چلے گئے ہیں" ثابت نے کہا۔

"ہماری کوئی چیز تو نہیں لے گئے۔ کیوں؟" اس کی بیوی نے چاروں طرف بے چینی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ کچھ لے نہیں گئے۔ وہ بڑے لوگ تھے۔ اور بڑے آدمی غریبوں کی چیزیں بغیر کسی وکیل کی مدد کے نہیں لیتے۔ ارے یہ کیا ہے؟" اس کے شوہر نے کارنس پر رکھا ہوا خزانہ پالیا تھا۔

"اللہ جانے وہ اتنا روپیہ کیوں چھوڑ گئے۔ اتنے سارے نوٹ۔ اگر یہ ٹھیک ہو۔ ہماری تو خوش قسمتی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ ورنہ اتنی بڑی رقم ہمارے صمد کی تصویر کے پاس نہ چھوڑ جاتے۔ یہ سچ مچ کی شرافت ہے۔"

"میں بھی نہیں سمجھ پائی کہ یہ سب نوٹ چھوڑ سکتے ہیں۔ کچھ بھی ہو لو نہ ہمارے کام آوے گا ہی۔"

"اس سے ہم لوگ آدھ سیر بکری کا گوشت لیں گے اور"

"ہاں اور کچھ میٹھا بھی اور جاتے بھی اور تمہارے لئے ایک چپل بھی یہ سب شہر پہنچکر لیں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے ——— لیکن دیکھو اس کاغذ پر کچھ لکھا ہے۔"

"ہاں ہے تو مگر افسوس ہے کہ ہم پڑھے لکھے نہیں ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ کچھ ہمارے لئے ہی ہو۔"

"ہاں ٹھیک ہے میرا بھی یہی خیال ہے۔"

اس نے کاغذ اٹھالیا اور بہت احتیاط سے معائنہ کیا۔ اور اپنے شوہر کو دیدیا۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا۔

"بڑا افسوس ہے کہ ہم اسکول میں پڑھے لکھے نہیں۔" رحیماں نے کہا: "مجھے ضرورت نہ معلوم ہوئی۔"

"میں چاہتی ہوں کہ یہ لفظ جو وہ لکھ گئے ہیں کسی طرح پڑھ لوں۔"

(باقی صفحہ ۵۷ پر دیکھئے)

احمد ندیم قاسمی

سمت

شام ہاتھوں میں شعاعوں کے لیے انگارے
دُور پربت کے جھروکے میں نظر آتی ہے
ابنِ آدم کو اگر سمت کا احساس نہ ہو
ایک پل کو تو یہ سمجھے کہ سحر آتی ہے

•

وہی موہوم اُجالا، وہی لالی، وہی کیف
وہی اک گونج میں لپٹا ہوا سناٹا ہے
کون جانے کوئی ڈوبا ہو کہ اب اُبھرے گا
کس نے آغاز کیا، کس نے سفر کاٹا ہے

•

شام کے بعد، شعاعوں کے بجھے انگارے
رُخِ گیتی پہ اترنے لگے کاجل بن کر
صبح ہوتی تو تجلّی کا امڈتا سیلاب
سنگ و آہن کی فصیلوں سے بھی آتا چھن کر

•

جھٹپٹا ہے یہ گجردم کا دھندلکا تو نہیں
کورچشمی کا یہ الزام نہ اپنے سر لو!
صبح کے جشن کا انجام کہیں رات نہ ہو
تم جو چاہو تو ابھی سمت معیّن کر لو

• (بشکریہ ادب لطیف)

علی احمد شاہدی

عاشو خالہ

دنیا والوں کی بھلی چلائی۔ کہنے والے کب چوکتے ہیں۔ کوئی دل کے زخموں پر پردہ ڈالنے کی خاطر ہی کیوں نہ مسکرائے۔ لوگ جل اٹھیں گے اور اگر غم کی آگ آنسوؤں سے ٹھنڈی کی جائے تو طنز آمیز قہقہے آپ کا مذاق اڑائیں گے لیکن عاشو خالہ سب کچھ سنتیں اور دیکھنے کے بعد بھی بے نیازانہ گزر جاتی تھیں۔

اڑوس پڑوس والیاں کب زبان بند رکھتی ہیں۔ عاشو خالہ کا کہیں ذکر چھڑا اور لے اڑیں، اور پھر ایک نہیں اوپر تلے پانچ بیٹے تھے۔ اولاد نرینہ بھلا عاشو خالہ کی قسمت پر رشک کیوں نہ ہوتا جبکہ آس پاس والیاں.. اکلوتے بیٹے کی امید میں ہاتھ پھیلائے دامن پسارے زندگی کے اجاڑے دن گزار رہی تھیں۔

اور اب کے جو پاس پڑوس میں خبر پہنچی تو کلو تانگے والے کی بہو نے اپنے صحن میں سے بشیر پان فروش کی بیٹی کو آواز دی۔

"ارے بی نسو! میں نے کہا کچھ سنتی ہو۔ اب چھٹوں کی تیاری ہے خالہ کے گھر۔"

"عاشو خالہ کے یہاں نا؟ توبہ اللہ۔ بارہ ماہ پورے ہوتے دیر نہیں اور گود بھری تیار۔" نسو اپنی جہاندیدہ ماں کے بالوں میں جوں کا شکار کھیلتی ہوئی بولی۔ بات اڑتی اڑاتی حکیم جی والے کے گھر تک پہنچی۔ حکیمن نے بھی سنا اور انہیں ٹھنڈی سانسوں کا دورہ پڑنے لگا۔

"تمہارے قربان تیری قدرت کے ——— جس کو بخشتا ہے چھپر پھاڑ کے بخشتا ہے۔"

حکیمن کی عاشو خالہ سے ہمیشہ ٹھنی رہی۔ خدا جانے کیوں لگتی تھی سنا ہے کہ حکیمن کی چھ بیٹیاں ایک سے ایک چندے آفتاب چندے ماہتاب رنگ روپ پہ چاندنی نچھاور، قد و قامت پر سرو قربان لیکن رات دن کی ہائے ہائے ——— اولاد نرینہ نہ ہونے کا درد۔

"بیٹیاں تو پتھر کی سلیں ہیں جو ساری زندگی کلیجہ پر رکھی رہتی ہیں۔ وہ میاں حکیم نہ ہوتے تو کہنے کی بات تھی کون سا نسخہ تھا جو نہ آزمایا گیا جو سلتے دن کی کڑوی کسیلی دواؤں سے بھی جی بھر گیا۔

"میں تو کہوں ہوں بی بی۔" حکیمن نے اپنی منڈیر پر سے پڑوسن کو مخاطب کیا۔ "عاشو پر کسی شہید مرد کا سایہ معلوم ہوتا ہے۔ جو لڑکے ہی لڑکے ہوئے ہیں۔ نہ ایک لڑکی ہو جائے پھر دیکھوں ہوں۔ کہاں جاتی ہیں۔ یہ چونچلے یہ خالہ کس طرح ناز نخرے اٹھاتی ہیں۔"

پھر بھی عاشو خالہ جیسا دل بھی تو کوئی رکھے ہر دھوپ جلے کے لئے گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں ہی بھرتیں۔ داد و دہش کا تانتا بندھا تھا مجال کیا جو کوئی دست سوال دراز کرے اور مایوس واپس جائے۔ جگت خالہ جو تھیں ——— رہی کلو تانگے والے کی جلتر بہو جو انگلیاں توڑ توڑ کے کوسنے دیتی۔

"ہائے عاشو خالہ تم مر جاؤ چلچلاتی دھوپ میں تمہارا جنازہ جائے۔"

عاشو خالہ سنتیں اور مسکرا دیتیں۔ "اللہ بڑا کارساز ہے وہی موت و حیات کا مالک ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد ڈیوڑھی پر کھڑی منمنا رہی تھی۔

"عاشو خالہ!"

"کیا ہے ری کلو کی بہو؟" خالہ کے لہجے میں پیار کی حلاوت ہوتی۔

"عاشو خالہ ساڑھی پھٹ گئی ہے۔ عاشو خالہ! وہ ساڑھی کا گھیر سمیٹ کر پھٹے سوراخوں میں سے اپنے کالے کالے گھٹنے خالہ کو یوں دکھا دیتی گویا شرم کی کوئی بات ہی نہیں۔

"ہاں ہاں رے بس سن لیا کتنے کو آتی ہے ساڑھی؟"

"بس یہی کوئی دس پندرہ کو۔ موئی چھوٹی عاشو خالہ۔"

عاشو خالہ کی تھیلی کھلتی اور پندرہ کے نوٹ کلو کی بہو کے ہاتھ میں

چلے جاتے۔

صبح ہی صبح نسرین ماتمی صورت بنائے آکھڑی ہوئی۔ یوں معلوم ہوا گویا آنسو اب ٹپکے اب ٹپکے۔

"کیا بات ہے رے نو؟" خالہ پیار سے مسکرائیں۔

"ابا بیمار ہیں عاشو خالہ۔ ڈاکٹر آیا ہے۔ اماں کے پاس پیسے نہیں" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبنے لگی۔

"تو صاف کیوں نہیں کہتی اس میں رونے کی کون سی بات ہے۔" اور عاشو خالہ کی ہنسی پھر کھلتی۔ "یہ لو پانچ روپے ہیں ڈاکٹر کی فیس دے دیجو اور یہ لے اور۔ بڑی بھلی گھڑی کہہ کر نہیں آتی۔"

اور تو اور حکیمن کی خادمہ آئی۔ "عاشو خالہ بیگم صاحب فرماتی ہیں کہ تین سیر چینی دے دیجئے مہینے پر لوٹا دیں گے۔"

"اے ہے۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ حکیمن بہن سے کہنا یہ بھی آپ کا گھر ہے۔ اپنی پرائی کا خیال نہ کیا کریں۔"

حکیمن نے بات رکھنے کو مہینہ پر چینی واپس کی تو خالہ نے اسی دم پھر دلوا دیا۔ "ایسی بھی کیا غیریت۔ اپنوں میں حساب کتاب نہیں ہوتا بہن۔"

اور حکیمن نے سوچا "مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟"

اس چھوٹے سے محلے کے چھوٹے چھوٹے نیچے نیچے مکانوں کے درمیان عاشو خالہ کی حویلی باغ میں تاڑ کی طرح فخر سے سینہ تانے کھڑی تھی۔ دائیں بائیں بر چھیاں تھیں جس میں تھوک کا سامان رکھا جاتا تھا۔ بر چھی کے نیچے عرصہ سے ایک لولے لنگڑے گونگے غلیظ بھکاری نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ لوگ اسے ملنگ کہتے تھے۔ وہ آنے جانے والوں سے ہاتھ پھیلا کر اشارے سے کچھ نہ کچھ مانگ لیتا۔ اور عاشو خالہ بلاناغہ لڑکوں کے ہاتھ اسے کھانا بھجواتیں۔

"نذیر! یہ روٹی اور دودھ ملنگ کو دے آ۔ غریبوں کی دعا میں بڑا اثر ہے۔ غریب جب روتے ہیں تو عرش کانپ جاتا ہے۔ جانتے ہو؟"

سردیوں کی ایک رات ژالہ باری ہوئی۔ سرد ہواؤں نے شریانوں کے رواں گرم لہو تک کو منجمد کر دینے کی ٹھانی خالہ نے ملنگ کو ایک کمبل بھجوا دیا اور کہلایا کہ آج رات وہ ہماری بیٹھک میں آ کے سو جائے۔

نرم گرم کمبل دیکھ کر ملنگ کی آنکھوں میں حسرت و تشکر کے آنسو ڈبڈبا آئے اور وہ بوڑھی بے نور سی آنکھوں میں آنسو لئے نفی میں ہاتھ ہلا کر کہا یعنی نہیں نہیں اتنا کرم کافی ہے۔ میں اپنے ناپاک جسم سے خالہ کی بیٹھک گندی کرنا نہیں چاہتا۔

صبح بھنگن نے خبر دی "بیگم صاحب آج ملنگ تو گھوڑے بیچ کر سویا ہے۔ پہلے تو منہ اندھیرے اٹھ بیٹھتا تھا۔"

بارہ بجے دن کو کلو کی بہو آئی "عاشو خالہ ملنگ کو تو آج خوب نیند آئی۔ ابھی تک اٹھا نہیں۔"

"اے تو کیا ہو گیا۔ رات نہ جانے بیچارہ کب سویا ہوگا۔ اچھا لے اسے جگا کر کھانا دے آ۔ بھوکا پڑا ہوا ہے غریب۔"

کلو کی بہو کھانا لے کر گئی۔ ملنگ کا کمبل کھینچا اور ایک ڈراؤنی چیخ مار کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ملنگ دانت چبائے جسم اینٹھا پڑا تھا۔ مکھیاں اس کے منہ اور ناک میں داخل ہو ہو کے بھنبھنا رہی تھیں۔

"ملنگ مر گیا،" وہ دوڑی ہوئی خالہ کے پاس آئی۔

"ملنگ ——— مر گیا۔" خالہ رو پڑیں۔

ملنگ کے مرنے کی خبر سارے محلے میں پھیل گئی۔ لوگ دیکھنے آتے اور اپنی اپنی ناک پر رومال دھر کے واپس چلے گئے۔

شام چار بجے خالہ نے کلو کو بلا بھیجا۔ کلو خوشی کی ہر تقریب اور غمی کے ہر اجتماع میں پیش پیش رہتا تھا۔

"کلو" خالہ نے دروازہ کی اوٹ سے مخاطب کیا۔

"جی خالہ جی!"

"ملنگ کے کفن دفن کا کوئی انتظام ہوا؟"

"نہیں جی!"

"کیوں! کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے خالہ جی کہ محلے والے چندہ دینے کو راضی نہیں ہیں۔ بھنگی بلوائے تھے تو انہوں نے بھی بدبو کے مارے لاش اٹھانے سے انکار کر دیا۔"

"یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ کلو کے محلے میں ایک غریب کی لاش بے گور و کفن پڑی رہے۔"

"تو میں کیا کروں خالہ جی پھر؟"

خالہ ایک لمحہ کو خاموش ہو گئیں۔ پھر ان کی ہنسی کھلی۔

"اچھا یہ پچیس روپے۔ اور یہ پانچ تیرے ہیں اور دیکھو دن ڈھلنے تک ملنگ کے کفن دفن کا انتظام ہو جائے"

"بہت اچھا جی ــــــ خالو جی" کلو سعادت مندی سے سر جھکا کر چلا گیا۔

خالو آڑھت کا کام کرتے تھے۔ اور اکثر و بیشتر باہر رہتے تھے۔ ہزاروں کا لین دین روز آنہ ہوتا۔ روپے کی ریل پیل تھی۔ پڑوس سے آوازیں اٹھتیں "کسی بڑی آسامی کے ہاں ڈاکہ مارا معلوم ہوتا ہے"

جب ایک مرتبہ پیاز کی دیگیں سڑ گئیں اور خالو پیسے پیسے کے پیچھے بھاگنے لگے تو گونج پیدا ہوئی "نام بڑے درشن تھوڑے" لیکن خالہ نے کہا: "اللہ کی شان ہے جسے چاہے ذلت دے اور جس کو چاہے سرفراز کرے"

آخر نرسوں اور دائیوں کی قسمت جاگنے کا بھی وقت قریب آپہنچا! ایک شام جبکہ سورج ابھی ڈوبا ہی تھا صحن میں چھڑکاؤ کیا جا چکا تھا؛ چارپائیاں بچھا دی گئی تھیں۔ ہوا ہلکی پھلکی اور ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ بچے سب باہر کھیلنے نکل گئے تھے۔ خالہ اور خالو پلنگ پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے خالہ نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھری شاید زندگی میں پہلی بار اور کہا: "ہائے کتنا جی چاہتا ہے کہ میری بھی ایک پیاری سی بچی ہو"

خالو نے گھبرا کر دیکھا: "کیوں"

"ماں کے دل کا درد بیٹی سے زیادہ کون سمجھتا ہے۔ ہائے میری بیٹی ہوتی تو کل کو میری میت پر بھی کوئی چار آنسو بہانے والا ہوتا"

"ہائیں یہ کیسی مایوسی کی باتیں کر رہی ہو آج تم!"

جواب میں خالہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

اور پھر وہ ساعت بھی آپہنچی جب اہل خانہ کے دلوں میں لڈو پھوٹتے ہیں۔ ہر ایک کے ہونٹ کھل اٹھنے کے لئے مضطرب ہو جاتے ہیں اور پھر دایہ اور نرس کی آپا دھاپی کے درمیان ایک ننھی سی جان کے رونے کی آواز آئی۔

سب کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔

تھوڑی دیر بعد دایہ گھبرائی ہوئی کمرے سے باہر آئی "شکیلہ صاحب مبارک ہو لڑکی" ــــــ اور وہ فوراً اندر واپس چلی گئی۔

پھر لوٹی۔

"بیگم کی حالت خراب ہے شکیلہ صاحب"

نرس بھی ایک دم دہشت زدہ سی باہر آئی "شکیلہ صاحب ڈاکٹر کو بلاؤ۔ بیگم خطرے میں ہے"

اور جب ڈاکٹر صاحب گھبرا یا ہوا آیا تو نرس نے اداسی سے شکیلہ صاحب کو دیکھ کر سر جھکا لیا "بیگم ــــــ ایکسپائرڈ ــــــ شکیلہ صاحب"

اور جیسے مسرت کے سارے چراغ جل بجھے۔

"بیگم ــــــ بیگم مر گئیں" خالو کا منہ حیرت اور غم سے کھلا اور آنکھیں خلا میں اٹکی رہ گئیں۔ ساری کائنات جیسے تاریکیوں میں ڈوب گئی۔ خالو کا ذہن بے پایاں ظلمتوں میں ڈوبنے لگا۔ وہ صحن میں چلے آئے اور ان کی داد طلب ماتمی نگاہیں آسمان کی جانب اٹھ گئیں "یا رب العزت!" اور ان کی آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے "یا خالق ارض و سما" لیکن ان آنسوؤں نے پتلیوں کو دھویا اور حلق میں اتر گئے۔ وہ جانتے تھے ان کے آنسو پلکوں سے ڈھلک آئے تو وہ پانچ بند ٹوٹ جائیں گے جو ان کے بیٹوں کی آنکھوں میں سے بہہ نکلنے کے لئے بیتاب ہیں۔

دوسرے روز صبح میت اٹھی۔ جنازہ محلے سے گذر رہا تھا ــــــ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ جنازے کے ساتھ تھے۔ پانچ مظلوم فریادی پیکر آنکھوں میں آنسو بھرے۔ دروازے پر کھڑے ماں کا جنازہ گذرتے دیکھ رہے تھے۔ اندر دور کی ننھی سی جان بلک رہی تھی۔

مسجد کے صحن میں کھڑے نورانی چہرے والے بوڑھے نے کہا: "کسی خوش نصیب کی سواری ہے"

نسو اور کلو کی بہو ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں اور پھر ساڑھی کے پلو سے مگرمچھ کے آنسو خشک کرنے لگیں۔

جنازہ حکیمن کے دروازے کے سامنے سے گزرا تو انہوں نے جھٹ دوپٹہ سر پر سنبھال لیا اور ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ــــــ "ہائے میں نہ کہتی تھی ایک چھوکری کے غم سے ہی جہاں چھوڑ کے چل بسیں یہاں پانچ کا غم کلیجے پر لئے پھر رہی ہوں"

چھ مہینہ بعد خالو جی کو لتے خالہ کی قبر پر پہنچے۔ سفید قبر مٹی سے ذرا سی تڑخ گئی تھی اور دو ننھے ننھے زرد پھول سر نکالے لہلہا رہے

تھے۔ خالو قبر کے سرہانے بیٹھکر رونے لگے۔

"سلتی ہو! یہ تمہارے معصوم بچی تمہارے مرقد پر چار آنسو بہانے آئی ہے۔ تم بہی تو کہتی تھی نا۔ تمہارے سرہانے بیٹی کی آنکھوں سے چار قطرے ـــــ"

خالو کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ انہوں نے بچی کو قبر کے سرہانے بٹھا دیا۔ بچی نے پھول کی طرف ہاتھ لپکائے۔

"نہیں نہیں" جیسے عاشو خالہ گڑگڑائیں۔

"نہیں نہیں میری بچی یہ میری آنکھیں ہیں۔ مجھے ان آنکھوں سے بے مہر انسانوں کی اس دنیا کو دیکھتے رہنے دو جن کے دلوں کو خلوص اور محبت کے آنسوؤں سے بھی نہیں بھیگایا جاسکتا!"

(بشکریہ "ہمایوں")

شمیم جاوید •

فرار؟

دو گام چل کر رہ گئی
یہ زندگی ہر موڑ پر کروٹ بدل کر رہ گئی

•

کتنے دیئے جلتے رہے
تاریکیوں کے سائے میں راہی مگر چلتے رہے

•

کب دشت پیمابے جنوں
نومیدئ جاوید ہے امید کی پلکوں پہ خوں

•

حدِ نظر سے اُس طرف
کس کی ہے مجھکو جستجو دیوار و در سے اُس طرف

•

ماضی کے افسانے کہاں؟!
ہر لمحہ ڈستا ہے مجھے جاؤں گا اب جانے کہاں ؟!

احمد نسیم •

قفس کی قید کو بھی میں چمن کہدوں تو کیسا ہو!
دیارِ غیر کو اپنا وطن کہدوں تو کیسا ہو
سحر پھوٹی ، اُجالا ہو چلا اندھوں کی بستی میں
میں اس کو بھی صداقت کا کفن کہدوں تو کیسا ہو
ہماری زندگی کیا ہے حسیں دھوکہ کی پگڈنڈی
میں اس کو مہوشوں کا بانکپن کہدوں تو کیسا ہو
سکندر سے کوئی پوچھے حقیقت رہنمائی کی!
میں تم کو رہنماؤ! راہزن کہدوں تو کیسا ہو
ستاروں کے چمکنے سے عروسِ شب نکھرتی ہے
خوشی کو ، رنج و غم کا پیرہن کہدوں تو کیسا ہو
قد و عارض کی باتوں سے تو دنیا تاڑ لیتی ہے
مگر چوری چھپے سرو و سمن کہدوں تو کیسا ہو

اشم میرزا

مدّوجزر

گلی میں چھابڑی والا آواز لگا رہا تھا "شکر قند۔ ایک آنے پاؤ" حامد سہمے ہوتے انداز میں سلمٰے کے گھٹنے سے لگ کر کھڑا ہوگیا اور اس نے دھیمی آواز میں کہا "امی۔ ایک آنہ دو۔ شکر قند لینی ہے" سلمٰے اپنے شوہر خالد کا سوئیٹر بن رہی تھی۔ اس نے یوں گھور کر حامد کی طرف دیکھا کہ وہ خوف سے کانپ اٹھا "شکر قند کھا کر پھر بیمار پڑنے کا ارادہ ہے۔ ابھی دو دن ہوتے بستر پر سے اٹھے ہوتے اب پھر مجھے بدنام کرنا چاہتا ہے ــــ" حامد ہولے ہولے قدم اٹھاتا دروازے کی طرف آگیا۔ اور پھر حسرت کی نظروں سے شکر قند سے بھری ہوئی چھابڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا ایک ہمجولی مکان کی نچلی منزل پر بیٹھا بڑے مزے سے شکر قند کھا رہا تھا دو چار بچے چھابڑی والے کے پاس کھڑے تھے۔ حامد کا ننھا سا ذہن سوچنے لگا "سبھی لڑکے شکر قند کھاتے ہیں۔ انہیں تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پھر میں کیسے بیمار پڑ سکتا ہوں۔ کوئی بات ہو۔ امی میری بیماری کا ذکر چھیڑ دیتی ہیں۔ آخر امی مجھے کیوں شکر قند لیکر نہیں دیتیں" اس کا جی چاہا کہ اپنے ہمجولی سے شکر قند مانگ لے۔ لیکن اسے سلمٰے کے غصے کا خیال آگیا۔ ابھی سوچ کے دائرے پھیل ہی رہے تھے۔ کہ سلمٰے نے سلائیاں ایک طرف رکھ کر اسے آواز دی "حامد۔ بیٹا۔ کہاں چلے گئے ہو۔ کتابیں صحن میں بکھری پڑی ہیں ابھی تک سبق یاد نہیں کیا" حامد نے دروازہ بند کر دیا اور چپکے سے صحن میں آگیا۔ اب کتاب پکڑ کر وہ بے دلی سے ورق الٹ رہا تھا سبق یاد کرنے کو اس کا جی نہ چاہ رہا تھا۔ اس کی دادی کلثوم کسی عزیز سے ملنے کی خاطر باہر گئی ہوئی تھی۔ اگر وہ موجود ہوتی۔ تو شاید اسے یوں کڑھنے کی نوبت نہ آتی اور بہو کے طعنے برداشت کرتے ہوتے وہ اسے شکر قند لے دیتی اور وہ مزے سے کھا رہا ہوتا۔ دادی کے خیال سے اس کی کچھ ڈھارس بندھی۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ دادی کو شکر قند خرید دینے کے لئے آج مجبور کر دے گا ــــ کلثوم واپس آگئی۔ حامد ابھی تک کتاب کے اوراق الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ اس نے سبق یاد نہ کیا تھا اور سلمٰے اون کے گولے اور سلائیاں ٹوکری میں رکھکر باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔ کلثوم کو دیکھ کر حامد ایک جوش کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی کلثوم اس کی طرف بڑھتے ہوتے بولی "کیا ہوا ہے میرے لال کو۔ سلمٰے نے پھر پیٹا ہوگا۔ کتنی بے درد ہے پھول سے بچے پر ہاتھ اٹھاتے ذرا بھی ترس نہیں آتا" حامد کی آنکھوں میں چمکیلا پانی تیرنے لگا۔ کلثوم نے اسے گود میں اٹھاتے ہوتے کہا "اب چپ ہوجا میرے لال۔ میرے ہوتے ہوتے تیری طرف کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ آج آلینے دو خالد کو۔ اسے سب کچھ بتا دوں گی" اس نے جیب سے رومال نکالا اور اس میں بندھے ہوتے شکر قند کے دو ٹکڑے نکال لئے۔ اور حامد کے مغموم چہرے پر ایک دم مسرت کا رنگ نکھر گیا۔ اس نے جلدی سے دونوں ٹکڑے پکڑ لئے۔ اور دادی کے پاس بیٹھکر بڑے مزے سے چھلکے سمیت شکر قند کھانے لگا۔ سلمٰے باورچی خانے میں بیٹھی ساس کی باتیں سُن رہی تھی اور غصے سے اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا تھا۔ وہ منتظر تھی کہ کب کلثوم آکر حامد کے متعلق دریافت کرے اور کب وہ اپنے غصے کے بھوت کا مظاہرہ کرے۔ اس کی روح کو زہریلے الفاظ کے اتنے کچوکے لگاتے کہ وہ تلملا کر سٹپٹا کر اس گھر سے قطع تعلق کر لے۔ آج صبح بھی دونوں میں جھڑپ ہو چکی تھی۔ چلتے پی کر حامد کلثوم کے پاس کھڑا ہوگیا تھا اور اس نے پراٹھے کا ٹکڑا حامد کو پکڑا دیا تھا۔ سلمٰے اسے برداشت نہ کر سکی اور چلا کر کہا "اماں، تم تو ہاتھ دھو کر بچے کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ جب یہ بد پرہیزی کی وجہ سے بیمار پڑ گیا تو پھر آپ کو چین آتے گا۔ آپ کی وجہ سے یہ کیسی بری عادتوں کا شکار ہو رہا ہے۔ پہلے کیسے کھاپی کر کھیلنے لگتا تھا۔ اور اب تو ہزار نعمتیں کھانے پر بھی اس کی نظر نہیں بھرتی" کلثوم نے اسے تیز چبھتی ہوئی نظروں سے گھورا تھا۔ اور ایک ٹکڑا حامد کو پکڑا دیا تھا۔ سلمٰے نے جل بھن کر حامد کو

حکم دیا تھا" حامد کے بچے۔ پھینک اسے نکڑا۔ ادھر آ تجھے اس بدتمیزی کا مزا چکھا دیتی ہوں" حامد کلثوم کی گود میں چھپنے کی کوشش کرنے لگا خالد ماں اور بہو کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سلمےٰ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی۔ اس کے حکم کی خلاف ورزی ہو رہی تھی۔ اس کے اصولوں کا مذاق اُڑایا جا رہا تھا۔ غصے سے بپھری ہوئی کلثوم کے پاس پہنچی، اور حامد کا ہاتھ پکڑ کر زور سے اپنی طرف کھینچ لیا۔ کلثوم بھی خاموش نہ رہ سکی تھی۔ اس کی تڑپتی ہوئی آواز کمرے میں گونجنے لگی تھی "ارے ہے اپنی ممتا کا کچھ خیال کر۔ تو تو ڈائن بنتی جا رہی ہے۔ نہ جانے کس منحوس گھڑی تو نے قدم گھر میں رکھا تھا۔ دن بدن برکت اٹھتی جا رہی ہے" خالد نے اٹھکر حامد کو گود میں اٹھا لیا تھا۔ اور کلثوم سے مخاطب ہوا تھا "امّی جان اب جانے دیجئے۔ آخر وہ بھی ماں ہے۔ اب آپ کا زمانہ گزر چکا ہے۔ نئے ماحول میں بچے کی پرورش کی طرف خاص دھیان رکھنا پڑتا ہے" سلمےٰ منہ سوجھائے دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اور کلثوم دیر تک وہیں بیٹھی بڑبڑا رہی تھی۔ سلمےٰ کا غصے ابھی تک فرو نہ ہوا تھا۔ وہ اب چاہ رہی تھی کہ کلثوم اسے خالد کی عدم موجودگی میں چھیڑے اور وہ اپنے دل کا غبار اچھی طرح سے نکال سکے۔

———

کلثوم حامد کو شکر قند کھاتے دیکھکر خاموش ہو گئی تھی۔ سلمےٰ نے کچھ دیر تو وہیں پر اس کا انتظار کیا اور پھر اٹھکر باہر آ گئی۔ حامد شکر قند کھاکر ویسے ہی اب منہ ہلا رہا تھا۔ سلمےٰ نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور آگے قدم اٹھاتے ہوئے پوچھا" حامد کیا کھا رہا ہے" حامد ایک دم چونک پڑا۔ اور اس کے ہونٹوں کی حرکت یکدم بند ہو گئی۔ کلثوم بیزاری سے بولی: "بچے کو میرے پاس دیکھکر تمہارے سینے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ جیسے اس کی ایک خیر خواہ تم ہی رہ گئی ہو۔ اور سب اس کے دشمن ہیں" سلمےٰ نے جل کر کہا "اماں۔ میرا بولنا تو تمہیں زہر لگتا ہے۔ تم تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی ہو" وہ اب "آپ" سے "تم" پر اتر آئی تھی۔ کلثوم آنکھیں نکال کر بولی "اے ہے۔ بیٹی خدا سے ڈر۔ آخر تمہیں بھی ایک دن مرنا ہے۔ کیوں مجھ پر جھوٹی تہمت لگا رہی ہے میں تو ہر وقت تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگتی رہتی ہوں" "اونہہ" سلمےٰ نفرت سے بولی "بغل میں چھری۔ منہ میں رام رام" کلثوم اس چوٹ سے تلملا اٹھی "کمینے کو سب کمینے ہی نظر آتے ہیں" اور سلمےٰ کو اس طعنے نے چکرا دیا۔ بات بڑھتی گئی۔ گھر میں ہنگامہ پیدا ہو گیا تھا۔ دونوں بڑھ چڑھ کر وار کر رہی تھیں۔ ہار ماننے کو کوئی بھی تیار نہ تھی۔ اور ہمسائیاں صحن میں جمع ہو رہی تھیں۔ یہ لڑائی ان کے لئے ایک عجوبہ تھی۔ ویسے تو محلے میں ایک وبا۔ وہ آپس میں ضرور لڑ پڑتی تھیں اور یہ ہر روز کا ایک دستور بن چکا تھا۔ لیکن اس گھر سے آج تک کسی نے اونچی آواز نہ سنی تھی۔ ساس بہو کا اتفاق ضرب المثل بنا ہوا تھا اور اب وہ یوں ایک دوسری کو ڈٹ رہی تھیں جیسے لڑائی جھگڑا ان کا آبائی پیشہ ہو۔ ان کی لڑائی کا اصل سبب عدم تھا۔ انہیں کبھی وہم بھی نہ ہوا تھا کہ جس گھر میں ہر وقت مسکراہٹیں رقصاں تھیں وہاں کبھی نفرت اور غصے کے بھوت قابض ہو جائیں گے۔ کلثوم نے خود ہی خالد کے لئے رشتہ ڈھونڈا تھا اور اپنی پسند پر اسے فخر تھا۔ وہ سلمےٰ کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتی تھی۔ لیکن حامد جب ذرا سیانا ہوا۔ تو اچانک رنجش کی ایک لہر اُبھر آئی تھی۔ اور دن بدن یہ لہر پھیلتی چلی گئی تھی۔ سلمےٰ حامد کی پرورش اپنے اصولوں کے مطابق کرنا چاہتی اور کلثوم اپنی بات منوانے پر مصر تھی۔ اور حامد کو پرہیزوں کے جال میں جکڑنے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اور ماضی اور حال کے ٹکراؤ نے رنجش کی پھیلتی ہوئی لہر کو آج ایک بپھرے ہوئے دھارے میں بدل دیا تھا۔ ہمسائیاں انہیں چپ کرانے کی کوشش کرنے لگیں۔ مگر انھوں نے جیسے کوئی نشہ آور چیز کھالی ہو۔ لڑائی کا نشہ ترنے کا نام نہ لیتا تھا۔ ہمسائیوں نے دونوں کو زبردستی الگ الگ کمروں میں دھکیل دیا۔ کچھ دیر تک تو دونوں.. چلاتی رہیں اور پھر ان کے سوکھے ہوئے حلق میں آواز لڑکھڑانے لگی۔ کلثوم کا سر چکرا رہا تھا۔ اس نے دوپٹے سے سر کس کر باندھ لیا سلمےٰ کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ وہ گلے کی رگوں کو ملنے لگی تھی۔ خالد نے جب دروازے کے اندر قدم رکھا۔ تو صحن میں ایک ویرانی سی پھیلی تھی۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے خدشہ پیدا ہو گیا۔ کہ ایسی چپ کسی حادثے کی علامت ہو سکتی ہے۔ خالد نے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ کلثوم چارپائی پر سر نہوڑائے بیٹھی "ہائے۔ ہائے" کی آواز سے اپنی تھکاوٹ دور کر رہی تھی۔ خالد نے بے چین ہو کر پوچھا: "امّی جان کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" کلثوم نے قہر آلود

نظروں سے اسے گھورا اور چھاتی پر ہاتھ مار کر بولی "تمہاری بیوی نے آج مجھے کہیں کا نہیں رکھا ہے۔ گھر کی عزت خاک میں ملا دی ہے۔ میرے بالوں میں خاک ڈال دی ہے۔ ہائے بیٹا۔ کاش! میں یہ دن دیکھنے سے پہلے مر گئی ہوتی ــــــ" سلمٰے خالد کی آواز سن کر اس کمرے میں آگئی کلثوم اسے دیکھ کر گرجی "نکل جا چڑیل اس کمرے سے۔ کیا ابھی تک دل ٹھنڈا نہیں ہوا ہے" سلمٰے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولی:

"اب بیٹے کے سامنے آنسو بہا کر بے گناہ بن رہی ہو" کلثوم نے چلا کر کہا "سارا محلہ اس بات کا گواہ ہے کہ میری سات پشتوں کو تم نے ننگی گالیاں دی ہیں۔ اور اب مکر کا جال پھیلانے کے لئے آئی ہو" خالد جھنجھلا کر بول پڑا "آخر آج تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے"۔ کلثوم بولی "مجھے کیا ہوتا تھا تمہاری اس چہیتی کا دماغ چل گیا ہے" سلمٰے خاموش نہ رہ سکی "اگر کوئی مقابلے کی بہو ملتی تو پھر پتہ چلتا" دونوں پھر پینترا بدل کر میدان میں آگئیں۔ خالد کچھ دیر تک تو پاگلوں کی مانند دونوں کی طرف دیکھتا رہا اور پھر گرجا "میں کہتا ہوں۔ چپ ہو جاؤ۔ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے" اس نے سلمٰے کو چپ کرانے کی خاطر دھمکیاں دیں ماں کے سامنے ہاتھ جوڑے مگر اس کی کوئی پیش نہ چلی۔ وہ جھنجھلا کر کھڑا ہو گیا۔ اور سلمٰے کو گھسیٹتا دوسرے کمرے میں لے آیا۔ کلثوم غصے سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ باہر نکلتے ہوئے بولی "اب میں اس گھر میں ایک پل بھی نہیں ٹھہر سکتی۔ یہ سمجھتے ہیں کہ میں انہیں کے سہارے جی رہی ہوں۔ میں ان کا یہ غرور توڑ کر ہی رہوں گی"

وہ اپنی بیٹی خالدہ کے گھر آگئی شام کے وقت یوں خستہ حالت میں کلثوم کو دیکھ کر خالدہ کا دل بیٹھنے لگا۔ کلثوم کے آنسو دیکھ کر خالدہ کا خاوند اشرف بھی آگیا۔ کلثوم نے سسکیاں بھرتے ہوئے سب قصہ سنا دیا۔ خالدہ کو یقین نہ آرہا تھا سلمٰے جیسی باشعور بھابی کیسے اس کی ماں کی بے عزتی کرنے کی جرأت کر سکتی ہے اشرف کے ذہن میں الجھاؤ بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ اسے تسلی دینے لگا "امی آپ غم نہ کریں۔ یہ بھی آپ کا اپنا ہی گھر ہے۔ شاید قدرت کو مجھے آپ کی خدمت کرنے کا موقع بہم پہنچانا تھا۔ جو یہ حادثہ رونما ہوا ہے" خالدہ تنگ دل عورت نہ تھی اسے والدین کی وہ تمام نصیحتیں یاد تھیں جو انھوں نے اسے ڈولی میں سوار ہونے سے پہلے کی تھیں وہ دلاسہ دینے لگی "امی جان۔ میں صبح خود وہاں جا کر سلمٰے سے باز پرس کروں گی۔ آپ اب رونا بند کر دیں ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو کوئی دکھ نہیں پہنچا سکتا" ــــــ خالدہ کے دونوں بچے کلثوم کے پاس آگئے۔ اس نے دونوں کو گود میں بٹھا لیا اور ایک شدید اثر کے تحت انہیں بازوؤں میں بھینچ لیا۔ دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی "تم ہی ذرا انصاف کرو۔ کیا میں ان معصوم بچوں کی دشمن بن سکتی ہوں۔ سلمٰے کو تو میرا خالد کو بلانا بھی اب برا لگتا ہے"

صبح کو جب خالدہ کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ کلثوم مصلے پر بیٹھی گڑگڑا کر حامد کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ خالدہ کا دل بھر آیا "جس انسان کو ایسی رحمدل اور پرشفقت ماں اور ساس نصیب ہو۔ وہ اگر کوئی گستاخی کرے تو انتہائی افسوسناک اور رنج دہ بات ہے" صبح کے ناشتے سے فارغ ہو کر خالدہ اپنے بھائی کے مکان پر آگئی۔ دروازہ مقفل تھا۔ خالدہ کا ماتھا ٹھنکا "الٰہی خیر۔ یہ سب اس وقت کہاں چلے گئے ہیں" وہ ہمسائی کے گھر میں داخل ہوئی۔ ہمسائی اسے اپنے پاس بٹھا کر رنجیدہ ہو کر بولی "کلثوم نے گھر میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔ خالد ماں کو گھر میں موجود نہ پا کر پاگلوں کی طرح گرجنے لگا تھا سلمٰے کو مارا بھی تھا کچھ دیر بعد وہ سلمٰے کو لیکر باہر نکل آیا۔ اور دروازے کو قفل لگا دیا۔ وہ ضرور سلمٰے کو اس کے میکے چھوڑ آیا ہوگا" خالدہ کا دل بیٹھنے لگا۔ واپس آکر اس نے کلثوم کو سب کچھ بتا دیا۔ اور کلثوم کا سر چکرانے لگا "ہائے بچہ ــــــ یہ تجھے کیا ہو گیا۔ تم کون ہوتے ہو سلمٰے کو گھر سے باہر نکالنے والے" اور لمحہ بھر اس کے شعور میں تھرتھراتے ہوئے لڑائی کے واقعات ایک دم ذہنی سلوٹوں میں چھپ گئے۔ ہر لمحہ جذبات نے ایک نیا موڑ پیدا کر لیا تھا۔ اور اس کے آنسوؤں کے ابال میں ممتا غوطے کھا رہی تھی۔ خالدہ روہانسی ہو کر بولی "ہمارے خاندان میں کیا پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے۔ خالد کا فرض تھا کہ سلمٰے کو ساتھ لیکر آپ سے معافی مانگنے آتا۔ تحمل سے کام لیکر شکوک مٹانے کی کوشش کرتا۔ سلمٰے کے ماں باپ بے چارے یہ صدمہ کیسے برداشت کر سکیں گے۔ اگر کوئی مجھے اس گھر سے نکال دے تو آپ کو کتنا دکھ ہوگا" کلثوم کے ہونٹ ہلتے تھے لیکن الفاظ حلق سے نہ نکلتے تھے۔ اگر سلمٰے گھر پہ ہی ہوتی تو کلثوم کے جذبات کبھی اتنی جلدی نیا موڑ پیدا نہ کرتے اور ابھی تک غصے کے ناگ پھن اٹھائے

جلوم لہجے ہوتے۔ دوپہر کے بعد وہ حرارت سی محسوس کرنے لگی۔ شام کو
اس کا بخار تیز ہو گیا۔ اشرف دفتر سے واپس آ کر ڈاکٹر کو بلا لایا۔ کلثوم چھت
پر بیٹھی تھی۔ اسے وہم سا ہو گیا تھا کہ وہ اب کبھی چارپائی پر سے نہ اٹھ سکے
گی۔ ڈاکٹر کے ساتھ اشرف باہر نکل گیا۔ دوا لیکر وہ خالد کے پاس پہنچا۔
وہ حامد کو گود میں لئے غمگین بیٹھا تھا۔ اشرف کو دیکھ کر اس نے مسکرانے
کی کوشش کی۔ اور مجروح ہنسی اس کے ہونٹوں پر تڑپ کر رہ گئی۔ اشرف
افسوس بھرے لہجے میں بولا "بھائی جان۔ انہونی بات ہو گئی ہے۔ اس
گھر کی لڑائی کے متعلق سوچتے ہوئے میرا ذہن تو نڈھال ہو جاتا ہے"
خالد سر جھکائے بیٹھا تھا اور حامد سہمی ہوئی نظروں سے اشرف کی طرف دیکھ
رہا تھا۔ اشرف ذرا رک کر بولا "اسی لڑائی نے آپ کی امی کو بیمار کر دیا ہے
بخار کی وجہ سے انہیں ذرا ہوش نہیں۔ ڈاکٹر کو بلایا تھا اب اس سے دوا
لیکر آیا ہوں" خالد کے دل میں ٹیس کی ایک لہر دوڑ گئی "امی کو کیا ہو گیا
ہے" اس سے پہلے کہ وہ کھڑا ہو۔ ایک نئے خیال نے اس کے بے چین
جذبات کا رخ موڑ دیا "امی بزرگ تھیں۔ وہی اگر تحمل سے کام لیتیں
تو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا" وہ بے چین ہو کر بالوں میں انگلیاں
پھیرنے لگا۔ اسے جلتی ہوئی سوچ میں الجھا دیکھ کر اشرف بولا "امی کی
ہر سانس میں آپ کی سلامتی کی دعا بسی ہوئی ہے۔ جب انہوں نے سنا
ہے کہ آپ باجی سلمیٰ کو اس کے میکے چھوڑنے گئے ہیں۔ ان کی حالت ابتر
ہو گئی ہے" خالد کے ذہنی تار لرز اٹھے "امی کو تو اس خبر سے خوش ہونا
چاہیئے تھا۔ انہوں نے لڑائی کو اسی لئے بڑھایا تھا کہ میں سلمیٰ سے قطع تعلق
کر لوں" وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولا "امی کی حالت سلمیٰ کے جانے
کے بعد کیسے ابتر ہو سکتی ہے انہیں کی خواہش کے مطابق تو میں نے
اسے گھر سے نکالا ہے" اشرف اسے سمجھانے لگا "مجھ پر یقین کریں ان کی
بیٹی بھی دوسرے گھر میں گئی ہے۔ بھلا ان سے کیسے امید ہو سکتی ہے
کہ وہ دوسرے کے گھر کو اجاڑ کر خوش ہو سکتی ہیں" ماں کی محبت خالد
کی زندگی کی وسعتوں پر قابض ہو گئی۔ اشرف بولا "میرے بھائی چلئے۔
آپ کو دیکھ کر امی کا بخار ضرور اتر جائے گا" خالد ایک شدید جذبے کے
تحت کھڑا ہو گیا اشرف اسے ساتھ لے آیا۔ کلثوم بخار کی حالت میں...
بڑبڑا رہی تھی۔ حامد باپ کی گود سے اتر کر کلثوم کے سرہانے کھڑا ہو گیا اور
اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ کر بولا "دادی جان مجھے چھوڑ کر آپ کیوں
چلی آئی تھیں۔ ابو [illegible] کا نام [illegible]" کلثوم نے جلتی ہوئی
آنکھیں کھولیں اس کی پہلی نظر خالد پر پڑی اور آنکھوں میں آنسو امڈ
آئے۔ حامد کا ہاتھ پکڑ کر اس نے پیار کے ساتھ زور سے لگایا وہ اٹھنے
کی کوشش کرنے لگی۔ اشرف آگے بڑھ کر بولا "امی جان لیٹی رہیے
آپ کو تکلیف ہوگی" کلثوم کراہتے ہوئے بولی "خالد بیٹا۔ تم سے ایسی
امید نہ تھی۔ زخموں پر پھاہا رکھنے کی بجائے تم نے انہیں اور چھید دیا ہے
کتنے ارمانوں کے ساتھ میں سلمیٰ کو گھر بیاہ لائی تھی اس کے غریب ماں
باپ میرے متعلق کیا خیال کرتے ہوں گے رنجش مٹانے کا یہ طریقہ تو نہ تھا
کہ تم اسے گھر سے نکال دیتے [illegible] کس گھر میں جھگڑے نہیں ہوتے اگر سب تمہاری
طرح جلدبازی سے کام لیتے تو کسی کو [illegible] نظر آتے"
خالد نظریں جھکائے بولا "میں کیسے یقین کروں کہ آپ سلمیٰ کو [illegible] گھر میں
[illegible]" کلثوم نے [illegible] کہا "تم نے مجھے ظالم سمجھا ہے جس
طرح تم بیٹے ہو اسی طرح [illegible] کی بیٹی ہے دوسرے لوگ خواہ
[illegible] نفرت [illegible] لیکن میں [illegible] سے نہیں [illegible]
اسے لینے جاؤں گی" [illegible] ایک نئے روپ میں خالد کے سامنے جلوہ گر ہوئی
تھی۔ اپنے سسرال سے لوٹتے وقت سلمیٰ کے چہرے کا منظر یاد
آگیا۔ کتنی عاجزی سے اس نے معافی مانگی تھی گڑگڑا کر منتیں کی تھیں۔
اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنا سر کلثوم کے قدموں پر رکھ دیا۔

(بشکریہ شہباز)

معین احسن جذبی •

کچھ اور بھی ہیں

شریکِ محفلِ دار و رسن کچھ اور بھی ہیں
ستمگرو! ابھی اہلِ کفن کچھ اور بھی ہیں

رواں دواں یونہی اے ننھی بوندیوں کے ابر
کہ اس دیار میں اجڑے چمن کچھ اور بھی ہیں

خدا کرے نہ تھکیں حشر تک جنوں کے پاؤں
ابھی مناظرِ دشت و دمن کچھ اور بھی ہیں

ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

ابھی تو ہیں دلِ شاعر میں سینکڑوں ناسُور
ابھی تو معجزہ ہائے سخن کچھ اور بھی ہیں

دلِ گداز نے آنکھوں کو دیدیئے آنسو!
یہ جلتے ہوئے غم کے چلن کچھ اور بھی ہیں

(بشکریہ آجکل)

انوار ظہوری •

○

فضائیں گم زمیں گم آسماں گم
نگاہوں میں ہیں کتنے لامکاں گم
ہوئی جب سے تمنائے جواں گم
نفس اندر نفس ہے سوزِ جاں گم
ہوئی ہیں منزلیں ویران کتنی
ہوئے راہوں میں کتنے کارواں گم
وہ آئے بھی تو دل کی انجمن میں
رہے اکثر نصیبِ دشمناں گم
بہاریں نو شگفتہ خواہشوں کی
ہوئیں در پردۂ موجِ خزاں گم
وہاں کیا آتشِ دل کا اثر ہو!
ہوا جس بزم میں دردِ فغاں گم
جب ان کے سامنے پہنچے تو اے دل!
ہوا کیوں مطلبِ عرضِ بیاں گم
سنائیں داستانِ درد کس کو!
ہوئے سب مہرباں نامہرباں گم
رکھیں انوار ہم کس سے توقع
خلوصِ آدمیت ہو جہاں گم!

○

مصباح دلیسنوی

گرفتاریاں

"یو ہیو بین اریسٹڈ" (آپ گرفتار کر لئے گئے ہیں)

یہ الفاظ سن کر نئے کلکٹر صاحب ٹھٹک کر رہ گئے جسم پر تقریباً لرزہ طاری ہو گیا۔ جو چہرہ ایک سیکنڈ پہلے بشاش نظر آتا تھا۔ آناً فاناً اتر گیا۔ ایک ثانیہ کے لئے دماغ ماؤف ہو گیا جن ہاتھوں سے ایک منٹ پہلے ماتحت افسروں کی سلامی کا جواب دیا گیا تھا وہ بے حس و حرکت ہو گئے۔ نئے کلکٹر صاحب نے مخاطب کرنے والے کو سر سے پیر تک دیکھا۔ ایک سیاہ فام انسان۔ پست قد۔ کچی پکی داڑھی۔ آنکھوں پر مضحکہ خیز عینک۔ سر پر دو پلی ٹوپی۔ لمبا کرتہ زرد رنگ کا تہبند گرد آلود پمپ شو۔ بغل میں موٹے موٹے رجسٹر۔ چہرہ پر برسوں پرانی سنجیدگی۔ اس ہئیت کا انسان پورے اطمینان کے ساتھ سامنے کھڑا تھا۔ کلکٹر صاحب نے بالکل مایوس ہو کر سپرنٹنڈنٹ پولیس کو دیکھا اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی پیچھے جو افسر کھڑے تھے وہ زیر لب مسکرا رہے تھے۔ کلکٹر صاحب کی وحشت پر تذبذب کا عالم طاری تھا۔ اتنے میں سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ایک قدم آگے بڑھا کر کہا:

"سر! ان سے ملئے۔ یہ یہاں کے تیسرے بادشاہ ہیں"۔

کلکٹر صاحب نے قدرے اطمینان کی سانس لی لیکن قوت گویائی جیسے اب بھی مسلوب تھی۔ تیسرے بادشاہ نے پھر مخاطب کیا:

"سر! یو ہیو بین اریسٹڈ۔ آپ رہا ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ نذر رہائی ادا کر دیں"۔

کلکٹر صاحب نے اطمینان اور استعجاب کے درمیان دوسری سانس لی۔ شاہ سوئم نے بغل سے رجسٹر نکالا اور ایک ورق الٹتے ہوئے گویا ہوا۔

"صرف آپ ہی گرفتار نہیں ہوئے ہیں۔ میں نے آپ کے پیشرو کو گرفتار کیا۔ میں نے انگریز کمشنر کو گرفتار کیا۔ میں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو گرفتار کیا۔ میں نے لیاقت علی خاں کو گرفتار کیا ...."

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے شاہ سوئم رجسٹر کے اوراق الٹتا رہا۔ اب کلکٹر صاحب کے حواس بجا ہو رہے تھے۔ انھوں نے رجسٹر میں گاندھی، نہرو، لیاقت علی خاں اور دوسرے مشاہیر کے دستخط دیکھے۔ ایک انگریز کمشنر کے یہ الفاظ تھے۔

"میں نے عزیز میاں کو ہر طرح آزما کر دیکھا۔ یہ ایک مخلص اور دیانتدار انسان ہیں۔ یہ بجا طور پر یہاں کے بے تاج بادشاہ ہیں"۔

دس منٹ بعد کلکٹر صاحب پچاس روپے دے رہے تھے اور عزیز میاں رجسٹر میں اس کا اندراج کر رہے تھے۔ اور پھر پوری جماعت پلیٹ فارم پر چل رہی تھی۔ اسٹیشن کے باہر بڑے قاعدہ سے پولیس کھڑی تھی۔ کلکٹر صاحب کار میں بیٹھے۔ سیٹیاں بجیں اور موٹریں متحرک ہو گئیں۔ عزیز میاں بغل میں رجسٹر دبائے خراماں خراماں اسٹیشن کے باہر نکلے اور بازار میں گم ہو گئے۔

عزیز میاں اس چھوٹے سے شہر کے بادشاہ تھے۔ وہ خود کو تیسرا بادشاہ اس لئے کہتے تھے کہ پہلا بادشاہ تو برطانیہ کا بادشاہ ہے۔ دوسرا ضلع کا کلکٹر اور تیسرے عزیز میاں۔ پہلے اور دوسرے بادشاہ تو بدلتے رہتے تھے لیکن عزیز میاں پچھلے پچیس سال سے اپنے تخت پر قائم تھے۔ ضلع کا ہر کلکٹر ان کے ہاتھوں گرفتار ہو کر شہر میں داخل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ شہر کا کوئی معزز انسان اور افسران سے بچ کر نہیں نکلتا تھا۔ وہ ہز مجسٹی تھے۔ ان کی اہلیہ ہر مجسٹی تھیں۔ ان کی کابینہ میں ہر قسم کے عہدہ دار تھے۔ ان کا ایک وزیر مالیات، ایک اکاؤنٹنٹ اور کئی کلرک تھے۔ دفتر میں باقاعدہ کام ہوتا تھا۔ ہر چیز کا ریکارڈ محفوظ رہتا تھا۔ ایک ایک پائی کا حساب لکھا جاتا تھا۔ زر رہائی سے اچھی خاصی آمدنی تھی جس سے شہر کی بیواؤں اور یتیموں کی پرورش ہوتی تھی۔ بیواؤں اور معذوروں کو ماہانہ وظیفے ملتے تھے۔ یتیموں کی تعلیم و تربیت کے اخراجات پورے کئے

جاتے تھے۔ سرکاری طور پر کئی مرتبہ عزیز میاں کو آزمانے اور ان کی اصلیت جاننے کی کوشش کی گئی لیکن وہ پھر کھرے اور بے داغ نکلے۔ ہزاروں کی آمدنی میں عزیز میاں اپنا حصہ صرف سو روپے لیتے تھے۔ انکی ہر محبوبہ سخت پردے میں رہتی تھیں۔ گھر میں ہر محبوبہ کی حیثیت بیوی اور ملازمہ دونوں کی تھی۔ ملازم اور ملازمہ کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ عزیز میاں سارے شہر میں پیدل پھرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ صبح ۵ بجے اٹھتے اور "بریک فاسٹ" کر کے گھر سے نکل جاتے تھے۔ دو بجے آ کر لنچ کھاتے تھے اور پھر رات کو گیارہ بجے ڈنر کی باری آتی تھی۔ چائے، سگرٹ اور پان کے عادی نہ تھے۔

دفتروں میں عزیز میاں خالص انگریزی بولتے تھے۔ بھولے سے بھی مادری زبان کا ایک لفظ نہ نکلتا تھا۔ انگریزی بولنے کی مشق بہت اچھی تھی۔ بامحاورہ جملے بڑی بے ساختگی سے بولتے تھے۔ شہر کے کسی آدمی نے ان کو کبھی غیر سنجیدہ نہیں پایا۔ کسی نے کسی موقع پر ہنستے یا مسکراتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ پرمزاح باتیں کرتے وقت بھی کبھی ان کے لبوں پر مسکراہٹ کی خفیف لکیر بھی نظر نہیں آئی۔ وہ کبھی کسی بابو سے پوچھتے:

"میو لولے کلٹیویٹڈ لینڈ"؟ (کیا آپ کے پاس مزروعہ زمین ہے؟) "ہیو لولے گارڈن"؟ (کیا آپ کے پاس باغ ہے؟) "ہاؤ مینی فلاورز؟" (کتنے پھول ہیں؟) "ہاؤ مینی لیلیز اینڈ ہاؤ مینی روزز؟" (کتنے لالے اور کتنے گلاب ہیں؟) یہ سوالات بیوی اور بچوں کے متعلق ہوتے۔ ان کا مخاطب مسکراتا اور شرماتا لیکن عزیز میاں اس طرح سنجیدہ رہتے جیسے ملازمت کے سلسلہ میں انٹرویو لے رہے ہیں۔

عزیز میاں کے بچپن اور جوانی کے حالات سے کوئی واقف نہیں تھا۔ ان کی تعلیمی حالت اور گذشتہ تجربات کا بھی کسی کو علم نہیں تھا۔ ان کے ملنے والوں اور خود ان کے لئے ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی کسی نے کبھی یہ باتیں جاننے کی کوشش نہیں کی اور نہ انھوں نے کبھی ایسا موضوع چھیڑا جس میں ان کے ماضی کی جھلک نظر آسکے۔ انداز گفتگو نشست و برخاست اور رہن سہن سے وہ انوکھے انسان معلوم ہوتے تھے

اس چھوٹے سے شہر کی معاشرتی زندگی کے ہر شعبہ میں عزیز میاں جیسے پیوست ہو گئے تھے۔ بظاہر ان کی شخصیت محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن ان کی شفقت کے اثرات دلوں کی گہرائیوں میں چھپے تھے۔ ہزاروں دل ان کے لئے دھڑکتے تھے۔ سینکڑوں آنکھیں ان کے سامنے جذبۂ عقیدت سے معمور رہتی تھیں۔ وہ بازاروں سے گزرتے تو نعرے نہیں لگتے۔ تزک و احتشام سے خیر مقدم نہیں کیا جاتا لیکن کئی آنکھیں احسانمندی کے بے پناہ جذبے کے ساتھ جھک جاتیں۔ جذبۂ عقیدت میں زبردست تحریک پیدا ہوتی۔

شہر کے تمام رکشا والے، قلی، مزدور، چھوٹے دوکاندار، بہشتی، بھنگی، چمار، حجام ہر روز اپنی مقررہ جگہوں پر عزیز میاں کے منتظر رہتے عزیز میاں روزانہ پوری پابندیٔ وقت کے ساتھ ہر فرد کے پاس پہونچتے اور سب سے پیسے وصول کر لیتے۔ کوئی دو پیسے اور کوئی دو روپے روزانہ دیتا۔ ہر وصولی کا باقاعدہ اندراج ہو جاتا اور اس طرح رات کے گیارہ بجے عزیز میاں گھر لوٹتے۔

دوسرے دن عزیز میاں ڈاکخانہ جاتے اور پاس بکوں کا ایک پلندہ پیش کرتے اور اس طرح قطرہ قطرہ کر کے دریا بنتا گیا۔ سب کے پاس بک عزیز میاں کے دفتر میں جمع رہتے۔ عزیز میاں کسی کو حساب پوچھنے کا موقع نہیں دیتے۔ روزانہ رجسٹر کھولکر سب کی رقوم کی میزان بتلاتے رہتے اور ہدایت کرتے کہ اپنے طور پر بھی حساب رکھنے کی کوشش کرو۔ کسی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملا اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ آج فلاں رکشا والے کے لڑکے کی شادی کے موقع پر عزیز میاں نے ڈاکخانہ سے ایک ہزار روپے نکالکر دیئے۔ فلاں قلی حج کرنے کے لئے جا رہا ہے اور عزیز میاں اسے بندرگاہ تک چھوڑنے جا رہے ہیں۔ فلاں مزدور نے زمین خریدی۔ فلاں حجام مکان کی مرمت کرا رہا ہے۔

شہر کے کسی خاص و عام آدمی کے حالات عزیز میاں سے پوشیدہ نہیں تھے۔ دفتر کے بابو انھیں خبر رساں ایجنسی سمجھتے تھے۔ شہر کے کس افسر کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ کون بابو کہاں جا رہا ہے۔ کون کب آ رہا ہے۔ کون کب معطل کیا گیا۔ کون رشوت لیتا ہے۔ کون اس سے پرہیز کرتا ہے۔ کون رشوت لینے کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ اس قسم کی تمام خبریں عزیز میاں کی نوک زبان پر رہتی تھیں۔ ریلوے اسٹیشن کے حالات گاڑیوں کی آمد و رفت وغیرہ کی پوری تفصیلات ان کے ذہن میں محفوظ

بتی تھیں۔ کوئی بڑا افسر یا بڑا آدمی آنے والا ہوتا تو اس کی اطلاع عزیز میاں کو پہلے ہی مل جاتی۔ بعض اوقات دفتر کے بابوؤں کو قبل از وقت مطلع کر دیتے کہ فلاں افسر کا تبادلہ ہو رہا ہے اور اس کی جگہ فلاں افسر آ رہا ہے۔

ایک دن پلیٹ فارم پر گاڑی کھڑی تھی۔ فرسٹ کلاس کا ایک ڈبہ ریزرو تھا۔ جس میں ایک صاحب بہادر بیٹھے تھے۔ عزیز میاں حسب معمول بغل میں رجسٹر دبائے ڈبہ میں داخل ہوئے اور صاحب بہادر سے کہا۔ "ول جنٹلمین ایو ہیو بین اریسٹڈ" یہ سنتے ہی صاحب بہادر کے کان کھڑے ہو گئے اور ایک لمحہ گھورنے کے بعد وہ طیش میں کھڑے ہو گئے اور پورے زناٹے کے ساتھ عزیز میاں کو ایک چانٹا رسید کیا۔ عزیز میاں گرتے گرتے بچے لیکن پیشانی پر ایک بل بھی نہ آیا اور بڑے پیار سے اپنے گال پر ہاتھ رکھکر کہا۔ "یور فادر کسڈ دیز چیکس" (آپ کے اباجان ان رخساروں کو بوسہ دیتے تھے) صاحب بہادر نے اپنے باپ کے نام گالی سمجھکر دونوں ہاتھوں سے دھکا دیا۔ عزیز میاں ڈبہ کی دیوار سے جا لگے لیکن انھوں نے اسی شفقت سے کہا۔ "یور فادر ایمبریسڈ می" (آپ کے اباجان مجھے سینہ سے لگاتے تھے) صاحب بہادر کا پارہ اور چڑھ گیا اور انھوں نے اتنے زور سے دھکا دیا کہ عزیز میاں ڈبہ سے باہر پلیٹ فارم پر گر پڑے۔ سارے رجسٹر بکھر گئے۔ عینک دوسری طرف گری۔ عزیز میاں کو چوٹ آئی۔ پلیٹ فارم کے بہت سے آدمی جمع ہو گئے۔ لوگوں نے عزیز میاں کو اٹھایا۔ ان کی عینک اور رجسٹر اٹھائے گئے۔ کپڑوں سے گرد جھاڑی گئی۔ لوگ خیریت پوچھنے لگے لیکن عزیز میاں سب کو نظر انداز کر کے صاحب بہادر سے نہایت محبت سے بولے۔ "یور فادر لفٹڈ می" (آپ کے اباجان مجھے سنبھالتے تھے) صاحب بہادر پر اب تک کوئی اثر نہیں تھا۔ عزیز میاں کے گرد ایک کثیر مجمع تھا جو مشتعل ہو رہا تھا۔ سب نے صاحب بہادر کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ دفتر کے ایک بابو بلند آواز میں چیخنے لگے۔ "صاحب! آپ میں نام کو بھی انسانیت نہیں۔ انھوں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا۔ یہ امیر اور غریب سب کے ہمدرد ہیں۔ عزیز میاں کو آپ نہیں جانتے۔ یہ واحد شخص ہیں جن کی وجہ سے ہم لوگ بیواؤں اور یتیموں کی فکر سے آزاد ہیں یہی ہیں جو لوگوں کے مستقبل کا سامان کرتے ہیں۔ اس شہر کا بچہ بچہ عزیز میاں کی شخصیت پہ نازاں ہے۔ اگر ہر شہر لکھ کا دوں میں ایک عزیز میاں پیدا ہو جائے تو کروڑوں آدمیوں کی بہت سی مشکلات دور ہو جائیں۔ عزیز میاں ہماری نظر میں بہت ہی قابل احترام انسان ہیں۔"

عزیز میاں نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو مزید کچھ کہنے سے منع کیا۔ جب سکوت ہوا تو صاحب بہادر مسکراتے اور ندامت سے نظریں جھکائے ڈبہ سے نیچے اترے اور عزیز میاں کو گلے لگا لیا۔ عزیز میاں نے کہا۔ "میں جانتا تھا کہ بچہ ہے مجھے نہیں جانتا۔ خیر اب تمام باتیں بتا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر رجسٹر کھولا اور پوچھا۔ "یہ حروف پہچانتے ہیں۔" صاحب بہادر نے بڑے اشتیاق سے دیکھا اور کہا "اوہ مائی گاڈ! یہ تو میرے اباجان کے حروف ہیں۔" اور پھر عزیز میاں نے سارا رجسٹر دکھا دیا اور کہا۔ "آپ زیر حراست ہیں۔ زر ضمانت ادا کر کے چھوٹ سکتے ہیں۔"

صاحب بہادر ایک بڑے نواب کے صاحبزادے تھے۔ اس جملہ پر مسکرائے اور جیب سے پانچ سو روپے نکال کر دیئے۔ عزیز میاں نے حسب معمول اندراج کیا اور ان کے دستخط لئے۔

اس طرح عزیز میاں خاموش کام کرتے رہے اور جب ملک میں عام انتخابات کا وقت آیا تو عزیز میاں کو بڑی مشکل سے رضامند کر کے لوگوں نے ان کا نام امیدوار کی حیثیت سے پیش کر دیا اور سارا شہر کسی لالچ یا خوف سے بے نیاز ہو کر ان کے لئے کام کرنے لگا۔ دوسرے تمام امیدواروں کو ناکامی ہوئی اور عزیز میاں باضابطہ مجلس قانون ساز کے رکن ہو گئے۔

لاکھوں دن کے کام کا نقصان
جناب! اس سخت کھانسی اور زکام میں مبتلا ہونے کی وجہ سے آج دفتر حاضر نہ ہو سکوں گا امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔
اور یہ صرف اس لیے کہ لوگ کھانسی، نزلہ اور زکام کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اپنے گرد و پیش نظر ڈال کر دیکھیے کہ کتنے آدمیوں کا کتنا قیمتی وقت ان عام بیماریوں کے سبب ضائع ہو جاتا ہے۔
ایک طرف وقت اور دولت برباد ہوتی ہے تو دوسری طرف صحت و مسرت۔
اس بے اندازہ نقصان سے پناہ کی سب سے اچھی تدبیر ہے سعالین کا استعمال جو کھانسی، نزلہ اور زکام سے بچاؤ کا ذریعہ بھی ہے اور موثر علاج بھی۔
کھانسی، نزلہ اور زکام کی خصوصی دوا
سعالین
گلے اور پھیپھڑوں کی حفاظت کرتی ہے
ہمدرد
ٹیوب ۲۰ ٹکیاں — ۸/ آنہ
جار ۲۵۰ ٹکیاں — ۵ روپیہ
Suualin
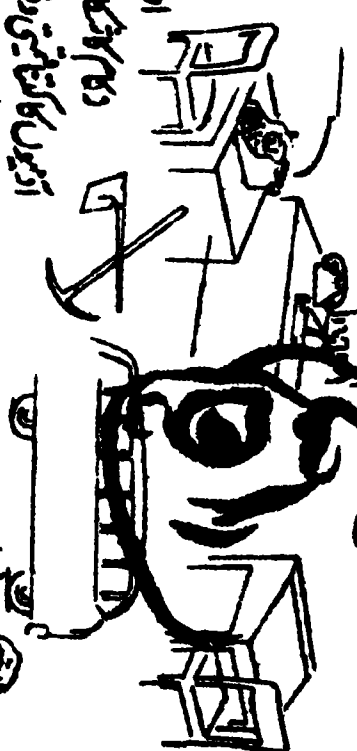
سعید علوی٭

○

شبِ سیاہ میں جن کا کہ رہزنی ہے شعار
وہی ہیں دن کے اُجالے میں قوم کے معمار
اُجڑ چکا ہے گلستاں، پلٹ چکی ہے بہار
غضب ہے پھر بھی کہ اہلِ چمن کو ہے انکار
نظر سے جن کی ہے خطرے میں آبروئے وطن
چلے ہیں آج بنانے وطن کو وہ گلزار
ضمیرِ وقت کی پُرسوز داستاں سُن کر
نفس نفس میں بھڑک اٹھے عزمِ نو کے شرار
اٹھے ہیں ظلم مٹانے سحر کے شیدائی!
نہ رک سکیں گے قدم راہ ہو جو تیرہ و تار
"جو گل کو دیکھ کے تخلیقِ گل نہیں کرتے"٭
میں کس طرح سے یہ سمجھوں کہ وہ بھی ہیں فنکار
چھٹے گا میری نگاہوں کی تابناکی سے
عروسِ زیست کے رُخ سے غم و الم کا غبار
اٹھو ملے تیرہ نصیبو! گجر بجاؤ کہ اب
جبینِ وقت پہ اُبھرے ہیں صبح کے انوار

٭ میں گل کو دیکھ کے تخلیقِ گل کی سوچتا ہوں۔ ندیم

عاصی کرنالی ●

معیار

فرض کر لیجئے کہ مجھے افسانہ لکھنے یا غزل کہنے کا شوق ہے اور یہ بھی فرض کر لیجئے کہ میرا معیار ابتدائی درجے سے کچھ بڑھکر ہے۔ کیونکہ میں سرزمین مشرق کی پیداوار ہوں۔ اس لئے مجھے شہرت کے مرتبے تک پہنچنے کے لئے بڑے بڑے ہفت خواں طے کرنے پڑیں گے۔ میرا جرم ہے خدمت ادب، اور اس کی سزا خوردان معاصرین کی طرف سے مجھے ملیگی جو ترقی کی رفتار میں مجھ سے آگے ہیں۔ میرے یہ ہم عصر ان تمام وسائل سے مجھے اور مجھ جیسے پُرشوق اور جواں عزم افراد کو محروم کر دیں گے۔ جن پر ان کا تسلط ہے۔ رقابت وحسد کی خلیجیں، نفرت وگریز کی خندقیں۔ غصہ واشتعال کے لاوے، ناقدری وحوصلہ شکنی کے طوفان ہماری راہ روکیں گے۔ اس طرح یا تو ہم جلد ہمت ہار دیں گے یا پھر ہمارا کامیاب ہو جانا ایک بہت بڑا معجزہ ہوگا۔

اصل بات شروع کرنے سے پہلے مجھے یہ وضاحت کرنی ہے کہ میرا روئے سخن کسی خاص شخص کی جانب نہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کا ایک اجتماعی عکس ہے۔ جسے افسانے کے انداز میں پیش کرنے کے لئے کچھ مفروضے بہرحال دلچسپی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اب آپ جلدی سے فرض کر لیجئے کہ چونکہ میں متبدی سے ذرا بڑھکر ہوں۔ اس لئے مجھے بھی یقیناً بہت سے پہاڑوں سے گزرنا اور بہت سے سمندروں کو عبور کرنا پڑا ہوگا۔

میں نے ایک بہت اچھی غزل کہی حلقے کی تنقیدی نشستوں نے اُسے شاہکار کہا۔ میں نے اسے ایک ماہنامے کے مدیر صاحب کی خدمت میں برائے اشاعت ارسال کر دیا۔ جواب آیا۔ ہم بوجوہ خاص اشاعت سے قاصر ہیں۔ میں نے "بوجوہ خاص" کی وضاحت چاہی مجھے جواب موصول نہ ہو سکا۔ ایک نظم کسی اصلاحی موضوع پر بڑی کاوش کے ساتھ ترتیب دی اور ایک کثیر الاشاعت ہفت روزہ کے مدیر کو بھیجی۔ جواب آیا۔ غیر معیاری ہے۔ میں نے ایک لفافہ مع جوابی لفافے کے ارسال کیا اور پوچھا۔ غیر معیاری کیوں ہے۔ فرمایا۔ غیر معیاری اس لئے ہے کہ معیاری نہیں ہے۔

ایک صاحب نے کہا۔ لاہور کا فلاں رسالہ بڑا "ادبی" ہے۔ اس کے ایڈیٹر صاحب بے انتہا جوہر شناس اور قدردان ہیں۔ وہاں ضرور کوئی فکری کاوش بھیجئے۔ میں نے چند رباعیات بھیجدیں۔ جواب ندارد۔ خط لکھا۔ جواب ندارد۔ اس خیال سے کہ ڈاک میں غتربود نہ ہو گئی ہوں از سر نو لکھ کر بھیجیں۔ جواب ندارد۔ اندیشہ ہوا کہیں رسالہ بند نہ ہو گیا ہو۔ معلوم ہوا کہ بک اسٹال پر آتا ہے۔ جوابی لفافہ بھیجا۔ جوابی لفافہ ندارد۔ پھر جوابی لفافہ بھیجا۔ وہ بھی ندارد۔ اندازہ ہوا بڑے عالی ظرف ہیں لبریز ہو کر چھلکنے کا نام نہیں لیتے۔

ایک مرحوم ایڈیٹر کا جواب ہر کسی کو یہی آتا۔ ہمیں آپ کی غزل نہیں مل سکی۔ ڈاک کا قصور ہے۔ میں نے جوابی رجسٹری سے غزل بھیجی ان کی دستخطی رسید مجھے موصول ہوئی۔ غزل نہ چھپی۔ "تقاضائیہ" بھیجا۔ جواب آیا۔ ہمیں آپ کی غزل نہیں مل سکی۔ ڈاک کا قصور ہے۔

سوچا۔ اب نظم نہیں نثر بھیجا کریں گے۔ ایک افسانہ "بھکارن" ایک مدیر کو بھیجا۔ انہوں نے لکھا۔ بہت طویل ہے۔ مختصر کر کے بھیجا۔ اطلاع ملی۔ بہت مختصر ہے۔ طویل اور مختصر کے بین بین بھیجا۔ جواب آیا۔ اب وہ افسانہ ہی نہیں رہا۔

"شعاع نو" ایک روزنامہ نکلتا تھا۔ سنڈے ایڈیشن کے لئے ایک تمثیل "سنجوگ" بھیجی۔ کوئی وجہ لکھے بغیر اصل مضمون واپس آگیا۔ وجہ پوچھی۔ جلا کٹا جواب آیا۔ صاحب! ہمارا معیاری پرچہ ایسے بوگس... مضامین نہیں چھاپتا۔ ایک ماہ بعد وہی مضمون ایک ایسے صاحب کی معرفت ارسال کیا گیا جو مدیر محترم کے گہرے دوست تھے۔ مدیر صاحب نے لکھا۔ ڈرامہ بہت معیاری ہے۔ صاحب مضمون کو مبارکباد عرض کیجئے

ہی سنڈے ایڈیشن میں ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔

میرے ایک دوست جو کسی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ میرا ایک مقالہ "میر اور داخلیت" سن کر عش عش کر اٹھے اور حسرت سے کہنے لگے کاش میں کسی اخبار یا رسالے کا ایڈیٹر ہوتا۔ اور اس بیش بہا مضمون کو اس کے خاص نمبر میں صفحۂ اول پر چھاپتا۔ سو اتفاق سے کچھ عرصہ بعد وہ واقعی ایک اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے۔ میں نے وہی مضمون ان کی "سنہری رائے" درج کرتے ہوئے ارسالِ خدمت کر دیا۔ اب چونکہ ان کا معیار اونچا ہو چکا تھا انہوں نے بے تکلف لکھ دیا۔ آپ کا یہ مضمون میرے معیار پر نہیں اترتا رہی میری سابقہ رائے۔ سو آپ جانتے ہیں زمانے کے ساتھ ساتھ ادب کی قدریں بلکہ ذہن کی قدریں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے بڑے خلوص سے معذرت ہوں۔

ایک بزرگوار جو کسی مدیر صاحب کے عزیز تھے۔ مجھے ایک روز ان کے دفتر لے گئے۔ لکھنے کی میز پر ایک طرف ڈاک کے کھلے لفافوں کا انبار رکھا تھا۔

"یہ سب ڈاک خانے سے منگاتے ہیں کیا؟" بزرگوار نے پوچھا۔

"یہ صاحب کون ہیں چچا جان؟" مدیر صاحب نے میرے بارے میں استفسار کیا۔

"اپنے بے تکلف دوست ہیں۔"

اطمینان حاصل کرنے کے بعد وہ بولے: "یہ جوابی لفافے ہیں — ادب کے وہ مریض جن کے ذہن پر حصولِ شہرت کے جراثیم چمٹے ہوتے ہیں بھیجتے ہیں۔"

"آپ انہیں جواب دیتے ہوں گے؟" چچا جان نے سوالیہ نشان بنتے ہوئے پوچھا۔ "چچا جان! نہیں، ہم ایڈیٹروں کو اپنی شخصیت کا ایک معیار قائم رکھنا پڑتا ہے۔ ہر کس و ناکس کو جواب دینے لگیں۔ تو اپنے معیار سے گر جائیں۔"

"پھر یہ لفافے؟"

"یہ ہم نجی کاموں میں صرف کرتے ہیں۔"

"خوب خوب! ماشاءاللہ!" چچا جان نے بھتیجے کے معیارِ شخصیت کو سراہتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں یہ دیکھئے!" مدیر صاحب چچا کی طرف جھکتے ہوئے بولے "یہ میں نے ایک ہی نشست میں چار افسانے مختلف فرضی ناموں سے گھسیٹ دیئے ہیں۔ سلیم نظری، جمیل ذوقی، راحت وارثی اور نجیب اسلم کے ناموں سے!"

"لیکن بھائی اس زحمت اٹھانے سے فائدہ؟"

"آپ جانتے ہیں۔ رسالے کے مالک کی طرف سے لکھنے والوں کو پانچ روپے فی غزل اور افسانے پر تین روپے فی صفحہ ملتا ہے۔ میں نے تیس صفحات کا مواد لکھ مارا ہے۔ بیٹھے بٹھائے مفت میں نوے روپے کھرے ہو جائیں گے۔"

"لیکن اس طرح دوسرے لکھنے والوں کی حق تلفی ہو گی!"

"جی بھاڑ میں جائیں وہ۔ ہم انہیں یہ لکھ کر ٹرخا دیتے ہیں کہ صاحب آپ کی غزل یا افسانہ غیر معیاری ہے۔ پھر انہیں جرأت نہیں ہوتی۔"

"لیکن اگر وہ پوچھ بیٹھیں۔ آپ "معیار" کی تعریف کیا سمجھتے ہیں؟"

"چچا جان! معیار کی کوئی جامع تعریف نہیں۔ اگر ہو بھی تو ہم ادب کی نئی قدروں کو ثابت کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ فلسفیانہ استدلال اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ زمانہ عجیب ہے۔ جتنا مہمل کہئے۔ لوگوں کی عقلوں سے بالاتر ہو گا۔ اور لوگ داد دیں گے۔ مثلاً میرا ایک مضمون جس کی ایک سطر میں آپ کو سناتا ہوں، اتنا الجھا ہوا اور بے معنی ہے کہ اسے ایک عمدہ ریسرچ ایک عظیم تھیوری اور ایک ادبی شہ پارا خیال کیا گیا ہے اور وہ اب تک سات رسائل میں چھپ چکا ہے میں نے اس میں ایک جگہ محبت کی تعریف میں لکھا ہے۔

مرمریں محسوسات کے تخیلی مصور کی شاہکارانہ
قوتوں کے حسین ہیولیٰ کی تخلیق ——— اور غیر مرئی
لاشعوری و تحت الشعوری جذباتیت کی سسکتی اور
سلگتی ہوئی انسانی روح کے مظہر کا دوسرا نام محبت ہے!

چچا جان! لوگ اس تعریف کو بہت معیاری بات سمجھ رہے ہیں۔

چچا جان نے فرطِ شفقت سے اپنے معیاری بھتیجے کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور ہم وہاں سے رخصت ہوئے۔

میرے ایک شاعر دوست سلیمی صاحب نے ایک غزل کسی

ایڈیٹر کو دست بدست پیش کی۔ انہوں نے ایک سرسری نظر ڈالی اور فرمایا "معاف کیجئے ہم اپنے مخصوص ادبی حلقے کے علاوہ کسی کا کلام نہیں چھاپتے"

"کیا ادب کی ہمہ گیریت حد بندی کے منافی نہیں ہے؟" سلیمی صاحب نے سوال کیا

"ہم صحت مند ادب چاہتے ہیں اور وہ ہمیں حلقے سے باہر نہیں ملتا"

"کیا آپ کے حلقے کے علاوہ سب کی فکر مفلوج اور احساس جذامی ہے؟"

"ہمیں فضول باتوں کا وقت نہیں۔ آپ تشریف لے جاسکتے ہیں"

"لیکن یہ ایک رقعہ ہے آپکے نام حضرت علامہ تلامہ علمی صاحب کا"

"کیا کہا؟ حضرت علامہ صاحب کا رقعہ!" (رقعہ پڑھکر) "ذرا غزل پھر دکھائیے" (غزل پڑھکر) "ارے بھائی! یہ تو معیاری غزل ہے میں نے تو اب بہ غور پڑھی۔ پہلے میرا ذہن فرائڈ اور سفرالی کے ایک دقیق موضوع میں الجھا ہوا تھا۔ ماشا اللہ آپ کی فکر صحت مند ہے ہمہ گیر ہے!"

"مجھے اجازت دیجئے!"

"بیٹھئے صاحب! چائے پی کر جائیے گا!"

میرے ایک اور دوست خالد رحمانی صاحب کو تین حادثے پے در پے پیش آئے۔ ایک بڑا مشاعرہ ان کے شہر میں ہوا۔ بڑے بڑے سکہ بند شاعر آئے ہوئے تھے۔ رحمانی صاحب نے سکرٹری مشاعرہ سے اپنا نام لکھنے کو کہا۔

"آپ کی تعریف؟"

"خالد رحمانی"

"کچھ نیا سا نام ہے۔ پہلے سننے کا اتفاق نہیں ہوا"

"جی ہاں! لیکن میرے شعر پُر اثر ہوتے ہیں"

"بھئی گستاخی معاف! آپ مبتدی معلوم ہوتے ہیں۔ اور مبتدی حضرات کو اس معیاری مشاعرے میں پڑھوانا کچھ ٹھیک نہیں"

رحمانی صاحب گرمیاں گزارنے پہاڑوں پر گئے۔ ایک ریڈیائی صاحب وہاں تشریف رکھتے تھے۔ یہ صاحب ان سے ملے۔ اور غزلوں کے کنٹرکٹ کی درخواست کی۔ ان صاحب نے ایک طویل انگڑائی لی اور اخبار کے مطالعے میں محو ہوگئے۔ رحمانی صاحب نے درخواست کو دہرایا۔

"میں شاعر ہوں!"

"شاعر، یعنی شاعر ہیں آپ!"

"جی ہاں، ایک اچھا شاعر!"

ان صاحب نے فلک شگاف قہقہہ لگایا "بھئی اچھا شعر کہنے والا تو سارے ملک میں نہیں ملتا"

"گستاخی معاف" رحمانی صاحب نے پھر جرأت کی "کیا اچھے شاعروں سے ہمارا ملک محروم ہے؟"

وہ بیزاری سے بولے "شاید کچھ لوگ اچھا شعر کہتے ہوں۔ لیکن ہمارے معیار پر نہیں اترتے!"

رحمانی صاحب نے ایک ناول بھی لکھ مارا تھا۔ ان کے احباب نے جستہ جستہ سنا تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے۔ تعریف بھی کی تھی۔ وہ ناول کے اجزا ایک بیگ میں رکھ ایک پبلشر کی دکان پر جا پہنچے۔

"السلام علیکم۔ ایک ناول طباعت کے لئے لایا ہوں" پبلشر صاحب نے چشمے کو ذرا سرکا کر انہیں اوپر سے نیچے تک بغور دیکھا۔

"آپ کی کتنی کتابیں اب تک مارکیٹ میں آچکی ہیں؟"

"قبلہ یہ پہلا اتفاق ہے"

"تو معاف کیجئے صاحب! ہم خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں۔ اور پھر گمنام اور مبتدی لوگ معیاری کتابیں لکھ بھی کہاں سکتے ہیں"

"آپ اس ناول کا مطالعہ تو فرمائیں!"

"بھئی بڑے بڑے سن رسیدہ، تجربہ کار مصنفین اپنے ملک میں پڑے ہیں۔ ان کے ہوتے آپ سے معاملہ کیوں طے کریں"

"پبلشر صاحب! یہ سن رسیدہ، تجربہ کار مصنفین کب تک جئیں گے۔ مرنا برحق ہے ان کے بعد میدان خالی ہو جائے گا۔ اگر نئی پود نہ ابھری تو شعر و ادب کے چراغ میں تیل بتی کون کرے گا۔ دیکھئے نا! خزاں کے موسم میں بڈھے بوڑھے پتے جھڑ جاتے ہیں جب جوان کونپلیں ابھرتی ہیں اور فصل بہار کا پیغام لاتی ہیں"

"میں آپ سے وعظ نہیں چاہتا۔ میرے سامنے تجارت کا سوال ہے۔ ادب کا نہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ ہم سب شخصیتوں کے بیوپاری ہیں۔ آپ پہلے شخصیت بنائیے ——— پھر تشریف لائیے"

(باقی صفحہ ۷۵ پر دیکھئے)

ش۔ مظفر پوری

سفید بال

نجمہ بیگم کی یادداشت کتنی کمزور تھی۔ آج ان کی بات سن کر راشد صاحب حیران رہ گئے۔ مگر یہی بات کسی اور نے کہی ہوتی تو راشد صاحب کو حیرت نہ ہوتی۔ مگر نجمہ کی زبان سے اس بات کو سن کر وہ کچھ یاد کرنے لگے۔ پندرہ سال پہلے جب ان کی بیگم سے نئی نئی شادی ہوئی تھی تو نجمہ بیگم نے ایک بات کہی تھی جو آج کی بات کے بالکل برعکس تھی۔ اگر وہ بات ان کی یادداشت میں ہوتی تو آج وہ یقیناً ایسی بات نہ کہتیں۔ راشد صاحب کو اس تضاد پر ہنسی آگئی اور انہیں شک گزرا کہ اس تضاد کے پیچھے ضرور کوئی راز تھا!

پندرہ سولہ سال پہلے راشد صاحب اپنی نوجوانی میں آج سے بھی زیادہ خوبصورت تھے۔ مگر انہوں نے اپنی خوب صورتی پر ڈاڑھی کا غلاف چڑھا رکھا تھا۔ ایک تو کٹر مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے دوسرے یہ کہ بارہ تیرہ سال کی عمر تک گھر میں مولوی رکھ کر انہیں دینیات کی تعلیم دی گئی۔ اور جب وہ نماز روزے کے ٹھیک سے پابند ہو گئے تب انہیں انگریزی پڑھائی گئی۔ اسکول سے کالج میں پہنچے تو مسیں بھیگ چکی تھیں۔ بی۔ اے کرتے کرتے چہرہ کم اور ڈاڑھی زیادہ نظر آنے لگی۔ کالج کے لڑکوں نے ان کی ڈاڑھی کا مذاق بھی اڑایا اور بلیک بورڈ پر چاک سے ان کے کارٹون بھی بنائے لیکن وہ بڑے صبر و ضبط کے ساتھ اپنی ڈاڑھی کو پروان چڑھاتے رہے ڈاڑھی بھی کچھ ایسی نورانی پائی تھی کہ دادی جان کی جب بھی نظر پڑتی تو بے ساختہ زبان سے "سبحان اللہ۔ ماشاءاللہ" نکل جاتا۔ راشد صاحب کو بھی اپنی ڈاڑھی پر کچھ اس قدر ناز تھا کہ دادی جان کی زبان سے تعریف سن کر ان کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ پھر وہ دن آیا کہ راشد صاحب کو اپنی ڈاڑھی پر کچھ محنت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور جب نائی نے پہلی بار ڈاڑھی پر قینچی چلائی تو جیسے ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مگر مجبوری تھی۔ ڈاڑھی کے بال اس قدر بڑھ چکے تھے کہ بے قرینہ دکھائی دیتے تھے۔ اس لئے اس کی وضع قطع کو درست کرنا بھی ضروری تھا رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی ڈاڑھی کے لئے کنگھے اور خوشبو کا استعمال بھی شروع کر دیا اور چمک دار ڈاڑھی میں ان کا گورا چہرہ ایسے نظر آتا تھا جیسے کالے بادلوں میں گھرا ہوا چاند۔ پھر اللہ نے وہ دن بھی دکھایا کہ ان کی ڈاڑھی اپنی دیدہ زیبی اور خوش وضعی کے لئے شہر کے صوفیوں اور مولویوں میں مشہور ہو گئی۔ اور راشد صاحب اپنی ڈاڑھی کی شہرت کو برقرار رکھنے کے لئے اس کی طرف پہلے سے بھی زیادہ توجہ دینے لگے۔

لباس کی تراش و خراش اور دیگر آرائش و زیبائش سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ انہوں نے ڈاڑھی ہی کو سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ اگر نائی سے قینچی چلانے میں ذرا بھی چوک ہو جاتی تو وہ بڑے برہم ہوتے۔ اس لئے نائی ڈرتے ڈرتے ہی قینچی چلایا کرتا تھا کہ نہ جانے کون سا بال چھوٹا ہو جائے یا اکھڑ جائے۔ اور ڈاڑھی کا سہاگ اجڑ جائے۔

خیریت یہ تھی کہ بات ابھی ڈاڑھی ہی تک تھی۔ ابھی کرتے اور پاجامے پر موزونیت کا رنگ نہیں چڑھا تھا۔ مگر آگے چل کر راشد صاحب کے پروگرام میں زلف رکھنا اور لباس کی اصلاح کرنا بھی شامل تھا نہ جانے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں ان کو انتظار کس بات کا تھا

بی اے پاس کرنے کے بعد ایک سال تک تو وہ اپنی ڈاڑھی، نماز روزے وظائف میں کھوئے رہے۔ خوشحال اور تجارت پیشہ گھرانے کی سعادت مند اولاد تھے۔ اس لئے نوکری چاکری کے چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اباجان کے جیتے جی ہی انہوں نے گدی سنبھال لی۔ اچانک ایک دن انہیں اپنی زندگی میں کسی بہت بڑی کمی کا احساس ہوا۔ سب کچھ تو ہو چکا تھا صرف شادی باقی رہ گئی تھی۔ انہیں بڑی الجھن ہوئی کہ چھبیس ستائیس کے سن کو پہنچ گئے پھر بھی ان کے دادا جان اور اباجان اور سب سے بڑھ کر امی جان کو ان کی شادی کا خیال کیوں نہیں آیا۔ کچھ دیر

کے لئے وہ ملول خاطر ہوگئے۔ مگر جب خیال آیا کہ بزرگوں کے جیتے جی
خود اپنی شادی کے بارے میں سوچنا سوء ادب ہے تو انہوں نے جی کو
مار لیا اور اللہ توکل ہو کر رہ گئے کہ دیکھیں بزرگوں کے کان پر کب جوں
رینگتی ہے!

لیکن بات وہ نہیں تھی جو راشد صاحب نے سمجھ رکھی تھی ان
کے بزرگوں کو پورے ایک سال سے شادی کا خیال پریشان کئے ہوئے تھا
البتہ معاملہ کچھ ایسا تھا کہ انہیں چراغ لیکر لڑکی کو ڈھونڈنا پڑ رہا تھا۔ یہ
بات راشد صاحب کو معلوم نہیں تھی اور اگر معلوم ہو جاتی تو نہ جانے ان
کا کیا حال ہوتا۔ بزرگوں نے بھی مصلحت اسی میں سمجھی تھی کہ فی الحال صاحبزادے
کے علم میں یہ بات نہ آنے پائے۔

بہت ممکن تھا کہ لڑکی ملنے میں اتنی دقت نہ ہوتی۔ مگر بزرگوں
نے شرائط کچھ ایسی رکھی تھیں کہ ویسی لڑکی چراغ لیکر ڈھونڈنے سے
بھی نہیں مل رہی تھی، پہلی اور بنیادی شرط یہ کہ لڑکی نماز روزے کی
سختی سے پابند ہو اور اس کا سارا چلن شریعت کے دائرے میں ہو۔
دینی تعلیم سے بہرہ ور ہو۔ امور خانہ داری سے واقف اور قبول صورت ہو
پستہ قد نہ ہو شاید اس لئے کہ صاحبزادے خاصے لمبے تڑنگے تھے، ان
تمام خصوصیات کے ساتھ ساتھ اگر حافظ قرآن بھی ہو تو قابل ترجیح
سمجھی جائے گی۔

ان شرائط کو سن کر ایک گمراہ اور بدعقیدہ رشتہ دار نے جل کر
یوں کہہ دیا تھا کہ ان سب کو چھوڑ کر صرف ایک شرط رکھ دی جائے ۔
یعنی لڑکی چاہے لڑکی بھی نہ ہو مگر ڈاڑھی والی ہو۔ اس طنز کا نتیجہ یہ
نکلا کہ دونوں گھروں میں ناچاقی ہوگئی۔

یہ ساری بات اندر ہی اندر چل رہی تھی۔ راشد صاحب بالکل
بے خبر تھے اور خبر ہوتی بھی کیسے۔ نہ کہیں آنا نہ کہیں جانا۔ نہ کسی کے
پاس اٹھنا بیٹھنا۔ گھر سے دفتر، دفتر سے گھر۔ کام کے علاوہ جو وقت
بچ رہتا وہ اللہ اللہ کرنے میں گزر جاتا۔ کچھ بات چیت ہوتی بھی تو گھر
کے بزرگوں سے۔ یہ کان میں کوئی بات پڑتی کہاں سے۔ کچھ بھی ہو مگر
بی اے پاس لڑکے کی یہ حالت دیکھ کر کتنے ہی لوگ انگشت بدنداں تھے
بس ایک کسر تھی۔ اور اس کے لئے بھی بزرگوں کی اجازت مل چکی تھی۔
کیوں کہ جہاں گھر کا گھر حاجی ہو وہاں کسی ایک کا حاجی نہ ہونا۔ دل اور
نگاہ دونوں میں بری طرح کھٹکتا تھا۔ لہٰذا آئندہ سال عزم بیت اللہ
کا بھی پروگرام بن چکا تھا۔

لیکن جب سے صاحبزادے کو اپنی شادی کا خیال آگیا تھا عزم
بیت اللہ کا خیال دل میں دب سا گیا تھا۔ بزرگوں نے بہت ہاتھ پاؤں
مارے لیکن کوئی لڑکی ان کی کسوٹی پر پوری نہ اتری۔ ایک نہ ایک کسر رہ
جاتی تھی۔ کھوٹا سودا کرنا منظور نہ تھا۔ مجبور ہو کر غریب گھرانوں میں لڑکی
کی تلاش شروع ہوئی۔ کیونکہ اگر سودا کھرا ہو تو ایک دو قدم نیچے اتر کر بھی
شادی کرنے میں بزرگوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ
پچھلے بیس پچیس سال کے اندر ایسی کوئی لڑکی پیدا ہی نہیں ہوتی تھی۔ اگر
قدرت کو منظور ہوا ہوتا کہ راشد صاحب صاحبزادے کی بجائے صاحبزادی
بن کر پیدا ہوں تو بزرگوں کو یہ مشکل درپیش نہ ہوتی۔ مگر اس وقت شاید
دوسری مشکل یہ ہوتی کہ راشد صاحب جیسا لڑکا نہیں ملتا!

اللہ اللہ کر کے راشد صاحب کے بچپن کے استاد مولوی قطب الدین
کی لڑکی دل و نگاہ کو جچ گئی۔ گویا مولوی صاحب نے اسی دن کے لئے یہ امانت
رکھ چھوڑی تھی۔ امی جان لڑکی کو گھر جا کر دیکھ بھی آئیں۔ بلائیں بھی لیں، دعا
بھی دیں۔ کچھ سوغات بھی بھیجدی۔ بس تاریخ مقرر ہونے ہی والی تھی کہ
نہ جانے کس کمبخت نے جا کر بھانڈا ہی پھوڑ دیا۔ اس بار راشد صاحب نے
اپنے حجرے میں بیٹھے بیٹھے یہ ماجرا اپنے کانوں سے سنا۔ کوئی عورت ان کی
امی جان سے کہہ رہی تھی:۔

"بی بی جی آپ نے لڑکی کو چلا پھرا کر بھی دیکھ لیا تھا؟"

امی کہنے لگیں:۔

"ایسی بھی کیا بات ہے۔ بھلا لڑکیوں کو کوئی چلا پھرا کر دیکھتا ہے
اچھی خاصی ہے۔ بالکل میری پسند ہے۔ مولوی قطب الدین کی
لڑکی ہے۔ کوئی ایری غیری تھوڑی ہے۔"

"نہیں بی بی جی۔ میرا مطلب کچھ اور ہے۔ لڑکی تو سچ مچ لاکھوں
میں ایک ہے۔ صورت بھی ہے۔ سیرت بھی ہے مگر......"

وہ عورت رک گئی تو امی جان نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"مگر کیا؟"

"ایک پاؤں سے ذرا لنگڑی ہے۔ کچھ زیادہ نہیں بس ذرا سی" اور امی جان "ہائے اللہ" کہکر سکتے میں آگئیں۔

اس دن راشد صاحب کو اپنی شادی کے بارے میں پہلی بار اور پہلی بات معلوم ہوئی۔ جو یقیناً بڑی روح فرسا تھی۔ بزرگوں نے سنا تو سر پیٹ لیا۔ اور مولوی قطب الدین کو اس چال بازی کی سزا یوں دی کہ ماہانہ وظیفہ بند کر دیا۔

لڑکی کی تلاش پھر شروع ہوئی۔ لیکن اب وہ شرائط ختم کر دی گئیں بس یہ طے پایا کہ خوب تعلیم یافتہ حسین اور عالی نسب لڑکی بیاہ کر لائی جائے چاہے وہ کتنی ہی فیشن ایبل اور آزاد خیال کیوں نہ ہو۔ جب گھر میں آجائے گی تو خود بخود ٹھیک ہو جائیگی۔ خربوزے کو دیکھکر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے لیکن اس تجربے میں بھی بزرگوں کی اور خاص طور پر صاحبزادے کی بڑی کرکری ہوئی۔ کیونکہ یہاں والدین کی بجائے لڑکیوں کی پسند کا سوال تھا۔ یوں بھی راشد میاں کی شادی کے لئے جو مہم عرصہ سے چل رہی تھی وہ کافی مشہور ہو چکی تھی اور بعض محفلوں میں مذاق کا مضمون بن چکی تھی مزید برآں لڑکیاں ان کی تصویر دیکھکر اور ان کا کیرکٹر اسکیچ سن کر کچھ اس طرح بھڑک اٹھتی تھیں جیسے جنگلی بھینسے کو سرخ کپڑا دکھایا گیا ہو۔ اور سچ بات تو یہ تھی کہ راشد صاحب کی مقطع ڈاڑھی شادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اس کا کسی نہ کسی طرح ان کو علم ہو گیا کیا عجب کہ غیب سے ہی ایسی کوئی ندا آئی ہو مقطع میں سخن گسترانہ بات آن پڑی تھی۔ کچھ دنوں تک مخمصہ میں رہنے کے بعد انہوں نے ترازو کے ایک پلڑے میں ڈاڑھی اور دوسرے میں شادی کو رکھا۔ ہر چند کہ انہوں نے ٹالہ مار کر ڈاڑھی کے پلڑے کو بھاری کرنا چاہا مگر شادی یعنی عورت کے مقابلہ میں تو تاج و تخت کا پلڑا بھی ہلکا پڑ جاتا ہے۔ بے چاری ڈاڑھی کی کیا حقیقت تھی۔

راشد صاحب کو ڈاڑھی کے خلاف اور شادی کے حق میں فیصلہ کر لینا پڑا۔ حسن اتفاق یا سوء اتفاق سے انہی دنوں دادا جان بہشت نصیب ہو گئے اور اس طرح راشد صاحب کی ڈاڑھی کی قصیدہ خوانی کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ گویا ڈاڑھی کے صفایا کے لئے میدان صاف ہو چکا تھا۔

لیکن اتنی مشہور و مقبول ڈاڑھی کا ایک دم سے صفایا کر دینا کوئی منہ کی بات نہ تھی۔ اس تصور ہی سے راشد صاحب کو پسینہ آنے لگتا تھا کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ کوئی سنے گا تو کیا کہیگا۔ آخر سوچتے سوچتے ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ اور ڈاڑھی سے پیچھا چھڑانے کے لئے انہوں نے ایک شش ماہی پلان بنایا۔

سب سے پہلے تو انہوں نے ڈاڑھی میں خارش کے دانے ہونے کا بہانہ نکالا۔ اور کسی ڈاکٹر کا حوالہ دیکر یہ بتایا کہ پسینہ کی تیزابیت کے سبب یہ مرض لاحق ہوا ہے۔ گھنی ڈاڑھی ہونے کی وجہ سے ہوا پسینہ کو خشک نہیں کر پاتی۔ اور نہ دانے ان سے بالوں کی جڑیں ٹھیک سے ہلتی ہیں۔ اس لئے اندیشہ ہے کہ خارش بڑھتے بڑھتے پھوڑے وغیرہ پیدا کر دے۔ اس جواز کے سہارے آدھی ڈاڑھی صاف ہوئی۔ پھر خشخشی ہوئی۔ پھر مکمل فرنچ کٹ ہوئی۔ اور بتدریج صاف ہو گئی۔ اور راشد صاحب کلین شیو جنٹلمین بن گئے۔

چہرے کے ساتھ ساتھ لباس کی وضع قطع بھی بدلی۔ پسند تھی تو لے دیکے ایک نماز رہ گئی۔ راشد صاحب کو کسی کا یہ قول پسند آ گیا تھا کہ جوانی میں یہ بھی بہت ہے۔

اس طرح راشد صاحب نجمہ بیگم کو بیاہ کر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک بار نجمہ بیگم نے ان سے شادی کرنے سے دبی دبی زبان سے انکار بھی کر دیا تھا۔ اس لئے کہ شادی کے چند ہی روز بعد بات سے بات نکل پڑی تو نجمہ بیگم نے اظہار معذرت کے طور پر کہہ دیا۔

"میں تو پہلے ہی آپ کی ہو چکی تھی مگر نہ جنگل جیسی ڈاڑھی سے جی ڈر گیا تھا۔"

شادی کے آٹھ دس مہینے تو خیر خوبی سے گزر گئے۔ لیکن اس کے بعد جب راشد صاحب نے دیکھا کہ اب کوئی ڈر نہیں رہا تو جانے کیوں ان کی نیت بدلنے لگی اور ایک دن انہوں نے باتوں باتوں میں پھر سے ڈاڑھی رکھنے کا ارادہ ظاہر کر دیا۔ چونکہ ان کے انداز میں سنجیدگی تھی اس لئے نجمہ بیگم سہم گئیں۔ کچھ دیر تک چپ چاپ رہیں۔ اس کے بعد بڑی بے بسی کے لہجہ میں بولیں:۔

"اگر آپ نے سچ مچ ایسا کیا تو میں پھر آپ کے گھر کبھی نہ آؤنگی مجھے

بڑا ڈر لگتا ہے۔"

راشد ہر چند کہ سنجیدہ تھے۔ پھر بھی نجمہ بیگم کے حال پر انہیں ہنسی آگئی اور انہوں نے اپنا خطرناک ارادہ ترک کر دیا۔

اور آج پندرہ سال گزر جانے کے بعد جب نجمہ بیگم نے کہا:

"اللہ رکھے اب لڑکی جوان ہوئی۔ کل کلاں گھر میں داماد کا آنا جانا ہوگا پھر کچھ ہی دنوں بعد گھر میں بہو آئے گی۔ اب کیا چھیل چھبیلے بنے پھرتے ہو کچھ تو بزرگی پیدا کرو اپنے اندر۔ بالکل جوان سے لگتے ہو اللہ قسم!"

گویا نجمہ بیگم کا صاف اشارہ ڈاڑھی رکھنے کی طرف تھا۔

ابھی تو خیر سے کوئی ایسی عمر نہیں تھی۔ یہی کوئی بیالیس تینتالیس کا سن ہوگا۔ اچھی صحت اور آرام و آسائش کی زندگی میں اتنی عمر کا آدمی جوان ہی تو ہوتا ہے۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات تھی۔ پھر نجمہ بیگم کو کھٹکتی کیوں تھی۔ خود نجمہ بیگم بھی تو کچھ کم نہ تھیں۔ ابھی تو ان کے چہرے پر کہیں ہلکی سی جھری بھی نہ پڑی تھی۔ اور چار بچوں کی ماں ہو کر بھی ایسے ٹھسے سے رہتی تھیں کہ کیا کوئی کنواری البیلی رہے گی۔ کیا مجال کہ کبھی آنکھوں میں سرمہ اور کپڑوں میں خوشبو لگانا بھول جائیں۔ آخر راشد صاحب کو بوڑھا دیکھنے کا شوق ان کے دل میں کیوں پیدا ہوا؟ ضرور کوئی راز تھا۔ ضرور کوئی بات تھی۔

راشد صاحب کئی روز تک چکر میں پڑے رہے۔ لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس روز کے بعد سے نجمہ بیگم اور بھی زیادہ بننے سنورنے لگیں راشد صاحب کو دفتر سے گھر آنے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو وہ پریشان ہو جاتیں۔ اور بالکل خلاف معمول قسم قسم کے سوالات کرنے لگتیں۔ اور جب وہ گھر آجاتے تو نجمہ بیگم ایک منٹ کے لئے بھی انہیں اکیلا نہ چھوڑتیں ہر وقت کمرے کے اندر ہی گھسی بیٹھی رہتیں۔ اپنی عمر، صورت اور جوانی کے بارے میں بڑی بہکی بہکی باتیں کیا کرتیں۔ جیسے کسی احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ یا انہیں یہ احساس رہ رہ کے ستاتا ہو۔ کہ کہیں ان کی جوانی صحت اور خوبصورتی راشد صاحب سے آگے تو نہیں نکل گئی تھی شاید انہیں اپنے شوہر کی سدا بہار جوانی اور خوبصورتی میں اپنے لئے کوئی خطرہ نظر آنے لگا تھا۔ جس کا کھلے لفظوں میں اظہار نہ کر کے وہ عجیب و غریب حرکتوں اور طفلانہ باتوں پر اتر آتی تھیں۔ ایسی پہلے تو وہ کبھی نہیں تھیں۔ اب کچھ نہ کچھ ضرور تھا۔

نجمہ بیگم بدستور راشد صاحب کو عمر کے زیادہ ہونے اور لڑکی کے جوان ہونے کا احساس دلاتی رہیں۔ جوانی کے دنوں کا ساٹھ سال کے بڈھوں جیسی حسرت کے ساتھ ذکر کیا کرتیں۔ کبھی کبھی کسی بات کو ان الفاظ کے ساتھ شروع کرتیں:۔

"جوانی کی یادیں بھی کتنی گہری ہوتی ہیں۔ ہر بات کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔"

راشد صاحب کو اس پاگل پن سے وحشت اور کوفت ہونے لگی تھی۔ نجمہ بیگم تو دس بیس سال پہلے ہی ان کو بوڑھا کر دینے پر تلی ہوئی تھیں مگر کیوں؟

یہ بھید بھی آخر ایک روز کھل ہی گیا۔

بات یوں ہوئی کہ چند دنوں سے راشد صاحب اپنے کمرے کی کھڑکی کا پردہ ایک منٹ کے لئے بھی سمٹا ہوا نہیں پاتے تھے۔ ایک دن جو کمرے میں کچھ گھٹن سی ہونے لگی تو وہ یوں ہی پوچھ بیٹھے:۔

"بیگم آخر ہوا نے تمہارا کیا بگاڑا ہے کہ اسے اندر نہیں آنے دیتیں"

نجمہ بیگم نے کھڑکی کا پردہ سمیٹنے کے بجائے پنکھا چلا دیا اور پھر اچانک ایک ایسی بات بول پڑیں جس کا کوئی اور چھور نہیں تھا کہنے لگیں

"چھی چھی۔ کیسے بے شرم لوگ ہیں۔"

راشد صاحب چونک پڑے:۔

"کون لوگ ہیں؟ کس کو کہہ رہی ہو؟"

"اور کون۔ وہی سامنے والے مکان میں نئے کرایہ دار جو آئے ہیں۔ ایک تو کرہ ہے اسی میں کچھ بچے ٹھسے رہتے ہیں۔ میاں بیوی بھی جوان لڑکی بھی جوان۔ جانے کیسے لوگ ہیں۔ اور تو اور لڑکی تو بے حیائی کی بے حیا ہے۔ آوارہ لگتی ہے۔ نہاتی ہے تو غسل خانے کی کھڑکی تک بند نہیں کرتی۔ اور نہانے کے بعد گھنٹوں تو چھت پہ لہک لہک کر بال سکھایا کرتی ہے۔ اور ادھر نہ جانے دیدے پھاڑ پھاڑ کر کیا گھورتی رہتی ہے مجھے تو جب سے آئی ہے زہر لگتی ہے۔ سن لینا کبھی۔ نکل جائے گی۔ کسی کے ساتھ۔"

اب راشد صاحب کی سمجھ میں آگیا کہ انہیں پردے میں کیوں رکھا

جا رہا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ان کی سمجھ میں آگیا اتنے کھلے ہوتے بھید کو وہ کب سے پانے کی کوشش کر رہے تھے یہی ایک بھید نہیں بلکہ دوسرا بھید بھی کھلا۔ پان لگاتے لگاتے نجمہ بیگم نے چھوٹی لڑکی صفیہ کو پکار کر کہا۔

"ذرا سروتا پرے کمرے سے لے کر آنا"

جب صفیہ سروتہ رکھکر پلٹنے لگی تو اچانک اس نے ماں کے سر پر انگلی رکھکر کہا:۔

"امی ایک اور سفید بال"

یہ سنتے ہی نجمہ بیگم نے ڈھلکا ہوا دوپٹہ سر پر ڈال لیا صفیہ اس طرح خوش تھی جیسے اس نے ماں کو خوشخبری سنائی ہو۔ لیکن نجمہ بیگم نے تو جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ خود راشد صاحب بھی آنجانے سے بن گئے اور اسی وقت جی میں ٹھان لی کہ اب ڈاڑھی ضرور رکھ لیں گے!

(بشکریہ شمع دہلی)

نظر خورجوی ●

جا پہونچے قافلہ نظر اب دیکھئے کہاں
نا آشنائے راہ ہے خود میرِ کارواں

دل! تیری آہ سے تو قیامت بپا ہوئی
سمجھا تھا میں نے تجھ کو محبت کا رازداں

جینے کا ہے یقیں نہ تعیّن ہے موت کا
پھر ایسی زندگی میں ہو کیا کوئی شادماں

زینت میں گلستاں کی اضافہ کرینگے ہم
اللہ نے دیا جو کبھی ہم کو آشیاں!

کر دے گا سوزشِ دلِ برقِ تپاں کو سرد
گلشن کے کام آئے گا جل کر بھی آشیاں

شبنم سبحانی ●

آکاش میں تاروں کی ڈھر آج ہے پھیکی
کیا بات ہے کچھ بزمِ قمر آج ہے پھیکی

مغموم ہیں بے کیف ہیں قدرت کے نظارے
تابانیٔ خورشیدِ سحر آج ہے پھیکی !!

کل تک تو ہمیں تھے تری آنکھوں کے ستارے
کیوں پیرِ مغاں ہم سے نظر آج ہے پھیکی

کل تک جو تھی رنگین جنوں والوں کے خوں سے
اے دوست وہی راہگذر آج ہے پھیکی

ہم کچھ نہ سہی، پھر بھی نہ ہونے سے ہمارے
اے دوست! تری رونقِ در آج ہے پھیکی

جو بات تھی کل تک مری شمشیر کی مانند
شبنم وہی بے سوزِ جگر آج ہے پھیکی

محمد خالد فاروقی

عارضِ گل گوں!

بارش کی ہلکی ہلکی پھوار نے نوجوان طبیعتوں میں ایک اُمنگ سی پیدا کر دی تھی۔ ایسے میں جاوید سے بھی نہ رہا گیا۔ موسم کی مناسبت سے اس نے گہرے رنگ کا سوٹ زیب تن کیا اور بے مقصد ایک ترنگ میں اپنی "بی۔ ایس۔ اے" سائیکل پر جس کو وہ بڑی احتیاط سے رکھتا تھا ایک طرف چل پڑا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ اور اس کی منزل کدھر ہے؟ مسحور کن موسم نے اسے گھر سے باہر کھلی فضاؤں میں پہنچا دیا تھا آج اسے اپنی "بی۔ ایس۔ اے" کی چال میں بھی انداز جنوں نظر آ رہے تھے تارکول کی دھلی ہوئی سڑکوں کے اتار چڑھاؤ پر پھسلتے ہوئے چلے جانے میں اسے خاص لطف آ رہا تھا وہ بے اختیار گنگنانے لگا اس کے چہرے سے طراوٹ اور آنکھوں میں گہرا اطمینان جھلک رہا تھا اس کا خیال تھا کہ اس وقت ذہن کے کسی پر سکون گوشہ میں بیٹھکر کافی کا ایک کپ اور کیپسٹن پینا اس کی بے قرار نگاہوں کے لئے خیال افزا ثابت ہوگا۔

ذیلین کی شمالی گیلری میں ایک کوچ پر بیٹھے ہوئے اس نے کافی کا آڈر دیا اور سگریٹ جلا کر ایک مبہم سی فکر میں کھو گیا لیکن بہت جلدی افق میں پھولی ہوئی شفق اور گیلری میں کھلے ہوئے سرخ گلابوں نے اس کے آوارہ خیالات کا دامن تھام لیا۔ اب اس کی جویائے جمال نگاہیں کبھی شفق کی سرخی اور کبھی گلاب کی رنگینی کا جائزہ لیتیں ابھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ دونوں میں سے کس کے حق میں اپنی رائے دے کہ ایک تیسری چیز نے اس کو سخت امتحان میں ڈالدیا اور وہ تھے جمیلہ کے عارضِ گل گوں......... اس کے خیالات فطرت کے معصوم مناظر کی سیر کرتے ہوئے اچانک ایک خطرناک موڑ پر چل پڑے اور اسے اس کی خبر بھی نہ ہوئی..... ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے ذہن میں کسی حسین مکڑی نے سنہری تاروں کا جالا بننا شروع کر دیا ہو..... جمیلہ کے بغیر اب اس کے لئے کسی چیز میں بھی دلکشی نہ تھی اس نے فیصلہ کیا کہ ایک بہر قیمت جمیلہ کو اپنا کر رہیگا..... لیکن .... شفق کی دوری اور گلاب کے کانٹوں کی طرح اس کے ذہن میں سرزوکی سکا دشمن ابھر آئی اس کے شفیق چچا کا پژمردہ چہرہ جنہوں نے اس کو یتیمی میں اپنے زیر سایہ لیا اور بیٹے کی طرح پالا پوسا تعلیم دلائی اور آج انہی کی سفارش سے وہ پورٹ ٹرسٹ میں آفیسر بنا ہوا ہے ساتھ ہی ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی منگیتر کا معصوم سراپا آکھڑا ہوا اور چچا کے الفاظ اس کے کان میں گونجنے لگے "بیٹا اب تو یہ تمہاری امانت ہے خدا ہمیں جلد اس فرض سے سبکدوش کرے........ لیکن .... جمیلہ......!

اس کے قد و قامت صحت مند جسم سرخ و سفید با شوکت چہرے کا تصور اس کے خیالات کے دھارے کو پھیر دیتا اور رفتہ رفتہ معلوم ہونے لگا جیسے اندر ہی اندر وہ کسی سے شکست کھا رہا ہے آج اس کو اپنی سیرت کا کھوکھلا پن بری طرح محسوس ہو رہا تھا اس کے کانوں میں اس کے ضمیر کی آواز بازگشت گونج رہی تھی۔ کیا تم احسان فراموش بن جاؤ گے اپنے محسن کی تمناؤں کا آسانی سے خون کر دو گے...... لیکن.....

پھر وہی جمیلہ کے عارضِ گل گوں کا خیال اس کو ایک نئی تاویل سوجھا دیتا اور اس کے ضمیر کی آواز گھٹتی ہوئی معلوم ہوتی احسان تو تم دوسری طرح سے اتار سکتے ہو عہد شکنی ضرور ہوتی ہے لیکن کیا زندگی تباہی کے گڑھے میں جھونکنا دانشمندی ہے...... پھر کرسمات کے اور میرے خیالات میں بھی تو زمین آسمان کا فرق ہے اگرچہ کہ وہ جدید تعلیم سے آراستہ ہے لیکن روشن خیالی تو اس میں ذرا نہیں۔ پردہ کی حمایت ہر وقت حرام حلال کی بحث آخر کیسے نبھے گی بھلا آخر ان باتوں کو کیوں سوچنے لگے لیکن انکار کے لئے بھی میری زبان کیسے ہل سکتی ہے میرا روآں رواں تو ان کا مرہونِ منت ہے لیکن جمیلہ بھی تو اس وقت میرے لئے ایک بڑی حقیقت ہے جس کو میں کیسے نظر انداز کر دوں...... کاش! جمیلہ میرے ہی لئے ہوتی اور اسماء کسی اور کے لئے حسین کس قدر موزوں ہے اسماء کے لئے۔

کچھ بھی ہو جمیلہ سے میرا رشتہ محبت نہیں کٹ سکتا لیکن

یہ استوار بھی کیسے ہو جہاں مرزا کی روشن خیالی معاون ہے وہیں اس کی
حریصانہ طبیعت اپنی لڑکی کی قیمت کا خوب اندازہ کرتی ہے جمیلہ کی
خاطر اس کی تسکین بھی کسی نہ کسی طرح کرنی ہی پڑے گی مرزا کو مکان کی
تعمیر کے لئے پانچسو روپے درکار ہیں اگر میں نے یہ احسان اس پر کر دیا تو
بہت کچھ راہ ہموار ہو سکتی ہے لیکن پانچسو روپے ! اُف ! اتنی بھاری
رقم آخر میں کہاں سے لاسکوں گا پورے گھر کے خرچ کے لئے تو یہ ڈھائی سو
بھی کافی نہیں ہوتے لیکن اس کے سامنے پانچسو کے عدد کے ساتھ ہی
رابرٹسن کمپنی کا منیجر علاؤالدین کے چراغ کے دیو کی طرح آ ابھرا...
بس ذرا ہی سا تو کام ہے کسی اندھیری رات میں اس کا مال سمندر میں
گرا دیا جاتے تاکہ وہ وقت پر نہ چھڑا سکنے کی وجہ سے کئی ہزار کی ڈیوٹی
سے بچ جاتے........ لیکن ..... یہ تو رشوت ہے ! اس کے
جسم میں اس خیال سے ایک کپکپی سی دوڑ گئی یہ تو اپنے ملک اور اپنی
قوم کے ساتھ بڑی خیانت ہے ۔ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں
جہنمی ہیں جہنم ! اف جہنم ! انگارے ، سرخ سرخ انگارے !.....
اس خونیں شفق کی طرح یا ان سرخ گلابوں کے سے ..... نہیں نہیں ،
جمیلہ کے آتشیں گالوں جیسے ..... آتشیں گال ! اوہ ! کتنا مزا آئیگا
ان دو انگاروں پر منہ .... اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اندر سے
کہہ رہا ہو۔ میں اس آگ میں جلنا چاہتا ہوں ایسی آگ میں ——
دھیمی دھیمی آنچ کتنی پر لطف :

وہ کافی پی چکا تھا سامنے نکلسن روڈ پر قمقمے جل اٹھے ۔ جاوید بازار
کی چمک دمک ، زرق برق موٹروں کی آمد و رفت اور عالی شان
دکانوں کی دیدہ زیبی میں کھویا ہوا تھا کہ سامنے کے بک اسٹال پر کھڑی
والی ایک چمکدار موٹر سائیکل نے اس کی توجہات کو اپنی طرف منعطف
کر لیا ۔ ایک نوجوان جوڑا موٹر سائیکل سے اترا اور بک اسٹال پر آویزاں
نیم عریاں میگزینس کا جائزہ لینے لگا اس منظر نے اس کے دبے ہوئے
جذبات کو ابھار دیا ۔ اس نوجوان جوڑے کو جدید وضع کے اس موٹر
سائیکل کی ایک ہی سیٹ اس قدر پیوستہ بیٹھے ہوئے دیکھکر ایک نئے
خیال نے اس کے ذہن میں جنم لیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ جمیلہ سے تعلقات
اور بے تکلفی بڑھانے میں اس طرح کی موٹر سائیکل نہایت موثر ہو سکتی
ہے ویسے اسے روز آنہ اسکول جانے کے لئے قطار میں گھنٹوں کھڑے رہنا
پڑتا ہے ! اور میری اس پیش کش کو وہ بآسانی قبول کر سکتی ہے کہ میں
روز آنہ اسے چھوڑتا ہوا چلا جاؤں لیکن —— آٹھ نو سو روپے آخر
وہ کہاں سے لاتے —— مرزا کو پانچسو الگ دینے پڑیں گے ....
رابرٹسن اینڈ کو کے منیجر کی یہ پیش کش بھی تو تھی اس کا پانچ ہزار
کا فائدہ ہو رہا ہے تو اسے کم از کم مجھے ڈیڑھ ہزار تو دینے چاہئیں ۔ اب
جاوید کے ذہن میں اس کی اسکیم مکمل تھی ۔

دوسرے ہفتے مرزا کے مکان کی ادھوری دیواریں بن کر مکمل ہو رہی
تھیں اب یہ معمول ہو گیا تھا کہ جمیلہ اسکول موٹر سائیکل پر جایا کرتی ۔
مرزا کے معاشی حالات ابتر تھے وہ اپنی بیٹی کے مستقبل کے بارے میں
مسرور تھا جمیلہ ہر روز کچھ نہ کچھ فرمائشیں کر بیٹھتی اور جاوید اس کو ٹال
نہ سکتا پھر اس نے سینٹرل ہوٹل میں ایک کمرہ بھی کرائے پر لے لیا تھا
جہاں دونوں اکثر فرصت کے اوقات اور تنہائی کے لمحات گذارتے تھے جمیلہ
کم سنی اور ماں بہنوں سے محرومی کے سبب پوری طرح جاوید کے جال میں
پھنس چکی تھی جاوید کے لئے ان اخراجات کو پورا کرنا ممکن نہ تھا اور وہ
رشوت لینے پر مجبور تھا ادھر اسماء نے اپنی تعلیم مکمل کر لی اور چچا نے
ایک دن اپنے خیال کا اظہار کر دیا اور دن و تاریخ بھی مقرر کر دی جاوید
کے لئے سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ادھر جمیلہ نے گھر سے
نکلنا بند کر دیا جاوید اس سے گھر پر ہی ملاقات کرتا۔ آخر جمیلہ نے
ایک دن آنسو بہاتے ہوئے جاوید سے کہا کہ اب تمہارے عذر بہانے
میں برداشت نہیں کر سکتی تمہاری وفاکیشی کا تقاضا ہے کہ تم نے
جس طرح میری زندگی بوجھل کر دی ہے اب اس کو سہارا دینے میں میرا
ہاتھ بٹاؤ ! جاوید اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکا وہ سخت کشمکش و پیچ
میں مبتلا تھا اسے کوئی راہ سجھائی نہ دے رہی تھی

اسماء سے شادی کی تاریخ سر پر آگئی ایک ہی دن تو بیچ میں
رہ گیا تھا —— ایک نا معلوم سا خوف سے اس کا دل بیٹھا جا رہا
تھا اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے تاریکی میں کوئی آفت اس کی طرف
رینگ رہی ہے ۔ اف ! یہ شام کتنی پر ہول ہے کالی کالی گھٹائیں ۔
گرج ، بجلیاں ، طوفانی موجیں اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے

ساری کائنات اس سے برہم ہے آج وہ شام کی ڈیوٹی پر تھا موٹر بوٹ میں بیٹھے ہوئے اسے ٹھنڈ لگ رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی کشتی کو خوفناک سمندر کی تاریکی میں ڈبونے کے لئے بیچ سمندر سے ایک موج اٹھائی جائے۔ آج اسے ڈیوٹی سخت دوبھر معلوم ہو رہی تھی لیکن کیا کرے روپے کی سخت ضرورت تھی آخر اس نے ایک مسافر سے عجلت اور ضرورت کے پیش نظر ضروری احتیاطوں کو نظر انداز کر کے۔ رشوت لے ہی لی اور اسے پتہ نہ تھا کہ اس کے مشکوک رویئے کی بناء پر سی آئی ڈی نے ایک پلان کے تحت رشوت دلائی ——— وہ موقع پر دھر لیا گیا اس کمثائی نے جاوید کے نشہ کو پوری طرح ہرن کر دیا تھا جمیلہ کے عارض گل گوں دہکتے ہوئے شعلوں کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے ناچ رہے تھے ——— اسی صبح مرزا کے مکان کے قریب ایک الکٹرک پول سے اخبار میں لپٹی ہوئی ایک نوزائیدہ بچی کی لاش لٹک رہی تھی جس کی خوبصورت سی نازک گردن پر کسی ظالم ہاتھ کے نشانات ابھر آئے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس معصوم چہرہ پر منجمد نقوش راہگیروں سے پوچھ رہے ہوں کہ بتاؤ آخر میں کس جرم میں ماری گئی ؟

(حلقہ ادب اسلامی کراچی میں پڑھا گیا)

بقیہ مضمون صفحہ ۲۹ سے آگے :-

" وہ اس لئے کہ تم عورت ہو اور ہر چیز کو کریدنے کی عادی ہو میں مرد ہوں اور کہتا ہوں کہ روپیہ رکھ لو۔ اور سامان باندھ لو۔ اس بار قسمت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم لوگ " بلکٹ " پہنچ کر ناشتہ کریں گے ——— "

" دی بگ بک آف گریٹ شارٹ اسٹوریز سے "

(ادارۂ ادب اسلامی گورکھپور میں پیش کیا گیا)

(بشکریہ " معیار ")

بقیہ مضمون صفحہ ۴۸ سے آگے :-

خالد رحمانی صاحب نے گھر آ کر دیوان اور ناول نذرِ آتش کر دیئے، اور شعر و ادب سے تائب ہو کر کفش دوزی کا پیشہ سیکھنے لگے۔ ان کی دکان پر یہ کتبہ آویزاں دیکھا جا سکتا ہے۔

کمالِ کفش دوزی علم افلاطوں سے بڑھ کر ہے
یہ وہ نکتہ ہے جسے جس کو مشائی نہ اشراقی

تصنیف: ٹالسٹائی
ترجمہ: غلام عباس

گنہگار

پچھلے زمانہ میں ایک شخص تھا جس نے اپنی زندگی کی ستر بہاریں فسق و فجور اور گناہوں کی آغوش میں گذار دی تھیں۔ اس کی تمام زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جو گناہ کا ارتکاب کرتے ہوئے نہ گذرا ہو۔۔۔۔
ایک بار وہ سخت بیمار ہوگیا لیکن پھر بھی اس نے اپنے گناہوں سے توبہ نہ کی صرف وقت نزاع، جبکہ وہ جام اجل کو لبیک کہنے والا تھا۔ رو پڑا اور خدا کی بارگاہ میں دعا کی:۔

"اے اللہ مجھے معاف کردے، جیسے تونے چوروں اور گنہگاروں کو صلیب پر معاف کردیا تھا۔"

اور جونہی اس نے یہ الفاظ اپنی زبان سے نکالے، اس کی روح جسد خاکی سے پرواز کر گئی۔ اور خدا کی محبت اور اس کی رحمت کے نشے میں سرشار جنت کے دروازے کی طرف گئی جہاں پہنچکر اس نے دستک دی اور جنت میں داخل ہونے کی اجازت طلب کی۔

اندر سے آواز آئی:۔

"کون ہے جو جنت کے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور اس کے اعمال کیسے ہیں؟"

منکر نکیر نے اس کے گناہوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس نے زندگی میں ایک بھی نیک کام نہیں کیا۔

یہ سن کر اس آواز نے گرج کر کہا:۔

"آگے جاؤ۔ گنہگار جنت میں داخل نہیں ہوسکتے۔"

تب گنہگار نے کہا:۔

"اے میرے آقا۔ میں تیری آواز سنتا ہوں لیکن تیرے رخ مبارک کو نہیں دیکھ سکتا۔ اور نہ ہی میں تیرا نام جانتا ہوں۔"

آواز نے جواب دیا:۔

"میں پیٹر ہوں۔"

تب گنہگار نے کہا:۔

"اے پیٹر، مجھ پر رحم کر! خدا کی رحمت اور انسان کی کمزوریوں کو یاد کر۔ کیا تو عیسیٰ ابن مریم کا پیرو نہیں تھا؟ کیا تو نے اس کی زبان نیک کام کرنے کی تلقین نہیں سنی تھی؟ اور کیا تیرے پیش نظر اس کی پاک اور صاف سیرت قابل مثال نہیں ہے۔۔۔۔ یاد کر وہ وقت جبکہ وہ غمگین اور خوفزدہ تھا اور اس نے تین بار تجھے رات بھر جاگنے اور عبادت کرنے کی تاکید کی تھی۔ لیکن تو نے اس پر کان نہ دھرا کیونکہ تیری آنکھیں نیند کے بوجھ سے بھاری ہو رہی تھیں۔ اور اس نے تجھے تین مرتبہ محو خواب پایا تھا مجھ سے بھی ایسی ہی حرکت سرزد ہوئی تھی۔ یہ بھی یاد کر کہ کس طرح تو نے موت تک اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن جب اسے وقت کے ..... مطلق العنان حکمران صلیب پر چڑھانے کے لئے لیجا رہے تھے تو تو نے ایسے کٹھن مرحلے میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ مجھ سے بھی ایسی ہی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ اور یاد کر وہ وقت بھی جبکہ تو نے صبح ہوجانے پر بستی سے دور جاکر سخت گریہ وزاری کی تھی۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ تو مجھے جنت کے اندر داخل ہونے سے ہرگز نہیں روک سکتا۔"

جنت کے دروازے کے پیچھے سے آنیوالی آواز اب بالکل خاموش تھی۔

گنہگار نے تھوڑی دیر صبر کرنے کے بعد دروازے پر پھر دستک دی اور جنت میں داخل ہونے کے لئے التجا کی

اور اس نے دروازے کے پیچھے سے ایک دوسری آواز سنی:۔

"کون ہے اور اس کے اعمال کیسے ہیں؟"

منکر نکیر نے آواز کے پوچھنے پر اس کی زندگی کے گناہوں کی فہرست دہرائی جس میں گناہ کے سوا ایک بھی نیک کام کا ذکر نہیں تھا۔

"آگے جاؤ، گنہگار ہمارے ساتھ جنت میں نہیں رہ سکتے۔"

گنہگار نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

"میرے آقا۔ میں تیری آواز سنتا ہوں، لیکن تیرا چہرہ مبارک نہیں دیکھ پاتا۔ اور نہ ہی میں تیرا نام جانتا ہوں۔"

"میں پیغمبر اور بادشاہ داؤد ہوں۔"

گنہگار نہ تو مایوس ہوا اور نہ ہی جنت کے دروازے سے ٹلا۔ اس نے کہا۔

"اے داؤد بادشاہ مجھ پر رحم کر! خدا کی رحمت اور انسان کی... کمزوریوں کو دیکھ۔"

"خدا کا تو پسندیدہ تھا اور اس نے تجھے تمام انسانوں پر بزرگی اور برتری عطا کی تھی۔ تیرے پاس عیش و آرام کے لئے سب کچھ تھا۔ بادشاہت، عزت، کثرت مال، بیویاں اور اولاد تھی۔ لیکن تیرے دل میں ایک بار گناہ نے گھر کر لیا تھا۔ تو نے اپنے مکان کی چھت سے دوسرے مکان کی چھت پر ایک شخص کی خوبصورت بیوی دیکھی تھی تو تو نے اسے حاصل کرنے کی غرض سے اس کے خاوند کو تلواروں کے ایک ہی وار سے پیوند خاک کروا دیا تھا۔ مجھ سے بھی اسی قسم کی لغزشیں سرزد ہوئی تھیں یاد کر کس طرح تو نے توبہ کی تھی اور کس طرح یہ کہا تھا "اے اللہ، میں نے بے شک ظلم کیا۔ میرے گناہ ہر وقت میرے سامنے ہیں اور مجھے ہر وقت احساس دلا کر شرمسار اور نادم کرتے ہیں، میں نے بھی ایسی ہی توبہ کی تھی لہٰذا تو مجھے اندر داخل ہونے سے نہیں روک سکتا۔"

اور اب دروازے کی پشت سے آنیوالی آواز خاموش تھی

گنہگار نے کافی دیر انتظار کر کے دوبارہ دستک دی اور جنت میں داخل ہونے کی التجا کی، اور پھر ایک تیسری آواز نے اندر سے کہا۔

"کون ہے یہ شخص اور اس نے اپنی زندگی دنیا میں کیسے گزاری ہے"

اور منکر نکیر نے اس کے گناہوں کی لمبی چوڑی فہرست تیسری بھائی، تو کہ تو نے زندگی میں کوئی بھی کام سر انجام نہیں دیا۔

"یہاں سے چلے جاؤ۔ گنہگار جنت میں داخل نہیں ہو سکتے۔"

اور گنہگار نے پھر عرض کیا۔

"اے میرے آقا۔ میں تیری آواز سنتا ہوں لیکن تیرا چہرہ مجھ سے روپوش ہے اور مجھے تیرا نام بھی نہیں معلوم۔"

تب آواز نے کہا۔

"میں یحییٰ۔ عیسیٰ کا ہر دلعزیز دوست یا پیرو ہوں۔"

اور گنہگار نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"تب مجھے ضرور جنت میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی۔ پیغمبر اور داؤد مجھے اس لئے اندر داخل ہونے سے نہیں روک سکتے۔ وہ خدا کی رحمت اور انسان کی کمزوریوں کو خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ تو مجھے اپنے اندر داخل ہونے کی اجازت دے گا کہ تو خدا کی مخلوق سے سب سے زیادہ پیار اور محبت کرنے والا ہے۔ کیا تو وہی نہیں ہے کہ انجیل میں تحریر ہے جس نے لکھا تھا۔ خدا محبت ہے اور یہ کہ جو خدا کی مخلوق سے پیار نہیں کرتا وہ خدا کو نہیں پہچان سکتا کیا تم نے اپنے آخری ایام میں لوگوں سے یہ کہا تھا "بچو ایک دوسرے سے پیار کرو" تب تو کس طرح مجھے حقارت اور نفرت سے دیکھ سکتا ہے اور جنت میں داخل ہونے سے روک سکتا ہے یا تو تو اپنے کہے ہوئے الفاظ کو واپس لے لے اور صاف صاف کہہ دے کہ جو کچھ تو نے کیا تھا وہ سب غلط کیا تھا۔ یا مجھے پیار کرتے ہوئے جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے۔

گنہگار کے یہ کہتے ہی جنت کے دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے اور یحییٰ نے گنہگار کو گلے لگا لیا اور اسے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیں۔ منیجر

مسرور قریشی

دو غزلیں

ہم اگر خود سنور نہیں سکتے
منزلوں سے گذر نہیں سکتے

کہہ رہی ہے شہادتِ اخوان
تیرے دیوانے مر نہیں سکتے

تم نے کانٹے بچھا دیئے تو کیا
قافلے اب ٹھہر نہیں سکتے

تو مسیحا سہی مگر اے دوست!
زخم سینے کے بھر نہیں سکتے

راہ تاریک راہبر گمراہ
پار بیڑے اتر نہیں سکتے

لاکھ منڈلائیں آندھیاں مسرور
چار تنکے بکھر نہیں سکتے

کاش سمجھیں وہ ان اشاروں کو
گل سے نسبت رہی ہے خاروں کو

سبزہ پامال پھول افسردہ!
جانے کیا ہو گیا بہاروں کو

تارے ڈوبے سحر ابھر آئی
نیند آئی نہ غم کے ماروں کو

نوح و طوفاں میں اک کشاکش ہے
کچھ خبر ہی نہیں کناروں کو

شبِ غم کس کے دل پہ کیا گذری
کیا خبر ڈوبتے ستاروں کو

لوگ خود ہی بنے ہیں دیوانے
کوئی تہمت نہ دے بہاروں کو

ذکرِ بیداد چھیڑ کر مسرورؔ!
اور بھڑکا دیا شراروں کو

غضنفر رفیق

اعتبار

کتنی اندھیری رات تھی وہ۔ شہر کے تمتے برسات کی ایک مسلہ کن یلغار کے باعث دھندلائے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر پانی چھوٹی چھوٹی نالیوں کی شکل میں بہہ رہا تھا ہوائیں بہت سرد لیکن لطیف آور تھیں۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور بالکنی کی ریلنگ پر ہاتھ ٹکاتے۔ سامنے ٹھہرے بہتے پانی پر تھرکتی ہوئی بجلیوں کو دیکھنے لگا ہر طرف سہما سہما سا سناٹا رہا تھا۔ سامنے والی کوٹھی کے آگے کھڑے ہوتے نیم کے پتے تالیاں بجا رہے تھے۔ قریب کی دیوار سے نکلا ہوا کل آنسو بہا رہا تھا۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹرٹراتے ہوئے حشرات الارض یا تو احتجاج کر رہے تھے یا برسات کی آمد پر خوشیاں منا رہے تھے مگر وہ اداس تھا مضطرب تھا۔ اس کی انگلیوں کے درمیان سگرٹ سلگ رہا تھا۔ اس کی پسلیوں کے اندر دل بھی تڑپ رہا تھا۔ جذبات پوری شدت سے سلگ اٹھے تھے۔ اسی لئے وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ پانی میں چمکتی ہوئی بجلیوں کو بے مقصد گھور رہا تھا

"میں آگئی" کسی نے سرگوشی کی۔ وہ چونک پڑا اور اندھیری بالکنی میں ادھر ادھر ٹٹولنے لگا۔ کوئی نہ تھا۔ پھر وہ سگرٹ کا ایک لمبا کش لیکر مسکرا پڑا۔ خلاء میں ایک تصویر ابھر آئی تھی۔ ایک حسین تصور۔ وہ بڑے غور سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ زہرہ نہ۔ اس کا خیال۔ کیونکہ زہرہ تو ہندوستان کے ایک گوشہ میں مدت سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے اس لمحہ اپنے آپ پر بڑا غصہ آیا اس نے زور زور سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ زہرہ۔ زہرہ میری بیوی ہو کر بھی ناقابل حصول ہے میں یونہی جلتا رہوں" نہیں نہیں اس نے آنکھیں بند کرلیں اور آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔ اس نے

آج محمود نے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ دس بجے اس کے ساتھ کلب چلے گا۔ محمود نے اسے لالچ دیا تھا کہ وہ کلب کی مارگریٹ نینی اور رخسانہ کو دیکھ کر زہرہ کو بھول جائے گا۔ بما بمیا۔ جب ہپ ہپ ہترا مارگریٹ رخسانہ اور نینی کے تصور سے پہلے ہی اسے پھر زہرہ کی صورت نظر آگئی۔ شادی کے ایک بعد والا واقعہ سے یاد آگیا اس روز زہرہ پہچانی نہیں جاتی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر معین کو ایک عجیب سا خیال آیا تھا اس نے حیران ہو کر کہا تھا کہ "کون جو تم زہرہ کی ممالبی پلکیں لرز اٹھی تھیں اس نے اس کے عجیب سے خیال کی تائید کی تھی" بھول گئے۔ میں تو اک ستارہ ہوں جو آسمان ..... پھر دونوں زور سے ہنس پڑے تھے۔

ایک دن زہرہ میکے گئی تھی۔ اس نے وہاں سے لکھا تھا "آپ بہت یاد آتے ہیں"

اس نے جواب دیا تھا" مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ تمہیں آسمان پر ڈھونڈتا رہتا ہوں زہرہ۔ تم جلد آجاؤ۔ ہمیں لیلیٰ مجنوں کے قسم کی محبت نہیں کرنی چاہیے۔ ہم تو جیون بھر کے ساتھی ہیں زہرہ" پھر زہرہ آگئی تھی۔ اس کی زندگی کے اندھیرے آسمان پر ستارہ نکل آیا۔ اس نے کہا" زہرہ اب تم کہیں مت جاؤ"

ایک رات۔ وہ بہت دیر سے گھر لوٹا تھا۔ سب سو چکے تھے۔ اس نے کمرے کی بتی جلائی۔ میز پر کھانا رکھا تھا اور زہرہ قریب ہی سر جھکائے اونگھ رہی تھی۔

"تم جاگ رہی ہو" معین نے حیرت سے کہا کیونکہ اس مشینی دور میں بیوی کا خلوص بھی کاروباری سا بن گیا تھا۔ اسے زہرہ سے اتنی محبت کی امید نہیں تھی "تم سو کیوں نہیں گئیں زہرہ" "۔۔۔۔ اگر میں رات بھر نہ آتا تو"

وہ خمار بھری موٹی موٹی آنکھوں سے اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔" تو ۔۔ کیا غضب ہو جاتا۔ انتظار کر لیتی ۔"

"زہرہ" معین نے شدت جذبات سے مجبور ہو کر کہا تھا۔ "فرض کرو کہ میں اس وقت کسی گندی جگہ سے آرہا ہوں اور اگر میں تم سے کہدوں کہ فلاں مسجد میں وعظ تھا وہیں بیٹھا تھا۔ تو یقین کر لوگی۔ اعتبار آجائیگا؟"

زہرہ نے حسب معمول ہنس کر کہا تھا "فرض کیجئے۔ میں رشیدہ کے گھر کل رات میلاد شریف میں جانے کے بجائے کہیں ناچ گانے میں چلی جاتی اور اگر آپ سے کہدیتی کہ میں میلاد سن رہی تھی تو آپ کیا یقین کر لیتے ۔۔۔۔۔۔"

معین ہنسا تھا۔ "اگر تم کہتی کہ کل رات چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے تو بھی یقین کر لیتا۔ اعتبار جو ہے" زہرہ بھی ہنسی "درصل اعتبار ہی سب سے بڑی چیز ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ میری محبت آپکے پیروں کو غلط راہ میں نہیں دکھا سکتی۔ اس وقت میں نے دل ہی دل میں پورے خلوص سے دعا مانگی تھی کہ خدا اسے کبھی بھی بے وفائی کی راہ پر نہ جانے دے۔ اور اس دن سے لیکر آج کے دن تک وہ اپنے ارادے میں پکا تھا لیکن محمود کی رنگین باتوں نے اسے زہرہ کا پاکیزہ تصور چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے بجائے اس کے آگے مارگریٹ، بٹی اور رخسانہ آگئے تھے۔

فضا میں اداسی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کراچی کی ناقابل بھروسہ برسات گو کہ ایک ہی ریلے کے بعد دم توڑ چکی تھی لیکن ہوائیں بڑی سرد تھیں۔ سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے زیادہ دیر نہیں جاگنا چاہیئے کیونکہ ہلکے ہلکے جھونکے اس کے بوجھل پپوٹوں کو آہستہ آہستہ تھپکیاں دے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد کسی گھڑیال نے دس بجاتے وہ چونک پڑا۔ کیواڑ پر کوئی دستک دے رہا تھا۔

"محمود" وہ آہستہ سے بڑبڑایا "شاید محمود آگیا ہے تاکہ اسے کلب کی رومانی فضا سے متعارف کرا سکے۔ تاکہ میں مارگریٹ اور رخسانہ میں کھو کر زہرہ کی یاد کو بھلا دوں۔ پھر ڈانس۔ ناچ رنگ ۔۔۔۔۔ حسن کی بہتات۔"

"نہیں ۔ نہیں" یکایک وہ جوش سے بڑبڑایا "زہرہ مجھ سے بڑی دور ہے بہت دور۔ وہ تب تک نہیں آسکتی جب تک میں نہ بلواؤں۔ میں اسے فوری بلواؤں گا۔ کیونکہ اب میں نوکر ہو چکا ہوں مجھے روزی مل چکی ہے میں اب اس قابل ہو چکا ہوں کہ زہرہ کے خوابوں کو پورا کر سکوں۔ لیکن زہرہ پھر بھی جانے کب آئے۔ ہزاروں میل دور ہے۔ تب تک چین نہیں۔ میں محمود کے ساتھ جاؤں گا۔ ورنہ یہ تنہائی مجھے مار ڈالے گی میں آج کلب ضرور جاؤں گا۔"

دستک کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ محمود نے اس کا نام لیکر پکارا۔ وہ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ زہرہ کا چہرہ ۔ معصوم چہرہ اس کے سامنے آگیا جو کہہ رہا تھا "درصل اعتبار ہی سب سے بڑی چیز ہے میرے سرتاج۔ اگر تمہیں مجھ پر اعتبار ہے ۔ مجھ سے محبت ہے تو تم کبھی بھی ایسی غلط راہوں پر نہیں چل سکتے جس کی منزل تباہی و بربادی ہو۔ اور جب آپ کے قدم اس راہ پر اٹھ سکتے ہیں تو پھر آپ کا اعتبار مجھ پر بھی پوری طرح نہیں رہے گا۔ کیوں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا!"

محمود کیواڑ پیٹے جا رہا تھا۔ اور زہرہ کا تصور چیخ رہا تھا "بتاؤ بتاؤ کیا تم نے ہزاروں میل دور مجھے اس لئے مقید کر رکھا ہے۔ کہ آزادی سے رنگ رلیاں مناتے رہو۔ اور میں پھر بھی تم پر اعتبار رکھوں۔ بھلا بتاؤ کیا یہ تمہارا انصاف ہے۔ جب خود تم گندگی میں گر جاؤ گے تو مجھے بھی اپنے ہی جیسا سمجھنے کتنی دیر لگے گی۔ پھر میری محبت۔ تمہاری چاہت۔ کیا اس کا وجود بھی رہے گا۔"

"ٹھیک ہے" تیز۔ تیر کی طرح ایک سرد جھونکا اس کے جسم سے ٹکرا کر بالوں میں انگلیاں پھیر گیا۔ اسکے دماغ میں ٹھنڈک کی ایک تیز لہر دوڑ گئی اس نے سوچا "ٹھیک ہے۔ زہرہ تم ٹھیک کہتی ہو میں نے ایک وقت کئی ہستیوں سے غداری کی کوشش کی تھی جس میں سے ایک میں خود تھا۔ ایک تم۔ اور ایک" اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔

محمود دستک دے دیکر واپس ہو چکا تھا۔ زرد قمقمے ایسے ہی دھندلا گئے تھے جیسے ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئی ہوں۔ نیم کا درخت خاموش تھا حشرات الارض بدستور ٹرٹرا رہے تھے۔ نلکے سے پانی ٹپک رہا تھا۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔

جذبات کی شدت سے اس کا گلا رندھ گیا۔ اسکی ہتھیلیاں رنگ پر جم سی گئیں اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔

صابرہ شیریں

"ستارہ" کا تاسیس نمبر

جیسے برسات کے موسم میں بوجھل تاریک بادلوں کی دراز سے جھانکتا ہی ننھا سا روشن تارا "تا حد امکاں اپنی پرنور کرنوں سے ظلمتوں کا سینہ چاک کر کے بھٹکے ہوئے راہ گیروں کو راستہ دکھانے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ ایسے ہی افق ادب پر طلوع ہونے والا یہ "ستارہ" اس زمانے میں بیشمار گمراہ کن رسالوں کے درمیان اپنی ضیا پاشیوں سے بھٹکتے ہوئے نونہالوں کی رہبری کر رہا ہے۔ اور اب تاسیس نمبر کی شکل میں اس روشن ستارہ نے ظلمتوں کے مقابلہ میں نور کی فتح کا عملی ثبوت پیش کر دیا ہے۔ آجکل پاکستان سے شائع ہونے والے بچوں کے تقریباً تمام رسالے محض تفریح اطفال کا کام انجام دیتے ہیں۔ اور یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ دیو پریوں، بھوتوں اور جادوگروں کی دلچسپ کہانیاں اپنے پیچھے کوئی ادبی تاثر، تعمیری پہلو، یا عمدہ نصیحت نہیں چھوڑتیں بلکہ توہم پرستی کا وسیع جال معصوم بچوں کے ننھے ذہنوں پر مسلط کر جاتی ہیں۔ جو ان کے ذہنی نشوونما اور ادبی ذوق کو ہمیشہ کے لئے مقید کر لیتا ہے۔ ستارہ نے اس دام گمراہی کو توڑ کر ایک ایسی آزاد فضا ایک صاف روشن ماحول پیدا کر دیا ہے۔ جو قوم کے نونہالوں کے ذہنی نشوونما کو صحیح راہ پر لگاتا اور ان کے ادبی ذوق کو نکھارتا ہے۔ اسکے پاکیزہ مضامین دلچسپ کہانیاں ندرت بیان کے ساتھ اپنے اندر بیش بہا مشورے عمدہ نصیحتیں اور پرخلوص پیغام پوشیدہ رکھتی ہیں۔ بچوں کو جدید ادب سے روشناس کرانے میں یاور تیغمان پیش پیش نظر آتے ہیں انکی کہانی "وہ اسکی ماں تھی" تاسیس نمبر کی کہانیوں میں سب سے افضل ہے۔ اتنی آسان زبان میں ایسے اچھوتے انداز اور جدید طرز کی کہانی لکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایسی ہی پاکیزہ کہانیاں اپنے پیچھے کوئی تعمیری اثر چھوڑ سکتی ہیں۔ محمد محسن کی کہانی "ایک کھیل" نہایت پر لطف طریقہ پر بچوں کو بے جا شرارتوں کے نتائج سے آگاہ کر دیتی ہے

نوید محمود خاں" میں پتہ کہتا ہوں، کے قہقہوں کے درمیان بچوں کے دل میں مبالغہ آرائی سے نفرت کے جذبات پیدا کر دیتے ہیں ..... نور عنایت اللہ کے "شیخ محمد" علم سے بے بہرہ ہونے کا مکمل نتیجہ بنکر سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ وہ کہانیاں ہیں جو قہقہوں کے پیچھے اچھی نصیحتوں کے ممت نقوش بچوں کے دل و دماغ پر چھوڑ جاتی ہیں۔ ادبی مضامین میں مولانا ارشد تھانوی کا مضمون "بچپن کی شاعری" حقیقتاً نثر سر سبد ہے نہایت آسان زبان میں ادبی شان و انداز میں بچپن کی شوخیوں کا عکس نہ صرف بچوں کے بلکہ بڑوں کے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ وحید اختر کا ایک خط کا دلچسپ جواب بچوں کو ادبی قدروں سے روشناس کراتا ہے مولانا ماہر القادری کا مضمون "میرا بچپن" اگرچہ بچوں کو قوم کے ایک مشہور و قد آور شاعر کے بچپن کے تھوڑے حالات سے آگاہی ضرور کرتا ہے لیکن بچپن کی شوخیوں اور دلچسپیوں سے خالی ہے۔ حالانکہ بچے فطرتاً ایسے ہی واقعات کو شوق سے پڑھتے ہیں .....

قیصر تقصری کا ڈرامہ "راہ کا پتھر" نہایت دلچسپ مفید اور ادبی لحاظ سے بلند ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میری عمر کے یا مجھ سے بڑی عمر کے ہر شخص کو بہت پسند آئے گا۔ لیکن افسوس کہ بہت زیادہ چھوٹے بچے اس میں کچھ خاص دلچسپی نہ لے سکیں گے کیونکہ یہ انکی ننھی سمجھ سے بالا ہی بالا رہے گا۔ حصہ نظم تقریباً سارا کا سارا مرصع ہے۔ بچوں کے شاعر شفیع الدین نیر نے مسلم لڑکی کی ایسی سچی اور پاکیزہ تصویر کھینچ کر رکھدی ہے کہ ہر لڑکی اسے پڑھ کر اس پاکیزہ سیرت کے لئے اپنے دل میں کشش اور احترام کا جذبہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے گی..... صہبا اختر "کھیلو ننھے بچوں کھیلو" کا پر کیف نغمہ سنا کے حقیقتاً قوم کے ننھے شیروں کے دل میں روح شجاعت بیدار کر دیتے ہیں۔

ابن انشار شریر ہمایوں کی عادتوں اور عجیب و غریب مشاغل کو نہایت دلچسپ انداز میں نظم کرنے کے بعد آخری شعر میں علم کی فضیلت اور اہمیت کا گہرا احساس بچوں کے دل پر مرتسم کر دیتے ہیں۔ آصف غیور کی نظم "ہم" شوخی سلاست اور روانی کا مرقع ہے۔ یہ نظمیں خوشگوار تاثرات کے ساتھ بچوں کی شاعرانہ صلاحیتوں کو نکھارتی اور ان کی اصلاح کرتی ہیں البتہ شعلہ آسیونی کی نعت "نقوشِ جاوداں" اگر ستارہ کے بجائے بڑوں کے کسی رسالہ میں شائع ہوتی تو زیادہ بہتر تھا — ہمایوں مسرور کی مسلسل کہانی "زمین کے نیچے" بہت مفید اور دلچسپ چیز ہے اس سے بچوں کو نہ صرف یہ کہ چیونٹیوں کے متعلق وسیع معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ یحییٰ اور ملکہ کی تقریروں کے ذریعہ اخلاق اور احساسِ فرض کا سبق بھی ملتا ہے اسلم غیور کا مضمون "گھر کی سیر" بچوں کے لئے معلومات کا خزانہ ہے۔ اس کے علاوہ "پھول اور کلیاں" کے عنوان سے ننھے بچوں کے مضامین شائع کر کے ان کی ہمت افزائی کی ہے یہ بہت مفید سلسلہ ہے اس سے بچوں کو اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے کا موقع ملتا ہے تحریری مقابلے سے بھی اسی قسم کے فوائد حاصل ہوتے بلکہ بچوں میں لکھنے کا شوق زیادہ پیدا ہوتا ہے — حقیقت یہ کہ اگر ایسے ہی چند اور "ستارے" افق ادب پر طلوع ہو جائیں تو آج یہ ننھے بچے جو کل ہماری قوم کے ستون ہونگے اچھے مذاق اور پاکیزہ نعرہ ساتھ ساتھ اپنے قلم کے صحیح استعمال پر بھی قادر رہیں گے۔ یہ ماہنامہ مجلس تعلیم ملی پاکستان ملیر سٹی کا ترجمان ہے۔

سالانہ چندہ چار روپے۔

JANUARY, 1956 PHONE REGD. No. S. 13

MONTHLY 'MUSHIR' KARACHI

Only Title Printed by Paragon Printers, Bunder Road, karachi-1

ساون کی مدھری فضاؤں میں
جوانی کی امنگیں اور
خوشی کے جھولے
فیمیلن
کے شکر گزار ہیں
حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی سے طلب کیجئے

ترتیب

پاکستان کا واحد پاکیزہ اردو ڈائجسٹ

(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ماہنامہ مشیر کراچی

ٹیلی فون: ۷۹۲۳۳

جلد: ۷ شمارہ: ۲

فروری ۱۹۵۶ء

مرتبہ

عبدالغفور بیگ

بدل اشتراک: فی پرچہ: آٹھ آنے

سالانہ: پانچ روپے

بھارت میں ترسیل زر کا پتہ:

پندرہ روزہ "الحسنات" رام پور (یو پی) بھارت

پرنٹر پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ مشیر بندر روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہمارا دستور

۹ جنوری ۱۹۵۶ء کے روز نئے دستوری مسودہ کی اشاعت نے "بے دستوری" کے اس جمود کو جو ملک کی دستوری زندگی پر گزشتہ ساڑھے آٹھ سال سے چھایا ہوا تھا، توڑ کر پاکستان کی سیاسی زندگی کو پھر سے متحرک کر دیا ہے۔ اس ملک میں ترتیب دستور کے سلسلے میں گزشتہ ساڑھے آٹھ سال سے ایک کشمکش جاری ہے۔ جس کے نتیجہ میں ملک کو مختلف قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑا اور بعض ایسے ایسے خطرناک مراحل سے بھی گزرنا پڑا جن کی وجہ سے بعض اوقات یہاں نہ صرف جمہوریت بلکہ اس ملک کا مستقبل بھی تاریک نظر آنے لگا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ طاقت کے نشہ میں ہوسِ اقتدار نے شہنشاہیت کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔ "بے دستوری" کی اس تاریک اور مایوس کن فضا میں کسی ایسے دستوری مسودہ کا شائع ہونا جس سے ملک میں دستوری اسلامی اور جمہوری زندگی کی بحالی کے کچھ امکانات پائے جاتے ہوں یقیناً قوم کے لئے قدرے اطمینان کا سانس لینے کا باعث ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ چند خود غرض اور مفاد پرست حلقوں کو چھوڑ کر سارے ملک نے کسی نہ کسی رنگ میں اس دستوری مسودہ کا پُرجوش خیر مقدم کیا ہے۔

ہمارے خیال میں بھی بحیثیتِ مجموعی یہ ایک اچھا دستوری خاکہ ہے جسے ضروری اصلاحات کے ساتھ ملک اور قوم کے لئے مفید اور قابلِ قبول بنایا جاسکتا ہے۔ اس مسودہ دستور میں اسلامی اور جمہوری نقطۂ نظر سے خوبیاں اور خامیاں دونوں ہی موجود ہیں۔ اگر عوام اس کی خوبیوں کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی خامیوں کو دور کروانے کے لئے متحدہ جدوجہد کریں تو مناسب اصلاحات کے بعد یہ ایک اسلامی جمہوریہ کے لئے مثالی دستور بن سکتا ہے۔ اس دستوری مسودہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں قراردادِ مقاصد کو شامل کر کے ریاست کے راہ نما اصولوں میں اس ملک میں اکثریت کے ساتھ بسنے والی مسلمان قوم کے باشندوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنے کے لئے مناسب اقدامات کرنے کا عزم کا اظہار کر دیا گیا ہے اور یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہ کی جائے گی اور موجودہ قوانین کو بھی بتدریج قرآن و سنت کے مطابق ڈھال دیا جائیگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں اقلیتوں کے معاشرتی، تہذیبی اور مذہبی حقوق کی حفاظت کی بھی پوری ضمانت دے دی گئی ہے۔ یہ خوبی جمہوری اور اسلامی ہر دو نقطۂ نظر سے قابلِ ستائش ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دستوری لحاظ سے یہ مسودہ جمہوریت کے عام تقاضوں کو بھی بڑی حد تک پورا کرتا ہے۔ پھر تیسری بات یہ ہے کہ پاکستان کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر اس میں مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کا زیادہ سے زیادہ مناسب توازن بھی قائم رکھا گیا ہے جو سرِدست ممکن تھا۔ لیکن ان خوبیوں کے باوجود یہ دستوری خاکہ بہرحال انسانی کوششوں ہی کا نتیجہ ہے اور کوئی ایسا حرفِ آخر نہیں ہے جو اصلاح کی ضرورت سے بے نیاز ہو۔ اس دستوری خاکہ میں متعدد ایسی خامیاں ضرور ہیں جو اسلامی اور جمہوری نقطۂ نظر سے تشویشناک حد تک قابلِ اعتراض بھی ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ ان خامیوں کو دور کرنے کے لئے معقول دلائل کے ساتھ جو تجاویز بھی پیش کی جائیں گی ان پر غور کرنے کے لئے ہمارے وہ رہنما جنہوں نے یہ خاکہ مرتب کیا ہے کھلے دل سے آمادہ ہونگے۔ ان دو صفحات میں اتنی گنجائش تو نہیں ہے کہ دستوری خاکہ کی ساری خامیوں کا کوئی تفصیلی جائزہ لے کر ان کے متبادل تفصیلی تجاویز پیش کی جاسکیں تاہم اجمال کے ساتھ اس سلسلے میں کچھ موٹی موٹی خامیوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

اس دستوری مسودہ کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ جہاں اس مسودہ میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنے اور قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہ بنانے کے اصولوں کو تسلیم کر لیا گیا ہے وہاں ان کے نفاذ کا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا گیا ہے جس کے تحت ان اصولوں پر عمل پیرا ہونا یا انہیں نظرانداز کر دینا حکمران جماعت کی مرضی اور اختیار میں ہے حالانکہ دستور کا تو اصلی مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ

میں ریاست کے معاملات کو چلانے کے لئے بنیادی اصول طے کر دیئے جائیں اور انتظامیہ اور مقننہ کو یہ اختیار نہ رہے کہ وہ ان اصولوں کی خلاف ورزی کر سکیں
دستور کی دفعہ ۲ اسلامی دستور کے مطالبے کی تکمیل کی بجائے اسے تعویق میں ڈالنے کی ایک کوشش ہے اس دفعہ کی اصلاح اس طرح کر دی جانی چاہئے۔ کہ ان
اسلامی دفعات کا نفاذ گو بتدریج ہو مگر لازمی ہو اسے کسی وقت اور کسی طرح بھی انتظامیہ یا مقننہ التوا میں نہ ڈال سکے۔ یا اسے نظر انداز نہ کر سکے۔

دستوری مسودہ کی دوسری بڑی خامی وہ غیر محدود اختیارات ہیں جو صدر ریاست کو سونپے گئے ہیں مسودہ پر ایک نظر ڈالنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
صدر ریاست کوئی انسان نہیں بلکہ ایک غیر مرئی طاقت ہے جو انتظامیہ کی ساری مشینری پر بیک وقت ہر جگہ چھائی ہوئی ہے مسودہ دستور میں ایسے غیر محدود اور
ہمہ گیر اختیارات کو غیر مشروط طور پر ایک واحد شخصیت میں مرتکز کر دینے سے ملک میں بآسانی ڈکٹیٹر شپ قائم ہو جانے کے قوی اندیشے اور خدشے پیدا کر دیئے گئے ہیں جنہیں کسی
نہ کسی طرح دور کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً صدر ریاست کو اسمبلی توڑنے کا اختیار نہ دیا جائے۔ اور وزیر اعظم اس وقت تک اپنے عہدے پر قائم رہے جب تک اسے اسمبلی
کا اعتماد حاصل رہے اگر صدر ریاست کسی وقت ہنگامی صورت حال کا اعلان کرے تو بنیادی شہری حقوق کی حفاظت کے اختیارات سپریم کورٹ کو پہنچنا چاہئیں۔ اور
سپریم کورٹ کو یہ بھی اختیار ہونا چاہئے کہ ہنگامی حالت کے اعلان کے بعد اس کے جواز کے متعلق مقدمات سن سکے۔ ہائی کورٹ کے ججوں کے تقرر کے سلسلے میں گورنر
سے مشورہ والی تجویز بھی عدلیہ کی آزادی کے منافی ہے جسے حذف کر دینا چاہئے۔ اس کے علاوہ جہاں مارشل لاء کو باقاعدہ طور پر دستور میں شامل کر لیا گیا ہے وہاں اس
کے حدود کار پر مناسب پابندیاں بھی متعین ہونی چاہئیں اور فوجی عدالتوں کے مقدمات کے خلاف اپیلیں سننے کا حق بھی سپریم کورٹ کو اسی طرح ہونا چاہئے جس طرح اسے ملک کی
دوسری عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں سننے کا حق حاصل ہے۔ ان اہم امور کے علاوہ مسودہ دستور میں متعدد خامیاں اور بھی ہیں۔ جو تفصیلی طور پر مختلف
حلقوں اور اداروں کی طرف سے پریس میں زیر بحث لائی جا رہی ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ حکمران طبقے کو کسی ایسی خامی کو دور کرنے اور کسی ایسی تجویز کو قبول کرنے
میں تامل نہ ہوگا جو معقول دلائل کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔

دستوری مسودہ کے اس اعلان نے کہ پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ ہوگا اور اس میں کتاب و سنت کے خلاف کوئی قانون نافذ نہ کیا جائیگا صرف اندرون
ملک ہی مسرت کی لہر نہیں دوڑا دی بلکہ عالم اسلام کی توجہات کو بھی اپنی طرف مرکوز کر لیا ہے۔ دوسرے مسلمان ممالک میں بھی ہمارے اس اعلان کا پُرجوش خیر مقدم
کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت پورے عالم اسلام میں کتاب و سنت کی طرف لوٹنے کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے اور وہ ایک ایسی رہنمائی اور قیادت کا
شدت سے انتظار کر رہا ہے جو اسے تمام راستوں سے ہٹا کر اسلام کے راستے پر گامزن کر دے اور سارے آستانوں سے کھینچ کر صرف ایک اللہ کے آستانے پر جھکا دے
ہر جگہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تحریکیں ابھر رہی ہیں اگر پاکستان میں ہم اس تجربہ میں کامیاب ہو گئے تو دوسرے مسلمان ممالک میں بھی ان تحریکات کو کامیابی سے ہمکنار
ہونے میں مدد ملے گی۔ اس وقت اسلام کو بحیثیت ایک نظام حیات کے غالب آنے میں جو سب سے بڑی مشکل حائل ہے وہ یہ ہے کہ ان ممالک میں جو گروہ برسر اقتدار ہیں انہیں
یقین نہیں ہے کہ آج کی دنیا میں اسلام ایک کامیاب نظام حیات کی صورت میں چل سکتا ہے اور اس یقین سے محرومی کی بدولت وہ اسلامی تحریکات کو کچل رہے ہیں یا ان
کے راستے میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں اگر ہم اس تجربہ میں کامیاب ہو گئے تو نہ صرف دوسرے اسلامی ممالک میں ان تحریکات کو تقویت پہنچے گی بلکہ برسر اقتدار گروہ کو اپنی آنکھوں
سے یہ کامیاب تجربہ دیکھ کر یقین ہو جائیگا کہ اسلام ہی مسلمانوں کی مشکلات و مسائل کا واحد حل ہے۔ پاکستان جب عالم وجود میں آیا تھا تو سارے عالم اسلام کی
نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں تھیں اور وہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ وہ جس قیادت کی ضرورت محسوس کر رہے تھے پاکستان اس کی اہلیت رکھتا ہے کیونکہ وہ اسلام
ہی کے نام پر عالم وجود میں آیا تھا اور اس کے بانی نے اپنی تقریروں میں بار بار کہا تھا کہ پاکستان کو اسلامی نظام حیات کا تجربہ گاہ بنایا جائیگا۔ مگر ان کی
وفات کے بعد ہمارے برسر اقتدار افراد نے مملکت کے مقصد قیام کو پس پشت ڈال کر یہاں جس قسم کے کھیل کھیلے انہوں نے اسلامی ممالک کو پاکستان سے مایوس
کر دیا اور وہ نگاہیں جو رہنمائی حاصل کرنے کے لئے ہماری طرف اٹھی تھیں عالم مایوسی کا شکار ہو گئیں۔ اب جبکہ پھر ہم ایک مسودہ دستور پیش کر کے ان عزائم
کا اعلان کر رہے ہیں جنکو پورا کرنے کے لئے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا تو مسلمان ممالک کی نگاہیں پھر ہماری طرف اٹھنے لگی ہیں اب یہ ہمارا کام ہے کہ ان نگاہوں
کو مایوس نہ ہونے دیں اور مسودہ دستور میں جو خامیاں رہ گئی ہیں انہیں دور کر کے ایک مثالی اسلامی مملکت کے تجربہ کو کامیاب بنائیں ●

اثر لکھنوی •

غزل

وہ عشرتِ چمن آرائیٔ خودی نہ رہی
حریفِ معنیٔ رنگیں جو زندگی نہ رہی

دعا سحر کی جو مانگی تو یوں قبول ہوئی
شبِ فراق ستاروں میں روشنی نہ رہی

دلِ خراب ہے، آشوب گاہِ بے تابی
ہوائے شوق چمن سازِ بے خودی نہ رہی

اب اس کے بعد گلہ کس سے کیجئے کس کا
کہ جلوہ چینِ نظر، تابِ دیدگی نہ رہی

تری خوشی تو ہوئی عشق آرزو دشمن
بلا سے لذتِ آہِ سحر گہی نہ رہی

بہار آئی ہے، ایسی بہار، کیا کہیے
گلوں میں رنگ، شگوفوں میں تازگی نہ رہی

نہ جانے کونسی خواہش کی دل سے رخصت ہے
وہی چراغ ہے لیکن وہ روشنی نہ رہی

متاعِ ہوش کی ہر چند ہے فراوانی
متاعِ ہوش کی اتنی کبھی کمی نہ رہی

نشاطِ جوشِ گل ہائے آرزو معلوم
دلوں میں دردِ محبت کی چاشنی نہ رہی

وہی ہیں رند، وہی میکدہ، وہی ساقی
مگر یہ کیا کہ مساوات پہلی سی نہ رہی

حیات جہدِ مسلسل کا زمزمہ ہے، سچ ہے
خطا معاف، وہ شانِ سپردگی نہ رہی

جن اشکِ تر میں اثرؔ تھی شراب کی مستی
وہی ہیں اشک مگر اب وہ سرخوشی نہ رہی

(بشکریہ منی نلین)

سید باقر علیم ●

خون کا جوش

باپ کی عمر تیس سال! بیٹے کی عمر تین سال!

آپ نے اس عمر کے باپ کو اتنی چھوٹی عمر کے بیٹے کے ساتھ ہر قسم کا بغض و عناد روا رکھتے..... دیکھا ہے؟ جی ہاں میں نے تو دیکھا ہے۔

برآمدے میں سب گھر کے لوگ کھانا کھا رہے تھے سجاد اپنی ماں کے پاس بیٹھا تھا۔ کھانا کم کیا کھا رہا تھا۔ ضد کر رہا تھا۔ "میں بھی اتنا ہی مکھن لوں گا جتنا چچا کو دیا ہے"۔ بھابی جان نے خاطر سے اس دن کا تقریباً سارا مکھن میرے اور بابر بھائی کے سامنے رکھ دیا تھا۔ بے چاری سجاد کے لئے اتنا مکھن کہاں سے لاتیں ٹال مٹول کرتی رہیں دفعتہً بابر بھائی کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے "اس لاڈلے کو میرے سامنے سے دور کرو ورنہ جان سے مار ڈالوں گا مکھن کھاتا ہے اپنی شکل نہیں دیکھتا"۔ سجاد بیچارہ سہم کر چپ ہو گیا۔ بھابی بھی رونے لگیں

بابر بھائی اور میں ایک درخت کے نیچے کرسیاں ڈالے گپ شپ کر رہے تھے۔ سجاد آ گیا اور کرسی پر چڑھ کر میری گود میں آ بیٹھا۔ اور کھیلنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ بابر بھائی کے کان سرخ ہو رہے ہیں مگر میرا اور سجاد کا تو پیار ہے۔ سجاد کو میں نے جسم کے اعضا کے انگریزی نام یاد کرانا شروع کر رکھا تھا۔ اس نے بڑے مزے میں آکر اپنا سبق دہرانا شروع کر دیا۔ ناک کو ہاتھ لگاتا اور کہتا نوز۔ میری آنکھ کو چھوتا اور کہتا آئی..... ایر...... لپ۔ بابر بھائی کے کان بہت سرخ ہو گئے۔ ضبط نہ کر سکے۔ زور سے چیخے: "دفعان ہو یہاں سے۔ ماں کو تو ٹھیک ٹھیک پنجابی بھی نہیں آتی بیٹے صاحب چلے ہیں انگریزی سیکھنے"۔ سجاد ہنس کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ایسے حادثات ہر روز پیش آتے رہتے۔ کوئی اجنبی آدمی یہ دیکھ کر نہیں کہہ سکتا تھا کہ بابر بھائی اور سجاد کا باپ بیٹے کا رشتہ ہے۔

ایک دن میں اور بابر بھائی مروجہ طریق تعلیم پر گفتگو کر رہے تھے۔ "دیکھو نا! یہی وجہ ہے کہ آج کل ہمارے یہاں بو علی سینا ابن خلدون حالی شبلی پیدا نہیں ہوتے۔ یہ لوگ بچوں کو غیر ضروری مضامین کا فضول کچرا ہی ہضم کراتے رہتے ہیں جو کسی کام کی نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں کوئی سپیشلسٹ پیدا نہیں ہوتا"۔ میں بابر بھائی کی تائید میں سر ہلاتا رہا۔ بات بڑھتے بڑھتے نہ جانے کیسے سجاد کی تعلیم تک پہنچ گئی۔ میں نے کہا "سجاد کو پہلے چار پانچ سال تو کسی کانونٹ سکول میں بھیجیں گے نا"۔ بابر بھائی نے مجھے فقرہ بھی مکمل نہ کرنے دیا: "نہیں نہیں ہوش کی بات کرو! تم نے کہاں پڑھا ہے میں نے کہاں پڑھا ہے جج صاحب نے کہاں تعلیم پائی ہے۔ ماسٹر فضل کریم والا گاؤں کا سکول سب سے اچھا ہے۔ تم ایسی باتیں کر کے اس کی ماں کا دماغ خراب نہ کرو..."

میں نے اپنی رائے کی تائید میں کچھ کہنا چاہا مگر بابر بھائی نے اس موضوع پر بات کرنے ہی سے انکار کر دیا۔

بابر بھائی جب سجاد کو گھر میں کھیلتے کودتے دیکھ لیتے، کوئی نہ کوئی آوازہ کسنا ضروری ہو جاتا "دیکھنا دیکھنا اس کی شکل بڑا ابنا سا کھڑا ہے فیروز میراثی کا بیٹا اس سے بہتر معلوم ہوتا ہے"۔ "سنو ذرا صاحبزادے کی آواز۔ جیسے چکارا بج رہا ہے۔ شٹ اپ......!"

بابر بھائی کی یہ عداوت زبانی زبانی ہی رہتی تو معاملہ نقصدہ نہ تھا مگر اس کا خطرناک عملی پہلو بھی تھا۔ دیکھئے نا باپ کی موٹر ہو اور بیٹے کو قطعاً بیٹھنے کی اجازت نہ ہو۔ اور اس پر طرہ یہ کہ محلے بھر کے ترچھے ٹیڑھے لونڈے اس میں سیریں کرتے پھریں۔ بابر بھائی جب شام کو موٹر باہر جاتے تو شبر کا ہتا ما گھر سے بلا کے لیجاتے۔ شبر ہمارا بھانجا ہے لوگ برابر والے مکان میں رہتے ہیں۔ شبر گھر سے غیر حاضر ہو تو کہتے اپنے دوست کے بیٹے امو کو بلانے کے لئے بھیج دیا۔ یہ دونوں لڑکے سجاد کے ہم عمر ہیں۔ بجد انداس جیسے بھولے ہیں، وہ پہلے سے نہ خوف

ہے تو ہم دونوں کو بابر بھائی کی موٹر میں دیکھ کر آگ لگ جاتی ہے جب موقع پاتا ہوں ان دونوں کو لال لال آنکھیں بھی دکھاتا رہتا ہوں۔ ویسے تو ویسے بھی ہمارے گھر میں کم گھستا ہے، بابر بھائی کے بلانے پر آتا ہے۔ مگر شبر کی ننھیال ہے۔ سو اکثر آتا رہتا تھا۔ مگر اب تو اس نے بھی آنا کم کر دیا ہے۔ اس تبدیلی کا میں ذمہ دار ہوں، شبر بڑا پیارا بچہ ہے، اور پھر بھانجا۔ مگر مجھے اس سے بابر بھائی کی وجہ سے خواہ مخواہ کا بیر ہوتا جا رہا تھا۔ سجاد میرے پاس بیٹھا تھا، اور بھلے برے سوالات کر رہا تھا۔ شبر آ گیا۔ بندوق دیکھ کر دوڑا دوڑا میرے پاس آیا "ماموں جان مجھے بندوق دیجئے۔ میں آپ کو چلا کر دکھاؤں" بچارہ بڑے ارمانوں کے ساتھ آیا تھا۔ میں نے بندوق کی نالی اس کے سینے پر رکھ دی۔ بچارہ بھونچکا سا رہ گیا" دیکھو شبر! اب اگر تم بابر بھائی کی کار میں بیٹھے تو میں گولی مار دوں گا" الٹے پاؤں روتا ہوا اپنے گھر بھاگ گیا۔ آپ یقین مانئے کہ میں نے تو مذاق کیا تھا۔ مگر میری بہن آج تک مجھ سے خفا ہے اور حتی الوسع شبر کو ہمارے گھر آنے نہیں دیتی۔

مگر ان سب کوششوں کے باوجود بابر بھائی کی زیادتیوں کا کوئی علاج نہیں۔ میں اکثر شام کو کار مانگ کر سجاد کو پھرا لاتا ہوں سجاد تو خوش ہو جاتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ بات پھر بھی نہیں بنتی۔

آپ کو اس عداوت کی وجہ بھی بتا دوں۔ بابر بھائی کے پاس گویا ایک دلیل ہے۔ مگر ہے بڑی بودی۔ یہ سب کچھ بھابی جان کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ بابر بھائی چھوٹے سے تھے تو ان کی منگنی ہو گئی تھی فوجی ملازمت کے سلسلے میں وہ باہر بہت سے ملکوں میں رہ آئے ہیں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے، تعلیم بھی اچھی خاصی ہے بھابی جان جیسی ان پڑھ اور گنوار بیوی انہیں کیونکر پسند آ سکتی ہے۔ پھر سنا ہے سنگاپور میں ان کا کبھی کچھ "دانفیئر" بھی تھا۔ شادی کے لئے بہت عرصے ٹال مٹول کرتے رہے مگر والدہ صاحبہ کی ضد آخر کار جیت گئی اس میں کوئی شک نہیں کہ بھابی جان اور بابر بھائی کا کوئی جوڑ نہیں۔ لیکن اس میں سجاد کا کیا قصور ہے۔ میرا نقطۂ نظر ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ بابر بھائی کو شادی نہیں کرنی چاہیئے تھی، کر لی ہے تو نبھانی چاہیئے۔ اور پھر سوال یہ ہے کہ سجاد اس قسم کے سلوک کا کیسے مستحق سمجھ لیا گیا ہے۔

اس موضوع پر میں نے ایک آدھ مرتبہ بابر بھائی سے بات چیت بھی کی ہے مگر انہوں نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ بعض اوقات ایسی باتوں کا ان پر الٹا اثر ہوتا ہے ایک دوپہر کو ایسی ہی باتیں ہو رہی تھیں اتنے میں بھابی آ گئیں۔ ساتھ ہی سجاد بھی تھا اور وہ اس حال میں کہ تیل کی پوری بوتل اس کے بالوں میں انڈیل دی گئی تھی تر ہمیں رنگ نکلی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں کاجل تھا اور شاید گالوں پر کچھ پوڈر کریم کا استعمال بھی ہوا تھا۔ آئیں تھیں مجھ کو کہنے کہ سجاد کو لیجاؤ۔ باٹا سے اس کے لئے چپل خریدنا تھا۔ مگر سجاد بھائی نے ہم تینوں کی وہ گت بنائی کہ خدا کی پناہ ویسے اصولی طور پر میں بھی بناؤ سنگار کے متعلق بھابی جان کے نظریہ کا قائل نہیں مگر کیا کیا جائے۔ گاؤں میں انہوں نے یہی کچھ سیکھا تھا۔ بچے لاڈ پیار کا طرز بھی ان کا وہی پرانا ہے۔ میں نے کئی بار محسوس کیا کہ سجاد گالیاں سیکھ رہا ہے۔ دبی زبان سے بھابی جان کو بتایا بھی، مگر بے سود وہ تو سجاد سے اپنے اوپر گالیوں کی مشق کیا کرتی تھیں۔

اس کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ بابر بھائی کو سجاد سے جس قدر نفرت تھی اس سے کئی گنا زیادہ میں اس کا خیال رکھتا تھا مجھے ٹھیک طرح یاد ہے کہ میں نے اس پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ البتہ ایک دن ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میرے ہاتھوں کو بھی آلودہ کر دیا اور یہ واقعہ کئی لحاظ سے رکارڈ توڑ ثابت ہوا۔

دوپہر کا وقت تھا میں اور بابر بھائی کھانا کھا کر ان کے کمرے میں چلے گئے۔ بابر بھائی نے مضامین پطرس سے کوئی مضمون بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔ پطرس کے مضامین پڑھے جائیں اور ایک ہنگامہ نہ مچ جائے۔ فلک شگاف قہقہے لگ رہے تھے (میرے) نہایت بے ڈھنگی چیخیں بلند ہو رہی تھیں (بابر بھائی کی) میں کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ گھر کے سب لوگ اگلے پڑوسی کے گھر کسی تقریب میں شامل ہونے کے لئے گئے ہوئے تھے مجھے گلی میں سجاد کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ کوئی اور بچہ بھی تھا کسی بات پر تکرار ہو رہی تھی بڑی دلچسپ تکرار تھی۔ مگر اچانک سجاد نے نہایت بلند آواز میں حریف کو ایک بری گالی دی جلیبی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بابر بھائی

شہر کراچی

سید باقر علیم •

خون کا جوش

باپ کی عمر تیس سال ! بیٹے کی عمر تین سال !
آپ نے اس عمر کے باپ کو اتنی چھوٹی عمر کے بیٹے کے ساتھ ہر قسم کا بغض و عناد برداشت کرتے..... دیکھا ہے ؟ جی ہاں میں نے تو دیکھا ہے
برآمدے میں سب گھر کے لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ سجاد اپنی ماں کے پاس بیٹھا تھا۔ کھانا تو کیا کھا رہا تھا۔ ضد کر رہا تھا " میں بھی اتنا ہی مکھن لوں گا جتنا چچا کو دیا ہے " بھابی جان نے خاطر سے اس دن کا تقریباً سارا مکھن میرے اور بابر بھائی کے سامنے رکھ دیا تھا۔ بے چاری سجاد کے لئے اتنا مکھن کہاں سے لاتیں ٹال مٹول کرتی رہیں دفعتہً بابر بھائی کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے " اس لاڈلے کو میرے سامنے سے دور کر دو ورنہ جان سے مار ڈالوں گا مکھن کھاتا ہے اپنی شکل نہیں دیکھتا " سجاد بیچارہ سہم کر چپ ہو گیا۔ بھابی بھی رونے لگیں
بابر بھائی اور میں ایک درخت کے نیچے کرسیاں ڈالے گپ شپ کر رہے تھے۔ سجاد آگیا اور کرسی پر چڑھ کر میری گود میں آ بیٹھا اور کھیلنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ بابر بھائی کے کان سرخ ہو رہے ہیں مگر میرا اور سجاد کا تو پیار ہے۔ سجاد کو میں نے جسم کے اعضاء کے انگریزی نام یاد کرانا شروع کر رکھا تھا۔ اس نے بڑے مزے میں آ کر اپنا سبق دہرانا شروع کر دیا۔ ناک کو ہاتھ لگاتا اور کہتا نوز۔ میری آنکھ کو چھوتا اور کہتا آئی ..... ایر....... لپ۔ بابر بھائی کے کان بہت سرخ ہو گئے۔ ضبط نہ کر سکے۔ زور سے چیخے: " دفعان ہو یہاں سے۔ ماں کو تو ٹھیک پنجابی بھی نہیں آتی بیٹے صاحب چلے ہیں انگریزی سیکھنے، سجاد دبک کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ایسے حادثات ہر روز پیش آتے رہتے۔ کوئی اجنبی آدمی یہ دیکھ کر نہیں کہہ سکتا تھا کہ بابر بھائی اور سجاد کا باپ بیٹے کا رشتہ ہے۔
ایک دن میں اور بابر بھائی مروجہ طریق تعلیم پر گفتگو کر رہے تھے " دیکھو نا ! یہی وجہ ہے کہ آج کل ہمارے یہاں بو علی سینا ابن علاؤ حالی شبلی پیدا نہیں ہوتے۔ یہ لوگ بچوں کو غیر ضروری مضامین کی فضول کھچڑی ہضم کراتے رہتے ہیں جو کسی کام کی نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں کوئی سپیشلسٹ پیدا نہیں ہوتا " میں بابر بھائی کی تائید میں سر ہلاتا رہا۔ بات بڑھتے بڑھتے نہ جانے کیسے سجاد کی تعلیم تک پہنچ گئی۔ میں نے کہا " سجاد کو پہلے چار پانچ سال تو کسی کانونٹ سکول میں بھیجیں گے نا۔ بابر بھائی نے مجھے فقرہ بھی مکمل نہ کرنے دیا " نہیں نہیں ہوش کی بات کرو ! تم نے کہاں پڑھا ہے میں نے کہاں پڑھا ہے منج صاحب نے کہاں تعلیم پائی ہے۔ ماسٹر فضل کریم والا گاؤں کا سکول سب سے اچھا ہے۔ تم ایسی باتیں کر کے اس کی ماں کا دماغ خراب نہ کرو .... "
میں نے اپنی رائے کی تائید میں کچھ کہنا چاہا مگر بابر بھائی نے اس موضوع پر بات کرنے ہی سے انکار کر دیا۔
بابر بھائی جب سجاد کو گھر میں کھیلتے کودتے دیکھ لیتے، کوئی نہ کوئی آوازہ کسنا ضروری ہو جاتا " دیکھنا دیکھنا اس کی شکل بڑا اپنا سا لگ کھڑا ہے فیروز میراثی کا بیٹا اس سے بہتر معلوم ہوتا ہے " " سلو ذرا صاحبزادے کی آواز۔ جیسے چکارا بج رہا ہے۔ شٹ اپ ...... ! "
بابر بھائی کی یہ عداوت زبانی زبانی ہی ہوتی تو مضائقہ نہ تھا مگر اس کا خطرناک عملی پہلو بھی تھا۔ دیکھئے نا باپ کی موجودگی میں بیٹے کو قطعاً بیٹھنے کی اجازت نہ ہو، اور اس پر طرہ یہ کہ محلے بھر کے ترچھے بیڑھے لونڈے اس میں سیر کرتے پھریں۔ بابر بھائی جب شام کو موٹر میں باہر جاتے تو شبر کو اپنا ساتھ گھر سے بلا کے لیجاتے۔ شبر ہمارا بھانجا ہے وہ لوگ برابر والے مکان میں رہتے ہیں۔ شبر گھر سے غیر حاضر ہوتا تو لڑکے کو اپنے دوست کے بیٹے امو کو بلانے کے لئے بھیج دیا۔ یہ دونوں لڑکے سجاد کے ہم عمر ہیں۔ بجز اناس جیسے بھولے ہیں، اور پہلے سے نہ طلاقت

مجھے تو معلوم ہے کہ بابر بھائی کی موجودگی میں دبک کر الگ تھلگ بیٹھا ہے تعجب
ہوتا ہے آتا ہوں ان دونوں کو لال لال آنکھیں ہی دکھاتا رہتا ہوں اور
تو ویسے بھی ہمارے گھر میں کم ٹکتا ہے، بابر بھائی کے بلانے پر آتا ہے
مگر شبر کی غنیمت ہے۔ سوکھ کر آدھا رہتا تھا۔ مگر اب تو اس نے بھی آنا
کم کر دیا ہے۔ اس تبدیلی کا میں ذمہ دار ہوں، شبر بڑا پیارا بچہ
ہے، اور بہت سمجھدار تھا۔ مگر بیچارہ اس سے بابر بھائی کی وجہ سے خواہ مخواہ
کا بیر ہوتا جا رہا تھا۔ سجاد میرے پاس بیٹھا تھا، اور عجیب عجیب سوالات
کر رہا تھا۔ شبر آ گیا۔ بندوق دیکھ کر دوڑا دوڑا میرے پاس آیا
”ماموں جان مجھے بندوق دیجئے۔ میں آپ کو چلا کر دکھاؤں“ بیچارہ
بڑے ارمانوں کے ساتھ آیا تھا۔ میں نے بندوق کی نالی اس کے سینے
پر رکھ دی۔ بیچارہ بوکھلا سا رہ گیا۔ ”دیکھو شبر! اب اگر تم بابر بھائی
کی کار میں بیٹھے تو میں گولی مار دوں گا“ الٹے پاؤں روتا ہوا اپنے گھر
بھاگ گیا۔ آپ یقین مانئے کہ میں نے تو مذاق کیا تھا۔ مگر میری بہن
آج تک مجھ سے خفا ہے اور حتی الوسع شبر کو ہمارے گھر آنے نہیں دیتی۔

مگر ان سب کوششوں کے باوجود بابر بھائی کی زیادتی
کا کوئی علاج نہیں۔ میں اکثر شام کو کار مانگ کر سجاد کو پھراتا ہوں
سجاد تو خوش ہو جاتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ بات پھر بھی نہیں بنتی۔

آپ کو اس عداوت کی وجہ بھی بتا دوں۔ بابر بھائی کے پاس
گویا ایک دلیل ہے۔ مگر ہے بڑی بودی۔ یہ سب کچھ بھابی جان
کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ بابر بھائی چھوٹے سے تھے تو ان کی منگنی ہو گئی
تھی فوجی ملازمت کے سلسلے میں وہ باہر بہت سے ملکوں میں رہ آئے
ہیں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے، تعلیم بھی اچھی خاصی ہے بھابی
جان جیسی ان پڑھ اور گنوار بیوی انہیں کیونکر پسند آ سکتی ہے۔ پھر
سنا ہے سنگاپور میں ان کا کبھی کچھ افیئر بھی تھا۔ شادی کے لئے بہت
عرصے ٹال مٹول کرتے رہے مگر والدہ صاحبہ کی ضد آخر کار جیت گئی
اس میں کوئی شک نہیں کہ بھابی جان اور بابر بھائی کا کوئی جوڑ نہیں۔
لیکن اس میں سجاد کا کیا قصور ہے۔ میرا نقطہ نظر ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ
بابر بھائی کو شادی نہیں کرنی چاہئے تھی، کر لی ہے تو نباہنی چاہئے۔
اور پھر سوال یہ ہے کہ سجاد اس قسم کے سلوک کا کیسے مستحق سمجھ لیا گیا ہے
اس موضوع پر میں نے ایک آدھ مرتبہ بابر بھائی سے بات چیت بھی
کی ہے مگر انہوں نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا بلکہ میں تو
سمجھتا ہوں کہ بعض اوقات ایسی باتوں کا ان پر الٹا اثر ہوتا ہے۔ ایک
دوپہر کو ایسی ہی باتیں ہو رہی تھیں اتنے میں بھابی آ گئیں۔ ساتھ ہی
سجاد بھی تھا اور وہ اس حال میں کہ تیل کی پوری بوتل اس کے بالوں
میں انڈیل دی گئی تھی تر بھی بہت تنگ ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں کاجل
اور شاید گالوں پر کچھ پوڈر کریم کا استعمال بھی ہوا تھا۔ آتے ہی مجھ کو
کہنے لگیں کہ سجاد کو لے جاؤ۔ بازار سے اس کے لئے چپل خریدنا تھا۔ مگر سجاد بیچارے
نے ہم تینوں کی وہ گت بنائی کہ خدا کی پناہ۔ ویسے اصولی طور پر میں بھی
بناؤ سنگار کے متعلق بھابی جان کے نظریہ کا قائل نہیں مگر کیا کیا
جائے۔ گاؤں میں انہوں نے یہی کچھ سیکھا تھا۔ بچے سے لاڈ پیار کا ڈھنگ
بھی ان کا وہی پرانا ہے۔ میں نے کئی بار محسوس کیا کہ سجاد گالیاں
سیکھ رہا ہے۔ دبی زبان سے بھابی جان کو بتایا بھی، مگر بے سود
وہ تو سبق دے دے اپنے اوپر گالیوں کی مشق کرایا کرتی تھیں۔

اس کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ بابر بھائی کو سجاد سے
جس قدر نفرت تھی اس سے کئی گنا زیادہ میں اس کا خیال رکھتا تھا
مجھے ٹھیک طرح یاد ہے کہ میں نے اس پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ البتہ
ایک دن ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میرے ہاتھوں کو بھی آلودہ کر دیا
اور یہ واقعہ کئی لحاظ سے رکاوٹ تو ثابت ہوا۔

دوپہر کا وقت تھا میں اور بابر بھائی کھانا کھا کر ان کے کمرے
میں چلے گئے۔ بابر بھائی نے مضامین پطرس سے کوئی مضمون بلند
آواز سے پڑھنا شروع کیا۔ پطرس کے مضامین پڑھے جائیں اور ایک
ہنگامہ نہ مچ جائے۔ فلک شگاف قہقہے لگ رہے تھے (میرے)
نہایت بے ڈھنگی چیخیں بلند ہو رہی تھی (بابر بھائی کی) میں کمرے
کے پاس بیٹھا تھا۔ گھر کے سب لوگ ایک پڑوسی کے گھر کسی تقریب
شامل ہونے کے لئے گئے ہوئے تھے مجھے گلی میں سجاد کی آواز سنائی
دی۔ اس کے ساتھ کوئی اور بچہ بھی تھا کسی بات پر تکرار ہو رہی تھی
بڑی دلچسپ تکرار تھی۔ مگر اچانک سجاد نے نہایت بلند آواز میں
حریف کو ایک بری گالی دی ایسے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بابر بھا

شبیر کراچی

سید باقر علیم •

خون کا جوش

باپ کی عمر تیس سال! بیٹے کی عمر تین سال!

آپ نے اس عمر کے باپ کو اتنی چھوٹی عمر کے بیٹے کے ساتھ ہر قسم کا بغض و عناد برداشت کرتے ..... دیکھا ہے؟ جی ہاں میں نے تو دیکھا ہے برآمدے میں سب گھر کے لوگ کھانا کھا رہے تھے سجاد اپنی ماں کے پاس بیٹھا تھا۔ کھانا کم کیا کھا رہا تھا۔ ضد کر رہا تھا "میں بھی اتنا ہی مکھن لوں گا جتنا چچا کو دیا ہے"۔ بھابی جان نے خاطر سے اس دن کا تقریباً سارا مکھن میرے اور بابر بھائی کے سامنے رکھ دیا تھا۔ بے چاری سجاد کے لئے اتنا مکھن کہاں سے لاتیں ٹال مٹول کرتی رہیں دفعتہً بابر بھائی کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے "اس لاڈلے کو میرے سامنے سے دور کر دو ورنہ جان سے مار ڈالوں گا مکھن کھاتا ہے اپنی شکل نہیں دیکھتا" سجاد بیچارہ سہم کر چپ ہو گیا۔ بھابھی بھی رونے لگیں

بابر بھائی اور میں ایک درخت کے نیچے کرسیاں ڈالے گپ شپ کر رہے تھے سجاد آ گیا اور کرسی پر چڑھ کر میری گود میں آ بیٹھا۔ اور کھیلنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ بابر بھائی کے کان سرخ ہو رہے ہیں مگر میرا اور سجاد کا تو پیار ہے۔ سجاد کو میں نے جسم کے اعضا کے انگریزی نام یاد کرانا شروع کر رکھا تھا۔ اس نے بڑے مزے میں آ کر اپنا سبق دہرانا شروع کر دیا۔ ناک کو ہاتھ لگاتا اور کہتا نوز۔ میری آنکھ کو چھوتا اور کہتا آئی ..... ایر .... لپ۔ بابر بھائی کے کان بہت سرخ ہو گئے۔ ضبط نہ کر سکے۔ زور سے چیخے: "دفعان ہو یہاں سے۔ ماں کو تو ٹھیک ٹھیک پنجابی بھی نہیں آتی بیٹے صاحب چلے ہیں انگریزی سیکھنے، سجاد دبک کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ایسے حادثات ہر روز پیش آتے رہتے۔ کوئی اجنبی آدمی یہ دیکھ کر نہیں کہہ سکتا تھا کہ بابر بھائی اور سجاد کا باپ بیٹے کا رشتہ ہے۔

ایک دن میں اور بابر بھائی مروجہ طریق تعلیم پر گفتگو کر رہے تھے "دیکھو نا! یہی وجہ ہے کہ آج کل ہمارے یہاں بو علی سینا ابن خلدون حالی شبلی پیدا نہیں ہوتے۔ یہ لوگ بچوں کو غیر ضروری مضامین کی فضول کھچڑی ہضم کراتے رہتے ہیں جو کسی کام کی نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں کوئی سپیشلسٹ پیدا نہیں ہوتا" میں بابر بھائی کی تائید میں سر ہلاتا رہا۔ بات بڑھتے بڑھتے نہ جانے کیسے سجاد کی تعلیم تک پہنچ گئی۔ میں نے کہا "سجاد کو پہلے چار پانچ سال تو کسی کانونٹ سکول میں بھیجیں گے نا۔ بابر بھائی نے مجھے فقرہ بھی مکمل نہ کرنے دیا: "نہیں نہیں ہوش کی بات کرو! تم نے کہاں پڑھا ہے میں نے کہاں پڑھا ہے منے صاحب نے کہاں تعلیم پائی ہے۔ ماسٹر فضل کریم والا گاؤں کا سکول سب سے اچھا ہے۔ تم ایسی باتیں کر کے اس کی ماں کا دماغ خراب نہ کرو ....!"

میں نے اپنی رائے کی تائید میں کچھ کہنا چاہا مگر بابر بھائی نے اس موضوع پر بات کرنے ہی سے انکار کر دیا۔

بابر بھائی جب سجاد کو گھر میں کھیلتے کودتے دیکھ لیتے، کوئی نہ کوئی آوازہ کسنا ضروری ہو جاتا: "دیکھنا دیکھنا اس کی شکل بڑا اپنا سکو کھڑا ہے فیروز میراثی کا بیٹا اس سے بہتر معلوم ہوتا ہے" "سلو ذرا صاحبزادے کی آواز۔ جیسے چکارا بج رہا ہے۔ شٹ اپ ......!"

بابر بھائی کی یہ عداوت زبانی زبانی ہی رہتی تو مضائقہ نہ تھا مگر اس کا خطرناک عملی پہلو بھی تھا دیکھئے نا باپ کی موٹر ہو اور بیٹے کو قطعاً بیٹھنے کی اجازت نہ ہو، اور اس پر طرہ یہ کہ محلے بھر کے ترچھے ٹیڑھے لونڈے اس میں سیریں کرتے پھریں۔ بابر بھائی جب شام کو موٹر پر باہر جاتے تو شبر کو اپنا گھر سے بلا کے لیجاتے۔ شبر ہمارا ہمسایہ ہے وہ لوگ برابر والے مکان میں رہتے ہیں۔ شبر گھر سے غیر حاضر ہو تو لوگ کو اپنے دوست کے بیٹے امو کو بلانے کے لئے بھیج دیا۔ یہ دونوں لڑکے سجاد کے ہم عمر ہیں۔ بجز اس کے جیسے بھولے ہیں، وہ پہلے ہی

یہ تو نہیں معلوم کہ بابر بھائی کی موجودگی میں بھاگ بھاگ کیوں جاتی ہے جب
سے آتا ہوں ان دونوں کو الگ الگ ہی دیکھتا رہتا ہوں باہر
زیادہ بھی جاتے مگر میں کم لگتا ہے، بابر بھائی کے بھلے پر آتا ہے
مگر شبر کی شیل ہے۔ سو کمرہ آباد رہتا تھا۔ مگر اب تو اس نے بھی تو
کم کر دیا ہے۔ اس تبدیلی کا میں ذمہ دار ہوں، شبر بڑا پیارا بچہ
ہے، اور سمجھ رہا تھا۔ مگر مجھ اس سے بابر بھائی کی وجہ سے خواہ مخواہ
کا بیر ہوتا جا رہا تھا۔ سجاد میرے پاس بیٹھا تھا، اور مجھے بہت سوالات
کر رہا تھا۔ شبر آگیا۔ بندوق دیکھ کر دوڑا دوڑا میرے پاس آیا
"ماموں جان مجھے بندوق دیجئے۔ میں آپ کو چلا کر دکھاؤں۔" بیچارہ
بڑے ارمانوں کے ساتھ آیا تھا۔ میں نے بندوق کی نالی اس کے سینے
پر رکھ دی۔ بیچارہ ہو بچا سا رہ گیا۔ "دیکھو شبر! اب اگر تم بابر بھائی
کی کار میں بیٹھے تو میں گولی مار دوں گا۔" الٹے پاؤں روتا ہوا اپنے گھر
بھاگ گیا۔ آپ یقین مانئے کہ میں نے تو مذاق کیا تھا۔ مگر میری بہن
آج تک مجھ سے خفا ہے اور حتی الوسع شبر کو ہمارے گھر آنے نہیں دیتی۔

مگر ان سب کوششوں کے باوجود بابر بھائی کی زیادتیوں
کا کوئی علاج نہیں۔ میں اکثر شام کو کار مانگ کر سجاد کو پھرا لاتا ہوں
سجاد تو خوش ہو جاتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ بات پھر بھی نہیں بنتی۔

آپ کو اس عداوت کی وجہ بھی بتا دوں۔ بابر بھائی کے پاس
گویا ایک دلیل ہے۔ مگر ہے بڑی بودی۔ یہ سب کچھ بھابی جان
کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ بابر بھائی چھوٹے سے تھے تو ان کی منگنی ہوئی
تھی فوجی ملازمت کے سلسلے میں وہ باہر بہت سے ملکوں میں رہ آئے
ہیں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے، تعلیم بھی اچھی خاصی ہے بھابی
جان جیسی ان پڑھ اور گنوار بیوی انہیں کیونکر پسند آسکتی ہے۔ پھر
سنا ہے سنگاپور میں ان کا کسی کچھ [illegible] افیئر بھی تھا۔ شادی کے لئے بہت
عرصے ٹال مٹول کرتے رہے مگر والد صاحب کی ضد آخر کار جیت گئی
اس میں کوئی شک نہیں کہ بھابی جان اور بابر بھائی کا کوئی جوڑ نہیں۔
لیکن اس میں سجاد کا کیا قصور ہے۔ میرا نقطۂ نظر ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ
بابر بھائی کو شادی نہیں کرنی چاہئے تھی، کر لی ہے تو نبھانی چاہئے۔
اور پھر سوال یہ ہے کہ سجاد اس قسم کے سلوک کا کیسے مستحق سمجھ لیا گیا؟

اس موضوع پر میں نے ایک آدھ مرتبہ بابر بھائی سے بات چیت بھی
کی ہے مگر انہوں نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا بلکہ میں تو
سمجھتا ہوں کہ بعض اوقات ایسی باتوں کا ان پر الٹا اثر ہوتا ہے ایک
دوپہر کو ایسی ہی باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں بھابی آگئیں۔ ساتھ ہی
سجاد بھی تھا اور وہ اس حال میں کہ تیل کی پوری بوتل اس کے بالوں
میں انڈیل دی گئی تھی۔ ترچھی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں کاجل تھا
اور شاید گالوں پر کچھ پوڈر کریم کا استعمال بھی ہوا تھا۔ آتے ہی کہنے لگیں، مجھ کو
کہنے کہ سجاد کو لیجائے۔ بازار سے اس کے لئے چپل خریدنا تھا۔ مگر سجاد بھائی
نے ہم تینوں کی وہ گت بنائی۔ خدا کی پناہ دیجئے۔ اتفاق سے خود میں بھی
سجاد سے متعلق بھابی جان کے نظریہ کا قائل نہیں مگر کیا کیا
جائے۔ گاؤں میں انہوں نے یہی کچھ سیکھا تھا۔ بچے لاڈ پیار کا کرتے
بھی ان کا وہی پرانا ہے۔ میں نے کئی بار محسوس کیا کہ سجاد گالیاں
سیکھ رہا ہے۔ دبی زبان سے بھابی جان کو بتایا بھی، مگر بے سود
وہ تو سجاد سے اپنے اوپر گالیوں کی مشق کرایا کرتی تھیں۔

اس کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ بابر بھائی کو سجاد سے
جس قدر نفرت تھی اس سے کئی گنا زیادہ میں اس کا خیال رکھتا تھا
مجھے ٹھیک طرح یاد ہے کہ میں نے اس پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ البتہ
ایک دن ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میرے ہاتھوں کو بھی آلودہ کر دیا
اور یہ واقعہ کئی لحاظ سے رکارڈ توڑ ثابت ہوا۔

دوپہر کا وقت تھا میں اور بابر سب کھانا کھا کر ان کے کمرے
میں چلے گئے۔ بابر بھائی نے مضامین پطرس سے کوئی مضمون بلند
آواز سے پڑھنا شروع کیا۔ پطرس کے مضامین پڑھے جائیں اور ایک
ہنگامہ نہ مچ جائے۔ فلک شگاف قہقہے لگ رہے تھے (میرے)
نہایت بے ڈھنگی چیخیں بلند ہو رہی تھیں (بابر بھائی کی) میں کھڑکی
کے پاس بیٹھا تھا۔ گھر کے سب لوگ اکٹھے پڑوسی کے گھر کسی تقریب میں
شامل ہونے کے لئے گئے ہوئے تھے مجھے گلی میں سجاد کی آواز سنائی
دی۔ اس کے ساتھ کوئی اور بچہ بھی تھا کسی بات پر تکرار ہو رہی تھی
بڑی دلچسپ تکرار تھی۔ مگر اچانک سجاد نے نہایت بلند آواز میں
حریف کو ایک بری گالی دی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بابر بھائی

نہ سُن سکے۔ میں نے سجاد کو تقریباً چیخ کر آواز دی۔ بابر بھائی لیٹے ہوئے پڑھ رہے تھے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ کتاب رانوں پر رکھ لی۔ سجاد گیلی بھیگی بلی بنا ہوا آیا۔ جونہی میرے قریب پہنچا میں نے بڑے زور سے ایک الٹا تھپڑ جڑ دیا۔ چھوٹا سا بچہ، اتنے زور کا تھپڑ، لڑکھڑاتا ہوا انگیٹھی کے پاس جا گرا۔ اس نے بڑی ہولناک چیخ ماری۔ میں سجاد کو پکڑنے کے لئے اٹھا۔ بابر بھائی کے منہ سے بے اختیار نکلا "ظالم مر جائے گا" سجاد اٹھکر پناہ کے لئے بابر بھائی کی طرف بھاگا۔ خدا جانے اس نے کیا سوچا۔ ان کے قریب پہنچکر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گھوما اور باہر برآمدے کی طرف بھاگ گیا۔ میں اس کے پیچھے باہر گیا۔ میں نے اسے اور زیادہ پیٹنا تو مناسب نہ سمجھا مگر ڈانٹ ڈپٹ ضرور کی۔ پھر پکڑ کر اسے ہمسائے کے گھر پہنچا آیا۔ وہاں دروازے پر بلا کر بھابی اور بہنوں کو تنبیہہ کی، بلکہ اخلاق، گالی اور تربیت پر آٹھ دس منٹ کی اچھی خاصی تقریر جھاڑ دی، لوٹ کر گھر آیا تو بابر بھائی کھلی کتاب منہ پر رکھے لیٹے تھے میں نے سوچا سو گئے ہیں یا کچھ سوچ رہے ہیں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

کوئی پانچ بجے آنکھ کھلی تو سجاد یاد آ گیا۔ میں کافی دیر تک اپنے آپ کو کوستا رہا۔ پھر سوچا بابر بھائی سے موٹر مانگتا ہوں اور سجاد کو سیر کرا لاتا ہوں۔ اس سے صلح تو کرنی ہی تھی۔ میں کپڑے بدلنے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ باہر صحن میں موٹر سٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور ساتھ ہی بابر بھائی کی آواز "سجاد! چل بے سیر کو چلتا ہے؟" بڑی عجیب سی بات تھی۔ میں نے تبدیل لباس کا خیال چھوڑ کر جلدی میں چپل ڈھونڈا۔ گھبراہٹ میں الٹا پھنتا رہا۔ پھر سیدھا پہن کر بے تحاشا کمرے سے بھاگا اور بابر بھائی کو بڑے زور سے آواز دی۔ بابر بھائی نے آواز نہیں سُنی۔ کار باپ بیٹے کو لے کر چل دی۔

آپ کو معلوم ہے میں کیا کہنا چاہتا تھا؟

(بشکریہ "الحمرا")

یعقوب طاہر •

یہ کون ہے کس کے چرچے ہیں؟

(۱)

کچھ دل ہیں لگادی آگ جنہیں کچھ دل ہیں کہ جن کو شاد کیا
یہ کون ہے جس نے آتے ہی محفل کا سکوں برباد کیا
اس گوشے سے اس گوشے تک
یہ کون ہے کس کے چرچے ہیں

(۲)

تسبیح و مصلٰے برہم ہیں اک ہل چل ہے ایوانوں میں
ہے خانقہوں میں شور بپا بت لرزاں ہیں بتخانوں میں
اس گوشے سے اس گوشے تک
یہ کون ہے کس کے چرچے ہیں

(۳)

پہرے بھی زباں پر بٹھلائے قیدی بھی بنا کر دیکھ لیا
لب سل نہ سکے سر جھک نہ سکا پھانسی بھی چڑھا کر دیکھ لیا
اس گوشے سے اس گوشے تک
یہ کون ہے کس کے چرچے ہیں

(۴)

مکتب نہ گیا، دستار نہ لی ہر شخص کو آنکھ دکھاتا ہے
یہ کون ہے ہم سے بالا ہی رہبر اب بنتا جاتا ہے
اس گوشے سے اس گوشے تک
یہ کون ہے کس کے چرچے ہیں

(۵)

وہ جھاگ اچھلتے پھرتے ہیں گرگٹ نے سماں پھر باندھا ہے
دشمن تک اب مل بیٹھے ہیں سیلاب یہ کیسا آیا ہے
اس گوشے سے اس گوشے تک
یہ کون ہے کس کے چرچے ہیں

(۶)

ربوہ سے تصادم ختم ہوا دیوبند و بریلی ایک ہوئے
جس صف میں تھے منکر سنت کے حامی بھی وہیں اب آ پہنچے
اس گوشے سے اس گوشے تک
یہ کون ہے کس کے چرچے ہیں

(۷)

وہ ایک انوکھی سج دھج سے　　پھر فسق نے تار ہلائی ہے
تقویٰ اور طاعت قصاں ہیں　　رسوائی ہے رسوائی ہے
اس گوشے سے اس گوشے تک
یہ کون ہے کس کے چرچے ہیں

(۸)

تحریف کی قینچی چلتی ہے　　الزام تراشے جاتے ہیں
پھر کفر "بنایا" جاتا ہے　　اسلام "تراشے" جاتے ہیں
اس گوشے سے اس گوشے تک
یہ کون ہے کس کے چرچے ہیں

(۹)

جب مقصد حق کی خدمت ہو　　پھر جھوٹ پہ تکیہ آخر کیوں
جب جرم کسی کا "ثابت" ہو　　دعوے پر دعویٰ آخر کیوں
اس گوشے سے اس گوشے تک
یہ کون ہے کس کے چرچے ہیں

(۱۰)

باطل ہو کہ حق ہو دونوں ہیں　　صدیوں سے بپا تکرار وہی
غلبے کی تمنا ویسی ہی　　انداز وہی کردار وہی
اس گوشے سے اس گوشے تک
یہ کون ہے کس کے چرچے ہیں

(۱۱)

ہر غاصب نے ہر داعی پر　　جن جن کے مظالم توڑے ہیں
ہر اینٹ نے جھگڑا ڈالا ہے　　ہر سنگ نے ماتھے پھوڑے ہیں
اس گوشے سے اس گوشے تک
یہ کون ہے کس کے چرچے ہیں

(۱۲)

ہم سر پہ بٹھائیں ظالم کو　　محدود رہے جو شریعت تک
ہم خادم دیں تسلیم کریں　　پرواز ہے جو سیاست تک
اس گوشے سے اس گوشے تک
یہ کون ہے کس کے چرچے ہیں

(۱۳)

ہر سنگ کو توڑ نہ توڑ مجھے　　ہر سنگ کی ہے تکرار یہی
ہر اینٹ کو چھیل نہ چھیل مجھے　　ہر اینٹ کا ہے اصرار یہی
اس گوشے سے اس گوشے تک
یہ کون ہے کس کے چرچے ہیں

(۱۴)

تعمیر گلستاں کرتی ہے　　پھر دور بہاراں لاتا ہے
جائے تو کہاں معمار ترا　　اجڑے ہوئے گھر کو بساتا ہے
اس گوشے سے اس گوشے تک
یہ کون ہے کس کے چرچے ہیں

سڈنی ہک

مارکس سے اعراف میں ملاقات

کارل مارکس کو اعراف میں تلاش کر لینا مشکل نہیں تھا۔ اس کی داڑھی کسی قدر ترشی ہوئی تھی۔ یک چشمی عینک غائب تھی اور تصویر میں اس کے چہرے سے جو خشونت برستی تھی وہ کافی حد تک زائل ہو گئی تھی اور ملاطفت کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے ایک طرف اینگلز اور دوسری طرف ٹراٹسکی بیٹھا ہوا تھا اور وہ کسی اہم نکتے کے متعلق کینیز اور جیلن سے گفتگو کر رہا تھا۔ لیکن اس حصے میں نہیں تھا۔ میرے گائیڈ نے مجھے بتایا کہ وہ بے صبری سے سٹالن کا انتظار کر رہا تھا جس کی آمد اگرچہ کافی دیر سے متوقع تھی مگر وہ ابھی تک پہنچا نہیں تھا۔ وہاں یہ افواہیں بھی گرم تھیں کہ اعراف اسے قبول کرنے سے انکار کر دیگا۔

مارکس نے جب یہ سنا کہ زمین کا رہنے والا کوئی شخص اس سے ملنے آیا ہے تو وہ اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر میری طرف بڑھا۔ میں نے یہ بتانے کی بجائے کہ میں اس کے اور اس کے نظریہ کے متعلق متعدد کتابوں کا مصنف ہوں (میں نے یہ سن رکھا تھا کہ ناقد اور مورخ ان لوگوں کی نگاہوں میں کبھی محترم نہیں بن سکتے۔ جن کے متعلق انہوں نے قلم اٹھایا ہو) میں نے صرف یہ کہا کہ میں اس کے لئے ایک خبر لایا ہوں۔

"خبر؟" اس نے کہا: "مجھے امید ہے کہ تمہاری خبر قدرے مختلف اور خوشگوار ہوگی۔ گزشتہ بیس سال سے تو میں ایک تکلیف دہ یکسانیت کا شکار ہوں۔ سیاسی اور سماجی امور سے دلچسپی رکھنے والا ہر نووارد مجھ سے الجھ پڑتا ہے اور دنیا میں رونما ہونیوالے حوادث کی ذمہ داری مجھی پر ڈالتا ہے۔"

"میری خبر ذاتی نوعیت کی ہے۔" میں نے جواب دیا: "ماسکو کی مارکس اینگلز لینن انسٹی ٹیوٹ، روسی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی ایگزیکٹیو کمیٹی کے ایما پر تمہاری کتابوں کا نیا اور اصلاح شدہ ایڈیشن چھاپ رہی ہے۔"

"اصلاح شدہ ایڈیشن! کیا واقعی؟" اس نے کسی قدر برہمی سے کہا: "۱۹۱۷ء سے روسی اپنے ہر قول اور ہر فعل سے میری اصلاح میں مصروف ہیں۔ وہ جو بھی تباہی لاتے ہیں۔ اس کی ذمہ داری میرے سر ڈال دی جاتی ہے اور بسا اوقات یہ ان لوگوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے۔ جن سے بہتر آگاہی کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔"

"لیکن کیا یہ قدرتی نہیں؟" میں نے زور دیتے ہوئے کہا: "کسی وقت تم نے اپنے آپ کو کمیونسٹ کہا تھا اور وہ بھی اپنے آپ کو کمیونسٹ کہتے ہیں۔"

"میرے عزیز پروفیسر یہ ایک منطقی غلطی ہے۔" مارکس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا: "یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ تیس سالہ جنگ میں چونکہ دونوں فریق عیسائی تھے۔ اس لئے دونوں کے درمیان اتحاد موجود تھا۔ سوویٹ کمیونزم میرے کمیونزم سے بالکل مختلف چیز ہے۔"

"کس بات میں؟" میں نے استفسار کیا۔

مارکس نے جو جواب دیا اس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یا تو وہ اب بھی بے شمار مطالعے کا عادی ہے اور یا کوئی کائناتی خبر رساں آکر اس پر مہربان ہے۔ "اتنا کچھ پڑھنے کے بعد تمہیں تو بے خبر نہیں ہونا چاہئیے۔ ہم نے اپنے آپ کو کمیونسٹ اس لئے کہا تھا کہ ہمارے اور ان جذباتی سوشلسٹوں کے درمیان حد امتیاز قائم ہو سکے جن کی آنکھیں ایک مثالی نظام پر مرکوز رہتی ہیں اور اس بات سے قطعی بے نیاز رہتی ہیں کہ اس کے لئے کیا کیا قدم اٹھانے چاہئیں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جب میں اور میرے دوست کمیونسٹ لیگ کے ممبر تھے تو ہم نے لکھا تھا کہ ہم ان کمیونسٹوں میں نہیں جو آزادی کو تباہ کرنا چاہتے ہیں یا ساری دنیا کو ایک بہت بڑی بارک یا مال گودام میں تبدیل کرنا

چاہتے ہیں۔ ایسے کمیونسٹ واقعی موجود تھے جو شخصی آزادی کو برداشت کرنے سے انکار کردیتے تھے اور ان کا ضمیر مطمئن رہتا تھا۔ لیکن میرے نزدیک ایک نفیس سماج کے لئے شخصی آزادی اتنی ہی ضروری تھی جتنی آکسیجن۔ سرمایہ داری پر میری نکتہ چینی کی بنیاد اس جذبے پر تھی کہ شخصی آزادی کی تمنا ان لوگوں میں بھی پیدا کی جائے جو نسبتاً اس سے محروم ہیں۔"

"لیکن اگر یہ ٹھیک ہے" میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "تو پھر کمیونسٹ روس نے تمہیں دیوتا بنا کر تمہارے نام پر ایک دین کیوں کھڑا کر لیا ہے؟ اگر انہی کا ایک فقرہ استعمال کیا جائے تو یہ ایک اتفاقی حادثہ نہیں کہ ......"

"یہ طویل کہانی ہے" مارکس نے مداخلت کی۔ "تاریخ میں اتفاقی حادثے ضرور ہوتے ہیں۔ خواہ اسے اتفاقی حادثہ نہ بھی قرار دیا جائے۔ روسی ہمیشہ گڑبڑ کرتے رہے ہیں۔ مجھے ایک سے زائد بار یہ کہنا پڑا۔ میں مارکسی نہیں ہوں۔ بیکونن جس نے ایک بار اپنے آپ کو مارکسی کہا تھا۔ اس سے میں نے زمین پر ہی کنارہ کشی کر لی تھی۔۔۔ کمیونسٹ اس جیسے ہی لوگ ہیں اور اب تو بیکونن بھی یہاں ان کے خلاف خفگی کا اظہار کر رہا ہے۔ میں آج کے کمیونسٹوں کو اپنی جائز اولاد تسلیم نہیں کرتا خواہ وہ اپنے متعلق کوئی بھی دعویٰ کرتے ہیں۔"

"میں نے کبھی باپوں کو یہ کہتے سنا ہے" میں نے جواب دیا "لیکن اس سے ولدیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خواہ جائز خواہ ناجائز۔ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے تمہارے خیالات سے امنگ حاصل کی ہے اور ایک سوشلسٹ سماج قائم کر لیا ہے تم ان کے طور طریقوں کو پسند نہ کرو لیکن ان کے وجود سے تو انکار نہیں کر سکتے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہرگز نہیں" مارکس نے اتنی تلخی اور شدت سے جواب دیا کہ اس کی ڈاڑھی کے کناروں میں چمک پیدا ہو گئی۔ "وہ سوشلسٹ سماج جس کا میں تصور کرتا رہا ہوں۔ ایک ایسا سماج ہے جس میں، ہر شخص کی آزادانہ ترقی دوسروں کی آزادانہ ترقی کی ضمانت ہو۔ یہ بات پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ بالخصوص جابروں کی حکومت کی مکمل طور پر ضد ہے۔ سوشلسٹ سماج کی بنیاد مساوات پر ہوتی ہے، خواہ مکمل مساوات ناقابلِ حصول ہی

کیوں نہ ہو۔ شروع شروع میں اس کی بنیاد مساوی تنخواہ پر ہے۔ کیمونسٹوں نے مزدوروں کی لوٹ کھسوٹ کا ایک نیا اور بدتر طریقہ ایجاد کر لیا ہے ان کے نظام کے ماتحت آمدنی اور رہن سہن کا فرق اتنا زیادہ ہے جو سرمایہ داری کے ابتدائی دور میں بھی نہیں تھا۔ وہ مارکسی سوشلسٹ ہونے کا دعویٰ کیوں کرتے ہیں۔ جو خرید و فروخت کے اصولوں کے تابع ہیں مزدوروں کے خون پسینے سے جو زائد آمدنی ہوتی ہے۔ وہ ان کے آقاؤں کی جیب میں چلی جاتی ہے ....."

یہ محسوس کر کے کہ مارکس اپنے پرانے نظریاتی گھوڑے پر سوار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے مداخلت کی: "تمام کی تمام نہیں۔ کچھ آمدنی نئے کارخانے قائم کرنے کے بھی کام آتی ہے اور وہاں ٹریڈ یونینیں بھی ہیں۔"

اب مارکس کی ڈاڑھی کا ہر بال چمکنے لگا تھا: "ٹریڈ یونینیں!" اس نے بھڑک کر کہا "ان کی ٹریڈ یونینیں کمپنی کی ٹریڈ یونینوں سے بھی بدتر ہیں۔ یہ ٹریڈ یونینیں خفیہ پولیس کی آلۂ کار ہیں اور ان کا مقصد مزدوروں کو خوفزدہ کر کے انہیں زیادہ شدید محنت پر مجبور کرنا ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ سبق دیا ہے کہ مزدور طبقہ، اپنی جرأت خود اعتمادی، آزادی اور ذاتی وقار کو روزمرہ روٹی کے مقابلے میں زیادہ ضروری سمجھتا ہے۔ یہ بات ایک ایسے نظام حکومت میں کس طرح ممکن ہے جہاں پریس بے رحمانہ سنسر کا شکار ہو۔ جہاں ابتدائی سکولوں سے یونیورسٹیوں تک تعلیم حکومت کے جابرانہ شکنجوں میں جکڑی ہوئی ہو جہاں جبری محنت لی جاتی ہو اور جلاوطنیاں اور پھانسیاں عام ہوں نہیں سوویٹ یونین ایک سوشلسٹ سماج نہیں۔"

"اور یہ ایک سرمایہ دارانہ سماج بھی نہیں" میں نے بات کو آگے بڑھانے کی گنجائش نکالتے ہوئے کہا: "کیونکہ پیداوار تقسیم اور تبادلے کے تمام اہم ذرائع مشترکہ ملکیت ہیں۔ تو آخر یہ کس قسم کا سماج ہے تم نے سماجی ارتقا کا جو نظریہ پیش کیا تھا اس سے اس کی وضاحت نہیں ہوتی۔"

"یہ معاملہ صرف اصطلاحوں کا ہے" مارکس نے کسی قدر درشتی سے کہا "اہم نکتہ یہ ہے کہ سوویٹ سماج جہاں کہیں بھی موجود

ہ پھوہڑی روایات کی توہین کا مرتکب ہو رہا ہے۔ جن کے لئے
سٹ تحریک ہمیشہ جدوجہد کرتی رہی اور اس سے پہلے کی تمام
ں تحریکیں بھی جن کی سوشلسٹ تحریک وارث تھی ان کے لئے
ال رہیں۔"

"بہت اچھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں یہ تسلیم کرتا ہوں
ن کا سماجی فلسفہ تمہارا سماجی فلسفہ نہیں لیکن ایک مکمل اشتراکی
م کے عمل میں ایسی کوئی بات نہیں جو ان کے سماجی فلسفے کے مقابلہ
ہ تمہارے فلسفے کی کامیابی کی ضمانت بن سکے۔ میں تم سے اس
ر کا مطالبہ کر رہا ہوں کہ تم سوویت سماجی نظام کی ابتدا اور اس
ارتقاء کی اپنے نظریۂ تاریخ کی بنیاد پر وضاحت کرو۔ کیا تم
نے بار بار یہ نہیں کہا تھا کہ کوئی سماجی نظام اس وقت تک تباہ نہیں
تا جب تک اس کی پیداواری قوتیں ترقی کے تمام امکانات کو ختم
یں کر لیتیں۔ ۱۹۱۷ء میں روس کی پیداواری قوتوں کے لئے ترقی
ا وسیع میدان موجود تھا۔ ترقی کے یہ امکان ۱۹۱۷ء میں امریکہ میں
بی موجود نہیں تھے جو روس سے اس وقت بہت آگے تھا اور جس
نے اس کے بعد اپنی پیداواری قوتوں کو بہت ترقی دی ہے۔"

"بہت خوب!" مارکس نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ "میں نے
پیشگوئی کی تھی کہ سوشلزم پہلے برطانیہ اور امریکہ میں کامیاب ہو گا
کیوں کہ یہ ملک اس کے لئے تیار ہیں۔ میں نے بالکل نہیں کہا
تھا کہ پہلے یہ روس جیسے ایک پسماندہ، غیر ترقی یافتہ اور نیم وحشی
ملک میں کامیاب ہوگا۔ تم دیکھتے ہو کہ یہ کمیونسٹ جب اپنے کو مارکسی
کہتے ہیں تو کتنا احمقانہ جھوٹ بولتے ہیں۔"

میں حیران تھا کہ اس کے تیور اتنے فاتحانہ کیوں ہیں۔ "میں سمجھ
گیا۔" میں نے پکار کر کہا: "کہ کمیونسٹ مارکسی نہیں جیسا کہ وہ ظاہر
کرتے ہیں اگر تم از سر نو زندہ ہو کر ماسکو پہنچ جاؤ تو کریملن کے عظیم
محتسب غالباً تمہیں امریکی سامراج کا ایجنٹ قرار دے کر لوبیانکا کے
کسی تہہ خانے میں پھینک دیں گے لیکن مجھے جو چیز اس سے بھی نمایاں
نظر آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ کمیونسٹوں نے مارکسزم کے نام پر مارکس کے
بنیادی نظریئے کی تکذیب کر دی ہے۔ اس نظریئے کے مطابق اقتصادی

پیداوار کا طریقہ ہی سیاسی واقعات کا رخ معین کرتا ہے۔ اس کے
الٹ نہیں ہوتا۔ لیکن کمیونسٹوں نے سیاسی طاقت پر قبضہ کیا۔
اقتصادی نظام کو قومی ۔ ۔ ۔ بنایا۔ ملک کو صنعتی ترقی دی اور زراعت
کو مشترکہ بنا دیا۔ ان کا تمدن جمہوری نہیں لیکن ان کا اقتصادی نظام
اشتراکی ضرور ہے۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ روس میں واقعات کے
پیچھے جو طاقت کام کر رہی ہے وہ تمہارے قول کے مطابق ۔ تاریخی قوانین
نہیں تھے جو اک آہنی ناگزیریت کے ساتھ اپنے نتائج کا رخ معین کرتے
ہیں بلکہ اصل قوت محرکہ کمیونسٹوں کا ارادہ تھا کیا اس سے یہ ثابت نہیں
ہوتا کہ اقتصادی قوتوں کی عنان آدمی کے ہاتھ میں ہے وہ انہیں اپنی بھلائی
کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ برائی کے لئے بھی۔ یہ استعمال احمقانہ بھی
ہو سکتا ہے اور عاقلانہ بھی۔ آدمی اقتصادی قوتوں کے تابع نہیں ہوتے
جیسا کہ تم نے خیال کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کمیونسٹوں نے اس
نظریئے کو غلط ثابت نہیں کر دیا جو تاریخی مادیت کہتی کا اصل الاصول تھا۔"

"پروفیسر اتنی جلدی نہ کرو۔" مارکس نے پرسکون لہجے میں جواب
دیا۔ "اگر تم میرے لفظوں پر ہی اکتفا کرنا چاہتے ہو تو تمہاری بات
ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن آؤ ہم ان معنی پر غور کریں جو ان لفظوں کی
پشت پر موجود تھے جب میں نے یہ لکھا کہ کیا بات تاریخی طور پر ضروری ہے
اور کیا ناممکن، تو تہذیب کی ایک خاص سطح میرے ذہن میں تھی میرے ذہن میں
بنیادی ضرورتوں اور قدروں کا ایک ایسا تصور موجود تھا۔ جسے
انسانی افعال کی قوت رہنما سمجھا جا سکتا تھا۔ میرے ذہن میں انسانوں
کی دوسرے انسانوں کے ساتھ بدسلوکی کی ایک انتہا تھی میں سوشلسٹ
ہونے سے کہیں زیادہ ایک انسان دوست تھا لہٰذا میرے نزدیک
روس جیسے پسماندہ ملک میں سوشلسٹ اقتصادی نظام کا قیام ناممکن
تھا۔ اس کے لئے ایک ایسی قیمت ادا کرنی پڑتی جس کی اخلاق اجازت
نہیں دیتا تھا۔ لیکن یہ اور بات ہے کہ ہم انسانوں کی مصیبت سے
بالکل ہی بے نیاز ہو جائیں اور چالاک شکاری جانوروں کے اخلاق
کو اپنا لیں۔"

"صرف یہیں کچھ بھی نہیں لگتا" اس نے قدرے توقف کے بعد اپنا
سلسلہ کلام جاری کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر ہم اسے انسانی ناشوں کی کما

سے زرخیز بڑی زمین اور ان کے خون کے دریا سے سیراب کرنے کے لئے
تیار ہو جائیے تو اسے بھی ایک گلستان میں تبدیل کیا جا سکتا ہے ایک
ایسا ملک سوشلسٹ بن جاتے اور وہاں اس کی اقتصادی بنیادیں
پہلے سے موجود نہ ہوں۔ فنی مہارت جمہوریت اور تہذیب کی روایات
مفقود ہو۔ ان تمام مقاصد کی شکست کا باعث ہوگا۔ جن کے حصول
کے لئے سوشلسٹ تحریک عالم وجود میں آئی تھی۔"

"یہ افسوسناک ہے۔" میں نے کہا۔ "کہ تم نے ان مقاصد کی
وضاحت کرنے پر مناسب وقت صرف نہیں کیا۔ تم نے زیادہ زور
اس اقتصادی نظام پر دیا جو ان کے حصول کے لئے ضروری تھا۔ اس سے
یہ خیال پیدا ہو گیا کہ ملک کا مشترکہ ہونا ہی سوشلزم کا پہلا اور آخری
مقصد ہے۔ جب یہ حاصل ہو جائے گا تو سماج میں دوسری خوبیوں کا
خود بخود اضافہ ہو جائے گا۔ قصور صرف تمہارے شاگردوں کا ہی نہیں
جنہوں نے ایک ضروری شرط کو واحد شرط مان لیا۔ ہو سکتا ہے کہ جابجا
سوشلسٹوں نے طریق کار کو نظر انداز کر دیا ہو لیکن تمہاری نگاہوں سے تو
مقصد ہی اوجھل ہو گیا۔ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ تمہاری کوتاہی زیادہ
شدید تھی۔"

"نہیں" مارکس نے کہا۔ "میرے استادوں نے جو ہیگل کے
پیرو تھے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ مقاصد اور ذرائع کا آپس میں اتنا گہرا
تعلق ہے کہ انہیں الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے
بہت سی باتوں کو طے شدہ تصور کر لیا ہو لیکن اسے فراموش نہ کرو کہ میں
نہ تو ہی کتابیں لکھ رہا تھا اور نہ انقلابی نسخے، جنہیں ہر جگہ اور ہر وقت
استعمال کیا جا سکے۔"

"تو پھر روایت یہ فیصلہ کرنے میں کافی اہمیت رکھتی ہے کہ
انسان دوسرے انسانوں سے کیا سلوک کر سکتے ہیں اور کیا نہیں۔"
میں نے ایک نکتہ پیش کرتے ہوئے کہا۔ "اور بعض حالتوں میں سماجی
تبدیلی کا رخ متعین کرنے میں روایت اتنی ہی اہم ہو سکتی ہے جتنا
اقتصادی پیداوار کا طریقہ۔"

"میں نے اس سے کبھی انکار نہیں کیا۔ اس کے برعکس میرا قول
یہ ہے آدمی اپنی تاریخ خود بناتا ہے لیکن وہ یہ نہیں کر سکتا کہ اسے
جیسا چاہے بنا لے۔ وہ اپنے لئے ماحول خود منتخب نہیں کرتا بلکہ اسی ماحول
میں کام کر سکتا ہے جس میں وہ موجود ہو۔ گزشتہ نسلوں کی روایات کا
بوجھ زندہ لوگوں کے ذہن پر ایک آسیب کی طرح موجود رہتا ہے۔ یعنی
اس وقت جب یہ نظر آتا ہے کہ وہ کوئی بالکل نئی بات کر رہے ہیں
بسا اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ ماضی کسی سمت سے رینگ رہا ہے
روس کا ماضی کسی بھی کلیسا کے حکم سے فنا نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس
کے حال میں زندہ ہے ماضی کی طرح کے موجودہ حکمرانوں کی ترقی کا مظہر
بھی یہی ہے کہ وہ اپنی شخصی اور جابرانہ حکومت کی حدوں کو وسعت
دیتے رہیں۔ زار کے روس نے جب پولینڈ کو مغلوب کیا تھا اس وقت
جو باتیں میں نے کہی تھی وہ آج بھی سچ ہے۔ روس کی پالیسی غیر متغیر
ہے۔ اس کے طریقے اور اس کی چالیں بدل سکتی ہیں لیکن اس کی
پالیسی کا قطبی ستارہ اپنی جگہ کبھی تبدیل نہیں کرتا۔ یہ پالیسی
تسخیر عالم کی پالیسی ہے۔"

میں اعتراف میں خارجہ پالیسی پر بحث کرنا نہیں چاہتا تھا
اس لئے میں نے ایک اور سوال اٹھا دیا۔

"خیر یہ بتاؤ کہ چین کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ ظاہر ہے کہ
یہاں ایک ایسی چیز رونما ہو رہی ہے۔ جس کا تم نے تصور نہیں کیا تھا
کیا تمہارے خیال میں چین میں سوشلزم قائم ہو سکتا ہے۔ کیا سوویٹ
یونین کی مدد سے بھی یہ ممکن ہے؟"

"سوویٹ یونین کے متعلق میرا جو تجربہ ہے۔" مارکس نے نفرت
سے کہا: "وہ چین پر اور بھی صادق آتا ہے۔ میں پیشن گوئی کرتا ہوں
کہ چین میں سوشلزم قائم کرنے کی کوششیں سوویٹ یونین سے
کہیں زیادہ ناکام ہوں گی۔"

"مان لیا" میں نے جواب دیا۔ "لیکن جس چیز کی تم نے
پیشنگوئی نہیں کی وہ یہ ہے کہ یہ کوشش کی جائے گی۔ کوشش کامیاب
ہو یا ناکامیاب لیکن اس سے اہم تاریخی تبدیلیاں عالم وجود میں
آئیں گی۔ یہ سلسلہ شروع بھی ہو گیا ہے۔ تاریخی عمل کے متعلق ایک
اہم بات وضاحت طلب رہ گئی ہے۔"

"تمہیں معلوم ہونا چاہئیے کہ میری بنیادی دلچسپی ہمیشہ مغربی

دنیا سے رہی ہے۔ مارکس نے بڑے سکون کے ساتھ وضاحت کرتے ہوئے کہا "میرے نظریوں کی صحت یا عدم صحت کا انحصار اس بات پر ہے کہ واقعات وہاں کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ میں نے پیشگوئی کی تھی کہ وسیع پیمانے پر صنعتی نظام مرتکز ہوتا جائیگا مشینیت بڑھے گی سرمایہ مرتکز ہوگا، اجارہ داریاں قائم ہوں گی اور یہ تمام دنیا کے لوگ ایک بین الاقوامی مارکیٹ کا حصہ بن جائیں گے۔ یہ تمام باتیں رونما ہوئی ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے" میں نے کہا "لیکن ایسی بھی کئی باتیں ہیں جن کی تم نے پیش گوئی کی تھی اور وہ رونما نہیں ہوئیں۔ تم نے پیشگوئی کی تھی کہ مزدور طبقہ غریب سے غریب تر ہو جائے گا۔ طبقہ متوسط فنا ہو جائے گا اور قوم پرستی اور وطن پرستی کا زوال ہوگا۔ اب مغربی یورپ خصوصاً امریکہ میں بہت سے مزدوروں کا معیار زندگی اتنا اونچا ہے جو اس سے پہلے کئی سماجوں میں مراعات خصوصی کے حامل طبقے کا بھی نہیں ہوتا تھا۔ قوم پرستی کا جذبہ بدستور قوی ہے اور طبقہ متوسط ناپید نہیں ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ غیر اشتراکی اقتصادی نظاموں میں مزدوروں کو اشتراکی نظاموں والے ملکوں کے مقابلے میں زیادہ آزادی اور زیادہ سیاسی اقتدار حاصل ہے اور پیداوار میں سے بھی ان کو نسبتاً زیادہ حصہ ملتا ہے۔"

"میں بڑی خوشی سے یہ بات تسلیم کرتا ہوں" مارکس نے ہنس کر جواب دیا "لیکن میرا خیال ہے کہ اس کا کچھ کریڈٹ مجھے بھی ملنا چاہیے کیونکہ سیاسی اقدام کی ضرورت پر میں نے ہی زور دیا تھا اور فیکٹری کے ضابطوں پر بھی میں نے ہی توجہ مبذول کی تھی۔"

"لیکن ان چیزوں کے علاوہ جن کی تم نے پیش گوئی کی تھی۔ اور وہ رونما نہیں ہوئیں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں۔ جن کی تم نے پیش گوئی نہیں کی تھی اور وہ رونما ہوئیں۔ مثلاً نئی صنعتوں کا قیام تخلیقی قوتوں کی توسیع، فاشزم کا عروج اور ایک ویلفیئر سٹیٹ کے تصور کا عالم وجود میں آنا۔"

"میں نے سرمایہ دارانہ نظام کی قوت کا اندازہ لگانے میں غلطی کی تھی" مارکس نے کہا "اور اس بات کا اندازہ لگانے میں غلطی کی تھی کہ جمہوریت کو سماجی کنٹرول اور ذمہ داری کے استحکام کے لئے کہاں تک استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بات کا تعلق تفصیلات اور مقدار سے ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ کہا تھا کہ بعض ملک مثلاً انگلینڈ اور امریکہ میں سرمایہ دارانہ نظام کو پرامن طور پر تبدیل کرکے سوشلزم بنایا جا سکتا ہے۔ ٹیکنیکل انقلاب کا بھی یہی حال ہے میرا خیال ہے کہ میں پہلا شخص تھا جس نے یہ محسوس کیا کہ صنعت اور زراعت میں سائنس کے دانشمندانہ ٹیکنیکل استعمال کا سماج پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔"

"لیکن تم نے تو یہ کہا تھا کہ ٹیکنیکل ترقی ہمیشہ جنگ اور صنعت کی غلام اور اس کی ماتحت ہوتی ہے" میں نے احتجاج کیا "یہ بات نہ تو تمہارے ذہن میں تھی اور نہ کسی دوسرے کے ذہن میں کہ ٹیکنیکل ترقی اور اس کے تباہ کارانہ استعمال کے متعلق تم جو فیصلہ کرو گے اس کا تعلق ہمارے تمدن کے وجود یا عدم وجود سے بھی ہو سکتا ہے۔"

"بعض ایجادات اور ان کی قیمت کا اندازہ ان کی ابتدا سے ہی نہیں لگایا جا سکتا" مارکس نے تسلیم کیا "ماضی میں ٹیکنیکل ترقی کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں لیکن اگر موجودہ دور کے انسانوں نے ماضی کے انسانوں کے مقابلے میں ان کے متعلق زیادہ فراست سے کام لیا اور ان کے استعمال کی بہتر سکیم تیار کی تو ممکن ہے کہ نوع انسانی باقی رہ سکے اور اس کی آبادی میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہو جائے۔"

اب میں نے آخری سوال پوچھا "کیا تمہارے خیال میں ہمارے دور کا اہم ترین مسئلہ اب بھی سرمایہ داری اور سوشلزم کے تصادم کا مسئلہ ہے؟"

مارکس نے اپنی بات خوب سوچ سمجھ کر اور ٹھہر ٹھہر کر کہی "سرمایہ داری اور سوشلزم کا روایتی تصور آج صرف ایک خیالی چیز رہ گیا ہے اور سماجی حقیقت کو سمجھنے کے لئے بیکار ہے جہاں کہیں آزاد ادارے موجود ہیں۔ انہیں سرمائے کو سماجی طور پر زیادہ ذمہ دار بنانے اور مزدوروں کو زیادہ طاقت ور اور خوشحال بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے آزادی کے تحفظ کے علاوہ مغرب میں اب جو اہم مسئلے درپیش ہیں ان کا تعلق جائداد کی نئی شکلوں سے نہیں بلکہ انسانی تجربات کے لئے جمہوری طریقوں سے ہے اور ان کا مقصد انسانی زندگی کو زیادہ خوشگوار اور تخلیقی

تکمیل کے امکانات کو وافر تر بناتا ہے۔ سب تخائب سرمایہ داری اور سوشلزم میں نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آزادی کے امکانات کو زیادہ بہتر بنانے کے لئے کسی مخصوص صورت حال میں ان میں سے کون زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ سوشلزم کو اب فلاح کا ایک ایسا اصول سمجھنا چاہئے جس کا تمدن کو جمہوری بنانے کے ساتھ گہرا رابطہ ہے۔ یہ جمہوریت کا جزو لاینفک ہے اور ان دونوں کا زندگی کے ہر پہلو سے تعلق ہے خواہ وہ اقتصادی ہو، خواہ تعلیمی، خواہ سماجی۔ سوشلزم ایک سماجی نظام کی حیثیت سے جمہوری ہے۔ اس کا انحصار تخلیقی بصیرت پر ہے۔ اس تصور پر کہ ایک مقصد کو سامنے رکھکر کسی بھی انسانی ادارے کو تبدیل کیا جا سکتا ہے اور یہ مقصد ہے آزاد انسانوں پر مشتمل سماج کا ارتقا۔ اس سماج میں ہر شخص دوسرے سے مختلف ہوگا لیکن وہ دوسروں کے اختلافات کا احترام بھی کرے گا اور اس اختلافات سے لطف بھی لے سکے گا۔ لتنے میں وہ جہاز آپہنچا جسے مجھے زمین پر واپس لے جانا تھا۔ لاکی مجھے اس جہاز تک چھوڑنے آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میری اور اس کی بات چیت کو مشکل ہی سے باور کیا جائیگا۔ اس نے آخری بات جو مجھ سے کہی وہ ڈانٹے کا ایک فقرہ تھا جس پر اس نے اپنی اہم ترین تصنیف کے دیباچے کا بھی اختتام کیا تھا "اپنی راہ چلتے رہو اور لوگوں کو باتیں بنانے دو"

(ماہنامہ "تحریک" دہلی)

حاذق نروائن پلز

ایک جنرل ٹانک ہے جو عصبی اور دل ودماغ کی کمزوریوں کا مجرب علاج ہے۔ یہ گولیاں دماغی کام کرنے والے حضرات یعنی وکیل، بیرسٹر، پروفیسر اور طالب علم صاحبان کے واسطے آب حیات کا کام دیتی ہیں اور جسم انسانی کی جملہ عصبی کمزوریوں کو بحال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ دواخانہ ہذا کے خاص مجربات میں سے ہیں۔

قیمت :- (چالیس گولی) بڑا سائز پیس وام: چار روپے بارہ آنے

حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی ۲ سے طلب فرمائیں

حاذق ہسٹریا پلز

یہ گولیاں خالص و کمیاب جڑی بوٹیوں سے جدید طبی اصول پر تیار کی جاتی ہیں۔ عورتوں کی مشہور بیماری ہسٹریا (اختناق الرحم)، بچوں کی مرگی (ام الصبیان) کے لئے لاثانی دوا ہے اسکے علاوہ عام کمزوری، ضعف، ہضم، اختلاج قلب (دل کی دھڑکن) کیلئے بھی بہت مفید ہے۔ یہ دواخانہ ہذا کی لاجواب بے نظیر ترتیب ہے جس پر طب یونانی جس قدر بھی فخر کرے بجا ہے۔

قیمت :- فی شیشی (۴۰ گولی) پانچ روپے پانچ آنے

حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی ۲

رام لعل

نربدا کی آمد

سیتا خوش تھی۔ شادی کے بعد کے شروع کے ایام بے حد رنگین تھے۔ وقت بڑی تیزی سے سرکتا گیا۔ اس کے شوہر دلباغ کو ملازمت مل گئی تھی۔ لیکن انھیں کبھی تنخواہ کی فکر نہیں رہتی تھی۔ دونوں کے ماں باپ اپنے پیسے اور کپڑے لتے سے لیکر دال اور آٹے تک ان کی مدد کرتے رہتے تھے۔ انکی خوشیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ایک لڑکے کے بعد دوسرا لڑکا پیدا ہوا۔ دوسرے کے بعد تیسرا اور پھر ایک لڑکی کی باری آئی تو اور پھر اچانک سیتا نے محسوس کیا کہ بہار ختم ہو چکی ہے۔ وہ چھبیس برس کی ایک مریل سی عورت ہے۔ اس کے سر کے بال بڑی تیزی سے جھڑتے چلے جا رہے ہیں جن سے اب وہ پہلا سا خوبصورت اور سجیلا جوڑا بھی نہیں بنتا۔ اس کے گالوں کا ابھرا ابھرا سرخ گوشت اڑ چکا ہے۔ اور اب اس کا شوہر بھی پہلا سا بانکا، ہنس مکھ اور چست و چالاک نوجوان نہیں رہا ہے۔ بلکہ بڑھا ہوا شیو اور ہر وقت غصے میں رہنے والا ایک کلرک ہے جس کی میلے کالروں والی قمیصیں، پتلونیں اور پسینے کی بدبو سے بھری ہوئی بنیائنیں فرش پر بکھری رہتی ہیں۔ جو اپنے جوتوں پر خود کبھی پالش نہیں کرتا۔ اپنے جوتے کبھی ٹھیک مقام پر نہیں رکھتا اور جو اس کی بنائی ہوئی سبزی دال میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی نقص نکالتا ہی رہتا ہے اور جس نے اپنی صورت سے مشابہت رکھنے والے چار بچے بھی دے دیئے ہیں۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی۔

گھر میں ہر وقت خاصا ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ سب سے بڑا لڑکا نیرا تھا۔ جسے گلی میں کھیلنا بہت پسند تھا۔ اور بار بار ڈانٹ ڈپٹ سننے پر بھی گلی میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی عادت سے باز نہیں آتا تھا۔ پرکاش کو سکریں اور برف کی بنی ہوئی آئس کریم بہت پسند تھی سیدھے ہاتھوں پیسے نہ ملنے پر وہ چوری بھی کر لیا کرتا تھا۔ ہریش اور سدھا کو گھر کی چیزیں توڑنے پھوڑنے سے ہی کم فرصت ملتی تھی۔ فاؤنٹین پن کی سیاہی۔ ٹائم پیس کی سیل۔ تالوں کی چابیاں اور بوٹوں کے تسموں پر ان کی خاص نظر رہتی تھی۔

دلباغ کو اپنے افسر کی چاپلوسی بہت مرغوب تھی۔ دفتر سے اٹھتا تو اس کے ساتھ گھر تک جاتا۔ جب تک افسر خود اسے جانے کے لئے نہ کہتا، وہ اس کے آگے پیچھے پھرتا رہتا۔ جب لوٹتا تو عموماً بچے سوتے ہوئے ملتے۔ سیتا بھی سوئی ہوئی ہوتی۔ وہ اپنے آپ نعمت خانے سے ٹھنڈا کھانا نکال کر کھاتا اور ضرورت ہوتی تو سیتا کو کندھا ہلا کر جگا دیتا ورنہ پڑ کر سو جاتا۔ یہ ان کی زندگی کا معمول تھا۔ محدود تنخواہ کی وجہ سے اس معمول میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکی تھی۔ ورنہ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح تیسرے دن باہر گھومنے پھرنے اور سینما دیکھنے جایا کرے۔ وہ اگر خاوند کے سامنے تجویز بھی کرتی تو وہ اس سے روپے طلب کرتا۔ کیونکہ پوری تنخواہ وہ اسی کو لا دیا کرتا تھا۔ جو گھریلو ضروریات کے لئے ناکافی تھی۔ دلباغ کو اپنے بچوں سے بڑی محبت تھی۔ فرصت کے اوقات میں انہیں کندھے اٹھائے پھرتا تھا۔ ان سے سبق سنتا، پڑھاتا۔ لکھنا پڑھنا سکھاتا تھا۔ چونکہ وہ بہت دبو قسم کا شوہر تھا۔ اس لئے سیتا کو اس کے ساتھ لڑنے جھگڑنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ وہ عموماً پڑوسیوں اور دیگر لوگوں پر نکتہ چینی کرتی رہتی تھی۔ یہی عادت اس کی زندگی میں تھوڑی سی دلچسپی پیدا کئے ہوئے تھی۔ کوئی دوسری دلچسپی اگر تھی بھی تو وہ اس کے ماموں کی لڑکی نربدا کے خطوط تھے۔ جو اسے شملہ سے بھیجا کرتی تھی۔ وہ خطوط بہت دلچسپ ہوتے تھے اسے شادی سے پہلے کا زمانہ یاد دلاتے۔ کالج کی چہلیں اور کلیلیں اور سکھی سہیلیوں کے قصے اور باتیں!

جب ان کی زندگی کتابوں سے اگر تھوڑی سی الگ ہو سکتی تھی۔ تو رنگین لباسوں کے انتخاب اور لغو رسومات اور ناخنوں کی پالش میں

کھو جاتی تھی۔ نربدا بھی اس کے ساتھ پڑھتی تھی۔ دونوں بہت شریر ہوا کرتی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو پرانی شرارتیں یاد دلا کر بہت خوش ہوتی تھیں۔ انٹر کے بعد سیتا کی تو شادی ہو گئی تھی۔ لیکن نربدا نے اپنی تعلیم جاری رکھی تھی۔ اس کا باپ انجینیر تھا۔ وہ اپنی لڑکی کو ایم اے کرانا چاہتا تھا۔ بور بہت پر پڑھتے پڑھتے کئی برس گزار دیتے تھے۔ وہ اب تک کتنی ڈگریاں پا چکی تھی۔ سیتا اس سے اپنی شادی کے بعد نہیں مل سکی تھی۔ وہ دہلی سے لکھنؤ آگئے تھے۔ دہلی میں رہتے تو کبھی نہ کبھی ملاقات ہوتی ہی رہتی۔ جہاں اکثر خاندان کے افراد آتے جاتے اور ملتے رہتے تھے۔ اس دوران میں نربدا کے خطوط ہی سے اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کا ایک سکھ نوجوان سے رومانس چلا تھا۔ جو چند ماہ بعد سول میرج اور پھر چند ماہ بعد مستقل علیحدگی پر ختم ہو گیا تھا۔ تب سے وہ اپنے باپ کے پاس پڑھتی تھی۔

سیتا کو اچانک نربدا کا ایک خط ملا جس میں اس نے لکھا کہ وہ اس کے پاس لکھنؤ آ رہی ہے۔ اسے گلے کا آپریشن کرانا تھا بلکہ پورا اسپتال میں اس کے باپ کا ایک دوست ڈاکٹر بھاٹیہ متعین تھا۔ جس نے نربدا کو لکھنؤ آکر آپریشن کرانے کا مشورہ دیا تھا۔

سیتا اس خبر سے بہت خوش ہوئی۔ اس نے نربدا کو فوراً پہنچنے کے لئے لکھ دیا۔ لیکن اس کے دل میں ایک خوف تھا کہیں دلباغ کے ساتھ الجھنا نہ پڑ جائے۔ وہ گھر پر مہمان رکھنے کے خلاف تھا۔ کچھ عرصے پہلے دلباغ کا ایک بھتیجا ان کے ہاں آکر رہنے لگا۔ جسے سیتا نے بھی ناپسند کیا تھا۔ دلباغ کو مجبوراً اس کے لئے کہیں اور انتظام کرنا پڑا تھا۔ دلباغ پہلے بھی نربدا کے بارے میں نکتہ چینی کر چکا تھا اسے نربدا کے انجینیر باپ کی عقل پر افسوس ہوتا تھا۔ کہ اس نے خود اپنی لڑکی کی زندگی کو تباہی کے راستے پر ڈالا تھا۔ اگرچہ اسے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ سیتا کے خاندان کا معاملہ تھا ایک فرد کا ذاتی معاملہ تھا۔ پھر بھی اسے دلباغ کا رویہ تو معلوم تھا۔ جب وہ کھانا کھا رہا تھا۔ تو سیتا نے نربدا کے آنے کا ذکر کیا اور اسے اپنے ماموں کا وہ خط بھی دیا جو اس نے دلباغ کے لئے لکھا تھا لیکن اس نے خط پڑھے بغیر ہی مروڑ کر اس کی طرف پھینک دیا جو بند ہوا

سبزی کی کیتلی میں گرا اور وہ بڑبڑانے لگا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمارے پاس اتنی جگہ کہاں ہے؟ اسی ایک کمرے میں ہم سب کیسے رہیں گے؟ ایک بیمار آدمی کے لئے کیا کیا نہیں کرنا پڑتا.......؟"

سیتا نے سبزی کی کیتلی میں تیرتا ہوا خط نکال لیا۔ اور بولی وہ لوگ ہم پر اپنا حق سمجھتے ہیں، ورنہ ڈاکٹر بھاٹیہ بھی تو موجود ہیں۔"

"میں یہ کچھ نہیں جانتا۔ تم اپنی مرضی کی خود مالک ہو۔ میرا کہا تھوڑا مانوگی۔ اتنی بات ضرور کہونگا ایک فیشن ایبل مزاج کی بیمار لڑکی کی دیکھ بھال ہمارے بس کا روگ نہیں ہے۔ وہ یہاں خوبصورت فرنیچر اور دلپذیر ماحول کا تصور لیکر آ رہی ہوگی۔ اسے چھینک بھی آجائے گی تو تمہیں ڈاکٹر بلانے کے لئے دوڑانے گی۔ اب اسی گلے کے آپریشن کو لے لو۔ کیا وہیں شملہ یا دہلی میں نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا لکھنؤ میں ہی اسپیشلسٹ بیٹھے ہیں؟"

"تم تو خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنانے لگ جاتے ہو۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ یہاں ڈاکٹر بھاٹیہ ہیں جو میرے ماموں کے کلاس فیلو رہے ہیں، وہ خود نربدا کا آپریشن کریں گے۔"

"سیتا! تم اس کے مزاج کو کیوں نظر انداز کر دیتی ہو؟ اسی مزاج کی وجہ سے تو وہ اپنے خاوند کے ساتھ چار دن بھی نہ رہ سکی۔"

"اب مہربانی کر کے خاموش رہو، دوسروں کے معاملے میں اس طرح کہنے کا تمہیں کیا حق ہے؟ میں کہتی ہوں کہ اس کا خاوند حد درجہ شرابی تھا۔ ان کی علیحدگی کی بڑی وجہ یہی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے، ایسی لڑکی کے ساتھ شادی کر کے مرد شراب نہ پئے گا، تو کیا کرے گا۔"

"شراب کیا ہوتی ہے ممی؟" یکایک بیر نے کھانے کی پلیٹیں آپس میں ٹکرا کے پوچھا۔ بچے کھانا بھول گئے تھے، وہ ان کی باتوں کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔

"بکومت" دلباغ نے بیر کے گال پر تھپڑ جڑ دیا۔ "جلدی جلدی کھانا کھا کر سبق یاد کرو۔ آج کسی کو سبق یاد نہ ہوا، تو اسکی ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

نیرا گال پر ہاتھ رکھکر رونے لگا۔ اس کی شکل بالکل دلباغ سے ملتی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ دلباغ ہی گال پر ہاتھ رکھے رو رہا تھا۔

"سنو" سیتا نے نیرا کے رونے کو نظرانداز کرکے کہا "میں نے آرڈر کے لئے لکھ رکھی ہوں۔ میرا خط پہنچتے ہی اس کا تار آجائے گا۔ تم کو اسے لینے کے لئے اسٹیشن جانا ہوگا۔"

"میں نہیں جاسکتا۔ مجھے کیا پڑی ہے۔ کیا میں کسی کا چپراسی ہوں!" آج وہ بالکل ہی بگڑ چکا تھا۔ اس نے جلدی جلدی دو چار لقمے منہ میں ڈالے۔ پھر جلدی جلدی پانی کے گلاس ہی میں انگلیاں دھوکر سیدھا کھڑا ہوا اور اسے پیار کرتے ہوئے بولا: "میں نہیں چاہتا، میری بچی پر کسی ایسی لڑکی کا سایہ تک بھی پڑے۔"

سیتا سے اب برداشت نہ ہو سکا۔ وہ تن کر کھڑی ہوگئی آج اس کا شوہر بہت زیادتی کر رہا تھا۔ آج تک اس نے اس طرح زبان نہیں چلائی تھی۔ لیکن وہ سیتا کی آنکھوں میں آگ کے شعلے بھڑکتے دیکھکر جلدی سے باہر کھسک گیا۔ اسی وقت پرتش نے ہرتش کے بازو پر دانتوں سے کاٹ لیا۔ ہرتش نے روتے روتے اس کے منہ پر زور سے تھپڑ لگا دیا۔ جس سے پرتش کھڑا نہ رہ سکا۔ کھانے کی پلیٹوں پر جا گرا۔ تمام سبزی اور پانی الٹ گیا دونوں کے چیخنے چلانے سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ سیتا نے بمشکل دونوں کو الگ کیا اور غصے سے چلاتے ہوئے بولی "نرمدا آنے والی ہے اس کے سامنے تم لوگوں نے ایسی حرکتیں کیں تو خوب خبر لوں گی۔"

اسی وقت دلباغ پھر اندر آگیا۔ وہ باہر کھڑا سب کچھ سن رہا تھا۔ بولا: "تم ٹھیک کہتی ہو۔ جب نرمدا آجائے گی تو ہم سب گھر چھوڑ کر کہیں اور جا رہیں گے۔ مجھے امید ہے کہ مجھے اپنے دفتر میں کچھ جگہ مل جائے گی۔ مجھے اپنے افسر پر پورا بھروسہ ہے۔"

"دیکھو تم پھر بات بڑھا رہے ہو؟!" سیتا کی آنکھوں میں غصے کی بجائے آنسو آگئے "کیا میں نرمدا کو نہیں جانتی؟ وہ میرے ماموں کی لڑکی ہے۔ میرے ساتھ پڑھتی رہی ہے۔ وہ یہاں کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گی۔"

پرتش نے یکایک اپنی بندوق تان لی اور ماں کی طرف گھمنے لگا۔ اسے گھومتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ بندوق کی نالی ماں کی طرف تھی۔ وہ اسکے پاس جاکر بولا: "میں پوچھتا ہوں ممی نرمدا کون ہے، یہاں کیوں آئے گی؟" یہ کہتے کہتے اس نے گولی داغ دی۔ کارک سیتا کی گردن پر لگا۔ اور اس نے زور سے ایک طمانچہ لگا دیا۔ دلباغ نے پرتش کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور بولا: "چلو بچو، سب باہر چلو۔ اس وقت تمہاری ممی کو کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ وہ نرمدا کے خیال میں سب کو بھول گئی ہے۔"

وہ سب کو لیکر باہر چلا گیا۔ سیتا کو ہنسی بھی آئی اور رونا بھی اس کے خاوند نے کس قدر عجیب رویہ اختیار کر لیا تھا جیسے وہ بچوں سے اس سے زیادہ پیار کرتا تھا۔

نرمدا کو لینے کے لئے کوئی اسٹیشن نہ پہنچا۔ دلباغ بچوں کو لیکر کہیں کھسک گیا تھا۔ اس دن بارش ہو رہی تھی۔ سیتا خود اسٹیشن پر پہنچنے کے لئے تیار ہو رہی تھی کہ اچانک اس نے دروازے کے سامنے ایک تانگے کو رکتے ہوئے دیکھا۔ تانگے میں ایک جانی پہچانی صورت کی جھلک دیکھکر وہ لپک کر باہر نکل آئی۔ تانگے میں سچ مچ نرمدا تھی۔ وہ ذرا بھی تو تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ وہی بھرا بھرا ابھرا ہوا چہرہ، پتلا لمبا جسم، اور کمر پر لہراتی ہوئی لمبے بالوں کی دو چوٹیاں۔ اس کے لباس میں ضرور ایک تبدیلی تھی۔ تب وہ ہمیشہ شلوار قمیص پہنتی تھی۔ اب تنگ چھوٹی اور چست چولی اور ریشمی ساڑھی باندھے ہوئی تھی

"ہیلو سیتا!"

دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ دیر تک ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی کھڑی رہیں۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"تم کتنی بدل گئی ہو۔ سیتا! بالکل ایک گھریلو عورت معلوم ہوتی ہو۔ تمہاری صحت بہت اچھی ہے!" نرمدا نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔

سیتا کو اپنے پچکے ہوئے گال یاد آگئے۔ ناک کی نوک کا خیال آگیا۔ جس پر گہرا سرخ یا داغ پڑ چکا تھا۔ وہ نرمدا کے دونوں کاندھوں پر ہاتھ رکھکر اس کے چہرے کو گھورتی ہوئی بولی: "تم اب بھی خوبصورت ہو بالکل ویسی کی ویسی؟"

دونوں اندر آگئیں۔ نزہد نے اپنا سامان کھولا۔ اس کے پاس بہت سے کپڑے تھے۔ ریشمی، قیمتی اور نئے نئے فیشن کے۔ وہ ایک شہزادی معلوم ہوتی تھی۔ سیتا نے اس کے کپڑوں کی تعریف کی، تو وہ بول اٹھی: "سچ پوچھو تو سیتا! یہ کپڑے زندگی میں حقیقی خوشی نہیں لاتے میں نے خوب دیکھ لیا ہے۔"

اس نے جلدی سے سفر کے کپڑے بدل ڈالے، منہ ہاتھ دھو کر بال کھول دیئے۔ جلدی جلدی ان میں کنگھی کر کے جوڑا باندھنے لگی۔ اس کے بال پہلے سے زیادہ لمبے ہو گئے تھے۔ سیتا اس کی طرف بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی۔

دلباغ اور بچے ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ بارش تیز ہو گئی تھی جب وہ چائے پی رہی تھیں تو سیتا نے کہا: "نزہد! تم مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤ۔ شروع سے آخر تک، تم پر کیا کیا بیت چکی ہے؟"

وہ اس پر تقریباً جھک سی گئی: "تمہارا خاوند تو ریڈیو کے لئے فیچر لکھتا تھا۔ تم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے یکایک یہ جھگڑا کیوں ہو گیا؟"

نزہد ابھی اس کی طرف جھکتے ہوئے بولی: "سیتا! تم یقین نہیں کرو گی مجھے آج تک کوئی ایسا مرد نہیں نظر آیا جو مکمل ہو! مردوں میں بڑی بڑی خامیاں ہوتی ہیں۔ یہ عورتوں کا صبر اور حوصلہ ہو کہ انھیں نظر انداز کر جاتی ہیں۔ تم یہ سمجھو جب میں نے گوربخش سنگھ سے شادی کی تھی تو میں نے اس کی بہت سی خامیاں برداشت کر کے صرف اس کے آرٹ سے محبت کی تھی۔ تم جانتی ہو گی کہ یہ آرٹسٹ کس قدر عجیب ہوتے ہیں، لیکن وہ تو نرگد ھا نکلا۔ میں اس کی دوزخ میں نہیں رہ سکتی تھی۔ تین برس بعد مجھے مجبوراً الگ ہو جانا پڑا۔"

سیتا نے اس کے کندھے کو چھو کر کہا: "تم نے مجھے ہمیشہ اپنے راز بتائے ہیں۔ یہ بتاؤ دلیپ کا کیا ہوا؟ کالج کے زمانے میں تم اس سے محبت کرتی تھیں!"

"تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ تم مردوں کو نہیں جانتی ہو کیا؟ میں نے زندگی میں بہت کچھ دیکھ لیا ہے، کالج، یونیورسٹی، ریڈیو، فلمیں، اسٹیج، بڑے بڑے

اچھے اچھے لوگ! کتنے مردوں نے مجھ سے محبت کا اظہار کیا، لیکن.....!"

نزہد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں اور زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

سیتا نے اس کے آنسو پونچھے۔ اس کا سر گود میں رکھ لیا۔ نزہد کا دل واقعی ٹوٹ چکا تھا۔ سیتا نے کہا: "میرا خیال ہے نزہد! تم اگر مجھ پر بھروسہ کرو تو میں تمہاری زندگی سنوار سکتی ہوں۔ ان کے افسر کا ایک چھوٹا بھائی ہے، ابھی چند ماہ پہلے اس کی بیوی ایک حادثے کا شکار ہو گئی ہے، نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے، خوبصورت اور تعلیم یافتہ بھی ہے۔ اگرچہ مجھے تمہارے جیجا جی کو یہ کام کرانے کے لئے بہت کچھ کہنا سننا ہو گا، لیکن یہ رشتہ ہو سکتا ہے، میرا مطلب ہے، تم اگر چاہو تو؟"

"فار گاڈ سیک، سیتا! تم نہیں جانتی ہو اب میں اس زندگی سے کس قدر تنگ آچکی ہوں۔ میں یہاں آرام کرنے آئی ہوں، اور کوئی بات نہیں ہو گی۔"

"ٹھیک ہے، میں تو صرف تمہاری رائے معلوم کر رہی تھی اب تمہارے ساتھ میرے دن بھی اچھی طرح کٹ جائیں گے۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ میں نے گزشتہ سات سال میں ایک بھی فلم نہیں دیکھی کسی ہوٹل میں لیمونیڈ تک نہیں پیا۔ میرے لئے تو تفریحات کی زندگی ہی ختم ہو چکی ہے۔ کیا تم میری بے بسی کا اندازہ کر سکتی ہو؟ ہم کل ہی دن میں کہیں چلیں گے۔"

نزہد ہنس پڑی: "تم کہتی ہو تو میں ضرور چلوں گی، سیتا! لیکن یہ سمجھ لو کہ میرے لئے ان میں اب کشش نہیں ہے۔ میں نے ہزاروں فلمیں اور ڈرامے اور کنسرٹ دیکھے ہیں۔ میری تو نیند حرام ہو گئی ہے، سیتا تم تعجب کرو گی، میں کئی مرتبہ رات رات بھر سو نہیں سکی۔ پوری رات کروٹیں بدلتے گزر جاتی ہے۔ سوچتے سوچتے صبح ہو جاتی ہے۔"

"اگر واقعی تمہاری یہی کیفیت ہے تو بہت عجیب ہے۔ اگرچہ یقین نہیں آتا!"

"تمہارے لئے یہ عجیب ہو سکتی ہے سیتا! کیونکہ تمہارا ماحول بالکل دوسرا ہے۔ تمہارے چار بچے ہیں۔ خاوند ہے جو تم پر جان چھڑکتا ہے۔ تمہیں ایک بالکل حقیقی زندگی میسر ہے۔"

"بالکل حقیقی کیسے؟" سیتا نے بے چین ہو کر کہا: "تمہیں میری حقیقی
ی کا ٹھیک اندازہ نہیں ہے"
"چل ہٹ!" نزبدا نے کہا "دلباغ تم سے بہت پیار کرتا ہے
س گھر کی ہر ایک چیز سے اس کی محبت کا اندازہ ہو رہا ہے۔ جیسے
تمہاری ضرورت ہے۔ اس گھر میں پانچ روحیں ہیں۔ جن کی دنیا
ے دم سے ہے۔ مجھے دیکھو۔ میں چاہے مروں یا جیوں، کسی کو
پرواہ ہوگی، ایسا کوئی شخص نہیں!"
"پھر بھی تم کتنی آزاد ہو۔ کتنی بے فکر ہو"
"تم بالکل پاگل ہو سیتا! کیا تم ابھی تک ان دنوں کو یاد کرتی ہو۔
ب ہمارے پیچھے پیچھے لڑکے گھوما کرتے تھے۔ ہر وقت ٹیلیفون نمبر ملانے
فکر میں رہتے تھے۔ جب ہم پر بننے سنورنے کا بھوت سوار رہتا تھا
"ہاں، بالکل بالکل، وہی زندگی میری آنکھوں کے سامنے ناچ
ی ہے۔ وہی سماں نظر آ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے، میں پھر....!"
نزبدا نے سیتا کی طرف بڑی اداس نظروں سے دیکھا اور سر ملا کر
لی "وہ زمانہ چلا گیا۔ جیسے بالکل خواب ہو گیا ہے" اس کے ہونٹ
مڑ کر ایک مسکراہٹ بن گئے "تم سمجھ لو، میں تمہارے ساتھ صرف
ں لئے باہر نہیں جا سکوں گی۔ تم محض ہمدردی کی خاطر مجھے پھر اس دنیا
یں لے جاؤ گی، جہاں صرف تفریح ہی تفریح ہے اور اس کے پیچھے زہر
ہی زہر اور دھواں بھی! بس کسی طرح جلدی سے گلے کا آپریشن ہو جائے
ذ میں لوٹ جاؤں"
"خیر تمہاری مرضی! لیکن اتنا ضرور کہدوں کہ اس گھر میں پڑے
سڑتے رہنا بھی کوئی زندگی نہیں ہے، تم بہت جلدی اکتا جاؤ گی"
"اکتا جاؤ نگی؟ میرا خیال ہے کہ تم خود اپنی زندگی سے اکتا چکی ہو
لیکن میں تمہاری پوری پوری مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میں ابھی
کچن میں جا کر ترکاری بناتی ہوں۔ میں سچ کہتی ہوں، میرا جی چاہتا ہے کہ
کسی کے میلے کچیلے کپڑے دھویا کروں۔ گھر کی چنتا میں غرق رہا کروں،
تمہارے بچے پڑھنے جاتے ہوں گے۔ کچھ دن میں انہیں اسکول چھوڑ آیا
کروں گی" یہ کہتے کہتے نزبدا ہنس پڑی۔ سیتا کے گلے میں باہیں
ڈال کر بولی "معاف کرنا بہن! میں نے فضول باتوں میں تمہارا
بہت مغز چاٹا ہے"
"واہ! تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری
خاطر کیسے کروں۔ تم کہیں یہاں سے ذرا اکتا نہ جاؤ"
"بس اب رہنے بھی دو!" نزبدا یہ کہتے کہتے اٹھ کھڑی ہوئی اور
اندر کمرے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی "تمہارا مکان تو دیکھوں"
اسی وقت دروازے پر کھٹکا ہوا۔ دلباغ بچوں کو لیکر لوٹ
آیا تھا۔
سیتا نے کہا "یہاں آؤ نزبدا، تمہیں ان سے ملاؤں۔ یہ
سب آ گئے ہیں!"
لیکن نزبدا نے اس کی آواز نہ سنی، وہ اندر کمرے میں چلی گئی
دلباغ اور بچے صحن میں سے ہوتے ہوئے برآمدے میں آ گئے سب کے
کپڑے اور بال بارش میں بھیگ گئے تھے اور پیروں پر کیچڑ لگا ہوا تھا
نیرا سیدھا اندر بھاگتا چلا گیا اور پھر فوراً ہی باہر آ کر بولا "ممی! اندر
کمرے میں کوئی عورت ہے"
"چپ! بدتمیزی سے مت بولو۔ وہ تمہاری موسی ہے سمجھے
اور جب تک یہاں رہے، بڑے ادب سے بات کرو"
دلباغ کمرے میں ایک طرف چپ چاپ کھڑا سیتا کو دیکھ رہا
تھا۔ سیتا اس کی خاموشی سے پریشان تھی۔ بولی "تم سب اپنے
گیلے کپڑے اتار ڈالو نہیں تو سردی لگ جائے گی" پھر اپنے خاوند کی
طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی "تم نہیں بدلو گے؟ میں نکالدوں کپڑے"
"نہیں جی شکریہ! میں خود نکال لونگا"
سیتا کو صرف ایک خوف تھا۔ وہ نزبدا کے سامنے کوئی ایسی
ویسی بات نہ کہدے، وہ جلدی جلدی بچوں کے گیلے کپڑے اتارنے
لگی۔ اچانک چاروں بچوں اور دلباغ کی نظریں دروازے پر جم گئیں
جو سیتا کی پشت پر تھا۔ سیتا نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں نزبدا کھڑی تھی
اونچی پتلی اور دلکش نزبدا، ہونٹوں پر دل لبھانے والی مسکراہٹ لئے
"آؤ نزبدا، میں تمہیں سب سے ملاؤں ——— یہ میرا لڑکا
نیرا، یہ اس سے چھوٹا ہرنیش اور یہ پرنش اور یہ ہماری سدھا ہے! یہ
تمہارے جیجا جی"

"نمستے !"

نربدا کو جواب دینے کے لئے دلباغ زیادہ دیر تک خاموش نہ رہ سکا فوراً ہاتھ جوڑ دیئے۔ اور مسکرا دیا۔ اور خلاف توقع معذرت کرتے ہوئے بولا "معاف کیجئے، میں آپ کو لینے کے لئے اسٹیشن پر نہیں آسکا۔ دراصل مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ .... دراصل میں اپنی غلطی محسوس کرتا ہوں مجھے معاف کر دیجئے"۔

وہ اس قدر مہذب اور سنجیدہ بن گیا۔ یہ دیکھ کر سیتا کی حیرت کی کوئی حد نہیں رہی۔ پھر وہ سوچنے لگی۔ وہ پہلے کب غیر مہذب اور غیر سنجیدہ رہا تھا۔ دوسروں کے روبرو تو وہ بڑے اخلاق سے پیش آتا تھا کم از کم یہ وصف تو اس کے اندر موجود ہی تھا۔

نربدا نے سب بچوں کے سر پر باری باری ہاتھ پھیرا۔ نیرا کو اپنے ساتھ چمٹا کر اس کے گال پر چوم بھی لیا۔ سب بچے اس سے متاثر نظر آتے تھے۔ سدھا کو وہ گود میں اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ اسے بار بار چومنے لگی۔ اس کے گیلے بالوں پر اپنی آنکھیں رکھ کر مسکرانے لگی۔ ناک سے اس کے گال پر گدگدی کرنے لگی "ہُو ہُو ہُو۔ بے بی"۔

سیتا جلدی جلدی بچوں کے کپڑے تبدیل کر رہی تھی۔ نربدا اور دلباغ باتیں کر رہے تھے۔ وہ اس کے گلے کی خرابی اور آپریشن کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ سیتا ان کی باتیں سن رہی تھی۔ یہ باتیں ابھی تک خود اس نے بھی نہیں پوچھی تھیں۔ نربدا دل میں کیا کہتی ہو گی۔ اس نے دلباغ کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا۔ اس میں دوسرے کئی نقائص سہی۔ لیکن اس موقعہ پر تو وہی کچھ کر رہا تھا جو اسے کرنا چاہیے تھا

دلباغ نے سیتا سے پوچھا "چائے کا پانی آگ پر دھرا ہے یا نہیں"۔

سیتا نے بھی بڑے ہی ادب سے جواب دیا "جی ہاں رکھا ہوا ہے ذرا دیکھ لیجئے"۔

دلباغ اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے نربدا بھی چلی گئی اس نے کہا "لائیے میں چائے بنا دوں"۔

"نہیں نہیں، آپ بیٹھئے، میں بنا لیتا ہوں"۔

"آپ تو بناتے ہی ہوں گے، آج میں بنا دوں گی، شاید آپ کو پسند آجائے"۔

"اچھا!" دلباغ ہنس رہا تھا۔ نربدا بھی ہنس رہی تھی سیتا جب سب بچوں کو کپڑے پہنا چکی تو اسی وقت نربدا اور دلباغ چائے اور برتن لیکر آپہنچے۔ دونوں مسکرا رہے تھے۔ دلباغ نے ابھی تک بارش سے بھیگے ہوئے کپڑے تبدیل نہیں کئے تھے۔ اس کے سر کے بال پیشانی کے ساتھ چپک گئے تھے۔ وہ بہت عجیب معلوم ہو رہا تھا لیکن وہ اپنی حالت سے بالکل بے خبر تھا نربدا نے سب کو چائے دی۔ وہ اس گھر میں سب کے درمیان ایک دلکش پری دکھائی دیتی تھی، وہ اپنے حسن سلوک سے سب کا دل جیت رہی تھی، سیتا سوچ رہی تھی کہ کسی فلم کی ہیروئن معلوم ہوتی تھی۔ نیرا۔ ہریش اور سدھا سب کے سب نربدا کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ بالکل سمٹ کر اور اس کی طرف بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ سیتا سے نہ رہا گیا بولی "تم سب کو آج کیا ہو گیا ہے؟"

سب کے سب مسکرا دیئے۔ نربدا نے نیرا کے خوبصورت بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ جس میں سیتا نے ابھی ابھی کنگھی کی تھی۔

نربدا بولی "یہ چھوکرا مجھے پسند ہے"۔

سیتا کا خیال تھا۔ نیرا اپنے لئے چھوکرے کا خطاب سن کر لڑ پڑے گا۔ کیونکہ پہلے ایک موقعہ پر ایک عورت کے ساتھ اسی بات پر لڑ پڑا تھا۔ اس نے کہا تھا "دیکھئے جی! میں چھوکرا نہیں ہوں بلکہ چوپڑ ہوں۔ میری عمر بارہ برس کی ہے چھٹی جماعت میں پڑھتا ہوں پھر چھوکرا نہ کہیئے گا"۔

لیکن نربدا کے سامنے وہ بالکل بھیگی بلی بن گیا۔ سر جھکا کر وہ چائے پینے لگا، اور ایک گھونٹ پی کر نربدا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ بہت خوبصورت ہیں!"

"ہاں، موسی جی!" ہریش بھی بول اٹھا "آپ سچ مچ بہت سندر ہیں۔ ہماری ممی سے بھی زیادہ۔ کیوں، پاپا جی؟"

سیتا اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گئی۔

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو" دلباغ نے مسکراتے ہوئے بچوں کی تائید کر دی۔ نربدا نے چائے کا پیالہ ہاتھ سے رکھ کر نیرا اور ہریش کو اپنے کندھا

ر بولی "تم سب ہی تو بہت خوبصورت ہو۔ مجھے پیارے لگتے
ن کے چہرے پر سرخ سرخ لہریں ابھر رہی تھیں۔
سیتا کا جی چاہا۔ میز کے کونے پر رکھا ہوا ٹیبل لیمپ جلتے
خون پر گرا دے لیکن بڑے ضبط سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تاکہ
اندر مچے ہوئے طوفان کو کسی طرح چھپا سکے۔
دلباغ نے پوچھا "کہاں جا رہی ہو؟"
"آؤ چھیلنے، کھانا جلدی نہ بنا تو زبیدا کو اسپتال پہنچنے میں دیر
ے گی۔"
"تم ٹھیک کہتی ہو۔"
یہ کہکر جیسے دلباغ نے اسے دھکا دیکر کمرے سے باہر کر دیا ہو
رھی کچن میں جا رکی۔ کچن کمرے کی بغل میں تھا۔ وہ کالی کے پاس
ھانا تیار کرنے لگی۔ دلباغ اور زبیدا باتیں کر رہے تھے۔ وہ فلموں
ٹ کر رہے تھے۔ وہ اداکاری اور موسیقی پر گفتگو کر رہے تھے۔ دلباغ
ی اداکاروں کے بارے میں اپنی اپنی رائے دی۔ زبیدا نے بتایا
ایک سال مس شملہ بھی چنی گئی تھی۔ پھر اچانک دلباغ نے پوچھا۔
"آپ بمبئی کیوں نہیں گئیں۔ آجکل تو فلموں میں پڑھی لکھی لڑکیاں
رتی ہیں۔"
"جی تو چاہتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ایک ڈائریکٹر کو اپنے
فوٹو بھیجے تھے۔ اس نے مجھے بمبئی آنے کے لئے لکھا تھا لیکن انہی دنوں
شادی ہو رہی تھی۔ میرے ڈیڈی اور ہونے والے شوہر نے
بات کو منظور نہیں کیا تھا۔ اگر وہ رضامند ہو گئے ہوتے تو آج میں
نرگس اور مینا ربائے کی طرح مشہور ہو گئی ہوتی۔"
"کیوں نہیں، کیوں نہیں، میں آپ کے اندر کوئی کمی نہیں پاتا۔
محض اتفاق کی بات ہے۔ یوں سمجھئے، آپ کی بدقسمتی تھی۔"
آلو چھیلتے چھیلتے سیتا اپنی انگلی کاٹ بیٹھی۔ درد ہونے کے ساتھ
تھ ذرا ذرا خون بھی نکل آیا۔
کھانا تیار کر کے وہ کچن سے باہر نکلی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ اس سے
خاوند کی آنکھوں کی طرف نہ دیکھا گیا۔ اس کی نگاہیں مسلسل زبیدا کے جسم
حسن کا جائزہ لے رہی تھیں۔ آج وہ بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔

"کھانا تیار ہے۔"
"ویری گڈ۔" دلباغ مہک اٹھا۔
"ممی زندہ باد۔" یہ نیرا تھا۔
ہریش اور پریش کھانا پک جانے کی خوشی میں تالی بجا رہے تھے
سدھا زبیدا کی گود ہی میں تھی۔ وہ اس کے بالوں میں کنگھی کر کے سرخ
ربن باندھ رہی تھی۔
کھانے کے بعد زبیدا نے ایک بہت خوبصورت ساڑھی زیب تن کی
پہنا۔ بال کھولکر پھر کنگھی کی اور دو چوٹیاں بنائیں۔ دلباغ ایک طرف
کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ تیار ہو گئی تو وہ بھی کپڑے بدلنے لگا۔ اس
نے بہت عرصہ کے بعد نکٹائی بھی باندھی جس پر جا بجا شکن تھے۔ یہ کپڑوں
کے نیچے دبی پڑی تھی۔ وہ زبیدا کے ساتھ ہسپتال جا رہا تھا۔ انہیں تیار
دیکھ کر بچے بھی ساتھ جانے کے لئے مچل رہے تھے لیکن جب بچے نے بھی زبان
کھولی۔ سیتا نے اس کی خبر لی۔ گھڑی بھر میں پورا گھر میدان جنگ بن گیا
ہر طرف رونے اور چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دلباغ نے سیتا کو ایک
مرتبہ بھی بچوں کو مارنے سے نہ روکا۔ وہ بالکل خاموش نظروں سے دیکھتا
رہا۔ جیسے زبیدا کو بتانا چاہتا ہو کہ سیتا ایسی ہے، ہمیشہ ایسا کرتی ہے
اس کی خاموشی سے سیتا اور بھی جل اٹھی۔ زبیدا بھی خاموش تھی جیسے
وہ دونوں نہ چاہتے ہوں کہ بچے ان کے ساتھ باہر جائیں۔
زبیدا بکس میں سے سینڈل نکال رہی تھی۔ دلباغ تانگہ لانے
گیا تھا۔ باہر ابھی تک ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ سیتا کے ذہن
میں ایک خیال تیزی سے اٹھا۔ وہ کمرے میں جا کر زبیدا کا سامان
باندھنے لگی۔ اس کی تمام بکھری ہوئی اشیا کو سوٹ کیس میں ڈال
دیا۔ زبیدا کو بہت تعجب ہوا۔ اس نے پوچھا "یہ کیا کر رہی ہو؟"
"تمہارا سامان باندھ رہی ہوں۔" اس کے لہجے میں بڑی تلخی تھی
"کیوں؟"
اس نے ایک لمحہ کے لئے ہاتھ روکا، اور بولی "معاف کرنا
زبیدا! میرا گھر تمہارے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ تمہارے آنے سے پہلے
اس کا بھی یہی خیال تھا۔ اسی وجہ سے وہ تمہیں لینے کے لئے اسٹیشن
نہیں گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تم ڈاکٹر بھاٹیہ کے ہاں جا کر رہو تو بہتر

"نمستے!"

نربدا کو جواب دینے کے لئے دلباغ زیادہ دیر تک خاموش نہ رہ سکا فوراً ہاتھ جوڑ دیئے۔ اور مسکرا دیا۔ اور خلاف توقع معذرت کرتے ہوئے بولا "معاف کیجئے، میں آپ کو لینے کے لئے اسٹیشن پر نہیں آسکا۔ دراصل مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ .... دراصل میں اپنی غلطی محسوس کرتا ہوں مجھے معاف کر دیجئے۔"

وہ اس قدر مہذب اور سنجیدہ بن گیا۔ یہ دیکھ کر سیتا کی حیرت کی کوئی حد نہیں رہی۔ پھر وہ سوچنے لگی۔ وہ پہلے کب غیر مہذب اور غیر سنجیدہ رہا تھا۔ دوسروں کے روبرو تو وہ بڑے اخلاق سے پیش آتا تھا کم از کم یہ وصف تو اس کے اندر موجود ہی تھا۔

نربدا نے سب بچوں کے سر پر باری باری ہاتھ پھیرا۔ نیرا کو اپنے ساتھ چمٹا کر اس کے گال پر چوم بھی لیا۔ سب بچے اس سے متاثر نظر آتے تھے۔ سدھا کو وہ گود میں اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ اسے بار بار چومنے لگی۔ اس کے گیلے بالوں پر اپنی آنکھیں رکھ کر مسکرانے لگی۔ ناک سے اس کے گال پر گدگدی کرنے لگی "ہُوہُو ہُو۔ بے بی"

سیتا جلدی جلدی بچوں کے کپڑے تبدیل کر رہی تھی۔ نربدا اور دلباغ باتیں کر رہے تھے۔ وہ اس کے گلے کی خرابی اور آپریشن کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ سیتا ان کی باتیں سن رہی تھی۔ یہ باتیں ابھی تک خود اس نے بھی نہیں پوچھی تھیں۔ نربدا دل میں کیا کہتی ہو گی۔ اس نے دلباغ کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا۔ اس میں دوسرے کئی نقائص سہی۔ لیکن اس موقعہ پر تو وہی کچھ کر رہا تھا جو اسے کرنا چاہیئے تھا

دلباغ نے سیتا سے پوچھا "چائے کا پانی آگ پر دھرا ہے یا نہیں"

سیتا نے بھی بڑے ہی ادب سے جواب دیا "جی ہاں رکھا ہوا ہے ذرا دیکھ لیجئے"۔

دلباغ اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے نربدا بھی چلدی اس نے کہا "لایئے میں چائے بنا دوں"

"نہیں نہیں، آپ بیٹھئے، میں بنا لیتا ہوں"

"آپ تو بناتے ہی ہوں گے، آج میں بنا دوں گی، شاید آپ کو پسند آجائے"۔

"اچھا!" دلباغ ہنس رہا تھا۔ نربدا بھی ہنس رہی تھی سیتا جب سب بچوں کو کپڑے پہنا چکی تو اس وقت نربدا اور دلباغ چائے اور برتن لیکر آپہنچے۔ دونوں مسکرا رہے تھے دلباغ نے ابھی تک بارش سے بھیگے ہوئے کپڑے تبدیل نہیں کئے تھے۔ اس کے سر کے بال پیشانی کے ساتھ چپک گئے تھے۔ وہ بہت عجیب معلوم ہو رہا تھا لیکن وہ اپنی حالت سے بالکل بے خبر تھا نربدا نے سب کو چائے دی۔ وہ اس گھر میں سب کے درمیان ایک دلکش پری دکھائی دیتی تھی، وہ اپنے حسن سلوک سے سب کا دل جیت رہی تھی، سیتا سوچ رہی تھی کہ کسی فلم کی ہیروئن معلوم ہوتی تھی۔ نیرا۔ ہریش اور سدھا سب کے سب نربدا کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ بالکل سمٹ کر۔ اور اس کی طرف بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ سیتا سے نہ رہا گیا بولی "تم سب کو آج کیا ہو گیا ہے؟"

سب کے سب مسکرا دیئے۔ نربدا نے نیرا کے خوبصورت بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ جس میں سیتا نے ابھی ابھی کنگھی کی تھی۔

نربدا بولی "یہ چھوکرا مجھے پسند ہے"۔

سیتا کا خیال تھا۔ نیرا اپنے لئے چھوکرے کا خطاب سن کر لڑ پڑے گا۔ کیونکہ پہلے ایک موقعہ پر ایک عورت کے ساتھ اسی بات پر لڑ پڑا تھا۔ اس نے کہا تھا "دیکھئے جی! میں چھوکرا نہیں ہوں نیرش کمار چوپڑہ ہوں۔ میری عمر بارہ برس کی ہے چھٹی جماعت میں پڑھتا ہوں پھر چھوکرا نہ کہیئے گا"۔

لیکن نربدا کے سامنے وہ بالکل بھیگی بلی بن گیا۔ سر جھکا کر وہ چائے پینے لگا، اور ایک گھونٹ پی کر نربدا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا

"آپ بہت خوبصورت ہیں!"

"ہاں، موسی جی!" ہریش بھی بول اٹھا "آپ سچ مچ بہت سندر ہیں۔ ہماری ممی سے بھی زیادہ۔ کیوں، پاپا جی؟"

سیتا اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گئی۔

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو" دلباغ نے مسکراتے ہوئے بچوں کی تائید کر دی۔ نربدا نے چائے کا پیالہ ہاتھ سے رکھ کر نیرا اور ہریش کو اپنے ساتھ

لگا لیا اور بولی ؟" تم سب ہی تو بہت خوبصورت ہو۔ مجھے پیارے لگتے ہو۔" اس کے چہرے پر سرخ سرخ لہریں تیر رہی تھیں۔

سیتا کا جی چاہا۔ میز کے کونے پر رکھا ہوا ٹیبل لیمپ چائے کے برتنوں پر گرادے لیکن بڑے ضبط سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تاکہ دل کے اندر مچے ہوئے طوفان کو کسی طرح چھپا سکے۔

دلباغ نے پوچھا۔ "کہاں جا رہی ہو؟"

"آؤ چلیئے، کھانا جلدی نہ بنا تو زبیدا کو اسپتال پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔"

یہ کہکر جیسے دلباغ نے اسے دھکا دیکر کمرے سے باہر کر دیا ہو۔ وہ سیدھی کچن میں جا رکی۔ کچن کمرے کی بغل میں تھا۔ وہ کالی کے پاس بیٹھکر کھانا تیار کرنے لگی۔ دلباغ اور زبیدا باتیں کر رہے تھے۔ وہ فلموں پر بحث کر رہے تھے۔ وہ اداکاری اور موسیقی پر گفتگو کر رہے تھے۔ دلباغ نے کئی اداکاروں کے بارے میں اپنی اپنی رائے دی۔ زبیدا نے بتایا کہ وہ ایک سال مس شملہ بھی چنی گئی تھی۔ پھر اچانک دلباغ نے پوچھا۔

"آپ بمبئی کیوں نہیں گئیں۔ آجکل تو فلموں میں پڑھی لکھی لڑکیاں کام کرتی ہیں۔"

"جی تو چاہتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ایک ڈائریکٹر کو اپنے کچھ فوٹو بھیجے تھے۔ اس نے مجھے بمبئی آنے کے لئے لکھا تھا لیکن انہی دنوں میری شادی ہو رہی تھی۔ میرے ڈیڈی اور ہونے والے شوہر نے اس بات کو منظور نہیں کیا تھا۔ اگر وہ رضامند ہو گئے ہوتے تو آج میں بھی نرگس اور مینا رائے کی طرح مشہور ہو گئی ہوتی۔"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں، میں آپ کے اندر کوئی کمی نہیں پاتا۔ یہ تو محض اتفاق کی بات ہے۔ یوں سمجھئے، آپ کی بدقسمتی تھی۔"

آلو چھیلتے چھیلتے سیتا اپنی انگلی کاٹ بیٹھی۔ درد ہونے کے ساتھ ساتھ ذرا ذرا خون بھی نکل آیا۔

کھانا تیار کرکے وہ کچن سے باہر نکلی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ اس سے اپنے خاوند کی آنکھوں کی طرف نہ دیکھا گیا۔ اس کی نگاہیں مسلسل زبیدا کے جسم اور حسن کا جائزہ لے رہی تھیں۔ آج وہ بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔

"کھانا تیار ہے۔"

"ویری گڈ۔" دلباغ مہک اٹھا۔

"ممی زندہ باد۔" یہ نیرا تھا۔

ہریش اور پریش کھانا پک جانے کی خوشی میں تالی بجا رہے تھے۔ سدھا زبیدا کی گود ہی میں تھی۔ وہ اس کے بالوں میں کنگھی کر کے سرخ ربن باندھ رہی تھی۔

کھانے کے بعد زبیدا نے ایک بہت خوبصورت ساڑھی زیب تن کی۔ بال کھولکر پھر کنگھی کی اور دو چوٹیاں بنالیں۔ دلباغ ایک طرف کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ تیار ہو گئی تو وہ بھی کپڑے بدلنے لگا۔ اس نے بہت عرصہ کے بعد نکٹائی بھی باندھی جس پر جا بجا شکن تھے۔ یہ کپڑوں کے نیچے دبی پڑی تھی۔ وہ زبیدا کے ساتھ ہسپتال جا رہا تھا۔ انہیں تیار دیکھکر بچے بھی ساتھ جانے کے لئے مچل رہے تھے۔ لیکن جب بچے نے بھی زبان کھولی۔ سیتا نے اس کی خبر لی۔ گھڑی بھر میں پورا گھر میدانِ جنگ بن گیا ہر طرف رونے اور چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دلباغ نے سیتا کو ایک مرتبہ بھی بچوں کو مارنے سے نہ روکا۔ وہ بالکل خاموش نظروں سے دیکھتا رہا۔ جیسے زبیدا کو بتانا چاہتا ہو کہ سیتا ایسی ہے، ہمیشہ ایسا کرتی ہے اس کی خاموشی سے سیتا اور بھی جل اٹھی۔ زبیدا بھی خاموش تھی جیسے وہ دونوں نہ چاہتے ہوں کہ بچے ان کے ساتھ باہر جائیں۔

زبیدا بکس میں سے سینڈل نکال رہی تھی۔ دلباغ تانگہ لانے گیا تھا۔ باہر ابھی تک ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ سیتا کے ذہن میں ایک خیال تیزی سے اٹھا۔ وہ کمرے میں جاکر زبیدا کا سامان باندھنے لگی۔ اس کی تمام بکھری ہوئی اشیا کو سوٹ کیس میں ڈال دیا۔ زبیدا کو بہت تعجب ہوا۔ اس نے پوچھا "یہ کیا کر رہی ہو؟"

"تمہارا سامان باندھ رہی ہوں۔" اس کے لہجہ میں بڑی تلخی تھی

"کیوں؟"

اس نے ایک لمحہ کے لئے ہاتھ روکا، اور بولی "معاف کرنا زبیدا! میرا گھر تمہارے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ تمہارے آنے سے پہلے اس کا بھی یہی خیال تھا۔ اسی وجہ سے وہ تمہیں لینے کے لئے اسٹیشن نہیں گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تم ڈاکٹر بھاٹیہ کے ہاں جاکر رہو تو بہتر

ہوگا۔ اس طرح وہ ناراض بھی نہیں ہوگا۔" یہ کہکر وہ پھر سامان باندھنے لگی

نزہدا کچھ نہ بولی۔ صرف مسکرا دی۔ باہر نکل کر سڑک پر دونوں طرف دیکھا۔ دلباغ تانگہ لیکر ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ سامنے سے ایک لوہاری تانگہ آرہا تھا۔ اسے بلاکر اپنا تمام سامان اس میں رکھوا دیا۔ چھ سوٹ کیس تھے۔ چار ٹیچی، ایک بکس اور ایک ہولڈال۔

جدا ہونے سے پہلے دونوں سہیلیوں کی نگاہیں نیچی تھیں۔ ایک دوسری کی طرف دیکھ نہ سکیں۔

نزہدا کے جانے کے بعد دلباغ بھی تانگہ لے کر آگیا۔ اور گھر میں نزہدا کو نہ پاکر حیرانگی سے بولا:۔

"نزہدا کہاں ہے؟"

سیتا نے جیسے ایک عرصہ کے بعد پہلی مرتبہ اپنا منہ کھولا "جہنم میں، کیا تم بھی جاؤ گے اس کے پیچھے؟"

دلباغ ایک طرف سکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ کوئی جواب نہ دیا۔ سیتا نے کہا: "کھڑے کھڑے دیکھ کیا رہے ہو؟ یہ ٹائی بھائی اب اتار ڈالو اور ذرا بچوں کی بھی سدھ لو۔ کتنے روز سے انھوں نے کتابوں کو چھوا تک نہیں"

(بشکریہ "مشرب")

قمر جمیل •

غزل

غبارِ راہ کو سامانِ کارواں سمجھیں
ہمیں یہ حکم ہے کانٹوں کو مہرباں سمجھیں

اگر متاعِ چمن لُٹ رہی ہے صبر کریں
اگر کمیں میں ہو صیاد باغباں سمجھیں

جہاں لہو ملے پینے کو میکدہ جانیں
جہاں اسیر رہیں صحنِ گلستاں سمجھیں

لب و دہن کو اجازت ہو عرضِ شوق کریں
وہ عرضِ شوق جسے آپ داستاں سمجھیں

زباں پہ حرفِ شکایت نہ ہو اگر دیکھیں
نگہ کو نرگسِ رعنا کی ہم زباں سمجھیں

شکستہ بھی ہو سفینہ تو نا امید نہ ہوں
کہ سیلِ موجِ تمنا کو بادباں سمجھیں

نہیں کہ شوقِ فراواں نہیں ہے سینوں میں
مگر یہ حکم کہ آئینِ گلستاں سمجھیں

بجا کہ آپ سفینے کے ناخدا ہیں مگر
ذرا تہیۂ طوفانِ بیکراں سمجھیں

یہ آرزو کہ کبھی نظمِ گلستاں بدلے
اس آرزو کو تمنائے دشمناں سمجھیں

جمیلؔ دار و رسن سے علاجِ غم ہو گا؟
یہ لوگ کاش رہ و رسمِ آسماں سمجھیں

ممتاز مفتی •

شام کا وقت تھا، وہ چپ چاپ بیٹھک سے ملحقہ برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ مکان پر ہو کا عالم طاری تھا۔ جیسے صور پھونک چکا ہو۔ بیٹھک میں اس کی چیزیں ادھر اُدھر یوں بکھری پڑی تھیں۔ جیسے ان کا کوئی وارث نہ ہو۔ میز پر صبح کا بچا ہوا کھانا ویسے ہی پڑا تھا۔ ریک پر سگرٹ کے خالی ڈبوں کے ڈھیر سے بنے ہوئے تھے۔ سگرٹ کے ڈبوں کی طرف دیکھ کر اقبال نے ایک لمبی آہ بھری اور پھر سامنے رکھی ہوئی تپائی پر پڑے ہوئے سگرٹ کو اٹھا کر اسے خالی ڈبی میں ڈال کر چارپائی پر پھینک دیا۔ اس نے وہ سگرٹ کئی بار ڈبیہ سے سلگانے کے لئے نکالا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں سگریٹ پینے کو اس کا جی نہ چاہا تھا اب تو اسے سگریٹ کو دیکھ کر وحشت ہوتی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ سالہا سال سے بیمار ہو یا جیسے وہ مادی طور مر چکا ہو اور اب صرف روح کی حیثیت سے جی رہا ہو۔ چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ خاموشی اور ویرانی۔ اور وہ اس گہری خاموشی میں گویا ڈبکیاں کھا رہا تھا

ہی ہی ہی ہی ——— ہنسی کی آواز سن کر وہ چونکا پڑوس میں گوہر قہقہہ مار کر ہنس رہا تھا۔ کتنا خوش قسمت ہے، اقبال نے سوچا۔ گوہر کا مردانہ دار چہرہ اس کے سامنے آ گیا۔ کتنا بارعب چہرہ تھا اور پھر اس کی گھنی مونچھ، گوہر کی مونچھ کا خیال آتے ہی اس کا سینہ تن گیا وہ اٹھ بیٹھا جیسے دفعتاً مایوسی کے اس گہرے اندھیرے میں امید کی ایک شعاع آ چمکی ہو۔

اقبال کے گھر کی خاموشی اور ویرانی کا تمام تر سبب گوہر کی مونچھ تھی۔ اگر گوہر کی مونچھ اس دور کی یادگار ہوتی جب کلین شیو اور مونچھ کے درمیان سمجھوتہ نہ ہوا تھا اور لوگوں نے لبوں پر فل سٹاپ سے لگائے تھے۔ جیسے مکھیاں بیٹھی ہوں، تو حالات خراب نہ ہوتے یا اگر وہ مالبوں کے پتلے سے کش کی طرح ہوتی۔ جیسے نوجوان رومانی شکل و صورت بنانے کے لئے رکھ لیتے ہیں تو بھی کوئی مضائقہ نہ ہوتا۔ یا اگر مولوی صاحب کی طرح گوہر مونچھ کی لبیں کٹوا کر انہیں کھوکھلا کر لیتا تو بھی بات نہ بگڑتی۔ لیکن گوہر کی مونچھ پینٹ برش کی طرح گھنی اور پھیلی ہوئی تھی۔ مونچھ کی بات چھوڑیئے۔ گوہر کا چہرہ بھی تو چوڑا اور بھرا ہوا تھا۔ اس کا قد اونچا تھا۔ اس کا جسم فربہ تھا، اس کی آواز بات کرنے کا انداز، قہقہہ، چال ڈھال، ہر تفصیل سے رعب، دلیری، بے پروائی، بے فکری اور خوش باشی کا اظہار ہوتا تھا اور یہ تمام خصوصیات اقبال کی نگاہ میں مردانہ اوصاف تھے، جن سے وہ خود محروم تھا۔

ان کے علاوہ دو ایک اور تفصیلات بھی تھیں۔ مثلاً گوہر کی بیوی انوری تھی۔ جس کا چہرہ نسائی زیردستی کا مرقع تھا اور جس کی آواز اس قدر مدہم تھی کہ وہ کمرے کے اندر ہی دب کر رہ جاتی تھی لیکن سب سے اہم تفصیل یہ تھی کہ گوہر ان کے پڑوس میں۔ ان کے گھر سے ملحقہ گھر میں آ بسا تھا۔ اگر وہ ان کے پڑوس میں نہ آتا تو شاید یہ واقعہ بھی رونما نہ ہوتا۔

شادی سے پہلے اقبال کو اپنی موجودہ بیوی وسیمہ سے محبت تھی۔ اس لئے نہیں کہ وسیمہ بے حد خوب صورت اور شوخ تھی، یا اس کے انداز میں کوئی انوکھا پن تھا۔ خوب صورت اور شوخ لڑکیاں تو وہ کئی دیکھا کرتا تھا۔ چلتے ہوئے سڑک پر یا کمپنی باغ میں یا کارڈن میں، انہیں دیکھ کر وہ چونک جایا کرتا تھا۔ لیکن ان کی خوبصورتی اور شوخی کا اثر دیر تک نہ رہتا۔ چونکہ وہ محسوس کرتا جیسے وہ بہت دور ہوں، بہت دور، اس کی دسترس سے دور اور وہ بے حد اجلی ہوں۔ اتنی اجلی کہ ہاتھ لگاؤ تو میلی ہو جائیں اور اس کے اپنے ہاتھ میلے تھے۔ لہٰذا ان سے محبت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس کے برعکس وسیمہ اس کے بہت قریب تھی۔ وہ اس کی خالہ زاد

بہن بھی نا اسلئے آپ جانتے ہیں لڑکیاں جب جوان ہوتی ہیں تو ان میں ایک بے نام سی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے چاہے خدوخال کیسے ہوں۔ رنگ گندمی ہو یا سانولا۔ ان کی شخصیت میں ایسی تغیرات نمایاں ہو جاتی ہیں جو جوان لڑکوں کو بے حد پیاری لگتی ہیں، نہ جانے لڑکیاں جوان ہو کر جاذب نظر کیوں ہو جاتی ہیں؟ وسیمہ اقبال کے سامنے کھیل کھیل کر جوان ہوئی تھی۔ ان دنوں اس نے بچی کی طرف کبھی توجہ نہ دی تھی۔ پھر جب جوان ہونے کے بعد پہلی مرتبہ وہ اسے دیکھکر چھپ گئی تھی تو دفعتاً اقبال نے محسوس کیا تھا کہ وہ بڑی جاذب نظر ہے اور اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ اس کے بعد جب کبھی دور سے وہ اس کی آواز سنتا تو وہ محسوس کرتا جیسے اس کے آنا چہرہ میں ایک خصوصی رنگ ہو اور جب کبھی وہ سامنے سے گزرتی ہوئی مسکرا آنکھیں جھکا لیتی تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔

وسیمہ سے منگنی ہونے کے بعد وہ بے حد خوش تھا اور اس خوشی کی شدت میں وہ اس قدر کھو گیا تھا کہ اس نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ وسیمہ کی ناک ستواں ہے یا نہیں۔ یا اس کے ہونٹ پتلے ہیں یا موٹے۔ اسے یہ تفصیلات دیکھنے کا موقع بھی تو نہیں ملتا تھا۔ جب کبھی وسیمہ سامنے آتی تو اس کی آنکھوں سے متبسم شعاعیں سی نکلتیں اور بھرے بھرے ہوئے گندمی گال ابھر آتے اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ بے معنی تفصیلات پر سوچنے کی اسے فرصت ہی نہ ملتی

شادی کے دو سال بعد آہستہ آہستہ اس کے خدوخال آنکھوں کی چمک کی اوٹ سے باہر نکل آئے۔ ناک بیٹھی گئی۔ ہونٹ موٹے ..... ہوتے گئے اور رنگ سانولا پڑتا گیا اور اس کی حرکات میں ایک بھدا پن سا نمایاں ہوتا گیا۔ بیٹھے بٹھائے دفعتاً وہ محسوس کرتا جیسے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہا ہو۔ موازنہ کر رہا ہو لیکن اس کے باوجود وہ خوش تھا۔ چونکہ طبعاً وہ گھریلو طبیعت کا تھا اور وسیمہ اس کے گھر کا محور تھی۔

پھر آہستہ آہستہ اقبال پر انکشاف ہونے لگا کہ وہ وسیمہ کی ہر بات پر ٹھیک ہے۔ یا جی ہاں کہہ دیتا ہے۔ وسیمہ سے ٹھیک ہے یا جی ہاں کہتے ہوئے اسے اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ وسیمہ اس سے ہر بات منوالیتی ہے۔ ٹھیک ہے یا جی ہاں کہنے کے بعد کسی وقت جب وہ کسی اور کام میں مصروف ہوتا تو دفعتاً اسے خیال آتا کہ اس وقت اس نے وسیمہ کی بات کے جواب میں ٹھیک ہے کیوں کہہ دیا تھا حالانکہ بات تو کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اس وقت اسے وسیمہ پر کچھ غصہ آنے لگتا اور وہ سمجھتا کہ وسیمہ بڑی خود پسند ہے کہ ہر جائز و ناجائز بات پر اس سے جی ہاں کہلوالیتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں اپنی شرافت کو کوستا جس کی وجہ سے وہ جی ہاں کہہ دیا کرتا تھا۔

سب سے پہلے اسے اس بات کا احساس اس روز ہوا تھا جب وہ دفتر میں جمیل کے ساتھ بیٹھا سگرٹ پی رہا تھا جمیل کے سامنے برصیا سگریٹ کا پیکٹ پڑا تھا اور وہ اس ڈبیہ میں سے لگاتار سگریٹ پی رہا تھا۔ اس وقت اسے یاد آیا کہ اس کی اپنی جیب میں تین پیسے کے سستے سگرٹ کاغذ میں لپٹے ہوئے پڑے تھے۔ کیونکہ اس سے ایک روز پہلے اس نے وسیمہ سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ سے وہ سستے سگریٹ پیا کرے گا اور وہ بھی دن میں پانچ سے زیادہ نہیں۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے بگلے اس کی جیب سے سر نکال کر اس کا منہ چڑا رہے ہوں اور جمیل سے کہہ رہے ہوں ذرا اس کی طرف دیکھئے، یہ میاں جیب میں سگرٹوں کی جگہ بگلے لئے پھرتے ہیں۔ اس وقت اسے اپنی حماقت اور وسیمہ کی زیادتی پر غصہ آنے لگا تھا۔ آخر جمیل کی تنخواہ بھی تو اس کے برابر تھی۔ اس کے باوجود وہ کس مزے سے سگریٹ پی رہا تھا۔ اگرچہ وسیمہ سے وعدہ کرتے وقت اس نے محسوس کیا تھا کہ وسیمہ کی بات بڑی معقول ہے لیکن اب وہ سمجھنے لگا تھا جیسے دھوکہ دیکر اس سے وعدہ لیا گیا ہو اور پھر معقولیت کا مطلب کیا وہ گاڑھے پسینے کی کمائی سے گھر والوں کا پیٹ نہیں پالتا تھا؟ کیا وہ گھر کا مالک نہیں تھا؟ گھر کا مالک! اللہ اکبر

انہی دنوں اس کی گوہر سے ملاقات ہوئی۔ گوہر کا اونچا لمبا قد۔ بھرا ہوا جسم، رعب دار چہرہ اور اس پر گھنی مونچھیں دیکھکر اس نے محسوس کیا جیسے وہ مردانہ وقار کا ایک مجسمہ ہو۔ گوہر کو دیکھکر اسے اپنی کمتری کا شدید احساس ہونے لگا۔ اور اپنے ٹھیک ہے اور جی ہاں ذہن میں اور بھی چبھنے لگے۔ اس روز اس نے برصیا سگریٹ

کا ایک پورا پیکیٹ خرید لیا اور بیٹھک سے ملحقہ برآمدے میں بیٹھ کر ایک شانِ بے نیازی سے سگرٹ کا دھواں اڑانا شروع کر دیا۔ اس لحاظ سے تو گوہر کی مونچھ جمیل کی سگرٹ کی ڈبیہ سے بھی زیادہ زود اثر ثابت ہوئی۔

کچھ دنوں کے بعد وسیمہ نے اسے کہا "لے ہو! آپ گوہر صاحب سے ملنے نہیں گئے کیا؟ آخر وہ ہمارے پڑوسی ہیں۔ سنا ہے کل رات ان کے گھر چور آئے تھے۔"

جب وہ گوہر کے گھر پہنچا تو گوہر بیٹھک میں ایک شانِ استغنا سے بیٹھا حقہ پی رہا تھا "سنا ہے آپ کے ہاں چور آئے تھے کل رات" اقبال نے بات شروع کی۔ گوہر نے ایک زبردست قہقہہ لگایا "ہا ہا چور، وہ چلایا ہا ہا ہا ہا ہا۔ میز پر پڑا ہوا بلوری گلاس جل ترنگ کی طرح بجنے لگا۔ ہاں وہ آئے تھے، ہی ہی ہی ہی ہی۔ وہ یوں ہنس رہا تھا جیسے چوروں کا نہیں بلکہ ہسپتال کے مریضوں کا ذکر کر رہا ہو "بیوی نے مجھے جگایا، وہ بولا، کہنے لگی اوپر کوئی ہے۔ روشن دان میں، میں نے کہا اسے تو چپ رہ۔ اور پھر چپ چاپ سنتا رہا۔ اوپر سٹور کے پاس روشندانوں میں دو آدمی تھے۔ پھر میں نے ڈانٹ کر کہا "ابے او چور کے بچے، بیوقوف! ہمیں سوتے لینے در۔ اتنی جلدی ہی آ دھمکے ہو۔ ہائیں۔ ہا ہا ہا" اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ میری بات سن کر وہ بھاگے۔ کوٹھے پر دڑ دڑ کی آوازیں آئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ مجھ سے وہ کہنے لگی اوپر جا کر دیکھ تو آؤ۔ وہ پھر ہنسنے لگا اور مونچھ کو تاؤ دیتے ہوئے بولا "بیوقوف ہوتی ہیں یہ عورتیں۔ بس ان کی صورت دیکھتے رہو یا ان سے پیار کر لو۔ بس ان کی بات نہ سننا کبھی سمجھے؟" اس نے مجھے ڈانٹا۔ میں نے اس سے کہا "بھلے مانس کس خیال میں ہو تو؟ ہفتہ بھر تو وہ اب ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔ پھر کبھی آئیں گے تو دیکھا جائے گا۔ اب تو یوں سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے ہیں کہ بیچاروں کو کوئی چیز اٹھانے کی فرصت نہیں ملی۔"

"تو کیا بیگم صاحبہ کی تسلی ہو گئی؟" میں نے پوچھا۔

"ہونہہ! بیگم صاحبہ" وہ چلایا "تم لوگوں نے گھر والیوں کے مزاج بگاڑ دیتے ہیں۔ شہزادیاں بنا دیا ہے انہیں۔ ان کے آگے پیچھے جی ہاں جی ہاں کرتے پھرتے ہو۔ کوئی بات ہے یہ۔ اجی مرد کا کام ہے کہ مرد بنا رہے" اس نے مونچھ مروڑتے ہوئے کہا "اور عورت کو عورت بنا کر رکھے۔ ہاں!"

اس کی باتیں سن کر اقبال گھبرا گیا۔ اس نے مجرموں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی نگاہ سامنے صوفے پر جا پڑی جس پر گیہوں کی بوری رکھی ہوئی تھی "یہ صوفے پر گیہوں کی بوری؟" اس نے بات بدلنے کے لئے کہا۔

"کیوں جی گوہر بولا "تمہاری بیٹھک سے تو اچھی ہے۔ میاں اناج ہے اناج" وہ پھر قہقہہ مار کر ہنسا۔

اقبال اس بات پر بالکل ہی گھبرا گیا اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا "اچھا پھر ملاقات ہو گی"

گوہر کے گھر سے نکل کر وہ سیدھا اپنے پنواڑی کے پاس پہنچا اور ایک بڑھیا ڈبہ ادھار لے کر گھر آ گیا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کا سینہ ابھرا ہوا تھا۔ گردن اکڑی ہوئی تھی اور وہ سگرٹ کے ڈبہ کو یوں اچھال رہا تھا جیسے کوئی ٹرافی یا تمغہ ہو۔

شام کے وقت وسیمہ بیٹھک میں آئی تو اس نے حیرانی سے سگرٹ کے ڈبے کی طرف دیکھا "یہ آپ کا ڈبہ ہے؟" وسیمہ نے اس نے پوچھا۔

"ہوں" وہ بولا۔ اور پھر کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

"آپ نے خریدا ہے؟" وسیمہ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہوں" اس نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔ لیکن اس بے نیازی کے باوجود اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور کتاب کے صفحات سے سر نکال کر گوہر مونچھ مروڑتے ہوئے طنزاً مسکرا رہا تھا۔

"ادھار لیا ہے کیا؟" وہ بولی۔

"اور کیا خیرات میں بٹتے ہیں؟" اقبال کی چھاتی اور بھی تن گئی اور اس نے بڑے طمطراق سے گوہر کی طرف دیکھا۔

"یہ آپ کہہ رہے ہیں کیا؟"

"جی ہاں خاکسار ہی عرض کر رہا ہے۔"

"جی ہاں جی ہاں جی ہاں" منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا چلانے لگا
"تم نے انہیں شہزادیاں بنا دیا ہے۔ ان کے آگے پیچھے جی ہاں جی ہاں کرتے پھرتے ہو" گوہر قہقہہ مار کر ہنسا۔

اقبال نے غصہ میں کتاب بند کر دی "کوئی اور سوال پوچھنا باقی ہے؟" اس نے وسیمہ سے غصہ میں پوچھا۔

"لیکن آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا" وہ بولی۔

"ہاں کیا تھا" اس نے جواب دیا "پھر؟"

"پھر؟" اب وہ حیرانی سے بولی۔

"اب ہماری مرضی، ہماری باتوں میں دخل دینے والی تم کون ہو؟ جاؤ اپنا کام کرو"

وسیمہ کے لئے یہ ایک انوکھی بات تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اسے تخت سے اتار کر فرش پر گرا دیا گیا ہو۔ چونکہ وہ ایسے رونے کی عادی نہ تھی وہ سٹ پٹا گئی اور بھاگ کر اندر چارپائی پر آگری اور ٹپ ٹپ آنسو گرانے لگی۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ یکدم جی ہاں جی ہاں کے مرغزار سے نکل کر تم کون ہو کے لق و دق صحرا میں کیسے آگری تھی۔ نہ جانے کب تک وہ ویسے ہی پڑی رہی۔ کچھ دیر کے بعد جب ان کا بیٹا ننھا اختر پڑوس میں بچوں سے کھیلنے کے بعد فارغ ہو کر آیا اور اس نے یوں امی کو پڑے دیکھا تو وہ حیران ہوا، پھر جب اس کے شور مچانے پر بھی امی نے اسے وہ توجہ نہ دی جس کا وہ خود کو حقدار سمجھتا تھا تو وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔ اس پر باہر سے اقبال چلایا "یہ کیا شور ہے؟ وسیمہ وسیمہ! بند کرو اس شور کو"

پیارے اختر کا رونا شور سمجھا جائے اور اس کو گود میں اٹھا کر بہلانے پھسلانے کی بجائے کہا جائے "بند کرو اس شور کو" بھوکی شیرنی کی طرح وہ اٹھ بیٹھی اور اس نے لپک کر اختر کو گود میں اٹھا لیا پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتی یکدم اقبال کمرے میں آ داخل ہوا "تم بولتی کیوں نہیں؟" وہ چلایا "میں کب سے بلا رہا ہوں" اسے غصے میں دیکھ کر وسیمہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے "نہیں بولتی" اقبال چلایا "نہیں بولتی تو نہ سہی" وہ غرایا "مجھے کیا ضرورت کہ میں زبان گھستا پھروں" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اسے یوں کمرے سے نکلتے دیکھ کر وسیمہ نے پوری کوشش کی کہ لپک کر اسے پکڑ لے اور اس سے پوچھے کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آخر کیوں؟ لیکن وسیمہ کی ٹانگیں منوں بوجھل ہو چکی تھیں ان میں سے حرکت کی اہلیت خارج ہو چکی تھی۔ جیسے وہ زمین میں گڑی ہوں۔ اگلے روز شام کے وقت برآمدے میں بیٹھے ہوئے اقبال نے محسوس کیا جیسے وہ گھر ویران پڑا ہو۔ اندر سے کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی محض ویران دکھائی دے رہا تھا۔ سکوت اور ویرانی! وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اوہ مجھے تو جانا ہے اور وہ چپ چاپ باہر نکل گیا۔ چار پانچ روز وہ پرانے دوستوں سے ملتا رہا۔ وہ دوست، جن کے گھر جانے کی اسے عرصہ دراز سے فرصت نہ ملی تھی۔ دراصل وہ اپنے گھر سے دور رہنے کی شدید کوشش میں مصروف تھا لیکن دقت یہ تھی کہ آخر اسے اپنے گھر لوٹنا ہی پڑتا تھا اور پھر وہی سکوت، وہی ویرانی جیسے صور پھونک گیا ہو۔

اس کا جی چاہتا تھا کچھ ہو، کوئی شور شرابا ہو، کوئی بات چیت کرے اور کچھ نہیں تو کوئی مزید جھگڑا ہی ہو جائے۔ تکرار ہو بدزبانی ہو، کچھ تو ہو۔ لیکن وہی خاموشی وہی ویرانی۔ غصے سے اس کا دماغ پھر جاتا اور وہ سگریٹ کے ڈبے کی طرف جھپٹتا لیکن سگریٹ تو گھٹیا سگریٹ کا سا مزا دینے لگے تھے۔ اور ان کا دھواں اس کی آنکھوں اور حلق میں چبھنے لگا تھا۔ وہ سگریٹ پھینک کر گوہر کی طرف جا پہنچتا "ہا ہا ہا" گوہر اسے دیکھ کر ہنستا "میاں سارا دن گھر میں گھسے رہتے ہو۔ کیا بات ہے؟ کیا ہو گیا آج کل کے نوجوانوں کو؟ بیوی کے گلے کا ہار بنے رہتے ہیں۔ ہی ہی ہی۔ اور پھر بعد میں جب وہ پنجے نکالتی ہے تو روتے ہیں۔ بھئی جبھی تو ہمارے والد کہا کرتے تھے ـ گربہ کشتن روز اول۔ ہی ہی ہی" وہ ہنسنے لگا "جانتے ہو ہمارے چچا نے اپنی نئی نویلی دلہن سے اولین بات کیا کی تھی؟ کہنے لگے ذرا اٹھ کر ہماری بندوق تو بھر دینا۔ بندوق بھر دینا نئی نویلی دلہن سے! ہا ہا ہا" وہ ہنسنے لگا۔

گوہر سے مل کر اسے ایک گونہ تسلی ہو جاتی لیکن گھر پہنچ کر وہی اداسی اس پر مسلط ہو جاتی۔ اور اس کا جی چاہتا کہ دیوانہ وار قہقہہ

لگاکر ہنس پڑے یا چیخ مار کر رو دے، کچھ کرے تاکہ گھر کی وہ خاموشی اور ویرانی دور ہو جائے۔ رات کے وقت ڈولی میں سے کھانا نکالتے ہوئے اقبال غرایا "یہ کھانا برف میں لگاکر رکھا گیا ہے کیا۔ کوئی بھینس سمجھ رکھا ہے مجھے؟" کھانا اٹھاکر وہ بیٹھک میں آگیا۔

چوری چوری اس کا جی چاہتا تھا کہ گھر میں کوئی حرکت ہو۔ دسیمہ کوئی بات کرے یا ننھا اختر ہی رو دے۔

کچھ دیر کے بعد اسے اندرونی دروازے میں دسیمہ کی شکل دکھائی دی وہ چپ چاپ کھڑی اس کی طرف ڈری ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اقبال کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ بھاگ کر اسے تھام لے اور اس سے پوچھے "جی آپ اس قدر اداس کیوں ہیں؟" ———— "ہی ہی ہی ہی" سگرٹ کے خالی ٹین سے گوہر کا سر نکل آیا "بندوق بھر دینا، نئی نویلی دلہن سے! ہی ہی ہی"

دسیمہ چپ چاپ اس کے قریب آکھڑی ہوئی "لائیے میں گرم کر دوں" وہ بولی۔ اس کا ہاتھ اس کے قریب آپہنچا۔ اس کی انگلیاں کتنی سفید اور خمدار تھیں۔ اقبال کا جی چاہا کہ انہیں تھام لے اور پھر مسکرا کر اس کی طرف دیکھے اور پوچھے "جی آپ مجھ سے ناراض کیوں ہیں؟" لیکن اس وقت پلیٹ سے گوہر کا چہرا ابھرا۔ گوہر نے مونچھ مروڑتے ہوئے بامعنی نگاہوں سے اقبال کی طرف دیکھا۔ اقبال نے محسوس کیا جیسے وہ جرم کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔ اس نے پلیٹ اٹھاکر زور سے دیوار پر دے ماری "لے جاؤ اپنا کھانا" وہ غرایا "لے جاؤ۔ مجھے تمہارے کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں ہوٹل میں کھا سکتا ہوں"

اپنا غصہ نکالنے کے بعد جب اس نے دسیمہ کی طرف دیکھا تو اسے لیک دھچکا سا لگا۔ وہ مایوسی کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ میں نے کیا کر دیا؟ اس کے دل میں سے آوازیں آنے لگیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ایک بار پھر دسیمہ اس کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ صرف ایک بار ———— لیکن وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ اقبال نے کوشش کی کہ وہ اس سے کچھ کہے لیکن اس کے حلق میں آواز نہیں تھی۔ اور ہوتی بھی تو آخر کوئی بہانہ بھی ہوتا۔ شدید غصے کا اظہار کرنے کے فوراً بعد محبت کی کوئی بات کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ وہ

دیر تک منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور آخر جھنجھلا کر اٹھ بیٹھا شاید اس لئے کہ دسیمہ کی طرف مزید دیکھنے کی اس میں ہمت نہ تھی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس واقعہ کو بیس دن ہو چکے تھے، بیس دن! اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے سالہا سال گزر چکے ہوں۔ سالہا سال! اس کے گھر کی خاموشی روز بروز بھیانک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

وہ جاں بخش آوازیں جو گھر سے ابھرتی رہتی ہیں اور محلے بھر میں گونجتی رہتی ہیں۔ اس کے گھر سے عنقا ہو گئی تھیں، جیسے وہاں کوئی بستا ہی نہ ہو۔ پہلے ننھا اختر کھیلتے ہوئے کتنا شور مچایا کرتا تھا لیکن اب۔ اب جانے وہ کہاں چھپا رہتا تھا اور پھر برتنوں کے کھنکنے کی آواز تک بھی نہیں آیا کرتی تھی۔ صرف صبح اور شام کے وقت جب وہ بوڑھی مائی آتی جو ان کا سودا لایا کرتی تھی تو گویا وہ اپنے آپ سے باآواز بلند باتیں کرتی اور اقبال کو محسوس ہوتا کہ ابھی تک اس گھر میں لوگ باگ رہتے تھے۔ لیکن اس کے جانے کے بعد پھر وہی خاموشی، وہی ویرانی، اس ویرانی سے وہ اکتا چکا تھا۔ بارہا اس کے جی میں آتی تھی کہ اندر چلا جائے اور جاکر دسیمہ سے پوچھے "کیا تم نے واقعی یہ سمجھ لیا ہے کہ میں تم سے ناراض ہوں بے وقوف؟" اور یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لے۔ "لیکن گوہر کا وہ بارعب چہرا اور گھنی مونچھیں اور اس کا وہ مردانہ وار قہقہہ ———— وہ رک جاتا اور دعائیں مانگتا یا اللہ کوئی راستہ۔ کوئی سہارا۔ اب میں کبھی ایسی بات نہیں کروں گا لیکن اپنی عزت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ پھر وہ بھاگ کر گوہر کی طرف جا بیٹھتا۔ ہا ہا ہا۔ گوہر اسے دیکھ کر قہقہہ لگاتا۔ اور اس کا غم گوہر کے اس قہقہے میں ڈوب جاتا۔ اور گوہر کی مونچھ سے تازہ تقویت حاصل کر کے وہ لوٹ آتا۔

"اب میں کیا کروں۔ کیا کروں میں" اقبال سوچ رہا تھا۔ شام کتنی اداس تھی۔ اور پھر سر پر کالی پہاڑ سی رات کھڑی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ کس کی طرف جاؤں۔ سینما؟ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر روپے گنے۔ ہاں لیکن کوئی ساتھی بھی ہو۔ اس نے ایک آہ بھری۔ دروازہ پر آواز سن کر وہ چونکا۔ "اندر آجاؤ" وہ بولا۔

بھی وہ گوہر اس کے قریب آ گیا۔ اس وقت گھر بیٹھے ہو شام کے وقت؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں میاں؟ آؤ باہر گھومیں، یہ کیا گھر بیٹھنے کا وقت ہے؟ تم آجکل کے نوجوانوں نے تو حد کر دی۔ اس کا قہقہہ گونجا۔ آؤ سیر کو چلیں، سیر کرتے کرتے وہ دونوں سینما ہال میں جا پہنچے

گوہر صاحب شو دیکھیں گے آپ؟ اقبال نے جیب کے بٹوے ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔ اسے خاموش دیکھکر اقبال بولا۔ ہاں دیر ہو جائے گی۔ گھر اطلاع بھی نہیں دی آپنے۔ بارہ ایک بج جائینگے

گھر؟ گوہر قہقہہ مار کر ہنسا۔ ہم نے گھر والی کو شہزادی بنا رکھا ہے کیا مجال کہ کوئی پوچھے کہ کہاں سے آتے ہو۔ وہ پھر ہنسنے لگا۔

شو دیکھکر وہ دونوں واپس آئے تو اقبال ابھی لیٹا ہی تھا کہ گوہر آ گیا۔ ہی ہی ہی ہی وہ ہنستے ہوئے بولا۔ یادداشت تو بالکل ہی جواب دے گئی ہے وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ یاد ہی نہ رہا کہ آج رات میری بیوی کو اپنی خالہ کے ہاں جانا تھا۔ وہ لوگ تالا لگا کر چلے گئے ہیں۔ ہی ہی ہی ہی۔ وہ ہنسنے لگا۔ نہ جانے چابی کسے دی گئی ہے۔ احمق کہیں کی

پھر کیا ہوا اقبال چلایا۔ ابھی ہو جاتا ہے انتظام۔ آپ کا اپنا گھر ہے یہ۔ البتہ حقہ نہیں ہوگا۔ ہمارے ہاں۔ لیکن سگرٹ جو ہیں۔ سگرٹ۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ سگرٹ ختم ہو چکے ہیں۔ ابھی لاتا ہوں

وہ بولا۔ یہ نکڑ والی دکان شاید کھلی ہو۔

سگرٹ خرید کر لوٹتے ہوئے اتفاقیہ اس کی نگاہ گوہر کے مکان کی طرف پڑی۔ اندر بتی جلتی ہوئی دیکھکر وہ حیران رہ گیا۔ اس نے غور سے اس کے گھر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ باہر کی طرف کوئی تالا نہ تھا۔ اس نے دروازے کو چھوا۔ اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ قہقہہ مار کر ہنس دے یا چیخیں مار مار کر روئے دیوانہ وار وہ اپنے گھر کی طرف بھاگا۔

"میں آپکے دولت خانے پر آیا تھا" گوہر اقبال کو دیکھکر بولا۔ اور پھر مونچھ کو تاؤ دینے لگا۔ "لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ وہ سامنے آ کر بیٹھیں گی ہی ہی ہی ہی۔" گوہر ہنسا۔ آج کل کے نوجوانوں کی بیویوں کی طرح اس نے اک انداز سے مونچھ مروڑنی شروع کر دی۔

ہاں۔ اقبال نے محسوس کیا جیسے مونچھ نہیں بلکہ وہ بڑے فتنے مروڑ رہا ہو۔ وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا۔ ہی ہی ہی ہی ہی۔ اور پھر پاگلوں کی طرح اندر دوڑا۔ نسیمہ اسے دیکھکر گھبرا اٹھی۔ ہا ہا ہا ہا وہ ہنستے ہنستے بیٹھ گیا اور اس نے اپنا سر نسیمہ کی گود میں رکھ دیا اور اس کی ہنسی ہچکی میں بدل گئی۔
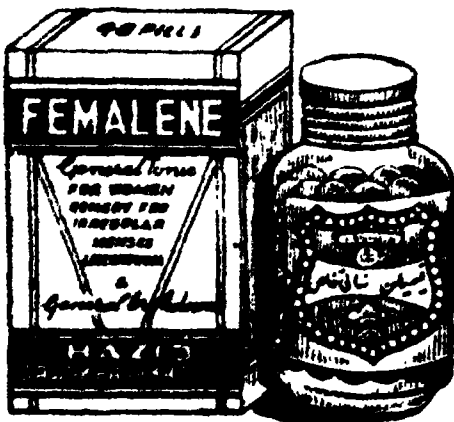
(بشکریہ ماہ نو)

عرشی بھوپالی

حدیثِ غمِ یار

دل طعنِ دشمناں کا سزاوار ہی تو ہے
سعیِ جمیل و شوقِ طلب گار ہی تو ہے

تعزیر جس پہ دیتے ہو کچھ جرم تو نہیں
ذکرِ وفا، حدیثِ غمِ یار ہی تو ہے

روشن ہوئے ہیں جادۂ محبوب کے چراغ
یہ کارواں کی گرمیٔ رفتار ہی تو ہے

کٹ جائے سر تو کیا جو چلی جائے جاں تو کیا
اے ناصحو یہ کوچۂ دلدار ہی تو ہے

آؤ کہ اور فاصلۂ یک قدم سہی
وہ منزلِ نگار سرِ دار ہی تو ہے

دشتِ جنوں میں آبلہ پائی کا کیا گلہ
یہ راہِ شوق وادیٔ پُرخار ہی تو ہے

توقیر کیا ملامتِ دنیا کی عشق میں
دل حرفِ مدعا کا گنہگار ہی تو ہے

اس منکرِ وفا سے امیدِ وفا فضول
وعدہ شکن ہے یار جفاکار ہی تو ہے

لب نے رُخِ صبیح کو چھو بھی لیا تو کیا
یہ سعیِ شوقِ جنت بے کار ہی تو ہے

(بشکریہ ایشیا)

نجم الاسلام

تخلیقی تفکّر

اسلامی دور کے مفکروں میں دو نام ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے تخلیقی تفکر کے موضوع پر اپنی تصانیف میں اظہار خیال کیا ہے اور بتایا ہے کہ غور و فکر کی قوت کیسے نشو و نما پا سکتی ہے کس طرح تفکر کیا جاتا ہے ان کے سامنے اس کی افادیت پوری طرح تھی کہ علم کے طالب علموں کو غور و فکر کی قوت سے کام لینے کے لئے ان مطالبوں کو سمجھنا ضروری ہے جو یہ قوت ذہنی افعال سے کرتی ہے اگر ہم یہ جان لیں کہ ذہن کس طرح سوچتا ہے تو ہم زیادہ بہتر طور سے سوچنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

یہ دو مفکر امام غزالی اور ابن خلدون ہیں۔ امام غزالی نے اپنے افکار و خیالات کی ترتیب میں قرب الٰہی کو اپنا مقصد بنایا ہے چنانچہ وہ تفکر کو عرفانِ الٰہی کے حصول کا سب سے بہتر ذریعہ سمجھ کر اپنے نتائج فکری کا اظہار کرتے ہیں۔

ابن خلدون نے تعلیمی نفسیات پر گفتگو کرتے ہوئے تفکر کو حقائق و معارف اور علم و فنون کے خزانے کا دروازہ کہا ہے لہٰذا سب علموں کے لئے قوت غور و فکر کے کچھ مستقل اصولوں پر زور دیا ہے۔

ان دونوں بزرگوں کے افکار کو سمجھنے کے لئے بعض اقتباسات مفید ہو سکتے ہیں۔

اقتباسات | ابن خلدون طالب علموں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

" فکر انسانی بھی خدا کی مصنوعات میں سے ایک خاص مصنوع (مخلوق) ہے۔ باری تعالیٰ نے اس کو بعینہٖ اسی طرح سے پیدا کیا ہے جس طرح دیگر مخلوقات کو یہ فکر اس وقت ظہور میں آتی ہے جبکہ نفس کی حرکت دماغ کے درمیانی حصہ میں ہوتی ہے۔ جب فکر انسانی کی یہ حرکت عدم سے وجود میں آتی ہے تو افعالِ انسانی کی ایک خاص اثر ترتیب و نظام کے ماتحت صادر ہونے کا مبدا بنتی ہے اور کبھی کبھی ایسے علم کے حصول کا مبدا و ذریعہ بنتی ہے جس سے انسان ناواقف تھا۔ اس وقت انسان مطلوب کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس علم مطلوب کے فوائد اور نقصانات دونوں کو پیش نظر رکھ کر اس کے حاصل کرنے یا نہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اثنائے غور و خوض میں اس پر وہ طریقہ چشم زدن میں منکشف ہوتا ہے جو اس علم مطلوب کے دونوں شعبوں میں اتحاد پیدا کر دیتا ہے اگر وہ علم واحد ہے یعنی دوسرے امور و فنون کے مسائل اس میں مخلوط نہیں ہیں اور اگر دوسرے علم کے مسائل بھی اس میں ملے جلے ہیں تو وہ انکشاف کے بعد اس کے دوسرے مبادی کی تحصیل شروع کرتا ہے یہاں تک کہ وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور یہ اس فکر انسانی کا کرشمہ ہے جو دیگر حیوانات سے انسان کو ممتاز کرتی ہے۔"

اس کے بعد ابن خلدون نے فکری عمل کے انضباطی اور ترتیبی پہلو پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

" فن منطق بھی اس طبیعت فکری و نظری کے فعل کی ایک کیفیت ہے اور اس کا فن سے بہرہ ور ہونا اس لئے ضروری ہے تاکہ خطا و صواب میں امتیاز کر سکے۔ گو اصل فطرت کے اعتبار سے وہ خطا سے پاک و صاف ہے لیکن کبھی قضایا کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے جو نظم و ترتیب ضروری ہے وہ غور و خوض کی کمی اور اشتباہ کی زیادتی کی وجہ سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس تباہی کے گرداب سے بچنے کے لئے فن منطق کا جاننا ضروری ہے۔"

پھر اس خیال کے استثنائی گوشوں کو اجاگر کرتے ہوئے اپنی رائے میں اعتدال پیدا کرنے کی کوشش اس طرح کی گئی ہے۔

" منطق ایک صنعتی علم ہے جو فکر میں جودت اور تیزی پیدا کرتا ہے اور چونکہ مزاج فکر انسان کا فطری جوہر ہے۔ اس لئے بسا اوقات فن منطق کی قطعاً ضرورت

نہیں ہوتی اسی لئے تم بہت سے جلیل القدر ارباب نظر پاؤ گے کہ وہ فن منطق سے ماہر و قابل ہونے کے علوم و فنون میں صحیح مطالب تک پہونچتے ہیں خصوصاً جبکہ صدقِ نیت اور فیضانِ ایزدی بھی معین و مددگار ہو۔ نیز وہ طبیعتِ فکری کے ذریعے سے علوم و فنون کے صحیح راستہ پر گامزن ہوتے اور طبیعت کی رہنمائی کے معتدل طریقہ اور میانہ روی تک پہنچ جاتے ہیں اور اس طرح ان کو مطلوب کا علم ویسے ہی حاصل ہو جاتا ہے جیسے کہ نفس الامر میں ہے۔

ابن خلدون نے چند ایک جگہ جہاں تخلیقی تفکر Creative Thinking اور برجستگی spontaneity کا تذکرہ بطورِ خاص کیا ہے۔ اس سے تخلیقی تفکر کے لئے کئی باتیں قرار پائی ہیں مثلاً الفاظ اور معانی کا صحیح لحاظ جو منطقی اصول کے مطابق ہو۔ فکر طبعی کا بیرونی اوہام اور ماحول کے اثرات سے معرا ہونا۔ اور فیضانِ الٰہی پر اعتماد۔ ان باتوں کو نظر میں رکھنے کے بعد وہ درجہ بدرجہ ان فرائض کو گنواتے ہیں جو قانونِ تخلیق کا پورا پورا حق ادا کرنے کے لئے ایک مفکر پر عائد ہوتے ہیں۔

۱۔ آزادانہ غور و خوض کی دعوت

۲۔ ایک معتدل طرزِ فکر کی جستجو

۳۔ مطالب کی موزوں الفاظ میں آراستگی

کبھی کبھی ذہن شکوک و شبہات کے گھپ اندھیروں میں بھٹکنے لگتا ہے۔ اس وقت ضروری ہوتا ہے کہ الفاظ کے حجابات اور شکوک و شبہات کے عوائق و موانع اور علوم رسمی، ان سب سے تخلی بالطبع ہو کر آزادانہ غور و خوض کی دعوت دی جائے اور ذہن کو مقصود کی کھوج میں لگا دیا جائے۔ اس کے بعد مبداءِ فیاض کی جانب سے کامیابی کی روشنی جلوہ گر ہوتی ہے اور مطالب تک پہونچنے کا ایسا معتدل اور درمیانی راستہ ہاتھ آتا ہے جو اس فکر طبعی کے غور و خوض کے ضروری عناصر و نتائج میں سے ہے۔ اس معتدل طرزِ فکر کی جستجو کے بعد ہی یہ امید کی جا سکتی ہے کہ مفکر اپنے مطالب تک پہونچ جائے گا۔ پھر آگے اس کا کام رہ جاتا ہے کہ وہ تخلیقی اصولوں کی پاسداری کرتا ہوا مطالب تک پہونچ جائے اور انہیں موزوں الفاظ کا قالب عطا کرے۔ عام فہمی اور عام استفادہ کی نظر سے ابن خلدون کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ متکلمین اسے روزمرہ کی بول چال کے پیرایہ میں ظاہر کر دیں پہلے روزمرہ کی بول چال کا رواج اہلِ علم و اصحابِ فکر کے یہاں نہیں تھا۔ مگر اب عام فہمی ایک ایسا لسانی وصف بن چکی ہے جسے سب تسلیم کرتے ہیں۔ آج کا مفکر مفکر ہی نہیں متکلم بھی ہے۔ اسے عام فہمی کے لئے شارحین کا سہارا لینے کی چنداں ضرورت نہیں۔

ابن خلدون نے برجستگی کا کیا تصور پیش کیا ہے؟ اور اس کی نشوونما میں کن عوامل کا ہاتھ بتایا ہے؟ اس کے جواب میں اس کی کوئی تفصیل تحریر بطور حوالہ پیش کی جانی ممکن نہیں لیکن نظریہ کو سمجھنے کے لئے وہ چند باتیں ہی کافی ہیں جو تادیب کے زیرِ عنوان کہی گئی ہیں۔ وہ تادیب کو افعال و کردار کی تعمیر کے لئے مضر سمجھتے ہیں اور اسے بد اخلاقی بزدلی اور خود فریبی کا سرچشمہ کہتے ہیں۔ اس کمزوری کے پورے کی شاخیں قوموں کے زوال و انحطاط سے ملی ہوئی ہیں مگر اس کی جڑیں ذہنی انفعال میں پیوست ہیں۔ اس سے ذہنی انحطاط پیدا ہوتا ہے اور ذہنی انحطاط سے زیادہ بڑی کوئی برائی نہیں جو جذبات، قوتِ فکر اور اختراع کو ختم کر کے کند بنا دیتی ہے۔

برجستگی کی نشوونما کے لئے وہ فطری ارتقائے ذہنی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اور خود فطری ارتقائے ذہنی کیا ہے۔ اس کے لئے ان کے اس قول کو سمجھنے کی ضرورت ہے جو کردار سازی کے سلسلے میں انہوں نے کہا ہے۔ وہ اس سلسلے میں معاشرتی تادیب کا ذکر کرتے ہیں۔ غالباً اس سے ان کی مراد وہ اخلاقی اور سماجی آداب ہیں جو ایک اچھی اور فکری لحاظ سے بلند سوسائٹی کی نظر میں وقعت کے قابل قرار پاتے ہیں۔ ان سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور فکر اور اختراع کی قوتیں تقویت پاتی ہیں۔

مگر کیا اس سلسلے میں ابن خلدون کی باتیں تشفی بخش ہیں؟ سب سے پہلے بات تو یہی ہے کہ قوائے ذہنی کی جس تشریح کے سہارے جدید نفسیات اپنی تحقیقات کو آگے بڑھاتی ہے اور برجستگی

تعریف کرتی ہے اگر وہ درست ہے تو ابن خلدون نے اسے کہاں تک نظر انداز کر دیا ہے۔ قوت فکر کی طرح بربجستگی کا وصف بھی ہر انسان میں بطور ودیعت رکھا گیا ہے کسی میں کم کسی میں زیادہ یہ وصف کسی حد تک نفسیات حیوانیہ کے اصولوں کا پابند بھی ہے جو قانون تجزیہ اور قانون اثرات کے تحت پیش کئے جاتے ہیں۔ پھر برجستگی کا موضوع کچھ ایسے مستثنیات بھی رکھتا ہے جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بہت سے افعال ایسے ہوتے ہیں۔ جو آدمی سے یک بیک صادر ہوتے ہیں قیاس کہتا ہے کہ ان افعال کے پیچھے ذہنی عمل کی برجستگی لازمی ہے مگر وقفہ عمل اتنا تھوڑا ہوتا ہے کہ اسے تسلیم مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے بعض صرف اس بنیاد پر برجستگی کا تصور ہی بدل دینے کے حامی نظر آتے ہیں۔ ان کے بیان میں ایک تضاد بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

> "سختی کرنے سے جذبات فنا ہو جاتے ہیں۔ جھوٹ اور تساہل کی عادت پڑ جاتی ہے۔ جوش اور انبساط مردہ ہو جاتے ہیں۔ انسانی اخلاق حمیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اخلاقی حالت غلاموں کی سی ہو جاتی ہے۔ جیسے یہودی کہ ظلم واستبداد کی وجہ سے چالاک ہو گئے ہیں۔۔۔۔"

کیا واقعی تادیب سے چالاکی پیدا ہو جاتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر ذہن کا کند ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے؟ ممکن ہے یہاں چالاکی سے فریب کاری اور خود فریبی مراد ہو۔ جس میں ظاہری طور سے تیزی۔ تیز طراری کے ساتھ برجستگی کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ بہ ایں ہمہ ابن خلدون کی یہ بات کہ برجستگی کی نشوونما اساسی طور پر اخلاقی حالت سے متعلق ہے اپنی جگہ درست معلوم ہوتی ہے اس پر نتیجہ خیز مباحث کا آغاز ہو سکتا ہے۔

ایک اور بات بھی یہاں ذکر کے قابل ہے اور وہ یہ کہ برجستگی کے متعلق جن خیالات کا اظہار ابن خلدون نے کیا ہے وہ سب ایسے طالب علموں سے وابستہ ہیں جو قوائے ذہنی کی کمزوری کے سبب سے معلموں کی نظر میں قابل تعزیر قرار پاتے ہیں جبکہ تخلیقی تفکر کے ضمن میں ایسے طلباء کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو اپنے ذہنی ارتقا کے وسیع امکانات لیکر آتے ہیں۔ درحقیقت ایسے ہی طلباء کو سامنے رکھکر برجستگی کے اعلیٰ معیار پر رائے زنی کی جانی مناسب تھی۔

شروع میں ابن خلدون کے جو اقتباسات دیئے گئے ہیں ان سے بھی کہیں کہیں اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر نوعیت تحقیقاتی کم ہے۔ توضیحی زیادہ ہے۔ جس میں ہر ذہن کی انفرادیت بھی کچھ نہ کچھ شامل ہو جاتی ہے۔ اس لئے تنقیدی گرفت کے بجائے اس کا جامع اختصار موزوں تر ہوگا۔

(۱) قوت فکر دوسری قوتوں کی طرح ایک نعمت الٰہی ہے جو دماغ کے درمیانی حصہ میں نفس کی حرکت کے سبب سے ظہور میں آتی ہے۔

(۲) کبھی یہ پرانے خیالات کی ترتیب و تنظیم تک اپنا دائرہ رکھتی ہے اور کبھی ایسے علوم کے حصول کا مبدا بنتی ہے جن سے انسان ناواقف تھا

(۳) ترتیب و تنظیم کی صلاحیتیں فن منطق سے بڑھتی ہیں لیکن ضروری نہیں کہ جس نے اس فن کو بحیثیت فن نہ سیکھا ہو وہ تخلیقی تفکر سے محروم ہو۔

پہلی بات قوت فکر کی تعریف سے متعلق ہے۔ یہاں نفسیات کی جدید تعریفات کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ قوت اپنے نتائج کس طرح پیدا کرتی ہے اور اس کا نظام تربیت کیا ہے اور یہ بات ابن خلدون کے مختصر بیان سے واضح ہوتی ہے۔ اب آیئے ابن خلدون سے کچھ اور آگے بڑھیں۔

شروع میں ابن خلدون کے ساتھ امام غزالی کا نام بھی لیا گیا ہے ایک لحاظ سے امام غزالی کے افکار و خیالات کا مطالعہ ابن خلدون سے پہلے زیادہ مناسب تھا۔ مگر امام غزالی کے افکار و خیالات کا مرکزی نقطہ تصوف ہے۔ جبکہ ابن خلدون نے تعلیمی نفسیات کو پیش نظر رکھا ہے آج کا ذہن تعلیمی نفسیات کو سمجھنے کی طرف آسانی سے مائل ہو سکتا ہے اور اس صورت میں جبکہ ابن خلدون کے خیالات ایک حد تک سامنے لائے جا چکے ہیں امام غزالی کے نقطۂ نظر کو سمجھنا پہلے سے زیادہ آسان ہوگا ——————

امام غزالی کے یہاں قوت فکر کے سلسلے میں بحث و نظر کا انداز

فلسفیانہ نہیں مصلحانہ ہے۔ دلیل اور دیانت کا طرز سیدھا سادہ رکھا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کم سے کم ایک بات غزالی نے بڑی چونکا دینے والی کہی ہے تخلیقی تفکر کے عملی پہلو پر جلس کا ایک معروف اصول منطق کرتے ہوئے جو باتیں کہی گئی ہیں وہ امام غزالی کی فلسفیانہ صلاحیتوں کو عجیب انداز میں پیش کرتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ان باتوں کا جائزہ لیا جائے۔ ان نکات کا ذکر ضروری ہے جن کو غزالی نے ہر لمحہ پیش نظر رکھا ہے۔ امام غزالی نے بحث و نظر کو ان نکات کا پابند بنایا ہے۔

(۱) فضیلتِ تفکر

(۲) حقیقتِ تفکر

(۳) اسکا مقصد، اور

(۴) میدانِ فکر

فضیلت کے سلسلے میں امام غزالی نے قرآن کریم کے ان احکامات کا ذکر کیا ہے جو بہت سی جگہوں پر تفکر، تدبر، نظر اور اعتبار کے الفاظ کی صورت میں دیئے گئے ہیں۔ رسول کریمؐ کا ارشاد بھی پیش کیا ہے۔

"تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ سنۃ" (ایک ساعت کا تفکر سال بھر کی عبادت سے زیادہ ہے) یہاں تفکر سے مراد باری تعالیٰ کی صفات خلقیہ میں تفکر کرنا ہے۔ ذات میں تفکر کرنے کو آپؐ نے ایک دوسرے ارشاد میں منع فرمایا ہے۔ اس لئے کہ وہ انسانوں کے دائرہ سے باہر ہے۔

پھر امام غزالی نے حضرت عائشہؓ کی زبانی رسول کریمؐ کے یہ ارشادات نقل کئے ہیں۔

"ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب رسول کریمؐ نماز پڑھتے تھے اور روتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ حق تعالیٰ نے آپکے سب گناہ بخش بھی دیئے۔ پھر آپ کیوں روتے ہیں۔ فرمایا کہ میں کیوں نہ روؤں میرے اوپر یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ[1]" پھر آپ نے فرمایا کہ افسوس ہے کہ اس شخص پر جو یہ آیت پڑھے اور ان چیزوں میں تفکر نہ کرے"۔

حضرت عیسیٰؑ کا یہ قول بھی قابلِ ذکر ہے۔

"حضرت عیسیٰؑ سے لوگوں نے پوچھا کہ یا روح اللہ زمین پر اور کوئی بھی آپکے مثل ہے۔ فرمایا ہاں جس شخص کا کلام بالکل ذکر ہو۔ خاموشی بالکل فکر ہو اور نظر بالکل عبرت ہو۔ وہ میرے مثل ہے"۔

اس کے بعد ایک اور حدیث رسولؐ نقل کی گئی ہے۔ جس میں غور و فکر اور عجائبات عالم سے عبرت حاصل کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے۔

ابو سلیمان دارانیؒ کا یہ قول بھی امام غزالی کے نزدیک کافی اہمیت رکھتا ہے۔

"دنیا میں تفکر کرنا حجاب آخرت ہے اور آخرت میں تفکر کرنے کا ثمرہ حکمت اور دلوں کی زندگی ہے"۔

فضیلتِ تفکر کے اس بیان کے بعد امام غزالی کے خیالات و افکار کی قدر و قیمت اس لحاظ سے بڑھ جاتی ہے کہ اس میں تفکر کا بلند ترین مقصد پیش نظر رکھا گیا ہے یعنی تخلیق عالم کے اسرار و رموز کی تحقیق اور خالق کائنات کی قدرتوں کا عرفان۔ جس کے دائرہ میں علوم و فنون کے وہ تمام بنیادی مسلمات آجاتے ہیں جن کی بنا پر تمدنی... حیاتیاتی اور طبعی معلومات کو ترتیب دے کر فلسفوں کی تشکیل ہوتی ہے اور نظام بنتے ہیں۔

امام غزالی کے نزدیک تفکر کی حقیقت کیا ہے؟ اسے سمجھنے کے لئے اس اقتباس کا مطالعہ اہم ہے۔

طلب علم تفکر کے معنی ہیں اور جو علم فی البدیہہ نہ معلوم ہو اسے طلب کرنا چاہیئے اور اسے جاننا اور دریافت کر لینا ممکن نہیں مگر اس طرح ہر کہ اور دو معرفتوں کو جمع کریں اور ان دونوں میں تالیف کریں تاکہ جفت ہو جائیں اور ان دونوں معرفتوں میں سے تیسری معرفت پیدا ہو۔ جس طرح نر مادہ سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ دونوں معرفتیں اس تیسری معرفت کی دو اصلیں

[1] بلاشبہ اہلِ عقل کے لئے آسمان و زمین کی تخلیق اور اختلاف لیل و نہار میں کھلی کھلی نشانیاں ہیں۔

کے مانند میں اس تیسری معرفت کو اور کسی معرفت
کے ساتھ جمع کریں تاکہ اس سے چوتھی معرفت پیدا ہو
اسی طرح ایک معرفت کو دوسری معرفت میں ملاتے
جانا نسل علوم کو بے نہایت بڑھاتا ہے"
اس طریقے سے علوم نہیں حاصل کر سکتا اس کا سبب
یہ ہوتا ہے کہ جو علوم اصل ہیں ان کی طرف وہ راہ نہیں
پاتا۔ اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی شخص سرمایہ
نہ رکھتا ہو تو وہ سوداگری کیونکر کریگا اور اگر اصل علوم
تو جانتا ہے مگر ایک علم کو دوسرے کے ساتھ جمع کرنا
نہیں جانتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سرمایہ
تو رکھتا ہے مگر سوداگری نہیں کر سکتا"

یہاں طرز تحریر مطالب کی راہ میں کسی قدر رکاوٹ پیدا کرتا
ہے شاید اس کا احساس صاحب تحریر کو بھی ہوا ہے۔ چنانچہ آگے چل کر لکھا ہے

"اس کی حقیقت کی تفصیل دراز ہے اس ایک مثال
میں ہم بیان کرتے ہیں کہ مثلاً کوئی شخص جاننا چاہے
کہ دنیا سے آخرت بہتر ہے تو وہ یہ نہیں جان سکتا۔
تاوقتیکہ دو باتیں نہ جانے ایک یہ بات جان لے کہ
باقی فانی سے بہتر ہے دوسری بات یہ جان لے کہ آخرت
باقی ہے اور دنیا فانی ہے جب یہ دو اصلیں معلوم ہو گئیں
تو یہ تیسرا علم کہ آخرت دنیا سے بہتر ہے خواہ مخواہ ان
سے پیدا ہو جائے گا اس پیدا ہونے سے ہم وہ
مضمون مراد نہیں لیتے جو معتزلہ کا مقصود ہے اس
بات کی تفصیل بھی دراز ہے"

اس مثال کے بعد غزالی کا مدعا واضح ہو جاتا ہے۔ اور منطقی
ارتباط پر بخوشی روشنی پڑجاتی ہے۔ پھر غزالی نے اپنی بحث کو اختصار
کی خاطر اس جملے میں سمیٹ لیا ہے:—

"غرض کہ تفکر کی حقیقت اس علم کی طلب ہے جو دو
علموں کو دل میں حاضر کرنے سے پیدا ہوتا ہے مگر جس
طرح گھوڑے کے جوڑے سے بکری نہیں پیدا ہوتی اسی
طرح دو علموں سے جو علم چاہیں وہ نہ پیدا ہوگا۔ بلکہ
ہر نوع علم کی جداجدا دو اصلیں ہیں ان دونوں اصلوں
کو اپنے دل میں جب تک جمع نہ کیا جائے گا تب
تک وہ فروع نہ ظاہر ہونگی"

ان سطور میں غزالی نے ایک دو مبالی طریقہ فکر کی نشاندہی
کی ہے۔ ایک طرف تو مختلف خیالات کی باہم آمیزش سے نئے خیال
کی صورت گری ہوتی ہے دوسری طرف خذ ما صفا ودع ما کدر کا بھی پیش نظر
رہتا ہے مگر اس تمام دقیقہ عمل میں نظریۂ توافق کا احترام کہیں کم نہیں
ہوتا نہ منطقی اصولوں کے خلاف نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ طریقہ فکر
استخراجی ہو ——— یا استقرائی۔ یہ بات دونوں پر صادق
آتی ہے۔

یہاں ایک بات تشریح طلب ہے۔ کیا امام غزالی نے
افزائش نسل کے اصول کو ذہنی عمل پر منطبق کرکے صرف یہ بات ظاہر
کی ہے کہ ذہنی عمل منطقی اصولوں کا پابند ہوتا ہے۔ جیسا کہ مثال سے واضح
کیا گیا ہے۔ یا اس انطباق کی حقیقت اس سے کچھ زیادہ بھی ہے۔ نیا
تحقیق کے نئے نتائج پر دیگر قوانین بھی عائد ہوتے ہیں؟ اس پر گفتگو
کی جا سکتی ہے

قوموں اور نسلوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب کبھی دو مختلف النسل
اور مختلف المزاج قومیں تاریخی حوادث کی بنا پر یا کسی اور سبب سے
ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں اور ان کے میل جول سے تیسری نسل
وجود میں آتی ہے تو یہ تیسری نسل جسمانی اور ذہنی لحاظ سے قوی تر ہوتی
وہ تاریخی عوامل کیا ہوتے ہیں جو اس ذہنی فوقیت کا سلسلہ بھی
نظر ہیں؟ یہاں ان کا مطالعہ بھی موضوع سے خارج نہیں مگر اتنے اہم
اصول کو ذرا امام غزالی کے نظریۂ فکر سے مربوط کرکے دیکھیں۔ کیا یہ اصول
یہاں بھی صداقت پر مبنی کہا جا سکتا ہے؟ دو مختلف طرز ہائے فکر کے
نتائج کے مجموعہ کو کیا تیسری بہتر صورت کہا جائے گا؟

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے ارباب فکر کی ذہنی جدوجہد کا
مطالعہ اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ ارباب فکر کی بیشتر تعداد کا ذہنی
ارتقاء ایسے حالات کی پیداوار ہے جب دو متضاد نظریوں کی باہم

آویزش شدید تر ہو گئی تھی۔

مزید ثبوت کے لئے واقعات کا منفی پہلو دیکھنا ہو تو اس طبقہ کا ذہنی افلاس دیکھئے جو کافی ہاؤسوں اور کلبوں کی پیداوار ہے۔ یا پھر پرانے طرز کے مدرسوں کے ایسے طلبا سے ملئے جنہیں آج بھی علوم جدید کی کوئی خبر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں طبقے کسی عظیم تر مفکر کے وجود سے خالی رہے ہیں۔

جہاں نظریات کی آویزش مطالعہ اجتماعی نقطہ نظر سے اہم ہے وہاں ایک فرد کے ذہنی عمل کا مطالعہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اس سلسلہ میں کافی دلچسپ تجربات ہو سکتے ہیں۔

امام غزالی نے شروع ہی میں یہ کہا ہے کہ جو علم فی البدیہہ نہ معلوم ہو اسے طلب کرنا چاہیئے۔ یعنی غور و فکر کی مدد سے سمجھنا چاہیئے طلب علم تفکر کا دوسرا نام ہے۔ اس کے سوا اس علم کو جاننا ممکن نہیں یہاں ایک نکتے کی بات یہ ہے کہ ابن خلدون اور غزالی دونوں نے ایسے خیالات کے بارے میں جو فی البدیہہ نہیں معلوم ہوتے یا ان کا علم پہلے سے نہیں ہوتا۔ نہایت محتاط الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ابن خلدون نے کہا ہے کہ فکر افعال انسانی کی ایک خاص ترتیب و نظام کے تحت صادر ہونے کا مبداء بنتی ہے اور کبھی کبھی ایسے علم کے حصول کا مبداء و ذریعہ بنتی ہے جس سے انسان ناواقف تھا۔ امام غزالی نے کہا ہے کہ

"تفکر کی حقیقت اس علم کی طلب ہے جو دو علموں کو
دل میں حاضر کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔"

<u>اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر نتیجۂ فکر کی بنیاد کسی پچھلے خیال پر</u> ہوتی ہے جسے ہم نیا پن کہتے ہیں۔ درحقیقت وہ ایک ایسی ترتیب نو ہوتی ہے جس سے ذہن مانوس و متعارف نہیں ہوتا۔ ایسی سب صورتوں میں نتائج تک پہونچنے کا وہ راستہ اختیار کیا جاتا ہے جسے استخراجی کہا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان جس چیز سے واقف نہ ہو وہ اپنا وجود ہی نہ رکھتی ہو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مفردات اور مرکبات کی آمیزشوں سے بے شمار تجربات کئے جاتے ہیں ان میں کوئی نتیجہ خیز بھی ہو سکتا ہے۔ مگر بیشتر ناکامیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض علوم میں صرف مشاہدات سے نتائج اخذ کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ مفروضہ نتائج کی صحت اور درستی کے لئے مشاہدات نہیں کئے جاتے۔ بہرحال یہ اختلافی بات ہے جو علوم و فنون کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے ——۔

تفکر کیوں ضروری ہے؟ اور کس لئے کرنا چاہئے؟ امام غزالی نے اس سلسلے میں لکھا ہے۔

"حق تعالیٰ نے آدمی کو ظلمت اور جہل میں پیدا کیا ہے[1] اسے ایک نور کی حاجت ہے تاکہ اس ظلمت سے نکل کر اپنی راہ لے اور یہ جانے کہ مجھے کیا کام کرنا چاہیئے اور کس طرف سے چلنا چاہیئے۔ دنیا کی طرف سے یا آخرت کی طرف سے اور اپنے ساتھ مشغول ہونا چاہیئے یا خدا کے ساتھ۔ اور یہ نور معرفت کے بغیر معلوم نہیں ہوتا اور نور معرفت تفکر کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح کوئی شخص تاریکی میں عاجز ہوتا ہے اور راہ نہیں چل سکتا تو پتھر کو لوہے پر مارتا ہے تاکہ اس سے آگ چمکے اور اس آگ سے یہ اپنا چراغ جلالے تو اس چراغ کے سبب سے اس کا حال بدل جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ دیکھنے لگتا ہے اور راہ کو بے راہی سے تمیز کر لیتا ہے اور چل نکلتا ہے اسی طرح ان دونوں علموں کی مثل ہے جو اصل ہیں ان دونوں علموں کو تیسرا علم پیدا ہونے کے واسطے جمع کرنا ایسا ہے جیسے پتھر اور لوہا اور تفکر کی مثال ایسی ہے جیسے پتھر کو لوہے پر مارنا اور معرفت کی مثل ایسی ہے جیسے وہ نور جو پتھر کو لوہے پر مارنے سے پیدا ہوتا ہے تاکہ اس کے دل کی حالت بدل جائے اور جب حال دل بدل جاتا ہے۔ مثلاً جب یہ معلوم کیا کہ آخرت بہتر ہے تو دنیا سے منہ پھیر کر آخرت کی طرف متوجہ ہوگا پس تفکر سے تین چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ معرفت، حالت، عمل، مگر عمل حالت کا تابع ہے اور حالت معرفت کی تابع ہے اور معرفت تفکر کی تابع ہے۔ پس تفکر سب نیکیوں کی اصل اور

---

[1] مخلوق ایک ظلمت میں پیدا کی گئی اور پھر اس پر نور چھڑکا گیا۔

کبھی جہاسی بات سے تفکر کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔"

ان سطور میں فکر اور عمل کے تعلق کی نوعیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ عملی قوتوں کو صحیح راہ پر لگانے کے لئے فکر ضروری ہے۔ ہر عمل کی بنیاد کسی خیال یا فکر پر ہوتی ہے۔ بنیاد کی کجی اسے ٹیڑھا بنا دیتی ہے۔ اب بطور خلاصہ ان مراحل کا ذکر ضروری ہے جو فکر و عمل کے باب میں امام غزالی نے بیان کئے ہیں۔

۱۔ علوم کا استحضار ذہنی

۲۔ خیالات کی باہم آویزش و آمیزش

۳۔ تفکر نتائج کی ترتیب و تنظیم

۴۔ معرفت ۔ ۵۔ حالت ۔ ۶۔ عمل

فکر کی جولانگاہ کے بارے میں بھی امام غزالی کا قول سن لیجئے۔

"فکر کی جولانگاہ اور میدان کی نہایت نہیں اس واسطے کہ علم کی انتہا ہے اور سب چیزوں میں فکر جاری ہے مگر جو چیز راہِ دین سے علاقہ نہیں رکھتی اس کی شرح کرنا ہمیں مقصود نہیں اور جو چیز راہِ دین سے تعلق رکھتی ہے اگرچہ اس کی تفصیل بے نہایت ہو مجملاً اس کے انواع کا بیان ہو سکتا ہے۔ یہاں راہِ دین سے ہم وہ معاملہ مراد لیتے ہیں جو بندہ اور خدا کے درمیان ہے"

اس کے بعد وہ انفرادی اعمال کی حد تک تفکر کی تشریح کرتے گئے ہیں جس کی سرحدیں مسائل تصوف سے مل گئی ہیں۔ اجتماعیات میں بھی ان کے نزدیک تفکر خالی از فائدہ نہیں لیکن اپنی حد تک انہوں نے انسان کی انفرادی عبادت کو تفکر کی جولانگاہ بنایا ہے۔

انفرادی اصلاح کے سلسلے میں انہوں نے تفکر کو کس طرح اپنایا ہے یہ بیان انہوں نے سب سے زیادہ تفصیل سے پیش کیا ہے۔ وہ ... کو ایسا دیکھنا چاہتے ہیں ؎

ہر چہ آید در دلم غیر تو نیست　　یا توئی یا بوئے تو یا خوئے تو

اگر اسے اصلاحی تفکر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ انفرادی حیثیت سے تفکر کے مختلف طریقے ہیں۔ جن میں ایک تفکر ذاتی ہے یعنی آدمی اپنے اوپر غور کرے۔ اس سے باطنی نقائص کا ادراک ہوتا ہے۔ پھر مفرو پہلو ان

سے بچنے کے لئے تفکر کی تین صورتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اعمال کا جائزہ۔ کون سا عمل غلط ہے۔ کون سا درست ہے۔ دوسرے اپنا جائزہ یعنی غلط اعمال خود سے کہاں تک سرزد ہوتے ہیں۔ تیسرے تدارکی تفکر یعنی غلط کاری سے بچنے کی صورتیں۔ اس تمام عمل کو احتساب و محاسبہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد متوازی انداز میں اس کے اثباتی پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ بخل۔ مکر۔ ریا۔ حسد۔ غصہ۔ حرص۔ طعام۔ ترش سخن دوستی مال۔ دوستی جاہ وغیرہ کا بھی اس سلسلے میں ذکر کیا ہے۔ جس سے غالباً مراد یہ ہے کہ یہ جذبات بطور محرکات عملی اور فکری قوتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

تفکر کا ایک وسیع میدان۔ تفکر ذاتی کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ذاتِ الٰہی اور صفاتِ الٰہی کے بارے میں سوچا جائے۔ لیکن ذاتِ الٰہی کے بارے میں عام اجازت نہیں دی گئی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ اس کی حدیں مسئلہ جبر و قدر سے مل جاتی ہیں۔ البتہ غزالی نے صفات کے بارے میں غور و فکر کے بہت سے نکات پیش کئے ہیں۔

امام غزالی کے ان خیالات پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے بعد جدید نفسیات کے رجحانات سے ناقدانہ واقفیت بھی ضروری ہے۔ جو ایک ماہر نفسیات جدیدہ ہی رکھ سکتا ہے۔

معلومات عامہ پر بھروسہ کر کے یہاں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں جلس کا بعید ناقص تصور ذہن پر چھایا ہوا ہے۔ ادراک اور فکر پر تحت الشعور کا جو محاسب بٹھایا گیا ہے وہ کبھی کبھی زندگی کے روزمرہ واقعات کو بھی سمجھانے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ عقل و ادراک۔ شعور۔ تحت الشعور۔ لاشعور کے نفسیاتی اور فلسفیانہ پہلو گڈمڈ ہو گئے ہیں۔

بہرکیف اب برسرِ مطلب آئیے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے حسبِ ذیل باتیں قابلِ غور معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ ذہنی ارتقاء پر ماحول کا اثر

۲۔ نفسیاتی الجھنوں کا اثر تفکر کے نتائج پر

۳۔ تخلیقی تفکر کے شرائط نفسی

ان عنوانات کے تحت بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ نئے اصولوں اور قانونوں کی دریافت بھی ہو سکتی ہے۔ نفسیاتی اور ماحولی اثرات کی جدلی تعبیرات قدیم مفکرین سے جدا ہیں۔ پہلے ان کی تعبیر خواہشات جذبات احساسات تعلیم و تربیت۔ اکتسابات ذہنی۔ تجربات زندگی سے کی جاتی تھی۔ اب انہیں خالص نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے جس سے کافی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں اسی لئے بہت سے ارباب فکر تحلیل نفسی کے ان نظریات کیخلاف ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ذہن کی بعض غیر معمولی حالتوں کے تجزیہ میں یہ اثرات خالص نفسیاتی نقطۂ نظر سے پیش کرنے کے بعد ہی ابہام کے پردوں سے نکل پاتے ہیں۔ اس لئے ضروری نہیں ان تعبیرات کا قطعی انکار کیا جائے جن میں نفسیاتی الجھنوں کو اعتدال پر قائم رہتے ہوئے پیش نظر رکھا گیا ہو اور انتہا پسندانہ تقلید سے گریز کیا گیا ہے۔

تنقید کی ان مختلف توضیحات کے بعد اس موضوع پر جتنا مواد ملتا ہے اور مزید مواد کے لئے جو جو نکات سامنے آتے ہیں ان کو ایک عمومی انداز میں مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ آئندہ عمومی ترتیب علم و فن کے ہر شاخ کے لئے بہت سی مفید معلومات فراہم کر سکتی ہے طالب علموں کے لئے اس سے تعلیمی نفسیات کے اصول مل سکتے ہیں مصلحین کے لئے یہ اصلاحی سعی و جہد کا صحیح تصور فراہم کر سکتی ہے۔ فنکار اس سے فن کا ایک تصور لے سکتے ہیں۔ جو فکر و فن میں صحیح تناسب رکھتا ہو۔ اور لفظ و معنی کی گمراہ کن الجھنوں سے پاک ہو۔ نقاد اس سے ادب کے بہت سے مسائل کا متوازن حل پا سکتے ہیں ——— اور اپنی قوت فکر کی گیرائی اور گہرائی میں ہر وہ شخص اضافہ کر سکتا ہے جو تخلیقی صلاحیتیں رکھتا ہو۔

(بشکریہ "معیار")

ناممکن! ——— محمد نیاز

کشاکش سے بدن میں روح گھبرا جائے ناممکن
میں چیخ اٹھوں کہ مجھکو موت ہی آجائے ناممکن

مری خودداریوں کو بے کسی کھا جائے ناممکن
زمانہ ناکسوں کے ناز اٹھوا جائے ناممکن

بنامِ آبِ زمزم شیخ جی! ام الخبائث دو
مگر اس منہ میں اس کا کوئی قطرا جائے ناممکن

ملے گر مفت مے ملتی ہے وہ بھی دستِ زاہد سے
ادھر کم بخت رعبِ زہد ہی چھا جائے ناممکن

قسم کھاتا ہوں اے حسنِ عروسِ پاکبازی اب
کوئی کافر جوانی دل کو بہکا جائے ناممکن

خدایا! دل کو اب کردہ گناہوں پر ندامت ہے
یہ ناکردہ گناہوں پر ترس کھا جائے ناممکن!

(بشکریہ "دعوت")

عاصی کرنالی •

○

شبنم سے اٹھتے ہیں شرر
اُف رے دیوانوں کی نظر
ہوش و خرد یا علم و خبر
ان سے بڑھ کر آہِ سحر
یہ کیا اے آئینِ چمن
چاک ہیں کیوں پھولوں کے جگر
یہ گردوں یہ ماہ و نجوم
منزل ہیں یا راہِ گذر
ساحل کے گوشوں میں حباب
موجوں کے دامن میں گہر
جو خود سیدھی راہ چلے
ہے وہی عصرِ نو کا خضر
آپ فرشتہ بنتے ہیں
یہ تو نہیں معراجِ بشر
لالہ و گل کے دیوانو
عام نہیں توفیقِ نظر

(ہمایوں)

حفیظ میرٹھی •

○

جایئے ہو کے بے قرار کہاں؟
سب ہیں غمگین غمگسار کہاں؟
اب کے پھولوں میں وہ مہک ہی نہیں
لٹ گئی عصمتِ بہار کہاں؟
ہر گھڑی لب پہ ذکرِ یار تو ہے
دل میں ہر دم خیالِ یار کہاں؟
ایک انداز پر رہے قائم
زندگی اتنی وضعدار کہاں؟
ہائے اس دورِ خود نمائی میں
پردہ داری بھی پردہ دار کہاں؟
درد ہی چین سے نہیں رہتا
دل میں گنجائشِ قرار کہاں؟
سہہ سکے بارِ آشیانے کا
شاخِ گل اتنی پائدار کہاں؟

(تسنیم)

فضل من اللہ ●

انجانا گوشہ

چند قدم چلنے کے بعد بابا اللہ بخش ہانپنے لگا۔ سورج آگ برسا رہا تھا اور اس آگ میں اس کا جسم پھنکا جا رہا تھا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور اس کا جسم چند منٹوں ہی میں پسینے سے شرابور ہو گیا تھا جس سے اس کی قمیص جسم سے چپک کر رہ گئی تھی۔ زیادہ تکلیف اسے پیشانی کا پسینہ دے رہا تھا۔ جہاں سے موٹے موٹے قطرے ڈھلک کر اسکی آنکھوں میں گرتے تھے اور آنکھوں میں مرچوں کی طرح پڑتے تھے چنانچہ وہ زیادہ دور نہ جا سکا اور سانس لینے کے لئے رک گیا اور اس نے ایک موٹی سی گالی آہستہ سے دی نجانے کس کو؟ قسمت کو، بیٹوں کو یا۔۔۔ خراب موسم کو؟

صبح تک وہ اس سفر کے لئے تیار نہ تھا۔ کئی دفعہ اس نے بیٹے کو سنایا بھی "میرے کون سے بچے روتے ہیں جہیں تو نہ سہی" جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ منڈی جانے کے لئے رضامند ہو جائے اور جو چیزیں ختم ہو چکی تھیں وہ لیتا آئے۔ اگر وہ بالواسطہ طور پر اسے کہتا تو ممکن ہے کہ وہ مان جاتا لیکن اس کی یہ بلاواسطہ فرمائش بیٹے نے ایک کان سنی اور دوسرے کان نکال دی اور چپکے سے دفتر چلا گیا اب تو وہ واقعی پریشان ہو گیا۔ دکان میں تالا ڈال دینے کی دھمکی جتنی آسان تھی اسے عملی جامہ پہنانا اتنا آسان نہ تھا کیونکہ بدقسمتی سے زمانہ ہی ایسا آگیا ہے کہ بوڑھے والدین کی صحیح عزت اسی وقت ہوتی ہے جبکہ انکے پاس کچھ ہو، روپیہ ہو، جائداد ہو یا کوئی اور ذریعہ آمدنی کا ہو ورنہ۔۔۔ "کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی"۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ بڑے بیٹے کو خاطر میں نہ لاتا تھا حالانکہ سارے کنبے میں وہی کماتا تھا اور سب سے زیادہ محنت وہی کرتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ دفتر کے کام کے علاوہ وہ دکان کے سلسلہ میں بھی اس کا ہاتھ بٹاتا تھا اور دوسرے تیسرے دن اسے اکبری منڈی سے سودا لا کر دیتا تھا مگر وہ اس کا بیٹا تھا اس لئے وہ احسان مند ہونا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ اور موقع بے موقع اگر موقع ملتا تھا ادھر بیٹا بھی تن جاتا تھا اور یہ تناؤ اگرچہ چوبیس گھنٹے سے زیادہ عمر نہ پاتا تھا پھر بھی کھچاؤ پیدا ہو ہی جاتا تھا۔ کل رات بھی یہی ہوا۔ تکرار کی وجہ سالن تھا۔ بیٹا کہتا تھا کہ دن بھر محنت کرنے کے بعد اسے کو روٹی تو کام کی ملنی چاہئیے لیکن باپ کا پارہ حسب معمول چڑھ گیا تھا اور اس نے فضول دلیل بازی شروع کر دی تھی مثلاً یہ کہ نہ بھی تو ہیں نا جنہیں یہ سالن بھی نصیب نہیں، یا یہ کہ اس میں زہر تو نہیں پڑا ہوا وغیرہ وغیرہ بظاہر یہ دلائل خاصے وزنی معلوم ہوتے ہیں اور ان میں ایک جذباتی اپیل بھی ہے لیکن جو شخص محسوس کرتا ہو کہ اسکی آمدنی اچھا سالن دے سکتی ہے تو وہ یہ باتیں برداشت نہیں کر سکتا چنانچہ اس نے جھلا کر سالن کا کٹورا دیوار پر دے مارا اور بھوکے پیٹ بستر پر جا گرا اور کچھ وقت پریشان رہنے کے بعد سو گیا۔ بابا نے پروا نہ کی اور بڑے اطمینان سے کھانا کھایا۔ نماز پڑھی۔ مسجد میں نمازیوں سے گپیں ہانکیں اور ساری رات اطمینان سے سوتا رہا۔ صبح کو جب اس نے بیٹے کو بلاواسطہ منڈی جانے کی ترغیب دینی شروع کی تو اس نے جھنجھلا کر کہا۔

" تم میں باپ کی کوئی خوبی بھی ہے میں رات فاقہ سے رہا مگر تم۔۔"

وہ جل کر رہ گیا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ دراصل اسے بیٹے کا یہ طرز تخاطب ازحد ناپسند تھا۔ اس نے اسے کئی بار ٹوکا بھی تھا مگر بیٹے کی عادت نہ بدل سکی اور ستم بالائے ستم وہ بڑا بحث و تمحیص کا انسان واقع ہوا تھا اور بعض اوقات اس کے دلائل واقعی وزنی ہوتے اور بابا جیسے سہم جاتا لیکن بار ماننا اس کے خاندانی روایات کے خلاف تھی اس کے بزرگوں میں سے کسی نے ایک نوادرد کے ہاتھ میں کنول کا پھول دیکھا اور اسے کہا "یہ بے بہار گلاب کا پھول کہاں سے لائے ہو؟"

نو وارد نے حقیقت بیان کی مگر وہ بزرگ نہ مانا اور آدھ گھنٹے کی دلیل بازی کے بعد کہنے لگا "اچھا بھائی یہ گلاب کا پھول ہی ہوگا" اب ذرا باپ بیٹے کا مکالمہ ملاحظہ ہو۔

"یہ جو تم مجھے "ابا جی" کہتے ہو تو میری عزت کے لئے نہیں کہتے بلکہ عادتاً تمہارے لئے یہ لفظ ویسا ہی ہے جیسے جنگال والوں کے لئے مسٹر جی یا چیئر جی"۔

"میرا جی تو چاہتا ہے کہ تجھے ابا جی ابّے کہوں"

"ہاں ہاں تاکہ رہی سہی کسر پوری ہو جائے، غلط نہیں تم ہو ہی خالص حرا ــــــ"

"نہیں ــــ اس نہیں میں چیخ کا انداز تھا ــــ" یہ بات نہیں مجھے تم سے محبت ہے۔ محبت القابات کی محتاج نہیں ہوتی۔ جہاں القاب ہوتا ہے وہاں محبت نہیں ہوتی۔ کچھ اور ہوتا ہے ــــ اصل الفاظ یعنی پیکر نہیں روح ہے ــــ"

"اور یہ روح ابا جی ابّے اور تم اور تو میں مستور ہے"

"کاش تم ابا جی ابّے کی حلاوت جان سکتے۔ مجھے خوب یاد ہے جب ہماری حلال خور تمہیں 'باپ' کہہ کر پکارتی تھی تو اس لفظ میں کتنی محبت، کتنا احترام اور کتنا کیف پوشیدہ ہوتا تھا۔ کاش میں بھی تمہیں صرف 'باپ' ہی کہہ کر پکار سکتا"۔

"لو اور سنو غلط نہیں تم ہو ہی خالص حرا......"

کبھی کبھار ایسا موقع آجاتا کہ بیٹا اپنی تنخواہ کا اور باپ اور بھائی کی کفالت کا احسان جتاتا۔ تو بابا بھڑک کر کہتا۔

"یہ احسان کیا میں نے تمہیں پال پوس کر جوان کیا، پڑھایا تو تم اس قابل ہوئے، میرا کوئی احسان ہی نہیں"

اب ذرا جوابی منطق ملاحظہ ہو۔

"تم نے مجھ پر کیا احسان کیا۔ ساری دنیا یہی کرتی ہے۔ انسان موت پر فتح حاصل نہیں کر سکتا لیکن یہ حسرت اس کے دل میں ہمیشہ باقی رہتی ہے کہ وہ ایسا کر سکے چنانچہ اس کے لئے وہ مختلف تدابیر کرتا ہے، خواہشیں رکھتا ہے اور کوششیں کرتا ہے ایسی ہی خواہش اور کوشش نرینہ اولاد کی ہے جو اس کی وارث بن سکے جو اس کا نام باقی رکھ سکے خاندانی ناموں کا رواج اسی خواہش نے ڈالا۔ اگر ہم سندھی ہوتے ہوتے تو میرا نام خدا بخش اللہ بخش ہوتا یعنی اللہ بخش کا بیٹا خدا بخش بابا کو اس طرفہ استدلال کی خوفناکی کا اندازہ ہو جاتا لیکن وہ ہار ماننے کے لئے تیار نہ ہوتا بلکہ بحث جاری رکھنے کے لئے لقمہ دیتا۔

"ہاں سندھ میں ایسے ہی نام ہوتے ہیں اور بمبئی میں بھی۔ آدم جی حاجی داؤد، عبدالستار اسحٰق سیٹھ، حبیب ابراہیم رحمت اللہ وغیرہ ــــ"

"انگریزوں کے ہاں بھی یہ سلسلہ چلتا ہے ہمارے نو عیسائیوں کے ہاں جیسے جارج محمد دین، ڈوروتھی نیل گھسیٹا یا ڈیوڈ میتو"

اور اس پر نو عیسائیوں کی عادات کا ذکر چھڑ جاتا اور ان کے لطائف شروع ہو جاتے مگر خدا بخش ــــ بابا اللہ بخش کا بیٹا بھی ایک کائیاں تھا۔ وہ بحث کو ترک کیسے کرتا۔

"تو رہ گئی پالنے پوسنے کی بات تو نہ پالتے نہ پوستے، اور مجھے دوسرا کیوں نہیں پڑھ گیا۔ یہ بھی تم پر احسان ہے ــــ دنیا تو ایک منڈی ہے جہاں ہر شخص پیسے لگاتا ہے تاکہ بعد میں نفع دے سکے والدین اولاد کی تعلیم پر اور تعلیم سے متعلقہ ذرائعات پر بہت کچھ خرچ کرتے ہیں تاکہ بعد میں اس کا پھل کھا سکیں"

"پھل تو کوئی قسمت والا ہی کھا سکتا ہے"

"لیکن یہاں تو سوال نیت کا ہے۔ اگر نیک نیتی سے یعنی اخلاص سے اولاد کی تعلیم و تربیت ہو تو وہ یقیناً والدین کی خدمت کرے گی میں نے اس دنیا میں تھوہر کو پھلتے پھولتے دیکھا ہے تو کیا خلوص نیت اور حسن اعمال کا بیج خراب ہو کہ اس کا پودا برگ و بار نہ لائے گا"

اور بابا اللہ بخش یہاں پہنچ کر قنوطی ہو جاتا اور بیٹے کو طعنے اور گالیاں دینے لگتا نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اکثر گستاخ ہو جاتا لیکن یہی گستاخی اسے ناپسند تھی اس کے برعکس چھوٹے بیٹے سے اسے محبت تھی حالانکہ اس نے اسے بہت دکھ دیا تھا۔ اس کی مرضی کے خلاف وہ اسکول سے بھاگ نکلا تھا۔ اس کی مرضی کے خلاف وہ گھر سے بھاگ گیا تھا۔ اس کی مرضی کے خلاف اس نے نشہ شروع کر دیا تھا،

اس کی مرضی کے خلاف اس نے دکان برباد کی تھی اور اس کی مرضی کے خلاف وہ بعض اوقات رات بھر گھر سے باہر بسر کرتا تھا لیکن اس میں یہ خوبی تھی کہ وہ باغی نہ تھا۔ وہ اسے اباجی اور آپ کہکر یعنی تہذیب سے بات کرتا تھا اور پھر لطف یہ کہ اکڑنے کے لئے اس کے پاس کوئی وجہ موجود نہیں تھی وہ رات بھر باہر رہنے کے بعد جب آتا تو اس قابل نہ ہوتا کہ باپ سے نظریں ملا سکے اور اس موقع پر باپ کی جھڑکیاں، گالیاں اور نصیحتیں سبھی سن لیتا اور دم نہ مارتا اس سے اس کے جذبہ پدری ——— جذبہ حاکمیت ——— جذبہ خداوندی کی تسکین ہوتی اور خواہش ہر ان میں سے کچھ بھی نہیں تھا پھر وہ اس کی محبت کیسے حاصل کر سکتا تھا؟

لیکن آج جب کہ قیامت کی گرمی تھی اور چند قدم چلنے کے بعد اسے عافیت تنگ محسوس ہو رہی تھی وہ چھوٹے بیٹے کو منڈی نہیں بھیج سکتا تھا اسے اس پر اعتماد نہیں تھا اگرچہ وہ اسے پیارا تھا

جب وہ ذرا دم لے کر آگے بڑھنے لگا تو اس کے ذہن میں ایک خیال نے چکا چوندسی پیدا کر دی "اگر میری دو بیٹیاں ہوتیں تو" لیکن وہ اس خیال پر زیادہ دیر غور نہ کر سکا کیوں کہ گرمی تیز ہو رہی تھی اور اسے جلد از جلد شہر پہنچنا تھا۔

شہر پہنچنے میں اسے سوائے اس کے دقت نہ ہوئی کہ بس میں بھیڑ بہت تھی اور اسے اپنی جان اور جیب دونوں کی فکر تھی اس نے کوشش کر کے ایک کھڑکی کے پاس سیٹ پر قبضہ جما لیا جہاں سے اسے باہر کی ہوا آتی رہی جب تک جسم پر پسینہ رہا یہ ہوا خنک رہی اور جب یہ پسینہ خشک ہو گیا تو یہ جسم کو جھلسنے لگی لیکن اس صعوبت کو وہ بس برداشت کرتا ہی گیا۔ اس کیفیت میں اس کا ذہن کچھ سوچنے کے قابل نہ تھا اور موٹر انجن کی سوئی کی طرح تھا جو باوجود حرکت کرنے کے ایک ہی جگہ کھڑی محسوس ہوتی تھی۔ البتہ اس کے ذہن پر ایک بوجھ سا ضرور تھا اور وہ ایک انجانا کرب ضرور محسوس کر رہا تھا۔

گنگا رام کے ہسپتال کے قریب بس رکی تو ایک عورت دو بچوں کو لئے بس میں سوار ہوئی۔ اسکے لاشعور نے پھر وہ سوال دہرایا "اگر میری ——— دو بیٹوں کی جگہ، دو بیٹیاں ہوتیں تو؟" ——— تو یہ صورت کیسی رہتی ——— باوجود کوشش کے کوئی اچھا اور واضح تاثر اس کے ذہن میں نہ ابھر سکا۔ وہ لڑکیوں کے حق میں نہ تھا۔ جب کبھی بھی اس سلسلہ میں اسے اظہار خیال کا موقع ملتا وہ خدا کا شکریہ ادا کرنا نہ بھولتا جس نے اس کی پانچ بیٹیوں کو چھوٹی عمر میں اپنے پاس بلا لیا۔ اپنی ساری عمر میں ایک مرتبہ اس نے ایسا نہ کیا تھا اور وہ موقع تھا اس کے بھائی کے ہاں بچی کی پیدائش کا جسے دیکھکر اس کے بھائی کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ تو اس نے اسے تسلی دی تھی اس نے یہ سنا ضرور تھا کہ بیٹی رحمت ہوتی ہے یا یہ کہ رسولؐ خدا نے فرمایا ہے کہ جس شخص کی دو بیٹیاں ہوں وہ اور آنجنابؐ اتنے قریب ہونگے جتنی کہ ہاتھ کی دو انگلیاں لیکن چونکہ اس کی اپنی کوئی بیٹی زندہ نہ رہی تھی اس لئے اسے اس معاملہ کے روشن پہلو پر غور کرنے کا موقع نہ ملا تھا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ سوسائٹی کی تعمیر میں، بھائیوں کی تعمیر سیرت میں، باپ اور ماں کے کردار کی نرمی میں بیٹی کا کیا حصہ ہوتا ہے وہ بس اتنا جانتا تھا کہ بیٹیاں بوجھ ہوتی ہیں اول سے لیکر آخر تک ... بیٹا بچپن میں ننگا پھر سکتا ہے بیٹی نہیں، پھر بیٹی اگر بد اخلاق ہو جائے بگڑ جائے تو باپ کے لئے پھانسی کا پھندا بن جاتی ہے مگر بیٹا اور پھر بیٹی کے لئے جہیز اور داماد الگ مصیبت ایک بیٹی دو اور دوسرے ایک الو کے پٹھے کی ناز برداری کر داس کے سامنے جھکو نہیں تو ...... !

ادمی بس نے اسے سرکلر روڈ پر کراؤن بس کے اڈے کے پاس اتار دیا یہاں سے اکبری منڈی زیادہ دور نہیں مگر گرمی کی شدت نے اس کا برا حال کر دیا تھا۔ پیاس سے اس کا گلا کانٹا ہو رہا تھا اور پسینہ اس پر مستزاد۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ ٹیوب ویل کے قریب بڑ کے سائے تلے رک گیا اور پھر چلنے لگا پھر اس کی نظر ایک شخص پر پڑی جس نے ایک چاٹی سر پر اٹھا رکھی تھی اس نے سوچا شاید قلفیاں ہوں گی لیکن پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ مکھن نکلی لسی بیچ رہا ہے جس پر اس کو خدا کی شان نظر آئی کہ گاؤں میں جو چیز مفت ملتی ہے وہ شہر میں ایک آنہ گلاس بکتی ہے اور اس نے شہر اور شہر والوں کو ایک موٹی سی گالی دی جو مکھن نکلی لسی بھی قیمتاً بیچتے ہیں اور باریک باریک گاجروں کے قتلے برف پر رکھکر ٹکے سیر کی چیز ٹکے چھٹانک بھی نہیں دیتے

منڈی میں پہنچکر سب سے پہلے اس نے سردائی کا ایک ... گلاس پیا اگرچہ عمر رسیدہ مگر جسیم "پہلوان" نے مغز بادام، اور چاروں مغز شیشوں میں سجا رکھے تھے مگر اسے یقین تھا کہ وہ یہ سب کچھ لوگوں کو نہیں پلاتا ہوگا اس کے باوجود ایک گلاس سے اس کی تسکین ہوگئی اس نے گھی کا بھاؤ پوچھا تو اس نے منہ کا ذکر کیا وجہ اس کی امریکن گھی بتائی جو تقسیم کم ہوا ہے اور پولس کے طفیل دیہات میں زیادہ پہنچا ہے تاکہ اس گھی کو بھی خراب کرے۔

بازار کے عین وسط میں پہنچکر اسے نسوار خریدنے کا خیال آیا۔ اس وقت تک وہ تقریباً تمام ضروری اشیاء خرید چکا تھا۔ پلٹنے ہی والا تھا کہ اسے نسوار کا خیال آیا۔ اس کے لئے چونکہ بازار کے آخری سرے پر جانا پڑتا تھا اس لئے وہ کچھ مذبذب ہوگیا ادھر ٹریفک ایک دم رک گئی ایک ٹھیلا کچھ سامان لادنے کے لئے رکا تو اس کے عقب میں تانگوں، بیوں، ٹھیلوں اور سائیکلوں کی ایک قطار لگ گئی۔ پتہ نہیں بازار کس تنگ دل شخص نے بنائے تھے کہ یہاں آناً فاناً ٹریفک رک جاتا ہے۔ جب زیادہ دیر تک راستہ نہ کھلا تو وہ پلٹنے لگا نسوار کا گاہک کبھی کبھار ہی آتا تھا اور وہ بھی پیسے ٹکے کا اس کی خاطر اتنی مصیبت سہنے کے لئے آمادہ نہیں ہورہا تھا مگر جیسے کوئی ان دیکھی طاقت اسے نسوار کی دکان کی طرف دھکیل رہی تھی۔

اکبری منڈی کا بازار خاتمہ پر —— کشمیری بازار کے نزدیک بالکل تنگ ہوجاتا ہے یہاں بڑھنے اور ہٹنے کے لئے گنجائش نہیں نکلتی چند آدمی اور ایک آدھ سائیکل والا ہو تو کھوے سے کھوا چھلنے لگتا ہے۔ نسوار والے کی دکان پر جب وہ پہنچا تو یہی کیفیت تھی وہ یہاں سے جلد واپس جانا چاہتا تھا لیکن ایک تو نسوار والا کچھ سست قسم کا انسان تھا دوسرے گاہک جاہل کہ حساب اس کے ذہن میں بیٹھتا ہی نہیں تھا۔ اس سے دیر ہوگئی اور پھر اس کی باری آگئی اس نے پاؤ بھر نسوار کا آرڈر دیا نسوار والے نے یہ آرڈر نوکر کو دیدیا ....

.... اس نے دیکھا کہ ایک لڑکی جیسے آسمان سے ٹپک کر وہاں آگئی اس کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن تھی۔

"تالا تم لگا گئیں تھیں؟" نسوار والے نے کہا۔

اور وہ لڑکی جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو خجل ہوگئی اس لئے کہ یہ الفاظ "اگر ایسا کرتی تو آنے نہ دوں گا" اس لئے اس پریشانی کی حالت میں سے

بابا کو اس لڑکی کی آمد اچھی نہ لگی کیوں کہ لڑکی جوان تھی اگرچہ بھرپور جوان نہ تھی لیکن بیشتر اس کے کہ وہ شہر والوں کو ذہن میں روز کے یعنی بے غیرت کہتا اس نے لڑکی کے چہرے پر بے حد پریشانی کے آثار نمایاں دیکھے —— اس وقت وہ پریشانی کی مجسم تصویر بنی ہوئی تھی۔ ایک غیر شخص کی موجودگی میں۔ سراسیمگی کی حالت میں بمشکل کہہ سکی —— "بابا جان کھڑ" اور اس نے باپ کے کان کی طرف اشارہ کیا جس پر عینک کی کمانی پڑی تھی جہاں مچھر بیٹھی ہوئی تھی —— نسوار والے نے بے پروائی سے کمانی پر ہاتھ پھیرنا شروع کردیا لیکن لڑکی نے دیکھا کہ وہ وہاں سے باہر نہیں

"وہ! وہ! کان کے قریب" وہ بے اختیار سراسیمگی کے عالم میں حوصلے سے چلا اٹھی۔

نسوار والے نے عینک اتار دی اور مچھر تمباکو میں آگری جس پر اس نے تمباکو کو ڈھکنا رکھدیا۔ وہ مچھر جو مارنے کے لئے کھسیانی بلی کی طرح ڈھکنے کو دبانے لگا مگر مچھر پھر سے اڑ گئی۔

بابا اللہ بخش نے دیکھا کہ لڑکی کے چہرے پر ایک خوشگوار طمانیت کھیل رہی تھی۔ اور اچانک اس کے ذہن کا ایک دریچہ کھل گیا اور اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ساری عمر یہ اہم گوشہ اس کے لئے اجنبی گوشہ رہا اور خدائے بزرگ و برتر کی ایک عظیم نعمت کا اسے احساس تک نہ ہو سکا۔

عمران انصاری ●

نگاہِ ناز کا نازک اشارا کون سمجھے گا
کہ چمکا میری قسمت کا ستارا کون سمجھے گا

بساطِ عشق پر ہم نے لگا دی جان کی بازی
یہ بازی کون جیتا، کون ہارا کون سمجھے گا

سرِ طوفاں یہ کس کو لیکے موجِ تہ نشیں ابھری
کنارے سے کیا کس نے کنارا کون سمجھے گا

تمہارا رنگ اڑ جاتا ہے احساسِ جدائی سے
خوشی سے کر سکو گے غم گوارا کون سمجھے گا

جہاں اہلِ نظر سازِ طرب پر رقص کرتے ہوں
وہاں سوزِ دروں پروردگارا کون سمجھے گا

سرِ محشر بلندی سے ذرا آواز دیجیے گا
بھلا کس نے کہاں، کس کو پکارا کون سمجھے گا

نگاہِ دوست کو اعظم ہی کچھ بہتر سمجھتا ہے
ستم میں بھی کرم ہے جلوہ آرا کون سمجھے گا

راغب مرادآبادی ●

پھر انقلاب کا شانہ جھنجھوڑنا ہے مجھے
طلسمِ فرقِ مراتب کا توڑنا ہے مجھے

عجب نہیں کہ ہو اک چشمۂ کرم جاری
شرارِ سنگِ ستم کو نچوڑنا ہے مجھے

دلیلِ راہ کہیں جس کو رہروانِ حیات
رہِ حیات میں وہ نقش چھوڑنا ہے مجھے

بجائے تیشۂ عزمِ جواں پہ ناز مرا
چٹان جبر و تشدد کی پھوڑنا ہے مجھے

وہ دل جو ٹوٹ گئے ضربِ سرد مہری سے
انھیں خلوص و محبت سے جوڑنا ہے مجھے

امینِ عظمتِ انساں نہیں جو اے راغب
ہر اس نظام کی گردن مروڑنا ہی مجھے

شمس النساء خالد عرفانی •

دو کنارے

اپنی ان مظلوم بہنوں کی پامال زندگیوں کے نام! ——
—— جس کا عکس میں کر اس افسانے میں جھلک رہا ہے!

پاکستانی وفد کئی دنوں سے اغوا شدہ خواتین کی تلاش میں دلی کے قریب کلدیپ نگر میں آیا ہوا ہے۔

زہرہ نے جب یہ خبر اخبار میں پڑھی تو سوچنے لگی اب جاگے ہیں ہمارے بھائی —— اب یاد آئی ہیں انہیں اپنی بہنیں بیٹیاں اور بیویاں .... کتنی لمبی نیند سوئی تھی ان کی غیرت۔

کیا کریں گے اب وہ ہمیں لے جا کر ہم سکھوں اور ہندوؤں کی، بیویوں کو —— ہم غیر مسلموں کی بچوں کی ماؤں کو۔

ان کے خون نے اب جوش مارا ہے۔ جب کہ ہمارا خون مختلف اقوام کے خون میں خلط ملط ہو کر بٹ چکا ہے۔

اور ایک دن وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ اس کا شوہر دیپک اس کے بھائی اظہر کو لے کر گھر میں داخل ہوا۔

کون بھائی اظہر۔ دل میں دبی چھپی محبت مچل اٹھی۔ وہ اپنی تیسری بچی اوما کو پرے دھکیل کر آگے بڑھی۔ لیکن چند قدم۔ پھر جیسے کسی نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ شاید دیپک کی شوہریت یا کمل ومل اور اوما کی محبت نے ...... اور اس کے اٹھے قدم جیسے دیکھ کر اظہر نے سر جھکا لیا اس کے خون کا جوش جو لمحے پہلے تیزی پر تھا۔ یکدم سرد پڑ گیا۔

زہرہ۔ شیلا کے بھیس میں سفید باڈر والی ساری لگائے ماتھے پر سرخ قشقہ چپکائے ہندو عورت کے بھیس میں کھڑی تھی

بیٹھ جاؤ نا اظہر بھائی! اس نے صاف ستھرے بستر کی طرف اشارہ کیا۔ دیپک کمرے سے جا چکا تھا۔

اظہر ا دل نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گیا۔

سناؤ زہرہ کیسی ہیں تم .... ؟ اظہر کو اور کوئی بات نہ ملی۔ پوچھ کر کیا کیجئے گا بھائی جان؟ زہرہ، زہرہ تب ہی کب جو اپنی بیتی سنائے گی ...... اس وقت تو آپ کے سامنے شیلا ہے دیپک کی بیوی۔ دیپک کے بچوں کی ماں۔ اب ماضی کو چھوڑیئے میرا ماضی تو آپ ہی لوگوں کے ساتھ چلا گیا تھا۔ آپ ہی لوگ لے گئے تھے اسے اسلامی مملکت میں اپنے پاکستان میں سنبھالے تو صرف زہرہ کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ جس میں شیلا کی روح حلول کر گئی۔

تمہارا رشتے برابری پر سکتا ہے۔ کہتے ہیں نا؟ تہبا پڑے پڑے مرنے میں کوئی نہ کوئی بری روح داخل ہو جاتی ہے ہاں تو اس طرح آپ کی بہن زہرہ کا خون بچے رہ گیا تھا جس میں دیپک نے نئی زندگی کی روح پھونکی —— اپنی بیوی شیلا کی روح جسے یہ پاکستان میں چھوڑ آیا تھا —— اور شاید اس لاوارث لاش میں بھی کسی زہرہ کی روح حلول کر گئی ہو۔

ہاں تو آپ شیلا کے حالات سن لیجئے۔ دیپک شروع شروع میں بے حد ظالم اور بے رحم شوہر تھا۔ بات بات پر جھڑکتا اور کبھی کبھی پیٹنے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ لیکن بہت تھوڑے عرصے یہ حالت رہی۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے میں آپ سب کو بھول گئی۔ اور انہوں نے مجھے بھی اپنی شیلا کا بہترین نعم البدل پایا ——

دراصل جب تک میرے دل میں اپنے والدین کی عزت اور اپنی اسلامی عزت کا جذبہ زندہ رہا۔ میں دیپک کی نہ بن سکی لیکن ایک دن میری ملاقات ثریا سے ہوئی۔ ثریا کو جانتے

ہیں نا آپ ——— ہمارے محلہ کے وہ قاضی کی بڑی لڑکی — وہ دراز بال اور سنہری رخساروں والی حسینہ ——— وہ بے حد مطمئن اور خوش تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر اشوک اسے بے حد چاہتا ہے۔ اور اسے بڑا خوش رکھتا ہے۔ اس لئے کہ وہ صرف اشوک کیلئے وقف ہو کر رہ گئی ہے اس نے اپنے عزیزوں کو اپنے ماضی کو یک دم بھلا دیا ——— جیسے وہ اسی کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بھی کہا ——— "پگلی تو کیا سمجھتی ہے۔ اگر تو واپس اپنے گھر گئی تو کیا تیرے عزیز تجھے سینے سے لگائیں گے۔ تجھے وہ مقام دیں گے جو پہلے تھا۔ پھر کیوں اپنی زندگی برباد کر رہی ہے۔ خاموشی سے دیپک کی بن جا بھلا دے سب کو ——— صرف اس کو یاد رکھ اس کی دنیا کو اس کے مذہب کو۔ ایمان تو دلوں کے ہوتے ہیں۔ دل تو کوئی دھونے سے رہا .... چل اب چھوڑ کر جانے والوں کو اپنے تصور سے مٹا دے۔

بس دیپک کی ہو جا۔ اور میں نے ایسا ہی کیا۔ دیپک میرا شوہر اب میری پوجا کرتا ہے ——— مجھے ازدواجی زندگی کی ساری مسرتیں دی ہیں اس نے۔ میرے بچے بھی تو ہیں۔ آذکل دمل. منی۔ دیکھو یہ ہیں۔ تمہارے۔ تمہارے نہیں کچھ نہیں یہ ہمارے مہمان ہیں۔ تمہارے پتا لاتے ہیں نا انہیں۔ نمسکار کرو۔ ان کو۔

اظہر خاموش جیسے زہر کے گھونٹ پیتا رہا۔ اب بس کرو شیلا رانی! دیپک جو شاید سب کچھ سن رہا تھا ملازم کے ساتھ ناشتے کی شے لیکر آیا۔ لو کچھ کھلاؤ پلاؤ انہیں۔

نہیں معاف کیجئے۔ اظہر نے جلدی سے کہا۔ میں اسوقت کچھ نہیں کھاؤں گا۔ بہوں گا۔ وہ جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

ہائیں! بھیا یہ کیا ——— چائے کی ایک پیالی بھی نہیں میں کل آؤں گا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا ——— لیکن میں کچھ سنجیدگی سے باتیں کرنا چاہتا ہوں ——— اور وہ چلا گیا — زہرہ دروازے میں کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی۔ اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اظہر کی آمد نے ماضی کی دبی چھپی آگ کو ہوا دی تھی ——— اس کے دل میں شعلے سے بھڑک رہے تھے۔

شیلا تم نے برا کیا ——— دیپک نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا ——— تمہارا بھائی جانے کن جذبات کے ساتھ یہاں آیا تھا تم نے اس کا مذاق سا اڑا دیا۔ اس پر طعنوں کی بوچھاڑ کر دی۔ شیلا نے ایک نظر دیپک کو دیکھا۔ اور لبسورتی ہوئی بچی کو گود میں لیکر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

نہیں میں نے ان کا مذاق نہیں اڑایا۔ اپنے دل کے زخموں کی ابھرتی ٹیسوں کو دبانے کی کوشش کی ہے۔

اپنے سوتے جذبات کو جاگتے محسوس کر کے تھپکیاں دینی چاہی ——— پھر انہیں حق ہی کیا تھا یہاں آنے کا ——— کون ہے یہاں ان کا وہ غصے سے کہہ رہی تھی۔ غیر مذہب اور غیر عورت کے گھر میں ——— تمہارا دماغ چل گیا ہے کیا۔ دیپک نے مسکرا کر کہا۔ تم دو گھڑی اس سے سیدھے کچھ باتیں تو کرتیں۔ اچھا کل اگر وہ آئے تو اپنے آپ کو قابو میں رکھنا۔

لیکن تین دن گزر گئے۔ اظہر لوٹ کر نہیں آئے۔ شیلا کو یقین تھا کہ اب وہ نہیں آئیں گے۔

کبھی کبھی وہ سوچتی۔ اس نے کس قدر جذباتیت سے کام لیا۔ اپنی ماں کی خیریت بھی نہیں پوچھی نہ اباجان کا حال معلوم کیا اور ہاں چھوٹی بہن تارا ——— ہائے کتنی یاد آتی تھی اسے راتوں کو اکثر وہی خوابوں میں نظر آتی رہی۔

آپی۔ میری گڑیا کی قمیض پر استری کر دو۔ زہرہ آپا ذرا یہ سبق یاد کروا دیجئے۔ اور اپنی ننھے ننھے "طالبوں" کے ذریعہ وہ اسے نظر آتی ——— اور اباجان کا لمبے کا مارا سراپا کھوں کھوں کھوں .... رات کی تنہائیوں میں کس طرح ماضی کی یہ مانوس آواز اس کے کانوں میں گونجا کرتی۔ اور دیر تک کھانستے رہنے کے بعد جیسے وہ کہہ رہے ہوں۔ زہرہ بیٹی پانی کے چند گھونٹ — اور وہ تیزی سے اٹھکر پاس پڑی ہوئی صراحی سے انڈیل کر شیشے کے گلاس میں انہیں پانی دیتی۔ اسے یاد آیا۔ ایک رات جب دیپک یونہی کھانس رہا تھا۔ تو جیسے اس کے کانوں میں آواز گونجی۔ زہرہ بیٹی

پانی کے چند گھونٹ، اور وہ تیزی سے گلاس بھر کر دیپک کے پاس پہنچی۔ میں نے تو پانی نہیں مانگا۔ اس نے حیران ہو کر کہا۔

اوہ ——— وہ یکدم ماضی کی گہرائیوں میں سے حال کی سطح پر ابھر آئی ——— وہ بیتے دنوں کی یاد میں آنسو بہاتی رہی۔ کبھی کبھی وہ اپنے والدین کی بدسلوکی اور بھائی کی بے پروائی سے بیدل سی ہو جاتی۔ جو اسے یوں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اگر اسے دیپک اپنے گھر نہ لے آتے۔ تو نہ جانے وہ کتنوں کے قبضے میں رہتی، اور کیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی۔

لیکن تارا کی یاد اس کے دل میں اکثر سوئیاں چبھوتی رہی۔ ننھی منی نیلی آنکھوں اور گھنگھریالے بالوں والی پیاری سی لڑکی۔ جب اس کے یہاں کمل پیدا ہوا۔ تو وہ قدرے بدل گئی۔ پھر ومل آوارد ہوا۔ اور اب اوما کی آمد پر تو یہ بے حد خوش تھی۔ وہ کبھی کبھی اسے تارا ہی کہہ کر پکارتی ——— تھی بھی تو بالکل ایسی ہی نیلی نیلی پتلیاں لئے موٹی موٹی آنکھیں۔ سنہری چھلے دار بال۔ سفید چمپئی رنگ کس قدر معصومیت تھی اس کے چہرے پر ——— اور اب تو سچ مچ وہ تارا کو بھی بھول گئی تھی مگر اب اظہر نے آ کر اس کی پرسکون دنیا میں ہلچل مچا دی۔ اسکی یادوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا گئے۔ اظہر بے رحم اور بے حس انسان شاما کو وہ یکدم چونکی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ دیپک کے ساتھ پھر چلے آ رہے ہیں ——

بھائی اظہر! آپ اس کی اس دن کی باتوں کا کوئی خیال مت کیجئے۔ یہ کبھی کبھی پاگل ہو جاتی ہے۔ دیپک نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ وہ تعلیم یافتہ اور وسیع دل آدمی تھا۔

اور اس دن وہ پاگل نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنے عزیزوں کے متعلق باتیں کرتی رہی۔ ابا تو کبکے چل بسے تھے۔ مرتے ہوئے انہوں نے وصیت کی تھی۔ کہ زہرہ کو خواہ عمر کے کسی حصہ میں ضرور واپس لانا۔ اماں جان بے حد بوڑھی ہو گئی ہیں۔ اور اب تک اسے یاد کر کے روتی ہیں۔ بلکہ تمہاری جدائی نے ان کی کمر توڑ دی ہے۔

تارا کی شادی ہو گئی ہے اس کا شوہر بیرسٹر ہے۔ بڑا اچھا آدمی ہے، وہ اسے بہت یاد کرتی ہے۔

تارا کا نام سنکر اس کا دبا دبا پیار عود کر آیا ——— کیا اب بھی وہ اتنی ہی پیاری ہے۔ زہرہ مسکرا رہی تھی۔

ہاں اس سے زیادہ ——— لیکن تمہارے غم نے سب کو نڈھال کر دیا ہے۔ وہ بھی بہت دکھی ہے تمہارے لئے۔

اوہ میری تارا ——— اس کا دل بھر آیا ——— لیکن اس نے فوراً اپنی ننھی اوما کو گود میں لے کر بھینچ لیا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھا اس کے سنہرے بالوں کو چوما ——— اور پھر اظہر سے باتیں کرنے لگی

اماں بہت کمزور اور قبل از وقت ضعیف ہو گئی ہیں زہرہ۔ اظہر بولے ان کی بس ایک ہی آرزو ہے اور وہ ہے تمہیں دیکھنے کی ایک بار صرف ایک بار کیا تم میرے ساتھ نہیں چلو گی؟

نہیں بھیا یہ ناممکن ہے۔ اب آپ مجھے لے جا کر کیا کریں گے ابتدا میں اگر آپ آ جاتے تو اور بات تھی لیکن اب ——— اب میں اس نئی زندگی کی شاہراہ پر اس قدر آگے نکل گئی ہوں کہ میرا پلٹ کر آنا ناممکن ہے۔ اور میں تنہا بھی تو نہیں۔ یہ تین جانیں میرے ساتھ ہیں ——— دیپک بھی اب میرے بغیر رہ نہیں سکیں گے۔ اب تو یہی میری دنیا ہے۔

لیکن صرف ماں کی خاطر۔ اظہر نے کہا۔ ان کی آخری بوڑھی آرزو کی تکمیل کے لئے" معاف کیجئے بھائی جان میں اب اس گھر سے قدم نکالنا نہیں آپ بے فکر رہیئے۔ یہ جائیں گی آپ کے ساتھ دیپک نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔" یہ ضرور جائیں گی"

کیا سچ مچ آپ زہرہ کو بھیجنے پر تیار ہیں۔ اظہر نے مسرت سے پوچھا۔ بالکل۔ لیکن ایک شرط ہے میری۔ دیپک نے جواب دیا۔ وہ کیا۔ زہرہ بولی۔

بچے یہیں رہیں گے صرف اوما کو لے جا سکتی ہو تم۔

ہیں ——— زہرہ تڑپ گئی ——— تو کیا آپ سمجھتے ہیں میں بچوں کے بغیر رہ سکوں گی۔ انہیں چھوڑ کر جا سکوں گی؟

نہیں ——— لیکن یہ تمہارے پاؤں کی زنجیریں ہیں ——— دیپک نے مسکرا کر کہا۔ جو تمہیں واپس آنے پر مجبور کریں گی۔ اگر آپ کو اعتبار نہیں تو میں یوں بھی جانے کے لئے رضامند

نہیں ہوں۔ زہرہ کہنے لگی۔

نہیں تمہیں جانا پڑے گا۔ اپنی بوڑھی ماں کی خاطر۔

ہاں زہرہ بہن تم ضرور چلو صرف چند دنوں کے لئے۔ اظہر نے پھر اصرار کیا۔ تم اپنی ممتا سے ہی ماں کے دل کے انداز لگالو۔

مگر کمل اور دمل مجھے چھوڑ کر کیسے رہیں گے۔ مانا کہ وہ آپ سے زیادہ مانوس ہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ بھی ساتھ چلیں۔ وہ دیپک سے کہنے لگی۔

میں !۔۔۔۔۔۔ وہ زور سے ہنسا۔۔۔۔۔۔ کیا تمہارے والدین مجھ سے داماد کا سواگت کریں گے۔ کرسکیں گے۔

زہرہ سوچنے لگی۔ اس کی ماں نے اس کے لئے کیسے نفیس جوڑے اور قیمتی زیورات تیار کر رکھے تھے۔۔۔۔۔۔ کتنا ارمان تھا۔ انہیں اس کو دلہن بنی دیکھنے کا۔۔۔۔۔۔ ابا جان کو مجھ سے کس قدر پیار تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے۔ میں اپنی بیٹی کا ایسے سے بیاہ کروں گا جو کار رکھتا ہو بنگلے کا مالک ہو، اور میری شہزادی کی خدمت کے لئے بہت سے نوکر چاکر ہوں۔

آہ۔۔۔۔۔۔ والدین کے سنہری سپنے اور میرا شاندار مستقبل تم غور کرلو زہرہ۔۔۔۔۔۔ دیکھو پھر ایسا موقعہ ہاتھ نہ آئے گا دیپک نے کہا۔۔۔۔۔۔ اور چلا گیا۔

تیسرے ہی دن وہ منی کے ساتھ اپنے بھائی کے ہمراہ ریل میں بیٹھی اور پاکستان کی سرحد میں داخل ہو گئی۔ اسے خوشی تھی کہ وہ اپنے برسوں کے بچھڑے عزیزوں سے ملنے جارہی ہے۔

لیکن اس کے دل کو اطمینان نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس دیس میں اجنبی محسوس کر رہی تھی۔

رات کو یونہی بچی نیند سے چونک کر مچل گئی۔ اور زور زور سے رونے لگی۔ کیا ہو گیا اسے اظہر نے جاگ کر پوچھا۔

معلوم نہیں۔ یونہی ضد کر رہی ہے۔ زہرہ نے اسے تھپکیاں دیتے ہوئے کہا۔

اس وقت گاڑی کسی بڑے پل پر سے گذر رہی تھی۔

پھینک دو دریا میں اس کافر کی بچی کو۔۔۔۔۔۔ وہ بیزاری سے بولا۔ زہرہ نے گھبرا کر اظہر کی طرف دیکھا۔ وہ عجیب سی مسکراہٹ سے مسکرا رہا تھا۔ یہ بھی مسکرائی اور منی کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ تین دن کے سفر کے بعد وہ گھر پہنچ گئے۔

زہرہ کا خیال تھا اس کی آمد کی خبر سنکر اس کی بوڑھی ماں اپنے کانپتے لرزتے قدموں سے باہر آئے گی۔ اور اسے بازوؤں میں لیکر پھوٹ پڑے گی۔ تارا آکر اسے چمٹ جائے گی۔ میری آپی۔۔۔۔۔۔ میری زہرہ آپا۔۔۔۔۔۔ وہ اپنا سارا پیار اس کے قدموں میں ڈال دے گی۔

لیکن وہ دیر تک منتظر برآمدے میں کھڑی رہی۔ کوئی بھی تو نہیں آیا اس کی سواگت کو۔

سسرال سے آئی بیٹی کے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہے کیا؟ وہ سوچنے لگی؟

ارے بھئی آؤنا۔۔۔۔۔۔ کہاں رہ گئیں۔ اظہر کی کرخت سی آواز سنائی دی۔

وہ سوئی ہوئی ادماکو شانے پر جاکر کمرے میں داخل ہوئی اسکی ماں نے جو تکیوں کے سہارے اٹھ بیٹھی تھی۔ بے تابی سے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ لیکن دوسرے لمحے اس کی گود میں بچی کو دیکھکر جیسے خود بخود اس کے بازو نیچے گر گئے۔

ایک ہی نظر میں زہرہ نے اپنے ماں کے جذبات کا انداز لگالیا آداب عرض امی جان۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ جیتی رہو بیٹی۔ وہ بھی رو رہی تھی۔

اس نے بچی کو نیچے قالین پر ڈالدیا۔ اور پلنگ کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے گود میں اپنے آپ کو ڈال دے۔ اور اس قدر روئے کہ آٹھ سال کی جدائی کا غم تمام بہہ جائے۔

لیکن سب کے سوکھے سوکھے چہرے۔ اجنبی نظریں۔ کہاں رہتی ہو تم کون ہے تمہارا شوہر۔ کتنے بچے ہیں۔ اور اس قسم کے بہت سے سوال اس کی اماں نے کر ڈالے۔ زہرہ ہر بات کا جواب دیتی رہی۔۔۔۔۔ سب کچھ سننے کے بعد انہوں نے ایک آہ سرد بھری۔ اگر آج تمہارے

ابا جھٹے تو کیا گزرتی تمہیں اس حالت میں دیکھ کر ان پر......

کاش! تم پیدا ہوتے ہی مرجاتی......

ماں کے منہ سے یہ الفاظ...... زہرہ نے ایسی نظروں سے کمرے میں خاموش ٹہلتے اظہر کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو آپ یہی سب سننے کے لئے مجھے یہاں لائے تھے بھائی جان....

تارا کہاں ہیں امی...... اس نے اپنے مجروح جذبات کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

وہ اپنے گھر...... شاید شام تک آئے گی۔ اس کا شوہر ذرا تنگ دل آدمی ہے۔ ویسے تو وہ بہت خوش ہے اپنے گھر میں فوج میں افسر ہے وہ...... ہائے کتنی دشواریاں پیش آئیں ہمیں اسے اٹھانے میں...... خدا کا شکر ہے کہ اس وقت وہ عیش میں ہے۔

اتنے میں ایک نازک اندام گندمی رنگ اور دلکش نقش و نگار والی جوان عورت ناشتے کے برتن لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔

زہرہ نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ سفید سادی ساڑھی ہلکا پھلکا زیور اور بکھرے بکھرے بالوں میں کون ہے یہ ملازمہ تو معلوم نہیں ہوتی۔

یہ تمہاری بھاوج ہے زہرہ۔ امی نے اس کے تجسس کو پڑھ لیا۔ بھاوج۔ زہرہ نے حیرانی سے پوچھا۔

ہاں یہ ہندو لڑکی ہے۔ اس کے عزیز اسے چھوڑ کر اپنی جانیں لے کر بھاگ گئے تھے، اور یہ مسلمان غنڈوں کے ہاتھ آ گئی تھی۔ لیکن بروقت اظہر نے اسے ان کے ہاتھوں سے چھڑا لیا اور اپنے گھر لے آئے خیال تھا کہ امن و امان ہونے پر اسے اس کے عزیزوں کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ لیکن ہم ایسا نہ کر سکے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے امی اسی کی کہانی دہرا رہی ہے۔

پھر جب اظہر کی شادی کی ضرورت پیش آئی تو ہمیں کہیں سے دلہن حاصل نہ ہو سکی، اور مجبوراً اسی کو مسلم بنا کر اس گھر کی بہو بنانا پڑا

کیوں دلہن کیوں نہ ملی اظہر بھائی کے لئے۔ زہرہ نے پوچھا جس گھر کی لڑکی ایک ہندو مرد کی بیوی بنے اس کے بچے پیدا کر رہی ہو۔ اس گھر میں کون اپنی بیٹی دے سکتا ہے زہرہ اظہر نے حقارت اور طنز سے کہا...... زہرہ کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری تارا کو مجھ جیسا بر مل گیا۔ ورنہ میری معصوم بچی کی زندگی بھی تباہ ہو کر رہ جاتی۔ ماں نے کہا۔

شام گزر گئی تارا نہیں آئی۔ دوسرا اور تیسرا دن بھی خیر جانے دو۔ زہرہ نے سوچا۔ وہ بھی اگر شاید میرے بچارے دل پر کوئی گھاؤ لگائے۔ اس کے دل میں بہن کا پیار سہم کر سمٹ گیا

پھر ایک دن صبح اس کی بھابی نے اسے آکر جگایا۔ بہن اٹھو تارا آئی ہے تم سے ملنے۔ اور ایک بار وہ پورے جوش سے تارا کو گلے لگانے دوڑی...... وہ اماں کے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔

تارا میری بہن —— اس نے بانہیں پھیلا دیں۔ اور تارا بھی مچل گئی۔ مگر اس کی نظریں اپنے شوہر پر پڑیں۔ جو اسے نظروں ہی نظروں میں کہہ رہا تھا۔ خبردار اس جسم کو نہ چھونا۔ اور تارا پھر واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

یہ سب دیکھ کر وہ بے حد بد دل ہوئی۔ اس کا دل چاہنے لگا وہ آج ہی یہاں سے چلی جائے۔

اور ایک ہفتے کے بعد جب اس نے اپنی واپسی کا خیال ظاہر کیا تو اظہر بگڑ گیا۔ یہ نہیں ہو سکتا زہرہ اب اس خیال کو دماغ سے نکال دو۔

لیکن مجھے بچے یاد آ رہے ہیں۔ وہ میرے بغیر بیمار ہو گئے ہوں گے وہ روہانسی سے ہو کر بولی۔

وہ سب مرجائیں مجھے خوشی ہے۔ اچھا ہوتا تم اس سپولن کو بھی وہاں چھوڑ آتی۔ اظہر انتہائی حقارت سے بچی کو دیکھتے ہوئے بولے

بہرحال مجھے اب جانا ہے وہ بولی۔ تمہاری ان سب سے یہ نفرت اور حقارت میرا ارادہ نہیں بدل سکتی۔

زہرہ —— وہ گرجا —— زبان بند کرو آئندہ واپسی کے متعلق کچھ کہا۔ تو میری بندوق تم نے دیکھی ہے نا؟

جی ہاں دیکھی ہے۔ وہ شیرنی کی طرح بپھر گئی اور آپ کی بہادری اور غیرت بھی...... اس وقت کہاں گئی تھی آپ کی یہ غیرت...... جب بزدلوں کی طرح مجھے۔ اپنی بہن کو۔ ہندو

سکھوں کے درمیان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے ـــــــــ

اس وقت بھی تو آپ جوان اور توانا تھے۔ یہی دل اور یہی جذبات رکھتے تھے۔

یاد ہے آپ سب ٹرک میں بیٹھے بھاگ رہے تھے، اور میں اپنی دوسری بہنوں کے ساتھ دشمن کے نرغے میں پھنسی آپ کو اپنی عزت کا واسطہ دے دے کر بچانے کے لئے پکار رہی تھی۔ اس وقت آپ نے کان بند کر لئے تھے۔ ایک بار پلٹ کر نہیں دیکھا تھا اس وقت بھی تو یہ بندوق تھی آپ کے پاس اور اس کی گولیاں۔ منہ بند کرو زہرہ ـــ اظہر غصے سے کانپنے لگا۔ آپ یہ گرمی اور غصہ صرف اپنی مظلوم بہن کے لئے رہنے دیں اظہر بھائی۔ جیسے آپ نے صرف خانہ پری کرنے اور گھر سنبھالنے کے لئے نکاح کی زنجیر میں جکڑ رکھا ہو۔

بیاہتا بہنوں پر کسی کا زور نہیں ہوتا۔ میں اپنی مرضی کی خود مالک ہوں۔ میں آج ہی واپس جاؤں گی۔

زہرہ خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔ ماں نے کہا۔ یہ ضد چھوڑ دو۔ اب تم یہیں رہو گی۔ واپسی کا تصور بھی۔

کیا آپ بھی یہی کہہ رہی ہیں اماں۔ زہرہ نے کہا۔ آپ تو ماں ہیں میرے دل کا اندازہ لگا سکتی ہیں۔ میرے دو بچے مجھ سے دور ہیں اس وقت .... انہیں میری ضرورت ہے میرے شوہر کو میرا انتظار ہوگا۔

آپ لوگوں کو مجھ سے ملنا تھا مل چکے۔ میں نے آپ سب کی محبت کا خوب اندازہ لگا لیا۔ آپ سب کی نفرت حقارت سب کچھ محسوس کر لی۔ اب مجھے جانا ہے۔ وہ میرا گھر ہے۔ میرا شوہر بڑی قدر کرتا ہے میری۔ مجھے بے حد چاہتا ہے وہ۔ میرے گھر میں میری عزت ہے۔ میں یہ قابلِ نفرت زندگی برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ لوگ میرے لئے محض اجنبی بن کر رہ گئے ہیں۔ میں یوں غیر کی دنیا میں کب تک رہ سکوں گی۔ بس اب ہم کچھ سننے کے لئے تیار نہیں۔ اظہر نے آخری فیصلہ سنایا۔ دیکھو اگر یہ فرار ہوئی۔ تو تمہیں گولی مار دی جائے گی۔ وہ اپنی بیوی کو میرا محافظ بنا کر چلے گئے۔

چند دن زہرہ نے بے بسی سے اور گذار دیئے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ یہاں کبھی نہ رکے گی بلکہ اس نے اپنے ساتھ اپنی بھانجی کو بھی بھاگ نکلنے کے لئے تیار کر لیا تھا۔ جو یہاں کتوں سے بدتر زندگی گذار رہی تھی۔ وہ موقعہ کی تلاش میں تھی۔

لیکن اس دن اس کی مایوسی کی انتہا نہ رہی جب اسے معلوم ہوا .... اظہر بھائی نے اس کی طرف سے دیپک کو انتظار نہ کرنے اور اپنی نفرت و حقارت کے ساتھ کبھی نہ لوٹنے کے لئے لکھ دیا ہے اور وہاں سے بھی جواب مل گیا کہ اسے یہی خطرہ تھا۔ اور اس کی اسے کچھ ایسی پروا نہیں۔ کمل اور ومل اس کے بغیر بھی بڑی خوشی سے جی رہے ہیں۔

آہ .... میری انہیں بھی ضرورت نہیں۔ میرے بچے بھی میرے بغیر رہ سکتے ہیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اب کیا ہوگا زہرہ بہن ..... اس کی بھابی نے ٹوٹے ہوئے دل سے پوچھا۔ بھاگ نکلنے کا جو راستہ اس کے لئے کھل رہا تھا وہ اسے بند ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

اب۔ اب زندگی بیکار ہے بہن۔ زہرہ نے کہا اور ایک دن زہرہ گھر سے غائب تھی۔

تلاش کے بعد جلد ہی معلوم ہوا کہ .... ایک عورت اور ایک ننھی بچی کی پھولی ہوئی لاش پانی کی ندی میں تیر رہی ہے۔ اظہر دل نہ چاہتے ہوئے بھی ندی کے کنارے پہنچا۔ زہرہ منی کو سینے پر چپٹائے دوسرے کنارے پر بہہ رہی تھی۔ اظہر اسے دیکھتا رہا۔ لو بھائی جان خدا حافظ۔ دیکھا میں جا رہی ہوں نا؟ اپنے گھر سے ..... جلد ہی لاش ڈوبتی ابھرتی شکستہ ناؤ کی طرح دوسرے کنارے پر جا لگی ..... ادھر اس ساحل پر اظہر پیشانی پر ہاتھ رکھے دیکھتا رہا جب لاشیں نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ اور شکست خوردہ سا پلٹ آیا۔

(بشکریہ شہناز)

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان ہی نہ ہو ـــــــ منیجر

ابنِ محمود ●

○

بغیر سوز فغاں بھی فغانِ بے اثری
سوادِ شام رہے یا سپیدۂ سحری
ابھی تو سمتِ سفر بھی ہے نا درست تری
ابھی خیال محض ہے خیال راہبری
یہاں کے رازِ نہفتہ کو کھولنے والے
سمجھ سکا نہ تو خود کو اسے وائے بیخبری
ترا مقام ستاروں سے بھی بہت آگے
بھٹک رہی ہے کہاں کچھ تیری دون نظری
ترا فریضۂ ہستی فقط پیامبری
تری حیات کا مقصد جہادِ بے جگری
ترے وجود سے بزمِ حیات کی رونق
ترے ہی ہاتھ میں دنیائے غم کی چارہ گری
دمِ وصال نہ جانے کہ کس طرح گذرے
شبِ فراق نہ پوچھو کہ کس طرح گذری

احمد نسیم مینا نگری

○

کسی کا درد پہلو میں اگر شامل نہیں ہوتا
کبھی وہ دل مذاقِ عشق کے قابل نہیں ہوتا
صداقت بے خطر بیباک کر دیتی ہے انساں کو
جو حق گو ہیں انھیں اندیشۂ باطل نہیں ہوتا
محبت راہ کی دشواریوں کو ختم کرتی ہے
کبھی محسوس رہرو کو غمِ منزل نہیں ہوتا
رموزِ عشق سے واقف جو ہو جاتا ہے دنیا میں
وہ اک لمحہ بھی تیری یاد سے غافل نہیں ہوتا
ظفرمندی ثمر ہوتا ہے دنیا میں عمل ہی کا
کہ بے سعیٔ عمل دنیا میں کچھ حاصل نہیں ہوتا
فریب خوابِ ہستی خود عیاں ہو جائے انساں پر
مگر انساں شناسائے نگاہ و دل نہیں ہوتا
سفینہ ڈوب جاتا ہے کبھی آکر کنارے پر
کبھی طوفاں کی موجوں میں غمِ ساحل نہیں ہوتا
اگر قیدِ قفس میں طاقتِ پرواز باقی ہے
قفس کو لے کے اُڑ جانا کوئی مشکل نہیں ہوتا
نسیمؔ آسان ہو جاتی ہے ہر دشواریٔ منزل
اگر انساں میں ہمت ہو تو کچھ مشکل نہیں ہوتا

(ادبِ عالیہ)

ریڈرز ڈائجسٹ سے ایک افسانہ کا آزاد ترجمہ

ظفر حسین •

اعتراف

کلیسا کے نووارد جوان پادری کو یہ بات عہدہ سنبھالتے وقت ہی بتا دی گئی تھی کہ اس کی رہائش کا انتظام کلیسائی علاقہ کے اس حصہ میں ہے جہاں قصاب اور دیگر نچلے طبقہ کے لوگ آباد تھے اور جہاں گندگی، اور آوارگی، دونوں، شہر کے دیگر علاقوں کے بہ نسبت کہیں زیادہ تھیں۔ جوان پادری نے یہ تمام باتیں نہایت صبر و سکون سے سنیں۔ فحاشی اور آوارگی کے خلاف جو جذبہ مدت سے اس کے دل میں موجزن تھا اس کے تدارک کا تو یہی موقع تھا۔ پھر بھلا وہ یہ تمام باتیں سنکر ناک بھوؤں کیوں چڑھاتا؟

جولائی کی ایک گرم دوپہر کا یہ واقعہ ہے۔ جبکہ تمام لوگ اپنے اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے۔ وہ سیاہ جبہ میں ملبوس کلیسا کے بڑے دروازہ کے سامنے کھڑا تھا۔ چہرے سے ایک گہرے فکر کی جھلک دکھائی دے رہی تھی، اور پسینہ کے ننھے ننھے قطرے اس کی شفاف پیشانی پر لرز رہے تھے کہ ...... سستی سینٹ کی ایک ہلکی سی لپٹ نے اسے چونکا کر خیالوں کی دنیا سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ ٹھیک اس کے مقابل، بھرے بدن کی ایک عورت بڑی بے باکی سے ایک ہاتھ کمر میں دھرے اپنی بلی جیسی گول گول آنکھوں سے اسے مسلسل گھورے جا رہی تھی۔ چہرے سے تازگی اور بشاشت مفقود تھی اور انکی جگہ تجربہ کاری اور مکاری کی جھلک نمایاں تھی۔ لبوں پر ہلکی ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ہاتھوں میں اس نے سستی قسم کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں اور چہرے پر ریشمی جھالر ڈال رکھے تھے۔ اور پھر اس نے ایک کرخت سی زنانہ آواز سنی۔

"آرام کرو۔ بوڑھے لڑکے۔ میں یہاں کسی مذہبی سلسلے میں نہیں آئی ——"

"تو پھر تم یہاں کس لئے آئی ہو ——؟" پادری نے سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا۔

"اوہ! —— ابھی ابھی میں نے اپنی بوڑھی ماں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں کلیسا میں ضرور جاؤں گی۔ اور بس —— وہ راستہ میں میرا انتظار کر رہی ہے۔ اور میں ..... چند منٹ یہاں یونہی، ٹھہر کر اسے یہ یقین دلا دینا چاہتی ہوں کہ اعتراف گناہ میں مشغول ہوں"

پادری کی شفاف پیشانی پر یکبارگی پسینہ کے ننھے ننھے قطرے جھلکنے لگے۔ آہستہ سے اس نے پیشانی صاف کی اور گلا صاف کرتے ہوئے بولا —— "سنو بچی ..... !"

"میرا نام اگنی ہے —— اگیتا آر ..... "

"میں تمہارا نام نہیں پوچھتا ——" پادری نے پرسکون لہجہ میں قطع کلام کرتے ہوئے کہنا شروع کیا —— "لیکن تمہیں اب یہ ضرور بتا دوں گا کہ "اگیتا" ایک لاطینی لفظ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں "نیک اور صالح —!"

"یہ تمہارا ایک مذاق ہے ——!" وہ آہستہ سے ہنسی —— "اگیتا۔ یعنی نیک اور صالح! اوہو! ذرا مجھے اپنے کو تم سے پوری طرح متعارف تو کرا لینے دو۔ ذرا مجھے یہ تو بتا لینے دو کہ میں کون ہوں شاید تمہیں نہیں معلوم۔ اچھا لو میں خود ہی بتلائے دے رہی ہوں۔ سنو محترم پادری صاحب! میں اس شہر کی شاید سب سے آوارہ عورت ہوں۔ ہاں۔ ہاں —— آوارہ —— فاحشہ۔ سمجھے! اور ابھی ابھی حکومت کی "زنانہ اصلاح گھر" سے چھوٹ کر آ رہی ہوں"

اس نے یہ تمام باتیں کچھ اس انداز میں اگل دیں جس میں ایک فاحشہ عورت کی حقارت انگیز بیباکی اور بے حیائی دونوں پوری طرح اجاگر تھیں —— اور نوجوان پادری سمجھ گیا کہ اس کا یہ بے حجابانہ اندازِ گفتگو اور باغیانہ گستاخی دراصل اس کے اندر چھپے

ہوتے شیطان کی آواز ہے ـــــ اس کی اپنی نہیں ـــــ کیونکہ ضمیر تاریکیوں میں ڈوب ضرور جاتا ہے پر فنا نہیں ہوتا اس لئے اس کی اصلاح ممکن ہے۔ راہی راستہ کے پیچ و خم میں پھنس کر منزل سے بھٹک ضرور گیا ہے۔ لیکن وہ پھر منزل کے قریب پہنچ سکتا ہے۔

"جو کچھ بھی فکر مجھے وہاں رہی ـــــ" عورت نے دم لینے کے بعد کہنا شروع کیا ـــــ" وہ یہ کہ کس طرح اس منحوس "بندش خانہ" سے نکلوں ـــــ اور اس کے لئے میں نے دعائیں بھی مانگیں۔ لیکن تم کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ میری دعائیں اور التجائیں خدا سے نہیں تھیں ـــــ کیونکہ میں جانتی تھی کہ مجھ جیسی آوارہ ہستی کی دعائیں سننے کے لئے اس کے پاس وقت نہیں ـــــ"

"اگر میں یہ کہوں کہ اس کی ذات سے متعلق ایسا غلط خیال تم نے کیوں قائم کر لیا تو ؟"

"اب کچھ بھی کہو ـــــ میں جانتی تھی کہ میں گنہگار ہوں۔ آوارہ ہوں ـــــ فاحشہ اور ناپاک ہوں ـــــ میں ہزار کچھ کروں گناہ کے سیاہ داغ پیشانی سے نہیں دھل سکتے۔ لوگ مجھے فاحشہ ہی کہیں گے۔ پھر جبکہ ہمیشہ کے لئے میری حیثیت ایک پاپی اور گنہگار کی سی ہوگی ـــــ تو تمہارے اس خدا کے سامنے یوں گڑگڑانے سے فائدہ ـــــ؟ اور اسی لئے میں نے "شیطان" سے مدد کی درخواست کی ـــــ"

پادری کا جوان چہرہ ذرا غضب سے تمتما اٹھا۔ حق سے یہ انحراف اور گستاخی اس کے لئے نہایت حیرتناک اور قابل شرم بات تھی ـــــ مگر فوراً ہی اس نے اپنے اس وقتی جوش پر قابو پا لیا۔

"لیکن شیطان" وہ پھر اپنے اسی سنجیدہ اور پرسکون لہجہ میں بول اٹھا ـــــ" کیا اس نے تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا؟"

"کیوں نہیں ؟ ـــــ کیا تم اپنی خدمتوں کا معاوضہ لینا چھوڑ دوگے ۔ ؟ میں نے شیطان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ مجھے اس منحوس" اصلاح خانہ" سے نجات دلادے تو میں نوانسانوں کو گنہگار بنا کر اس کی صف میں داخل کرادوں گی ـــــ اور واقعی میں نے ایسا ہی کیا ـــــ میں نے نو بیوقوفوں کو اپنے حسن کے جال میں پھانس کر انہیں خدا پر لعنت و ملامت کرنے پر مجبور کر دیا اور ان بے وقوفوں نے خوب لعنتیں بھیجیں ـــــ بڑا ہی مزا آیا ہا ہا ہا ہا

(نوجوان پادری ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور حاضر جواب انسان تھا مگر ان بیہودہ باتوں اور بدترین انکشافات پر کچھ دیر کے لئے وہ بھی پریشان سا ہو گیا ـــــ اسے ایسا لگا جیسے شیطان اس کا مذاق اڑانے کے لئے اس مکار عورت کے روپ میں سامنے اکڑا ہوا ہو ـــــ اور عورت کے مکروہ قہقہے۔ جیسے اسے شیطان کے قہقہے محسوس ہونے لگے)

"میں کہتا ہوں کہ شیطان کو ایک اچھا سودا ہاتھ لگا" پادری نے سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا ـــــ" شیطان ہاں شیطان۔ جس سے تم نے اس چیز کی بھیک مانگی جسے تم آزادی کہتی ہو ـــــ اور معاوضہ میں اس نے تم سے تمہارا ضمیر چھین لیا۔ تمہاری انسانیت خرید لی ـــــ"

"اوہ ! اس کے لئے تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ بوڑھے لڑکے ـــــ" وہ ایک عجیب طنزیہ لہجہ میں مسکرا کر بولی مگر اس نے اس کی بات سے بے خبر گفتگو کو جاری رکھا اب اس کے لہجہ میں گرمی آگئی تھی۔ اور آواز میں کسی قدر جوش ابھر آیا تھا۔

"اب بھی وقت ہے ـــــ تمہارا ضمیر ابھی مردہ نہیں ہوا ـــــ تمہاری انسانیت ابھی نہیں مری۔ تم ایک بھیانک فریب نظر میں مبتلا ہو کر اپنے ضمیر اور اپنی انسانیت کو تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دینا چاہتی ہو۔ تم اپنے اندر کے انسان کی آواز کو زبردستی دبا دینا چاہتی ہو۔ جبکہ یہ ناممکن ہے۔ ضمیر فنا نہیں ہوتا انسانیت نہیں مرتی۔ میں کہتا ہوں کہ .... :"

"آخر تم یہ باتیں کس طرح کہہ سکتے ہو ـــــ" اچانک وہ ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح غرا اٹھی۔ جیسے کسی نے اس کی شہ رگ پر انگلی رکھ دی ہو ـــــ جیسے اچانک تصورات کے محل دھم سے نیچے آرہے ہوں۔

"تم اس کلیسا میں کس لئے آئیں ؟ ـــــ اپنی بوڑھی ماں کی خوشی کی خاطر ـــــ کیوں ـــــ؟ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمہاری ماں تمہیں اب بھی پیاری ہے ـــــ تمہیں اس سے اب بھی محبت ہو ـــــ

اور جس دل میں محبت ہو ——— کسی کے خیال کا خیال ہو۔ کسی کی خوشی کی خوشی ہو۔ وہ مردہ نہیں ہو سکتا ——— مجھے چند دنوں کا موقع دو تاکہ میں تمہیں اصل حقیقت سے روشناس کراؤں ——— آؤ تمہیں میں بتاؤں کہ خود تم کیا ہو ——— بس صرف چند لمحے اور یہ تمام باتیں ایک برے خواب کی طرح تمہارے دماغ سے نکل جائیں گی

کسی انجانے خیال سے وہ کپکپا اٹھی۔ اس کے ہاتھ لرز سے گئے اور ہاتھوں کی سستی چوڑیاں فضا میں یکبارگی چھنک کر رہ گئیں۔

"میں جا رہی ہوں ——— !" اس کی آواز میں بیباکی کی جگہ لب لرزش اور گھبراہٹ صاف عیاں تھی ——— "تم میرے لئے کچھ نہیں کر سکتے ——— کچھ نہیں"

"رک جا ——— اور دعا مانگ۔ اے گمراہ ہستی"۔ مگر وہ جانے کے لئے مڑ چکی تھی۔

"لیکن تم آؤ گی ———" وہ زور سے بولا ——— "آج رات تم اعتراف کرنے ضرور آؤ گی"

اور سنگ مرمر کے فرش سے ابھرتے ہوئے جوتوں کی کھٹ کھٹ اس کے سوال کا جواب دے رہی تھی۔

اور حسب معمول لوگوں سے اعتراف سننے کے لئے وہ "اعتراف گاہ" میں داخل ہوا تو اس کے دماغ میں جو خیال گردش کر رہا تھا وہ یہی تھا کہ یہ گمراہ اور آوارہ ہستی یوں ہی تاریکیوں میں بھٹک کر رہ جانے نہ پائے ——— اس کے دماغ میں جیسے نیکی اور بدی ——— فرشتے اور شیطان ——— ضمیر اور خواہشات کی ایک عجیب جنگ جاری تھی۔ اور پھر اچانک اسے ایسا لگا کہ فحاشی اور آوارگی کے خلاف اس کے دل میں پروان چڑھتا ہوا جذبہ طوفان کی شکل اختیار کر چکا ہو جیسے یکبارگی اُبل پڑا ہو۔

یہ کوئی واہمہ نہیں تھا۔ اگنیشا۔ آر۔ کا یہ پختہ یقین کہ گناہ اس کے رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا جس سے بچنا ناگزیر تھا وہ اپنے کو اس گہرے کھڈ میں گرا ہوا سمجھتی تھی جہاں سے نکلنا اس کیلئے محال ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا ——— اس کے اس باطل یقین کو کس طرح ختم کیا جائے ——— کس طرح اسے یہ یقین دلایا جائے کہ وہ ایک بھیانک خود فریبی میں مبتلا ہے ——— مگر ——— مگر وہ کون ہوتا ہے ان سب باتوں کا تجزیہ کرنے والا ——— اور اس لئے اس نے اس سلسلے میں خدا سے مدد کی درخواست کرنا بہتر سمجھا

اس کا جواب بالکل صاف تھا۔ اس قسم کے خیالات کو شکست دینے کا بس ایک ہی راستہ تھا ——— اور وہ تھا ضمیر کا حربہ ——— یعنی محبت ——— پرخلوص عبادت اور عمل صالح ...... اور وہ لوگوں کا اعتراف گناہ سننے کے لئے مڑ پڑا۔ اس وقت وہ اپنے اندر ایک عجیب اکیلا پن اور تنہائی محسوس کر رہا تھا ——— تائب اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر کے پاک ہو رہے تھے۔ اس نے ان میں سے ہر ایک سے یہ کہا ——— "اپنے کفارہ اور دعا کے علاوہ ——— کیا تم ——— ایک بھٹکے ہوئے ضمیر کی خاطر کچھ دیر ... دعا کے لئے ٹھہرنا پسند کرو گے؟"

اور کسی نے بھی انکار نہیں کیا۔ ایک شخص نے صرف اس دعا میں شرکت کے لئے اپنا سفر ملتوی کر دیا اور دوسروں نے اپنے اپنے کام ضروری کام اس دعا تک .... روک دیئے ——— اور "اعتراف گاہ" کی مہراب دار مرصع دیواریں ایک بار پھر دعا کے جنچے تلے الفاظ دھیمے بول سے گونج اٹھیں ——— آج پادری کی آواز میں لوگ ایک عجیب عزم اور جوش کی جھلک پا رہے تھے ——— اسے اپنی اس وارفتگی کا خود پتہ نہ تھا ——— نہ جانے کیوں؟ ——— دعا ختم ہو گئی ——— لوگ آہستہ آہستہ کمرے سے نکلنے لگے۔ شفق کی پیلی پیلی ترچھی کرنیں جالیوں سے چھن چھن کر اس کے پرعزم چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ اور اعتراف گاہ کی چھوٹی چھوٹی کرسیاں اس زرد زرد روشنی سے جھلملا رہی تھیں۔

شام کی اس پرسکون تنہائی میں یسوع کے مجسمے پر جھکے ہوئے اس نے اپنے اندر ایک عجیب انوکھا پن محسوس کیا ——— اور پھر جبکہ، اپنی دعا کو وہ از سر نو شروع کرنے لگا "ہمارے مقدس باپ" تو دور گلی سے کسی پھل فروش کی پرامید آواز نے فضا میں ایک پرسکون سا انتشار پیدا کر دیا ——— "میٹھے تربوز۔ ناشپاتیاں۔ میٹھے تربوز ناشپاتیاں" اور پھر آہستہ آہستہ آوارگی میں ڈوب گئی۔

اور وقت یونہی گزرتا گیا ——— رات کی سیاہی فضا میں

کھلتی گئی۔ ملازم نے کلیسا کے برقی شمع دان بھی روشن کر دیئے تھے اور باہر کلیسا کا بڑا گھنٹہ رات کی آمد کا اعلان کر رہا تھا

ڈنگ ڈونگ ــــــ ڈنگ ڈونگ ــــ ڈنگ ڈونگ ــــ

ڈنگ ڈونگ ــــــ"

باہر سڑک سے بھی اب آوازیں آنا تقریباً بند ہو چکی تھیں۔ البتہ کبھی کبھی گلی کے آوارہ کتے کسی شرابی یا نگے کو لڑکھڑاتے آتا دیکھکر مزید بھونکنے لگتے تھے اور کچھ دیر کے لئے فضا کے اس سکون میں انتشار سا پھیل جاتا تھا۔ اعتراف گاہ میں اب سوائے اگیتھا آر کے پرخلوص اور بے لوث ہمدرد کے کوئی نہ تھا۔ ملازم کی کھڑکیاں بند کرنے اور دروازے مقفل کرنے کی آہٹ آرہی تھی۔ گھڑی کی چھوٹی سوئی بارہ کے خانے کو چھو چکی تھی۔ یکبارگی اعتراف گاہ گھنٹی کی آواز سے گونج اٹھی ــــــ ڈھن، ڈھن۔ ڈھن۔ ڈھن۔ ڈھن۔

مگر دعاؤں میں مصروف یہ ہستی ان تمام چیزوں سے بے نیاز دعا میں مشغول تھی۔ اتنے میں ملازم کمرہ بند کرنے کے لئے اندر آیا۔ "تم جاؤ" پادری نے آہستہ سے سر اٹھاتے ہوئے دھیمے اور پرسکون لہجے میں کہا "میں دروازہ بند کر دوں گا ـــ" اور پھر آہستہ سے سر جھکا کر عبادت میں مشغول ہو گیا ــــــ وقت گزرتا جا رہا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی ... کہ اچانک اس نے سنگ مرمر کی فرش سے ابھرتے ہوئے جوتوں کی آواز آہستہ آہستہ قریب آتے ہوئے سنی۔ اور سینٹ کی جانی پہچانی ایک ہلکی سی لپٹ نے اس کا دل مسرت آمیز یقین سے بھر دیا۔

وہ اپنی جگہ سے مطلق نہ ہلا اور نہ ہی آنیوالے کو دیکھنے کی کوشش کی کوئی اس کے قریب آکر آہستہ سے یسوع کے مجسمے کے سامنے نڈھال ہو کر جھک گیا ــ وہ پاس سے آتی ہوئی سسکیوں کی مسلسل آواز صاف طور سے سن رہا تھا ــــــ اس نے آہستہ سے سر کو ذرا اٹھایا ــــــ کلیسا کے روشن دانوں سے سحر کی ہلکی ہلکی نورانی سپیدی اگیتھا آر کے پروقار چہرے پر پڑ رہی تھی مکاری کی جگہ اس کے چہرے سے اب ایک عجیب قسم کی رونق اور ملائمت ٹپک رہی تھی۔

(حلقہ ادب اسلامی ڈھاکہ کی ایک نشست میں پڑھا گیا)

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہو

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری فروری ۵۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں، یا پھر خط کے ذریعے اطلاع دیں آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے۔ کہ وی۔ پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ منتظر کرم: منیجر منیر کراچی

نمبر	نام	نمبر	نام	نمبر	نام
۱۰۳۱	ملک غلام حسین صاحب سرگودھا	۲۲۹۸	عباد اللہ صاحب، ملتان	۲۲۷۵	سید کوثر علی صاحب جعفری، مالیر کوٹلہ
۱۰۳۲	مختار الرحمٰن صاحب، ہزارہ	۲۲۹۹	حافظ اللہ بخش صاحب، ڈیرہ غازی خاں	۲۲۷۷	قدوس خاں صاحب ابھاگا زمان بھوگ
۲۱۲۲	محمد عرفان صاحب۔ دیناج پور	۲۳۰۳	سردار زادہ میر رسول بخش خانصاحب	۲۲۷۹	اے۔ آر۔ انجم صاحب، آرامکو
۲۱۹۵	مولوی محمد نصر اللہ صاحب کھوکھر پاکپتن		ڈسکی بیل پٹ	۲۲۸۰	احمد علی خاں صاحب خیرپور
۲۲۸۳	مشتاق احمد خاں صاحب مظفرگڑھ	۲۲۶۷	ہیڈ ماسٹر صاحب	[illegible]	دار المطالعہ جماعت اسلامی، بھکر
۲۲۸۶	سپرنٹنڈنٹ صاحب آدمجی بورڈنگ ہاؤس کراچی		ڈی۔ ایل۔ بی ہائی سکول، کھرد	[illegible]	عبد الرزاق صاحب صدیقی
۲۲۸۷	ظفر حسین صاحب، ڈھاکہ	۲۲۶۶	غیور احمد صاحب۔ فاز توری، کراچی		کیمبل پور
۲۲۹۱	ایم۔ بشیر احمد صاحب، حیدرآباد	۲۲۷۳	اقبال مسلم دار المطالعہ، شاہ آباد	[illegible]	شیخ محمد نسیم صاحب، گوجرانوالہ

شاعر رضوی لکھنوی

بادۂ عرفاں

حیات میں غمِ جاناں نہیں تو کچھ بھی نہیں / جو شمعِ عشق فروزاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

روش روش پہ بہاریں برس رہی ہیں تو کیا / چمن میں وہ گلِ خنداں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مری نگاہ میں ساحل سے کھیلنے والو / اگر تلاطمِ طوفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

عروسِ حسن کی زلفوں میں کہکشاں کی طرح / اگر خلوص کی افشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہزار طرح کی آسائشیں میسر ہوں / سکونِ قلب کا ساماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہزار بار جبینِ بشر جھکے لیکن / ترے وجود پر ایماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

غرورِ تمکنت و نشۂ حکومت میں / خیالِ خاطرِ انساں نہیں تو کچھ بھی نہیں

حسینِ صبح کے لمحاتِ کیف آگیں میں / خیالِ شامِ غریباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ تخت و تاج یہ نام و نمودِ دنیادی / جو پاس دولتِ ایماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خدا گواہ ہے غربت کے سر پہ سایہ فگن / شکوہ و سطوتِ سلطاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سنا پھر اہلِ بصیرت کو مطلعِ رنگیں / جو دورِ بادۂ عرفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

جو حسنِ ذات نمایاں نہیں تو کچھ بھی نہیں / بلند سیرتِ انساں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہزار کلمۂ حق ہو زباں پر جاری / جو دل سے طاعتِ یزداں نہیں تو کچھ بھی نہیں

وہ مضطرب ہیں پسِ پردہ شاعرِ رنگیں / جو آج آپ غزل خواں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(بشکریہ "دعوت")

سردار یوسفی

ایک ادیب تین نام

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ عابد نے میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے کو بھینکی ہوئی سگرٹوں کے ٹکڑے اور میز کے نیچے رکھی ہوئی ردی کی ٹوکری کو کاغذ کے پرزوں سے منہ تک بھر دیا تھا۔ تین گھنٹے کی مسلسل کاوش کے باوجود وہ تین چار سطروں سے زیادہ نہ لکھ سکا سگریٹ پھونکتے پھونکتے اور کاغذوں کو ردی کی ٹوکری میں ایندھن بناتے بناتے وہ اب بالکل تھک گیا تھا مگر مضمون کا ابھی تمہیدی حصہ بھی تشنہ تھا اس دوران میں بیت الخلا بھی وہ دو مرتبہ جا چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بیت الخلا کی پرسکوت فضا میں مضامین الہامی کیفیت کے ساتھ پردۂ دماغ پر ابھرتے ہیں۔ لیکن آج اس کی ہر ترکیب بیکار ثابت ہوئی وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے اب بھی خیالات کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اس کی بیوی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس وقت یہ مسکراہٹ اس کے لئے زہر جیسی تلخ اور ناقابل برداشت نشتر ثابت ہوئی۔ وہ مارے غصے کے چیخ پڑا۔ جیسے خاموش ستار کے تاروں پر اچانک ہاتھ پڑ جائے اور وہ جھنجھنا اٹھے " یہ کیا مصیبت ہے جی میرے پیچھے ایک وحشتناک سائے کی طرح ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہو۔ تم مجھے کچھ بھی تو نہیں کرنے دو گی۔ تمہاری جہالت مجھے لے ڈوبے گی۔ مجھے تم سے کوئی لگاؤ نہیں۔ میں نے شادی سے پہلے بھی یہ بات کہی تھی اس رشتے کی مخالفت بھی کی تھی مگر تقدیر کے بھنور میں مجھے تمہارے ہاتھوں ڈوبنا تھا سو ڈوب رہا ہوں۔ میری زندگی تباہ ہو گئی ہے۔ یہ بھاگوان قدم آنے نہ پائے تھے کہ میری تقدیر کا چکر شروع ہو گیا۔ میں فیل ہوا میری تعلیم ادھوری رہ گئی مجھے خوب سبز باغ دکھائے گئے لڑکی پڑھی لکھی ہے میٹرک پاس ہے۔ ادیبہ ہے۔ تعلیم کا بڑا شوق ہے۔ روشن خیال ہے خوب صورت ہے باسلیقہ ہے بوڑھی اور سٹھیائی ہوئی عقلوں میں یہ بات کہاں آنے والی تھی کہ ایک میٹرک پاس لڑکی کے والدین دیکھے بھالے ایک ایسے لڑکے کو کیوں پسند کر رہے ہیں جو میٹرک میں دو مرتبہ فیل ہو چکا ہے۔ ان کی ناقص عقلوں میں یہ بھی کیسے آسکتا تھا کہ لڑکی میں کوئی عیب ضرور ہے جو ایسی صورت میں بھی رشتہ مل رہا ہے مگر انہیں اس سے کیا۔ میں تو شروع میں ہی سمجھ گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اور اب معلوم ہوا کہ دال میں سب کالا ہی کالا ہے۔ پڑھی لکھی جاہل وہ بکتا جاتا جو اس کے منہ میں آیا آج اس نے سب کچھ ہی تو کہہ ڈالا مگر اس کی بیوی یہ سب سننے کے بعد بھی کھڑی مسکرا رہی تھی اور اس کے آخری جملے پر " پڑھی لکھی جاہل " پر تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ اس موقع پر اس قہقہے نے وہی کام کیا جو تیل آگ پر کرتا ہے۔ وہ غصے سے جھلا اٹھا۔ اس کا ہاتھ یکبارگی اٹھ گیا۔ " بے غیرت کہیں کی "

اور وہ اپنا گال سہلاتی رہ گئی اس کے باوجود وہ اپنی ہنسی پر قابو نہ پا سکی۔ اس نے عابد کو اور بھی اشتعال دلا دیا اس مرتبہ وہ غصہ میں پیچ و تاب کھا کر ہوش و حواس کھو بیٹھا غنیمت ہوا کہ اس کے ہاتھ میں شیشے کا ٹھوس پیپر ویٹ نہیں آیا جو وہیں میز پر موجود تھا البتہ پلاسٹک کی ایش ٹرے اٹھا کر اس نے پوری قوت سے اپنی بیوی کے منہ پر دے ماری۔ وہ چکرا کر زمین پر گر پڑی۔ کچھ دیر تو عابد نے بالکل پروا نہ کی مگر پھر کچھ خوفزدہ ہو کر دیکھا پیشانی سے خون رس رہا تھا عابد نے ہاتھ پکڑ کر اسے بستر پر دھکیل دیا اور پھر خود اپنے بستر پر جا پڑ گیا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد اس کی بیوی کو ہوش آیا۔ اس کے سر میں سخت درد تھا۔ اسے اب غصہ بھی آ رہا تھا وہ سوچ رہی تھی کہ انسان نام و نمود کا کتنا بھوکا ہوتا ہے، اور پھر اس کا شوہر تو سستی شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے پھر وہ اٹھی۔ اس کا شوہر سو چکا تھا۔ اس نے پہلے تو الماری سے پاؤڈر کا ڈبہ نکالا اور اپنا زخم بھرا پھر کچھ لکھنے بیٹھ

گئی۔ وہ کافی دیر تک لکھتی رہی یہاں تک کہ اس کے سر میں آئے ہوئے زخم میں ٹیسیں شروع ہو گئیں۔ اس نے جلدی جلدی لفافہ بند کیا اور ننگے پاؤں زینے سے نیچے اتری دروازے کے قریب ہی لگے ہوئے لیٹر بکس میں لفافہ ڈالا اور واپس لوٹ آئی۔

آج پچیس تاریخ تھی۔ ہر ماہ کا پرچہ پہلی تاریخ تک چھپ کر بازار میں آجانا ضروری تھا۔ لیکن اس مرتبہ مواد ہی فراہم نہ ہو سکا تھا۔ کسی نے بھی تو مضامین نہیں بھیجے تھے۔ اسی لئے تو عابد خود بھی کچھ لکھنے کی کوشش میں کئی راتوں کی نیند جاگ کر حرام کر چکا تھا۔ اختر ریاض، سردار کشور، نعمان پرویز، الماس خانم جو اس کے پرچے کے لئے مستقل طور پر اپنی نگارشات بھیجا کرتے تھے ان کو وہ۔ مکرر سکرر لکھ چکا تھا مگر لاحاصل، اور الماس کا مضمون نہ ملنے پر تو وہ ایک عجیب قسم کی کیفیت محسوس کر رہا تھا جو بیک وقت دماغ میں بھی الجھاؤ پیدا کر رہی تھی اور دل میں ایک عجیب سا اضطراب۔ اس مرتبہ تو اس نے الماس کو اس کا مضمون نہ ملنے کو ایک تقریب بنا کر مزاج پرسی کے ساتھ بہت کچھ لکھ دیا تھا حتیٰ کہ وہ سب کچھ بھی جو وہ پچھلے کئی ماہ سے صرف سوچ کر رہ جاتا تھا۔ وہ اس کے افسانے یا مضمون کو نمایاں جگہ دیتا تعریفی خط لکھتا۔ اظہارِ مطلب کیلئے طرح طرح کے پیرائے اختیار کرتا یہاں تک کہ ایک مرتبہ اس نے الماس کو لکھا تھا "اے کاش ہم دونوں مل کر اس رسالے کو چلاتے مگر ایسا اسی وقت ممکن ہے کہ آپ میری درخواست پر اس کی مدیر بننا قبول کر لیں۔ اور اس طرح میری ایک دلی آرزو پوری ہو جائے گی۔"

وہ اب بھی اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ آخر یہ سب ہی نے مضمون ایک ساتھ بھیجنا کیوں بند کر دیئے کہ ڈاکیا آیا اور ایک لفافہ میز پر ڈال کر چلا گیا۔ اس نے نہایت بے صبری سے لفافہ کھولا ایک خط کے ساتھ ایک مختصر سا افسانہ موجود تھا اس نے پڑھنا شروع کیا

مکرمی ایڈیٹر صاحب تسلیم

گرامی نامہ ملا۔ مجھے خود تاخیر کا احساس تھا مگر افسوس میں مجبور تھی۔ میرے چھ سات ماہ سے برابر لکھتے رہنے کے بعد اس مرتبہ آپ کو میرا مضمون نہ ملنے پر تشویش ہونا قدرتی بات تھی آپ نے اس کی وجہ بھی دریافت کی ہے۔ اس کی وجہ گو میری انتہائی پرائیوٹ زندگی سے تعلق رکھتی ہے تاہم میں آپ کو بھی غیر نہیں سمجھتی اور اس زمانے میں جب کہ نہ کوئی اپنا اپنا نظر آتا ہے اور نہ پرایا اتنا پرایا سا یا دوسرے لفظوں میں ہر وہ چیز جو اپنی نظر آتی ہے ذرا غور سے دیکھنے کے بعد اس معیار سے گر جاتی ہے اور ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ کوئی چیز اپنی نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی ثابت ہوتی ہے مگر فی زمانہ ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کیوں کہ ایسی باتوں کا تعلق دماغ سے کم ہوتا ہے اور دل سے زیادہ معاف کیجئے میں غیر ضروری تفصیل میں چلی گئی۔ بات دراصل یہ تھی کہ میرا شوہر ایک عجیب قماش کا انسان ہے مجھے ڈر ہے کہ اسے انسان کہہ کر کہیں میں انسان کی توہین تو نہیں کر رہی ہوں۔ آپ کہیں گے کہ چاہے میں انسان کی توہین کر رہی ہوں یا نہیں البتہ شوہر کی برائی کو برائی کہکر اس ملک کی عورتوں اور ان کی روایات کی توہین ضرور کر رہی ہوں آپ مجھ پر یہ سماجی فتویٰ لگا کر مجھے باغی یا غدار کہہ سکتے ہیں۔ مگر آپ نے وجہ دریافت کی ہے نا ہاں تو اس کا رویہ میرے ساتھ بہیمانہ ہے اس نے آج تک مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی وہ سمجھتا ہے کہ میں پڑھی لکھی جاہل ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے خیالات میری سمجھ سے بالاتر ہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ سب انسانوں کی سمجھ سے۔ ہاں فرشتے ان پر ضرور دسترس رکھتے ہوں گے!

آج کل وہ کوئی ایک ہفتہ سے گھر پر زیادہ نظر آ رہے ہیں۔ ان کی گھر پر موجودگی میرے لئے سکون پرور ہونے کی بجائے ایک نفسیاتی الجھن کا سبب بن جاتی ہے۔ وہ ایک رسالے کے ایڈیٹر بھی ہیں اگر

ان کی ایڈیٹری کا قلم دوسروں کی انگلیوں میں ہی حرکت کرتا ہے۔ ابھی چند دن کا واقعہ ہے کہ کچھ بذاتِ خود لکھنے کی کوشش فرما رہے تھے لیکن چند سطروں سے زیادہ نہ لکھ سکے۔ ہاں انہیں سگریٹ پھونک کر ایش ٹرے اور کاغذ پھاڑ پھاڑ کر ردی کی ٹوکری بھرنا خوب آتا ہے۔ جب وہ اس قسم کی کوشش میں ناکام نظر آتے ہیں تو میرے دل میں ان کے لئے ہمدردی ہی ہو سکتی ہے! انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی بیوی ایک دن میں اتنا کچھ لکھ سکتی ہے جتنا وہ سگریٹ کے سینکڑوں ٹن پھونکنے اور ہزاروں پیڈوں کو ردی کی ٹوکری کا ایندھن بنانے کے باوجود اپنی پوری عمر میں بھی نہیں لکھ سکتے۔ ان کا رویہ ہر چند میرے ساتھ ایسا نہ تھا کہ میں کسی قسم کی جرأت کرتی۔ لیکن آدھی رات گئے تک انہیں اس طرح میز پر جھکا ہوا دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا میں نے ان کو احساس دلانا چاہا۔ ان کو میری مداخلت بڑی شاق گزری۔ بس غصہ ہی جو آ گیا ایش ٹرے کھینچ ماری میرے منہ پر۔ میں زمین پر چکر کھا کر گر پڑی چوٹ معمولی تھی۔ میں ہی جانتی ہوں کہ اس وقت عورت کی بے بسی اور مرد کی زیادتی کے احساس نے اسے کس قدر غیر معمولی بنا دیا تھا۔ مگر شاید میرا شوہر اس میں حق بجانب تھا۔ کیوں کہ ہمارا معاشرہ اس کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ عورت کی تقدیر کو اپنے چرنوں کی جس طرح چاہے زینت بنا لے میری زندگی بھی معاشرے کے کتے ہوئے ایسے ہی مرد کے حقوق کے چاروں طرف گھوم رہی ہے۔ میں ایک تعلیم یافتہ عورت ہوں ہمارے ہاں کسی لڑکی کا میٹرک تک پڑھ لینا بھی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سمجھا جاتا ہے اور جو لڑکی ان حدود کو پھاند کر سماج کے فرسودہ بندھنوں

کو توڑ دیتی ہے اسے عورت کے معیار سے گرا دیا جاتا ہے گویا تعلیم کے دروازے اگر بظاہر ان کے لئے بند نہیں رکھے گئے تو ان پر پہرہ ضرور بٹھا دیا گیا ہے۔ میری اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر پانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرا ہونے والا شوہر دو مرتبہ میٹرک میں فیل ہو گیا تھا۔ اس طرح میں نے اس سے پہلے ہی میٹرک... پاس کر لیا تھا میرے والدین میری شادی کے سلسلے میں رائے بدلنے کو تیار نہ تھے۔ کیوں کہ وہ زبان دے چکے تھے۔ اب تعلیم کا توازن بھی بہر حال قائم رکھنا تھا لہٰذا مجھے کالج میں داخلہ دلانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی میں یہ سب کچھ سمجھتی رہی۔ انہیں باتوں نے میرے اندر اس سماج کے خلاف باغیانہ خیالات کو جنم دیا میں اس وقت ایک بے زبان کلی کی مانند تھی مگر بیحد حساس اپنی بپتا کا اظہار زبان سے تو نہ کر سکتی تھی البتہ میرا قلم کچھ بے معنی سی لکیریں کھینچنے لگا یہی بے معنی لکیریں آگے چل کر میرے خیالات کی آئینہ دار بن گئیں دل میں لگی ہوئی آگ کے شعلے جب بھڑک اٹھتے دماغ پر ایک غبار سا بوجھل اور گھناؤنا بادل بن کر چھا جاتا تو قلم کی نوک اس غبار کو چھانٹنے میں میری مدد کرتی آنکھوں سے شبنمی موتی جھڑتے، قلم ان کو چن کر صفحۂ قرطاس پر جڑ دیتا۔ میں لکھنے لگی۔ میں لکھتی رہی۔ مگر میں نے ظاہری نام و نمود کو مقصدیت پر کبھی ترجیح نہیں دی۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ دنیا مجھے جانے میں تو چاہتی ہوں کہ دنیا عورت کو جان لے انسانیت کے قریب آ کر انسان کو پہچان لے۔

میں نے دبے مگر غیر مبہم الفاظ میں ماں سے... اپنی زندگی کے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے کو بھی کہا مگر میں جانتی ہوں۔ وہ مجبور تھی۔ اس نے بھی تو اسی سماج کے جوتے تلے زندگی کی تلخیوں کے جام پیے تھے۔ اس کی ممتا

بھی میری مدد نہ کر سکی۔ اس وقت وہ ہمارے سماج کی کامیاب کنٹر اور شفیقہ عورت ثابت ہوئی۔ ہمارے سماج کے مرد کی باوفا بیوی! منہ بند اور بے زبان کلی ایک آہ کر کے پھول بن گئی۔ اس کے چٹکنے کی آواز کون سنتا! آنکھ کھلی تو صد چاک گریبان بال پریشاں اور خزاں کا خوف ——— اور باغباں صیاد آہ کو باغبانی سونپی گئی وہ صیاد ہی تو تھا۔

معاف کیجئے میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا۔ ابھی میرے سر کا زخم بالکل ٹھیک نہیں ہوا ہے سر چکرا رہا ہے۔ مگر میں آپ کو ایسی حالت میں بھی مایوس نہیں کر رہی ہوں۔ ایک مختصر افسانہ ارسال ہے۔ آپ کا مجھ پر حق ہے آپ مرد ہیں نا! ہاں آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مضمون اگر میں نے نہیں بھیجا تھا تو یہ ساتھ ہی اختر ریاض، نعمان پرویز اور سردار کشور کو کیا ہوا ——— دراصل بات یہ ہے کہ یہ سب الماس ہی کے مختلف نام ہیں۔ الماس خانم کہہ لیجئے یا ان میں سے کوئی ایک۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور اب تو آپ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ الماس خانم بھی تو الماس خانم نہیں ہے!

اور کوئی خدمت؟

نیاز کیش

الماس

عابد نے خط پڑھا اسے ایسا معلوم ہوا جیسے دفتر کی ہر چیز گھوم رہی ہے۔ میز کرسی فائلیں، خطوط، دیواریں، چھت، فرش، ندامت اور پشیمانی کے احساس نے اس کی گردن جھکا دی۔ اس احساس نے اس کے دل و دماغ میں ایک عورت کو جنم دیا۔ ایک عظیم اور باوقار عورت کو اور جیسے یہ عورت اس کی بیوی کے روپ میں اسکے قریب کھڑی مسکرا رہی تھی

(بشکریہ "ملی میگزین")

بقیہ صفحہ (۶۴)

یہ جو بھی صاحب ہوں ان سے میری دردمندانہ اپیل ہے کہ وہ خدارا اپنے شوق کے لئے بیچارے افسانہ نگاروں کا گلا نہ گھونٹیں۔ اگر وہ پسند ہی کرتے ہیں کہ لوگ انہیں افسانہ نگار سمجھیں تو وہ براہ کرم مجھ سے کسی وقت بھی معرفت "شیر" ملاقات کر لیں میں ان سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں ان کے لئے اپنے ساتھی افسانہ نگاروں سے افسانوں کی بھیک مانگ لیا کروں گا۔

آخر میں پوسٹ آفس والوں سے یہ درخواست ہے کہ خدا کے لئے وہ اس چوری کا سدباب کریں اور ہم جیسے مظلوم ادیبوں کو اس الجھن سے نجات دلائیں۔

والسلام — اسماعیل ادیب

التماس ہے کہ . . . . اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا پورا پتہ لکھنا نہ بھولئے۔ بغیر پتہ کے کوئی نگارش قابل قبول نہ ہوگی۔ نیز ادارہ شیر ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اس لئے مضامین وغیرہ بھیجنے سے پہلے اسکی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ——— مینیجر

اختر رضوانی •

رباعیات

(۱)

سوجھی نہ کوئی بات یگانے کیلئے
جو بار اٹھایا وہ زمانے کے لئے
دنیا کی لکھی ہم نے کہانی لیکن
عنواں نہ ملا اپنے فسانے کے لئے

(۲)

نقاد گہر بار بنے بیٹھے ہیں
ہاں محرم اسرار بنے بیٹھے ہیں
اللہ رے تقسیم وطن کے اعجاز
بہروپیے فنکار بنے بیٹھے ہیں

(۳)

تاریکیوں میں آج بھی تابندہ ہوں
ماحول کی ظلمت میں درخشندہ ہوں
ہرچند ہیں صدمے دلِ تنہا پہ مگر
تکمیلِ عزائم کے لئے زندہ ہوں

(۴)

اشکوں کو فروزاں بھی کیا ہے ہم نے
ہر درد کا درماں بھی کیا ہے ہم نے
ذروں کو ستاروں کی ضیا بخشی ہے
طوفاں میں چراغاں بھی کیا ہے ہم نے

(۵)

قدرِ غمِ انساں بھی گئی دل بھی گیا
ہر جنس فراواں بھی گئی دل بھی گیا
ان عہد فروشوں کی محبت کے طفیل
یہ دولتِ ایماں بھی گئی دل بھی گیا

نامہ و پیام

برادر محترم! السلام علیکم

عرصہ کے بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ کیا کروں۔ شعر و ادب کے علاوہ کچھ اور بھی کام ہیں جن سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ میری نظم پر تنقید کا جو سلسلہ ہے اسے جاری رکھئے کم از کم مجھے اپنے شاعرانہ افکار کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں فیصلہ کا موقع ملے گا۔ میں ابھی کوئی رائے نہیں دوں گا۔ چھوٹے بڑے ناقدین اپنی بات کہہ لیں تو میں بھی اپنے تاثرات قلمبند کروں گا۔ میرے احباب میں بعض اتفاق رکھتے ہیں اور بعض اختلاف۔ یہ کسی کے ذہن میں خیال نہیں آنا چاہئے کہ متفق حضرات میرے دوست ہیں اور دوسرے میرے مخالف۔ اس وقت میرے سب سے گہرے دوست جمیل احمد فاروقی ہیں، حالانکہ انہوں نے میری نظم پر تنقید کی ہے۔ شبنم سے بھی میرے گہرے تعلقات ہیں اور عمران انصاری سے بھی۔ سب کو حق ہے کہ اپنے تاثرات پیش کریں۔ اختلاف بذات خود ایک رحمت ہے۔ اسی سے فکر کو جلا ملتی ہے۔ کاش تعمیری تحریک میں یہ راستی آمیز اور مخلصانہ اختلاف کچھ اور پرورش پاتے۔

والسلام ——— افتخار

محترم ایڈیٹر صاحب۔ اسلام علیکم۔

بہت دن سے خیال تھا کہ آپ کو خط لکھوں لیکن بخدا مجھے قطعی یہ امید نہیں تھی کہ مجھے اس موضوع پر آپ کو مخاطب کرنا پڑیگا۔

آج سے کوئی تین چار مہینہ پہلے کی بات ہے کہ میں نے دو افسانے "فرار" اور "اعتبار" جناب نصر اللہ خاں صاحب عزیز مدیر "ایشیا" کے نام بھیجے تھے۔ یہ افسانے ایک لفافہ میں رکھکر میں نے ناظم آباد پوسٹ بکس میں ڈالے تھے۔ جب میں پوسٹ کر چکا تو غیر شعوری طور پر مجھے احساس ہوا کہ یہ افسانے کبھی بھی "ایشیا" تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ بدقسمتی سے میں نے پہلی مرتبہ شاعری کی بھی کوشش کی تھی جس کے نمونے کے طور پر چند رباعیات بھی میں نے عزیز صاحب کو بھجوائیں تھیں۔

اور ہوا بھی ایسا ہی کہ وہ افسانے اب تک "ایشیا" کو نہیں ملے اتفاقاً میری نظر ماہنامہ "جام نو" کے ایک شمارے پر پڑی۔ شاید وہ ستمبر یا اکتوبر کا ابتدائی شمارہ تھا اس میں ایک افسانہ "فرار" پڑھا۔ جناب غضنفر رفیق صاحب افسانہ نگار تھے اور پورا کا پورا افسانہ حتیٰ کہ عنوان تک انہوں نے نقل کر دیا تھا۔ میں اس سرقہ بالجبر پر "جام نو" کے آفس احتجاج کرنے کے لئے گیا اور ایک تحریر ایڈیٹر صاحب کے نام چھوڑی کہ وہ مجھے غضنفر صاحب کے پتہ سے مطلع کریں تاکہ میں ان سے مل کر اس معاملہ پر گفتگو کر سکوں لیکن پتہ مجھے ابھی تک ملا نہیں، نہ ہی خیری صاحب کی وضاحت۔ دوبارہ جا نہ سکا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

آج میں نے "مشیر" کے تازہ شمارے میں اپنا دوسرا افسانہ پڑھا۔ پڑھکر انتہائی کوفت ہوئی کہ جناب غضنفر رفیق صاحب نے بڑی ڈھٹائی سے دوبارہ پھر وہی نامعقول حرکت کی یعنی افسانے کا عنوان بھی وہی رکھکر چھپوا دیا۔

اب میں مجبوراً یہ مراسلہ لکھ رہا ہوں۔ ساتھ ہی مجھے بڑا افسوس ہے کہ ہمارے بعض دوست جب خود نہیں لکھ سکتے تو وہ اس قسم کی حرکات کر بیٹھتے ہیں جس کی وجہ سے وہ افسانہ نگار جو اپنے قیمتی وقت کو اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ اسکے بدلے وہ ادب کی کچھ خدمت کر سکیں لکھنے سے بیزار سے ہو جاتے ہیں۔ ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں۔

میرے دوست قیصر نصری مدیر "ستارہ" اس بات کے راوی ہیں کہ غضنفر رفیق صاحب کے خطوط جو ستارے کے لئے موصول ہوتے ہیں ان میں جو پتہ دیا ہوتا ہے وہ پوسٹ آفس کے کسی کلرک کی معرفت دیا ہوتا ہے۔ ان کے اکثر و بیشتر "سرقے" ستارے کو موصول ہوتے ہیں۔ جو شک کے باعث ابھی تک شائع نہیں ہو سکے۔

(باقی صفحہ ٦٢ پر دیکھئے)

سرت اور سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کا موقع
اپنی زندگی میں آج مجھے پہلی بار ملا ہے کہ ہسٹریا کے بار بار دوروں سے
میری زندگی کس قدر اجیرن اور ناگوار بنا دی تھی اور آج دلی خوشی کے ساتھ
میں حاذق ہسٹریا پلز کی نہایت ہی شکر گذار ہوں کہ ان کے چند ہفتوں
کے استعمال نے مجھے نئی زندگی بخشی اور مجھے اس موذی مرض سے
نجات دلائی۔
بے شک حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی کی یہ
ایجاد مستحسن اور قابل فخر ہے۔
حاذق دواخانہ بندر روڈ
کراچی نمبر ۱
سے طلب کیجئے
مستند اور قابل بھروسہ

A MONTHLY DIGEST OF CONSTRUCTIVE URDU LITRATURE

THE MUSHIR KARACHI

بلند معیار
کے سبب حاذق دواخانہ کی تیار کردہ یونانی ادویہ
مشہور اور مقبول عام
ہیں
حاذق کا
نیا اور تازہ خون پیدا کرتا ہے۔ وزن بڑھاتا ہے اور ہڈیوں کو مضبوط کرتا ہے۔ قوت اور طاقت بخشتا ہے کھانا ہضم کر کے بھوک بڑھاتا ہے
(خوراک)
کھانیکا ایک چمچہ روزانہ دو تین دفعہ کھانا کھانے کے بعد استعمال کیجئے
بچوں کے لئے نصف خوراک۔
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی پاکستان
منیجر
حاذق دواخانہ
بندر روڈ۔ کراچی نمبر

اصلاحی ادب کا ڈائجسٹ
(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ماہنامہ مشیر کراچی

ٹیلی فون: ۳۲۳۹۷

جلد: ۷ شمارہ: ۳

مارچ ۱۹۵۶ء

ترتیب

مرتبہ
عبدالغفور بیگ

بدل اشتراک: فی پرچہ: آٹھ آنے
سالانہ: پانچ روپے

بھارت میں ترسیل زر کا پتہ:
پندرہ روزہ "الحسنات" رام پور (یو پی) بھارت

پرنٹر و پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ مشیر بندر روڈ کراچی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابوالاعلیٰ مودودی

ہمارا دستور ــــــ اور اس کے بعد

کئی سال کی پے درپے مایوسیوں کے بعد اب پھر یہ توقع قائم ہوئی ہے کہ ہمارے ملک کو ایک ایسا دستور مل جائے گا جسے کم از کم بنیادی طور پر اسلامی کہا جاسکے۔ اگرچہ مختلف رجحانات کی موجودگی، اور ان کی کشمکش نے اس امر کے مواقع باقی نہیں چھوڑے ہیں کہ یہاں پہلے ہی مرحلے میں ایک خالص اور مکمل اسلامی نظام حکومت قائم ہو سکے لیکن بحالت موجودہ یہ بھی بہت غنیمت ہوگا کہ ہماری سمت سفر جو اب تک لادینی کی طرف تھی، اب بدل کر اسلام کی طرف مڑ جائے اور ہم پہلا قدم صحیح رخ پر اٹھا سکیں۔ اس کے بعد اگر مسلسل اور پیہم جدوجہد جاری رکھی جائے تو یہ امید کی جاسکتی ہے کہ آخر کار ہم اپنی ریاست کو ایک مکمل اسلامی مثالی ریاست بنانے میں ان شاء اللہ کامیاب ہو جائیں گے۔

اس موقع پر جو بات عوام اور حکومت، سب کے ذہن نشین ہونی چاہئے وہ یہ ہے کہ دستور کسی تعویذ کا نام نہیں ہے جس کو ریاست کے گلے میں باندھ دینے سے سب کچھ خود بخود ٹھیک ہو جائے۔ دستور میں ہم خواہ کتنے ہی اعلیٰ مقاصد اور پاکیزہ اصول درج کر دیں۔ ان سے عملاً کوئی فرق واقع نہ ہوگا جب تک کہ حکومت اور حکام اور باشندگان ملک سب کے سب مل جل کر معاشرے کی اصلاح اور خصوصاً معاشرے کے اخلاق کی تعمیر کے لئے کوشش نہ کریں۔ ہم ایک ناقص دستور سے بھی بہترین نتائج پیدا کر سکتے ہیں، اگر ہماری نیت بخیر ہو اور ہم سب کا ارادہ اسلام کی بہترین رہنمائی سے فائدہ اٹھا کر اپنی حالت درست کرنے کا ہو اس کے برعکس کوئی کامل و اکمل دستور بھی، خواہ وہ سو فی صدی اسلامی ہو، محض اپنے الفاظ کی طاقت سے کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا۔ بلکہ ہم اپنے اخلاق کی خرابی اور اپنے اعمال کی شومی سے اس کو ناکام کر کے، ممکن ہے اپنے ساتھ خود اسلام کی رسوائی کا سامان بھی کر دیں گے۔ دستور کو صحیح اصولوں پر قائم کرنا بلاشبہ ضروری ہے تاکہ ایک صالح معاشرے کی تعمیر میں اس کے نقائص رکاوٹ نہ بن سکیں لیکن دستور کی اصلاح کے بعد معاشرے کی اصلاح کے لئے عملی سعی بھی اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ ضروری ہے۔ ایک بد اخلاق معاشرہ چلانے کی بھی مصیبت ہے اور اس حکومت کے لئے بھی جو اس کے انتظام کی ذمہ داری سنبھالے کوئی [illegible] معاشرہ [illegible] کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

[illegible] حکومت [illegible] نظم و نسق چلانے والی حکومت بن کر نہ رہنا چاہئے بلکہ معاشرے کی تعمیر صالح [illegible] نظریات ہم سے مختلف تھے جس کو ہماری صلاح و فلاح [illegible] نظر صرف امن و انتظام کو بحال رکھنا اور اپنے نظم و نسق [illegible] کر سکتے تھے کہ باہر کے فرمانروا ہماری زندگی میں [illegible] اپنے نظم و نسق کو چلانے میں انہوں نے جو [illegible] اس بات کی انہیں کوئی پروا نہ تھی کہ ان طریقوں سے [illegible] حکومت کی خلاف الصدق ہی بنی ہے [illegible] سے کام لیتی ہے جو اس کی پیش رو حکومت نے جاری کئے

سکتے تو ہم قیامت تک کسی تعمیر نو کی امید نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر معاشرے کی اصلاح کے لئے کچھ غیر سرکاری عناصر بھی کوشش کریں اور خود معاشرے کے افراد بھی اپنی اصلاح کے خواہشمند ہوں۔ تب بھی حکومت کے غلط طور طریقے ان کو اس مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیں گے لہذا ضرورت ہے کہ ایک طرف حکومت اصلاح کے مقصد کو سامنے رکھ کر نئی تدبیریں اختیار کرے اور دوسری طرف معاشرے کے اصلاح پسند عناصر کا پورا تعاون اس کام میں اسے حاصل ہو۔

حکومت کی صحیح تدابیر معاشرے کو کس طرح بناتی، اور غلط تدابیر اسے کس طرح بگاڑتی ہیں، اس کو ہم ایک متعین مثال سے واضح کریں گے۔

عرب میں اسلامی حکومت کے قیام سے پہلے لوگ اس بات کے قطعاً خوگر نہ تھے کہ کوئی باقاعدہ حکومت ان پر ٹیکس لگائے اور وہ اپنے اموال میں سے ایک حصہ نکال کر اس کے حوالہ کر دیں۔ اس ماحول میں اسلام نے پہلی مرتبہ ان پر زکوٰۃ عائد کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وصولی کے لئے عاملین صدقہ (تحصیلدار) مقرر کئے۔ یہ کام اگر محض نظم ونسق چلانے کے ڈھنگ پر کیا جاتا تو بعید نہ تھا کہ سخت خونریز لڑائیوں کے بعد ہی لوگ زکوٰۃ دینے پر آمادہ کئے جاسکتے اور ایک ایک بستی اور ایک ایک چراگاہ پر زکوٰۃ کی وصولی کے لئے فوج اور پولیس کے مضبوط دستے بھیجنے پڑتے۔ لیکن جو حکمرانی اصلاحِ معاشرہ کے نقطۂ نظر سے کی جارہی تھی اس نے اس کام کے لئے جو تدبیریں اختیار کیں اور پھر ان سے جو نتائج حاصل کئے وہ حیرت انگیز بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کی کہ یہ زکوٰۃ دنیوی بادشاہیوں کے باج وخراج کی طرح نہیں ہے بلکہ ایک عبادت ہے جسے ادا کرنا تم پر اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز، روزہ اور حج فرض ہے۔ یہ مال میری جیب میں نہ جائے گا۔ بلکہ اس میں سے کچھ کھانا مجھ پر اور میری آل اولاد پر حرام ہے۔ یہ تمہارے مالداروں سے لیا جائے گا اور تمہارے ہی حاجت مندوں پر خرچ کیا جائے گا۔ حکومت جس خدمت کی انجام دہی کا جو کام کرے گی اس کا صرف واجبی خرچ وصول شدہ اموال میں سے لیا جائے گا۔ اس طرح محض تعلیم وتلقین سے ان لوگوں کے ذہن ادائیگی زکوٰۃ پر راضی کر لئے گئے جو سخت خونریزی کے بغیر کبھی اسے قبول کرنے والے نہ تھے اور اس آمادگی میں بہت بڑا دخل اس فرمانروا کی سیرت کا تھا جو ان سے یہ بات کہہ رہا تھا۔ اس کی سیرت ہی نے لوگوں میں یہ اعتماد پیدا کیا کہ جو کچھ کہا جارہا ہے وہی کیا بھی جائے گا۔

اس کے ساتھ حضور نے جو تحصیلدار تیار کئے ان کو صرف تحصیل وصول کی ٹریننگ ہی نہیں دی بلکہ ان کی اخلاقی تربیت بھی فرمائی۔ آپ نے ان کو بتایا کہ زکوٰۃ کی تحصیل کے لئے نکلنا جہاد فی سبیل اللہ کا حکم رکھتا ہے اور جہاد ہی کا ثواب تم کو ملے گا بشرطیکہ یہ کام حق کے ساتھ کرو (العامل على الصدقة بالحق كالغازي في سبيل الله حتى يرجع الى بيته۔ ابوداؤد) آپ نے ان کو تنبیہہ فرمائی کہ زکوٰۃ کی تحصیل میں زیادتی کرنے والا اتنا ہی بڑا گناہگار ہے جتنا زکوٰۃ نہ دینے والا۔ بلکہ اس کی زیادتی ہی اس بات کی موجب ہوگی کہ لوگ زکوٰۃ نہ دینے کا گناہ کرنے لگیں (المعتدى فى الصدقة كمانعها۔ ترمذی وابوداؤد) آپ نے ان کو ہدایت کی کہ زکوٰۃ میں لوگوں کے عمدہ مال چھانٹ چھانٹ کر نہ لیں اور مظلوم کی بددعا سے بچ کر رہیں، کیونکہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا (اياكم وكرائم اموالهم واتق دعوة المظلوم فانها ليس بينها وبين الله حجاب۔ رواہ الجماعہ) آپ نے ان کو یہ آداب بھی سکھائے کہ جس سے زکوٰۃ وصول کرو اس کے حق میں دعائے خیر کرو۔ اس دعائے خیر نے تحصیلداروں اور ٹیکس گذاروں کے تعلق کی اس کیفیت کو بالکل ہی الٹ دیا جو دنیوی حکومتوں میں پائی جاتی ہے۔ دنیا کا دستور تو یہ تھا اور ہے کہ تحصیلدار ٹیکس گذاروں کو گالیاں دیتا ہے اور ٹیکس گذار جواب میں اسے گالیوں اور کوسنوں سے یاد کرتے ہیں۔

دوسری طرف آپ نے ٹیکس گزاروں کو جو ہدایات دیں وہ یہ تھیں کہ خدا کی راہ میں برا مال چھانٹ کر نہ دو۔ تحصیلدار جو کچھ مانگیں وہ ان کے حوالہ کردو اور ان سے اپنا مال نہ چھپاؤ۔ تحصیلدار کو مطمئن کئے بغیر تم ادائیگی زکوٰۃ کے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ وہ خواہ ظلم کرے یا عدل، تمہیں ہر

کا مطالبہ پورا کرنا ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ آپؐ نے لوگوں سے فرمایا: سیأتیکم رکب مبغضون فاذا جاؤکم فرحبوا بھم وخلوا بینھم وبین ما یبتغون فان عدلوا فلانفسھم وان ظلموا فعلیھا وارضوھم فان تمام زکوٰتکم رضاھم۔
"تمہارے پاس وہ لوگ آئیں گے جن کا آنا تمہیں ناگوار ہوگا، مگر تم ان کا خیر مقدم کرنا اور جو کچھ وہ لینا چاہیں وہ ان کے حوالے کر دینا۔ وہ عدل کریں گے تو ان کے لئے بہتر ہے اور ظلم کریں گے تو وہ خود اس کا وبال بھگتیں گے، تم بہرحال ان کو مطمئن کرو کیونکہ تمہاری زکاۃ کی تکمیل ان کے اطمینان ہی پر موقوف ہے۔" لوگوں نے پوچھا کہ زکوٰۃ کے تحصیلدار ہم پر زیادتی کریں تو کیا ہم ان کی زیادتی کے بقدر اپنے مال ان سے چھپا سکتے ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا نہیں۔
پھر زکاۃ کے جو قواعد آپ نے مقرر فرمائے ان میں حق اور انصاف کا پورا لحاظ تھا، تاکہ زکاۃ کی تشخیص و تحصیل میں لوگوں پر کوئی ایسی زیادتی نہ ہو جو ادائیگی زکوٰۃ سے جی چرانے کی محرک بن سکے۔

اس انتظامی پالیسی نے تھوڑی ہی مدت میں یہ حالت پیدا کر دی کہ بہت تھوڑے خرچ پر بغیر کسی جبر یا مظاہرۂ قوت کے مملکت کی پوری زکوٰۃ بڑی سہولت سے وصول ہونے لگی۔ زکوٰۃ نہ دینے یا کم دینے کے واقعات قریب قریب ناپید ہو گئے۔ ایک محصل کسی لاؤ لشکر کے بغیر دور دراز کی بستیوں اور چراگاہوں پر پہنچ جاتا تھا اور زکاۃ وصول کر کے لے آتا تھا۔ کسی جھگڑے کی نوبت نہ آتی تھی۔ بلکہ جھگڑا الٹا اس بات پر ہوتا تھا کہ لوگ حکومت کے واجبی حق سے زیادہ دینا چاہتے تھے اور محصل لینے سے انکار کرتے تھے۔ مسند احمد، ابوداؤد میں یہ قصہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت اُبی بن کعب زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے ایک گلہ بان کے ہاں پہنچے اور اس کے اونٹوں کو دیکھ کر فیصلہ کیا کہ اس پر صرف ایک بنتِ مخاض (ایک سال کی عمر کا بچہ) دینا واجب ہے۔ گلہ بان نے کہا یہ نہ دودھ دے، نہ سواری کے کام آئے۔ اس کے بجائے یہ جوان موٹی تازی اونٹنی حاضر ہے۔ حضرت ابیؓ نے کہا اس کے لینے کا تو میں مجاز نہیں ہوں۔ آخر کار وہ شخص اس اونٹنی کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا اور اپنی درخواست پیش کی۔ حضورؐ نے فرمایا واجب تو وہی ہے جو تمہیں بتا دیا گیا تھا لیکن اگر تم اللہ سے اجر پانے کے لئے یہ اونٹنی دیتے ہو تو میں قبول کر لوں گا۔ اس نے کہا یہ حاضر ہے، لے لیجئے۔ چنانچہ وہ آپؐ نے لی اور اس کے حق میں برکت کی دعا فرمائی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک گلہ بان نے اپنے گلے میں سے بہترین اونٹنی نکال کر زکوٰۃ میں پیش کی اور تحصیلدار سے کہا کہ میں اپنا سب سے اچھا جانور دینا چاہتا ہوں۔ مگر تحصیلدار نے لینے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک اور جانور چھانٹ کر لایا اور تحصیلدار نے اسے بھی قبول نہ کیا۔ تیسری مرتبہ جو جانور وہ لایا اسے تحصیلدار نے تو لیا مگر کہا کہ میں اب بھی ڈرتا ہوں کہ کہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرمائیں کہ تم ایک شخص کا اچھا مال چھانٹ لاتے ہو۔ (احمد۔ ابوداؤد۔ نسائی)
یہ نتائج ہیں اس نظم و نسق کے جو اخلاقی اصلاح کو حکمرانی کا بنیادی ذریعہ بنا کر کام کرتا ہے۔ اس کی تدابیر ایک طرف کم سے کم خرچ پر زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرتی ہیں اور دوسری طرف معاشرے کے اخلاقی معیار کو اتنا بلند کر دیتی ہیں کہ حکومت اور رعیت، دونوں ایک دوسرے پر پوری طرح اعتماد کر کے کامل اطمینان اور باہمی خیر سگالی کی فضا میں اپنا کام کر سکتے ہیں۔

اب ذرا اس حکومت کا حال دیکھئے جو اخلاق کی فکر کئے بغیر محض نظم و نسق چلانے کی کوشش کرتی ہے اور چونکہ ہم نے زکوٰۃ کو مثال میں پیش کیا تھا اس لئے یہاں ہم انکم ٹیکس کو مثال میں لیتے ہیں۔ ایک مدت سے اس معاملہ میں حکومت اور ٹیکس گذاروں کے درمیان آنکھ مچولی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل رہا ہے۔ حکومت ٹیکس عائد کرنے اور اس کو وصول کرنے کے لئے جو طریقے اختیار کرتی گئی وہ لوگوں میں ٹیکس سے بچنے کی ذہنیت پیدا کرنے اور زیادہ سے زیادہ بڑھاتے چلے گئے۔ حکومت نے اس کا مداوا یہ سوچا کہ ٹیکس گزار جو حساب پیش کریں اس کو صحیح تسلیم نہ کیا جائے اور انکم ٹیکس کے حکام بغیر کسی ثبوت اور تحقیق کے خود جس قدر چاہیں ایک شخص کی آمدنی تجویز کر کے اس پر ٹیکس عائد کر دیں۔ لوگوں نے اس کے جواب میں یہ تہیا

جھوٹے حساب لکھنے شروع کر دیئے، اور افسروں نے بیچ میں سے رشوت خوری کے وسیع مواقع نکال لئے۔ اب حالت یہ ہے کہ ۹۰ فی صدی سے بھی زیادہ کاروباری لوگ جھوٹے حساب پیش کرتے ہیں اور انکم ٹیکس کے افسر باقاعدہ سرکاری ہدایات کے تحت لازماً ہر ٹیکس گزار کو جھوٹا سمجھ کر اس کے پیش کردہ حساب سے زائد، بلکہ بسا اوقات کئی کئی گنا زائد ٹیکس تجویز کر دیتے ہیں (اس کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ حساب پیش کرتے وقت ہر شخص سے حلف لیا جاتا ہے کہ اس کا حساب سچا ہے اور پھر اسے جھوٹا قرار دیا جاتا ہے۔) اس حالت میں جو تھوڑے بہت کاروباری آدمی ہمارے معاشرے میں ایسے رہ گئے ہیں جو سچے حساب رکھنا اور واجبی ٹیکس ادا کرنا چاہتے ہیں، وہ بھی جھوٹ پر مجبور ہوتے چلے جا رہے ہیں، کیونکہ وہ خواہ سو فی صدی سچے حساب لکھیں، انکم ٹیکس آفیسر بہرحال ان کو جھوٹا ہی قرار دیتے ہیں اور ان پر اتنا ہی زائد ٹیکس لگا دیتے ہیں جتنا جھوٹے حساب والوں پر لگایا جاتا ہے۔ اس طرح سچے لوگوں کا سارا منافع ہی نہیں بلکہ اصل سرمایہ بھی مارا جاتا ہے اور ان کو مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ یا تو کاروبار بند کر دیں یا خود بھی جھوٹے لوگوں میں جا شامل ہوں۔

انتظامی حیثیت سے یہ پالیسی اس لحاظ سے ناکام ہے کہ ملک کا حقیقی انکم ٹیکس کبھی پورا وصول نہیں ہوتا اور حکومت کو اسی آمدنی پر قناعت کرنی پڑتی ہے جو چھین جھپٹ سے وصول ہو جائے۔ پھر یہ کم آمدنی بھی بہت زیادہ مصارف سے حاصل ہوتی ہے اور مزید براں اس پالیسی کی بدولت سرکاری عملہ میں لازماً بددیانتی پرورش پاتی ہے۔ اس لئے محض نظم و نسق چلانے کے نقطہ نظر سے بھی یہ صورت حال کسی طرح اطمینان بخش نہیں ہے۔ دوسری طرف معاشرے پر اس کا جو اثر پڑ رہا ہے وہ یہ ہے کہ ملک کا پورا کاروباری طبقہ جھوٹ، بے ایمانی اور دروغ حلفی کی وبائے عام میں مبتلا ہو رہا ہے، اور جو بچا کھچا ایک ایماندار عنصر ہماری آبادی میں باقی رہ گیا ہے اس کے لئے بھی اپنے اخلاق کو بچانا محال بلکہ غیر ممکن ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ایک اجنبی حکومت تو اس بات سے بے پرواہ ہو سکتی تھی کہ جس قوم پر وہ حکومت کر رہی ہے وہ اخلاقی حیثیت سے گرتی ہے یا اٹھتی ہے۔ مگر کیا ایک قومی حکومت کو بھی اس معاملہ میں بے حس رہنا چاہیئے؟ ایک قومی حکومت کے لئے اس سے بڑھ کر کیا چیز خطرناک ہو سکتی ہے کہ جس معاشرے پر اس کی طاقت کا سارا دارومدار ہے وہ اخلاقی حیثیت سے بالکل ناقابلِ اعتماد ہو؟ معاشرہ ہی تو ریاست کی جڑ بنیاد ہے۔ یہ بنیاد اگر کمزور ہو تو اس پر ایک طاقت ور ریاست کی عمارت کیسے کھڑی رہ سکتی ہے۔ یہ وہ سوال ہے جس پر ہماری حکومت کے کارفرماؤں کو سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیئے اور نئی پالیسی اس طرح بنانی چاہیئے کہ نظم و نسق بھی زیادہ کامیابی کے ساتھ چلے اور اس کے ساتھ وہ معاشرے کو بگاڑنے کے بجائے بنانے کا ذریعہ بھی بن سکے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر انکم ٹیکس کی مثال میں بتایا ہے، ایک غلط انتظامی پالیسی حکومت اور معاشرے دونوں کو بدی کے چکر میں مبتلا کر دیتی ہے اور اس کی ہر گردش دونوں طرف بدی کو بڑھاتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ معاشرے میں کسی صالح عنصر کا بقا بھی ممکن نہیں رہتا۔ اس چکر کو توڑنا ضروری ہے اور اس کے توڑنے کی ابتدا بہرحال حکومت کی طرف سے ہونی چاہیئے۔ وہ ابتدا نہ کرے تو معاشرے کا کوئی غیر سرکاری عنصر اصلاح حال کے لئے کچھ کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کے قواعد ہر شخص کو راستی سے انحراف پر مجبور کر دیتے ہیں۔ البتہ اس کی طرف سے اصلاح کا آغاز ہو تو قوم ابھی اتنی بے جان نہیں ہے کہ اس سے جوابی تعاون کی امید نہ کی جا سکے۔ انکم ٹیکس ہی کے معاملے کو لیکر مثال کے طور پر ہم بتاتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے اس چکر کو توڑنے کی ابتدا کس طرح ہو سکتی ہے اور پبلک کی طرف سے تعاون کی کیا شکل اختیار کی جا سکتی ہے۔

۱۔ نئے دستور کے نفاذ کے ساتھ ہی موثر انداز میں کاروباری طبقے سے عام اپیل کی جائے کہ وہ اپنے حسابات ایمانداری کے ساتھ رکھیں اور اپنی قومی حکومت کے ساتھ راستبازی سے معاملہ کریں۔ وہ اگر اپنی روش بدل دیں تو حکومت بھی ان کو راستباز تسلیم کرتے ہوئے ان سے معاملہ کرے گی اور کسی کے سابق رویہ کو اس کے خلاف حجت نہ بنایا جائے گا۔

۲۔ انکم ٹیکس کی حد سے بڑھی ہوئی شرحوں پر نظر ثانی کی جائے۔ کیونکہ وہ لوگوں کے لئے جعلی حسابات رکھنے اور حقیقی آمدنی کا ایک بڑا محرک ہیں نیز

(باقی صفحہ ۳۳ پر دیکھئے)

ماہر القادری •

○

مرا وجود ہے خود حاصلِ جبینِ نیاز
نفس نفس ہی عبادت، نظر نظر ہے نماز
خرد کی راہ میں آئے بہت نشیب و فراز
رواں دواں ہی رہا میں یقیں کی عمر دراز
زہے! کمالِ مشیت! خوشا! ظہورِ جمال
حقیقتوں کو دیا جس نے آب و رنگِ مجاز
دل و نظر پہ ہوئی ہیں نوازشیں کیا کیا
بہ رنگِ ذوقِ تماشا، بہ نامِ سوز و گداز
اسی کے نام سے گرتے ہوئے سنبھلتے ہیں
کہ جس نے دی ہے پتنگے کو طاقتِ پرواز
نہ جانے کیوں غلط آہنگ ہو گئے نغمے
مدد کا وقت ہے سازِ الست کی آواز
سوائے ذاتِ خدا جو ہے قادر و خلاق
نہ کوئی عقدہ کشا ہے نہ کوئی بندہ نواز

(بشکریہ فاران)

شفیق جونپوری •

○

لب پہ جب دیکھئے انکارِ وفا رکھا ہے
واہ کیا خونِ شہیداں کا صلا رکھا ہے
یہ ہماری ہی بدولت ہیں کچھ آثارِ حیات
ہم جو محفل سے چلے جائیں تو کیا رکھا ہے
تم نے اس کی کبھی بھی حوصلہ افزائی کی
جس نے ہر تیر کو سینے سے لگا رکھا ہے
مدتوں سے ترے غم نے ترے دیوانے کو
خوگرِ شیوۂ تسلیم و رضا رکھا ہے
غیر کی شمع بھی بجھنے نہیں دیتے شرفا
تم نے اپنے ہی چراغوں کو بجھا رکھا ہے
کس کو معلوم تھا میخانہ نہیں مقتل ہے
ایک اک جام میں خونِ غربا رکھا ہے
آشیانوں کی اجازت بھی جو دی گلچیں نے
تو نشیمن کو نشیمن سے جدا رکھا ہے
تم جو بدلے تو زمانے کا چلن بھی بدلا
یہ نہ سمجھو کہ وہی دورِ وفا رکھا ہے
اے شفیق آپ کہاں جاتے ہیں درماں کیلئے
درد کا نام ستمگر نے دوا رکھا ہے

(بشکریہ نئی نسلیں)

عشرت عادل مارہروی

سب سے بڑی کمزوری ـــــــ!

۳ اگست

تسلیم! مجھے آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ آپ کا لڑکا ارشد جو طالب علم جماعت دہم حصہ ب ہے پڑھائی کے دوران میں اسکول سے بھاگ کر سینما دیکھتا ہوا پکڑا گیا ہے۔ آپ سے گذارش ہے کہ آپ فدوی کو تنبیہ کریں۔ اگر دوبارہ ایسی حرکات سے باز نہ آیا تو ہم اسے کوئی رعایت دینے سے مجبور ہوں گے اور اسکول سے اس کا نام خارج کرتے ہوئے ہمیں افسوس ہوگا ـــــــ امید ہے آپ اس بارے میں توجہ فرمائیں گے

مخلص

پرنسپل ہمرس ہائی سکول پونا گر

---

۵ اگست۔

محترم ماسٹر صاحب تسلیم۔

یہ خط آپ کو اپنے چھوٹے بھائی ارشد کے سلسلے میں لکھ رہی ہوں آپ اس کے کلاس ٹیچر ہیں آپ اسے اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ آپ کے اسکول میں اس کا آخری سال ہے اگر آپ دیگر مہربانیوں کے علاوہ اس سال اس کی فیس معاف کروا دیں گے تو یہ آپ کا احسان ہوگا۔ جس کے لئے میں مشکور ہونگی

مخلص

راشدہ بانو

۸ اگست

محترمہ تسلیم!

اپنے ہونہار طالب علم ارشد کے ہاتھ آپ کا پرچہ ملا۔ یاد فرمائی کا بے حد مشکور ہوں۔ میں ارشد کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔ آپ اس کی طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔ میں اس کی فیس معاف کرانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھوں گا۔ امید ہے آپ کسی اور خدمت کے لئے بھی یاد فرمائیں گی۔ آپ کی خدمت میرے لئے باعث مسرت ہوگی

مخلص

ماسٹر قمر احمد برنے

۱۴ اگست

محترم ماسٹر صاحب تسلیم

آپ کا خلوص نامہ ملا شکریہ آپ کے خلوص اور ہمدردی کی میں بیحد مشکور ہوں آپ ارشد کو اپنا ہی بھائی سمجھئے۔ کیونکہ آپ کی زیر نگرانی یہ سنبھل جائے گا اور پھر اس کا کوئی بڑا بھائی نہیں۔ ابھا جان ہیں تو وہ تمام وقت دفتر کے کاموں میں الجھے رہتے ہیں۔ اور میں عورت ذات ہوں اس لئے صرف گھر پر ہی نگرانی کر سکتی ہوں۔ گھر میں کوئی دوسرا مرد نہیں جو ہر وقت اس کی دیکھ بھال کرے۔ اس لئے آپ سے امید ہے کہ آپ سکول میں اس کی دیکھ بھال رکھیں گے۔ آپ کے پرنسپل صاحب اس سے کچھ ناراض ہوگئے ہیں آپ کو زحمت تو ہوگی مگر میں آپ کی بہت مشکور رہوں گی۔ اگر آپ کی کوشش اور سفارش سے پرنسپل صاحب اسے معاف کر دیں گے میرے

تم بڑی شریر ہو ...... نصور تمہاری منگائی تھی یا میری کمزوری کی؟

غالباً تم نے میرا امتحان لیا تھا۔

تو لو .... میں اپنے امتحان میں کامیاب ہو گیا!

ماہر القادریؒ

○

مرا وجود ہے خود حاصلِ جبینِ نیاز
نفس نفس ہی عبادت، نظر نظر ہے نماز

خرد کی راہ میں آئے بہت نشیب و فراز
رواں دواں ہی رہا ہے یقیں کی عمر دراز

نہے بکمالِ مشیت! خوشا! ظہورِ جمال
حقیقتوں کو دیا جس نے آب و رنگِ مجاز

دل و نظر پہ ہوئی ہیں نوازشیں کیا کیا
بہ رنگِ ذوقِ تماشا، بہ نامِ سوز و گداز

اسی کے نام سے گرتے ہوئے سنبھلتے ہیں
کہ جس نے دی ہے پتنگے کو طاقتِ پرواز

نہ جانے کیوں غلط آہنگ ہو گئے نغمے
مدد کا وقت ہے سازِ الست کی آواز

سوائے ذاتِ خدا جو ہے قادر و خلاق
نہ کوئی عقدہ کشا ہے نہ کوئی بندہ نواز

(بشکریہ "فاران")

شفیق جونپوری

○

لب پہ جب دیکھئے انکارِ وفا رکھا ہے
واہ کیا خونِ شہیداں کا صلا رکھا ہے

یہ ہماری ہی بدولت ہیں کچھ آثارِ حیات
ہم جو محفل سے چلے جائیں تو کیا رکھا ہے

تم نے اس کی بھی کبھی حوصلہ افزائی کی
جس نے ہر تیر کو سینے سے لگا رکھا ہے

مدتوں سے ترے غم نے ترے دیوانے کو
خوگرِ شیوۂ تسلیم و رضا رکھا ہے

غیر کی شمع بھی بجھنے نہیں دیتے شرفا
تم نے اپنے ہی چراغوں کو بجھا رکھا ہے

کس کو معلوم تھا میخانہ نہیں مقتل ہے
ایک اک جام میں خونِ غربا رکھا ہے

آشیانوں کی اجازت بھی جو دی گلچیں نے
تو نشیمن کو نشیمن سے جدا رکھا ہے

تم جو بدلے تو زمانے کا چلن بھی بدلا
یہ نہ سمجھو کہ وہی دورِ وفا رکھا ہے

اے شفیق آپ کہاں جاتے ہیں درماں کیلئے
درد کا نام ستمگر نے دوا رکھا ہے

(بشکریہ "نئی نسلیں")

عمر عادل مارہروی

سب سے بڑی کمزوری ــــــ!

۳ اگست

تسلیم! مجھے آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ آپ کا لڑکا رشید طالب علم جماعت دہم حصہ ب پڑھائی کے دوران میں اسکول سے بھاگ کر سینما دیکھتا ہوا پکڑا گیا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ فوری تنبیہ کریں۔ اگر وہ ایسی حرکات سے باز نہ آیا تو ہم اسے کوئی رعایت دینے سے مجبور ہوں گے اور اسکول سے اس کا نام خارج کرتے ہوئے ہمیں افسوس ہوگا ــــــ امید ہے آپ اس بارے میں توجہ فرمائیں گے

مخلص

پرنسپل ایم۔ سی۔ ہائی اسکول پورن نگر

---

۸ اگست۔

محترم ماسٹر صاحب تسلیم۔

یہ خط آپ کو اپنے چھوٹے بھائی ارشد کے سلسلے میں لکھ رہی ہوں آپ اس کے کلاس ٹیچر ہیں آپ اسے اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ آپکے اسکول میں اس کا آخری سال ہے اگر آپ دیگر مہربانیوں کے علاوہ اس سال اس کی فیس معاف کروا دیں گے تو یہ آپ کا احسان ہوگا۔ جس کے لئے میں مشکور ہونگی

مخلص

راشدہ بانو

۹ اگست

محترمہ تسلیم!

اپنے ہونہار طالب علم ارشد کے ہاتھ آپ کا پرچہ ملا۔ یاد فرمائی کے بے حد مشکور ہوں۔ میں ارشد کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔ آپ اس کی طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔ میں اس کی فیس معاف کرانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھوں گا۔ امید ہے آپ کسی اور خدمت کے لئے بھی یاد فرمائیں گی۔ آپ کی خدمت میرے لئے باعث مسرت ہوگی

مخلص

ماسٹر قمر احمد بی اے

۱۴ اگست

محترم ماسٹر صاحب تسلیم

آپ کا خلوص نامہ ملا شکریہ آپ کے خلوص اور ہمدردی کی میں بیحد مشکور ہوں۔ آپ ارشد کو اپنا ہی بھائی سمجھئے۔ کیونکہ آپ کی زیر نگرانی یہ سنبھل جائے گا اور پھر اس کا کوئی بڑا بھائی نہیں۔ ابا جان ہیں تو وہ تمام وقت دفتر کے کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ اور میں عورت ذات ہوں اس لئے صرف گھر پر ہی نگرانی کر سکتی ہوں گھر میں کوئی دوسرا مرد نہیں جو باہر بھی اس کی دیکھ بھال کرے۔ اس لئے آپ سے امید ہے کہ آپ اسکول میں اس کی دیکھ بھال رکھیں گے۔ آپ کے پرنسپل صاحب اس سے کچھ ناراض ہوگئے ہیں آپ کو زحمت تو ہوگی مگر میں آپ کی بہت مشکور ہوں گی۔ اگر آپ کی کوشش اور سفارش سے پرنسپل صاحب اسے معاف کر دیں گے میرے

> تم بڑی شریر ہو ...... تصویر تمہاری منگائی تھی یا مینا کماری کی؟
>
> غالباً تم نے میرا امتحان لیا تھا۔
>
> تو لو .... میں اپنے امتحان میں کامیاب ہوگیا!

لائق کوئی خدمت ہو تو یاد فرمائیں۔

مخلص

راشدہ بانو

۱۴ر اگست

کرم فرما راشدہ

آپ کا پرچہ ملا۔ آپ کا کوئی کام کرنے میں مجھے زحمت ہو گی یہ صرف آپ کی غلط فہمی ہے ورنہ خاکسار کو تو آپ کا کام کرنے میں مسرت ہوتی ہے آئندہ ایسے خیال سے پرہیز کیجئے گا۔ شاید اس سے پیشتر بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں ارشد کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں اور ایک بار پھر کہتا ہوں کہ ارشد میرے بھائی کی جگہ ہے۔ آپ اس کی طرف سے بے فکر رہئے۔ ارشد کی طرح میں بھی اپنے ماں باپ کا ایک ہی لڑکا ہوں اور ایک ہی اولاد بھی میرے باپ نے مجھے بڑے لاڈ سے پالا تھا۔ مگر ایسے وقت میں جب کہ میں زندگی کی ایک نئی راہ پر چلنے کو تیار تھا تو انہوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ میری صرف ایک ماں ہے۔ آپ کی طرح وہ بھی میری صرف گھر پر ہی دیکھ بھال کرتی تھی۔ مگر گھر سے باہر کی دنیا میں کبھی میرے قدم نہیں ڈگمگائے۔ شاید آپ نے یہ سنا ہو گا کہ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔ پھر آپ ارشد کی طرف سے اتنی فکرمند کیوں رہتی ہیں۔ خدا ہے اور خدا کے بعد میں آپ مطمئن رہیں۔ میں نے پرنسپل صاحب سے کہہ سن کر ارشد کو معاف کرا دیا ہے میں اسکول میں اور اسکول سے باہر بھی اس کی ہر ممکن نگرانی رکھتا ہوں اور پھر وہ بھی تو ہونہار ہے۔ جب آپ نے ارشد کو میرا بھائی سمجھ لیا ہے تو آپ ہر کام کے لئے مجھے یاد فرما سکتی ہیں۔ اس میں زحمت کا خیال آپ کے لئے موزوں نہیں۔ دیگر کار لائقہ سے بلا تکلف یاد فرمائیں۔ منتظر رہوں گا۔

آپ کا مخلص

قمر احمد ایم اے

۱۶ر اگست

محترم ماسٹر قمر احمد صاحب آداب

آپ کا پرخلوص پرچہ ملا تھا حقیقت یہ ہے کہ آپ جیسا مخلص انسان دنیا میں ڈھونڈھے سے نہیں ملے گا۔ آپ نے ارشد کے ساتھ جو ہمدردیاں فرمائیں ہیں اس کے لئے میں بیحد مشکور ہوں۔ آپ کے حالات سے تھوڑی سی واقفیت ہونے پر آپ سے بے انتہا ہمدردی ہو گئی ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ جس کامیابی کے ساتھ آپ نے اب تک زندگی کی منزلیں طے کی ہیں اس سے بھی زیادہ کامیابی کے ساتھ آئندہ آگے بڑھیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو آپ یاد فرمائیے گا۔ آپ ہمیشہ مجھے مخلص پائیں گے

ناچیز

راشدہ بانو

۱۶ر اگست

محترمہ راشدہ صاحبہ خلوص۔

آپ کا خط ملا پڑھ کر بے انتہا مسرت ہوئی۔ آپ کو بھی مجھ سے ہمدردی ہوئی ہے یہ معلوم کر کے مجھے بہت خوشی ہوئی حقیقت تو یہ ہے کہ آپ جیسی مخلص خاتون آج تک میں نے نہیں دیکھی۔ آپ نے صرف ذرا سی واقفیت پر ہی مجھ سے ہمدردی فرمائی ہے۔ اگر آپ میری زندگی کے حالات جاننا چاہتی ہیں تو میرا ایک ناول پڑھئے جو میں نے قریب آج سے پانچ سال پہلے لکھا تھا۔ اس وقت میرے حالات کیا تھے اور کیا گزر چکے تھے۔ یہ سب آپ کو میرے ناول کے مسودے میں ملے گا۔ آپ مجھے لکھئے میں آپ کو مسودہ ضرور بھیج دوں گا۔ امید ہے آپ بھول لیں گی نہیں۔ آپ نے مجھ سے ہمدردی فرمائی ہے ایسی ہمدردی جس کا میں ایک عرصے سے یا یوں سمجھئے کہ زندگی بھر سے بھوکا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ہمدردی ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی اور بڑھتی ہی رہے گی۔ آپ کے پاس وقت تو ہو گا ہی تو آپ میرا غیر مطبوعہ ناول ضرور منگا لیجئے۔ میں بڑی خوشی سے آپ کو بھیج دوں گا۔ آئندہ آپ مجھے خط لفافے میں بند کر کے بھیجئے گا جواب کا بے چینی سے منتظر رہوں گا۔ مجھے امید ہے آپ کاہلی نہ کریں گی۔

آپ کا قمر احمد ایم اے

۲۰ر اگست۔ محترم قمر احمد صاحب۔ آداب

خط ملا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ جواب میں دیر سے دے رہی ہوں آپ جانتے ہی ہیں کہ گھر پر اگر کوئی کام کرنے والا ہے تو وہ صرف میں ہی ہوں امی جان تو اب کرنے کے قابل نہیں۔ کھانا پکانا۔ گھر کی صفائی کرنا اور پھر اگر وقت ملا جو بہت مشکل سے ملتا ہے، تو سلائی وغیرہ کرنا۔ امید ہے آپ

کا مجھے احساس ہے۔ اسی لئے میں نے معافی کی بات کی تھی۔ اگر آپ کو
اس سے دکھ ہوا ہے تو مجھے بھی افسوس ہے۔ ناول میں نے شروع کر دیا ہے
ارشد کی فیس کے معاف ہونے کی بے حد خوشی ہوئی یہ آپ کی محبت اور
کوششوں کا نتیجہ ہے ورنہ ارشد اس کا مستحق نہیں تھا۔

مخلص راشدہ

۱۰ ستمبر

پیاری راشدہ۔ محبت۔

کافی بے چینی اور انتظار کے بعد تمہارا خط ملا۔ میں تو خط بھیجکر
یہ سمجھا تھا کہ تم ناراض ہو گئیں مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر خط بھیجے خدا
کا شکر ہے کہ تم ناراض نہ ہوئیں۔ محبت کی جو آگ میرے دل میں بھڑک
رہی ہے اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔ مگر کچھ بھی کچھ تپش تو تمہارے دل
میں ہے ہی۔ خدا کرے یہ تپش شعلہ بن جائے اور میرے دل کے شعلے تمہارے
دل کے شعلوں سے مل جائیں۔ تمہیں دیکھنے کے لئے میں بے حد بے چین ہوں
راشدہ کیا تم کہیں مجھ سے مل سکتی ہو۔ اگر ابھی ایسا نہ ہو تو اپنی تصویر ہی
بھیج دو۔ میں بہت بے چین رہتا ہوں۔ اگر تم نے تصویر نہ بھیجی تو مجھے
بے حد دکھ ہوگا۔

ہمیشہ۔ تمہارا اپنا

قمر احمد۔ ایم اے

۱۸ ستمبر

قمر خلوص۔

آپ کا خط ملا تھا۔

آپ نے تصویر مانگی ہے سوچ رہی ہوں۔ آپ میرے دل کی...
کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں بہت مجبور ہوں ورنہ آپ سے ملاقات
کو تو شاید آپ سے بھی زیادہ بے چین ہوں۔ امید ہے آپ خیریت سے ہونگے

راشدہ بانو

۱۰ ستمبر

میری راشدہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم بڑی شریر ہو۔ تصویر تمہاری منگائی تھی
کہ مینا کماری کی؟ غالباً تم نے میرا امتحان لیا تھا تو لو میں اپنے امتحان میں
کامیاب ہو گیا۔ اب تو انعام ہی کے طور اپنی تصویر بھیجدو۔ ناول تم
نے شروع کر دیا ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم سمجھ گئی ہو کہ مجھے ایک سوجھ سے
ایک محبت بھرا دل رکھنے والی لڑکی کی ضرورت تھی (صفحہ ۱۴) میں تمہاری
تصویر کا بے چینی سے منتظر ہوں۔

تمہارا

قمر احمد ایم اے

۲۷ ستمبر

قمر صاحب۔ آداب

آپ کا خط ملا تھا۔ واقعی آپ اپنے امتحان میں کامیاب نکلے
وہ تصویر واقعی فلم ایکٹریس مینا کماری کی تھی۔ یقین کیجئے میں نے دھوکا
دینے کے لئے یہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ دیکھنا تھا کہ آپ کی محبت میں کتنی
گہرائی ہے۔ اپنی دوسری تصویر بھیجدوں گی۔ کوئی موجود نہیں ہے۔ ارشد
کے پاس سے اردو نثر کی کتاب گم ہو گئی ہے۔ آپ اسے اسکول کے
کتب خانے سے دلوا کر مجھے مشکور فرمائیے۔

مخلص

راشدہ بانو

۲۷ ستمبر

پیاری راشدہ بہت سا پیار

جب کافی انتظار کے بعد تمہارا خط ملتا ہے تو بہت خوشی ہوتی
ہے اور خط بھی کیا جس میں تم کچھ بھی نہ کہنے کے باوجود سب کچھ کہہ جاتی
ہو۔ محبت بھرے دل کی خاموش دھڑکنیں تمہارے خط میں میں محسوس
کرتا ہوں۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں نے مینا کماری کی تصویر بھیجنے کو
دھوکا خیال کیا تھا۔ اس کا تو میں نے کہیں ذکر بھی نہیں کیا تھا
تم اپنی تصویر جلد بھیجدو۔ میں بے چین ہوں۔ جواب پہلی فرصت میں دینا

تمہارا اپنا

قمر احمد۔ ایم اے۔

۱۲ اکتوبر

قمر صاحب۔ آداب

تصویر میرے پاس ابھی موجود نہیں۔ آپ جانتے ہیں میں

پردہ کرتی ہوں۔ اس لئے کسی فوٹوگرافر سے تصویر کھنچوانا میرے لئے ناممکن ہے۔ میری ایک رشتے دار اگلے مہینے آنے والی ہیں۔ اگر وہ اپنے ساتھ کیمرہ لائیں تو میں تصویر کھنچوا کر آپ کو بھیجوں گی۔ انتظار میں بڑا مزہ آتا ہے نا؟

مخلص راشدہ بانو

۱۳ر اکتوبر

پیاری راشدہ پیار

اب تو تمہارے خط کا انتظار کرنے کا میں عادی ہو گیا ہوں مگر تصویر کا انتظار بہت بار ہوگا۔ مگر تمہارے لئے بار اٹھانا میری محبت کا ثبوت ہے۔ ارشد کو میں نے کتاب دلوا دی تھی بہت جلدی میں ہوں جواب دینا جلدی۔

تمہارا قمر احمد

۱۴ر اکتوبر

قمر۔ آداب۔

آپ کا خط ملا تھا۔ کتاب دلوانے کا شکریہ۔ آپ کے حساب کے ماسٹر اس سے ناراض ہو گئے ہیں۔ مہربانی ہوگی اگر آپ کی کوششوں سے وہ اسے معاف کر دیں گے۔ طبیعت خراب ہے زیادہ نہ لکھ سکوں گی۔

راشدہ

۲ر نومبر

راشدہ محبت۔

ارشد پچھلے دنوں اسکول نہیں آیا تھا اور نہ میرے پاس۔ آج آیا ہے۔ تمہارا خط میں انتظار میں میں نے پایا ہے۔ تم جواب پانے کے لئے بے چین تو ہو رہی ہوگی۔ مجھے اس کا احساس ہے۔ ایسا کرو تم مجھے اجازت دو تو میں ڈاک سے تمہیں خط بھیجا کروں کہیں ایسا نہ ہو کہ ارشد کی کسی غلطی سے ہماری محبت کا راز کھل جائے اور ہم ایک دوسرے کے لئے ترسنے لگیں کل حساب کے ماسٹر سے میل کرا دوں گا۔ غلطی ارشد ہی کی تھی۔ سنا ہے اس نے ان سے بہت زبان چلائی ہے تم اسے نصیحت کرنا۔ ـــــ تمہاری رشتہ دار کب آ رہی ہیں۔ ارشد کہہ رہا تھا کہ تم نے اس سے کہا کہ میں مختصر خط لکھا کروں۔ اور یہ مختصر ہی تو ہے نا؟ ـــــ جواب جلدی دینا۔

ہمیشہ تمہارا قمر احمد ایم اے

۲۰ر نومبر

قمر صاحب۔ آداب

پچھلے دنوں میں ملیریا میں گرفتار رہی آپ کے کئی خط ملے تھے۔ مجھے افسوس ہے جواب میں دیر ہو گئی۔ اب بھی کمزوری بہت ہے۔ ڈاک سے خط بھیجنا مناسب نہیں۔ پکڑ جانے کا ڈر ہے۔ ارشد ہشیار ہے آپ مطمئن رہیں۔ رشتہ دار خاتون ابھی نہیں آئیں۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

مخلص

راشدہ بانو

۲۰ر نومبر

ابھی ابھی تمہارا خط ملا ہے اپنی والدہ کو گاؤں چھوڑنے جا رہا ہوں۔ چار بجے ہیں۔ اور ساڑھے چار پر گاڑی آ جاتی ہے۔ بہت جلدی میں ہوں معاف کرنا۔ ہزاروں محبت بھری دعاؤں کے ساتھ۔

تمہارا

قمر احمد

ر دسمبر

آپ کے خطوط سے کمزوری بھاگ رہی ہے آپ زیادہ فکرمند نہ ہوں۔ راشدہ آپ کے لئے ہمیشہ زندہ رہے گی۔ سنا ہے آپ کے یہاں لڑکوں کو وظیفہ ملا کرے گا۔ ارشد فرما رہے تھے کہ آپ اگر اسے وظیفہ دلانے میں کوشش کریں تو مشکور ہوں گی۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

مخلص راشدہ

ار دسمبر

جانِ من راشدہ

خط ملا۔ تمہاری طبیعت کی طرف سے بہت فکر ہے دن رات دعا ہے کہ اللہ میری راشدہ کو سلامت رکھے۔ ارشد میاں کے وظیفے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں رہے گی۔ تم مطمئن رہو ـــــ میری راشدہ۔ تم اپنی ذات کے لئے بھی تو مجھ سے کوئی خدمت لو کہ مجھے کچھ سکون ہو۔ راشدہ کوئی ملاقات کا ذریعہ نکالو۔ آخر کب تک میں اس طرح تمہارے دیدار کے لئے تڑپوں گا۔ تمہاری صحت کے لئے دعاگو۔

ہمیشہ تمہارا قمر احمد ایم اے

۱۲ / دسمبر

قمر، محبت بھرا سلام

میری طبیعت خدا کے فضل سے اب بالکل ٹھیک ہے اور پھر تمہاری محبت بھری دعائیں رائیگاں تھوڑی جائیں گی۔ گھبراؤ نہیں جب ہم ایک دوسرے کے ہو گئے ہیں تو پھر ملاقات بھی ہو جائے گی میری رشتہ دار خاتون آ گئی ہیں اور میں نے تصویر کھنچوالی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ان کے ساتھ لکھنؤ جا رہی ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ مجھے وہاں ارادے کے خلاف کچھ زیادہ دنوں تک رک جانا پڑے میں وہاں سے تمہیں خط نہ بھیج سکوں گی مگر تم گھبرانا نہیں۔ تمہاری راشدہ کا دل ایک لمحہ کے لئے بھی تم سے خالی نہ ہوگا۔ آج شام کی گاڑی سے میں چلی جاؤں گی۔ تصویر تمہیں آکر بھیجوں گی میں نے بھی تم کو "تم" سے خطاب کیا ہے۔ قمر محبت میں بے تکلفی ہی اچھی ہوتی ہے نا۔ . . . .

تمہاری

راشدہ

۲۰ / مارچ

قمر احمد، ہزاروں پیار

کل میں لکھنؤ سے واپس آ گئی ہوں۔ جیسا کہ مجھے ڈر تھا وہی ہوا تقریب تین مہینے یہ کیسے گذرے اس کا تم اندازہ نہ کر سکو گے ایک لمحہ کے لئے بھی تمہارا خیال دل سے جدا نہ ہوا۔ تصویر مجھے افسوس ہے صاف نہیں آئی۔ تمہیں بھیجوں گی بھی تو تم مجھے اس میں دیکھ نہ پاؤ گے انشاء اللہ کوئی صورت نکال کر جلد ہی اپنی تصویر بھیج دوں گی۔ ارشد کے وظیفے کا معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی۔ یہ سب تمہاری کوششوں کا پھل ہے۔ اب اس کے امتحان شروع ہونے والے ہیں۔ تم خود بھی خیال رکھنا اور دیگر ماسٹروں سے بھی خوب، خوب کہہ دینا کہ وہ اسے پرچہ کرنے میں مدد دیں۔ یہ تمہارا ارشد پر احسان ہوگا جس کے لئے تمہاری راشدہ بہت مشکور ہوگی۔

ناول ختم ہوا ہی چاہتا ہوگا۔ اپنی تصویر کب بھیج رہے ہو۔

تمہاری راشدہ

۲۲ / مارچ

پیاری راشدہ۔ محبت بھرے دل کا سلام لو

ایک طویل عرصے کی بے چینی اور انتظار کے بعد تمہارا آج خط ملا اور وہ بھی ایسا خط کہ اتنے عرصہ انتظار کی کوفت دور ہو گئی۔ تصویر کا مجھے افسوس ہے۔ اب تم جلد ہی بھیج دو۔ اپنی تصویر بھیج رہا ہوں۔ دیکھو تمہارا قمر احمد کیسا ہے۔ میری راشدہ اس کا دل بہت خوب صورت ہے۔ ظاہری خوب صورتی سے اندرونی خوب صورتی زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ ارشد کے امتحان شروع ہونے والے ہیں۔ میں نے اسے اب دو وقت پڑھانا شروع کر دیا ہے تم بے فکر رہو۔ اپنا اسکول سینٹر ہے۔ یہاں اسے ہر طرح کی سہولتیں حاصل ہوں گی۔ میں ہر ماسٹر سے کہہ دوں گا۔ تم دیکھنا ارشد اسکول کے ہر لڑکے سے زیادہ ممتاز رہے گا۔ ناول ختم ہو جائے تو میرے کلام کا "مجموعہ۔ دیوان قمر" پڑھنا۔ تمہاری محبت نے مجھے شاعر بنا دیا ہے۔ اسے شائع کرانے کے لئے ناشران سے بات چیت کر رہا ہوں۔ جواب جلد دینا۔

تمہارا

قمر احمد

۲ / اپریل

پیارے قمر۔

خطوط ملے۔ میرے مزاج پھر بگڑ گئے تھے اس لئے دیر ہو گئی ارشد کے امتحان ہو رہے ہیں اور تمہاری مہربانیوں سے وہ ایک دفعہ نقل کرتے ہوئے پکڑا جانے کے باوجود برابر نقل کر رہا ہے۔ مگر ماسٹران بھی اسے کافی مدد دے رہے ہیں۔ جس کے لئے میں بے حد مشکور ہوں۔ تمہاری تصویر مل گئی ہے۔ دل یقیناً خوب صورت ہوگا۔ ناول بھیج رہی ہوں رائے پھر لکھوں گی ——— "دیوان" بھی پڑھوں گی۔

تمہاری

راشدہ

۱۳ / اپریل

پیاری راشدہ

خط میں تاخیر ہو رہی ہے۔ معاف کرنا۔ ارشد کے سب پرچے اچھے ہو رہے ہیں۔ تم مطمئن رہو۔ میں نے تو اپنی تصویر بھیج دی۔ اب تم کب بھیج رہی ہو۔ آج کل میں بہت مصروف ہوں خدا معلوم کب ایک دوسرے کو پا سکیں گے۔

تمہارا

قمر احمد۔ ایم اے

۲۷ر اپریل

پیارے قمر،

ارشد کے امتحان ختم ہونے پر ماہیں اس کے سب پرچے بہت اچھے ہو گئے ہیں اور یہ تمہاری محبت کا نتیجہ ہے۔ میرے سر میں آج بہت شدت کا درد ہے۔ امید ہے تم خیریت سے ہو گے اللہ نے چاہا تو ہم جلد نیک ہو جائیں گے

مخلص

راشدہ

۲ر مئی

پیاری راشدہ

اپنی مصروفیات کی بنا پر جواب میں تاخیر ہو گئی ہے، معاف کر دینا۔ ارشد کے امتحان ختم ہو گئے۔ اللہ نے چاہا تو وہ فرسٹ آئے گا جب کے پرچے میں اس کے تمام سوالات صحیح ہیں۔ تمہاری طبیعت کی طرف سے فکر ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ امی کو تمہارے گھر بھیج دوں۔ تاکہ وہ تمہارے والدین سے تمہیں میرے لئے مانگ لیں تمہاری کیا رائے ہے؟

تمہارا

قمر احمد ایم اے

محترمی و مکرمی جناب ماسٹر قمر احمد صاحب

السلام علیکم

آج اتفاقاً برخوردار ارشد میاں کا بکس کھولا تو اس میں سے آپ کے تحریر کردہ خطوط ملے پڑھ کر افسوس بھی ہوا اور حیرت بھی۔ راشدہ نام کی میرے گھر کوئی بھی لڑکی نہیں۔ بات یہ ہے ارشد میرا صرف ایک ہی بچہ ہے۔ جس کی نہ کوئی بہن ہے اور نہ راشدہ نام کی کوئی رشتہ دار آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ارشد کی فیس وہ کہتا تھا معاف نہیں ہوئی اور آپ کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اس کی فیس ہی معاف نہیں کروائی بلکہ وظیفہ بھی دلوا دیا جس کا مجھ کو علم نہیں۔ آپ سے پڑھنے کو میں نے ہی اسے رائے دی تھی سو آپ سے اس نے پڑھنا شروع کیا۔ مگر وہ ہر ماہ مجھ سے جیب خرچ آپ کی فیس کے بطور لیتا تھا۔ ارشد نے اگر آپ کے سامنے راشدہ کو اپنی بہن ظاہر کیا ہے اور اس نام سے عشقیہ خط لکھا کرتے ہیں سو یہ اس کی جعلسازی ہے۔ آپ اس بارے میں آئندہ سے دیانت کیجئے گا۔ اور میں بھی سختی سے پوچھ گچھ کروں گا۔

مخلص

عبدالحمید خاں

(بشکریہ شمع دہلی)

اثر لکھنوی

غزل

عیش کونین سے بیگانہ بنا رکھا ہے   وہ فسانہ تری آنکھوں نے سنا رکھا ہے

ناروا جو ہے وہی ہم نے روا رکھا ہے   اور الزام مقدر کو لگا رکھا ہے

وائے غفلت کہ ہم آزاد ہوئے تو لیکن   کام کرنے کے جو ہیں ان کو اٹھا رکھا ہے

خواب دیکھے جو گئے عالم بیداری میں   آج ہم کو انھیں خوابوں نے سُلا رکھا ہے

نکہتِ آوارگیِ موجِ نسیم ایک طرف   گل نے آغوش ترے شوق میں وا رکھا ہے

اک یہی شکل تلافی تھی سو وہ بھی نہ رہی   شوق تعزیر کا نام اس نے خطا رکھا ہے

اسکی چتون میں لگاوٹ تھی لبِ اتنی سی ہی بات   دل میں ارمانوں نے اک شور مچا رکھا ہے

خون دل ہونے دو آنکھوں سے لہو بہنے دو   آج کیا دردِ محبت میں مزا رکھا ہے

بھولی باتوں پہ اثر اس کی نہ جانا ہرگز
آگے تم جانو تمھیں ہم نے سنا رکھا ہے

(بشکریہ ہمایوں)

جمیل احمد فاروقی ●

جدید اُردو غزل میں تعمیری رُجحانات

آرنلڈ (Arnold) کے نزدیک ایک شاعر کی عظمت کا راز صرف اس حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ کس قدر توانائی اور حسن کے ساتھ اپنے خیالات کو زندگی سے ہم آہنگ کر سکتا ہے یعنی اس نے اس سوال کا جواب کیا دیا ہے کہ ہم کس طرح زندہ رہیں؟ سچ پوچھئے تو یہی سوال آج بھی سارے ادب کے سامنے ہے اور اسی کے تشفی بخش حل پر اس کی زندگی اور موت کا انحصار ہے۔ ہمارا بھی ادب کی ہر صنف سے صرف یہی ایک مطالبہ ہے خواہ وہ افسانہ اور ڈرامہ ہو یا شاعری کہ ہم کس لئے زندہ رہیں اور کیسے زندہ رہیں؟ یوں تو یہ سوال پوری انسانیت کے سامنے ہے مگر ادب میں ہم اس لئے اس کو سوال اٹھاتے ہیں کہ ادب زندگی سے پیدا ہوتا ہے، زندگی ہی سے وابستہ رہتا ہے اور زندگی ہی کی خدمت کرتا ہے۔ ادب اور زندگی کا تعلق اس قدر گہرا اور مضبوط ہے کہ ہم اسے نظر انداز بھی کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ جنہیں رقیقیت کی بھول بھلیاں راس آچکی ہیں یا جنہیں اپنی جھول داخلیت کے گھونسلے کی پرستش سے ہی فرصت نہیں ملتی انہیں تو چھوڑ دیجئے۔ ان سے پوچھئے جو ایک بامقصد اور باشعور زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور جن کے نزدیک ادب، زندگی کا ایک عظیم ترجمان اور نقیب ہی نہیں بلکہ ایک زبردست طاقت اور توانائی کا پیکر بھی ہے۔ میکسم گورکی (Maxim Gorky) نے ایک بار یہ کہا تھا کہ ادب سے زیادہ طاقتور وسیلہ کوئی موجود ہی نہیں جس سے ہم ایک دوسرے کو اپنے خیالات سے روشناس کرائیں۔ یہ بات اس شخص کی نہیں ہے جسے اپنے پیشے سے خواہ مخواہ کا شغف ہو بلکہ اس شخص کی ہے جس نے اپنی زندگی کے پچاس سال عملی تجربے اور [illegible] میں صرف کئے ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ایک باشعور ادیب اور شاعر کا تخلیقی عمل اور اس کے تخلیقی عمل کا ایک ایک محور اس حقیقت کا شاہد ہے۔ اس لئے ایک سچے اور زندہ ادیب کی صرف ایک ہی پہچان ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ اس نے ہمیں زندہ رہنے کے لئے کسی [illegible] ترجیحات کی طرف رہنمائی کی ہے یا نہیں اور اس کا ادب [illegible] رہنمائی کی جدوجہد میں ایک طاقتور وسیلے ([illegible] Weapon) کی حیثیت رکھتا ہے یا نہیں۔

جب ہم ادب اور زندگی کی بات کرتے ہیں تو بعض ناقدین کو قدرتی طور پر یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ [illegible] مرکزی [illegible] ہو [illegible] سمجھتے ہیں [illegible] زندگی کے [illegible] ادب [illegible] ہے [illegible] ([illegible]) نے ایک [illegible] ہے۔ [illegible] کو [illegible] فرمان [illegible] ادب [illegible] اور [illegible] کا مطالبہ [illegible] کا قدرتی نتیجہ ہے۔ [illegible] کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتلائی جاتی ہے کہ وہ عوام کے [illegible] سے غیر ملکی [illegible] کہ وہ [illegible] آپ کو [illegible] زندگی [illegible] مقصد [illegible] تصور [illegible] زندگی کا [illegible] ہمارے سامنے ایک [illegible] کا ایک [illegible] ہے [illegible] خود [illegible] ایک [illegible] بانگ [illegible] نسان [illegible] دنیا [illegible] باعث [illegible] سامنے جوابدہ نہیں ہو سکتے۔ [illegible] وہ شعوری مقصد ہے [illegible] جب ہم [illegible] زندگی [illegible] باہم [illegible] گفتگو کرتے ہیں تو ہمارے سامنے ایک [illegible]

جوتا ہے اور ہم ادب کو اسی تصورِ حیات کا ایک طاقت ور اور بے مثل
ترجمان اور عکاس دیکھنا چاہتے ہیں۔ روحِ جمہور اور عوامی تقاضوں کی
بحث بہت پرانی ہو چکی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ان کھلی اصطلاحوں
کے اندر کس قدر رجعت پسندانہ ذہنیت کارفرما ہے۔ جو لوگ ادب میں
روحِ جمہور دیکھنا چاہتے ہیں وہ خود ادب اور جمہور دونوں کے دشمن ہیں
سچا جمہوری ادب تو وہی ہو سکتا ہے جو خدا پرستانہ ہو۔ جو عوام کی
مرضی و ناپسندی کے تابع نہ ہو۔ جب انسان خود اپنے نفع و نقصان
پر قادر نہیں اور اپنی حیات و موت پر ذرہ برابر بھی قدرت نہیں رکھتا
تو پھر اس کی پسند و ناپسند کیا؟ ——— اس کے سامنے جواب ہی
کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ انسان کے نفع و نقصان اور اس
کی سچی ترقی و بہبودگی کا بہترین ضامن تو وہی ہو سکتا ہے جو اس کا
خالق اور رب ہو اور جس کے یہاں برتری و بزرگی کا معیار اور انسانی
ارتقا کا اندازہ اس کے تقویٰ سے کیا جاتا ہو۔ ایسا ہی ادب روحِ جمہور
کے اصل تقاضوں کا حامل بن سکتا ہے۔

اس مختصر سی توضیح سے جہاں، یہ بات شرح ہوتی ہے کہ
ادب و زندگی کے ربطِ باہمی سے ہماری کیا مراد ہے وہاں یہ چیز بھی کھل
کر سامنے آجاتی ہے کہ ہم ادب کی ہر صنف میں ایک واضح اور صحت مند
تصورِ حیات کی جھلک بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ تصورِ حیات جس قدر
مربوط اور نمایاں ہو کر سامنے آئے گا اسی قدر ادب میں نکھار، اثر انگیزی
اور بین الاقوامیت پیدا ہوگی۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ
ہم دوسرے مکاتیبِ فکر کی طرح ادب میں مقصدی میلانیت ———
(Tendenziousness) کے سختی سے قائل ہیں۔
کیونکہ جب انسان اور کائنات کی تخلیق ایک عظیم مقصد اور غایت کے
تحت وجود میں آئی ہے تو پھر ادب بغیر کسی غایت یا میلان کے ناقابل
تصور ہے۔

آخر سوچئے تو کہ (Divine Comedy) آج بھی کیوں ہماری
روح کو جھنجھوڑ دیتی ہے، حالانکہ تیرھویں صدی کا وہ سماجی طوفان مدت
ہوئی ختم ہو چکا ہے۔ صرف اسی لئے تو کہ اس عظیم ادبی تخلیق کی پشت پر
ایک مخصوص میلان کارفرما ہے۔ ایلیا اہرن برگ (Ilya Ehrenburg)
نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ایک فنکار اور ادیب بھی عام انسانوں کی
طرح بعض چیزوں کو پسند کرتا ہے اور بعض کو ناپسند، جب کہ اس کا اختلاف
نسبتاً زیادہ شدت اختیار کر لیتا ہے، دریں عام لوگوں کے مقابلے میں
اس کے محسوسات بھی زیادہ تیز ہو جاتے ہیں جس کا لازمی اور قدرتی
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا دماغ ایک مخصوص میلان اور رجحان کی طرف
مائل ہو جاتا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ یہ میلان خدا پرستی، انسان
دوستی اور صحت مندی کی طرف اسے لے جاتے یا اس کے برعکس۔
غرض میلان بہر صورت نمایاں ہو کر رہے گا۔ حق و باطل کی کشاکش میں
غیر جانبداری ناممکن ہے۔ یا تو ادیب خیر کی حمایت کرے گا یا شر کی
ان دونوں کے درمیان کوئی اعتدال کی راہ نہیں۔

جو لوگ ادب میں صرف حقیقت کی ظاہری شکل کو پیش
کر دینے کے قائل ہیں اور اپنی طرف سے کسی رجحان کے براہِ راست
اظہار کو ادبی روایات کے خلاف تصور کرتے ہیں یا اسے جانبداری کا
اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی موت پر محمول کرتے ہیں وہ در اصل خود
حقیقت سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں رکھتے۔ ان کے اندر وہ طاقت
ہی مفقود ہے جو حقائق کی تلخیوں کی تاب نہ لا سکے۔ وہ اس کی آڑ میں
خود اپنی کمزوریوں کو چھپانا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی بہت سے ادبی مفکرین
میں سائمنڈز (Symonds) بھی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ
حقائق اور واقعات جو آرٹسٹ کے علم اور مشاہدے میں آچکے ہوں بس
انہیں کی پرخلوص عکاسی ہی حقیقت نگاری ہے۔ اس بحث سے قطع نظر
کہ خود آرٹسٹ کے علم اور مشاہدے کے امکانات پر مکمل اعتماد کیا بھی
جا سکتا ہے یا نہیں، یہاں صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ آرٹسٹ کا کام
یہی نہیں کہ وہ ناقص اور ادھورے خاکے پیش کر کے علیحدہ ہو جائے بلکہ
اس کا سب سے بڑا اور اہم ترین فریضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ان خاکوں
کی تکمیل میں ایسے انمٹ رنگوں سے کام لے، جو انہیں اٹل، غیر فانی
اور لازوال بنا دیں۔ یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آرٹسٹ
حقیقت کی گہرائیوں میں ڈوب نہ جائے اور کوئی خاص مقصدی میلان
اس کے شعوری عمل کو حرکت میں نہ لائے۔ سردار جعفری نے اپنی کتاب
"ترقی پسند ادب" میں ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ "آرٹسٹ کو صرف حقیقت

کے مظاہرے پر اکتفا کرنے کے بجائے ان کی تہوں کو ٹٹولنا پڑتا ہے اور کیوں اور کیسے کا جواب دینا پڑتا ہے اور جیسے ہی ادیب یا آرٹسٹ یہ جواب دینے کی کوشش کرتا ہے مستقبل اس کے سامنے بے نقاب ہو جاتا ہے سچ پوچھئے تو یہ بڑی معمولی سی بات ہے اور ہر وہ ادیب یا آرٹسٹ جو ایک بامقصد زندگی کے ساتھ ادب کا بھی ایک مقصدی اور مثبت تصور رکھتا ہو اس بات سے انکار نہیں کر سکتا اگر ایک آرٹسٹ خدا پرستانہ نظامِ حیات کو تمام انسانی دکھوں کا مداوا سمجھتا ہے، اگر اسے اس بات کا پورا پورا یقین ہے کہ موجودہ سماجی نظام کی مادّی و اخلاقی پستیوں کا سبب لادینی جمہوریت ہے تو پھر اسے ایک واضح فیصلہ کرنا ہوگا اور ادب میں کیوں اور کیسے کا صاف صاف جواب دینا پڑے گا اور اسے یہ بھی مکمل کر بتلانا ہوگا کہ حقیقت کے ان مظاہر کے پیچھے خود خالقِ کائنات کے تخلیقی مقاصد کیا ہیں اور وہ خود شعوری طور پر ان سے کہاں تک اور کس حد تک اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان عظیم مقاصد سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ادیب یا آرٹسٹ کو موضوع اور مواد (Subject Matter) کے انتخاب میں غیر معمولی احتیاط اور حکمت سے کام لینا ہوگا۔ نہ تو ہر موضوع ادب کا موضوع بن سکتا ہے اور نہ ہر موضوع کے اپروچ میں فنکار کی تمام تخلیقی صلاحیتیں اپنی تابانیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آسکتی ہیں۔ ادیب ہر چیز اور ہر انسان کے متعلق نہیں لکھ سکتا۔ اسے اپنے موضوع اور مواد کے انتخاب میں انتخابی طریقۂ کار کو اپنانا ہی پڑتا ہے۔ ایک کتاب اس لئے نہیں لکھی جاتی کہ ادیب کو اس کے لکھنے کا طریقہ معلوم ہے بلکہ اس لئے کہ وہ کتاب خود ادیب کے دماغ سے نکلنے کے لئے بے چین ہے۔ ایسے خارجی و داخلی محسوسات سے ہو کر اسے گذرنا پڑتا ہے کہ وہ کچھ کہنے کے لئے مضطرب ہو۔ فی الحقیقت یہی جذبۂ تخلیق (Creative Impulse) ایک ادیب یا آرٹسٹ کے فن کی جان ہے اور یہ اسی وقت نمایاں ہو سکتا ہے جب احساس میں شدت و گرمی ہو اور مقصد کی وسعت و ہمہ گیری اس کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہو۔ یہی جذبۂ تخلیق ہمیں اردو ادب میں ایک طرف مخدوم۔ فراق۔ ساحر۔ کرشن چندر اور بیدی کے یہاں ملتا ہے تو دوسری طرف اقبال۔ ماہر القادری۔ شفیق جونپوری ——

انور صدیقی۔ محمود فاروقی اور اسعد گیلانی ہی میں سرشار نظر آتے ہیں۔

آج انہیں نظریات کی روشنی میں تعمیر پسند ادیب کا کارواں آگے بڑھ رہا ہے۔ یوں تو ہر صنفِ ادب میں ان رجحانات کے شعوری التزام پر ہم زور دیتے ہیں مگر شاعری کا جہاں تک تعلق ہے ہم خصوصیت کے ساتھ اس پر نگاہ رکھتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ یہی سارا ادب ہے بلکہ اس لئے کہ یہ ادب کی سب سے زیادہ اہم صنف ہے۔ دنیا کے ادب کا تین چوتھائی حصہ شاعری پر مشتمل ہے۔ خصوصاً اردو ادب میں تو آج بھی افسانہ۔ ڈرامہ اور دوسری اصناف کے مقابلے میں شعری تخلیقات کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہی شاعری اردو بولنے والوں کی زبان میں [illegible] اور فطرت کا عکس ہے اور اس کو فن کا ایک موثر ترین حربہ قرار دیا گیا اس کی نظر میں اس حربے (Weapon) کی طرف سے ذرا بھی بے توجہی مجرمانہ تغافل پسندی (Criminal Negligence) کے مترادف ہے۔ اردو شاعری میں خصوصاً غزل کی صنف جسے غنائی شاعری (Lyric Poetry) سے تشبیہ دی جا سکتی ہے ایک ایسی صنف ہے جسے ہم بجا طور پر ایک موثر ترین حربہ کہہ سکتے ہیں۔ اسے رشید صدیقی کے الفاظ میں اردو شاعری کی آبرو کہہ لیجئے چاہے کلیم الدین احمد کی زبان میں نیم وحشی صنفِ سخن، مگر یہ صنفِ ادب بہرحال ہر دور میں شعوری یا نیم شعوری طور پر ایک موثر ترین حربے کی حیثیت سے استعمال کی گئی ہے۔ طریقہ استعمال بدلتا رہا۔ مگر حقیقت نہیں بدلی آج بھی ترقی پسند اور تعمیر پسند فنکاروں کا سوادِ اعظم اسی حربے سے مسلح ہے مگر اپروچ اور طریقۂ استعمال میں فرق ہے۔ یہ فرق بنیادی اور اصولی ہے اور اس لئے ہے کہ ہر نظریۂ فن زندگی سے بنتا۔ سنورتا اور بگڑتا ہے جس وقت اور جہاں سے نظریۂ حیات بدلتا ہے وہیں سے فن کا تصور اور فن کے تقاضے بھی بدل جاتے ہیں۔ غالباً اسی قسم کا تصور پریم چند کے ذہن میں بھی تھا جب انہوں نے یہ کہا تھا کہ "ہمیں حسن کے معیار کو بدلنا ہوگا" درحقیقت اپروچ اور استعمال کا فرق ہی آرٹ کا حسن ہے جسے بہ الفاظ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جس قدر فنکار کا شعورِ زندگی کی تہذیبی قدروں سے ہم آہنگ ہوگا اسی قدر فن کے معیار میں تبدیلی بھی ہوگی اور یہ بات کون نہیں جانتا کہ یہ تہذیبی قدریں ہی نظامِ حیات

فراہم کرسکتا ہے جس میں پوری انسانیت کا تصور ہو۔

یہاں فن میں جس تبدیلی کا ذکر کیا گیا ہے اس کا مطلب ماضی سے بغاوت نہیں بلکہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ فن خواہ قدیم ہو یا جدید اپنا معیارِ حسن نظریۂ زندگی میں تلاش کرتا ہے۔ زندگی ہی فنی اقدار کا تعین کرتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ فنکار کا نظریۂ حیات تو بدل جائے مگر فن کے قدیم یا مروجہ اصولوں پر کوئی آنچ نہ آنے پائے اور وہ اس پر قانع ہو کر بیٹھ جائے اس لئے اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ ایرہچ اور استعمال کا یہ اختلاف نہ تو فنی قدروں کو مجروح کرتا ہے اور نہ ماضی کے ادبی سرمائے کی نفی بلکہ فن اور زندگی میں زیادہ سے زیادہ آہنگ (Harmony) پیدا کرتا ہے اور قدیم و جدید کی درمیانی کڑی (Link) کو قائم رکھتا ہے۔

ٹی۔ ایس ایلیٹ (T. S. Eliot) نے ایک جگہ لکھا ہے ہمیں ادب کے تاریخی تسلسل کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے ادب کے قدیم سرمایے کی پوری حفاظت کرنی چاہیئے اور اسی قدر نہیں بلکہ اس سے فائدہ بھی اٹھانا چاہیئے۔ یہی خیال گورکی نے اس طرح ادا کیا ہے کہ "ہم دورِ ماضی کے وارث ہیں اور ہمیں اس پر اپنے اندر فخر کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے" اس میں شک نہیں کہ ہم اپنے آپ کو ماضی سے الگ نہیں کرسکتے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ماضی۔ حال اور مستقبل یہ تینوں ایک دوسرے سے اس قدر مربوط ہیں کہ خود انہیں بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ہم ادبی وراثت کے ضرور قائل ہیں مگر زندگی سے خیانت نہیں کرسکتے۔ ہم زندگی کو فن پر مقدم سمجھتے ہیں

چنانچہ ادب میں نظریئے کے استعمال اور اظہار کا بیان مسلم ہے اب اس سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں مگر جب شاعری اور... خصوصیت کے ساتھ غزل جیسی موثر ترین صنف، کا سوال آتا ہے تو بعض اوقات بڑی ہچکچاہٹ محسوس کی جاتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو فن کا ماورائی تصور بعض ذہنوں پر بری طرح غالب آجاتا ہے۔ غزل میں نظریئے کی تلاش کے لئے بڑی غیر فطری شرائط مقرر کردی جاتی ہیں۔ آل احمد سرور جیسا بالغ نظر نقاد بھی جو نظریئے کی اہمیت پر یہ کہہ سکتا ہو کہ "اب غزل کی بحث کسی نہ کسی نظریئے کے زیر سایہ ہی ممکن ہے صرف رائے زنی سے کام نہیں چل سکتا" اور پھر یہ کہ "اسی طرح نظریئے کی رو سے بکھرے ہوئے جلوے بڑے معنی خیز ہو جاتے ہیں" اسی فاضل نقاد کا یہ بھی خیال ہے "تخلیقی کاموں میں نظریئے کی تلاش براہِ راست نہیں ہونی چاہیئے یہ بالواسطہ ادب میں جگہ پاتے رہتے ہیں" بالواسطہ سے مراد ان کی یہ ہے کہ تخلیقی ادب میں نظریئے کا اظہار تشبیہات و استعارات اور... رموز و کنایات میں ہونا چاہیئے۔ جس طرح تنقید یا دوسرے علوم میں نظریئے کا کھل کر اظہار کیا جاتا ہے وہ طریقہ تخلیقی ادب کے منافی ہے

اس بات کے اعتراف میں یقیناً کوئی تامل نہیں کہ تخلیقی ادب اور دوسرے علوم کا معاملہ کافی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہے اور اس لئے نظریئے کے استعمال میں مختلف ذرائع (Mediums) کو کام میں لانا پڑتا ہے۔ خصوصاً غزل جو ایک داخلی صنفِ سخن ہے اس میں تو نظریئے کے استعمال کے لئے جذبات ہی کو وسیلہ بنانا پڑتا ہے لیکن اس کو تسلیم کرنے کے بعد بھی جو چیز ایک داخلی صنفِ سخن کو تخلیقی ادب کا درجہ دیتی ہے وہ صرف زبان و بیان، تشبیہات و استعارات کی خوبصورتی اور صفائی اور اظہارِ خیال میں ایجاز و اجمال کا نام نہیں بلکہ خود خیال کی رفعت اور سچائی ہے۔ وہ تہذیبی قدریں جن میں فنکار کے جذبات و خیالات کی پرورش ہوتی رہتی ہے انہیں کے پرخلوص اور متناسب اظہار سے تخلیقی ادب پروان چڑھتا ہے اور وہی تخلیقی ادب کہلاتا ہے۔ کسی خیال کی رفعت و سچائی۔ گہرائی و ہمہ گیری ناپنے کے لئے ہمیں لازمی طور پر نظریئے ہی کی طرف جھکنا پڑتا ہے اور جب نظریئے کی اہمیت مسلم ہے تو پھر اس کے استعمال میں براہِ راست یا بالواسطہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف سوال اس قدر رہ جاتا ہے کہ اس کے اظہار میں تناسب۔ برجستگی اور خلوص کا مکمل اہتمام کیا گیا ہے یا نہیں۔ اور یہ سوال بھی فوراً ہی حل ہو جاتا ہے۔ اگر فنکار کا شعور نظریئے سے پوری طرح ہم آہنگ ہو اور فن میں اتنی لچک موجود ہو کہ زندگی کے شانہ بشانہ چل سکے تو آج ڈھکی چھپی بات یا سات پردوں میں رہنے والے خیالات کو کون پوچھتا ہے۔ اب ادب کی کسی صنف میں ابہام کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ حسین و پاکیزہ تشبیہات و استعارات اور مخصوص رموز و علائم کے لئے بہرحال ہر تخلیقی ادب میں جگہ رہی ہے

اور رہے گی۔

یہاں تک ادب، زندگی اور فن کا جو نظریاتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے کہ اس سے تعمیر پسند غزل کے تصورات کے سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ یوں تو یہ تعمیر پسند نقطۂ نظر اردو غزل کی پوری تاریخ میں پایا جاتا ہے اور کلاسیکی غزل سے لیکر جدید اردو غزل تک ان تصورات کے ہلکے اور گہرے نقوش ہمیں جابجا ملتے ہیں مگر ان کا شعوری اور منظم اظہار سب سے زیادہ علامہ اقبال کی شاعری میں نظر آتا ہے ان کی پوری شاعری نظریات کی شاعری ہے۔ یہ نظریات اتنے بالکل واضح اور موثر انداز میں اور کہیں بھی نہیں ملتے۔ انہوں نے فن کو نظریئے سے ملا کر دیکھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں انہوں نے فن کے جامد پامال اور فرسودہ تصور کی جگہ ایک حیات افروز فن کی بنیاد ڈالی۔ نظریئے کی بے پناہ طاقت۔ فنی توانائی کا بھرپور جامع اور آفاقی شعور علامہ اقبال کے یہاں اس قدر پختگی کے ساتھ ملتا ہے کہ ہم ششدر رہ جاتے ہیں۔ سچ پوچھیئے تو آج انہیں کے نقش قدم پر پوری جدید اردو شاعری کا قافلہ گامزن ہے۔

سردار جعفری نے ٹھیک کہا ہے کہ اقبال کے بغیر ہم اپنی موجودہ شاعری کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ خصوصاً تعمیر پسند غزل گو شاعروں کے لئے تو ان کا سارا سرمایۂ فکر و ادب ایک مستقل حرکت و عمل اور حرارت و پیغام کا حامل ہے۔ ترقی پسند ادب کے خوشہ چینوں نے جس قدر بھی ان کے گلدستۂ فن و ادب سے خوشہ چینی کی ہے اس کا اعتراف اگرچہ ہر جگہ موجود ہے مگر اس کا اصل تقاضہ یہ تھا کہ جہاں کہیں بھی ان کے نظریۂ حیات سے اختلاف ہوتا اس کو وزنی دلائل و براہین سے غلط و ناقابل عمل ثابت کیا جاتا لیکن کیا کیا جائے اس دیانتداری کو کہ جب بھی ان کے نظریات سے اختلاف کا اظہار کیا گیا ہے تو بجائے ٹھوس اور عملی انداز بیان کے صرف رجعت پسندی اور قدامت پرستی کی سستی اصطلاحوں پر بات آکر رک جاتی ہے۔ مجھے اس وقت سردار جعفری کا ایک اعتراض یاد آ رہا ہے جو انہوں نے "ترقی پسند ادب" میں علامہ اقبال پر کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ انقلاب تک تو اقبال ٹھیک ٹھیک کہتے ہیں لیکن انقلاب کے بعد جب نئے نظام کا سوال آتا ہے تو وہ قدامت پرستی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اول تو اس اعتراض کا پہلا حصہ ہی غلط ہے۔ جس انقلاب اور انقلابی طریقہ کار کا تصور اشتراکی ادیب کے ذہن میں موجود ہے اس کا کوئی شائبہ تک اقبال کی شاعری میں نہیں ملتا۔ ان کا ایک شعر بھی اس کے ثبوت میں نہیں پیش کیا جا سکتا کہ وہ کبھی بھی اور کسی دور میں بھی کمیونسٹ انقلاب کے حامی اور علمبردار رہے ہوں۔ اس لئے جعفری کا یہ خیال کہ اقبال انقلاب تک تو ٹھیک ٹھیک ساتھ دیتے ہیں سراسر غلط فہمی اور ناواقفیت پر مبنی ہے۔

رہی دوسری بات۔ ظاہر ہے۔ وہ جب کمیونسٹ انقلاب پر یقین ہی نہیں رکھتے تھے تو پھر اس نظام کے لانے کا کیا سوال؟ ہاں اگر کمیونزم پر یقین نہ رکھنا ماضی پرستی اور قدامت پسندی کی دلیل ہے تو بیشک علامہ اقبال ماضی پرستی اور قدامت پسندی کی کسوٹی پر ضرور پورے اترتے ہیں کہ وہ مارکس اور لینن کے غیر فطری اور بیہودہ نظریۂ حیات کے بجائے صرف پیغمبر اسلام جیسی عظیم ترین شخصیت کے لائے ہوئے خدا پرستانہ نظام میں انسانیت کی فلاح کا راز سمجھتے تھے۔ ان کا یہ جرم یقیناً بہت بڑا ہے کہ ان کی شاعری ایک محدود اور پست فلسفۂ حیات کی ترجمانی نہ کر سکی بلکہ ایک عظیم الشان آفاقی نظامِ زندگی اور ایک وسیع اور بلند نصب العین کی بشارت دیتی ہے۔

بہرحال ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ نظریئے کے پرسوز اور پرخلوص سچائیوں کی طاقت اور برکت ہی تھی جو اقبال کو شاعری میں ایک آہنی شخصیت کے مقام پر لے آئی ورنہ آج بھی ایسے نظریاتی شاعروں کی کمی نہیں جن کا یہ حال ہے کہ وہ جب سیدھے سادے شعروں میں نظریئے کو ٹھونسنے لگتے ہیں تو قاری کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان کے سر پر کوئی ہتھوڑے چلا رہا ہو۔ اس طرح کی مثالیں ترقی پسند اور تعمیر پسند شعرا کے یہاں بیشمار ملتی ہیں۔ یہ تین غزلوں کے چند اشعار ہے

کس نے کہا کہ امن کا جھنڈا دنیا میں لہرانے نہ پائے
یہ بھی ہے کوئی ہٹلر کا چیلا مانے ساتھی جانے نہ پائے
ہشیار سامراج! گداؤں کی سرزمین
تجھکو کرے گی دفن ترے جاہ و تن کے ساتھ (مجروح)

ابھی تو دیوار و در پہ منڈلا رہے ہیں بیکاریوں کے سائے
ملوں کے اعصاب کے تشنج وہی، رگوں کی تھکن وہی ہے
وہی ہے سرمایہ دار مزدور کی کشاکش جو کل تلک تھی
لہو میں بھیگا ہوا زمانے کے جسم پہ پیرہن وہی ہے

(سردار جعفری)

یہ بھی سچ ہے اے زاہد آج راہِ منزل سے خود بھٹک گیا ہوں میں
یہ بھی جانتا ہوں میں فرض ساری دنیا کی مجھ پہ رہبری بھی ہے

(ابو المجاہد زاہد)

زہر برسائے گی کیسا کیا یہ بتائیں کس کو
سنتے ہیں چین میں ایک سرخ گھٹا چھائی ہے
ہو گئی روس میں شداد کی جنت تیار
آہنی پردے کے پیچھے سے خبر آئی ہے

(عرشی بھوپالی)

اور دوسری طرف علامہ اقبال کے صرف دو شعر پیش کئے جاتے ہیں؎

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

ان اشعار سے موازنہ مقصود نہیں بلکہ یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ نظریے کا استعمال تو بہت آسان ہے مگر وہ دلوں کے گہرائیوں میں اسوقت تک نہیں اتر سکتے جب تک سوزِ یقین اور خونِ جگر کی آمیزش نہو۔ انور صدیقی نے کتنے پتے کی بات کہی ہے؎

سوزِ یقین کے بغیر خاتم بے نگیں ہے فن
دستِ ہنروراں میں ہے معجزۂ ہنر تو کیا

غور سے دیکھا جائے تو ادب۔ زندگی اور فن کے انہیں تصورات کے ساتھ اردو غزل میں تعمیر پسندی کا رجحان بڑھنا شروع ہوا۔ ایک طرف علامہ اقبال کے خدا پرستانہ تصورات کے طاقتور سیلاب نے صدیوں کے فکری دھاروں کا رخ پلٹ کر رکھدیا اور دوسری طرف انھیں تصورات کی بنیادوں پر متعدد سائنٹفک تحریکیں وجود میں آگئیں جو جدید علوم کے تمام حربوں سے مسلح تھیں۔ انہیں دونوں کے اثر سے اور انہیں اساسی افکار کے سہارے دیکھتے ہی دیکھتے غزل گو شعراء کا ایک بڑا گروہ میدان میں آگیا جس میں شفیق جونپوری نعیم صدیقی ماہر القادری۔ روش صدیقی۔ حفیظ میرٹھی۔ انور صدیقی، عرشی بھوپالی عاصی کرنالی۔ کوثر نیازی۔ مسعود جاوید۔ اعظم ادیب اور طالب حجازی سب سے پیش پیش ہیں۔ تعمیر پسند تحریک کے ان جیالے فنکاروں میں بیشتر ایسے ہیں جو ابھی نو عمر ہیں اور ذہنی پختگی کے مراحل طے کر رہے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کی مشقِ سخن کی عمر تیس اور پینتیس سال تک پہونچ چکی ہیں اور اب انھوں نے ادب و فن کے (Ivory Tower) سے نکل کر زندگی کے عظیم تقاضوں کو خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ فنکار ہیں جنہوں نے اسلامی اقدارِ حیات پر اپنے فن و ادب کی بنیاد ڈالی ہے اور سالہا سال کی جھوٹی رومانیت اور سستی جذبات پرستی کے بجائے حقائق کو اپنے سینے سے لگایا ہے۔ ان فنکاروں میں زندگی، کائنات اور تمام بین الانسانی مسائل کو سمجھنے کا ایک پر خلوص آفاقی جذبہ ملتا ہے۔ اقبال نے جو چراغ روشن کیا تھا اور جس کے متعلق شاید ان کا یہ خیال تھا کہ اس سے کسب نور کرنے والے نہ میسر آئیں گے۔ آج اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ روشن ہے روشن ہی نہیں بلکہ اس کی ضیا باریوں سے ہزاروں شمعیں جل رہی ہیں؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

یہاں جن فکری محرکات کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کے علاوہ ایک تیسری قوت محرکہ اور بھی ہے جو تعمیر پسند فنکاروں کو ان فکری محرکات سے قریب تر لانے میں معاون ثابت ہوئی اور وہ ان فنکاروں کو بڑھتا ہوا سماجی شعور اور انسانی مسائل کا شدید ادراک و احساس ہے۔ سیاسی لوٹ کھسوٹ۔ عالمی امن کے نام پر دوسری جنگ عظیم کی تیاریاں۔ اخلاقی قدروں کی پامالی اور جرائم کی ترقی۔ جدید لادینی تحریکوں کی لائی ہوئی لایقینیت اور دہریت کی تباہیاں۔ عام انسانی صفوں میں ذہنی اور روحانی انتشار۔ بھوک۔ افلاس اور بیماریوں کا سیلاب اور پھر سب سے بڑھکر سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظاموں کی لائی ہوئی طبقاتی کشمکش اور منافرت۔ ایک طرف یہ اور اس طرح کے دوسرے بے شمار ضمنی مسائل تھے اور دوسری طرف اشتراکی ادب

کی مہلک اور غیر صحت مند قدروں کے نمونے! ان مسائل اور حالات نے تعمیر پسند فنکاروں پر بڑا نفسیاتی اثر ڈالا۔ شروع شروع میں تو یہ خود ذہنی انتشار میں مبتلا رہے مگر ان تاریکیوں سے نکلنے کی برابر جدوجہد کرتے رہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان تمام انسانی مشکلات کا حل کہیں اور ہے۔ انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں خواہ وہ معاشی اور سیاسی ہوں یا معاشرتی اور اخلاقی کامل توافق اور توازن برقرار رکھنے کے لئے ایک ایسے ہمہ گیر نظام زندگی کو لانا ہوگا جس میں انسان کی تمام صلاحیتیں خیر ہی کے کاموں میں لگائی جا سکیں جس میں ایک عظیم ہستی کے سامنے جوابدہی کا شعوری احساس ہر لمحہ موجود ہو۔ ورنہ پھر دنیا ایک حادثۂ عظیم ([illegible]) سے بچ نہیں سکتی یاد رہے کہ ان تعمیر پسند فنکاروں کو اس واضح نصب العین تک پہونچنے کے لئے بڑی کٹھن منزلوں سے گذرنا پڑا ہے۔ روش صدیقی نے ٹھیک کہا ہے

کس کو معلوم کہ ہم حسن شناسانِ ازل
کتنے اوہام سے گذرے تو یقین تک پہنچے

واقعی ہم ان دشوار گذار مراحل کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایک طرف مادیت اور الحاد کا بڑھتا ہوا رجحان اور دوسری طرف خدا پرستی اور بندگی کا تصور! مگر واضح رہے کہ جہاں چٹان کے بجائے سیلاب کی قوت ہوتی ہے وہیں پر نظریے کی طاقت اور فنکاروں کی بے پناہ تخلیقی صلاحیت کی آزمائش بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ غزل جیسی صنفِ سخن کی تمام روایتی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے ان تعمیر پسند فنکاروں کو جن تجرباتِ نو سے گذرنا پڑا ہے وہ جس منزل پر ہیں اس سے اردو غزل گوئی کی ایک عظیم تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ تاریخ ایک ایسے دور کی ترجمان ہے جس میں ان تعمیر پسندوں نے زندگی کی خدا پرستانہ قدروں کو ایک ایسے مستحکم اور جاندار نظام حیات کی شکل میں اردو غزل میں سمویا ہے! اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ تعمیری غزلوں کے رجحانات کا ایک تفصیلی جائزہ دیا جائے تاکہ ہم بآسانی ارتقائی منازل کا پتہ لگا سکیں جن سے یہ تعمیر پسند فنکار گذر رہے ہیں۔

(باقی آئندہ)

لاکھوں نے اِن میں روپیہ لگایا ہے
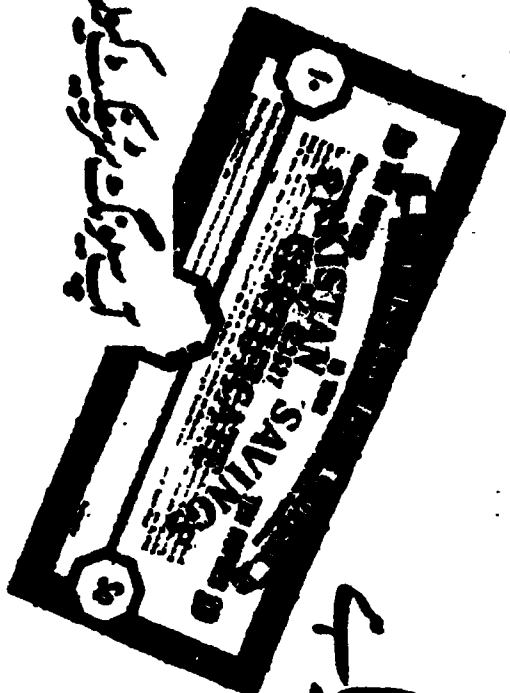
فائدے روزِ روشن کی طرح واضح ہیں۔ سیونگ سرٹیفکیٹ اس وقت روپیہ لگانے کی سب سے زیادہ نفع بخش صورت ہے۔ آپ بآسانی پانچ یا دس یا اس سے زیادہ مالیت کے سرٹیفکیٹ خرید سکتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر بھنا بھی سکتے ہیں۔ دس برس میں ہر دس روپے کے ۱۵ روپے ہو جاتے ہیں۔

کاغذ بنانے کا ایک نیا کارخانہ

آپ سیونگ سرٹیفکیٹ کیوں نہ خریدیں ؟

صرف اتنا ہی نہیں۔ ان تمسکات میں رقم لگانا اچھے پاکستانی ہونے کی نشانی ہے۔ آپ نہ صرف اپنی اور اپنے بال بچوں کی آئندہ خوشحالی کا سامان کرتے ہیں بلکہ اپنے ملک کو ایک پھلتا پھولتا خوشحال اور ترقی یافتہ ملک بنانے میں بھی مدد دیتے ہیں۔

ترقی کے لئے روپیہ بچانا شرط ہے

پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ میں روپیہ لگایئے

۴½ فیصدی منافع۔ ڈاکخانوں، سیونگ بیورو اور مقررہ ایجنٹوں سے مل سکتے ہیں۔

A.P.P.-38/56 (1)

قیصر قیصری •

اکھونی اٹھے چھپے چان

چودھری کی پشکرنی میں کنول کا صرف ایک پھول سر اٹھائے کھڑا تھا۔ ماجد نے اپنی پنجابی اتار کر دھیں کنارے پر ڈال دی اور لنگی کو اوپر چڑھا کر پانی میں اتر گیا۔ ــــــ پشکرنی میں پانی کم تھا اور کیچڑ زیادہ تھی۔ اس کیچڑ میں قدم جماتے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیر مچھلیوں کے کسی غول پر پڑ گیا ہو اور ہر قدم پر تڑپتی ہوئی مچھلیوں کی بو کا ایک بھبکا بھی پانی کی سطح سے اٹھ کر اوپر آ جاتا تھا ــــــ لیکن ماجد کو اس بو میں کوئی بیگانہ پن محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اور تہہ کی چکنی سطح پر وہ اتنی بار پھسل چکا تھا۔ کہ اب اس کے پر بھاگتے وقت بھی اپنا توازن قائم رکھتے تھے۔

بھاگتا ہوا وہ کنول کے قریب پہونچ گیا پانی صرف اس کی کمر تک آ رہا تھا۔ اس کے قدموں نے پانی میں جو لہریں پیدا کی تھیں وہ پھول کو آہستہ آہستہ ہلکورے دے رہی تھیں۔ ماجد نے اپنا ہاتھ ہلا کر اور زیادہ لہریں پیدا کر دیں کنول کا پھول ایک بار پانی میں ڈوبا اور پھر باہر نکل آیا۔ ماجد کے چہرہ پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے اپنا منہ کسی قدر ٹیڑھا کرتے ہوئے کہا "تم بھی یہاں اکیلے تھے۔ ہو نا؟"

ایک بھنورا کسی طرف سے بھن بھن کرتا ہوا آیا اور پھول سے دور دور ہوا میں چکر لگانے لگا ماجد نے لپکے دبکا اور کنول کو چھوڑ کر اس کی طرف دوڑا۔ بھنورا ایک ہی پرواز میں اس سے کافی دور چلا گیا۔ اور موسلے کی ایک بیل سے ذرا اوپر ہوا میں ایک جگہ قائم ہو گیا۔ لیکن اس کے پروں کی آواز اب بھی ماجد کے کانوں تک پہونچ رہی تھی۔ ماجد پھول کی طرف واپس مڑا اور اس سے بولا "اپنے دوست کا گیت سن رہے ہو؟"

پھول نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پانی کی لہریں اب اسے ہلکورے بھی نہیں دے رہی تھیں۔

اچانک ماجد نے گھوم کر اپنی پشت کی طرف دیکھا۔ بھنورے کی بھن بھن سے پرے ایک دوسرا گیت بھی اسے سنائی دے گیا تھا۔ بے اختیار وہ پشکرنی کے دوسرے کنارے کی طرف بڑھا۔ دوسرے کنارے پر چودھری کا لڑکا رحمان بظاہر کسی اور چیز کی طرف دیکھ رہا تھا اور کسی اور طرف جا رہا تھا۔ اس نے ماجد کی طرف نہیں دیکھا۔ نہ ہی کچھ کہا۔ لیکن اس کے گیت کی زبان کو ماجد اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ گیت رحمان کے دل سے نکل رہا ہے چاہے اس کی نظریں کسی اور طرف ہی کیوں نہ لگی ہوں۔ کانچ جیسے پر لرزتا کھاتی اکھو ہاتھے۔ وہ یقیناً اسے اپنے پاس بلانا چاہتا تھا۔ وہ یقیناً اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا۔

دونوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ کی ضرورت تھی۔

ماجد تالاب سے نکل کر رحمان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ لیکن اس کے منہ سے کوئی بات نہیں نکل سکی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"ماجد" رحمان نے کہا۔ اور پھر فوراً ہی ادھر ادھر دیکھنے لگا پشکرنی کے اس طرف صرف اس کا اپنا لکڑی کا ایک مکان تھا۔ اور اس کا دروازہ بھی اس وقت بند تھا لیکن پشکرنی کے اس پار پورا گاؤں آباد تھا۔ اگرچہ اس کی گلیاں بھی سنسان پڑی تھیں۔ ٹین کی چھتوں والی دوکانوں کے سامنے بھی کوئی گاہک کھڑا نظر نہیں آ رہا تھا گاؤں کے زیادہ تر لوگ بترک ندی کے پار شکندر پور کے جلسہ میں گئے ہوئے تھے۔ بس دو چار آدمی مسجد کے صحن میں موجود تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی ایک بار پھر رحمان نے ماجد کی طرف دیکھا۔ ماجد کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے نکل کر آہستہ آہستہ اس کے رخساروں کی طرف بڑھ رہے تھے اور اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ جیسے کوئی بات اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی ہے یا شاید آنسوؤں نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ رحمان نے ان آنسوؤں کو دیکھا۔ اور اس کھلے ہوئے منہ کو دیکھا

اور پھر اپنے مکان کی طرف چل دیا۔ اس کی سست اور لڑکھڑاتی ہوئی چال سے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ صرف دو چار قدم چل کر واپس لوٹ آئے گا۔ لیکن وہ لوٹا نہیں۔ ماجد نے اسے اپنے دروازہ تک جاتے اور پھر اس کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔

ماجد کے منہ سے اب بھی کوئی آواز نہیں نکل سکی۔ وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھکر وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگا اس گاؤں میں آج اس کا آخری دن تھا۔ رحمان اگر کچھ دیر رک جاتا اور اس سے بات کرلیتا تو وہ اسے بھی یہ بات بتا دیتا اس کا باپ اپنے بھائی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ آج صبح اسے شکندرپور سے آنا تھا کل وہ تھوڑی دیر کے لئے آیا تھا۔ اور کہہ گیا تھا۔ کہ شکندرپور کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ لوگوں نے اس کی دکان سے نمک تک خریدنا چھوڑ دیا ہے اور جب سامنے سے گزرتے ہیں تو اس کی طرف گھورتی ہوئی ایک نظر ڈال جاتے ہیں۔ ان کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔ اور جواب میں ماجد کے باپ نے خود اس کے گاؤں کے حالات اسے سنائے تھے۔ اور کہا تھا کہ لوگوں نے اس سے بات کرنا چھوڑ دیا ہے اور ادھر مل کی فضا اور بھی زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ مزدوروں سے لیکر کارخانہ کے افسر تک ٹولیوں میں بٹ گئے ہیں۔ اور ہر ٹولی دوسروں کو شک کی نظر سے دیکھتی ہے ایک عام افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ دوسرے کارخانوں کی طرح عنقریب یہاں بھی فساد ہونے والا ہے پھر دونوں بھائی دیر تک سوچتے رہے تھے کہ آیا ماجد کے باپ کو اپنے کارخانہ کی قربت چھوڑ کر شکندرپور چلا جانا چاہئیے یا اس کے بھائی کو اپنی دکان چھوڑ کر یہاں آجانا چاہئیے۔ اور آخر میں دونو اس نتیجہ پر پہونچے تھے۔ کہ صرف دو بھائیوں کے ایک جگہ جمع ہو جانے سے کوئی فائدہ نہیں پہونچے گا۔ چنانچہ کل دونوں بھائی ڈھاکہ میں جا رہے تھے۔

ماجد کو اچھی طرح یاد تھا کہ آج سے کچھ سال پہلے جب ان کا قافلہ یہاں پہونچا تھا۔ تو اس وقت یہ گاؤں انہیں ڈھاکہ شہر سے زیادہ پیارا معلوم ہوا تھا۔ اس وقت اس کے باپ کو اس کی فضا میں مچھلیوں کی سڑاند بالکل محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جیسی کہ اب ادھر کچھ دن سے محسوس ہونے لگی تھی۔ اور نہ اس نے مچھروں کی کثرت کا شکوہ کیا تھا

حالانکہ اب ان مچھروں کی وجہ سے اسے کئی راتوں سے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس وقت اس نے یہاں کی آبادی کو وحشی، جنگلی، اور ہندو بھی نہیں کہا تھا۔ کیونکہ وہ سب دوڑے ہوئے اس کی مدد کو آگئے تھے انہوں نے اپنے ہاتھ سے اس کا سامان گاڑی سے اتارا تھا۔ اپنے ہاتھ سے انہوں نے اس کے لئے لکڑی کا ایک مکان تیار کیا تھا۔ اور اس پر سون کی چھت ڈالی تھی۔ اس کا باپ اس وقت ان سب کو بار بار اپنے اجڑنے کی داستان سنا رہا تھا۔ وہ لوگ اس وقت اس کی زبان کو آج کی طرح آسانی کے ساتھ نہیں سمجھ سکتے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اور وہ اسے اپنے گلے سے لگا لگا کر اپنی زبان میں تسلیاں دے رہے تھے جیسے وہ سب اس کے خاندان کے آدمی ہیں۔ جیسے کسی جگہ کوئی ظلم ہوا ہے۔ تو وہ ان سب پر ہوا ہے۔

ماجد کو اس گاؤں کا نقشہ اب بالکل یاد نہیں تھا۔ جہاں سے وہ یہاں آیا تھا۔ اس کے باپ نے بتایا تھا کہ وہاں مکان لکڑی کے نہیں ہوتے تھے، اینٹوں کے ہوتے تھے اور وہاں کسانوں کے مکانوں کے سامنے پانی کی چھوٹی چھوٹی پوکریں یا پشکرینیاں نہیں ہوتی تھیں وہاں کی بکریاں یہاں کی گایوں کے برابر ہوتی تھیں۔ اور گائیں اور بھی بڑی بڑی ہوتی تھیں۔ یہ سب باتیں ماجد نے اپنے باپ سے سنی تھیں لیکن اس گاؤں کو دیکھنے کا اشتیاق اس کے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوتا تھا اسے تو اسی گاؤں سے محبت تھی۔ ہاں کبھی کبھی اسے وہ چہرے یاد آجاتے تھے۔ جو بچپن کے دنوں میں اس کے اردگرد رہتے تھے۔ اس کی ایک ماں تھی ایک بہن تھی بوڑھے سے ایک دادا تھے جو لکڑی ٹیکتے ہوئے گھر میں آیا کرتے تھے۔ اور ایک دادی تھیں جو ہر وقت پتھر کی ایک چوکی پر بیٹھی رہتی تھیں پھر کبھی کبھی اس کے دماغ میں وہ منظر ابھر آتا تھا جسے وہ اپنے دماغ سے نکال پھینکنا چاہتا تھا۔ اور نہیں پھینک سکا تھا اسے یہ دکھا کہ وہ، اور اس کا باپ، اور اس کا چچا ایک بیل گاڑی میں بیٹھے ہوئے بھاگ رہے تھے اور خاکی وردی والے دو غیر آدمی بھی ان کے ساتھ بیٹھے تھے اور پیچھے ان کے گاؤں میں آگ لگی ہوئی تھی، اور اس کا باپ اسے تسلیاں دے رہا تھا کہ آگے اس کی ماں ہے، اور بہن ہے اور دادا دادی سب آگے گئے ہیں۔ اور اس نے یہ سوچنے کی بالکل ضرورت

محسوس نہیں کی تھی کہ ابھی کچھ دیر پہلے تک جو لوگ اس کے ساتھ تھے اب ایک دم لٹنے لگے کیسے چلے گئے ہیں۔ اس نے اپنے باپ کی اس بات پر پورا یقین کر لیا تھا کہ بلوائیوں کی گولیاں اور بھالے ایک دم کچھ لوگوں کو بہت آگے جنت میں پہونچا دیتے ہیں۔ اور ایک طرح سے اسے ان خاکی وردی والے آدمیوں پر بہت غصہ آیا تھا، جو اسے اس سیدھے راستہ سے بچا کر اتنے طویل راستہ پر لیجا رہے تھے۔

اور پھر جب بیل گاڑی، ریل گاڑی، کشتی، اور بس کے ایک طویل سفر کے بعد وہ پہلے ڈھاکہ اور پھر اس گاؤں پریومالا میں پہونچے تھے۔ تب بھی اسے اس جنت میں اپنی ننھی سی بہن، پیاری سی ماں، اور بوڑھے دادی دادا کا چہرہ کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ بلکہ صرف ایک ہفتہ ان کے ساتھ رہ کر اس کا چچا بھی شکندر پور چلا گیا تھا۔ کیونکہ شکندر پور اس علاقہ کی بڑی منڈی تھی، اور وہاں پرچون کی آڑھت قائم کرنے میں کافی نفع کی امید تھی۔ یہ پریومالا کی آبادی بہت تھوڑی اور غریب تھی۔ یہاں والے صبح کو باسی چاولوں کی پیچ پیکر گذارا کر لیتے تھے اور اپنی ہی پشکرنیوں سے مچھلیاں پکڑ کر کھا لیتے تھے۔ دو دکانوں سے وہ نمک اور ناریل کا تیل بھی کبھی اتفاق سے ہی خریدتے تھے۔ لیکن ان میں ایک خلوص اور پیار موجود تھا کہ ماجد کا باپ اپنے بھائی کے بہت کچھ کہنے سننے پر بھی اس کے ساتھ شکندر پور جانے پر راضی نہیں ہوا تھا۔ اور یہیں قریب کے جوٹ کے مل میں منشی کی حیثیت سے ملازم ہو گیا تھا۔ یہاں والوں کے پیار اور محبت نے ماجد کے دل سے اپنی ماں بہن اور دادا کی یاد بھی بھلا ڈالی تھی۔

صبح سویرے وہ، رحمان اور فضل حوالدار اور اوسر گنگولی کے بچے اسکول جاتا تھا۔ اسکول جانے کے لئے انہیں پہلے کشتی سے برک ندی پار کرنا پڑتی تھی۔ پھر لوکل بورڈ کی سڑک مل جاتی تھی۔ اسی سڑک پر ان کا اسکول تھا۔ اسکول سے تین چار میل اور آگے چلنے کے بعد شکندر پور آ جاتا تھا۔ چھٹی ہونے پر کبھی کبھی ماجد اپنے چچا سے ملنے کیلئے شکندر پور بھی چلا جایا کرتا تھا۔ اس دن اس کا چچا اسے پہنچانے کے لئے خود ہی اس کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ لیکن ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا۔ روزانہ وہ اپنے گاؤں کے ساتھیوں کے ساتھ ہی اسکول سے واپس لوٹتا تھا۔ راستہ میں وہ کبھی کبھی برک ندی کے کنارے رک کر نہاتے تھے۔ مرغی کے باغ میں آم توڑتے تھے، کسی پشکرنی میں گھس کر مچھلیاں پکڑتے تھے پھر گھر پہونچ کر بھی ان کے کھیل تفریح کا یہ سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ رحمان کے یہاں ماجد دن میں کتنی ہی بار جاتا تھا۔ رحمان کی ماں اسے بیحد پیار کرتی تھی اور چودھری بھی اسے پیار کرتا تھا۔

لیکن اب اسے کوئی بھی پیار نہیں کر رہا تھا۔ ابھی دو دن پہلے چودھری نے رحمان کو اس کے قریب کھڑا ہوا دیکھ لیا تھا۔ تو سے مارتا ہوا گھر لے گیا تھا۔ اور اس سے اگلے دن جب اس نے اوسر گنگولی سے بات کرنا چاہی تھی، تو گنگولی اسے دھکا دیکر بھاگ گیا تھا۔ اس اوسر گنگولی کا بڑا بھائی رشی گنگولی ابھی حال ہی میں ایمن سنگھ سے آیا تھا۔ اور گاؤں والوں کو نہ جانے کیا کیا سمجھاتا رہتا تھا۔ گاؤں کی زیادہ تر زمینیں اور تالاب انہی گنگولیوں کی تھیں۔ اس لئے رشی کی باتیں لوگ بڑی توجہ سے سنتے تھے۔ اس سے پہلے کشتی میں بیٹھ کر برک ندی کے پار سے آدمیوں کی کوئی ٹولی آئی تھی اور انہوں نے بھی نہ جانے کیا کیا کچھ کہا تھا۔ ان کے جلسہ میں اتفاق سے ماجد اور اس کا باپ بھی موجود تھا۔ ان آدمیوں میں سے کسی ایک نے کوئی ایسی بات کہہ دی تھی کہ ماجد کا باپ زمین سے اٹھکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اور چیخ کر بولا تھا کہ تم جھوٹ کہتے ہو۔ ہم نے تمہارا کوئی حق نہیں مارا ہے ہم بھی تمہاری طرح غریب ہیں۔ ہم نے تو تم سے وہ زمینیں اور وہ باغ تک نہیں مانگے۔ جو ہم چھوڑ کر آئے تھے۔ میں بھی تمہاری طرح مزدور ہوں۔ اور اگر مل کا منیجر میرا ہم وطن ہے اور کبھی کبھی میرے یہاں آتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تمہارا حق مار کر مجھے کوئی ترقی دے دیگا اور اپنی جگہ مجھے منیجر بنا دے گا۔" اور جواب میں ایک ساتھ لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ اور مولی کے دونوں بیٹے تو اسے مارنے کے لئے بھی بڑھے تھے۔ لیکن چودھری اور حوالدار گھرزون کے آدمی درمیان میں آ گئے تھے اور انہوں نے ماجد کے باپ کو زبردستی کھینچ کر اس کے گھر تک پہنچا دیا تھا۔ ماجد کا باپ آخر وقت تک چلاتا رہا تھا کہ "مجھے یہاں سے نہ لے جاؤ۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ ان ظالموں نے مجھے میرے وطن سے اجاڑ دیا تھا۔ اب یہ یہاں بھی مجھے زندہ دیکھنا نہیں

چاہتے ———" اور ماجد چیخیں مارتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے گیا تھا اشرف حوالدار نے اسے بھی مکان کے اندر کر کے باہر سے کنڈی چڑھا دی تھی، اندر جاکر وہ اپنے باپ سے پٹ گیا تھا اور خوب پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اس کے باپ کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر تھیں۔ اس نے ماجد کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا "بیٹا گھر سے باہر مت نکلنا" اور اس نے باپ کے آنسو دیکھ کر اپنی آنکھیں پونچھ لی تھیں۔ اور ان سے پوچھا تھا "ابا سچ بتایئے۔ کیا انہی لنگولیوں اور مولویوں نے میری امی اور دادا دادی کو مارا تھا"

پھر حالات اور خراب ہو گئے تھے۔ برک ندی کے پار سے آدمیوں کی کئی ٹولیاں اور آئی تھیں۔ انہوں نے جلسے کئے تھے۔ ماجد اور اس کا باپ اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے ان کی تقریریں سنتے تھے۔ یہ لوگ عجیب عجیب نعرے لگاتے تھے جن کا مطلب ماجد کی سمجھ میں بالکل نہیں آتا تھا۔ یہ لوگ کبھی نمک کا ذکر کرتے تھے۔ کبھی کپڑے اور چاولوں کا ذکر کرتے تھے اور پھر اردو بھاشا کے خلاف نعرے لگاتے تھے۔ ماجد کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ نمک اور چاولوں کا اس کی اور اس کے باپ کی ذات سے کیا تعلق ہے اس نے یہ بات اپنے باپ سے بھی پوچھی تھی لیکن اس کے باپ کو بھی کوئی خاص وجہ معلوم نہیں تھی، یا معلوم تھی تو اسے بتانے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ وہ صرف اتنا کہہ دیتا تھا۔ "کچھ نہیں بیٹا۔ انہیں کچھ پتہ نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہمیں نمک اور چاول کسی جگہ سے سستے مل جاتے ہیں۔ اسی لئے انہیں ہمارے اوپر غصہ آجاتا ہے"

آخر آج وہ دن آپہنچا تھا۔ جب وہ اور اس کا باپ ہمیشہ کے لئے اس گاؤں کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اس کے باپ نے آج بھی اسے گھر سے نکلنے سے منع کر رکھا تھا لیکن وہ ظہر کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہو گیا تھا اور وہ چپکے سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ رحمان کو بتانا چاہتا تھا کہ اب صرف شکندر پور سے اس کے چچا کی آنے کی دیر رہ گئی ہے۔ اس کے بعد وہ ڈھاکہ چلے جائیں گے اور وہ دونوں زندگی میں شاید پھر ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔

رخسار پر ایک زوردار طمانچہ کھا کر اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور اس نے دیکھا کہ اس کا چچا سامنے کھڑا ہے اور نامعلوم خوف کی وجہ سے یا غصہ سے تھر تھر کانپ رہا ہے۔

"کب سے یہاں بیٹھے ہو۔ ؟" چچا نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا

"آج بھی کھیل سے فرصت نہیں ہے"

چچا نے آج سے پہلے کبھی اسے زبان سے ڈانٹا بھی نہیں تھا۔ ماجد کو ایسا محسوس ہوا جیسے دنیا میں اب اس کا کوئی اپنا باقی نہیں رہا ہو وہ وہیں زمین پر مچل گیا۔ اور چیخ چیخ کر رونے لگا "میں نہیں جاؤں گا.... میں نہیں جاؤں گا ——— ابا سے کہہ دیجئے"

چچا نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی کے ساتھ نیچے جھک کر اس نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور لشکر ہی کے پانی میں اتر گیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس نے ماجد کی چپل بھی اٹھا لی۔ گھر کی طرف چلتے ہوئے اسے برک ندی کے پار سے آتا ہوا آدمیوں کا ایک غول نظر آیا اور اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ ماجد اور زیادہ زور زور سے اس کی گود میں مچلنے لگا

"میں نہیں جاؤں گا" دروازہ میں داخل ہوتے وقت آخری بار چیخ کر اس نے کہا "ابا سے کہہ دیجئے"

اس کے ابا نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے "رونہیں بیٹا" انہوں نے ہمیں بلایا تو ہم پھر آجائیں گے"

"میں نہیں جاؤں گا ———" اس نے ایک ہچکی لے کر کہا اور ایک بستر پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ یہ بستر اور اس کے قریب پڑے ہوئے دوسرے بنڈل، سب اس کے چچا کے تھے۔

تھوڑی دیر تک اس کے باپ اور چچا میں کچھ سرگوشی ہوتی رہی پھر اس کا چچا دروازہ تک گیا اور اس کی جھری سے باہر کی طرف جھانکنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے ماجد کے باپ کو بھی اشارہ سے وہیں بلا لیا ایک منٹ تک دونوں وہیں کھڑے رہے اور جھانکتے رہے پھر ایک ساتھ بھاگ کر اندر آگئے۔ ماجد کے باپ نے چارپائی کے نیچے سے دو چھوٹے چھوٹے بانس کھینچے اور بندھے ہوئے سامان کے قریب رکھ دیئے۔ دروازہ پر دستک ہوئی اور کسی نے آواز دے کر کہا۔

"شیخ جی"

ماجد کا باپ اپنی جگہ بیٹھا ہوا زمین کو گھورتا رہا اور چچا نے بانس کے ایک سرے پر اپنا سیدھا ہاتھ رکھ لیا۔ ماجد سہم کر اپنے باپ کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

"دروازہ کھولو۔ شیخ جی۔ میں ہوں چودھری"

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ماجد کا
چچا آہستہ سے بولا " یہ نئے آدمی ان لوگوں کے ساتھ کون آ رہے تھے ؟ "
" کہیں باہر سے آئے ہیں " ماجد کے باپ نے بھی اتنی ہی
آہستہ آواز میں کہا۔
" یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں "
" نہیں ہیں "
" دروازہ کھول دوں ! " چچا نے پوچھا۔
ماجد کے باپ نے اسے روکا اور خود دروازہ کی طرف بڑھ گیا
" کون ہے ؟ " اس نے اس طرح کہا گویا ابھی ابھی اس نے دروازہ کی دستک
سنی ہے۔
" میں ہوں چودھری "
ماجد کے باپ نے دروازہ کھول دیا۔ اور باہر چلا گیا۔ کچھ دیر تک
خاموشی رہی۔ صرف کبھی کبھار کسی کے زور سے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔
ماجد اور اس کا چچا ایک دوسرے کی طرف سے منہ موڑے بیٹھے تھے لیکن
دونوں کے کان دروازہ کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ اور دونوں کے دماغ
میں ایک ہی خیال بسا ہوا تھا۔ باہر کتنے آدمی ہیں ؟ کیا چاہتے ہیں ؟
کچھ دیر بعد ماجد اپنی جگہ سے اٹھا اور دبے قدموں دروازہ کی
طرف چلنے لگا۔
" مت جاؤ " اس کے چچا نے اسے ڈانٹا۔
ماجد رک گیا۔ اور عین اس وقت دروازہ کھل گیا۔ ماجد کا باپ
تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر آیا۔ وہ انتہائی عجلت میں تھا۔ آتے ہی اس
نے کہا " میری ٹوپی کہاں ہے، ماجد ؟ "
" ٹوپی !؟ " ماجد کے چچا نے پوچھا۔ اس کے لہجہ میں حیرت کم
تھی اور اضطراب زیادہ تھا۔ بانس کے سرے پر اس کے ہاتھ کی گرفت
خود بخود مضبوط ہو گئی تھی۔
" ٹوپی " ماجد کے باپ نے اپنے بھائی اور بیٹے کی طرف کوئی دھیان
دیئے بغیر کہا " مسجد میں جلسہ ہو رہا ہے "
" اور آپ جا رہے ہیں ؟ " بھائی نے پوچھا۔
" ہاں "

ماجد کے چچا کو کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ بانس کے سرے پر
اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ ماجد دوڑ کر اپنے باپ کے پیروں سے لپٹ
گیا " میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔ وہ آپ کو بھی امی کی طرح مار
ڈالیں گے۔ میں سچ کہتا ہوں ابا آپ نہ جائیے۔ میں مذاق نہیں کرتا
سچ کہتا ہوں "
" وہ نہیں بیٹا۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ خود مجھے بلانے
آئے تھے "
" مگر سوچئے تو سہی ...... " ماجد کے چچا نے کچھ کہنے کی کوشش کی
" میں نہیں جانے دوں گا ...... نہیں ...... نہیں ...... "
ماجد چلایا " وہ آپ کو بھی مار ڈالیں گے "
" مسجد میں کوئی کسی کو نہیں مارے گا بیٹا " اس کے باپ نے کہا۔
اور اس کی پیٹھ تھپکنے لگا اس کے اپنے چہرہ پر مسکراہٹ تھی۔
" آپ ان پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرتے ہیں " ماجد کے
چچا نے کہا لیکن اس کے لہجہ میں اب اضطراب نہیں تھا۔
" تم جانتے نہیں " ماجد کے باپ نے سمجھایا " وہ اجنبی جو ان کے
ساتھ تھے نا۔ شکندرپور میں آج انہی کی تقریر تھی۔ چودھری صاحب
کہتے ہیں کہ ان کی تقریر میں بلا کا جادو ہے۔ شکندرپور میں انہوں نے
لوگوں کو کلمۂ طیبہ کا مطلب سمجھایا تھا۔ اب وہ یہاں کی مسجد میں ملت
اور مساوات پر تقریر کریں گے۔ کیا تمہارے خیال سے میں اس ملت
میں شامل نہیں ہوں۔ نمک اور چاول کی ضرورت لوگوں کے دلوں پر
ہمیشہ کے لئے مہر تو نہیں لگا سکتی نا۔ آؤ باہر چل کر دیکھو کتنے لوگ
ان مخلص اجنبیوں کو گھیرے کھڑے ہیں "
ماجد کا باپ باہر چلا گیا۔ چچا کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے
کھلے ہوئے دروازہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ماجد کی طرف گھوم کر بولا " بیٹے
میں نے بہت زور سے تمہارے طمانچہ مار دیا تھا "
" نہیں " ماجد نے آہستہ سے کہا اور چچا کے بالکل نزدیک
آ کر بیٹھ گیا۔
کافی دیر تک دونوں اس طرح بیٹھے رہے پھر اس کا چچا اٹھ کر
دروازہ تک گیا اور باہر کی طرف جھانکنے لگا۔ ماجد بھی اس کے قریب۔

اگر کھڑا ہوگیا باہر سڑک پر ریشم گنگول کے علاوہ اور کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ گنگولی اپنا چہرہ لٹکائے کھڑا تھا۔ اور مسجد کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مسجد کے علاوہ اور کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ مسجد میں کوئی شخص بول رہا تھا۔

پھر سورج زرد ہوگیا۔ اور مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی۔ ماجد کے چچا نے اس سے پوچھا۔ "اگر تمہیں اکیلے ڈر نہ لگے تو میں بھی نماز مسجد ہی میں جاکر پڑھ لوں۔"

ماجد نے اجازت دیدی۔ اسے واقعی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔

مغرب کی نماز کے بعد بھی اس کے باپ اور چچا مسجد سے واپس نہیں ہوئے، کسی کے تقریر کرنے کی آواز اب پھر آنے لگی تھی۔

اندھیرا ہوتے ہی چوتھی یا پانچویں شب کا چاند آسمان پر نکل آیا ماجد کے مکان کے اندر ہلکی ہلکی چاندنی پھیل گئی۔ اور تب اچانک اسے بہت سے آدمیوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ بھاگتا ہوا وہ پھر دروازہ میں گیا۔ سب لوگ آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوتے مسجد کی طرف سے چلے آرہے تھے۔ اس کا باپ، چچا، گاؤں کے تمام آدمی، اور دو تین ایسے آدمی جن کی شکلیں اس سے پہلے ماجد نے کبھی نہیں دیکھی تھیں ماجد کے مکان تک پہونچنے سے پہلے ہی لوگ ایک دوسرے سے مصافحہ کرکے رخصت ہونے لگے۔ ماجد کے باپ اور چچا نے بھی ان اجنبی لوگوں سے ہاتھ ملائے اور اپنے گھر میں آگئے۔ اندر آتے ہی ماجد کے باپ نے اس کے ماتھے پر پیار کیا اور کہا۔ "اب ہم کہیں نہیں جا رہے ہیں۔"

ماجد ان کے ہاتھ سے اپنے آپ کو چھڑا کر ایک دم دروازہ کی طرف بھاگا۔ اور شکر ہی کو پار کرتا ہوا۔ چودھری کے مکان کے سامنے پہونچ گیا۔ مکان کے کواڑ بھڑے ہوتے تھے اور اندر سے رحمان کا وہی پرانا گیت بلند ہو رہا تھا

اکھوئی اٹھے چھپے چان	چاند ابھی ابھرا ہے
آدھوا کو آدھو چھپائے	آدھا اجالا ہے اور آدھا اندھیرا
کا چھے اشے پر لو	میرے نزدیک آؤ
ہاتھو کھانی اکھو ہاتے	اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھدو

"میں آرہا ہوں رحمان" ماجد نے چیخ کر کہا۔ "تم میری گود میں آؤ" چودھری نے اس کے عقب سے کہا اور اسے اپنی گود میں اٹھا لیا۔

(بشکریہ "چراغ راہ")

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری مارچ ۱۹۷۰ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ برائے مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں۔ یا پھر خط کے ذریعے اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی۔ پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

منتظر کرم :- منیجر "مشیر" کراچی

۲۱۲۳ جناب محمد اختر صاحب۔ کوہاٹ
۲۱۲۸ میسرز مرزا سوڈا واٹر فیکٹری، راولپنڈی
۲۱۳۰ جناب ظہور الدین صاحب۔ کراچی
۲۲۹۷ جناب محمد بشیر خاں صاحب ذوق، گلگت
۲۳۰۲ جناب ایم عبدالغنی صاحب، ڈیرہ غازی خاں
۲۳۱۷ محترمہ ثروت سلطانہ صاحبہ وحیدی کراچی ۵
۲۳۲۰ جناب غلام مصطفےٰ صاحب۔ سرگودھا
۲۳۲۳ سکریٹری صاحب۔ لٹریری سیکشن۔ جی۔ ایم ہوسٹل۔ ڈھاکہ
۲۳۲۴ ناظم صاحب۔ دارالمطالعہ جماعت اسلامی۔ سیالکوٹ
۲۴۸۱ عبید الرحمٰن صاحب۔ فرخ آباد
۲۴۸۵ جناب حسام الدین صاحب کوثر دروش (چترال)
۲۴۸۶ محترمہ بیگم ف۔ م۔ حاشر صاحب کھیتا سرائے
۲۴۹۰ جناب نقی علی صاحب۔ لاہور

دو غزلیں!

عرشی بھوپالی ●

سرفراز اب کے بہت عشق میں اے یار ہوئے
جاں پہ کھیلے کبھی رسوا سرِ بازار ہوئے

دوست بیگانے بنے، اقربا اغیار ہوئے
ہم محبت کی قسم کھا کے گنہگار ہوئے

تجھ میں اے دوست کوئی بات تو دیکھی ہوگی
بے سبب تو نہ ترے لوگ پرستار ہوئے

طعن کرتے ہو مری آہ سحرگاہی پر
کتنے آتش کدے اس آہ سے گلزار ہوئے

ہم بھی کچھ، سہل نہ سمجھے تھے وفا کی منزل
امتحاں ان کی محبت کے سرِ دار ہوئے

باخبر کون نہیں ہم ہیں وہ آشفتہ مزاج
جان دے کر بھی صلے کے نہ طلبگار ہوئے

کیا ملا تم کو سبکساریِ ساحل کے سوا
ہم تو اک جست میں گرداب کے اس پار ہوئے

پھر وہی دشت نوردی وہی منزل کا جبال
پھر سے پیدا، مرے تلووں میں نئے خار ہوئے

نعیم صدیقی ●

میٹھی میٹھی سی یہ سینے میں جلن کیا کہنا!
اک پُر اسرار سے کانٹے کی چبھن! کیا کہنا!

نت نئے رنگ سے باندھا ہے ہنرمندوں نے
عشق کا ایک ہی مضمون کہن! کیا کہنا!

کس عجب وادیٔ پرخار میں ہے اپنا گذر
ایک اک کانٹے کے دامن میں چمن! کیا کہنا

مرے ماحول کو ایمان کھٹکتا ہے مرا
جیسے ظلمات میں بےتاب کرن! کیا کہنا

عشق والوں کا وطن گرچہ ہے سارا آفاق
پھر بھی گویا کہ نہیں کوئی وطن! کیا کہنا!

حسن وہ حسن کہ ایمان شکن تھا کل تک
اس کا نظارہ ہوا کفر شکن! کیا کہنا!

شیخ کے لب پہ ہیں توحید کے اسرارِ دقیق
دل میں بتخانے کی مخفی سی لگن! کیا کہنا!

تیری آمد ہے خیالوں کے لئے فصلِ بہار
لد گئی پھولوں سے پھر شاخ سخن! کیا کہنا!

(بشکریہ "چراغ راہ")

شوکت تھانوی

تا بکے

ڈاکٹر کیا معنی میں تو مویشیوں کا ڈاکٹر بھی نہیں ہوں۔ مگر مطب کر رہا ہوں اور ہر وقت سولی پر جان ہے کہ خدا جانے کب میری ڈاکٹری کا بھانڈا پھوٹ جائے اور پولیس کو خود میری نبض ٹٹول کر اس تشخیص پر پہنچنا پڑے کہ یہ شخص شفاخانے سے زیادہ جیل خانے کیلئے موزوں ہے مگر میرے متعلق کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ذرا میری رام کہانی سُن لیجئے اور خدارا مجھ کو بتائیے کہ اس میں میرا کیا قصور ہے۔

صاحب میں ایک خانہ بدوش سا انسان ہوں جس کا دنیا میں کوئی نہیں وہ چند چیزیں جنکو میں اپنا کہہ سکتا تھا وہ بھی میری نہ رہیں ایک بستر تھا جس میں ایک کمبل تھا۔ ایک تکیہ۔ ایک دری۔ اور ایک چادر تھی۔ ایک نہایت مکروہ صورت کا روغن اترا ہوا بکس تھا جس میں چند کپڑے تھے اور ان ہی کپڑوں کی تہہ میں میری ساری پونجی ساٹھ روپے بھی تھی تاکہ نوکری ڈھونڈنے میں جو وقت لگے۔ اس میں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے اور اپنے اس مختصر سے سامان کے ساتھ میں سفر کر رہا تھا اس لئے کہ سفر کو ظفر کا وسیلہ کہا جاتا ہے جس چھوٹے سے اسٹیشن پر مجھکو اترنا تھا اس سے ایک ہی اسٹیشن پہلے جب میری آنکھ کھلی تو میرا یہ سامان بھی غائب ہو چکا تھا۔ کاش میں بیٹھے بیٹھے ٹیک لگا کر سونے کے بجائے بستر بچھا کر ہی سویا کرتا۔ تاکہ یہ بستر تو بچ جاتا۔ مگر لعنت بھیجئے بستر پر۔ بستر سے زیادہ ضروری تو وہ بکس تھا جس میں ساٹھ روپے بھی تھے اور اب میں پائی پائی کا محتاج بیک بینی... دو گوش رہ گیا تھا۔

دماغ چکرا رہا تھا عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ اس پردیس میں اب میرا کیا حشر ہوگا ایک وقت کی روٹی کا بھی سہارا نہ تھا۔ کوئی جان پہچان کا بھی نہ تھا۔ اور کسی کے آگے دست سوال دراز کرنے کی نہ ہمت تھی نہ ہمت تھی نہ ہے نہ ہوگی۔ بہرکیف وہ اسٹیشن جس پر مجھ کو اترنا تھا نہایت تیزی سے قریب...

آ رہا تھا۔ اور اسی رفتار سے میری بدحواسی بڑھ رہی تھی کہ یکایک میری نظر ایک ہینڈ بیگ پر جم کر رہ گئی۔ اس میں کچھ تو نکل ہی آئے گا چوری تو ہے مگر اپنا سامان بھی تو چوری ہو گیا ہے۔ فرض کیجئے کہ ضمیر کا کہنا مان لیا جائے اور نہ اٹھائیں یہ ہینڈ بیگ تو کیا ہوگا۔ کیا بھیک مانگیں گے ہم پردیس میں اور بھیک مانگنا بھی کون سا بچوں کا کھیل ہے یہ تو بجائے خود بہت بڑا فن ہے۔ دوسروں کی جیب سے پیسہ نکلوالینا آسان بات تو نہیں۔

میں انہی خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور میں اپنی جگہ سے اٹھکر باہر جانے کے لئے آگے بڑھا۔ ہاتھ اس ہینڈ بیگ کی طرف اٹھا اور پھر واپس آ گیا۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکلا مگر پھر لوٹ آیا۔ مسافروں کو دیکھا جو اپنا سامان چوری کرانے کے لئے غافل پڑے سو رہے تھے۔ انجن نے سیٹی دی۔ گارڈ نے سیٹی بجائی اور اب وہ ہینڈ بیگ میرے ہاتھ میں تھا۔ اور میں اس سنسان اسٹیشن کے ویران پلیٹ فارم پر ہینڈ بیگ لئے ویٹنگ روم کی طرف جا رہا تھا۔ تاکہ صبح ہونے تک وہیں ٹھہروں۔ تھوڑی ہی دیر میں میرا معصوم دل میری مصلحت کو سمجھکر قائل ہو چکا تھا۔ کہ یہ جرم ہی سہی۔ مگر ایک ہی صورت تھی اپنے کو دوسرے اخلاقی اور غیر اخلاقی جرائم سے بچانے کی مگر آپ جانیں چور کا دل ہی کتنا۔ اور چور بھی وہ جس نے اس میدان میں آج پہلا ہی قدم رکھا ہو یقین جانیئے ویٹنگ روم میں پہنچکر اس بیگ کو ایک دوسری بنچ پر رکھا۔ اور خود ایک دوسری بنچ پر بیٹھے۔ تاکہ وہ اپنے سے غیر متعلق نظر آئے۔ بہت دیر تک اس کو دور ہی سے دیکھتے رہے پھر ویٹنگ روم سے باہر نکل کر چاروں طرف دیکھا۔ تاریکی اور سناٹا۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس ہینڈ بیگ کے قریب آئے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کو کھولا۔ پھر دروازے کی طرف

دیکھا۔ مزید اطمینان کے لئے ایک بار پھر باہر نکل گئے۔ اور پھر واپس آکر اس ہینڈ بیگ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ پہلی چیز جو نکلی وہ ایک تارپیچ تھا۔ پھر نکلا مریض کا سینہ دیکھنے والا آلہ اسٹیتھو اسکوپ پھر نکلا ایک چمکتا ہوا ڈبہ۔ جس میں انجکشن دینے کی پچکاری تھی۔ ایک چھوٹا سا اسپرٹ کا چولہا نکلا۔ پھر دواؤں کی بے شمار چھوٹی بڑی شیشیاں اور چھوٹے بڑے ڈبے نکلے۔ ایک تولیہ نکلا تھرمامیٹر نکلا۔ ایک ڈبے میں چمچماتے ہوئے چھوٹے بڑے چاقو۔ نشتر اور قینچیاں اور چمٹے چمٹیاں نکلیں۔ اور ابھی یہ سامان بنچ پر پھیلا ہوا تھا کہ دھڑ سے دروازہ کھلا اور ایک صاحب نہایت حواس باختہ کمرے میں داخل ہو کر ایک کرسی پر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ جیسے بجلی کا کرنٹ لگ جائے ایک دم اچھل کر میرے قریب آگئے۔

"کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟"

ظاہر ہے کہ یہ موقع صرف ہاں کہنے کا تھا یعنی اس سوال کا... مطلب ہی یہ تھا کہ یا تو آپ ڈاکٹر ہیں ورنہ چہ۔ لہٰذا جس بدحواسی کے ساتھ یہ سوال کیا گیا تھا اسی بدحواسی کے ساتھ عرض کیا۔

"جی ہاں"

اور یہ سنتے ہی وہ حضرت آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر عجیب مجذوبانہ انداز سے بولے۔

"واہ ری تیری شان۔ واقعی تو بڑا کارساز ہے۔ تو بڑا کارساز ہے میرے مولا! تو مسبب الاسباب ہے"

اور پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کو خدا نے رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا ہے میں اسٹیشن آیا تھا کہ ادھر یا اُدھر جدھر جا رہے والی بھی کوئی گاڑی مل جائے گی میں جاؤں گا اور جہاں سے بھی ہو سکے گا ڈاکٹر لا کر اپنی بچی کو دکھاؤں گا جو میری زندگی کا آخری سہارا ہے۔ ڈاکٹر صاحب خدا کے لئے اب دیر نہ کیجئے"

اور قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں ان حضرت نے تمام سامان ہینڈ بیگ میں رکھ کر خود مجھ کو بھی اسی ہینڈ بیگ میں رکھنے کی کوشش کی، اور ایک ہاتھ میں ہینڈ بیگ پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے میرا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے اسٹیشن سے باہر آگئے اور ایک تانگے پر بٹھا کر مجھے لے چلے وہ نہ جانے کہاں کہاں کیسے چلے جا رہے تھے، اور میں صرف اس بات پر غور کر رہا تھا کہ الٰہی ہونے والا کیا ہے؟ دیکھئے قسمت آخر کیا گل کھلانے والی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کب اور کہاں وہ تانگہ رکا۔ بس اتنا ہوش ہے کہ وہ حضرت مجھے تانگے سے اتار کر ایک مکان میں گھسیٹ لے گئے اور تھوڑی ہی دیر میں ایک مریضہ کے قریب میں نے اپنے کو بیٹھا پایا جس کا زرد رنگ چراغ کی دھیمی روشنی میں کچھ اور بھی زرد نظر آرہا تھا وہ اٹھارہ انیس سال کی ایک لڑکی تھی، اور بخار کی شدت میں تقریباً بیہوش۔ میں نے اس کی نبض دیکھی اور اپنے کو کچھ زیادہ ہی ڈاکٹر ثابت کرنے کے لئے ہاتھوں کے علاوہ پیروں کی نبض بھی دیکھ ڈالی، اور اس طبی معائنہ کے بعد ان حضرت سے جو مجھ کو لائے تھے میں نے کہا۔

"آپ بالکل اطمینان رکھئے۔ میں علاج شروع کرتا ہوں..... انشاءاللہ بہت جلد مریضہ کی حالت بہتر ہو جائے گی"

مریضہ کی حالت بہتر ہو گی یا نہ ہو گی اس کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔ البتہ خود میری حالت بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ مگر اب تو پھنس ہی گئے تھے۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا لہٰذا ہینڈ بیگ کھول کر مختلف دوائیں ٹٹولیں۔ ایک چھوٹی شیشی پسند آئی۔ مگر نہ جانے وہ پینے کی دوا تھی یا انجکشن کی۔ اور خطرہ یہ بھی تھا کہ اگر پینے کی دوا کا انجکشن دیدیا یا انجکشن کی دوا پلا دی تو کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ لہٰذا صرف یہ کیا کہ اس دوا کے تین چار قطرے مریضہ کی پیشانی پر چھڑک کر مالش شروع کر دی پھر ایک اور شیشی کی تھوڑی سی دوا رومال پر چھڑک کر وہ رومال مریضہ کی ناک سے لگا دیا۔ عین اسی وقت خیال آیا کہ اس قسم کے بخار میں گھر کی بڑی بوڑھیاں تلوؤں پر نمک اور لسوڑے کے پتوں سے جھاڑا کرتی ہیں۔ لہٰذا مریضہ کے والد سے کہا کہ آپ کہیں سے لسوڑے کے پتے منگا لیجئے۔

چنانچہ وہ تو گئے لسوڑے کے پتے لینے، اور میں نے بہت ہی عجز اور خلوص کے ساتھ دعائیں کرنا شروع کر دیں۔ مریضہ کے حق میں نہیں خود اپنے حق میں کہ الٰہ العالمین تو ہی عزت رکھنے والا ہے۔ تو ہی آزمائشوں سے نکالنے والا ہے تو ہی اس شدید امتحان سے سرخروئی کے ساتھ مجھ کو نکال لے۔ میرا ایمان ہے کہ دعا اگر واقعی دل سے کی جائے

تو ضرور قبول ہوتی ہے۔ چنانچہ ابھی دعا ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ مریضہ نے نہایت نحیف آواز میں کہا۔

"ابا جان !"

اور میں نے ایک دم چونک کر جو مریضہ کو دیکھا ہے تو وہ پسینے میں شرابور مگر ہوشیار پڑی ہوئی مجھکو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ان سے کہا

"آپ کے ابا جان ابھی آتے ہیں"

اس نے اسی کمزور آواز میں کہا۔

"مگر آپ کون ——— ؟"

میں نے گھبرا کے کہا "میں عبد القدیر یعنی . گویا میں ڈاکٹر ہوں۔"

اور اسی وقت مریضہ کے والد سوڑے کے پتے لئے ہوئے تشریف لائے، وہ مریضہ کو بیدار اور ہوشیار دیکھکر تقریباً چیخ اٹھنے کے انداز میں بولے

"زرینہ! بیٹی . تو ہوشیار ہوگئی . خدا جزائے خیر دے ڈاکٹر صاحب کو . واقعی ڈاکٹر ہو تو ایسا۔ ان کو خدا نے رحمت کا فرشتہ بنا کر تیرے لئے بھیجا تھا "

میں نے کہا " اب آپ ان کو گرم دودھ فوراً پلائیے . اور ایک کمبل ان پر ڈال دیجئے۔ تاکہ پسینہ اچھی طرح نکل آئے اور ان سے زیادہ بات نہ کیجئے "

مریضہ کے والد نے میری ہدایات پر پورا عمل کرنے کے بعد مجھ کو ایک دوسرے کمرے میں پہنچا دیا کہ آپ یہاں آرام فرمائیں . چنانچہ میں ان کے واپس جانے کے بعد سجدۂ شکر میں گر پڑا . کہ میرے مولا ! تو نے میری دعا سن لی اور اس سخت امتحان میں مجھکو سرخروئی عطا فرمائی اور جب میں آرام دہ بستر پر پہنچا تو واقعی ایسا گھوڑے بیچکر سویا کہ صبح جب مریضہ کے والد نے مجھے بیدار کیا ہی میں اسی کروٹ سے سو رہا تھا جس کروٹ سے لیٹا تھا۔ آنکھ جو کھلی سامنے ہی میز پر نہایت پر تکلف ناشتہ موجود تھا اور مریضہ کے والد خاطر مدارات کی انتہا کئے دیتے تھے

میں نے آنکھیں مل کر بیٹھتے ہی پوچھا۔

"کہئے کیا حال ہے صاحبزادی کا ؟"

وہ صاحب ہاتھ جوڑ کر بولے :۔

"ڈاکٹر صاحب ! کس زبان سے شکریہ ادا کروں . آپکی مسیحائی نے مردے کو زندہ کر دیا ہے۔ چودہ دن سے جو بخار ایک منٹ کے لئے نہ اترا ہو۔ وہ اب بالکل نہیں ہے۔ وہ بشاش ہے . اس کے چہرے پر صحت کے آثار ہیں . آپ ناشتہ فرما لیجئے پھر چل کر دیکھ لیجئے گا "

میں نے ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کیا۔ اور جا کر مریضہ کو دیکھا تو وہ واقعی مجھکو دیکھکر مسکرا رہی تھی . صرف اس کے والد محترم ہی نہیں بلکہ وہ خود بھی میری مسیحائی کی قائل نظر آرہی تھی۔ کچھ بڑی بوڑھیاں جو آس پاس بیٹھی تھیں وہ بھی مجھکو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھ رہی تھیں گو عقیدت تھی کہ ہر طرف سے ابلی پڑتی تھی۔ میں نے مریضہ کو دیکھا نبض دیکھنا تو جانتا نہ تھا . مگر غالباً بخار واقعی اتر چکا تھا . لہٰذا میں نے مریضہ کے لئے کچھ غذائیں ڈرتے ڈرتے تجویز کیں۔ مثلاً نارنگی کا عرق مرغ کا شوربہ - دودھ وغیرہ۔

اور پھر واپسی کی جو اجازت چاہی تو مریضہ کے والد جن کا نام خیر الدین صاحب تھا . مچل گئے . کہ ابھی آپ کیسے جا سکتے ہیں۔ ایک آدھ دن تو ہم کو بھی مہمان نوازی کی سعادت بخشئے۔

مگر یہاں یہ فکر تھی کہ اگر یہ لڑکی پھر بیمار ہوگئی تو کیا ہوگا مگر راہ فرار نظر نہ آرہی تھی . نتیجہ یہ کہ ٹھہرنا پڑا . اور وہ بھی اس طرح کہ ساری بستی میں ہلڑ سا مچ گیا کہ عیسیٰ دوراں قسمت سے ادھر آنکلا ہے . لہٰذا ؏

اٹھو ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی

چنانچہ لوگ دوڑے کہ زمانہ چال قیامت کی چل گیا ہے اور مریضوں سے میں اس طرح گھرا کہ چاروں طرف خود اپنی موت نظر آنے لگی . کہ اب مارے گئے بے موت ۔

کسی مریض کی ناک پر نبض دیکھکر کسی شیشی کا عرق تلوے میں لگا دیا . کسی کا پیر خراب تھا . لہٰذا ہاتھ پر ایک دوا مل کر پٹی باندھ دی کسی کی آنکھ خراب تھی لہٰذا کان میں ایک دوا ڈال دی . کسی کے مسوڑھے ناقص تھے . لہٰذا اس کو سر منڈانے کا مشورہ دے دیا . مگر اب اس کا کیا علاج کہ ان مریضوں نے بھی اچھا ہونا شروع کر دیا . اور اب آس پاس کی بستیوں سے بھی مریضوں کا سیلاب آنا شروع ہوگیا صبح سے شام تک فرصت ہی نہ ملتی تھی۔

ادھر میرے میزبان کا یہ اصرار کہ ڈاکٹر صاحب آپ مستقل طور

یہیں رہ جائیے۔ میرا مکان حاضر ہے۔ مطلب کھو لئے میں میں خود حاضر ہوں خدمت کے لئے روپے پیسے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ تو برس ہی رہا تھا۔ لہٰذا میں اب مستقل طور پر اسی بستی کا سول سرجن بنا بیٹھا ہوں تمام بستی میں میری ہی دھوم ہے اور یہ شہرت اکی کہ خیرالدین صاحب زرینہ کی شادی بھی ڈاکٹر صاحب ہی سے کر رہے ہیں مگر میں ہر وقت یہی سوچتا رہتا ہوں کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

(بشکریہ "بیسویں صدی")

بقیہ اداریہ صفحہ ۵ سے آگے۔

کم سے کم آمدنی جس پر ٹیکس نہیں لگتا اس کا نصاب بڑھایا جائے۔ زکوٰۃ اور خیرات کی رقوم کو اخراجات میں شمار کیا جائے اور زیادہ عیالدار آدمیوں کو ذاتی اخراجات کے معاملہ میں زیادہ الاؤنس دیا جائے۔ ظاہری حساب کے لحاظ سے تو اس طرح حکومت کی آمدنی کم ہو جانے کا اندیشہ ہے لیکن اگر لوگ ایمانداری کے ساتھ ٹیکس ادا کرنے لگیں تو ان رعایتوں کے باوجود آمدنی زیادہ ہونے کی امید ہے۔

۳۔ حکومت کی اس اپیل کو موثر بنانے کے لئے ریڈیو، پریس اور پلیٹ فارم سے اخلاقی تبلیغ کی ایک مہم شروع کی جائے اور لوگوں میں راستبازی کی حس بیدار کرنے کے لئے پیہم سعی کی جاتی رہے۔

۴۔ ہر جگہ کاروباری طبقوں کی مقامی انجمنیں منظم کی جائیں جو اس بات کا ذمہ لیں کہ اپنے پیشے کے لوگوں کو صداقت و دیانت پر آمادہ کریں گی اور غلط روش اختیار کرنے والوں پر اخلاقی دباؤ ڈالیں گی۔

۵۔ انکم ٹیکس کے حکام کو ہدایات دی جائیں کہ وہ ہر شخص کو جھوٹا فرض کر کے اندھا دھند ٹیکس نہ لگائیں۔ بلکہ ایسے لوگوں کی ہمت افزائی کے لئے ہر ممکن کوشش کریں جن کی صداقت پر شبہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ ہو۔

اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے شعبہائے زندگی میں حکومت کس طرح اصلاح کا آغاز کر سکتی ہے اور اس میں پبلک کا تعاون کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(بشکریہ "ترجمان القرآن")

انور صدیقی •

شہرِ حبیب

اجنبی شہر کی بے رنگ فضائیں اکثر
اک جہنم مرے سینے میں جگا دیتی ہیں
میری پلکوں پہ لرز اٹھتے ہیں جلتے آنسو
راستے پاؤں کی زنجیر سے بن جاتے ہیں
کتنے طوفاں مری باہوں کو جکڑ لیتے ہیں
میرے انفاس کی لَو اور بھی بڑھ جاتی ہے
میری لَے ٹوٹ کے گر جاتی ہے
تلخیٔ دہر بہر گام نظر آتی ہے
تلخیٔ دہر جگا دیتی ہے ایسی یادیں
جن کے آئینے میں ہے عکس فگن شہرِ حبیب
نکہت و نور میں ڈوبے ہوئے اس کے در و بام
چاند تاروں کو بھی آئینہ دکھاتی روشیں
شاہراہیں کہ خطِ کاہکشاں ہوں جیسے
جلوہ گاہیں کہ سحر دیکھے تو شرما جائے
پُر فشاں چار طرف نغمۂ جبریل شکار
زندگی موت سے لیتی ہوئی ہر لحظہ خراج
خاکداں سجدہ گہِ مہر و مہ و انجم ہے!!
ابنِ آدم کا بہر گام عروج ———
اس کی پلکوں میں سحر
اس کے اشکوں سے خجل خوشۂ پرویں کی بہار
اس کی سانسوں میں رواں بربطِ زہرا کا خروش

اس کے ماتھے پہ جھلکتا ہوا خورشیدِ مبیں
اس کے دامن سے عیاں جلوۂ صد رنگ بہار
اس کے ہونٹوں پہ لرزتا ہوا افسونِ نیاز
زندگی رقص کناں مثلِ صبا ———
ہر طرف سایہ فگن دامنِ یزداں جیسے
نہ کوئی کنجِ قفس اور نہ کوئی رنج و محن
نہ کوئی گوشۂ زنداں نہ کوئی دار و رسن
نہ کوئی خوفِ عقوبت ہے نہ کوئی تعزیر
ہر طرف صبح ہے، ہر سمت بہاریں تنویر
زندگی مائلِ تسخیرِ قمر رہتی ہے
شہر یہ وہ ہے جہاں آ کے سحر رہتی ہے
اجنبی شہر میں ہوں پھر بھی مرے شہرِ حبیب!
تیری یادیں مجھے سرمایۂ جاں ہیں اب بھی
میرے احساس کی اک جوئے رواں ہیں اب بھی
درمیاں لاکھ سہی صدیوں کا یخ بستہ سکوت
راستے تیرے خطِ کاہکشاں ہیں اب بھی
کون کہتا ہے سیہ رات نے غلبہ پایا ———
بام و محراب ترے نور فشاں ہیں اب بھی
حادثے گذرا کئے پھر بھی ترے نقشِ جمیل
نورِ مہتاب میں گل رنگ و جواں ہیں اب بھی
اجنبی شہر میں ہوں پھر بھی مرے شہرِ حبیب!

مسافرہ۔ لاہور

انقلاب

راحیل نے باپ کے گھر میں قدم رکھا تو وہاں کی بڑھتی ہوئی خاموشی دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ اس گھر میں روزانہ کتنے ہنگامے بپا ہوتے تھے۔ کوئی دن بھی تو پرسکون نہ گزرتا تھا وہاں ——— اور آج ——— صرف آٹھ سال گزرنے کے بعد اس گھر کی فضا یوں محسوس ہوتی تھی جیسے تھک کر اونگھ رہی ہو۔ گذرتے ہوئے واقعات کی تلخیاں کبھی کبھی آہیں بھرتی ہوئی محسوس ہوتیں، اور پھر ہر طرف مہیب خاموشی چھا جاتی۔

ڈیوڑھی سے گذرتے وقت راحیل کو وہ دن یاد آگیا جب اس کی پیاری امی کو پاؤں کی ٹھوکروں سے گھر سے نکال دیا گیا تھا اسی ڈیوڑھی کے دروازے سے ٹکرا کر امی کے سر سے خون کا دھارا بہہ نکلا تھا اور وہ دونوں بہن بھائی سسک سسک کر رونے لگے تھے۔

"خبردار! جو اونچی آواز نکالی، ورنہ تم دونوں کا بھی گلا گھونٹ دوں گا۔" ان کا باپ چیخا۔ اور نجمی سہم کر راحیل کے ساتھ چمٹ گئی۔

"ظالم میرے بچے میرے حوالے کر دے۔ پھر میں کبھی تیرے گھر کا منہ بھی نہ دیکھوں گی۔" امی نے خون کی کلی پھینکتے ہوئے کہا۔

"دفعہ ہو جا یہاں سے۔ بچے جہیز میں لائی تھی کیا؟ یہ میرے ہیں تیرے نہیں۔"

امی نے کتنی ہی منتیں کیں مگر انہیں بری طرح دھتکار دیا گیا اور وہ آنسو بہاتی ہوئی کہیں چلی گئیں۔ لڑائی جھگڑا تو اس گھر میں اکثر ہوتا رہتا تھا۔ اور امی کی پٹائی بھی بہت ہوتی۔ مگر گھر سے نکال دینے کا عمل پہلی دفعہ ہوا تھا۔ وہ اور نجمہ اس قدر دہشت زدہ ہو گئے تھے کہ ان کے منہ سے ایک بات بھی نہ نکلتی تھی۔ جب رات ہو گئی اور امی پھر بھی گھر نہ آئیں تو چھوٹی سی نجمی نے اپنی میلی کچیلی قمیض میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

"رات ہو گئی بھیا امی کو کتے کھا جائیں گے۔"

"تو چپ ہو جا میری بہن۔ میں امی کو ڈھونڈ کر لاتا ہوں مگر ابا کو بالکل نہ بتانا۔"

یہ کہتا ہوا وہ اسی ڈیوڑھی میں سے نکل کر رات کی تاریکی میں کھو گیا جس جس جگہ اسے شک تھا۔ کہ امی گئی ہوں گی۔ وہ وہاں دیکھ آیا مگر ہر جگہ مایوسی ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دم گھٹنے لگا ہو اگر نجمی کا خیال نہ ہوتا۔ تو وہ ضرور کسی کنوئیں میں چھلانگ لگا دیتا۔

"بہت دیر ہو گئی ہے۔ وہ اکیلی پریشان ہو گی۔" یہ سوچ کر اس نے گھر کا رخ کیا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی مڈبھیڑ باپ سے ہوئی

"اس وقت کہاں سے آ رہا ہے حرامی؟" انہوں نے گرج کر پوچھا۔

"امی کو ڈھونڈنے گیا تھا ابا۔" اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔ فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا مگر اب الفاظ واپس لینے اس کے بس کی بات نہ تھی۔ ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔ اور وہ چکرا کر اسی ڈیوڑھی میں گر گیا۔ "اگر اب گھر سے قدم باہر رکھا تو ٹانگیں توڑ کر اندر ڈال دوں گا کتے۔ تو کون ہوتا ہے اس کم بخت کو لانے والا۔ میرے گھر میں اس کے لئے اب کوئی جگہ نہیں ہے ——— سمجھا!"

مگر وہ بھی تو نہ سمجھ سکا۔ اسے تو صرف اس چیز کی سمجھ آ سکی تھی کہ وہ بوٹوں کی ٹھوکروں سے ڈیوڑھی میں ہر طرف لڑھک رہا ہے پٹ پٹا کر نیم بیہوشی کی حالت میں جب وہ کمرے میں گیا۔ تو نجمہ ایک کونے میں دبکی ڈر سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کے بعد امی کو طلاق

بے دی گئی۔ اور بچے بظاہر ہمیشہ کے لئے ماں سے چھوٹ گئے۔

خونی ڈیوڑھی کو دیر سے دیکھتے ہوئے راحیل اندر صحن میں داخل ہوا۔ خاموش صحن کے کونوں میں سے اسے اپنی وہ چیخیں سنائی دیں جو اس پیٹائی پر بلند ہوئی تھیں جب اس کے باپ نے اسے چھپ کر ماں کے پاس بھاگ جانے کی سزا میں پیٹا تھا۔ ہر روز کی مار دھاڑ سے وہ اتنا سخت دل برداشتہ ہوا کہ ایک دن بغیر ٹکٹ کے گاڑی میں بیٹھ کر پشاور جا پہنچا۔ اس وقت اس نے صرف ایک نیکر پہن رکھی تھی، اور وہ بھی پھٹی پرانی۔ اپنے ننھالی گھروں کے قریب وہ بچوں سے کھیلنے لگا۔ اچانک ایک گھر کا دروازہ کھلا۔ ایک عورت ننگے سر ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی آئی۔ اور اسے اٹھا کر لے گئی۔ یہ اس کی امی تھیں اگرچہ اس نے، انہیں دو تین سال بعد دیکھا تھا، اور غم و فکر کی وجہ سے ان کی شکل بھی بدل گئی تھی۔ مگر پھر بھی انہیں پہچاننے میں اسے زیادہ دقت نہ ہوئی امی اسے دیکھ کر دیر تک روتی رہیں۔ پھر انھوں نے اسے نہلایا اور کھانا کھلایا ماں کے پاس اسے کتنا سکون ملا تھا۔ ہاں بہن کا خیال اکثر پریشان کرتا۔ ایک دن وہ باہر کھیل رہا تھا کہ اپنے باپ کو آتے دیکھا اس کا خون منجمد ہو گیا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر خوف کے مارے ٹانگوں نے جواب دیدیا۔ اور وہ ایک بے بس جانور کی طرح ان کے ساتھ چل دیا۔ گھر لا کر اس خاموش صحن میں اس کے باپ نے اسے یوں وحشیوں کی طرح مارا کہ وہ چیختے چیختے بیہوش ہو گیا۔ اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی، اور وہ کئی ماہ تک چارپائی سے نہ اٹھ سکا۔

صحن سے گزر کر راحیل آہستہ آہستہ پہلے کمرہ میں گیا کمرہ گرد اور جالوں سے اٹا پڑا تھا۔ سارے گھر کی ٹوٹی پھوٹی چیزیں وہاں بھری پڑی تھیں۔ اسے وہ وقت یاد آگیا۔ جب اس کی امی کو نکال کر تیسرے ہی مہینے اس کمرے میں ایک نئی امی کو لایا گیا تھا اس رات وہ کمرہ قمقموں کی تیز روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ دروازے پر پھولوں کے ہار لٹکے ہوئے تھے ایک رنگین پلنگ پر پھولوں سے مہکتا ہوا بستر بچھا تھا۔ کمرہ میں رنگ برنگ کے کپڑے پہنے کئی عورتیں موجود تھیں۔ اس کی نئی امی کسی پرستان کی نازک سی پری معلوم ہو رہی تھی۔ عورتیں اسے ہنس ہنس کر کچھ کہتیں اور وہ شرما کر اپنا منہ گھٹنوں میں چھپا لیتی۔

چند مہینے گھر میں ذرا امن و سکون رہا، اور پھر راحیل کی اپنی چیخوں کے ساتھ اس کمرے میں سے نئی امی کی چیخیں آنسو اور آہیں بھی شامل ہو گئیں۔ شادی کے دوسرے ہی سال وہ اللہ میاں کے پاس چلی گئیں۔ وہ اتنی نازک اور بیماری تھیں کہ اس گھر میں ان کا سال بھر زندہ رہنا بھی ایک قسم کا معجزہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ اسی کمرے میں انہوں نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں پوری کیں اس وقت ان کے پاس راحیل اور لغمہ ہی تو تھے۔ لغمہ مسلسل روئے جا رہی تھی اور وہ ٹکٹکی باندھ کر موت کو آتے دیکھ رہا تھا۔ جو یقیناً نئی امی کے لئے ایک رحمت بنکر آ رہی تھی ان کے مرنے کے بعد وہ کمرہ استعمال کرنا چھوڑ دیا گیا۔ سب کا خیال تھا کہ نئی امی کی موت اتنی بے بسی میں ہوئی ہے کہ انکی بے چین روح اپنا انتقام لینے کے لئے ہر وقت کمرہ میں موجود رہتی ہے۔ ابا خود بھی اس کمرے میں جاتے ہوئے گھبراتے بلکہ باقاعدہ ڈرتے تھے۔ مگر ان کی سختی میں کسی قسم کی کمی نہ آئی تھی۔

راحیل نے حسرت سے کمرے پر ایک نظر ڈالی، اور دوسری طرف چلا گیا۔ اس وقت اس کے سامنے ایک ایسا کمرہ تھا۔ جہاں یکے بعد دیگرے اس کی تین مائیں آئیں۔ ایک مرہٹن، ایک کشمیرن اور ایک پنجابن پہلی ماں تو دو ماہ بعد ہی بہت سا زیور لے کر میکے بھاگ گئی۔ اور پھر واپس آنے کا نام ہی نہ لیا دوسری ماں کو جلد طلاق مل گئی۔ کیونکہ وہ بڑی سخت تھیں وہ ابا کی سختی کا جواب اتنی ہی سختی سے دیتی تھیں اور تیسری ٹی بی کا شکار ہو کر بہشت کو سدھاریں۔ بیماری کے جراثیم کے خیال سے وہ کمرہ بھی بہت کم استعمال ہوتا تھا۔

راحیل سر جھکائے اس کمرہ میں سے گذر کر اگلے کمرے میں چلا گیا یہ اس کی مہاجر امی کا کمرہ تھا۔ ابا کے ظلم و ستم کی وجہ سے خاندان میں سے تو کوئی رشتہ دیتا نہ تھا باہر کے لوگ بھی کچھ واقف ہو گئے تھے چنانچہ انہوں نے ایک لاوارث مہاجر لڑکی سے نکاح کر لیا جو بڑی کم زبان ڈرپوک اور سیدھی سادی تھی۔ ان کی کم زبانی اور سیدھا پن ان کے لئے زیادہ تکلیف کا باعث بنا۔ ان کا نفاس ابھی آٹھ ہی ماہ کا تھا کہ انہیں بھی ذلیل کر کے لڑکے سمیت گھر سے نکال دیا۔

بہا جرا امی نے صرف یہی کہا: "میرا صبر ایک دن رنگ لائے گا۔ یاد رکھنا۔" وہ تو یہ کہہ کر نہ جانے کہاں چلی گئی۔ مگر اسی شام ابا کا پاؤں پہلی سیڑھی پر سے پھسلا اور وہ لڑھکتے ہوئے آخری سیڑھی پر آ رہے۔ ایک بازو ٹوٹ گیا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ نغمہ ڈر کر رونے لگی۔ ڈاکٹر کو بلوا کر ان کے بازو پر پلستر لگوایا گیا۔ وہ کئی ماہ بیمار رہے اور اس بیماری نے انہیں اور زیادہ چڑچڑا اور سخت بنا دیا تھا.... جا۔ہاں یہ لیٹے لیٹے بھی سب کو گالیاں دیتے اور برا بھلا کہتے رہتے

دائیں طرف نغمی کا کمرہ دیکھ کر راحیل کے قدم خود بخود اس طرف اٹھنے لگے۔ دروازہ کھولا تو کمرہ بالکل اسی حالت میں تھا جس میں آج سے آٹھ سال پہلے نغمہ چھوڑ کر گئی تھی۔ کھڑکی کے قریب ہی اس کی چارپائی بچھی تھی۔ اور اس پر بستر بھی اسی طرح پڑا تھا۔ ہاں بستر پر آٹھ سال کی مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ سلاخوں والی کھڑکی دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے نغمی ان سلاخوں کو پکڑے کھڑی رو رہی ہے اور سامنے کے گھر کی کھڑکی میں امی بیٹھی آنسو بہا رہی ہیں کل ہی کی تو بات معلوم ہوتی تھی جب امی نے اسے بازار میں پکڑ کر کہا تھا: "ایک دفعہ نغمی سے ملا دے بیٹا۔ مجھ میں اب زیادہ جدائی... برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔"

"مگر امی میں کیا کر سکتا ہوں ابا تو آج کل ہر وقت گھر پر رہتے ہیں۔ اور نغمی کو کہیں آنے جانے کی سخت ممانعت ہے۔"

"نہیں بیٹا تو مجھے باہر سے ہی دکھا دے۔ اسے ایک نظر دیکھ لوں گی تو میری تسلی ہو جائے گی۔"

آخر سوچ کر اس نے امی کو سامنے کھنڈروں کی کھڑکی میں بٹھا دیا۔ اور خود بھاگا بھاگا نغمہ کے پاس گیا: "امی سے ملے گی؟" اس نے آہستہ سے کہا اور جواب میں نغمی کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ نکلے

"اس دنیا میں ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے بھیا؟" وہ رو کر بولی

اس نے اس کے کان میں کچھ کہا، اور وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی "میں یہاں دروازے پر کھڑا رہتا ہوں اگر ابا ادھر سے گزرے تو تمہیں اطلاع دے دوں گا۔"

نغمی کھڑکی پر چڑھ گئی۔ سامنے امی کھڑی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر زار و قطار رونے لگیں، اور دیر تک روتی رہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتیں ابا نے نغمی کو پکارا۔ وہ گھبرا کر کھڑکی بند کر کے چلی گئی اور امی ساتھ والے کمرے میں بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ ماں بیٹی کے درمیان ایک چھوٹی سی گلی حائل تھی۔ مگر ان دونوں کے لئے وہ گلی بھی ناقابل عبور پہاڑ تھا۔ امی اس ملاقات کے بعد سخت بیمار رہنے لگیں۔ چنانچہ دونوں بہن بھائیوں نے دوبارہ ملنے کا منصوبہ ترک کر دیا۔ انہیں یقین تھا کہ اس دنیا میں یہ ملاپ ناممکن ہے۔ ان کے حالات کچھ اس قسم کے تھے جن کا بدلنا تقریباً ناممکن تھا۔ ابا کی سختی میں کبھی کمی نہ آ سکتی تھی، اور کوئی بیوی اس گھر میں زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ بچے اس قید خانے میں سے ان کی زندگی میں نکل نہ سکتے تھے۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری زندگی اسی چار دیواری میں سختیاں جھیلتے جھیلتے گزر جائے گی۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔

ابا کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے باپ کی منت خوشامد پر نغمہ کی شادی اپنے بھتیجے سے کر دی، اور وہ دلہن بن کر سسرال چلی گئی۔ یہ ایک ایسی حرکت تھی جس کا یقین اسے ابھی تک نہ آیا تھا اپنی ہوش میں پہلی دفعہ اس نے گھر سے باہر قدم رکھا۔ مگر وہ قدم پھر کبھی اس گھر میں نہ آیا۔ اس کا کمرہ اسی طرح رہا۔ وہاں نہ کوئی آتا نہ جاتا اور نغمی کے جانے کے بعد گھر میں تھا ہی کون جو اس کمرے کو استعمال کرتا۔ ولیمہ کے بعد باپ کے گھر آنے کی بجائے وہ اپنے شوہر کے ساتھ سیدھی پشاور ماں کے پاس پہنچ گئی۔ بیس برس بعد ماں بیٹی کا ملاپ ہو گیا۔ یہ دوسری ایسی بات تھی جس کا وہ کبھی تصور بھی نہ کر سکتا تھا

اس وقت راحیل کی عمر پچیس برس کی ہو چکی تھی۔ جا و بے جا سختی کی وجہ سے اس کا دل پڑھائی میں بھی نہ لگا۔ کئی دفعہ گھر سے بھاگا۔ مگر ہر دفعہ پکڑا گیا۔ اور پھر اسے ایسی سخت سزائیں دی گئیں کہ آئندہ بھاگنے کا خیال چھوڑنا پڑا۔ ابا کو جب پتہ چلا کہ بیٹی ماں سے جا ملی ہے۔ تو وہ تلملا کر رہ گئے۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا جس نے انہیں دیوانہ بنا دیا اسی رات وہ ذرا دیر سے گھر آیا۔ تو ابا نے آتے ہی اسے بالوں سے پکڑا اور پچیس سالہ جوان بیٹے کو بے دردی سے پیٹنا شروع کر دیا نہ جانے کس طاقت نے اسے روکے رکھا، اور وہ خاموشی

سسکتا رہا۔ اور پھر وہ اسی رات لاپتہ ہو گیا۔

تین چار ماہ بعد اس نے امی کو سو روپیہ بھیجا۔ اور اس کے بعد بڑی باقاعدگی سے انہیں ساٹھ روپے ماہوار بھیجتا رہا۔ اپنی ماں کی بے کیف زندگی اسے ایک لمحہ کے لئے نہ بھولتی تھی۔ وہ ماں جس کی زندگی کے دن تلخ یادوں سے بھرپور تھے۔ جس نے آج تک مانگ کر ہی کھایا تھا کبھی باپ سے اور کبھی بھائیوں سے۔ جس نے اپنے گھر کا سکھ ایک دن کے لئے بھی نہ دیکھا تھا۔ امی کے متعلق سوچتے ہوئے اس کا دل خون کے آنسو رونے لگتا۔ اس کا جی چاہتا کہ سونے چاندی کے ڈھیر ماں کے آگے لگا دے اور اس کی گزشتہ تنگدستی کی تلافی کر دے۔ مگر یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا عالم فاضل نہ تھا۔ مگر پھر بھی اپنی اوقات کے مطابق وہ ماں کی ہر طرح مدد کرتا رہا۔

آٹھ سال گزر گئے ابا کے دوبارہ گھر لے جانے کا ڈر ذرا کم ہوا تو وہ نہ جانے کیا سوچ کر امی سے ملنے آ گیا۔ اس دوران میں گھر کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ وہ ٹوٹا پھوٹا اور چیزوں سے خالی مکان اب اور ہی نظارہ پیش کر رہا تھا۔ مکان کی مرمت ہو چکی تھی، اور اندر ہر کمرے میں ضرورت کا سامان موجود تھا۔ نغمی کے ننھے ننھے بچے صحن میں کلیلیں کر رہے تھے اور امی اور نغمی چارپائی پر بیٹھی ہنس رہی تھیں۔

"خدایا یہ خواب تو نہیں ہے" وہ آنکھیں ملتا ہوا اندر پہنچا۔ اور امی نے بھاگ کر اسے سینہ سے لگا لیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد امی اسے باورچی خانے میں لے گئیں۔ کھانا کھاتے ہوئے نغمہ سے اسے پتہ چلا کہ ابا کی کشمیرن بیوی جسے اس کی سختی کی بنا پر جلد طلاق مل گئی تھی امی کے جہاتے میں بڑے ٹھاٹھ سے رہتی ہے۔ اس نے ایک ڈاکٹر سے شادی کر لی ہے اور وہ بڑی عزت کرتا ہے اور پھر امی نے ایک اور انکشاف کیا انہوں نے بتایا کہ اس کی مہاجرامی کی بھی خدا نے سن لی ہے ان کے لڑکے کی تجارت اتنی ترقی پر ہے کہ وہ مٹی کو ہاتھ لگاتا ہے اور وہ سونا بن جاتی ہے۔ یہ خوش خبری اس کے لئے اور زیادہ غیر متوقع تھی۔ ماں سے پتہ پوچھ کر وہ سیدھا وہاں پہنچا۔ ایک خوبصورت سی ننھی منی کوٹھی کے سامنے کار کھڑی تھی۔ اور پاس ہی نذاکیہ

تھا اس نے اندر اطلاع کروائی۔ تو دونوں ماں بیٹے استقبال کے لئے نکلے۔ ارشد بڑھ کر اس کے ساتھ چمٹ گیا، اور اس نے جھک کر چھوٹے بھائی کی پیشانی چوم لی۔ آٹھ ماہ کا دبلا پتلا بچہ اب ایک تندرست اور خوبصورت جوان بن گیا تھا۔ مہاجرامی کے سامنے وہ جھک گیا انہوں نے اس کا سر چوما شفقت سے پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ دعائیں دیں اندر لے گئیں، اور بڑی خاطر مدارات کی۔ جب وہ وہاں سے باہر نکلا، تو اس کا دل بہت ہی خوش تھا۔ اور وہ بار بار سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ سب خواب تو نہیں۔ آج سے آٹھ سال پہلے تو وہ ان باتوں کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ اور نہ جانے کیا سوچ کر وہ اپنے باپ کے گھر کی طرف چل دیا۔ اس گھر کی طرف جس نے کئی زندگیوں کو تباہ کیا تھا جس نے ان کا مستقبل بالکل تاریک کر دیا تھا مگر خدا کو کچھ اور ہی... منظور تھا۔

اور اب ——— آٹھ سال بعد جب وہ اس گھر میں چل پھر رہا تھا تو وہاں کا رنگ ہی اور دکھائی دے رہا تھا۔ نہ وہاں کسی کے رونے کی آواز آتی تھی نہ چیخنے کی۔ نہ کوئی کسی کو جھڑک رہا تھا نہ پیٹ رہا تھا نہ سہمے سہمے زرد چہرے دکھائی دے رہے تھے اور نہ ان پر شعلہ برساتی ہوئی آنکھیں۔ ہر طرف خاموشی اور ویرانی تھی۔ گھر کی گندی حالت زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔ کہ یہاں کوئی نہیں رہتا۔

اپنے خیالات سے چونک کر راحیل نے ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ وہ واپس مڑنے ہی والا تھا کہ کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ دو تین کمروں میں سے گزرتے ہوئے وہ آخری اندھیرے سے کمرے میں جا پہنچا۔ روشنی میں سے آنے کی وجہ سے اسے پہلے تو کچھ نظر نہ آیا۔ مگر جب اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس.. ہو گئیں تو اسے اپنے سامنے ایک گندی سی چارپائی پر ایک کمزور سا آدمی لیٹا ہوا نظر آیا جس کے سر کے بال برف کی مانند سفید ہو رہے تھے یہی کمرہ تھا جہاں بہت زیادہ مار چکنے کے بعد ابا ان کو بند کر دیا کرتے تھے اس کا نام ہی گھر میں کالی کوٹھڑی پڑ گیا تھا چارپائی کے قریب بلغم کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا جس میں کیڑے چل رہے تھے بستر

کی جگہ چند پھٹے پرانے کپڑے رکھے تھے۔ کمرے کی ہوا اتنی بدبودار تھی کہ وہاں ایک اچھا بھلا انسان بھی بیمار ہو سکتا تھا۔ راحیل چپ چاپ کھڑا کمرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ اس آدمی نے آہ بھری اور گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

"کریمن آج تو تو بڑی جلدی اٹھی ہے مارے پیاس کے میرا دم نکلا جا رہا تھا۔ پانی جو تو رکھ گئی تھی تا وہ جانے کیسے صبح ہی زمین پر گر گیا تھا۔ آج تو خدا نے فرشتہ بنا کر تجھے وقت سے پہلے بھیج دیا ہے۔ ورنہ میں شام تک مر گیا ہوتا۔ مگر تو جانتی ہے۔ میں راحیل یا ارشد کو دیکھے بنا مرنا نہیں چاہتا۔ پانچ سال سے بیمار ہوں مگر کوئی بہن بھائی۔ رشتہ دار خبر لینے نہیں آتا۔ سال بھر سے اس قبر نما کمرے میں بچوں کا انتظار کر رہا ہوں مگر کوئی شکل نہیں دکھاتا۔ میں نے بڑے بڑے ظلم کئے ہیں کریمن مگر میں مرنے سے پہلے معافی.. چاہتا ہوں ..۔۔۔۔۔"

راحیل کو یوں محسوس ہوا جیسے زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے سرک رہی ہے۔ باوجود کوشش کے وہ ضبط نہ کر سکا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ اور وہ روتا ہوا باپ پر گر گیا۔ "یہ تمہارا کیا حال ہو گیا ابا۔"

"کون ہو؟" بوڑھے نے ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

"میں راحیل ہوں ابا۔ تمہیں نظر بھی نہیں آتا۔ میرے ابا یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔"

"راحیل میرے بیٹے" بوڑھے کی ہچکی بندھ گئی اور ساتھ ہی اس کا سانس اکھڑ گیا۔ راحیل بھاگ کر پانی لایا۔ پانی پی کر اس کی حالت کچھ سنبھلی اور وہ پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"مجھے معاف کر دو بیٹا، مجھے معاف کر دو۔"

اس سے پہلے کہ وہ انہیں دلاسا دیتا۔ ابا اس کے قدموں پر گر پڑے راحیل اس طرح تڑپ کر علیحدہ ہوا۔ جیسے اسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں ابا۔" اس نے جھک کر انہیں اٹھایا اور چارپائی پر بٹھا دیا۔

"میں بڑا گنہگار ہوں بیٹا۔ مجھے معاف کر دو۔ میں پانچ سال سے اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہوں۔ سب نے مجھے کتے کی طرح دھتکار دیا ہے۔ کوئی منہ لگانے کو تیار نہیں۔ نہ پیسہ رہا ہے اور نہ صحت کہ کچھ کما سکوں۔ مگر بیٹا مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ میں صرف اپنے قصوروں کی معافی چاہتا ہوں" یہ کہتے کہتے وہ دھم سے پھر اس کے قدموں پر گر گئے۔ راحیل۔ اس منظر کی تاب نہ لا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ صحن کے ستون کے سہارے کھڑے ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"خدایا یہ خواب ہے یا حقیقت! دنیا میں یوں بھی ہوتا ہے کہیں وہ انسان جو لوگوں کو جانوروں سے زیادہ اہمیت نہ دیتا ہو۔ اس قدر بے بس بھی ہو سکتا ہے؟ وہ جسم جو ریشمی بستروں پر سوتا ہو چیتھڑوں پر بھی لیٹ سکتا ہے؟ وہ شخص جس نے چھ شادیاں کی ہوں اتنا تنہا بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے پاس کوئی پانی دینے والا بھی نہ ہو۔ وہ سر جو ہمیشہ غرور سے تنا رہتا ہو کسی پاؤں پر بھی گر سکتا ہے؟ وہ گھر جس میں ہر وقت ہنگامہ رہتا ہو اتنا خاموش بھی ہو سکتا ہے؟

میری امی کا نیا گھر ۔۔۔۔۔ کشمیرن امی کا نیا گھر ۔ نمو کا نیا گھر۔ مہاجر امی کی نئی کوٹھی ۔۔۔۔۔ اور یہ ابا کا گھر ان سب کا پرانا گھر ۔۔۔۔۔ الٰہی دنیا کیا ہے ۔۔۔۔۔! کیا تھی ۔۔۔۔۔؟ کیا ہو گئی ۔۔۔۔۔ آٹھ سال کی قلیل مدت میں اتنا زبردست انقلاب"

اس نے اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ لیں کوٹھری میں سے ابا کے زور زور کر پکارنے کی آواز آ رہی تھی۔

"راحیل ۔۔۔۔۔ میرے بیٹے ۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو بیٹا ۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو!"

(بشکریہ "زیب النساء")

التماس ہے کہ..... اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان کے اپنا پورا پتہ لکھنا نہ بھولئے بغیر پتہ کے کوئی نگارش قابل قبول نہ ہوگی نیز ادارۂ مشیر ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کا ذمہ دار نہیں ہے اسلئے مضامین وغیرہ بھیجنے سے پہلے انکی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ ضرور بھیجئے
(منیجر)

فاروق بانسپاری •

جام جہاں نما

اک اشتراکی نوجواں! فاقہ کشوں کے درمیاں
مصروف وعظ و پند تھا یوں غیظ میں کف در دہاں
"کیا حق ہے اک انسان کو ہو دوسروں پر حکمراں!!
تہذیب کی نا منصفی! یا الحفیظ و الاماں"
یہ سامراجی شعبدے پابند یہ آزادیاں
یہ شیوۂ غارت گری یہ دعوئ امن و اماں
دنیا سے اٹھ سکتا نہیں اس لطف کا بارگراں
ٹھکرا رہی ہے پرکھو سی چکرا رہا ہے آسماں
دست ہوس سے اڑ گئیں
انسانیت کی دھجیاں
جمہوریت کی قیصری باصد ہزاراں دلبری
امن و اماں کے نام پر مصروف جنگ زرگری
مجلس بہ مجلس مشورہ پردہ بہ پردہ خودسری
یہ پُرخطر جود و کرم" یہ حکمت سوداگری
دنیا و دیں کی کش مکش دراصل سب ہے ظاہری
دونوں کا مقصد ایک ہے شاہی ہو یا پیغمبری
یہ اسلحہ سازی کی دھن یہ تجربات جوہری
تخفیف کی یہ دعوتیں! یہ اہتمام عسکری!!
تجویز امن عامہ
غارت گروں کی شاعری
اک سمت گنج سیم و زر اک سمت فاقوں پر گذر
اک سمت دولت خندہ زن اک سمت غربت نوحہ گر
نعمت جہاں کی اک طرف منعم کے دسترخوان پر
مفلس کی دنیا بھوک ہے اک سمت ہے زیر و زبر
اک سمت گلگونہ برُخ محلوں میں حسن فتنہ گر
اک سمت غازہ کے عوض چہروں پہ خاک رہ گذر
انبوہ انساں اک طرف عریاں بہ احوال دگر
پیراہن خوش رنگ میں اک سمت شہری جانور
تقسیم دولت ہے غلط
مابین انساں کس قدر
درمان بنیائے حزیں جز اشتراکیت نہیں
اس لال پرچم کے تلے آسائش خلد بریں!!
روٹی یہاں، کپڑا یہاں فردوس برروئے زمیں
ہر سانس پیغام سکوں ہر لمحہ عشرت آفریں
زندہ حقیقت بن گیا لینن کا سپنا حسیں!!
اپنا نظام زندگی سر اخوت کا امیں!!
مرضی ہمدی عین حق! راجا ہمیں پرجا ہمیں
پیدا نہ اب تک ہو سکی
ایسی مساوات حسیں"
میں نے کہا اے مہرباں برحق یہ ساری داستاں
لیکن نہ اب تک کھل سکے مجھ پر یہ اسرار نہاں
انساں کو جب یہ حق نہیں انساں پہ ہو وہ حکمراں
پھر جرمنی کے پاؤں میں کیوں ہیں تمہاری بیڑیاں
مغرب کا چھوڑو تذکرہ مغرب ہے رسوائے جہاں
فن لینڈ میں کیوں خون کی تم نے بہائیں ندیاں؟
تسلیم اسرائیل سے حق کے بنے تم پاسباں

پھر یوں بگسن کی تانیں سے کیوں طبع نازک پہ گراں
نسبتے تو دونوں ایک ہیں
دونوں کا احسان آسماں

جمہوریت کی قمری مانا بہ عصر عسکری!!
تہذیب کی دنیا میں ہے یکطرف فن قاہری!
ہر چند ہے ضرب المثل مغرب کی مشرق بھی کی
اس ظلم کی تقصیر سے لیکن نہیں تم بھی بری
مذہب سے ہو نا آشنا تم بندگان سامری
دیں ابن آدم کا عصا دنیا کمال ساحری
فرعونیت گم راہ کن مذہب کا مقصد رہبری
شاہی جب تری ظلم پر آگے بڑھی پیغمبری
کچھ بھی تمہاری رائے میں
یکطرف کمش ہے ظاہری

ہے اتحاد خیر و شر دنیا میں نا ممکن مگر
کی نازیوں سے دوستی پھر تم نے کس امید پر
حق آشنا بنکر ہوئے باطل سے کیوں شیر و شکر
پاکی میں آیا کلمۂ حق گندی سیاست کا اثر
عیار نے جو کچھ کیا رکھ کر اسے پیش نظر
تم بھی تو کرتے ہو وہی لیکن بہ انداز دگر
آزادی فکر و عمل اپنوں کو تم دیتے اگر
آنسو بہاتی بے کسی کیوں بیر یا کی موت پر
جاؤ اسی انصاف کے
صدقے ہو گئی شام و سحر

دراصل دیکھی ہی نہیں تم نے مساوات حسیں
آؤ ادھر دکھلائیں ہم نظارہ عہد مبیں
عباسیوں کا دور ہے بغداد کی ہے سرزمیں
فرماں روائے مملکت خدمت گذار مملکت دیں
چشم عدالت سرنگوں ہے داد خواہوں کے قریں
اک سمت بطلی کے قتیل اک سمت سلطان حزیں
انصاف کی سرکار میں دونوں بیک صف جاگزیں
وہ سربراہ ملک ہو یا تاج شاہی کا امیں
سب کو طلب یکجا کرے ایسی عدالت ہے کہیں؟
انصاف کے چیلے ہو تم
انصاف سے کہہ دو تمہیں

دعویٰ بہت آسان ہے مشکل عمل ممکن ہے
تم اور بھائی چارگی اللہ کی یہ شان ہے
جب اخوت کچھ نہیں اعلان ہی اعلان ہے
دیکھی تو بیشک ہے دکان پھیکا مگر پکوان ہے
کپڑا تمہارا جسم ہے روٹی تمہاری جان ہے
باقی جو کچھ دنیا میں ہے سب پیٹ پر قربان ہے
گمراہی انکار سے پامال عظم انسان ہے
حاصل سکون روح ہے نے دل کو اطمینان ہے
انکار حق سے یہ جہاں
کچھ دن کا بس مہمان ہے"

"بشکریہ معیار"

اعتذار

فروری ۵۶ء کے شمارے میں جناب اثر لکھنوی صاحب کی غزل کا حسب ذیل شعر غلط چھپ گیا ہے۔ قارئین تصحیح فرمالیں ؎

حیات جہد مسلسل کا نام ہے سچ ہے
خطا معاف وہ شان سپردگی نہ رہی

(ادارہ)

مصنفہ: ہف وال پول
مترجمہ: ابن فرید بی۔اے

فرار

جب فوسٹر غیر ارادی طور پر کمرے میں چل کر، کتابوں کی الماری تک آیا اور کسی قدر آگے کی طرف جھکتے ہوئے کبھی ایک کتاب پر اور کبھی دوسری کتاب پر نظرِ انتخاب ڈالنے لگا۔ تو اس کا میزبان اس کی لاغر و ناہموار گردن کے پٹھوں کو اس کے پست فلالین کے کالر پر ایستادہ دیکھ کر سوچنے لگا کہ کس قدر آسانی کے ساتھ وہ اس کا گلا گھونٹ سکے گا اور یہ فعل اسے کس قدر مسرت، جاں فزا مسرت، فراہم کر سکے گا۔

پست سفید چھت اور سفید دیواروں والا کمرہ لیک لینڈ کی ملیح و لطیف آفتابی کرنوں کے سیلاب سے بھرا ہوا تھا۔ برطانیہ کی جھیلوں کی سرزمین میں اکتوبر کا مہینہ رشک کے قابل ہوتا ہے۔ سنہری، دلفریب اور معطر کرنیں مست خوباں کی طرح دا غدار آسمان پر آہستہ خرامی کرتی ہوئی یاقوتی شام کی مسرتوں تک جا پہونچتی ہیں، تو اس خوبصورت بستی پر سائے گہرے ارغوانی دھبوں کی شکل میں، سیمابی جالی کے تانے بانے کی شکل میں گہرے عنبری اور بھورے داغوں کی شکل میں پھیلنے لگتے ہیں۔ پہاڑوں پر سے بادل جنگی جہازوں کی طرح گذرنے لگتے ہیں۔ کبھی چھپتے ہوئے، کبھی سامنے آتے ہوئے، کبھی دیووں کی سی فوج کے ساتھ میدانوں کے سینے پر اترتے ہوئے، اور اچانک لطیف نیلے آسمان کی وسعتوں کی طرف پرواز کرتے ہوئے پژمردہ سے رنگ میں پھیل جاتے ہیں۔

فن ڈک کا چھوٹا سا مکان لو فلز سے نظر آتا تھا۔ اس کے داہنی طرف دریچوں سے آئس واٹر کی پھیلی ہوئی پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔

فن ڈک نے فوسٹر کی پشت دیکھی اور اچانک خود کو اس قدر بیمار سا محسوس کرنے لگا کہ بیٹھ گیا اور ایک لحظہ کے لئے اپنی آنکھوں کو ہاتھ سے ڈھک لیا۔ فوسٹر لندن سے وہاں اپنی صفائی پیش کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ اپنے تعلقات خوشگوار بنانے آیا تھا۔ وہ فوسٹر کو تقریباً بیس سال سے جانتا تھا، اور اس تمام عرصہ میں فوسٹر ہمیشہ اس کی کوشش کرتا رہا تھا کہ اس کے تعلقات ہر ایک سے خوشگوار رہیں۔ وہ کبھی گوارا ہی نہیں کر سکتا تھا کہ لوگ اس سے نفرت کریں۔ اسے نفرت تھی کہ لوگ اس کے بارے میں غلط انداز سے سوچیں۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر شخص اس کا دوست بن جائے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ فوسٹر اطمینان بخش اور کامیاب زندگی بسر کر رہا تھا۔ اور ہاں! شاید فن ڈک کی ناکامی کی وجہ بھی یہی تھی۔

کیونکہ فن ڈک اس معاملہ میں فوسٹر کی ضد تھا۔ اس کو دوستوں کی تمنا نہیں تھی۔ وہ قطعاً اس کی پروا نہیں کرتا تھا کہ لوگ اسے پسند کریں ——— چنانچہ وہ کوئی نہ کوئی وجہ تلاش کر کے لوگوں کو ذلیل سمجھا کرتا تھا ——— اور کتنے ہی لوگ اس کی نگاہ میں قابلِ نفرین تھے۔

فن ڈک نے اس لمبی، دُبلی خمیدہ پیٹھ کی طرف دیکھا اور اپنے گھٹنوں میں کپکپاہٹ محسوس کرنے لگا۔ جلد ہی فوسٹر اس کی طرف مڑے گا اور کتابوں کے بارے میں سیٹی کی سی تیز آواز میں کچھ اگل دیگا۔ "کتنی دلچسپ کتابیں ہیں تمہاری فن ڈک!" کتنی ہی راتیں فن ڈک آنکھوں میں کاٹ چکا تھا جبکہ اسے بالکل نیند نہیں آتی تھی، اس نے اس سیٹی کی سی تیز آواز کو بالکل قریب سے سنا تھا۔ ہاں! بالکل اپنے بستر کے قریب، اور کتنی ہی بار اس نے اس آواز کا جواب بھی دیا تھا۔

"میں تم سے نفرت کرتا ہوں! تم میری زندگی کی ناکامی کی وجہ ہو۔ تم ہمیشہ میرے راستہ میں آگئے ہو۔ ہمیشہ، ہمیشہ، ہمیشہ! میری حوصلہ افزائی کی اور میرے ساتھ ظاہرداری برتی لیکن درحقیقت دوسروں پر یہ ظاہر کرنا چاہا کہ میں کس قدر قابلِ رحم ہستی ہوں، میں کتنی عظیم ناکامی ہوں۔ کیسا مغرور بیوقوف ہوں! میں جانتا ہوں! تم مجھ سے کچھ بھی چھپا نہیں سکتے۔ میں تمہارے باطن میں جھانک سکتا ہوں"

بیس سال سے فوسٹر ہٹ دھرمی کے ساتھ فن ڈک کے

راستے میں روڑا بنا ہوا تھا۔ یہ بڑا پرانا واقعہ تھا جبکہ روڈنس کو ایک نادر رسالہ "پارتھینن" کے لئے ایک نائب مدیر کی ضرورت تھی ——
فن ڈِک اس کے پاس گیا اور اس سے بڑی امید افزا گفتگو کی۔ اس نے اس دن کتنی عمدگی کے ساتھ گفتگو کی تھی اور کتنے جوش و خروش کے ساتھ روڈنس پر واضح کیا جسے اس نے اس کی خود بینی کے ذریعہ اندھا کر دیا تھا، ظاہر کر دیا کہ "پارتھینن" کیا رسالہ بن سکتا تھا۔ روڈنس نے کس طرح اپنے جوش و خروش کو محسوس کیا تھا، اور کس طرح وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کو کمرے میں گھسیٹتے ہوئے چلاتا تھا! ہاں! ہاں! فن ڈک! یہ تو بہت عمدہ رہے گا۔ یہ تو یقیناً لاجواب ہوگا" اور بالآخر کیسے فوسٹر نے اس اسامی کو اچک لیا تھا۔

رسالہ صرف سال بھر یا اتنے ہی کچھ عرصے تک چلا تھا لیکن فوسٹر کو اس کے ساتھ تعلق نے مشہور کر دیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ فن ڈک ہو جاتا۔

پھر پانچ سال بعد فن ڈک کی ناول "تلخ ایلوا" جس کے لئے اس نے تین سال تک خون پسینہ ایک کر دیا تھا —— منظر عام پر آئی۔ اور اسی ہفتہ کے اندر، فوسٹر نے اپنی ناول "سرکس" شائع کر دی جس نے اپنا نام پیدا کر لیا حالانکہ خدا ہی بہتر جانتا ہے وہ ایک دم ناقص، جذباتی اینچ پینچ تھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ محض ایک ناول کسی کو تباہ و برباد نہیں کر سکتی —— لیکن غور کیجئے کیا نہیں کر سکتی؟ اگر "سرکس" شائع نہ ہوئی ہوتی تو کیا لندن کے ہر فن مولا کا حلقہ۔ خود بین، ناقص، نا فہم، بر خود غلط جو اپنی بکواس سے بہت کچھ تو ایک کتاب کی اچھی یا بری قسمت پر اثر انداز ہو سکتا ہے "تلخ ایلوا" کے بارے میں مباحثے کرتا اور اس طرح اسے شہرت سے ہم کنار کر دیتا۔ اور اب ایسا ہے کہ جیسے وہ کتاب پیدا ہی مردہ ہوئی تھی اور "سرکس" اپنی شہرت کی راہ پر کامیابی کے ساتھ اکڑتی ہوئی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

اس کے بعد متعدد مواقع پر —— جن میں سے کچھ معمولی تھے اور کچھ اہم —— کس طرح فوسٹر کا وہ لاغر اور بھدا جسم فن ڈک کی مسرتوں سے الجھتا رہا۔

فن ڈک، بہرحال، وہاں ایک حصار میں پہنچ گیا تھا۔ خود کو چشموں کی سرزمین کے جزیرے میں چھپائے ہوئے بغیر کسی دوست غمخوار اور بغیر کسی سرمایہ کے وہ ہر وقت اپنی ناکامی کے بارے میں سوچا کرتا وہ بالکل ناکام تھا اور یہ اس کی اپنی غلطی نہیں تھی۔ اور یہ اس کی ذہانت اور صلاحیتوں کی موجودگی میں اپنی غلطی کیونکر ہو سکتی تھی؟ یہ موجودہ طرز زندگی کی غلطی تھی، اس تہذیب کی خام کاری کی غلطی تھی اس مادہ پرستانہ بھیڑیے کی غلطی تھی جو انسانی ذہانت کا قاتل بن بیٹھا تھا۔ اور یہ فوسٹر کی غلطی تھی۔

ہمیشہ فن ڈک یہ توقع کرتا رہا کہ فوسٹر اب خود کو اس سے دور نہ رکھ سکے گا۔ وہ تصور ہی نہیں کر پاتا تھا کہ وہ اس شخص کو دیکھ کر کیا نہ کرے اور پھر ایک دن وہ متحیر ہو گیا۔ جب اسے ایک تار ملا۔
"ادھر سے گذرتے ہوئے، کیا میں تمہارے ساتھ دوشنبہ اور منگل کے دن ٹھہر سکتا ہوں؟"

(کاکلز فوسٹر)

فن ڈک کو اپنی آنکھوں پر اعتبار ہی نہیں آ رہا تھا۔ اور پھر تجسس، سنگ تحیر، اور پنہاں و پراسرار تحریک کے تحت جس کی وہ تشریح کرتے ہوئے خوف کھاتا تھا —— اس نے تار دیدیا۔
"آجاؤ۔"

اور یوں وہ شخص وہاں موجود تھا۔ وہ آیا تھا —— چاہے آپ کو یقین نہ آئے —— اپنے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لئے۔ اس نے ہلن ایڈمس سے سنا تھا کہ فن ڈک کو اس سے تکلیف پہنچی ہے، اور اسے اس سے کچھ شکایات بھی ہیں۔
"میں اس احساس کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا، میرے بزرگ، چنانچہ میں نے سوچا کہ میں راستے میں رک جاؤں۔ دیکھوں معاملہ کیا ہے اور اسے سلجھاؤں۔"

گذشتہ رات کھانے کے بعد فوسٹر نے مصالحت کرنے کی کوشش کی۔ بے صبری کے ساتھ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا جیسے پالتو کتے کی آنکھیں بلی پر جم جاتی ہیں، اور وہ خود کو اس کا حقدار سمجھنے لگتا ہے،... اور فن ڈک سے کہا تھا "بتاؤ، کیا بات تھی؟"

فن ڈک نے صرف یہ کہا کہ کوئی بات ہی نہیں تھی، ہیلن ایڈمس زرا احمق ہے۔"

"اوہ! مجھے یہ سنکر بڑی خوشی ہوئی۔" فوسٹر خوشی سے چیختے ہوئے اپنی کرسی سے اچھل پڑا اور فن ڈک کے کندھے پر ہاتھ رکھدیا۔ "میں بے انتہا خوش ہوں، میرے بزرگ، میں اسے کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے دوست نہ رہیں؟ ہم تو کتنے طویل عرصہ سے ایک دوسرے کے دوست رہے ہیں۔"

بخدا۔ فن ڈک اس سے کس قدر نفرت کر رہا تھا۔

"کس قدر دلچسپ کتابوں کا ذخیرہ ہے تمہارے پاس۔" فوسٹر نے مڑتے ہوئے فن ڈک کی طرف استعجاب اور تشکر بھری نگاہوں سے دیکھا۔ "ہر کتاب دلکش معلوم ہوتی ہے۔ میں تو تمہارے ترتیب کے انداز کی بھی داد دیتا ہوں۔ اور یہ کھلی ہوئی کتاب گیر ——— مجھے تو بڑی حقارت محسوس ہوتی ہے۔ کتابوں کو شیشوں کے پیچھے بند کرتے ہوئے ———!"

فوسٹر سامنے آگیا اور اپنے میزبان کے بالکل قریب ہی بیٹھ گیا وہ کسی قدر آگے جھک گیا اور میزبان کے گھٹنے پر اپنا ہاتھ رکھدیا۔

"دیکھو! میں آخری بار کہہ رہا ہوں، لیکن میں بات پکی کر لینا چاہتا ہوں کیا ہمارے درمیان کوئی بدگمانی ہے؟ میرے بزرگ بتاؤ کیا ہے کوئی بدگمانی؟ میں جانتا ہوں کہ تم نے گزشتہ رات مجھے اطمینان دلایا تھا، لیکن میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ......."

فن ڈک نے اس کی طرف دیکھا اور اسے گھورتے ہوئے اچانک بڑی لطیف سی نفرت انگیز مسرت محسوس کی۔ اس نے اس شخص کے لمس کو اپنے گھٹنے پر پسند کیا۔ وہ خود بھی قدرے آگے جھک گیا اور سوچنے لگا۔ کتنا دل خوش کن ہوگا یہ، کہ وہ فوسٹر کی آنکھوں کو اس کے سر کے اندر دھنسا دے، انہیں کچھ مڑا دے، پاش پاش کر دے کہ وہ اندر دھنس جائیں، ان کے گڑھوں کو خون آلود اور خالی چھوڑ دے۔ اس نے کہا۔

"کیوں، نہیں! بالکل نہیں۔ میں نے تم سے گذشتہ رات ہی کہا تھا۔ آخر بدگمانی ہو بھی کیا سکتی ہے؟"

اس ہاتھ نے گھٹنے کو کسی قدر اور مضبوطی سے تھام لیا۔

"میں بے انتہا خوش ہوں۔ یہ بڑا ہی فرحت بخش ہے فرحت بخش مجھے امید ہے کہ تم مجھے احمق تصور نہ کروگے۔ لیکن میرے دل میں تمہارے لئے ہمیشہ سے خلوص رہا ہے جب سے مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں ہمیشہ تم کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے ہمیشہ تمہاری صلاحیتوں پر رشک کیا ہے۔ تمہاری ناول ——— وہ ——— وہ ——— وہ جو لیک ایلوا کے بارے میں تھی۔"

"تلخ ایلوا۔"

"ارے ہاں! وہی وہی۔ وہ لاجواب کتاب تھی۔ متزلزل ہونے کے باوجود وہ بڑی عمدہ تھی۔ اسے کسی قدر اور بلند ہونا چاہئیے تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے میری اس زمانہ میں یہی رائے تھی۔"

"ہاں، اسے کسی قدر اور بلند ہونا چاہئیے تھا۔"

"تمہارا زمانہ بھی آئے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ اچھی کوششوں کا بدلہ دیر سے ہی ملتا ہے۔"

"ہاں۔ میرا زمانہ بھی آئے گا۔"

وہ باریک سیٹی کی سی آواز جاری رہی!

"اب مجھے میری استعداد سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے ہاں ایسا ہی ہے۔ تم انکار نہیں کر سکتے۔ میں جھوٹی شرم کا اظہار نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہی میرے باطن میں بھی ہے۔ میرے اندر یقیناً کچھ صلاحیتیں ہیں لیکن اتنی نہیں جتنی کہ لوگ سمجھتے ہیں اور تم! تمہارے اندر تو اس سے کہیں زیادہ صلاحیتیں ہیں جتنی وہ خیال کرتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں میرے بزرگ! تم بیشک ایسے ہی ہو لیکن مجھے امید ہے تم معاف کروگے اگر میں کہوں کہ تم نے کوئی ترقی نہیں کی ہے جیسی تمہیں کرنا چاہئیے تھی۔ یہاں محبوس ہو۔ ہر طرف پہاڑوں میں محصور ہو۔ مرطوب آب و ہوا میں۔ جہاں ہر وقت بارش ہوتی رہتی ہے ——— کیوں رو رہے ہو؟ تمام دنیا سے بیگانہ ہو۔ انسان سے تمہارا ملنا جلنا نہیں، ان سے بات چیت کر کے تم یہ پتہ لگانے سے بھی تو قاصر ہو کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ کیوں! ذرا میری طرف تو دیکھو۔"

فن وک نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا

"اب میں نصف سال لندن میں رہتا ہوں، وہاں تمام بہترین چیزیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ بہترین مباحثے۔ بہترین موسیقی بہترین تماشے اور پھر میں تین مہینے کے لئے سمندر پار اٹلی یا یونان یا کہیں اور چلا جاتا ہوں۔ باقی تین مہینے دیہات میں گزار دیتا ہوں اب بتاؤ یہ کتنا عمدہ پروگرام ہے۔ تم بھی اسی طرح رہو۔"

اٹلی یا یونان یا کہیں اور!

فن وک کے سینے کے اندر کسی چیز نے حرکت کی۔ گھر، گھر، گھر، کس قدر تمنا تھی اس کو، کتنی بیتاب خواہش تھی اس کو کہ وہ صرف ایک ہفتہ یونان میں اور دو دن سسلی میں گذار سکے! کبھی کبھی تو وہ سوچنے لگتا تھا کہ بس بھاگ ہی جائے وہاں، لیکن جب جیب میں پیسوں کا سوال آتا تھا تو......... اور کیسے یہ بیوقوف، یہ خر مغز، یہ بر خود غلط، مغرور، سرپرستی دکھا رہا ہے کہ........

وہ باہر سنہری دھوپ کی طرف دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا خیال ہے تمہارا تفریح کے بارے میں؟" اس نے مشورتاً کہا۔ "سورج ابھی ایک گھنٹہ تک اور نہ ڈوبے گا۔"

جیسے ہی اس کے لبوں سے یہ الفاظ ادا ہوئے اس نے محسوس کیا کہ جیسے کسی اور ہی نے اس سے کہلائے ہیں۔ اس نے اپنے رخ کو تقریباً نصف پیچھے کی طرف گھما کر بھی دیکھا کہ شاید وہاں کوئی اور موجود ہو۔ یہ احساس اس کے اندر اس وقت سے ہی بیدار ہو گیا تھا جبکہ فوسٹر وہاں آیا۔ تفریح؟ آخر کیوں وہ فوسٹر کو تفریح کے لئے لیجائے۔ کیوں اس کو اپنی محبوب سرزمین کی سیر کرائے، کیوں اس کے خطوط، خم اور خلار دکھائے کیوں آکس واٹر کی بیابانی سیر دکھلائے۔ کیوں ارغوانی بادلوں سے اس طرح ڈھکی ہوئی پہاڑیاں دکھلائے جیسے کسی آرام طلب دیو کے گھٹنوں کے نیچے کمبل اڑسا ہوا ہو؟ کیوں؟ جیسے اس نے کسی اور کی طرف رخ کر کے مڑتے ہوئے کہا ہو۔ "کیوں اس میں تمہارا کچھ اور ہی منصوبہ چھپا ہوا ہے۔"

وہ دونوں روانہ ہو گئے۔ راستہ یکایک جھیل پر ختم ہو گیا، اور پھر درختوں کے درمیان جھیل کے کنارے کنارے بڑھتا گیا۔ جھیل کی دوسری طرف چمکدار پیلی روشنی نیلاہٹ پر چھائی ہوئی تھی۔ پہاڑیں تاریک ہو رہی تھیں۔

فوسٹر جس انداز سے گفتگو کر رہا تھا اس سے ایسا مترشح ہو رہا تھا جیسے وہ احکامات صادر کر رہا ہو۔ وہ اس سے کسی قدر آگے ہی آگے چل رہا تھا۔ اپنے لاغر اور ملبوس تر سے جسم کو پر شوق جھکولوں کے ساتھ آگے بڑھا رہا تھا جیسے وہ جلدی میں ہو کہ کہیں کوئی ایسی چیز اس سے چھوٹ کر نہ رہ جائے جو اس کے لئے انتہائی فائدہ بخش ہے وہ اپنے کندھوں پر سے فن وک کی طرف یوں الفاظ لڑھکا رہا تھا۔ جیسے وہ سارس کے سامنے چارہ پھینک رہا ہو۔

"حقیقتاً مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ اور کیسے نہ ہوتی؟ بہرحال یہ ایک نیا انعام ہے۔ انہوں نے سے ابھی دو ہی ایک سال سے دینا شروع کیا ہے، لیکن یہ ہے بڑا مسرت بخش۔ سچ: بڑا ہی مسرت بخش کہ اس کے حصول کی کوشش کی جائے۔ جب میں نے لفافہ کھولا اور اس میں چیک دیکھا۔ تو، اگر تم چاہتے تو اس وقت مجھے ایک نہ تے ہلاک کر دیتے! سچ مچ تم ایسا کر سکتے تھے۔ یقین مانو سٹو پونڈ تھے کیا یہ بڑی رقم نہیں؟ لیکن یہ اعزاز بھی تھا......"

فوسٹر رک گیا

"کیوں کیا بات ہو؟"

"کون سی؟"

"تم ہنسے تھے۔"

"کسی بات نے ہنسا ہی دیا۔"

فوسٹر نے اپنا ہاتھ فن وک کے ہاتھ میں ڈالدیا۔

"کتنا پسندیدہ ہے یہ کہ ہم دوستوں کی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چہل قدمی کریں۔ میں ذرا وہمی قسم کا آدمی ہوں۔ میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میرا کہنا تو یہ ہے کہ زندگی بے انتہا مختصر ہے، ہمیں چاہیئے کہ ہم دوسروں کے ساتھ میل محبت کے ساتھ رہیں چاہے وہ کوئی ہو۔ تم بیحد الگ تھلگ رہتے ہو میرے بزرگ۔" اس نے فن وک کے ہاتھ کو دبایا۔ "تمہارے اندر یہی خرابی ہے۔"

یہ اذیت تھی، شدید آسمانی اذیت! اس دبلے ہڈیوں کے

ڈھلانچے سے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں محسوس کرنا کتنا فرحت بخش تھا۔ وہ
تقریباً اس کے دل کی حرکت کو بھی محسوس کر سکتا تھا۔ اس ہاتھ کو
محسوس کرنا کتنا فرحت بخش تھا۔ جو اس کے اندر لالچ پیدا کر رہا تھا کہ
اسے موڑ دے، امیٹھ دے اور ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز سنے۔ ترڑ۔۔ ترڑ۔ ترڑ
اس لالچ کو اپنے اندر پرورش دیتے ہوئے وہ کتنی مسرت محسوس کر رہا تھا
جیسے اس کے اندر پانی کھول رہا ہو لیکن پھر بھی وہ اس لالچ پر عمل کرنے
سے قاصر تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے نوسٹر کے ہاتھ کو مس کیا، پھر
الگ ہٹ گیا۔

"ہم گاؤں تک آپہونچے ہیں۔ یہی وہ ہوٹل ہے جہاں گرمیوں
میں لوگ آتے ہیں۔ یہاں سے ہم داہنی طرف مڑیں گے۔ چلو میں تم کو
اپنا قرار دکھاؤں گا۔"

"تمہارا قرار؟" نوسٹر نے سوال کیا۔ "میں اپنی لاعلمی کی معافی
چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے بتاؤ یہ قرار کیا ہوتا ہے؟"

"قرار ایک طرح کا چھوٹا چشمہ ہوتا ہے۔ پانی کی ایک مختصر جھیل
پہاڑوں کی وادیوں کی گود میں! بیحد پرسکون حسین، خاموش، ان
میں سے کچھ تو اتھاہ گہرے ہوتے ہیں۔"

"میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"یہاں سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ہیں، راستہ ناہموار ہے
تمہیں تکلیف تو نہ ہوگی؟"

"نہیں ذرا بھی نہیں۔ میرے پیر کافی لمبے ہیں۔"

"ان میں سے کچھ اتھاہ گہرے ہیں ——— بے انتہا عمیق
کسی نے ان کی تہہ کو نہیں چھوا ہے ——— لیکن ہیں بالکل پرسکون
شیشہ کی طرح، ان پر صرف سائے ہی پڑتے ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے فن ڈک؟ میں پانی سے ہمیشہ خوف کھاتا
رہا ہوں۔ میں نے کبھی تیرنا نہیں سیکھا۔ میں اپنے قد سے زیادہ
گہرائی میں نہیں گیا ہوں۔ کتنا عجیب ہے یہ؟ لیکن اس کی وجہ
صرف یہ ہے کہ عرصہ ہوا جب میں مدرسہ میں پڑھتا تھا اور بچہ ہی تھا
چند بڑے ساتھیوں نے مجھے پکڑ کر سر کے بل پانی میں ڈبو دیا، انہوں
نے مجھے غرق ہی کر دیا تھا۔ سچ مچ! وہ مذاق کی حد سے بھی آگے نکل
گئے تھے۔ مجھے ابھی تک ان کے چہرے یاد ہیں۔"

فن ڈک نے غور کیا۔ اس کے ذہن میں تصویر کھنچ گئی وہ
لڑکوں کو دیکھ سکتا تھا۔ لمبے تڑنگے، توانا تندرست اور
یہ مینڈک کا سا ہڈی اور چمڑا۔ ان کے مضبوط ہاتھ۔ اس کی گردن کے
گرد۔ اس کے سرکنڈوں کے سے پیر پانی کے باہر ٹھوکریں سی مارتے
ہوئے، ان کے قہقہے، اور اچانک محسوس کرنا کہ بات بگڑ رہی ہے، لاغر
جسم ایک دم نرم ہو کر بے حس......

اس نے ایک گہری سانس لی۔

نوسٹر اس کے برابر ہی چل رہا تھا۔ آگے نہیں تھا۔ جیسے وہ
کس قدر خوفزدہ ہو اور تحفظ کا خواہش مند ہو۔ درحقیقت منظر ہی
تبدیل ہو چکا تھا۔ ان کے آگے اور پیچھے عمودی پہاڑی راستہ پتھروں اور
روڑوں سے بھرا ہوا پھیلا تھا۔ ان کے داہنی طرف پہاڑی کے دامن
میں ایک گہرے نشیب پر چند کاٹیج تھیں۔ تقریباً سنسان لیکن
شام کی دھندلائی ہوئی روشنی میں اور بھی ویران دکھائی پڑ رہی تھیں
حالانکہ وہاں تھوڑا بہت کام ہو رہا تھا۔ پتلی پتلی چمنیوں سے ڈوبتی
ہوئی آواز آ رہی تھی۔ پانی کی ایک دھار بڑی خشمگیں سی ایک جھیل میں
گر رہی تھی اور ایک سیاہ سایہ پہاڑیوں کے مقابل میں سوالیہ نشان
بنا رہا تھا۔

اب ڈھلان کافی عمودی ہو گئی تھی، اور نوسٹر نے گہری سانس
لے کر چھوڑ دی۔

فن ڈک اس کی اس حرکت پر اور بھی چڑ گیا۔ استاد بلا پتلا
ہوتے ہوئے بھی یہ اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکتا ہے۔ کاٹیج نیچے
چھوڑتے ہوئے وہ بہتے ہوئے پانی کی دھار کے کنارے، جو کبھی کاہی
اور سفید یا بھوری ہو جاتی تھی۔ پہاڑیوں کی طرف بڑھتے رہے۔

اب ان کا رخ ہلولین کی طرف تھا۔ وہ دریا پہاڑیوں کے
پیالے کے گرد چکر لگاتا ہوا داہنی طرف مڑ گیا تھا۔

"وہ رہا قرار!" فن ڈک نے اشارہ کرتے ہوئے۔ "تم کہا ہو سورج
اتنے عرصہ نہ رہے گا جتنی میں امید تھی۔ اندھیرا ابھی سے بڑھ رہا ہے۔"

فوسٹر نے ٹھوکر کھائی، اور فن دک کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"اس دھند نے تو پہاڑیوں کو بھیانک بنا دیا ہے۔ جیسے یہ زندہ انسان ہوں۔ مجھے راستہ بڑی مشکل سے نظر آ رہا ہے۔"

"ہم یہاں بالکل اکیلے ہیں۔" فن دک نے کہا۔ "کیا تم سکوت کو محسوس نہیں کر رہے ہو؟ لوگ اب کانوں کو چھوڑ کر گھر جا چکے ہوں گے اب یہاں ہمارے سوا کوئی نہیں ہو۔ اگر تم غور کرو تو بڑی عجیب سبز روشنی پہاڑیوں پر پھیلتی ہوئی دیکھو گے۔ یہ صرف لمحہ بھر رہے گی اور پھر تاریکی چھا جائے گی۔"

"آہ یہ ہے میرا قرار۔ فوسٹر! تم جانتے ہو میں اس جگہ سے کس قدر محبت کرتا ہوں؟ میں اسے بالکل اسی طرح اپنی ملکیت سمجھتا ہوں جس طرح تم اپنی تخلیقات، تمام مسرتوں، شہرت اور کامیابی کو سمجھتے ہو۔ میرے پاس یہ ہے اور تمہارے پاس وہ سب کچھ۔ شاید، بالآخر ہم دونوں برابر ہیں۔ ہاں ......

"لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ جیسے میں اس پانی کے ٹکڑے کا ہوں اور یہ میرا اور ہم دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے۔ ہاں ...... کیا یہ تاریک نہیں ہے؟"

"یہ گہرے قراروں میں سے ایک ہے۔ کسی نے بھی آج تک اسے ہاتھ نہیں لگایا ہے صرف ہلیین اس سے آگاہ ہے، اور میں قیاس کرتا ہوں کہ ایک دن یہ مجھے بھی اپنی حفاظت میں لے لے گا اور مجھے سرگوشیوں میں اپنے راز بتائے گا ——"

فوسٹر کو چھینک آ گئی۔

"بہترین۔ بیحد خوبصورت ہے، فن دک! مجھے تمہارا قرار پسند ہے۔ دل کش! اور اب ہم کو لوٹ چلنا چاہئے۔ کانوں کے درمیان چلنا بڑا مشکل ہے۔ خنکی بھی کافی بڑھ گئی ہے۔"

"وہ چھوٹا سا محراب وار ستون دیکھ رہے ہو تم؟" فن دک نے فوسٹر کا ہاتھ پکڑ کر رہنمائی کی۔ "یہ کسی نے اسے پانی کے اندر تعمیر کرایا ہے۔ مجھے گمان ہوتا ہے اس کے پاس کشتی ہو گی۔ آؤ ذرا نیچے جھانکو۔ اس چھوٹے سے محراب دار ستونوں کے قریب کتنی گہرائی محسوس ہوتی ہے اور پہاڑ بھی سمٹ آتے ہیں۔"

فن دک، فوسٹر کو ہاتھ سے تھام کر محراب دار ستونوں کے قریب لے گیا۔ درحقیقت وہاں پانی کافی گہرا نظر آ رہا تھا۔ گہرا اور سیاہ! فوسٹر نے نیچے جھانکا پھر اوپر پہاڑیوں کی طرف دیکھا۔ بالکل جیسے وہ سب قریب سمٹ آئی تھیں اس کو پھر چھینک آئی۔

"مجھے خطرہ ہے، زکام ہو گیا ہے مجھے! ہم کو گھر واپس چلنا چاہیئے فن دک۔ ورنہ ہمیں راستہ بھی نہ ملے گا۔"

"گھر ہی ہے پھر!" فن دک نے کہا۔ اور اس کے ہاتھ رشتہ دار کی طرح گردن کے گرد جکڑنے لگے۔ ایک لمحہ کے لئے سر نصف ہو گیا۔ اور خوف زدہ بچکانہ آنکھیں تکنے لگیں۔ پھر ایک دھکے کے ساتھ تھرتھری آسان ہو گئی۔ جسم آگے دھکا کھا گیا، اور ایک تیز چیخ پیدا ہوئی، پھر پانی کا چھپاکا ہوا۔ اور اس سفید چیز نے بڑھتے ہوئے دھندلکے میں اتھل پتھل کرنا شروع کیا۔ کئی بار ایسا ہی ہوا پھر دور تک بلبلے پھیل گئے اور خاموشی چھا گئی۔

خاموشی بڑھنے لگی۔ قرار کو اس نے آغوش میں چھپا لیا اور جیسے ساکت پہاڑیوں نے ہونٹوں پر سے انگلی رکھ دی۔ فن دک خاموشی میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ سکون حاصل کر رہا تھا۔ اس نے ذرا بھی جنبش نہ کی وہ وہاں کھڑا ہوا قرار کے سیاہی مائل پانی کو گھورتا رہا۔ وہ اپنے ہاتھ باندھے تھا جیسے کسی گہری سوچ میں پڑ گیا ہو۔ لیکن وہ سوچ نہیں رہا تھا وہ صرف ایک فرحت بخش چونکا دینے والے، ایک لطیف احساس سے محظوظ ہو رہا تھا جس کے بارے میں پہلے اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

فوسٹر جا چکا تھا —— وہ عذاب جان، فضول گو، خود پسند، بر خود غلط احمق! جا چکا تھا کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔ قرار نے یقین دلا دیا تھا۔ وہ فن دک کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا جیسے وہ تابندہ کرتے ہوئے کہہ رہا ہو "تم نے بڑی عمدگی کے ساتھ کر دیا —— ایک ضروری چابکدستی کا کام۔ ہم دونوں ہی نے کیا ہے۔ میں نے اور تم نے۔ میں تم پر فخر کرتا ہوں۔"

وہ اپنے آپ پر فخر کر رہا تھا۔ آخر کار اس نے اپنی زندگی کے لئے ایک واضح اقدام کیا تھا۔ خیالات، پرشوق خیالات کا اب اس کے ذہن میں سیلاب آ گیا تھا۔ کتنے سالوں تک وہ اس جگہ پڑا رہا۔ اپنی

رنجش اور کمزوری کو بغیر پڑھے کے بدن کی طرح پرورش کرتے ہوئے۔ اور بالآخر عمل کا موقع مل گیا۔ اس نے خود کو حرکت دی، اور پہاڑیوں کی طرف دیکھا۔ اسے فخر تھا ــــــــ اور وہ یخ بستہ تھا وہ کانپ رہا تھا اس نے اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کر لئے۔ ہاں، وہ دھندلی سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی، جو تاریکی پھیلنے سے پہلے چند لمحوں تک پہاڑیوں کے سائے سے الجھی رہتی تھی۔ دیر کافی ہو رہی تھی۔ اسے لوٹنا چاہئیے۔

راستے پر چلتے ہوئے وہ اس قدر کانپ رہا تھا کہ اس کے دانت بجنے لگے۔ اور پھر جیسے اسے احساس ہوا وہ فرار کو چھوڑنا نہیں چاہتا ہو فرار سے اسے انس ہو گیا ــــــــ ساری دنیا میں وہی ایک اس کا رفیق تھا جیسے ہی اس نے راستہ میں ٹھوکر کھائی تنہائی کا یہ احساس اور بھی بڑھ گیا۔ وہ گھر جا رہا تھا، ایک خالی مکان میں۔ گذشتہ رات اس میں ایک مہمان تھا۔ کون تھا وہ؟ کیوں نوسٹر، حقیقتاً ــــــ نوسٹر اپنے احمقانہ قہقہوں اور اوسط درجہ کی پسندیدہ آنکھوں کے ساتھ۔ اب نوسٹر وہاں نہ ہوگا۔ نہیں، وہ اب وہاں کبھی بھی نہ ہوگا۔

اور اچانک بن پکے نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اسے کیا معلوم تھا کیوں؟ علاوہ اس کے کہ اب وہ فرار چھوڑ چکا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس نے خواہش کی کاش وہ وہاں رات بھر ٹھہر سکا ہوتا لیکن سردی ہو رہی تھی اس لئے وہ نہیں ٹھہر سکتا تھا اور اس لئے وہ اب دوڑ رہا تھا تاکہ وہ جلد ہی مانوس روشنی اور فرنیچر والے مکان میں پہونچ جائے ــــــ اور وہ تمام چیزیں جنہیں وہ اچھی طرح جانتا تھا اس کو سہارا دیں۔

اس کے دوڑنے سے روڑے اور پتھر اس کے قدموں کے نیچے بکھرنے لگے۔ اور اس کے پیچھے چھر چھر کی آواز پیدا کرنے لگے جیسے کوئی اور بھی اس کے پیچھے دوڑ رہا ہو۔ وہ رک گیا؛ اور دوسرا دوڑنے والا بھی رک گیا۔ اس نے سکوت میں سانس لی۔ اس کے بدن میں اب کافی گرمی آگئی تھی۔ اس کے رخساروں پر پسینہ کی دھاریاں بہنے لگی تھیں اور ایک دھار گردن سے بہہ کر قمیص کے اندر جاتی ہوئی محسوس ہو رہی اس کے گھٹنے لرز رہے تھے۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف پہاڑیاں عجب سکوت میں غرق تھیں، بادل اب دلیسی ربڑ کے لیسے غلاف بن گئے تھے جن کو پہنا اور اتارا جا سکتا ہو، اور وہ گہرے ارغوانی رنگ کے غلاف آسمان پر تیر رہے تھے اور ستارے، سمندر میں تیرتی ہوئی کشتی کی جھلملاتی ہوئی آنکھوں کی طرح نظر آنے لگے تھے۔

اس کے گھٹنے کسی قدر سنبھلے، اس کے دل کی دھڑکن میں کمی ہوئی، اور اس نے دوبارہ دوڑنا شروع کر دیا، اچانک وہ موڑ پر مڑا اور ہوٹل کے سامنے آگیا۔ ہوٹل کے چراغ روشن تھے اور اس کی کھڑکیاں بند ہو رہے تھے، اب وہ جھیل کے کنارے راستہ پر آہستگی کے ساتھ چلنے لگا۔ اور اگر کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہوتا تو اسے کافی اطمینان و سکون نصیب ہو جاتا۔ وہ دو ایک بار رکا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اور ایک بار اس نے للکارا بھی "کون ہے؟" مگر صرف پیڑوں کی سرسراہٹ ہی نے جواب دیا۔

اس نے بڑی عجیب تدبیر نکالی تھی لیکن اس کے ذہن میں اس شدت کے ساتھ خلش ہو رہی تھی کہ وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ کیا یہ فرار ہے جو اس کا پیچھا کر رہا ہے؟ فرار پھیلتا، سرکتا ہوا سڑک کے کنارے کنارے آ رہا تھا تاکہ وہ تنہا نہ رہے۔ وہ فرار کو اپنے کان میں تقریباً سرگوشی کرتے ہوئے سن سکتا تھا۔ "ہم دونوں نے مل کر کیا ہے، اور اس لئے میں نہیں چاہتا کہ ذمہ داری کا سارا بوجھ اکیلے تم ہی پر پڑے۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا تاکہ تم اکیلے نہ رہو۔"

وہ پہاڑی راستے سے گھر کی طرف اتر آیا۔ وہاں سے گھر کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے پیچھے پھاٹک کی کھنکھناہٹ سنی جیسے وہ اس کو اندر قید کر رہا ہو۔ وہ بیٹھک میں چلا گیا جو روشنی سے منور ہو چکی تھی وہاں وہ سب کتابیں موجود تھیں جن کی نوسٹر نے تعریف کی تھی۔

بوڑھی عورت جو اس کی دیکھ بھال کرتی تھی نمودار ہوئی۔

"جناب، کیا آپ چائے پئیں گے؟"

"نہیں شکریہ، ایمی۔"

"کیا دوسرے صاحب کو چاہئیے؟"

"نہیں، وہ صاحب رات کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"پھر تو رات کا کھانا ایک ہی کے لئے چاہئیے؟"

"ہاں، ایک ہی کے لئے چاہئیے۔"

وہ سونے کے لیے کمرے میں چلا گیا اور فوراً ہی گہری غنودگی میں ڈوب گیا۔

وہ اس وقت بیدار ہوا جب بوڑھی خادمہ نے اس کے کندھے کو ہلا یا اور کہا کہ کھانا تیار ہو گیا ہے۔ وہ جھلملاتی ہوئی موم بتیوں کی روشنی کے علاوہ کمرے میں بہت تاریکی تھی۔ وہ دو سرخ موم بتیاں جو اس دیوار گیر پر رکھی ہوئی تھیں وہ ان سے کتنی نفرت کرتا تھا۔ اس نے ہمیشہ ان سے نفرت کی تھی۔ اور اب وہ ایسی نظر آ رہی تھیں جیسے ان میں فوسٹر کی صفات ہوں ——— وہی باریک سیٹی کی سی تیز آواز

اسے ہر لحظہ یہ خطرہ ہو رہا تھا کہ فوسٹر اب کمرے میں داخل ہوا کہ اب ہوا، حالانکہ وہ جانتا تھا وہ نہیں آئے گا۔ وہ مسلسل دروازے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتا رہا لیکن اس طرف اندھیرا تھا کہ کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ سارے کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا علاوہ اس دیوار گیر کے جہاں دو موم بتیاں فریاد آسا روشنی کے ساتھ رو رہی تھیں۔

وہ کھانے کے کمرے میں چلا گیا اور کھانے بیٹھ گیا لیکن اس سے کچھ کھایا ہی نہیں جا رہا تھا۔ میز کے کنارے جہاں فوسٹر کی کرسی ہونی چاہیے تھی، بڑا عجیب سا لگ رہا تھا عجیب سا خالی خالی، تنہائی کا احساس دلاتا ہوا۔

وہ ایک بار میز سے اٹھ گیا اور کھڑکی تک گیا اور اسے کھول کر باہر جھانکا۔ اس نے کوئی آواز سنی، خاموشی کے درمیان بہتے ہوئے پانی کی کھل کھل، گھل گھل جیسے کوئی تالاب لبالب بھر رہا ہو۔ درختوں میں سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ ایک الو بھیانک آواز میں چیخا۔ اچانک جیسے کسی نے اس کے شانوں کے پیچھے سے اس سے کچھ کہا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی اور اپنی گھنی بھنوؤں کے درمیان کمرے میں گھومتا بالآخر بستر پر سونے پہنچ گیا۔

کیا وہ سو رہا تھا یا پہلے سے وہ اونگھتے ہوئے خالی دماغ لیٹا ہوا تھا؟ وہ پوری طرح جاگ رہا تھا، بالکل بیدار تھا، اور اس کا دل توہمات سے دھڑک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اس کا نام لے کر پکارا ہے۔ وہ ہمیشہ کھڑکی کو کسی قدر کھول کر اور پردے کو لپیٹ کر سویا کرتا تھا۔ اس رات چاندنی کافی بڑی بیماری کی طرح چیزوں پر پڑ رہی تھی۔ نہ وہ روشنی کا سیلاب تھا اور نہ روشنی کی ایسی پھوار تھی کہ کہیں کسی دائرے کو کسی مربع کو بے معنی بنا کے اور باقی اشیا کو آبنوسی اندھیرے میں چھوڑ دے۔ روشنی کسی قدر مدھم تھی، سبزی مائل شاید اس روشنی کی طرح جو پہاڑیوں پر اندھیرا چھا جانے سے نمودار ہوتی ہے۔

وہ کھڑکی کی طرف گھورنے لگا۔ اسے ایسا نظر آیا تھا کہ جیسے وہاں کوئی چیز حرکت کر رہی ہو۔ کاہی مبہوت روشنی میں یا اس سے باہر جیسے کوئی چاندی کے رنگ کی چیز چمک رہی تھی۔ وہ نزدیک گھورنے لگا۔ وہ بالکل بہتے ہوئے پانی کی طرح نظر آ رہی تھی۔

بہتا ہوا پانی ——— ! وہ اپنے سر کو اٹھائے ہوئے سن رہا تھا، جیسے کھڑکی کے اس پار سے وہ پانی کے گرنے کی آواز سن رہا تھا جو بہہ نہ رہا ہو بلکہ انڈیلا جا رہا ہو۔ بھر رہا ہو۔ بھر رہا ہو۔ غور غور کرتا ہوا جیسے اب وہ لبالب بھر جائیگا، اب بھر جائے گا۔

وہ بستر میں کچھ اونچا ہو کر بیٹھ گیا اور پھر اس نے ٹھیک دیکھا کہ اندر کھڑکی کے درمیان سے پانی رس رہا تھا۔ وہ اسے چوکھٹ کی ابھری ہوئی لکڑی تک کروٹ لیکر بھرتے ہوئے، پھر رکتے ہوئے، پھر بھرتے ہوئے، بہتے ہوئے اور کروٹ لیتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ اور عجیب چیز تو یہ تھی کہ وہ بغیر کسی آواز کے گزر رہا تھا۔

کھڑکی کے اس پار تو اس کی غور غور سنائی دیتی تھی، لیکن کمرے میں کامل سکوت تھا۔ کہاں سے آ رہا ہے یہ؟ اس نے کھڑکی ... کی چوکھٹ پر پانی کی روپہلی دھار کو ابھرتے، سمٹتے اور بہتے ہوئے دیکھ لیا اسے کھڑکی بند کر دینی چاہیے۔ اس نے اپنے پیر چادر اور کمبل سے باہر نکال لئے اور نیچے دیکھا۔

اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ فرش پانی کی چمک دار سطح کر لبریز تھا اور وہ سطح اونچی اٹھ رہی تھی۔ اور اس کے دیکھتے دیکھتے چارپائی کے آدھے پائے ڈوب گئے۔ وہ بغیر کسی لہر، بغیر کسی حرکت، بغیر کسی بلبلے کے اوپر چڑھ رہا تھا۔ اب وہ چوکھٹ سے اوپر بہہ رہا تھا لیکن بے آواز! بن وک بستر میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ کپڑے اس کی ٹھوڑی تک لپٹ گئے ——— اس کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں۔ اس کا گلا

رہ گیا جیسے اس کے حلق میں کوئی ڈھکن لگ گیا ہو۔

لیکن اسے کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ اسے اس کو روکنا چاہئے۔ پانی

لب کرسیوں کے آسن تک چڑھ آیا تھا، لیکن پھر بھی بے آواز تھا۔ کیا

وہ دروازے تک پہونچ سکے گا؟

اس نے اپنے ننگے پیر نیچے رکھے اور پھر چیخ اٹھا۔ پانی برف کی

طرح سرد تھا۔ یکایک جھکتے ہوئے وہ اس کی تاریک چمکیلی اور یکساں

سطح کو دیکھنے لگا۔ جیسے کسی نے اسے آگے دھکا دیدیا۔ اس کا چھوٹا اس

کا سر برف کی طرح سرد سیال کے نیچے تھا۔ وہ چپچپا سا لگ رہا تھا،

وہ سرد برفانی سیال پگھلے ہوئے موم کی طرح گرم محسوس ہو رہا تھا۔

اس نے اپنے پیر پھینکنا شروع کئے پانی اس کے سینے تک آگیا تھا۔ وہ باہر

باہر جھا۔ وہ صرف آئینہ، کتابوں کی قطار، ڈوربر کے گھوڑے کی تصویر کو

دیکھ سکتا تھا۔ جو اس کی پہونچ سے باہر تھے۔ اس نے پانی پر ہاتھ مارنا

شروع کر دیا اور جیسے اس کے چھلکے سے مچھلی کے سفنوں کی طرح اس کے

چہرے پر چپکنے لگے۔ چیچپے سے! وہ اس کے درمیان اپنا راستہ بنانے کی

جدوجہد کرتا رہا۔

پانی اب اس کی گردن تک چڑھ آیا تھا۔ پھر کسی چیز نے اسے نیچے

سے پکڑ لیا کسی چیز نے اسے تھام لیا۔ وہ جدوجہد کرتا رہا اور چیختا رہا "مجھے

جانے دو، مجھے جانے دو۔ میں تم سے کہتا ہوں مجھے جانے دو۔ میں تم سے

نفرت کرتا ہوں۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ میں تمہارے پاس نہ

آؤں گا۔ نہ آؤں گا ——"

پانی نے اس کے منہ کو ڈھانپ لیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے

دیدوں میں کسی نے انگلی بھونک دی ہو۔ ایک ننگے ہاتھ نے بڑھ کر اس

کی ران کو پکڑ لیا۔

صبح کے وقت عزیب خادمہ نے دروازہ پر دستک دی جواب

نہ ملنے پر وہ حجامت بنانے کے لئے پانی لے کر اندر داخل ہوگئی جیسا کہ

اس کا طریقہ تھا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ مالی کو بلانے دوڑ گئی

انہوں نے اس کی لاش کو اٹھا کر بستر پر رکھدیا۔ جس کی آنکھیں

پھٹی ہوئی تھیں اور بھنچے ہوئے دانتوں کے درمیان زبان باہر نکلی

ہوئی تھی۔

اس تمام ہنگامہ کا باعث صرف ایک الٹا ہوا پانی کا جگ

تھا۔ پانی ایک چھوٹے سے دھبہ کی شکل میں دری پر جمع ہوگیا تھا۔

(بشکریہ "معیار")

جگن ناتھ آزاد •

غزل

کبھی بلندیٔ ذوقِ نظر تک آپہنچی
کبھی حیاتِ غمِ بال و پر تک آپہنچی

فغاں کو مل کے بھی ہم تم اسے نہ روک سکے
شبِ وصال حدودِ سحر تک آپہنچی

نظر سے بڑھ کے زباں تک کہیں نہ آجائے
جہانِ دل کی کہانی نظر تک آپہنچی

ابھی تو دل میں ہے خوابیدہ حسرتِ پرواز
یہی ہوس جو کبھی بال و پر تک آپہنچی

نظر کی بات تو کچھ اور ہے مگر کیوں کر
تری شبیہہ دلِ بے خبر تک آپہنچی

بھٹک رہی ہے ابھی تک تو آرزو دل کی
اگر کبھی یہ تری رہ گذر تک آپہنچی

(بشکریہ ماہِ نو)

کیف نوگانوی •

غزل

کس کو سنائیں حالِ دل
سوز سے خالی ہے محفل

ہوش نہ ہو جب تک شامل
جوشِ محض ہے لاحاصل

ذوقِ طلب ہو گر کامل
کچھ بھی دور نہیں منزل

ہائے وہ بدقسمت راہی
کوئی نہ ہو جس کی منزل

محفل میں اب کوئی نہیں
انکی عنایت کے قابل

قیس کی نظروں سے پوچھو
ذرہ ذرہ ہے محمل

مدت سے ہیں فرشِ راہ
آپ کی خاطر دیدۂ و دل

ڈھونڈ رہی ہے چشمِ جہاں
کیفؔ کوئی مردِ کامل

(بشکریہ دعوت)

عمران انصاری •

غزل

میں اُس کی نظر میں آ تو گیا، مانا کہ کسی قابل نہ سہی

دیتا ہوں دعائیں نظروں کو نذرانۂ جان و دل نہ سہی

منزل کا مگر میں قائل ہوں، میرے لئے گر منزل نہ سہی

دنیا نہ سہی، عقبیٰ نہ سہی، لیلیٰ نہ سہی، محمل نہ سہی

کچھ سوز تو ہے، کچھ ساز تو ہے، نغمہ نہ سہی آواز تو ہے

کچھ درد تو ہے، کچھ کرب تو ہے، گر عشق میں کچھ حاصل نہ سہی

چہرے پہ خطوطِ تاج محل، زلفوں پہ شبستانی آنچل

وہ موجِ صبا میں تازہ کنول، کہنے کو مہ کامل نہ سہی

عالم اکبرآبادی •

○

گھبرا کے فکرِ شام و سحر ہم نے چھوڑ دی

دنیا تھی اک فریبِ نظر ہم نے چھوڑ دی

تیر بھی انتظارِ محبت پہ تھا گراں

تیری بھی آج راہ گذر ہم نے چھوڑ دی

منزل سے دور جا کے یہ اندازہ ہو سکا

منزل تو پیچھے اہلِ سفر ہم نے چھوڑ دی

جب آ گیا خیال ترے اضطراب کا

ہر اک دعا بغیرِ اثر ہم نے چھوڑ دی

کیا جان دے سکے گا کوئی تیرے نام پر

دنیا میں یہ بھی رسم اگر ہم نے چھوڑ دی

وہ وقت زندگی پہ گراں تھا گراں رہا

جس وقت کہ امیدِ سحر ہم نے چھوڑ دی

عالم کرم ضرور وہ کرتے ستم کے بعد

امیدِ التفات! مگر ہم نے چھوڑ دی

ابو الطیب

یہ موت کس کی؟

رات ڈھل چکی تھی۔ آسمان ستاروں سے جھلملا رہا تھا۔

فتح محمد کے "دل بہار ہوٹل" کے ٹاٹ کے پردے ہوا میں ہل رہے تھے۔ ہوٹل کی دائیں جانب کی ٹین کی دیوار میں کبھی کبھی ہوا کے کسی تیز جھونکے سے ٹکرا کر ایسی تڑتڑ سے معلوم ہوتا جیسے ننھی کنکر کی سطح پر سے گزر رہی ہو۔ جنوبی کے جاڑے تھے۔ کرنٹ کی سوں سوں شائیں شائیں کرتی فضا میں تیر رہی تھیں۔ لوگ سروں کو جھکائے اپنے کوٹوں کے کالروں کو اونچا کئے سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی بھولا بھٹکا مہاجر دونوں ہاتھوں سے خود کو سمیٹ کر کانپتا ہوا گزر جاتا۔ خوب صورت کاریں بجلی کی طرح چمک کر تاریکی میں گم ہوتی جا رہی تھیں۔

کچھ مزدور پیشہ لوگ دل بہار ہوٹل کے سامنے بیٹھے گپ شپ میں مشغول تھے۔ فتح ان کے درمیان گشت کر رہا تھا۔ ہوٹل کے سامنے کارپوریشن کا کوڑا دان بھی رکھا ہوا تھا۔ جہاں غلاظت اور گندا پانی گرنے میں سے نکل کر آس پاس کے گڑھوں میں بہہ کر جھاگ دے رہا تھا۔ اس گڑھے کے قریب کچھ مہاجروں کی جھونپڑیاں تھیں جن میں سے دائمی مریضوں کی کھوں کھوں کی کڑک دار آوازیں احتجاج کی صورت میں اٹھ رہی تھیں۔ دو چار مرگلے کتے نیم اندھیرے میں کھڑے ان خریداروں کو تاک رہے تھے۔ جو دل بہار ہوٹل کی ٹوٹی ہوئی تپائیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ جب وہ ہڈیاں چوڑ کر سڑک پر پھینکتے تو کتے ان پر لپکتے اور دیر تک گتھم گتھا ہوتے۔ فتح ان پر ڈنڈا لے کر دوڑتا۔ وہ ہڈی چھوڑ کر بھاگ گئے اور دکان سے دور ہٹ کر ایک دوسرے سے گتھ جاتے۔

یہ پاکستان کے دارالحکومت کراچی کے ایک شاندار بازار کے پشت کی دنیا ہے۔ اس تنگ اور تاریک گلی میں سے کراچی کا سب سے بے رونق بازار ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پس ماندہ اچھوتوں کی کالونی میں فلم کے ذریعے مہذب شہروں کی زندگی دکھائی جا رہی ہو۔

فتح نے آج مرغ پلاؤ پکا رکھا ہے لیکن معمول کے مطابق خریداروں کا پتہ نہیں اس لئے فتح آج کچھ اداس نظر آ رہا تھا۔

"ارے بھئی بھتے (فتح) آج ٹھنڈی کچھ جیاستی (زیادہ) ہے"

تھوڑی دیر بعد چند مزدور بائیں طرف سے اس کے ہوٹل میں داخل ہوئے۔

"ہاں بھیا اللہ کی مرجی (مرضی) کیا کھاؤگے؟" فتح میں کچھ جان سی آگئی۔

"یار ذرا ہاتھ تو دھو لینے دو"

"جرور (ضرور) یہ کام پہلے ہو نا چہئے (چاہئے)"

مزدور تنور کے پاس آئے۔ سلور کا میلا سا لوٹا اٹھا کر باری باری سے کلی کی۔ ہاتھ دھوئے اور تپائی پر آکر بیٹھ گئے۔

"ہاں بھئی بتاؤ کھاؤ گے کیا؟" ابھی وہ تپائی پر بیٹھے ہی تھے کہ فتح ان کے سر پر سوار ہو گیا۔

"ٹھہر جا یار ذرا سانس تو لینے دے"

"جرور!"

اچھا تو بتا آج کیا ہے؟" تپائی پر بیٹھ کر ان میں سے ایک نے رومال سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔

"مرغ پلاؤ۔ چانپ۔ بھنا ہوا گوشت۔ زبان۔ مغز۔ آلو گوشت دال۔ سبجی (سبزی)" فتح حسب عادت ان سارے سالنوں کے نام بڑی تیزی سے سنا گیا۔ لیکن جب مرغ پلاؤ کو دوبارہ کہا تو وہ اس فقرے پر ٹھہر گیا اور قدرے مسکرا کر کہا۔

"استاد بڑے مزے کا ہے پلاؤ"

"کیتنے کا؟"

"صرف ایک روپیہ کی پلیٹ!"

"چھوڑ یار۔"

"تو بھنا ہوا لاؤ۔"

فتح کو بڑا صدمہ پہنچا۔ دل ہی دل میں اس نے کہا لعنت ہو اس دھندے پر، وہ بھنے گوشت کو پلیٹوں میں رکھ کر سوچتا جا رہا تھا۔ "سالے روز روز مرغ پلاؤ کی کہتے ہیں۔ آج محنت کر کے مرغا لایا تو پتہ نہیں کدھر مر گئے۔"

ہوٹل میں ایک پرانا سا پیٹرو میکس دھندلی روشنی چاروں طرف پھینک رہا تھا۔ دو چار بھنگے اس کے گرد چکر لگاتے اور پھر غائب ہو جاتے۔

"واتا فتح! آج کیا پکایا ہے؟" تھوڑی دیر کے بعد دو آدمی اور ہوٹل میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے داخل ہوئے۔ دونوں نو عمر تھے، اور قد بھی متناسب تھا۔ ایک گہرے زرد رنگ کا بوشرٹ زیب تن کئے ہوئے تھا۔ پیر میں سیاہ کروم کا بروگ شو۔ میلی سی گرے رنگ کی پینٹ۔ بال بکھرے ہوئے اور خاک آلود چہرہ کتابی جس میں سے دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں سیاہ چشمے میں سے جھانک رہی تھیں۔ بشرے پر فکر و جنون کی بہت سی لکیریں الجھی ہی ڈور کی طرح بکھری پڑی تھیں دائیں ہاتھ میں کچھ منتشر کاغذات اور کتابوں کا پلندہ تھا۔

دوسرے کے ہاتھ میں سگار تھا۔ اس کے بال بھی کچھ بے ترتیبی سے پیشانی پر پڑے ہوئے تھے۔ یہ شخص کمرے کی مرمت کرتا تھا۔ یہ تو اس کا پیشہ تھا لیکن طبعاً وہ ایک سخن دوست آدمی تھا۔ کام کے بعد اکثر وہ کسی نہ کسی الجھن میں مبتلا رہتا۔ فلسفے کو اس نے باقاعدہ نہ پڑھا تھا۔ بلکہ ہر کتاب کے کچھ صفحات وہ غور سے پڑھتا اور کتاب کو اپنے صندوق میں رکھ آتا پھر دوسری اٹھا لاتا۔ اس طرح مختلف فلسفیوں کے اقوال نے اس کے ذہن میں نظریاتی ہیولے کی صورت اختیار کر لی تھی جسے خود تو وہ سمجھ نہ پاتا لیکن اس نظریاتی ہیولے نے اس کی عملی زندگی کو بہت متاثر کیا۔ زمانے سے بے منزلی جو پہلے فقط عادت تھی اب اس کا ایک اصول بن گئی۔ کسی طرح کے سیرحی قوانین کا وہ پابند نہ رہا۔ جو جی میں آتا کرتا۔ دنیا اور انسانوں سے کچھ امید نہ رکھتا لیکن ضرورت مندوں کی ہر طرح مدد کرتا حتیٰ کہ دوسروں سے قرض لے کر بھی ان کی حاجتیں رفع کر دیتا۔ اس کیفیت نے اس کے چہرے کے خد و خال کو بھی سدرجہ متاثر کیا جس کی وجہ سے وہ اکثر جذبات سے عاری نظر آتا تھا۔ اس کے مسے ہوئے چہرے پر پتلی پتلی بھنسیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے بالوں میں تیل پڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ اس کے سر پر کیلے کے پتوں کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ سویٹر، سیاہ بھڑکیلی افغان چپل تھی اور ہاتھ میں ڈیم کی کتاب "ٹاپ آف فلاسفی" کا اردو ترجمہ۔

وہ دونوں دوست تپائی پر آ کر بیٹھ گئے۔ آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ ہوٹل میں دوسرے لوگ بھی بات چیت کر رہے تھے۔ فتح چولہے کے پاس جا کر بھگونے میں چمچہ ڈال کر پلاؤ کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ پیٹرومیکس لیک کر رہا تھا اس لئے روشنی اور ڈوبتی سی جا رہی تھی۔ باہر سردی سے کتے کے پلے دردناک آواز میں قیاؤں قیاؤں کر رہے تھے۔ کوئٹہ کی سرد ہوا اس انداز پر فراٹے بھر رہی تھی جس کی وجہ سے کبھی کبھی پیڑ کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ بھی سنائی دے جاتی۔

"لو بابو جی۔ آج مرغ پلاؤ کھاؤ۔" فتح نے آج بغیر آرڈر دیئے دو سنگل پلیٹیں ان دونوں کے سامنے رکھ دیں۔

"بھئی" عبید ابھی اپنا فقرہ پورا بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ ایک دم خاموش ہو گیا اور کوٹ کی جیبیں ....ٹٹولنے لگا۔

صرف نو آنے، اندر جیب ہی میں پیسوں کو ٹٹول کر اس نے اندازہ لگایا۔ اس وقت اس کے جی میں آیا کہ مرغ پلاؤ کی پلیٹیں واپس کر دے اس نے پھر پلیٹ کی جانب دیکھا تو اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور بھوک اسے اور ستانے لگی۔ کیونکہ یہ شے اس نے ایک عرصے سے نہ کھائی تھی۔ بھٹیار خانے کی ایک ہی طرح کی روٹیاں کھاتے کھاتے اس کے ذہن سے مختلف قسم کے کھانوں کا ذائقہ دھندلا ہو چکا تھا۔ پلاؤ کا خوشبودار دھواں اسے پھر ماضی کی طرف لے گیا جہاں وہ آئے دن انہیں اڑایا کرتا۔ متنجن۔ قورمہ۔ بریانی۔ مرغ پلاؤ نہ جانے کتنے کھانوں کا ذائقہ اس کے ذہن میں ابھر آیا۔

خواہش اور شدید ہوئی تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں، پھر اس نے اپنے دوست کی طرف دیکھا جو خود اس کے تذبذب کو دیکھ کر آہستہ آہستہ

مسکرا رہا تھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور بغیر کچھ سوچے عبید نے کھانا شروع کر دیا۔ ننکا ننکا دل خود سے دھڑک رہا تھا، اور وہ کھانا کھا رہا تھا۔

"سعید خوب کھاؤ" خوف کی شدت کو کم کرنے کے خیال سے اس نے سعید سے کہا۔

"بھیا! مجھے بھی بھوک لگی ہے کچھ مجھے بھی کھلا دو" ایک ناتواں ضعیف آواز اس سرد رات میں ان کے کانوں تک پہنچی۔

ان دونوں کے ہاتھ رک گئے اور انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

ایک ضعیف العمر عورت اس کڑاکے کے جاڑے میں دکان کے باہر کھڑی پتے کی طرح کانپ رہی ہے۔

اس کے سوکھے ہوئے سفید بال کیچڑ اور دھول سے بادوازن کے جنوں کی صورت اختیار کر کے سر پر بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ بدن پر صرف ململ کا ایک پرانا کرتا تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے خود کو بھینچ لیا تھا۔

اپنا درد دل کہہ کر وہ ایک مستقل سوال بنی ہوئی جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ چہرہ بڑھاپے کی شفقت اور سنجیدگی سے چمک رہا تھا، پلکوں کی اوٹ میں سے سہمی سہمی آنکھیں اپنے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔

وہ دونوں فکر میں ڈوب کر برف کی طرح جم کر رہ گئے۔

سعید کے ستے ہوئے چہرے پر بے چارگی طاری تھی کبھی کبھی اس کی چھوٹی چھوٹی بے رونق آنکھیں تڑپتے کیڑے کی طرح جھپکتیں لیکن وہ زبان سے کچھ نہ کہتا۔

عبید اس آگ میں پھنک رہا تھا جو اس سوال سے اس کے اندر بھڑک اٹھی تھی۔ اس وقت وہ اس بے کس و لاچار بوڑھی کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن وہ خود بھوکا ننگا تھا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ اس سے کہدے کہ معاف کرے اور کہیں اور چلی جائے کیونکہ یہ کسی دوسری جگہ جا کر پیٹ بھر سکتی ہے۔ ذہن میں فوراً رد عمل پیدا ہوا، تو خود غرض ہے اس طرح کی معذرتوں سے تو اپنی انسانیت کو کیوں مارتا ہے۔ اس کی مدد کر اپنے پیٹ کے ساتھ اپنے ضمیر کو بھی غذا دے، تاکہ جسم کے ساتھ ضمیر بھی توانا ہو سکے، انسان کی ہر حالت میں مدد کرنا چاہئے —— اسی عمل سے ضمیر کو توانائی اور مسرت ملے گی۔ پھر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا

کچھ لمحوں بعد اس کشمکش نے اس کے چہرے پر پشیمانی کا رنگ اختیار کر لیا۔

"بھیا! کچھ کھلا دے" بوڑھی ماں نے پھر کہا۔

"لو ماں بیٹھ جاؤ" عبید نے اپنے سامنے سے پلاؤ کی پلیٹ ہٹا کر اور بڑھیا کو اندر آ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

بڑھیا اندر آ کر تپائی پر بیٹھ گئی۔ فتح نے اسے دیکھا۔ ہاتھ کا حقہ اس نے زمین پر رکھا اور بڑھیا کے پاس آیا۔ "چل چل باہر بیٹھ" ہاتھ کے اشارے سے اس نے بڑھیا کو باہر نکل جانے کو کہا۔

بڑھیا نے اس لتاڑ کا کوئی جواب نہ دیا فتح کو صرف مشفقانہ انداز میں دیکھا۔ اسی طرح کی ایک نظر سعید اور عبید پر ڈالی۔

"بھئی اسے یہاں بیٹھ جانے دو۔ یہ پیسوں کا کھانا کھا رہی ہے"

"بابو جی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ خریدار (خریدار) بگڑتے ہیں کہ گندے لوگوں کو ہوٹل کے برتنوں میں یہاں بٹھا کر کھانا کیوں کھلاتے ہو۔ ایک تو ویسے ہی اس ہوٹل میں لوگ کم آتے ہیں۔ اور پھر آج میرا مرغ پلاؤ دیگچا بھرا پڑا ہے"

"بھیا مجھے بڑا دکھ ہوگا۔ اس وقت اسے اندر ہی بیٹھ کر کھانے دو" عبید نے بڑی بے چارگی کے ساتھ کہا۔

لیکن فتح نہ مانا۔ بڑھیا دونوں کو دیکھتی رہی۔ انتظار طویل ہو گیا تھا۔ عبید سوچ میں پڑ گیا۔ فتح پیچھے مڑا اور میلوں پرے کانچ کے گلاسوں کو اٹھا اٹھا کر اپنی میلی صافی سے صاف کرنے لگا۔ پانی کے جگ خالی ہو چکے تھے۔ فتح نے انہیں اٹھایا اور اندر کمرے میں چلا گیا۔

"بھیا! مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔ اس جھگڑے کو چھوڑو تو مجھے کھانا کھلا دے" بڑھیا نے بھوک کی شدت سے مجبور ہو کر کہا۔ ہوا کے جھونکے اور تیز ہو گئے۔ اسے اور کپکپی لگ گئی لیکن اس مرتبہ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے خود کو زور سے بھینچ لیا۔

عبید اپنی تپائی سے اٹھا اس کے ہاتھ کو پکڑ کر اسے چھپر کے نیچے کر کے وہیں بیٹھ جانے کے لئے کہا تاکہ وہ سردی سے بچ جائے جب وہ چھپر کے نیچے بیٹھ گئی تو پھر اس نے اپنی مرغ پلاؤ کی پلیٹ اس کے سامنے لا کر رکھ دی۔ بوڑھی ماں سب کچھ بھول کر کھانے میں مصروف ہو گئی۔ پلاؤ جب ختم ہو گیا تو آنکھیں پھاڑ کر اس نے پھر عبید کی طرف

دیکھا اور بڑے بھولے پن سے کہا جیسے وہ اپنے بچوں کو مخاطب کر رہی ہو۔
"ذرا سے چاول اور دلا دے"
"ارے مائی تو شریف لوگوں کو کیوں پریشان کرتی ہے، چل چل آگے بڑھ۔
ایک تو ان کے منہ سے سارا کھانا چھین لیا سالی ان سالے فقیروں کی گیرت (غیرت) بالکل مر جاتی ہے۔"

بوڑھی ماں نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہ کی ــــــ البتہ اس کا چہرہ ضرور نفرت سے متغیر ہو رہا تھا ــــــ لیکن اسی کیفیت میں اس کی بوڑھی آنکھوں سے شفقت بھی رس کی طرح ٹپک رہی تھی۔ جبید نے ان آنکھوں کو دیکھا تو اسے اپنی دادی اماں یاد آگئی جو اتنی ہی معصوم اور سنجیدہ تھی۔ شفقت کے ساتھ صبح اسے اٹھاتی۔ کچھ پڑھ کر اس پر پھونکتی پھر اسے چڑیوں کو باجرہ ڈالنے کے لئے باہر صحن میں بھیجدیتی۔ وہ جلدی سے باجرہ ڈال کر اپنی دادی اماں کے پاس آجاتا تو وہ پھر اسے ایک آنہ دیتی جس کی وہ حلوائی سے جلیبی لا کر کھاتا ــــــ ماضی کے اس تصور سے اس کا دل بھر آیا اور دن کے ساتھ آنکھیں بھی آبدیدہ ہوگئیں۔ کیونکہ ہندوستان سے اس کی بوڑھی دادی کے کئی خط آچکے تھے جس میں لکھا تھا بیٹا ایک مرتبہ صورت تو دکھا جا۔ اس کا غم زدہ دل پھر تڑپا۔ اس نے پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر اسے ٹٹولا۔ لیکن وہاں نو آنے سے زیادہ تھے کہاں۔ جو پہلی پلیٹوں کے لئے کافی نہ تھے۔ پھر اس نے انہی مدد طلب نگاہوں سے سعید کی طرف دیکھا اور کہا۔

"بھئی اسے کھانا اور کھلانا ہے۔"

سعید نے اپنے سامنے سے پلاؤ کی پلیٹ اٹھائی اور بوڑھی کے سامنے رکھدی۔

"لیکن تم کیا کھاؤگے؟"

"میری فکر نہ کرو ہماری تو ایسے ہی گزرے گی۔ یہ کیوں لوٹ کر جائے ہم اس کے علاوہ دوسروں کے لئے اور کیا کر سکتے ہیں۔ اس لئے مزید پریشان ہونا بیکار ہے۔" وہ پھر خاموش ہوگیا۔ مگر اسے سگرٹ کی طلب محسوس ہوئی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر اٹھکر پان والے کی دکان پر چلا گیا۔ وہاں سے گولڈ فلیک کا ایک سگریٹ خریدا اور منہ میں لگا کر سلگایا اور پھر ہوٹل میں آکر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ تبدیل نہ ہوا تھا۔

اس اندھیری رات میں صرف اس کی آنکھیں چمک رہی تھی۔ اور اس کے لبے کشوں سے سگریٹ شعلے کی طرح دمک رہا تھا۔ سامنے پیڑ و میکس کی تیکھی روشنی میں صرف ایک کیڑا اچکر کاٹتا نظر آرہا تھا۔

بڑھیا نے دوسری پلیٹ بھی صاف کردی۔ اب اس کے چہرے پر اطمینان امڈ آیا تھا، اور وہ سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھی۔

"پانی پیوگی؟" جبید نے اسے پانی کی یاد دلائی۔

"ہاں بیٹا!"

سعید نے جگ سے گلاس میں پانی ڈالا اور بوڑھی ماں کے سامنے رکھدیا۔ بوڑھی ماں اسے بھی پی گئی۔

"بس؟"

"ہاں بیٹا بس۔ اللہ اس کی تجھے جزا دے۔ تیری عمر دراز ہو تیری اچھی سی بہو گھر میں آئے۔" بڑھیا اپنے آخری فقرے پر خود ہی ہنس پڑی اور اٹھکر تنور کی طرف جانے لگی، تاکہ کچھ دیر آگ کے قریب بیٹھ کر جاڑے سے بچے ... بڑھیا جب چارپائی کے سہارے تنور کے پاس آکر کھڑی ہوگئی تو فتح پھر چلایا۔

"ارے او ری بڑھی۔ چل چل آگے۔ یہ جگہ سونے کی نہیں یہیں مت کر، پھر اور بھی آکر کھڑے ہو جائیں گے۔"

"بیٹا میں سوؤں گی نہیں (سونا نہیں چاہتی) صرف جاڑے کے مارے تیرے تنور کے پاس کھڑی ہوگئی ہوں سب مجھے مت بھگا۔ میں اس جاڑے میں کہاں جاؤں گی۔" بوڑھی اماں نے یہ ساری باتیں فتح سے اس طرح کہیں جیسے کسی دردمند کو حال زار سنایا جاتا ہے۔ اس مرتبہ بھی بوڑھی ماں کالب و لہجہ فتح کے انسانیت کش سلوک سے متاثر نہ ہوا بلکہ امید اور محبت اس میں برقرار رہی۔

جبید بوڑھی ماں کے اس مگر پلو کردار سے بہت متاثر ہوا کیونکہ اس کی حاجت میں پیشہ ورانہ گدائی نہ تھی ــــــ اور نہ بوڑھی ماں نے اپنی بھوک کے اظہار کے لئے کوئی غیر معمولی ڈرامائی انداز اختیار کیا تھا بلکہ وہ اسی لب و لہجہ میں عام انسانوں کو مخاطب کر رہی تھی جس لب و لہجے میں وہ اپنے بیٹے پوتوں سے بات چیت کرتے اتنی عمر گذار چکی تھی۔

فتح کسی بات پر جب رضامند نہ ہوا تو بوڑھی ماں آہستہ آہستہ

سڑک پر چلنے لگی اور ادھر اُدھر دیکھتی جاتی کہ کہیں رات گذارنے کے لئے جگہ مل جائے۔ جب وہ ہوٹل سے کچھ دور چلی گئی تو پھر عبید نے سعید سے کہا: "میرے پاس پیسے صرف (ختم ہو گئے ہیں) کیا یہ ادھار کرے گا۔ اگر نہیں تو میں اپنا پارکر کا فاؤنٹین پن اس کے پاس رکھ دوں، کل پیسے دے کر اسے لے جاؤں گا۔ شاید ہمارا اعتبار یوں نہ کرے۔ کیونکہ وہ اکثر شکایت کرتا رہتا ہے کہ یہ بابو ادھار کھا کر پھر ادھر کا رخ نہیں کرتے۔"

سعید اس بات پر مسکرایا اور جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوا آگے بڑھا اور فتح کے ہاتھ پر دو نوٹ رکھ کر ہوٹل کے باہر نکل آیا۔ بڑھیا اب ان سے کچھ دور ہو گئی تھی۔

فتح کے دل بہار ریستوران کے قریب فلک نما عمارتیں ایستادہ تھیں، ان کے محدب شیشوں میں سے جھلاہٹ دودھ کی طرح جمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اوپر آسمان ایک شامیانے کی طرح تنا ہوا تھا، چاند بڑی آہستہ روی سے اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ ان عالیشان عمارتوں کے عقب میں مہاجروں کے کیبن بنے ہوئے تھے جہاں ایک بکری بندھی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ایک ٹھیلا کھڑا تھا۔ بکری کو جاڑے سے بچانے کے لئے اس پر ٹاٹ کا ایک ٹکڑا ڈال دیا گیا تھا۔ وہ جگالی کر رہی تھی کبھی کبھی گردن کے ہلانے سے اس کے گلے کی گھنٹیاں بجنے لگتیں۔

بوڑھی ماں جب اس کے قریب پہنچی تو وہ ممیائی۔ اماں نے اسے دیکھا، اس اندھیرے میں اس کی چمکتی معصوم آنکھوں میں اس نے رحم پایا تو وہ اس کے قریب آ گئی۔ بکری دم ہلانے لگی تو اماں نے بھی اسے چمکارا اور اس کے اوپر سے ٹاٹ لے کر ٹھیلے کے نیچے جا کر سکڑ کر لیٹ گئی۔ بکری اس کے اور قریب چلی گئی اور دیر تک دم ہلا کر اسے سونگھتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی اس کے پاس بیٹھ کر اپنی زبان سے اس کے کپڑوں کو چاٹتی رہی۔

سعید ایک دم قہقہہ مار کر ہنس پڑا —— اور اس کیفیت میں عبید کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"بھئی کیا ہے؟" عبید نے پوچھا۔

"دیکھا؟"

عبید نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

یہ دونوں ابھی تک دل بہار ہوٹل کے قریب کھڑے ہوئے تھے

عبید کی خاموشی نے سعید کو بھی سنجیدہ کر دیا۔ اب اس نے بھی چپ سادھ لی۔ عبید اس وقت ایک افسانوی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اسے اپنے آئیڈیل کے لئے ایک کردار کی ضرورت تھی —— ایسے کردار کی جس کی فریب فطرت ایک متحرک قوت کی صورت میں اس میں موجود ہو —— یہ تو صرف اس کا آئیڈیا تھا، لیکن ابھی تک اس کے مظاہرے میں اس قوت کے شعوری اور غیر شعوری مظاہرے نہیں آئے تھے۔

اس آئیڈیے کی کردہ جگہ جگہ مارا مارا پھرا۔ مختلف لوگوں سے ملا جلا —— ان ملنے والوں میں بہت سے ایسے تھے جو خود کو بحیثیت کردار کے افسانے کے لئے پیش کرتے لیکن عبید کسی پر توجہ نہ دیتا کیونکہ ان میں اکثر و بیشتر ایسے ہوتے جو سماج دشمن رجحانات کے حامل ہوتے یا کسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا۔ لیکن آرٹ میں اب وہ ان کرداروں کی نمائندگی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ آرٹ آج کل انہی کی جلوہ گاہ ہو کر رہ گیا ہے —— اور اس جلوہ گری سے آرٹ کی فطرت بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر آرٹ زندگی کا ترجمان ہے تو انسانی زندگی سے اسے دوستانہ حیثیت سے پیش آنا چاہئے —— اور ان قوتوں اور رجحانات کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی کرنا چاہئے جو تعمیر اور تعمیر میں انسانوں کی مدد کر رہی ہیں۔ لیکن اگر آرٹ نے زندگی میں یہ حیثیت اختیار نہ کی تو معنوی ہستی سے وہ بھی اسی طرح مٹ کر رہ جائے گا جس طرح اور دوسرے علوم و فنون جو انسان کی بعض کمزوریوں کا سہارا لے کر پروان چڑھ رہے تھے۔ اس وقت یہ سارے خیالات اس کے ذہن میں برقی قمقموں کی طرح جل رہے تھے۔ اور اس میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ اس بڑھیا کو سمجھ جائے کہ یہ ہے کیا۔ اس کے ذہن کے نگارخانے میں یہ سوال ایک الجھی ہوئی ڈور کی طرح پڑا ہوا تھا جس کی گرہیں اس میں وحشت پیدا کر رہی تھیں۔

بکری نے بیٹھے بیٹھے ہی اپنے منہ سے بوڑھی اماں کی پیٹھ پر سے ٹاٹ کھسکانا شروع کیا، اماں کلبلائی، بکری رک گئی۔

بوڑھی اماں کو جاڑے سے بچانا چاہئے۔ بکری کی تحریک نے عبید کے ذہن میں اب یہ خیال ڈال دیا —— اور وہ اتنا غالب آ گیا کہ عبید اس کے سوا سب کچھ بھول سا گیا۔

"سعید! تم ٹھہرو، بڑھیا کے لئے میں اپنا کمبل لاتا ہوں تم کہیں بیٹھ جاؤ یہ کہیں اور نہ چلی جائے۔"

ایک چلتے ہوئے راہ گیر نے یہ بات سن لی، وہ ٹھہر گیا اور کہا۔

"ارے بابا یہ دیوانی ہے۔ تمہارا کمبل کوئی اڑا کر لے جائیگا اسے کچھ نہ ملے گا۔"

"تو ایسے لوگ مدد کے اور زیادہ مستحق ہیں۔" عبید نے جواب دیا۔

"تمہاری مرضی۔" راہ گیر ہنستا ہوا چلا گیا۔

"سعید۔ تم ٹھہرے رہو۔ میں ابھی کمبل لے کر آتا ہوں۔"

اس جذبۂ عمل کو لے کر وہ اپنی نیم تاریک کوٹھڑی میں آیا۔

تخلیق اس پر نشے کی طرح چھائی ہوئی تھی ـــــ اور بوڑھی اماں اس کے ذہن میں احتجاج بکر فن میں ڈھل چکی تھی۔ اس کیفیت میں اس نے اماں کو دوبارہ دیکھا تو اس کا ذہن اور دل کسی نامعلوم درد سے بوجھل ہو گیا ـــــ اور اس وقت اس کی وہی حالت ہو گئی جو بچے کی پیدائش سے قبل درد سے ایک حاملہ عورت کی ہوا کرتی ہے

لیکن اس کے ساتھ عمل کا جذبہ اس میں دھیما پڑتا گیا اور اس وقت اس کا جی چاہا کہ وہ کمبل چھوڑ کر پہلے اس درد کو کاغذ پر پھیلائے۔ اس کی کوٹھڑی کے سامنے ایک مہاجر کا ہوٹل تھا۔ وہ دوڑ کر وہاں گیا اور کاغذ پنسل لے کر بیٹھ گیا۔ درد فن میں ڈھل کر کاغذ پر پھیلنے لگا۔ انسانی محبت، احساس، ذمہ داری، اور رحم کا جذبہ دھیرے دھیرے اس عمل کی موجودگی میں اس سے رخصت ہونے لگا۔ کاغذ پر جیسے جیسے بوڑھی ماں کا خاکہ مختلف رموز کو لیکر پھیلتا چلا گیا عبید پر ویسے ویسے خود ستائش کا جذبہ نشے کی طرح چڑھنے لگا۔ نفس کی اس موج نے اسے چاروں طرف سے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور اس کا احساسِ فرض ظلمات میں بالکل ہی ڈوب گیا۔

معاً اس نے اپنے اندر ایک حرکت محسوس کی۔ اس کا ضمیر چراغ سحری کی طرح ٹمٹما رہا تھا۔ ضمیر کی اس حالت کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا پھر اس پر خوف طاری ہوا۔ اس نے قلم چھوڑ دیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور سوچتا رہا۔

"کیا میں اس فنکاری میں ایک بڑا انسان بن سکوں گا۔ آخر میری زندگی کس لئے۔ صرف فنی تجربوں کے لئے ہے۔ میں فنکاری کے صرف تجربے کرتا ہی مر جاؤں گا۔ میرے اندر کے انسان کا کیا ہوگا؟"

چائے کا ایک کپ ایک عرصے سے اس کے سامنے رکھا ہوا تھا رات کافی ہو چکی تھی۔ دکاندار دکان بند کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے کہا:ـــ

"میاں عبید صاحب چائے کی بھی خبر لے لو بڑی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی ہے۔"

عبید فوراً چونکا اور ٹھنڈی چائے کو شربت کی طرح پینے لگا اور کاغذ پنسل کو جیب میں رکھ لیا۔

کوٹھڑی میں سے کمبل لے کر وہ دوڑا اور بس کے اڈے پر آیا۔

بس صدر جانے کے لئے تیار تھی وہ اس میں بیٹھ گیا۔

بس سے جلدی سے اتر کر وہ بوڑھی اماں کے پاس آیا۔ پھر سعید کو ادھر ادھر دیکھا جو دل بہار ہوٹل کی تپائی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

بکری زور زور سے چلا رہی تھی۔ اس نے کمبل بڑھیا پر ڈالا اور آوازیں دیں۔ لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ پھر اس نے بوڑھی ماں کو نیند کو جگانا چاہا ـــــ لیکن اماں پھر بھی نہ جاگی۔ متوحش ہو کر وہ اس کے چہرے کی طرف جھکا تو وہ کنکری زمین پر مردہ حالت میں پڑا تھا ـــــ پھر اس نے اماں کی نبض پر ہاتھ رکھا لیکن وہاں بھی اماں کی کوئی ہچکی نہ تھی۔ اس کے اندر پھر شدید دھماکے ہوتے لیکن اس وقت اس نے "یہ" محسوس کیا جیسے کوئی بڑی چیز اس کے اندر ٹوٹ رہی ہو ـــ

بکری اب ممیانا بند کر چکی تھی، صرف اپنی تھوتھنی سے نعش کو ٹٹول رہی تھی۔

"سعید!" عبید نے غم زدہ آواز میں سعید کو آواز دی۔

"ہاں! یہاں آ جاؤ۔" ـــــ اس کے پاس ایک اطمینان آمیز آواز آئی۔

"ارے بڑھیا مر گئی۔" اس مرتبہ اس کا اندرونی کرب اس کے لب و لہجہ میں لپٹ کر باہر آ گیا۔

"اچھا تو اب اس کے کفن کا انتظام کرو۔" سعید کو پھر کچھ

خیال آیا ــــــــ ہاں یہ کام اب ہمارا نہیں۔ صبح ہوتے ہی اس نیک کام کو کوئی انجمن انجام دے گی ــــــ اور اگر نعش کو پڑے پڑے زیادہ دیر ہوگئی تو پھر حکومت صحت عامہ کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے اس نعش کو کہیں لے جائے گی۔ غالباً ہسپتال میں تاکہ میڈیکل کالج کے طلبا اس پر تجربہ کرکے انسانوں کی جسمانی بیماریو

کو سمجھ سکیں مسٹر عبید اس نظام زندگی میں انسان کا یہ انجام مصرف ہے۔ لیکن ہاں! تم نے اتنی دیر کہاں لگائی؟"
عبید اس سوال پر آبدیدہ ہو گیا۔
(بشکریہ ہمایوں)

حاصل مرادآبادی

غزل

یہاں تو کوئی بھی غنچہ نہیں کھلا ہے ابھی
چمن میں آکے اسیروں کو کیا ملا ہے ابھی

متاعِ دردِ غمِ عشق کا صلا ہے ابھی
خوشی کے بدلے محبت کو غم ملا ہے ابھی

حیات شوق کشاکش میں مبتلا ہے ابھی
جگر خراش فغاؤں کا سلسلہ ہے ابھی

ترے حضور بھی اے دوست کیا ملا ہے ابھی
وہی الم ہیں وہی غم کا سلسلہ ہے ابھی

جہاں سکون کی نیندیں جہاں سوتا ہے
وہاں سے دور بہت دور قافلہ ہے ابھی

شکایت روشِ غیر کعبے کیوں کر
ستم شعاری احباب کا گلہ ہے ابھی

فضائیں راس کہاں ہیں چمن کی اے حاصل
اگرچہ اپنے ارادوں میں حوصلہ ہے ابھی

طالب حجازی

غزل

جو کٹ جائے کسی کے ناز اٹھاتے زندگی اپنی
ہے رشک قیصر و کسریٰ مجھے وہ بندگی اپنی

جسے ہو جستجوئے کل بنے کیا اس کا اجزا ہے
بڑھتی جاتی ہے قطرے قطرے ہی سے تشنگی اپنی

حیات کش مکش میں موت بھی اک راز رفعت ہے
سر منزل مجھے لے جا رہی ہو ماندگی اپنی

مثالِ بوئے گل غماز اپنا ہو گیا ہوں میں
مجھے مشہور دوراں کر گئی آشفتگی اپنی

غلامیٔ غیر کی مردِ مسلماں کو نہیں زیبا
بسر کرتا ہے آزادی سے شاہیں زندگی اپنی

اگرچہ رحمتِ یزداں مرے کام آگئی طالب
مگر رسوائے محشر کر گئی شرمندگی اپنی

تذکرے اور تبصرے

ماہنامہ "تعمیر انسانیت" لاہور کا مشرقی پاکستان نمبر

قیمت:۔ ایک روپیہ چار آنے

سالانہ چندہ:۔ چھ روپے

مشرقی پاکستان کے متعلق جتنی معلومات ماہنامہ تعمیر انسانیت کے اس خاص نمبر سے حاصل ہو سکتی ہیں اور شاید ہی کسی جگہ سے دستیاب ہو سکیں۔ اس زمانے میں جبکہ خود غرض لیڈروں نے "مشرق" اور "مغرب" کی بحث چھیڑ رکھی ہے اس نمبر کا وجود غنیمت ہی نہیں باعث تسکین بھی ہے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ "انسانیت کی تعمیر" کا جو کام انہوں نے اپنے ذمہ لیا ہے اسے وہ آئندہ بھی اسی حسن و سلیقہ سے انجام دیتے رہیں گے۔

(م ۔ ح)

ماہنامہ "صبح صادق" لکھنؤ کا "قرآن نمبر"

قیمت:۔ دو روپے

سالانہ چندہ:۔ چار روپے

"صبح صادق" کے "قرآن نمبر" کا اندازہ تو کچھ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے لکھنے والوں میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا عبد السلام قدوائی ندوی، مولانا عبد الباری ندوی اور ڈاکٹر میر ولی الدین شریک ہیں قرآن کے متعلق جو بیش بہا مضامین اس نمبر کی زینت ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ہر مسلمان انہیں پڑھے اور ان سے استفادہ کرے

ادارہ صبح صادق نے مالی مشکلات کے باوجود اتنا ضخیم (۲۰۰ صفحات) کا نمبر نکال کر جس بے لوث خدمت اور جذبۂ ایثار کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ خدا کرے اس نمبر کے طفیل ان کی پریشانیاں کم ہو جائیں

(م ۔ ح)

"جدید شعرائے اردو"

ملنے کا پتہ:۔ فیروز سنز ۔ ۶۰ سرکلر روڈ۔ لاہور

جدید اردو شاعری کا یہ تذکرہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ان سب تذکروں سے مختلف ہے جو اس موضوع پر اب تک طبع ہو چکے ہیں تھا ضخیم تذکرے سے پہلے اس موضوع پر گنتی کی جو کتابیں شائع ہوئیں۔ انہوں نے جدید اردو شاعری کے صرف اس اصطلاحی مفہوم کو پیش نظر رکھا جو آزاد اور حالی کی تحریک نے اس کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تذکرے آزاد اور حالی اور ان سے براہ راست متاثر ہونے والے معاصرین کے ذکر سے آگے نہیں بڑھے۔

زیر نظر کتاب میں خاصے سوچ بچار سے کام لیا گیا ہے۔ تقدم و تاخر کے لئے شاعروں کے رجحانات، میلانات اور ماحول کے پیش نظر پورے تذکرے کو چار ادوار میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ متقدمین، متوسطین کے لئے متاخرین اور نئی پود۔ پہلے دور میں آزاد۔ حالی۔ شبلی۔ اسماعیل میرٹھی۔ اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال شامل ہیں۔ دوسرے دور میں حسن کاکوروی سے لیکر آغا شاعر قزلباش تک ان کے ہم عصر ۲۴ شاعروں کا تذکرہ ہے۔ تیسرے دور میں جگر اور جوش سے لیکر حیا لکھنوی تک اور نئی پود میں جہاں نثار اختر اور ناصر کاظمی اور سراج الدین ظفر ایسے شاعر شامل ہیں۔

انتخاب کلام میں اس امر کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ وہ شاعر کے منفرد امتیازی رنگ اور اس کے ماحول کے اثرات کا ترجمان اور آئینہ دار ہو اور پھر اس کتاب میں انہیں شاعروں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کی شاعری نئے اسلوب و خیالات اور نئے تجربات کی حامل ہو۔ پھر یہ کتاب ان کے نمونۂ کلام اور سوانحات پر ہی مشتمل نہیں بلکہ ان کے کلام پر بے لاگ اور بے باک تنقید بھی ہے۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت میں ادارہ تالیفات فیروز سنز نے جس محنت اور کاوش سے کام لیا ہے وہ بلاشبہ قابل تعریف ہے۔

یہ کتاب اردو ادب میں گراں بہا اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی اشاعت کے لئے ادارہ فیروز سنز مستحق تبریک ہے۔ جس نے اس کی طباعت و اشاعت میں خاص اہتمام سے کام لیا ہے۔ ساری کتاب اردو ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ جن شعرا کی تصاویر مل سکی ہیں ان کے بلاک زینت کتاب ہیں۔ جلد مضبوط۔ گرد پوش حسین جو صاحب کتاب اولے کے ذوق حسن کی آئینہ دار ہے۔ ضخامت بڑے سائز کے تقریباً ۷۰۰ سو صفحات۔ قیمت صرف اٹھارہ روپے جو اس محنت و کاوش کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

ہم امید کرتے ہیں کہ اصحاب ذوق اور علم دوست حضرات اس کتاب کو یقیناً پسند فرمائیں گے ان کی حوصلہ افزائی ناشرین کے عزائم میں بلندی اور مزید اعلیٰ ادبی تخلیقات کا موجب بن سکے گی۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ ہمیں اس کتاب میں ایک طرح کی کمی محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ نئے دور کے بعض اچھے شعرا (مثلاً شفیق جونپوری، حفیظ میرٹھی، نعیم صدیقی، فاروق بانسپاری، عرشی بھوپالی وغیرہ) کے کلام کا انتخاب اس میں شریک نہیں۔ غالباً ان حضرات کی چیزیں ناشرین یا مرتب تک پہنچ نہ سکیں بہرحال ہمیں امید ہے کہ آئندہ اڈیشن میں اس کمی کو پورا کردیا جائے گا۔　　(م - ح)

"رنگِ سحر"

مرتبہ طالب حجازی

قیمت :- ایک روپیہ دو آنے

ملنے کا پتہ :- ناظم حلقہ ادب اسلامی، حافظ آباد

"صبح نو" کے بعد "رنگ سحر" حافظ آباد کے حلقہ ادب اسلامی کی پیشکش ہے اس کتاب کو دیکھنے سے ہمیں مایوسی ہوئی کیونکہ ہمیں یہ توقع تھی کہ "صبح" ہو جانے کے بعد کوئی ایسی چیز پیش کی جائے گی جس پر ہم فخر کرسکیں اور یہ کہ سکیں کہ یہ "روز روشن" ہے۔ بہرحال آئندہ یہ بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے کہ حافظ آباد کے حلقہ سے کوئی بہتر چیز آئے گی اور اس کی تلافی ہو جائے گی اس کتاب میں خامیاں ہیں لیکن کسی انسانی کوشش ان سے مبرا ہی لیکن جو چیز اس میں سے صاف جھلکتی نظر آتی ہے وہ ہے مرتب کا خلوص اور جذبہ۔ انھوں نے جس نیک نیتی سے اس کتاب کو مرتب کیا ہے اور اپنے رفقاء کا تعارف کرایا ہے وہ بڑی قابل قدر چیز ہے اور دوسرے حلقہ ہائے ادب کے لئے قابل رشک۔　　(م - ح)

"نئے سفینے"

مرتبہ ابوالفہیم و حمید علی خاں

قیمت :- ۱۲/

ملنے کا پتہ :- مکتبہ نشاۃ ثانیہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد دکن

"نئے سفینے" ادارہ ادب اسلامی حیدرآباد دکن کی پیشکش ہے۔ اس کتابچہ سے اس کا تو اندازہ ہوتا ہے کہ حیدرآباد دکن میں کچھ پرجوش لوگ موجود ہیں جو ادب اسلامی یا تعمیری ادب کے علمبردار ہیں مگر ان کی چیزیں ابھی اس قابل ہرگز نہیں تھیں کہ انہیں کتابی شکل دی جائے بہرحال ہمیں توقع ہے کہ آئندہ اسلامی ادب یا تعمیری ادب کی صحیح صحیح نمائندگی کی جائے گی اور اس کی نمائندگی کا حق جس طرح ادا کرنا چاہیے کیا جائے گا۔　　(م - ح)

ماہنامہ "ہمایوں" لاہور

شمارہ - جنوری ۱۹۵۶ء

سالانہ چندہ :- پانچ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ماہنامہ "ہمایوں" پاکستان کے ادبی رسائل میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے اور جب سے اس نے اپنا رخ "قومی تزکیۂ نفس اور تہذیب اخلاق" کی سمت موڑا ہے۔ اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے ہم ادارۂ ہمایوں کو اس کے لئے قابل مبارکباد سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ایسے حالات میں جبکہ ادبی دنیا کا دھارا الحاد و دہریت، فحاشی و عریانی کی طرف بہہ رہا ہے اس راہ کو پسند کیا اور اسے اختیار کیا اور اس کے نتیجہ میں جو خسارہ ہوا اسے خندہ پیشانی سے ایک بڑے فائدے کے لئے گوارا کیا۔

اس بار "بزم ہمایوں" میں بشیر احمد صاحب نے جو باتیں ادب اور ادیبوں کے متعلق لکھی ہیں، وہ ہر ادیب کو پڑھنی چاہئیں ان کی یہ بات کتنی معقول اور وزنی معلوم ہوتی ہے کہ "جس دل کو محض اپنی غرض نہ ہوگی، جس میں دنیا اور دنیا والوں کا صحیح عکس ہوگا، ان سے صحیح قسم کی محبت و ہمدردی ہوگی۔ اس میں زندگی کی وہ دلکش تصویریں ابھریں گی جو ادب کی صورت میں پیش ہو کر نوع انسان کے لئے دلچسپ اور مفید

پڑھ سکیں گی۔

مقالات میں محمد ضیاء الدین صاحب شمس کا "لباس اور اس کی اہمیت" اور میاں عبد الرحمٰن صاحب اعجاز کا "ماڈرن آرٹ" دونوں ٹھوس اور خاصے تحقیقی ہیں۔ غزلوں کا حصہ کافی جاندار ہے۔ خصوصاً اثر لکھنوی صاحب کی غزل کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے

گجندر سنگھ کا افسانہ "بدھ ہاتھ" اچھا ہے مگر افسانوی حصہ کو ذرا اور بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ (م - ح)

"بنگال میں اردو"

مصنف:۔ وفا راشدی

پبلشر:۔ مکتبہ اشاعت اردو حیدرآباد (پاکستان)

قیمت:۔ مجلد مع گرد پوش پانچ روپے

بنگال سے اردو کے تعلق اور بنگالیوں کی اردو سے محبت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ بنگال میں اردو کا مصنف بنگالی ہے۔ وفا راشدی کی شخصیت اردو داں طبقہ میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ بنگال کا یہ نوعمر ادیب اور خوش فکر شاعر "پیام نو" کی شکل میں اردو کی بلند پایہ نظموں کا ایک مجموعہ پیش کر کے ملک کے گوشہ گوشہ سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اب بنگال میں اردو کے نام سے انہوں نے مشرقی و مغربی بنگال میں اردو کی ابتدا سے لیکر ۱۹۵۰ء تک کی مکمل تاریخ پیش کی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جو کام کسی "انجمن ترقی اردو" کے کرنے کا تھا اس کا بیڑا ایک فرد نے اٹھایا اور بحسن و خوبی پایہ تکمیل تک پہنچا دیا اب آنے والے عہد میں جو شخص بھی اردو کی تاریخ مرتب کریگا اس کے لئے وفا راشدی کی یہ تصنیف مشعل راہ کا کام دے گی۔

مصنف کو اس کتاب کی تصنیف میں جو محنت کرنی پڑی ہوگی اس کا اندازہ کتاب کے مواد سے لگایا جا سکتا ہے۔ کتاب میں بنگال کے تقریباً ڈھائی سو معروف و غیر معروف اردو شعرا کا تذکرہ مع نمونہ کلام موجود ہے۔ اس کے علاوہ بنگال میں اردو کے احیاء نیز اردو و بنگالی کے تعلق پر مختصر لیکن اہم مضامین شامل ہیں۔ آخر میں بنگال سے نکلنے والے اردو جرائد اور اردو کی خدمت کرنے والی انجمنوں کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یقین ہو جاتا ہے کہ بنگال میں اردو کا ماضی تابناک تھا۔ حال تابناک ہے اور مستقبل انشاء اللہ اور زیادہ تابناک ہوگا۔

(ق - ق)

پندرہ روزہ الحسنات رام پور کا خاص نمبر

(داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ)

آج کی ہنگامہ پرور دنیا میں جہاں اوقات نماز کے علاوہ بہت کم ایسے لمحات انسان کو میسر ہوتے ہیں غالباً صرف جیل کی چہار دیواری ہی ایک ایسا گوشہ عافیت باقی رہ گیا ہے۔ جہاں انسان کو کسی موضوع کا حق ادا کرنے کے لائق فرصت نصیب ہو جاتی ہے ایک سال کی نظربندی سے رہا ہونے کے بعد ابو سلیم محمد عبد الحیٔ صاحب نے الحسنات کے زیر نظر خاص نمبر کی شکل میں دنیا کو جو انمول تحفہ دیا ہے اسے دیکھ کر ان فرزندان سیاست کی فراست کا ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے جو تدبر کی زندان سے ذہن کی کھڑکیاں بند کرنے کا کام لینا چاہتے ہیں۔

یہ خاص نمبر داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر مشتمل ہے۔ موضوع اتنا دلچسپ وسیع اور اہم ہے کہ الحسنات کے ...... ۸ × ½ ۵ کے ۱۸۴ صفحات کیا بڑی سے بڑی ضخامت اس کے لئے قطعاً ناکافی تھی۔ یہ بھی غالباً اس موضوع ہی کا اعجاز ہے کہ ضخیم سے ضخیم جلد میں ہو تو سیری نہیں ہوتی یا اتنے مختصر اوراق میں بھی تشنگی کا احساس نہیں چھوڑتا۔ ایک بڑی خصوصیت اس نمبر کی یہ ہے کہ حیات طیبہ کے ساتھ ساتھ تحریک اسلامی کی نوعیت اور غرض و غایت سے بھی پوری طرح متعارف کرا دیا ہے۔ رہی زبان تو اس سلسلہ میں عابد الحیٔ صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں رواں تحریر، بے تکلف جملے، سادہ الفاظ یہ سب ان کی تحریر کی نمایاں خصوصیات ہیں بلکہ بچہ سے لیکر بزرگ تک اور ایک عامی سے لیکر عالم تک ہر شخص ان کی زبان کی شگفتگی سے لطف اٹھاتا ہے۔

یہ نمبر مجلد نہیں ہے اور ایک روپیہ آٹھ آنے کی قیمت میں جلد کا تقاضا مناسب بھی نہیں ہے لیکن دل چاہتا ہے کہ کاش مجلد ہوتا اور لوگوں کے پاس زیادہ مدت تک محفوظ رہتا۔ ویسے مکتبہ الحسنات نے اس کی اشاعت میں کافی اہتمام سے کام لیا ہے۔ کاغذ اچھا ہے اور کتابت دیدہ زیب ہے۔ البتہ کہیں کہیں دو قلم استعمال کئے گئے ہیں

کتابت کی غلطیوں کا فقدان بڑا حیران کن ہے۔ خدا کرے کہ اردو کے دوسرے رسائل بھی غلطیوں کی تصحیم میں اتنی ہی عرق ریزی سے کام لیا کریں۔

(ق۔ق)

"فاران" کراچی کا "سیرت" نمبر

دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

چندہ سالانہ:۔ چھ روپے

قیمت:۔ سیرت نمبر۔ ڈھائی روپے

کام خلوص کا طالب ہو اور کام کرنے والا مخلص تو دنیا کی کوئی مشکل نہیں رہتی۔ اس بات کا ثبوت اس مرتبہ فاران کراچی نے اپنا سیرت نمبر شائع کرکے دیا ہے۔ یہ نمبر جہاں ایک طرف مولانا ماہر القادری کی انتھک محنت، بے پایاں خلوص اور بے پناہ جذبۂ عقیدت کا نتیجہ ہے وہاں موضوع کے نزاکت کے اعتبار سے ان کی قوت نقد و نظر کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ عنوانات پر ایک نظر ڈال کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ۷۰۳ صفحات کے اس نمبر کو جو ضخیم ہونے کے باوجود اس عظیم موضوع کے لئے قطعاً ناکافی تھا سیرت طیبہ کے زیادہ سے زیادہ گوشوں سے منور کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس اختصار کے باوجود مضامین کی جامعیت اپنی جگہ پر قائم ہے۔ خاص طور سے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیرس) سید عبد القدوس ہاشمی، سید ابو الحسن علی ندوی، پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر ضیاء احمد، پروفیسر عبد الحمید اور مسٹر ناتھ رام (ایم۔اے) کے مضامین جامعیت بالاختصار کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔ شیخ مصطفیٰ السباعی اور ڈاکٹر فواد فخر الدین (انڈونیشیا) کے مضامین کے تراجم بھی ایک مثالی چیز ہیں

حصۂ نظم بھی کچھ کم گہربار نہیں ہے۔ خیاباں کے عنوان سے فارسی کے جدید و قدیم شعرا کی منظومات اور کہکشاں کے دامن میں کبیرداس سے لیکر کوثر نیازی تک اردو شاعروں کے نذرانہ ہائے عقیدت جمع کرکے... سمع و نظر ——— کی زیادہ سے زیادہ تسکین کا سامان اکٹھا کیا گیا ہے گلہائے تازہ میں اردو شعرا کی جدید ترین منظومات جمع ہیں۔

اس کے علاوہ مولانا ظفر احمد عثمانی کی عربی نظم، محمد عاصم کے شعر العرب کے نام سے عربی منظومات کے تراجم اور مولانا محمد ناظم ندوی کا مضمون عربی کے چند منتخبات اردو اور فارسی کے ساتھ عربی کی معقول نمائندگی کر رہے ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ نمبر تحقیق، تالیف، اور انتخاب کا ایک نادر گلدستہ ہے۔ اس قسم کے نمبر برسوں کے بعد کہیں نظر سے گذرتے ہیں۔ مضامین کی ترتیب و نظم پر البتہ زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے ——— منظومات کی طرح حصہ نثر میں بھی مختلف عنوانات قائم کئے جاسکتے تھے ٹائٹل سہ رنگا ہے اور خوش مذاقی کا آئینہ دار۔

(ق۔ق)

ماہنامہ "صبح صادق" کا "قرآن نمبر"

(جو ۱۵ر جنوری ۱۹۵۹ء کو شائع ہو چکا ہے)

• قرآن کی دعوت، اس کے مطالبات، اس کی تاثیر اور انقلاب انگیزی اور اس قسم کے تمام موضوعات پر بلند پایہ مضامین کا ایک بیش بہا ذخیرہ۔

• یہ نمبر علوم قرآن، تاریخ قرآن، فضائل قرآن اور آداب تلاوت قرآن وغیرہ جیسے اہم مضامین کا ایک قابل قدر خزانہ ہے

• قرآن کی تدوین کب اور کس طرح ہوئی، قرآن فہمی کے شرائط و اصول کیا ہیں۔ قرآن کی خدمت کن کن زبانوں میں ہوئی ایسے تمام ضروری اور مفید سوالات کا جواب آپ کو بسط و تفصیل کے ساتھ اس خصوصی نمبر میں ملے گا اور اکابر مفسرین کے دلچسپ اور سبق آموز حالات اور ان کی تفسیری خدمات آپ اس ضخیم نمبر میں ایک جگہ پڑھ سکیں گے۔ ارکان ادارہ صبح صادق کے علاوہ جن جلیل القدر علماء نے اس نمبر میں قرآن کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے ان میں سے بعض حضرات کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں۔

مولانا عبد الماجد دریا آبادی، مولانا عبد الباری ندوی، مولانا عبد السلام قدوائی، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مولانا محمد عمران خاں ازہری، ڈاکٹر میر ولی الدین، مولانا شاہ معین الدین، مولانا محمد اسحاق۔

چندہ سالانہ، چار روپیہ ——— قرآن نمبر کی قیمت، دو روپیہ

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ ——— دفتر رسالہ صبح صادق کاظم نگر لکھنؤ

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ جناب شجاعت علی صاحب کاٹن ایکسچینج بلڈنگ میکلوڈ روڈ کراچی، پاکستان

ساون کی نکھری فضاؤں میں
جوانی کی امنگیں اور
خوشی کے جھولے
فیملن
کے شکر گزار ہیں
حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی سے طلب کیجئے

Regd. No. S. [illegible]

Monthly "MUSHIR" Karachi.

Printed at Mashhoor Press, McLeod Road, Karachi.

ماہنامہ

مشیر

کراچی

"خدا پاکستان کو
استقامت اور خوشحالی
عطا فرمائے"
برماشیل یوم جمہوریہ پر
مبارکباد پیش کرتی ہے
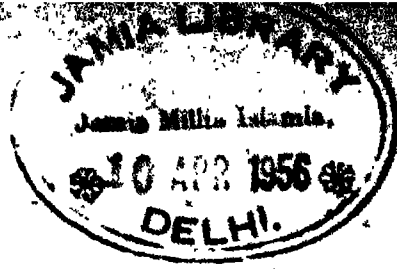
JAMIA LIBRARY
Jamia Millia Islamia.
10 APR 1956
DELHI.
DAWN OF A NEW ERA
نئے دور کا آغاز
جس طرح نسیم صبح کی رفتار سے پھول کھل جاتے ہیں، اسی طرح
زمانے کی رفتار ایک ذی حیات قوم کے دلوں کو جگا دیتی ہے اور انہیں
ہر قدم پر تازہ مسرتیں اور تازہ تر ولولہ بخشتی ہے۔
جمہوریت کے قیام کے ساتھ ہماری قوم نے ترقی کی طرف اپنے ابدی
سفر کی پہلی منزل تمام کرلی، اور اب زیادہ وسیع فضاؤں میں داخل ہوکر نئی صبح
کے اجالے میں خراماں خراماں آگے بڑھ رہی ہے۔
قومی زندگی کے اس نئے دور میں ملکی صنعتوں کو بیش از بیش اہمیت
حاصل ہوگی اور پارچہ جات کی صنعت پہلے کی طرح اب بھی پیش پیش رہے گی۔
آدمجی کاٹن ملز لمیٹڈ
لانڈھی ــــ کراچی
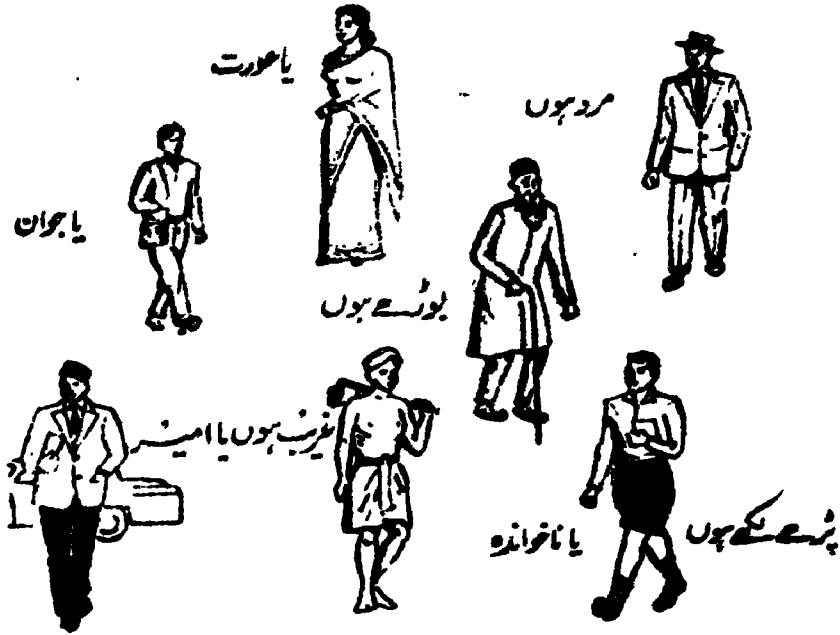
ڈاکخانہ کے سیونگ بنک سے یکساں مستفید ہو سکتے ہیں۔ ملک کے گوشے گوشے میں کھلے ہوئے چار ہزار سے زائد سیونگ بنک ڈاکخانے آپ کی خدمت کے لئے موجود ہیں۔

ڈاکخانہ کے سیونگ بنک میں آپ دو روپے کی مختصر سی رقم سے حساب شروع کر سکتے ہیں اور ۱۰،۰۰۰ روپے تک زر جمع لگا سکتے ہیں۔ بعد میں لین دین ایک روپیہ کی قلیل رقم تک کیا جا سکتا ہے، یہ سہولت کسی اور بنک سے حاصل نہیں ہوتی۔ جمع شدہ رقم پر آپ کو ۲½ فیصدی فی سال سے لے کر ۳ فیصدی فی سال تک منافع ملتا ہے جو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔ یہ ایک اور بڑی رعایت ہے جو کسی اور بنک میں روپیہ لگانے کی صورت میں میسر نہیں آتی۔

بچت کیجئے جس قدر اور جب کبھی ممکن ہو، اور اپنی بچت کا روپیہ خواہ کتنا ہی قلیل ہو، ڈاکخانہ کے سیونگ بنک میں جمع کراتے رہیں۔ آپ کے آرام کی خاطر ڈاکخانہ کے سیونگ بنک قریب قریب ہر جگہ موجود ہیں اور ان میں آپ کا سرمایہ ہر لحاظ سے محفوظ ہوتا ہے۔ مزید برآں آپ کی بچت نہ صرف آپ کے اپنے لئے بلکہ پوری قوم کے لئے منفعت بخش ہوتی ہے۔

تفصیلات قریب ترین سیونگ بنک ڈاکخانہ سے معلوم کریں۔

ڈاکخانہ کے سیونگ بنک

manhattan

APP — 37/56 (10)

اچھی عادتیں بڑی دولت ہیں!

کیا آپ اصولِ صحت کے پابند ہیں؟

جس کی صحت اچھی اُس کی قسمت اچھی
تندرستی سے دماغ روشن اور حوصلہ
قائم رہتا ہے جب یہ حاصل ہے سب
کچھ حاصل جسمانی صحت بہتر ہو تو بہت سی مالی اور رُوحانی پریشانیاں
کافور ہو جائیں۔

کیا آپ روپیہ بھی بچاتے ہیں؟

"تنگدستی اگر نہ ہو غالب۔ تندرستی ہزار نعمت ہے" اپنی تندرستی کا
خیال رکھیے اور تنگ دستی کے رُوگ سے بچنے کے لئے روپیہ بھی
بچاتے رہیے کیونکہ فراغت کی زندگی کے لئے کفایت بھی اشد ضرورت
ہے۔ اپنی بچت سیونگز سرٹیفکیٹ میں لگائیے تاکہ بڑھتی رہے۔
اس طرح دس برس میں ہر دس روپے کے چودہ روپے تین آنے بن
سکتے ہیں۔ اور اس وقت یہ رقم اب سے کہیں زیادہ کارآمد ہوگی۔

بچت میں برکت ہے

روپیہ بچانے کی عادت ڈالئے

پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ میں روپیہ لگائیے

۳٫۴ فیصدی منافع۔ ڈاکخانوں، سیونگ بیورو اور مقررہ ایجنٹوں سے مل سکتے ہیں

APP. 23/36 (R11)

UNITED

اصلاحی ادب کا ڈائجسٹ

(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ماہنامہ مشیر کراچی

ٹیلی فون : ۷۹۲۳

جلد : ۷ شمارہ : ۴

"اسلامی جمہوریہ نمبر"

اپریل سنہ ۱۹۵۶ء

مرتبہ :
عبد الغفور بیگ

بدل اشتراک : فی پرچہ : آٹھ آنے
سالانہ : پانچ روپے

بھارت میں ترسیلِ زر کا پتہ :
چندہ دفتر "الحسنات" رام پور (یو-پی) بھارت

(پرنٹر و پبلشر عبد الغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ مشیر بندر روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا۔ کتابت عابد سعید)

سپاس

اسلامی جمہوریہ پاکستان

کے قیام پر آج ۲۳ مارچ سنہ ۵۶ء کو

● ——— ہم انتہائی مسرت کے ساتھ ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں ان تمام رہنماؤں اور کارکنوں کی خدمت میں جنہوں نے گذشتہ آٹھ سال سے دستور کے خالص قانونی مسئلہ کو عوامی مسئلہ بنانے میں شاندار جدوجہد کی ..... اس کے لئے جانی و مالی قربانیاں دیں۔ مصائب جھیلے۔ مشکلات کا صبر و استقامت سے مقابلہ کیا اور باوجود بعض ہزیمت خوردہ تخریب پسند عناصر کی ذلیل اشتعال انگیزی وغیر اخلاقی اور بیہودہ حرکات کے خون کا ایک قطرہ بہے بغیر اس اہم مسئلہ کو آئینی طور پر امن و امان سے طے کرا دیا۔ بلاشبہ یہ کامیابی آئینی طریق کار کی سب سے بڑی اور شاندار کامیابی ہے۔

● ——— ہم ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں ان تمام رہنماؤں اور اسلامی فرقوں کے نمائندوں کی خدمت میں جنہوں نے اول سے آخر تک باہمی جزوی اختلافات کے باوجود اس اہم مسئلہ پر متحد رہ کر یہ عدیم النظیر شہادت فراہم کی کہ وہ اسلام کی خاطر ہر قسم کے فرقہ وارانہ گروہی اور ذاتی مفادات سے بلند ہو کر "متحدہ محاذ" کا نمونہ پیش کر سکتے ہیں۔

● ——— ہم اپنے دل کی گہرائیوں سے سپاس عقیدت و محبت پیش کرتے ہیں مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم، سید سلیمان ندوی مرحوم اور مرحوم لیاقت علی خان کو جن کے ہاتھوں "قرارداد مقاصد" کا لگایا ہوا پودا آج تناور درخت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اور ہم توقع رکھتے ہیں کہ اس شجر طیبہ کے ثمار اور سایہ سے بے شمار خلق خدا فائدہ اٹھائے گی اور ہم اپنے رب سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ان رہنماؤں کی اس نیکی کو قبول فرما کر ان کی لغزشوں کو معاف کر دے گا۔

● ——— ہم وفور جذبات کے ساتھ ہدیۂ اخلاص پیش کرتے ہیں پاکستان کے عوام کی خدمت میں جنہوں نے ہر مرحلے پر اپنے مخلص رہنماؤں کی آواز پر لبیک کہا اور جس طرح انہوں نے سنہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ خونریزی میں یہ ثبوت پیش کیا تھا کہ وہ اسلام کے لئے ہر قسم کی قربانی پیش کر سکتے ہیں اس سے بڑھ کر دستوری مراحل میں یہ بات ثابت کر دی کہ اسلام سے ان کا تعلق ناقابل شکست ہے۔

● ——— ہم خلوص قلب سے مبارکباد پیش کرتے ہیں ان ارکان دستور ساز اور ان گمنام اور نام و نمود کی خواہش سے بے نیاز برگزیدہ شخصیتوں کی خدمت میں جنہوں نے شبانہ روز محنت شاقہ کے بعد ان تمام حملوں کا دفاع کیا جو دستور کی اسلامی دفعات کے مخالفین پے در پے کر رہے تھے۔

● ——— ہم شکر گذار ہیں وزیر اعظم چوہدری محمد علی کے جن کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ اگر وہ مزید ہمت و استقلال سے کام لیتے تو وہ ان تمام خامیوں کو جو دستور میں رہ گئی ہیں ان ترمیمات کی روشنی میں جنہیں پانچ دینی اور سیاسی جماعتوں نے متحدہ طور پر پیش کیا تھا دور کر کے دستور کو زیادہ سے زیادہ اسلامی اور جمہوری بنا سکتے تھے تاہم انہوں نے موجودہ ماحول میں بھی جو مضبوطی اور عمل کیفیت دکھائی ہے وہ قابل شکر ہے۔

● ——— ہم ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں سابق دستور ساز کے صدر مولوی تمیز الدین کی خدمت میں جنہوں نے اس شدید ترین مرحلے پر جب کہ ملک کو آہنی اور اندھی آمریت کے حوالے کرنے کا منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا رہا تھا ——— جرأت و ہمت سے کام لیکر نہ صرف پچھلی گذشتہ سات سالہ کوتاہیوں کی بہت حد تک تلافی کی بلکہ ملک کو اس ہلاکت سے بچا کر پوری ملت پر ایک احسان کیا اور اب اسی جدوجہد کے نتیجہ میں ملک کو ساڑھے آٹھ سال کے بعد اسلامی جمہوریہ پاکستان بننے کا شرف حاصل ہوا۔

(المنبر)

اسلامی جمہوریہ پاکستان

زندہ باد ——— پائندہ باد

یومِ اسلامی جمہوریۂ پاکستان پر ملت کے نام

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

کا

پیغام

"یوم دستور ہماری قومی تاریخ کا نہایت اہم دن ہے۔ اس دن سے ہم اپنی زندگی کی ابتدا ایک ایسی آزاد قوم کی حیثیت سے کر رہے ہیں جس نے آئینی طور پر خداوند تعالیٰ کی حاکمیت کا اقرار کیا ہے۔ اقتدار کو اس کی طرف سے ایک مقدس امانت مان کر استعمال اقتدار کے لئے اس کے مقرر کردہ حدود کی پابندی قبول کی ہے۔ آج دنیا کی تمام قوموں کے درمیان ہم وہ تنہا قوم ہیں جس نے اپنے دستور مملکت کے سرنامے پر یہ اعلان ثبت کیا ہے کہ ہم جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور اجتماعی انصاف کے اس تصور پر عمل کریں گے جو اسلام نے ہم کو دیا ہے۔ اس لحاظ سے آج کا دن ہمارے لئے صرف ایک مبارک دور کا آغاز ہی نہیں بلکہ ایک سخت آزمائش کے دور کی ابتدا بھی ہے۔ ہم نے خدا اور خلق دونوں کے سامنے اپنے آپ کو امتحان کی کسوٹی پر رکھ دیا ہے۔ اب دنیا بھی دیکھے گی اور دنیا کا مالک بھی دیکھے گا کہ ہم اپنے اس قول میں کہاں تک صادق اور مخلص ہیں۔

میں اس یوم اسلامی جمہوریہ پر اپنی قوم کو مبارک باد بھی دیتا ہوں اور اس کے ساتھ ساری قوم سے اور اس کے ہر عنصر اور گروہ سے یہ اپیل بھی کرتا ہوں کہ وہ تمام چھوٹے چھوٹے مفادات، تعصبات، اور اختلافات کو نظرانداز کر کے اپنی توجہات اس ملک میں ایک مثالی اسلامی نظام قائم کرنے پر مرکوز کر دے۔ ہم سب کی دنیا اور آخرت کا انحصار اس پر ہے کہ ہم اپنے اخلاق اور کردار کو درست کریں، اپنے فرض کو پہچانیں اور نیک نیتی کے ساتھ وہ طرز عمل اختیار کریں جس کو ہم اپنے ایمان اور ضمیر کے مطابق حق جانتے ہوں۔ ہمارے حکام کو، ہماری سیاسی پارٹیوں اور ان کے لیڈروں کو، ہمارے علماء، ہمارے تاجروں اور صنعت کاروں کو، ہمارے زمینداروں اور سرمایہ داروں کو، ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں اور عوام کو اور ہمارے مردوں اور عورتوں سب کو یہ اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ ان کا مستقبل پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے اور پاکستان کا مستقبل اہل پاکستان کی سیرت و کردار سے وابستہ ہے۔ اگر ہم خداترسی، دیانت، انصاف، فرض شناسی منظم محنت اور جفاکشی اور اسلام کے اصولوں کی مخلصانہ پیروی اختیار کریں تو ہماری یہ مملکت تھوڑی ہی مدت میں دنیا کی امامت اور رہنمائی کے مقام پر پہنچ سکتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس صفات اختیار کر کے ہم ذلت اور کمزوری کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں دیکھ سکتے۔ لہذا دستور کے نفاذ کی مسرت میں ہم اسی وقت حق بجانب ہوں گے جب کہ آج کے دن ہماری قوم کا ہر فرد یہ عزم کرے کہ وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی عمارت پاکیزہ اور مضبوط سیرت کی چٹان پر تعمیر کرے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی جمہوریہ پاکستان

گیا دورِ ظلمت ہوئی صبح روشن وہ پھوٹی اُفق پر کرن دینِ حق کی

آج ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کے روزِ سعید پر جب کہ مملکت پاکستان کو ایک اسلامی جمہوریہ قرار دینے کا تاریخی اعلان ہو رہا ہے ہم خلوصِ قلب سے قارئین اور اہالیانِ پاکستان کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ الحمدللہ یہ بات باعثِ مسرت و مقامِ شکر ہے کہ خدائے ذوالجلال نے عوام کی شبانہ روز پُرخلوص آٹھ سالہ جدوجہد کو شرفِ قبولیت بخشا اور ملک کو ایک قابلِ قبول اسلامی دستور ملا لہٰذا اسلامی جمہوریہ قرار پایا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اسلامی دستور کے ذریعے ہمارے اس نوزائیدہ اسلامی جمہوریہ کو ترقی و رفعت سے ہمکنار کرے اور اسے لازوال استحکام عطا فرمائے۔ آمین

پاکستان کو "اسلامی جمہوریہ" قرار دینا اس دور میں ایک جرأت مندانہ اور دلیرانہ اقدام ہے۔ اور اسلامی تاریخ میں ایک نیا تجربہ۔ کیونکہ خلافتِ راشدہ کے بعد پہلی مرتبہ ایک اسلامی ریاست کا نظام چلانے کے لئے اختیارات شاہی خاندانوں کے بجائے عوام کو حاصل ہوئے ہیں اگر اس عظیم الشان تغیر کو صحیح ذہنوں کے ذریعے اور مناسب ہاتھوں سے عملی جامہ پہنایا گیا تو ہمیں یقینِ واثق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اسلامی تاریخ میں یہ ایک ایسے نئے دور کے آغاز کا سبب ہوگا جسے بجا طور پر اسلامی تاریخ کا دوسرا دورِ زریں کہا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ عہدِ جدید کی بین الاقوامی سیاست میں یہ ایک نیا واقعہ ہے کیونکہ اس واقعہ کے ساتھ ہم اسلام کو بین الاقوامی سیاست میں "سرمایہ دارانہ جمہوریت" اور "کمیونزم" کے بالمقابل ایک تیسرے نظریہ اور نظام کی حیثیت سے شریک کرنے کی ذمہ داری اٹھا رہے ہیں۔ ابھی تک مسائلِ عالم کو حل کرنے کے لئے بین الاقوامی سیاست کے میدان میں صرف یہی دو متضاد نظریئے اور متحارب نظام بر سرِ پیکار رہے ہیں اور عالمی مسائل کی گتھی سلجھنے کی بجائے دن بدن الجھتی ہی جا رہی ہے۔ اب جبکہ ہم ایک تیسرے نظریہ اور نظام کی حیثیت سے اسلام کو اس میدان میں لے آئے ہیں تو انشاء اللہ تعالیٰ اسلام ایک نظامِ وسطہ کی حیثیت سے عالمی مسائل کی الجھنوں کو سلجھانے میں گرانقدر خدمات انجام دے سکے گا۔

لیکن اس دورِ جدید میں ہمارا اپنے ملک کو "اسلامی جمہوریہ" قرار دینے سے جو خوش فہمی پیدا ہوئی ہے وہ اس وقت تک حقیقت کا جامہ نہیں پہن سکتی جب تک کہ ہمارے عوام اور خواص اس حقیقت کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں کہ اس نظریاتی ریاست کے کاروبار کو چلانے کیلئے انہیں ایسے افراد کا انتخاب کرنا ہوگا اور ریاست کی باگ ڈور ایسے ہاتھوں میں دینی ہوگی۔ جو انفرادی اور ذاتی طور پر اسلام کی جداگانہ اور امتیازی خصوصیات کے حامل ہوں اور اس ریاست کو چلانے کے لئے انہیں امتیازی خصوصیات کے پیشِ نظر ریاست کے داخلی اور خارجی معاملات کو نئے سرے سے ترتیب دینے کی اہلیت رکھتے ہوں کیونکہ جہاں اسلام داخلی طور پر اپنے نظریاتی، اقتصادی، معاشرتی اور تہذیبی شعبہ ہائے زندگی میں چند امتیازی خصوصیات کا حامل ہے وہاں بین الاقوامی تعلقات میں بھی وہ اپنی جداگانہ خصوصیت کو فراموش نہیں کر سکتا ہے (ادارہ)

بجادۂ حق کا سنگِ میل شکر ہے ہو گیا نصب دیکھ کے یہ نشانِ راہ بڑھتے رہیں گے کارواں

ماہر القادری •

صبحِ آزادی

موجِ طوفاں کے مقابل نظر آتی ہے مجھے
ہر طرف عشرتِ ساحل نظر آتی ہے مجھے
کامیابی سرِ منزل نظر آتی ہے مجھے
صبحِ آزادیٔ کامل نظر آتی ہے مجھے

دوشِ افلاک پہ ذرات نے ڈالی ہے کمند
پستیاں ہوگئیں پس ایک اشارے میں بلند
اللہ اللہ! یہ اسلام کے مخلص فرزند
جو اُڑائے لئے جاتے ہیں ارادوں کی سمند

اب دھندلکے نہ اندھیرے ہیں نہ تنہائی ہے
مطلعِ نور ہیں اور انجمن آرائی ہے

کارواں اپنی ترقی کا نہیں رُک سکتا
سبز پرچم کسی طاقت سے نہیں جھک سکتا

اب نہ خوابیدگی شوق نہ افسردہ دلی
خس و خاشاک میں بھی روحِ عمل جاگ اٹھی
کِس قدر شوخ ہے اندازِ نسیمِ سحری
پھول کچھ کہنے ہی والے تھے کلی بول پڑی

ابھی پیغامِ محمدؐ کی ہے باقی تکمیل
فکر و دانش کو یہ اجمال ہے خود ہی تفصیل
ابھی ماحول کو ہونا ہے بہت کچھ تبدیل
ابھی کردار کے سانچے میں ڈھلے گی تخئیل

فکرِ گلچیں ہے نہ اندیشۂ صیاد ہمیں
وقت نے کی ہے عطا دولتِ آزاد ہمیں

صبحِ نو اپنی تمناؤں کا مظہر ہوگی
ارضِ پاک اور حسیں اور منور ہوگی

؟

شبابِ لالہ و گل کو پکارنے والو　خزاں سرشت بہار آگئی تو کیا ہوگا

(احسان دانش)

ابوالبیان حمّاد •

طوفانِ تجلّی

جاگا دلِ پروانہ میں ارمانِ تجلّی
روشن ہوئی پھر شمعِ درخشانِ تجلّی

ہے مطلعِ انوار ہر اک گوشۂ عالم
اللہ رے یہ وسعتِ دامانِ تجلّی

ظلمت گہِ عالم جو بنا مہبطِ جلوہ
ہے معجزۂ چاک گریبانِ تجلّی

ہے دیدۂ دل، جس کا مجلّا و مصفّیٰ
ہو جائے گا حاصل اسے عرفانِ تجلّی

ذرّے ہوں کہ وہ انجم و خورشید و قمر ہوں
ہے سب میں نہاں ذوق فراوانِ تجلّی

ہے رنگ کا طوفان کہ انوار کا چشمہ
کھلتا نہیں کچھ حال شبستانِ تجلّی

ظلمت کا جگر چاک نہ ہو تو مرا ذمہ
ہر طرح ہوا ہے سروسامانِ تجلّی

ہے رو کشِ صد طور ہر اک ذرۂ عالم
ہے دیدنی، کیفیّتِ بارانِ تجلّی

اِس سمت رواں ہے کبھی اُس سمت رواں ہے
یہ سیل تجلّی ہے کہ طوفانِ تجلّی

ہے لشکرِ ظلمات پہ یلغار مسلسل
یہ دبدبہ و طنطنہ و شانِ تجلّی

کیوں یاد نہیں مردِ مسلماں کو ذرا بھی
اللہ سے باندھا ہے جو پیمانِ تجلّی

ضَو ریز و ضیاپاش بھی ہے جلوہ فگن بھی
مینارِ تجلّی ہو کہ فارانِ تجلّی

کر لے وہ ذرا وادیٔ ایمن کا نظارا
مومن کو جو مطلوب ہو عرفانِ تجلّی

افکار ہیں یا شمعِ تخیّل کی شعاعیں
حمّاد بہت خوب ہے عنوانِ تجلّی

شمیم جاوید ٭

جشنِ جمہور

مرے وطن! ہو مبارک یہ دورِ نو تجھ کو
ہمارا سوزِ دروں کچھ تو کام آیا ہے
سوادِ کوچۂ جاناں میں آ گئے ہیں ہم
دیارِ عشق کا، پہلا مقام آیا ہے

○

یہی وہ یومِ درخشاں ہے ایک جس کے لئے
غیور ماؤں نے، بیٹوں کے سر کٹائے تھے
نہ جانے کتنے دلوں کے سہاگ اجڑے تھے
نہ جانے کتنے کلیجوں نے تیر کھائے تھے

○

وہ خواب - جن کو فقط اک سراب سمجھا تھا
وہ خواب - آج حقیقت میں ڈھلتے جاتے ہیں
وہ دیکھ! آتشِ نمرود ہو گئی گلزار
جہانِ شوق کے عنواں بدلتے جاتے ہیں

○

جو ظلم، اہلِ ہوس نے کئے ہیں، یاد نہ کر
اسی سے رنگِ وفا میں نکھار آتا ہے
ہزاروں کلیاں گلستاں کی خون ہوتی ہیں
پھر اس کے بعد - پیامِ بہار آتا ہے

○

یہ جشن - عظمتِ جمہور کی نشانی ہے
یہ جشن - امن کا پیغام ہے جہاں کے لئے
نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

(۲)

مرے وطن! ہو مبارک! یہ دورِ نو تجھ کو
ترے عوام - پیامِ حیات لائے ہیں
نظر اٹھا کے ذرا اپنا رنگ و روپ تو دیکھ
قدم قدم پہ نئی جنتوں کے سائے ہیں

عروسِ نو ہے کہ آنچل اڑا رہی ہے شفق شفیق ماں کی طرح مسکرا رہی ہو زمیں
چمک رہی ہیں ستاروں کی نیگوں آنکھیں یہ جشنِ ملتِ بیضا ہے۔ جشنِ عزم و یقیں

○

نظر نظر میں ہیں روشن، مسرتوں کے کنول جلو میں اپنے لئے، عہدِ نو کے افسانے
حیات ۔ جنتِ گم گشتہ ۔ کی تلاش میں ہے نئے جنوں کو ہیں درکار، اور ویرانے

○

جوان بہنوں نے گوندھے ہیں ہار پھولوں کے حسین بچوں نے پہنے ہیں شوخ پیراہن
ضعیف ماؤں نے مانگی دعائے فتح و ظفر رواں ہوئے ہیں نئے راستوں پہ اہلِ وطن

○

وہ راستے، کہ جو ویراں پڑے ہیں صدیوں سے وہ راستے، جو مداوائے دردِ انساں ہیں
وہ راستے جو بدل دیں جہاں کی تقدیریں وہ راستے جو ازل اور ابد کے پیماں ہیں

(۳)

خوشا یہ جشنِ بہاراں! خوشا یہ ذوقِ جنوں! مٹا ہے فرقِ مراتب کوئی گدا ہے، نہ شاہ
یہ کائنات، یہ ارض و سما، خدا کے ہیں ہوا ہے حکم اذاں ۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

○

مرے وطن کے رفیقو! نئی فضاؤں میں

نئی حیات کی آمد کا اہتمام کرو

بدل کے خود کو ۔ نظامِ جہاں بدل ڈالو

ضیائے نیرِ اسلام ۔ آج عام کرو

محمود فاروقی

مجھے آج اپنا وطن مل گیا ہے!

کل ہم نے بہت کچھ کھویا تھا !

آج ہم نے بہت کچھ پالیا !

—— آنے والے دن کے لئے ہم وہ سب کچھ جمع کریں گے جس کی ہم کو ضرورت ہے زندگی انہی تین دنوں سے عبارت ہے —— "امروز" "دیروز" "فردا"

اور دیکھو ! زندگی کے دن کس طرح ادلتے بدلتے رہتے ہیں اور —— وقت کی ان تہ بہ تہ سلوٹوں میں کیا کچھ نہیں پوشیدہ ہے ——

ہماری آرزوئیں، ہمارے عزائم، ہماری ناکامیاں، ہماری محرومیاں، ہماری مسرتیں، ہماری کامرانیاں، ہمارے آنسو، ہماری مسکراہٹ ——

کسی پکارنے والے نے پکارا ——

ہم جاگے ہم سنبھلے —— اور پھر ایک ساتھ چل پڑے

ہم نے اپنے گھروں کو چھوڑا —— اور چل پڑے

اپنے وطن کو چھوڑا —— اور چل پڑے

مال و اسباب چھوڑا —— اور چل پڑے ——

زندگی کی تلاش میں —— جس پر دوسروں کا سایہ نہ ہو

—— وطن کی تلاش میں —— جو دوسروں کا دست نگر نہ ہو ——

سینا کے جنگلوں میں بنی اسرائیل چالیس سال تک دشت نوردی کرتے رہے —— ان کو بھی وطن کی تلاش تھی، ان کو بھی زندگی کی تلاش تھی —— لیکن جب ان کو اپنا مامن و مسکن مل گیا اور ایک نئی زندگی کے دروازے ان پر کھل گئے۔ تو انھوں نے اپنے رب سے ناشکری کی اور اپنے نئے گھر میں اس طرح داخل ہوئے کہ ان کے دل انحراف و سرکشی کے زہر میں بجھے ہوئے تھے ——

لیکن جب ہمارا قافلہ اس نئی سرزمین میں داخل ہوا تو خدا گواہ ہے کہ ہم پیاسے تھے —— لیکن ہماری زبانیں شکر و حمد کے ترانوں سے بھیگی ہوئی تھیں ——

ہم بھوکے تھے —— لیکن ہمارے دل وفا و محبت کے جذبے سے لبریز تھے ——

ہم تھکے ہوئے تھے —— لیکن ہمارے ارادوں کی دھمک سے زمین لرز رہی تھی ——

ہم نے سب کچھ کھو دیا تھا —— لیکن دل معلوم دیتا تھا کہ جیسے ہمارا کچھ بھی نہیں گیا —— کچھ بھی تو نہیں ——

ہم بنی اسرائیل نہیں تھے کہ اپنے نبی سے کہہ دیتے "جاؤ! تم اور تمھارا خدا دونوں تنہا لڑو، ہم کھڑے تماشہ دیکھتے ہیں"!

ہم مسلم تھے اور ہم نے بدر و حنین کی امانتیں اپنے سینہ میں چھپا رکھی تھیں —— اس لئے ہماری زبانوں سے اپنے مشفق و مہربان خدا کی عظمت و تقدیس کے سوا کچھ نہیں نکلا —— اپنے رسول کی محبت و وفا کے سوا کچھ نہیں نکلا ——

ہم نے اللہ سے تجدید عہد کیا اور نئے ولولوں اور نئی آرزوؤں کے ساتھ یہاں بس گئے —— یہ ہمارا نیا وطن تھا۔

یہ ہمارا نیا گھر تھا —— یہ ہمارا مسکن و ماوا تھا ——

ہم نے بڑی توقع اور امید کے ساتھ لب کھولے ——

ہم کو اپنا گھر بسانے کے لئے سامان دو ——

وہ وعدے پورے کرو جو ہم سے کئے گئے تھے

زندگی کا وہ نظام دو جس کی تلاش میں ہم یہاں تک آئے ——

وفا و محبت کا وہ دستور دو جس کیلئے ہم نے اپنا سب کچھ قربان کردیا

ہم کو ہماری زندگی دو ——

زندگی جس کے لئے ہم نے موت سے ایک ہولناک کش مکش
کی اور یہاں تک پہنچے ——
اور دیکھو! زندگی کے دن کس طرح ادلتے بدلتے رہتے ہیں ——
—— اور وقت کی ان تہ بہ تہ سلوٹوں میں کیا کچھ نہیں
پوشیدہ ہے ——
انھوں نے ہم کو کیا دیا ——
سر چھپانے کے لئے —— کھلے آسمان کا سایہ ——
بیٹھنے کے لئے —— تپتی ہوئی زمین کا فرش
اور کھانے کے لئے —— جھلستی ہوئی ریت
ہم آسمان تلے پڑے رہے ——
تپتی زمین پر لوٹتے رہے ——
اور گرم گرم ریت پھانکتے رہے —— یہ سب کچھ منظور تھا.
یہ سب کچھ گوارا تھا ——
لیکن آہ انھوں نے اس پر ہی بس نہیں کیا انھوں نے
ہم سے وہ مانگا جس کے لئے ہم نے سب کچھ کھویا تھا! ——
—— انھوں نے ہم سے ہمارا ایمان مانگا، ہمارے یقین کو کھسوٹنے
لگے، ہم سے ہمارے اسلام کو چھیننا چاہا —— اور پھر ——
کچھ ایسا لگا —— جیسے یہ ہمارا اپنا گھر نہیں ہے! ——
—— ہمارا اپنا وطن نہیں ہے، ایک سرائے ہے، جہاں کوئی چیز
ایسی نہیں جسے ہم اپنی کہیں ——
ایک بے اطمینانی، ایک بے دلی، ایک اضطراب، ایک
ہیجان —— اور زندگی جیسے کجلا کر رہ گئی، دل بجھ
گئے، آنکھیں ویران ہونے لگیں، ہمتیں چھوٹ گئیں، ولولے
پست ہو گئے، آرزوئیں مرجھا کر رہ گئیں، ——
ایک تعطل اور جمود سا چھا گیا —— کچھ اس طرح جیسے
موت اپنے پر پھیلائے سروں پر چھا گئی ہو، ان اندھیروں..... اور
دھندلکوں سے شپرہ چشم شب زادوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا،
انھوں نے ہماری گٹھڑیاں ٹٹولیں اور جو کچھ ملا اٹھا لے گئے.
وہ ہماری راستی لے گئے ——
ہمارا خلوص لے گئے ——
ہماری حیا چھینی ——
ہماری غیرت لوٹی —— اور ہم سے ہماری زندگی چھین لی.
اور پوری بے حیائی کے ساتھ اعلان کیا ——
—— ہم تمھارے آقا ہیں! ہم تمھارے مالک ہیں. ہم
تمھارے رزاق ہیں: ہم تمھارے خدا ہیں. ——
—— ہم خاموش تھے، ہمارے منہ بند تھے. ہم مجبور تھے!
موت کے سائے کچھ اور لانبے ہو گئے ——
—— اور زندگی کچھ اور سمٹ گئی !
اور دیکھو: زندگی کے دن کس طرح ادلتے بدلتے رہتے ہیں ——
—— اور وقت کی ان تہ بہ تہ سلوٹوں میں کیا کچھ نہیں پوشیدہ ہے
کسی پکارنے والے نے پکارا ——
وہی پکار جسے تاریخ کے ہر موڑ پر ہم سنتے آئے تھے ——
—— جو ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کا محور و مرکز تھی
لوگوں نے اس پکار کو سنا ——
—— ان کے سر اٹھے، نئی آنکھیں چمکنے لگیں، ان کے دل
دھڑکنے لگے —— انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا سرگوشیاں
کیں، مشورے ہوئے وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے. ایک ہاتھ
نے دوسرے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا. اور پھر وہ ایک عزم اور
پورے جوش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے ——
ان کے لب ہلے اور انھوں نے پوری ہم آہنگی کے ساتھ لبیک کہا ——
—— چہرے جوش سے تمتما رہے تھے، سینے عزم و ارادہ سے ابھر
رہے تھے، اور اسلامی دستور کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی ——
—— ٹھہرے ہوئے پانی میں جیسے ہلچل سی مچ گئی —— رکی ہوئی
ہوائیں چل پڑیں —— اور اندھیروں، دھندلکوں کو چیرتی ہوئی
روشنی کی لکیر آہستہ آہستہ آگے بڑھی —— لوگوں نے ایک دوسرے
کو پہچانا —— اپنے آپ کو جانا ——
ہم کو ہماری زندگی دو ——
ہمارا ایمان اور یقین لوٹا دو ——

ان شہیدوں کا خون واپس دو جو ہم سے بچھڑ گئے ——
ان عورتوں کی عصمتیں لوٹاؤ جو ہم سے جُدا ہو گئیں ——
ہماری امانتیں ہم کو واپس دو ——
اسلامی دستور بناؤ ! ——
—— جلسے جلوسوں میں کتابوں اخباروں میں
ہر جگہ ہر طرف یہی ایک پکار تھی جو اٹھ رہی تھی، یہی ایک آواز تھی.
جو گونج رہی تھی ——
در و دیوار پکار رہے تھے ——
پاکستان پکار رہا تھا ——
پاکستان کے عوام پکار رہے تھے ! ——
—— شپرہ چشم شب زادوں میں کھلبلی سی پڑ گئی ...
انھوں نے سر جوڑ جوڑ کر سازشیں کیں اور پھر دیکھتے دیکھتے پورے
ملک میں ایک ہنگامہ رستاخیز بلند ہو گیا ——
آہنی زنجیریں کھڑکھڑانے لگیں ——
دیکھتی ہوئی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی گئی ——
بولتے لبوں میں سنگین تالے ڈالدیئے گئے، قید خانوں کے
دروازے کھولدیئے گئے۔ افتراق و انتشار کے بیج بوئے گئے...
الزامات و اتہامات کے طوفان اٹھائے گئے۔ ——
—— اندھیروں نے ابھرتے سورج کو اغوا کرنے کی کوشش کی
حق کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا —— گولیاں چلائی گئیں ...
سنگینیں تان لی گئیں —— دار و رسن آراستہ کئے گئے اور موت کے
پہرے بٹھا دیئے گئے ——
—— زندگی پھر ایک بار سمٹ کر رہ گئی —— !
آزادی کے کئی جشن آئے اور گزر گئے —— لوگ مسکرا نہ سکے
وزارتیں بنیں اور ٹوٹ گئیں —— لوگ مسکرا نہ سکے ——
نئے نئے وعدے کئے گئے —— لوگ مسکرا نہ سکے ——
دلخوش کن مظاہرے کئے گئے —— لوگ مسکرا نہ سکے
—— وہ کیسے مسکراتے ؟
ان کے دل ٹوٹ گئے تھے۔ انکے حوصلے پست کر دیئے گئے تھے۔ انکی
امیدیں پامال کی گئیں تھیں ——
—— ان کی زندگیاں لوٹ لی گئی تھی —— !
انھوں نے محسوس کیا جیسے وہ ابھی تک اپنی منزل نہیں پا سکے ہیں
ہزاروں قربانیوں کے بعد ملنے والا یہ گھران کا اپنا گھر نہیں ہے، یہ
ایک سرائے ہے جس کی کوئی چیز بھی ان کی اپنی نہیں ہے جہاں انکی
اپنی رائے اور پسند کا کوئی احترام نہیں یہ ان کا اپنا وطن نہیں، بلکہ
اغیار کا بنایا ہوا قید خانہ ہے —— ایک دیمک زدہ در و دیوار سا
قید خانہ —— جہاں وہ مجبور ہیں بے بس ہیں ——
وہ ایک دوسرے کو بھی کبھی نگاہوں سے دیکھتے جیسے پوچھ رہے ہوں۔
ہمارا وطن کہاں ہے ؟ — کہاں ہے ہمارا وطن ؟ ——
ان کی آواز سناٹوں میں گونج کر رہ جاتی ایک صدائے بازگشت
سنائی دیتی اور بس —— !
اور دیکھو ! زندگی کے دن کس طرح اولتے بدلتے رہتے ہیں ——
—— اور وقت کی ان تہ بہ تہ سلوٹوں میں کیا کچھ نہیں پوشیدہ ہے۔
سینوں میں گھٹتے ہوئے غم اندر ہی اندر پکتے رہے —— ہر شخص
ایک چلتی پھرتی بھٹی تھا جس میں غم و غصہ کی آگ دہک رہی تھی....
آگ دہکتی رہی اور اندر ہی اندر آتش فشاں بھڑکتا رہا۔ جذبات
کے ہزاروں ایٹمی بم تیار تھے جوان بھڑکتے ہوئے دلوں میں پھٹنے
کے لئے بیقرار ہو رہے تھے ——
دلوں میں چکر کھانے والے ایٹم پھٹ گئے آتش فشاں بھڑک اٹھا...
گرم گرم سیال لاوا بہہ نکلا —— رائے عامہ تند و تیز سیلاب کی
طرح گلی کوچوں میں بہہ نکلی ——
اسلامی دستور ! اسلامی دستور ! اسلامی دستور !
—— جلسے جلوس مظاہرے نعرے اور مطالبے !
اس بہتے ہوئے سیلاب پر بند باندھنا محال تھا — لوگوں کو روکا
نہیں جا سکتا تھا —— دستور بنانے والے عوام کی پسند
کا احترام کرنے پر مجبور ہو گئے ——
دستور بنایا گیا —— جس میں عوام کے مطالبات کے لئے ——
ضمانتیں تھیں اور انکے حقوق کی پاسداری کی گئی تھی ....

لیکن ابھی مسرت کے نعرے بلند ہونے نہ پائے تھے کہ ـــــــ
آہنی ہاتھوں میں ایک کدال بلند ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس ایوان کو ڈھا
دیا گیا جس نے ایک قابل قبول دستور بنایا تھا ـــــــ

ـــــ ایک ایوان ڈھا دیا گیا ـــــ اس ضرب سے
سنگ و گل کی کوئی عمارت نہیں ٹوٹی بلکہ اس سے بہت سے نازک شیشے
ٹوٹ کر بکھر گئے اور قطرہ قطرہ کرکے ان میں جمع کیا ہوا ارغوانی سیال سرِ راہ
بہہ گیا ـــــــ

یہ ان کی آرزوؤں کا خون تھا ـــــ
یہ ان کی تمناؤں کا خون تھا ـــــ
یہ ان کے دل و جگر کا خون تھا ـــــ

ـــــ ارے یہ تو ان کی سوگوار زندگی کا خون تھا! ـــــ
یہ دو روپیہ والی وسکی کی بوتل نہیں تھی ـــ جسے کوئی بدمست شرابی
نشہ میں توڑ کر پھینک دے اور قہقہے لگا کر اٹھ کھڑا ہو۔ ـــــ
ـــــ ارے یہ تو ملت اسلامیہ کا وہ آب حیات تھا جسے صدیوں اور
قرنوں سے ایک دل دوسرے دل کو امانتاً سپرد کرتا آیا تھا ـــــ
جسے بدر و حنین سے لیکر بالاکوٹ کی شہادت گاہوں تک قطرہ قطرہ
کرکے جمع کیا جاتا رہا تھا۔ ـــــ

وہ زمین میں جذب نہیں ہوا، بہتا رہا ـــ گلی کوچوں میں ـــ سڑکوں
اور شاہراہوں پر ـــــ اور ہر راہرو کے تلووں سے لگ کر پوچھتا
رہا ـــــ

بتاؤ مجھے کیوں بہایا گیا؟ ـــ کیوں بہایا گیا مجھے؟ ـــــ
اور دیکھو ـــ! زندگی کے دن کس طرح ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔
ـــــ اور وقت کی ان تہ بہ تہ سلوٹوں میں کیا کچھ
نہیں پوشیدہ ہے ـــــ

ایک دوسرا ایوان بنایا گیا ـــــ

ـــــ اندر ہی اندر سازشیں کی گئیں اوپر سے نیچے تک
ہزاروں تبدیلیاں کی گئیں ـــــ بڑے مرعوب کن مظاہرے کئے
گئے ـــــ نئی کرسیاں رکھی گئیں ـــــ نئے لوگ لائے گئے
ـــــ ایک نیا ایوان بن گیا!

یہ ایوان ملت کا عجیب و غریب کنبہ تھا۔ ہر مزاج ہر خیال کے لوگ
تھے ہر گروہ نت نئے ارادوں سے آیا تھا اور الگ الگ نعرے لگا رہا
تھا۔ ـــــ کوئی اسلام کی مخالفت میں کھل کر چلا رہا تھا اور کوئی
حمایت تو کر رہا تھا لیکن دبی دبی زبان سے ـــ کوئی مخالفت و
موافقت کے درمیان معلق تھا ـــ کوئی بڑے زور زور سے اسلام
اسلام پکار رہا تھا لیکن خدا کے لئے نہیں بلکہ اغراض کے لئے ـــ
ـــ کوئی اپنے لئے دوسری راہ نہیں پا رہا تھا اس لئے حامی بن گیا تھا
اور ایسے بھی تھے جو دل سے چاہتے تھے کہ یہاں اسلام کا بول بالا ہو اور
عوام کے مطالبے پورے ہوں ـــــ ان کے درمیان مصالحتیں بھی ہوئیں
مخالفتیں ہوئیں۔ ساز باز ہوئی ـــ جوڑ توڑ ہوئی ـــ اور ـــ
دستور کا قلم نقطہ بہ نقطہ حرف بہ حرف آگے بڑھتا چلا گیا ـــــ

ایوان سے باہر لوگ منتظر تھے ـــــ
لوگ بے چین تھے، مضطرب تھے، اور ہر ممکن ذریعہ سے ایوان کو
مجبور کر رہے تھے کہ وہ دستور جلد از جلد بنائے ـــ ان کے اپنے
معتقدات کے مطابق بنائے۔ ـــــ

دستور کے مسودہ پر قلم چلتے چلتے کئی بار رکا، کئی بار بہکا ـــ اور
باہر لوگوں کے دل دھڑکتے رہے ـــــ

کیا ہوگا ـــــ؟ ہر شخص مجسم سوال بنا ہوا تھا اور
انتظار کے لمحے بڑی بے چینی کے ساتھ گزر رہے تھے ـــ کوئی خوش خبری
ملتی تو انکے دل کھل اٹھتے اور کوئی ایسی ویسی بھنک پڑتی تو انکے
چہرے سنولا جاتے ـــــ اس کھینچا تانی اور کشمکش میں لوگوں
نے پورے وثوق سے جان لیا کہ کون انکا دشمن ہے اور کون ان کا
دوست ـــــ دستور کے مسودوں پر قلم نہیں چل رہا
تھا۔ بلکہ تقدیر ایک خط فاصل کھینچ رہی تھی۔ ایک واضح اور معین حد قائم
کر رہی تھی۔ جس کے ایک طرف عوام کے دوست، پاک سرزمین کے خیر خواہ
اور اللہ کے وفادار یکجا ہو رہے تھے ـــــ اور دوسری طرف عوام کے
دشمن، پاک سرزمین کے بدخواہ اور اللہ کے باغی سمٹ رہے تھے ـــــ

ـــــ یہ لکیر واضح ہوتی چلی گئی ـــــ
یہ خط فاصل ابھرتا چلا گیا ـــــ

یہ صدا ایک دیوار بن کر بیچ میں حائل ہو گئی ——

اصحاب میمنہ ایک طرف ہو گئے اور اصحاب میسرہ دوسری طرف

اور پھر ایک دن ——

—— قلم چلتے چلتے رک گیا۔ اور اس نے اس اہم دستاویز کے آخری حرف اور آخری نقطہ پر اپنے خون دل کے آخری قطرہ کو ثبت کر دیا ——

اور پورا ایوان گونج اٹھا ——

—— اللہ اکبر، اللہ اکبر! —— اللہ بڑا ہے، اللہ بڑا ہے!

یہ اصحاب میمنہ کی مکمل فتح تھی —— ——

یہ پاکستان کے عوام کی فتح تھی —— ——

یہ ایک فتح مبین تھی —— شاندار و تابناک —— اللہ کا ایک بے بہا عطیہ

—— اصحاب میسرہ کے چہروں پر سیاہی چھپ کر رہ گئی ... اور وہ ہونٹ لٹکائے بڑبڑاتے گالیاں بکتے، منہ سے جھاگ اڑاتے منظر سے غائب ہو گئے اور دنیا نے پھر ایک جاء الحق و زھق الباطل۔ کا حیران کن نظارہ دیکھ لیا ——

اور دیکھو —! زندگی کے دن کس طرح الٹتے بدلتے رہتے ہیں ——

—— اور وقت، ان تہ بہ تہ سوتوں میں کیا کچھ نہیں پوشیدہ ہے ——

۲۳ مارچ —— آج سے تقریباً ۱۵ سال پہلے اسی ہنگامہ پرور تاریخ میں ہم نے اپنے لئے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا تھا اور پاکستان کی قرارداد منظور کی تھی۔ ——

پورے نو سال ہم نے اس ملک میں ایک مسافر اور اجنبی کی طرح زندگی بسر کی ——

اور آج —— سورج چاند کے ہزارہا طلوع و غروب کے بعد لیل و نہار کی بے شمار گردشوں کے بعد، موسموں کے ان گنت تغیر و تبدل کے بعد پھر ایک بار —— ۲۳ مارچ کی صبح طلوع ہوئی ہے، نو سال سے چھائی ہوئی ایک مسلسل اور طویل رات کا نقاب تار تار ہو چلا ہے اور ایک نئے دور ایک نئی زندگی کی شوخ و چنچل کرن پوری آب و تاب سے سطح زمین کا رخ کر رہی ہے اندھیرے بدحواسی کے ساتھ فرار ہونے لگے ہیں، اور ایک روشن مستقبل مسکراتا ہوا نمودار ہو رہا ہے ——

یہ ۲۳ مارچ کا آفتاب ہے ——

صرف ایک ستارہ نہیں بلکہ ہماری امیدوں اور آرزوؤں کا جگمگاتا ہوا نشان —— ہماری زندگی کا ترجمان —— یہ رات و دن کے الٹ پھیر سے نمودار نہیں ہوا ہے بلکہ اسکو ہمارے عوام نے ظلمات کے اندھیروں سے تلاش کر کے ابھارا ہے —— اسے پانے کے لئے وہ مسلسل نو سال تک رات کے بھیانک سینہ کو کھودتے رہے، ان کے ہاتھ تھک گئے ان کی انگلیاں چھل گئیں ان کے ناخن جھڑ گئے لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور آج وہ گوہر مقصود اپنی زندگی کے افق پر نمودار ہوا ہے ——

آج کا دن فتح و کامرانی کا دن ہے —— آج لفظوں کو ان کے معانی مل گئے —— اور ۲۳ مارچ کی قرارداد پاکستان نے اپنا مفہوم پا لیا۔ اور پورے نو سال بعد آج یہ اجنبی سرزمین ہمارا اپنا پاکستان بن گئی ——

آج پاکستان بن گیا —— آج زندگی مل گئی —— مظلوم و مجبور انسانو! اپنا سر اٹھاؤ کہ آج سرکشوں کے سر جھکا دیئے گئے اور عظمت و بلندی کا تاج تمہارے لئے مقدر کر دیا گیا ——

—— سر اٹھاؤ! کہ ایک نیا دور تم کو سلام کر رہا ہے —— سر اٹھاؤ! کہ مسرتیں تمہارے قدموں پر موتی بکھیر رہی ہیں —— سر اٹھاؤ! کہ ایک جہان تازہ تمہاری آہٹوں کا انتظار کر رہا ہے ——

دیکھو دیکھو —— ۲۳ مارچ کا اجالا پھیلا ——

دیکھو دیکھو —— انھوں نے اپنے جھکے ہوئے سر اٹھا لئے ——

—— ان کے چہرے مسرتوں سے دمک رہے ہیں ——

ان کی آنکھوں میں زندگی جگمگا رہی ہے ——

وہ اٹھ کھڑے ہوئے ——

ان کی چاپ مستقبل کے نغمے سنا رہی ہے ——

ان کو آج وہ سب کچھ مل گیا جو وہ کھو چکے تھے ——

ان کو آج اپنے شہیدوں کا خون مل گیا ان کو آج اپنا پاکستان مل گیا، ان کو آج اپنی زندگی مل گئی، وہ خوش ہیں اور مسرور، اور ان کا دل دھڑک دھڑک کر پکار رہا ہے ——

—— "مجھے آج اپنا وطن مل گیا ہے" ✖

اقبال سیفی •

شعلۂ سوزِ نوا

شعلۂ سوزِ نوا

تیرہ و تار فضاؤں میں فروزاں قندیل!

موجۂ گل تھی نری شوخیِ رفتار نہ تھی
ہم سے پہلے کہیں یہ گرمیِ بازار نہ تھی
زندگی طوق و سلاسل سے گرانبار نہ تھی

گرد آلود تھا ہستی کا ہر اک نقشِ جمیل

آسماں پر کوئی ضوریز ستارا ہی نہ تھا
کہیں اخلاص و محبت کا شرارا ہی نہ تھا
شعلۂ سوزِ نوا، انجمن آرا ہی نہ تھا

دشت آثار سی تھی وادیِ ہر رادیِ نیل!

پھول کھلتے تھے تو زخموں کا گماں ہوتا تھا
شورِ فریاد پہ نغموں کا گماں ہوتا تھا
موجۂ گل پہ بگولوں کا گماں ہوتا تھا

شعلۂ سوزِ نوا

کاروانِ دل وجاں کے لئے آوازِ رحیل

ہر طرف غم کی فضا یاس کا سناٹا تھا
آبلہ پائی میں کانٹوں نے لہو چاٹا تھا
یارو ہم نے بڑی جوکھوں سے سفر کاٹا تھا!

ہوئی اس طرح سے کچھ جذبِ جنوں کی تکمیل

یوں لیا بادِ حوادث میں سنبھالا ہم نے
پھونک دی ذرّوں کے سینوں میں جوالا ہم نے
تیرہ و تار فضاؤں کو اُجالا ہم نے!

شعلۂ سوزِ نوا

تیرہ و تار فضاؤں میں فروزاں قندیل!

نصر اللہ خاں عزیز

"ولادتِ سعید"

۲۳ مارچ کو پاکستان کا یوم جمہوریہ اسلامیہ بڑی دھوم دھام سے منایا جارہا ہے۔ اور کیوں نہ منایا جائے۔ پاکستان کا دستور نہیں بنا بلکہ ایک ایسے شخص کے گھر میں فرزند ارجمند تولد ہوا ہے جو اولاد سے بالکل مایوس ہوچکا تھا۔

پہلے اس نے ایک بیوی کی۔ خیال تھا کہ پہلے ہی سال میں وارث جائداد پیدا ہو جائے گا۔ مگر سال پر سال گذرتے گئے۔ دنیا سنتی رہی کہ بیگم صاحب کا پیر بھاری ہے۔ عنقریب ان کی گود ہری ہونے والی ہے مگر ان کا حمل حمل رجاء ثابت ہوا۔ ڈاکٹر لیاقت علی جو ہلی کے مشہور خاندانی فزیشن تھے برسوں علاج کرتے رہے مگر نتیجہ صفر۔

اس کے بعد بنگال سے ایک شاہی طبیب شفا الملک حکیم ناظم الدین کو بلوایا گیا۔ بنگالے کا جادو مشہور ہے یہاں تک سنا ہے کہ وہاں تو آدمیوں کو پھونک مار کر بھیڑ اور بکری بنا دیا جاتا ہے۔ بلکہ طوطا اور مینا بنا کر پنجرے میں بند کر دیا جاتا ہے انہوں نے بھی بہتیرا اسرار مارا مگر بیگم صاحبہ بانجھ ہی رہیں۔ لوگوں نے کہا دیسی طب سے کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی امریکی سند یافتہ ڈاکٹر بلواؤ اور انجکشن کا طریقہ آزماؤ۔ آج اس طریقہ علاج کی کامیابی کی دھوم ہے۔ چنانچہ امریکہ سے ڈاکٹر محمد علی آف بوگرا ہوائی جہاز پر اُڑ کر پہنچے۔ انھوں نے ایسے ٹیکے لگائے کہ واقعی معلوم ہونے لگا۔ اب صاحبزادہ بلند اقبال میاں دستور سلمہ اللہ تعالیٰ تولد ہونے ہی والے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے نو مہینہ اور دن بھی مقرر کر دیا کہ اس روز وضع حمل ہو جائے گا۔

مگر شوئی تقدیر کہ ایک روز بیگم صاحبہ گھر کے ایک بزرگ سے لڑ پڑیں انھوں نے اسے دھکا جو دیا تو لڑکھڑا کر گریں اور نہ صرف اسقاط حمل ہو گیا کہ بلکہ وہ خود بھی عنقریبا ہو گئیں اور ڈاکٹر محمد علی امریکہ چلے گئے بڑے میاں نے پھر ایک شادی کر لی۔

اگرچہ بعض لوگوں کی تو رائے یہ تھی کہ اب اولاد نرینہ کی آرزو بیکار ہے بہتر یہ ہے کہ امریکہ یا انگلستان کے کسی مجہول النسب لڑکے کو گود لے لیا جائے مگر خاندان والے نہ مانے اور ایک روز سہرے باندھ کر ان کو پھر دولہا بنا دیا گیا۔ اب کے ایک دیہاتی حکیم صاحب کو تعینات کر دیا گیا۔

دیہاتی حکیموں کا قاعدہ ہے کہ وہ مریض کے پلنگ کے پاس پلنگ بچھا کر علاج معالجہ کرتے ہیں چنانچہ حکیم چوہدری محمد علی نے بھی شب و روز سر پر سوار رہ کر غذا اور دوا کی نگرانی کی۔ بڑے میاں کو مقوی ـــــ دوائیں کھلائیں نئی بیگم کی حفاظت کی کہ وہ کسی سے لڑنے بھڑنے نہ پائیں یہ علاج کامیاب ہوا اور ۲۹ فروری کو برخوردار سعادت اطوار پردۂ عدم سے نمودار ہو کر عالم وجود میں آ گئے ؟

حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

اب اگر کچھ لوگوں نے چیخ کر گلا کے جو ہر یوں کی طرح رسم عقیقہ پر حسب عادت ڈھول تاشے اور باجے گاجے کا اہتمام کیا ہے تو حیرت کیوں ان کے نزدیک تو خوشی منانے کا یہی طریقہ ہے۔

(بشکریہ "ایشیا" لاہور)

قمر جمیل

غزل

اٹھی تیری نگہ تو کہکشاں سے کھیلتی ہوئی
جھکی تو اپنے سنگِ آستاں سے کھیلتی ہوئی

قدم تو بڑھ گئے مگر قدم سے دور رہ گئی
قدم کی چاپ گردِ کارواں سے کھیلتی ہوئی

یہ زندگی ازل ابد کی سرحدیں نہ چھو سکی
گزر گئی حجابِ درمیاں سے کھیلتی ہوئی

خدا کرے وہ جانِ انتظار آئے پھر مگر
چلی نہ جائے جذبۂ نہاں سے کھیلتی ہوئی

افق پہ تیرگی چھٹی کسی طرح یہ شب کٹی
قمرؔ وہ دیکھ پو پھٹی اذاں سے کھیلتی ہوئی

محمد ارشاد خاں ●

آمریت کا خط
ـــــ "جمہوریہ اسلامیہ پاکستان" کے نام

تم میرا خط پڑھتے ہوئے ضرور تعجب کر رہے ہوگے ـــــ کیونکہ میں گذشتہ آٹھ سال سے اس بات کی متواتر کوشش کر رہی ہوں کہ یہ سرزمین جسے لوگ "پاکستان" کے نام سے جانتے ہیں، تمدن کی اجتماعی خرابیوں سے پاک نہ ہونے پائے۔ ابنائے وطن کو بھوک، بیماری اور نجاست کے مکانوں سے نجات نہ مل سکے۔ ان حالات میں ملک کا سواد اعظم معاشی اعتبار سے بدحال، صحت کے لحاظ سے نڈھال، تعمیر زندگی کی دوڑ میں پس ماندہ و پامال اور فکری و ذہنی افتاد کے اعتبار سے نہایت ژولیدہ فکر رہے، اور ان تمام نقائص اور خرابیوں کے استیصال کا ضامن جو اسلام ہے، جو لوگوں کے ایک ایک مسئلہ کو اپنی گرفت میں لیکر حل کرتا چلا جاتا ہے کسی طرح بھی میرے عہد میں اس کا بول بالا نہ ہو۔ اور نہ ہی "جمہوریت" یہاں پھل پھول سکے۔ میں نے اس سلسلہ میں کیا کیا جتن کئے۔؟ اگر وہ معلوم کرنا چاہتے ہو تو پاکستان کی آٹھ سالہ تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھ لو۔

پاکستان بننے کے بعد جب تم نے دیکھا کہ یہاں "مینا بازار" لگنے لگے رشوت اور چور بازاری وسیع پیمانے پر شروع ہو گئی ـــــ عریاں اور فحش فلموں کی نمائشیں ہونے لگیں۔ ریڈیو پر رات دن فلمی گانے نشر ہونے لگے تو تمہیں میرے ان ارادوں کا علم ہو گیا کہ میں اس ملک میں اسلامی نظام ہرگز نہ قائم ہونے دوں گا۔ اور ان حالات سے متاثر ہو کر تم نے اپنے نمائندوں کے ذریعے کچھ اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔

"ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ تقسیم ملک کے فوراً ہی بعد یہاں ان تمام خرافات کا جو انگریزوں نے پھیلائی تھیں سدباب کیا جاتا۔ لیکن شراب نوشی، بے حیائی اور عریانیت کے مظاہرے ہمیں بتا رہے ہیں کہ یہ لوگ اس مقصد سے انحراف کر رہے ہیں جس کے لئے قوم نے جانوں، مالوں اور آبروؤں کے بھاری نقصانات برداشت کئے۔ بستیوں کو کھنڈر بنتے دیکھا ـــــ سڑکوں پر خون کی ندیاں بہتی دیکھیں ـــــ بچوں کے سینوں میں کرپانیں چبھتی دیکھیں ـــــ پردہ دار خواتین کو سڑکوں پر برہنہ پھرتے دیکھا ـــــ غرضیکہ یہ اور اسی قسم کی بے شمار قربانیاں قوم نے محض اسلامی نظام کے لئے دی تھیں۔ اس لئے ہم حکمران طبقے کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر انھوں نے اسلامی نظام قائم کرنے میں پس و پیش کیا تو ہمیں ایک اور جنگ لڑنا پڑے گی۔"

جب میں نے دیکھا کہ "اسلامی نظام" کا مطالبہ پوری قوم بڑی شدت سے کر رہی ہے تو میں نے قوم کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ:۔

"چونکہ یہ نوزائیدہ حکومت ابھی ابھی بنی ہے ـــــ اس کی سرحدوں پر چاروں طرف دشمنوں سے خطرہ ہے۔ اس وقت تو ساری قوت پاکستان کو مضبوط کرنے میں صرف ہونی چاہیئے ـــــ اور فی الحال اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنے کے کام کو ملتوی رکھنا چاہیئے۔" لیکن جب تم نے میرے اس ڈھونگ کو زیادہ دنوں تک کامیاب نہ ہونے دیا تو مجھے مجبوراً یہ عذر پیش کرنا پڑا کہ:"اگر یہاں اسلامی حکومت قائم کر دی گئی تو ہندوستان میں ہندو حکومت قائم ہو جائے گی ـــــ اور ہندوستان کے مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔"

لیکن تم نے میرے اس عذر پر یہ دلیل پیش کرکے کہ:۔

"وہاں تو ہندو حکومت قائم بھی ہو چکی ـــــ اگرچہ کاغذی طور پر یہ کہا جا رہا ہے کہ حکومت ہند کا کوئی مذہب نہیں اور یہاں سب کو برابر کے حقوق ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہاں مسلمانوں کو زمین پر چلنے کے بھی حقوق حاصل نہیں ہیں۔" ـــــ میرے اس عذر کو بھی خالی جانے دیا تو مجھے یہ عذر تراشنا پڑا کہ:"اسلامی حکومت تو "ملاؤں" کی حکومت ہوگی اور "ملا" دنیا کے معاملات کو قطعاً نہیں جانتا۔"

لیکن تم نے قوم کو یہ بتا کر کہ:"پاکستان میں اب جو لوگ اسلامی

نظام کے مطالبہ کو لیکر اٹھے ہیں وہ صرف ملا ہی نہیں بلکہ دنیا کے معاملات کو بھی خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث کو بھی ——— یہ لوگ فلسفہ و سیاست کو بھی خوب سمجھتے ہیں اور قرآن کے فلسفہ و سیاست سے بھی بخوبی واقف ہیں؛ میرے اس عذر کو بھی نہیں چلنے دیا۔ تو مجھے ایک اور ترکیب سوجھی اور وہ یہ کہ ایک ایسا قانون بنایا جائے جس کی رو سے نہ تو کوئی شخص میرے اوپر تنقید کر سکے اور نہ ہی کوئی شخص میری اجازت کے بغیر کسی جلسہ میں تقریر کر سکے۔ اور اگر کوئی شخص اس قانون کی خلاف ورزی کرے یا مجھے شبہ ہو جائے کہ وہ خلاف ورزی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اسے بغیر مقدمہ چلائے جیل میں ٹھونس دیا جائے۔ چنانچہ میں نے "سیفٹی ایکٹ" بنایا اور اس کے ذریعہ سینکڑوں افراد کو بغیر مقدمہ چلائے جیلوں میں ڈال دیا۔

غرضیکہ یہ قانون میں نے اپنے مخالفوں اور خصوصاً اسلام پسند عناصر کو کچلنے کے لئے خوب استعمال کیا۔ جب طاقت کے بل بوتے پر میں نے تمہاری آواز کو دبا دیا تو تہذیب مغرب سے متاثر کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ پاکستانی نوجوان مردوں اور عورتوں کو معمولی معمولی کاموں کے لئے بھاری اخراجات پر مغربی ممالک میں بھیجا تاکہ مغربی ممالک کے باشندوں کے عیش و عشرت اور عیاشی کے "نظارے" دیکھ کر یہ لوگ بھی اسلام کی مخالفت کرنے لگیں!

۱۹۵۰ء میں میں نے محسوس کیا کہ اب غیر اسلامی دستور نافذ کرنے کے لئے ماحول کافی سازگار ہو چکا ہوگا لیکن جب پوری قوم نے غیر اسلامی دستوری سفارشات کو ٹھکرا دیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ لیکن چونکہ میرے پاس طاقت تھی اس لئے میں نے اسلام پسند عناصر کو کچلنے اور لادینی دستور نافذ کرنے کی کوشش برابر جاری رکھی اور ایک چال یہ چلی کہ قوم کو یہ بتانا شروع کر دیا... دستور کے مسئلہ پر ملک کے تمام علماء متفق نہیں ہیں۔ لیکن نہ جانے کس طرح تم نے ۳۱ علماء کرام کو جمع کر لیا۔ جبکہ میں نے ملک کے بڑے بڑے علماء سے سودے بازی کرنی چاہی تھی

ان علماء کے متفق ہونے کا نتیجہ میرے لئے بہت برا ثابت ہوا کیونکہ یہ صرف جمع ہی نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے تین چار روز میں ایک دستوری خاکہ بنا کر قوم کے سامنے پیش کر دیا اور قوم میرا سر کھانے لگی کہ جلدی دستور بناؤ۔ آخر مجبور ہو کر ۱۹۵۲ء میں ایک ایسا دستور بنایا جس میں خدا اور رسول کا نام بار بار لیا گیا تھا۔ لیکن ان دستوری سفارشات کے پیش کرنے کے کچھ ہی عرصے بعد میں نے قادیانیوں کا مسئلہ کھڑا کرا دیا تاکہ خوب ... خونریزی ہو، اور اس خونریزی کے سلسلے میں اسلام پسندوں کو جھوٹے الزام میں ٹھہرا کر اس ساری بدنظمی اور خونریزی کی ذمہ داری ان پر ڈال کر انہیں موت کے گھاٹ اتار دوں غرضیکہ تم نے اخبارات اور رسالے جاری کئے تو میں نے انہیں "پریس ایمرجنسی" کے تحت بند کر دیا۔ ڈیکلریشن منسوخ کر دیئے۔ تمہارے اخبارات سے بغیر کسی وجہ کے جھوٹا الزام تراش کر ہزاروں روپے کی ضمانتیں طلب کیں۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ تمہارے پاس دولت تو ہے نہیں۔ لامحالہ تم ضمانت کی رقم جمع نہ کر سکو گے اور اس طرح مجھے اخبار بند کرنے کا بہانہ ہاتھ آ جائے گا۔

میں نے ضمیر فروش صحافیوں کے ضمیر خریدے اور تمہارے خلاف جھوٹی اور بے بنیاد خبریں شائع کرائیں اور اپنے اداریے لکھوائے جس سے عوام میں تمہارے خلاف نفرت پھیلے۔

میں نے کچھ لالچی لوگوں کو ہزاروں روپے دیکر تمہارے خلاف اخبارات میں بیان دلوائے۔ مراسلت لکھوائے۔ اور کفر کے فتوے تک لگوائے

میں نے تمہارے نمائندوں پر ملک سے غداری کرنے کے جھوٹے الزام محض اس لئے لگائے کہ کسی نہ کسی طرح تمہیں اور تمہارے ہمنواؤں کو خوفزدہ کر دوں ——— لیکن تم بیچارہ گر بیچارہ سارے تمام صعوبتیں برداشت کرتے رہے تمہارے پاس دولت تھی۔ نہ فوج اور پولیس۔ نہ ہوائی جہاز۔ نہ مشین گنیں اور نہ ہی ٹینک۔ تمہارے پاس تو صرف ایک طاقت تھی اور وہ تھی تمہارا صبر اور استقلال۔ اور رضائے الٰہی کے لئے قربانی کا جذبہ جس نے مجھ جیسی "آمریت" کو شکست دیدی۔

تمہارے لئے ہر ابتلاء اور آزمائش نے حقیقت میں ایک موقع فراہم کیا جس سے تمہارے عزائم استوار ہوئے۔ جس سے تمہارے چارہ سازوں کو میرے مقابلہ میں ایک مرتبہ اور سرخرو ہونے کا موقع ہاتھ آیا۔ یہ کشمکش جاری ہی تھی کہ امتداد زمانہ کے ساتھ میرے ترکش سے اتہام الزام، غداری اور بیوفائی کے وہ تمام تیر چھوٹ چکے جن سے میں تمہاری

اسلامی قوت کا مقابلہ کرتی رہی ——— بالآخر مجھے ناکامی ہوئی اور تمہیں کامیابی ——— اور اس کامیابی کو حق کی فتح اور باطل کی شکست کہنا چاہیئے۔

خط ختم کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ "حق و باطل کی یہ کشمکش ازلی و ابدی ہے۔ میں اور میرے پیدا کئے ہوئے تخریبی عناصر کبھی نیست و نابود نہیں ہوتے۔ صرف دب جاتے ہیں اور تمہاری اندرونی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں جب بھی موقع ملتا ہے ابھرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کی خاطر میں "جمہوریت" کا لبادہ اوڑھ لینے میں بھی کبھی عار محسوس نہیں کرتی

فقط حق کی ازلی و ابدی دشمن
"آمریت"

راغب مراد آبادی •

جان سے، تیری محبت میں گذرنے والے
وہ کبھی دار و رسن سے نہیں ڈرنے والے

ناخدا پر ہے نظر جن کی وہ ڈوبیں گے ضرور
اور ہیں شورشِ طوفاں سے گزرنے والے

کاش اس راز کو اربابِ زمانہ سمجھیں
خاکِ ہستی سے ہیں انجم بھی ابھرنے والے

دیکھئے کس کو ملے شانہ کشی کی عزت
شاہدِ عصر کے گیسو ہیں سنورنے والے

حسنِ آرائشِ گلشن پہ نہ جانا راغب
کہ یہ اجزا ہیں کسی روز بکھرنے والے

قیصر قیصری •

تعیّنِ رہ

لو اُجاگر ہوئے ملے ہوں پہ نقوشِ کفِ پا
بسترِ سنگ پہ فرسخ کہکشاں ہو گئے اٹھے
آخرش کشمکش وہ خوش انجام ہوئی
راستے اپنی منازل کا پتہ دینے لگے
کھل گیا رات کے اربابِ سیاست کا بھرم
کارواں منزلِ مقصود سے واقف نکلے

راہِ منزل متعین ہوئی لیکن اے دوست
یہ تگ و تاز کا آغاز ہے انجام نہیں
شب کے پسماندہ اندھیرے نگروں میں ابتک
نفسِ صبح سے کچھ دور دمِ شام نہیں
کسی طوفاں کا سرا پردہ ہوا ہوں کا سکوت
فرصتِ صبح میں آرام کا ہنگام نہیں
رات کے ماندے قدم اور ابھی تیز کرو
کہ ابھی دور بہت دور ہے اپنی منزل

اسماعیل ادیب •

لیکن کیا لکھوں؟

مجھے یوم جمہوریہ کے متعلق کچھ لکھنا ہے لیکن اس وقت مجھے قطعی سکون حاصل نہیں، میرے دماغ میں اب تک وہی سلیم میاں اور انکی بیوی گھوم رہے ہیں۔

یہ میاں بیوی بھی بڑے عجیب ہیں۔ معمولی سے معمولی بات میں اختلاف۔ بڑے سے بڑے معاملے میں جھگڑے۔ غرض کہ پڑوس کیا ہے بس اچھا خاصا ہنگامہ ہے۔ جب بھی دیکھو ناک بھوں چڑھائے ہی رہیں گے۔ ایک دوسرے کو خونیں نظروں سے گھورتے نظر آئیں گے۔ خدا جانے وہ کون سے مبارک لمحے ہوتے ہوں گے جب یہ ایک دوسرے سے مطمئن ہوں

آج کل عورتیں آزادی کا نعرہ بڑی شدت سے لگا رہی ہیں میں بھی اتنی آزادی کا حامی ہوں کہ جس سے عورت صرف مرد کی غلام نہ بن سکے رہی یہ آج کل کی آزادی۔ تو بھئی خدا بچائے اس سے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں سلیم میاں کا طرفدار ہوں۔ بھئی خدا کا نام لیجئے میں تو خود کی بھی جائز طرفداری نہیں کرتا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ غلطی عموماً سلیم میاں کی ہی ہوتی۔ خواہ وہ ان کی بیوی کی حماقت کا نتیجہ ہو۔ لیکن صاحب مرد تو اس لئے ہی پیدا کیا گیا ہے کہ وہ عورت کی حماقتوں کا اپنی عقل سے ازالہ کر سکے۔ ورنہ پھر خدا کو کیا ضرورت تھی کہ وہ بلاوجہ ایسا کرتا۔

بہت پہلے کی بات ہے۔ بیوی کو شکایت ہوگئی تھی کہ شوہر اس کی آسائش کا خیال نہیں رکھتا۔ جب کہیں، ٹال دیتا ہے۔ چنانچہ ایک دن ٹھن گئی دونوں میں۔ ادھر ہے کہ بیوی احتجاج کئے جا رہی ہے۔ میاں جھڑکیاں دئے رہے ہیں۔ ہم پڑوسی ہونے کے طفیل سنے جا رہے ہیں۔ جل بھن کر قلم ہاتھ سے چھوڑے بیٹھے ہیں۔ جی میں آ رہا ہے کہ خوب جی بھر کر اخبارات میں ایسی لڑائیوں کے خلاف لکھیں۔ لیکن جب انکشاف ہوتا ہے کہ قصور میاں کا ہے تو خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے۔

بیوی کہہ رہی ہے۔

"بس، چھوڑو اپنا جادو چلے۔ کسی اور کو دکھانا۔ میں اب کچھ سننے سنانے والی نہیں۔ فوری میرے لئے ایک ساڑھی لا دو۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ کیا تمہیں ہی پہننے اوڑھنے کا شوق ہے۔ اب تک سنتے آئے تھے کہ عورتیں شوق و ذوق کرتی ہیں اور مرد کما کر لاتے ہیں۔ لیکن تم ہو کہ نئی نئی تراش کے کپڑے چاہئیں۔ اچھے اچھے کھانے چاہئیں۔ گوشت کے سالن کے بغیر حلق سے نوالہ نہیں اترے گا۔ جب تک ایک سینما نہ ہو مہینہ کاٹے نہیں کٹے گا۔ ہائے اللہ۔ مجھ نصیبوں جلی کو کیا تم ہی رہ گئے تھے کیا کیا آرزوئیں کی تھیں کہ شادی ہوگی تو آزادی ملے گی۔ آزادی ملے گی تو دل کے ارمان نکلیں گے۔ لیکن یہاں تو روز روز ہی کا رونا رہتا ہے۔ چاول نہیں تو میرے لئے۔ صابن نہیں آیا تو میرے لئے۔ کپڑے نہیں بنے تو میرے لئے۔ اور آپ۔ کھانا نہ ملے تو ہوٹل آباد کریں۔ اپنی ضرورت ہو تو صابن ہی کیا اسنو پاؤڈر بھی لائیں۔"

بیوی خدا خدا کر کے چپ ہوئیں تو میاں نے شروع کیا۔

"بیگم ——— الزام تراشی کوئی تم سے سیکھے۔ کیا کیا نہ کہہ ڈالا۔ اس سے اچھا تھا ہاتھ اٹھا دیتیں۔ میں کہتا ہوں مجھ سے نہیں چلنے کا یہ حساب کتاب۔ تم نے خود کہا تو کر لیا تھا۔ ورنہ مجھے کیا پڑی۔ اب تم جو کہو سو کہو ——— میری بھلا کون سنے گا۔ شاید تمہیں گرانی کا علم نہیں دکاندار کاٹ کھانے کو آتے ہیں کاٹ کھانے کو۔ اب اس پر تمہارا یہ کہنا کہ میں فیشن پورے کرتا ہوں کتنا ناواجبی ہے۔ مانا کہ میں نے کچھ کپڑے بنا لئے۔ لیکن تم ہی کہو نہ بناتا تو آفس میں کیا عزت رہتی۔ اور ملنے جلنے والے کیا سمجھتے۔ اس میں تمہاری بھی تو بدنامی ہے۔ پھر ہمارا کاروبار کیسے چلے گا۔ رہا اچھے کھانوں کا۔ جب اتنا کماتا ہوں تو کیا ایک شوق کا بھی حق نہیں رکھتا۔ ——— خیر جانے دو سب ——— ساڑھی کی کہہ رہی ہو نا ——— وعدہ رہا لا دوں گا بس ——— اب تو خوش؟

لیکن بیوی کہیے چھوڑنے والی تھیں۔ مفنائی۔

"بس دعدہ ہی کرتے رہو —— لاتے نہیں۔ یہ تو معلوم ہے"

میاں اب کی بار گرم ہو گئے۔

"کہہ جو دیا لاؤں گا —— اب ضد کرو گی تو پھر الٹی سیدھی سنادوں گا۔ جانتی نہیں کیا کیا مصیبتیں ہیں۔ یہاں تو اپنی جھونپڑی کے ہی لالے پڑے ہیں اور تم ہو کہ ساڑھی —— ساڑھی"

بات یہ ہے صاحب۔ کہ سلیم میاں کی بیوی طاہرہ بڑی زمانے کی ستائی عورت ہے۔ باپ جب تک رہے کلیجے سے لگا کر پالا۔ ہر طرح کی ناز برداریاں کیں اور پھر سلیم میاں سے شادی بھی کردی۔ انہیں گھر داماد رکھ لیا۔ اور پھر آپ جانتے ہیں کہ کراچی میں مکان کی کتنی قلت ہے۔ طاہرہ کے باپ کے ہاں غربت کے باعث پختہ گھر تو تھا نہیں۔ لے دے کے ایک نیم پختہ جھونپڑا تھا۔ شادی کے بعد وہ تو اللہ میاں کو پیارے ہو گئے لیکن جاتے جاتے کہہ گئے کہ سلیم میاں۔ میری بچی کو جان سے زیادہ عزیز سمجھنا خیال رہے میں نے اسے ماں بنکر پالا ہے اور دیکھو اس جھونپڑی کو پکا کر لینا ورنہ خدا جانے کب گر پڑے۔ یا لوگ شرارت سے گرا ڈالیں۔ تنگ کریں۔ یہاں کسی چیز کا بھروسہ نہیں۔ میری خواہش ہے کہ مکان فوری بنوالو۔ کیونکہ مکان کے بغیر آدمی کسی کام کا نہیں۔

لیکن سلیم میاں میں بڑی بڑی عادتیں ہیں وہ انتہائی لاپرواہ قسم کا آدمی ہے اس نے مکان چھوڑ اتنا بھی نہیں کیا کہ جھونپڑی پکی کر لیتا یا بیوی کی ضروریات پوری کرتا۔ اسے تو بس اپنے عیش سے مطلب ہے۔

میں مجبوراً جب اس کی بیوی کی طرفداری کرتا ہوں تو وہ مجھ سے بھی خفا ہو جاتا ہے کہتا ہے۔ واہ اسماعیل صاحب آپ بھی غلط بیانی سے کام لینے لگے۔ اگر آپ کی نیت صلح صفائی کی ہے تو بھلا اس طرح کہیں صلح صفائی ہو گی۔

لیکن توبہ —— مجھے تو یوم جمہوریہ کے لئے کچھ لکھنا ہے۔ اور میں چند مہینے پہلے کی بات ہے۔ گھر کے کسی بچے نے باپ سے کہدیا کہ وہ پڑھنے کے لئے پیدل نہیں جائے گا۔ پیدل جائے گا تو ایک پیسہ چنے کے لئے لیگا۔ اس پر باپ کو اتنا غصہ آیا کہ انہوں نے اسے مارتے مارتے لہولہان کردیا۔

پھر بیوی نے چیخ چیخ کر محلہ سر پر اٹھا لیا۔

"ماردیا۔ قتل کردیا —— ہائے کوئی دیکھو —— اس قصائی باپ کا ظلم دیکھو"

اور میاں ہیں کہ پیٹے جارہے ہیں۔

"اور کرے گا ضد —— اور کریگا ضد —— لے۔ لے۔ لے"

چلئے صاحب۔ ہنگامہ شروع ہو گیا۔

یہ چھوڑیئے۔ بڑے بچے کی خواہش تھی کہ وہ مقامی زبان میں تعلیم حاصل کرے گا۔ باپ مفر کہ پڑھے گا تو انگریزی نہیں تو کچھ نہیں اور جو بچے نے حکم عدولی کی۔ تو لگے پیٹنے۔

"بول۔ کون سی زبان —— بول کونسی زبان ؟"

حالانکہ سلیم میاں کو خدا نے عقل دی تھی۔ وہ سمجھ سکتے تھے اور بچہ کوئی ایسا ضدی بھی تو نہیں تھا۔ صرف کم عقل ہو چار بچوں کے باپ بن گئے لیکن ابھی تک دماغ میں بچپنا بھرا ہوا۔ اب بیوی جو دخل دے تو مغلظات کی پوری فہرست پڑھ ڈالیں۔ کچھ پہلے کی بات ہے ایک بچے نے بڑی گھناؤنی گالی دی۔ لیکن باپ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ طاہرہ کو چڑ ہوئی تو اس نے لکڑی اٹھا کر اسے سزا دینی شروع کی۔ اور نہیں تو کیا کرتی بچہ اگر یونہی گالیاں دیتا رہے تو سب گالیاں سیکھیں گے۔ بچوں کو اتنی عقل کہاں کہ اچھے برے کی تمیز کر سکیں۔ پھر اخلاق بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ لیکن سلیم میاں بیوی کو سزا دیتا دیکھ کر بڑے برافروختہ ہوئے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ سمجھانا بجھانا چھوڑ بیوی کو ہی سزا دینی شروع کردی۔ یہ درست تھا کہ بیوی نے بچے کو فوری پیٹنا شروع کیا لیکن یہ کسی شوہر کی شان ہے کہ وہ بیوی کی ایسی عزت کرے، بجائے اسے صلاحیت سے کہنے کے انہوں نے وحشیانہ طریقے استعمال کئے جسے سن کر سارے پڑوسی محلے والوں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔

اب ان کے جھونپڑے سے لگے باغ ہی کے قصے کو لیجئے۔ چھوٹی موٹی سی پھلواری ہے لیکن ادھر سے یہ قبضہ جمائے بیٹھے ہیں تو ادھر سے ایک اور پڑوسی اس پر غاصب کی طرح قبضہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے مجھے پہلے تو حال حقیقت معلوم نہیں تھی پھر پتہ چلا کہ باغ پر صرف ان کا حق ہے لیکن یہاں حق کو کون دیکھتا ہے۔ قوت کی دیکھی جاتی ہے۔ سلیم میاں

ابھی تک فیصلہ نہ کرپاتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ میں نے جیسا تو کہنے لگے۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں صاحب۔ ادھر میں ابھی جھونپڑا بھی بنانے نہیں پایا ہوں۔ ذرا جھونپڑی کی جگہ مکان بن جائے پھر دیکھوں گا۔

لیکن ——— خدا جانے آج یہ سلیم میاں کیوں معہ گل کے میرے دماغ میں شور مچا رہے ہیں۔ نہ یوم جمہوریہ کے متعلق ہی لکھ سکا ہوں نہ ڈھنگ سے سلیم میاں کی ہی داستان لکھی ہے۔

یوں تو ان کی بیوی طاہرہ کا مطالبہ شروع ہی سے مکان کے متعلق تھا۔ لیکن پہلے اپنے فائدے اور لاپرواہی کے باعث انہوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ اب جو آن پڑی تو سوچنے لگے کہ کیا کرنا چاہیئے۔

بیوی کا مطالبہ دن بدن زور پکڑتا جا رہا تھا کہ مکان بناؤ کسی طرح بناؤ۔ بچے آوارہ ہوتے جا رہے ہیں۔ دن بھر ادھر ادھر گھومتے رہتے ہیں کچھ کہو تو کہتے ہیں کیا کریں جھونپڑے میں کیسے بند پڑے رہیں۔ پھر ایک جھونپڑے کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کا بھی کام نہیں ہو سکتا۔ ورنہ مولوی صاحب کو روز قرآن شریف پڑھوانے کے لئے بلالیا کرتے فرش پر بڑی گندگی رہتی ہے اسی لئے نماز پڑھنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ جھونپڑی کے پردے پھٹ گئے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ اور مجبوریوں کے باعث پردے کی بڑی تکلیف ہے۔ بلکہ پردہ کیا ہی نہیں جا سکتا جس کے باعث غیر مرد بڑی بھوکی نظروں سے دیکھا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ

لیکن کبھی بھی سلیم میاں نے ان باتوں پر توجہ نہیں دی۔ مگر چند مہینوں سے ان کے اطوار کچھ پسندیدہ سے ہوگئے ہیں۔ انھوں نے سنجیدگی سے ساری باتوں پر غور کرنا شروع کیا تھا اور اس کے بعد بڑے خلوص سے فیصلہ کیا تھا کہ یہ ساری شکایتیں ساری برائیاں صرف اس گندے جھونپڑے کی وجہ سے ہیں۔ جب مکان نہیں تو کراچی میں رہنے والا انسان نہیں۔

ابھی ابھی وہ میرے پاس سے اٹھ کر گئے ہیں۔ نیا مکان بنوالیا ہے۔ بڑے مسرور ہیں۔ اپنے طرز عمل میں بھی بڑی ترمیم کرلی ہے کہہ رہے تھے کہ مکان بن گیا۔ بیوی بھی خوش ہے۔ بچے بھی خوش ہیں خود میں بھی خوش ہوں کہ چلو آٹھ سال بعد ایک تو کام کی چیز ہوئی۔

ان کا خیال ہے اب آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے بیوی بھی پردے کی پابند رہے گی۔ ان کی بھی طبیعت نہیں گھبرائے گی اور یہ سینما دیکھنا یا سڑکوں پر نظریں لڑانا چھوڑ دیں گے۔ بچوں کو مولوی صاحب سے قرآن پڑھوائیں اور سب کوشش کریں گے کہ مل کر اللہ کو یاد کریں۔ یہ وجہ ہے صاحب۔ کہ میرے دماغ میں وہ۔ اور ان کا جھگڑالو خاندان اب تک گھوم پھر رہا ہے۔

میں آج خود بھی بڑا سکون محسوس کر رہا ہوں۔

لیکن مجھے آج جمہوریہ کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری تھا لیکن اب آپ ہی کہئے کیا لکھوں ؟

ابو الخطیب

رپورتاژ

میرے عوام کو جب دستور ملا!

دن کا اجالا چاروں طرف پھیل گیا تھا دھوپ کی تمازت نے اسے چمک دار کردیا تھا۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی فٹ پاتھ پر لگے ہوئے پیڑ جھوم رہے تھے اور بعض پر چڑیاں بیٹھی جھول رہی تھیں اور کچھ چہک رہی تھیں۔ سامنے اسمبلی ہال پر ہمارا ہلالی پرچم فضا میں تیر رہا تھا۔ کولتار کی تپتی سڑک سنسان پڑی تھی کبھی کبھی کوئی کار گزر جاتی...... لیکن جب کوئی غریب اس سڑک سے گزرتا تو تھانیدار اس پر جھپٹتا، جو اس وقت لوگوں کو بڑا ناگوار گزرتا۔ اسمبلی ہال کے سامنے ہزاروں آدمی جلوس کا انتظار کر رہے تھے، پولس نے انہیں وہیں روک لیا تھا اور خود سڑک پر جال کی طرح پھیلی پڑی تھی لوگوں کو پولس کی یہ بات بھی ناگوار گزری۔ ان میں سے چند نے کہا:-

"آج کے دن تو ہمیں اس سے ملنے دو"

"نہیں نہیں، جب گزریں گے تو دیکھ لینا"

"نہیں ہم ہار پہنائیں گے"

"نہیں، تم آگے نہیں جا سکتے" ایک تھانیدار نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہم ضرور جائیں گے" بہت سے لوگوں نے فوراً سخت لہجے میں اصرار کیا

"آگے بڑھے تو ہم لاٹھی چارج کردیں گے" تھانیدار نے گرج کر کہا۔

"ہم ہار ڈالیں گے اور ضرور ڈالیں گے، اگر آج بھی تمہیں خون کی ہولی کھیلنا ہے تو کھیلو" لوگوں نے مشتعل ہوکر کہا۔

اور لوگوں میں کھچڑی پکنا شروع ہوگئی۔ اسی اثنا میں سپرنٹنڈنٹ آگیا۔ تھانے دار اس کے پاس گیا معاملے سے آگاہ کیا اس نے چند آدمیوں کو اسمبلی ہال جانے کی اجازت دیدی۔ لوگ خوش ہوگئے، نعرے لگائے اور بعد میں کسی من چلے نے سپرنٹنڈنٹ زندہ باد کا بھی نعرہ لگا دیا جس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا ——————

بڑے انتظار کے بعد وزیروں اور ممبروں کا جلوس اسمبلی ہال سے کاریوں میں گزرا جو لوگوں کو بہت ہی ناگوار گزرا۔ ان کے موڈ بگڑ گئے کیونکہ وہ اس امید میں کھڑے تھے کہ یہ سب آج پیدل چلیں گے

ابتدا میں ملٹری کی حفاظتی ٹولی نہایت شان اور گن مشینیں تانے نکلی، عوام نے اس منظر کو بھی دیکھ کر دکھ محسوس کیا کیونکہ آج کے دن تو وہ ایک ساتھ مل کر اس جشن کو منانا چاہتے تھے۔ جب چمکدار کاریں اسمبلی ہال سے نکلیں تو سب سے پہلے عوام نے بڑے جوش سے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ "اللہ اکبر" اس آواز سے فضا میں تھرتھری سی محسوس ہوئی جب وزیر اعظم کی سفید کار ہال سے باہر آئی تو چاروں طرف سے نعرے بلند ہوئے، نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، اسلامی جمہوریہ پاکستان زندہ باد...... سفید کار میں وزیر اعظم محمد علی، صدر مجلس دستور ساز مولانا عبدالوہاب اور شیر بنگال فضل الحق کھڑے ہوئے تھے اور مسکرا مسکرا کر لوگوں کی محبتیں کو سمیٹ رہے تھے۔ ان تینوں حضرات کی کار جب سڑک پر آئی تو عوام نے پولس کا گھیرا توڑ دیا اور کار کی طرف لپکے کار کے پیچھے ایک فوجی جیپ کار میں چند فوجی مشین گنیں تانے بیٹھے تھے اپنے عوام کی اس دیوانگی کو دیکھ کر وہ بھی مسکرائے اور ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ لوگ سفید کار پر جھپٹتے، لیکن وہ کچھ نہ کہتے۔ صدر مجلس سبز عبا پہنے ہوئے تھے جس پر کلابتو کا کام تھا انکی سفید داڑھی ہوا سے ہل رہی تھی۔ اور مور کے پنکھ کی طرح پھیل کر اس وقت بڑی حسین معلوم ہو رہی تھی، ان کا ہاتھ ہل رہا تھا۔ انکا چہرہ اَن بن بلائے مہمانوں کی محبت کو دیکھ کر مسرت سے تمتما رہا تھا۔ وزیر اعظم محمد علی کا اس سے مختلف حال تھا۔ ہار تو تقریباً ان سب کے گلوں میں پڑے ہوئے تھے لیکن محمد علی کے گلے میں پھولوں کا ایک پھندا تھا جو ان کی ٹھوڑی تک آگیا تھا۔ ننگی گنجی چاند پر پسینے کی بوندیں اس طرح پڑی تھیں جیسے شبنم سبز پتوں پر آکر ٹھہر جائے مسکرا

وہ بھی ہنس رہے تھے۔ لیکن اس مسکراہٹ میں ایک طرح کی حیرانی تھی۔ ایسی حیرانی جو خلاف توقع مسرت کے حاصل ہو جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ انکی چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھیں بڑے تعجب سے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں ...... اور جب کوئی دیوانہ اچھل کر نعرہ لگاتا تو وہ اسے گھورنے لگتیں۔ بوڑھا شیر بنگال پشت پر کھڑا ہوا تھا۔ اسکے سر پر خاختائی رنگ کی قراقلی کی پاکستانی ٹوپی تھی دھوپ کی تمازت نے ان کے جھریوں دار سیاہی مائل ملیح چہرے کو پسینے سے تر کر دیا تھا وہ اس جلوس کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کوئی بوڑھا پر دادا اپنے پوتوں پڑپوتوں کو اچھلتا کودتا دیکھکر اپنے دل سے کچھ کہہ رہا ہو، حیرانی ان کی آنکھوں میں بھی تھی ..... اس جم غفیر کو دیکھ کر ......

جلوس سیلاب کی طرح گورنر جنرل ہاؤس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور وزیروں کی کاریں اس سیلاب میں کشتیوں کی طرح تیر رہی تھیں۔

جب نعرہائے تحسین بلند ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے سیلاب ڈکرا رہا ہو۔

اس جلوس کو کسی جماعت نے منظم نہیں کیا تھا بلکہ لوگ اخبار میں جلوس کی اطلاع پاکر خود ہی آ گئے تھے، اس مبارک ساعت کو دیکھکر خوشی سے ان سب کے چہرے چمک رہے تھے ..... اور کیوں نہ چمکتے؟ اس قوم نے اس ساعت کے انتظار میں اپنے آٹھ سال بتائے تھے،

جلوس آہستہ آہستہ گورنر جنرل ہاؤس کی طرف بڑھ رہا تھا نعرے فضا میں گونج رہے تھے طرح طرح کے نعرے —— لیکن جب کچھ لوگوں نے سہروردی مردہ باد، اسمبلی سے واک آوٹ کرنے والے مردہ باد کے نعرے لگائے تو وزیروں نے لوگوں کو منع کیا کہ ایسا نہ کرو۔

"انھوں نے قوم سے غداری کی ہے ہمیں اس کا اظہار کرنے دیجئے" کچھ نوجوان ان پر مشتعل ہوکر جھپٹے اور وہ خاموش ہوکر مسکراتے رہے اور کاریں اس سیلاب میں تیرتی رہیں۔

جلوس جب منزل مقصود تک پہنچ گیا تو صدر مجلس نے پیچھے مڑکر عوام کو دیکھا۔ اور آخری سلام کیا۔ اب چہرے پر ان کے کچھ اور کیفیت تھی۔

"جاؤ، خدا حافظ ..... خدا تمہاری مدد کرے" پھر سے سلام کے لئے اپنے ہاتھ اٹھائے۔ پولس نے بڑی بھیڑ کو اسمبلی ہال کے قریب ہی روک لیا تھا لیکن پھر بھی عوام کی بھاری تعداد پولس کے گھیروں کو توڑ تاڑ کر گورنر جنرل ہاؤس تک اس آخری نظارے کو دیکھنے چلی ہی گئی تھی۔ گورنر جنرل ہاؤس کے سامنے دورویہ قطاروں میں عوام کھڑے ہوئے تھے۔ وزیروں اور ممبروں کی کاریں گزر رہی تھیں۔ جب مولانا اطہر علی اور فرید الدین کی کار آئی تو لوگ خوشی کے مارے اچھل پڑے اور کہا "اسلامی دستور کا دولہا آرہا ہے"

مولانا اطہر علی اور فرید الدین کے سروں پر ہار اس طرح پڑے تھے جیسے شادی میں دولہا کو پہنائے جاتے ہیں۔ کار جب قریب آئی تو ایک نعرہ بلند ہوا ..... پھر اس کے بعد دوسری کار ..... پھر ایک قطار ...... مسلم عوام اپنے دستور سے کس درجہ دلچسپی لیتے ہیں اس کا مکمل اندازہ اس وقت ان کی بے ترتیب ٹولیوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو اس وقت ادھر ادھر دھوپ میں کھڑی گفتگو میں مصروف تھیں ...... کچھ نوجوان گورنر جنرل ہاؤس کے سامنے دھرنا دیکر بیٹھ گئے ....

"ارے بھئی چلو" ایک داڑھی والے نوجوان نے کہا۔ اسکے ہاتھ میں امرودوں کی پوٹلی تھی۔

"ارے اس میں کیا ہے؟"

"امرود!"

"دستور کی خوشی میں"

"لیکن صرف اسکو ملیں گے جس نے نعرے لگائے ہیں"

اس کے ساتھیوں نے اس بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ کیونکہ ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا ..... جو گھنٹے آدھ گھنٹے تک نہ چیخا ہو۔ پوٹلی فٹ پاتھ پر رکھدی گئی۔ لوگوں کی چھینا جھپٹی سے امرود ادھر ادھر لڑھکنے لگے۔ لیکن ایک دو کے بعد کسی نہ کسی نے اسے جھپٹ ضرور لیا۔ امرود جب ختم ہو گئے تو کچھ مجاہدین نے ذرا بیچارگی کے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہمارا حصہ۔"

اس پر سب مسکرائے اور اپنے اپنے امرودوں میں سے آدھا آدھا کاٹ کر اپنے ساتھیوں کو دیا۔ امرود جب ختم ہو گئے تو ان میں سے ایک نے کہا:۔ "اچھا چلو اب"

"نہیں ہم آزادی کا پروانہ لیکر جائیں گے اس دن کا ہمیں آٹھ سال سے انتظار تھا۔" اس پر پھر ایک قہقہہ لگا۔

"ارے یار آج جمعہ بھی ہے نماز بھی پڑھنا ہے، اور شکرانے کے نفل بھی، یہ کام اللہ کے سپرد کرو اور چلو۔"

نماز سب کے چہروں پر روحانی طراوت بن کر چھا گئی اور وہ بغیر کچھ کہے اٹھ کھڑے ہوئے۔

کراچی، اس چمکتی دھوپ میں ایسے انبساط میں ڈوبا نظر آرہا تھا۔ جو اسلامیان ہند کو صدیوں کے بعد حاصل ہوا تھا۔ سب کو.. اطمینان تھا کہ چلو ایک مسئلہ تو حل ہوا۔ لیکن اس خوشی کے ساتھ ایک سوال بھی سب کے ذہن میں تھا

"کیا یہ لوگ اس دستور پر عمل بھی کر سکیں گے جو آج کرسیاں سنبھالے بیٹھے تھے۔ لیکن یہ سوال اس وقت ان کے ذہن کو پریشان نہیں کر رہا تھا بلکہ دستور کی خوشی نے ان کے دلوں کو طرح طرح کی امیدوں سے بھر دیا تھا۔ مسرت کے اس احساس کو لیکر میں آگے بڑھا یہ سوچ کر کہ ذرا ان کا بھی حال دیکھ لوں جنھیں اس کا سب سے زیادہ انتظار تھا۔ ذہن میں اس خیال کے آتے ہی کراچی کے ایک مشہور بازار کے عقب کی ایک گلی میں چلا گیا۔۔۔ اس گلی میں جہاں چھوٹے موٹے دکاندار اور محنت و مزدوری کرنے والے رہتے ہیں۔۔ جہاں ابھی تک کارپوریشن کا کوڑا دان ان کی جھونپڑیوں اور دکانوں کے سامنے آس پاس کی ساری گندگی اور کوڑا کرکٹ لئے پڑا رہتا ہے۔ جہاں ابھی تک کھجیلے اور مرگلے کتے نچوڑی ہوئی ہڈیوں اور مری ہوئی مرغیوں کی تلاش میں اس کوڑے کو کریدا کرتے ہیں۔۔ اور جب کوئی غریب مہاجر عورت اس کوڑے پر سے کانچ کی ٹوٹی بوتلیں اور پھٹے پرانے جوتے اور دوسری چیزیں پھینکنے آجایا کرتی ہے تو یہ ڈر کر بھاگ جاتے ہیں اور آپس میں لڑا کرتے ہیں۔ اسی کوڑا دان کے سامنے ایک "دل بہار ہوٹل" ہے۔ جو ٹین کی چادروں اور لکڑی کے تختوں سے بنایا گیا ہے۔ اس کی میزوں اور تپائیوں پر میل وارنش کی طرح چڑھ گیا ہے۔ میلے کچیلے ایلومونیم کے گلاس اور جگ ان پر رکھے ہوئے تھے۔ تنور میں روٹیاں لگ رہی ہیں۔ روٹی پکانے والے کا بھی رنگ اتنا ہی کالا ہے جتنی میزیں اور تپائیاں ...... اوپر سے اس سیاہ رنگ پر پسینہ۔

جب پسینہ اسے زیادہ پریشان کرتا ہے تو ایک ہاتھ سے وہ اسے نچوڑتا ہے اور پھر اسی ہاتھ سے روٹی کے پیڑے بنانے لگتا ہے۔ اس ہوٹل کے سالن بڑے مشہور ہیں۔ اس لئے مزدور دور دور سے یہاں آتے ہیں۔ اس وقت ساری تپائیاں بھری ہوئی ہیں۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں کیونکہ بارہ بج گئے اور یہ وقت کھانے کا ہوتا ہے جیسے ہی ایک آدمی اٹھا میں جا کر بیٹھ گیا۔ جو کھانا کھا چکے تھے وہ پیسے دیکر ہنستے ہوئے چلے جاتے۔

تھوڑی دیر بعد ایک مزدوروں کی ٹولی در آئی اور آپس میں مذاق کرتی تپائیوں پر بیٹھ گئی ۔۔۔ اور اسی موڈ میں ہوٹل کے مالک غلام علی کو مخاطب کیا۔

قانون

"کیوں بھئی گلام علی: اسلامی کانون بن گیا، بیٹا اب تیری کمبختی آگئی ۔۔۔ اب سڑی چربی کیسے گلائے گا؟ بڑا مال جمع کر لیا ہے بیٹا اب سب بتانا پڑے گا کہ یہ کہاں سے آیا؟"

"ابے جب سڑا مال گلاتا ہوں تو پھر یہاں کیوں آ کے مرتے ہو؟ جاؤ وہاں جاؤ، جہاں اچھا مال ملے، اسلامی دستور آگیا ہے تو بڑی خوسی کی بات ہے، جب دنیا ٹھیک ہوگی تو ہم بھی ٹھیک ہو جائینگے ہم تو دنیا کے ساتھ ہیں۔" غلام علی نے یہ بات پتیلی میں بھنا ہوا گوشت ڈالتے ہوئے کہی۔

"ابے اب چوری پہ ہاتھ بھی کٹیں گے۔" ان میں سے ایک دوسرے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"منظور، لیکن بیٹا پھر چوریاں بھی تو نہیں ہونگی، مال کھا کے بھی تو کوئی نہیں بھاگے گا؟" یہ بات غلام علی نے ذرا تلخ لہجے میں کہی، لیکن مسکراہٹ اسکے چہرے پر بھی پھیل رہی تھی ۔۔۔ اس وقت اس کا چہرہ دو احساسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ پہلا اسکا یہ احساس

تھا اور دوسرا وہ ناگوار احساس کہ دل اسے قریبی سمجھتے ہیں۔

مسجد سے موذن کی صدا آئی۔ میں غلام علی کے پاس گیا اور اس سے کہا: "استاد نماز کے بعد آؤنگا"

"کوئی بات نہیں آپ کا ہی ہوٹل ہے"

مسجد ہوٹل کی پشت پر تھی، میں نے گھڑی دیکھی ابھی کچھ منٹ اور باقی تھے اسلئے میں ایک دوسری مسجد میں چلا گیا۔ جہاں امام مسجد ملک کے معاشرتی حالات پر بھی دینی نقطہ نظر سے کچھ بتایا کرتے ہیں۔

میں نے جلدی سے وضو کیا۔ تھوڑی دیر بعد جماعت کھڑی ہوگئی نماز سے فارغ ہوکر جب میں باہر سیڑھیوں پر آیا جوتے پہنے ابھی میں اپنے سیاہ سیمی بروگ شو کے لیس باندھ ہی رہا تھا۔ کہ ایک آواز میرے کانوں سے آکر ٹکرائی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دو بنگالی اپنے ہاتھوں میں جوتے لئے بنگلہ میں کچھ بات چیت کر رہے تھے۔ انکی پوری گفتگو میں نہ سمجھ سکا کیونکہ بدقسمتی سے بنگلہ زبان نہیں جانتا۔ لیکن ان کی گفتگو میں 'اسلامی دستور' کا جب لفظ آیا میں چونک پڑا۔

یہ دونوں بنگالی مزدور پیشہ نظر آتے تھے ان کے سوکھے بال ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔ بدن پر سفید قمیص اور ڈھیلا پائجامہ، چہرے غربت اور مشقت کی وجہ سے تُتے ہوئے لیکن سادگی اور معصومیت ان پر پپڑی کی طرح جمی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سادگی، اور معصومیت جو بنگالیوں کے کردار کی ایک نمایاں خصوصیت ہے جوتے پہن کر جب وہ سیڑھیوں سے اترنے لگے تو میں نے ان سے پوچھا۔

"کہیئے بنگالیوں کو اسلامی دستور پسند آیا؟"

اس سوال پر انھوں نے مجھے ذرا بگڑے ہوئے انداز سے دیکھا جیسے اس سوال سے انھیں بڑا دکھ پہنچا ہو۔

"کیا بنگال میں مسلمان نہیں رہتا؟ تم لوگ ہی مسلمان ہے؟ اسلامی دستور کون پسند نہیں کرتا؟"

"میرا مطلب کچھ اور تھا" میں بولنا تھا۔

"مطلب کچھ ہو [illegible]"

اس جواب کے بعد پھر وہ اپنی گفتگو میں مصروف ہوگئے،

اور دوبارہ انھوں نے میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

اب میں الفنسٹن اسٹریٹ پر آگیا...... یہ کراچی کی وہ سڑک ہے جہاں رومینٹک زندگی شراب کی طرح بہتی ہے۔ شام ہوتے ہی خوش رنگ شوخ اور بے باک لڑکیاں ٹولیاں بناکر یہاں اس طرح گھومتی ہیں جیسے یہ کوئی تفریح گاہ ہے — دکانوں پر ٹڈیوں کی طرح چھاجاتی ہیں شام ابھی دور ہے اس لئے یہاں ابھی.... کچھ چہل پہل نظر نہیں آتی۔ کبھی کبھی کوئی لڑکی ہنستی، مسکراتی — یا کسی امریکی فلم کے اشتہار کو دیکھکر مسکراتی ہوئی گزرجاتی ہے لیکن ہاں! من چلے اوباش فلم زدہ لونڈے امریکن پتلونیں چڑھائے دنیا جہان سے بے خبر... لڑکیوں کی تلاش میں ادھر ادھر گھوم رہے ہیں...... کیپٹل سینما اسی سڑک پر واقع ہے..... اسکی دیوار پر امریکی فلم کے اشتہار لگے ہوئے ہیں۔ جن میں ستر رلڑکیاں مختلف پوزیز میں "آکر لے محبت کرلے" کی دعوت دے رہی ہیں۔ اسی دیوار کا سہارا لئے ایک ادھیڑ عمر کا پنجابی اپنی ریڑھی کو لئے کھڑا ہے اس ریڑھی میں مونگ پھلیاں بھری ہوئی ہیں۔ اس وقت اس کے پاس کوئی خریدار نہ تھا۔ شاید اسے بھوک لگ رہی تھی اس لئے اس نے ریڑھی میں سے مونگ پھلیاں اٹھا کر چھیلنی شروع کردیں اور ادھر ادھر دیکھتا رہا، اور جب اس کے سامنے سے کچھ نوجوان لڑکیاں قہقہہ لگاتی گزریں تو اس نے منہ چلانا بند کردیا — اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ابھرنے لگے، اور ماتھے پر کئی لکیریں ابھر آئیں اور چہرہ اس کے اندرونی ردعمل سے تمتما اٹھا۔ جب لڑکیاں قہقہہ لگاتی اس کے سامنے سے گزریں تو اس نے زور سے مونگ پھلی [illegible] زمین پر مارا اور کہا۔

"[illegible] دکھو ر تنلیاں ہے، پاکستان کی ناک نہیں کٹے گی؟"

رنگ برنگی لڑکیاں ساری دنیا سے بے خبر... سیدھی چلی جا رہی تھیں، ان کے دوپٹوں کے سرے سر پر جوڑوں سے لٹکے ہوئے تھے اور دوپٹوں کے پلو فضا میں پرچم کی طرح لہرا رہے تھے، وہ برابر انھیں گھور رہا تھا — چند لمحوں کے گزرنے کے ساتھ وہ سیاہی دھبوں کے ساتھ ہلکی سے ہلکی ہوتی جا رہی تھیں۔

دستور سے متعلق عوام کی توقعات یقیناً ماضی کی یادتذہ کر رہی تھیں، اور بتا رہی تھیں کہ ان کے ماضی نے کس طرح ان کی آرزوں اور عزائم کو دستوری سطح پر پیدا کیا۔

مسلم عوام شعوری اور غیر شعوری طور پر ہمیشہ ریاست کو کئی بھلائی کا ایک بڑا ذریعہ سمجھتی رہی۔ یہی آرزو — آج بھی ان میں خون کی طرح گردش کر رہی تھی۔

عوام کی دستوری تاویلات سے یقیناً اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ملی اسپرٹ کو نظر انداز کر کے نہیں ..... ملت مسلمہ کی دینی اسپرٹ ہی اسکی زندگی ہے۔ دوسری اہم چیز اس کی روایت دوستی ہے۔ اسکی ساری چمکدار اور تاریک صدیوں کو دیکھ جائیے آپ کو اسکی زندگی میں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ ملیں گے۔ لیکن اس اتار چڑھاؤ کے باوجود ایک خواہش ان صدیوں میں قدر مشترک کی حیثیت سے ملے گی۔ اور وہ یہ ہے کہ اس کی زندگی — اور زندگی..... کے سارے سماجی ادارے اس کے تصورِ حیات اور روایت کے پابند رہیں۔ اسی جذبے نے پاکستان میں سیکولر طاقتوں کو پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ اور یہی جذبہ الجزائر کے میدان کارزار میں شمشیر بکف ہے۔ عوام میں اپنے تصورِ حیات سے وفاداری کو پاکر مجھے بڑی مسرت ہوئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ مسلمان من حیث القوم کبھی اپنی دینی اسپرٹ سے خالی نہ ہو گا۔

کافی ہاؤس الفنسٹن اسٹریٹ کی پشت پر آویزاں ہے۔ اب میں وہاں پہنچ گیا۔ یہاں کس قسم کی مخلوق آتی ہے؟ ان کی اقسام گنانے کا یہ موقع نہیں بس اتنا جان لیجئے یہاں کے تمام آنے والوں میں کسی نہ کسی قسم کی نفسیاتی بیماری ہوتی ہے، ہر شخص کسی نہ کسی مغالطے میں ہوتا ہے۔ یہاں ہر آدمی دوسرے کو پاگل بے وقوف یا کسی اور گالی سے نوازتا ہے۔ عام آدمی کو نفرت سے دیکھتے ہیں، ان سے گھلنا ملنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ یہ ہاؤس ایک کلب کی حیثیت رکھتا ہے، نشستیں گھنٹوں رہتی ہیں۔ موضوعات اچار مربے، عیاشی، سیاست، فلسفہ، مسلم لیگ، حکومت، جماعت اسلامی، کمیونسٹ، عوامی لیگ ان سارے موضوعات پر ہر شخص اس طرح گفتگو کریگا۔ جیسے یہ اسکا اپنا موضوع ہے،

فنکار یہاں اکثر دوسرے فنکار کو گالیاں دیتے نظر آتے ہیں۔ شام قریب آچکی ہے۔ لوگ آ رہے ہیں، بہت سی میزیں بھر چکی ہیں۔ بیرے چکری کی طرح گھوم رہے ہیں۔ سگرٹوں کا دھواں فضا میں تیر رہا ہے؟ چینی کی پیالیوں کی کھنک آہستہ آہستہ آ رہی ہے۔ کبھی کبھی کوئی جوشیلا میز پر گھونسے مار کر اپنی بحث کو وزن دار بنا رہا ہے۔ میں ایک کونے کی میز پر بیٹھا ہوا تھا..... مجھے ایک میز پر ایک ترقی پسند حضرت نظر آئے ان سے پہلے سے راہ و رسم تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائے میں انکے پاس چلا گیا۔ ور کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں نے مسکرا کر کہا:

"کامریڈ! کیا مبارکباد پیش کروں۔ آج کی خوشی میں تم شامل ہو؟"

"اس ملک میں مرنا بھی میں انسانیت کی توہین سمجھتا ہوں میں تو ایسے ملک میں جینا اور مرنا چاہتا ہوں۔ جہاں سارا اختیار انسان کے ہاتھ میں ہو، پنجاب میرا پیدائشی وطن ہے لیکن یہاں بھی خود کو میں اجنبی محسوس کرتا ہوں جیسے میں یہاں غریب الوطن ہوں۔"

اس میز پر دوسرے لوگ اور بھی بیٹھے ہوئے تھے اس پر وہ ہنس پڑے ایک نے ماچس نکالی دیا سلائی جلائی، اور جب وہ جل اٹھی تو اسے نہایت احتیاط سے اپنے ایک ہاتھ سے چھپایا اور دوسرے دوست سے پوچھا:-

"بتاؤ یہ کیا ہے؟"

"زندگی کا بھڑکتا شعلہ۔"

"انسانیت کی آخری ہچکی جو پاکستان میں ہے" یہ حضرت شاعر بننے والے تھے اس لئے انھوں نے داد طلب نگاہوں سے اپنے دوستوں کو دیکھا کہ اسکے تخیل کی داد دیجائے لیکن یاں ہر شخص داد چاہتا ہے، دیتا بہت کم وہ بیچارہ کچھ کر رہ گیا۔ دیاسلائی جل رہی تھی وہ۔ ایک کیمسٹری کے طالب علم کی طرف لے گیا اور کہا —

"آپ بھی اپنی رائے کا اظہار کیجئے۔"

"ابے یہ کچھ بھی نہیں ایک دیاسلائی جو جل رہی ہے۔"

اس جواب پر سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"جی یہ تو سمجھ اور ذوق کی بات ہے۔" ابھی ہونے والے شاعر نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔

جب دیا سلائی بجھ گئی تو کیمسٹری کے طالب علم نے کہا۔

"اب یہ کیا ہے ؟"

"انسانیت اور جمہوریت کی موت ۔"

"لیے یہ بات زندگی سے پھسل کر سیاست پر کیوں سوار ہوگئی ؟"

"اس لئے کہ آج اس ملک کے ذہین ترین افراد اور یہ جاہل بدھو قوم — جسے مسلمان کہتے ہیں، جو سکھوں کے بعد بیوقوفی میں دوسرے نمبر پہ ہے جو کرتی پہلے ہے اور سوچتی بعد میں، اس نے مُلّا کا ساتھ دیکر پاکستان کو صدیوں پیچھے دھکیل دیا ہے اب یہاں ..... مولوی صاحب کا مولابخش حکومت کریگا۔ آج کی مہذب دنیا میں ۔ دوسرے افغانستان کا وجود، میرا جی چاہتا ہے کہ اس دستور کو ردی کی ٹوکری میں ڈالدوں ۔"

میرا ترقی پسند دوست جب بندوق کی طرح خالی ہوگیا، تو پھر ایک قہقہہ پڑا اور ٹیبلیں ڈھول کی طرح بجنے لگیں۔

"بیرا ..... ذرا ..... پانی ۔"

تھال میں وہ بہت سے گلاس سجا کر لایا اور سب کے سامنے ٹھنڈا پانی رکھنے لگا۔

"کامریڈ اب ایسی باتیں مت کرو۔ جیسا بن گیا وہ ٹھیک ہے تم عوام کی باتیں کرتے ہو لیکن کیا یہ دستور عوام کو پسند نہیں ؟" اس کے برابر بیٹھے ہوئے دوسرے دوست نے پانی پی کر کہا۔

"عوام جاہل ہیں ، اپنا اچھا برا سمجھنے کی ان میں صلاحیت نہیں، اس وقت ان میں بیداری نہیں ۔"

"کامریڈ یہ دلیل تمھاری نہیں ۔" میں بیچ میں بول اٹھا۔

"اچھا تو عوام عقلمند اس وقت ہوتے ہیں جب وہ سرخ انقلاب کے لئے آپ کے ہتھے چڑھ جائیں۔ ساری دنیا کو کیا تم نے بے وقوف سمجھ رکھا ہے ، کیا ساری دنیا روس ہے کہ جدھر ہانک دو غریب چلے جائیں ۔"

"بحث بہت جاندار ہوئی اب آپ حضرات ایک ایک کافی پی لیجئے ۔" ایک کالے چور ربلیک مارکیٹر کے لڑکے نے کافی آفر (offer) کی۔

کافی پینے کا میرا موڈ نہ تھا اس لئے معذرت چاہ کر میں نیچے اتر آیا۔ اور آہستہ آہستہ اپنے دوست کے گھر کی طرف چلنے لگا۔ شام ہو چکی تھی۔ خوشگوار فضا میں خنکی تھی۔ سگار کی طلب محسوس ہوئی، میں ایک پان والے کی دکان پر آیا۔

اس کی دوکان سگریٹ کی خالی ڈبیوں اور تصویروں سے سجی ہوئی تھی۔ درمیان میں بڑا سا آئینہ تھا جس میں ہر پان کھانے والا پان کھا کر اپنے ہونٹوں کی لالی اور چہرے کی نوک پلک دیکھتا۔ دکان پر کچھ اور لوگ بھی کھڑے پان لے رہے تھے۔ کیونکہ یہ پان بڑے مزیدار بناتا تھا۔

سگریٹ کی ڈبیوں کے اوپر خواجہ اجمیری کی تصویر لگی ہوئی تھی اس کے مقابل دہلی کے لال قلعے کی، اسی کے قریب علامہ اقبال اور قائداعظم کی لیکن اس کے سامنے جو تصویر تھی وہ ایک فلم ایکٹریس صبیحہ کی تھی۔ جس میں وہ انگڑائی لے رہی تھی ۔ اسی تصویر پر مالک دکان نے اپنی تصویر بھی جڑ دی تھی۔ جس میں ہیٹ پہن کر ایک آنکھ بند کئے وہ دنیا کو دیکھ رہے تھے ۔

دکاندار پان لگا ہی رہا تھا کہ ریڈیو سے خبریں نشر ہونے لگیں ریڈیو کی آواز سن کر اور لوگ بھی آگئے تھوڑی دیر میں بھیڑ جمع ہوگئی۔ .... جب اناؤنسر نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کا اعلان کیا۔ تو ایک بڈھا دھاڑ مار کر رو دیا۔ پنواڑی ایک دم چونک پڑا۔ دوسرے لوگ بھی بڑے میاں کی طرف متوجہ ہوئے ۔ بڑے میاں اب خاموش ہوگئے لیکن آنسوؤں کی جھڑی برابر جاری رہی۔ آنسو آنکھوں سے نکلتے اور اس کی سفید داڑھی میں آکر الجھ جاتے اور چمکنے رہتے۔ بڑے میاں نے اپنے آنسوؤں کو پونچھا بھی نہیں، بلکہ اس سیل رواں کو اسی طرح بہنے دیا۔ جب بوڑھے کو کچھ دیر ہوگئی تو کچھ لوگوں نے پوچھا۔

"ارے بابا آج تو خوشی کا دن ہے تم رو کیوں رہے ہو ؟"

"بیٹا میں خوش، میرا خدا خوش ، مجھے آج اپنی بٹیا یاد آگئی ... جس کی پاکستان میں بسنے کی بڑی تمنا تھی، دلی میں میں نے سب کچھ برباد کیا، بیٹوں کو اپنے سامنے تڑپتے دیکھا۔ گھر والی بھی میرے سامنے تڑپتی مرگئی وہ سب شہید ہوگئے ۔ صرف میری بھولی ماں گھر

کے پاخانے میں جاکر چھپ رہی ۔ میں دوسرے کے گھر میں بند پڑا رہا۔ پھر ہم ہمایوں کے مقبرے میں آگئے ۔ وہاں میری بچی مجھے مل گئی :" بڑے میاں کے آنسو برابر جاری تھے ، جب اپنی داستان کہتے کہتے انھیں ہچکی آتی تو وہ چپ ہو جاتے اور کبھی کبھی کسی کو دیکھ بھی لیتے چہرے یہاں بھی سب کے اداس تھے ۔ یہ سب ان کے غم میں شریک تھے

"ہاں بابا پھر ؟" سوال اٹھتا ۔

تو بابا پھر شروع کرتے ۔

"اس کو پاکر میں خوش ہوا کہ چلو اس کے دل کی تمنا پوری ہو ۔ میں نے دلی سے کچھ بھی نہیں لیا ۔ بچو کا جہیز بھی چھوڑا ، اور سوچا اب اللہ وہیں سب کچھ کریگا ۔ دلی میں جو زندگانی گزاری وہ تو ایک خواب تھی ، اب اپنی دنیا یہاں بنائیں گے ، اپنی بہو کو لیکر جب میں امرتسر آیا ۔ تو ہماری ٹرین کو کاٹ دیا گیا مجھ بدنصیب پر بھی کچھ حملے ہوئے لیکن میں نہ مرا ، لیکن میری بچو کو لے کر وہ بھاگ گئے ۔ بہو اس وقت کچھ بھی نہ کہہ سکی وہ خود حیران تھی ، بہو مجھ سے چھن گئی میں اکیلا پاکستان آگیا ۔ وہ وہیں رہ گئی ، پاکستان دیکھنا اسکے مقدر میں نہیں تھا ۔ اس نے الیکشن میں پاکستان کے لئے بڑا کام کیا تھا نہ جانے پگلی پاکستان کے لئے کیا کیا کہتی تھی ، مقدر کی بات ہے ...... خدا کرے وہ اس وقت زندہ ہو ــــ اور ــــ اس کے کان سُن لیں کہ ــــ اس کا ملک اسلام کا ہو گیا ......"

...... جب بڑے میاں نے اپنی بپتا ختم کی تو ریڈیو سے اعلان ہوا ۔

"اب کچھ ہلکے پھلکے گانے سنیئے" ✽

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری اپریل ۱۹۵۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے ۔ براہ مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں ۔ یا پھر خط کے ذریعے اطلاع دیں ۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا ۔ منتظر کرم :- منیجر منشور کراچی

۱۰۳۸ جناب نجم الدین خاں صاحب ، نواب شاہ
۱۰۳۹ جناب حافظ حبیب الرحمٰن صاحب ۔ رنگپور
۱۰۴۸ جناب عزیز احمد صاحب بھٹی ۔ راولپنڈی
۱۰۵۲ جناب سیف الدین صاحب ۔ کراچی
۱۰۷۵ جناب محمد جلیل خانصاحب ۔ بنوں شہر
۲۱۶۴ جناب عبدالمنان صاحب ۔ دستور
۲۱۹۷ مکتبہ تعمیر انسانیت ۔ لاہور
۲۳۳۰ جناب ناظم صاحب دفتر جماعت اسلامی ، کیمبل پور
۲۳۳۴ جناب ہیڈ ماسٹر صاحب ، چوبالہ (گجرات)
۲۳۳۵ جناب محمد شریف صاحب ۔ گوجرانوالہ
۲۳۳۶ جناب ہیڈ ماسٹر صاحب ہائی اسکول ۔ منٹگمری
۲۳۷۸ جناب عبدالحمید خاں صاحب ۔ لائلپور
۲۴۲۲ جناب سید غوث صاحب ۔ کراچی
۲۴۳۳ جناب عبدالرحمٰن صاحب عزیز ۔ منٹگمری
۲۴۸۸ جناب سبطین احمد صاحب ۔ بدایوں
۲۴۹۳ جناب سیٹھ غلام حیدر صاحب ، فیروز والہ
۲۴۹۴ جناب افتخار احمد خاں صاحب ۔ لاہور
۲۴۹۵ جناب محمد رفیع صاحب ۔ کراچی
۲۴۹۶ جناب مسز فاروقی صاحبہ کراچی
۲۴۹۷ جناب چوہدری نیاز احمد صاحب ۔ سیالکوٹ
۲۴۹۸ جناب بلقیس بیگم صاحبہ ۔ کراچی

جب دیا سلائی بجھ گئی تو کیمسٹری کے طالب علم نے کہا۔

"اب یہ کیا ہے ؟"

"انسانیت اور جمہوریت کی موت "

" ایسے یہ بات زندگی سے پھسل کر سیاست پر کیوں سوار ہوگئی ؟"

" اس لئے کہ آج اس ملک کے ذہین ترین افراد اور یہ جاہل بدھو قوم — جسے مسلمان کہتے ہیں، جو سکھوں کے بعد بیوقوفی میں دوسرے نمبر پر ہے جو کرتی پہلے ہے اور سوچتی بعد میں، اس نے مُلّا کا ساتھ دیکر پاکستان کو صدیوں پیچھے دھکیل دیا ہے اب یہاں..... مولوی صاحب کا مولا بخش حکومت کریگا۔ آج کی مہذب دنیا میں... دوسرے افغانستان کا وجود، میرا جی چاہتا ہے کہ اس دستور کو ردی کی ٹوکری میں ڈالدوں"۔

میرا ترقی پسند دوست جب بندوق کی طرح خالی ہوگیا، تو پھر ایک قہقہہ پڑا اور ٹیبلیں ڈھول کی طرح بجنے لگیں۔

"بیرا... ذرا..... پانی "

تھال میں وہ بہت سے گلاس سجا کر لایا اور سب کے سامنے ٹھنڈا پانی رکھنے لگا۔

"کامریڈ اب ایسی باتیں مت کرو، جیسا بن گیا وہ ٹھیک ہے تم عوام کی باتیں کرتے ہو لیکن کیا یہ دستور عوام کو پسند نہیں ؟" اس کے برابر بیٹھے ہوئے دوسرے دوست نے پانی پی کر کہا۔

" عوام جاہل ہیں، اپنا اچھا برا سمجھنے کی ان میں صلاحیت نہیں، اس وقت ان میں بیداری نہیں "

"کامریڈ یہ دلیل تمھاری نہیں " میں بیچ میں بول اٹھا۔

" اچھا تو عوام عقلمند اس وقت ہوتے ہیں جب وہ سرخ انقلاب کے لئے آپ کے ہتھے چڑھ جائیں۔ ساری دنیا کو کیا تم نے بے وقوف سمجھ رکھا ہے، کیا ساری دنیا روس ہے کہ جدھر ہانک دو غریب چلے جائیں "

" بحث بہت جاندار ہوئی اب آپ حضرات ایک ایک کافی پی لیجئے " ایک کالے چور ریلیک مارکیٹرم کے لڑکے نے کافی آفر (Offer) کی۔

کافی پینے کا میرا موڈ نہ تھا اس لئے معذرت چاہ کر میں نیچے اتر آیا۔ اور آہستہ آہستہ اپنے دوست کے گھر کی طرف چلنے لگا۔ شام ہو چکی تھی۔ خوشگوار فضا میں خنکی تھی۔ سگار کی طلب محسوس ہوئی، میں ایک پان والے کی دکان پر آیا۔

اس کی دکان سگریٹ کی خالی ڈبیوں اور تصویروں سے سجی ہوئی تھی۔ درمیان میں بڑا سا آئینہ تھا جس میں ہر پان کھانے والا پان کھا کر اپنے ہونٹوں کی لالی اور چہرے کی نوک پلک دیکھتا۔ دکان پر کچھ اور لوگ بھی کھڑے پان لے رہے تھے۔ کیونکہ یہ پان بڑے مزیدار بناتا تھا۔

سگریٹ کی ڈبیوں کے اوپر خواجہ اجمیری کی تصویر لگی ہوئی تھی اس کے مقابل دہلی کے لال قلعے کی، اسی کے قریب علامہ اقبال، اور قائد اعظم کی لیکن اس کے سامنے جو تصویر تھی وہ ایک فلم ایکٹریس صبیحہ کی تھی جس میں وہ انگڑائی لے رہی تھی۔ اسی تصویر پر مالک دکان نے اپنی تصویر بھی جڑ دی تھی جس میں ہیٹ پہن کر ایک آنکھ بند کئے وہ دنیا کو دیکھ رہے تھے۔

دکاندار پان لگا ہی رہا تھا کہ ریڈیو سے خبریں نشر ہونے لگیں ریڈیو کی آواز سن کر اور لوگ بھی آگئے تھوڑی دیر میں بھیڑ جمع ہوگئی..... جب اناؤنسر نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کا اعلان کیا۔ تو ایک بڈھا دھاڑ مار کر رو دیا۔ پنواڑی ایک دم چونک پڑا۔ دوسرے لوگ بھی بڑے میاں کی طرف متوجہ ہوئے۔ بڑے میاں اب خاموش ہوگئے لیکن آنسوؤں کی جھڑی برابر جاری رہی۔ آنسو آنکھوں سے نکلتے اور اس کی سفید داڑھی میں آکر الجھ جاتے اور چمکتے رہتے۔ بڑے میاں نے اپنے آنسوؤں کو پونچھا بھی نہیں، بلکہ اس سیل رواں کو اسی طرح بہنے دیا۔ جب بوڑھے کو کچھ دیر ہوگئی تو کچھ لوگوں نے پوچھا۔

"ارے بابا آج تو خوشی کا دن ہے تم رو کیوں رہے ہو؟"

"بیٹا میں خوش، میرا خدا خوش، مجھے آج اپنی بٹیا یاد آگئی..... جس کی پاکستان میں بسنے کی بڑی تمنا تھی، دلی میں میں نے سب کچھ برباد کیا، بیٹوں کو اپنے سامنے تڑپتے دیکھا۔ گھر والی بھی میرے سامنے تڑپتی مرگئی وہ سب شہید ہوگئے۔ صرف میری بہو سلمہ گھر

کے پاخانے میں جاکر چھپ رہی، میں دوسرے کے گھر میں بند پڑا رہا۔ پھر ہم ہمایوں کے مقبرے میں آگئے۔ وہاں میری بچی مجھے مل گئی۔" بڑے میاں کے آنسو برابر جاری تھے، جب اپنی داستان کہتے کہتے انھیں ہچکی آتی تو وہ چپ ہو جاتے اور کبھی کبھی کسی کو دیکھ بھی لیتے چہرے یہاں بھی سب کے اداس تھے۔ یہ سب ان کے غم میں شریک تھے

"ہاں بابا پھر؟" سوال اٹھتا۔

تو بابا پھر شروع کرتے۔

"اس کو پاکر میں خوش ہوا کہ چلو اس کے دل کی تمنا پوری ہو۔ میں نے دلی سے کچھ بھی نہیں لیا۔ بچو کا جہیز بھی چھوڑا۔ اور سوچا اب اللہ وہیں سب کچھ کریگا۔ دلی میں جو زندگانی گزاری وہ تو ایک خواب تھی، اب اپنی دنیا یہاں بنائیں گے، اپنی بہو کو لیکر جب میں امرتسر آیا۔ تو ہماری ٹرین کو کاٹ دیا گیا مجھ بدنصیب پر بھی کچھ حملے ہوئے لیکن میں نہ مرا، لیکن میری بچو کو لے کر وہ بھاگ گئے۔ بہو اس وقت کچھ بھی نہ کہہ سکی وہ خود حیران تھی، بہو مجھ سے چھن گئی میں اکیلا پاکستان آگیا۔ وہ وہیں رہ گئی، پاکستان دیکھنا اسکے مقدر میں نہیں تھا۔ اس نے الیکشن میں پاکستان کے لئے بڑا کام کیا تھا نہ جانے پگلی پاکستان کے لئے کیا کیا کہتی تھی، مقدر کی بات ہے ...... خدا کرے وہ اس وقت زندہ ہو —— اور —— اس کے کان سن لیں کہ —— اس کا ملک اسلام کا ہوگیا ......"

...... جب بڑے میاں نے اپنی بپتا ختم کی تو ریڈیو سے اعلان ہوا۔

"اب کچھ ہلکے پھلکے گانے سنیئے" ✱

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری اپریل ۱۹۵۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں۔ یا پھر خط کے ذریعے اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی، پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ منتظر کرم:۔ منیجر "منشور" کراچی

۱۰۳۸ جناب نجم الدین خاں صاحب، نواب شاہ
۱۰۳۹ جناب حافظ حبیب الرحمن صاحب۔ رنگپور
۱۰۴۸ جناب عزیز احمد صاحب بھٹی۔ راولپنڈی
۱۰۵۲ جناب سیف الدین صاحب۔ کراچی
۱۰۷۵ جناب محمد جلیل خانصاحب۔ بنوں شہر
۲۱۶۴ جناب عبدالمنان صاحب۔ دستور
۲۱۹۷ مکتبہ تعمیر انسانیت۔ لاہور
۲۳۳۰ جناب ناظم صاحب دفتر جماعت اسلامی، کیمبل پور
۲۳۳۴ جناب ہیڈ ماسٹر صاحب، چوبالہ (گجرات)
۲۳۳۵ جناب محمد شریف صاحب۔ گوجرانوالہ
۲۳۳۶ جناب ہیڈ ماسٹر صاحب ہائی اسکول۔ منٹگمری
۲۳۷۸ جناب عبدالحمید خاں صاحب۔ لائلپور
۲۴۳۲ جناب سید غوث صاحب۔ کراچی
۲۴۳۳ جناب عبدالرحمن صاحب عزیز۔ منٹگمری
۲۴۸۸ جناب سبطین احمد صاحب۔ بدایوں
۲۴۹۳ جناب سیٹھ غلام حیدر صاحب، فیروز والہ
۲۴۹۴ جناب افتخار احمد خاں صاحب۔ لاہور
۲۴۹۵ جناب محمد رفیع صاحب۔ کراچی
۲۴۹۶ جناب مسز فاروقی صاحبہ کراچی
۲۴۹۷ جناب چوہدری نیاز احمد صاحب۔ سیالکوٹ
۲۴۹۸ جناب بلقیس بیگم صاحبہ۔ کراچی

جگر مراد آبادی

عشق اک تجربہ ہے پیار نہیں
عشق جب تک بروئے کار نہیں

ہیں تو دیوانۂ بہار بہت
کوئی دیوانۂ بہار نہیں

زندگی ہے تمام فکر و عمل
زندگی وقت کا شمار نہیں

حسن رعنا نہ اس قدر دلکش
خیر گذری کہ پائدار نہیں

دل کی کلیاں نہ جس سے کھل جائیں
اور کچھ ہو تو ہو بہار نہیں

عشق اپنا پیام خود ہے جگر
عشق مرہونِ اشتہار نہیں

(بشکریہ ماہِ نو)

آنریبل چیف جسٹس ڈاکٹر ایس اے رحمان •

مغرب کی کمندیں

مغرب کی کمندیں لمبی ہیں، مشرق کی امنگیں نورس ہیں
کچھ دام کے حلقے رنگیں ہیں، کچھ طائر دور نشیمن سے

ہو خیر جوانِ سادہ کی، یوں ماضی سے بیزار ہوا
میراث پدر کی گویا اک دھبا تھی۔ مٹایا دامن سے

نقالی میں مشاق ہوئی بیدار غلامی لے آئی
انداز تفکر لینن سے، گفتار کا نشتر لندن سے

وہ آندھی آزادی کی چلی سب ٹیلے میداں ایک ہوئے
اخلاق سماج اور مذہب سب پھندے تھے اتارے گردن سے

عریانی دور ترقی میں تقدیر ادب بن جاتی ہے
فن کاری چمکاتی ہے اسے کچھ حرص و ہوا کے روغن سے

(بشکریہ الحمراء)

عبدالکریم عابد •

اسلامی جمہوریہ کا آغاز

ایک لمحۂ فکر

۲۳ر مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور یہ واقعہ ہم سب لوگوں کے لئے بڑی مسرت کا باعث ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اب ہمارے عوام پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جمہوریت اور اسلام کے تقاضوں کو سمجھیں اور اپنے فکر وعمل کو تبدیل کریں۔

دراصل عوام اور حکومت ایک سکے کے دو رخ ہیں اگر ان میں سے کوئی بھی ایک کھوٹا ہو تو دوسرے کا کھرا رہنا ممکن نہیں رہتا افلاطون نے کہا تھا کہ ریاست ایک آئینہ ہے جس میں ہم عوام کی زندگی اور ان کے اخلاق وعادات کا عکس دیکھ سکتے ہیں اب یہ عوام کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اخلاق عادات اطوار اور اذہان کو اس طرح تبدیل کریں کہ اس کا عکس جب مجسم ہو کر حکومت وریاست کی صورت میں نظر آنے لگے تو دنیا میں ہر طرف ہماری تعریف کا غلغلہ بلند ہو اور کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ جمہوریت اور اسلام کے اصولوں پر مبنی ہوئی ریاست وحکومت کا کوئی افادہ نہیں ——— حضرت علیؓ کی حکومت سے زیادہ جمہوری واسلامی حکومت کس کی ہو سکتی ہے لیکن یہ حکومت بھی اپنی خوبیوں کے باوجود ناکام رہ گئی کیونکہ عوام غیر تربیت یافتہ، جاہل اور خود غرض تھے حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا کہ کیا بات ہے آپ کی حکومت میں سابق خلفاء کی طرح امن وامان اور آرام وآسائش نصیب نہیں ہے انہوں نے جواب دیا کہ "پہلے حکمراں مجھ جیسے لوگوں پر حکومت کرتے تھے اور مجھے تم نالائقوں سے سابقہ پڑا ہے"

اپنے اس جواب میں حضرت علیؓ نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ بہترین افراد بہترین دستور حکومت کے تحت بھی ایک اعلےٰ حکومت اور ویلفیر سٹیٹ قائم نہیں کر سکتے تاآنکہ عوام اور رعایا کی اکثریت خود اچھی نہ ہو یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انفرادی زندگی کی اصلاح اور تزکیہ کے پروگرام کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے کیونکہ صالح انفرادیت کے بغیر ملک کی اجتماعیت بھی صحت مند نہیں رہ سکتی۔ ——— پھر خاص طور سے جمہوریت کا تو سارا دارومدار عوام پر ہے اگر عوام ہی نااہل اور برے ہوں تو اچھی حکومت کون بنائیگا؟

اصل میں جمہوریت کی راہ ایک پل صراط کی مانند ہے کہ جس کے ایک طرف امن وخوشحالی کی جنت اور دوسری جانب تباہی وبربادی کا دوزخ سلگ رہا ہے اس پل صراط پر کامیابی سے گزر جانا اسی وقت ممکن ہے کہ جب ہمارے عوام دینی ودنیوی لحاظ سے ارفع ہوں ورنہ جمہوریت کی مثال اس دو دھاری تلوار کی ہوگی جو کسی جاہل کے ہاتھ لگ جائے خوب یاد رکھئے کہ پاکیزہ اخلاق اور بیدار شعور کے بغیر جمہوریت ایک مصیبت ولعنت ہوگی آج مغربی ممالک میں سرمایہ داری کا ہولناک نظام اس جمہوریت کی راہ سے آیا ہے کیونکہ عوام کی نااہلی نے تاجروں مل مالکوں اور صنعت کاروں کے اس طبقے کو برسر اقتدار آنے کا موقع دیا جو معاشی استحصال اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کو اپنا نصب العین ٹھہراتا ہے پھر ان مغربی جمہوریتوں نے تو اپنی ناجائز کارروائیوں کا نشانہ زیادہ تر مشرق کو قرار دیا تھا اس لئے یورپی عوام نسبتاً تباہی سے محفوظ رہے مگر پاکستان میں اس طرح کی قیادت کے غلبہ کا نتیجہ براہ راست ہم ہی کو بھگتنا پڑیگا کیونکہ بیرونی ممالک کی منڈیوں کے راستے سے منافع خوری کا کوئی موقع اس غریب ملک کو حاصل نہیں ہو سکتا پس عوام کے لئے ہر وقت چوکنا رہنے اور خوب سوچ بچار کرنے کی ضرورت شدید ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ جمہوریت کی آزادیاں سرمایہ دار طبقہ اڑا لے جائے اور پھر ان آزادیوں کو اپنی ناجائز اغراض کے لئے استعمال کرے اور یہی وہ اندیشہ ہے کہ جس کے روک تھام کی خاطر ہم نے جمہوریت کے تحت اسلام کو بھی دستور وآئین میں

جگہ دی ہو کیونکہ جمہوریت کا رشتہ اگر محمد صلعم کی بجائے میکاولی کی گمندہ سیاسیات اور آدم سمتھ کی آزاد معاشیات سے باقی رہا تو سرمایہ داری کا نظام یقیناً پیدا ہوگا اور پھر پورے ملک پر گنتی کے چند مل مالکوں اور کارخانہ داروں کی آمریت ہوگی لیکن نام جمہوریت کا بدنام ہوگا۔

نہ صرف موجودہ یورپی جمہوریتیں اس کی مثال ہیں بلکہ یونان کی۔

"یہاں کریسی[1] حکومت بھی اسی نکتہ کی تشریح ہے اس جمہوریت کو جو خدا پرستی سے آزاد ہو کر اختیار کی گئی تھی دیکھکر افلاطون چیخ اٹھا تھا کہ:۔

"جمہوریت دراصل نام ہے انار کی مزاج اور انتشار کا جس کے تمام شہری خود غرضی مکاری حرص و ہوس میں، ڈوبے ہوتے ہیں اور جمہوری حکومت کا صدر سب سے خود غرض مکار اور بدمعاش ہوتا ہے (ریاست" مصنفہ افلاطون)

"جمہوری حکومت نام ہے اس نظام حکومت کا کہ جہاں ایک طبقہ تو شراب و کباب کی رنگینیوں اور عیاشیوں میں منہمک ہو اور دوسرا بھوک فاقہ اور افلاس سے جاں بلب ہو" (جمہوریہ مصنفہ افلاطون)

"جمہوریت اصل میں بدترین قسم کی آمریت کو جنم دیتی ہے (ریاست مصنفہ افلاطون) خدا سے دعا ہے کہ ہماری جمہوریہ ایسی نہ ہو اور اسلام کو جس مقصد کے لئے جمہوریت کے ساتھ لازمی قرار دیا گیا ہے وہ اسلام عوام کی زندگیوں میں جڑ پکڑے اور رچ بس جائے تاکہ مندرجہ بالا سٹیج کی جگہ بہتر صورت حال سامنے آئے اور مایوس و غم زدہ بے خدا جمہوریت و اشتراکی آمریت کے دردناک نتائج کی تلافی کر سکے۔

[1] یہ یونانی زبان کا لفظ ہے

محشر رسول نگری

مثنوی صحیفۂ فطرت کا ایک ورق

مقصدِ امومت

قافلہ سالارِ اربابِ رضا　　شارحِ اسرارِ آدابِ رضا
جس نے لکھی خون سے تفسیرِ عشق　　کھینچ دی ہر ذرے پہ تصویرِ عشق
راہِ حق میں گھر لٹایا تین بار　　سارا مال و زر لٹایا تین بار
زندگی بھر جو رہا شب زندہ دار　　پا پیادہ حج کیا پچیس بار
عمر بھر مشقِ رضا کرتا رہا　　تازہ پیمانِ وفا کرتا رہا
اور ۔ پھر جب فتنۂ باطل اٹھا　　حق کو بے باکانہ للکارا گیا
ہوگئی ہر سو ملسط قاہری　　خود بنائے لا الٰہ گرنے لگی
مصحفِ عشق و رضا کو چوم کر　　غیرتِ شبیر اٹھی جھوم کر
حق کی خاطر حق کا پروانہ اٹھا　　اٹھنے والا سرفروشانہ اٹھا
پھر خدا کا نام زندہ ہوگیا　　مسلکِ اسلام زندہ ہوگیا
حامیانِ جور و استبداد پر　　ہوگیا ثابت کہ اہلِ حق کا سر
آستانِ غیر پر جھکتا نہیں　　ق　کٹ تو سکتا ہے مگر جھکتا نہیں
جوہرِ فرزند اگر لے ہمنوا　　سیرتِ مادر سے پاتا ہے جلا
حضرت زہراؓ کی عظمت دیکھ لے　　سیرتِ خاتونِ جنت دیکھ لے
کس طرح کی تربیت شبیرؑ کی　　غنچۂ نورستۂ تطہیر کی
دامنِ قرآں میں پالا آپ کو　　عشق کے سانچے میں ڈھالا آپ کو
روح پھونکی آپ میں کردار کی　　صبر کی، تسلیم کی، ایثار کی
تربیت پا کر ہوئے جب نوجواں　　تحفۂ اسلامِ حق کا ارمغاں
خُلقِ پیغمبرؐ کی اک تفسیر تھی　　شیرِ یزداںؓ کی نئی تصویر تھی
حسنِ کردارِ نبیؐ کا آئینہ　　جوشِ ایثارِ علیؓ کا آئینہ
لرزۂ طوفانِ عالمگیرِ حق　　ترکشِ اسلام کا اک تیرِ حق
سختیاں جو اہلِ شر کی سہہ گیا　　سینۂ باطل میں گڑ کر رہ گیا
ملتِ بیضا کی ماؤں سے کہو　　کاش کچھ فرزند ایسے تو جنو
لشکرِ باطل سے جو ٹکرا سکیں　　پرچمِ توحید پھر لہرا سکیں
مادرانِ امتِ گردوں مآب!　　اسوۂ زہراؓ سے لو آب و تاب
جاں نثارانِ رضا پیدا کرو　　عاشقانِ حق نما پیدا کرو
پھر یزیدیت ہے سرگرمِ ستیز　　قوتیں باطل کی ہیں پھر حشر خیز
گرم ہے پھر کربلا کا معرکہ　　کفر و شر، عشق و رضا کا معرکہ
مادرانِ قوم للہ اک حسینؓ　　پھینک دو یا اپنے اپنے نورِ عین
یہ امومت، پیچ ہی پھر، ہیچ ہے　　خام کاری ہوس کا پیچ ہے
باغِ حق کی آبیاری کرنہ کی　　سر پھرے کا رہے پھر زندگی
پھول کچھ ایسے اگانے چاہئیں　　ایسے گل بوٹے لگانے چاہئیں
جن کی خوشبو سے معطر ہو جہاں　　تازہ ہو جائے نبی کا گلستاں

خار و خس پیدا کئے تو کیا کیا
بوالہوس پیدا کئے تو کیا کیا

جمیل احمد فاروقی ●

(گزشتہ سے پیوستہ)

جدید اردو غزل میں تعمیری رجحانات

موضوعات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو تعمیری غزل کا دامن بیشما اور متنوع مضامین سے مالا مال ہے اور انھیں موضوعات سے رجحانات کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان تمام بکھرے ہوئے مضامین کو جب ایک مربوط کڑی میں رکھ کر جائزہ لیا جائے تو صرف تین ہی ایسے اہم اور مستقل عنوانات ملتے ہیں جن کے تحت ہم مختلف رجحانات کا تنقیدی تجزیہ کرسکتے ہیں:۔

۱۔ ماحول کی شدید کش مکش اور اسکے اثرات: اسوقت دنیا میں جتنے بھی نظام اور ضابطے رائج ہیں ان کے ہولناک نتائج سے پوری انسانیت ایک مستقل کراہ بن کر رہ گئی ہے۔ آج امن اور مسرت کے پیچھے فساد اور معصیت کوشی کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ مادی فوائد کے ساتھ ساتھ اخلاقی انحطاط بڑھتا جا رہا ہے۔ انتشار اور پراگندگی زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہے۔ حیات کے ادبی گوشے میں بھی ایک شدید قسم کا روحانی بحران پیدا ہو گیا ہے۔ اگر دنیا کے ادب پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو جہاں اس میں ان تمام تخریب و فساد کی منظم قوتوں کے خلاف ایک بغاوت کا عنصر نظر آتا ہے۔ وہیں پر ایک ایسے خدا پرستانہ نظام حیات کو برپا کرنے کا رجحان بھی تیزی کے ساتھ پھیلتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس میں انسان کی اعلیٰ اقدار کا تحفظ اولین اہمیت رکھتا ہو۔ اس خیر و شر کی رزمگاہ میں آج تعمیر پسند غزل سب سے آگے ہے۔ تعمیر پسند شاعروں نے رائج الوقت نظاموں پر بڑی بڑی تنقیدیں کی ہیں۔ ان میں ایک شاعر کا دل و دماغ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے باشعور اور خدا پرست انسانوں کے دل کی دھڑکنیں اسیر کرلی گئی ہیں۔ انسانی حاکمیت کے تصور نے ہزاروں نئے نئے بت تراش کر رکھ دیئے ہیں۔ زندگی کی مادی توضیحات نے انسان کو بھیڑ اور بکریوں کی صفوں میں لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ ایک طرف تو انسان کو پوری کائنات کا حاکم اور مالک بتلایا جاتا ہے اور دوسری طرف اسے اپنے ہی جیسے انسانوں کی اور زمین کی پرستش کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ایک طرف ذلت و مسکنت کا یہ عالم اور دوسری طرف انسان اور اس کے ہمہ گیر اور ترقی پذیر مادی و روحانی تقاضے! یہ کش مکش کوئی معمولی کش مکش نہیں۔ پوری انسانیت اس کش مکش سے دوچار ہے اور پوری زندگی اس کا مظہر! ؎

انسان پہ انسان کی حکومت اگر اے دوست
فردوس بریں بھی ہو تو آرام نہیں ہے

ہر چند آفتاب نمودار ہو چکا
تھرا رہی ہے صبح کی پہلی کرن ابھی
رواں دواں ہے شب و روز قافلہ اپنا
ہوا نہ فیصلۂ منزل و مقام ابھی
حدودِ گلستاں ہی تک نظر محدود ہو جسکی
بھلا اس پھول کو پروازِ شبنم کی خبر کیا ہو
(شفیق جونپوری)

زمانے میں نظامِ خاک و آہن ہی اگر ہوتا
تو انسانوں کے دل کے آئینہ خانے کہاں جاتے
ظلمتِ غم کے گرانبار سلاسل ہیں وہی
یوں تو تاروں کو بجھے رات ڈھلے دیر ہوئی
اب بھی مجبور ہے بلبل کا مذاقِ پرواز
یوں تو ہر حلقۂ زنجیر کٹے دیر ہوئی
(انور صدیقی)

ہو گئی شاید مسرت کی حقیقت بے نقاب
ہر شگفتی کی صدا ہے آج گھبرائی ہوئی
(حفیظ میرٹھی)

رنگ گل کا ہے سلیقہ نہ بہاروں کا شعور
ہائے کن ہاتھوں میں تقدیر حنا ٹھہری ہے
وہی خزاں ہے وہی ہیں لہو کے نذرانے
تمہیں بتاؤ کہ مہکے کہاں یہ ویرانے
یہ کیا غضب ہے کہ الحاد کے اندھیروں میں
حیات ڈھونڈتی پھرتی ہے آئینہ خانے
(عرشی بھوپالی)

رنگ لالے میں، نہ سوسن میں زباں ٹھہری ہے
اپنے گلشن میں ادھر جب سے خزاں ٹھہری ہے
رات دم توڑ چکی ظلمت غم باقی ہے
جانے تنویر سحر آج کہاں ٹھہری ہے
ہم آج کا کل گیتی سنوارنے کے لئے
کس کی زلف شکن در شکن سے گزرے ہیں
(انور صدیقی)

کس کو معلوم کہ ہم حسن شناسان ازل
کتنے اوہام سے گزرے تو یقیں تک پہنچے
(روش صدیقی)

۲۔ اسلامی اقدار حیات کے واضح نقوش: ان اشعار میں صرف حقیقت کے مظاہر کی عکاسی نہیں کی گئی ہے بلکہ ان کی تہوں کو بھی ٹٹولا گیا ہے۔ وہ کیڑے جو پوری سماجی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کو کھوکھلا کرتے چلے ہیں ان پر بھرپور وار کئے گئے ہیں۔ احساس کی گرمی اور بے پناہ جذبہ خلوص کی آمیزش نے دردمندی اور خارجیت کو اس طرح گھلا ملا دیا ہے کہ دل سینوں میں تڑپ اٹھتے ہیں۔ اپنا اور کائنات کا دکھ ایک بن جاتا ہے۔ ان اشعار میں ایک ایسا اجتماعی شعور جھلکتا ہے جو ہمیں ایک خدا پرستانہ انقلابی جدوجہد کے ذریعہ پورے انسانی معاشرے کی تنظیم نو پر اکساتا ہے۔ ان میں تخیل کی حسین گلکاریاں نہیں بلکہ حقائق کی زہرناکیاں ہیں جو ہمیں کرب دیتی ہیں اور ہمیں زندگی کی صالح اور ٹھوس قدروں کی پذیرائی کے لئے تیار کر دیتی ہیں۔

چنانچہ ماحول سے کش مکش کا اثر جہاں تعمیر پسند غزل گو شاعروں پر یہ پڑا کہ اس نے غیر خدا پرستانہ افکار پر تنقید کی غیر معمولی جرأت ان کے اندر پیدا کی اور انسانی دکھ درد کو گلے لگانے کا جذبہ پیدا کیا وہیں پر ایک آفاقی فکری نظام کے نقوش واضح اور مثبت طور پر پیش کرنے میں زبردست محرک بھی ثابت ہوا۔ آج تک اردو غزل کی پوری تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں گذرا جس میں اسلامی اقدار حیات کو اس قدر منظم، مربوط اور فکری توانائی کے ساتھ تنگنائے غزل میں پیش کیا گیا ہو۔ اردو غزل میں علامہ اقبال کے بعد اسلام کی تہذیبی قدروں کو اس قدر شعوری انداز اور فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ سمو کر پیش کرنے میں ان تعمیر پسند شاعروں نے ایک ایسی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے جس سے نہ صرف نظریے کی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ تمام اصناف سخن میں خود غزل کے امکانات کا بڑا تابناک اور روشن تصور سامنے آتا ہے۔ غزل کی تمام برگزیدہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے قدروں کو اپنے فطری تسلسل اور تناسب کے ساتھ ابھارنا ایک ایسا تخلیقی عمل ہے جو بڑی فکری ریاضت کے بعد وجود میں آتا ہے۔ اس لئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح کے تخلیقی عمل کے معیاری نمونے غزل میں اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ منظر عام پر آچکے ہیں لیکن اتنا ضرور اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ تخلیقی عمل کے جتنے اور جیسے بھی نمونے اس وقت تک سامنے آچکے ہیں وہ بے حد امید افزا ہیں۔ مجھے اس حد تک توقع ہے کہ اگر مسلسل تجربات کا یہی عالم رہا تو جدید تعمیر پسند غزل نہ صرف اپنے مطلوبہ معیار پر بہت جلد آجائے گی بلکہ اپنے تمام پچھلے سرمائے کو ایک صدائے بازگشت میں تبدیل کر دے گی۔

اب میں قدروں کی طرف پھر لوٹتا ہوں۔ دوسری اہم قدریں توحید و آخرت کا تصور ہے جو انسان میں فطرتاً موجود ہے۔ یہ اسلام کا سنگ بنیاد ہے۔ اسی سے آزادی، مساوات اور اخوت کے اصولوں کو غذا ملتی ہے اور زندگی تمام قید و بند سے آزاد ہو کر فضائے بسیط میں

پرداز کرتی ہے اور اپنے فطری تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور یہی چیز انسان میں ذمہ داری اور جوابدہی کا احساس پیدا کرتی ہے جس کے بغیر اخلاقی نراج لازمی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے ایک پیغام میں یہ کہا تھا کہ..

"جب تک جغرافیائی وطن پرستی۔ اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا اس وقت تک انسان دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی نہ بسر کر سکیں گے اور اخوت۔ حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے" یہ بات واقعی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ توحید و معاد کے تصور کو پوری زندگی میں تکمیل کئے بغیر نہ تو رنگ و نسل اور قوم و وطن کے اعتبارات کو ختم کیا جا سکتا ہے اور نہ ذہنی انتشار اور پراگندگی دور ہو سکتی ہے۔ یہ تمام جھوٹے امتیازات اسی وقت تک ہیں جب تک دل و نگاہ توحید و معاد کے اسرار و رموز سے ناآشنا ہیں:۔

چمن کی قید نہ تخصیص آشیانے کی
مرے حدود میں ہیں وسعتیں زمانے کی

ہر بار وہ کہتے ہیں کہ مخصوص ہے چلو
کہہ دو کہ ہماری ... یہی نظر تو نہیں تھی
ہمیں بہار کا پابند ہی ہونا تھا
اسی سے رہ گیا محدود ہو کے مے خانہ

(شفیق جونپوری)

غور سے دیکھا جائے تو عالمگیر اخوت و ہمدردی یا اجتماعی احساس مسرت وغم، یہ تمام کیفیتیں اسی کی پیداوار ہیں انسان اور کائنات اور مختلف انسانوں کو جو کڑی (LINK) ایک دوسرے سے جوڑتی ہے وہ یہی جذبہ ہے۔ اسی سے انسانی وحدت کا تصور ہمیشہ کی طرح آج بھی قائم ہے گو یہ رشتۂ مسرت وغم اور اجتماعی دکھ سکھ کا احساس جس قدر کمزور ہوتا چلا جاتا ہے انسانی قرب و یگانگت کا جذبہ سرد پڑتا چلا جاتا ہے اور زندگی افتراق و انتشار میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے باہمی نفرت و عداوت، خود غرضی اور طبقاتی جنگ سب اسی کی پیداوار ہیں اسلام نے توحید اور بندگی کے تصور سے اس جذبۂ انسانی کو فروغ دینے کی جس قدر کامیاب کوشش کی ہے اس کی مثال دنیا کی کسی بھی آئیڈیالوجی میں نہیں مل سکتی۔

امن کے لئے بڑی بڑی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ ادبی تحریکیں امن کی مہم چلاتی ہیں اور شاعر امن کے موضوع پر لمبی چوڑی نظمیں لکھ کر عوام سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔ مگر عالمگیر نفرت وانتقام کی آگ بدستور اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ حد یہ ہے کہ امن کی معنوی مناسبت سے بعض امن کے شیدائی نوزائیدہ بچوں کے نام بھی رکھ لیتے ہیں۔ صنعتوں کی تباہی کا خوف دلایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر امن کہاں ہے؟ یہ کہاں سے آتا ہے؟ کیا درختوں میں اگتا ہے یا زمین سے کھود کر نکالا جاتا ہے؟ یا اس کی جڑیں کہیں اور ہیں؟ اگر انسانی وحدت اور ایک اقتدار کامل کی بندگی سے اجتماعی مسرت وغم اور آفاقی امن و آشتی کے چشمے نہیں ابل سکتے تو پھر وہ کون سا منبع ، سرچشمہ ہے کیا نسلی، قومی اور وطنی امتیازات اور طبقاتی منافرت کی پستیوں سے اجتماعی مسرت اور امن کے سوتے پھوٹتے ہیں؟

تعمیر پسند شاعر بتلاتے ہیں کہ عالمگیر امن و مسرت کی لہریں یہی مسموم ہواؤں کے دوش پر نہیں چلتیں۔ اگر ان لہروں کو ہوا، پانی اور سورج کی روشنی کی طرح تمام کائنات میں بکھرنا ہے اور زمین کے تمام بسنے والوں تک انہیں عام ہونا ہے تو پھر اس عالمگیر جذبۂ اخوت و محبت کو ایک مستقل اسلامی قدر کی حیثیت سے شعر کے قالب میں ڈھالنا ہوگا۔

چنانچہ جب اس قدر کو تعمیر پسند غزل میں نمایاں حیثیت سے ہم دیکھتے ہیں تو ایک طرف اس کا کائنات گیر اور آفاقی تصور ہمارا دامن کھینچتا ہے تو دوسری طرف اس کے دامن میں اس قدر بے پناہ خلوص جھلکتا ہے کہ ہمارا دل خود بخود انسانیت کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اپنی روح کی سرگوشیوں کو کائنات کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کرنے میں آدمی کو سوز تخلیق کے کن مدارج سے گذرنا پڑتا ہے لئے اقبال کی زبان سے تو بارہا سن چکے ہیں ذرا اب ان کے رازداروں سے بھی سن لیجئے چند اشعار ملاحظہ ہوں

میرے دل کی دھڑکنیں بنتی گئیں آہنگ وقت
میرا افسانہ حدیثِ دیگراں بنتا گیا

سوزِ تخلیق سے دل اپنا تپاں رکھتا ہوں
میں بھی اک جذبۂ تعمیر جہاں رکھتا ہوں

(انور صدیقی)

میں سن رہا ہوں تری دھڑکنیں مگر اے دل
غمِ جہاں سے الگ تو نہیں غمِ جاناں
(حفیظ میرٹھی)

چند آنکھوں میں گھر دیکھ بھی سکتا ہوں مگر
بزم کی بزم کو دلگیر میں کیسے دیکھوں
(مسعود جاوید)

جو ہوسکے تو غمِ دل کو لازوال بنا
یہ صورتِ غمِ دوراں رہی رہی نہ رہی
(روش صدیقی)

یہیں سے انسانی عظمت کا تصور اور تسخیر کائنات کا جذبہ ابھرتا ہے مگر یہ تصور قطعی طور پر اس رجحان سے مختلف ہے جو جدید مادہ پرستانہ فلسفۂ حیات کے زیر اثر ادب میں داخل ہوا۔ اسلام میں انسان کی عظمت اور تسخیر کائنات کا تصور بندگی اور نیابت الٰہی میں پوشیدہ ہے۔ تعمیر پسند غزل میں یہ تصور مادہ پرستانہ ارضیت کے ساتھ مل جل کر ایک ایسا مرکب بن گیا ہے کہ بادی النظر میں اسے الگ کرنے میں بڑی دشواری محسوس ہوتی ہے اور بظاہر دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا مگر بتدریج یہ تصور اپنی منفرد خصوصیات کے ساتھ تعمیر پسند غزل میں ابھر رہا ہے ایک نئی توانائی اور نئے حسن کے ساتھ! بندۂ مومن کی بصیرت ہی تسخیر کائنات اور عظمت انسانی کی بھی ضامن بن سکتی ہے۔

بندگی میں بھی رہا گر یہ عناں گیرِ حیات
ابنِ آدم کو ستاروں کے سلام آئیں گے

میں خرابِ گل و نسریں میں ہلاکِ مہ و مہر
میرے دامن میں ابھی ماہِ تمام آئیں گے

دیکھیں یہ نالۂ دلِ آدم کہاں رکے
تارے جبینِ ناز جھکائے ہوئے تو ہیں
(انور صدیقی)

بندگی کا یہ شعوری تصور جب احساس حسن و عشق پر اثر انداز ہوتا ہے تو فنکار کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا تھا:

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

یہ اسی عشق کی کارفرمائی ہے جو احساس بندگی سے پیدا ہوتا ہے لوٹتا ہے۔ یہ افلاطونی نظریہ محبت یا کروچے کے نظریہ حسن کا انعکاس نہیں ہے بلکہ خالقِ کائنات کے تخلیقی مقاصد سے پوری ہم آہنگی سے ظہور میں آتا ہے۔ اس لئے اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئیے کہ حسن و محبت کا تعمیری نقطۂ نظر اسلام کے اخلاقی نظام سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ اسلام کا مقصد صرف اخلاق انسانی کے نوامیس الٰہیہ کی حفاظت ہی نہیں ہے بلکہ ان محرکات کو بھی ختم کرنا ہے جن سے تخریب فساد کی جڑوں کو استحکام حاصل ہوتا ہو۔ اس لئے حسن و عشق، جو بنیادی جذبات انسانی ہیں انہیں ہر حال میں اسلام کے مکمل فکری ڈھانچے میں رکھ کر سوچنے اور برتنے کی ضرورت ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری میں حسن و عشق کا جو تصور ملتا ہے اسے ہم اسلامی فکر کا مکمل نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ جدید تعمیر پسند شاعروں میں یہ تصور ابھی اپنے پورے شعور کے ساتھ تو نہیں آیا ہے لیکن جہاں جہاں بھی ملتا ہے انتہائی صحت بخش اور حیات افروز ہے اور ایک خاص طرز فکر کی غمازی کرتا ہو لذت بندگی میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جب کائنات سمٹ کر ایک مرکز پر آجاتی ہے اور مقصد حیات ہی کیفیت عشق بن جاتا ہے۔ شیفتگی و وارفتگی بیخودی و ہشیاری سب اسی لذت بندگی کی واردات ہیں:۔

وہ سامنے جب آئیں گے خود داد بصیرت لے لیں گے
آوارہ پھریں، ڈھونڈیں نظریں، یہ اہلِ نظر کا کام نہیں
(شفیق جونپوری)

ہمارے عشق کا معیار ہی انوکھا تھا
نہ جو رنگ میں، بو میں رہے نہ رس میں رہے
(نعیم صدیقی)

تیغ لیلیٰ ہی کہاں ہے کوئی شرط نہیں
بے مقصد کا جو عاشق ہو وہی ہے مجنوں

(عاصی کرنالی)

بوس کر آ گیا ہے محمل کملاتا
غمِ زندگی دامن بچاتا

(روش صدیقی)

جل بہ تن من سب جل جائے
سوزِ دروں پر آنچ نہ آئے

(حفیظ میرٹھی)

ظاہر ہے کہ جب بندگی ہی حیاتِ انسانی کا مقصدِ منتہا ہے تو یہاں سے انفس و آفاق کے حقائق کی گرہیں کھلتی ہیں تو پھر اس سے وابستگی بھی لازمی ہے۔ اس راہ میں جن مراحل سے بھی گذرنا پڑے صرف استقامت و عزیمت ہی لازمی شرط نہیں ہے بلکہ تسلیم و رضا جوئی اور مکمل سپردگی کا جذبہ بھی قدم قدم پر نمایاں ہونا چاہیئے۔ یہ مقصد ہی اس بات کا متقاضی ہے کہ اسے تمام نشیب و فراز اور مصلحت اندیشیوں سے بلند ہو کر سینے سے لگا لیا جائے یہی اس کی خصوصیت ہے اور یہی اس کا مطالبہ اس کے حصول میں تذبذب اور تشکیک۔ سو بچار اور اندیشہ ہائے گوناگوں طرح طرح کے مراحل سامنے آتے ہیں مگر بالآخر کامیابی و کامرانی انہیں کو نصیب ہوتی ہے جو تسلیم و رضا اور مکمل سپردگی کے جذبے سے سرشار رہتے ہیں۔ ان کا غم، ان کی خوشی، ان کی محبت و نفرت، ان کی کامیابی و ناکامی، ان کی زندگی اور موت سب کچھ اسی سے عبارت ہے اور اسی کے لئے ہے۔ انہیں تو ہر حال میں اپنے خالق کی خوشنودی اور رضا جوئی مقصود ہے جو تمام موانع کے باوجود حاصل ہو کر رہتی ہے۔

جہاں رنج کے بالآخر تمہیں قبول کیا
الٰہی اپنے بڑی دیر تک دیس میں ہے

(نسیم صدیقی)

انور ہمیں ملے گی نہ کیوں منزلِ نشاط
ہم ہیں ہم ان کے غم کو بنائے ہوئے تو ہیں

(انور صدیقی)

اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا
سو بار جنوں نے تری تصویر دکھا دی

(ماہر القادری)

جب ہو کسی نظر کے اشارے پہ زندگی
پھر ماجرائے سود و زیاں کچھ نہ پوچھئے

(شفیق جونپوری)

بہت سے نقش ہیں جن کو لہو سے بھرنا ہے
تمہاری یاد سے لینے ہیں مجھکو کام ابھی

(انور صدیقی)

۳۔ اسلامی انقلاب کا جو پہلو حقیقت آمیز تصور و اقدارِ حیات کے واضح نقوش میں ہمیں خدا پرستانہ انقلاب کی گونج سنائی دیتی ہے اور ایک مثالی معاشرت کے قیام کی دعوت بھی پہلے تو ایک خاص التزام اور نفسیاتی تناسب کے ساتھ قدروں کو ابھار کے ذہنوں کو صاف کیا جاتا ہے اور غیر خدا پرستانہ افکار اور ان کے بنیاد پر لائے ہوئے نظامِ حیات سے نفرت کا احساس پیدا کیا جاتا ہے اس کے بعد پھر اس نظامِ زندگی کے حقیقت آمیز نقوش کو ابھارنے کی ایک شعوری جد و جہد کی جاتی ہے جو بظاہر صرف تیس سال اپنا آئیڈیل تصور کے ساتھ جاری رہ سکا مگر پوری دنیا کی فکری اور تہذیبی قدروں کی نئی بنیادیں فراہم کرنے کا سبب بنا۔ خصوصاً یورپ نشاۃ جدیدہ کا سنگِ بنیاد رکھنے میں صرف اسی نظامِ حیات کا ہاتھ تھا۔ چند اشعار میں کس خوبی سے ان خیالات کو پیش کیا گیا ہے۔

جلنے کو شمع جل نہ سکی صبح تک مگر
جو فروغِ دیدۂ امکاں ہوئی تو ہے
صدیوں کے بعد سینۂ مشرق سے آج پھر
تخلیقِ آفتاب درخشاں ہوئی تو ہے

(انور صدیقی)

ایک ہمہ گیر انقلاب لانے کا پیغام کوئی آسان کام نہیں خصوصاً غزل جیسی غنائی شاعری کو اس پیغام کا وسیلہ بنانا ہر فنکار کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ ترقی پسند غزل نے تو یہاں تک ثابت کر دیا ہے کہ معمولی خیالات کیا

کو غزل کی صنفی اور مزاجی خصوصیات کے ساتھ پیش کرنا ناممکن ہو اس اعترافِ شکست کے سلسلے میں مجروح سلطانپوری کا بس ایک شعر کافی ہے۔ ان کا ایک شعر سنئے ؎

مری نگاہ میں ہے ارضِ ماسکو مجروحؔ
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

فلسفہ۔ سیاست۔ تاریخ۔ اخلاقیات اور زندگی کے عام مسائل کو انقلاب انگیز صورت میں غزل میں داخل کرنا تو ایسے فنکاروں کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہیں جو بیچارے سیدھے سادے خیال کو غزل میں نظم نہیں کر سکتے۔ یہی تو وجہ ہے کہ احتشام حسین جیسا پختہ کار نقاد بھی غزل کی بساط کو زندگی کے صرف چند پہلوؤں تک محدود رکھنا چاہتا ہے اور بجائے اپنے شاعروں سے مایوس ہونے کے غزل کے امکانات سے مایوس ہے۔

تعمیر پسند غزل نے ثابت کر دیا ہے کہ جن انقلابی تصورات کو طویل سی طویل نظموں میں نہیں پیش کیا جا سکتا انہیں دو مصرعوں میں کتنے حسین۔ بلیغ اور اثر انگیز پیرائے میں سمویا جا سکتا ہے۔ مگر یہ واضح رہے کہ جب تک یہ انقلابی تصورات براہِ راست فنکار کے جذبۂ تخلیق ——— پر اثر انداز نہیں ہوں گے اور فنکار کے یقین و احساس کی آنچ میں اچھی طرح تپ نہیں جائیں گے اس وقت تک نہ تو وہ متناسب اور موزوں الفاظ کے خراد پر سڈول اور ہموار ہو کر غزل کے سانچے میں ڈھل سکتے ہیں اور نہ انہیں کوئی مستقل گداز جاذبیت اور فکری گہرائی نصیب ہو سکتی ہے۔ تعمیر پسند غزل میں خدا پرستانہ انقلاب کی جو گونج سنائی دیتی ہے اور جو چیز قاری کو فطری طور پر اس سے ہم آہنگ ہونے پر مجبور کرتی ہے اس میں یہی قوتِ تخلیق اور یہی نفسیاتی اپروچ کارفرما ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ عظیم قوتِ تخلیق کسی فنکار میں موجود نہیں تو پھر اسے یقیناً غزل کو اپنے نظریاتی اور انقلابی خیالات کا تختۂ مشق نہیں بنانا چاہئیے بلکہ ان سے باعزت طور پر دستبردار ہو کرنا۔ انصاری کے مشورے کے مطابق غزل کو صرف "خلوت آرائی" ہی تک محدود رکھنا چاہئیے جن کے نزدیک غزل کی خلوت مزاجی ہی اس کا حسن ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ ایسے فنکاروں اور نقادوں کا غزل کے لامحدود اور عظیم الشان امکانات سے انحراف کرنے کے بجائے، خود اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرنا، زیادہ سنجیدہ اور باوقار طریقہ ہے۔

چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ دیکھئے کہ خدا پرستانہ انقلاب کی تجدید کے لئے کتنے دلپذیر انداز سے اکسایا گیا ہے۔ وہ انقلابِ عظیم جس نے صدیوں کے زنگ آلود دماغوں کو جلا بخشی اور جاہلی نظام کے تمام تار و پود بکھیر کر ایک آفاقی اور مثالی معاشرے کی بنیادوں کو مستحکم کیا، آج بھی باعزم انسانوں کے آہنی ارادوں کا منتظر ہے! اگر غلط نظامِ فکر نے زندگی کو ایک ناقابلِ برداشت بوجھ بنا کر رکھ دیا ہے تو ہمیں اسے بہرحال اٹھا پھینکنا اور مختلف پیچ و خم سے گذر کر ارتقا کی سیڑھیوں پر چڑھنا ہے۔ جتنی تاخیر ہونی تھی وہ تو ہو چکی۔ اب تو اسی تاخیر سے اپنے شعلۂ شوق کو ہوا دینی ہے: ؎

شعلۂ بام سے اک آگ لگے دیر ہوئی
محفلِ شوق میں ہنگام اٹھے دیر ہوئی
جس سے منزل کا ہر اک نقش چمک اٹھا تھا
رہگذاروں پہ وہی شمع جلے دیر ہوئی
کیوں نہ ہم خونِ جگر دامنِ گل کو بخشیں
اپنے گلشن میں بہاروں کو بسے دیر ہوئی

(ابو صدیقی)

راہیں دشوار ہیں اور پرخطر ہیں۔ ہر طرف تاریکی ہی کا تسلط ہے۔ باطل نے اپنی منظم سازشوں کا جال پھیلا رکھا ہے۔ اور حق بھی نمودار ہو چکا ہے مگر اسے غالب کرنے والے ہاتھ درکار ہیں۔ ابتلا و آزمائش کی بڑی کڑی منزلیں طے کرنی ہیں۔ خدا پرستانہ انقلاب کے لئے جو اضطراب و ہیجان کی آگ سینوں میں سلگ رہی ہے ابھی اسے بڑے سنگین حقائق کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ خوش فہمی اور سستی جذباتیت نہیں کام آئیگی۔

فضائے تیرہ میں سیلابِ نور کیسے بہے
کہ ظلمتوں میں گھرا ہے مہ تمام ابھی
رہِ جنوں! ابھی سخت مقام آئیں گے
کتنے ویرانے سرِ دامنِ شام آئیں گے
کتنے شہر ہیں جو آباد رہیں گے یونہی
کتنے شاہیں ہیں ابھی جو تہِ دام آئیں گے
ہم نے تجدیدِ جنوں کی تو ہے آغاز لیکن
دفترِ شیخ حساب کتنے ہی نام آئیں گے (ابو صدیقی)

یہ انقلاب کا ایک حقیقت پسند تصور ہے! اس میں قنوطیت اور یاسیت کا شائبہ تک نہیں یہ ایک سچے انقلابی کردار کا ایک رخ ہے جو اپنی جد و جہد کے ہر مرحلے پر گہری نظر رکھتا ہے۔ دوسرا پہلو بھی دیکھئے جو ہماری حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جیسی اس معرکۂ خیر و شر میں ہمت و عزم اور حقیقت آمیز رجائیت کے نغمے سناتا ہے۔

ایک تارا بھی نہ ٹوٹے گا مری پلکوں سے
گرچہ ہونٹوں تک مرے زہر کے جام آئیں گے
محتسب لاکھ بچھے دیتے آزار مگر
دندۂ محفل میں تو ہی شعلہ بجام آئیں گے
میں خرابِ گل و نسریں میں ہلاک مہ و مہر
میرے دامن میں ابھی ماہ تمام آئیں گے
رہگذاروں کو ذرا اور بھی گل کاری بنا
راہِ غم کٹتے ہی منزل کے پیام آئیں گے (انور صدیقی)

یہ تمکنت قیصر و جم کچھ بھی نہیں ہے
ہم پر اثر تیغ ستم کچھ بھی نہیں ہے ،،
ہم دہر کو نوشینہ بنا سکتے ہیں اور
اپنے لئے یہ ساغر سم کچھ بھی نہیں ہے ،،
ہر موج صبا پاؤں کی زنجیر ہی لیکن
ہم رقص غزالانِ ختن دیکھ رہے ہیں ،،
سازش، اہل چمن، دام و قفس ہیں لیکن
موجۂ گل جو اڑی ہے تو کہاں ٹھہری ہے ،
سکوتِ نالہ و گل پر نہ جانا
ابھی ان [illegible] شعلہ آلود بھی ہے
(ماہر القادری)

جس انقلابی جد و جہد کے مختلف مراحل کے نقوش ان اشعار میں ملتے ہیں اس پر تاریخ عالم گواہ ہے کہ کس طرح ہر دور میں خدا پرستانہ نظام حیات کے داعیوں پر بے شمار مظالم ڈھائے گئے ہیں۔ کتنی بار مٹھی بھر خدا پرست انسانوں پر یہ زمین تنگ کر دی گئی ہے کتنے قافلے آئے، کبھی رواں دواں، کبھی کشاں کشاں لٹتے رہے اور بڑھتے رہے اور ان کے نقش قدم پر تجدد کی شعلیں جلتی رہیں —

کارواں لٹتا رہا لیکن ز فیضِ ذوقِ رم
گرد راہِ زندگی سے کارواں بنتا گیا
(انور صدیقی)

تعمیر پسند غزل کے اس آئینے میں ایک خاص تصور حیات اپنی تمام انقلابی اور تحریکی خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ آل احمد سرور نے ایک حالیہ سمپوزیم میں یہ کہا تھا کہ عام احساس کا جادو اب بھی غزل کے ذریعہ جگایا جا سکتا ہے۔ اس میں انسان دوستی کے جذبات کو بڑی خوبی سے بیان کر سکتے ہیں اور اس کے نشے سے اب بھی بہت سے کام لئے جا سکتے ہیں اس سلسلے میں انہوں نے غزل کو حدیث دلبری کے بجائے صحیفۂ کائنات بتلایا تھا۔ تعمیر پسند غزل اس وقت ہمارے سامنے ایک ایسی ہی صنف سخن ہے جس میں نہ صرف انسان دوستی بلکہ زندگی کی تمام اعلیٰ اقدار اپنے پورے تسلسل اور ارتقا پذیر رجحانات کے ساتھ مل سکتی ہیں۔ عام احساس کا جادو تو اس کے ذریعہ ہمیشہ جگایا گیا ہے اور جگایا جا سکتا ہے مگر سچ پوچھئے تو اس کے ذریعہ مستقل طور پر خدا پرستانہ شعور کی بیداری کا کام بہت ہی کم لیا گیا ہے اور جہاں جہاں لیا بھی گیا ہے تو کسی خاص مقصد یا غایت کے تحت نہیں بلکہ خود انسانی تقاضوں سے مجبور ہو کر۔ اقبال نے غزل کو اسی مقصد کے لئے استعمال کیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں غزل ایک طرف تو حدیث دلبری کے بجائے صحیفۂ کائنات بن گئی اور دوسری طرف تعمیر پسندوں نے اسے شعوری طور پر ایک موثر ترین حربے کی حیثیت سے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ایسا حربہ جس سے لادینی نظام فکر کی جڑوں کو کاٹ کر خدا پرستانہ قدروں کو ابھرنے اور پنپنے کا موقع دیا جا سکے۔

تعمیر پسند شاعروں نے اس حربے سے صرف یہی ایک کام لینے کی کوشش کی ہے اور اس میں کہاں تک کامیاب ہیں زیر بحث رجحانات کا تجزیہ اس کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ غزل کا (POSITIVE ROLE) کیا اور اس کے امکانات کی… سرحدیں کہاں تک ہیں۔ ایک طرف ترقی پسند غزل کا یہ شعر دیکھئے —

چمک ہی جائے گی تقدیر کائنات اک روز
… … خدا نہیں، نہ سہی آدمی کی ذات تو ہے (فراق)

جس میں بجائے خدا کی حاکمیت کے خود انسان کا کتنے بھونڈے طریقے سے مذاق اڑایا گیا اور دوسری طرف اس کے مقابل میں یہ شعر سامنے رکھئے جس میں کس قدر فنکارانہ حسن کاری اور فکری توانائی کے ساتھ ایک عظیم اور صحت مند خیال کو پیش کیا گیا ہے ؎

سنورے گی کائنات کا اس کی نگاہ ناز
کچھ کچھ حریف گردش دوراں ہوئی تو ہو

یہ ہے تعمیر پسند غزل کا رول (ROLE) کیا اب بھی اس کے امکانات کی نشاندہی کی ضرورت باقی ہے؟

(بشکریہ نئی سلیں)

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ لکھنا نہ بھولئے
تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان ہی نہ ہو۔ (منیجر)

شفقت کاظمی

نہ کریں شکوۂ بیداد گوارا نہ کریں — ہم کوئی بات علی الرغم تمنا نہ کریں

دل بایں کشمکش ہجر ہے راضی برضا — شوق سے آپ مرے حال کی پروا نہ کریں

لب پہ آئی ہے جو فریاد تو برہم کیوں ہو — یوں بھی کیا درد محبت کا مداوا نہ کریں

وجہ تسکیں ہے بہر حال تصور ان کا — ہم نے کی ہے نہ کبھی خواہش دنیا نہ کریں

پرسشِ حال جو فرمائیں کبھی آپ تو ہم — اپنی محرومیٔ تقدیر کو رویا نہ کریں

تجھ کو منظور نہیں ہم سے جو پیمانِ وفا — کیا کریں اور اگر ترکِ تمنا نہ کریں

جلوۂ حسن بھی چھپتا ہے چھپانے سے کہیں — دیدۂ شوق سے وہ صفت میں پروا نہ کریں

تو بھی مجبور نہ ہو دل سے تو اربابِ وفا — تجھ سے پیمانِ محبت کا تقاضا نہ کریں

سطوتِ حسن کا یہ حکم عجب ہے شفقت
ان کے آگے بھی ہم اظہارِ تمنا نہ کریں

(بشکریہ ایشیا)

قمرالدین قمر

پارس پتھر

"لو بیٹی اب تیار بھی ہو جاؤ!"

اس نے اپنی جھکی ہوئی نگاہوں کو اس کی طرف اٹھا کر دیکھا بڑھیا کے جھریوں والے چہرے پر نحوست کے آثار عیاں تھے۔ پپڑیاں جمے ہوئے ہونٹوں پر پھیکی سی خوشی تھی۔ جن کی چمک بالکل ماند تھی اور جو زبردستی پیدا کی گئی تھی۔ اس کی نگاہیں دیر تک اس کے پلپلے چہرے پر ٹک نہ سکیں اور وہ نظریں پھیر کر تپائی پر پڑے ہوئے لفافے کو گھورنے لگی۔ کچھ دیر پہلے جب اس کے ہاتھ میں یہ لفافہ پڑا تھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھل اٹھی تھیں۔ ہلکی سی مسرت کا احساس ہوا تھا۔ اسی احساس نے اس میں پھرتی پیدا کر دی تھی۔ "آج دعوت ہے وہ لوگ انتظار کرتے ہوں گے۔" اب اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ وہ جائے یا نہیں۔ انتظار تو ضرور کرتے ہوں گے۔ اسے دعوت میں ضرور جانا چاہیئے۔ پھر جانے کا ارادہ نہ ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اپنے شوہر سے اجازت طلب کرتی

"میں جاؤں؟"

"کہاں؟"

"بیگم آپ نے کھانے پر بلایا ہے!"

اس کی پیار بھری نگاہیں اپنے شوہر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ اس کونے سے اس کونے تک پھیل چکی تھی۔ بایاں ہاتھ اس کی مٹھی میں تھا اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے وہ اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔

"اچھا" وہ بالکل دھیمی آواز میں غیر دلچسپی سے بولا جیسے مجبوراً کہہ رہا ہو۔ پھر وہ کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دفتر جانے کا وقت قریب تھا اس نے کپڑے تبدیل کئے اور جاتے وقت سرگوشی کے انداز میں اس نے کہا "جلدی آجانا تنہائی کی رات بڑی بھاری ہوتی ہے۔ اس وقت چاندنی پھیلی نظر آتی ہے اور فضا کا بانکپن لٹ جاتا ہے۔ پھر تمہارے بغیر نیند بھی تو نہیں آئے گی"

جس پر وہ ہنس دی۔ فضا میں پھلجھڑی سی چھوٹ اٹھی اور ایک عجیب کیفیت کا احساس ہوتا رہا۔ ایک نامعلوم سی لذت سے سرشار وہ خاموش کھوئی کھوئی سی رہی۔ اس کا دل ان لوگوں سے ملنے کو بھی چاہتا تھا پھر وہ سوچتی اگر رات کو انہوں نے روک لیا تو؟ کافی روز بعد جا رہی تھی ممکن ہے سہیلیوں کے اصرار اور ان کے تقاضے سے وہ مجبور ہو جائے۔

"لو بیٹا اب تیار بھی ہو جاؤ۔ ہے ہے بیگم صاحبہ انتظار دیکھتی ہوں گی، اور تم ہو کہ ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔"

اسے اپنی ماں کی یہ آواز بہت بری لگی اور اس کی آواز تھی بھی غصہ سے بھری ہوئی۔ بلکہ ناراضگی اور غصے کی لکیریں بڑھیا کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ تو نہیں چاہتی تھی کہ اب وقت ضائع کرے۔ اس نے حقارت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ تپائی پر رکھی ہوئی اپنے شوہر کی تصویر میں کھوئی ہوئی تھی ——— یہ چونچلے یہ چاؤ اسے ذرا بھی پسند نہ آئے۔ اس نے غور سے اپنی آنکھوں کے ابلے ہوئے ڈیلوں کو گھما کر رشید میاں کی تصویر کی طرف دیکھا۔ بھلا کون سی خوبی تھی اس تصویر میں ——— وہی ایک بوسیدہ سی دھاری دار تانی اونے مڑے ہوئے کوٹ میں لپٹا ہوا اس کا گندمی چہرہ .... اور یہ چہرہ شادی سے پہلے اسے بہت اچھا لگتا تھا اس کی دم توڑتی مسکراہٹ یاد آ گئی۔ اور .... قریب قریب اس کے عادات و اطوار بھی اسے بہت پسند تھے۔ تبھی تو اس نے اسے اپنی فرزندی میں قبول کر لیا تھا۔ مگر اس وقت اس کی تصویر بہت ہی بھونڈی معلوم ہوئی، چہرے کے خطوط میں کوئی جاذبیت نظر نہ آئی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ان دونوں کو ساتھ گھورتی رہی تھی۔ اس نے ایک دوسرے کے چہرے کا تجزیہ کیا تھا۔ ایسا کرتے وقت بیگم کے یہ جملے اس پر اچھی طرح واضح ہو چکے تھے ——— "چہ چہ خالہ تم نے انیس کی زندگی کا سودا بہت عجلت میں کیا۔ بچاری کا نصیبہ ہی

پھوٹ گیا۔ سو روپے تنخواہ پانے والے لڑکے بھی آج کل کہیں شریف ہوتے ہیں۔ بچاری انیس پارس پتھر تھی خالہ! پارس پتھر! مگر تم نے اسے صرف پتھر سمجھ کر پھینک دیا۔"

بڑھیا کے کانوں میں اس وقت بھی بیگم کی آواز میں ارتعاش بن کر گونجتی رہیں۔ اس کی جھنجھلاہٹ سے اس کا غصہ اور بھی تیز ہو گیا۔ اسکی آنکھوں نے آج دیکھ لیا تھا اور بیگم کے جملے اس کی سمجھ میں آگئے تھے۔

انیس میں کون سی ایسی بات نہ تھی جو بیگمات میں ہوا کرتی ہیں، ان کی عادت، ان کا طریقہ۔ اس کی شکل و صورت پوری شباہت، بڑے گھرانوں کی عورتوں جیسی تھی، پھر کیا وجہ کہ وہ خود چولہا جلائے، گیلی لکڑیوں میں پھونکیں مارے۔ کھانا پکاتا۔ برتن دھوتا۔ گھر صاف رکھنا۔ اس نے اکثر و بیشتر دیکھا تھا وہ دن دن بھر چولہے کے پاس بیٹھی چاولوں کی طرح ابلتی رہتی ہے اور اس کی ساس ——— وہ دن بھر بہو پر حکومت کرتی رہتی یا چھالیہ کترتی رہتی یا پھر چارپائی میں دھنسی خراٹے بھرتی رہتی اس کے دل میں اس کی ساس کی طرف سے رقابت پیدا ہو گئی تھی اور یہ رقابت دن بدن دشمنی کی صورت میں جنم لیتی رہی۔ آخر ایسا کیوں؟

آخر ایسا کیوں کا سبب وہ خود بھی نہیں سمجھتی۔ البتہ بیگم نے اسے بتایا تھا" وہ بڑھیا پہاڑی لومڑی ہے خالہ! تم نے تو جیتے جی انیس کو ان خونخوار درندوں کے منہ میں جھونک دیا! خالہ اب کوئی صورت نہیں ہو سکتی"

اسی روز سے وہ انیس کی ساس کو چالاک لومڑی سمجھنے لگی تھی۔ بھلا اس میں جانوروں جیسی کوئی بات نہ تھی پھر ...... اس لئے کہ، اس کی بیٹی پر حکم چلاتی ہے اپنی برتری کی دھونس جماتی ہے۔ موہی..... منہ ہی منہ میں وہ گالیاں دینے لگی، اس کا کتنے ایسا منہ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا جیسے اس میں گھنگنیاں بھری ہوئی ہوں۔ آخر وہ تنگ آکر نہایت ہی کرختگی کے لہجہ میں بولی:۔

"سنتی ہو یا بیگم جادی کی لونڈی ہوں جو انتظار میں بیٹھی رہوں۔ میرا جلیسے کچھ کام ہی نہیں۔"

انیس جیسے چونک پڑی لیکن اسے اپنی ماں کی یہ حرکت بالکل پسند نہ آئی۔ یوں گھور گھور کر دیکھنا اور تصویر سے ایک طرح کی نفرت کا سبب وہ سمجھ نہ سکی۔ وہ اپنی ماں کے دن بدن تغیرات پر حیران سی ہو جاتی۔ اسے اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں ساس اور شوہر کے لئے بڑی بری لگتیں۔ جب ایسا ہی تھا تو پھر اس نے اس گھر میں شادی ہی کیوں کی؟ اب ہر بات میں کیڑے ڈالنا۔ دوسروں میں عیب نکالنا وغیرہ سب باتوں کو بالکل پسند نہ کرتی تھی۔ اس وقت بھی اسے اس کی یہ حرکت بہت بری معلوم ہوئی۔

ایسی کوئی صورت اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس نے جواب میں بیگم سے کہا۔ کیا صورت ہو سکتی ہے بھلا، اب جو ہونا تھا سو ہو گیا لیکن ابھی ابھی اس کے سوتے دماغ میں یہ بات کلبلا اٹھی تھی اگر شاید بیگم کے سمجھانے سے ایسا ہو سکے ...... کیسا؟ کیسے کی شکل بالکل مبہم سی تھی۔ گویا غیر شعوری طور پر یہ خیال آگیا تھا ورنہ وہ کیسا چاہتی تھی؟ وہ کبھی بھی تو ایسا ویسا نہیں چاہا کرتی تھی۔ ہر حالت میں قانع رہی۔ قناعت تو اس کی گھٹی میں پڑ گئی تھی۔ اور اب بھی قناعت اندر ہی اندر اسے اکسا رہی تھی۔ بس وہ یہی دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی آرام سے رہے، بیگموں کی طرح ——— پھر بھلا وہ خود ہی کون سی بیگم تھی اور اس نے اپنی بیٹی کے جہیز میں کیا دیا تھا۔ آج تک دبی دبی زبان میں انیس کہتی رہی اور وہ سنتی رہی۔" انہیں انگوٹھی تک نہ دی گئی ماں!" ہنھ ...... خود شرمسار ہونے کی بجائے وہ الٹی اس پر برس پڑی۔

اس وقت بھی وہ جھنجلائی ہوئی تھی۔ یہ جھنجلاہٹ اس کی قناعت کے بلوریں شیشے میں خراشیں ڈالتی، توڑ دینے کے درپے ہوتی جب وہ بیگم کو دیکھتی اور ان کی ہم رتبہ سہیلیوں کو تو جیسے اسکی قناعت کا آبگینہ پھوٹ پڑتا لیکن فوراً ہی پھوٹے ہوئے آبگینے کو دیکھ کر اپنی قسمت کو کوسنے لگتی۔ جب کبھی بھی ایسا موقعہ آیا اسے ذہنی تسلی مل جاتی غیر یقینی طور پر۔

غیر یقینی طور پر اس لئے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ سیدھی سادی روایات پر چلے جس پر اس کے بزرگ چلتے آئے یا پھر بیگم کیوں کہتی ہے "خالہ یہ قسمت وسمت بے کار سی باتیں ہیں، میں پھر کہوں گی اور ضرور کہوں گی تم نے انیس کا سودا بہت ہی عجلت میں کیا بچاری ابھی رل رہی ہے" ایک طرف تو بیگم کہتی تھیں قسمت وسمت کچھ نہیں دوسری طرف اس کے بزرگ کا کہنا تھا" وہی ہوتا ہے جو قسمت

میں لکھا ہو۔ کس کی بات سچ تھی اور کون جھوٹا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا ——— اور یہ بات بھی اس کی سمجھ میں بہت روز تک نہ آئی کہ "ایسی ہوتی تو راج رہتی . . . . . " پھر اس نتیجے پر کافی دیر بعد پہنچی ممکن تھا بیگم اپنے رشتہ داروں میں اسے منسوب کر دیتی اس طرح یقینی طور پر راج رہنے میں کوئی کسر نہ ہوتی۔ آخر بیگم انیس کو اپنی بہن کی طرح مانتی ہے۔

انیس اب بالکل تیار ہو چکی تھی۔ اس نے کاسنی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اسی رنگ کا بلوز۔ بالوں کی دو چوٹیاں گوندھی ہوئی تھیں جو نکھرے ہوئے چہرے پر بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ دھوپ آنگن سے ہوتی ہوئی کمرے کی کھڑکیوں سے جھانکنے لگی۔ اس کی ضیاپاش کرنیں فرش پر لوٹ رہی تھیں۔ بڑھیا نے مطمئن نگاہوں سے یکبارگی اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس وقت رکشا لاتے ہوئے اسے کوفت سی معلوم ہوئی۔ دل ہی دل میں اپنی عجلت اور اس عزیب سمدھیانے پر اس نے متعدد گالیاں بکیں جہاں ٹیک چھوکرا بھی ایسا نہیں جو رکشا ہی لا دے بھلا اس گھر میں اس کی بیٹی راج کیونکر رہ سکتی ہے؟

"چلو رکشا آگیا!"

انیس نے بڑھتے وقت دوبارہ اپنے شوہر کی تصویر کی طرف دیکھا۔ غور سے تصویر دیکھتے ہوئے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ سامنے کھڑا ہے اور کانوں میں اس کے الفاظ گھنگرو کی طرح بج رہے ہیں۔—

"تنہائی کی رات بڑی بھاری ہوتی ہے۔ پھر تمہارے بغیر نیند بھی تو نہیں آئے گی!"

رات اسے خود بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ بچھونے پر کروٹیں بدلتی رہی۔ ہر کروٹ جسم کی ہر حرکت کے ساتھ اس کے ذہن میں یہ جملے کیڑوں کی طرح رینگنے لگتے "تمہارے بغیر نیند بھی تو نہیں آئے گی؟" اس وقت رنج اور غم سے پریشان اس نے اپنی ماں کو بہت ہی برا بھلا کہا۔ لیکن اس نے پھر سوچا وہ خود غلطی کر گئی۔ صاف صاف بیگم آپا کے اصرار کرنے پر بھی کہہ دیتی رات میں نہیں رہ سکتی، لیکن ایک طرح کی شرم نے اسکے دامن کو بری طرح پکڑ رکھا تھا جس سے نجات . . . . . " آخر کتنے روز بعد آئی ہو یہ بھی کیا ایک روز نہ رہو۔ میاں اتنے ہی چہیتے ہیں تو پھر انہیں آنچل میں باندھے

پھوپو" بیگم کے ان الفاظ پر وہ پانی پانی ہو گئی۔ بڑی مشکلوں سے اس نے اپنی نظروں کو فرش سے اٹھا کر ان کی طرف دیکھا" یہ بات نہیں بیگم آپا۔ کھانے پینے کی تکلیف ہو جائے گی انہیں" بیگم گویا اس کے جواب پر تنک کر اٹھیں" ہے ہے انیس اب تو ہم اتنے ہی غیر ہو گئے مگر بہن میں تو اب تک تمہیں اپنی بہن کی طرح ہی مانتی ہوں۔ خیر جی جیسی تمہاری مرضی" اس نے دیکھا بیگم کے چہرے پر ناراضگی کی لکیریں پھوٹ پڑیں۔ آنکھوں میں خفگی نمایاں تھی اور ہونٹوں کو جیسے چبا رہی تھیں۔ پاس بیٹھی ہوئی بڑھیا نے بھی بیگم کی طرف سے اسے ڈانٹ پلائی" ہے انیس بہن سے بڑھکر میاں ہوتے ہیں۔ بچاری بیگم صاحب تیرے لئے کتنی اداس رہا کرتی ہیں اور تو ہے کہ ان کا دل توڑے دیتی ہے۔ چل چل بہت دیکھی ہیں لاڈلی بیویاں!"

آخر اسے رک جانا ہی پڑا۔ بیگم نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا اف اس کا سوچ اور فکر میں ڈوبا ہوا چہرا اس وقت اسے بہت بھلا معلوم ہوا گھنی گھنی پلکوں میں نمی جھلک رہی تھی لیکن ظاہری طور پر وہ مسکرا رہی تھی۔ بیگم نے بھی مسکرا دیا۔ دونوں کی کھینچا تانی ایک دم ختم ہو گئی۔ تب بیگم نے کہا۔

"اے انیس کیسی ہو گئی ہو، کیا بیمار ہو؟"

"نہیں تو!"

"پھر یہ حالت کیسی بنا رکھی ہے" اور یکایک خود ہی ہنس پڑیں ان کی ہنسی زہر میں ڈوبی ہوئی تھی جسے انیس نے بھی محسوس لیکن سبب معلوم نہ کر سکی۔ اتنا وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ بیگم کیا اس کا سسرال قطعی ناپسند ہے سسرال سے زیادہ اس کا شوہر ——— یہ ناپسندیدگی اور ایک طرح کا بغض اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ پہلے وہ خود بھی اس رشتے سے خوش تھیں کئی بار اس کے سسرال گئیں اور بار بار ان لوگوں کی تعریفیں کیں۔ مگر ادھر عرصے سے ان میں ایسی تبدیلیاں کیوں پیدا ہو گئی تھیں؟ آخر وہ کچھ کچھ سمجھنے میں کامیاب ہو گئی۔ ممکن ہے یہی بات ہو جس کی وجہ سے بیگم ان سے نفرت کرنے لگیں کہ وہ زیادہ تر کہیں بھیجنے کے روا نہیں تھے اور خاص کر رات دوسری جگہ رہنا بالکل پسند نہ کرتے تھے ٹھیک ہی تو ہے اسے ان باتوں میں کوئی ایسی بات نظر نہ آئی جو کسی کا دل دکھانے کا

سبب بن سکتی ہو۔

آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ بیگم بولیں: "کچھ روز رہ جاؤ ایک جگہ رہتے رہتے اچھے خاصے آدمی حیوان بن جاتے ہیں۔ اپنی زندگی ہے تو دنیا حسین ہے ورنہ اپنے مرے قیامت آئی۔ تم ہو کہ زندگی کے پیچھے پڑی ہو عبدل کو میں بلائے دیتی ہوں اس کے ہاتھ پرزہ بھجوا دو کہ آپانے کچھ دنوں کے لئے روک لیا ہے ——"

"مگر انہیں......" "ہے ہے میں کہتی ہوں اپنے مرے قیامت، زندگی چند روزہ ہی، اس کی قدر کرنا تمہارا فرض ہے، سمجھیں! دیکھو خالہ تم عبدل کے ساتھ چلی جاؤ اور انیس کے دولہا کو سمجھا کر کہہ دینا۔ سمجھیں انیس چند روز یہاں رہے گی۔"

وہ صرف ان کی طرف دیکھتی رہ گئی کیا کہے کیا نہ کہے اس کی سمجھ میں اس وقت کچھ نہ آیا۔ بلکہ اسے حیرت بھی ہوئی کہ آخر کس طرح وہ چند سطور تحریر کر سکتی: "بیگم آپا کا بہت بہت اصرار ہے کہ چند روز یہاں رہوں لہٰذا مجبوراً رکنا پڑا۔ آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔ فرصت کے وقت ضرور مل لیجئے گا۔ اماں کو بھیج رہی ہوں دو جوڑے کپڑے ان کے ساتھ کر دیجئے! آپ کی" —— کچھ دیر تک تو وہ بالکل انجان نگاہوں سے پرزہ پر رقم کردہ الفاظ کو گھورتی رہی پھر اس نے احتیاط سے موڑ کر عبدل کے ہاتھ میں تھما دیا۔ لیکن جیسے دل پر ایک بوجھ سا محسوس کرتی رہی اور یہ حالت اس وقت تک رہی جب تک عبدل واپس نہ آگیا۔ اس نے عبدل سے بڑی دھیمی آواز میں پوچھا: "کچھ کہہ تو نہیں رہے تھے؟"

"صاحب نے یہ کپڑے دیئے اور بولے: "میری طرف سے پوچھ لینا آپ کو رات کچھ نیند آیا تھا۔"

اس کا سارا جسم کانپنے لگا ریشے ریشے میں ایک طرح کی سرسراہٹ سی محسوس ہوئی حلق میں جیسے کانٹا سا چبھ گیا۔ مگر اپنی حالت پر اسے بہت جلد ہی قابو پا لینا پڑا۔ کیونکہ بیگم کی نگاہیں بری طرح اس کا جائزہ لے رہی تھیں "اب تیرے پتھر جیسے چہرے پر پارس جھلک پڑے گا تو تو میری اچھی بہن ہے بالکل پارس پتھر۔"

بیگم نے اسے اپنے سے بالکل چمٹا لیا۔ ان کی اس حرکت سے نہ جانے خوشی کے عوض [illegible]

آنکھوں میں خوشی کی چمک تاباں ہو جاتی پھیکی سی مایوسی کیوں دوڑ گئی بجائے اس کے کہ وہ مسکرا کر ہنسی کے پھول بکھیر دیتی ہونٹ کپکپا کیوں اٹھے۔ وہ اپنی حالت کو بالکل نہ سمجھ سکی۔ وہ بیگم کے اس عجیب جذبے اور عجیب مسرت کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ اس وقت اسے بیگم کی نیت میں کچھ فتور نظر آیا اور دل میں کھوٹ۔ یہ اور بات ہے ان کی نظروں میں بے باکی تھی۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے دل میں کھوٹ نہ ہو یا اگر نہ بھی ہو تو بھی اسے ان کی اس قسم کی باتیں بالکل ناگوار سی لگیں وہ چپکے سے اپنی ناگواری کو برداشت کر گئی بلکہ کچھ ایسی سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھنے لگی جیسے ان جملوں کا مطلب سمجھنا چاہتی ہے مگر بیگم اس کا مطلب سمجھائے بغیر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

وہ کرسی پر دھنسی چپ چاپ کھوئی کھوئی سی رہی صبح کا موسم پگھلتا ہوا بہہ رہا تھا اور دوپہری دھوپ چلچلاتی ہوئی بڑھی آ رہی تھی۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ کی تپش کا احساس پنکھے کے نیچے بیٹھنے والوں کو بہت کم ہی ہوتا ہے۔ وہ پتھر ہے۔ صرف پتھر نہیں پارس پتھر پہلے اپنے یہاں بہتر تھی کہ چلچلاتی ہوئی دھوپ اس کی تپش اور روند تاتی ہوئی لُو اس پر اثر نہیں کر سکتی تھی۔ دن بھر چولہے کے پیچھے لگے رہنا۔ اس لئے اسکی رنگت پہلے سے کتنی ماند پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کی چمک پھیکی ہو گئی تھی مگر دل میں ایک طرح کی خوشی، مسرت اور لگن تھی۔ یہی لگن اب جیسے کوئی چھین رہا ہے جیسے اس کی خوشی کو کوئی لوٹنے والا ہے۔ مگر وہ لٹیرا نظر نہیں آتا اور نظر نہ آنے والی ہر چیز وہم سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ پھر پتھر پر پارس لگتے ہی کندن کی طرح لشکارے مارا اٹھے گا۔ وہ پارس پتھر ہے۔ کس معنی میں؟ ہاں وہ صرف پارس پتھر ہے۔ کس معنی میں وہ یہ نہیں جانتی کیونکہ بیگم یہی کہتی ہیں۔

"وہ پارس پتھر ہے" "وہ جوان ہے" "وہ خوب صورت ہے" "وہ ایک لڑکی ہے" "وہ ایک عورت ہے" اور عورت ہونا ہی سب سے بڑی شرط ہے۔ اسی لئے تو انہوں نے اسے اپنی بہن کی طرح مانا اور اب بھی مانتی ہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں ایسی ہی لڑکی کی ان کو ضرورت ہے۔ ان کی آمدنی کا ذریعہ —— اور اب اسے پارس پتھر بنانا چاہتی تھیں۔ جہاں لگا دیں جگہ لگا دو سونا ہی سونا۔ اس زمانہ

میں سونے کی مانگ ہے، سونے کی عزت ہے۔ سونے ہی سے پیار
محبت کی جاتی ہے اور جہاں سونا نہیں جس جگہ سونا نہیں وہاں محبت بھی
کھوکھلی ہوتی ہے۔ پیار جھوٹا ہوتا ہے۔ سب سے بڑی چیز سونا ہے۔ سونے
کے زیورات کے بغیر عورت بھی لنڈوری لگتی ہے اور انیس کے پاس صرف
کانوں میں ایک جوڑا بالی کا تھی بس۔ لیکن بیگم چاہتی تھیں انیس سونے
سے لد جائے اور ساتھ ہی ان کے سونے کے زیورات میں بھی اضافہ ہونے
لگے۔ پھر سوال تھا اس کا شوہر کل ایک سو روپے تنخواہ پانے والا۔ اور ایک سو
روپلی کمانے والے بیگم کی نظر میں شریف نہیں ہوا کرتے بالکل نہیں۔ اسی بالکل
نہیں کی وجہ سے وہ انہیں بالکل پسند بھی نہیں تھا۔

انیس کرسی پر دھنسی رہی چپ چاپ کھوئی کھوئی سی یہاں
تک کہ دوپہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ بھی غائب ہوگئی۔ فضا میں ٹھنڈک
سی آگئی۔ آسمان کا رنگ ہلکا بیگنی ہوگیا۔ بیگم نے بھی کپڑے بدل لئے
اور چیخی رہی "تم بھی کپڑے بدل لو انیس۔ چائے پینے کے بعد ہم سینما
جائیں گے۔" اس نے شاید سنا نہیں کھوئی کھوئی سی کرسی پر دھنسی رہی
بیگم نے اس کی یہ حالت دیکھی تو بوکھلا گئیں۔ اسے یہ حرکت بالکل پسند
نہ آئی وہ چیخی۔ "کب سے کہہ رہی ہوں انیس کپڑے بدل ڈالو یوں کان میں
روئی ٹھونس کر نہیں بیٹھا کرتے۔ چلو اٹھو۔"

اس پر انیس نے صرف ان کی طرف دیکھا اور خاموش اپنی جگہ
بیٹھی رہی۔ بیگم بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانہ کی طرف لپکیں ساتھ ہی کہتی گئیں
"انیس تیار ہوجاؤ۔" اور جب بیگم باورچی خانے سے واپس لوٹیں تو یہ دیکھ کر
خوش ہوگئیں کہ انیس بالکل تیار بیٹھی تھی۔ انہوں نے چائے بنا کر پیالی
اس کی طرف بڑھا دی۔ دونوں نے چائے پی۔

چائے ختم کرنے کے بعد بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں لیکن ان کے بولنے
سے پہلے انیس نے عبدل کو آواز دی۔ "ایک رکشا لادینا عبدل۔"

رکشا آنے سے پہلے ہی وہ زینے سے اتر کر نیچے آنگن میں آگئی بیگم نے
پکار کر کہا "بھئی ہم رکشا پر نہیں جائیں گے۔ امجد صاحب کی کار آتی ہی
ہوگی۔" ——— "مگر میں رکشا پر ہی جاؤں گی!"

کچھ کہنے کی بجائے بیگم ہنس پڑیں۔ دیر تک انیس کی اطوار
پر ہنستی رہیں مگر ان کی ہنسی اس وقت یک بیک ہونٹوں پر گھٹ
کر رہ گئی جب انیس رکشے پر اکیلی جا بیٹھی اور رکشہ بھی آہستہ
آہستہ رینگنے لگا۔

(بشکریہ "ہمایوں")

عاصی کرنالی ●

چاک داماں بھی نہیں، تار گریباں بھی نہیں　　عشق کی تقدیر میں، رنجِ بہاراں بھی نہیں

مجھ میں ذوقِ جستجو تھا میں نے تم کو پالیا　　ورنہ تم ایسے تو نزدیک رگِ جاں بھی نہیں

کچھ گماں کے مرحلے ہیں کچھ یقیں کی منزلیں　　عشق مشکل بھی نہیں اور عشق آساں بھی نہیں

سینۂ دریا پہ اِک بہتا ہوا ناسور ہیں　　ایسی موجیں جو کم از کم نبضِ طوفاں بھی نہیں

اپنے اپنے ظرف پر ہے، اے شعاعِ آفتاب　　کتنے پتھر ہیں کہ جو لعلِ بدخشاں بھی نہیں

گلشنِ ہستی کے ان کانٹوں پہ حسرت ہے مجھے　　خوبیِ تقدیر سے جو تیری مژگاں بھی نہیں

عشرتِ احساس کی نیندوں سے جی گھبرا گیا　　اس شبستاں میں کوئی خوابِ پریشاں بھی نہیں

آتی ہیں عاصی شکستِ دل کی آوازیں مجھے

کتنی فریادیں ہیں جو ہونٹوں پہ لرزاں بھی نہیں

(بشکریہ تعمیرِ انسانیت)

سید ساحر ہاشمی ٥

اپنا گھر

(تمثیل نگار)

امی :۔ نجمہ کی ماں، پروفیسر کی ضدی بیوی
نجمہ :۔ پروفیسر کی بیٹی، ارشد کی بیوی
دلہن :۔ نجمہ کی بھابی، صفدر کی بیوی
بیگم :۔ ارشد کی ماں
پروفیسر :۔ نجمہ کے باپ ایک کالج پروفیسر
صفدر :۔ نجمہ کا بھائی

ارشد :۔ نجمہ کا شوہر
ننھا :۔ صفدر کا معصوم دودھ پیتا بچہ
زمانہ :۔ حال
زبان :۔ اردو
مقام :۔ کراچی

فیڈان

(زنانہ قدموں کی چاپ اور پھر یکدم دو عورتوں کے مل کر رونے کی آواز سسکیوں اور ہچکیوں کے ساتھ ساتھ۔

امی :۔ امی کی جان، تم پر صدقہ، بات بتاؤ ——— ہے ہے رو رو جان ہلکان کئے دے رہی ہو۔ یہاں کلیجہ پھٹا پڑ رہا ہے چندو!

نجمہ :۔ اُم ——— می! انھوں نے مجھے مارا یہ دیکھئے!

امی :۔ (پیشانی پر ہاتھ مارنے کی آواز کے ساتھ ہی) ہائے ہائے سارا رخسا سرخ ہو رہا ہے اور پانچوں انگلیاں اوپڑ رہی ہیں۔ اللہ میاں تم نے اپنی قدرت سے وہ ہاتھ نہ توڑ دیا جس نے میری پھول سی بچی کو نیلا بنایا۔ بھلا کسی اپاہج نے تمہیں دوڑ کر بھی، نہ بچایا۔

نجمہ :۔ میرے تو الف سے ی تک بسر تھے۔

امی :۔ اوں! سب کی ملی بھگت ہے!

نجمہ :۔ وہ لوگ بداخلاق بے رحم ہیں۔ مجھے ان کے نام اور تصور سے لرزہ ہوتا ہے، امی ہمیں اب نہ بھیجنا وہاں!

(پروفیسر کا آنا۔ مردانہ قدموں کی چاپ اور کھنکار کی آواز پھر معصوم بچے کے ٹھنکنے کی آواز کے ساتھ زنانی دبی دبی سی صدا جو بچے کو پچکارتی ہو)

امی :۔ ایسا ہی ہوگا امی کی جان، توبہ! اب نجمہ ہرگز ہرگز اپنی سسرال نہیں جائے گی۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے صاحب!

پروفیسر :۔ پاگل ہیں آپ۔ یہ کب آئی ہے، کیوں بلایا تھا اور وجہ؟

امی :۔ دشمنوں کا سر۔ بات نہ بات کی لڑائی۔ نوک جھونک، جدت ملاحظہ ہو۔ ایسی ترقی کا کالا منہ کہ جوان بیوی کو مار پیٹ گردن دھکے گھر سے نکال کھڑا کیا۔ زمانہ بھر کے بے حیا۔ اپنی عزت کا نہیں تو دوسرے کی ممتا کا خیال تو ہوتا ——— ایسا بھی کیا بغض۔ کوئی مونچھوں والا یا چونڈے والی مقابلہ پر آئے جب نون تیل کا بھاؤ معلوم ہو۔

پروفیسر :۔ یہ پاگل پن ہے۔ بکواس نہیں کرتے ہیں...... پہلے سوچنا چاہئے۔

امی :۔ اللہ اللہ! ہمارے دل کی پکار محض بکواس ہے۔ ان کا اتنا بڑا ظلم بھی پیارا۔ یہ دور اندیشی آپ کی نہ جانے کیا خبر لے کرا کر رہے گی!"

(مردانہ قدموں کی چاپ۔ صفدر کا آنا)

پروفیسر :۔ بہتر ——— پگلیں!

صفدر :۔ آہا۔ نجمہ آئی ہے۔ ارے رو رہی۔ کیوں؟

(سسکیوں، سسکیوں کی مسلسل آوازیں)

امی :۔ دیکھو بہن کا چہرہ نیلا سرخ ہو رہا ہے رخسار پر انگلیوں کے

نیل پڑتے ہیں۔ یہ باپ بھائی والی کا حشر ہے۔ لنڈے سانڈ کی ہمت دیکھی، آج تو اس پر بیتی ہے کل تم پر چڑھے گا میاں۔

صفدر :۔ امی ! ہم جتنے شریف ہیں ایسے ہی بدمعاش بھی اس سے تو لگڑی کے دو بہتر ہیں ۔

پروفیسر :۔ پاگل ——— سب کے سب پگلے ، ہم ملیں گے انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

امی :۔ آج تک بڑے تیر مارے ہیں یہاں تک تو ذلیل ہو چکے۔

صفدر :۔ بے شک امی ! اگر اول ہی دھپیا دیا ہوتا تو سر نہ اٹھاتے۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے تھوڑی مانتے ہیں !

پروفیسر :۔ اپنی اپنی پاگل ہٹ رہنے دو۔ یاد رکھو جو ہم نے کہا ہے ہوگا بس ! (قدموں کی چاپ پروفیسر کا جانا)

صفدر :۔ غریب نجمہ سسرال میں عزت نہیں پا سکتی۔ امی ! ابا میاں نے تو گھر بھر کو گیدڑ بنا دیا۔

امی :۔ میاں ان کا دماغ تو کتابیں اور لڑکے چاٹ گئے تمہاری امی تو اپنے فیصلہ پر اٹل ہے اٹل ! فیڈ آؤٹ

فیڈ ان

(پروفیسر کا آنا۔ مردانہ قدموں کی چاپ۔ پلنگ پر سے اٹھتے ہوئے چولوں کی آواز)

پروفیسر :۔ دلہن نجمہ سو گیا۔

دلہن :۔ جی ——— آیئے ابا میاں تشریف رکھئے !

پروفیسر :۔ دیکھا دلہن یہ فضیحتہ ، تمہاری امی تو پاگل ہیں ہی صفدر میاں کو سمجھا دینا وہ پاگل نہ ہوں۔ نجمہ نادان ہے اس کی غلطی پر ضرور زیادتی ہوئی ہے۔ بھئی ارشد بھی بچہ نہیں ہے بیگم صاحبہ سے ہم معلومات کریں گے۔ نجمہ کو بھی نشیب و فراز سمجھا دینا۔ آخر عمر تو ہر بیٹی کی اپنے گھر ہی گذرتی ہے !

دلہن :۔ جی ہاں ! انشاءاللہ بندی پوری کوشش کرے گی

پروفیسر :۔ ہمیں امید ہے

(مردانہ قدموں کی چاپ۔ صفدر کا آنا)

(پھر مردانہ قدموں کی چاپ اور کپڑوں کے اتارنے پہننے کی ہلکی سی آواز ہوتی ہے۔ پھر پلنگ پر لیٹنے کی آواز)

دلہن :۔ کہاں گھوم پھر آئے ہیں۔

صفدر :۔ کہیں نہیں۔ ارشد کی ٹنگ دوڑ میں تھا۔

دلہن :۔ بھلا کیا بھرے بازار میں کشتم پچھاڑ کا ارادہ تھا :

صفدر :۔ ہاں۔ فری اسٹائل کشتی کبھی چھٹپن میں لڑی تھی اور آج فن تو یہ فن شہرہ آفاق ہے۔

دلہن :۔ قربان ! بڑی واہ واہ ہوئی سوٹ ٹائی والوں کی۔ اور جب دنیا کو حقیقت کا علم ہوتا تو اور بھی زندہ باد کے نعروں سے دھوم مچتی بچے کے باپ ہو گئے لیکن چھٹپن ہی مزاج مبارک سے رخصت نہ ہوا۔

صفدر :۔ خدا نہ کرے رخصت ! ہمارے تمہارے ماں باپ سلامت رہیں۔ اچھا تو محترمہ تم نے ایک گریجویٹ اور گورنمنٹ ملازم کو ایسا ہی کچھ سمجھا تھا۔

دلہن :۔ جب حوصلے ہی ایسے بلند تھے۔ اچھا خیر ! ہم لوگ سب نجمہ کے بڑے ہیں۔ ہمارا نظریہ اس کی بھلائی ہو نہ کہ برائی بیٹی کی حمایت امرت نہیں زہر ہوتی ہے۔ اس سے نئی نئی زندگیاں تلخ یا تلف ہو جاتی ہیں۔ بیٹی کا تو اپنا گھر وہی ہوتا ہے جس گھر وہ ڈولے بیٹھ کر جاتی ہے اور پھر مر کر ہی وہاں سے جدا ہوتی ہے۔ بیٹی کا برتاؤ سلیقہ ایسا خوشگوار ہونا چاہیئے جس سے شوہر اور اس کے بڑے چھوٹے سب اس کو عزیز جانیں۔ بات بات میں دو بدو ہونا اچھا تھوڑی ہوتا ہے - زبان کا ہر چسکہ جوتے کھلواتا ہے۔

صفدر :۔ بے شک ابھی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ لوگ اتنجان نہیں اپنے رشتہ دار ہیں، اور ارشد تو ساتھ کھیلا ہوا ہے۔ دہلی چھوڑتے ہی کراچی کی ہوا نے مزاج نہ بگاڑ دیئے ہوں۔ ہماری نجمہ بھی ایسی بداخلاق نہیں۔

دلہن :۔ اجی نہ وہ برے نہ نجمہ۔ دراصل ہماری امی جان کی شہ خطرناک ہے۔

صفدر :۔ ممکن ہے۔ اچھا تم نجمہ کو سمجھاؤ۔ امی جان کی بیری تو دھری رہ جائے گی۔

دلہن :- جب ان لوگوں کو اس بچی کے سامنے تو اہی جتایا جاتا رہیگا
تو پھر اس کو لڑنا ہی ہوگا۔

صفدر :- ہاں۔ (وقفہ)

(چائے کی خالی پیالیوں کے اٹھانے کی آوازیں اور پھر زنانہ
قدموں کی چاپ)

بیگم :- مجھے بڑا ہی قلق ہے پروفیسر صاحب! ارشد کی نالائقی نے
میری آنکھیں جھکا دیں۔ اس نے آپ کی پھول سی بچی پر ہاتھ
کیا چھوڑا اور پھر نکالا کیا دیا بخدا میری گردن اور کر توڑ دی، جانتا
ہے یہ روز کا اس کا مشاہدہ ہے کہ نجمہ مجھے کس قدر پیاری ہو مگر
شاباش اسے اس نے خوب میرے جذبات کا احترام کیا۔ بھلا
وہ عزت اس کی اور اس کے باپ دادا کی تو ہے۔ مردوں کا یہ شیوہ
ہوتا ہے کہ ایک ایک ناسمجھ بچی کے کہنے پر آگ بگولہ ہو جائے۔ اگر میں
موجود ہوتی تو اس کا شیطانی قہر اس پر نازل نہ ہوتا۔ اس کے
مرحوم و مغفور ابا میاں تو مجھ سے سختی کے ساتھ کلام کرنا بھی اپنی
توہین گردانتے تھے اور خدا کی قسم یہ ان کا بیٹا ہے۔

پروفیسر :- یہ بچے پاگل ہیں۔ بیگم آپ بھی برا نہ کریں۔ ان کے معاملات نبٹانا
ہمارا آپ کا فرض ہے۔ اچھی بری حرکت سے ہی آپ متاثر ہو کر
نوجوان آپس میں قدر کرنی سیکھتے ہیں۔ سب کچھ سیکھ جائیں گے
پاگل کہیں کے۔

بیگم :- اللہ اللہ کیجئے پروفیسر صاحب۔ یہ بیل بچہ ہے اور کب
اس کے سینگ نکلیں گے۔ یہ برا بھلا نہیں جانتا۔ ایم۔ اے
اور ڈبل، میں تو بخدا مرتے دم تک نہیں بخشوں گی۔ اور آپ بھی
اپنی حسب منشا اس کو وہ سزا دیں کہ اس کو پتہ چل جائے۔

ارشد :- ابا میاں! میں بہت ہی نادم ہوں۔ خدا کے واسطے میری
خطا معاف کر دیجئے امی بہت خفا ہیں۔ میں اپنے بزرگوں سے
وعدہ کرتا ہوں آئندہ کبھی بھی کسی حماقت کا مرتکب نہ ہوں گا!

پروفیسر :- ہیں نا پاگل یہ۔ مگر ان کے جذبات کتنے خلوص بھرے ہیں ہم
قدر کرتے ہیں جو گناہ کر کے فوراً ہی نادم ہو اور خلوص سے توبہ
کرے خدا فوراً معاف کر دیتا ہے۔ ہم بھی معاف کرتے ہیں۔
بیگم صاحبہ بھی ضرور بخش دیں گی ارشد میاں۔

بیگم :- جی نہیں۔ میں تو نجمہ ہی کے روبرو اس کو بخش سکتی ہوں۔

ارشد :- ابا میاں قبلہ کی اجازت ہو تو امی محترمہ کے حکم کی تعمیل
بجا لاؤں۔

پروفیسر :- ضرور۔ لیکن جمعہ کے روز اور آج، کل تک صبر کرو۔ (وقفہ)

(بچہ کی غوں غوں اور آغوں کی آوازیں اور مسلسل بوسوں کی آوازیں)

دلہن :- دیکھا بی بی نجمہ ننھا اپنے پیار کرنے والے سے کیسا باتیں کر رہا
ہے۔ کیا ارشد اور تم آپس میں نفرت رکھتے ہو!

نجمہ :- نہیں بھابی، دراصل مجھے ڈر لگتا ہے ان سے۔

دلہن :- بڑا اچھا ہے۔ یاد رکھو بی بی۔ ارشد نے جو تم پر زیادتی کی کچھ
ضرور کوئی ایسی ویسی خطا کی ہوگی جسے میں معلوم کرنا نہیں چاہتی
لیکن میں بھی عورت ہوں، اور یہ میرا دعویٰ ہے کہ میاں ارشد کی
جدائی زیادہ برداشت نہ کر سکو گی بلکہ رو رو یا ہی کرو گی۔

نجمہ :- اچھی بھابی! یہ نجمہ رشو خالہ کی سگی بھانجی ہے جو سال بھر بعد
ہی بیوہ ہو گئی تھیں اور آج انہیں تیس سال ہو رہے ہیں۔

دلہن :- بے شک! لیکن بی بی بیوہ کو قدرت صبر عطا کرتی ہے کیونکہ
مرحوم جی کر آ ہی نہیں سکتا اور جس کا شوہر ماشاء اللہ حیات
ہو اس کو تو کسی پہر چین نصیب ہوتا ہی نہیں۔ چھاتی میں ہوکیں
اٹھتی ہیں اور سانپ سے لہراتے ہیں۔ پھر اوپر سے دنیا کے بول
زندگی عذاب اور آنکھیں دریا بنا دیتے ہیں۔ اچھی نجمہ عقلمند اور
صاحب علم ہو۔ اپنا اور اپنے بزرگوں کا برا بھلا مد نظر رکھو بگڑی
کے دو محض محاورے سے ہوا نہیں کرتے۔ بیٹیوں کی عمر انہی کے گھر
گذرتی ہے باپ بھائی کے پہاڑ ہو جاتی ہے۔۔۔۔"

(زنانہ قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی)

امی :- اے کیوں بی دلہن! کیا سکھا پڑھا رہی ہو۔ تمہاری ہی بری
صحبت نے اور غلط مشوروں نے ہماری بچی کو بے راہ کر رکھا ہے
تمہاری خوشی ہے کہ ہماری بیٹی جوتے کھا کھا کر جئے اور تم مزے
کرو گلچھرے اڑاؤ۔

(مردانہ قدموں کی چاپ)

پروفیسر :- یہ پاگل ہیں۔ ان کے لفظوں کی کوئی قیمت نہیں۔ یہ سب کو پاگل بنانا چاہتی ہیں ؟

(مردانہ قدموں کی چاپ)

ی :- پاگل تو کتابوں اور لڑکوں نے آپ ہی کو بنا دیا ہے۔ ہم ملا خدا حافظ۔ ہم اپنے بچوں کا بھلا چاہتے ہیں۔ ہم برملا کہیں گے کسی چڑیل نے ہماری بیٹی کو ورغلا رکھا ہے یہ ہماری دلہن ہے حرام خور ہماری بدنامی اور ذلت کی خواہاں ہے۔ مردار کو جی میں تو ایسا آتا ہے کہ ناک چوٹی کاٹ کر باہر کر دوں۔

پروفیسر :- دیکھا نجمہ۔ ہم نے کہا پاگل نہ بنیں مگر یہ نہ مانیں، دلہن کو جو کچھ انہوں نے کہا تم نے معلوم کر لیا ہے سب لغو اور بہتان لیکن پھر عزیز دلہن نے نیچے سے اوپر آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ صفدر میاں ذرا بتاؤ تو جیسی یہ تمہاری پاگل امی دلہن کے سر ہیں اور تم لگے تھے ہم نہ ہوتے یہ دلہن اپنی صفائی کے لئے یا ان کی لن ترانیوں اور بدزبانیوں سے خائف ہو کر دو بدو ہوتیں یا نجمہ ہی اور لیکچرار دو۔ دو میں چار کا ضرب لگا کر تمہیں پھرتی تو . . . . .

صفدر :- قسم خدا کی ابا میاں ایسی جرأت اور بدتمیزی پر طمانچے کہاں اُدھیڑ ڈالتا اور نکال باہر بھی کرتا۔

امی :- جی ایسے ہی تو تیس مار خاں ہو بیٹے بس ہنسنے دو، لوپری چوچلے

پروفیسر :- خاموش تعلیم میں آڑے نہیں آتے۔ پاگل ہیں نا : ہاں بھئی دلہن اگر اس وقت صفدر میاں تمہیں مارنے ہی لگتے اور غصہ سے مجبور ہو کر گھر سے نکالنے پر تل پڑتے تو ؟

دلہن :- ابا جان ! انہی قدموں کی قسم تڑپ تڑپ کر قدموں ہی میں جان بحق ہو جاتی مگر اپنا گھر نہ چھوڑتی۔

پروفیسر :- شاباش ! بیٹی بحساب تو تمہیں "اپنا گھر" پورا سبق یاد ہو گیا ہو گا۔ دیکھو کل جمعہ ہے۔ میاں ارشد اور بیگم صاحبہ تمہیں لینے آئیں گے ذرا الغرض :- جو کبھی پاگل کے کہنے سننے میں پاگل خود بھی بنو اور ہم سب کو پاگل بناؤ۔

امی :- ہم بھی دیکھیں گے کہ کون مونچھوں چونڈے والی ذرا پاگل کی بچی تی سنے سے اس کی بیٹی کو نکال لے جاتا ہے بلا سے خون خرابے ہی ہو (ایک لمبے سانس کے ساتھ فیڈ آؤٹ)

(شکریہ جامِ نو)

انور صدیقی •

غزل

نوا پیرانِ سوزِ آرزو نے کم نہیں کرتے
چمن میں اعتبارِ شعلہ و شبنم نہیں کرتے

مزاجِ ساقیٔ نامہرباں برہم نہیں کرتے
ہم ایسے رند ہیں جو فکرِ بیش و کم نہیں کرتے

وہ کوئی اور ہونگے راہِ غم سے جو ہراساں ہیں
یہ دیوانے خیالِ جادۂ پُر خم نہیں کرتے

جنہیں احساس سیلِ آرزو ہوتا نہیں ہمدم
کبھی وہ احترامِ دیدۂ پُر نم نہیں کرتے

یقیں کی شمع روشن ہو تو تخلیقِ سحر ہوگی
درازیٔ شبِ ہجراں کا انور غم نہیں کرتے

عمران انصاری •

غزل

مرا دل ہے اور غمِ عشق ہے غمِ عشق سے تو مفر نہیں
میں ہلاکِ تیغِ نظر سہی، پہ اسیرِ زلف و کمر نہیں!

مرے دل کے آئینۂ یقیں پہ غبارِ شام و سحر ہیں
کہ یہ روشنی ہے وہ روشنی جو رہینِ شمس و قمر نہیں

تو جو آج غم سے اداس ہے تو جنوں کی مجھکو پیاس ہے
جسے جام کہتا ہے محتسب وہ یہی تو دیدۂ تر نہیں

تو اسیرِ رسم و رواج ہے، مرا باغیانہ مزاج ہے
یہ جنونِ عشق ہی خام ہے کہ ادھر تو ہے پہ اُدھر نہیں

میں برائے عشق جہاں میں آج سہی کہ خانہ خراب ہوں
مگر ایسے دل ہیں کہیں بھی ہوں جنہیں اپنے گھر کی خبر نہیں

شوکت تھانوی

اقربا ہوگئے مرے آگاہ

میں اپنے کو نہایت تنہا محسوس کرتا تھا ایسا تنہا کہ ؎

پڑئیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

چند ضروری ہی نہیں بلکہ اشد ضروری اعزہ جن میں بیوی اور بچوں کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ قیام پاکستان سے کچھ پہلے ہی بمد پیشگی ہجرت کرکے اس طرف چلے آئے تھے۔ باقی اعزہ یا تو اللہ کو پیارے ہوئے یا ریڈ کلف کو۔ کچھ اسی قسم کا حال احباب کا بھی سمجھ لیجئے۔ مگر جس دن سے میں نے موجودہ عہدے کا چارج سنبھالا ہے مجھ کو اپنے خاندان کی وسعت اور حلقۂ احباب کی بے پناہی کا اندازہ اس شدت سے ہو رہا ہے کہ بعض اوقات تو اپنے ان مرنجان مرنج تعلقات پر چیخیں مار کر رونے کو جی چاہتا ہے دفتر پہنچتے ہی میز پر ڈاک کا ایک انبار نظر آتا ہے۔ جس میں کارآمد خطوط تو خیر کبھی کبھار ہوتے ہیں عموماً لفافہ کھولتے ہی کچھ اسی قسم کے نامہ ہائے محبت نظر آتے ہیں۔

"ارے بھئی! السلام علیکم!

مجھے تو کل عزیزی جمیل میاں سلمہٗ کی زبانی معلوم ہوا کہ تم پاکستان ہی میں ہو اور خدا کے فضل سے آج کل جنرل منیجر ہو گئے ہو میں نے تو تمہارے متعلق ہمیشہ ہر ایک سے یہی کہا کہ اس شخص کی پیشانی پر مجھ کو اقبال مندی چمکتی نظر آ رہی ہے اور یہ شخص کسی نہ کسی دن ضرور حکومت کی کرسی سنبھالے گا۔ چنانچہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ میری بات پوری ہوئی اور میں نے تم کو اس عہدے پر دیکھ لیا۔ اچھا اب مطلب کی بات سنو۔

عزیزی جمیل میاں سلمہ اللہ تعالیٰ انٹرنس کا امتحان دینے والے تھے کہ یہ قیامت برپا ہو گئی اور ہم کو اس طرف آ جانا پڑا۔ ظاہر ہے ان حالات میں ان کی تعلیم تو جاری رہ نہیں سکتی تھی۔ مجبوراً یہ طے کیا کہ ان کے لئے کوئی مناسب ملازمت ہی مل جائے۔ اب یہ معلوم ہونے کے بعد کہ تم خدا کے فضل سے اس مرتبہ پر ہو مجھ کو یہ فکر باقی نہیں رہی اگر چاہو تو اپنے ہی قلم سے اپنے اس بھتیجے کو دو ڈھائی سو کی ملازمت تم خود دے سکتے ہو میں بہرحال صاحبزادے کو تمہارے پاس بھیجنے کو تیار بیٹھا ہوں اور ان کا بستر گول کر چکا ہوں۔ تمہارا خط آتے ہی روانہ کر دوں گا۔

امید ہے کہ تم مجھ کو بھولے نہ ہو گے ارے بھئی میں وہی اسلم ہوں جو تمہارے چچا زاد بھائی رشید میاں کے توسط سے لکھنؤ میں مل چکا ہے امید ہے آپ مجھ کو پہچان گئے ہوں گے۔ سب کو سلام و دعا۔

تمہارا خیر طلب
محمد اسلم"

اب آپ ٹاپتے پھرئیے کہ یہ کون محمد اسلم ہیں۔ اور یہ کون جمیل میاں سلمہٗ ہیں۔ طرح طرح کی صورتیں ذہن کے پردے پر ابھریں گی اور آخر یہ لفافہ کے اندر ہوتا ہوا ردی کی ٹوکری میں پہنچ جائے گا۔ مگر دماغ کو بھول بھلیاں بنانے کے لئے پھر دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا خط موجود ہے اور ابھی یہ ڈاک ختم بھی نہیں ہوئی کہ چپراسی نے ایک کارڈ لاکر دیدیا۔

"عبدالستار خاں"

یا اللہ یہ کون عبدالستار خاں ہیں ایک عبدالستار خاں وہ تھے جن کے ساتھ ہمارے یہاں کی آیا کی لڑکی نے پہلے تو خود ہی شادی کر لی تھی اس کے بعد اس کی ماں نے تدبر سے کام لیکر بڑی ہنسی خوشی رخصتی کر دی تھی ایک دوسرے عبدالستار خاں وہ تھے جو اجمیر شریف کے عرس میں

انور صدیقی •

غزل

نوا پیرانِ سوزِ آرزو نے کم نہیں کرتے
چمن میں اعتبارِ شعلہ و شبنم نہیں کرتے

مزاجِ ساقیِ نامہرباں برہم نہیں کرتے
ہم ایسے رند ہیں جو فکرِ بیش و کم نہیں کرتے

وہ کوئی اور ہونگے راہِ غم سے جو ہراساں ہیں
یہ دیوانے خیالِ جادہ پُر خم نہیں کرتے

جنہیں احساسِ سیلِ آرزو ہوتا نہیں ہمدم
کبھی وہ احترامِ دیدۂ پُرنم نہیں کرتے

یقیں کی شمع روشن ہو تو تخلیقِ سحر ہوگی
درازیِ شبِ ہجراں کا انورؔ غم نہیں کرتے

عمران انصاری •

غزل

مرا دل ہے اور غمِ عشق ہے غمِ عشق سے تو مفر نہیں
میں ہلاکِ تیغِ نظر سہی، پہ اسیرِ زلف و کمر نہیں!

مرے دل کے آئینۂ یقیں پہ غبارِ شام و سحر ہیں
کہ یہ روشنی ہے وہ روشنی جو رہینِ شمس و قمر نہیں

تو جو آج غم سے اداس ہے تو جنوں کی مجھکو بیاس ہے
جسے جام کہتا ہے محتسب وہ یہی تو دیدۂ تر نہیں

تو اسیرِ رسم و رواج ہے، مرا باغیانہ مزاج ہے
یہ جنونِ عشق ہی خام ہے کہ اِدھر تو ہے یہ اُدھر نہیں

میں برائے عشقِ جہاں میں آج سہی کہ خانہ خراب ہوں
مگر ایسے دل میں کہیں بھی ہوں جسے اپنے گھر کی خبر نہیں

شوکت تھانوی

اقربا ہو گئے مرے آگاہ

میں اپنے کو نہایت تنہا محسوس کرتا تھا ایسا تنہا کہ ؎

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

چند ضروری ہی نہیں بلکہ اشد ضروری اعزہ جن میں بیوی اور بچوں کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ قیام پاکستان سے کچھ پہلے ہی بہ پیشگی ہجرت کر کے اس طرف چلے آئے تھے۔ باقی اعزہ یا تو اللہ کو پیارے ہوئے یا ریڈ کلف کو کچھ اس قسم کا حال احباب کا بھی سمجھ لیجئے۔ مگر جس دن سے میں نے موجودہ عہدے کا چارج سنبھالا ہے مجھ کو اپنے خاندان کی وسعت اور حلقۂ احباب کی پہنائیوں کا اندازہ اس شدت سے ہو رہا ہے کہ بعض اوقات تو اپنے ان مرنجان مرنج تعلقات پر چیخیں مار کر رونے کو جی چاہتا ہے دفتر پہنچتے ہی میز پر ڈاک کا ایک انبار نظر آتا ہے۔ جس میں کار آمد خطوط تو خیر کبھی کبھار ہوتے ہیں عموماً لفافہ کھولتے ہی کچھ اسی قسم کے نامہ ہائے محبت نظر آتے ہیں۔

"ارے بھئی! السلام علیکم!

مجھے تو کل عزیزی جمیل میاں سلمہٗ کی زبانی معلوم ہوا کہ تم پاکستان ہی میں ہو اور خدا کے فضل سے آج کل جنرل منیجر ہو گئے ہو میں نے تو تمہارے متعلق ہمیشہ ہر ایک سے یہی کہا کہ اس شخص کی پیشانی پر مجھ کو اقبال مندی چمکتی نظر آ رہی ہے اور یہ شخص کسی نہ کسی دن ضرور حکومت کی کرسی سنبھالے گا۔ چنانچہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ میری بات پوری ہوئی اور میں نے تم کو اس عہدے پر دیکھ لیا۔ اچھا اب مطلب کی بات سنو۔

عزیزی جمیل میاں سلمہ اللہ تعالےٰ انٹرنس کا امتحان دینے والے تھے کہ یہ قیامت برپا ہو گئی اور ہم کو اس طرف آ جانا پڑا۔ ظاہر ہے ان حالات میں ان کی تعلیم تو جاری نہ رہ سکتی تھی۔ مجبوراً سوچا کہ کیا ان کے لئے کوئی مناسب ملازمت ہی مل جائے۔ اب یہ معلوم ہونے کے بعد کہ تم خدا کے فضل سے اس مرتبہ پر ہو مجھ کو یہ فکر باقی نہیں رہی اگر چاہو تو اپنے ہی قلم سے اپنے اس بھتیجے کو دو ڈھائی سو کی ملازمت تم خود دے سکتے ہو میں بہر حال صاحبزادے کو تمہارے پاس بھیجنے کو تلا بیٹھا ہوں اور ان کا بستر گول کر چکا ہوں۔ تمہارا خط آتے ہی روانہ کر دوں گا۔

امید ہے کہ تم مجھ کو بھولے نہ ہو گے ارے بھئی میں وہی اسلم ہوں جو تمہارے چچا زاد بھائی رشید میاں کے ساتھ تم سے لکھنؤ میں مل چکا ہے امید ہے آپ مجھ کو پہچان گئے ہوں گے۔ سب کو سلام و دعا۔

تمہارا خیر طلب
محمد اسلم"

اب آپ ٹاپتے پھریئے کہ یہ کون محمد اسلم ہیں۔ اور یہ کون جمیل میاں سلمہٗ ہیں۔ طرح طرح کی صورتیں ذہن کے پردے پر ابھریں گی اور آخر یہ لفافہ کے اندر ہوتا ہوا ردی کی ٹوکری میں پہنچ جائے گا۔ مگر دماغ کو بھول بھلیاں بنانے کے لئے پھر دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا خط موجود ہے اور ابھی یہ ڈاک ختم بھی نہیں ہوئی کہ چپراسی نے ایک کارڈ لا کر دیدیا۔

"عبدالستار خاں"

یا اللہ یہ کون عبدالستار خاں ہیں ایک عبدالستار خاں وہ تھے جن کے ساتھ ہمارے یہاں کی آیا کی لڑکی نے پہلے تو خود ہی شادی کر لی تھی اس کے بعد اس کی ماں نے تدبر سے کام لیکر بڑی ہنسی خوشی رخصتی کر دی تھی ایک دوسرے عبدالستار خاں وہ تھے جو اجمیر شریف کے عرس میں

جیب کٹ جانے کی وجہ سے ہمارے ہی اخراجات پر لکھنو واپس آئے تھے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون سے عبدالستار خاں ہو سکتے ہیں۔ چپراسی سے پوچھا "کس صورت شکل کے آدمی ہیں؟" وہ بولا "اسے غنیمت سمجھئے سرکار!"

ذرا رعب سے پوچھنا پڑا۔ "غنیمت سے کیا مطلب ہے میں پوچھ رہا ہوں۔ کیا وضع قطع ہے۔ کیا حلیہ ہے۔ کس عمر کے آدمی ہیں؟"

اس نے کہا "کچھ بزرگ ہیں۔ عینک لگائے ہوئے ہیں اچکن پہنے ڈاڑھی چڑھائے ہوئے۔ ٹانگے پر آئے ہیں۔"

کچھ سمجھ میں نہ آیا تو الجھ کر کہا "بھیجو ان کو۔"

اور اب جو چپراسی کے جانے کے بعد چلمن اٹھا کر ایک بزرگ تشریف لائے ہیں تو خدا کی شان نظر آگئی۔ سفید داڑھی مگر بلا کا بانکپن۔ آڑی ترچھی ٹوپی۔ چوڑیدار پاجامہ۔ ریشمی شیروانی۔ جس کی جیب میں گھڑی اور سونے کی زنجیر میں قطب نما۔ آنکھوں میں شوخی اور ان پر سونے کی کمانی کا چشمہ۔ آتے ہی بزرگ محترم نے نعرہ بلند کیا۔

"السلام علیکم۔ نہیں پہچانے ذرا حافظہ پر زور ڈالو۔"

حافظہ پر ایمانداری کے ساتھ پورا زور ڈال کر عرض کیا "کچھ خیال نہیں آتا۔"

عجیب غماز ہنسی ہنس کر ذرا آنکھوں کو مٹکا کر بولے "لکھنو"

اور اس کے بعد وہ تو گردن ہلا رہے تھے اور یہاں یہ عالم کہ حافظہ لکھنو کا ایک ایک محلہ ٹاپتا پھرتا ہے کہ یا اللہ ان کو کہاں دیکھا ہے نخاس میں تو نہیں۔ مگر نہ تو یہ صورت سے چور معلوم ہوتے ہیں کہ چوری کا مال بیچیں نہ کباڑیئے ہو سکتے ہیں یہ چوک؟ ————

نہیں اب ایسے بھی۔ بیچارے نہیں ہو سکتے کہ اس سفید ڈاڑھی اور اس بزرگی کے بعد چوک سے کوئی نسبت رکھتے ہوں۔

ان بزرگ نے مشکل آسان کرتے ہوئے فرمایا "ارے بھئی جھوائی ٹولہ اب تو یاد کر لو۔"

قریب تھا کہ میں نعرہ بلند کرتا کہ "مولانا شمر" مگر فوراً یاد آگیا کہ اول تو ان کا نام عبدالستار خاں ہے دوسرے نہ کبھی ہوتا یہ نام، تو بھی مولانا شمر کا تو انتقال ہو چکا ہے کوئی حکیم تو نہیں یا شاید جھوائی ٹولے کے کوئی عطار ہوں۔ جھوائی ٹولہ میں حکیموں اور عطاروں کے علاوہ بس بھانڈ رہتے ہیں وہ تو نہیں ہو سکتے۔ مگر کیا تعجب کہ بھانڈ اپنی عجیب عجیب صورتیں بنا لیتے ہیں۔ مگر سوال تو یہ تھا کہ بھانڈ ہونے یا نہ ہونے کے متعلق ایک شریف آدمی سے پوچھا کیسے جاتا۔ آخر بہت گھما پھرا کر عرض کیا

"جھوائی ٹولہ میں ایک رہا کرتا تھا فتنہ بھانڈ۔"

وہ بزرگ برجستگی سے بولے "رہتا ہو گا مگر میں وہ بھانڈ نہیں ہوں۔"

اور یہ کہہ کر دیر تک شانے اچکا اچکا کر ہنستے رہے۔ اور پھر یکایک سنجیدہ ہو کر بولے "بھئی ایمان کی بات تو یہ ہے کہ تم کو یاد ہو ہی نہیں سکتا بہت چھوٹے تھے تم بس اتنے سے (ہاتھ کے اشارے سے کوئی ڈھائی فٹ بتایا ہو گا) بھائی صاحب کی انگلی پکڑے آجایا کرتے تھے اور آتے ہی پہلی فرمائش ہوتی تھی کپتان کے کنوئیں کی برفی کی۔ مگر یہ ہے کیا برفی بناتا تھا ظالم۔ ٹنڈے کے کباب اور کپتان کے کنوئیں کی برفی یہ دو چیزیں ایسی چھوٹی ہیں کہ داغ دے گئی ہیں گویا۔"

اب یہ بزرگ محترم تو مزے لے لے کر بھولے ہوئے افسانے یاد کر رہے ہیں اور میں اپنے کو اس کے لئے تیار کر رہا ہوں کہ ان کو ایک قسم کا چچا سمجھ کر ذرا شفقت حاصل کرنے کے لئے سعادت مندی کے ثبوت دوں۔

چنانچہ عرض کیا "کچھ پئیں گے آپ؟"

بڑے پیار سے بولے "پلا دو کوئی تکلف تھوڑی ہے تم سے مگر دیکھو پئیں گے صرف سادہ پانی۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ بھابی صاحبہ"

اور اب وہ آنکھوں سے سوالیہ نشان ٹپکا رہے ہیں۔ اور گردن جنوب اور شمال مسلسل ہل رہی ہے۔

عرض کیا "والدہ صاحبہ کا تو لکھنو ہی میں انتقال ہو چکا تھا والد صاحب کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد ان کی صحت بھی جواب دے گئی۔"

وہ بزرگ بولے "صحت تو ان بیچاری کی ہمیشہ تولہ ماشہ تھی۔"

عرض کیا "نہیں صحت تو ان کی بہت عمدہ تھی۔"

وہ بزرگ گڑبڑا کر بولے "یہی میرا مطلب ہے کہ صحت تو ان کی نہایت عمدہ تھی مگر اس کے باوجود تمہارے ابا جان کا ایک پیر گھر میں اور ایک حکیم صاحب کے مطب میں رہا کرتا تھا۔ مگر صاحب کیا جنتی بیوی تھیں ہماری بھابی بھی جب کبھی معلوم ہو گیا کہ میں باہر آیا ہوں فوراً پان بھیجتیں اور چونکہ

یہ معلوم تھا کہ مجھ کو رساول پسند ہے لہٰذا جب کبھی رساول کہیں سے آجاتے یا خود گھر میں تیار ہو کیا مجال کہ بغیر میرے کسی کے حلق سے تو اتر جائے۔ اس معاملہ میں میرے اور تمہارے والد کے درمیان بڑی لتاڑ گی ہوتی تھی۔"

قطع کلام کر کے عرض کیا "مگر والد صاحب کو تو رساول بے حد ناپسند تھی۔"

وہ بزرگ آنکھیں گول کر کے بولے "ایسی ویسی ناپسند۔ نفرت کہو نفرت، یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ لتاڑ گی اسی بات پر تو ہوتی تھی کہ وہ رساول کی کرتے تھے ذلت اور تحقیر اور میں پڑھتا تھا، اور رساول کو دیکھ کر پھول والی گلی کی بالائی اور تمہاری والدہ کی پکائی ہوئی رس کی کھیر۔ کیا کہنا ہے؟"

سچ پوچھئے تو یہ بات سن کر والدہ صاحبہ مرحومہ سے دل میں ایک شکایت پیدا ہوئی کہ آخر اپنے ہاتھ کی رساول ہمیں کیوں نہ کھلائی کبھی پھول والی گلی کی بالائی کے ساتھ۔ بلکہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا والدہ صاحبہ کو رساول پکاتے کبھی نہ دیکھا کہیں سے آگئی تو مل گئی سب کو ورنہ گھر میں پکتے کبھی نہ دیکھی اور چچا صاحب محترم اسی رساول کی تعریف کے پل باندھ رہے تھے اب تک۔

"تولہ بھر چاول اور ایک گھڑا رس کا۔ برابر کی زعفران اور اعلٰے درجہ کا دودھ۔ باریک کترا ہوا میوہ۔ صاحب میں نے ایسی رساول کبھی نہیں کھائی۔ ایک مرتبہ جناب ہماری بھابی اللہ بخشے ہم سے ناراض ہو گئی تھیں بات یہ ہوئی کہ میں چلا گیا تھا تبدیل ہو کر الٰہ آباد۔ دو مہینے کے بعد مجھ کو لکھنؤ جو آنا ہوا تو شامت اعمال ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ یاد آتو خیر تمہارے لیے ہی نہیں چھ مہینے تک۔ مگر بھابی نے یہ سزا تجویز کی کہ اب کبھی کھیر نہ ملے گی۔ سچ ہے یہ کیا معلوم تھا یہ سزا واقعی سچی ہو گی۔ پھر نہ مل سکی رس کی کھیر مارے سعادت مندی کے پوچھنا ہی پڑا۔" اب تو آپ کسی ہوٹل میں مقیم نہیں ہیں۔"

ایک تبسم کے ساتھ فرمایا "نہیں خیر اب تو گھر ہی یہاں اللہ کے فضل سے مجھے تو اللہ جانتا ہے بیحد مسرت ہوئی یہ سن کر کہ تم اس جگہ پر آگئے ہو میں نے تمہاری چچی سے کہا کہ لو بڑی ہی مبارک ہو کام بن گیا۔ اپنا ہی بچہ اس جگہ پر لگا ہوا ہے۔ وہ بھی ہنس کر بولیں کہ یہ تو وہی ہوا کہ بغل میں بچہ اور شہر میں ڈھنڈورا۔"

والد صاحب کے ملنے والے جو ٹھہرے نہایت ادب سے پوچھنا پڑا "آخر ایسا کون سا کام نکل آیا؟"

جیب میں سے چاندی کی ڈبیہ نکال کر پان کھایا دوسری ڈبیہ دکھا کر پان کی صلاح لی اور پھر ڈبیہ جیب میں رکھتے ہوئے بولے "کام تو کوئی ایسا اہم نہیں ہے مگر ضرورت اس کی تھی کہ کوئی اپنا ہی آدمی ہو جو ذرا سے ہیر پھیر کر سکے۔ بات یہ ہے کہ یوں تو پاس قارون کا خزانہ ہو تو وہ بھی ختم ہو جاتا ہے میرے پاس جس قدر روپیہ تھا اتنے دنوں کی ... بے روزگاری کی نذر ہو گیا۔ اب سوچ رہا تھا کہ جو کچھ تھوڑا بہت باقی ہے اس سے کوئی چلتا ہوا کاروبار ہی کر لیتا۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا محکمہ ٹھیکہ دیتا ہے مختلف قسم کے۔"

یہ موقع تھا کہ جی چاہا کہ کرسی چھوڑ کر بھاگیں جس طرف بھی منہ اٹھ جائے۔ اس جگہ کا چارج لینے کے بعد قسم کھائی تھی کہ کسی کے ساتھ جانبداری رعایت یا بے انصافی نہ کریں گے مگر عجب معاملہ آپڑا تھا اپنے ایک ایسے چچا کا جن کو والدہ صاحبہ اعلیٰ درجہ کی رس کی کھیر دیا کرتی تھیں۔ سوال یہ ہے کہ اب ان سے کیا کہتے اس قسم کے بہت سے لوگوں کو ڈانٹ چکے تھے۔ دفتر سے نکلوا چکے تھے۔ ان کے پیچھے رذیل لے کر دوڑ چکے تھے مگر یہ بزرگ محترم اول تو اس قدر محترم تھے کہ یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور اگر محترم نہ بھی ہوتے تو ان تمام منزلوں سے گذرے ہوئے نظر آتے تھے۔ بڑے جہاندیدہ تھے۔ بلکہ باراں دیدہ۔ وہ مسلسل ارشاد فرما رہے تھے۔

"بس برائے نام رقم لے لی جائے تاکہ ضابطہ کی خانہ پری ہو جائے اور ٹھیکہ مل جائے تم کو نہیں معلوم بیٹے کہ سو: ابر ستاہے اس کاروبار میں تو اس کے لئے بھی تیار ہوں تم میرے ساتھ شرکت کر لو در پردہ۔"

میں نے ایک دم چیخ کر کہا "چچا میاں۔"

اور باہر سے آواز آئی۔ "آ رہا ہوں بیٹے۔"

اور ایک خضر صورت بزرگ بڑبڑاتے ہوئے اندر آگئے "روک رہا تھا چپراسی مجھ کو حالانکہ میں نے اس سے کہا کہ تمہارے صاحب کا چچا ہوں وہ صورت دیکھتے ہی مجھ کو پہچان جائیں گے۔ چنانچہ تم نے چلمن کے اندر ہی سے مجھ کو پہچان کر آواز دی۔ خدا تمہاری عمر میں برکت دے۔ صاحب نصیب کرے اقبال بلند ہو۔"

جیب کٹ جانے کی وجہ سے ہمارے ہی اخراجات پر لکھنؤ واپس آئے تھے کچھ
سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون سے عبدالستار خاں ہو سکتے ہیں۔ چپراسی سے پوچھا
"کس صورت شکل کے آدمی ہیں؟" وہ بولا "انہیں غنیمت سمجھیے سرکار!"
ذرا رعب سے پوچھنا پڑا۔ "غنیمت سے کیا مطلب ہے میں پوچھ رہا
ہوں، کیا وضع قطع ہے۔ کیا حلیہ ہے۔ کس عمر کے آدمی ہیں؟"
اس نے کہا "کچھ بزرگ ہیں۔ عینک لگائے ہوئے ہیں اچکن
پہنے ڈاڑھی چڑھائے ہوئے۔ تانگے پر آئے ہیں۔"
کچھ سمجھ میں نہ آیا تو الجھ کر کہا "بھیج دو ان کو۔"
اور اب جو چپراسی کے جانے کے بعد چلمن اٹھا کر ایک بزرگ تشریف
لاتے ہیں تو خدا کی شان نظر آگئی۔ سفید داڑھی مگر بلا کا بانکپن۔ آڑی
ترچھی ٹوپی۔ چوڑیدار پائجامہ۔ ریشمی شیروانی۔ جس کی جیب میں گھڑی اور
سونے کی زنجیر میں قطب نما۔ آنکھوں میں شوخی اور ان پر سنہرے کی کمانی کا
چشمہ۔ آتے ہی بزرگ محترم نے نعرہ بلند کیا۔
"السلام علیکم۔ نہیں پہچانے ذرا حافظہ پر زور ڈالو۔"
حافظہ پر ایمانداری کے ساتھ پورا زور ڈال کر عرض کیا "کچھ خیال
نہیں آتا۔"
عجیب غماز ہنسی ہنس کر اور آنکھوں کو مٹکا کر بولے "لکھنؤ"
اور اس کے بعد وہ تو گردن ہلا رہے تھے اور یہاں یہ عالم کہ حافظہ
لکھنؤ کا ایک ایک محلہ ٹاپتا پھرتا ہے کہ یا اللہ ان کو کہاں دیکھا ہے نخاس
میں تو نہیں۔ مگر نہ تو یہ صورت سے چور معلوم ہوتے ہیں کہ چوری کا مال
بیچیں نہ کبابئے ہو سکتے ہیں یہ چوک؟ ——————
نہیں اب ایسے بھی۔ بیچارے نہیں ہو سکتے کہ اس سفید ڈاڑھی
اور اس بزرگی کے بعد چوک سے کوئی نسبت رکھتے ہوں۔
ان بزرگ نے مشکل آسان کرتے ہوئے فرمایا "اے بھئی جھوائی
ٹولہ اب تو یاد کر لو۔"
قریب تھا کہ میں نعرہ بلند کرتا کہ "مولانا شرر" مگر فوراً یاد آگیا
کہ اول تو ان کا نام عبدالستار خاں ہے دوسرے نہ بھی ہوتا یہ نام، تو بھی
مولانا شرر کا تو انتقال ہو چکا ہے کوئی حکیم تو نہیں یا شاید جھوائی ٹولے
کوئی عطار ہوں۔ جھوائی ٹولہ میں حکیموں اور عطاروں کے علاوہ بس بھانڈ
رہتے ہیں وہ تو نہیں ہو سکتے۔ مگر کیا تعجب کہ ہوں یہ مسخرے عجیب عجیب
صورتیں بنا لیتے ہیں۔ مگر سوال تو یہ تھا کہ بھانڈ ہونے یا نہ ہونے کے
متعلق ایک شریف آدمی سے پوچھا کیسے جاتا۔ آخر بہت گھما پھرا کر عرض کیا
"جھوائی ٹولہ میں ایک رہا کرتا تھا ننھے بھانڈ۔"
وہ بزرگ برجستگی سے بولے۔ "رہتا ہوگا مگر میں وہ بھانڈ
نہیں ہوں۔"
اور یہ کہہ کر دیر تک شانے اچکا اچکا کر ہنستے رہے۔ اور پھر یکایک
سنجیدہ ہو کر بولے۔ "بھئی ایمان کی بات تو یہ ہے کہ تم کو یاد ہو ہی نہیں سکتا
بہت چھوٹے تھے تم بس اتنے سے (ہاتھ کے اشارے سے کوئی ڈھائی فٹ
بتایا ہوگا) بھائی صاحب کی انگلی پکڑے آیا کرتے تھے اور آتے ہی پہلی
فرمائش ہوتی تھی کپتان کے کنوئیں کی برفی کی۔ مگر ہے ہے کیا برفی بناتا تھا
ظالم۔ ٹنڈے کے کباب اور کپتان کے کنوئیں کی برفی یہ دو چیزیں ایسی
چھوٹی ہیں کہ داغ دے گئی ہیں گویا۔"
اب یہ بزرگ محترم تو مزے لے لے کر بھولے ہوئے افسانے یاد کر رہے
ہیں اور میں اپنے کو اس کے لئے تیار کر رہا ہوں کہ ان کو ایک قسم کا چچا
سمجھ کر ذرا شفقت حاصل کرنے کے لئے سعادت مندی کے ثبوت دوں۔
چنانچہ عرض کیا "کچھ پئیں گے آپ؟"
بڑے پیار سے بولے۔ "پلا دو کوئی تکلف تھوڑی ہے تم سے مگر
دیکھو پئیں گے صرف سادہ پانی۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ بھابی صاحبہ؟"
اور اب وہ آنکھوں سے سوالیہ نشان ٹپکا رہے ہیں۔ اور گردن
جنوب اور شمال مسلسل ہل رہی ہے۔
عرض کیا "والدہ صاحبہ کا تو لکھنؤ ہی میں انتقال ہو چکا تھا
والد صاحب کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد ان کی صحت بھی جواب دے گئی۔"
وہ بزرگ بولے "صحت تو ان بیچاری کی ہمیشہ تولہ ماشہ تھی۔"
عرض کیا "نہیں صحت تو ان کی بہت عمدہ تھی۔"
وہ بزرگ گڑبڑا کر بولے۔ "یہی میرا مطلب ہے کہ صحت تو ان کی نہایت
عمدہ تھی مگر اس کے باوجود تمہارے ابا جان کا ایک پیر گھر میں اور ایک حکیم
صاحب کے مطب میں رہا کرتا تھا۔ مگر صاحب کیا جنتی بیوی تھیں ہماری
بھابی بھی جب کبھی معلوم ہو گیا کہ میں باہر آیا ہوں فوراً پان بھیجتیں اور چونکہ

نہ معلوم تھا کہ مجھ کو رساول پسند ہی نہ تھا جب کبھی رساول کہیں سے آجاتے یا خود گھر میں تیار ہو کیا مجال کہ بغیر میرے کسی کے حلق سے تو اتر جائے ، اس معاملہ میں میرے اور تمہارے والد کے درمیان بڑی لتاڑ ڈگی ہوتی تھی "

قطع کلام کر کے عرض کیا " مگر والد صاحب کو تو رساول بے حد پسند تھی "

وہ بزرگ آنکھیں گول کر کے بولے " ایسی ویسی ناپسند ، نفرت کہو نفرت ، یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ لتاڑ ڈگی اسی بات پر تو ہوتی تھی کہ وہ سلو کی کرتے تھے ذلت اور تحقیر اور میں پڑھتا تھا ، اور رساول کو دیکھ کر پھول والی گلی کی بالائی اور تمہاری والدہ کی پکائی ہوئی رس کی کھیر ۔ کیا کہنا ہے ؟ "

سچ پوچھئے تو یہ بات سن کر والدہ صاحبہ مرحومہ سے دل میں ایک شکایت پیدا ہوئی کہ آخر اپنے ہاتھ کی رساول ہمیں کیوں نہ کھلائی کبھی پھول والی گلی کی بالائی کے ساتھ ۔ بلکہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا والدہ صاحبہ کو رساول پکاتے کبھی نہ دیکھا کہیں سے آگئی تو مل گئی سب کو ورنہ گھر میں پکتے کبھی نہ دیکھی اور چچا صاحب محترم اسی رساول کی تعریف کے پل باندھ رہے تھے اب تک ۔

" تولہ بھر چاول اور ایک گھڑا رس کا ۔ برابر کی زعفران اور اعلیٰ درجہ کا دودھ ۔ باریک کترا ہوا میوہ ۔ صاحب میں نے ایسی رساول کبھی نہیں کھائی ۔ ایک مرتبہ جناب ہماری بھابی اللہ بخشے ہم سے ناراض ہو گئی تھیں بات یہ ہوئی کہ میں چلا گیا تھا تبدیل ہو کر الٰہ آباد ۔ دو مہینے کے بعد مجھ کو لکھنؤ جو آنا ہوا تو شامت اعمال ہوٹل میں ٹھہر گیا ۔ یاد آتو خیر تمہارے لیے ہی نہیں چھ مہینے تک ۔ مگر بھابی نے یہ سزا تجویز کی کہ اب کبھی کھیر نہ ملے گی ۔ ہے ہے یہ کیا معلوم تھا یہ سزا واقعی بھی ہو گی ۔ پھر نہ مل سکی رس کی کھیر " ہمارے سعادت مندی کے پوچھنا ہی پڑا " اب تو آپ کسی ہوٹل میں مقیم نہیں ہیں "

ایک تبسم کے ساتھ فرمایا " نہیں خیر اب تو گھر ہی یہاں اللہ کے فضل سے مجھے تو اللہ جانتا ہے بیحد مسرت ہوئی یہ سن کر کہ تم اس جگہ پر آگئے ہو میں نے تمہاری چچی سے کہا کہ لو بڑی بی مبارک ہو کام بن گیا ۔ اپنا ہی بچہ اس جگہ پر لگا ہوا ہے ۔ وہ بھی ہنس کر بولیں کہ یہ تو وہی ہوا کہ بغل میں بچہ اور شہر میں ڈھنڈورا "

والد صاحب کے ملنے والے جو ٹھہرے نہایت ادب سے پوچھنا پڑا " آخر ایسا کون سا کام نکل آیا ؟ "

جیب میں سے چاندی کی ڈبیہ نکال کر پان کھایا وہ ہی سرڈبیہ دکھا کر پان کی صلاح لی اور پھر ڈبیہ جیب میں رکھتے ہوئے بولے " کام تو کوئی ایسا اہم نہیں ہے مگر ضرورت اس کی تھی کہ کوئی اپنا ہی آدمی ہو جو ذرا سے ہیر پھیر کر سکے ۔ بات یہ ہے کہ یوں تو پاس قارون کا خزانہ ہو تو وہ بھی ختم ہو جاتا ہے میرے پاس جس قدر روپیہ تھا اتنے دنوں کی ... بے روزگاری کی نذر ہو گیا ۔ اب سوچ رہا تھا کہ جو کچھ تھوڑا بہت باقی ہے اس سے کوئی چلتا ہوا کاروبار ہی کر لیتا ۔ مجھے معلوم ہوا کہ تمہارا محکمہ ٹھیکہ دیتا ہے مختلف قسم کے "

یہ موقع تھا کہ جی چاہا کہ کرسی چھوڑ کر بھاگیں جس طرف بھی منہ اٹھ جائے ، اس جگہ کا چارج لینے کے بعد قسم کھائی تھی کہ کسی کے ساتھ جانبداری رعایت یا بے انصافی نہ کریں گے مگر اب معاملہ آپڑا تھا اپنے ایک ایسے چچا کا جن کو والدہ صاحبہ اعلیٰ درجہ کی رس کی کھیر دیا کرتی تھیں ۔ سوال یہ ہے کہ اب ان سے کیا کہتے اس قسم کے بہت سے لوگوں کو ڈانٹ چکے تھے ۔ دفتر سے نکلوا چکے تھے ۔ ان کے پیچھے رول لے کر دوڑ چکے تھے مگر یہ بزرگ محترم اول تو اس قدر محترم تھے کہ یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور اگر محترم نہ بھی ہوتے تو ان تمام منزلوں سے گذرے ہوئے نظر آتے تھے ۔ بڑے جہاندیدہ تھے ۔ بلکہ باراں دیدہ ۔ وہ مسلسل ارشاد فرما رہے تھے ۔

" بس برائے نام رقم لے لی جائے تاکہ ضابطہ کی خانہ پری ہو جائے اور ٹھیکہ مل جائے تم کو نہیں معلوم بیٹے کہ سونا برستا ہے اس کاروبار میں تو اس کے لئے بھی تیار ہوں تم میرے ساتھ شرکت کر لو در پردہ "

میں نے ایک دم چیخ کر کہا " چچا میاں "

اور باہر سے آواز آئی " آرہا ہوں بیٹے "

اور ایک خضر صورت بزرگ بڑبڑاتے ہوئے اندر آگئے " روک لیا تھا چپراسی مجھ کو حالانکہ میں نے اس سے کہا کہ تمہارے صاحب کا چچا ہوں وہ صورت دیکھتے ہی مجھ کو پہچان جائیں گے ۔ چنانچہ تم نے چلمن کے اندر ہی سے مجھ کو پہچان کر آواز دی ۔ خدا تمہاری عمر میں برکت دے ۔ صاحب نصیب کرے اقبال بلند ہو "

اور میں ان کو ابھی پہچاننے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ؎

ایک عمری سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
دوسرے آ گئے کیسے مرے اللہ نئے

کہنہ اپنی عینک کا زاویہ درست کرتے ہوئے چچا نمبر ایک کو پہچان کر بولے "اخاہ عبدالستار خاں۔ تم یہاں بھی موجود ہو۔"

اور عبدالستار خاں نے گویا ٹالنے کے لئے کہا "جی ہاں مولوی صاحب ایک کام تھا مجھکو۔"

مولوی صاحب بولے "کام کیا ہو گا۔ چار سو بیس قسم کا کوئی نیا جال ہو گا۔ مگر میں ان برخوردار کو تمہارے جال میں ہرگز نہ پھنسنے دوں گا۔ ان کے والد میرے ہم جماعت تھے اور میرے بڑے بھائی کے برادر نسبتی کی حقیقی خالہ زاد بہن تھیں ان کی والدہ۔ گویا یہ تو اپنے ہی بچے ہوئے۔ ان کو تو آپ بخش دیجئے اپنے کرتوتوں سے۔"

عبدالستار خاں نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "مولوی صاحب کی باتوں کا خیال نہ کرنا بیٹے۔ میرے اور ان کے کچھ حریفانہ تعلق ہیں مگر مولوی صاحب یہ بات اچھی نہیں ہے۔ میں بھی پٹھان ہوں اور مجھ کو بھی بدلہ لینا آتا ہے۔"

مولوی صاحب نے اپنی لاٹھی بجا کر کہا "بہت دیکھے ہیں ایسے پٹھان جو کچھ تم سے ہو سکے کر لینا۔ اپنی ان حرکتوں کے پیچھے انشاء اللہ جیل کی ہوا کھاؤ گے۔"

میں ان دونوں بزرگوں کو اسی کمرے میں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں آکر ایک میز کے سامنے بیٹھ کر استعفیٰ لکھنے لگا۔ کہ چونکہ میں پاکستان کے ساتھ اقربا نوازی اور خویش پروری کر کے غداری کرنا نہیں چاہتا۔ لہٰذا یہ استعفیٰ پیش کر رہا ہوں۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں میرے بہت سے ضروری اعزا مارے گئے۔ مگر غیر ضروری اعزا چونکہ اب تک زندہ ہیں لہٰذا میں مستعفی ہوتا ہوں، اور اب انتظار ہے اس استعفیٰ کی منظوری کا۔

(بشکریہ "حریم")

بیدل میرٹھی

○

حشر میں جب مرا بیاں ہوگا — نطق وابستۂ زباں ہوگا

آپ کیوں کر ملیں گے محشر میں — آپ ہوں گے تو پاسباں ہوگا

راہ طے کر رہی ہے خود منزل — اب تو منزل پہ کارواں ہوگا

اب تو تم سے لگا ہوا ہے دِل — تم نہ ہوگے تو دل کہاں ہوگا

اُن زمینوں سے غم ٹلے گا کیوں — جن زمینوں پہ آسماں ہوگا

ہے محبت میں ضبطِ غم کی قید — درد ہوگا مگر نہاں ہوگا

فصلِ گل جب بھی آئے گی بیدلؔ
آشیں رنگ گلستاں ہوگا

(زیرِ ترتیب مجموعۂ "خونِ دل" کا ایک ورق) (بشکریہ چراغ راہ)

انجم میرزا

نئی خبر

ایک قریبی عزیز کی مزاج پرسی کے لئے جانا تھا۔ میں نے سوچا کوئی چیز لے چلوں۔ ایک بند دکان کے چبوترے پر ایک آدمی چھابڑی میں بڑے قرینے سے خوب صورت مالٹوں کو سجائے بیٹھا تھا۔ میرے قدم آگے نہ اٹھ سکے۔ چھابڑی کے پاس کھڑے ہو کر میں نے مالٹوں کی خوشنما رنگت سے ایک آسودگی سی محسوس کی۔ انہیں دیکھ کر مجھے خیال گذرا کہ "وہ بیچنے کے لئے نہیں بلکہ نمائشی طور پر سجے ہوئے ہیں۔ میں اس آدمی کی سلیقہ مندی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔" بھئی! تمہیں اپنے کاروبار سے دلی لگاؤ ہے۔ یوں دکانداری میں ایک کشش پیدا کرنے کا گُر ہر ایک نہیں جانتا۔ درجن کا کیا بھاؤ ہے؟"

اس نے تشکر آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "بابو جی چیز خواہ نہ بکے۔ مگر کوئی پھوہڑپن کا طعنہ تو نہیں دے سکتا۔ ایک درجن کے دس آنے لوں گا۔" میں سمجھا مذاق کر رہا ہے۔ یہی خوب صورت مالٹے کسی بڑی دکان پر روپیہ ڈیڑھ روپیہ درجن سے کم قیمت پر کسی حالت میں نہیں مل سکتے۔ ہو سکتا ہے اپنی تعریف کے چند کلمات کے عوض یہ مجھ سے رعایت برت رہا ہو۔ میں نے جیسے اسے نفع نقصان سے آگاہ کرنے کی خاطر کہا۔ "بھئی! میں نے تمہاری تعریف اس لئے نہیں کی کہ تم میری خاطر قیمت خرید سے بھی کم دام وصول کر کے گھاٹے میں رہو۔ جو مناسب دام ہوں لگا لو۔" اور وہ مسکرا کر بولا "بابو صاحب یہ بات نہیں ہے میں جائز منافع کے سوا اور کچھ وصول کرنا نہیں چاہتا۔ آپ کے تعریفی کلمات کی بدولت میں دگنے دام وصول کر سکتا تھا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ آپ ضرور خریدیں گے مگر میں کسی قیمت پر بھی اپنے اصولوں کا دشمن نہیں بن سکتا۔ دس آنے جائز قیمت ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔" مالٹے خرید کر بھی مجھے اس کی باتوں پر یقین نہ آیا تھا۔ "میں خوش تھا کہ آٹھ دس آنے کی بچت ہو گئی ہے۔ اس کی اس حماقت کی یاد کو محفوظ رکھنے کی خاطر چلتے ہوئے میں نے اس کا نام پوچھا۔ میں اس کی اس اصول پرستی کو بے وقوفی سمجھ رہا تھا۔ اس مشینی دور میں جبکہ باپ بیٹا لین دین میں ہیرا پھیری سے باز نہیں رہ سکتے۔ اس کا یہ فعل میری نظر میں قدامت پرستی کی انتہا تھی۔ اس نے اپنا نام بتایا اور میرے کانوں نے جو نئے نئے شگفتہ اور جاذب توجہ نام سنتے رہتے تھے۔ کوئی تاثر قبول نہ کیا محمد شفیع کے نام میں کوئی کشش اور جاذبیت محسوس نہ ہوئی ——

چند دن بعد جالندھر کے ایک مہاجر دوست ارشد کی دکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ شفیع ادھر سے گذرا۔ اس کی چھابڑی میں خوش رنگ تازہ امرود سجے ہوتے تھے۔ چھابڑی دکان کے تختے پر رکھ اس نے سلام کیا اور ارشد بڑی خوش خلقی سے سلام کا جواب دیکر اس کے شب و روز کا حال پوچھنے لگا۔ میں سمجھا تھا کہ مجھے پہچان کر وہ مزید حماقتوں کا ثبوت بہم پہنچانے آیا ہے اور اب میں ارشد کے ساتھ مل کر اس کا خوب مذاق اڑاؤں گا۔ مگر وہ تو ارشد کا کوئی گہرا دوست معلوم ہوتا تھا۔ اس کا مذاق اڑانے کی حسرت دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس نے میری طرف مسکراتی ہوئی نظریں گھما کر پوچھا۔ "بابو جی! بڑے میٹھے امرود ہیں —— ایمانداری کا سودا ہے۔" ارشد بولا "ایک آدھ سیر تول دو۔" امرود واقعی لذیذ تھے۔ مگر قیمت بازار کے لحاظ سے کم تھی۔ چھابڑی اٹھاتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "میاں جی! کوئی تازہ خبر؟" ارشد نے نفی میں سر ہلا دیا اور شفیع کا چہرہ الٹک سا گیا —— اخبار میں تو بہت سی تازہ خبریں تھیں مگر ارشد نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ارشد سے پوچھا "یہ بدھو کون تھا؟" ارشد نے گہرا سانس بھر کر کہا "پہلے یہ شفیع دلال کے نام سے مشہور تھا اور اب یہ صرف شفیع ہے۔" میں اس کی بات کا مفہوم نہ پا سکا یہ کس چیز کی دلالی کرتا تھا۔ ارشد خیالوں میں کہیں کھو گیا تھا۔ یادوں کے دبیز

پھولوں سے ابھرتے ہوئے کہا: "گھوڑوں کا دلال تھا۔ جالندھر میں
اچھی عزت بنی ہوئی تھی۔ سبھی کوچوان اس کے مرید تھے۔ آداب دنیا بدل
گئی ہے۔ زندگی ایک نئے موڑ پر پہنچ کر سوگوار بہاروں کے انتظار میں
تازگی کی کرنیں ڈھونڈ رہی ہے۔ حیات بدلتے ہوئے چہرے خاکوں
میں محبت مندر رنگ بھرنے کی خاطر قوس قزح کی کمان کو چھونے کی
کوشش کر رہی ہے۔" مجھے کچھ تعجب ہوا۔ "عجیب بات ہے۔ گھوڑوں کی دلالی
میں تو کوئی لمحہ جھوٹ اور فریب سے خالی نہیں گزرتا۔ پھر شفیع کا یوں
بدھو بن کر جینا میرے لئے تو ناقابل فہم بات ہے۔" معلوم ہوتا تھا ارشد
کو اس زندگی نے بہت متاثر کیا ہے۔ وہ میرے استعجاب کا رخ موڑنے
کی خاطر بولا۔ "زندگی میں بعض ایسے بھی مقام آتے ہیں جہاں انسان ٹوٹ
گئے سازوں میں ماضی کے گیت ڈھونڈنے کی خاطر انسانیت سے
سمجھوتہ کر لیتا ہے ——— اپنے شہر میں کون یقین کے ساتھ کہہ
سکتا تھا کہ شفیع ایک دن چھابڑی سر پر اٹھائے مارا مارا پھرے گا۔
شفیع تانگہ اسٹینڈ پر بیٹھا سگریٹ کے تمباکو میں چرس ملتے ہوئے جب کسی
کوچوان کے گھوڑے میں کوئی نقص نکالتا تھا۔ تو اس کی بات پتھر پر لکیر بن
جاتی تھی۔ اور اگر آج وہ کسی کو انسان بن کر جینے کا ڈھنگ سکھاتا ہے تو
لوگ اسے بدھو سمجھتے ہیں۔" میں ارشد کی اس چوٹ کو خاموشی سے برداشت
کر گیا۔ میرا اشتیاق بڑھ گیا تھا۔ اور اپنی ناراضگی کا اظہار کر کے ارشد کے
موڈ کو خراب کرنا نہ چاہتا تھا۔ ایک گاہک کے دوکان میں داخل ہونے
پر ارشد اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چند گاہک اور آ گئے اور میں دوکان سے
باہر نکل آیا ——— شفیع کے متعلق سوچتے ہوئے مجھے محسوس ہونے
لگا۔ جیسے اس ہڈیوں کے ڈھانچے میں صدیوں سے کائنات کا چکر لگاتی
ہوئی کوئی بے چین روح چھپ کر بیٹھ گئی ہے۔ جس نے اس کی زندگی کو
ایک ایسی ڈگر پر ڈال دیا ہے۔ جہاں پھبتیوں اور طعنوں کی بھٹی میں انسان
کندن بنتا ہے۔

چند دن کچھ ایسی مصروفیت میں گذرے کہ میں اطمینان سے ارشد
کے پاس بیٹھ کر شفیع کے متعلق مزید معلومات حاصل نہ کر سکا۔ ایک دن
صبح دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلا تو میرے لڑکے جاوید نے بتایا کہ سرکاری
نل کے دائیں طرف ادھ جلے مکان میں جو بھکاری رہا کرتا تھا وہ چل بسا ہے۔
میں نے بڑے غور سے جاوید کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر غم کے ایسے
اثرات تھے جیسے کوئی پیاری چیز کھو گئی ہو۔ ایک بھکاری کی موت پر اسکے
بچے کا سوگوار چہرے کی سوگواری میرے لئے ایک حیران کن بات تھی مجھے
جلدی تھی اس لئے اپنی حیرانی کا جواب حاصل کئے بغیر گلی میں آ گیا
سرکاری نل کے پاس ایک ارتھی بچھی تھی اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا ہوا
شفیع نگاہوں خلاؤں میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ میری حیرت میں اضافہ
ہو گیا۔ نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جس کے تحت میں آگے قدم اٹھانے
سے خود کو معذور سمجھ رہا تھا۔ جب جھک کر بوٹ کا تسمہ کھولنے لگا تو شفیع
کو میری موجودگی کا احساس ہو گیا۔ رندھے ہوئے لہجے میں بولا "شاید آپ
دفتر پہنچنے میں کہیں دیر نہ ہو جائے۔ جنازہ بعد دوپہر اٹھے گا" میں نے
دایاں بوٹ اتار لیا تھا۔ بایاں بوٹ اتارتے ہوئے کہا: "ابھی تو دو گھنٹے
باقی ہے اور پھر ایسے موقعوں پر دیر ہو جانے کی معذرت کر لی جاتی ہے" اس
کے قریب بیٹھ کر میں نے پوچھا۔ "کیا یہ بھکاری آپ کے رشتہ داروں میں
سے ہیں۔؟" "جی ہاں" اس نے گہرا ٹوٹا ہوا سانس بھر کر کہا۔ "انسان
ہونے کی حیثیت سے یہ میرا بڑا بھائی تھا" میں نے تعجب سے کہا "یہ تو
کوئی اہم رشتہ نہ ہوا" "آپ ٹھیک فرماتے ہیں" اس نے دھیمے لہجے میں
کہا: "آپ کو صرف اپنی ذات سے انس ہے اس لئے آپ انسان کی عظمت
کے قائل نہیں۔ آپ اپنی عزت کرانا جانتے ہیں اور دوسروں کی عزت کا
ذرا بھی پاس نہیں۔ آخر کب تک آپ ایسی زندگی گذاریں گے" مجھے اپنے
الفاظ پر ندامت محسوس ہوئی۔ خواہ کچھ بھی ہو اس کی شخصیت نے میرے
دل و دماغ میں ایک گوشہ اپنے لئے محفوظ کر لیا تھا۔ میں اپنی خفت مٹانے
کی خاطر بولا: "میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا ——— دیکھئے نا
ہمارے موجودہ ماحول نے ہمیں کس حد تک بے رحم بنا دیا ہے۔
ہمیں اتنی فرصت ہی نہیں کہ ہمسائے کے ٹھنڈے چولہے کے گرد ابھرتی
ہوئی سسکیوں کے متعلق کچھ سوچ سکیں" شفیع جیسے کچھ مطمئن ہو گیا ہو
اس نے بھکاری کا ذکر چھیڑ دیا: "یہ بھکاری لوگوں کی نظروں میں کتنا
ہی حقیر کیوں نہ ہو مگر میں نے کبھی اسے حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا
اس نے ایک خوشحال گھرانے میں جنم لیا تھا۔ جوانی میں اس کے ہاتھوں
کی ابھری ہوئی مچھلیوں پر دوستوں کو رشک آتا تھا۔ مگر ادھیڑ عمر میں

آزادی کی لگن نے اس کا گھر بار چھین لیا۔ بیوی بچے حالات کے خونی موڑ پر بچھڑ گئے۔ اور یہ تنہا رہ گیا۔ منزل کی منور چوٹیوں کے اولین بوسے کا جنون ہر پھل زندگی کو توڑتا آگے بڑھ رہا تھا۔ تخیلات کی بلوریں محراب پر حسین تتلیاں رقص کر رہی تھیں ــــــ مگر ــــــ یہ ایک ٹھوکر لگنے سے گر پڑا۔ اس نے اٹھنا چاہا۔ اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ منوں بوجھ تلے دب کر رہ گیا ہو۔ اور خوابوں کے گل پوش جزیروں میں ویرانیوں کے بھیانک قہقہے گونجنے لگے۔ اور تخیلات میں حسین تتلیوں کے پر جھلس کر رہ گئے۔ اور مستقبل کے سنہری دریچوں پر کثیف دھویں کے بادل چھا گئے تھے اور اسے اپنی تنہائی کا احساس اذیت ناک لو کے لگانے لگا تھا۔ اس کے اردگرد سوکھے سہمے، ننگ دھڑنگ بچے سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ اور بوسیدہ چیتھڑوں سے دوشیزگی کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی کنواریاں بھیڑیوں کے خونی جبڑوں کے خوف سے کانپ رہی تھیں۔ اور بیکار نوجوانوں کی ذہنی صلاحیتیں فالج کا شکار ہو رہی تھیں اور ان سب کو ذیشان عمارات کے نقشے اور فیشن ایبل لباسوں کی تصویر دکھا کر اور گول گول روٹی کے دائرے بنا کر پرچایا جا رہا تھا ــــــ یہ بھکاری اس لوٹ کھسوٹ کے طوفان میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ لوگ اس کے ساتھ بھکاریوں سے بھی بدتر سلوک کرنے لگے۔ اور یہ اپنے خوابوں کی سنہری تعبیر کے حصول کی خاطر بیکراں خلاؤں میں نظریں الجھاتا رہا۔ اور آج یہ زندگی کے بندھن سے آزاد ہو گیا ہے؟" ــــــ ضبط کے باوجود آنسو میری پلکوں پر لرزنے لگے۔ شفیع کی شخصیت سے متاثر ہو کر یا میری موجودگی کے احساس سے چند اور محلے والے ہمارے پاس آکر بیٹھ گئے

شفیع بولا۔ "بابو صاحب! آپ کو دفتر سے دیر ہو رہی ہے۔ کہیں دیر سے جانے پر جواب طلبی نہ ہو ــــــ" مجھے اچانک انسپکشن کا خیال آگیا اور جنازہ میں شرکت کا یقین دلا کر دفتر چلا آیا۔ انسپکشن پارٹی کے سامنے ریکارڈ پیش کرتے ہوئے میں کچھ اس طرح کام میں کھو گیا تھا کہ چھٹی کے وقت تک مصروفیت ذرا بھی کم نہ ہوئی تھی۔ دفتر سے واپس لوٹا تو شفیع میت کو دفنا کر واپس آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ بہت سے آدمی تھے انہیں میں میرا بڑا لڑکا جاوید بھی تھا۔ اس کی شرکت پر مجھے اچنبھا ہوا اور کھلنڈرا جاوید، ایک نئے روپ میں میرے سامنے تھا۔ اور میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کس جذبے نے اسے ایک لاوارث آدمی کے جنازہ میں شامل ہونے پر مجبور کیا ہے جاوید سے پوچھنا چاہا لیکن نہ جانے کیوں میں ایک کمتری سی محسوس کرنے لگا تھا۔

شفیع سے اب بازار میں گاہے بگاہے سامنا ہو جاتا تھا۔ ارشد نیا مال خریدنے کے لئے باہر گیا ہوا تھا۔ اس لئے شفیع کے متعلق مزید معلومات حاصل نہ ہو سکیں ــــــ ایک دن ارشد کسی کام کے لئے دفتر آگیا۔ میں نے باتوں باتوں میں شفیع کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ ادھوری کہانی کو مکمل کرنے کی خاطر بولا۔ "شفیع نئی امنگوں اور نئے ولولوں کے ساتھ جالندھر کو خیرباد کہہ کر یہاں آیا تھا۔ اس انقلاب نے اسے زندگی کی نئی راہوں سے متعارف کرا دیا تھا۔ گھوڑوں کی دلالی میں اس نے جو ہیرا پھیری کے جتنے جال بچھا رکھے تھے وہ سب ٹوٹ گئے تھے۔ زندگی اب پُرسکون امن اور چین کے مرغزاروں کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ پچھلی زندگی کو اس نے یکسر بدل دیا تھا۔ اب وہ چرس نہ پیتا تھا۔ گھوڑوں میں نقص نکال کر اپنی دلالی وصول کرنے کی ترکیبیں نہ سوچتا تھا۔ بلکہ اب تو وہ ایسی بہاروں کو دائمی بنانا چاہتا تھا جن کے پہلو میں خزاں کی سسکیوں اور نوحوں کا عکس تک نہ جھلملاتا ہو۔ اور اس نے خود کو نئے سانچے میں ڈھال کر دوسروں کو بھی اپنے رنگ میں رنگنے کی مہم شروع کر دی اور یہ جدوجہد اب تک جاری ہے۔"

شام کو بازار میں پنواڑی کی دوکان کے سامنے شفیع کو کھڑے دیکھ کر میں بھی رک گیا۔ وہ دیہاتی پروگرام کی خبریں بڑے انہماک سے سن رہا تھا۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد وہ آہ بھر کر بڑبڑایا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرے سلام کا جواب دیکر اس نے خود فراموشی کے عالم میں پوچھا

"بابو صاحب! کوئی نئی خبر؟" مجھے تعجب ہوا کہ نئی خبریں اس نے ابھی سنی ہیں۔ اب جانے وہ کون سی نئی خبر سننے کا متمنی ہے۔ میں نے کہا "ان کے علاوہ اور کوئی نئی خبر نہیں۔" وہ جیسے خواب سے چونک پڑا ہو "کیا یہ نئی خبریں تھیں؟ ہونہہ۔ آپ ابھی تک سفید قبروں سے لپٹے ہوتے ہیں۔ لیکن جناب! ان کے اندر تو جان لیوا سڑاند پھیلی ہوئی ہے۔" اس کی یہ منطق میری سمجھ میں نہ آسکی۔ وہ میرے ساتھ آگے قدم اٹھاتے

ہوئے بولا۔" میں خود پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ اس لئے دوسروں سے خبریں سننے کا محتاج ہوں۔ مگر لوگ نہ جانے میرے سوال سے کیا مطلب اخذ کرتے ہیں۔ ہمیشہ مجھے ڈکیتی، اغوا اور قتل کی خبریں سنا کر رُخصت کر دیتے ہیں جیسے زندگی کا اب یہی مقصد رہ گیا ہو۔ اگر کوئی آگے بڑھا تو لمبے وار تقریر سننے لگا۔ بابو صاحب! آخر اخباروں کے ورق ایسی ہی خبروں سے سیاہ کیوں ہو رہے ہیں؟" اس سوال پر میرے پاس ایک ہی جواب تھا۔ کہ ہمارا معاشرہ ہی ایسا بن گیا ہے۔ وہ تڑپ اٹھا۔" تو کیا معاشرہ یوں ہی بگڑتا رہے گا؟" میرے پاس اس کا کوئی معقول جواب نہ تھا۔ اس نے پرسوز لہجے میں کہا۔" بابو صاحب! اس معاشرہ کو بدلنا ہوگا۔ ورنہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔" اور کسی انجانی طاقت نے میری شریانوں تک کو جھنجوڑ دیا۔ لیجروں اور ناٹکوں میں رنج کو الجھائے میرا خون منجمد ہو چکا تھا.... مجھے احساس تک نہ رہا تھا کہ میرے اردگرد جو ابتری پھیلی ہوئی ہے اس کا کیا علاج ہو۔ میں سمجھے ہوئے تھا کہ میرا کام دو اور دو چار گننا ہی ہے مجھے اپنے ماحول سے کوئی سروکار نہیں۔ جس طور گذراں ہو رہی ہے بس ٹھیک ہی تو ہے اور اب ایک ان پڑھ انسان مجھے زندگی کا آئین سمجھا رہا تھا۔

ایک شام جب کہ سردی اپنے شباب پر تھی۔ صبح اٹے پڑنے سے برفیلی ہوا سانس تک کو منجمد بنانے پر تلی ہوئی تھی شفیع لاٹھی پکڑے مجھے سڑک کے موڑ پر ملا۔ بادل جھکے ہوئے تھے اور سرکاری بجلی کی زرد بیمار روشنی بڑھتے ہوئے اندھیرے سے خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔" کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" وہ لاٹھی پر بوجھ ڈالتے ہوئے بولا" کرم دین پہریدار چند دنوں سے بیمار ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں یہی نوکری پر گذارہ چلتا ہے۔ اگر یہ آسرا بھی نہ رہے تو نہ جانے اس کا کیا حشر ہو۔ مگر آپ جانتے ہیں۔ مفت میں کون روٹی کھلاتا ہے میں نے سوچا اگر وہ پہرہ دینے نہ آیا تو دوکاندار دوسرا پہرہ دار مقرر کر لیں گے اور اسے جواب مل جائے گا۔ اس لئے اس کی ڈیوٹی دینے آ جاتا ہوں۔" میں نے سردی کا خیال کرتے ہوئے کہا۔" اتنی ٹھنڈ میں کوئی گرم کپڑا تو اوڑھ لیا ہوتا۔" اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں جیسے کچھ چھپانا چاہتا ہو۔ رات کو خوب مینہ برسا تھا۔ صبح کو بستر سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ دفتر میں حاضری بھی ضروری تھی۔ اس لئے مجبوراً لحاف اتارنا پڑا۔ دفتر سے واپسی پر ارشد مل گیا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں مجھے دیکھ کر بچوں کی طرح بلکنے لگا۔" شفیع مر گیا ہے۔" اور مچلے ہوئے لوہے میں سرانگشت ڈبونے سے جو اذیت ہوتی ہے۔ وہ میری پوری زندگی پر طاری ہو گئی تھی۔" شفیع کیوں مرا؟" میری ذہنی کائنات میں ایک زلزلہ سا آگیا! ارشد کے ساتھ میں بھی شفیع کے ٹھکانے پہنچ گیا۔ راستہ میں ارشد نے بتایا۔" رات کو سردی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اور شفیع اس خیال سے کہ ایسی خوفناک راتیں چوروں کی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ دوسرے پہریدار کا مشورہ قبول نہ کرتے ہوئے پہرہ دیتا رہا۔ صبح اسے نمونیہ ہو گیا تھا۔ مجھے بہت دیر بعد خبر ملی۔ جب میں ڈاکٹر کو لے کر پہنچا تو وہ آخری سانس لے رہا تھا۔"———— بہت سے لوگ میت کے چاروں طرف کھڑے تھے۔ جاوید کو ایک طرف بیٹھے دیکھ کر میں اس کے پاس چلا گیا۔ اور وہ مجھے دیکھ کر یوں اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا جیسے اسے میرے بچھڑنے کا شدید احساس ہو گیا ہو۔ میں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔" تمہیں بھی شفیع کی موت سے صدمہ ہوا ہے؟" وہ سسکیاں بھر کر بولا" اباجان! شفیع چچا بہت اچھے آدمی تھے۔ آدھی چھٹی کے وقت ہم ان کی چھابڑی کے اردگرد بیٹھ جاتے تھے اور یہ ایک تو ہمیں بازار سے سستی چیزیں دیتے تھے اور دوسرے ہمیں انسان بن کر زندہ رہنے کا سبق سکھلاتے تھے چھٹی کے بعد یہ کھیل کے میدان میں بھی ہمارے پاس پہنچ جاتے تھے اور وہاں بھی ان کی باتیں ہمیں امن اور سچائی کے راستے دکھاتی تھیں۔ اور اب اس کے الفاظ آنسوؤں میں ڈوب گئے۔ چند لمحوں بعد وہ تڑپ کر بول پڑا۔" اباجان! شفیع چچا ایک یتیم لڑکے انور کی فیس دیا کرتے تھے۔ وہ بہت محنتی اور لائق لڑکا ہے اور اگر اس کی فیس ادا نہ کی گئی تو یقیناً اس کی پڑھائی کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ اباجان: ایک التجا ہے۔ میں آپ سے جیب خرچ کیلئے کچھ نہ مانگا کروں گا۔ آپ صرف انور کی فیس دیدیا کریں۔" میرے سامنے ایک نیا شفیع کھڑا تھا شریر کھلنڈرا اور چٹور جاوید خلاف توقع اتنی جلدی انسانیت کا پورا کورس ختم کر چکا تھا۔ کفن سرکا کر میں نے شفیع کا چہرہ دیکھا اور مجھے اس کے چہرہ پر ایک سوالیہ نشان اُبھرا ہوا نظر آیا۔" بابو صاحب! کوئی نئی خبر؟" اور میرے ہونٹ کانپنے لگے۔" شفیع تم نہیں مر سکتے۔ تمہارے اصولوں کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں۔ تم ہمیشہ زندہ رہو گے۔"

(بشکریہ سوداگر)

نظر خورجوی •

غزل

زمانہ میں جسے دیکھا مسخر ہے نظر اپنا — ستارے اپنے ہیں خورشید اپنا ہی سحر اپنا

سرِ محفل بتِ کمسن نے رخ پھیرا جدھر اپنا — گنوا بیٹھا کوئی پہلو سے دل کوئی جگر اپنا

سرِ منزل گئے بھی اہل ہمت اپنی ہمت سے — مگر تم ہو کہ بیٹھے ڈھونڈتے ہو راہبر اپنا

بنی آدم زمانے میں اگرچہ ذات فانی ہر — عمل سے مستقل اک چھوڑ جاتا ہے اثر اپنا

میں وہ محرومِ قسمت ہوں کہ فصل گل میں بھی اے دوست — نظر آتا نہیں نخلِ تمنا بارور اپنا

کبھی اس کو برا کہنا کبھی اس کو بھلا کہنا — یہی شغل پسندیدہ ہے بس شام و سحر اپنا

مجھے بیکس سمجھنے والے دیکھیں کیا نہیں اپنا — نشیب اپنا فراز اپنا نظامِ خشک و تر اپنا

فلک کا شکوہ کرتے ہیں خزاں کو رونے بیٹھتے ہیں — غرض کٹتا ہر وقت اس دھن میں اکثر بشر اپنا

ملائک نے کبھی سجدہ کیا تھا اس کی عظمت کو — مگر وہ رتبۂ عالی گنوا بیٹھا بشر اپنا

مظالم ڈھالئے چرخِ ستمگر نے بہت اب تک — دکھا دے اے فغانِ دل ذرا تو بھی اثر اپنا

یہاں آئے رہے مہمان بنکر چل دئے ہمدم — ہماری بے کسی دیکھو نہ گھر اپنا نہ در اپنا

مری ہمت سلامت اور سلامت ذوقِ استعداد — وہ ہو گا اور کوئی تھام لیگا جو جگر اپنا

ذرا اس شومئ قسمت کو دیکھو تو کوئی میری — پھرا واپس نہ نامہ لے کے کوئی نامہ بر اپنا

قدم اب راہ میں رکھیں سنبھل کر قافلے والے
لباسِ راہبر میں راہزن آیا نظر اپنا

ابن محمود •

غزل

اور ترکش میں کوئی تیر نظر ہے کہ نہیں
کون جانے کہ ہرا زخم جگر ہے کہ نہیں

دل کے قلزم میں تلاطم تو بلا کا ہے مگر
چشم غمناک صدف گوں میں گہر ہے کہ نہیں

ایک موہوم سی آشا پہ جیے جاتا ہوں
کون جانے شب فرقت کی سحر ہے کہ نہیں

درد و غم سے میں تڑپتا ہوں یہاں تو لیکن
اس ستم کیش کو کچھ میری خبر ہے کہ نہیں

اہلِ ایمان کی تکفیرِ مسلسل کے سوا
شیخ کو یاد کوئی اور ہنر ہے کہ نہیں

راہ دشوار سہی، دور سہی منزل بھی
دیکھ سینے میں ترے عزم سفر ہے کہ نہیں

دیکھ پھر شاخ نشیمن پہ ہے تنکوں کی بہار
آسماں اور کوئی برق و شرر ہے کہ نہیں

نامرادی سے رہوں خاک بسر میں تا کے
میرے یارب مری آہوں میں اثر ہے کہ نہیں

مسرور قریشی •

غزل

کوئی کاش کہدے یہ جاکر کلی سے
کہ دھوکا نہ کھا، گلوں کی ہنسی سے

بہارِ چمن راس آئی نہ مجھ کو
عنادل سبق لیں مری زندگی سے

ہیں کیوں بندشیں آج آوازِ حق پر
یہ شعلے رُکے ہیں کہیں بھی کسی سے

بھیانک اندھیرے سے گھبرا نہ جانا
سحر ہوگی پیدا اسی تیرگی سے

یہ مغموم چہرے پریشاں نگاہیں
پشیماں ہے خود زندگی زندگی سے

مرے کام آیا نہ رہبر نہ رہزن
ملی مجھ کو منزل مری گمرہی سے

محبت میں نامعتبر ہے زمانہ
کبھی راز دل کا نہ کہنا کسی سے

یہ مسرور چھٹ کر رہے گا اندھیرا
کہ آوازِ حق آئی پھر تیرگی سے

فکر تونسوی •

میری یادداشت سے

ان دنوں شاید میں چھٹی یا ساتویں میں پڑھتا تھا۔ ہمارے گاؤں سے ۵۰ میل کے فاصلہ پر کوہ سلیمان کی پہاڑیوں کا طویل سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ جہاں آزاد بلوچی قبائل رہا کرتے تھے۔ گاؤں سے نظر آنے والی نیلی نیلی پہاڑیاں اور لحیم و شحیم بلوچ جو اپنی کمر کے ساتھ ہمیشہ تلوار لٹکائے رہتے ہیں میرے ننھے سے ذہن پر ایک رومانٹک سا اثر قائم کئے ہوئے تھے۔ اور میرے دل میں ہمیشہ یہ معصومانہ سی خواہش رہتی تھی کہ میں ان پہاڑیوں اور بلندیوں کے قریب جاکر انہیں چھوؤں۔ کیونکہ میرے لئے یہ دونوں چیزیں اجنبی تھے۔ حیرت انگیز تھے۔ مسحور کن تھے۔ اور میں ان کے... لمس کی لذتوں سے آشنا ہونا چاہتا تھا!

میرے والد صاحب ان بلوچی قبائل کے درمیان دکان کرتے تھے وہ دوسرے تیسرے مہینے گھر آتے۔ ان کے ساتھ بڑے اونچے اونچے اونٹ ہوتے جو بھیڑوں، اور دنبوں کی اون اور مونگ ماش سے بھرے ہوتے بڑے بڑے بوروں سے لدے پھندے ہوتے۔ میرے والد صاحب بکریوں کی اون سے بنی ہوئی ہمانی بھی اپنی کمر سے باندھ کر لاتے اس ہمانی میں ملکہ وکٹوریہ اور جارج پنجم کی مہر والے چاندی کے روپے بھرے ہوتے ہوتے۔ میں ان سے پوچھا کرتا۔

"بابا کیا بلوچوں کے پاس بہت روپے ہوتے ہیں؟"

والد مسکراتے اور کہتے:۔

"ہاں پتر! ہم بلوچیوں کے ہاں چاہے مٹی بھی جاکر بیچدیں۔ وہ اس کی چاندی بناکر دیدیتے ہیں۔ بہت سیدھے سادے لوگ ہیں وہ"

میں پھر پوچھتا:۔

"بابا! کیا تمہیں بلوچیوں میں رہ کر خوف نہیں آتا۔ سنا ہے وہ تو ذرا ذرا سی بات پر آدمی کا خون کردیتے ہیں؟"

"نہیں۔ جو آدمی ان کے سائے میں چلا جائے۔ وہ اس کے لئے اپنی جان تک لڑا دیتے ہیں۔ تم کہو تو تمہیں بھی لے چلیں، وہاں تمہیں گھی کھلائیں گے۔ گوشت دیں گے۔ ماش کی پھلیاں دیں گے" چلو گے؟

اور پھر آخر ایک صبح کو جب کہ میرے بابا اونٹوں پر سودا سلف لاد کر اپنے قبائلی علاقہ والی دکان کی طرف جانے کے لئے تیار ہوگئے تو ایک اونٹ پر مجھے لاد دیا اور ۲۵ میل کا طویل پیچدار اور دشوار گزار پہاڑی سفر طے کرنے کے بعد ہم ایک اونچے پہاڑی میدان پر جاکر اترے میرے خوابوں اور ارمان کی یہ سرزمین نہایت خشک تھی۔ اداس تھی، سنگین تھی۔ بڑے بڑے بے ڈول پتھروں سے بنے ہوئے ایک جھونپڑے میں میرے بابا کی دکان تھی۔ یہ جھونپڑا انہیں ایک بلوچ سید نے بنوا کر دیا تھا۔ یہ سید صاحب جن کا نام شاید سید نصیر الدین شاہ تھا۔ ارد گرد کے بہت سے بلوچی قبیلوں کے پیر بھی مانے جاتے تھے۔ طب اور حکمت کا پیشہ بھی کرتے تھے۔ کافی مالدار آدمی تھے۔ اور سادہ لوح معصوم بلوچ خدا اور پیغمبر کے بعد تیسرے درجہ پر ان کو مقدس روحانی ہستی تسلیم کرتے تھے۔ چونکہ تھوڑے بہت پڑھے لکھے تھے۔ میرا مطلب ہر نسخہ کے کاغذ پر "ہوالشافی" اور ادویہ کا نام لکھنا جانتے تھے۔ اس لئے ہر بلوچ شاہ جی کے پاؤں چھونا جزو ایمان سمجھتا تھا۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان ہی مقدس و محترم شاہ جی کے زیر سایہ میرے بابا بھی مٹی سے چاندی بنایا کرتے تھے۔ یہ چاندی کس طرح بنتی تھی اس کا علم مجھے وہاں جاکر ہوا۔ سادہ لوح بلوچ سودا سلف لینے کے لئے بھیڑ اور بکری کی اون کے سیر سیر بھر کے گولے بنا کر لاتے تھے۔ فرض کیجئے بلوچ کو نمک کی ڈلیاں خریدنی ہوتیں۔ تو میرے بابا ترازو کے ایک پلڑے میں اون کا گولہ ڈال دیتے اور دوسرے پلڑے میں نمک کے ڈلے برابر تول دیتے۔ (ممکن ہو اس کے باوجود ڈنڈی بھی مارتے ہوں) میں جانتا تھا کہ بابا نمک کے ڈلے من پیچھے فی من کے حساب سے

خرید لاتے ہیں جبکہ اون کے گولے ساڑھے پانچ من کے حساب سے چار بکتے ہیں۔ یہ صریحاً ظلم اور زیادتی تھی اور میں یہ سب کچھ دیکھ کر جی ہی جی میں کڑھا کرتا۔ کیونکہ میرے ذہن پر اسکول کے پڑھے ہوئے اخلاقیات کے سبق مسلط تھے۔ اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ کتابوں کی اخلاقیات اور میرے بابا کی تجارتی اخلاقیات میں دن اور رات کا سا فرق کیوں ہے۔

جب میرے بابا سودا تول رہے ہوتے تو سادہ لوح بلوچ نہایت آسمانی معصومیت کے ساتھ بابا کے کندھے پر اپنی لاٹھی رکھدیتے اور کہتے:-

"لالہ جی! یہ خشک لکڑی تمہارے کندھے پر ہے۔ بھاؤ ٹھیک ٹھیک لگانا نہیں تو خداوند کریم آنکھیں چھین لیتا ہے۔"

اور میرے بابا صرف کاروباری انداز میں مسکرا دیتے۔ مگر میرا سارا بدن کانپ اٹھتا۔ یہاں بلوچیوں کی ایسی سادہ قسم میں کتنی خاموش طاقت ہوگی؟ اس کا تصور آتے ہی میں آنکھیں بند کرلیتا۔ بابا بیس پچیس گنا منافع کما لیتے اور پھر شام کو شاہ جی اپنی مقدس منکوں کی مالا پھیرتے ہوئے دکان پر آتے اور منافع میں سے آدھا حصہ بانٹ کر لے جاتے۔

ہاں، میں یہ کہنا بھول گیا کہ میرے بابا اور شاہ جی میں ایک ملی بھگت تھی۔ دونوں لٹنے والوں میں ایک باہمی معاہدہ ہو چکا تھا۔ بیچارے بلوچ لوگ بیمار پڑتے تو بھاگے بھاگے شاہ جی کے پاس آتے۔ شاہ جی انہیں نسخہ لکھکر دیدیتے۔ بظاہر وہ اللہ کے نام پر مفت تشخیص کیا کرتے تھے مگر نسخہ پر دوائیاں لکھنے کے بعد آخر میں یہ بھی لکھدیا کرتے کہ اس نسخہ کی کتنی قیمت وصول کی جائے۔ یہ نسخہ میرے بابا کے پاس آجاتا۔ اور وہ شاہ جی کی مقرر کی ہوئی رقم بیمار بلوچ سے وصول کر لیتے۔ یہ رقم عام طور پر دوائی کی اصل قیمت سے بارہ گنا زیادہ ہوتی لیکن کبھی کبھار میرے بابا چودہ پندرہ گنا بھی وصول کر لیتے۔ اور مجھے سب سے زیادہ ذہنی کوفت اس وقت ہوتی جبکہ کوئی نسخہ لیکر دکان پر دوائیاں لینے کے لئے آیا کرتا کیونکہ میں نے کتابوں میں پڑھ رکھا تھا کہ طبیب اور بیمار میں باپ اور بیٹے کا سا رشتہ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تو باپ اپنے بیٹے کا خون نچوڑ رہا تھا۔

آخر ایک دن بڑا الجھن زدا واقعہ ہوا۔

اس دن ایک بوڑھا سا بلوچ شاہ جی سے نسخہ لکھوا کر بابا کے پاس آیا۔ بابا نے نسخہ کو دو مرتبہ پڑھنے کے بعد بوڑھے بلوچ سے کہا:

"اے نبو! تیری بڑھیا بیمار ہے؟ مگر تو اس کی دوائی کیسے کرے گا؟ شاہ جی نے تو ایک ایسی دوائی لکھی ہے جو نیچے میدان سے خرید کر لانی پڑے گی اور پھر یہ نہایت مہنگی بھی ہے۔ زعفران خالص لکھا ہے تم اسے خرید نہیں سکو گے؟"

بوڑھے بلوچ نے اپنی ہمیانی میں سے پندرہ روپے نکال کر بابا کے سامنے بکھیر دیئے اور کہا:-

"اپنی بڑھیا کے لئے میں اپنی بکری تک بیچ دوں گا۔ لالہ زعفران کہاں ہے؟"

بابا نے روکھے پن سے جواب دیا۔

"پندرہ روپے سے تو ایک رتی زعفران نہیں آئے گا اور یہاں پانچ رتیاں لکھی ہیں۔ کم سے کم پچھتر روپے چاہیں۔"

بوڑھے بلوچ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ ایک نہایت غریب مزارعہ تھا۔ اس کے پاس صرف ایک بکری تھی۔ اور پچھتر روپے وہ قیامت تک بھی اکٹھے نہیں کر سکتا تھا۔ بکری بیچ کر بھی نہیں کیونکہ بکری بیس روپے سے زیادہ نہیں بک سکتی تھی۔ چنانچہ بوڑھا بلوچ میرے بابا کے پاؤں پر گر گیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اور وہ گڑگڑا کر کہنے لگا:-

"خدا اور رسول کے لئے، اپنے بھگوان پرماتما کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ میں اپنی بکری بھی کھول کر تمہیں لا دوں گا۔ مجھے زعفران دیدو۔ میرے پاس اس سے زیادہ ایک کوڑی تک نہیں ہے۔"

مگر بابا تو شاہ جی کے حکم کی تعمیل کے پابند تھے۔ رحم ان میں کہاں سے پیدا ہوتا۔ نہایت درشت لہجہ میں بولے:-

"میں مجبور ہوں نبو خان۔ زعفران لانے کے لئے مجھے آج رات کو گھوڑا دوڑا کر تیس میل نیچے میدان میں جانا پڑے گا ——— اور نقد، پہلے دیکر ہی دوائی لانی پڑے گی۔ تم شام تک ان روپیوں کا بندوبست کر لاؤ۔ تو میں زعفران لا دوں گا۔"

بوڑھے نے لاکھ منت سماجت کی اور ایک مرتبہ تو اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر قسم کھائی کہ :-

"لالہ ! مجھے تمہارے بیٹے کی قسم ہے کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میری بڑھیا بیوی کو بچالو۔ ورنہ میرے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے رُل جائیں گے :

لیکن بابا کا دل نہ پسیجا۔ بوڑھے نے شاہ جی کی خوشامد بھی کی مگر شاہ جی اور میرے بابا کا دل شاید ایک ہی پتھر کا بنا ہوا تھا۔

چار و ناچار بوڑھا بلوچ شام تک آنے کا وعدہ کرکے ناکام لوٹ گیا اور اس کے جاتے ہی میرا سارا جسم غصہ سے سلگنے لگا کیونکہ میں جانتا تھا کہ سامنے ٹین کے ایک چھوٹے سے ڈبے پر زعفران لکھا ہوا ہے اور یہ بھی جانتا تھا کہ بابا خالص زعفران بالکل نہیں بیچتے ہیں اور معمولی کیسر کی ۵ رتیاں زیادہ سے زیادہ روپیہ ڈیڑھ روپیہ میں آجاتی ہیں لیکن سب سے زیادہ دردناک اور کرب انگیز پہلو یہ تھا کہ ہمارے بوڑھے بلوچ کی بیوی مر رہی تھی، اس کی گڑگڑاہٹ اور آنسوؤں نے مجھے حد درجہ بے چین کر دیا تھا !

دو اڑھائی گھنٹے کے بعد ایک نوجوان بلوچ غلامان جو میرا دوست بن گیا تھا اور مجھ سے الف بے تے سیکھا کرتا تھا۔ میرے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ ہنوخاں ساٹھ روپے میں اپنا بڑا لڑکا قبیلے کے بڑے خان کے پاس سال بھر کے لئے غلام بننے کے لئے دے رہا تھا مگر بڑے خان نے بیس روپے سے زیادہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔

اس بات نے میرے دل کو انتہائی اداس کر دیا اور میں نے بابا سے بغاوت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بابا اس وقت نیچے چشمہ پر پانی بھرنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ دکان میری تحویل میں تھی، میں نے انتہائی جرأت سے کام لیکر زعفران کا ڈبہ اٹھایا۔ اس میں سے ۵ رتی تول کر ایک پڑیا باندھی اور بوڑھے ہنوخاں کی جھونپڑی کی طرف چل دیا۔

اس کی جھونپڑی ایک اونچی پہاڑی پر تھی۔ میں چڑھتے چڑھتے ہانپ گیا۔ مگر میرے اندر جیسے کوئی انجن سا دھک رہا تھا جو مجھے کشاں کشاں اوپر ہی اوپر لئے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر دیکھ بھی لیتا کہ کہیں بابا میرا تعاقب نہ کر رہے ہوں۔ ادھر میرے ذہن میں بوڑھے ہنوخاں کی گڑگڑاہٹ گونج جاتی۔

"رحم کرو میرے بال بچوں پر رحم کرو۔ بابا مجھے زعفران دو"

بمشکل تمام میں ہنوخاں کی جھونپڑی کے قریب پہنچا ——

ہنوخاں اپنی بیمار بڑھیا کو اپنی گود میں رکھے زار و قطار رو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لپک کر نیچے اترا۔ مجھے اپنی گود میں اٹھا لیا۔ میں نے زعفران کی پڑیا اس کے سرد اور سخت ہاتھوں میں تھما دی۔ اور کہتے ہوئے ....

"لو ہنوخاں : اسے گھول کر بڑھیا کو پلا دو"

لیکن آج مجھے جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی یاد آتا ہے کہ جرم کے شدید احساس سے میں دن بھر بابا کی دکان پر بھی نہیں گیا تھا۔ اور بابا نے دوسرے دن ہنوخاں کے گھر سے مجھے برآمد کیا تھا۔ اور شاہ جی نے ہنوخاں کو اور میرے بابا نے مجھ کو لاٹھیوں سے بری طرح پیٹا تھا۔ اور یہ بھی یاد آتا ہے کہ آخری عمر میں میرے بابا کی آنکھیں بھگوان نے چھین لی تھیں۔ اور وہ کسی سادہ دل بلوچ کی دی ہوئی لاٹھی کے سہارے چلا کرتے تھے۔

(بشکریہ "آئینہ" دہلی)

التماس ہے کہ.....

● اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا پورا پتہ لکھنا نہ بھولئے بغیر پتے کے کوئی نگارش قابل قبول نہ ہوگی۔

● ادارہ "مشیر" ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کا ذمہ دار نہیں ہے اس لئے مضامین وغیرہ بھیجنے سے پہلے ان کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں ——

● جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور بھیجئے۔

● خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

(مینیجر)

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے (مینیجر)

March, 1956 Phone 7923 Regd. No. S. 1375
Monthly "MUSHIR" Karachi

Printed at Mashhoor Press, McLeod Road, Karachi.

مئی جون

۱۹۵۲ء

ساون کی مدھری فضاؤں میں
یہ
جوانی کی امنگیں اور
خوشی کے جھولے
فیملن
کے شکر گزار ہیں
فیملن عورتوں کے لئے ایک مخصوص جنرل ٹانک ہے عورتوں کی صحت اور
اور تندرستی کا بہترین ضامن ہے
حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی سے طلب کیجئے

بچت بڑھانے کی سہل تدبیریں

آپ کو فائدے سے روپیہ لگانے کے لئے بڑے سرمائے کی ضرورت نہیں۔ صرف ذرا دانشمندی سے کام لینے اور بچت کا عہد کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ کی بچت کتنی ہی تھوڑی ہو آپ اس کو اس طرح جمع کر سکتے ہیں کہ آپ کو بھی پورا پورا فائدہ ہو اور آپ کے ملک کو بھی۔ ذیل میں جو تدابیر بیان کی گئی ہیں ان سے بہتر طریقہ اپنے مستقبل کو محفوظ کرنے کا کوئی نہیں ہو سکتا سب سمجھدار اور روشن خیال لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

سیونگز سرٹیفکیٹ

یہ ہر درجے کی آمدنی رکھنے والے لوگوں کے لئے روپیہ لگانے کی بہترین مد ہے۔ ۵ روپے سے لیکر ۲۵ ہزار تک جتنی رقم چاہے لگائیے (مشترک طور پر ۵۰ ہزار تک)۔ نفع ۲ء۴ فیصدی۔ انکم ٹیکس معاف۔ دس برس میں دس روپے کے ۱۴ روپے ۳۰ بن جاتے ہیں مع منافع ایک سال بعد بھنائے جا سکتے ہیں۔

ڈاک خانے کا سیونگز بینک

کم عرصے کے لئے بچت کا بہترین ذریعہ۔ طریقہ کار سہل۔ بچت محفوظ چاہے ایک وقت میں ایک ہی روپیہ جمع کریں۔ ۲½ سے ۳ فیصدی تک منافع۔ انکم ٹیکس سے بری۔ مشترک حساب، تنہا یا مشترک میعادی حساب نیز کئی قسم کے دیگر حسابات کھولے جا سکتے ہیں۔ پاکستان کے طول و عرض میں ۴،۵۰۰ سے زائد شاخیں۔

ڈاک خانے کی بیمہ پالیسی

طویل عرصے کی بچت کا عمدہ ذریعہ۔ حکومت ضامن ہے۔ سرکاری و نیم سرکاری اداروں (مع بری، بحری فوج) کے ملازمین فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ زندگی کا بیمہ، شادی اور تعلیم کے لئے خاص بیمے قلیل اقساط، کثیر منافع، مستقبل کی حفاظت کا بہترین ذریعہ۔

بچت کے ٹکٹ

بچت کے ٹکٹ خریدنا بچوں کے لئے عمدہ تفریحی مشغلہ بھی ہے اور ان میں بچت کی عادت ڈالنے اور ان کے مستقبل کے لئے روپیہ بچانے کا بہترین ذریعہ بھی۔ ۴ آنے، ۸ آنے یا ایک روپے کے سیونگ اسٹامپ ڈاک خانے سے خریدے جا سکتے ہیں۔ ان کو جمع کر کے ۵ روپے یا ۱۰ روپے والے سیونگ سرٹیفکیٹوں میں تبدیل کرایا جا سکتا ہے۔ ٹکٹ چپکانے کے لئے کارڈ مفت ملتے ہیں۔

اپنی بچت بڑھائیے۔ اپنے اور اہل و عیال کے مستقبل کی طرف سے اطمینان حاصل کیجئے اور قومی تعمیر و ترقی میں مدد دینے کے لئے روپیہ بچانے کی ان سہل صورتوں سے فائدہ اٹھائیے

بچائیے، نفع کمائیے، بیمہ کرائیے اور خوش رہیے

AFP 38/56 UNITED

تعمیری ادب کا ڈائجسٹ

(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ماہنامہ مُشیر کراچی

ٹیلیفون : ۷۹۲۳

مئی - و - جون ۱۹۵۶ء

جلد : ۷

شمارہ : ۵، ۶

مرتبہ :
عبدالغفور بیگ

بدل اشتراک : فی پرچہ : آٹھ آنے

سالانہ : پانچ روپے

بھارت میں ترسیلِ زر کا پتہ :

پندرہ روزہ "الحسنات" رام پور (یو-پی) بھارت

ترتیب

(پرنٹر و پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ مشیر مندر روڈ۔ کراچی ۳ سے شائع کیا) کتبہ عابد سعید خوشنویس کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۰

گزارشِ احوالِ واقعی

مئی اور جون ۱۹۵۶ء کا مشترکہ شمارہ حاضر ہے۔ یہ شمارہ کسی پلان کے تحت نہیں بلکہ مجبوری کے تحت نکالا جا رہا ہے۔

ہماری مجبوری یہ تھی کہ تمام مراحل طے کرکے جب ہم "کاغذی مرحلہ" میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ نیوز پرنٹ "نایاب" ہے — اور اس کا حصول "کوہ کنی" سے کم نہیں —— چنانچہ ہم نے "کوہ کنی" شروع کی اور اس "کوہ" میں سے "طویل مدت اور عظیم مشقت" کے بعد جو کچھ ہاتھ لگا، اس سے مئی اور جون کے مشترکہ شمارہ کی اشاعت کا بندوبست کیا۔

ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام ہماری اس مجبوری کا لحاظ رکھتے ہوئے اس شمارہ کو قبول فرمائیں گے، جو کچھ کمی محسوس ہوتی ہے وہ انشاءاللہ آئندہ شماروں میں پوری کردی جائے گی۔

نیوز پرنٹ کے سلسلہ میں اتنا ہی کہدینا کافی نہیں کہ وہ "نایاب" ہے۔ اس صورت حال کو بدلنے کے لئے حکومت پاکستان کو فوری توجہ دینی چاہیئے ورنہ ہمیں اندیشہ ہے کہ بہت سے رسائل و جرائد بند ہوجائیں گے —— اور پاکستان میں رسائل و جرائد کی تعداد دیگر ممالک کے مقابلے میں پہلے ہی سے کم ہے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ انجمن ادبی رسائل پاکستان کی طرف سے کئی وفود ارباب اختیار کی خدمت میں بھیجے گئے، اور انھوں نے ان وفود سے اپنی گہری ہمدردیوں کا اظہار کیا مگر ابھی تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوسکا۔

خدا کرے کہ نیوز پرنٹ کا مسئلہ آئندہ شمارہ تک حل ہوجائے ورنہ کم صفحات کے مشترکہ شماروں ہی پر اکتفا کرنی پڑے گی۔

چودہری علی احمد خاں مرحوم

چودہری علی احمد خاں کو "مرحوم" لکھتے ہوئے انتہائی دکھ ہوتا ہے، ان کا مسکراتا ہوا چہرہ اور ان کی متحرک زندگی جب یاد آتی ہے تو یقین نہیں آتا کہ وہ اس دار فانی سے کوچ کرچکے ہیں۔ بہرحال حقیقت حقیقت ہوتی ہے اور اس حقیقت سے مفر نہیں کہ وہ آج ہم میں نہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

چودہری صاحب پولیس کے آدمی تھے لیکن دل کے اعتبار سے پولیس والے نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تحریک اسلامی سے متاثر ہوکر ملازمت ترک کردی اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت بہت جلد اس تحریک کی صف اول میں پہنچ گئے۔

چودہری صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اشتراکیت وغیرہ کے موضوعات پر انہوں نے کئی پمفلٹ لکھے ہیں۔ ان کا مشاہدہ بھی خاصہ تھا مشرقی پاکستان کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی خدمات کا اجر عظیم عطا کرے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل۔ آمین ۰

نعیم صدیقی

ایک رفیق اور بچھڑ گیا

(چودھری علی احمد خاں صاحب مرحوم کے انتقال پر)

چلے وہ غنچوں کی مانند مسکرا کے چلے — پر، اپنے چاہنے والوں کو خوں رلا کے چلے

بچاری عمرِ گریزاں کھڑی رہی مبہوت — گلے سے موت کو ہنستے ہوئے لگا کے چلے

دیارِ یار کو جانا تھا ـــ رازدارانہ — ارادہ اور تھا، کچھ اور ہی بتا کے چلے

ابھی تو آئے تھے، رختِ سفر کھلا بھی نہ تھا — پلک جھپکنے میں رختِ سفر اٹھا کے چلے

ہوا کے دوش پہ آئے، رواں دواں آئے — برس کے زور سے مانند اک گھٹا کے چلے

تمہاری طرح جھکا دے جو سر حضورِ خدا — بتوں کے سامنے لازم ہے سر اٹھا کے چلے

خود اپنے گھر کو تو ویرانہ کر گئے لیکن ـــ — جہانِ قلب و نظر اک نیا بسا کے چلے

تمہاری چاہ بنی یادگار جن کے لئے !! — انہی رفیقوں کی چاہت کو خود بھلا کے چلے

ہمارے حصے میں جاں کاہ زخم آتے رہے — فلک سے جب بھی کبھی تیر کچھ قضا کے چلے

کہاں کا عزم ہے؟ نظریں پھری پھری کیوں ہیں — کدھر کا رخ ہے کہ آنکھیں چرا چرا کے چلے

گلوں کے سینے ہیں زخمی، کہیں نہ دکھ جائیں — کہو صبا سے کہ دامن بچا بچا کے چلے

پکار دو کہ اٹھی ہے شہید کی میت — زمانہ پیچھے چلے، اور سر جھکا کے چلے

اک اک نفس کو رہِ عاشقی میں کر کے نثار — تم اہلِ دل کا سا جینا ہمیں سکھا کے چلے

رہِ عدم میں بھی یاروں کو پیچھے چھوڑ دیا !! — جدھر چلے سو قدم عزم کا بڑھا کے چلے

ابھی نہ جاؤ کہ تکمیلِ کار باقی ہے — ابھی کہاں بھلا قانون یاں خدا کے چلے

ترے جنازے پہ نظریں ہیں دونوں خطوں کی — زمینِ پاک کے دونوں سرے ملا کے چلے

سحر کی پہلی کرن کے ظہور کرنے تک — تمام رات اندھیروں سے جاں لڑا کے چلے

دعا کے پھول چڑھانے کو آئے ہیں احباب — چراغِ اشک کنارِ لحد جلا کے چلے

جھٹک دیا سرِ داماں سے گردِ دنیا کو

مبارک! اپنے لئے عاقبت بنا کے چلے

(بشکریہ ایشیا)

محشر رسول نگری

مثنوی صحیفۂ فطرت کا ایک ورق

"مقصدِ ہستی"

کوئی جس کا مقصدِ ہستی نہ ہو
کیوں وہ صیدِ ذلت و پستی نہ ہو

دل وہ کیسا جس کا دلبر ہی نہیں
قوم وہ کیا جس کا محور ہی نہیں

ہو اگر فکر و عمل میں انتشار
باغِ ہستی میں نہیں آتی بہار

سوچ تو بھی کیا ہے تیرا منتہا
کیا ہے تیری زندگی کا مدعا

مقصدِ ہستی رضائے دوست ہو
مغزِ ایماں ہے یہ باقی پوست ہے

ارتقائے زندگی کی حد نہیں
خودگری، خودآگہی کی حد نہیں

شرط یہ ہے، جو ترا مقصود ہو
ارفع و اعلیٰ ہو، نامحدود ہو

جز رضائے حق ذرا یہ تو بتا
کو لسا مقصود ہے لا انتہا

ہے فقط ذاتِ خدا ہی لایزال
نقش بندِ حسن ہے جس کا جمال

ایسی ہستی ہو اگر مسجودِ عشق
ہو رضا اس کی اگر مقصودِ عشق

کوئی حدِ ارتقا رہتی نہیں
خودگری کی انتہا رہتی نہیں

زندگی کے اور بھی مقصود ہیں
آب و گل کے سینکڑوں معبود ہیں

سب کے سب لیکن فنا انجام ہیں
سب کے سب نخچیرِ صبح و شام ہیں

ایسے مقصد کا بھلا کیا اعتبار
جس کی ہو بنیاد ہی ناپائیدار

مصلحت جس کی بدلتی ہی رہے
سائے کی مانند ڈھلتی ہی رہے

ہے جُدا اہلِ رضا کی مصلحت
ان کا محور ہے خدا کی مصلحت

جس کی ذاتِ پاک بے تغیر ہے
علم جس کا خالقِ تقدیر ہے

ہوں نہ مستحکم جب اقدارِ حیات
زندگانی پا نہیں سکتی ثبات

نقطۂ مرکز نہیں جس کا رضا
مادیت ہے فقط جس کی بنا

وہ نظامِ اجتماعیت ہے خام
اس کو حاصل ہو نہیں سکتا دوام

مادیت پر ہو جن کا اتحاد
ان کے ٹکراتے ہیں آپس میں مفاد

یہ تضادِ باہمی ہے وجہِ شر
اس سے ہوتا ہے فسادِ بحر و بر

ختم اس سے آدمیت کا وقار

اس سے دامانِ اخوت تار تار

اقتدارِ حضرت خالدؓ کو دیکھ

انکسارِ حضرتِ خالدؓ کو دیکھ

گو خدا کی سیف تھا وہ شیر نر

جھک گیا امرِ خلافت پر مگر

اس کا باعث تھا یہی اے ہمنوا

تھی وہاں پیشِ نظر حق کی رضا

مادیت پر اگر ہوتا مدار

پھیل جاتا مومنوں میں انتشار

کیوں نہ ان اقدار کو اپنائیں ہم

جامۂ کردار انھیں پہنائیں ہم

جن کی بنیادیں ہوں اتنی پائدار

ہو سکے تعمیر قصرِ اعتبار

اے مسلماں دیکھ حق کے واردات

ہو رضا جب تک نہ مقصودِ حیات

زندگانی جاوداں ہوتی نہیں

جوئے ہستی بیکراں ہوتی نہیں

مقصدِ محدود لیکر جو بڑھا

ایک حد پر جا کے آخر رُک گیا

جس کا مقصد ہو مگر حق کی رضا

بیکراں ہوتا ہے اُس کا ارتقا

بندۂ عشق و رضا کی حد نہیں

صاحبِ توحید "لَمْ یُوْلَدْ" نہیں

ہیں رضا آگاہ جو حق دستگاہ

چاند اور تارے ہیں ان کی گردِ راہ

زندگی کرتی ہے خود ان کا طواف

چومتا ہے ان کو کعبے کا غلاف

اُن کی ہستی آستانِ کبریا

اُن کی مستی رازدانِ کبریا!

نقطۂ پرکارِ حق اُن کا وجود

پردۂ اسرارِ حق اُن کا وجود

عبد ہیں اور مظہرِ معبود ہیں

آپ اپنی منزلِ مقصود ہیں

سحاب القادری شکیب •

غمِ آرزو یا غمِ امروز

"شیر" (کراچی) کے روحِ انتخاب نمبر (بابت جنوری سنہ ۵۵ء) میں جس وقت میری نظر سے افتخار اعظمی کی نظم "غمِ آرزو" گزری تو اس وقت میرے ذہن میں ورڈز ورتھ اور شیلی کی نظموں کا..... "Stanzas written in early Spring" اور "Ode to the west wind" کا تصور آیا۔ ورڈز ورتھ پھولوں کے کنج میں بیٹھتا ہے، اس کے کان جس وقت طائرانِ نغمہ سنج کی نغمہ پردازیوں سے آشنا ہوتے ہیں تو اسے کل بنی نوعِ انسانی کا خیال آتا ہے اس کی نظروں کے سامنے "انسانی غم و آلام رقص کرنے لگتے ہیں اور وہ بیساختہ پکار اٹھتا ہے... کہ "انسان نے انسان کے ساتھ کیا کیا ہے؟" یہ ایک ایسا سوال تھا، جسکا جواب نفی کے سوا اور کچھ نہیں تھا کیونکہ اس کی نگاہیں انقلاب فرانس کا خونیں اور المناک منظر دیکھ چکی تھیں، اسکے ذہن سے قتل و غارت گری کے نقوش کبھی محو نہ ہو سکے۔ اور یہی سبب تھا کہ اس کے لئے لمحۂ نشاط بھی ساعتِ غم بن گیا۔ انسانی فلاح و بہبود کے اسی جذبے نے اسے ایک فلسفۂ حیات ترتیب دینے پر مجبور کیا۔

شیلی Shelley کی نظم "Ode to the west wind" بھی ایسے ہی افکار کی صدائے بازگشت ہے جس نے اپنے اندر شدت اور زور کی تمام کیفیات سمو لی ہیں۔ اس نظم سے شیلی کے داخلی جذبات کا اندازہ ہوتا ہے اس نے بھی اپنے خیالات کا سرچشمہ فطرت ہی کو بنایا ہے لیکن اسکے ایسے پہلو کو اپنا موضوعِ سخن قرار دیا ہے جو بظاہر اپنی ہولناکی کے اعتبار سے چنداں قابلِ اعتنا نہیں معلوم ہوتا لیکن شیلی کے ذہین شاعر کو کیا کہیے! اس کی... نکتہ رس نگاہوں نے بادِ خزاں میں بھی ایک حسن دیکھا اور اسکے قلب نے اس کے اندر بھی ایک کشش محسوس کی۔ وہ اسے موسمِ بہار کا پیغامبر کہتا ہے اور فصلِ گل کی آمد کا اسی کا رہینِ منت قرار دیتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ بادِ خزاں کے دوش پر برگ و سحاب کے قافلے چلے جا رہے ہیں۔ اور سمندر کی خاموش لہروں میں ایک شورش، ایک تلاطم اور ایک ہیجان برپا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے دل میں حصولِ قوت کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ بادِ خزاں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے

"کاش میں ایک برگِ مردہ ہوتا تو مجھے تو
اپنے ساتھ لیجا سکتی، کاش میں تیرے ساتھ پرواز
کرنے کے لئے ایک تیز رو بادل ہوتا، اور کاش میں
تیری طاقت محسوس کرنے کے لئے ایک لہر ہوتا"

شیلی کی یہ باتیں زندگی کے ایک حرکی تصور (Dynamic Conception) کی نشاندہی کرتی ہیں۔ بادِ خزاں اس کے یہاں جہدِ حیات، کاوشِ پیہم، سعیِ مسلسل اور قوت و جلال کی ایک علامت (Symbol) ہے۔ وہ بادِ خزاں کی روح کو جذب کرنا چاہتا ہے اور اس سے وہ یہ درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کے پچھڑے ہوئے خیالات کو ان مرجھائی ہوئی پتوں کی طرح کائنات میں بکھیر دے جو خاکِ چمن کی تہ میں دبی پڑی رہتی ہیں۔ اور پھر موسمِ بہار میں سبزہ و گل کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں۔ وہ اس سے یہ کہتا ہے کہ وہ اسکے پرمعنی الفاظ کو انسانیت کے سامنے ان شراروں کی طرح منتشر کر دے جنکا تعلق ایک دشتِ آتشکدے سے ہے آخر میں وہ ہمیں ناامید نہیں کرتا بلکہ ایک رجائیت آمیز پیغام دیتا ہوا گزر جاتا ہے:-

If winter comes, can Spring be far behind?

یہ بالکل صحیح ہے کہ اس نے ہمارے سامنے کوئی معین فلسفۂ حیات نہیں پیش کیا ہے اور کوئی طریق زندگی نہیں بتایا ہے لیکن بہرحال اسے زندگی کا ناقد تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ اس نے خود کشاکش حیات کا مقابلہ کیا، اس نے زندگی سے چند سبق سیکھے، دلشکن تجربات نے اس کے جذبات کو سرد نہیں کیا بلکہ انھوں نے اسکے اندر عزم حیات پیدا کیا۔ ان ہی تمام محرکات کیوجہ سے اسکے اندر انقلاب کی تمنا بیدار ہوئی۔ اور یہ تمنا ہمیں تقریباً اس کی ہر نظم میں ملیگی۔ وہ ایک ایسی دنیا کا آرزومند نظر آتا ہے، جہاں انسان آزاد ہو، خوش ہو، بندہ و آقا کی تمیز نہ ہو۔ اور وہ صحیح معنوں میں انسان ہو۔ ایک فنکار سوائے اس کے اور کیا کر سکتا ہے کہ زندگی کے امکانات کو روشن کرے۔ فن کسی نظریۂ حیات کی آفاقی قدروں کے تحفظ سے قطعاً سبکدوش نہیں ہو سکتا لیکن اس سے یہ مطالبہ بے جا ہے کہ وہ پارٹی پروگرام یا سیاسی پالیسی کو واضح کرے فن اقدارِ حیات کا ضرور ذمہ دار ہے لیکن نفاذِ اقدار حیات کے طریقے بتانا اس کے لئے ممکن نہیں۔ میں ادب میں نظریے کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا۔ سیاست سے بھی ادب بے نیاز نہیں ہو سکتا لیکن اسے پارٹی پالیٹکس کا شکار نہیں ہونا چاہئے ورنہ وہ اسی طرح زوال پذیر ہوگا جس طرح روس میں ہوا۔ اقبال کا فن اسلئے زندہ ہے کہ اس نے قدروں کو مرکز فکر و نظر بنایا۔ اس نے نظریۂ اسلام کی روح پیش کی ہے، اس نے شاعری کو پارٹی پروگرام کے تابع نہیں کیا ہے۔ ملٹن (Milton) "Paradise Lost" اور "Paradise Regained" کی وجہ سے زندہ ہے نہ کہ ان تصنیفات کیوجہ سے جو اس نے اپنے زمانے کے وقتی اور ہنگامی سیاسی حالات سے متاثر ہو کر لکھیں۔ وہی ادب زندہ رہ سکتا ہے جو پارٹی پالیٹکس کے تحت نہ ہو، تعمیری نظام سے یا تعمیری تنظیم سے .... "Inspiration" لینا تو بجا ہے لیکن ادب کو سیاسی انجمن کا تابع مہمل بنا دینا غلط ہے فنکار سے یہ کہنا کہ وہ پارٹی کے موجودہ حالات اور پروگرام کے تحت فلاں فلاں موضوع پر لکھے، فن کی توہین ہے۔ اس طرح ادبی تخلیق میں صدقِ جذبات تو نام کو نہ ہوگا۔ موجودہ روسی ادب اپنی ناکامیوں کے ساتھ اس کی زندہ مثال ہے۔

افتخار اعظمی کی نظم "غم آرزو" اپنے آغاز کے اعتبار سے ورڈزورتھ کی نظم اور نتیجے کے اعتبار سے شیلی (Shelley) کی نظم سے مماثلت رکھتی ہے دونوں نظموں کے بارے میں اوپر میرے خیالات گزر چکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "غم آرزو" میں کوئی مرتب ضابطۂ حیات نہیں ہے لیکن اس میں بعض اعلیٰ انسانی قدریں ضرور ہیں۔ فنکار اپنے گرد و پیش سے متاثر ہوتا ہے اپنے ماحول کا تجزیہ کرتا ہے۔ حالات کی نبض شناسی کے فرائض انجام دیتا ہے اور پھر کوئی ایسی بات کہتا ہے جسکا تعلق بنیادی کمزوری سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے فن میں تبلیغی عناصر (Didactic Elements) کو جذب نہیں کرتا اور نہ ایسا لب و لہجہ اختیار کرتا ہے جسے ہم "فوجی باجہ" کہنے پر مجبور ہوں عتاب ہوگا مگر نوازش آمیز، غیظ و غضب ہوگا مگر پروقار، دردمندی ہوگی مگر حیات آفریں۔ غم آرزو کا جائزہ انھیں افکار کے تحت لینے کی ضرورت ہے۔

خیالات کی ساخت اور ان کے ارتقاء کے لحاظ سے ہمیں غم آرزو میں ایک منطقی ترتیب (Logical Setting) ملتی ہے جو نظم کے لئے ضروری ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ فن جس وقت تخلیقی مدارج سے گزرتا ہے۔ تو اسکا کافی تعلق انسانی ذہن کے اس وسیع گوشے سے ہوتا ہے، جسے ہم "لاشعور" کہتے ہیں۔ اور وہ براہ راست وجدان سے وابستہ ہوتا ہے۔ فن کی عظمت کا انحصار وجدان ہی کی رنگ آمیزی اور بوقلمونی پر ہوتا ہے۔ اس نظم کو ہم لاشعور کا یا وجدانی کرب کا اظہار (Out-pouring of Unconscious or intutional un-rest) کہہ سکتے ہیں۔ نظم تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں شاعر ہمیں سایۂ مہتاب میں نظر آتا ہے اسکے کانوں میں جوئبار کی

زم صدائیں آتی ہیں۔ شب ماہ کی جلوہ ریزیوں نے کوہ وصحرا کو ... قبائے نور پہنا دی ہے ایسے دلکش اور جذبات آفریں منظر میں اس کے ذہن میں چند خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ماضی کیطرف لوٹتا ہے جس سے اس کی زندگی کا عہد زریں وابستہ ہے۔ حال ... اسے بے کیف نظر آتا ہے۔ اسکے دل میں ایک تمنا بیدار ہوتی ہے جو کبھی شیلی کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔

"Sensitive Plant"

It loves, even like love, its deep
heart is full.
It desires what it has not, the beautiful

شاعر اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے اور اس کے دل میں اس شے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ جو موجود نہیں ہے اور یہی سبب ہے کہ اسکی خندہ زنی اپنے اندر درد و کرب کی کیفیات لیے ہوئے ہے وہ بیساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ ؎

یہ تبسم زیر لب ہے پردہ دار زخم دل
کون سمجھے آہ! اپنا راز غم کس سے کہوں

فصل بہار کی چاندنی رات میں میتھو آرنلڈ (Mathew Arnold) کے قدموں کی صدائے مبہم طلسم سکوت توڑ رہی ہے۔ وہ چاند کو دیکھتا ہے کہ اس کی وجہ سے فضا کی تاریکی چھٹ گئی ہے۔ ایسے عالم میں اسے اس رات کا خیال آتا ہے جب موسم بہار کی آغوش میں نور و نکہت کا سیل رواں تھا۔ برف پوش کہسار اپنا دامن پھیلائے ہوئے تھے۔ چاندنی کے سائے میں کھیت نور حیات سے چمک رہے تھے۔ لیکن اس عالم کیف میں بھی اس کے گوشہ دل سے ایک اضطراب ابھرتا ہے۔ سینہ شوق میں وہ ایک شورید گی محسوس کرتا ہے یہی اضطراب، یہی خلش اور یہی بیقراری جو میتھو آرنلڈ کی نظم .... "A Summer Night" میں ہے، "غم آرزو" کے پہلے حصے میں ہمیں ملتی ہے۔

نظم کے دوسرے حصے میں ہمیں ملے جلے داخلی اور خارجی۔۔ حالات کا پتہ چلتا ہے۔ شاعر چاندنی رات میں بیٹھا کسی کی یاد میں اشک غم بہا رہا ہے۔ شب ماہ میں اس کے دل پر کوئل کی پکار اور نوائے بلبل چرکے لگاتی ہے۔ وہ خود کو "زناری بت خانہ آلام" بتاتا ہے۔ وہ ناشناس راحت منزل ہے شاید اس لئے کہ نشاط رحیل اسے زیادہ عزیز ہے۔ وہ اپنے سیہ خانہ غم میں کوئی کرن نہیں پارہا کہ جس سے زندگی کے تاریک گوشے منور ہو سکیں۔ اسکا شجر حیات نخل سینا نہ بن سکا اور صبح مراد مداوائے تیرہ شبی نہ کر سکی۔ اسکا گلشن حیات سحاب بہار کی کرم فرمائیوں سے محروم رہا۔ اسکی متاع حیات چند گہرہائے اشک پر مشتمل ہے۔

بس یہی ہیں حاصل شبہائے تار زندگی
چشم گریاں نے کئے جو گوہر انجم نثار

لیکن ان حالات میں رہ کر بھی اس کے قدموں میں لغزش نہیں پیدا ہوتی۔ اس نے مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اس نے حالات پر قابو پانے کی مسلسل کوشش کی۔ آفات کا ہدف ہوتے ہوئے بھی اس نے حادثات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں لیکن اسے کیا کیا جائے کہ قضا و قدر کے فیصلے اس کے منشا کے خلاف رہے۔ ان تمام ناکامیوں کی ذمہ داری شاعر ان افراد پر عائد کرتا ہے جنھوں نے مکر و فریب اور تلبیس کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے یہاں پر شاعر اپنے انفرادی غم کو اجتماعی غم کی صورت بخشتا ہے ؎

بزم گلشن میں صبا کو بھی نہیں اذن خرام
ہے ابھی صحن چمن کا ذرہ ذرہ سوگوار

اسکی نگاہوں کے سامنے رقص ابلیس ہو رہا ہے۔ اسکی آنکھیں موجودہ دور کی سیاسی کشمکش، اقتصادی بحران، معاشی ابتری، اور ثقافتی بدحالی دیکھ رہی ہیں۔ اسکے ہمنواؤں میں برٹرینڈ رسل، ہکسلے اور سید قطب جیسے لوگ بھی ہیں۔ شاعر دیکھتا ہے کہ باغبان نے اپنی آستین میں بجلیاں چھپا رکھی ہیں۔ اور اسکی بے اعتنائیوں کی وجہ سے چمن تباہ ہو رہا ہے ع

شریک سازش ہے پتہ پتہ، چمن نہیں بجلیوں کا گھر ہے

ممکن ہے نظم کا تیسرا حصہ بعض سطحی نگاہوں کو پچھلے دو حصوں سے کچھ غیر متعلق معلوم ہو لیکن فی الحقیقت ان میں غیر معمولی ربط

ہے۔ پچھلے حصوں میں جن تمثیلات و علامات کو شاعر نے ..... اپنے
مافی الضمیر کے اظہار کے لئے استعمال کیا ہے، مینا و ایاغ کا ذکر
انہیں کی ایک کڑی ہے۔ جام و صہبا، ساقی و میخانہ کے ذریعے درحقیقت
یہاں شاعر نے اس روحانی کیف کا اظہار کیا ہے جو اسے ایک دور
میں بہت عزیز تھا۔ دوسرے حصے میں نامساعد حالات کا ذکر ہے
انسان جب مایوس کن حادثات میں گرفتار ہوتا ہے تو بزم عیش
میں جاتا ہے اور ساقی کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ یا خود
اپنے تخیل سے ایک دنیائے حسین بنا لیتا ہے۔ اور اسی کو حاصل حیات
سمجھتا ہے لیکن یہ سب حقیقت سے بھاگنے کے بہانے ہوتے ہیں اور
انسان کو ان طریقوں سے حقیقی امن و طمانیت نصیب نہیں ہوتا۔
طمانیت تو صرف پُرخلوص جہد حیات میں ہے یہی وجہ ہے کہ شاعر
بزم ساقی کو چھوڑ کر کارزار حیات کا رخ کرتا ہے۔ تیسرے حصے میں
مینا و ایاغ اور ساقی وغیرہ کا جس پہلو سے ذکر کیا گیا ہے اس نے
شاعرانہ محاسن کو نہ صرف بڑھایا ہے، بلکہ شاعر کے مدعا کو بھی وسعت
بخشی ہے۔ مینا و ایاغ، چمن، بلبل، باغباں اور صیاد تو ایسی
علامتیں ہیں جو اپنے اندر ایک جہان معنی رکھتی ہیں۔ شاعری کوئی فلسفہ
منطق، ریاضی یا اقلیدس نہیں، یہاں تو تصورات کی دنیا بہت
وسیع ہوتی ہے۔ عالم خیال زمان و مکاں کی قیود سے آزاد ہوتا ہے
اسکا مطلب یہ نہیں کہ میں ادبی نراجیت کی تبلیغ کر رہا ہوں بلکہ
میرا مدعا یہ ہے کہ اگر مفہوم میں وسعت پیدا کی جا سکتی ہے تو ہم
اسے محدود کیوں کریں۔

نظم کا آخری حصہ بہت اہم ہے، چونکہ نظم کی حیثیت ایک
عضوی کل (Organic whole) کی ہوتی ہے
اسلئے کسی جزو سے اسکا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس کا کوئی حصہ
ایسا ہے جس میں یاسیت غالب ہے تو پوری نظم پر یہی الزام لگانا
بے جا ہوگا۔ ہمیں تو اس نتیجے کی بنیاد پر فیصلہ کرنا ہوگا جو شاعر نے
آخر میں نکالا ہے۔ نظم کے آخری حصے کو جب ہم پڑھتے ہیں۔ تو
ہمارے اندر موجودہ حالات سے بیزاری کا احساس پیدا ہوتا ہے
شاعر کے ناآسودہ دل و دماغ کا پرتو نظر آتا ہے، اور تغیر و انقلاب
کے جذبے کی نمود ہوتی ہے۔ شاعر نہیں چاہتا کہ موجودہ صورت حال
قائم رہے۔ وہ نظام حیات میں اساسی تبدیلی کا آرزو مند نظر آتا ہے
اس کے اندر انسانیت کو بنانے اور سنوارنے کی تمنا ہے وہ لالہ و گل
کو اپنے خون جگر سے تازگی حیات بخشنا چاہتا ہے۔ اس کا یہ شعر
پیغمبرانِ عالم کے اسوۂ حسنہ کی یاد تازہ کرتا ہے ؎

خونِ دل سے میں انہیں بخشوں گا حسنِ آب و رنگ
لالہ و گل سے ابھی محروم ہیں یہ باغ و راغ

اسکا قافلۂ حیات عالم بیخودی میں منزل کی طرف گرم سفر ہے۔ یہ
وہ بیخودی نہیں جس کی خواہش حضرت غالبؔ کو رہا کرتی تھی ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

بلکہ یہ وہ بے خودی ہے جو خودی کی خالق ہے اور جس کے متعلق مولینا
رُوم رح فرماتے ہیں ؎

جہد کن در بیخودی خود را بیاب
زود تر واللہ اعلم بالصواب

یہاں بے خودی سے مراد خود فراموشی نہیں ہے بلکہ ایک لگن اور ایک
طلب مقصود ہے۔ جد و جہد اور سعی پیہم کی طرف ایک اشارہ ہے۔
ایک والہانہ کیف ہے جس سے کاروانِ شوق سرشار ہے ....
کاروانِ شوق کے ساتھ بے خودی کا استعمال بہت پرمعنی ہے عشق
اور وجدان لازم ملزوم ہیں۔ یہاں بے خودی سے درحقیقت وجدان
مراد ہے جو عقل و خرد سے بلند تر ہے۔ عزم آرزو کے اس آخری شعر میں
ایمائیت کے ساتھ ساتھ بڑی رجائیت ہے ؎

جادہ پیما بے خودی میں کاروانِ شوق ہے
کیا عجب مل جائے اسکو اپنی منزل کا سراغ

یہاں بے خودی جذبہ حیات کو ابھارنے والی ہے۔ اگر بے خودی کے
معنی خود فراموشی کے ساتھ دیگراں فراموشی لئے جائیں۔ تو یقیناً یہ
مہلک ہے، لیکن اگر وہ راہِ حیات میں کاروانِ شوق کو حوصلہ
حیات بخشتی ہے اور منزل کی طرف لیجاتی ہے۔ تو اسکی جتنی بھی تعریف
کی جائے کم ہے۔ مندرجہ بالا شعر میں بے خودی سے یہی مراد ہے

جمیل احمد فاروقی نے اپنی تنقید "غم آرزو میری نظر میں" میں اس نظم کے بارے میں چند باتیں فرمائی ہیں۔ "بیخودی" کے متعلق فاروقی صاحب رقمطراز ہیں "کہاں کا سفر اور کیسی منزل؟ جب "بیخودی" زاد سفر ٹھہری تو منزل کا خدا حافظ" اس سلسلے میں تفصیل سے اوپر اپنے خیالات کا اظہار کرچکا ہوں۔ یہاں پر صرف چند باتیں کہنی مقصود ہیں۔ نظریے کی اہمیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے؟ لیکن اس کے یہ معنے تو نہیں کہ ادب کو تبلیغ و تلقین کا ذریعہ بنالیا جائے۔ فاروقی صاحب نے اپنی تنقید میں ادبی علامات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ بے خودی، اور مستی و سرشاری یہ فارسی اور اردو شاعری کی ایسی علامات ہیں جن کے معانی میں بہت وسعت ہے، بے خودی کے مفہوم کا تعین سیاق و سباق سے کیا جائے گا بے خودی شعور و آگہی کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ تو وجدان کا ایک اعلیٰ تر مظہر ہے۔ یہ ایک وجدانی کیف ہے، جو زندگی کی حرکت میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ اقبال اعظمی نے انھیں معنوں میں بے خودی کا استعمال کیا ہے۔

فاروقی صاحب نے بار بار تعمیر پسندانہ اور خدا پرستانہ ادب کا ذکر کیا ہے۔ تعمیری ادب سے یہ مراد نہیں کہ ہر نظم میں ایک مخصوص ضابطۂ حیات پایا جائے، بلکہ تعمیری یا اسلامی ادب میں وہ تخلیقات بھی آتی ہیں۔ جو زندگی کے کسی گوشے کے بارے میں ایک تعمیر آفریں نقطۂ نظر پیش کرتی ہوں۔ کسی فنکار سے یہ مطالبہ بے جا ہے کہ وہ اپنی ہر نظم میں مکمل ضابطۂ حیات پیش کرے، ہاں یہ مطالبہ یقیناً صحیح ہے کہ وہ اعلیٰ انسانی قدروں سے کبھی گریز نہ کرے۔ رسول پاکؐ نے بعض ایسے اشعار کی تعریف کی ہے۔ جو اگرچہ اپنے اندر کوئی نظام حیات نہیں رکھتے پھر بھی زندگی کو ... حسن تعمیر سے آشنا کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار کو رسول پاکؐ نے اسلئے پسند فرمایا ہے کہ وہ حیات آفریں ہیں ؎

ولقد أبیتُ علی الطّوی وَأظلّہ
حتّی أنالَ بہٖ کریمَ المأکلِ (عنترہ)

میں شب و روز اس لئے بھوکا پیاسا رہتا ہوں تاکہ اس طرح حلال روزی حاصل کرسکوں۔

وَلَا خیرَ فی حِلمٍ إذا لم یکن لہٗ
بَوادِرُ تحمی صفوَہٗ أن یُکدّرا

وَلَا خیرَ فی جہلٍ إذا لم یکن لہٗ (النابغۃ الجعدی)
حلیمٌ إذا ما أوردَ الأمرَ أصدرا

إذا نظرتَ إلی أسِرّۃِ وجہہٖ
برقت کبرقِ العارضِ المتہلّلِ (ابوکبیر)

ان اشعار میں کہیں بھی کسی منضبط تصور حیات کی نشاندہی نہیں ہے لیکن جناب رسالت مآبؐ نے صحت مند رجحانات کی وجہ سے انھیں پسند فرمایا خصوصیت کے ساتھ عنترہ کے شعر میں تو بقول اقبال "صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر ہے"۔ واضح تصور حیات اگر کسی نظم میں آتا ہے تو یقیناً قابل تعریف بات ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو دیکھنا چاہیئے۔ کہ تعمیری رجحان کا کوئی گوشہ ہے یا نہیں؟

فاروقی صاحب کو "غم آرزو" میں دو غالب رجحانات نظر آتے ہیں۔ ایک تو مجہول رومانیت اور دوسرا شکست خوردگی اور پسپائیت۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مجہول رومانیت کیا ہے؟ میرے نزدیک وہ رومانیت یقیناً مجہول یا لغو اور لایعنی ہے جو قاری کے ذہن پر بیزاری، جمود و تعطل اور کلبیت کے اثرات مرتسم کرے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ رومانیت میں ذہن سے زیادہ جذبات اور وجدان کو دخل ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صرف جذبات ہی کی نیرنگی اور کارفرمائی ہوتی ہے مثلاً کیٹس (Keats) کو لیجئے۔ اسکے یہاں صرف جذبات کی کارفرمائی ہے۔ لیکن میتھو آرنلڈ (Mathew Arnold) کے یہاں دل و دماغ کا ایک معتدل امتزاج ہے۔ شعر و ادب میں رومانیت نام ہے اعلیٰ تخئیلی قوتوں کے اظہار کا۔ رومانیت پسند شاعر پر جذباتی غلبہ و استیلا ہوتا ہے۔ جو قوت متخیلہ کے عمل سے منصۂ شہود پر آتا ہے۔ رومانی شاعر اپنے جذبات کے اظہار کے لئے تمثیلات کا سہارا لیتا ہے۔ فاروقی صاحب

نے جس رومانیت کو مجہول قرار دیا ہے، وہ کم از کم ہر رومانی شاعر
کے یہاں ملیگی۔ اس سلسلے میں میتھو آرنلڈ کی نظم..........
A Summer Night کا حوالہ دینا مناسب
سمجھتا ہوں۔ جس کے بارے میں اپنی رائے شروع میں درج کر چکا
ہوں۔ اگر یہی مجہول رومانیت ہے تو سوائے اس کے کہ ہم فاروقی
صاحب کے احترام کیوجہ سے خاموش رہیں اور کیا کر سکتے ہیں؟
ہمیں اقبال کی بعض ایسی نظمیں ملیں گی جن میں کوئی واضح تصورِ
حیات نہیں پھر بھی ولولۂ حیات رکھتی ہیں مثلاً "نغمۂ ساربانِ
حجاز" اس نظم پر رومانیت کے اثرات واضح ہیں۔

جہاں تک شکست خوردگی اور قنوطیت کا تعلق ہے، اس
کے بارے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جس شے کو فاروقی صاحب نے
قنوطیت کہا ہے، وہ فی الاصل دردانگیزی ہے۔ شکست خوردگی
اور قنوطیت غم و آلام میں لذت لینے کا نام ہے۔ فانی کے یہاں
یقیناً یہ عناصر ہمیں ملتے ہیں۔ فانی ہم سے زندگی کا حوصلہ چھین
لیتے ہیں۔ وہ ہمیں موت کی برودت اور اسکے تعطل سے قریب
کر دیتے ہیں۔ لیکن میر کے یہاں یہ بات نہیں۔ ان کی نومیدی
یاس انگیز نہیں، انکا غم راحت افزا ہے، وہ حادثاتِ جہاں سے
گھبراتے نہیں، وہ شکست کے باوجود عزیمت کا دامن ہاتھ سے
نہیں چھوڑتے۔ "غمِ آرزو" میں ہمیں درد و کرب کا احساس ہوتا
ہے، اگر شکست خوردگی یا پسپائیت ہوتی تو شاعر آخر میں کیوں
اپنے جذبۂ عمل کا اظہار کرتا۔ اس کے قوائے عمل کو تو معطل ہو جانا
چاہیئے تھا۔ لیکن ہمیں ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ فاروقی صاحب نے
نظم کے اجزا کے متعلق تو فیصلے صادر کر دیئے ہیں لیکن......
من حیث الکل پوری نظم کے تاثر کے متعلق انھوں نے کوئی بات
نہیں کہی ہے جبکہ نظم کے متعلق فیصلے کا انحصار اسکے مجموعی تاثر
پر ہوتا ہے نہ کہ اس کے اجزا پر؟ اظہارِ غم قنوطیت نہیں ہے،
بیانِ درد پسپائیت نہیں ہے۔ غم بھی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے
اسکی ترجمانی کون کریگا۔ غم تو فطرتِ انسانی کی صیقل ہے۔ جس
سے خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔

فاروقی صاحب کو نظم کے مندرجہ ذیل اشعار میں طفلیانہ پن
اور غیر صحت مند عناصر ملتے ہیں ؎

یہ تجلی، یہ تبسم، یہ ترنم، یہ فضا
آج کی شب ہے روا ہر لغزشِ گامِ جنوں
تیرے آئینہ میں رقصاں ہے جمالِ لختِ یار
شوق کہتا ہے کہ بڑھ کر تیرے عارض چوم لوں

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ ادب پر اس طرح کی خود ساختہ قیود
نہیں لگانی چاہیئے۔ اگر ان اشعار میں عامیانہ پن ہے تو اقبال
کے ان اشعار کے متعلق فاروقی صاحب کی کیا رائے ہے؟ ؎

بر سرِ بام آ، نقاب از چہرہ برکش
نیست در کوئے تو چوں من آرزومندے دگر
حلقہ بستند سرِ تربتِ من نوحہ گراں
دلبراں، زہرہ وشاں، گلبدناں، سیم براں
حسرتِ جلوۂ آں ماہِ تمامی دارم
دست بر سینہ، نظر بر لبِ بامی دارم
دخترکے برہمنے لالہ رخے سیمن برے
چشم بروئے او کشا، باز بخویشتن نگر

ادبیات عالم میں تمثیلات کی بھی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ اور اپنے
مقصد کے لئے شاعر ان تمثیلات سے کام لیا کرتا ہے۔ غمِ آرزو
میں شاعر جس ماحول کی منظر کشی کر رہا ہے اس میں ان جذبات
کا پیدا ہونا ایک فطری عمل ہے۔ اور اسی عکاسی سے نظم کا پہلا حصہ
جاندار ہو جاتا ہے اس طرح سے مقصد میں قوت پیدا ہو جاتی ہے
اس سلسلے میں علامہ اقبال کی دو نظموں کا ذکر ضروری ہے پہلی نظم
"کشمیر" ہے۔ شاعر کشمیر کے لئے رختِ سفر باندھنے کی تلقین کرتا ہے
کوہ و کمر میں ناظورۂ فطرت اپنی ادائیں دکھا رہی ہے چراغِ لالہ سے
ساری فضا منور ہے نگارِ ارض نے برقعِ نسترن پہن رکھی ہے۔ لالے
کے اگنے کی وجہ سے زمین سرخ ہو گئی ہے۔ ایسے ہوشربا ماحول میں
شاعر کے دل میں ربط نوازی اور بادہ پیمائی کا شوق پیدا
ہوتا ہے ؎

زخمہ بہ تار ساز زن بادہ بہ ساتگیں بریز
قافلۂ بہار را انجمن، انجمن نگر

اور آخری شعر میں تو صاف صاف کہتا ہے ؎

دختر کے برہمنے لالہ رُخے سمن برے
چشم بروئے او کشا باز بخویشتن نگر

یہاں "باز بخویشتن" کہہکر اپنے فلسفہ خودی کیطرف اشارہ کردیاہے
اقبال کی دوسری نظم "ساقی نامہ" ہے اسمیں نشاط باغ "کشمیر" کے حسن افروز مناظر کی عکاسی کی گئی ہے۔ ایسی تو یہ شکن فضا میں وہ یہ بھی کہہ اٹھتا ہے ؎

چہ خواہم دریں گلستاں گر نہ خواہم
شرابے، کبابے، رُبابے، نگارے

مناظر کی اور جذبات کی عکاسی کے بعد وہ اپنے مقصد کیطرف رجوع کرتا ہے اور کشمیریوں کی خوئے بندگی پر اظہارِ تاسف کرتا ہے۔ آخر میں ساقی سے یہ کہتا ہے ؎

ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

اس طرح اقبال نے ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دل میں آرزو کا پیدا ہونا کوئی جرم نہیں ہے۔ لیکن آرزوئے ناسزا کا عمل یقیناً قابلِ تعزیر ہے۔ غمِ آرزو کے وہ دو اشعار جنھیں فاروقی صاحب نے نشانہ تنقید بنا لیا ہے، ان میں جو تمنا ہے، وہ ماحول کے مطابق ہے اگر شاعر نے اس تمنا کا اظہار نہ کیا ہوتا تو تصویر کشی مکمل نہ ہوتی۔ دراصل یہاں تصویر کشی کے مختلف پہلوؤں سے مقصد کے لئے وہ فضا تیار ہوتی ہے جو درحقیقت مقصود بالذات ہے جسانؓ بن ثابتؓ نے جو قصیدے حضورؐ کی مدح میں کہے، انکی ابتدا بھی اسی قدیم طرزِ تشبیب سے ہوئی ہے۔ غمِ آرزو کے ان اشعار سے نظم کا مقصد قطعاً فوت نہیں ہوتا۔

جناب جمیل احمد فاروقی کو یہ بھی اعتراض ہے کہ شاعر اس آخری مقام پر نہیں پہنچ سکا۔ جہاں اسے پہنچنا چاہیئے تھا۔ لیکن یہ تشنۂ تشریح ہے کہ وہ کونسا فکری مقام ہے اور فکری مقام سے کیا مراد ہے؟ کسی نظم میں حیاتِ انسانی کے تمام پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی جاسکتی۔ ایک نظم میں صرف چند گوشوں کیطرف اشارے کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ نظم ورڈزورتھ کی .... The Autobiographical نظم Prelude کی طرح نہیں ہے جس میں عہدِ طفلی سے لیکر عالمِ پیری تک کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ غمِ آرزو میں انسانی زندگی کا ایک گوشہ لے گا اور وہ ہے۔ نوعِ انسانی سے ہمدردی اور محبت کا جذبہ۔ زندگی کو بنانے اور سنوارنے کا ولولہ اور اس طرح تغیر اور انقلاب کی خواہش۔ نظم کا آخری شعر حرکی تصور کی طرف ایک دعوت ہے۔ رجائیت کے ساتھ جہدِ حیات کے لئے ایک پیغام ہے۔ نظم اپنے مقصد کے لحاظ سے بالکل واضح ہے۔ تشنگی نام کو نہیں، ان مقاصد کے ہوتے ہوئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ تعمیر پسند ادب میں یہ نظم ایک اضافہ ہے۔

فاروقی صاحب کا یہ خیال بھی واضح نہیں کہ کن اجزا کے "غیر متوازن انتخاب" نے اس نظم کو غیر مقصدی تاثرات کا حامل بنا دیا ہے

فاروقی صاحب نے ساحر لدھیانوی کی نظم "جاگیر" کا حوالہ دیا ہے اور اس کے متعلق انھوں نے فرمایا ہے کہ اس نظم کو پڑھنے کے بعد جاگیردارانہ نظام سے بجائے نفرت کے دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے انھوں نے غمِ آرزو کو بھی اسی قبیل کی نظموں میں شمار کیا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس نظم کو پڑھنے کے بعد ہم میں موجودہ نظام کو بدلنے کی خواہش پیدا ہوجاتی ہے۔ کیا ہم جب چشمِ آدم سے جوئے خوں بہتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ تو ہمارے اندر احساسِ مسرت پیدا ہوتا ہے؟ کیا سینۂ گلشن کے داغدار ہونے کے باوجود ہم میں نظامِ گلشن کے بدلنے کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا؟ کم از کم میرے دل میں یہ جذبہ نہیں پیدا ہوتا ہے۔ آخری حصہ تو واقعتہً احساسِ انقلاب کو بیدار کرتا ہے۔

دوسرا نکتہ جو قابلِ توجہ ہے، وہ یہ ہے کہ افتخار اعظمی نے پہلی بار عرش سے فرش پر قدم رکھا ہے؟ فی الحقیقت ایسا نہیں ہے

اس سے قبل بھی انکی ایک نظم "نئی نسلیں" جولائی سنہ ۱۹۵۴ء میں
بعنوان "چاندنی رات میں" شائع ہو چکی ہے اسمیں بھی شاعر نے
آخر میں اعلیٰ انسانی کردار کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔
اس کے علاوہ "معیار" بابت مارچ سنہ ۱۹۵۵ء میں ایک نظم
"تجدید ستم" شائع ہو چکی ہے۔ یہ بیشک ایک مکمل نظم ہے جسمیں مسلم
ممالک کے بعض ارباب حکومت کے جور و تعدی کیخلاف شاعر نے احتجاج
کیا ہے اور اسمیں ایسے غیظ و غضب کا اظہار ہے جو ہمیں ملٹن ......
Milton کی نظم On the late massacre in Piedmont
میں ملتا ہے۔ یہ نظم بھرپور سیاسی شعور
کی حامل ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر فتحار اعظمی اس قسم کی نظمیں
لکھیں تو اور زیادہ کامیاب رہیں گے۔

آخر میں مجھے چند جملے فاروقی صاحب کے طرز تنقید کے بارے
میں کہنے ہیں۔ فاروقی صاحب کی تنقید پڑھنے کے بعد ان کے تشدد
کا اندازہ ہوتا ہے۔ انکے یہاں کہیں کہیں انتہا پسندی ضرورت سے زائد
نظر آتی ہے۔ وہ ہر شعر میں سیاسی اور معاشرتی نقطہ نظر چاہتے ہیں۔
حالانکہ فن کے پرکھنے کے معیار کچھ اور بھی ہیں۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ فنکار
کی داخلی زندگی کے علاوہ کچھ ایسے بھی خارجی حالات ہیں۔ جہاں اسکے ذوق نظر
اور جذبہ ایثار دونوں کا امتحان ہوتا ہے لیکن پھر بھی شاعر کی قلبی کیفیات
کی بھی بہت اہمیت ہے۔ فنکار غیب و حضور کے درمیان ایک توازن پیدا
کرتا ہے۔ میرے ان خیالات سے یہ نتیجہ نکالنا کہ میں کسی قدر "ادب برائے
ادب" کا قائل ہوں قطعاً غلط ہے میں نظریے کی مخالفت نہیں کرتا
ہوں بلکہ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ فنکار پر کوئی بے جا پابندی نہیں
لگانی چاہیے۔ ایک وقت ... ضرور آتا ہے جب نظریہ فنکار کی شخصیت
میں رچ بس جاتا ہے اور وہ از خود اپنے اظہار کی راہیں تلاش کر لیتا
ہے۔ فنکار کا ذہن ارتقا کی مختلف منزلوں سے گزرتا ہوا معراج
کمال تک پہنچتا ہے۔ اس وقت اسکی نگاہ بلند ہو جاتی ہے۔ اور اس
کے سخن میں شان دلنوازی آجاتی ہے۔

نقاد کو چاہیے کہ جب وہ کسی پارۂ فن پر تنقید کرے تو فن
کی ان تمام عظمتوں کو سامنے رکھ لے۔ نقاد کے لئے حیات انسانی کے
حقائق کا ادراک بہت ضروری ہے۔ ورنہ اس کی تنقید کھوکھلی ہوگی
تحلیل و تجزیہ نقاد کا خاص فرض ہے۔ اسے چاہیے کہ تخلیق میں
تجربات کی اہمیت کو فراموش نہ کرے کیونکہ فنکار انھیں تجربات کی
روشنی میں کسی نتیجے پر اور کسی منزل پر پہنچتا ہے۔ تخلیق میں انفرادی
تجربات کا عنصر جماعتی تجربات سے زیادہ ہوا کرتا ہے۔ اور یہی
انفرادی تجربہ اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا جماعتی تجربے
کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر جماعت بہرحال اپنے
وجود کے لئے فرد کی مرہون منت ہوا کرتی ہے جو اسے آب و رنگ
بخشتا ہے اور پھر فرد جماعت میں گم ہو کر فی نفسہ ایک جماعت
ہو جاتا ہے ۔

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرہ وسعت طلب قلزم شود

جناب جمیل احمد صاحب فاروقی کی تنقید پڑھ کر اندازہ ہوتا
ہے کہ ان کے نزدیک انفرادی مشاہدات و تجربات کی کوئی اہمیت
نہیں ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ تنقید کا انداز ادعائی ......
(Dogmatic) ہو کر رہ گیا ہے جو قاری کے ذہنی
خلاؤں کو پُر کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ اچھی تنقید میں توازن
ہوا کرتا ہے۔ لیکن ہمیں اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے
ذہن میں مکمل آسودگی نہیں پیدا ہوتی۔

جمیل احمد فاروقی صاحب عمر کے لحاظ سے میرے بزرگ
بھی ہیں اور ادبی رشتہ کی وجہ سے دوست بھی، اس لئے یہ کہہ کر
رخصت ہوتا ہوں کہ اگر انھیں فرصت کبھی ملے تو میرے مخلصانہ
افکار پر بھی غور فرما لیں۔ مجھے اپنی رائے پر اصرار نہیں ہے۔ اگر
انھیں کہیں مجھ سے اختلاف ہوگا تو مجھے غور و فکر کا ایک نیا
گوشہ ملے گا۔

فاروق بانسپاری

○

تری نگاہ ہے زندانیٔ نشاں اے دوست
جہاں ہیں اور پسِ پردۂ جہاں اے دوست

فراغ عقل کو موجوں کے پیچ و خم سے نہیں
مظاہرات کا دریا ہی بیکراں اے دوست

یہ راز مجھ پہ خراباتیوں نے فاش کیا
مئے کہن ہے علاجِ غمِ جہاں اے دوست

بلند تر ہے تری فکر سے مقامِ خلیل
کہ تو ہے چاند ستاروں کے درمیاں اے دوست

مرے جہاں میں فقط لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
ترا جہاں ہمہ اصنامِ این و آں اے دوست

نہ عندلیب کے نغمے نہ بوئے کیف آور!
یہ گلستاں ہے کہ تصویرِ گلستاں اے دوست

پہونچ سکے گی نہ پائے یقین و ایماں تک
قیاس و فکر کی یہ سربلندیاں اے دوست

ترے چمن میں بہ ایں غازۂ نشاطِ بہار
گلوں کے منھ پہ برستا ہی کیوں دھواں اے دوست

عطائے تیغ و سناں اس کے حق میں ہی بے سود
حنا بدست ہیں جس قوم کے جواں اے دوست

جلا دیئے ہیں سفینے یقیں نے ساحل پر!
خودی کی موت ہی اندیشۂ زیاں اے دوست

بہ ایں پرستشِ تخمین و ظن بحالِ زبوں
بجا کہ تو ہے حقیقت کا راز داں اے دوست

خطوطِ چاکِ گریباں تھے رہگذارِ حیات
تری نگاہ رہی سوئے کہکشاں اے دوست

وہ تیری بزمِ غنا کے لئے ہے ناموزوں!
کہ خوش گلو نہیں فاروق خوش بیاں اے دوست

عرشی بھوپالی

بہت ہی تلخ سہی، دردِ روزگار تو ہے — کوئی انیس تو ہے کوئی غمگسار تو ہے

مرے نصیب میں زنجیر و طوق و دار تو ہے — اگر بہار نہیں، مژدۂ بہار تو ہے

ہر اختیار جفاؤں پہ اور تمھارے بقول — نہ اختیار سہی، دل پہ اختیار تو ہے

بلا سے پائے طلب ہے جو خونچکاں اپنا — اِن آبلوں سے چمن کا ترے وقار تو ہے

بہت رفیق ہیں شامِ الم کے اور اگر — نہ ہو رفیق کوئی، تیرا انتظار تو ہے

جو اہلِ دل پہ زمیں تنگ ہو گئی تو کیا — ترا دیار تو ہے تیرا رہگذار تو ہے

کسی کے آگے زباں شرم سے نہیں کھلتی — یہ کیا کہیں کہ جفا پر وہ شرمسار تو ہے

ہزار طعن کریں عاشقی پہ اہلِ ہوس — ہمیں یقیں تو ہے اپنے پہ اعتبار تو ہے

رفیقو آؤ کہ موسم کا فرض ادا کر لیں
"نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے"[1]

[1] غالب

ابنِ فریدی

۔۔۔تا کلاز

شام کے دھندلکے چاروں طرف چھانے شروع ہو گئے۔ دسمبر کے آخری ہفتوں کی کہرآلود شاموں میں تاریک پڑنے والے سائے اور گہرے ہو گئے۔ کالونی کی باؤنڈری کے اندر اپنی گھنی شاخوں کو پھیلائے ہوئے درختوں کے نیچے بچے اور بچیاں حلقے بنانے کھیل رہے تھے۔ ناچ رہے تھے چھوٹی چھوٹی مناجاتیں گاتی جا رہی تھیں۔ ان کے شور اور قہقہوں سے ساری فضا گونج رہی تھی۔ چاروں طرف سرشاری چھائی ہوئی تھی۔ یہ خوشی اور مسرت کے جذبات میں ڈوبے ہوئے بچے اس ماحول کو بڑا ہی پاکیزہ اور دل خوش کن بنا رہے تھے۔

کرسمس کے یہ دن بڑے مصروف سے تھے۔ اپنی تمام مصروفیتوں کا جلیبی وہ اس وقت کھڑی ہوئی جائزہ لے رہی تھی۔ کھڑکی پر اس کی پرانی ساری کے پردے ہلکی ہلکی جنبشوں کے ساتھ ہل رہے تھے۔ یہ ہفتہ، یہ شام یہ رات اور آنے والا دن اس کالونی کے لئے خوشیوں کا زمانہ تھا پھر یہ سارا ماحول سنسان اور خاموش ہو جائے گا۔ پھر ایک سکوت اور ایک اداسی چاروں طرف چھا جائے گی، آج کی اس فضا میں کچھ ویسا ہی تقدس تھا جیسا التقدس اسے کلیسا میں یسوع کے مجسمے کے سامنے دعا پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا تھا۔

کلیسا کا تصور آتے ہی وہ اپنے اندر ایک کسک سی محسوس کرنے لگی صبح صبح جب ابھی چاروں طرف کہر سی چھائی ہوئی تھی اور دھوپ بڑی البسرائی اور بے اثر سی لگ رہی تھی اس نے بچوں کو تیار کرنا شروع کر دیا۔ بچے چہک رہے تھے اور وہ ایک اندرونی طمانیت محسوس کرتے ہوئے انہیں بار بار ٹھیک ہونے کی تاکید کر رہی تھی۔ لیکن بچے اس ہدایتوں پر بے انتہا محبت اور خلوص محسوس کرتے ہوئے بھی اس کی باتوں پر کان نہیں دھر رہے تھے۔ باہر کالونی کے بچے ارغنون بجاتے ہوئے دوڑ رہے تھے اور ان کے پرمسرت شور کی آواز پوری کالونی میں گونج رہی تھی۔ اسے وہ منظر بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ کاش زندگی کا لمحہ لمحہ اسی خوشی اور مسرت کے لئے وقف ہو جائے، کاش یہ مسرت ابدی ہو جائے۔

اور اسی مسرت میں کھوئی ہوئی ہی اس نے اپنے بچوں کو معمولی پاپلین اور گبردن کی قمیص اور پتلونیں پہنائیں اور دو پرت سستے اون کے پل اوور پہنا دیئے۔ بچوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بالوں کو سنوارا اور اپنے پالش کئے ہوئے جوتے پرانے دھلے ہوئے موزوں کے ساتھ پہن لئے۔ اس وقت ایک ہزار تنگ پر گئی لیکن یہ سب اس کو اس وقت گوارا تھا۔ وہ مقدس ہفتے کا ایک دن تھا۔ وہ بڑے دن کی نوید دینے والا دن تھا، وہ کرسمس کا زمانہ تھا۔

لیکن بچے جیسے ہی تیار ہوئے اپنی پوشاک کی نمائش کے لئے کوارٹر کے باہر نکل گئے اور ایک دم شور کے بعد کامل سکوت چھا گیا۔ اس نے اب خود بھی تیاری کرنی شروع کر دی اس کا شوہر بازار سے پھولوں کے گلدستے لینے چلا گیا تھا۔ اس نے اس کے کپڑے بھی بکس سے نکال کر رکھ دیئے۔ پھر خود باورچی خانہ میں، جو ٹین کا شیڈ ڈال کر بنایا گیا تھا۔ چلی گئی اس نے پلیٹوں میں آش جو کا دودھ میں ابلا ہوا دلیہ نکالا۔ ڈبل روٹی کے قتلے کاٹے اور آگ پر ہلکا ہلکا سینک کر مکھن کی بڑی ہی باریک سی پرت ان پر چڑھانے لگی۔ آج وہ بڑی شگفتگی محسوس کر رہی تھی اور سارے کام بڑے انہماک اور بڑی دلچسپی سے کر رہی تھی۔ اس کا شوہر بچوں کے ساتھ کوارٹر میں داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پھولوں کے گلدستے تھے اور دوسرا ہاتھ وہ ٹام کی پشت پر رکھے ہوئے تھا، اور ٹام، جم اور پنٹو مرجھائے مرجھائے سے اس کے ساتھ تھے۔ وہ چونک پڑی۔ آخر یہ کیا ہوا۔

اس سے پہلے کہ وہ بولتی اس کا شوہر اس سے پوچھ بیٹھا "تم کیا

بچوں کو کیا ہوا؟ یہ باہر کیوں کھوئے کھوئے سے کھڑے ہیں؟"
"میں کیا بتا سکتی ہوں؟ ابھی تو یہ ہنستے کھیلتے باہر گئے تھے۔"
اور پھر اس نے تمام بچوں سے پوچھا لیکن سب خاموش اپنے
کھوئے کھوئے کچھ بھی نہ بولا۔ اس نے جلدی جلدی تمام ناشتہ ساتیاں کے بچے
بچھی ہوئی میز پر لگا دیا اور پھر باری باری ایک ایک بچے سے پوچھنے لگی۔
بالآخر منّے نے بسورتے ہوئے لہجے میں حقیقت حال کھول دی۔
"فلٹن ہماری ہنسی اڑا رہا تھا ہمارے کپڑے خراب ہیں اور ہم
بُرے ہیں اور ہم سے اس کی ممی اور پاپا بات کرنا پسند نہ کریں گے اور
وہ ایسے لڑکوں کو اپنے ساتھ نہیں کھلانا چاہتا۔"
اوہ۔ یہ مسرت کے دنوں کا زمانہ اس دنیا میں گزر رہا ہے وہ
کہاں خیالی دنیا میں پرواز کر رہی تھی۔ وہ کیسی چھوٹی مسرتوں میں
کھوئی تھی۔ فلٹن کے جملے اس کے سینے کو برماتے ہوئے پار ہو گئے لیکن فلٹن
ابھی بچہ ہے اس کی بات کا خیال کرنا۔ البتہ یہ الفاظ جو فلٹن کی زبان
سے نکلے تھے کسی اور ہی کے تھے اک ایسی ذہنیت کے جو سال بھر اس
کو اور اس کے شوہر کو ایک پسماندگی میں مبتلا رکھتی تھی اور جس کو وہ کرسمس
کے مقدس ہفتے میں بھلا دینے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر ہر صبح کوئی ایسا
ہی واقعہ پھر اس کو نیند سے چونکا دیتا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس
لی اور اس کے اندر کی مسرت دیر سے رکھی ہوئی آئس کریم کی طرح گھلنے
لگی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے بچوں کے بال کچھ الجھ گئے ہیں اور ان کے
کپڑوں پر مٹی کے ہلکے ہلکے دھبے آ گئے ہیں۔ اس نے یونہی افسردہ سے
انداز میں ان کے کپڑوں سے گرد کو جھاڑ دیا، ان کے بالوں کو درست کر دیا
اور پھر اس غم انگیز تاثر کو فنا کرنے کے لئے سب سے ناشتہ کرنے کے لئے کہا
"ہوگا، تم فلٹن کی بات کی پرواہ نہ کرو جلدی سے ناشتہ کرو.....
چرچ جانے کا وقت ہو رہا ہے۔"
کلیسا کا نام سن کر بچوں میں پھر ایک اشتیاق جاگ اٹھا اور
وہ اپنے ناشتے میں منہمک ہو گئے۔ وہ تھکے تھکے انداز میں خلاؤں میں
تکتی رہی اور نہ معلوم کیا سوچتی رہی۔
کلیسا میں داخل ہو کر اس نے یسوع کے مجسمے کے سامنے گھٹنے
ٹیک دیئے اور غم انگیز سی، سر جھکائے مؤدب بیٹھی رہی۔ اس وقت اس
کے دل سے لاکھوں صدائیں اٹھ رہی تھیں جیسی ہی آہیں [illegible]
وہ تمنا کر رہی تھی، کاش یسوع کا یہ مجسمہ اس کی سن لے۔ پھر وہ وہاں
سے اٹھ کر چلی آئی اور چیپل کے لئے اگلی نشستوں کے پاس سے گزرتی
ہوئی پچھلی بنچوں میں اپنے خاوند کے پاس بیٹھ گئی جو اس کے بچوں کے ساتھ
اس سے پہلے وہاں بیٹھ چکا تھا۔ اس وقت چیپل میں شرکت کے لئے
بہت لوگ کلیسا میں داخل ہو چکے تھے اور چاروں طرف ایک ہلکی بھنبھناہٹ
گونج رہی تھی۔ اگلی نشستوں پر زرق برق کپڑوں میں ملبوس عورتیں
اور مرد بیٹھنے شروع ہو گئے ان کے بچے بھی قیمتی کپڑوں اور اعلیٰ آرائشوں کے
ساتھ ان کے پاس ہی خاموش بیٹھے ہوئے تھے ——— جیسے وہ اس
وقت اپنی ساری شرارتوں کے طوفان کو سینے میں دبائے بیٹھے ہوں پچھلی
بنچ کے بچے کئی بار گردنیں اونچی کر کے انہیں دیکھنے کی کوشش کر چکے تھے اور
مقدس باپ نے انہیں ایسا کرنے سے کئی بار منع بھی کیا تھا اور وہ کھوئی
کھوئی سی، مقدس شمعوں اور پردوں کو تکتی رہی، جیسے وہ اس وقت
اس مقدس کلیسا سے بہت دور ہو۔ بڑے فاصلے سے اس کے ایک ایک
منظر کو دیکھ رہی ہو، دھندلائے ہوئے سے، غیر واضح سے۔
پھر مارگریٹ اپنے ولایتی سرج کے سکرٹ اور ریشم کی طرح چمکتے ہوئے
گاؤن اور سمور کے بالوں کے کالر کے درمیان بہترین میک اپ کے ساتھ آکر
پیانو کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کی انگلیاں پیانو سے مناجات کی دھن
پیدا کرنے لگیں اور تمام لوگ کھڑے ہو گئے۔ سب نے اپنے سروں کو
جھکا لیا اور بڑی ہی تقدس آمیز دھیمی لے میں مناجات گاتے رہے
مارگریٹ نے پیانو بند کر دیا مناجات ختم ہو چکی تھی۔ تمام لوگ خاموش
بیٹھ گئے۔ مقدس باپ نے وعظ کہا اور پھر سب لوگ کھڑے ہوتے
مناجات پڑھی گئی، مارگریٹ نے پھر پیانو کو چھیڑا اور پھر تمام لوگ
چہروں پر ایک مسکراہٹ لئے ہوئے رخصت ہونے لگے۔ وہ کچھ دیر چیپل
کے بعد رکی رہی۔ چند ایک لوگوں سے ملاقات کی۔ وہی۔ وہی مسکراہٹیں
وہی مقدس ہفتہ کی مبارکبادیں! ——— اور ان سب چیزوں
نے جیسے اس کے غم کو ایک حد تک ہلکا کر دیا وہ اب پھر اپنے سینے پر سے
ایک بوجھ کو ہٹتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ جب مارگریٹ اپنے بچے کو لئے
ہوئے اس کے سامنے سے گزرنے لگی تو اس نے اس کو رشک کے ساتھ

دیکھتے ہیں مقدس ہفتے کی مبارکباد پیش کی۔

"ہیلو! مبارک مبارک"

مارگریٹ بھی اس کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اور اس وقت اس کو باوجود اس ظاہری تفاوت کے اپنے سے بہت نزدیک محسوس ہوئی۔ جیسے یہ قیمتی ملبوسات اس کے خود دار اور بڑے پن کو نہیں اس کی خوش مزاجی اور بھولی طبیعت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس کو نجانے کیوں اس وقت مارگریٹ پر پیار آنے لگا اور اس پیار کے جذبہ کے تحت ہی اس نے اپنے ہاتھ کا پھولوں کا گلدستہ بڑی شفقت کے ساتھ مارگریٹ کے بچے کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اسے اس وقت بڑا سکون سا محسوس ہونے لگا۔

لیکن ــــــــــ مارگریٹ کے بچے نے اس کے سامنے ہی پھولوں کی پتیاں نوچنا شروع کر دیں ذرا سی دیر میں وہ بچی ہوئی ٹہنیوں کا ایک چھوٹا سا گٹھا لگنے لگا اور جب مارگریٹ کلیسا کے پورٹیکو سے نکل کر روش پر آگئی تو اس نے بچے کے ہاتھ سے بغیر پھولوں کا۔۔ گلدستہ لے کر ایک جھاڑی میں پھینک دیا۔

وہ اب تک کھڑی ہوئی مارگریٹ کو بڑی پر امید نظروں سے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں لیکن یہ دیکھتے ہی اس کا دل مسوس کر رہ گیا۔ جیسے وہ اور اس کے بچے اور اس کا شوہر، سب بغیر پھولوں کا ایک گلدستہ تھے جو کالونی کی باؤنڈری کے ایک کونے میں اسی طرح پھینک دیئے گئے تھے، وہ بالکل اسی طرح ناقابلِ التفات تھے جیسے یہ سارے ڈنٹھل پنکھڑیوں کے نوچ لئے جانے کے بعد! ــــــــــ اس کی دل گرفتگی اور بڑھ گئی، وہ اور زیادہ اضمحلال محسوس کرنے لگی۔ اور اس کے اردگرد اٹھتی ہوئی مبارکباد، مبارکباد کی آوازیں بڑی ہی بے اثر سی ہو گئیں۔ وہ ان سے بہت دور تھی، بہت دور! جہاں ان میں ایک مبارکبادی بھی اس کے لئے نہ تھی۔

وہ اپنے بچوں کو لئے ہوئے بازار چلی گئی جو کالونی کے ایک حصہ میں کرسمس کے لئے لگایا گیا تھا۔ یہ مبارک ہفتہ تھا، یہ مقدس ہفتہ تھا، آج رات سانتا کلاز اپنی بے پہیوں کی گاڑی پر سوار رینڈیر کو ہانکتا ہوا، فضا میں پرواز کرتا ہوا آئے گا۔ اس کے سرخ و سفید، مضحکہ خیز بھڑکیلے کپڑے اور اس کی سفید لمبی داڑھی اور سفید بال ہر دو برفانی جھونکوں سے لہرا رہے ہوں گے۔ اس کی گاڑی کھلونوں، چاکلیٹوں اور ٹافیوں سے بھری ہوگی اور وہ دریچوں میں جھلملاتی جگمگاتی ہوئی شمعوں کو دیکھ کر چھت پر اتر آئے گا اور بچوں کے ہاتھوں، آتش دان کی کارنس میں لٹکائی ہوئی جرابوں میں، تحفے تحائف بھر کر شجر کرسمس کے پاس رکھ دے گا۔ اور صبح اٹھ کر بچے اپنی جرابوں کو تحفوں سے بھری ہوئی دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔ بھاگے بھاگے پھریں گے اور دوسروں کو دکھائیں گے۔

لیکن اس تصور کے پیدا ہوتے ہی اس کے ہونٹوں پر ایک زہر خند پھیل گیا۔ وہ جانتی تھی کہ سانتا کلاز کے یہ تحفے اس کو کتنے گراں پڑتے تھے، اور ہیرس کی کتنے دنوں کی مشقت محض سانتا کی اس فیاضی کی نظر ہو جاتی تھی۔

بازار میں گوٹ کناری کی دکان کے سامنے سے گذرتے ہوئے بچے ٹھہر گئے۔ اس نے چاہا کہ وہ آگے بڑھ جائے لیکن بچوں نے بڑے ملتجیانہ لہجے میں اس کے قدموں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

"ممی گوٹا کناری لیں گے!"

"کیوں؟ ــــــــــ کیا ضرورت ہے؟" اس نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

اس کے لہجے سے اظہار ہوتا تھا۔ اس کا خریدنا تو پیسے خراب کرنا ہے۔

"ممی کرسمس ٹری کے لئے!"

"لیکن گھر پہ تو بہت سا رکھا ہے۔ اب اور لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

اور بچے روہانسی صورت بنا کر چپ ہو گئے۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں سانتا کلاز کو یوں ٹالا نہیں جا سکتا ورنہ وہ بھی ہمیں نظر انداز کر جائے گا۔ وہ حسرت سے کھڑے ہوئے گوٹے کناری کو دور سے دیکھتے رہے۔ اس کا دل پسیج گیا اور اس نے اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے دو ایک روپے کا سامان لے ہی لیا۔ بچوں کے چہرے ایک بار پھر کھل اٹھے اور وہ آگے بڑھ گئے۔

تمام دوکانیں، جھنڈیوں، مالاؤں اور پھولوں سے سجی ہوئی

تھیں۔ جگہ جگہ سازوں پر مناجات کی دھنیں بجائی جا رہی تھیں۔"
آہستہ آہستہ دکانوں کے سامنے سے گذرتی رہی۔ معمولی پلاسٹک اور ربر کے کھلونے خریدتی رہی۔ پھر اس نے ٹافیوں اور چاکلیٹوں کے سستے پیکٹ خریدے اور بچے ایک بار پھر موم بتیوں کے خریدنے پر مصر ہو گئے۔

"ممی یہ بتّیاں بہت باریک ہیں۔ یہ بتّیاں بہت جلد بجھ جائیں گی" جم ممنانے لگا۔

"ہاں ممی یہ بجھ جائیں گی تو سانتا کلاز ہمارا دریچہ کیسے دیکھے گا؟" منٹو بھی مچلا۔

لیکن وہ جانتی تھی کہ ان بتیوں پر سانتا کلاز کا آنا منحصر نہیں انہیں جو کچھ سانتا کلاز سے ملنا ہے وہ تو پہلے ہی سے مقدر ہو چکا ہے وہ سانتا کلاز کے بے پہیوں کی گاڑی میں نہیں، اس وقت اس کے تھیلے ہی میں ہیں۔ لیکن پھر بھی اس نے بچوں کے تصور کو مجروح کرنا پسند نہیں کیا۔

"نہیں یہ ٹھیک ہیں، یہ بجھیں گی نہیں۔ ہم انہیں سوتے وقت جلائیں گے۔ پھر تو یہ دیر تک جلتی رہیں گی۔"

"لیکن ممی اگر سانتا کلاز پہلے ہی گزر گیا تو؟"

اور وہ ایک دم ٹھٹھک کر رہ گئی   سانتا کلاز تو گزر بھی چکا۔ یہ بچارے بچے کیا جانیں۔ انھیں کیا خبر کہ وہ سانتا کلاز کے لئے خواہ کتنا ہی اہتمام کریں لیکن سانتا کلاز ان کو اس سے زیادہ نہیں دے سکتا جتنا، اس کے والدین کفیل ہو سکتے ہیں۔

"نہیں ایسا نہیں ہے۔" اس نے ایک بار پھر بچوں کو دلاسا دیا۔ "سانتا کلاز تمہارے سونے سے پہلے کیسے گذر جائے گا؟"

لیکن یہ ایک اور جراحت تھی جس نے اس کو اور بھی زیادہ پژمردہ کر دیا تھا۔ دوسرے بچے ہنستے اور شور کرتے ہوئے فٹ پاتھ پر گذر رہے تھے اور ان کے والدین اچھے اچھے کھلونے خرید رہے تھے لیکن جب بھی اس کے بچوں نے کسی اچھے کھلونے کی طرف اشارہ کیا، اس نے فوراً ان کو بہلا دیا۔

"دیکھو یہ اچھا نہیں ہے، یہ بہت مہنگا ہے، یہ بہت جلد ٹوٹ جاتا ہے، بس ہاتھ میں لیتے ہی ٹوٹتے۔"

اور بچے اس کی باتوں پر یقین نہ کرتے ہوئے بھی مان جاتے تھے، کیونکہ وہ ابھی منٹو اور شام اور جم تھے۔ مرتھا اور ہیرس نہ تھے۔ وہ حسرت سے کھلونوں کی طرف تکتے ہوئے رہ جاتے تھے، اور اس کے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگتی تھیں۔ بھلا وہ مسرت بھی کیا جو زر سے خریدی جاتے۔ وہ انبساط اور خوشی بھی کیا جو بغیر دام نہ دستیاب ہو سکے؟   وہ خوش رہنا چاہتی ہے، اپنے بچوں کو خوش رکھنا چاہتی ہے۔ غم کی، مایوسی کی، ہلکی سی سیاہی بھی دلوں کے تقدس پر طاری ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی تھی   لیکن اس کا مداوا کیا ہے؟ —— کچھ بھی نہیں؟ —— وہ اس طرح بازار میں گھومتے گھومتے اکتا چکی تھی

"ہیرس اب چلنا چاہیئے۔ وقت کافی ہو چکا ہے۔"

"ہاں چلو، اب ہم کچھ خریدیں گے بھی تو نہیں۔"

ہیرس نے کچھ ایسے انداز میں کہا جیسے کچھ خریدنا اب اس کے بس میں بھی نہیں رہا تھا وہ خود بھی سمجھ رہی تھی۔ وہ دونوں واپس ہونے لگے لیکن بچے بضد ہو گئے۔ وہ ابھی کچھ دیر اور گھومنا چاہتے تھے

"مگر دیکھو نا، ابھی تو کنسرٹ بھی دیکھنا ہے۔ وہاں نہ چلوگے کیا؟"

اور بچے ایک بار پھر بہلاوے میں آ گئے۔ اور سب گھر واپس آ گئے لیکن بچے کیا وہ خود بھی یہ محسوس کر رہی تھی کہ گھر اب پہلے کے مقابلے میں اور بھی سنسان ہو گیا ہے، ایک عجب بے کیفی چاروں طرف چھا گئی ہے کرسمس بازار کے ہنگامے۔ اور پھر ہنگامے کے مقابلے میں یہ کامل سکوت۔ یہ ناقابل برداشت تھا۔ اس لئے سب نے ہی جلدی جلدی دوپہر کا لنچ کھایا اور کنسرٹ کے لئے کلیسا کی طرف چل دیئے۔ راستے بھر وہ عجیب کیفیت محسوس کرتی رہی۔ جیسے وہ افسردہ بھی تھی اور افسردہ نہیں بھی تھی۔ جیسے اس کا دل گھبرا بھی رہا تھا اور جیسے دل میں کوئی خواہش اور کوئی تمنا بھی نہ تھی۔

کنسرٹ کے لئے کلیسا کے کمپاؤنڈ میں شامیانوں کو خوب سجایا گیا تھا۔ سہ پہر کی سنہری پڑتی ہوئی دھوپ اپنی لطیف تمازت سے محروم ہوتی جا رہی تھی۔ کالونی کے بسنے والے بے پایاں مسرت میں

ے ہوئے کلیسا کے سامنے چہل قدمی کر رہے تھے اور غیر مسیحی مہمان مسیحیوں
، ساتھ بڑے محبت آمیز لہجے میں گفتگو کر رہے تھے۔ کنسرٹ کے شروع
نے میں کافی دیر تھی۔ ابھی پورے مہمان نہیں آئے تھے۔ ٹام، جم اور
اس کے پاس سے جا کر دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگے تھے لیکن اس
نت بھی اس کا دل دکھ رہا تھا۔ وہ بچے کھیل نہیں رہے تھے، بس اتفاق
، ساتھ کھڑے ہوئے دوسروں کو کھیلتے اور شرارتیں کرتے دیکھ رہے
ے، انہیں کھیلنے کا موقع کہاں ملتا۔ ان کے پاپلین اور گبرڈن کے ارزاں
ڑوں میں اتنی جاذبیت کہاں تھی کہ وہ خوش پوش سجے سجائے بچوں کو
ی طرف متوجہ کر سکے۔

"ہیرس! یہاں کھڑے رہنے سے بہتر ہے کہ ہم اندر چل کر بیٹھیں"
ں نے ناقابل برداشت اذیت کے ساتھ اپنے شوہر کو مخاطب کرتے
دے کہا۔

"ہاں تم بچوں کو پکار لو" ہیرس نے کچھ اس طرح جواب دیا جیسے
ں ماحول میں دولت اس کا منہ چڑا رہی ہو۔

اس نے بچوں کو بلا لیا اور وہ سب پچھلی بنچوں پر جا کر بیٹھ گئے
لی بنچیں ان کے لئے نہیں تھیں۔ ان پر ناموں کی چٹیں چسپاں تھیں
عزز مسیحیوں کے لئے! جو چمکتی ہوئی کاروں میں، بہترین ملبوسات
یں آئیں گے اور ان مہمانوں کے لئے جنہیں ان مسیحیوں نے مدعو کیا ہو گا
لبتہ وہ مہمان جن کو مرتھا کے جیسے خاندانوں نے مدعو کیا ہو گا وہ ان کی اپنی
ہی صفوں میں بیٹھیں گے۔ یہ قاعدہ وہ اپنی عمر کے اس سال تک دیکھتی
ائی تھی لیکن یہ آج ہی کیوں اس کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔ وہ
یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ ایک گتھی کو ذہن میں لئے ہوئے وہ بے آرام سی
بیٹھی رہی۔

کنسرٹ شروع ہونے سے پہلے اس نے کئی بار سوچا کہ وہ واپس
چلی جائے۔ یہاں آنے سے اس کی بے کیفی اور خلش میں کوئی کمی نہیں ہوئی
ہے بلکہ اذیت کا احساس اور بھی بڑھتا چلا جا رہا ہے اور خود کو اور بھی
زیادہ پستی میں گرا ہوا محسوس کر رہی ہے۔ مگر ٹام، جم اور پنٹو کی دلچسپی
کی خاطر وہ اپنی مرضی کے مطابق ایسا نہ کر سکی۔ بس اسی وجہ سے وہ خود
کو بنچ میں مقید کئے رہی۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ آرکسٹرا کا ترنم فضا

میں گونجنے لگا۔ اس کا ذہنی کھچاؤ کسی حد تک کم ہو گیا۔ اب وہ خود کو قدرے
پرسکون محسوس کرنے لگی۔ پھر بھی اسے یہ پتہ نہ چلا کہ کنسرٹ کب شروع
ہوا۔ وہ اس وقت چونکی جب تالیوں کا شور بری طرح گونج رہا تھا اور
یہ فینسی ڈریس کا مظاہرہ تھا! ——— کیرول کی بچی انجیلا ایک
ملکوتی لحاظ گرانہ لباس میں اسٹیج پر کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک
بڑا بدہیئت کاسہ تھا اور اس کے ناخنوں پر قیمتی پالش درست چمکتی
ہوئی نظر آ رہی تھی اور ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی اس روپ کا اور
اور بھی زیادہ مذاق اڑا رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی ہی تلخ مسکراہٹ
پھیل گئی۔ اس کے ذہن میں کسی نے چٹکی لے لی۔ زر و سیم کے ڈھیروں
سے کھیلنے والی انجیلا کے جسم پر یہ لباس اس قدر تحسین کا مستحق ہے اور خود
کالونی کے ناقابل التفات کونوں میں گوارڈس میں پڑے ہوئے انسان
معمولی سے التفات کے حقدار بھی نہیں۔ ان کا افسانوی بہروپ بھی تمام
نظروں میں کھب جاتا ہے اور حقیقی پیکر کسی کو بھی متوجہ نہیں کر پاتے؟

اُف۔ دنیا حقیقت سے نظریں چرا کر کس نامعلوم رخ پر کس
نامعلوم منزل کی طرف بھاگی چلی جا رہی ہے؟ آخر اس طرح ایک چیز کو
اس کے مقام سے ہٹا کر کسی ناموزوں جگہ پر رکھ دینے سے کیا حاصل
پالش لگے ناخنوں اور مرمریں سفید انگلیوں میں یہ کاسہ کیوں پکڑا دیا
گیا ہے؟ اس کے ذہن میں پنٹو کے جملے بازگشت کرنے لگے۔ "فلش
ہماری ہنسی اڑا رہا تھا۔ کہتا تھا ہمارے کپڑے خراب ہیں اور ہم برے ہیں
اور ہم سے اس کی ممی اور پاپا بات کرنا بھی پسند نہ کریں گے اور وہ ایسے
لڑکوں کو اپنے ساتھ کھلانا نہیں چاہتا" ——— ہاں ٹھیک ہے وہ
کیرول کی بچی انجیلا تو نہیں؟ ——— تمام خوشیاں اور تمام مسرتیں
اور تمام توجہات کا صرف ایک مرکز؟ یہ دولت؟ یہی جسے
انسان کے اپنے ہاتھوں نے جنم دیا تھا۔ مگر یہ تو آج خود انسانوں کو جنم دے
رہی ہے۔ ایسے بڑے انسانوں کو جو انجیلا کے باپ اور چچا جن کے لئے
چرچ کی نشستوں میں کارڈ لگتے ہیں۔ یہ کیسا صنم ہے جو انسانی،
ہاتھوں سے تراشا گیا اور انسانی پرستش کا واحد حقدار بن گیا۔ کیا انسان
خود اپنے ہی ہاتھوں مجبور ہے۔ اوہ خداوندا!

وہ کچھ اسی طرح سوچ رہی تھی کہ اسٹیج پر مارگریٹ کا بجتا پیتر سے۔

سانتا کلاز کے روپ میں نمودار ہوا۔ ایک بار پھر تالیوں کے شور سے فضا گونج اٹھی لیکن اس کا خون پھر کھول اٹھا۔ یہ کیا مذاق ہے؟ کیا یہ ہماری خوشیوں کے ٹھیکے دار بن بیٹھے ہیں؟ کیا سانتا کلاز بھی ہماری تحقیر کرنے پر اتر آیا ہے۔ سانتا کلاز کیا تم یہ احساس دلا رہے ہو؟ اسی لئے ناکہ ہم تمہارے التفات کو سیم و زر سے خریدنے کے لائق نہیں؟ —— بڑی دیر تک وہ ایسے ہی فینسی ڈریس کے مظاہرے دیکھتی رہی لیکن اس پر رقت طاری تھی اور اس کا دل و دماغ کہیں اور ہی تھا۔ وہ بڑی بے کلی کے ساتھ پہلو بدلتی رہی۔ وہاں بیٹھا رہنا اب آزمائش بن گیا تھا۔ ہر مظاہرہ اسے منہ چڑاتا تھا لیکن پھر جلد ہی وہ مختصر سی تمثیل شروع ہوگئی جس میں یسوع کا بچپن اور ان کی تبلیغ دکھائی گئی تھی۔

اس نے اطمینان کا سانس لیا —— کم از کم اب ہی وہ ان نفادتوں سے چھٹکارا پاسکے گی جن سے اب تک وہ اپنا پیچھا چھڑا نہ سکی تھی۔ لیکن یہ کیا؟ —— یسوع کے حواری فلٹن، انجیلا رابرٹ اور پیٹر —— اور یسوع کے دشمن، کوارٹروں میں بسنے والے ڈنکن، جونی، بیلی، اسپیررا —— کیا اس دنیا کی وسعتوں سے پرے بھی یہ اپنی دولت کا جال پھینکنے سے باز نہ رہے۔ کیا انسان کے قالب کے اندر کوئی بھی جھانک کر دیکھنے والا نہیں؟ یہ اندھیر ہے۔ یہ بے انصافی ہے، یہ ظلم ہے۔ اس کے اندر نفرت کا ایک مہیب جوالا مکھی پھوٹ پڑا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ وہاں سے نکل کر بھاگ جائے۔ لیکن ٹام، جم اور مینڈی کی دلچسپیاں بھاری بیڑیاں بن کر اسکے پیروں میں پڑگئیں۔ وہ اپنے آپ پر جبر کئے بیٹھی رہی اور اس کی شریانوں میں خون کھولتا رہا۔

کنسرٹ ختم ہونے کے بعد جب وہ وہاں سے اٹھی تو ایک اضطراب کے عالم میں اس کی نس نس اس طرح دکھ رہی تھی جیسے وہ برسوں کی بیماری کے بعد بستر علالت سے اٹھی ہو۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور شام کی خنکی کے باوجود اس کے ہونٹ خشک پڑ چکے تھے۔

جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو سورج قریب قریب ڈوب چکا تھا۔ اس نے جلدی جلدی چائے بنا کر سب کو پلائی۔ بچے باہر کھیلنے چلے گئے اور ہیرس پاس کے کوارٹر میں جونی کے باپ سے خوش گپی کرنے چلا گیا لیکن وہ سامنے بالکنی کے اندر کھلنے والی کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی اس کی پرانی ساری کے پرشے اب بھی ہلکے ہلکے ہل رہے تھے۔ موڈ بہت بے کیف تھی۔ بچے شام کے دھندلکوں میں دن بھر کے تمام واقعات سے بے پروا ہو کر کھیل رہے تھے۔ چیخ رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ ان کی زبانوں سے مناجاتوں کے ٹکڑے ادا ہو رہے تھے۔ وہ ان کو دیکھتے ہوئے بھی نمعلوم کہاں گم تھی۔ ان کے ان مشغلوں کا اسے ذرا بھی پتہ نہ تھا۔

تاریکی جب کافی بڑھ گئی تو اسے کوارٹر میں اندھیرے کا احساس ہوا۔ اس نے لیمپ روشن کیا۔ اور پھر دریچے میں کھڑی ہوگئی۔ آج دن بھر کے واقعات اس کے دماغ کو بری طرح جھنجوڑ رہے تھے۔ یکایک اسے خیال آیا یہ رات سانتا کلاز کی آمد کی رات ہے۔ اس نے آتشدان کی کارنس کی طرف مڑ کر دیکھا۔ بچے اپنے موزے لٹکا چکے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہر خند پھر پھیل گیا۔ اس نے ہیرس کا ایک بڑا موزہ اٹھایا اور ایک کیل سے آتش دان میں، بالکل غیر ارادی طور پر لٹکا نا ہی چاہا تھا، کہ ہیرس کمرے میں داخل ہوا اور استعجاب سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"مرتھا! تمہیں سانتا کلاز سے تحفہ چاہیئے کیا؟"

وہ مڑ کر چپ چاپ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"لیکن وہ تو کھلونوں سے بہلاتا ہے، سچی خوشی سے نہیں!"

ہیرس مسکرانے لگا مگر اس کے چہرے کا پھیکا پن اس مسکراہٹ کو دھندلا کر رہا تھا۔ مرتھا کے ہاتھ سے موزہ گر گیا۔ اس کی آنکھیں بے مقصد اسے تکتی رہیں۔ سچی خوشی؟ سچی خوشی۔ سچی خوشی کہاں میسر ہوگی؟ کہاں آخر؟ اے خدا۔

(بشکریہ "نئی نسلیں")

عالم اکبر آبادی ●

○

دیکھئے کب تک نبھے اُن کی روش اپنا چلن! — وہ خرد کی تمکنت اور ہم جنوں کا سادہ پن
تیرے دیوانے کبھی صحرا سے اُٹھ آئیں اِدھر — اس تمنا میں بہاریں ہو گئیں صرفِ چمن
آدمی اور غم کی خاطر مُسکرانا چھوڑ دے — زندگی کے مرحلوں میں اس قدر نازک نہ بن
چاند آوارہ ستارے منتشر گل سینہ چاک — رسم بن کر رہ گیا آخر میرا دیوانہ پن
سوچ لینا چاہیئے منزل سے پہلے ہم سفر! — کارواں کے ساتھ رہبر ہے یا کوئی راہ زن
جب سے تو نے کر دیا صیّاد پابندِ قفس — چھوٹے فکرِ آشیاں بندی سے یارانِ چمن
جب ضرورت پڑ گئی عنوانِ ہستی کے لئے — ہم سے دیوانوں نے بدلا ہے زمانے کا چلن

اُن سے عالم پوچھئے ہم سے خفا ہیں کس لئے
آج کیوں بدلا ہوا ہے اُن کا اندازِ سخن — !

———— + ————

م۔ نسیم ●

صدقہ

"چھ روپے دس آنے" اس نے میٹر دیکھکر کہا۔ پھر سیدھا ہوکر ایک ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے ماتھے پر جھکے ہوئے ٹوپی کے چھجے کو اونچا کیا۔

مارواڑی نوجوان نے بے پروائی سے بٹوا نکال کر ایک پانچ کا نوٹ اور ایک دو کا نوٹ اسے دیا، اور دروازہ کھول کر ٹیکسی سے اتر گیا

"یہ لو سیٹھ! اپنا پیسہ" اس نے چھ آنے مارواڑی کی طرف بڑھائے۔

پہلے کی سی بے پروائی سے؛ اس مارواڑی نوجوان نے کہا "لے لو۔ چائے پانی کرنا" وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی بانہہ پکڑ لی۔

"ابھی ہم محنت کرتا ہے سیٹھ۔ سمجھا؟ لو۔ رکھو اسے" اس نے نوجوان کے ہاتھوں میں چھ آنے تھما دیئے۔ پھر ہاتھ آگے نکال کر میٹر کی پلیٹ سیدھی کی۔ ٹن سے گھنٹی بجی اور عددوں کی لائن میں سب صفر آ گئے۔ اپنی ریزگاری اس نے جیب میں ڈالی۔ ٹوپی کے چھجے کو سیدھا کر کے جھکا لیا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے مسکرا کر سیٹھ کو دیکھا۔ اور اسے حیران چھوڑ کر گاڑی تیزی سے بڑھ گئی۔

مین روڈ پر مڑتے ہوتے اسے ایک بوڑھا فقیر نظر آیا جس کی ایک ٹانگ پوری کٹی ہوئی تھی۔ وہ دوسری ٹانگ سکیڑے، لکڑی کی ہتھیلیوں کے بل چل رہا تھا۔ گاڑی بالکل اس کے برابر روک کر اس نے ایک روپیہ کا نوٹ نکالا، اور فقیر کے ہاتھ میں جھک کر دیدیا جو گاڑی دیکھ کر ٹھہر گیا تھا۔ نوٹ کو ہاتھ میں دیکھ کر فقیر حیرانی سے اس کے منہ کو تکنے لگا۔

"لے لو بابا۔ کچھ چائے پانی کرنا ہے کہ نہیں۔ ابھی ہم محنت کرتا ہے محنت! سمجھا؟" پھر ٹیکسی اس زناٹے سے مین روڈ پر مڑ گئی کہ فقیر کی نگاہیں اور اس کی دعائیں منہ تکتی ہی رہ گئیں۔

بس؟ اس کے دل نے پوچھا۔ کچھ بات نہیں بنی۔ اس نے دل سے کہا۔ خیر دیکھا جائے گا

فلورا فاؤنٹین کے پاس، دو جگہ سے گزرتے ہوئے ٹیکسی کے لئے آوازیں آئیں مگر اس نے ہاتھ ہلا کر انکار کر دیا۔ ذرا سا جھک کر میٹر کی پلیٹ ڈاؤن کر دی۔ پھر گاڑی چلاتے ہوئے کہنی کے سہارے بڑی چابک دستی سے اسٹیئرنگ سنبھال کر جیب سے سگرٹ نکال کر سلگا لیا۔

بوری بندر سے آگے نکل کر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کدھر جائے۔ دو رلیے تک آتے آتے اس کے ہاتھوں نے بے اختیار دائیں طرف وہیل گھما دیا اور گاڑی کرافورڈ مارکیٹ کی طرف مڑ گئی۔

مارکیٹ کے چوراہے پر ٹیکسی اسٹینڈ کے ایریا میں اس نے گاڑی داخل کر کے جونہی موڑنا چاہی کہ اندر سے آتی ہوئی دوسری ٹیکسی بالکل سامنے آ گئی۔ اس کا پاؤں پوری قوت سے بریک پر پڑا۔ چوں کی تیز آواز آئی۔ اور گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ بالکل دوسری گاڑی سے لگ کر رک گئی۔ بڑے غصے سے اس نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر جھانکا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اور وہ مسکرانے لگا۔ دوسری ٹیکسی سے نظر گل بلوچ سر نکالے ہاتھ ہلا کر ہنس رہا تھا

"اے استاد۔ اتنا تیزی!" نظر گل نے زور سے کہا۔ اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ "سلام علیکم" اس نے دروازہ کھول کر تقریباً باہر کودتے ہوئے اسے بڑھ کر گلے لگا لیا۔ "وعلیکم السلام" تو کب آیا گل؟ سب ٹھیک ٹھاک۔ شادی کا کیا بنا؟ کیا کر آیا شادی؟

"وہ سب خلاص ہو گیا استاد۔ بالکل خلاص۔ ہمارا بیوی شادی بنانے سے پہلے ہی مر گیا۔ ادھر قلات میں۔ ابھی ہم کو سال

ببر کا جپلی ادھر ہو گیا۔"

نظر گل کو بمبئی کا لہجہ بہت پسند تھا۔ مگر کوشش کرنے پر بھی وہ کبھی ٹھیک نقل نہ اتار سکا۔ اس کی بولی بمبئی زدہ بلوچی ہو کر رہ گئی تھی، نظر گل سے بات کرتے ہوئے، اپنے استاد کی جیب میں بے تکلفی سے ہاتھ ڈالا اور سگرٹ کا پیکٹ نکال لیا۔

"تب کیا تمہارے ماں باپ کو منج نہیں ہوا۔ تب ہی تم پھر کنوارا رہ گیا نا؟"

"ارے بابا۔ میرے کو موت نہیں آیا۔ تبھی کیا منج ہوگا۔ ہماری شادی نہیں ہوا۔ کوئی واندا نہیں۔ اچھا ہوا۔ ہمارا ماں باپ پھر بنا دے گا۔"

"تب کیا پھر پرمٹ بنانا ہوگا؟"

"سب چلتا ہے استاد۔ پرمٹ بھی بن جائے گا بابھی دوسرا بات بولو۔ ہمارا بھتیجے کا بتاؤ۔ ایک بھتیجا آیا نا؟" یہ کہتے ہوئے نظر گل نے دو سلگائے ہوئے سگرٹوں میں سے ایک اسے دیا۔

"بھتیجہ نہیں بھتیجی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا، اور سگریٹ کا گہرا کش لیکر دھواں زور سے اس کے منہ پر چھوڑ دیا۔

نظر گل نے برا سا منہ بنایا۔ نہ معلوم بھتیجی کی بات سن کر، یا دھوئیں کے حملے کے سبب پھر اپنے استاد کا منہ دیکھ کر وہ ایک دم ہنس پڑا۔ کمر میں ہاتھ ڈال کر دونوں، گاڑی کے مڈگارڈ سے ٹیک لگائے باتیں کرتے رہے۔

مگر اس کا جی باتوں میں نہ لگا۔

وہ صبح سے الجھن میں پڑا تھا۔ مگر مسئلہ ایسا ٹیڑھا تھا کہ بڑی مسجد کے امام صاحب بھی کوئی حل نہیں بتا سکتے تھے۔

سات دن ہوگئے جب اس کے ہاں نزہت ہوئی تھی اسکی پیدائش کی خبر سن کر اسے ایسا لگتا جیسے کسی جہاد میں جا کر وہ غازی بنا ہوا پلٹا ہے۔ سارے گھر والوں اور سب دوستوں سے وہ کب سے جھگڑ رہا تھا کبھی لڑتا کبھی روٹھ جاتا اور کبھی سب کو دلیلیں دے دیکر قائل کرتا۔ اس دوران میں اس کی بیوی مسجد کی طرح مقدس اور گمبھیر ہوتی چلی گئی۔ وہ رات کو اپنی ہونے والی بچی کو خواب میں کھلاتا، لوریاں دے کر سلاتا۔ اور صبح کو اٹھکر روزانہ خدا کو قائل کرنے کی کوشش کرتا۔ دیکھئے اللہ میاں! میں باپ ہوں باپ کی دعا سب سے پہلے سنیئے۔ لڑکی ہی ہونی چاہیئے۔ پھر جوں جوں نزہت کے دنیا میں آنے کا وقت قریب آتا گیا۔ اس کی گھبراہٹ بڑھتی گئی۔ اپنی بیوی کو وہ ہر بات کی اتنی زیادہ ہدایتیں دیتا کہ وہ تنگ آ کر کہتی۔ خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ بچہ میرے ہاں ہوگا کہ تمہارے ہاں۔ یہ سن کر وہ جھینپ گیا۔ مگر کچھ ہی دیر بعد نصیحتیں پھر شروع ہو جاتیں۔

جب نزہت پیدا ہوگئی تو اسے یقین نہیں آیا تھا، سب کے منع کرنے پر بھی وہ بیوی کے کمرے میں جا گھسا اور بچی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں بیوی کا شکریہ ادا کیا۔ وہ منہ پھیر کر ہنسنے لگی۔ وہاں سے باہر آکر اس نے بڑے فخر سے سب کو دیکھا۔ اور پھر اعلان کر دیا کہ بچی کا نام نزہت ہے۔ جو وہ شادی سے پہلے ہی طے کر چکا تھا۔ اس کی ماں اپنی تین بیٹیوں کی شادی کا عذاب سہہ چکی تھی۔ اس کا ایمان تھا کہ لڑکی پیدا ہوتی ہے تو زمین رنج کے مارے ایک گز زمین میں دھنس جاتی ہے۔

وہ شروع میں اس کی باتوں کو کبھی مذاق سمجھتی اور کبھی متفکر ہو جاتی لیکن اب واقعی بچی پیدا ہونے کے بعد بھی جب وہ مسرور نظر آیا۔ بلکہ جب بچی پر سب کے سامنے فخر کرتے دیکھا تو سارے شبے اس کے دل سے نکل گئے اور وہ خوش خوش خاطر مدارات میں لگ گئی۔

اس کے ٹھیک ساتویں دن بچی کا عقیقہ ہوا۔ قربانی کے بعد اس نے کچھ خیرات روپے ماں کو خیرات کرنے لئے بھی دیئے۔

مگر ابھی تک وہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔

بچی کی پیدائش سے پہلے ہی اس نے بچی کا صدقہ مانا ہوا تھا لیکن کسی کو بھی اس کی خبر نہ تھی۔

مگر آج سات دن ہو گئے تھے اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ صدقہ کیسے دے۔ کیسے دے۔ پہلے دل میں اس نے رذیلوں کی تعداد بڑھائی۔ مگر اس سے تسلی نہیں ہوئی۔ صدقہ تو ایک پیسے کا بھی ہو سکتا ہے پھر اس نے سوچا اچھا، کسی کا کام ٹھیک کرا دوں۔ مگر کس کا؟ نظر گل کو دیکھتے ہی اسے خیال آیا۔ چلو کام بن

گیا۔ مگر یہ سن کر کہ وہ پھر کنوارہ رہ گیا۔ اسے ایسا لگا کہ جیسے اس کا صدقہ کسی نے پھر اسی کے ہاتھ پر رکھ دیا ہو۔ یوں۔ نظر گل اس قدر شدید بلوچی تھا کہ ایک پیسہ لینے کا بھی روادار نہ ہوتا۔ اپنے استاد ہی کے لہجے میں وہ کہتا۔ "ابھی ہم محنت کرتا ہے استاد۔ محنت! سمجھا؟ آں؟"

باتیں کرتے کرتے اس نے گل کی جیب ٹٹول کر نسوار کی ڈبیا نکالی۔ اور ایک چٹکی سونگھ کر ڈبیا اپنی ہی جیب میں رکھ لی۔ پھر پوچھا "یہ گاڑی کس کی ہے؟" گل بولا: "دوسرے کی ہے، تم کو آتے دیکھا تو تھوڑا بڑھا دیا مسخری کرنے کو۔" وہ بولا: "اچھا تو چل تجھے ٹیکسی والا لالو بنا دوں" گل اس کی ٹیکسی میں بیٹھ گیا، اور وہ اپنے مالک کے گیراج کی طرف چل دیا۔

گل کو ٹیکسی دلا کر اور رخصت کر کے جب اس نے اپنی ٹیکسی.. بڑھائی تو اس کی بے اطمینانی اسی طرح باقی تھی پچاس روپے ایڈوانس اس نے آج گل کی طرف سے دیدیئے تھے۔ مگر اسے معلوم تھا کہ رقم بنتے ہی کل یا پرسوں، گل اسے روپے لوٹا دے گا۔ وہ پکا بلوچی تھا۔

ورلی ناکے سے مڑ کر سیدھے مہالکشمی کی طرف چلتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں خدا کو پھر قائل کیا۔ "اب تم ہی سوچو اللہ میاں کوئی رستہ بنے گا کہ نہیں۔ اپنا تو سوچتے سوچتے ماتھا خراب ہو گیا" اس کے دل نے کہا: "ابھی یہ بات چھوڑ دو استاد۔ دھندا کرو دھندا۔ ایسا ہی خالی پیلی گھوما پھیری کرو گے تو ٹھنڈا ہو جائے گا۔" اس نے کہا ٹھیک ہے۔ دھندا ہونا چاہیئے۔" اور ٹیکسی آہستہ کر کے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

آگے بس اسٹینڈ تھا۔ بس ابھی روانہ ہوئی تھی۔ لائن کے جو لوگ بس میں چڑھنے سے باقی رہ گئے تھے، ان میں سے دو تین آگے بڑھ چکے تھے اور دو تین ابھی کھڑے تھے۔ ان سے کچھ ہٹ کر الگ کھڑی ہوئی ایک لڑکی کے پاس ٹیکسی روک کر اس نے کہا:۔

"ٹیکسی ——— بائی؟"

لڑکی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے نظر جھکا لی۔ بمبئی میں رہ کر بھی گھورنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی اسے اندازہ ہوا کہ لڑکی پریشان سی ہو گئی ہے۔ ایک لمحہ متامل رہی، پھر آگے بڑھ کر ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

میٹر گراتے ہوئے اس کی نظریں باہر کھڑے ہوئے لوگوں سے چار ہوئیں، جن کی آنکھوں میں رشک بھی تھا اور طنزیہ ہنسی بھی، اسے یاد آگیا۔ یہ تو مہالکشمی ہے۔ فلمی پروانوں کا تاج محل، جس میں ان کے بجائے ہمیشہ ان کی امیدیں دفن ہوتی ہیں ———

"ورلی ناکہ" سن کر اس نے گاڑی بڑھائی اور ہلکی رفتار سے چلنے لگا لڑکی اس طرح بیٹھی تھی کہ سامنے کے ننھے سے شیشے میں اسے اس کا آدھا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ادھر نظر نہیں کی مگر نہ دیکھنے پر بھی لڑکی کے چہرے کا اتار چڑھاؤ الگ معلوم ہو جاتا تھا اس نے جو دھوپ کا چشمہ پہن رکھا تھا وہ اتار دیا۔ شاید ٹیکسی میں اسے کسی کی نگاہوں سے بچنے کی ضرورت نہ تھی۔ ڈرائیور کی طرف دو ایک بار دیکھ کر اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ اسے نہیں دیکھ رہا ہے۔ پہلے اس کے چہرے پر فکر مندی چھائی رہی۔ پھر اس نے سر کو جھٹکا دے کر وہ خیالات جیسے ذہن سے جھاڑ دیئے۔ اس نے دیر سے پکڑے ہوئے پرس کو بھی ہاتھ کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اپنی چمکیلی ساڑھی کی شکنیں درست کیں پلو کو ٹھیک کر کے کندھے پر جمایا۔ اور کھڑکی کے پاس کھسک کر وہ باہر دیکھنے لگی۔

اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ لڑکی بمبئی کی زندگی میں بہت کم ٹیکسی میں سوار ہوئی ہے۔ "اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے کپڑوں اور پرس سے جتنی امیر نظر آتی تھی اتنی تھی نہیں۔" اس کے دل نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا استاد۔ کہ یہ بھی مہالکشمی کے فلمی پروانوں میں سے ہے۔ جو ہر روز اتنے زیادہ اس شمع پر نثار ہوتے ہیں، کہ ٹرک بھر بھر کر باہر بھیجے جائیں تو بھی کم نہ ہوں۔" اس نے دل سے کہا "ٹھیک کہتا ہے یار۔" اسے کچھ افسوس ہوا۔ بے کار ایسی سواری کو بٹھا کر اسے بھی مصیبت میں ڈالا، اور اپنی مزدوری بھی کھوئی کی۔ یہ تو آگے جا کر، چودہ آنے پیسے پکڑا کر اتر جائے گی۔ میل ڈیڑھ میل سے زیادہ تو یہ لڑکیاں دکھانے کے لئے بھی نہیں بیٹھ سکتیں چاہے گھر دس میل کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ ٹیکسی پر دس میل کا مطلب ہے۔ سات روپے اور بس میں زیادہ

سے زیادہ سات آنے ——— وہ بمبئی کی سڑکوں ہی کو نہیں ان پر چلنے والوں کو بھی خوب جان گیا تھا۔

مگر وہاں تک پہنچکر اس کا خیال کچھ بدل گیا۔ کیونکہ لڑکی نے بے پروائی سے اسے آگے بڑھنے کی ہدایت کی۔ پھر جب ایک سائڈ اسٹریٹ میں مڑکر دو موڑ آنے کے بعد لڑکی نے ایک کھلے برآمدے کے کشادہ فلیٹ کے آگے گاڑی رکوائی۔ تو اس کا شبہہ قریب قریب ختم ہوگیا۔ انجن بند کرکے اس نے پہلی بار نگاہیں سیدھی کیں اور اس لڑکی کو شیشے میں دیکھا۔ پھر نہ معلوم اس کے اندر کون سی مہذبانہ لہر اٹھی کہ موٹر سے اتر کر وہ دوسری طرف گیا اور لڑکی کی طرف والا دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

لڑکی اپنا چشمہ پھر لگا چکی تھی۔ جس طرح وہ ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے ذرا جھجکی تھی۔ ایسے ہی ٹیکسی سے اترتے ہوئے کچھ رکی، پھر باہر نکل کر اس نے پرس کھولا۔ ایک پانچ کا نوٹ نکالا۔ اسے دو انگلیوں کے بیچ میں دبائے کچھ سوچتی رہی۔ پھر پرس کھول کر اس میں نوٹ واپس رکھتے ہوئے بولی:۔

"دیکھئے آپ ذرا بھی ٹھہرے رہیں۔ میں آتی ہوں"

"جی بہتر ہے" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ جاتے ہوئے کچھ رک گئی۔ حیران سی ایک نظر اس پر ڈالی۔ پھر اندر چلی گئی۔

دراصل وہ اس کی بات سن کر چونک پڑا تھا۔ ایک دم، اس طرح جیسے کسی بدمذاق آدمی کے منہ سے۔ بھولے سے کوئی اچھا شعر سن کر ایک سخن فہم اچھل پڑے۔ لڑکی کی زبان میں جو لوچ اور شائستگی تھی، اور اس میں منجھی ہوئی اردو کا کوئی گھرانہ بول رہا تھا۔

ٹیکسی کے پاس سے ہٹ کر وہ احاطہ کی دیوار تک گیا اور ہاتھ ٹیک کر کسی قدر آگے جھکتے ہوئے ادھر اُدھر نظر ڈالی۔

دیوار کے ساتھ لگے ہوئے ایک درخت کے نیچے پتھر کی بنچ پر ایک پٹھان دہری صدری کے ایک کاندھے پر پہنے چمٹے سے مونچھوں کے بال ٹھیک کر رہا تھا۔ اسے جھکا دیکھ کر پٹھان نے چھوٹا سا شیشہ سامنے سے ہٹا لیا۔ ابھی اس کے منہ سے کچھ نکلا نہیں تھا کہ وہ بولا:

"سلام علیکم۔ لالہ"

پٹھان کی مونچھوں سے دونوں سرے کانوں کی طرف دوڑ گئے۔ اس نے گردن ہلا کر اسے پاس آنے کو کہا: "وعلیکم السلام"

وہ اندر چلا گیا۔ بنچ پر پٹھان کے پاس بیٹھکر اس نے چند لگی بندھی باتیں کیں۔ چند لگی بندھی باتیں سنیں وہ باتیں جو بمبئی کی زندگی میں تعلق کی ابتدا بھی تھیں اور انتہا بھی۔ جو اس سنگین شہر کے ہر پتھر میں ایک لکیر کی طرح کھدی ہوئی تھیں۔ مگر ان ہی لگی بندھی باتوں سے پٹھان کو پتہ لگ گیا کہ وہ چھ سات سال سے ٹیکسی چلاتا ہے اور اندر والی بائی کو ابھی مہالکشمی سے لایا ہے اور اس کے ہاں ایک بچی ہوئی ہے جس کا نام دو سال پہلے ہی سے نزہت ہے اور اس سے وہ بہت خوش ہے۔

باتیں کرتے ہوئے اسے گل کی نسوار یاد آگئی۔ جیب سے ڈبیہ نکال کر اس نے پٹھان کے سامنے کردی۔ ایک چٹکی لیتے ہی پٹھان کی آنکھیں کھل گئیں "آہ۔ قسم اللہ کا! ایسا نسوار تم کدھر سے لایا بائی؟" اس نے ڈبیا جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"لالہ! یہ ہمارا ایک بلوچی دوست قلات سے لایا"

پٹھان کو اپنے پشاور کے قصہ خوانی بازار کی یاد آگئی۔ جہاں آلو بخارے، کشمش، گل بنفشہ اور بکرے کی ثابت سری ملتی ہے، وہ وہاں کی نسوار کی کرامتیں گنانے لگا ——— اور وطن کی یاد سے اسکی ہلکی آنکھوں میں چمک آگئی۔

اپنی لگی بندھی باتوں میں پٹھان نے بتایا۔ وہ فلیٹ کے مارواڑی مالک کا چوکیدار ہے۔ سیٹھ۔ اللہ کا قسم بہت مکھی چوس ہے اتنا چھوٹا سا فلیٹ کا تین ٹکڑے کرکے سب بھاڑے پر دیئے ہے پیچھے کا ایک کمرہ بھی الگ بھاڑے پر دیا ہے۔ جو بائی ابھی تمہارا گاڑی میں آیا نا۔ اس کا ایک سہیلی پہلے پیچھو والا کمرے میں رہتا تھا۔ اب اللہ نے اس کا قسمت کھول دیا۔ اس کا۔ بڑھیا فلم میں دھندا لگ گیا۔ اب وہ کسی اچھا فلیٹ میں چلا گیا۔ تبھی یہ کمرہ اس بائی کو دیدیا۔ یہ بائی مسلمان ہے ادھر حیدرآباد سے آتا پڑا ہے۔ ابھی اللہ نے اس کا قسمت نہیں کھولا۔ تبھی اس پیچھو والا کمرہ میں رہتا ہے۔ کوئی دھندا نہیں۔ ایک حسینہ کا بھاڑا آگے چلتا ہے۔ بمبئی میں سب لوگ کا حال

پتلا ہو جاتا ہے۔"
"ارے لالہ۔ یار کلاک ہو گیا۔ بائی ابھی آنے کو بولا تھا۔ کیا گڑبڑ گھوٹالہ ہو گیا" وہ یہ کہہ کر اٹھا۔ خان بولا۔
"ارے بابا۔ ابھی آئیں گا۔ تم ادھر بیٹھو۔ کچھ ادھر قلات کا بات بولو۔"
مگر وہ قلات کا بات نہیں بولا۔ آگے بڑھ کر وہ نل کے دروازے سے ہوتا ہوا فلیٹ کے پچھلی طرف گیا۔ ایک کھڑکی کے پاس سے گزر کر وہ پھر واپس لوٹا۔ وہ لڑکی اسی کمرے میں کپڑے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ گھبرا گئی۔ وہ بھی چور کی طرح شرمندہ ہو گیا۔ مگر وہ سنبھل کر بولی: "بس ابھی آتی ہوں۔"
وہ لوٹ آیا۔
تھوڑی دیر میں لڑکی واپس آئی۔ ٹیکسی میں بیٹھکر، کسی قدر اٹکتے ہوئے وہ بولی۔
"دیکھئے۔ ذرا آگے بڑھا کر اندر گلی سے فلیٹ کے پچھلی طرف موڑ لیجئے۔"
"جی بہتر ہے۔"
"نہ معلوم کیوں، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ وہ اس کے کہنے کے مطابق آگے بڑھا کر پچھلی اسٹریٹ میں لے گیا۔
"بس یہیں" کہہ کر لڑکی نے گاڑی رکوائی۔ اور اترکر فلیٹ کے احاطے کے پاس گئی۔ پھر پیشت کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ دیوار کے قریب کنج کے پاس وہ جھکی، اور پھر الٹے قدموں جلدی سے لوٹ آئی۔ اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔
درآمی ناکے تک پھر گاڑی لاتے لاتے اس نے پورا معاملہ سمجھ لیا۔ لڑکی، کرایہ نہ ہونے کے سبب چپکے سے کمرہ چھوڑ کر چلی آئی ہے، لڑکی پر رحم بھی آیا اور غصہ بھی۔
"کیسا دھندا کرتا ہے تم استاد۔ بالکل گڑ بڑ گھٹالہ۔" وہ دل سے بولا۔ "تھوڑا اور چپ رہو لالہ" دل اور تھوڑا چپ ہو گیا۔"
کئی سڑکوں سے گزر کر ایک جگہ لڑکی نے گاڑی رکوائی۔ اس نے ٹوپی کا کنارہ پکڑ کر پیچھے کھسکایا اور جھک کر سامنے والے بورڈ کی طرف دیکھا۔ یہ ایک ہوٹل تھا۔ ہاتھ سے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بولا۔
"کیا آپ ادھر اس ہوٹل میں ٹھہریں گی؟"
لڑکی کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں جیسے کسی نے اس سے کہا ہو؟ "اس اونچے ہوٹل میں آپ ٹھہریں گی؟ آپ!" کچھ سخت لہجے میں وہ بولی "کیوں؟"
"جی کچھ نہیں۔ یہ ہوٹل آپ کے لئے ٹھیک نہیں۔ ادھر اچھی عورتیں نہیں آتیں۔ یہاں دوسرا دھندا ہوتا ہے۔"
پیشانی کی شکنیں صاف ہو گئیں، مگر پھر لکیریں پڑ گئیں۔ اس بار خفگی کی نہیں تفکر کی۔ سوچتے سوچتے اس کا ہاتھ بٹوے کی طرف بڑھا۔ کھلے ہوئے پرس میں اس کی دو انگلیاں گئیں۔ غالباً نوٹ تھامنے، پھر گردن ٹیڑھی کرکے اس نے میٹر کو دیکھا۔ اور اس کی آنکھوں کی گھبراہٹ پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ اس کی انگلیاں پرس سے باہر آگئیں پھر کچھ تامل کے بعد وہ دوبارہ پرس میں جاکر ایک پرچہ نکال لائیں، اسے کھول کر وہ دیکھتی رہی۔ پھر گاڑی سے باہر آئی کچھ دور جاکر ڈاک خانے کے برابر لگے ہوئے ٹیلیفون بوتھ میں چلی گئی۔
جب وہ باہر نکلی تو پریشانی اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی ٹیکسی کی طرف بڑھتے ہوئے وہ رکی۔ پرس کھول کر اس میں سے ایک لفافہ نکالا۔ اس کے ساتھ ہی ایک پرچہ نکل کر گر پڑا۔ جس کی اسے خبر نہ ہوئی۔ مگر اس نے ٹیکسی ہی میں سے دیکھ لیا۔ یہ وہی پرچہ تھا، جو ابھی ذرا دیر پہلے اس نے پرس میں سے نکال کر دیکھا تھا۔ اس نے آواز دے کر لڑکی کو بتانا چاہا۔ مگر وہ لفافہ ہاتھ میں لئے تیزی سے ڈاک خانہ میں چلی گئی۔
اس نے ٹیکسی سے اتر کر وہ پرچہ اٹھا لیا۔ اس پر لکھا تھا
"پیاری حیدری! آج میں اسٹوڈیو جاتے ہوئے بس چھوڑ کر تمہارے گھر آئی۔ جب تم نے بلایا تھا تو ٹائم بھی دیا ہوتا۔ نہ معلوم تم کہاں گئی ہوئی تھیں۔ مجھے بیکار کا چکر کرنا پڑا۔ تم نے یہ بھی تو نہیں لکھا کہ کیا بات ہے۔ تم کیوں پریشان ہو

شاید ہیروں کا معاملہ ہے۔ مگر میری بہن کل میرا بھی کام پورا ہو چکا ہے۔ ہم اکسٹرا کو پوچھتا کون ہے کیا معلوم جیون بھر اسی طرح پھرتے پھرتے کٹ جائے اور کوئی چانس نہ بنے۔ کل رنجیت میں جا چکی ہوں۔ آج لیوری جا رہی ہوں منروا والوں کے ہاں۔ ایک صاحب نے کام بتایا ہے دیکھو کیا ہوگا اگر آج تم نہ ملیں، تو موڈرن اسٹوڈیو کے نیچے والے نمبر پر فون کرکے پوچھ لینا۔ شاید میں تب تک وہیں رہوں۔ نہ ملوں تب بھی تم کوشش کرکے ادھر آجانا۔ شاید بھاگ میں ہو اور کوئی کام بن جائے میں تو اب بھی چاہتی ہوں کہ کوئی صورت نہ نکلے تو ایک بار صاف انکار ہو جائے۔ نہ جانے ان ظالموں کو ٹال مٹول کرکے جھلانے میں کیا مزہ آتا ہے ہم کو پھنسائے رکھنے کا موقع ملتا ہے نا اسی لئے ایک بار سیدھی طرح جواب مل جائے تو میں اس جنجال سے نکل کر گھر چلی جاؤں۔ سوچتی ہوں یوں فلم کے چکر میں رہ کر اپنے آپ کو کب تک بٹاتے رہیں گے؟ کام تو دس سال میں بھی ملتا نہیں معلوم ہوتا۔ سب ان کی مکاری ہے تم اپنے گھر خط بہتر کیوں نہیں لکھتیں؟ تمہاری ماں بے چاری بے چین ہوگی۔ میری تو ماں بھی نہیں۔"

تمہاری "اُرملا"

نیچے ٹیلیفون نمبر لکھا تھا۔

وہ پرچہ ہاتھ میں لئے لڑکی کا انتظار کرتا رہا۔ پھر اچانک اسے نہ معلوم کیا خیال آیا کہ وہ مسکرانے لگا۔ پرچہ تہہ کرکے اس نے جیب میں رکھا۔ لڑکی ڈاک خانہ سے نکلی۔ اس کے ہاتھ میں ٹکٹ لگا لفافہ روپے والے نوٹ اور کچھ ریزگاری تھی۔ آگے بڑھ کر اسے پرس میں ڈالتے ہوئے اس کی فکر مند نظریں میٹر تک گئیں۔ پھر اس سے چار ہوئیں۔ پھر جھک گئیں۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

وہ اس گھبراہٹ کا مطلب بھی سمجھ گیا۔ میٹر میں پانچ روپے دس آنے کرایہ ہو چکا تھا۔ مگر پانچ کا نوٹ نوٹ کر اب چار روپے کچھ آنے رہ گیا تھا۔ پانچ روپے کے سوا اس کے پاس شاید اور کچھ بھی نہ تھا۔ لڑکی نے پرس میں سے پین نکال کر لفافہ پر پتہ لکھا اور غالباً اسے لیٹر بکس میں ڈالنے کے لئے باہر نکلنے لگی۔ اس نے بڑھ کر کہا۔

"لائیے میں ڈال دوں۔"

ٹھٹک کر لڑکی نے اسے دیکھا۔ پھر شکریہ کہکر لفافہ اسے دے دیا۔ لیٹر بکس تک جاتے جاتے اس نے: "نازلی بیگم۔ معرفت دواخانہ۔ سلطانیہ۔ گوشہ محل۔ حیدرآباد (دکن)" پڑھ لیا۔

واپس آکر اس نے سوالیہ نظروں سے لڑکی کو دیکھا۔

"اندھیری چلئے۔ موڈرن اسٹوڈیو۔"

گاڑی اسٹارٹ کرکے اس نے ادھر کا رخ کیا مگر اپنے دل میں وہ پورا پروگرام تیار کر چکا تھا۔ ایک موڑ کے پاس گاڑی ٹھہرا کر وہ اترا۔

"بیگم صاحب! ذرا میں ایک منٹ کے لئے وہاں تک ہو آؤں؟"

لڑکی نے اس طرح بولنے پر، پھر چونک کر اسے دیکھا۔ پھر بولی:۔

"ہاں، ہاں۔ جائیے۔"

سامنے کی بلڈنگ میں ریلوے بکنگ آفس تھا۔ اس نے جاکر حیدرآباد کا ایک ٹکٹ لیا۔ گاڑی جانے کا ٹائم نوٹ کیا اور واپس چلا آیا۔

گاڑی موڈرن اسٹوڈیو پہنچی۔ تو لڑکی نے پورٹیکو سے پہلے ہی رکوالی اور اتر پڑی۔ پھر بغل کے دروازے سے آفس کی عمارت میں چلی گئی۔ ٹیکسی پارک کرکے وہ مڈگارڈ سے بیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا برابر کے دو ڈرائیوروں نے اس کی ٹیکسی کا میٹر گردن بڑھا کر دیکھا پھر اس کی طرف دیکھا۔ مگر اس کی طرف سے حوصلہ افزائی نہ پاکر اپنی جگہ ہی رہے اس کے پاس نہیں آئے۔ وہ اسٹوڈیو آنے والی ٹیکسی کے میٹر دیکھ کر آدمی کا پتہ چلا لیتے تھے اگر میٹر بارہ، چودہ آنے بتاتا تھا تو اس کا مطلب یہ کہ آدمی شان دکھانے کے لئے ٹیکسی کرکے اسٹوڈیو آیا۔ نیا پنچھی ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں پرانا گاہک ہے۔

جیب سے نسوار کی ڈبیہ نکال کر اس نے ایک چٹکی سونگھی۔
فوراً اسے کچھ دیر پہلے کا مونچھیں ٹھیک کرتا پٹھان یاد آگیا اور اس کی کہی ہوئی باتیں بھی۔ نسوار کی ڈبیا کے گول شیشے میں اس نے اپنی ہیبن ہیبن بنی ہوئی مونچھوں کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور پھر ہلکے ہلکے سیٹی بجانے لگا۔
قریب دس منٹ بعد لڑکی بغلی دروازے سے باہر نکلی۔ مگر ٹیکسی تک آنے کے بجائے وہ مڑ کر گھاس کے قطعے پر چلی گئی اور وہاں ہلکے مگر بے چین قدموں سے ٹہلنے لگی۔
اس نے کچھ دیر انتظار کیا ایک بار پھر گاڑی کا نوٹ کیا ہوا وقت دیکھا۔ ایک بار پھر پورٹیکو کی گھڑی کی طرف نگاہ کی اور آگے بڑھ کر اس کی طرف چلا۔
اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ بس یہی موقعہ ٹھیک ہے ورنہ پھر دیر ہو جائے گی۔ لڑکی، اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھی، اضطراب اب اس سے چھپائے نہیں چھپ رہا تھا۔ اس کے قریب پہنچنے پر وہ جلدی سے بولی:۔
"وہ میری سہیلی یہاں آئیں گی۔ ان ہی کا انتظار ہے۔ بس ابھی چلتے ہیں۔"
"کیا ارملا بائی؟"
"؟ ——— ہاں۔ وہی ——— جانتے ہیں انہیں؟ کیا کبھی لے گئے ہیں؟"
"جی نہیں۔ ابھی معلوم ہوا۔ ایک سے؟"
اس نے جیب سے پرچہ نکال کر دکھایا۔ پرچہ دیکھ کر لڑکی حیران ہوئی۔ پھر فوراً ہی اس کی تیوریاں چڑھ گئیں مگر اس کے بولنے سے پہلے ہی وہ بولا۔
"آپ جب لفافہ نکال کر ڈاک گھر گئی تھیں۔ تبھی یہ پرس سے نکل کر گر گیا تھا۔ میں نے اٹھا لیا۔ پھر سوچا کیا معلوم آپ نے پھینک ہی دیا ہو۔"
لڑکی ایسی پشیمان ایسی جھنجلائی ہوئی نظر آرہی تھی جیسے کوئی بچہ، بڑے کو چوری کرتے پکڑے۔ وہ تلخی سے بولی:۔
"اسے پڑھا کیوں آپ نے؟"
"دیکھئے بیگم صاحب! پرچہ تو آپ نے پھینک دیا تھا کوئی نہ کوئی تو پڑھ ہی لیتا۔ اچھا ہوا۔ میں نے اٹھا لیا!"
پھر کچھ رک کر، بہت نرم لہجے کے ساتھ اس نے کہا۔
"آپ دن بھر ایسے ہی کھڑی رہیں گی۔ آپ کی ارملا بائی نہیں آئیں تو؟"
لڑکی نے مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ بمبئی میں اتنے دن رہ کر بھی عورت سے آنکھ ملا کر بات کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ پر اسے اندازہ ہو گیا کہ لڑکی نے بھی اس پر سے نظریں ہٹالی ہیں۔ شاید اب وہ کچھ مطمئن ہو گئی تھی نظریں جھکائے جھکائے ایک کنکر کو جوتے کی نوک سے ملائم زمین میں دباتے ہوئے بولا۔
"وہ ——— وہ بھی تو دھندا ڈھونڈنے نکلی ہوگی۔ پر دھندا آج کل کہاں ملتا ہے۔ ہزار لڑکی میں سے ایک کو بھی مل جائے تو بڑی قسمت۔"
سامنے سے ایک لڑکی، ایک چندیا صاف ادھیڑ عمر کی آدمی کے ساتھ جارہی تھی۔ ہر بات وہ اس سے بڑے لگاوٹ کے انداز سے کرتی، اور بار بار ہنستی تھی۔ ان دونوں کا رخ سامنے رسٹوران کی طرف تھا۔ یہ آدمی یقیناً فلم کمپنی کا کوئی کارندہ، کوئی اسسٹنٹ وغیرہ ہوگا۔ اور یہ لڑکی ہر ادا سے کوئی نئی امیدوار نظر آرہی تھی۔ اس نے ان دونوں کی طرف اشارہ کیا، اور جس کو دھندا مل جانے کی آس ہوتی ہے۔ اس کا یہ حال ہو جاتا ہے۔" وہ لڑکی اس دوسری لڑکی کے مٹکنے کو نہ معلوم کن نظروں سے دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ دونوں رسٹوران میں داخل ہو گئے۔ وہ کچھ دبے دبے لہجے ہوئے میں پھر بولا:۔
"بیگم صاحب! آپ مسلمان لڑکی ہیں۔ میرے اوپر اعتبار کریں۔ ان فلموں کا جھنجھٹ چھوڑیئے۔ میں آپ کو دوسرا کام بتادوں نہیں تو ایسے گنجوں سے آپ کا کبھی پیچھا نہیں چھوٹے گا، اور یوں بمبئی میں سب دھندے گندے ہی ہیں۔ آپ کو مجھ پر یقین ہو

تو ـــــــ سوچ لیں۔" اس کا دل چاہا کہ کہے "اری حیدری بیگم، کہاں پھنس گئیں آپ۔ جائیے گھر، اپنی ماں کے پاس ان کے کام آئیے! سب سے اچھا دھندا یہی ہے۔" مگر اس نے سوچا ابھی نہیں ٹھہر کر۔

مڑ کر وہ ٹیکسی کے پاس گیا۔ اور پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر ایسے کھڑا ہو گیا۔ جیسے لڑکی کے آنے کا انتظار کر رہا ہو۔

نہ معلوم لڑکی اس دوران میں کیا سوچتی رہی ہوگی۔ وہ چپ چاپ کھڑا بڑے اطمینان سے اس کا انتظار کرتا رہا۔

لڑکی آہستہ آہستہ کچھ سوچتی ہوئی ٹیکسی کے قریب آئی اور پھر فیصلہ کن انداز سے بڑھ کر چپ چاپ اندر بیٹھ گئی۔

جب ٹیکسی احاطے سے نکال کر وہ سڑک پر لایا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ لڑکی کے آنے تک یوں تو اطمینان سے بالکل چپ چاپ کھڑا رہا تھا۔ مگر اس کا دل برابر دھڑک رہا تھا، اگر لڑکی نہ آتی تو اس کی بنی بنائی اسکیم ہی خاک میں مل جاتی۔

مختلف سڑکوں سے تیزی کے ساتھ گزرتا ہوا، وہ بھنڈی بازار میں نکال لایا۔ پھر آگے کرافورڈ مارکٹ کے چوراہے سے نکال کر سیدھا بوری بندر پہنچا۔

اسٹیشن پر جب گاڑی کھڑی کرکے وہ باہر نکلا تو لڑکی تعجب سے، پیچھے بت بنی اسے دیکھ رہی تھی۔ میٹر سیدھا کرکے اس نے دروازہ کھولا۔ اس کا سوٹ کیس اٹھایا۔ اور چہرہ بشاش بنا کر کہا "آئیے!"

مڑتے ہوئے جب اس کی نظریں اٹھیں تو دور پارکنگ میں ٹیکسیوں کی قطار کے بیچ میں اسے نظر بھی دکھائی دیا۔ اس نے ہاتھ کا اشارہ کرکے اسے ٹھہرنے کو کہا۔ لڑکی اترتے ہوئے، ادھر ادھر دیکھ کر بولی:۔

"ادھر؟ ادھر کیا کام ہے گا استاد۔ یہاں کون ملے گا؟"

اسے اس لہجے سے کچھ توہین محسوس ہوئی۔ اس کا دل بولا۔ "استاد! تم بے کار کا ٹنٹا کرتا ہے۔ یہ لڑکی تم کو گڑبڑ گھوٹالے والا آدمی سمجھتی ہے جب ہی تو ایسا بولتی ہے۔ بالکل دلال کا ماپک۔"

اس نے دل سے کہا۔ "ہش، گڑبڑ کیسی؟ ایسی سیدھی لڑکی کو ایسی بات پھر مت بولنا۔ اب بکو مت۔" دل نے بکنا بند کر دیا۔ وہ بولا:۔

"اب آئیے تو۔ پہلے دیکھ لیجیے۔"

پلیٹ فارم پر ادھر الکٹرک لوکل ٹرین لگی تھی، اور ادھر حیدرآباد آنے والی ٹرین آکر ابھی کھڑی ہوئی تھی۔ ایک نوجوان پلیٹ فارم کے کھمبے سے لگا سگریٹ پی رہا تھا۔ لڑکی کے بڑھنے پر وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ مگر جب وہ سوٹ کیس لئے آگے بڑھا تو ساتھ ساتھ لوکل ٹرین کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"کتنی دور جانا ہوگا۔ کیا ادھر ہی؟"

"بہت دور۔" وہ آگے آکر دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ مسکرا کر بولا۔ "ادھر آئیے۔"

لڑکی پھر کچھ ٹھٹکی۔ بیچاری گھبرا رہی ہے، وہ مسکرایا، اچھا حیدری بیگم۔ ابھی سمجھ لوگی، میں کیا چاہتا ہوں۔ کیا میں دلی میں کوئی نوکری دلا دوں گا؟ ارے لڑکی اپنے گھر جا، گھر! یہ بمبئی نازلی بیگم کی بیٹی حیدری بیگم کے لئے نہیں ہے۔"

"آئیے! آپ چلئے تو۔" وہ بالکل چمکارنے کے انداز میں اس طرح بولا جیسے، میں بدمعاش نہیں ہوں، اور ہوتا بھی تو اسٹیشن میں، ڈر کیسا۔

زنانے ڈبے کے سامنے پہنچ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ لڑکی آگے آکر اس کے پاس آئی۔ درجہ ابھی خالی تھا۔ اندر سوٹ کیس رکھ کر اس نے لڑکی سے کہا:۔

"ہاں، اب بیٹھ کر پوچھئے۔ کیا پوچھتی ہیں؟"

"میں پوچھتی ہوں۔ یہ کیا مذاق ہے؟" لڑکی کچھ جل کر بولی۔ "یہاں کس لئے لائے ہیں آپ؟"

"اس لئے۔" کہہ کر اس نے ٹکٹ لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا لڑکی ہاتھ میں رکھا ہوا ٹکٹ دیکھنے لگی۔

"دیکھئے۔" اس نے ہلکے سے کہا۔ لڑکی نے پھر سر اٹھایا۔

"بمبئی شریف لڑکیوں کی جگہ نہیں۔ آپ واپس اپنے گھر کیوں

نہیں چلی جاتیں۔ آپ کے لئے بس یہی زیادہ اچھا ہے۔ یہ بمبئی بڑی خراب جگہ ہے، ادھر کسی کو بھلا دھندا نہیں ملتا۔ اُڑ ملا" وہ آگے بولا نہیں۔ لڑکی کا منہ لٹک گیا تھا۔ وہ ہلتے ہوئے جواری کی طرح مرجھا سی گئی تھی۔ اب اس کا سر پھر نیچے جھک گیا تھا۔ وہ پھر بولا:۔

"آپ اپنے گھر جائیے۔ اپنی ماں کے پاس۔ آپ کی ماں بے چاری انتظار کر رہی ہوں گی۔ آپ کی سہیلی بھی تو یہی بات کہتی تھیں۔ ان کی ماں نہیں۔ مگر آپ کی تو ہیں۔ کیا آپ کو وہ یاد نہیں آتیں؟" لڑکی کا چہرہ جذبات کی حدّت سے ایک دم تمتما اٹھا، اس کے ہونٹ کچھ کپکپائے اس لڑکی پر اسے بہت ہی رحم آ رہا تھا۔

"آپ خود ماں نہیں ہیں نا۔ نہیں تو آپ کو پتہ لگ جاتا، بیٹی کیا چیز ہوتی ہے، ماں کے لئے ——— اور باپ کے لئے بھی" اس کے تصور میں اپنی ننھی سی بیٹی آ گئی۔

لڑکی نے ہونٹ دانتوں سے دبا لیا۔ اس کے نتھنے پھڑکنے لگے، پھر وہ منہ چھپا کر رونے لگی۔

وہ چُپ رہا۔ کچھ بولا نہیں۔

"ارے! کیا بات ہے؟" پیچھے سے ایک تیز آواز آئی، اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ کھمبے سے لگا ہوا نوجوان قریب آ کر اکڑے ہوئے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ اسے بڑا غصہ آیا۔ کڑک کر اس نے جواب دیا

"لے تو کون ہے پوچھنے والا؟"

"جاؤ ادھر سے" ایک قدم بڑھا کر وہ اس کے سامنے آ گیا نوجوان خوب صورت ضرور تھا۔ سوٹ بھی اس کا اچھا تھا۔ مگر اسکے مقابلے میں اس کا بدن بالکل چھوٹے لڑکے کا سا تھا۔ اس نوجوان نے ایک نظر میں اس آخری بات کا موازنہ کر کے کہا:۔

"اچھا دھمکاتا ہے۔ بھولی بھالی لڑکی کو بھگاتا ہے بدمعاش اور آنکھیں نکالتا ہے، ابھی پولیس کو بلاتا ہوں"

وہ یہ دھمکی سن کر بھی جب ایک قدم اور آگے بڑھا تو وہ نوجوان پیچھے ہٹا اور تیز تیز قدموں سے چلا گیا۔

وہ مڑا۔ لڑکی جاتے ہوئے نوجوان کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے لہجہ پھر نرم کیا" دیکھئے! میری بات مانئے! بیگم صاحب! تو اپنے گھر جائیے! ادھر سب طرف ایسا ہی بدمعاش ملے گا" اس نے غصے سے ادھر دیکھا جدھر کو نوجوان گیا تھا ——— "اور آپ کی ساری زندگی خراب ہو جائے گی" لڑکی اسی طرف دیکھتی رہی بدمعاش کا لفظ سن کر اس نے سر اٹھا کر اسے سخت نظر سے دیکھا جیسے یہ بات اسے پسند نہ آئی ہو۔

"بے چاری!" ——— وہ دل ہی دل میں مسکرایا "ابھی بدمعاش اور بھلے آدمی کو بھی نہیں پہچان سکتی" جیب سے مڑا ہوا وہی پرچہ اس نے نکالا جو لڑکی سے گر گیا تھا اور اسے لڑکی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ لڑکی نے آہستگی سے پرچہ کھولا۔ ایک دس روپے کا نوٹ اس میں تھا۔ وہ پھر اسے دیکھتے ہوئے بولی:۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ ——— یہ خرچ کے لئے ہے۔ آپ حیدر آباد تک جائیں گی نا؟ یہ" وہ کہتے کہتے رک گیا "یہ صدقہ ہے۔"

لڑکی کا چہرہ پھر ایک دم سُرخ ہو گیا۔ مگر اس بار غصہ کے سبب وہ اچانک بھبک اٹھی ——— "تم کون ہوتے ہو جی۔ مجھے خرچ دینے والے؟" میں محتاج نہیں ہوں ان روپوں کی۔ یہ خیرات کسی فقیرنی کو دینا۔ سمجھے!" اس نے ہاتھ جھٹک کر مڑا ہوا کاغذ پھینک دیا۔" یہ، تم دھندا بنانے آئے ہو سمجھ کر دھرماتما بننے؟ واہ! یہ آئے ہیں مجھے سبق پڑھانے" اس کی آواز کچھ اونچی ہوئی "جاؤ یہاں سے مجھے نہیں چاہئیے۔ یہ تمہاری نصیحت"

وہ شاید کچھ اور کہتی، مگر سامنے سے گزرتے ہوئے دو ایک مرد رک گئے۔ شدت جوش اور اس طرح اپنی توہین کے خیال سے اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ کھڑکی کی طرف سے منہ موڑ کر وہ پشت کر کے بیٹھ گئی۔

بات بڑھ گئی تھی۔ بات بگڑ گئی تھی۔ اس نے جھک کر مڑا ہوا نوٹ اور پرچہ اٹھایا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ آخر اس سے کیا غلطی ہو گئی۔ کیا اس نے کوئی توہین

کی بات کہہ دی۔ مگر کون سی؟ ایسے آدمی کی طرح جسے عبادت میں
بھول ہو جانے پر مسجد سے دھکے دیکر نکال دیا گیا ہو۔ وہ حیران
سا کھڑا ہوا تھا۔ مگر لڑکی پر اسے اب بھی رحم آ رہا تھا۔ بڑے شکست
خوردہ لہجے میں وہ آہستہ سے بولا۔

"اچھا۔ جیسا آپ ٹھیک سمجھیں کریں۔"

وہ چپ چاپ وہاں سے چل دیا۔ جب وہ پلیٹ فارم سے نکل
کر اسٹیشن کے پورٹیکو سے باہر جا رہا تھا۔ تو اس نے دور سے اسی نوجوان
کو ایک سپاہی کے ساتھ پہلے جیسے تیز تیز قدموں سے اندر جاتے دیکھا
اسے خیال آیا۔ واپس چل کر ذرا اسے ٹھیک کردوں۔ پولس سے وہ کبھی
ڈرا نہیں تھا۔ مگر اس کا دل بولا۔ "رہنے دو استاد۔ اب تو تم چلا
آیا۔ پھر لوٹ کے جانا ٹھیک نہیں۔ وہ لڑکی سب ٹھیک کرلے گا۔
جب تم کو ایسا بولا، تو اس چھوکرے کو تو بالکل ٹھیک بنا دے گا۔ اس
نے پہلی بار دل سے اتفاق کیا، ہاں یار، ٹھیک ہے، رہنے دو"

اپنی ٹیکسی کے پاس اسے نظر گل کھڑا نظر آیا۔ اسے آتا دیکھ کر گل
آگے بڑھا اور کچھ بے تابی کے ساتھ کہا۔

"اے استاد! آج تم کیسا سواری لایا۔ ہمارا برابر کا ڈرائیور
بولا۔ یہ عورت تو خراب ہے۔ فلم والا لوگ کا ساتھ گھومتا ہے دھندا
کرنے اُدھر جاتا ہے۔"

اسے دھچکا سا لگا۔ وہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ جیسے گل کے ہاتھ
سے قرآن شریف چھوٹ گیا ہو۔ پھر اس کا چہرہ مرجھا گیا۔ گل بولا:۔

"کیا بات ہے استاد۔ خدا کا قسم ہم کو بولو۔" وہ بجھے ہوئے
لہجے میں بولا:۔

"کچھ نہیں۔"

اور ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اسٹیرنگ پر کہنی ٹیک کر بیٹھ گیا
پھر جیب سے سگرٹ نکال کر اس نے سلگایا۔ اور دھوئیں کے مرغولے
میں اس کا چہرہ چھپ گیا۔ گل دوسری طرف کی سیٹ پر آ کر چپ
چاپ بیٹھ گیا۔

نہ معلوم کتنی دیر وہ ایسے ہی بیٹھا رہتا کہ "اے بھائی! ٹیکسی
والا!" سن کر، چونک پڑا۔ سامنے ایک قلی کھڑا تھا۔

"وہ بابی نے تم کو بیٹھنے کے لئے بولا ہے۔"

اس نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرکے، ایک ٹکٹ اس
کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ٹیکسیوں کی قطار کے
سرے پر، ایک گاڑی میں وہی لڑکی اور وہ نوجوان دونوں بیٹھ
رہے تھے۔ گل نے گردن بڑھا کر ٹکٹ پڑھ لیا۔ پھر اُدھر دیکھا جدھر
وہ دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر کچھ حیرانی سے بولا:۔

"کیا گڑبڑ ہوتا ہے استاد۔ تم کہیں جائے گا؟ یہ
ٹکٹ کدھر کا ہے؟" "کچھ نہیں۔" اس نے ایک دم ٹکٹ کا سرا
اور ٹکٹ پھاڑ کر پھینک دیا۔

(بشکریہ "تذکرہ")

وحید الانسیم

○

کب تم سے اپنے دل کی دوا پوچھتے ہیں ہم
ہے یاد کوئی اور جفا پوچھتے ہیں ہم

کس سمت آج قافلۂ شوق ہے رواں؟
آئی کدھر سے بانگِ درا پوچھتے ہیں ہم

کیوں یہ خلش عذابِ مسلسل کہیں جسے
اے دل تجھی سے تیری خطا پوچھتے ہیں ہم

آنکھوں سے اشکِ درد ٹپکنے لگے ہیں کیوں؟
آ کر یہاں سے کون گیا پوچھتے ہیں ہم

ناصح بتا ہم ہی پہ یہ الزامِ عشق کیوں؟
اس درد سے ہے کون بچا پوچھتے ہیں ہم

پیتے نہیں ہیں مے بھی ترے اذن کے بغیر
پھر کس لئے سزا و جزا پوچھتے ہیں ہم

گلشن میں روپ بھر کے نسیم بہار کا
ہر برگِ گل سے تیرا پتہ پوچھتے ہیں ہم

شوکت تھانوی

جس محلّہ میں ہے ہمارا گھر

جس محلہ میں ہے ہمارا گھر

وہاں ایک تو رہتے ہیں حکیم صاحب جو نہ طب پڑھے ہوئے ہیں نہ گلوئے نیب اور پوست بیخ کاسنی کے خواص سے واقف ہیں انقلاب سے پہلے خدا جانے کیا تھے مگر اب طبیب حاذق بنے بیٹھے ہیں۔

ایک ہیر ڈریسنگ سیلون ہے' جہاں ہر فیشن کے بال تراشے جاتے ہیں۔ ایک پہلوان رہتے ہیں جن کو کشتی لڑنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا مگر کچھ شاگردوں کو زور کراتے ہیں اور ہر دھان پان آدمی کے سامنے سینہ تان کر جھومنے لگتے ہیں۔

ایک فالودہ والا ہے جو سردی میں آلو چھولے بیچتا ہے۔

ایک شاعر صاحب رہتے ہیں حضرت تاباں جھنگوی۔

اور یہ سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت سے اقبال سے وابستہ ہیں اور ہر ایک کو دعویٰ یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال کے سب سے زیادہ مراسم اسی سے تھے۔

چنانچہ حکیم صاحب کے دواخانہ کا نام ہے "جواب شکوہ دواخانہ طب یونانی"۔ ہیر ڈریسنگ سیلون پر سائن بورڈ لگا ہے۔ "اقبال ہیر ڈریسنگ سیلون"۔ پہلوان صاحب کے اکھاڑے کا نام ہے "اکھاڑہ حکیم الامت"۔ اور فالودے والے کی دکان پر سفیدے سے لکھا ہوا ہے۔ "اقبال فالودے دی ہٹی۔ سوڈا۔ لیمونڈ۔ آلو چھولے"۔

رہ گئے حضرت تاباں جھنگوی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اقبال کی ہر طرح میں کچھ نہ کچھ کہا ہے اور اقبال سے اگر بڑھیا نہیں تو گھٹیا بھی نہیں کہا ہے۔ تاباں صاحب کا کلام سننے کے بعد گرمیوں میں فالودہ پینا اور جاڑے میں آلو چھولے کھانا ضروری ہو جاتا ہے اور اکثر جی چاہتا ہے کہ "اکھاڑہ حکیم الامت" میں کچھ دن زور کرنے کے بعد حضرت تاباں کو پٹخ دیا جائے، یا "جواب شکوہ دواخانہ یونانی" سے کوئی ایسی دوا لا کر حضرت تاباں کو دی جائے کہ ان حضرت کا دماغ درست ہو جائے۔ "اقبال ہیر ڈریسنگ سیلون" والے اگر پابندی سے ان کے بال تراشتے نہیں بلکہ مونڈتے رہیں تو شاید دماغ کی کچھ اصلاح ہو سکے۔

خدا نہ کرے کہ کوئی شریف آدمی ان میں سے کسی کے قبضہ میں آجائے۔ ڈاکٹر اقبال سے اپنے مراسم کی داستان جو شروع کریں گے تو ناطقہ بند کر دیں گے۔ اس خاکسار کو اس محلہ میں آنے کے بعد سب کچھ بھگتنا پڑا۔

سب سے پہلا اتفاق پہلوان صاحب سے ہوا تھا۔ اس لئے کہ جس مکان میں یہ ہیچمداں آنا چاہتا تھا۔ اُس کی کنجی "اکھاڑہ حکیم الامت" ہی میں تھی۔ پہلوان صاحب نے اِدھر اُدھر کی ایک آدھ بات کرنے کے بعد ہی شروع کر دیا یہی ذکر۔

"ارے صاحب عجیب زمانہ آگیا ہے۔ اب دیکھئے اپنے اقبال ہی کو، دنیا جانتی ہے کہ وہ ڈاکٹر نہیں بلکہ حکیم تھے۔ حکیم الامت اسی لئے تو ان کو کہا جاتا ہے اور میں نے اپنے اکھاڑے کا نام بھی حکیم الامت اکھاڑہ رکھا ہے۔ مگر مارے فیشن کے لوگ ان کو ڈاکٹر کہنے لگے ہیں۔ حالانکہ وہ اُردو میں نسخہ لکھتے تھے۔ اور صاحب کیا شخص تھی اور کیا سوجھ بوجھ تھی۔ ایک دفعہ مجھ کو مرگی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ سارے زمانہ کا علاج کرایا۔ رسول مرحن کو دکھایا۔ دہلی والے حکیم جی کو دکھایا۔ گڑھی شاہو والے کو دکھایا مگر کسی سے فائدہ نہ ہوا۔ آخر میں میں نے سوچا کہ حکیم الامت کو تو دکھاؤں۔ بس بھائی جی دو تین دن دوا پی ہو گی اُن کی کہ مرض کا

پتہ بھی نہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ تم ورزش کیا کرو۔ میں نے ورزش شروع کردی اور یہ سب اُن کا طفیل ہے کہ میں آج کسی سے خم نہیں کھا سکتا۔ آجائے جس کا جی چاہے مقابلہ پر۔ بڑے بڑے رستم ہند اور رستم زماں بنے پھرتے ہیں۔ مگر میرے سامنے آنے کی کسی میں بھی ہمت نہیں۔"

چوندھیا کر عرض کیا۔ "یہ تو سب کچھ درست ہے مگر کیا ڈاکٹر اقبال آپ کے خیال میں حکیم نہیں بلکہ اس قسم کے ڈاکٹر تھے یہ مطب اور مریض والے۔"

پہلوان نے مگدر کی جوڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر نہیں بھائی جی میں کہہ رہا ہوں حکیم تھے۔ نبض دیکھی اور سب کچھ سمجھ گئے کہ مرض ہے کیا۔"

عرض کیا۔ "یعنی مطلب کہ وہ حکیم تھے یہ بنفشہ خطمی والے"

پہلوان نے خم ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "ہاں جی بڑے اعلیٰ حکیم تھے کیسا ہی مرض ہو اور دو نسخہ میں چھو منتر ہو جاتا تھا۔"

جی چاہا کہ ہنس دیں مگر یہ خیال آیا کہ اگر پہلوان صاحب نے بڑھ کر گدی پر ہاتھ رکھ دیا تو کیا ہوگا۔ لہٰذا اُن کی ہاں میں ہاں ملانا ہی پڑی اور وہ ڈاکٹر اقبال کی طبابت کے کمالات دیر تک سناتے رہے

کچھ دنوں کے بعد بال کٹوانے "اقبال ہیر ڈریسنگ سیلون" میں جانے کا اتفاق ہوا اور عین اُس وقت جب کہ اس خاکسار کا سر اس ادا سے جھکا ہوا تھا کہ ع

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

مزاجِ یار میں یہ آیا کہ باربر صاحب نے بھی ذکر چھیڑ دیا۔

"علامہ اقبال نے کبھی کسی اور سے بال نہیں کٹوائے وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ماسٹر امام دین تیرے ہاتھ میں جو صفائی ہے وہ مجھ کو ولایت میں بھی نظر نہیں آئی۔ ہر جمعہ کو مجھے بلایا کرتے تھے بال کٹوا رہے ہیں اور اپنے شعر سنا رہے ہیں۔"

گردن جھکائے جھکائے کہا۔ "شعر سنا رہے ہیں، یعنی تم کو سناتے تھے شعر۔ علامہ اقبال گویا تم کو شعر سناتے تھے۔"

خلیفہ امام الدین ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "بس کچھ پوچھیئے نہیں۔ شعر پر شعر سناتے تھے۔ ایک سے ایک حقانی شعر مست کر دیتے تھے شعر سنا سنا کر۔ بس بال بنوائے۔ شیشہ دیکھا اور خوش ہو گئے۔ جیب میں ڈالا ہاتھ اور جو نکل آیا وہ مجھ کو دیدیا۔ کبھی پانچ کا نوٹ کبھی دس کا نوٹ۔ ایک مرتبہ تو سو کا نوٹ بھی دیدیا تھا اور ہنس کر کہا تھا کہ امام الدین لے، تو بھی کیا یاد کرے گا۔"

اب بتلائیے اس نازک موقع پر یہ سب کچھ سن کر خاموش رہنا پڑتا تھا۔ یعنی سر جھکا ہوا، اور باربر کے ہاتھ میں تیز دھار کی نوکدار قینچی یعنی آدمی ذرا بھی بحث کرے تو جان کے لالے پڑ جائیں۔

فالودے والے اور ان بناسپتی حکیم صاحب سے ایک ہی وقت میں ملاقات ہو گئی تھی۔ ضرورت تھی مغز کدو کی۔ لہٰذا حکیم صاحب کے دواخانہ "جواب شکوہ دواخانہ طب یونانی" میں جانے کا اتفاق ہو گیا۔ وہاں فالودے والا پہلے سے بیٹھا ہوا حکیم صاحب کو نبض دکھا رہا تھا۔ نبض دیکھنے کے بعد یوم اقبال کا تذکرہ چھڑ گیا۔ حکیم صاحب نے اپنی ریش مقدس پر ہاتھ پھیر کر ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں صاحب اب چاہے یوم اقبال منایا جائے یا کچھ منایا جائے۔ اقبال ان سب سے اونچی چیز تھا۔ ہائے ہائے کیا مرنجان مرنج السان تھا۔ اپنی وضع کا پابند۔ دوست نواز اور میرے لئے تو ان کا یہ عالم تھا کہ رات کو دو بجے بھی کوئی شعر کہہ دیا ہے تو چلے آرہے ہیں غریب خانہ پر۔ کنڈی کھڑکائی اور گہری نیند سے مجھ کو اٹھایا اور بیٹھ گئے شعر سنانے۔ اب حقہ پر حقہ بھرا جا رہا ہے۔ چائے پر چائے دَم ہو رہی ہے اور وہ جھوم جھوم کر شعر سنا رہے ہیں۔"

فالودے والے نے کہا۔ "چائے تو بس جاڑے میں پیتے تھے کبھی کبھی۔ گرمیوں میں تو روز میری دوکان سے فالودہ جاتا تھا، بڑا شوق تھا فالودے کا۔"

حکیم صاحب نے جھوم کر کہا "ارے بھائی جس کو نہ معلوم ہو اس سے کہو۔ اسی فالودے نے ان کو آخر میں بیمار کر ڈالا معدہ

آخر کہاں تک کام لیتا۔ مگر صاحب سخت بدپرہیز، بخار چڑھا ہوا ہے۔ آرہے ہیں مجھ کو نبض دکھانے اور فرمائش ہے آلوچھولے کی"

فالودے والے نے کہا۔ "آلوچھولے میری دکان کے نا، کہتے تھے کہ ولایت میں سردار محمد تیرے آلوچھولے اس قدر یاد آتے ہیں کہ وہاں رہنا دوبھر ہو جاتا ہے"

حکیم صاحب نے فرمایا "تم تو جانتے ہو سردار محمد کہ مجھ سے زیادہ ان کے مراسم کسی اور سے تھے ہی نہیں۔ کوئی بات مجھ سے بغیر پوچھے نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنی ایک نظم جس کا نام شکوہ تھا۔ حمایت اسلام کے جلسہ میں پڑھ آئے۔ میں نے وہ نظم پہلے نہیں سنی تھی۔ ورنہ پہلے ہی منع کر دیتا۔ اب جو جلسہ سے لوٹ کر آئے اور میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو چپ ہو کر رہ گئے۔ میں نے جل کر کہا بڑا نام ہو رہا ہے اس نظم کے سلسلہ میں۔ کچھ شرما کر بولے "بھئی اب تو ہو گئی بات"۔ میں نے کہا "یہ غلط ہی بات ہو گئی تو بات کا جواب بھی ہو سکتا ہے۔ اسی وقت اس نظم کی تردید لکھو"

اس خاکسار نے بھی اب دخل دیا۔ "تو گویا جواب شکوہ آپ نے لکھوایا ہے"

حکیم صاحب نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ بات بہت لوگوں کو معلوم ہے کہ جواب شکوہ لکھانے والا یہی آپ کا غلام ہے اور دیکھئے وہ جو تخت پڑا ہے اس پر ڈاکٹر اقبال گاؤ تکیہ کا سہارا لئے بیٹھے تھے اور حقہ پی رہے تھے۔ سامنے میں بیٹھا ہوا باداموں کھا رہا تھا۔ ایک طرف مالٹے رکھے ہوئے تھے اور میں ڈاکٹر صاحب پر خفا ہو رہا تھا۔ آخر عاجز آکر ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "لاؤ بھئی حکیم صاحب کاغذ اور قلم دوات، جواب لکھتا ہوں"۔ بس جناب خدا جانے اس وقت مرحوم پر الہام ہو رہا تھا یا کیا کیفیت تھی کہ شعر برسنا شروع ہو گئے۔ وہیں کھانا کھایا گیا۔ وہیں سہ پہر کی چائے ہوئی اور آخر جب شام کو لوٹے ہیں ڈاکٹر صاحب تو جواب شکوہ تیار تھا۔

عرض کیا۔ "غالباً اسی مناسبت سے آپ نے دواخانہ کا نام "جواب شکوہ دواخانہ یونانی" رکھا ہے" اب سمجھ میں آئی وجہ تسمیہ

انکسار سے ہنس کر بولے۔ "ویسے تو کلام اقبال کا بیشتر حصہ اسی کمرے میں مرتب ہوا ہے۔ بہت سی نظمیں اور غزلیں یہیں کہی گئی ہیں۔ مگر جواب شکوہ تو خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے اور اسی مناسبت سے میں نے اس دواخانہ کا یہ نام رکھا ہے"

فالودے والے نے کہا۔ "فالودے میں بار بار برف ڈلواتے تھے"

حکیم صاحب نے فرمایا "مزاج میں حدت بہت تھی۔ گرمی تو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے"

آخر اب کہاں تک یہ خرافات سنی جاتی۔ مغز کد دلے اور چکرائی ہوئی عقل اور گھومتا ہوا دماغ لیکر "جواب شکوہ دواخانہ یونانی" سے بھاگے اپنے گھر کی طرف۔

حضرت تاباں جھنگوی نے تو خود ہی کھر دیکھ لیا ہے جب دیکھئے بیاض ہاتھ میں لئے تیوروں پر بل ڈالے قبض میں مبتلا چلے آرہے ہیں۔ بیٹھ گئے اور شروع کر دیا یہی ذکر۔

"اب دیکھئے جناب آپکے شاعر اعظم حضرت علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

پانی بھی مسخر ہے ہوا بھی مسخر
کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے

دیکھا ہے ملوکیت افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے

طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جینوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو شاعری کون کہتا ہے۔ حضرت یہ منظوم جغرافیہ ہے یہ عروض کے بھیس میں سیاست ہے۔ یہ موزوں قسم کی ناموزوں باتیں ہیں۔ بھلا ان باتوں کا شعر و شاعری سے کیا تعلق۔ نہ غالب نے جینوا باندھا نہ میر نے ملوکیت افرنگ سے واسطہ رکھا۔ نہ مومن خاں نے طہران کا نقشہ پیش کیا اور نہ داغ نے جو آپ کے اقبال صاحب کے استادِ محترم تھے کرۂ ارض بنایا

شاعری اس بوجھ کی کیونکر متحمل ہو سکتی ہے۔ اب دیکھئے اس زمین پر اس خاکسار نے کچھ عرض کیا ہے بغرض کرتا ہوں۔ شاید کچھ کسی قابل ہو سکے

پانی بھی معطر ہے ہوا بھی ہے معطر
اُڑتا ہوا آنچل ترا اگر نہ سنبھل جائے
دیکھا ہے مقدر نے ترے حسن کا جو خواب
کیا خوب ہو گر خواب وہ تعبیر میں ڈھل جائے
بدلے نہ اگر اپنی نظر وہ بت کم سن
ممکن نہیں عشاق کی تقدیر بدل جائے
تاباں ہی اب ایک تمنا ہے کہ اے کاش
ارمان نہ نکلے تو مرا دم ہی نکل جائے

اس کلام پر اگر چپ رہیئے تو محفل میں کیسے رہیئے اور داد دیجئے تو ذوقِ سلیم کو کہاں دفن کیا جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی کہاں جا کر رہے۔ ایک تو مکان ہی الاٹ مشکل سے ہوتے ہیں اور ہوتے ہیں تو ایسے کہ آدمی پاگل خانے میں رہنے کو ترجیح دینے لگے۔ (بشکریہ 'حریم' لکھنؤ)

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں ہے۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری مئی و جون ۱۹۵۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ برائے مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں۔ یا پھر خط کے ذریعے اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی۔ پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ منتظر کرم:۔ منیجر "مشیر" کراچی

مئی ۱۹۵۶ء		جون ۱۹۵۶ء
۱۰۶۴ ایم احمد الدین صاحب۔ بہاول نگر	۲۳۳۸ ایس، مسعود حسن صاحب، ڈھاکہ	۱۰۸۴ محمد شریف خاں صاحب۔ غریب آباد سکھر
۱۰۶۷ چوہدری غلام رسول چٹھا۔ رائیں تھرپارکر	۲۳۳۹ ظفر اقبال احمد صاحب۔ راولپنڈی	۲۱۵۰ حاجی علی احمد صاحب
۱۰۶۹ عاشق محمد صاحب کھیلی، لاہور	۲۳۴۱ ابراہیم محمد سپور صاحب، کراچی	عبداللہ جان صاحب کراچی
۱۰۷۴ عبدالغنی صاحب ڈار، گڑھی دوپٹہ	۲۳۴۲ محمد عبدالحق صاحب، لاہور	۲۱۵۶ بیگم نگہت طیبہ صاحبہ، لاہور
۱۰۷۶ سید مظفر علی شاہ صاحب، لاہور	۲۳۴۴ وجیہہ فاطمہ صاحبہ، کراچی	۲۱۷۵ غازی محمد اشرف صاحب چترال
۱۰۷۸ چوہدری محمد عبدالقادر صاحب۔ گوجرانوالہ	۲۳۴۹ ناجیہ غضنفر علی صاحب، سرگودھا	۲۳۵۱ ثریا کشور عبید صاحبہ، کراچی
۱۰۷۹ قاضی فیض الحسن صاحب انصاری لاہور	۲۳۵۲ ناظم جمعیۃ الطلبہ دارالسنت عالیہ مدرسہ	۲۳۵۸ مظفر علی صاحب، استور (گلگت)
۱۰۸۶ انعام اللہ صاحب، مردان۔	۲۳۳۸ ہیڈ ماسٹر صاحب مڈل اسکول راہوالی	۲۳۶۱ چوہدری نذیر احمد صاحب، پاک پتن
۲۰۰۱ عبدالمتین صاحب، لاہور	۲۴۹۹ عرفان حسین صاحب، کراچی	۲۳۶۵ محمد یعقوب صاحب ندوی۔ مگھیانہ،
۲۱۰۹ محمد ایوب صاحب، شہدادپور	۲۵۰۲ پیش امام صاحب جونی مسجد گجرات	۲۵۰۶ منیجر صاحب حلقہ اخوت، لاہور
۲۱۴۲ ملک خدا بخش صاحب، جہلم	۲۵۰۳ عنایت اللہ صاحب، منٹگمری	۲۵۰۷ قاضی محمد علی اختر صاحب صدر بائی ہوڈ
۲۱۵۲ ناظم صاحب مکتبہ جماعت اسلامی لاہور		

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے ——— (منیجر)

انور صدیقی

○

فریب خوردۂ رنگِ بہار ہم بھی ہیں
خرابِ نغمۂ صد جوئبار ہم بھی ہیں

پھر ایک بار ادھر آ بہارِ شہرِ حبیب!
ترا خیال، ترا انتظار ہم بھی ہیں

فراقِ صبح میں جلنا ہماری قسمت ہے
مثالِ شمعِ سرِ رہگذار ہم بھی ہیں

ستم گروں کی شکایت کبھی نہیں کرتے
سکوتِ سایۂ سرو چنار ہم بھی ہیں

ہمارے واسطے محمل طلوع کب ہوگی
تری طلب میں سراپا غبار ہم بھی ہیں

ہمارے پیرہنِ تار تار میں ہے شفق
لہو میں ڈوبی ہوئی اک بہار ہم بھی ہیں

تری ہی طرح ہے مجروح اپنی تنہائی
تری ہی طرح ابھی بے قرار ہم بھی ہیں

پھر آج دل میں اٹھی ہے خلش رہائی کی
پھر آج طالبِ صوتِ ہزار ہم بھی ہیں

تمھیں نہیں ہو اکیلے شکارِ جور انور!
نشانۂ ستمِ شہریار ہم بھی ہیں!

ابوسعید قریشی •

موضوع کی تلاش

نرم و گرم بستر میں لیٹا وہ سوچ رہا تھا کہ کس موضوع پر قلم اٹھائے۔ ایڈیٹر کا فرمائشی خط اس کی چھاتی پر مکتوبِ محبوب کی طرح کھلا پڑا تھا۔ اپنی عدیم الفرصتی کا رونا روتے ہوئے وہ دن بھر دوست احباب، دفتر کے رفقائے کار، دور و نزدیک کے جاننے والوں کو کہتا پھرا تھا ——

اب کیا عرض کروں صاحب، دنیا کے دھندے ہی ختم نہیں ہوتے کہ آدمی ذہنی مشاغل کی طرف توجہ کر سکے۔ کاروبارِ شوق کی فرصت ہی کس کمبخت کو ملتی ہے ع

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں + میں کہاں اور یہ وبال کہاں

یہ تو حکومت کا فرض ہے کہ فن کار فکرِ معاش سے آزاد ہو۔ جی ہاں ع

پھر دیکھئے اندازِ گلفشانیٔ گفتار

ایسے ایسے اچھوتے موضوع اور نرالے عنوان ذہن میں پڑے ہیں کہ اردو ادب پر جمود کا سارا گلہ ختم ہو جائے —— دن بھر وہ اسی رد میں باتیں کرتا رہا تھا۔ دن بھر اس کے ذہن میں سینکڑوں عنوانات گھومتے رہے تھے۔ جن کے بارے میں اس کا خیال تھا بس کاغذ پر اتارنے کا کام باقی رہ گیا ہے لیکن اب

کیا لکھوں؟

کس کے نقدِ خیال کا محاسبہ کروں، کون سے گڑے مردے اکھاڑوں

کس ریستم پاکستان کو پچھاڑوں؟

کس ذرے کو آفتاب بناؤں، کس چاند کو گہناؤں؟

کس افواہ کا افسانہ بناؤں، کس سیکنڈل میں طلسم ہوشربا کے رنگ بھروں؟

دن کو ان سوالوں کے جواب اسے معلوم تھے، لیکن سورج مکھی کے پھولوں کی طرح شام ہوتے ہی وہ کملا گئے تھے۔ بیسیوں موضوع اس کے ذہن میں سراب کے نخلستانوں کی طرح ابھرے اور آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ان گنت جانے پہچانے لوگ، جن میں ہر ایک کسی خاکے، افسانے یا ڈرامے کا محور بن سکتا تھا۔ ٹولیاں باندھے اپنی طرف آتے دکھائی دیئے لیکن قریب پہنچنے پر اجنبی نکلے۔

"فسانہ، کہانی، مقولہ، حکایت...... ایڈیٹر کا تجویز کردہ بھرا خط اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو پکار رہا تھا۔

مضمین کی فرمائش صلائے خاص بن کر آئی تھی "آپ کا وہ افسانہ آج تک یاد ہے........ یہ کردار نگاری، یہ طرزِ نگارش آپ ہی کا حصہ ہے —— آپ اتنا کم کیوں لکھتے ہیں۔ فن سے یہ بے اعتنائی اچھی نہیں ع

کچھ تو کہئے کہ لوگ کہتے ہیں

لیکن صریرِ خامہ۔ نوائے خموش تھا۔ معاً اسے اپنی نوٹ بک کا خیال آیا جیسے علی بابا کے غار کی طلسمی کلید مل گئی۔ کھل سم سم۔

نوٹ بک اس کی ڈوڈلنگ کے کرشموں سے طلسم ہوشربا کا مصور نسخہ معلوم ہو رہی تھی۔ ابوالہول، جل پریاں، بیمار آنکھیں، ابروؤں کی کمانیں، ہونٹوں کی لہریں، پنکھڑیاں، شاخیں، تنے، کلیاں، مافوق الفطرت مناظر کے اشاراتی خطوط، نقوش کے مبہم خم و پیچ، زلفوں کا دھواں، دھوئیں کی زلفیں —— تحت الشعور کی ان تحریروں کے ساتھ ساتھ مجوزہ افسانوں کے ان گنت عنوان ساحلِ سمندر پر سیپیوں کی طرح بکھرے پڑے تھے۔ استاد نے کہا تھا "جب کوئی نئی بات سوجھے تو فوراً لکھ لیا کرو........" ایسے کئی خیالات اس کی ڈائری میں محفوظ تھے افسانوں کے منصوبے، ناولوں کے کردار، کرداروں کے خاکے........ ان میں سے بہت سے موضوع بلاغت کے صفحۂ قرطاس پر بھی آ چکے تھے: ایسے عنوانات پر اس نے ص بنا دیا تھا لیکن متعدد خیال ابھی اچھوتے پڑے تھے۔ جیسے مکان کا سنگِ بنیاد

رکھنے کے بعد نقش رکھو جائے یا سرمایہ نہ رہے۔

وہ نوٹ بک کے ورق الٹ رہا تھا اور سوچ رہا تھا:

کیا لکھوں؟

آزادیٔ ہند اور فسادات کی لرزہ خیز داستانیں، قحط کے خونچکاں واقعات، بربریت کی ہیبتناک روداد یا تہذیب کے ملبے میں انسانیت کی تلاش میں روح پرور مثالیں؟

اس پاگل کشمیرن کا قصہ جس کے بارے میں اس نے اپنے شہر کے بڑے بوڑھوں سے سنا تھا کہ اس کے بیٹے کوتوالی کی چھت تلے دب کر مر گئے تھے اور وہ شہر کے کونے کونے میں میاں پوتر د! میرے بیٹو! میاں پوتر د! پکارا کرتی تھی۔ اس کی آواز جب رات کے سناٹوں میں گونجتی تو دل دہل جاتے اور مائیں ضدی بچوں کو "میاں پوتر آ گئی" کے ہوّے سے ڈرایا کرتیں؟

اس پیشہ ور رہبر پولیس کی ٹریجیڈی جس کا سہرا کسی نے نہیں لکھا تھا؟

کتنے ہی کردار تھے لیکن انہیں اسٹیج پر لانے لےجانے کے راستے بند تھے۔ بساط کے سارے مہرے غلط گھروں میں اوندھے پڑے تھے اور کھلاڑی سرپیٹ رہا تھا۔ ٹریجیڈی کا مسخرہ، یا انداز پر بیٹھا حیرت سے اس ہجوم کا منہ تک رہا تھا، جن کی محفل میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ جن کی تقدیر اس کے فقرے بازی سے بے نیاز تھی۔ مسخرے کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں کرداروں نے اپنے چہرے چھپا لئے

اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو گئیں اور خیالات کے ذرے پپوٹوں کے نیچے روہوں کی طرح چبھنے لگے۔ جن پر ایڈیٹر کی تجویزیں کاسٹک کی طرح لگ رہی تھیں۔ بچپن میں جب اس کی آنکھیں دکھتی تھیں تو کاسٹک ٹچ کرنے کے بعد ڈاکٹر ان پر روئی سے شیر گرم پانی ٹپکایا کرتا تھا جس کی دھاریں ہونٹوں کو چھوتی ہوئی کڑوی گڑے میں جل ترنگ بجاتیں اور سسکیاں لیتے لیتے درد کی دنیا سے دور ماں کی محبت بھری گرم گود میں پہنچ جاتا۔

ننندیا آجا ری۔ آجا ——— آجا!

ننھا نیند میں بلکنے لگا تھا اور دھیمے سے ممتا کی لوری سنا رہی تھی کیا آواز پائی تھی ظالم نے بچے تو بچے بوڑھوں کو بھی نیند آجاتی تھی۔ نیند، یادوں کا چور دروازہ!

ماضی کے ملبے تلے خیالات ایک دوسرے میں یوں تحلیل ہوتے جا رہے تھے۔ کہ کسی کا سر پیر دکھائی نہیں دے رہا تھا ——— ننھے منے بچے دراز ریش بڈھوں کو کندھوں پر اٹھائے پھر رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کی ایک عورت غسل خانے کی ٹونٹیوں سے سرخ رنگ کے دھبے دھو رہی تھی باجے بجے۔ بارات آئی اور سہرے کی لڑیاں جنازے کے پھولوں میں الجھ گئیں۔ ان آنکھوں میں کجلا بہنے لگا جن سے گھٹائیں اپنی سیاہی ادھار مانگتی تھیں زمین سے کالک کے بادل ابھرنے لگے جن میں فاقہ زدہ انسانوں کے ڈھانچے بجلی کی طرح چمک رہے تھے بت سیم تن کی سنہری زلفیں لہرائیں اور سانپ بن گئیں۔ دیکھنے والے پتھر گئے، زلزلہ آیا، زمین شق ہو گئی اور ایک پیڑ ابھرا۔ جس کے پھولوں کی مہک مست ہوا بوجھل ہو گئی۔ فضا تتلیوں کے پروں سے جگمگا اٹھی۔ مکھیاں بھنبھنائیں اور شہد کا چھتہ شاخ سے لٹک گیا۔ لوگ شہد لوٹنے کے لئے لپکے اور آپس میں الجھ گئے۔ آواز آئی ٹھہرو! اس کے بدن پر سفید وردی تھی اور سینے پر سنہری تمغے جگمگا رہے تھے چہرے پر خول چڑھا تھا، جس کے ایک طرف سیاست و تدبیر کی سنجیدگی تھی اور دوسری طرف حماقتوں کا بہروپ تھا۔ اس نے نیام سے پیش قبض نکالا اور شہد کے چھتے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ شہد بہہ نکلا۔ لوگ اپنی زبانیں نکالے لپ لپ کرنے لگے۔ پیش قبض زہر میں بجھا ہوا تھا۔ زمین پر پھیلے ہوئے شہد سے آگ کی لپٹیں ابھریں، اور ساری فضا میں دھواں پھیل گیا۔ کڑوا دھواں جس میں تارپین اور کولتار کی بو ملی ہوئی تھی، ہوا چلی، دھواں چھٹ گیا۔ اب وہ اپنے آبائی مکان میں تھا اپنے باپ کے بنائے ہوئے گھر میں۔ اپنے گھر میں، جس کے دیوان خانے میں سامنے کی دیوار پر اس کے باپ کی تصویر آویزاں تھی۔ تصویر کے نیچے ایک قد آدم کلاک کا پنڈولم جھول رہا تھا۔ ٹک۔ ٹک: دھک دھک، دل کی طرح۔ گڑ گڑ گڑ گڑا رہیں۔ فرفر فر فر۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آواز گونجنے لگی۔ بازار میں، ٹڈی دل، ٹڈی دل! کا شور تھا اور آسمان پر سرخ اندھیرا چھا گیا۔ پھر کہیں سے میاں پوتر د! کی لرزہ خیز آواز آئی۔ وہ سہم گیا۔ ٹن ٹن ٹن ٹن ـ کلاک: کھڑ کھڑ کھڑ۔ دروازہ؟ اسکی آنکھ کھل گئی

اس نے لحاف منہ سے ہٹایا۔ روشن دانوں میں شفق کی سرخی جھلک رہی تھی۔ لیکن اس کے سامنے آتشدان پر ساڑھے گیارہ بجے تھے۔

ٹن ٹن ٹن ——— ! بازار سے فائر بریگیڈ کی آواز آئی۔ وہ لحاف جھٹک کر بستر سے باہر نکل آیا اور سیدھا صحن کی طرف بھاگا۔ اسے یہ جانتے دیر نہ لگی کہ ماڈرن فرنیچر سٹور کی عمارت جل رہی تھی۔ اس کے مکان کی عقبی دیوار اور اس عمارت کی دیوار ایک تھی۔

آگ اگر جلد نہ بجھی.......... اس تصور سے اسکے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دروازہ پر پھر کھٹ کھٹ ہوئی۔

"کمال کر دیا آپ نے۔ آدھ گھنٹے سے دروازہ پیٹ رہا ہوں۔ اب بھی نہ اٹھتے تو توڑنا پڑتا۔"

عجب نیند پائی ہے۔ یا کوئی افسانہ ہو رہا تھا۔ جلدی کیجئے۔ آگ پھیل رہی ہے ؎

"قفس کے سامنے جلتا ہے آشیاں ان کا"

اس کے ہمسائے صغیر الحسن قاسمی کا یہ خاص انداز تھا۔ وہ دن بھر لطیفے اڑاتا اور موقع بے موقع بامعنی اور بے معنی شعر گڑھتا رہتا تھا۔ اس کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات اس کی سنجیدہ سے سنجیدہ بات پر بھی تفنن کا گمان گذرتا تھا۔ اور اگر آگ سامنے نظر نہ آ رہی ہوتی تو یہ بھی لطیفہ ہو سکتا تھا ؏

"اب تو اٹھتے ہیں اس مکان سے ہم"

ظالم کو اس وقت بھی دل لگی سوجھ رہی تھی۔" یاد اپنی تمہیں دلاتے جائیں۔ آگ کس کے لئے لگاتے جائیں" اچھا جلدی کیجئے۔ افسانہ بعد میں ہو جائے گا۔ میرا سامان تو صحرائے کوئی میں پہنچ چکا۔ آپ نندا کے جنگلات کا رخ کیجئے۔ سینگ لگائیے سر پہ اور سامان کی فکر کیجئے جائیے جائیے بچوں کو بچائیے۔ میرا منہ نہ دیکھئے ؏

میں آئینہ نہیں مجھے حیراں نہ کیجئے

دروازے کی دھڑ دھڑاہٹ سے اس کی بیوی جاگ گئی تھی۔

"کون تھا؟"

پیچھے بازار میں آگ لگی ہے۔ سوچ رہا ہوں بچوں کو باہر لے چلیں اور سامان نکال لیں۔ احتیاطاً ——— اس نے اپنے اندیشوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہائے اللہ! کہاں لے جاؤں بچوں کو اس سردی میں۔ ایسے ایک تو پہلے ہی لٹ پٹ کر آتے تھے۔ اب پھر پناہ گیر ہونا پڑے گا؟ ارے اٹھو بچو۔ پر جائیں گے کہاں میں پوچھتی ہوں؟

سوچ رہا ہوں کہ :-

"آگ سر پہ پہونچ جائے گی اور یہ سوچ تو پھر بھی ختم نہ ہوگی۔ ارے سلیم"۔ اٹھکر دیکھ قاسمی صاحب نے سامان نکال لیا اپنا اور سہیلہ اٹھ ننھے کی چارپائی تو باہر نکال۔ ہائے اللہ کیا کروں۔ کدھر جاؤں"

"ہمت سے کام لو میں کہتا ہوں"

"جی ہاں ساری ہمت میرے لئے تو رہ گئی اور آپ کھڑے سوچتے رہیں فرشتے تو نکال لینے سے رہے سامان کو۔ ایک لحاف بھی نہیں بنتا آجکل اور سردی سے ادھ مر رہا رگوں میں۔ آٹھ سال میں جاکر یہ چار جوڑے بنے ہیں۔ ہمارے پاس تو پیسہ بھی نہیں کہ اور بنوالیں۔ ہاتھ میں چھلا تک نہیں چھوڑا کہ آدمی بیچ کر ہی وقت نکال لے۔ جو کچھ تھا رشتہ داروں کی جھولی میں ڈال دیا اور فیض کیا مل گیا ان سے۔ ہمارا تو کوئی ہاتھ بٹانیوالا نہیں.......... !

اس نے جلدی سے ننھے کی چارپائی کھینچی اور گھسیٹتا ہوا برآمدے میں لے گیا۔ بچہ چیخنے لگا۔

"ہائے میں مری۔ ذرا دیا منے کو۔ سات بچوں کے باپ ہو گئے پر اتنی عقل نہ آئی کہ سوتے بچے کی چارپائی گھسیٹا نہیں کرتے۔ ہاں سلیم؟ چلے گئے قاسمی صاحب اور سامنے والے سیٹھ جی"۔

"کشو اور راٹو بھی چلے گئے امی جان"۔ منجھلی بچی خبر لائی۔

بس ایک ہم ہی پیچھے رہ گئے۔ آج نہیں بچنے کا کچھ۔ ہائے۔ کیا کروں میں!"

بیوی کی طرح اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آگ اس نے پہلے بھی دیکھی تھی۔ فسادات کے زمانہ میں اس نے ایک نہیں سیکڑوں مکان۔ پورے محلے کے محلے جلتے دیکھے تھے لیکن دور سے۔ مگر یہاں آگ ہر لحظہ قریب سے قریب تر آ رہی تھی اس کا اندازہ تھا کہ آگ اگر بجھ نہ گئی تو اس کے گھر تک پہونچتے پہونچتے کوئی آدھ پون گھنٹہ ضرور

لے گی۔ اور اس عرصہ میں اگر کوئی ہاتھ بٹانے والا مل گیا تو سامان بہ آسانی
بچایا جا سکتا تھا لیکن مدد کرنے والا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا اور اس کے ہاتھ
پاؤں سن ہوتے جا رہے تھے۔ وہ کبھی ایک چیز پر ہاتھ ڈالتا کبھی دوسری پر
لیکن اس کے باوجود دونوں چیزیں بدستور اپنی جگہ موجود نظر آتیں۔ ادھر
بیوی کی آواز میں اندیشوں کے بجائے ماتم کے سر ابھر رہے تھے، اور اسے وہ
دن یاد آ رہا تھا کہ جب اس کا بڑا بیٹا چھت سے گرا تھا اور ڈیڑھ ماہ بعد
دماغ کی نس پھٹ جانے سے چل بسا تھا۔

حافظے کے استبداد سے زندگی کے اور کئی حادثے، کئی دبے پڑے
دکھ، بجلی کی سرعت سے پناہ گاہوں سے نکل آئے، اور حشرات الارض
کی طرح اس کے گرد رینگ رہے تھے۔

ان نگوڑی تصویروں کو چولہے میں ڈالو جی۔ ٹرنک نکالو کپڑوں
کے جل گئے تو یہاں کفن کے لئے بھی کوڑی نہیں۔ اور آگ لگے ان موٹی کتابوں
کو۔ گدھوں بوجھ جمع کر لیا پر عقل مول نہ آئی۔ جہاں دس ہزار کی پہلے جلی
تھیں یہ بھی جل جائیں موئی ردی ؟

اس نے وہ نایاب تصویر پھر آتشدان پر رکھ دی جو اس کے ایک
مصور دوست کو اس کے ایک جاپانی شاگرد نے لندن میں بطور تحفہ دی
تھی۔ تصویر رکھ کر اس نے مہاتما بدھ کا وہ چھوٹا سا مجسمہ اٹھا لیا جو اس کے
ایک پٹھان دوست کو چارسدہ سے دستیاب ہوا تھا۔ بت کی عمر کا اندازہ
کوئی دو ہزار سال کے لگ بھگ تھا۔ اگر اس میں اور کوئی کمال نہ بھی ہوتا
تو یہ مدت ہی اس کے یہاں آنے جانے والوں کو مرعوب کرنے کے لئے
کافی تھی۔

"انہی بتوں کی بدولت تو ہم پر عذاب آیا ہے۔ مسلمانوں کے گھروں
میں مورتیوں کا کام ہی کیا آخر۔ رکھو اسے نہیں توڑتی ہوں۔ ادھر آؤ اور
ہاتھ بٹاؤ یا سارا کام عورت ہی کرے گی؟ ڈھور ڈنگر سمجھ رکھا ہے چولہا
جھونکو، بچے سنبھالو اور اب سامان بھی ڈھوؤ۔ سبھی کے مرد ایسے ہی ہوتے
ہیں کیا؟ نوکری نہ ہوتی تو سمجھ کے مار دیتے سب کو۔ موئے افسانے لکھنے
کے سوا آتا ہی کیا ہے اور۔ کیا دے دیتے ہیں رسالے والے پچیس نہیں
تیس حد چالیس۔ وہ بھی اگر پسند آ جائے۔ دوست مر گیا۔ بیچارہ کہانیاں
لکھتے لکھتے۔ بیوی نوکری کرتی ہے غریب۔ میں تو اتنی بھی پڑھی لکھی نہیں
کہ اسکول ٹیچر ہو جاؤں کہیں۔ وہ آئے کا کنستر ہی نکال لاؤ جس کی فکر
اتنی ذلت اٹھا کر بہ مشکل ملتی ہے اور۔۔۔ بدر مارے مارے پھر رہے ہیں تو
گھی کا ڈبہ اٹھا لا بیٹا۔"

دفعتاً بجلی کی رو بند ہو گئی۔ بتیاں بجھ گئیں۔ منجھلی بچی رونے لگی
"امی چلو کہیں۔"

"اب کیا ہو گا میں نے کہا؟ لالٹین بھی لائے تو اندھی۔ روپیہ
لے کر ٹھیک بھی کر دیا اس روز وہی بجھ گئی اور ٹپک: سات بچوں کے
باپ بن گئے پر چیزوں کی پہچان نہ آئی۔ ٹی سیٹ اٹھا لائے پانچ پیالی کا
کہ جاپان میں پانچ ہی پیالی کے سیٹ ہوتے ہیں۔ دکاندار بھی کہتا ہو گا
ایسے بدھو گاہک روز روز آئیں۔ اور لکھتے ہیں کہانیاں۔ اللہ جانے کون
پڑھتا ہو گا۔ سلیم بیٹا ذرا دیکھنا تو چودہ اگست کی موم بتیاں تو نہیں
رکھیں کہیں کھانے والے کمرے کی کارنس پر اور ماچس کہاں ہے؟ یہ بھی
کہ سگرٹوں میں پھونک گئی؟"

"کوٹ میں ہو گی۔ سلیم بیٹا کوٹ کہاں ہے میرا؟"

"پہن رکھا ہے آپ نے۔"

"جانے اس کا کیسے دھیان گیا!"

آتش زدہ عمارت سے اڑتے ہوئے انگارے صحن میں پھلجھڑیوں
کی طرح برسنے لگے۔

"ہائے امی جان۔ جلدی چلو کہیں۔" بچی چیخنے لگی۔

"چپ ہو جا مردار۔ ایک تو اللہ نے مصیبت ڈالی ہے دوسرے
تو ہاتھ پاؤں سن کئے دے رہی ہے۔"

"انتظار کس کا راہ دیکھنے والے؟" اس کا ہمسایہ دروازے میں
کھڑا تھا۔ "اسباب کیوں نہیں نکالتے۔"

"اسباب؟ جی ہاں۔ سوچ رہا تھا کہ کوئی ہاتھ بٹانے والا
مل جائے۔"

"سوچئے گا کل۔ پہلے بچوں کو بھیج دیجئے شعیب صاحب کے ہاں
باقی سامان کی دیکھی جائے گی۔ اپنے ساتھ لے جائیے انہیں یقیناً میاں
ہاں بھاجی آپ جائیے۔ اے۔ پی موجود ہے۔ فلیش پہنچتے رہیں گے
باقاعدہ چلتے چلتے دیر نہ کیجئے۔ اچھا حضور اب آپ سامان کے پاس

بیٹھئے اور سوچئے۔ لیتے ہم دیکھ آئیں کہ کنٹونمنٹ بورڈ کے فواروں کا کیا حال ہے۔ آگ کیا بجھائی جا رہی ہے عروس بہار کا منہ دھویا جا رہا ہے۔ ایک ایک ہوز میں ہزار ہزار سوراخ ہے۔ فرلونٹ شوم اس فائر بریگیڈ کے ٹاٹا اس مسئلے پر بھی غور کیجئے گا ذرا۔ آگ لگانے والے تو بہت ہیں بجھانے والا کوئی نہیں، یہاں تو ہر کام فوج ہی کرے گی۔ لڑیں گے البتہ شہری۔ آپس میں! جی ہاں! آداب عرض؟"

کس قدر زندگی تھی ظالم میں۔ مصیبت میں بھی ہنس رہا تھا آگ والی عمارت سے چار کنبوں کو بچا لایا تھا پیچھے سے سیڑھی لگا کر۔ ایک بار مخنثہ ہو گیا۔ گھر والے گھبرا گئے۔ بولا ڈر کا ہے کا ہے۔ میاں بھئے کوتوال۔ آپ کا بندوبست میری بیمہ کمپنی کرے گی۔ رہا میں سو مونچھوں کو لگاتا جاؤں گا تھوڑی سی۔ نکیرین بھاگ جائیں گے۔ ورنہ بقول شاعر قارون کا خزانہ راستے میں ضرور موجود ہوگا۔ رشوت دیکر نکل جاؤں گا۔ رضوان کا ڈر البتہ ضرور تھا سو اس کو رام کرنے کا ڈھنگ بھی سوچ لیا ہے ایک تو یہ کہ قاسمی کے بجائے بندہ آج سے رضوی ہے۔ جی ہاں بقائمی ہوش و حواس اعلان کر رہا ہوں۔ آپ گواہ رہئیے گا۔

سو جناب ایک تو، ہو گئی عزیز داری، دوسرے پبلسٹی کی اسے بھی ضرورت ہے اور ہم ٹھہرے جرنلسٹ اور وہ بھی فری لانس۔ بس دو چار فلیشز، چار چھ سٹوریز بھیج دوں گا کہ کام بڑی مستعدی سے ہو رہا ہے۔ شراب طہورا کا ایک مشکیزہ بھی باہر نہیں آسکتا۔ حریر و دیبا کا ایک تار بھی دیکھنے کو نہیں ملتا۔ ثمر بہشت کے ذخیروں پر کڑا پہرہ ہے۔ حوروں کو ترغیبات سے محفوظ رکھنے کے لئے کشیدہ کاری میں مصروف رکھا جاتا ہے" اور پھر بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ڈر ہے تو بس اتنا سا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

پر کیا معلوم کہ تم بھی اس وقت تک حور بن کر وہاں چلی آؤ۔"

گلی بازار اور چھتوں سے سیٹیاں گونجنے لگیں۔ اسے اپنا سکاؤٹنگ کا زمانہ یاد آ گیا جب اسے ٹینڈر فٹ کا بیج ملا تھا تو کھیل کھیل میں آگ بجھایا کرتے تھے۔ لیکن یہ آگ اصل آگ تھی۔ کوئین بنے کانوں کی طرح شائیں شائیں کر رہی تھی۔ ٹڈی دل کی طرح شوک رہی تھی، سپیروں کی پٹاریوں کی طرح پھنکار رہی تھی، لال آندھی کی طرح گونج رہی تھی۔ بڈھا فضلو کہا کرتا تھا کہ جیسے شاہ جن آتا ہے۔ سال بھر کا اناج اکٹھا کرنے ..... کے لئے کٹائی کے زمانے میں۔ باہر بالکل نہیں رکنا چاہئیے اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آگ کی روشنی سے دور تک سرخی ہی سرخی دکھائی دے رہی تھی۔ دروازے کے باہر محلے کا بڈھا چوکیدار اپنی چلم کے لئے انگارے چن رہا تھا۔ جو جلتی ہوئی عمارت سے اڑ اڑ کر چاروں طرف گر رہے تھے اسے تمباکو کی طلب محسوس ہوئی مگر سگرٹ ختم ہو چکے

سیٹیوں کی لہر پھر ابھری
"ملٹری آگئی۔ ملٹری آگئی۔"
"بم رکھا جائے گا۔"
"جلتی عمارت کو ڈائنا میٹ لگے گا۔"
"بھاگو!"
"دوڑو!"
"گرینیڈ! بم! ڈائنا میٹ!"

اس کے دروازے میں فلش لائٹ کا لشکارا ہوا ——— فوج!

"کوئی ہے ادھر۔ باہر آجاؤ۔ بازار میں آجاؤ۔ ڈائنا میٹ ہوگا جلدی جلدی کرو۔"

گلی میں ریوڑ دوڑ رہے تھے، کتے بھونک رہے تھے اور آسمان کے سانپ پھنکار رہے تھے۔ اس نے جلدی سے ایک چھوٹا سا تالا دروازے میں ڈالا اور مکان کے باہر کھڑا ہو گیا۔ بیرونی صحن کی دیواریں آسانی سے پھلانگی جا سکتی تھیں اور افراتفری کے اس عالم میں ڈھٹائی سے محتاط رہنا ضروری تھا۔

"ہے، ہو! ادھر کیا کر رہے ہو" گلی کے دہانے سے قانون کی آواز آئی۔ "بھاگو! ڈائنا میٹ لگے گا۔ ڈائنا میٹ!"

خطرے کے احساس سے اس کی پنڈلیاں سکڑ گئیں اور اس کے پاؤں سن ہو گئے۔ اس نے اپنے ہاتھ جیب میں ٹھونس رکھے تھے چابیوں کے لمس سے اسے یاد آ گیا کہ اس نے تالے کو بند تو کیا ہی نہیں تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ بیس کے گچھے سے اس چابی کی تلاش جس کی ضرورت تھی! کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس نے آخر چابی ڈھونڈ نکالی۔ لیکن تالے

کا زنگ چاپانی کا راستہ روکے ہوئے تھا، اور وہ سیدھی سی جھری جس میں بظاہر کوئی پیچ نہیں تھا۔ ایسی بند ہوئی تھی کہ جیسے تابن گئی تھی۔ پیتل کی تالی قلم کے نب کی طرح نظر آئی جو خیالات کی ترجمانی سے کاغذ پر ناک رگڑتا ہے اور الٹی سیدھی لکیریں کھینچتا چلا جاتا ہے۔ عطائی کے مضراب کی مانند جو سازنگے کے تاروں سے نغمے جگانے کی بجائے محض شور پیدا کرتی ہے اس تیشے کی طرح جو مرمر کی سل سے مجسمہ تراشنے کی جگہ اسے بے مصرف سنگریزوں میں تبدیل کر دیتا ہے اور وہ سوچنے لگا کس جاہل نے کہا تھا کہ مجسمہ مرمر میں موجود ہوتا ہے، نغمہ سازنگے کے پردوں میں پنہاں ہے، شعر عروض کی کتابوں سے برآمد ہوتے ہیں اور افسانوں کے پلاٹ بازاروں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ڈھکوسلے سب ڈھکوسلے! اگر یہ درست ہوتا تو ہر گلکار شاہجہان ہوتا۔ ہر میراثی، امیر خسرو، ہر قلی، کوہکن، ہر معلم، میر، غالب۔ ہر نقال، شیکسپیر، اور، سوفو، کلیز، اور ہر پلیدر پڑ ماپاسان، ماہم اور منٹو۔ خودکشی کر لی ظالم نے۔ ماحول سے بے نیاز نہ ہو سکا۔ سودیزیں کے قضیوں سے بلند نہ رہ سکا۔ ماپاسان پاگل ہو گیا گوگیں نے کان کاٹ لیا۔ عذرا پاوند دیوانہ قرار پایا۔

سیٹی پھر سنائی۔

"ہے ہو بابو! ادھر آ جاؤ۔ ڈائنامیٹ ہو گا۔ مرنا مانگتی ہے"

بنگالی سپاہی ——— وہ بازار کی طرف بڑھا لیکن پولیو کے مریض کی طرح اس کا ہر قدم کھنچے ہوئے پٹھوں کے خلاف زور آزما تھی۔ مکان سے دس ہی قدم کے فاصلے پہ نارنج کے پیڑ کے نیچے اسے ڈائنامنٹ کے دھماکے نے آلیا۔ فضا ٹوٹتے ہوئے شیشوں کے چھناکوں سے بیخ اٹھی۔ کرچیاں انگاروں طرح چمکیں اور مکانوں کی منڈیروں سے اینٹ پتھر اولوں کی طرح برس پڑے۔ اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔ باہیں لہرائیں، درخت کی شاخ سے ایک نارنج ٹوٹ کر سر پہ گرا۔ اور اس کے جعلی دانت جبڑوں کو چھوڑ کر باہر نکل آئے ...... یہ سب کچھ اس عجلت کے ساتھ ہوا کہ واقعات کے تقدم و تاخر کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ وقت پہلے اور بعد اور اضافیت کے سارے اصول جو اس نے کتابوں میں پڑھے تھے، دھول اور دھوئیں میں بہتے دکھائی دیتے۔ سارا محلہ بگولے کے آغوش میں ملفوف تھا۔ جعلی دانتوں کے کلپ ٹوٹ گئے تھے، ساٹھ روپے اور پچوں کے کپڑے بنتے۔ سامنے کے یہ دانت، جو کاٹنے کے کام نہیں آ سکتے تھے، محض دکھانے کے دانت تھے وہ انہیں رات کو دوائی میں ڈال رکھتا اور صبح برش سے صاف کرتا۔ لیکن اب اس کی ہتھیلی پر رکھے ہوئے وہی دانت اسے اپنی تدبیروں کا منہ چڑاتے نظر آ رہے تھے۔ دانتوں کو جیب میں ڈال کر وہ بازار کی طرف بڑھا۔

"ع۔ وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے۔ دھماکہ تو ہو چکا حضور۔ ع۔ واکیا آپ کو خبر نہ ہوئی؟ واپس چلئے اور اسباب کی رکھوالی کیجئے۔ شہ یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا۔ یار لوگ ہاتھ صاف کر جائیں گے مہاجر کی چرا پونجی پر۔ ہا ہا ہا! ع

اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

آتے آتے ہیں" ہمسایہ اسے ہاتھ سے گھسیٹتا ہوا اس کے دروازے پر لے آیا۔ اب آباد کاری کی فکر کیجئے۔

ڈائنامیٹ سے جلتی ہوئی عمارت کٹ کر علیحدہ ہو گئی تھی اور آگ پھیلنے کا اندیشہ نہیں رہا تھا۔ بجلی کھو لدی گئی تھی اور گھر روشن تھا۔ کمروں میں گرد کے بادل معلق تھے۔ فرش پر شیشے کی کرچیوں میں روشنی کی شعاعیں ٹیسوں کی طرح مچل رہی تھیں۔ کھڑکیوں، روشندانوں اور دروازوں کے خالی روزنوں سے جہاں کبھی شیشے ہوا کرتے تھے رات اپنی بے نور آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ دسمبر کی سردی برف کی شفاف چادر کی طرح پھیلنے لگی۔ آتشدان میں چمنی سے گری ہوئی کالک کی تہیں لگی تھیں کمرے کے اس آتشدان میں سیاہی کے ذروں نے جانے کس کس کی باتیں سنی ہیں۔ دکھ سکھ کے قصے، بچوں کی کھلکھلاہٹ۔ قہقہے، ہچکیاں۔ بوسے سسکیاں۔ لوریاں۔ بین۔ ایک بھی کو افسانے کا موضوع نہیں مل رہا کارنس پر مہاتما بدھ کا بت جوں کا توں پڑا تھا۔ آنکھیں مندی ہوئیں ہونٹوں پر تبسم۔ بت کے پاس۔ جاپانی تصویر کی حسینہ بدستور اپنے سنگار میں مصروف تھی۔

اس کے پاؤں تلے شیشے کی کرچیاں کرکرائیں اور وہ پھر اس اس دنیا میں آگیا۔ جہاں آدمی اطمینان کی تلاش میں فنا ہو جاتا ہے مقصد اور نصب العین کی دنیا۔ فلسفہ اور فنون لطیفہ کی دنیا۔ آٹے دال۔ نون تیل لکڑی کی دنیا۔ ماہ و سال اور ساعتوں کی دنیا۔ شیشے کی

کرچیوں، سیاہی کے انبار اور گرد کے ذروں کی دنیا...... اس نے کپڑوں کے انبار سے ایک گدّا نکالا اور اپنے گرد لپیٹ لیا اور برآمدے میں پڑی ہوئی ایک چارپائی پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ سامان کے انبار میں اس طرح لپٹا لپٹایا؛ خود کو لاوارث اسباب محسوس کر رہا تھا جیسے اس کا مالک ریلوے پلیٹ فارم پر بھول گیا ہو۔ اس تشبیہ سے اس کی مظلومیت کا احساس اور شدید ہو گیا۔ اور ان مظالم کی یادیں ایک ایک کرکے ابھرنے لگیں جو اس سے عمر بھر روا رکھے گئے تھے عزیزوں اور دوستوں کی موت کے مظالم۔ دفتری مظالم افلاس اور سفید پوشی کے مظالم۔ آرزوؤں کے مظالم اور سب سے بڑھ کر وقت کے مظالم جو اسے اپنے خیالات کو آراستہ کرنے کی مہلت بھی نہیں دے رہا تھا سوچنے تک کی فرصت نہیں دے رہا تھا اور ایڈیٹر نے لکھا تھا: آپ کے افسانے کا انتظار کروں گا۔ بخورده گزند، کبوتر بام حرم۔ وہ کیا جانے۔ وہ کیا جان سکتا ہے افسانہ یا افسانہ نگار کا افسانہ۔

شب آخر گشت و افسانہ از افسانہ می خیزد

کیا لکھوں کیا نہ لکھوں۔

"دھڑ دھڑ دھڑ!" دن چڑھ چکا تھا۔ اس کی بیوی بچے اپنے میزبان کو ساتھ لئے باہر کھڑے تھے۔

"آپ کو بڑی زحمت ہوئی شعیب صاحب...."

"جی نہیں یہ فرض تھا ہمارا۔ تکلیف تو آپ کو ہوئی!"

"اب کیا عرض کروں، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے عمر بھر بنا ہیں، ڈھونڈنا ہی لکھا ہے ان قسمت میں۔"

"میرے لائق کوئی اور خدمت۔ ناشتہ بھجوا دوں؟"

"جی نہیں۔ شکریہ۔ ابھی تیار ہوئی باقی ہے۔ آپ بھی پی کر جائیے نا سردی ہے۔"

"گھر پہ انتظار ہوگا۔ اور پھر اس حالت میں! آپ کا تو بالکل حاضری کا سلسلہ ہو گیا کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہلوا بھیجے گا!"

"آپ تشریف لائیے نا۔ تکلیف کی کیا ضرورت ہو۔"

"بس ذرا گلی کے نکڑ تک چلتا ہوں۔ سگرٹ بھی تو لینا ہیں۔"

اس کا ہمسایہ سگرٹ والے کی دکان پر پہلے ہی موجود تھا۔

"کہئے حضور کچھ بست کی بھی خبر ہے۔ سنا ہے کل پانچ ہزار کا بیمہ تھا

کرنے کی خاطر یہ چراغاں ہوا ہے بات کہ جھوٹ سچ کی اللہ کو خبر ہے پچھلے زمانے میں تین چار لاکھ تو لگ ہی گیا ہوگا۔ اس عمارت پہ دو سری دکانوں اور کرایہ داروں کے نقصان کا اندازہ دو لاکھ۔ اب ہو جائے ایک عدد اقتباس

آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

غور کیجئے گا عنوان پر اور بندو چل کے ڈپیچ تیار کرتا ہے۔"

اس روز گلی میں کباڑی بچوں کا تانتا بندھا ہوا تھا بوریاں کندھوں پر ڈالے وہ شیشے کے ٹکڑے چن رہے تھے جن سے سارا محلہ کہکشاں بنا ہوا تھا۔

"ارے یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے ایک لڑکے سے پوچھا۔ "ہاتھ زخمی نہیں ہوتے تمہارے"

"ہاتھوں کا کیا ہے صاحب۔ چھ پیسے سیر بکتی ہیں کرچیاں۔"

"کاہے کو؟"

"مانجا بنتا ہے صاحب۔ ریگ مال بنتا ہے۔ چوڑی والے لے جاتے ہیں۔"

ہاتھوں کا کیا ہے! —— چھ پیسے سیر بکتی ہے!

لڑکے کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا کاش افسانے لکھنے کے بجائے میں نے کرچیاں چننے کا کام کیا ہوتا۔

(بشکریہ "ماہِ نو")

محمد یعقوب طاہر

یومِ جمہوریہ

گلوں پہ رنگ کلی پہ نکھار آیا ہے
غزل سرا ہو کہ دورِ بہار آیا ہے

وہ جس کی دید کو صدیوں زمانہ رویا ہے
وہ نورِ چشم وہ جانِ قرار آیا ہے

سنبھل تو اے مرے مجرم ضمیر، چیدہ نظر
جو دیکھتا ہے دلوں تک کے پار آیا ہے

بلندیوں سے یہ کہدو، بہت نہ اترائیں
کہ پستیوں کا بھی اب غمگسار آیا ہے

لرزنے کا نہیں یہ وقت شکر ہے ناداں
وہ دل میں جس کی ہی پنہاں پکار آیا ہے

وہ جو تھا ملک بدر مدتوں سے اے ہمدم!
مرے وطن کا وہی تاجدار آیا ہے

اُٹھ اب کہ لڑنی ہے کانٹوں سے جنگ دست بدست
لٹانے پھول وہ جانِ بہار آیا ہے

حضور آپ کی محفل میں آپ کا طاہر
اب آگیا ہے مگر شرمسار آیا ہے

محسن بھوپالی

دورِ نو

مشرق سے ابھرنے کو ہے جمہور کا خورشید
تاریکیٔ شب رنگ ہمیشہ نہ رہے گی

منصور کے اعلان کی تائید کریں گے
حق گوئی ملامت کا نشانہ نہ رہے گی

انگلی نہ کوئی دامنِ یوسف پہ اٹھے گی
فرقت کی سزاوار زلیخا نہ رہے گی

گلشن میں چلے گی نہ ہوس کاریٔ گلچیں
نرگس کی نظر وقفِ تماشا نہ رہے گی

امروز بدل ڈالے گی خودداریٔ انساں
اب منتظرِ وعدۂ فردا نہ رہے گی

تحقیق کے پیمانوں میں ڈھل جائیگی ہستی
رنگینیٔ اوہام پہ شیدا نہ رہے گی

بیداریٔ احساس ذرا عام تو ہو لے
غنچوں کی سحر حزنِ سراپا نہ رہے گی

میرزا ادیب

دوسرا رُخ

دن بھر اپنے دوستوں کے ساتھ ادھر ادھر آوارہ گردی کرنے کے بعد جب شام کے قریب اس نے ڈرتے ڈرتے گھر کے دروازے پر قدم رکھا تو دیکھا کہ ماں حسب معمول نل کے پاس گندے کپڑوں کا انبار لگائے سر جھکائے کچھ سوچ رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ دوپٹے کے دامن سے آنسو بھی پونچھتی جا رہی ہے۔ یہ منظر اس کے لئے کوئی نئی بات کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ قریب قریب ہر روز ماں کو وہ اس حالت میں دیکھتا تھا۔ آنسو بہانا شاید اس کی سرشت میں داخل ہو ہی چکا تھا۔ اور وہ جان چکا تھا کہ گھنٹوں کسی گہری سوچ میں گم سم بیٹھے رہنا اور ذرا ذرا سی بات پر جان ہلکان کر دینا ایک ایسا کام ہے جو ماں کی عادت بنکر رہ گیا ہے۔ تاہم کبھی کبھی اس کے ذہن میں یہ خیال ضرور چبھتا تھا۔ کہ آخر میری ماں کو ہو کیا گیا ہے۔ جو وہ یوں ہر وقت غمگین اور افسردہ رہتی تھی محلے میں ہر گھر کے اندر کم از کم ایک ماں موجود ہے مگر آج تک کسی کو یوں آنسو بہاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا لیکن میری ماں ——— میری ماں کی تو بات ہی نرالی ہے شاید میرے باپ کے مرنے کے بعد ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا۔ جب اس نے صبح سے لیکر شام تک دو چار مرتبہ آنسو نہ بہائے ہوں۔ ماں کی اس عادت سے وہ اس درجہ تنگ آچکا تھا کہ اس کا دل چاہتا تھا کہ اس گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر کہیں دور چلا جائے۔ گھر میں آکر اسے ملتا ہی کیا ہے گالیوں اور بددعاؤں کی بوچھاڑ شروع ہو جائے گی۔

موقع کو غنیمت سمجھکر وہ دبے پاؤں کوٹھڑی میں چلا گیا! اور چولہے کے ارد گرد روٹیوں کی چنگیر تلاش کرنے لگا کنستر پر چنگیر پڑی تھی اور قریب ہی سالن نظر آرہا تھا۔ وہ جلدی جلدی لقمے نگلنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ ماں کے کوٹھری میں آتے ہی روٹی کھانا مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو اپنا پیٹ بھرے کپڑوں پر ڈنڈا مارنے کی آواز سن کر اسے اطمینان ہو گیا۔ کہ ابھی ماں مشغول ہے کچھ دیر بعد آسکے گی۔ اس وقت تو بالکل نہیں آسکتی۔ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ روٹی کھاتا رہا۔

پوری طرح پیٹ بھرنے کے بعد وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور ایک تازہ فلمی گیت گنگنانے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اس کی ماں کوٹھری میں آئی اور اپنے دونوں ہاتھ ڈبے کے قریب لیجا کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اگر اماں نے لعنت و ملامت شروع کر دی تو وہ کیا کہے گا وہ تمام دن گھر سے باہر رہنے کا کیا عذر پیش کرے گا۔

خلاف معمول ماں بڑے پیار سے بولی:۔

کیوں بچو روٹی نہیں کھائی۔ خدا جانے سارا دن کہاں پھرتے رہتے ہو پاؤں کے چھالے کا کیا حال ہے؟

اس نے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ابھی تک اسکی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں اور گالوں پر جا بجا مدھم داغ پڑے ہوئے تھے۔

"پاؤں دکھاؤ تو سہی۔ ہائے میں مر گئی۔ کیسے بڑے بڑے چھالے ہیں۔ تم سب ہاتھ دھو کر میری جان کے پیچھے پڑے ہو"

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر بہنے لگے

"اماں یہ تو بڑے چھوٹے چھالے ہیں۔ بھلا ان سے کیا ہوتا ہے"

اس نے کہا اور ماں کے ہاتھ کو پیچھے ہٹانے لگا۔ یکایک اس کے ہاتھ پر سرخ سرخ نشان سے نظر آنے لگے۔ اب اسے معلوم ہوا۔ کہ ماں کے ہاتھوں میں خون بہہ رہا ہے۔

"اماں یہ کیا ہوا؟ گر پڑی تھیں ——— کیسے؟ اماں بتاؤ نا؟"

اس کا دل بے تاب ہو گیا تھا۔

"گر پڑی تھی۔ کیوں نہ گر پڑتی"

اس نے کہا۔ اس کے غم آلود ہونٹوں پر مسکراہٹ کی باریک باریک لکیریں نظر آنے لگیں۔ یہ مسکراہٹ اس قدر دردناک تھی۔ کہ اس

کے دل پر گھونسا سا لگا اور وہ گھبرا کر بولا۔

"اماں یہ تو تمہارے چھالوں سے لہو نکل رہا ہے"

ماں دو تین لمحے خاموش اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی پھر بولی۔

"نکل رہا ہے تو تمہیں کیا۔ تم کھاؤ پیو اور عیش کرو۔ ساری دنیا کے دکھ میرے لئے ہیں۔ خدا ہی جانے کیا گناہ کیا ہے جس کی یہ سزا مل رہی ہے مجھ نصیبوں جلی کو موت بھی تو نہیں آتی۔ موت آئے تو یہ قصہ ختم ہو"

اب اس نے کوئی سوال نہ کیا۔ ڈرتا تھا کہ اگر اس نے کچھ اور کہا تو ماں یا تو اپنا سر پیٹ لے گی یا بھوکی ہی سو جائے گی۔ لیکن اس کے لئے خاموش ہونا قطعاً ناممکن تھا۔ چنگیر پر پڑے ہوئے رومال سے اس نے آنسو خشک کئے اور کہنے لگی۔

"صبح کو شام تک کام کرتی ہوں۔ جھاڑو دیتی ہوں۔ آٹا گوندھتی ہوں۔ برتن دھوتی ہوں۔ روٹیاں پکاتی ہوں۔ کیا کچھ نہیں کرتی۔ کپڑے دھو دھو کر میرے ہاتھوں کا یہ حال ہو گیا ہے۔ چھالے پڑ گئے ہیں۔ لہو نکلنے لگا ہے اس پر بھی ان لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ ہر وقت گالیاں دیتی رہتی ہیں اور تمہاری چچی"

وہ ڈر گیا۔ اگر چچی نے ماں کا کوئی لفظ سن لیا تو قیامت .... آجائے گی۔

"اماں ہاتھوں پر گھی لگا لے"

گفتگو کا موضوع بدلنے کے لئے یہی بات اس کے ذہن میں آئی لیکن ماں اسی جوش کے عالم میں کہتی گئی۔

"اللہ کرے متاب بندی۔ تیرا بیڑہ غرق ہو۔ کیڑے پڑ جائیں تیرے جسم میں۔ تڑپ تڑپ کر مر جائے۔ پھر یہ پوچھوں۔ کس طرح ستا کرتے ہیں۔ دوسروں کو اب مزا چکھانا"

اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اس نے کئی بار چچی کو ماں سے لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ لڑائی دیکھ کر وہ سخت پریشان ہو جاتا

"بکو بیٹا۔ آخر کب تک یوں ذلیل ہوتے دیکھو گے۔ ماں کی عزت کا کوئی خیال ہی نہیں ہے تمہیں"

اب ماں کا لب و لہجہ نرم پڑ گیا تھا۔

"آج تمہارے باپ کو مرے ہوئے تین سال سات مہینے گزر گئے ہیں۔ ہائے وہ دن کتنا منحوس تھا جب تمہارا باپ ہمیں ان موذیوں کے حوالے کر کے خود چلا گیا۔ کسی دن سامنے شہر کے لوگ ہماری عزت کرتے تھے۔ پر آج کمینوں کے نکلے لپٹے نہیں سمجھتے۔ آج تمہاری چچی نے ایسے الفاظ کہے ہیں۔ مجھے ... کہ ..."

"اماں وہ بہت بری ہے"

اس نے اپنے خیال کے مطابق ماں کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"بات بات پر تو مجھے مرتا رہی کہتی ہے۔ اور ایسی گندی گالیاں سناتی ہے کہ میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے"

وہ ذرا رکی پھر زیادہ نرم لہجے میں بولی۔

"بیٹا اب تو تیرا اسال ہو گیا ہے کوئی بچہ نہیں ہے تو اگر نوکر ہو جائے اور روٹی کا بندوبست کر دے تو آج ہی اس گھر سے نکل جاؤں۔ میری بے عزتی تیری نالائقی کے کارن ہو رہی ہے۔ تجھے اپنی ماں کی عزت کا بھی تو کا کوئی خیال نہیں ہے تیرا دل تو ہے کہ بن گیا ہے تو کہیں نوکر ہو جائے تو میں سچ مچ زندہ ہو جاؤں اسی وقت گھر سے نکل جاؤں۔ کہیں باہر رہ جائیں دونوں ——— اب تو یہاں ایک دن رہنا بھی دوبھر ہے۔ بیٹے ایک بار کہہ دے۔ ماں تو کہیں اور چل کر رہیں۔ میں نوکر ہو گیا ہوں ایک مکان کرایے پر لے لیا ہے"

بولتے بولتے ماں کا حلق سوکھ گیا۔ وہ ہانپتی ہوئی چارپائی پر گر پڑی اس کا بے اختیار دل چاہا کہ ماں سے کہے۔

"اماں تو نے ابھی تک روٹی نہیں کھائی۔ کم از کم اٹھ کے روٹی تو کھا لے"

لیکن رہ رہ کے اس کے دل میں خیال آتا تھا کہ اگر ماں سے روٹی کھانے کے لئے کہا تو وہ پھر بولنا شروع کر دے گی اور چچی نے کہیں سن لیا۔ تو خواہ مخواہ ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ اس کی ماں کا پہلے ہی برا حال ہے نہ معلوم چچی کی باتیں سن کر اس کا کیا حال ہو۔ یہ سوچ کر وہ چپ چاپ لیٹا رہا آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا۔

ماں کی باتوں نے اس کے ذہن میں شدید تلخی پیدا کر دی تھی۔ وہ اس تلخی کو ذہن سے نکال دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ دن بھر کے واقعات یاد کرنے لگا۔

اس کے دوست منیر کے ابا نے ایک بڑا خوبصورت تانگہ خرید لیا تھا۔ آج اس نے اس تانگے میں بیٹھکر دیر تک سیر کی تھی۔ لوہاری دروازہ کے باہر بھینسوں کے آگے آجانے سے دیر تک رکا رہا تھا۔ اور پائدان کی رگڑ سے ایک بھینس کے زخم ہوگیا تھا۔

بھینس کے زخم کا خیال آتے ہی اسے ماں کے چھالوں کا خیال آگیا۔ واقعی ماں پر بڑا ظلم ہوتا ہے۔ چچی کو اس پر ذرا سا ترس بھی نہیں آتا ہے۔ کل اتوار ہے منیر کے ساتھ نشاط میں چتر لیکھا فلم دیکھنی ہے پیسے تو وہی خرچ کرے گا ——— اگر بھینس والا لڑ پڑتا تو کیا ہوتا ——— بھینس کے زخم جو آیا تھا۔ ماں کے چھالے کیوں پڑ گئے ہیں۔ کپڑے دھو دھو کر کیا بے چاری اسی طرح مر جائے گی۔ رفتے دھوتے چچا چچی اس کی جان لیکر ہی چھوڑیں گے۔ اور کیا؟ چتر لیکھا فلم بڑی اچھی فلم ہے۔ پر ماں ——— میں فلم دیکھوں گا۔ اور وہ بیچاری گھر میں ——— وہ یہاں کی باتوں کو جس قدر بھلانے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی قدر وہ یاد آرہی تھیں اور اس کے ذہن کی تلخی بڑھتی جارہی تھی۔ سینے میں ایک نشتر سا چبھ رہا تھا۔

ماں زور سے کھانسی۔ سر اٹھا کر ساتھ والی چارپائی کو دیکھا، ہونٹ بھینچا، بے رونق احساس اور مایوس چہرہ۔ ماں تھک تھک کر چور ہو چکی تھی اس میں حرکت کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

"ماں" کہتی ہوئی ایک دلدوز آواز اس کے دل کی گہرائیوں میں گونجی، اس نے سر اٹھا کے ماں کے چہرے کو دیکھا، مایوسیوں اور حسرتوں کا تاریک ہیولی زرد، جھریاں پڑے ہوئے چہرے پر لرز رہا تھا۔ دیئے کی روشنی مدہم ہوتی جارہی تھی، اس نے سوچا دیئے کا تیل ختم ہوگیا ہو تیل جب ختم ہوجاتا ہے تو دیئے کی لو اندھیرے میں دم توڑ دیتی ہے۔ ماں کا دکھ بھرا جیون بھی دکھ سہہ سہہ کر ختم ہوجائے گا۔ ایک دن ختم ہوجائے گا

گزشتہ گرمیوں میں اس کا ایک دوست ایک کمزور اور نحیف بلی کے گلے میں رسی باندھ کر اسے گھسیٹتے ہوئے دور تک لے گیا تھا، اور اب اپنی ماں کی بے چارگی کی حالت محسوس کرکے اسے وہی منظر یاد آگیا تھا۔ بلی کس طرح چیخ رہی تھی۔ کس طرح دردناک آوازیں نکال رہی تھیں لو اس کی ماں۔ ابھی کل ہی چچا نے دھکا دے کر اسے پیچھے گرادیا تھا اسکی چچی نے اسے گالیاں دی تھیں اور اسے چچا اور چچی کے بیچے بعد دیگرے کئی بدسلوکیاں یاد آگئیں۔ فرط غم وغصہ سے اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ پہلے کبھی اس کی یہ حالت نہیں تھی۔ آج ماں کی باتوں نے اس کے دل ودماغ کی دنیا میں ایک ہلچل سی مچادی تھی۔ باہر کلاک نے چار بجائے تاب بھی اس کی آنکھیں نیند سے دور تھیں، ماں کی باتیں برابر اس کے دل ودماغ میں نشتر زنی کر رہی تھیں۔

وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو لعنت و ملامت کرنے لگا۔ کیا میری ماں صرف اس وجہ سے دکھی ہے کہ میں بیٹا ہو کر اس کی مدد نہیں کرسکا لعنت ہے میری زندگی پر، میں بیٹا نہیں دشمن ہوں، اپنی ماں کا"

"صبح وہ چارپائی سے اٹھا، ماں کی چارپائی کی طرف گیا، وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ یقیناً وہ باہر روزمرہ کے کام کر رہی تھی اس نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنی سوجی ہوئی آنکھیں ملیں اور گھر سے باہر نکل کر جلدی جلدی لوہاری دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔

آدھ گھنٹے کے اندر اندر اس نے ایک پریس کے منیجر سے نوکری کے متعلق بات پختہ کرکے کام کرنا شروع کردیا۔ ساڑھے پانچ بجے منیجر کی، منت سماجت کرکے آٹھ روپے پیشگی لئے اور شام کے قریب ایک کوٹھری کا کرایہ بھی ادا کردیا۔ یہ تمام فرائض ادا کرکے جب اس نے گھر کی طرف قدم اٹھائے تو خوشی کی لہریں اس کے رگ رگ میں تلاطم برپا کئے ہوئے تھیں ایک دوپہر کی دھوپ میں برف میں لگے ہوئے تربوز کی سرخ سرخ قاشیں دیکھکر جس قسم کی فرحت اسے حاصل ہوئی تھی، اسی قسم کی خوشی اب اسکی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے تھی سینہ تانے جب وہ اپنی گلی میں داخل ہوا تو اسے اپنے اردگرد ہر چیز بدلی ہوئی مسکراتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

اس کا دل چاہتا تھا کہ جلد سے جلد ماں کو یہ خوشخبری سنادے۔ جلد سے جلد اس کے ہنستے ہوئے چہرے کو دیکھے۔ یہ خوشخبری سن کر ماں کس قدر خوش ہوگی۔ کس قدر بے اختیار ہنس پڑے گی اور اس چیز کا خیال کرکے وہ خود ہنس پڑا۔

ماں کوٹھری میں لیٹی ہوئی تھی اور اپنے سر پر رومال باندھ رہی تھی۔

وہ اسے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

"اماں جان جی۔ میں نے کوٹھری کرایہ پر لے لی ہے، نوکری بھی ہوگیا ہوں۔ سب کچھ ہوگیا ہے اماں جان جی جلدی جلدی چلو۔"

شدت جذبات اور جوش مسرت سے اس کی آواز کانپ رہی تھی سینے میں ایک شدید ہیجان برپا تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ اپنا دل نکال کر ماں کے قدموں میں ڈال دے۔ ماں کو گود میں اٹھا کر فوراً اس منحوس کوٹھری سے نکل جائے۔

ماں دو چار لمحے اس کے چہرے کو گھورتی رہی پھر اپنی چھاتی پر دوہتڑ مار کر چیخنے لگی۔

"ہائے اللہ میں کہاں جاؤں ——— دشمنوں نے میرے بچے کو کیا پڑھا دیا ہے ——— اب گھر سے بھی جواب دے رہے ہیں ——— ان کی مرضی ہے ہم فاقہ کر کے مر جائیں۔ میرے اللہ!"

اور وہ زار و قطار رونے لگی۔

اور وہ ..... ٹکٹکی باندھے ماں کو دیکھ رہا تھا ——— چپ چاپ بے حس و حرکت جیسے کوئی پریشان خواب دیکھ رہا ہو۔

(بشکریہ "امروز" کراچی)

اس عید پر
آپ کے بچے
کیلئے
مناسب عطیہ

پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ

وہ تحفہ ہے جس کی قیمت بڑھتی رہتی ہے

آئندہ خوش حالی
کیلئے
ایک مفید مد میں
روپیہ لگائیے۔

جو والدین اپنے بچوں کی آئندہ بھلائی کے خواہاں ہیں وہ انھیں عیدی میں سیونگ سرٹیفکیٹ دینا پسند کرتے ہیں اور ہر سمجھدار آدمی انکے اس انتخاب کی داد دے گا کیونکہ جو سرمایہ ان تمسکات میں لگایا جائے گا، وہ بچوں کی آئندہ ضروریات پر کام آئے گا۔

پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ خریدئے

۴ ۱/۲ فیصدی منافع — انکم ٹیکس معاف

ڈاک خانوں، سیونگز بیورو اور معتبر ایجنٹوں سے مل سکتے ہیں

ام انیسہ رامنگری •

شاخِ نازک

مس شاہدہ بی اے گورے رنگ دلکش خدوخال گداز بدن او
سط قد کی ایک دوشیزہ ہے ۲۴ برس کے قریب عمر ہوگی۔ اس کی
آنکھوں پر لگی ہوئی نمائشی عینک اسے بہت زیب دیتی ہے اور وہ اسے
نے لئے ضروری سمجھتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک زنانہ اسکول کالج میں پروفیسر ہے
عینک کے بغیر پروفیسری کا رعب نہیں طاری ہوتا۔ اگر اسے پروفیسری کی
خدمت انجام نہ دینی پڑتی تو شاید وہ ضرورت ہوتے ہوئے بھی عینک
لگاتی۔

مس شاہدہ نے کالج سے تھوڑی ہی دور پر ایک بڑے مکان
کے دو بڑے کمرے کرائے پر لے رکھے ہیں۔ ایک نوکرانی کے ساتھ وہ اسی
مکان میں رہتی ہے۔

اتوار کا دن تھا مس شاہدہ باورچی خانے میں چولہے سے تھوڑی
دور کرسی ڈالے بیٹھی ہوئی تھی۔ آج اپنے کالج کی کچھ پروفیسروں کو اس نے
مدعو کیا تھا۔ وہ ملازمہ رحیمن سے اپنی نگرانی میں کھانے تیار کرا رہی تھی
اس کے ہاتھ میں انگریزی کا ایک ناول تھا۔ کبھی وہ ناول پڑھنے لگتی اور
کبھی چولہے کو دیکھنے لگتی تھی۔

"رحیمن دیکھو! نمک مصالحہ سب خوب ٹھیک ٹھیک رہے"
شاہدہ نے ناول کا صفحہ الٹتے ہوئے کہا
"اپنی سمجھ میں تو ٹھیک ہی ٹھیک رکھ رہی ہوں"۔ رحیمن نے
جواب دیا۔
"کھٹائی بھی ضرور ڈالنا۔ جتنی آئیں گی سب کھٹائی کی شوقین ہیں"
"صرف ماش کی دال میں نہیں ہے باقی تمام چیزوں میں کھٹائی
پڑی ہے"
"تو ماش کی دال کو کیوں چھوڑ دیا؟ اس میں بھی ڈال دو!"
"ماش کی دال میں کھٹائی نہیں پڑتی"
"واہ پڑتی کیوں نہیں!"
"ماش کی دال میں کھٹائی اچھی بھی نہیں لگتی۔ اور کھٹائی سے اس
کے گلنے میں بھی دقت ہوتی ہے"
"خیر تم جانو" یہ کہہ کر شاہدہ پھر ناول پڑھنے لگی
کچھ دیر بعد رحیمن نے کہا "کھیر میں کچھ میوہ ہوتا تو اچھا ہوتا"
"کون سا میوہ؟"
"ناریل کی گری، پستہ، کشمش"
"کشمش کا نام نہ لینا"
"کیوں؟"
"مجھے بڑی خراب لگتی ہے!"
"اپنی اپنی پسند ہے"
"چاول بہت کم ہے اور ڈالو"
"اتنے ہی ٹھیک ہیں۔ ابھی پھولیں گے بھی تو زیادہ ڈالنے سے
بہت گاڑھی ہو جائے گی۔ کھیر کچھ پتلی ہی اچھی لگتی ہے"
"تھوڑی ہلدی بھی ڈال دو پیلی ہو جائے گی"
"کھیر میں ہلدی؟"
"واہ میں نے زعفرانی کھیر کھائی ہے"
"ہاں زعفران ڈالی جا سکتی ہے"
"رنگ ہی سے غرض ہے نا۔ تو ہلدی سے بھی زرد ہو جائے گی"
"ہلدی نہیں ڈالی جاتی بی بی!"
"تم لوگ لکیر کے فقیر ہو۔ اپنے دماغ سے کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتیں"
"اب آپ لوگوں جیسا دماغ کہاں سے لاؤں۔ یہ تو پڑھی لکھی لڑکیوں
ہی کا کام ہے"
"بھئی مجھے تو کھانا پکانا ایک مصیبت معلوم ہوتا ہے"

"جو نئی چیزیں نکال سکتی ہیں جب وہ کھانے پکانے کو مصیبت ہی سمجھیں گی۔ تو نئی چیزیں نکلیں گی تو کیسے نکلیں گی؟"

"یہ کام باورچیوں کا ہے ہمارا نہیں" یہ کہکر شاہدہ پھر کتاب پڑھنے لگی۔

اسی وقت اس کے کمرے میں کچھ آہٹ محسوس ہوئی "معلوم ہوتا ہے کوئی آیا ہے" کہتی ہوئی شاہدہ باورچی خانے سے چل کر کمرے میں پہنچی۔ کمرے میں دو نوجوان خاتون تشریف فرما تھیں۔ شاہدہ کو دیکھتے ہی ان میں سے ایک بولی۔

"کہاں تھیں؟"

"باورچی خانے میں کھانا تیار کرا رہی تھی۔ یہ نوکرانیاں بغیر بتائے اچھے کھانے نہیں تیار کر سکتیں"

"تو کیا روز سامنے بیٹھکر پکواتی ہو؟"

"نہیں میں تو بالکل سادہ کھانا کھاتی ہوں اور اس میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن تم لوگوں کے لئے تو خاص کھانا تیار کروایا ہے"

"کیا کیا تیار کرایا ہے؟" ایک نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"جب سامنے آئے تو دیکھ لینا۔ رشیدہ ابھی نہیں آئی؟"

"آتی ہوگی۔ ممکن ہے اس کے شوہر نے وقت پر اجازت نہ دی ہو"

"یہ شوہر بھی بس بلائے جان ہی ہوتے ہیں۔ ان کی اجازت اور مرضی کے بغیر بیوی کہیں آجا نہیں سکتی۔ پتہ نہیں وہ اتنی سخت غلامی کیسے برداشت کرتی ہیں۔ خدا کی قسم مجھ سے تو کبھی برداشت نہ ہو"

"ہم کیا جانیں۔ رشیدہ آئے تو اس سے پوچھنا۔ یہاں تو جو حالت عین کی ہے وہی غین کی ہے"

"پوچھ چکی ہوں۔ وہ غلامی ہی میں خوش ہو!"

اسی وقت رشیدہ کمرے میں داخل ہوئی۔ رشیدہ کی عمر ۲۵ ر ۲۶ سال کے قریب ہوگی۔ وہ رنگ روپ میں ان تینوں سے اچھی ہے اس کے ساتھ اس کی پانچ برس کی بچی نسیمہ بھی ہے۔

شاہدہ بولی: "آؤ۔ آؤ۔ ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا"

"معاف کرنا مجھے کچھ دیر ہوگئی" رشیدہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شوہر والیوں کو ہمیشہ دیر ہو جاتی ہے"

"نسیمہ کے ابا کو کھانا کھلانے میں دیر ہوگئی"

"کیا اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہو؟" ایک نے مسکرا کر پوچھا۔

"جیسے بلبل کو چارہ کھلایا جاتا ہے؟" یہ کہکر شاہدہ نے ایک قہقہہ لگایا۔ دوسری سہیلیاں بھی ہنس پڑیں۔

رشیدہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ایک بولی۔ "سچ پوچھو تو یہ شوہر اسی لائق ہوتے ہیں کہ انہیں پنجرے میں بند رکھے اور صبح و شام چارہ دیدیا کرے"

"اگر ایسا ہو تب تو ان شوہروں کو آٹے دال کا بھاؤ ہی معلوم ہو جائے۔ اب تک ایک طرح سے انہوں نے بھی تو عورتوں کو پنجرے ہی میں رکھا ہے"

"یہاں آ نسیمہ!" ایک نے رشیدہ کی بیٹی سے کہا۔

نسیمہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ نسیمہ سے باتیں کرنے لگی۔

"تمہارے میاں تمہیں کبھی ڈانٹتے بھی ہیں یا نہیں؟" شاہدہ نے پوچھا۔

"تم سے مطلب؟" رشیدہ نے مسکرا کر کہا۔

"ہم یہ جاننا چاہتی ہیں کہ تم ان کی ڈانٹ ڈپٹ کو کیسے برداشت کرتی ہو؟"

"اکیلی رہتی ہو نا؟ گھر میں کوئی بڑا بوڑھا ہوتا تو پتہ چلتا کہ اس کی باتیں کیسے برداشت کی جاتی ہیں"

"اچھا تو آپ شوہر کو بڑا بوڑھا سمجھتی ہیں۔ حضرت خضر کی عمر کے ہوں گے تمہارے شوہر"

اس پر پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

رشیدہ بولی: "بڑے بوڑھے سے میری غرض ہے گھر کا اس شخص سے جس کا احترام کرنا ضروری ہو۔ جیسے ماں باپ بڑے بھائی وغیرہ"

"آپ کے شوہر آپ سے کتنے برس بڑے ہیں؟"
رشیدہ مسکرا کر بولی "آخر آپ لوگوں کو یہ سب جاننے کی فکر کیوں ہے؟ ویسے تو آپ لوگ مردوں اور شوہروں کے نام سے بھڑکتی ہیں مگر نہ جانے کیوں ان کی باتیں جاننے کے لئے ہمیشہ ہی بے قرار رہتی ہیں۔ جب بات کریں گی تو مردوں اور شوہروں کی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"
شاہدہ جھینپ گئی۔ مگر فوراً ہی سنبھل کر بولی "میں شوہر کو ایک عجیب و غریب جانور سمجھتی ہوں۔ اور کسی عجیب و غریب جانور کے متعلق جاننے کی خواہش ہونا ایک فطری تقاضہ ہے" یہ کہہ کر اس نے پھر ایک قہقہہ بلند کیا۔
"تو وہ عجیب و غریب جانور تو تمہارے گھر میں بھی ہے"
"ایں، میرے گھر میں، وہ کون؟"
"تمہارے ابا میاں، تمہاری امی جان کے شوہر ہونے کے ناتے آخر وہ بھی تو وہی عجیب و غریب جانور ہوئے۔ ذرا اپنی امی جان سے بھی ان کے متعلق پوچھنا"
شاہدہ کی ہنسی غائب ہوگئی۔ وہ منہ بنا کر بولی "اب تو تم پھوہڑ پن پر اتر آئیں۔ خواہ مخواہ ماں باپ کو گھسیٹنے لگیں"
"میں گھسیٹتی ویسٹتی کسی کو نہیں تمہاری بات کا جواب دیتی ہوں"
اسی وقت رحیمن نے آکر کہا "کھانا تیار ہے بی بی!"
"اچھا نکالو!"
رحیمن چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد شاہدہ بھی یہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی "جاؤں کھانے نکلوا دوں۔ اس سے تنہا یہ کام نہ ہو سکے گا"

(۲)

شاہدہ کے والد کچہری میں سب رجسٹرار ہیں شاہدہ ان کی اکلوتی بیٹی ہے۔ یوں تو کئی لڑکیاں لڑکے ہوتے مگر وہ زندہ نہ رہے شاہدہ کے والد لطیف حسین نے شاہدہ کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ اگرچہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ شاہدہ ملازمت کرے خصوصاً ملازمت کے لئے ان سے الگ کسی اور شہر میں رہے مگر شاہدہ نے ان کی بات نہ مانی۔ وہ سال میں تین بار گرمی، دسہرے اور بڑے دن کی چھٹیوں میں اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ دوسری چھوٹی چھٹیوں میں وہ اپنی کسی ایسی سہیلی معلمہ کے ساتھ اس کے گھر چلی جاتی جو کسی قریبی شہر کی رہنے والی ہوتی۔
گرمیوں کی چھٹیوں میں شاہدہ گھر آئی ہوئی ہے۔ شاہدہ کے والدین اسے اپنی ایک بیش بہا دولت سمجھتے ہیں۔ اگرچہ شاہدہ نے ان سے کہہ دیا ہے کہ وہ شادی نہیں کرے گی۔ اگر کرے گی بھی تو اپنی پسند کی اگر کسی مرد سے محبت ہوگئی تو شادی کرے گی ورنہ زندگی بھر کنواری ہی رہے گی۔ پھر بھی لطیف حسن اس کی شادی کی بات سوچا کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا نوجوان ملے جو یورپ سے ڈگری لے کر لوٹا ہو اور کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو یا کوئی اپٹوڈیٹ اور دولت مند گھرانے کا لڑکا ہو۔
جب شاہدہ گھر پر رہتی تو اس کی ماں رات دن اسکی خوشامد اور دلدہی میں لگی رہتی۔ سویرے دن چڑھے تک وہ سویا کرتی۔ اور جب تک ماں اسے دو تین بار جگانے کی کوشش نہ کرتی۔ وہ چارپائی نہ چھوڑتی۔ چارپائی سے اٹھتی تو اخبار لے کر بیٹھ جاتی۔
ماں کہتی "بیٹی جاؤ پاخانے سے فارغ ہو لو اور ہاتھ منہ دھو کر کچھ ناشتہ کر لو" مگر شاہدہ "ہوں۔ ہوں" کہہ کر رہ جاتی۔ ماں کے کئی بار کہنے پر وہ معمولات سے فارغ ہوتی۔ اسی طرح ناشتہ کرانے، غسل، کھانا وغیرہ سب کے لئے ماں کو خوشامد کرنی پڑتی۔ شاہدہ کے لئے روزآنہ کوئی نہ کوئی نئی چیز پکاتی۔ مگر شاہدہ کا مزاج ہی نہ ملتا ایک روٹی اور ذرا سے چاول کھا کر اٹھ جاتی۔
ماں کہتی "بیٹی میں نے تیرے لئے کتنی محنت سے ساگ تیار کیا مگر تو نے اسے چھوا تک نہیں"
شاہدہ ناک سکوڑ کر جواب دیتی "مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا میں تو پھل زیادہ پسند کرتی ہوں"
"ہمارا تو پھلوں سے پیٹ ہی نہ بھرے" ماں جواب دیتی۔
"تم پھل کی قدر کیا جانو۔ ان میں وٹامن ہوتا ہے۔ جانتی ہو وٹامن کس کو کہتے ہیں؟ تم بھلا کیا جانو، وٹامن طاقتور اجزا کو کہتے ہیں یہ کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ جیسے وٹامن اے۔ وٹامن بی۔ وٹامن سی وغیرہ"
ماں بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھ کر سوچنے لگی "نہ جانے وہ طاقتور اجزا کہاں چلے جاتے ہیں۔ چہرہ ہے کہ روز بروز خشک ہی ہوتا چلا جاتا ہے چھوٹا موٹا کام کرنے میں تھک جاتی ہے۔ گھی دودھ ہضم نہیں

ہوتا ذراسی ثقیل چیز کھانے سے بگڑ جاتا ہے۔ مرچ کھٹائی دیکھ کر تو گلے
کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ ایسے طاقتور اجزا سے خدا بچائے!"

"جنہیں پھل نہیں ملتے کیا وہ تندرست نہیں رہتے؟"

"پیسے کو تو چنے چبا کر بھی آدمی تندرست رہ سکتا ہے اسکی بات
دوسری ہے۔" شاہدہ نے منہ بچکا کر کہا۔

"تو پھر بات کیا ہوئی؟ جیسے اناج ویسے پھل۔"

"پھل بہت جلد ہضم ہو جاتے ہیں۔"

"جلد ہضم ہونے والی خوراک سے تندرستی بھی تو ویسی ہی
جلد بگڑ جانے والی بنتی ہے۔ اپنے ہی کو تو دیکھ۔ ذرا کام کرنے سے
تھک جاتی ہے۔ کھانے میں ذراسی بے احتیاطی ہوئی کہ تیرا ہاضمہ
بگڑا۔ جب جوانی میں یہ حالت ہے تو آگے چل کر کیا ہوگی؟ میں بوڑھی
ہوگئی پھر بھی تجھ سے زیادہ ہی محنت کر سکتی ہوں۔ میرا ہاضمہ بھی تجھ
سے کافی بہتر ہے۔ دیت ہاضمہ کو صحیح رکھنے اور ٹھوس تندرستی بنانے والی
چیزیں یہی اناج اور گھی دودھ وغیرہ ہوتے ہیں۔ پھل تو انہیں دیئے
جاتے ہیں جن کو اناج ہضم نہیں ہوتا۔ یعنی بیماروں کو!"

یہ بات سن کر شاہدہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ پھر بولی
اماں تم نے ڈاکٹری کب سے پاس کر لی؟"

"ارے رہنے دے۔ ڈاکٹروں کی بھی، تم نے خوب کہی۔ یہ کبھی کچھ
کہتے ہیں اور کبھی کچھ۔ ان کا بھی کوئی اصول ہے۔ اس دن تیرے ابا بتاتے
تھے کہ ولایت کے ڈاکٹر اب کہنے لگے ہیں کہ گائے کے گوبر میں جراثیم کش
اثرات ہوتے ہیں۔ کل تک جسے وہ گندگی کہتے تھے آج دوا بن گئی!"

اس طرح ماں بیٹی میں اکثر بحث ہوتی رہتی۔ بیٹی ماں کو پرانے
ٹائپ کی جاہل عورت سمجھتی ہے اور ماں بیٹی کو ناتجربہ کار بے عقل اور فیشن
کے پیچھے پاگل ہو جانے والی لڑکی کہتی ہے، اور شاہدہ کے والد لطیف حسن
صرف اتنی سی بات سے مطمئن ہیں کہ ان کی شاہدہ گریجویٹ ہے اس لئے
اس کی دوسری عادتوں پر وہ کچھ زیادہ دھیان نہیں دیتے اگرچہ شاہدہ
کی بعض باتیں انہیں بھی ناپسند ہیں لیکن وہ ان کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔
اس کے علاوہ تعلیم یافتہ لڑکی کے عیوب بھی تو ہنر بن جایا کرتے ہیں۔
شام کا وقت تھا لطیف حسن شاہدہ کو لیکر گھومنے نکلے انہیں

شاہدہ کو ساتھ لیکر گھومنے کا شوق تھا۔ گھر سے نکل کر تھوڑی دور ہی
گئے کہ سامنے سے ایک جوڑا آتا ہوا دکھائی دیا۔ دونوں نوجوان تھے قریب
آنے پر دوشیزہ آنکھیں پھیلا کر مسکراتی ہوئی شاہدہ سے بولی۔

"کہو شاہدہ تم کب آئیں؟"

شاہدہ نے کہا: "آج تیسرا دن ہے!"

"اوہ! تم نے ہمیں خبر نہیں دی!"

"سفر میں بہت تھک گئی تھی۔ اس لئے آرام کرتی رہی آج
ہی کل میں تمہاری طرف آنے والی تھی!"

نوجوان اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا اسکے چہرے
پر تبسم نمایاں تھا۔ شاہدہ کے والد کی گردن اسپرنگ دار کھلونے کی گردن
کی طرح دونوں دوشیزاؤں کے بازوؤں پر ہل رہی تھی۔ تبسم کی لہریں
دونوں کانوں کو چھونے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"ہمارے یہاں کب آؤ گی؟" دوشیزہ نے شاہدہ سے پوچھا۔

"کل پرسوں تک!"

"اچھا تو اب میں چلوں ایک جگہ جانا ہے۔ ہاں تم اپنی شادی
کب کر رہی ہو؟"

"اتنی جلدی کیا ہے۔" شاہدہ نے کہا۔

"یا ابھی کوئی پسند نہیں آیا؟"

"اس کی پسند معمولی نہیں ہے۔" لطیف حسن نے قہقہہ مار کر کہا۔
دونوں چلے گئے۔ اگرچہ نوجوان اور دوشیزہ نے لطیف حسن کو
صرف "آداب" کر لیا تھا اس کے بعد وہ برابر شاہدہ ہی سے باتیں کرتے
رہے۔ اس کی طرف مخاطب نہیں ہوئے۔ مگر ان کو اس کا کوئی خیال
نہیں تھا شاہدہ کی قدر و عزت کو وہ اپنی ہی قدر و عزت سمجھتے تھے
دور چلنے پر سامنے سے ایک نوجوان آتا ہوا دکھائی دیا وہ گورا
چٹا تندرست و توانا ننگے سر آدھی باہوں کی قمیض اور نیکر پہنے ہوئے
تھا۔ دور سے ہی دیکھ کر لطیف حسن نے شاہدہ سے کہا۔

"دیکھ شاہدہ یہ جو سامنے سے آرہا ہے۔ ایک دولتمند خاندان
کا لڑکا ہے۔ ایم اے۔ بی۔ ایس۔ سی ہے ایک شوگر ملس کا مینیجنگ
ڈائرکٹر ہو کر رہا ہے۔ مل میں اس کے شیئرس بھی ہیں۔ تنخواہ بھی

نافی ملے گی بجلی کا دو بیو صاحب جل کی طرف سے ملے گا۔ بڑا ہو جا رہا ہے
خلاق کا بھی بہت اچھا ہے۔ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔"

اتنے میں وہ نوجوان قریب آگیا۔ اس نے رجسٹرار صاحب کو
آداب کیا۔ رجسٹرار صاحب اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔

"یہ میری بیٹی شاہدہ بی اے اور یہ مسٹر نسیم احمد عثمانی ایم اے۔
پی ایس۔ سی ہیں۔" اس طرح لطیف حسن نے دونوں کا مختصر تعارف کرادیا۔
نوجوان نے شاہدہ سے انگریزی میں کہا "آپ سے مل کر بڑی خوشی
ہوئی ہے۔"

شاہدہ صرف مسکرادی لطیف حسن بول اٹھے۔ "یہ لکھنؤ میں گرلس
انٹر کالج میں پروفیسر ہے۔ اسے فن تعلیم سے خاص دلچسپی ہے۔ یہی
وجہ ہے جو اس نے فی الحال اپنا شوق پورا کرنے کے لئے وہاں سروس
کرلی ہے۔"

"بڑا اچھا کیا جب تعلیم حاصل کی ہے تو اس سے کچھ فائدہ بھی تو
اٹھانا چاہیئے!"

"اسی خیال سے میں نے بھی اسے اجازت دیدی۔"

نوجوان چلنے لگا۔ لطیف حسن بولے "کسی دن مکان پر آؤ نا؟"

"جب آپ حکم دیں!"

"کل اتوار کا دن ہے۔ تیسرے پہر آجاؤ۔ چائے بھی ہمارے یہاں
پینا۔ اس کے بعد گھومنے چلیں گے۔"

"بہت اچھا آؤں گا۔"

"ضرور!"

"ضرور: میں کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کرتا۔"

نوجوان باپ بیٹی کو آداب کرکے رخصت ہوا۔

دوسرے روز صبح اٹھتے ہی رجسٹرار صاحب نے شاہدہ کی ماں
سے تنہائی میں کہا: "آج ایک لڑکا آئے گا۔ جو امیر گھرانے کا کافی پڑھا
لکھا ہے۔ اچھی پوسٹ پر جا رہا ہے۔ اس کے لئے چائے اور ناشتے
کا انتظام کررکھنا۔"

"کس وقت آئے گا؟" بیوی نے پوچھا۔

"شام کو چار یا پانچ بجے تک آجائے گا۔ میں نے سوچا ہے کہ اگر
شاہدہ اسے پسند کرے تو بڑی اچھی جوڑی رہے گی۔"

"اپنی ہی برادری کا ہے۔"

"بس اتنی ہی تو کسر ہے۔ اپنی برادری کا نہیں ہے۔ لیکن اس کا
کوئی مضائقہ نہیں۔ آج کل ایسی شادیاں ہونے لگی ہیں۔"

شاہدہ کی ماں تعجب سے شوہر کا چہرہ دیکھنے لگی۔

لطیف حسن نے پوچھا "کیوں اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟"

"تمہاری عقل کو دیکھ رہی ہوں۔ لڑکی کے پیچھے اتنے دیوانے ہوگئے
ہو۔ کہ جائز و ناجائز کا بھی خیال نہیں کرتے۔"

"اس میں ناجائز کیا ہے۔ بیسیوں ایسی شادیاں ہوچکی ہیں
بڑے بڑے خاندانوں میں ہوئی ہیں۔"

"بڑوں کی بات چھوڑو۔ انہیں کوئی کچھ نہ کہے گا۔ ہم چھوٹے لوگ
ایسا کریں گے تو سب یہی کہیں گے کہ معلوم ہوتا ہے اپنی ذات میں انہیں
کوئی لڑکا نہیں ملا۔ اسی لئے غیر برادری میں شادی کی ہے کچھ دال
میں کالا ہوگا۔"

لطیف حسن ہنس پڑے۔ بولے: "دال میں کالا کی تم نے ایک
ہی کہی۔ خیر تم ان سب باتوں کی فکر نہ کرو۔ جب کوئی کچھ کہے گا تو ہم جواب
دے دیں گے۔"

"تم بھی عجیب بات کرتے ہو۔ ارے تم مردوں کو جواب دے لوگے
مگر عورتیں تو مجھے ہی نوچیں گی۔ انہیں کون جواب دے گا؟ پہلے
تو یہ بات سن کر اپنی برادری کا کوئی آئے گا نہیں اور دو چار آبھی جائیں
تو ان سے بارات اور تقریب کی کیا زینت ہوگی؟"

"اوہو! ہمیں بارات! ور تقریب کی زینت نہیں کرنی ہے
ہمیں تو اپنی لڑکی کی پسند کے مطابق کام کرنا ہے چاہے کوئی کچھ کہے
یا کچھ سمجھ آئے یا نہ آئے۔ ہمیں کوئی پروا نہیں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ جب کسی کی کوئی پروا ہی نہیں تو چاہے جو
کرو۔ وہ مثل ہے نا۔ "ننگا سب سے چنگا۔"

"بدتمیزی کی باتیں نہ کرو۔ نہ سمجھ نہ بوجھ جو منہ میں آیا بک
ڈالتی ہو!"

"مجھے کیا کرنا ہے۔ کرو جو تمہارا جی چاہے۔"

ہوتا ذراسی ثقیل چیز کھانے سے بگڑ جاتا ہے۔ مرچ کھٹائی دیکھ کر ان کے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ ایسے ناتواں مزاج سے خدا بچائے!"

"جنہیں پھل نہیں ملتے کیا وہ تندرست نہیں رہتے؟"

"رہنے کو تو چنے چبا کر بھی آدمی تندرست رہ سکتا ہے اسکی بات دوسری ہے"۔ شاہدہ نے منہ بچکا کر کہا۔

"تو پھر بات کیا ہوئی؟ جیسے اناج ویسے پھل"۔

"پھل بہت جلد ہضم ہو جاتے ہیں"۔

"جلد ہضم ہونے والی خوراک سے تندرستی بھی تو ویسی ہی جلد بگڑ جانے والی بنتی ہے۔ اپنے ہی کو تو دیکھ۔ ذرا کام کرنے سے تھک جاتی ہے۔ کھانے میں ذراسی بے احتیاطی ہوئی کہ تیرا ہاضمہ بگڑا۔ جب جوانی میں یہ حالت ہے تو آگے چل کر کیا ہوگی؟ میں بوڑھی ہوگئی پھر بھی تجھ سے زیادہ ہی محنت کر سکتی ہوں۔ میرا ہاضمہ بھی تجھ سے کافی بہتر ہے۔ نیت ہاضمہ کو صحیح رکھنے اور ٹھوس تندرستی بنانے والی چیزیں تو یہی اناج اور گھی دودھ وغیرہ ہوتے ہیں۔ پھل تو انہیں دیئے جاتے ہیں جن کو اناج ہضم نہیں ہوتا۔ یعنی بیماروں کو!"

یہ بات سن کر شاہدہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئی۔ پھر بولی "اماں تم نے ڈاکٹری کب سے پاس کر لی؟"

"اری رہنے دے۔ ڈاکٹروں کی بھی تم نے خوب کہی۔ یہ کبھی کچھ کہتے ہیں اور کبھی کچھ۔ ان کا بھی کوئی اصول ہے۔ اس دن تیرے ابا بتاتے تھے کہ ولایت کے ڈاکٹر اب کہنے لگے ہیں کہ گلے سڑے گوبر میں جراثیم کش اثرات ہوتے ہیں۔ کل تک جسے وہ گندگی کہتے تھے آج دوا بن گئی!"

اس طرح ماں بیٹی میں اکثر بحث ہوتی رہتی۔ بیٹی ماں کو پرانے ٹائپ کی جاہل عورت سمجھتی ہے اور ماں بیٹی کو ناتجربہ کار بے عقل اور فیشن کے پیچھے پاگل ہو جانے والی لڑکی کہتی ہے۔ اور شاہدہ کے والد لطیف حسن صرف اتنی سی بات سے مطمئن ہیں کہ ان کی شاہدہ گریجویٹ ہے اس لئے اس کی دوسری عادتوں پر وہ کچھ زیادہ دھیان نہیں دیتے اگرچہ شاہدہ کی بعض باتیں انہیں بھی ناپسند ہیں لیکن وہ ان کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیم یافتہ لڑکی کے عیوب بھی تو ہنر بن جایا کرتے ہیں۔

شام کا وقت تھا لطیف حسن شاہدہ کو لیکر گھومنے نکلے انہیں شاہدہ کو ساتھ لیکر گھومنے کا شوق تھا۔ گھر سے نکل کر کچھ ہی دور چلے تھے کہ سامنے سے ایک جوڑا آتا ہوا دکھائی دیا۔ دونوں نوجوان تھے قریب آنے پر دوشیزہ آنکھیں پھیلا کر مسکراتی ہوئی شاہدہ سے بولی۔

"کہو شاہدہ تم کب آئیں؟"

شاہدہ نے کہا: "آج تیسرا دن ہے!"

"اوہ! تم نے ہمیں خبر نہیں دی!"

"سفر میں بہت تھک گئی تھی۔ اس لئے آرام کرتی رہی آج ہی کل میں تمہاری طرف آنے والی تھی!"

نوجوان اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا اسکے چہرے پر تبسم نمایاں تھا۔ شاہدہ کے والد کی گردن اسپرنگ دار کھلونے کی گردن کی طرح دونوں دوشیزاؤں کے بازوؤں پر ہل رہی تھی۔ تبسم کی لہریں دونوں کانوں کو چھونے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"ہمارے یہاں کب آؤ گی؟" دوشیزہ نے شاہدہ سے پوچھا۔

"کل پرسوں تک!"

"اچھا تو اب میں چلوں ایک جگہ جانا ہے۔ ہاں تم اپنی شادی کب کر رہی ہو؟"

"ابھی جلدی کیا ہے"۔ شاہدہ نے کہا۔

"یا ابھی کوئی پسند نہیں آیا؟"

"اس کی پسند معمولی نہیں ہے"۔ لطیف حسن نے قہقہہ مار کر کہا۔

دونوں چلے گئے۔ اگرچہ نوجوان اور دوشیزہ نے لطیف حسن کو صرف "آداب" کر لیا تھا اس کے بعد وہ برابر شاہدہ ہی سے باتیں کرتے رہے۔ اس کی طرف مخاطب نہیں ہوئے۔ مگر ان کو اس کا کوئی خیال نہیں تھا شاہدہ کی قدر و عزت کو وہ اپنی ہی قدر و عزت سمجھتے تھے

دور چلنے پر سامنے سے ایک نوجوان آتا ہوا دکھائی دیا وہ گورا چٹا تندرست و توانا ننگے سر آدھی باہوں کی قمیض اور نیکر پہنے ہوئے تھا۔ دور سے ہی دیکھ کر لطیف حسن نے شاہدہ سے کہا۔

"دیکھو شاہدہ یہ جو سامنے سے آرہا ہے۔ ایک دولتمند خاندان کا لڑکا ہے۔ ایم اے۔ بی۔ ایس۔ سی ہے ایک شوگر ملس کا مینیجنگ ڈائرکٹر ہو کر رہا ہے۔ مل میں اس کے شیئرس بھی ہیں۔ تنخواہ بھی

...انی ملے گی۔ بنگلہ کار وغیرہ سب مل کی طرف سے ملے گا۔ بڑا ہونہار ہے
اخلاق کا بھی بہت اچھا ہے ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔"

اتنے میں وہ نوجوان قریب آگیا۔ اس نے رجسٹرار صاحب کو آداب کیا۔ رجسٹرار صاحب اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔

"یہ میری بیٹی شاہدہ بی اے اور یہ مسٹر نسیم احمد عثمانی ایم اے۔ پی ایس سی ہیں۔" اس طرح لطیف حسن نے دونوں کا تعارف کرایا

نوجوان نے شاہدہ سے انگریزی میں کہا۔ "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔"

شاہدہ صرف مسکرا دی لطیف حسن بول اٹھے۔ "یہ لکھنؤ میں گرلس انٹر کالج میں پروفیسر ہے۔ اسے فن تعلیم سے خاص دلچسپی ہے۔ یہی وجہ ہے جو اس نے بی اے کے بعد اپنا شوق پورا کرنے کے لئے وہاں سروس کرلی ہے۔"

"بڑا اچھا کیا جب تعلیم حاصل کی ہے تو اس سے کچھ فائدہ بھی تو اٹھانا چاہئے!"

"اسی خیال سے میں نے بھی اسے اجازت دیدی۔"

نوجوان چلنے لگا۔ لطیف حسن بولے "کسی دن مکان پر آؤنا!"

"جب آپ حکم دیں!"

"کل اتوار کا دن ہے۔ تیسرے پہر آجاؤ۔ چائے بھی ہمارے یہاں پینا۔ اس کے بعد گھومنے چلیں گے۔"

"بہت اچھا آؤں گا!"

"ضرور!"

"ضرور! میں کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کرتا!"

نوجوان باپ بیٹی کو آداب کر کے رخصت ہوا۔

دوسرے روز صبح اٹھتے ہی رجسٹرار صاحب نے شاہدہ کی ماں سے تنہائی میں کہا۔ "آج ایک لڑکا آئے گا۔ جو امیر گھرانے کا کافی پڑھا لکھا ہے۔ اچھی پوسٹ پر جا رہا ہے۔ اس کے لئے چائے اور ناشتے کا انتظام کر رکھنا۔"

"کس وقت آئے گا؟" بیوی نے پوچھا۔

"شام کو چار یا پانچ بجے تک آجائے گا۔ میں نے سوچا ہے کہ اگر شاہدہ اسے پسند کرے تو بڑی اچھی جوڑی رہے گی۔"

"اپنی ہی برادری کا ہے۔"

"بس اتنی ہی تو کسر ہے۔ اپنی برادری کا نہیں ہے۔ لیکن اس کا کوئی مضائقہ نہیں۔ آج کل ایسی شادیاں ہونے لگی ہیں۔"

شاہدہ کی ماں تعجب سے شوہر کا چہرہ دیکھنے لگی۔

لطیف حسن نے پوچھا۔ "کیوں اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟"

"تمہاری عقل کو دیکھ رہی ہوں۔ لڑکی کے پیچھے اتنے دیوانے ہو گئے ہو کہ جائز و ناجائز کا بھی خیال نہیں کرتے۔"

"اس میں ناجائز کیا ہے۔ بیسیوں ایسی شادیاں ہو چکی ہیں بڑے بڑے خاندانوں میں ہوئی ہیں۔"

"بڑوں کی بات چھوڑو۔ انہیں کوئی کچھ نہ کہے گا۔ ہم چھوٹے لوگ ایسا کریں گے تو سب یہی کہیں گے کہ معلوم ہوتا ہے اپنی ذات میں انہیں کوئی لڑکا نہیں ملا۔ اسی لئے غیر برادری میں شادی کی ہے کچھ دال میں کالا ہوگا۔"

لطیف حسن ہنس پڑے۔ بولے۔ "دال میں کالا کی تم نے ایک ہی کہی۔ خیر تم ان سب باتوں کی فکر نہ کرو۔ جب کوئی کچھ کہے گا تو ہم جواب دے دیں گے۔"

"تم بھی عجیب بات کرتے ہو۔ ارے تم مردوں کو جواب دے لوگے مگر عورتیں تو مجھے ہی نوچیں گی۔ انہیں کون جواب دے گا؟ پہلے تو یہ بات سن کر اپنی برادری کا کوئی آئے گا نہیں اور دو چار آ بھی جائیں تو ان سے بارات اور تقریب کی کیا زینت ہوگی؟"

"اوہو! ہمیں بارات اور تقریب کی زینت نہیں کرنی ہے ہمیں تو اپنی لڑکی کی پسند کے مطابق کام کرنا ہے چاہے کوئی کچھ کہے یا کچھ سمجھے آئے یا نہ آئے۔ ہمیں کوئی پروا نہیں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ جب کسی کی کوئی پروا ہی نہیں تو جو چاہے جو کرو۔ وہ مثل ہے نا "ننگا سب سے چنگا۔"

"بدتمیزی کی باتیں نہ کرو۔ نہ سمجھ نہ بوجھ جو منہ میں آیا بک ڈالتی ہو!"

"مجھے کیا کرنا ہے۔ کرو جو تمہارا جی چاہے۔"

یہ کہکر بیوی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ شاہدہ پڑی سوچتی رہی۔ ماں نے اسے دو بار جگایا، مگر شاہدہ صرف کروٹ بدل کر رہ گئی ۔۔۔ اٹھی نہیں۔

آج لطیف حسن کو شاہدہ کا دیر سے اٹھنا بہت شاق گزر رہا تھا۔ انھوں کئی بار زور سے پوچھا۔ "شاہدہ نہیں اٹھی؟"

"ابھی تو نہیں اٹھی۔ مالکن دو بار جگا چکی ہیں وہ تو روز ہی دیر سے اٹھتی ہیں۔"

"ہوں۔ یہ عادت بری ہے!"

نوکر حیران ہو کر سوچنے لگا۔ اب تک جو عادت بری نہیں سمجھی گئی وہ آج کیسے بری ہو گئی؟

حسب معمول تیسری بار جگانے پر شاہدہ بیدار ہوئی۔ اپنے کمرے میں آکر وہ بیٹھی جماہیاں لے رہی تھیں کہ لطیف حسن اس کے پاس پہنچ گئے۔ "بڑی دیر میں سو کر اٹھتی ہو شاہدہ؟"

"میں تو ہمیشہ اسی وقت اٹھا کرتی ہوں۔ کوئی آج ہی تھوڑی اٹھی ہوں۔" شاہدہ نے بے باکی کے ساتھ جواب دیا۔

"ہوں۔ ہوں۔ ذرا جلدی اٹھنے سے اچھا رہتا ہے آج نسیم احمد آئے گا۔"

"تو؟" شاہدہ نے باپ کو گھورتے ہوئے کہا۔

لطیف حسن سٹپٹا کر بولے۔ "کچھ نہیں میں نے تمہیں یاد دلایا ہے کل اس نے کہا تھا نا؟ ذرا ٹھیک ٹھاک ہو جانا۔ بڑے گھر کا لڑکا ہے۔"

شاہدہ بولی: "بڑے گھر کا لڑکا ہے تو ہوا کرے آپ کریں اس کی خوشامد۔ مجھ سے تو کسی کی خوشامد نہ ہوگی۔ میرے کلاس میں نہ جانے کتنے بڑے آدمیوں کی لڑکیاں پڑھتی ہیں میں کبھی ان کی پروا نہیں کرتی"

"ہوں ہوں۔ پروا کرنی بھی نہیں چاہیے۔ لیکن یہ بات دوسری ہے وہ مہمان بن کر آئے گا نا۔ مہمان کی خاطر تو کرنی ہی چاہیے۔"

"یہ بات دوسری ہے لیکن اس کے لئے آپ کو نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں مہمان کی خاطر کرنا جانتی ہوں!"

لطیف حسن بیٹی کے سامنے سے ہٹ آئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ معلوم ہوتا ہے نسیم احمد شاہدہ کو پسند نہیں آیا اسی لئے یہ ایسی بے اعتنائی کی باتیں کر رہی ہے۔ مگر پسند نہ آنے کی وجہ؟ اپنے سوال کا جواب سوچتے ہوئے وہ غسل کرنے چلے گئے۔

شام کے چار بجے کے قریب لطیف حسن نے شاہدہ کے بارے میں پوچھا۔ تو پتہ چلا کہ پڑی سو رہی ہے۔ وہ ناراض ہو کر بولے "اسے سونے ہی سے فرصت نہیں ملتی نہ جانے اتنی نیند کیسے آتی ہے۔"

جگاتے جانے پر شاہدہ اٹھی۔ بال بکھرے ہوئے۔ چہرے پر کسل کے آثار، جماہیاں لیتی ہوئی باپ کے سامنے آئی۔ تو منہ سکوڑ کر اور بھنویں چڑھا کر بولے: "تم نے یہ کیا صورت بنا رکھی ہے نسیم احمد دیکھے گا تو کیا کہے گا؟"

"اوہو! نسیم احمد کیا آ رہے ہیں؟ کوئی گورنر یا وائسرائے آ رہے ہیں آپ نے بھی حد کر دی!"

لطیف حسن دل ہی دل میں کڑھ کر رہ گئے۔ شاہدہ کے سامنے زیادہ بولنے کی انہیں جرأت نہ تھی۔ وہ سوچنے لگے۔

"انہیں خوبیوں سے تو ابھی تک شادی نہیں ہوئی ہے کوئی پسند ہی نہیں آتا۔ خدا جانے کیسا شوہر چاہتی ہے!"

چند منٹ باپ کے پاس بیٹھ کر شاہدہ چلی گئی

پانچ بجے کے قریب نسیم احمد آ گیا۔ لطیف حسن نے بڑی خاطر مدارات کی۔ اس کے بعد وہ اندر پہنچے۔ پہلے شاہدہ کی ماں سے بولے: "وہ آ گیا۔ فوراً چائے تیار کرو۔ شاہدہ کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں ہوگی۔" ماں نے بے اعتنائی ظاہر کرتے ہوئے کہا

"اسے بھیجو باہر!"

یہ کہکر وہ باہر آ گئے۔ کچھ دیر بعد شاہدہ بھی باہر آئی۔ اسے دیکھ کر لطیف حسن حیرت و مسرت سے دم بخود رہ گئے۔ شاہدہ کی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ بال نہایت خوبصورتی سے سنوارے گئے تھے۔ چہرہ بھی پاؤڈر کے سہارے خوب نکھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ لپسٹک نے ہونٹوں کی سرخی کو ضرورت سے کچھ زیادہ بڑھا دیا تھا۔ ساڑھی، جمپر بھی نہایت دیدہ زیب تھے۔

وہ مکمل طور پر ایک پیکر حسن نظر آ رہی تھی۔ لطیف حسن نے

دل ہی دل میں کہا: "آجکل کی ان تعلیم یافتہ لڑکیوں کے مزاج کی تھاہ پانا بہت مشکل ہے!"

نسیم احمد نے اٹھکر شاہدہ کا خیر مقدم کیا۔ شاہدہ باپ کے بغل والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ لطیف حسن نے نوکر کو چائے لانے کا حکم دیا تھوڑی دیر میں چائے آگئی۔ چائے کے ساتھ تین طشتریاں پھلوں کی اور ایک طشتری میں کچھ نمکین اور مٹھائی بھی تھی۔

نسیم احمد بولا: "بہت سامان منگالیا آپ نے چائے کے ساتھ ان چیزوں کی کیا ضرورت تھی؟"

"کھاؤ بھی!" لطیف حسن نے مسکرا کر کہا: "جوان آدمی کو بھی اتنا پرہیز صحیح نہیں!"

"پرہیز کی بات نہیں۔ چائے کے ساتھ تو چائے کے مطابق ہی تھوڑی سی کوئی چیز ہونی چاہیئے۔"

شاہدہ بول اٹھی: "یہ ہندوستانی چائے ہے!" یہ کہکر وہ ہنس دی نسیم بھی ہنس پڑا۔

لطیف حسن کچھ جھینپ کر بولے: "خیر جتنی خواہش ہو کھالو۔"

نسیم احمد نے دو چار قاشیں پھلوں کی کھائیں ایک سموسہ اور ایک رس گلا کھایا۔ شاہدہ نے صرف پھلوں کی کچھ پھانکیں کھائیں نسیم احمد نے کہا: "آپ نے مٹھائی اور نمکین میں سے تو کچھ کھایا ہی نہیں!"

"مجھے یہ چیزیں پسند نہیں!" شاہدہ نے منہ بنا کر جواب دیا چائے کے بعد پان سگریٹ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد لطیف حسن اٹھکر اندر چلے گئے۔ بیوی سے بولے: "تم باہر نہیں چلوگی؟"

"میں کیا کروں گی چل کر وہاں میرا کیا کام؟"

"ذرا لڑکے کو دیکھ تو لیتیں۔"

"مجھے نہیں دیکھنا ہو تمہیں دیکھو!"

"اچھا میرے کہنے سے پردے کی آڑ ہی سے دیکھ لو۔" یہ کہکر لطیف حسن بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے دروازے تک لے آئے، اور پردے کے پاس کھڑے ہوکر بیوی سے بولے: "دیکھو۔"

بیوی نے کچھ دیر تک دیکھنے کے بعد کہا: "لڑکا تو اچھا ہے بس اتنی ہی کسر ہے کہ اپنی برادری کا نہیں ہے!"

"اب یہ سب دیکھنے کا وقت چلا گیا۔"

"تمہارے یہاں چلا گیا تو تم سمجھتے ہو کہ دنیا سے چلا گیا۔" یہ کہکر بیوی اندر چلی گئی۔

لطیف حسن باہر آکر بولے: "شاہدہ کی ماں کی طبیعت آج ٹھیک نہیں ہے اس لئے وہ آج باہر نہ آسکیں گی۔"

"تب تو میں بہت بے موقع آیا۔" نسیم نے کہا۔

"نہیں ایسی کوئی فکر کی بات نہیں۔ سینما چلوگے؟"

"جیسی آپ کی مرضی۔ آپ کو کوئی زحمت تو نہ ہوگی؟"

"نہیں مجھے کوئی زحمت نہیں ہوگی۔ آؤ چلیں۔"

"تینوں سینما گئے۔ جتنی دیر تک نسیم کا ساتھ رہا اتنی دیر میں لطیف حسن نے دو تین بار ایسا موقعہ دیا کہ صرف شاہدہ اور نسیم ہی رہ گئے۔ وہ خود غیر حاضر رہے۔

بتدریج نسیم احمد کی آمدورفت بڑھتی گئی۔ وہ اب اکثر روز آنہ رجسٹرار صاحب کے گھر آنے لگا۔ برابر آنے جانے کے سبب شاہدہ کی ماں بھی اس کے سامنے ہونے لگیں۔ اگرچہ شاہدہ کی ماں عموماً پردہ نہیں کرتی تھیں۔ شوہر کے ساتھ اکثر بے پردہ گھومنے جایا کرتی تھیں مگر گھر پر وہ ہر شخص کے سامنے نہیں آتی تھیں کچھ خاص خاص لوگوں کے سامنے ہی آتی تھیں۔ شاہدہ اور نسیم دونوں ہی ان کے اس عجیب رویہ پر اعتراض کیا کرتے تھے۔ مگر انھوں نے ان دونوں کی بات پر کان نہیں دھرا۔ انہوں نے صاف طور پر کہدیا: "اس کے متعلق کسی کی بات نہیں مان سکتی۔ مجھ سے یہ کبھی نہ ہوگا کہ میں ہر ایرے غیرے کے سامنے آبیٹھوں!"

رفتہ رفتہ ایسا بھی ہونے لگا کہ شاہدہ اکیلی ہی نسیم احمد کے ساتھ گھومنے جانے لگی۔ شاہدہ کی ماں نے اس پر شاہدہ کو ٹوکا مگر شاہدہ نے ماں کو ڈانٹ دیا۔ بولی: "تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے میں کوئی بچہ نہیں ہوں کہ کوئی مجھے بہکالے گا۔ ان مردوں کو میں خوب سمجھتی ہوں یہ بڑے بیوقوف ہوتے ہیں کوئی بھی چالاک عورت انہیں انگلیوں پر نچا سکتی ہے۔ مجھے تو انہیں الو بنانے میں خاص

مزہ آتا ہے۔" یہ کہکر شاہدہ نے ایک قہقہہ لگایا۔ "بس انہیں ایک بار یہ یقین دلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے کہ تم ان کی طرف مائل ہو پھر دیکھو وہ کیسا بندر کی طرح ناچتے ہیں۔"

"ناچتے تو ضرور ہیں مگر نچانے کی قیمت بھی وصول کر لیتے ہیں۔" شاہدہ کی ماں نے کہا۔

"مگر ان بیوقوف عورتوں سے جو انہیں سمجھتی نہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ تو عقلمند ہے تو کر اپنے من کی مجھے کیا کرنا ہے" شاہدہ کی ماں نے شوہر سے بھی یہ بات کہی کہ "شاہدہ نعیم کے ساتھ تنہا گھومتی پھرتی ہے۔ یہ بات مجھے اچھی نہیں لگتی۔"

انہوں نے کہا۔ "تمہیں تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ نسیم شاہدہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جب تو اتنا ربط و ضبط بڑھا رہا ہے۔"

"کچھ بھی ہو یہ رویہ اچھا نہیں جب تک شادی نہ ہو جائے اتنی بے تکلفی ٹھیک نہیں ہوتی۔"

"اوہو۔ کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ شاہدہ پردیس میں رہتی ہے وہاں کیا کرتی ہوگی؟ وہاں تو وہ اکیلی ہی رہتی ہے۔ جو چاہے کر سکتی ہے۔"

"وہاں جو چاہے کرے۔ اس کی ذمہ داری اس پر ہے۔ یہاں تو ہماری ہی ذمہ داری ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن تم کوئی فکر نہ کرو۔"

"مجھ سے تو دیکھا نہیں جاتا اس لئے کہتی ہوں!"

"نہیں دیکھا جاتا تو آنکھوں پر پٹی باندھ لو۔"

مجبوراً بیوی خاموش ہو گئی۔

جون کا آخری ہفتہ آ پہنچا۔ ایک دن شاہدہ کی ماں صبح اٹھ کر شوہر سے بولیں: "تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

لطیف حسن نے بیوی کو تنہائی میں لے جا کر پوچھا: "کیا بات کرنی ہے؟"

"بات یہ ہے کہ جس کا مجھے اندیشہ تھا وہی ہوا تم کو سمجھایا مگر تم نہیں مانے الٹا مجھی کو بے وقوف بنانے لگے۔"

"الف لیلیٰ کی داستان نہ چھیڑو۔ بات کیا ہے یہ بتاؤ۔"

"کل نسیم احمد اپنی ملازمت پر چلا گیا۔"

"تو جانے دو۔"

"اس حرامزادے نے شاہدہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سے شادی کرے گا۔"

"تو کرے گا نا۔ ملازمت پر چلے جانے سے شادی تھوڑی ہی رک جائے گی۔"

"مگر کل وہ شاہدہ کو جواب دے گیا۔ اس نے کہا کہ اس کی شادی تو ایک جگہ پہلے ہی پکی ہو چکی ہے۔"

"یہ تو اس نے بہت بے جا کیا۔"

"اتنا ہی نہیں۔ وہ ہم کو تباہ بھی کر گیا ہے۔"

"ایں۔ کیا؟" لطیف حسن نے چونک کر پوچھا۔

بیوی نے شوہر کے کان میں کچھ کہا۔ لطیف حسن گھبرا کر بولے "سچ؟"

"سچ نہیں تو کیا جھوٹ! اسی لئے میں منع کرتی تھی لیکن تم پر تو نئی تہذیب کا بھوت سوار تھا۔ اب بتاؤ ہماری آبرو کیسے بچے؟" یہ کہکر بیوی رونے لگی۔

لطیف حسن کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں بولے "اب تو اسے ضرور شادی کرنی پڑے گی۔ میں ابھی اس کے باپ کے پاس جاتا ہوں۔"

لطیف حسن اسی وقت نسیم احمد کے باپ کے پاس پہنچے۔ نسیم احمد کے باپ نے ساری باتیں سننے کے بعد کہا۔ "واقعی بات تو بڑی بے جا ہوئی۔ لیکن میں اس میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس کی شادی کو پختہ ہوئے تین مہینے ہو چکے ہیں اور شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو چکی ہے۔"

"تو میری بیٹی کا کیا ہوگا؟ یہ بھی آپ نے سوچا؟" لطیف حسن نے جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا۔

"آپ نے اپنی بیٹی کو اس کے ساتھ تنہا کیوں گھومنے پھرنے دیا؟"

"آجکل تو عام طور پر ایسا ہو رہا ہے۔ نئی تہذیب میں یہ بات معیوب نہیں سمجھی جاتی۔"

"تعجب ہے کہ نئی تہذیب تو بری نہ سمجھی جائے۔ لیکن اس کے

ثرات کو برا سمجھا جائے۔ یہ کہاں کی عقلمندی اور کہاں کا انصاف ہے؟ جب آپ نے اپنی بیٹی کو نسیم کے ساتھ گھومنے پھرنے کی آزادی دی تھی تو آپ کو اس کا نتیجہ بھگتنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے تھا۔"

"میں کیا جانتا تھا کہ آپ کا بیٹا ایسا کمینہ پن کرے گا۔ ایک لڑکی کو بہکا کر اس کو تباہ و برباد کر دے گا؟"

"آپ کو کیا حق تھا کہ آپ میرے بیٹے کو ولی کامل سمجھ بیٹھیں۔ اگر آپ کی بیٹی نادان اور ناتجربہ کار تھی تو آپ کو تو محتاط رہنا چاہئے تھا"

"آپ سارا الزام مجھی پر عاید کر رہے ہیں آپ کے بیٹے نے جو عہد و پیمان کئے ان سے آپ کچھ نہیں کہتے۔ اس نے شادی کا جھوٹا وعدہ کر کے میری بیٹی کو گمراہ کر دیا۔"

"کسی کے وعدے پر یقین کر کے اتنا بڑا خطرہ سر لے لینا کوئی عقلمندی کی بات تو نہیں کہی جا سکتی۔"

"تو آپ اس معاملے میں کچھ نہ کریں گے؟"

"اگر میں چاہوں تب بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس پر میرا کوئی اختیار نہیں وہ کوئی بچہ تو ہے نہیں کہ جو کہوں گا وہ اسے مان لے گا پھر جہاں رشتہ پکا ہو چکا ہے۔ میں انہیں کیا جواب دوں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں عدالت میں چارہ جوئی کروں گا۔ اور آپ کے لڑکے کو سزا دلا کر چھوڑوں گا۔"

"اس کے لئے بھی آپ کو منع نہیں کرتا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اگر آپ کو اپنی اور اپنی بیٹی کی بے آبروئی کرا کر اس کا مستقبل بگاڑنا ہے تو جائیے عدالت میں!"

لطیف حسن دل ہی دل میں بیچ و تاب کھاتے ہوئے گھر لوٹے اور بیوی سے بولے "اس کا باپ اس سے بھی زیادہ نامعقول نکلا۔ وہ الٹے مجھی کو قصوروار ٹھہرانے لگا۔"

"ٹھیک ہی ہمارا قصور تو ہے ہی۔ اس وقت نہ تمہیں نے میری بات مانی نہ اس حرامزادی نے میری کچھ سنی۔ کہتی تھی میں مردوں کو انگلیوں پر نچاتی ہوں انہیں الو بناتی ہوں اب اس سے پوچھو کون الو بنا؟"

یہ کہہ کر شاہدہ کی ماں پھر رونے لگی لطیف حسن باہر چلے آئے۔

شاہدہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ آنکھوں میں آنسو بھرے بکھرے بال بکھرائے میلے کپڑے پہنے۔

ماں نے اس کے پاس پہنچ کر کہا: "اس کے باپ نے بھی جواب دے دیا۔"

شاہدہ نے رونا شروع کیا۔ ماں بولی: "بندر نچانے کا نتیجہ دیکھ لیا نا۔ بندر نچاتی تھی نا! یہ نہ سوچا کہ ذرا سا چوکنے سے بندر نوچ بھی کھاتا ہے؟"

شاہدہ نے کوئی جواب نہ دیا تکئے میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔

شاہدہ نے کالج سے ایک مہینے کی چھٹی لے لی۔ اور اس کے بعد اس کے والدین اسے لیکر کہیں چلے گئے۔ لوگوں نے پوچھا تو کہا: "شاہدہ کی صحت خراب ہے تبدیل آب و ہوا کے لئے پہاڑ جا رہے ہیں۔" جب وہ لوٹ کر آئے تو شاہدہ بہت کمزور اور پیلی ہو گئی تھی لوٹنے کے دوسرے ہی دن وہ اپنی نوکری پر چلی گئی۔

لطیف حسن جب باہر نکلتے ہیں تو کچھ لوگ انہیں دیکھ کر آپس میں سرگوشی کرنے لگتے ہیں۔ وہ شرم سے گردن جھکا لیتے ہیں۔

(بشکریہ "زیب النساء" لاہور)

راغب مراد آبادی •

حقائق

نہیں ہے مجھ کو تمنائے ساغرِ لب ریز
خیالِ عیش بھی ہے جہدِ زندگی سے گریز

بجا کہ رُو بہ ترقی ہے آجکل انساں
مگر زوال ہے انسانیت کا حیرت خیز

رواں دواں ہی سہی رخشِ ہستی دوراں
کبھی کبھی تو مگر ناگزیر ہے مہمیز

ابھی جہان میں باقی ہے رسمِ چنگیزی
یہ اور بات ہے، زندہ نہیں ہے اب چنگیز

شگفتِ گل تو ہے عبرت کا اک پیامِ خموش
سمجھ سکے گا نہ یہ رازِ غنچۂ نوخیز

غمِ نشاط تو مہلک ہے زندگی کے لئے
نشاطِ غم سے ضروری نہیں مگر پرہیز

بساطِ فقر ہے اورنگِ خسروی راغب
مری نگاہ میں ہے ہیچ دولتِ پرویز

○

کمالؔ مالیر کوٹلوی •

وقت کی پکار

ہُوا عیش کوشی کا رخصت زمانہ
جلا ڈال خار و خسِ آشیانہ

بغلگیر ہو موت سے والہانہ
بڑھا سوئے میداں قدم فاتحانہ

لگاتار صدمے مسلسل مصائب
تری آزمائش کا ہیں اک بہانہ

پرستارِ خالق؟ اجل سے گریزاں؟
مجاہد لقب، زندگی راہبانہ؟

بدل ڈال اطوار لادینیت کے
بدل جائے گی خود بخود یہ زمانہ

طبیعت میں پیدا مذاقِ عمل کر
ملے گا مقدر کا خود آب و دانہ

فرنگی کی تقلید نے تجھ کو کھویا
مقلد تھا ورنہ ترا اک زمانہ

تجھی کو نہیں ذوقِ سجدہ وگرنہ
وہی سنگِ در ہے وہی آستانہ

بہر گام ہیں فتح و نصرت کے ضامن
زباں رس بھری گفتگو مشفقانہ

یہ ملک اور ملت کی خدمت کے دعوے
حصولِ امارت کا ہیں اک بہانہ

خبردار دُنیا سے ایمان والو!
یہ ہے مومنوں کے لئے قیدخانہ

کمالؔ ابتری کارواں میں یہ کیوں ہے
چلیں ہم اگر مل کے شانہ بشانہ

سید قیصر قیصری

یہ بابا!

"جیسے کسی کو کھوئی چونی پڑی ہوئی مل جاتی ہے نا بابو۔ بس ایسے ہی یہ مجھے سڑک پر پڑا ہوا مل گیا تھا۔ پر اب چونی کی بات دوسری ہے ایسے آدمی خود اپنے شوق سے اٹھاتا ہے ٹھوک بجا کر دیکھتا ہے اور پھر کچھ نہیں تو صرف اس خیال سے جیب میں ڈال لیتا ہے کہ ممکن ہے کسی آپ جیسے جنٹلمین کو ریزگاری واپس کرتے وقت چل جائے۔ پڑھے لکھے لوگ نوٹ کے پیسے عام طور سے بغیر دیکھے اپنی جیب میں ڈال لیتے ہیں۔ غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں بابو؟ پر اس سے نہ جانے کیوں مجھے ایسی محبت ہو گئی ہے میں کہاں کا ایسا لفٹنٹ گورنر ہوں۔ میں نے کوئی خیرات خانہ بھی نہیں کھول رکھا ہے۔ یہاں اس نئے دیس میں اپنا ہی پیٹ پالنا مشکل ہے۔ جو کچھ کماتا ہوں اس کا آدھا چوتھائی یہ جانور ہی کھا جاتا ہے۔ باقی چار میرے اپنے بچے ہیں۔ چار سالی، سالا ہیں، بڑھی ساس دمہ کی مریض ہے۔ دو چار آنے روز اس کی دوائی پر خرچ ہو جاتے ہیں۔ پھر آپ جانیں اور بھی ہزاروں دکھڑے اپنے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ ہندوستان سے تن کے کپڑے اور حیدر خاں کا صندوقچہ لایا تھا۔ وہ صندوقچہ بھی کسی بدمعاش کے ہتھے لگ گیا۔ یہ گھوڑا تانگہ سب کچھ میرے سسر نے خرید کر دیا تھا اب وہ مر گیا تو میں اس کی بیوی بچوں کا سارا خرچ اٹھاتا ہوں منع کس منہ سے کر دوں۔ جب میرا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا تو اس مرنے والے نے میرے ساتھ وہ کیا جو اس چودھویں صدی میں کوئی کسی کے ساتھ نہیں کرتا۔ اور پھر میرا اس کا کوئی رشتہ ناطہ بھی نہیں تھا۔ آپ کہیں گے کہ ناطہ ہر آدمی کا دوسرے سے ہوتا ہے پر یہ بات تو مجھے اب معلوم ہوئی ہے ادھر فوجی کیمپ میں تو میرے اوپر بھوت سوار تھا۔ کوئی مجھ سے بات کرتا تھا تو میں اسے کاٹ کھانے کے لئے دوڑتا تھا مرحوم چودھری نے صرف اتنا مجھ سے کہا کہ بھیا دلدار تم جوان غریب مہاجروں کو تنگ کرتے ہو تو یہ بھی تمہاری ہی طرح مصیبت زدہ ہیں۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے سے کیا فائدہ؟ مسلمان آدمی کی پہچان تو یہ ہے کہ مصیبت کے وقت اپنے بھائی کی ڈھارس بندھاتا ہے۔ اس کے کام آتا ہے۔ تو بابو بس اتنا اس نے مجھ سے کہا اور میں اس پر بچھ نہ پڑا۔ کیمپ کے سارے آدمی مل کر اگر بیچ میں نہ آجاتے تو یقیناً اس دن بڑے زور کا دنگا ہو جاتا۔ اب بات اس طرح آپ کی سمجھ میں نہیں آ سکے گی۔ میں آپ کو سارا قصہ شروع ہی سے سنائے دیتا ہوں:

"بات یہ ہے بابو کہ مجھے ان دنوں بڑی نفرت ہو گئی تھی۔ مسلمان مسلمان کی رٹ مجھے بڑی بری لگتی تھی۔ اور پاکستان کے نام سے تو میرا بن آگ، بن لکڑی سلگتا تھا۔ ادھر ہندوستان میں میرا اچھا خاصا کاروبار چل رہا تھا۔ پاکستان نے ایک دم سے سب کچھ چوپٹ کر دیا۔ اب آپ سے کیا پردہ ہے، بابو۔ ادھر دلی میں رامپور سے کوکین منگوایا کرتا تھا۔ خدا جنت نصیب کرے رامپور کے بنے صاحب سو جتن کر کے کوکین میرے پاس بھجوا دیتے تھے اور میں اسے میرٹھ اور انبالہ تک بانٹتا تھا وہ بنے صاحب گڑھ مکتیشر کے میلہ میں مارے گئے۔ پتہ نہیں وہ اس میلہ میں کیا کرنے چلے گئے تھے۔ میرا تو بابو ان کی موت سے سارا دھندا ہی چوپٹ ہو گیا۔ مکتیشر کے بعد یہ وبا ان شہروں میں بھی پھوٹ نکلی جگہ جگہ دنگے شروع ہو گئے۔ آج میرٹھ میں تو کل غازی آباد میں۔ پرسوں خود دلی میں۔ اور پتہ نہیں بابو ان دنوں کوکین کی مانگ کیوں اتنی زیادہ ہو گئی۔ نوجوان غنڈے باز تو دارو پیتے تھے۔ لیکن بڈھے بڈھے سیٹھ ساہوکار کوکین مانگتے تھے۔ اور کوکین تھی کہ اس کا قحط پڑ گیا تھا۔ دلی میں بس ایک پنواڑی مکند لال کے پاس تھوڑا سا اسٹاک رہ گیا تھا۔ لیکن وہ تھا ہندو مسلمانوں کے ہاتھ کسی بھاؤ بیچنے پر تیار نہیں تھا۔ میں نے بھی جی میں کہا کہ "رہے مکندا سیٹھ! تیرے سفید بالوں کو لال خون میں نہ رنگا ہو تو میاں بھائی نہ کہنا۔ تو بابو! زندگی میں پہلا خون میں نے اس مکند کے

گا گیا۔ اس دن بس یونہی افواہ پھیل گئی تھی کہ شہر میں دنگا ہو گیا ہے اور سارا بازار شٹاک بند ہو گیا۔ میں پہونچا تو مکندا اپنی دکان کے کواڑ بھیڑ رہا تھا۔ پیچھے سے میں نے اس کی پیٹھ میں رامپوری چاقو گھسیڑ دیا اور جب وہ ہے رام کہتا ہوا نیچے گرا تو میں نے کہا "دیکھ بے مکندا۔ یہ ہے بیٹے صاحب کے خون کا بدلہ!"

"پھر تو صاحب میرے اوپر خون سوار ہو گیا۔ کتنے ہی آدمیوں کو میں نے ٹھکانے لگا دیا دلی کی گلیوں میں میں بھرایا ہوا پھرتا تھا۔ سنگ ساتھ کے لوگ اسپیشلوں میں بیٹھ کر دھڑا دھڑ پاکستان کو بھاگ رہے تھے۔ پر میں اسٹیشن پر جا کر انہیں گالیاں دیتا تھا۔ میں کہتا تھا کہ، بزدلو! یہ بائیس خواجہ کی چوکھٹ چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ پاکستان میں کیا کوئی دوسرا کلمہ پڑھایا جاتا ہے؟ پر صاحب وہ سمجھتے تھے کہ ادھر پاکستان میں جاگیریں بٹ رہی ہیں۔ میری اپنی گھر والی رو رو کر برا حال کئے لیتی تھی۔ رحیم دین بساطی کے گھر اس کا بڑا آنا جانا تھا۔ وہاں سے وہ ایسی ایسی باتیں سیکھ آتی تھی کہ میری جان سلگ جاتی تھی اور میں اسے خوب خوب مارتا تھا اور ایک دن تو جب اس نے پاکستان چلنے کے لئے زیادہ ضد کی تو میں نے شدّو کو اس کی گود سے چھین کر زمین پر پٹک دیا۔ اب مجھے یہ بات یاد آتی ہے تو دل بڑا املاتا ہے۔ بے چارا شدّو پورا دو سال کا بھی نہیں تھا۔ تین سال تو ہماری شادی کو ہوتے ہی تھے، پر بابو غصّہ بہت بری چیز ہے۔ میں نے شدّو کو زمین پر پٹک دیا اور شدّو کی ماں کو لوہے کے سریا سے مارا۔ اتنا مارا کہ سب پاکستان واکستان بھول گئی اور کہنے لگی کہ اب کہیں آنے جانے کا نام نہ لوں گی اور اسی دن شام کو وہ مر گئی۔ وہ بھی اور شدّو بھی۔ اس دن ہم لوگ پاس کے ایک گوردوارے پر چڑھائی کرنے جا رہے تھے۔ سب لوگ حیدر خاں کے پیچھے دالان میں جمع تھے۔ اس کے بلّم کا پھول نکل گیا تھا اور وہ اس میں ایک کیل ٹھونک رہا تھا۔ بس اچانک بلوائی آ گئے۔ آتے ہی انہوں نے مکانوں میں آگ لگانا شروع کر دی۔ بڑے معرکے کا رن تھا۔ وہ لوگ بالم والے کوچہ سے بندوقیں چلاتے تھے اور ہم حیدر خاں کی چھت سے پتھر پھینکتے تھے۔ دو چار بندوقیں اپنی طرف بھی تھیں۔ بعد میں فوج آ گئی اور بلوائی بھاگ گئے۔ حیدر خاں کا مکان امانت بچ گیا۔ پر میرا شیدو مر گیا۔ میری تو بابو ہمت ہی نہیں پڑی کہ ان گولیوں سے نکل کر اپنا گھر دیکھنے جاتا۔ بعد میں گیا تو گھر کا سلفہ ہو چکا تھا۔ سارا محلہ ہی جل رہا تھا۔ حیدر خاں کا پچھواڑا ایک گلی چھوڑ کر تھا۔ پر آگ ادھر بھی جا پہونچی تھی۔ کرفیو کھلنے پر جب ہم لوگ ایک قافلہ بنا کر جامع مسجد پہونچے تو حیدر خاں اور اس کے بیوی بچے بھی ہمارے ساتھ تھے۔ مگر سامان ان کا بھی سب وہیں رہ گیا تھا۔ وہ لوگ اپنے ساتھ بس زیوروں کا ایک صندوقچہ اٹھا لائے تھے اور اسے اپنے کلیجے سے لگائے لگائے پھرتے تھے۔ جامع مسجد سے ہم لوگ پرانے قلعے کے کیمپ میں پہنچے اور وہاں حیدر خاں نے سونے کے دو کڑے بیچ کر کھانے پینے کی کچھ چیزیں لیں تو میرے پیٹ میں بھی کئی وقت کے بعد تھوڑا سا رزق گیا۔ ادھر پرانے قلعے کے کیمپ کا حال میں آپ کو نہیں سناؤں گا۔ بابو اسے سن کر اچھے اچھے کا کلیجہ ہل جاتا ہے۔ دلی کے فساد میں اتنے آدمی نہیں مرے ہوں گے جتنے ان کیمپوں میں مر گئے۔ حیدر خاں بھی مر گیا۔ اسے ہیضہ ہو گئی تھی۔ چوبیس چوبیس گھنٹے پانی برستا تھا۔ کئی کئی وقت بعد جب ہمیں روٹی نصیب ہوتی تھی تو اس میں آدھا کیچڑ ملا ہوا ہوتا تھا۔ لوگ دھڑا دھڑ ہیضہ سے مر رہے تھے۔ حیدر خاں مر گیا تو اس کی بیوی بہت روئی اور مجھ سے کہنے لگی کہ اب میرا اور میرے ان تین بچوں کا اس دنیا میں کوئی نہیں رہا اور کہنے لگی کہ بس اوپر خدا ہے اور نیچے تم ہو۔ وہ مجھے اسی وقت سے بھیا بھیا کہنے لگی۔ پر بابو میرے دل پر اپنے آپ بیت رہی تھی۔ میرا شیدو گھر میں جل کر مر گیا تھا۔ ساری جمع جتھا جل گئی تھی اور میں حیدر خاں کا گھر بچاتا رہ گیا تھا۔ تو اسی دن شام کو جب ایک اسپیشل پاکستان کے لئے چھوٹی تو میں نے حیدر خاں کا صندوقچہ اٹھا لیا اور اس کی بیوی کو وہیں کیمپ میں چھوڑ کر چلا آیا۔ ان دنوں راستہ میں بھی بڑی کاٹا کاٹ ہو رہی تھی۔ پر ہماری گاڑی کو کسی نے کچھ نہ کہا۔ صندوقچہ میں بہت زیور تھا۔ میں نے کہا چلو پھر سے کوئی دھندا شروع کر دیں گے۔ پاکستان نئی جگہ ضرور ہے لیکن پھر اپنا ملک ہے۔ اپنے لوگ ہوں گے۔ کسی سالے مکندا کی خوشامد نہیں کرنا پڑے گی۔ بیٹے صاحب نہیں تو ان جیسے کئی بھائی بند اور مل جائیں گے لیکن یہاں پاکستان میں نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ پہلے ہی دن رفیوجی کیمپ میں سوتے میں کسی نے صندوقچہ صاف کر دیا۔ میں نے شور مچایا تو کسی نے

دھیان نہیں دیا۔ سب کے سب اپنا اپنا راگ گا رہے تھے۔ کوئی اپنے جوان بیٹوں کو رو رہا تھا اور کسی کے ماں باپ مر گئے تھے۔ میں کسی سے اپنے صندوقچے کا ذکر کرتا تھا تو لوگ اپنی اپنی جاگیروں اور کوٹھیوں کا ذکر لے بیٹھتے تھے ایک مہاجر سے میں نے کہا کہ تم نے کسی کے پاس ہرے رنگ کا ایک چھوٹا سا صندوقچہ تو نہیں دیکھا ہے جس کے ڈھکنے پر کتھئی رنگ کا ایک تین پتوں والا پھول بنا ہوا ہے؟ تو وہ جواب میں مجھ سے اپنی لڑکی کا پتہ پوچھنے لگا اور کہنے لگا کہ ابھی کل رات تک وہ یہاں تھی اور ایک مقامی رضاکار اس کے قریب ہو ہو کر گزر رہا تھا۔ تو بابو سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ ایسی نفسا نفسی کا عالم آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ زیور کے صندوقچوں سے زیادہ لوگوں کو اپنے اپنے کمبلوں کی فکر پڑی ہوئی تھی۔ اٹھائی گیرے سوتے ہوئے آدمیوں کے اوپر سے کمبل اتار لیتے تھے اور خدا جانے بیچ آ آ کے یا کیا کرتے تھے۔ لوگوں کی وحشت کا یہ عالم تھا کہ شہر کے مقامی لوگ چندہ کا پکا پکایا ہوا کھانا اور کپڑے بانٹنے کے لئے کیمپ میں آ نکلتے تھے تو ان سے بھی لڑائی لڑنا شروع کر دیتے تھے۔ کیمپ میں ایک عام افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ ان مقامی لوگوں نے ہندوؤں کا چھوڑا ہوا سارا مال آپس میں بانٹ لیا ہے اور مہاجروں کا دل بہلانے کے لئے کھانا پکا کر لے آتے ہیں۔ مرنے والا میرا سسر چوہدری بھی تیسرے دن کیمپ میں آیا کرتا تھا۔ اس کی ڈاڑھی میں منوں مٹی بھی رہتی تھی اور کیمپ میں بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ ابھی ایک آدمی کو گرم کوٹ دے رہا ہے اور ابھی دوسرے آدمی کے بچے کو نل کے نیچے بٹھا کر نہلا رہا ہے۔ وہ ہر ایک کا دکھ درد سنتا تھا اور ہر ایک کو تسلی دیتا تھا۔ پر آپ جانیں کیمپ میں سبھی طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ کچھ مہاجر تو کسی کے سامنے اپنی تکلیف کا ذکر ہی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو اپنا دکھڑا کہتے کہتے دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے تھے۔ کئی آدمی ایسے بھی تھے جو صرف گالیاں بکا کرتے تھے... ہندوؤں کو، سکھوں کو، پاکستان کو، مقامی لوگوں کو، مجھے خود بھی سارے زمانے سے نفرت ہو گئی تھی اور میں بھی سب کو گالیاں دیا کرتا تھا خود کیمپ کے ہی اپنے کتنے بھائی بندوں سے میری لڑائی ہو گئی۔ چوہدری گانا مجھے سمجھانے بیٹھ گیا تھا مگر میں نے اس کا بھی گریبان پکڑ لیا۔ میں نے کہا "چوہدری! مجھے سب پتہ ہے، تم لوگوں نے ہندوؤں کے بڑے بڑے مال مارے ہیں اور اب اپنی حاجی دکھانے کے لئے یہاں دو چار کپڑے بانٹنے کو لے آتے ہو۔" میں نے کہا "چوہدری ہم لٹے پٹے مہاجروں کو ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ ہمیں تمہاری خیرات نہیں چاہیئے۔" اور میں نے کہا کہ کیمپ سے کتنے ہی مہاجروں کا سامان چوری ہو گیا ہے اور کتنوں کی تو بہنیں اور بیٹیاں غائب ہیں اور مجھے سب پتہ ہے یہ کن لوگوں کی شرارت ہے۔"

اور میں نے اسے مارنے کو لیا تھا بابو پر کیمپ کے سارے لوگ بیچ میں آ گئے اور انہوں نے اسے بچا لیا۔ میری باتیں سن کر اس کی آواز بھرا گئی تو خدا جانے کیا سوچ کر وہ کیمپ سے چلا گیا۔ اور اس کے جاتے ہی سب لوگ مجھے برا بھلا کہنے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ چوہدری بڑا مسلمان آدمی ہے اور مہاجروں کی خدمت میں اس نے اپنا دن رات ایک کر رکھا ہے مگر میں نے اسے گالیاں دی ہیں اور اب وہ کسی مہاجر کو اچھا نہیں سمجھے گا اور اب کبھی کیمپ میں نہ آئے گا ——— مگر بابو۔

وہ پھر آ گیا اس دفعہ وہ اون کے چھوٹے چھوٹے سوئیٹر لے کر آیا تھا۔ اپنے ہاتھ سے یہ سوئیٹر اس نے مہاجر بچوں میں بانٹ دیئے اور پہنے دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ میں نے قادر سے کہا کہ "بے قادر یہ ضرور اس چوہدری نے کسی مالدار ہندو کے گھر پر ہاتھ مارا ہے۔ تو ایک دن جا کر دیکھ تو سہی کہ یہ رہتا کہاں ہے؟" یہ قادر رہتک کا مہاجر تھا اور میری اس سے بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ اسے بھی میری طرح ان چوہدری لوگوں سے بڑی نفرت ہو گئی تھی۔ وہ اس رات چوہدری کے پیچھے پیچھے گیا۔ لیکن اس رات اسے کسی بات کا پتہ نہیں چل سکا۔ اس نے کہا کہ میں اس کی گلی تو دیکھ آیا ہوں لیکن پتہ نہیں وہ اس گلی میں کسی کام سے گیا تھا یا وہیں رہتا ہے اس نے کہا کہ "اگر وہ اس گلی میں رہتا ہے تو پھر وہاں تو مسلمانوں کی بڑی پرانی آبادی ہے اور کسی ہندو کا چھوڑا ہوا کوئی مکان وہاں دور دور تک نہیں ہے۔"

اگلے دن چوہدری کیمپ میں آیا تو اس نے ایک نئی بات کی۔ وہ مجھے ایک بات کہنے کے لئے کیمپ سے باہر لے جانے لگا۔ میں نے سوچا کہ نہیں شاید آج یہ چوہدری مجھ سے بدلہ لینے کے لئے تیار ہو کر آیا ہو اور اس کے ساتھ کے آدمی باہر لگے کھڑے ہیں۔ پر میں بھی ایسا کوئی مرا تو نا توا نہیں تھا

میں اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ مگر اب دیکھنے کہنے لگا۔ "بھائی دلدار ایک بات کہوں۔ برا نہیں مانو گے؟" میں نے کہا۔ "ضرور کہو چوہدری! برا ماننے کی بات ہوگی تو ضرور مانوں گا اور نہیں ہوگی تو نہیں مانوں گا۔" کہنے لگا "تم ذرا بات والے آدمی ہو اس لئے ڈر لگتا ہے مگر بات یہ ہے کہ میرے پاس تھوڑی سی رقم ہے اگر تم کوئی کاروبار کرنا چاہو تو میں تمہیں دیدوں گا جب تمہارے پاس ہو جائیں تو ادا کر دینا۔ نہیں تو وہ کیا ہوتا ہے —— قرض حسنہ سمجھ لینا۔"

حیرت تو مجھے بہت ہوئی کہ میں تو اس کے ہاتھ پیر توڑنے والا ہو رہا تھا اور یہ بیٹھے بٹھائے کو مجھے روپیہ دے رہا ہے پر میں نے ...... سوچا کہ ملتا مال چھوڑنا نہیں چاہئیے۔ چنانچہ میں راضی ہو گیا اور اس نے کہا کہ "اچھی بات ہے کل میں تمہارے لئے کوئی صورت کر دوں گا۔ انشاءاللہ مگر تم کاروبار کیا کرو گے؟" میں نے کہا "سوچ کر بتاؤں گا۔" تو صاحب وہ چلا گیا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے قادر بھی گیا۔

قادر اس دن بہت دیر بعد لوٹ کر آیا اور واپس آ کر اس نے ایک ایسی کہانی سنائی کہ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ چوہدری تو بڑا غریب آدمی تھا بابو۔ قادر اس کے پڑوس کے آدمیوں سے ساری باتیں معلوم کر آیا تھا۔ وہ اسی گلی کے ایک بہت پرانے سے مکان میں رہتا تھا مکان سے پہلے وہ سڑکیں وغیرہ بنانے کے ٹھیکے لیا کرتا تھا۔ پڑھا لکھا بالکل نہیں تھا لیکن اس کا کام اچھا خاصا چل رہا تھا۔ پر جب سے ادھر تباہی نازل ہوئی تھی اور مہاجروں کے قافلے آنا شروع ہوئے تھے اس نے کام دھندا سب چوپٹ کر دیا تھا۔ دن رات مہاجر مہاجر کرتا پھرتا تھا۔ محلہ والے اسے چندہ دیتے دیتے تنگ آ گئے تھے لیکن قادر کے سامنے انہوں نے اس کی بے حد تعریف کی۔ دو ایک نے اسے برا بھلا بھی کہا لیکن یہی کہا کہ مہاجروں کے پیچھے اس نے اپنے گھر کا گھروندا بنا لیا ہے۔ اس کے اپنے بیوی بچے کبھی کبھار فاقہ بھی کر لیں لیکن وہ مہاجروں کا راگ گاتے جاتا ہے۔ سب کہتے تھے کہ چوہدری گاما آدمی کے بھیس میں فرشتہ ہے یہ باتیں میں نے قادر سے سنیں تو میں نے بھی کہا کہ واقعی فرشتہ ہے۔ اور بابو اس وقت مجھے بڑا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ ایک یہ چوہدری ہے جو دوسروں کے پیچھے اپنی جان پر بناتے پھرتا ہے اور ایک میں ہوں . . . .

میرے دماغ میں اس وقت ملکندے کی تصویر پھر گئی جس کا ہے رام کہتا ہوا سڑک پر گرا تھا میں نے ہاتھی مارا تھا مجھ سے۔ اور اس نے کہا تھا ہے رام۔ اور حیدر خاں کی بیوی کہتی تھی کہ بھیا اب اوپر آسمان پر خدا ہے اور نیچے زمین پر تم ہو اور میں اس کی کوٹھڑی کو لے کر چلا آیا تھا۔ حیدر خاں کی بیوی پر خدا جانے کیا گزری ہوگی اور اس کے تین بچے تھے۔ پر میں اتنا ظالم آدمی تھا بابو کہ میں نے اپنے شیدو کو اٹھا کر زمین پر پٹک دیا تھا۔ بس قادر کی باتیں سن کر میرے آنسو نکل آئے اور میں نے کہا کہ اب چوہدری کیمپ میں آئے گا تو میں اس کے پیروں پر گر پڑوں گا اور خوب خوب روؤں گا۔

چنانچہ جب وہ اگلے دن کیمپ میں آیا تو میں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے جھک گیا اور رو دیا لیکن اس نے کہا کہ یہ بری بات ہے اور تو مسلمان آدمی کو جوڑنا ہی نہیں چاہئیے۔ بس صاحب تو اس دن سے میں اس کا مطیع ہو گیا۔ اس نے مجھے پھلوں کا ایک ٹھیلہ کرا دیا میں راضی نہ ہوتا تھا۔ میں کہتا تھا مجھے پتہ ہے چوہدری تم بڑے غریب آدمی ہو اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر لاتے ہو لیکن چوہدری نے کہا کہ میں اپنی طرف سے تمہاری کچھ مدد نہیں کر رہا ہوں انسان کی کیا ہستی ہے کہ وہ کسی کے رزق کا انتظام کرے۔ ہاں اگر ضرورت کے وقت کوئی مسلمان اپنے کسی بھائی کے کام آ سکے تو اس سے بڑھ کر خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور اس نے کہا کہ تم پروا نہ کرو میں اپنی بیوی اور بچوں کی طرف سے غافل نہیں ہوں ان کا بھی خدا مالک ہے۔ تو صاحب اس نے مجھے پھلوں کا ٹھیلہ کرا دیا۔ اور قادر کو دودھ لسی کی دکان کرا دی۔ اور اسی طرح پتہ نہیں اس نے اور کتنے مہاجروں کو کیا کیا کرا دیا۔ البتہ یہ پھلوں کا بیوپار میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے اس سے شکایت کی تو اس نے یہ ٹھیلہ ایک دوسرے آدمی کو دلا دیا اور مجھے یہ گھوڑا تانگہ خرید دیا۔ تانگہ ہمارے خاندان میں کبھی کسی نے نہیں چلایا تھا لیکن چوہدری نے کہا کہ آدمی کو کسی پیشے میں عار نہیں ہونا چاہئیے۔ وہ بڑا فرشتہ آدمی تھا بابو اور بڑا غریب آدمی تھا بعد میں مجھے اپنی بیوی سے پتہ چلا کہ اس نے ہم لوگوں کے لئے اپنے گھر کے کوٹھے ... گرڈالے تھے۔ خود میرے تانگہ پر اس کی ایک لوہے کی الماری اور دو چار پائیاں

کیا کیا چیزیں بک گئی تھیں۔ خدا نے اسے زیادہ زندگی نہیں دی اور میں تو کہتا ہوں بابو بس وہ اسی غم میں گھل گھل کر مر گیا کہ جیسے چاہیئے تھی ویسی خدمت اس سے نہیں ہو سکی۔ جب اس کا دم اکھڑ رہا تھا تو میں اور قادر اور دوسرے بہت سے لوگ اس کے پاس موجود تھے بہت رک رک کر کہنے لگا کہ: "بھائیو! اب میرا آخری وقت آگیا ہے لیکن میں اپنے پیچھے کئی امانتیں چھوڑے جا رہا ہوں میری ایک بیوہ بیٹی ہے اور چار اور دوسرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میری بیوی دمہ کی مریض ہے اور بچے ابھی اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ بچوں کے نام کا کچھ روپیہ میں نے بنک میں جمع کر دیا تھا۔ اسے آج تک نہیں نکالا ہے بیٹی بیوہ ہوگئی تو اس کے لئے بھی تھوڑا سا روپیہ میں نے جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بھی ابھی تک جمع ہے۔ اس رقم کو میں اپنی رقم نہیں سمجھتا تھا اس لئے میں نے اسے خرچ نہیں کیا اب دو چار سال تک ان کی گذر بسر ہو جائے گی لیکن پھر بھی ان میں کوئی سمجھدار مرد موجود نہیں ہے اس لئے آپ لوگ میرے گھر کا خیال رکھیں"۔ . . . . . . تو بابو اس کی یہ باتیں سن کر میں تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ قادر مجھے پکڑ کر باہر لے گیا اور اس نے مجھے ایک نئی بات سمجھائی اس نے کہا کہ "رونے دھونے سے اب کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اب چوہدری رونے دھونے سے اچھا نہیں ہو جائے گا اس کا آخیر وقت آپہونچا ہے ہاں اگر اس کی روح کو اطمینان دلانا چاہتے ہو تو اس کی بیوہ لڑکی سے شادی کر لو"۔

میرے اس وقت ہوش ٹھکانے نہیں تھے لیکن قادر نے مجھے بہت بہت سمجھایا تو میں نے کہا چلو اگر چوہدری کو آخیر وقت میں اس طرح کچھ اطمینان ہو جائے تو میں اپنی جان تک دینے کے لئے تیار ہوں تو بس بابو اسی دن چوہدری کی لڑکی سے میرا نکاح ہوگیا۔ اور اسی دن صبح ہوتے ہوتے چوہدری مر گیا۔ مرتے وقت معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس دنیا سے بڑا خوش خوش جا رہا ہے۔ اور بابو اس نکاح سے میری اپنی دنیا بھی سنور گئی۔ بیوی ایسی ہے کہ گھر میں کبھی تو تڑاک کی بھی نوبت نہیں آئی۔ میرا ایک شہد خدا تعالے نے لیا تھا اب اس کے بدلے میں چار بچے دے دیئے ہیں۔ بڑا لڑکا تو اب مکتب بھی جانے لگا ہے سالی سالے بھی ابھی تک پڑھائی پڑھ رہے ہیں۔ ان کا روپیہ میں نے ابھی تک نہیں نکالا ہے۔ بڑے ہو کر آپ نکلوائیں یا کچھ کریں۔ میں تو مرتے مر جاؤں گا مگر امانت میں خیانت نہیں کروں گا۔

پر اس سارے قصہ میں اس بابا کا قصہ تو رہ ہی گیا۔ یہ بابا مجھے ایک سڑک پر بیٹھا ہوا مل گیا تھا۔ ایک پھٹی ہوئی کمبلی اوڑھے بیٹھا تھا اور سردی سے کانپ رہا تھا۔ میرے تانگہ میں ایک آپ ہی کے جیسے رحم دل بابو بیٹھے تھے۔ تانگہ اس کے پاس سے گزرا تو بابو نے جیب سے ایک دونی نکال کر اس کے سامنے پھینک دی۔ اس نے یہ دونی اٹھائی اور بڑے زور سے میرے گھوڑے کے آگے پھینک دی مجھے بڑا تعجب ہوا۔ بابو خفا ہو گئے اور گالیاں بکنے لگے۔ خیر اس وقت تو میں نے ان سے کچھ نہیں کہا لیکن لوٹتے میں جب ادھر سے خالی تانگہ لے کر گذرا تو میں نے اس سے پوچھا کہ بڑے میاں کون ہو اور کہاں سے ہجرت کر کے آئے ہو؟ پر صاحب یہ تو بابا الا آئیں بائیں شائیں بکنے لگا۔ اب آپ جانیے وقت وقت کی بات ہوتی ہے مجھ سے اس کا یوں سڑک پر سردی سے کانپنا نہیں دیکھا گیا اور میں اسے زبردستی تانگہ میں بٹھا کر اپنے گھر لے آیا۔ اب یہ بڈھا مجھ سے اتنا ہل گیا ہے کہ ایک پل کو بھی مجھ سے علیحدہ رہنا نہیں چاہتا۔ میرے بچے بھی اس کے ساتھ بہت ہل گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ خود بچوں جیسی حرکتیں کرتا ہے۔ اب یہ بچپن ہے کہ نہیں کہ آج صبح سے تانگہ کی گدی پر چڑھا بیٹھا ہے۔ اب اس وقت آپ اکیلی سواری مل گئے ہیں ورنہ اکثر جب میں چار سواریاں بٹھانا چاہتا ہوں تو مجھے ایک سواری کا نقصان ہو جاتا ہے پر میں اسے منع نہیں کرتا۔ پتہ نہیں یہ بے چارا اپنے زمانے میں نہ جانے کس شان سے رہتا ہوگا۔ اب تانگہ کی سواری سے اس کا دل ذرا خوش ہو جاتا ہے تو میں اسے منع کیوں کروں۔ لیجئے یہ آپ کی دیانند روڈ کی پریم اسٹریٹ آگئی۔ کہئے کون سے مکان پر رکنا ہے۔ اور سچ کہنا بابو ——— کیسا آپ کو سیدھے رستہ پر لایا ہوں ....."

(حلقۂ ادب اسلامی کراچی میں پڑھا گیا)

(بشکریہ "قاصد")

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان ہی نہ ہو ——— (منیجر)

انوار ظہوری •

اب اختتامِ خوابِ پریشاں ہوا تو ہے

وحدت کا رنگ حسن بداماں ہوا تو ہے — انسان تفرقوں سے گریزاں ہوا تو ہے
رنگِ رخِ حیات نمایاں ہوا تو ہے — پورا نگاہِ شوق کا ارماں ہوا تو ہے
اللہ رے انقلابِ حوادث کے باوجود — اک تازہ انقلاب کا ساماں ہوا تو ہے
یہ مطلعِ نجوم یہ حسنِ طلوعِ شب — مدت کے بعد جشنِ چراغاں ہوا تو ہے
غم تھا نہاں جو ہر نفسِ اضطراب میں — روحِ نشاط بن کے نمایاں ہوا تو ہے
بادل چھٹے ہیں ظلمت والحاد و کفر کے — اعلانِ لا الٰہ کا امکاں --- ہوا تو ہے
ہے دامِ ہر نگاہ جو یزداں شکار آج — ہر اہرمن نژاد پشیماں ہوا تو ہے
اے ارضِ پاک تجھ پہ خدا کی ہوں رحمتیں — کچھ شوقِ صد اشاعتِ ایماں ہوا تو ہے
سب تفرقے مٹے تو ہر اک خاص و عام آج — آزادیٔ وطن کا نگہباں ہوا تو ہے
کچھ فتنۂ کہن کے تقاضے مٹے تو ہیں — دستورِ تازہ حاملِ قرآں ہوا تو ہے
لو دفعتاً کھلے ہیں شریعت کے راستے — اب کوئی صدق دل سے مسلماں ہوا تو ہے
حسبِ اُمید قطع ہوئی ہے شبِ سیاہ — خورشید تازہ رنگ درخشاں ہوا تو ہے
رعنائیاں جلو میں لئے آ گئی بہار — اس بار انبساط کا ساماں ہوا تو ہے
جمہور کو جو دولتِ اسکندری ملی — ہر فرد آج خرم و شاداں ہوا تو ہے

جاگے جو ہیں وطن کو سنواریں گے ایک دن
اب اختتامِ خوابِ پریشاں ہوا تو ہے

بریگیڈیر گلزار احمد •

موتیوں کی مالا

لاہور کے اسٹیشن پر یوں بھی کافی چہل پہل رہتی ہے۔ مگر آج کا سا سماں لاہور تو کیا دنیا کے عظیم ترین ریلوے اسٹیشنوں پر کسی نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ جنگ طویل اور سنگین ترین جنگ ختم ہو چکی تھی۔ خون کی ندیاں بہا کر ملک نے اپنی آزادی برقرار رکھی تھی۔ قوم کے نونہالوں نے کشتوں کے پشتوں سے ملک کی سرحد کے گرد فصیل بنا کر اندرونِ ملک امن و سکون قائم رکھنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی، صحراؤں کی ریت کو حرکت اور دریاؤں کے پانی کو روانی، قوم کی جوان پود نے اپنے خون پسینے کی حدت و حرکت سے جاری رکھی تھی۔ جنگ کے اختتام پر آج اس فاتح و کامران فوج کا پہلا دستہ بیرونِ ملک کے محاذ سے واپس آ رہا تھا۔ اور صبح دس بجے اسے لاہور اسٹیشن پہنچنا تھا، پروگرام کی رو سے گاڑی کو لاہور اسٹیشن پر ایک گھنٹہ ٹھہرنا تھا۔ اور شمال کی جانب سفر جاری رکھنا تھا۔ لوگ پھولوں کے ہار لئے صبح سے گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ گاڑی پہنچنے میں ابھی دیر ہے، مگر کیا کیا جائے کہ انسان جب مدت سے بچھڑے ہوئے جگر گوشوں کی دید سے قلب کی تشنگی مٹانے کے لئے کہیں جاتا ہے تو گھنٹوں.... بلکہ پہروں پہلے ہی پہنچ جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس انتظار کا ایک ایک لمحہ ایک ایک پہر بن جاتا ہے مگر انسانی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ ان حالات میں ذہن کے مقابلہ میں جیت قلبِ مضطر ہی کی ہوتی ہے لاہور کی آبادی سالہا سال سے اسٹیشن پر چہل قدمی کرنے کی عادی ہے۔ لاہور میں یہ رسم بھی پرانی ہے کہ جب کوئی مقتدر ہستی لاہور سے گزر رہی ہو تو نصف لاہور کے قریب اسے دیکھنے اسٹیشن پر موجود ہوتا ہے۔ آج تو حالت ہی اور تھی۔ آج ملک کی فاتح فوج کا پہلا دستہ بیرونِ ملک سے واپس آ رہا تھا۔ آج تو مقامی پلٹنوں کے بینڈ بھی اس دستہ کی سلامی کے لئے موجود تھے۔ سول اور فوجی حکام بھی قوم کے مجاہدوں کو عقیدت کے پھول پیش کرنے آئے ہوئے تھے۔ ایسے میں کون ہوگا؟ جو لاہور اسٹیشن کی اس غیر معمولی چہل پہل کو دیکھنے کا موقع ہاتھ سے جانے دیتا۔ اسٹیشن کا پلیٹ فارم مردوں، عورتوں اور بچوں سے پُر تھا..... رنگ برنگ کے مہین دوپٹے قوس و قزح کا سا سامان پیش کر رہے تھے پھولوں کے انبار اور اس پر مزید بہترین عطر، پوڈر اور سینٹ کی بہتات، اگر یہ کہا جائے کہ خوشبو کے بادل لہرا رہے تھے تو غلط نہ ہوگا۔ منتظر جمِ غفیر کے سیلاب میں زہرہ بھی اسٹیشن کے اگلے حصے میں کتابوں کے اسٹال کے قریب اپنی متاعِ عزیز یعنی اپنے نوجوان شوہر کپتان عزیز مسعود کو ملنے کے لئے نہایت بیقراری سے گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔

زہرہ کے لئے آج کا دن کتنا مبارک تھا۔ عزیز کو محاذ پر گئے تین سال گزر چکے تھے۔ ابھی زہرہ کے ہاتھوں کی مہندی کا رنگ بھی پھیکا نہیں پڑا تھا کہ عزیز فوری بلاوے کی وجہ سے اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس دوران میں اس نے نہ معلوم کون کون سے ممالک دیکھے ہوں گے، اس نے بڑی بڑی مصیبتیں جھیلی ہونگی۔ کئی کئی دن صحرا کی جھلسا دینے والی لُو میں بے آب و دانہ گزارے ہوں گے۔ اختراعات عصرِ حاضر کے تباہ کن ہتھیاروں کا مقابلہ کیا ہوگا۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اس کے باوجود عزیز نے اسے بھلایا نہیں۔۔۔ اسکا ثبوت عزیز کی بلا ناغہ ہفتہ وار ڈاک تھی۔ ہجر و فراق کے ایام میں تو ہفتہ بھر کا وقفہ پہاڑ بنکر اس کے سامنے رہا کرتا تھا۔ مگر آج جب وہ اپنی پچھلے تین سالوں کی تمناؤں کے آخری مراحل طے کر رہی تھی۔ تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ان تین سالوں کے تمام ہفتے بلکہ سارے شب و روز ان روشن چراغوں کی مانند تھے جو اس تمام مدت لمحہ لمحہ کو اپنی ضو سے منور کر رہے تھے۔ اور ان دمکتے چراغوں کی روشنی میں اسے عزیز کی

زندگی کا ایک ایک لمحہ نظر آ رہا تھا۔

فوجی قوانین کی رُو سے عزیز ان ممالک کے نام نہیں لکھ سکتا تھا۔ مگر وہ اپنے گرد و پیش کی اچھی خاصی تفاصیل دے دیا کرتا تھا۔ جس سے زہرہ کو کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیسا ہے۔ اور کس حال میں ہے ۔۔۔ فوجی زندگی تمام تر زحمت و مشقت ہی نہیں ہوتی جنہوں نے فوج کو قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس زندگی کی صعوبتوں میں بھی ایک مٹھاس ہوتی ہے اور پھر مشکل مقامات لامحالہ ہی تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ راحت و آرام کی گھڑیاں بھی تو ہوتی ہیں ان گھڑیوں کو گزارنے کے انداز بھی یہ تنومند اور صحت مند نوجوان ہی جانتے ہیں۔ چنانچہ عزیز اپنے خطوں میں اپنے دوستوں کی رنگین محفلوں کا ذکر بھی کیا کرتا تھا۔ مگر اس کے باوجود زہرہ کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ محاذ جنگ پر عین کشت و خون کے درمیان یہ بہرہ دار رنگین محفلوں سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں وہ ہمیشہ یہی سمجھتی رہی تھی کہ یہ سب کچھ اس کا دل بہلانے کو لکھا جا رہا تھا۔ اسکی نگاہ میں جنگ ایک قیامت خیز منظر کے سوا اور کچھ نہ تھی جس میں ہر سُو موت، تباہی اور آتش بازی ہی نظر آتی تھی۔

عزیز کا تار کل شام پہنچا تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے یہ تار کھولا تھا۔ اسے انگریزی پر خاصا عبور حاصل تھا۔ وہ انگریزی تحریر و تقریر دونوں پر قادر تھی۔ مگر اس تار کے سیدھے سادے مفہوم کو سمجھنے کے لیے اسے یہ تار دوبارہ پڑھنا پڑا تھا۔ عجیب ترین بات یہ تھی کہ دو بار پڑھ چکنے کے باوجود وہ یہ پڑھنا بھی بھول گئی تھی کہ کون ہے جو کل صبح دس بجے لاہور سٹیشن سے گزر رہا ہے اور پھر..... جب اس نے نگاہ نیچی کر کے عزیز کا نام دیکھا۔ تو اسے وہ تمام اشارات سمجھ میں آ گئے جو عزیز کے آخری چند خطوں میں مبہم سی قسم کے ہوا کرتے تھے۔ اور اسکی باچھیں کھل گئیں۔ وہ جلدی سے اٹھ کر عزیز کے ابّا اور امّی اپنے ماموں اور ممانی کو اطلاع دینے کے لیے کمرے سے باہر نکلی۔ کہ اسکے ماموں اسی کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں بھی تار تھا۔ اور وہ بھی آبدیدہ آنکھوں سے مسکرا رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی بولے :۔

"بیٹا، مبارک ہو..... مجھے بھی تار مل گیا ہے" اور زہرہ کی نگاہیں جھک گئیں۔

ہجر کی راتیں لمبی ہوتی ہیں..... ہو انتظار کی گھڑیاں ۔۔۔ الامان ان کا نہ کوئی آغاز ہوتا ہے نہ انجام۔ عجیب و غریب مناظر آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ ایک متحرک تصویر کی طرح یہ مناظر آنکھوں کے سامنے آتے ہیں، اور پھر گزر بھی جاتے ہیں۔ ذہن پر کسی ایک کا نقش بھی پائدار نہیں رہتا اور انسان، دُور آسمان کی بلندیوں سے اپنی اور اپنے عزیز و اقارب کی زندگی پر ناقدانہ سی نظر ڈالتا رہتا ہے۔ اور بار ہا اپنے آپ کو اس سیمین پردہ پر کام کاج میں مصروف دیکھتا ہے۔ زہرہ نے بھی رات بھر میں نہ معلوم کیا کچھ دیکھ ڈالا۔ بچپن کے ایام، والدین کے ساتھ مختلف جگہوں پر جانا، اور پھر جب واپس لاہور آنا تو ماموں کا مکان، وہاں عزیز کا ہر بار موجود ہونا، نامزدگی اور پھر شادی، شادی کے عین بعد عزیز کا ایک لخت رخصت ہو جانا، اس کی جدائی کی یاد سے آج بھی زہرہ کے دل پر ہتھوڑے کی سی چوٹ پڑ رہی تھی۔ یہ جانتے ہوئے کہ عزیز صبح پہنچ رہا ہے۔ جدائی کے خیال نے زہرہ کی طبیعت کو از سر نو مضطرب کر دیا تھا۔ یہ اضطراری کیفیت آہستہ آہستہ رفع ہوئی تو عزیز کے مختلف خطوط آنکھوں کے سامنے آنا شروع ہوئے۔ جدائی کے بعد وہ پہلا خط، کتنا پر حجاب اور مختصر خط تھا وہ، مگر کتنے معانی مضمر تھے ان چند سطروں میں..... اور پھر یکے بعد دیگرے دوسرے خطوں کے مضامین بھی سامنے آتے گئے۔ جوں جوں مدت گزرتی گئی بھی حجابات اٹھتے گئے تھے۔ اور عزیز اپنی زندگی کی تفاصیل زیادہ واضح طور پر پیش کرتا رہا تھا۔ انہیں تفاصیل میں کبھی کبھی جنگ کی تفاصیل بھی ہوا کرتی تھیں۔ وہ غلطی سے دو ایک بار اپنے بھائی کے ساتھ بھی جا چکی تھی۔ وہاں جنگ کی خبروں کے ساتھ تصویروں کو بھی دکھایا گیا تھا۔ توپ و تفنگ، شعلہ و بربادی کا یہ خونی کھیل سینما کی سفید چادر پر دکھایا جاتا تھا۔ آگ، شعلے، ہوائی بمباری کے دھماکے موت، خون اور بربادی، ایسے مناظر دیکھنے کے بعد کئی کئی راتیں مسلسل زہرہ کو خواب میں بھی تصویریں نظر آیا کرتی تھیں۔ اور ہر ایسے بھیانک منظر میں عزیز کا چہرہ اس کی نگاہوں کا مرکز بنا رہتا تھا۔ وہ کئی بار "عزیز"..... "عزیز"..... پکارتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔

اور آج بھی وہ یونہی چونک پڑی۔

مگر اسے یاد آگیا کہ آج تو عزیز کی واپسی کا تار بھی پہنچ چکا تھا۔ اور وہ صبح سویرے خود بھی پہنچ رہا تھا..... وہ اس یاد سے مسکرا پڑی تھی۔ ..... وہ غیر ارادی طور پر اٹھ کھڑی ہوئی۔ آج کی رات نیند کہاں؟ ابھی تو خیالات کو نہ معلوم کہاں کی پرواز کرنی تھی۔ وہ بہت دیر تک پلنگ پر بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے لاہور اسٹیشن کا نقشہ تھا۔ گاڑی اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ عزیز فرسٹ کلاس کا دروازہ کھولے متجسس نگاہوں سے بھیڑ کو چیر کر اسے ڈھونڈھنے کی کوشش کر رہا تھا جونہی نظریں ملیں وہ "عزیز، عزیز" پکارتی ہوئی گاڑی کے پائدان سے لپٹ کر اس کے پاؤں چومنے لگی۔

وہ پلنگ سے گر پڑی تھی۔ اسے خیال آیا۔ آج تو میں جاگ رہی تھی۔ آج پلنگ سے گرنا کیا معنی؟ مگر اس نے اپنی اس حرکت کو ندامت سے نہ دیکھا۔ بلکہ مسکرا کر کھڑی ہوگئی اور کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ صبح کون سی ساڑھی پہنے گی ...... عزیز کہا کرتا تھا..... اور اس نے اپنے آپ سے پوچھا ......" وہ کہا کرتا تھا"

اور وہ کچھ بھی نہ یاد کر سکی۔ ایک، دو، یا دس بیس دن کی بات ہو تو یاد بھی رہے۔ یہاں تو دو سال سے بھی اوپر کی بات تھی۔ .... اور پھر عزیز تو بہت کچھ کہا کرتا تھا۔ وہ تو اس کی ہر بات کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی ......" عزیز کو کون سا رنگ زیادہ پسند تھا..... جب رفیق بھیا کے گھر گئے تھے" اور پھر اسے یاد آیا کہ ان چند مصروف دنوں میں تو عزیز نے اس کی پسند کے سبھی رنگ پسند کئے تھے۔ آخر تنگ آکر وہ بڑبڑانے لگی......

" ارے ساڑھی اور اس کے رنگ میں کیا رکھا ہے۔ مجھے تو ان کی صورت دیکھنا ہے" اور وہ اپنے خیالات کی رَو میں بہتی گئی... اسے تو عزیز کو دیکھنا تھا۔ اسے ملنا تھا اور محبت بھرے دل کا حقیر سا تحفہ پیش کرنا تھا۔ اسے تو اپنی جبین کو عزیز کے قدموں میں جھکانا تھا۔ اس خاک کو آنکھوں پر لگانا تھا جس پر اس کے قدم پڑیں گے۔ اور اس کی آرزو کا معراج تو عزیز کے سانس کی خوشبو سے معطر ہونا تھا۔ اسے ساڑھی اور اس کے رنگ میں پڑنے کی الجھن سے کیا غرض؟ اور وہ جانتی تھی، اسے یقین تھا کہ عزیز ان باتوں کو ہرگز نگاہ میں نہ لائے گا، وہ تو زہرہ کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا کہ اس کے کپڑوں پر نظر کرنے کی اسے فرصت بھی نہ ملے گی ...... بلکہ اس طرف اس کا خیال بھی نہ جائے گا۔ وہ تو زہرہ کے چہرے سے اپنی نظریں ہٹا بھی نہ سکے گا۔ اور وہ مُسکرا دی!

عزیز اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ کہیں خواب تو نہیں تھا اور اس نے خواب میں ہی اپنے آپ سے کہا تھا کہ نہیں یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ کل شام ہی تو تار آیا تھا۔ اور اب وہ آمنے سامنے تھے۔ دو سال کی فرقت، عزیز بالکل ویسا ہی تھا جس طرح کہ وہ رخصت ہونے کے وقت تھا...... ہاں، آج وہ مسکرا رہا تھا۔ اور وہ خود وہ خواب میں قدِ آدم آئینے کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی۔ اس نے چوٹی سے ایڑی تک اپنا جائزہ لیا۔ " کون کہتا ہے میں کمزور ہوں؟ میں تو بھلی چنگی ہوں" اور اس نے دیکھا کہ اس کی رنگت سرخ ہوتی جا رہی ہے۔ اس نے پلٹ کر عزیز کی طرف دیکھا کہ اسکی نظریں اسے کس رنگ سے دیکھ رہی ہیں۔ اسکا سر سرہانے سے نیچے ڈھلک گیا اور اسکی آنکھیں ایک بار پھر کھل گئیں........ جاگتے میں بھی خواب نے اپنا تسلسل قائم رکھا.... "کل ممانی جان بھی تو کہہ رہی تھیں کہ میری آنکھوں کے گرد حلقے پڑ رہے ہیں۔ اگر عزیز نے کہا کہ میں کمزور ہوگئی ہوں تو بھی مسکرا دونگی"

اور وہ سچ مچ مسکرا دی۔

اور پھر وہ سوچ میں پڑ گئی..... عزیز کی گاڑی کو لاہور کے اسٹیشن پر کوئی گھنٹہ بھر کے لئے رکنا تھا۔ ایک گھنٹہ، صرف ساٹھ منٹ پلک جھپکنے میں گزر جائے گا یہ وقت، اور وہ اسے جی بھر کر دیکھ بھی نہ سکے گی...... اور وہ اس سے مل کیسے سکے گی؟ اسٹیشن پر تو سینکڑوں، ہزاروں کا ہجوم ہوگا۔ "مشرقی حجاب، نسوانی شرم و حیا وہ اور میں، اور جمِ غفیر، بھلا ایسے میں ملاقات کیا ہوگی؟"... اور وہ کانپ سی گئی......

نو بجے جب لاہور کے ریلوے اسٹیشن کا ہجوم انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اور پلیٹ فارم پر اب تل دھرنے کو جگہ بھی نہ تھی۔ تو زہرہ بھی اپنے عزیز و اقارب کے درمیان ریلوے بک اسٹال کے قریب کھڑی نوجی خصوصی

گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔

آج ہر شخص مسکرا رہا تھا...... ہر ایک نے گاڑی کے ٹھہرنے سے قریب ترین جگہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی...... مگر کامیابی صرف معدودے چند کو ہوئی تھی۔ رنگ و بو کی اس افراط میں ہجوم اس رنگ و بو سے بے نیاز تھا۔ آج رنگوں کے امتزاج اور پھولوں کی خوشبو کی فراوانی کی طرف توجہ دینے کی فرصت کسی کو نہ تھی...... آج لوگ اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے ملنے کے لئے آئے تھے۔ سامنے معلق گھڑی کی سوئیاں نپی تلی رفتار سے حرکت کر رہی تھیں۔ مگر جیسے لوگوں کو اسکی صحت کا اعتبار نہ آرہا تھا۔ گھڑی گھڑی کلائیاں مروڑ کر اپنی اپنی گھڑی کیطرف لوگوں کی نگاہیں جارہی تھیں...... نظام شمسی کے سیاروں کی حرکت کی طرح گھڑی کی حرکت بھی ایک خاص رفتار کے تحت جاری رہتی ہے۔ اس دور کی ریل گاڑیاں بھی گھڑیوں کی رفتار کی پابند ہیں۔ اور وہ ہماری بے تابیوں کی طرف چنداں توجہ نہیں دیتیں۔ اس روز بھی یہ خصوصی گاڑی اپنے مقررہ وقت پر عین دس بجے پوری آب و تاب اور شاہانہ انداز سے نمودار ہوئی..... اسٹیشن کے پلیٹ فارم کو..... جھنجھوڑتی اور فرش کو تھرتھراتی ہوئی وہ پلیٹ فارم کے سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچی جہاں انجن نے دھوئیں کا سیاہ سفید بادل بلند کیا اور مقررہ جگہ پر پہنچ کر رک گیا۔

زہرہ کا خیال درست تھا۔ عزیز متجسس نگاہوں سے اس بھیڑ کے ایک ایک آدمی کو کھڑکی سے دیکھ رہا تھا...... زہرہ نے اسے دور سے ہی دیکھ لیا۔ اور وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑی رہی..... خواہش کے باوجود وہ اسکی طرف اشارہ کرکے "وہ" کا لفظ ادا نہ کر سکی۔ بالآخر عزیز نے انھیں دیکھ ہی لیا۔ عین اسی وقت زہرہ کے بھائی رفیق نے ہاتھ بلند کرکے رومال ہلایا اور عزیز کی مسکراہٹ اسکا جواب بن کر ان تک پہنچی۔ جب عزیز کا ڈبہ ان سے آگے گزر گیا تو وہ سب غیرارادی طور پر اسی طرف چلدیئے۔

زہرہ بھی غیر شعوری طور پر اسی طرف جارہی تھی۔ اس بے پناہ بھیڑ کو چیر کر راستہ بنانا بھی مشکل کام تھا۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح چلی جا رہی تھی...... خیالات میں ایک ہیجان، ایک تلاطم بپا تھا۔ گاڑی رک چکی تھی۔ عزیز ڈبے سے نکل کر ان کے سامنے کھڑا تھا اور اباجان اس سے بغل گیر ہورہے تھے، معاً زہرہ کے قدم رک گئے اور اسکی نظریں جھک گئیں...... نگاہیں جو مدت سے دیدار کی پیاسی تھیں۔ اب ان کو عزیز کے چہرے پر پڑنے کی اجازت تک نہ تھی۔ اسے اپنی خواہش اور اس کی تمام باریکیاں یاد تھیں...... اسے خوب یاد تھا کہ وہ اسکے دیدار کی پیاسی تھی۔ وہ کیسے بھول سکتی تھی کہ پہروں اس نے عزیز کے ساتھ پہلی ملاقات کی گفتگو کی مشق کی تھی۔ وہ کیا کہے گا اور زہرہ اسکے سوالوں کا کس طرح جواب دیگی۔؟ وہ خود اس سے کون کون سی باتیں پوچھے گی؟

"وہ آتے تو یوں کہتے...... وہ آتے تو یوں کہتے" ...... اور آج وہ آچکا تھا۔ اس کے سامنے کھڑا تھا، اباجان سے گلے مل چکا تھا...... رفیق بھائی بھی بغلگیر ہوچکے تھے۔ اماں جان بھی اسے پیار کرچکی تھیں... احباب بھی مل رہے تھے، نوکر ملازم تک معانقہ کر رہے تھے۔

"کیا میں ہی وہ بدنصیب ہوں جو تین سال کے بچھڑے رفیق حیات سے ملنے سے قاصر ہوں، اور تو اور اپنے خیالات کے اظہار سے بھی ناقابل ہوں، تو یہ بھی نہیں پوچھ سکتی کہ عزیز کیسے ہو تم؟"

اس خیال سے سینے کے زیر و بم میں مزید اضافہ ہوگیا تنفس تیز سے تیز تر ہوتا گیا اور انگلیاں بے چینی سے موتیوں کی مالا سے کھیلنے لگیں۔ خیال نے پھر تمام حدوں کو عبور کرنیکا تہیہ کرلیا اور اسے یاد آیا کہ وہ تو صرف عزیز کے قدموں کی خاک چھونا چاہتی تھی۔ وہ تو صرف اسکے پیروں کو اپنے ہاتھوں سے مس کرنا چاہتی تھی، اسکی کوئی اتنی بڑی آرزو تو نہ تھی، اور اسکی نظریں عزیز کے قدموں پر گڑ گئیں۔ وہ اب ہر ایک سے مل چکا تھا۔ اور اب اسکی نظریں زہرہ کے تمتماتے ہوئے چہرے پر تھیں۔ اور جسم کی سطح کو چیر کر اس کے دل تک پہنچ رہی تھیں۔

زہرہ کے ہاتھ مالا سے کھیلتے کھیلتے رک گئے اور پھر...... معاً مالا کا تاگا ٹوٹا ...... اور ...... موتی عزیز کے پاؤں میں بکھر گئے......

زہرہ "میرے موتی" کہتی ہوئی عزیز کے قدموں میں جھک گئی...... ×

(بشکریہ "ہمایوں")

ابنِ محمود ●

؟

خدا لگتی ذرا کہنا کبھی ہم یاد آتے ہیں
کبھی جب بھی سرِ مژگاں ستارے جھلملاتے ہیں

کبھی تنہائیوں میں پاس جب کوئی نہیں ہوتا
دلِ تخئیل میں بنکر خلش سی ہم در آتے ہیں

نکل جاتی ہیں کیا اب بھی کبھی بیساختہ آہیں
ہجومِ غم میں کیا اب بھی کبھی لب تھرتھراتے ہیں

کبھی سوئے فلک اٹھتے ہوئے بہرِ دعا اب بھی
تمھارے ہاتھ خوفِ یاس سے کیا کانپ جاتے ہیں

رئیس باغی ●

○

بنائے شیون و ماتم کسی کو کیا معلوم
رئیسؔ! کیا ہے مجھے غم کسی کو کیا معلوم

زمانہ واقفِ آوارگیِ شبنم ہے!
مگر حقیقتِ شبنم کسی کو کیا معلوم

وفا کی ہوتی ہے توہین اشک ریزی سے
سکونِ دیدۂ پرنم کسی کو کیا معلوم

عروج بیں ہیں نگاہیں ازل سے دنیا کی
بنائے پستیِ آدم کسی کو کیا معلوم!

یہ جلتے تنکے مرے آشیاں کے واقف ہیں
بہار و برق کا عالم کسی کو کیا معلوم

جبینِ شوق پہ کیوں طعنہ زن ہیں اہلِ جہاں
مآلِ سجدۂ پیہم کسی کو کیا معلوم

علی احمد شاہدی •

بڑی ماں

ہم سب کو ہمیشہ سے بڑی ماں کی فارسی دانی پر رشک رہا ہے فارسی دانی اور علمیت تو درکنار ان کی شیریں کلامی اور شگفتہ بیانی کا سارے خاندان میں شہرہ ہے۔ ایک بار جو تبادلۂ خیالات کر گذرتا ہے سراہے بغیر نہیں رہتا۔ مہینوں ان کی فصیح و بلیغ گفتگو کا مزا لیتا اور اپنی کم مائیگی کے احساس سے دبا چلا جاتا ہے۔ نئی نسل کا کتنا پڑھا لکھا فرد کیوں نہ ہو ہمیشہ علمیت اور وسعتِ معلومات میں بڑی ماں کا پلڑا ہی بھاری رہا۔

بڑی ماں کو تقریر کرنے، پند و نصائح کے پل باندھنے اور ستھرے ستھرے الفاظ اور میٹھی میٹھی کہاوتیں سنانے کا بھی ملکہ ہے یہی وجہ ہے کہ گھر کے نوجوان لڑکے بالے ان سے کنی کاٹتے ہیں۔

بڑی ماں کو دیکھ کر معاً یہ خیال گزرتا ہے کہ کوئی مقدس روح کوثر میں نہا کر دنیا کے اس آلائش خانے میں اتر آئی ہے یا راسے کے دوسرے پہر سفید براق لباس پہنے چاندی کے سائے میں کوئی نوری مخلوق محو پرواز ہے۔ بڑی ماں کی پیشانی تقدس پیار اور تقوے کے نور سے دمکتی رہتی ہے اور ان کے چہرہ کا پاکیزہ عکس دیکھنے والے کے دل پر اس طرح منعکس ہوتا ہے جیسے اندھیرے میں نور کی کرن۔

سر اور کانوں پر لپٹا ہوا اجلا دودھ جیسا دوپٹہ، پہنچوں تک آستین اور گھٹنوں تک کالا صاف دھلا کرتا۔ سفید شرعی پاجامہ پیر میں کلکتیہ سلیپر ——— صحن میں ٹہلتی رہیں گی۔ شام کا جھٹ پٹا ہوگا۔ وہ مقدس روح کی طرح وضو کریں گی۔ اور فرشتوں کی سی طہارت سے نماز ادا کر کے صحن میں پھر رسان رسان ٹہلنے لگ جائیں گی۔

جاوید پڑھتے پڑھتے بور ہو کر ذرا صحن میں نکل آئے۔ بڑی ماں نے سر اٹھا کر انہیں یوں دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں اور پھر فارسی کا ایک شعر نوکِ زبان سے ڈھلک کر ہونٹوں پر آ گیا ؎

مدت شادی و غم نیست برابر بہ جہاں — گریۂ شمع شبی خندۂ صبح است و بس

"جاوید میاں بھلا اس شعر کا مطلب تو بیان کر دیجئے" بڑی ماں نے شفقت بھری مسکراہٹ سے کہا۔ جاوید بھائی جھلا اٹھے۔

"بڑی ماں ——— آپ تو ———"

"مطلب پوچھتی ہوں بیٹے۔ ترکیب نحوی تھوڑی کرا رہی ہو

جاوید بھائی نے کوئی جواب نہ دیا۔

بڑی ماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "اب کس جماعت میں ہو بیٹے؟"

"بی اے فائنل میں" جاوید بھائی چیں بجبیں ہو کر بولے۔

"یعنی چودھویں جماعت میں نا بیٹا" بڑی ماں کی پیشانی پر تحیر کی شکنیں ابھریں۔ "تم نے تو فارسی مضمون لیا ہے بیٹے؟"

"آپ کو ہمارا فارسی کا پروفیسر ہونا چاہئے تھا بڑی ماں" جاوید بھائی سلگ اٹھے۔

اچانک بڑی ماں کی حمیت کو جیسے ٹھیس لگی۔ چہرہ پر سنجیدگی اعتماد کی درشتی عود کر آئی اور احساسِ تفاخر سے ان کی خمیدہ گردن کا جھکاؤ ایک لمحے کے لئے غائب ہو گیا۔

"پروفیسر ——— نہیں بیٹے پرنسپل ——— میرے پاس تمہارے اس زمانہ کی سند ہوتی تو میں تمہارے کالج کی پرنسپل ہوتی۔ تمہاری اس درسگاہ کی جس کے معلموں نے تمہیں علمیت اور لیاقت کے گوہروں سے محروم رکھا ہے"

یوں تو بڑی ماں طبعاً شگفتہ مزاج ہیں اور بشاشت ان کے چہرہ پر ہمہ وقت کھیلا کرتی ہے لیکن جب وہ خطابت کے موڈ میں ہوتی ہیں تو ان کے چہرے کی متانت ایک ایسی کرب آگیں کیفیت میں تبدیل ہو جاتی ہے کہ دیکھنے والا محسوس کرتا ہے جیسے بڑی ماں کسی روحانی درد میں مبتلا ہیں جو چہرے پر عیاں ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا بلکہ بعض حساس طبیعتیں

چی

کے طور پر درد کی ٹیسیں بھی محسوس کرتی ہیں۔
لیکن یہ نئی نسل کے لوگ ہیں جو بڑی ماں کی بوڑھی لیکن ستھری
ں میں آنسو دیکھ کر بھی مسکرا لیتے ہیں۔ کیونکہ نئی نسل کو بڑی ماں نے
معاف نہیں کیا۔ یہ لوگ بڑی ماں کے علمی و فکری تازیانوں کی ضربوں
ملا اٹھتے ہیں اور ان کی باتوں کے دلخراش نشتر نئی روشنی کے لڑکے بالوں
جھوٹی انا اور خودی کی دھجیاں بکھیر دیتے ہیں اور یہ اپنے علم و لیاقت کی
ریں لئے کھڑے رہ جاتے ہیں۔

"پڑھ لکھ کر تم نے اپنی ذات کو نہیں پہچانا میرے بچو۔ تم انسانیت
ادنیٰ سطح سے بھی گر گئے ہو میرے لعل۔ علم سے تو کردار کو جلا ملنی چاہئے تھی
سعدی کی گلستاں بوستاں پڑھ کر یوں سمجھتے تھے بیٹے کہ ہماری آنکھیں
ش ہو رہی ہیں۔ یہ کرشمہ تھا گلستاں بوستاں کا؟ نہیں بیٹے! یہ ہمارے
ناد کا درس اخلاص تھا جو ہمیں روشنی دکھاتا۔ آج تمہارے کتنے معلم ہیں
خلوص کی شمعیں اپنے دلوں میں روشن کر کے تمہاری جماعتوں میں آتے ہیں"

بڑی ماں بات کہیں گی اور متاسفانہ انداز میں اپنا سر ہلاتی
ہیں گی۔ ٹھنڈی سانس بھریں گی۔ چہرے پر گہری سنجیدگی گھل جائے گی
جیسے ان کی ایقان و آس کی قوتیں پسپا ہو رہی ہوں۔

اور گھر کے نوجوان لڑکے بالوں کو یہ قطعی ناپسند ہے کہ بڑی ماں
ہیں قدم قدم پر ان کی کم مائیگی کا احساس دلاتی رہیں اور خوش فہمیوں
کے خوابِ رنگیں سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگائیں۔

چونکہ بڑی ماں نے اس خوابِ رنگیں کا طلسم کچی نیند ہی میں توڑ
دیا ہے اس لئے ساری نئی نسل کڑوے تیور اور سرخ آنکھیں لئے بپھر کر اٹھ
کھڑی ہوئی ہے ——— ہمیں کچی نیند میں کیوں جگایا ہے؟
ہمارے شیریں خواب کے شیریں لمحوں کو یہ کس نے جھنجھوڑا۔

احساسِ انا کی آگ کو کم مائیگی اور کمتری کے خشک پتے ہوا دینے
لگے۔ تدبیروں اسکیموں اور سازشوں نے جنم لیا۔ نئی نسل کے نئے نئے بچے
سر جوڑ کر بیٹھے۔ "ہماری خودمختاری پر حملہ ہے۔ ہماری خودارادیت کی را
رک رہی ہے۔" اور سب ایک مکمل سازش کے تحت بڑی ماں کے گرد جمع
ہو گئے۔ یہ پہلا حملہ بولا گیا ——— جاوید بھائی بی اے۔ شفیق چچا متعلم
ایم اے۔ آپا عقیلہ لا اسٹوڈنٹ اور شکیلہ بھابی سخن گو، سخن سنج بس یہ تھیں

تو بابھی شریک نہ تھیں۔ انہیں زندگی سے بیزاری کا غم ہی دم نہ لینے دیتا
تھا بس تیور چڑھے رہتے۔ بچوں کو دھواں دھواں پیٹا کرتیں۔ اپنی جان
کو کوسا کرتیں۔ رویا کرتیں ایک ہنگامہ گریہ یا شکِ بپا رہتا۔

بڑی اماں نے آخری سجدہ کیا۔ سلام پھیرا۔ تسبیح کے دانے کھٹکھٹائے
اور جائے نماز تہہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کی بوڑھی شفقت بھری
ستھری آنکھیں اٹھیں۔ وہ سب سامنے کھڑے تھے۔

"تم سب آج اکٹھے کہاں سے چلے آ رہے ہو۔ میرے لالو" تو بڑی
ماں سب کو یکجا دیکھ کر مسرت سے کھل اٹھیں جیسے صبح کی پہلی کرن کے
ساتھ باغباں چٹکے ہوئے غنچے دیکھ کر مسکرا پڑتا ہے۔

باغباں کو نہ پودوں سے بیر ہوتا ہے نہ گلشن سے بلکہ ان
ہواؤں سے جو اپنے دوش پر خزاؤں کے زرد سائے لے آتی ہیں اور ان
لمحوں سے جو پھولوں کا رنگ دلوا اڑائے جاتے ہیں۔ بڑی ماں جانتی
تھیں یہی غنچے کل بہار کی نوید لائیں گے۔

"کچھ باتیں پوچھنا ہے بڑی ماں"

"پوچھو بیٹے"

"ایک مقالے میں حوالے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ مثنوی مولانا
روم میں حکایتوں کی کل تعداد کیا ہے اور مثنوی کا سالِ تصنیف معلوم
کرنا ہے۔" جاوید بھائی نے پہل کی۔

بڑی ماں مسکرائیں ——— شفیق مسکراہٹ

"ایک فارسی سہ بیت ہے۔ بڑی ماں اس کا مطلب سمجھ میں
نہیں آیا۔" شکیلہ آپا نے دوسرا وار کیا۔

"سہ بیت پڑھو بیٹی" چنانچہ شکیلہ نے پڑھا اور بڑی ماں نے
کئی لفظوں کا تلفظ صحیح کرایا اور شکیلہ خفیف ہو ہو گئیں۔

"شاہ نامہ فردوسی کے اشعار تو یاد ہوں گے بڑی ماں" عقیلہ
آپا کا سوال تھا۔

"کوئی مصرعہ پڑھو بیٹی اس کے آگے کے بیس پچیس شعر تو سنا ہی
دوں گی۔"

اور بڑی ماں نے سمجھا سمجھا کر شفقت اور محبت سے لڑکے بالوں
کی جھولیاں علم اور معلومات کے موتیوں سے بھر دیں۔ تب بھی یہ لوگ

خرمیت کے شدید احساس سے مرجھا گئے۔ نئی نسل کے گرگٹ نے رنگ بدلا اور یہ طنز تمسخر استہزا، کا تیکھا رنگ تھا۔ جو قدم قدم پر بڑی ماں کے میٹھے بولوں، پاکیزہ کہاوتوں اور شگفتہ تشبیہوں کے لطیف رنگوں سے الجھنے لگا بڑی ماں نماز پڑھ کر اٹھیں اور تسبیح کے دانے کھٹکھٹانے لگیں

"بڑی ماں" اللہ میاں کو ذرا تو دم لینے دیجئے کہاں تک آپ کے حصے کی ثواب کی بوریاں بٹورے جائیں" عقیلہ ایل ایل بی نے طنز کی۔

بڑی ماں کی پر نور پیشانی پر ذرا بل نہ آیا۔

"اس کارساز حقیقی کو فرصت کیا سنی بیٹی" وہ کارخانہ ارض و سما کا والی ہے، اس کی رحمت ذرہ ذرہ پر نگراں ہے بچی"

اور عقیلہ آپا نے یوں محسوس کیا جیسے بڑی ماں کے یہ چند الفاظ روشنی بن کر دل کے اندھیارے میں جگمگانے لگے ہیں۔

دھیرے دھیرے یہ طنزیہ استہزائی نسل کا معمول بن گیا سب کے سب وقت بے وقت مل بیٹھتے اور بڑی ماں ان کے کچوکے یوں تحمل محبت اور شفقت سے سہتیں جیسے نور کے سیلاب میں اندھیاروں کی لہریں تحلیل ہو جاتی ہیں اور نئی نسل کی انانیت زخمی ہو جاتی۔ اور خودی کی آنکھیں طیش سے سلگ اٹھتیں احتجاجی آوازیں بلند ہوتیں۔

"بڑی ماں ہم کوئی ایسے نادان نہیں ہیں کہ آپ ہمیں اٹھتے بیٹھتے درس دیتی رہیں۔ ہم بصیرت اور بصارت میں اگلے وقتوں کے لوگوں سے برتر ہیں بڑی ماں ——— بڑی ماں آپ ہماری روشن خیالی اور آزادیٔ فکر کی تعریف نہیں کرتیں۔ بس کیڑے ہی نکالا کرتی ہیں دیکھئے بڑی ماں ہم نے فیشن، تعلیم اور سائنس میں کس قدر ترقی کر لی ہے اب زندگی کتنی ہنگامہ پرور، کتنی پرلطف، بارونق اور خوشگوار ہو گئی ہے ——— بڑی ماں اب اگلے وقتوں کی خاموشیاں اور حماقتیں دیکھنے میں نہیں آتیں ———"

بڑی ماں یہ تیز و تند جملے سنے جاتیں اور ان کے چہرے پر وہی کرب ناک کیفیت، آنکھوں میں وہی درد اور پیشانی پر وہی تلخی عود کر آتی، جو اکثر ایسے موقعوں پر دیکھنے میں آتی ہے جیسے ان کی روح کو کوئی مسوس رہا ہو، جیسے امید کے روغن سے جلتے ہوئے محبت کے دیئے ٹمٹمانے لگے ہوں اور بڑی ماں اپنی روح کی گہرائیوں سے بولنے لگتیں، آنکھوں کا درد بڑھ جاتا اور غم کی تلخی چہرے پر بکھرنے لگتی۔

"میں اپنی جوانی میں اتنی بصیرت و بصارت والی نہ تھی میری بچیو تم اس وقت کے کنبے کے کنبوں کو بے بصیرت قرار دے سکتی ہو۔ یہ تمہارے اپنے ضمیر کی آواز نہیں ہے۔ ہم جیسی کچھ تھیں میری لاڈلیو لیکن ہماری روحیں ناپاک نہ تھیں۔ ہمارے باطن بھرپور تھے۔ ہمارے ظاہر تابندہ تھے ———" بڑی ماں سانس لینے کے لئے رکیں۔

"میری جوانی کے وقت کی کنواریوں کی آنکھوں میں لاج کی سرخی تھی۔ معصومیت کے اجیالے تھے۔ تقدس کا نور تھا۔ ——— ہم اس بے دردی سے اپنے جسموں کو عریاں نہ کر سکتے تھے" بڑی ماں نے ہولے سے دوپٹہ سر پر سنبھالا۔

"یہ سچ ہے میری بیٹیو کہ ہماری زندگی میں آج کے سے ہنگامے نہ تھے۔ آج کی سی رونق نہ تھی، فیشن نہ تھا۔ لیکن اب زندگی میں چاندنی کا سا وہ سکون کہاں ——— وہ ٹھنڈک کہاں جہاں روح اپنے زخموں پر سکون کے پھاہے رکھتی تھی ——— وہ خلوص صداقت اور سچائی کہاں ملے گی۔ تم نے زندگی کے چمن زار کو اجاڑ کر کاغذ کے رنگین پھولوں سے سجایا ہے۔ جن میں سادگی نہیں، نفاست اور بو باس نہیں ——— ایسے ہنگامے تم نے کر کیا کرو گی جو روح کا سکون مٹا دے جو زندگی کو کانٹوں کے بستر پر سلا دے ——— تم سب سچائی کی تلاش کا دعویٰ کر رہی ہو۔ سکون و مسرت کی تلاش میں بھٹک رہی ہو۔ وہی مسرت وہی سکون جو ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں" بڑی ماں نے آنکھیں اٹھا کر دلو طلب نگاہوں سے سب کو دیکھا۔

"میری لاڈلیو تمہاری نگاہوں کی حیا تمہارے مصنوعی عطروں کی خوشبو کی طرح اڑ گئی ہے ——— جہاں حیا ہے وہاں تقدس ہے پاکیزگی، خیال ہے، طہارت عمل ہے۔ رفعت فکر ہے" اور بڑی ماں کی آنکھوں میں ہم نے وہ دکھ دیکھا جو دلوں کو رلاتا ہے۔

"میری نادان بیٹیو! تمہاری روحیں آلائشوں سے پاک نہیں ہیں۔ دل آئینے نہیں ہیں نفس صبح کے اجیالے نہیں ہیں تم نے وہ شب چراغ بجھا دیئے ہیں جو زندگی کے سیاہ خانے میں نور بکھرتے تھے

اب یوں محسوس ہوتا تھا کہ بڑی ماں کی آنکھوں کا درد پھوٹ جائے گا۔ ان کی تقریر جاری تھی کہ باجی نے ننھی کو مارنا شروع کیا طمانچوں اور تھپیڑوں کی آوازوں سے کمرہ گونج اٹھا۔

"ہم نے تم کو محبت کی سیج پر پالا ہے۔ شفقت کے گہوارے میں جھلایا ہے۔ پیار کی آغوش میں تمہاری پرورش کی ہے اور تم نے ہماری فطرت سے ذرا بھی اکتساب نہ کیا۔ ہم نے تم کو محبت کرنا سکھایا۔ تم یہ سبق بھول گئیں۔ دیکھو میری بچیو یہ جو اندر دھما چوکڑی ہو رہی ہے۔ وہ میری کوکھ کی تخلیق ہے جو اپنی اولاد کا خون پی رہی ہے۔ پیٹ پیٹ کر ہی معصوم کو چھلنی کر چکی ہے۔ ہم نے تمہارے ہونٹوں کو مسکراہٹ بخشی۔ تمہارے رخسار کو شفق کی سرخی دی تھی، تم اپنی اولادوں سے یہ سب کچھ چھین رہی ہو ان کے ننھے دلوں پر چرکے لگا رہی ہو۔"

اتنے میں ننھی درد سے تلملاتی۔ ننھے ہاتھوں سے پیٹھ سہلاتی.. زار و قطار روتی دوڑی چلی آئی ——— "نانی ——— نا ——— نی نانی"، اس کے رخسار آنسوؤں میں نہائے ہوئے تھے۔ بڑی ماں نے محبت سے باہیں پھیلا دیں اور ننھی گریہ و زاری کرتی ان کے گلے سے لپٹ گئی۔

"دیکھو میری بیٹیو، ننھی روح کیسی بلک رہی ہے۔ کیسا تڑپ رہی ہے اس ننھی سی جان کو تم محبت کا راگ نہیں سنا سکتیں۔ پیار کی لوریاں نہیں دے سکتیں۔ ہم نے تو تمہیں پیار کی سیج پر پالا تھا۔ محبت کے چراغ جلائے تھے۔ دیئے روشن کئے تھے۔ یہ سوچ کر کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے دیئے سے دیا روشن ہوتا ہے ——— خدا کے لئے میری بیٹیو.. ان چراغوں کو نہ بجھاؤ۔ ان دیوں کو نہ پھونکو ورنہ اندھیاروں میں محبت کھو جائے گی۔ پیار منہ چھپا لے گا ——— میری بچیو۔"

یہ کہتے کہتے بڑی ماں کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اور ستمری مشفق آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔

ان کی بیچ پُر ضبط کا خول پاش پاش ہو گیا نئی نسل کی بیچ کانپی سب کے سب جھن میں آ گئے۔ تھوڑی دیر گم سم خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا کئے اور پھر سب ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑے

"بڑی کامیاب اداکارہ ہیں۔ بڑی ماں۔"

(بشکریہ "عصمت")

شعلہ آسیونی •

"نقوشِ جاوداں"

کھلیں گے لاکھ گل نکہت بداماں ہم نہیں ہونگے
بہاریں آئیں گی رقصاں غزلخواں ہم نہیں ہوں گے

سنواری جائیں گی زلفِ پریشاں ہم نہیں ہونگے
نہ جانے کون ہوگا پابہ جولاں ہم نہیں ہوں گے

بجھائی جائے گی شمعِ فروزاں ہم نہیں ہونگے
سحر چھیڑے گی پھر سازِ رگِ جاں ہم نہیں ہوں گے

کرن مہتاب کی کھیلے گی انکی زلف پیچاں سے
دہک اٹھیں گے رخسارِ شبستاں ہم نہیں ہوں گے

اگر چھائی کبھی کالی گھٹا گھر کر فضاؤں پر
اتر جائے گا ماہِ روئے تاباں ہم نہیں ہوں گے

مخاطب ہم ہیں سامانِ چراغاں کرنے والوں سے
اندھیری ہی رہے گی بزمِ جاناں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے غم کے افسانے سنائے جائیں گے ہر سو
جنوں ہوگا گریباں در گریباں ہم نہیں ہوں گے

چلے آؤ اگر پاسِ وفا کچھ بھی ضروری ہے
جو پھر ابھری بھی نبضِ بادو باراں ہم نہیں ہوں گے

چھلکنے کے لئے ترسے گی صہبا چشمِ ساقی میں
جو شعلہ درمیانِ بزمِ رنداں ہم نہیں ہوں گے

تذکرے اور تبصرے

"نونہال" کراچی:

قیمت اشاعت خاص۔ دس آنے

سالانہ چندہ:۔ ایک روپے آٹھ آنے

ہمارے پیش نظر نونہال کی خاص اشاعت "افریشیا کی کہانیاں" ہے۔ جس میں افریقہ ایشیا کے تیرہ ملکوں کی دلچسپ کہانیاں پیش کی گئی ہیں یوں تو بچے کہانیاں پڑھتے رہتے ہیں لیکن یہ اشاعت بچوں کے لئے اس اعتبار سے یقیناً دلکش اور مفید ہوگی کہ وہ نہ صرف ان ممالک کے نام ہی سے متعارف ہوں گے بلکہ ان کہانیوں کے ذریعہ وہ ہر ملک کے انسانوں اور ان کے طرز زندگی سے بھی کچھ نہ کچھ ضرور آشنا ہو جائیں گے۔ شاید بچوں کے لئے اس طرح کی یہ پہلی کوشش ہے اور قابل مبارکباد ہے کہانیوں کو بڑے سلیقے سے منتخب کیا گیا ہے۔

(م۔ خ۔ ت)

"شاہوار" (لاہور) کا افسانہ نمبر

قیمت:۔ ایک روپیہ

سالانہ چندہ:۔ چار روپے

آج کل کچھ ایسی ہوا چلی ہے کہ ہر پرچے والا یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ سوائے مقبول عام اور چوٹی کے ادیبوں کے اور کسی کی بھی نگارش اسکے معیاری ہونے کا ثبوت نہیں ماہنامہ شاہوار نے اس پرانی روش سے ہٹ کر اپنا افسانہ نمبر ترتیب دیا ہے۔ مرزا ادیب کے علاوہ اکثر لکھنے والے نوجوان افسانہ نگار ہیں۔ جن کی امنگیں۔ جن کا فن اور انداز نگارش بھی کچھ نہ کچھ نیاپن ضرور رکھتی ہیں۔ بہر حال اس مجموعہ کو دیکھ کر اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ ادب میں جمود نہیں رہا۔ ویسے اس کوشش کو شاہکار تو نہیں کہا جا سکتا نہ ہی اس میں اتنی غیر معمولی صلاحیتیں ہیں کہ اسے اردو ادب کے کسی دور میں جگہ ملے۔ پھر بھی ہم شاہوار کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں (ا۔ا)

"معیار" کا خاص نمبر

ماہنامہ معیار تعمیری ادب کی جو خدمات سرانجام دے رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہیں اس وقت تعمیری ادب کی ترجمانی کے لئے جتنے جرائد شائع ہو رہے ہیں ان میں معیار بلا شبہ ایک امتیازی معیار کا حامل ہے۔ اپنے موضوعات، مواد اور ترتیب کے لحاظ سے عام ادبی پرچوں میں اس نے بہت ہی جلد اپنی سا کھا ور وقار قائم کر لیا ہے۔ زیر نظر شمارہ اس ماہنامہ کا "خاص نمبر" ہے جو ان ادبی نگارشات پر مشتمل ہے جو علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک ادبی اجتماع میں تعمیر پسند ادیبوں کی جانب سے پیش کی گئی تھیں۔ ان میں جامعہ علی گڑھ کے بعض ممتاز اساتذہ اور ادبی حلقوں کی معروف شخصیتوں نے حصہ لیا ہے اور مختلف پہلوؤں سے تعمیری ادب کی اقدار پر روشنی ڈالی ہے خاص طور سے ضیاء احمد بدایونی ریڈر شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا خطبۂ صدارت مختصر جامع اور فکر انگیز ہے۔ اصغر علی عابدی ہمارے جانے پہچانے ادیب تھا انہوں نے ادب اور تمدن کے موضوع پر نہایت سلجھی ہوئی بحث کی ہے۔ اور پھر انہوں نے ادب کو تین عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے:۔

۱۔ خالق تمدن۔ ۲۔ مخلوق تمدن۔ ۳۔ اور تمدن۔

یہ تیسری اصطلاح یعنی صرف تمدن عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے صرف تمدن سے کسی ادبی نقطۂ نظر کی طرف ذہن نہیں جاتا اس مقام پر وہ عکاس تمدن یا مظہر تمدن لکھ سکتے تھے۔

"پھر فضا مسکرانے لگی" ابن فرید کا افسانہ ہے، ابن فرید ماحول کی صورت گری بڑی چابکدستی سے کرنے لگے ہیں اور اس خصوص میں ان کا فن بہت ہی نکھر چلا ہے لیکن ابن فرید کے کردار سوچتے بہت ہیں اور یادوں تصوروں میں گم نظر آتے ہیں۔ حرکت اور عمل سے بڑی حد تک عاری نظر آتے ہیں۔ جس خوبی سے وہ پس منظر کھینچ دیتے ہیں اگر اسی خوبی

سے کرداروں کے عمل اور حرکت کی تصویر کشی کرسکیں تو ان کے پلاٹ کہیں زیادہ جاندار ہو جائیں گے اس افسانہ میں بھی ایسی کمی محسوس ہوتی ہے اور دوسری کوتاہی افسانہ کے نتیجہ میں نظر آتی ہے پورا پلاٹ جس صبر اور تحمل سے مرتب کیا گیا ہے نتیجہ اتنی ہی جلد بازی سے پیش کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ بالکل ہی غیر متعلق اور برا اور پراسا لگتا ہے۔

مجموعہ کی سب سے زیادہ جاندار کہانی م۔ نسیم کی "انتہا سے پہلے" ہے اور قرۃ العین حیدر، حجاب امتیاز علی کے "بالا نشین ادب" (اونچے طبقہ کا عکاس) کی صف میں ایک مختلف مقصدیت کو بڑے فنکارانہ حسن کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ پلاٹ۔ طرز ادا۔ کردار۔ ماحول۔ مکالمہ۔ نفسیاتی تجزیہ اور مقصدیت تقریباً تمام تر اجزا پوری مناسبت اور ہم آہنگی سے پائے جاتے ہیں۔ میں اس کو تعمیری نگارشات میں ایک "مثالی تجربہ" کا نام دیتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں۔ صرف اس کا اختتام ہی موضوع بحث بن سکتا ہے۔ ابن فرید نے اپنے پلاٹ میں سے زبردستی کھینچ کھانچ کر ایک نتیجہ ابھارنے کی کوشش کی تھی اور م نسیم پلاٹ سے خود بخود نکلے ہوئے اچھے خاصے نتیجہ کو دور تک زبردستی گھسیٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اور وہ ربڑ کی طرح مصنف کے ہاتھ میں کھنچا ہوا نظر آتا ہے اور بڑے روایتی انداز میں دو بول پڑھ کر ہیرو اور ہیروئن کو رشتۂ ازدواج میں باندھے بغیر ان کو یہاں چین نہیں پڑا جس کی وجہ سے کہانی اپنے اختتام پر ذہن کو چونکاتی نہیں بلکہ وہ ایک دھیمی رفتار سے چلتے ہوئے جاتی ہوئی منزل پر چپ چاپ رک جاتی ہے حالانکہ پورے پلاٹ کا آہنگ واضح ہے کہ آخر میں ایک اچنبھے اور تحیر (Suspense) کی کیفیت کا طالب ہے۔ کہ جانے بوجھے ٹھیراؤ کا۔ آخر میں معز علی بیگ کچرا اور نفسیات کی ایک "اہم تجویز" درج ہے یہ تجویز دیکھنے میں بڑی منطقی اور ٹھیک معلوم ہوتی ہے لیکن عملاً بڑی حد تک دشوار سی ہے جس کے لئے کافی سہولتوں اور پورے اکیڈمک انتظامات کی ضرورت ہے یہ کام موجودہ حالات میں صرف اس طریقہ سے ہو سکتا ہے کہ "تعمیری تنقید" پر پوری توجہ صرف کی جائے اور ہمارے حلقوں میں تنقیدی صلاحیتوں کو نشو و نما دینے اور ان سے کام لینے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام ہو۔ ان کے علاوہ نظمیں اور غزلیں ہیں جو معیار کے عام معیار پر پوری اترتی ہیں لیکن کسی نمایاں تجربہ کو نہیں پیش کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر مجموعہ دلچسپ اور فکر انگیز ہے اگر اس میں اس ادبی اجتماع کا رودادیہ (Reportage) بھی شامل ہوتا تو اس کی دلچسپی اور افادیت دگنی ہو جاتی۔ خاص نمبر چھوٹی کتابی تقطیع پر چھاپا گیا ہے جو اس کی "خصوصیت" کو بڑی حد تک مجروح کر رہی ہے۔ اور سرورق کے الٹتے ہی ایک نیلے لکا سا ورق سامنے آجاتا ہے جو قاری کی پہلی نگاہ کو کھلا دیتا ہے۔

قیمت:۔ آٹھ آنے

زر تعاون سالانہ:۔ پانچ روپے (م۔ ف)

تبصرہ کے لئے دو جلدوں کا آنا لازمی ہے ـــــ

ماہنامہ القرآن "سیرت نمبر"

ادارہ تحریر۔ مظہر صدیقی جلیل احمد اختر۔ قیمت خاص نمبر ۱۲/. سالانہ چندہ ۴ روپے یہ پرچہ ادارہ تبلیغ القرآن کی طرف سے گولیمار کراچی سے حاجی پروفیسر فیروز الدین صاحب کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے اور سیرت نمبر اس کا ایک خصوصی شمارہ ہے جس میں حضور نبی کریم کی سیرت مقدس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے حضور کی سیرت ایک ایسا گلستان ہے جس میں دوست اور دشمن سب ہی اپنے اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق رنگا رنگ کے گلدستے مرتب کرتے رہتے ہیں اور یہ صرف حضرت محمد صلعم کی سیرت ہی ہے جس پر دنیا کے تمام انسانوں سے زیادہ لکھا گیا ہے دنیا کی ہر زبان میں ہر قسم کا مواد موجود ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں حضور کی سیرت نے بہت بڑا کام کیا ہے تاریخ کے صفحات پر وہ کردار ایک ایسا کردار ہے جو مدت لئے دراز گزر جانے کے باوجود نمایاں، درخشاں اور منور ہے اور ہزار دھندلکوں کے باوجود ظلمتوں کے اندر انسانیت کے قافلے کیلئے روشنی کا مینار ہے ـــــ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں اب سیرت کے موضوع پر جرائد کے نمبر نکالنے کا ذوق بڑھ چلا ہے جس سے قوم کے ذہنی رجحان کا پتہ چلتا ہے اس رجحان کے تحت بیشتر جرائد اپنے اپنے ذوق کے مطابق اپنے اپنے سیرت نمبر نکالتے رہتے ہیں چنانچہ القرآن نے بھی سیرت نمبر نکال کر اپنے آپ کو گلستان نبی کا خوشہ چیں ثابت کر دیا ہے۔ ادارہ القرآن کیلئے فخر کا باعث ہے البتہ انتخاب مضامین اور رجحان طبع کے اعتبار سے کلام کی پوری پوری گنجائش موجود ہے ایک بہتے ہوئے دریا کی انبیاء کی دعوت کے پہلو ہی زیادہ [illegible] ہونا ضروری ہے اور مقصد بعثت انبیاء پر اس کی نگاہ زیادہ ہونی چاہئے ولادت اور چراغاں کو مقصد بعثت کے برابر اہمیت دینا [illegible] مشن کے ساتھ زیادتی ہے جس چیز کے لئے حضور نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اسے برداشت نہیں ہو سکتا ہے ہجرت کی راہ سے نظر انداز کر دیا جائے اور حضور کی پیدائش پر چراغاں کیا جائے تو حضور کے مقصد دعوت کے ساتھ ایسا ظلم اور زیادتی ہے جیسے معمولی سمجھ کا آدمی بھی [illegible] محسوس کرے گا اس لئے [illegible] میں یہ پہلو بہت نمایاں رکھا گیا ہے اگرچہ یہ بھی زندگی کا ایک پہلو ہے لیکن پوری زندگی نہیں ہے جس چیز نے حضور کو انسانیت کے لئے پیغامبر بنا دیا۔ اسے انسانیت کو سمجھنا ہو تو یہ آپ کے نقش قدم پر چلنا دراصل حضور کی ۲۳ سالہ زندگی ہے جو چالیس سال کی عمر سے شروع ہو کر ۶۳ سال کی عمر میں ختم ہوتی ہے سیرت پر لکھنے والوں کو زندگی کے اس حصے سے ہی ہدایت مل سکتی ہے اور اس کی تفصیلات کا کام ابھی تو اس پر زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال القرآن کا یہ اقدام اپنی نوعیت کے اعتبار سے قابل استحسان ہے۔ (ا۔ ک)

بلند معیاری
کے سبب حاذق دواخانہ کی تیار کردہ یونانی ادویہ
شہور اور مقبول عام
ہیں
حاذق کا
مفرح فولادی
نیا اور تازہ خون پیدا کرتا ہے۔ وزن
بڑھاتا ہے۔ ہڈیوں کو مضبوط
کرتا ہے۔ قوت اور طاقت بخشتا ہے
کھانا ہضم کر کے بھوک بڑھاتا ہے
(خوراک)
کھانے کا ایک چمچہ روزانہ دو تین دفعہ
کھانا کھانے کے بعد استعمال کیجئے
بچوں کے لئے نصف خوراک۔
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبر ۱ پاکستان
2 OZ
HAZMEE
منیجر
حاذق دواخانہ
بندر روڈ۔ کراچی نمبر ۱

Regd. No.
Monthly "MUSHIR" Karachi

Printed at Mashhoor Press, McLeod Road, Karachi.

مشیر
قیمت
دفتر ماہنامہ "مشیر" بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

منظر حسین

داد خدا کی بیٹی

داد خدا بڑا "مذہبی" آدمی تھا۔

جس دن اس کے گھر بیٹی پیدا ہوئی اس نے چلتن بابا کے مزار پر گھی کا ایک چراغ جلایا۔ اور منت مانی کہ اگر اس کی بیٹی زندہ رہی اور خوبصورت، تو وہ اس کی شادی کے دن چلتن بابا کے نام پر ایک دنبہ ذبح کر دے گا ——— چلتن بابا نے اس کی سنی یا نہیں، اس کی بابت تو کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ البتہ اس کی بیٹی کے پیدا کرنے والے نے ضرور سن لیا ——— اور بیٹی دن بدن بڑھنے لگی اور اس کا حسن چمکنے لگا۔

جب وہ تین سال کی ہوئی تو داد خدا کے پاس "پیغامات" آنے لگے ——— کسی نے "پانچ سو" لگائے کسی نے "سات سو" کسی نے "آٹھ سو" لگائے، کسی نے "نو سو" ———

مگر داد خدا نے یہ کہہ کر تمام پیغامات ٹھکرا دیئے کہ "میری بیٹی کی صرف آنکھیں ہی پانچ پانچ سو کی ہیں"

جب وہ سات سال کی ہوئی تو "بڑے بڑے" پیغامات آنے لگے ——— "ایک ہزار" "ڈیڑھ ہزار" "دو ہزار" ——— "ڈھائی ہزار" ——— مگر داد خدا نے یہ کہہ کر پیغامات ٹھکرا دیئے کہ "میری بیٹی کی صرف آنکھیں ہی ایک ایک ہزار کی ہیں"۔

اور جب وہ چودہ سال کی ہوئی تو "اونچے اونچے" پیغامات آنے لگے ——— "پانچ ہزار" – "سات ہزار" "نو ہزار" ——— "دس ہزار" ——— مگر داد خدا نے یہ کہہ کر پیغامات ٹھکرا دئے کہ "میری بیٹی کی صرف آنکھیں ہی پانچ پانچ ہزار کی ہیں" ——— آخر جب وہ سولہ سال کی ہوئی تو "بڑے اونچے بڑے اونچے" پیغامات آنے لگے ——— "گیارہ ہزار" ——— "بارہ ہزار" ——— "تیرہ ہزار" ——— "چودہ ہزار"

داد خدا نے بولی لگائی "پندرہ ہزار" ——— ایک ——— پندرہ ہزار ——— دو ——— پندرہ ہزار ...... تی ——— ن ——— اور بیٹی ایک بڈھے ملک کو دیدی ——— اور بازار سے ایک دنبہ خرید کر چلتن بابا کو ———

اس "مقدس فریضہ" کی ادائیگی کے بعد داد خدا کو فوراً حج کا خیال آیا اور وہ اسی سال حج کے لئے روانہ ہو گیا حج کر کے جب وہ لوٹا تو اس نے اپنے گاؤں میں ایک مسجد بنوائی اور مسجد بنوا کر وہ "یاد خدا" میں مصروف ہو گیا۔

اور اب وہ "زندہ پیر" "خان بابا" اور دیگر ناموں سے مشہور ہے اور لوگ اس کی زیارت کو اسی طرح آتے ہیں جس طرح چلتن بابا کے مزار پر۔

(بشکریہ معیار)

تعمیری ادب کا ڈائجسٹ

(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ماہنامہ مشیر کراچی

ٹیلیفون: ۷۹۲۳۳

جولائی و اگست ۱۹۵۶ء

جلد ۷ ——— شمارہ ۷، ۸

مرتبہ

عبد الغفور بیگ

فی پرچہ: بارہ آنے

سالانہ: پانچ روپے

بھارت میں ترسیل زرکا پتہ: پندرہ روزہ "الحسنات" رام پور۔ یوپی۔ بھارت

(پرنٹر و پبلشر عبد الغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ "مشیر" بندر روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا۔ کتبہ حامد سعید کراچی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دمشق کانفرنس

دمشق میں جو کانفرنس حال ہی میں منعقد ہوئی تھی وہ اس اعتبار سے نہایت اہم تھی کہ اس میں پہلی مرتبہ عالم اسلام کی دکھتی ہوئی رگوں کو چھیڑا گیا اور ان کے متعلق سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ اس کانفرنس میں جذباتی تقریریں نہیں کی گئیں۔ خالی خولی نعرے نہیں لگائے گئے بلکہ "مرض اور اس کے علاج" کے بارے میں اچھی طرح سوچ سمجھ کر ایک پروگرام بنایا گیا۔ اس پروگرام کی پوری تفصیلات اس وقت ہمارے پاس نہیں۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں جو روح کارفرما ہے وہ "احیائے اخلاق" کی ہے۔ جیسا کہ مولانا مودودی نے دمشق میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا "قوموں پر مصائب و آلام کی یورش اس وقت ہوتی ہے جب وہ اخلاقی طور پر اور اپنی زندگی کے عمومی کردار میں ضعف و اضمحلال کا شکار ہو جاتی ہیں" اس لئے احیائے اخلاق پر زور دینا اس بات کی علامت ہے کہ مرض کی صحیح تشخیص کر کے اس کا صحیح علاج کیا جا رہا ہے اور انشاء اللہ وہ دن جلد آئے گا جب کہ عالم اسلام شفایاب ہو جائے گا۔

اس کانفرنس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کی خبروں کا تقریباً تمام خبر رساں ایجنسیوں نے بلیک آؤٹ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق و کردار سازی کی اس مہم میں ان ایجنسیوں کو کوئی دلچسپی نہ تھی اور شاید ان کے نزدیک کوئی نیوز ویلیو بھی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اتنی اہم کانفرنس کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ حالانکہ اس میں فلسطین، الجزائر اور کشمیر جیسے مسائل پر سوچا گیا تھا۔

وحشت کلکتوی اور قابل اجمیری

علامہ رضا علی وحشت کلکتوی ان دنوں ڈھاکہ میں سخت علیل ہیں۔ جس کی وجہ سے ادبی حلقوں میں تشویش پائی جاتی ہے۔ علامہ وحشت کا شمار ہند و پاکستان کے چوٹی کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام کو شبلی، حالی، اقبال اور سر عبدالقادر وغیرہ نے سراہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی خدمات کے پیش نظر حکومت اور دیگر ادب نواز حضرات ان کے مناسب علاج اور وظیفہ وغیرہ کا جلد از جلد بندوبست کریں گے۔

ایک اور شخصیت بھی اسی توجہ کی مستحق ہے وہ ہے قابل اجمیری جو ایک برس سے ٹی۔بی کے شکار ہیں امید ہے کہ ان کے ساتھ بھی انصاف کیا جائیگا

کچھ اپنے متعلق

نیوز پرنٹ کی نایابی کا دور ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے اس لئے مجبوراً جولائی اگست کا مشترکہ شمارہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس شمارہ میں ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مواد دیا جائے تاکہ صفحات کی کمی کا بدل ہو جائے۔ اس غرض کے لئے ہم نے اشتہارات کے صفحات بھی گھٹا دئے ہیں۔ پھر بھی جو کمی رہ گئی ہے وہ آئندہ شماروں میں پوری کر دی جائے گی۔ امید ہے قارئین کرام کو ہم سے شکایت نہ ہوگی۔ اور ان کا تعاون ہمیں پہلے کی طرح حاصل رہے گا۔

فاروق بانسپاری •

سینما

دل دادگانِ علم وفن — سرگشتۂ تخمین وظن
یہ پردۂ سیمیں نہیں — تخریب کا ہے پیرہن
دیتی ہے تابانی جسے — تاریکیٔ تہذیب وفن
عریاں یہ تصویریں نہیں — پیشِ نظر جلوہ فگن
اہلِ خرد کا جہل ہے — رقصاں یہ اذنِ اہرمن
سرخی بہ لب غازہ بہ رخ — یہ شاہدانِ سیم تن
سینہ بہ سینہ لب بہ لب — یہ اختلاطِ مرد و زن
یہ محفلِ جام و سبو — یہ آبِ آتش پیرہن
تشریف فرما شیخ جی — محوِ نظارہ برہمن
بیٹھے ہیں شانہ جوڑ کر — مادر پدر بھائی بہن

سوچو تو کس منزل میں ہو
انساں کا یہ دیوانہ پن

لبریز صہبا جام ہو — ساقی کا فیضِ عام ہو
پیشِ نگاہِ آرزو — مے خانۂ خیام ہے
رقصاں مذاقِ معصیت — ہمراہِ دورِ جام ہے
نغمہ بہ لب آغاز ہے — محوِ فغاں انجام ہے
دیکھو وہ پردے کی طرف — پردہ برائے نام ہے
ہر رند کی آغوش میں — ایک شاہدِ گلفام ہے
بوسوں کی لب پر مہر ہے — نظروں میں اک پیغام ہے

یہ پیار کے انداز ہیں — یا بے حیائی عام ہے
انسانیت کی موت سے — آفاق میں کہرام ہے
اس دور کے فنکار کو — خرمستیوں سے کام ہے

تہذیب کی یہ صبح ہے
یا زندگی کی شام ہے

فطری تقاضوں کا اثر — ہوتا ہے ہر ذی روح پر
تفریح کا قائل ہوں میں — لیکن بہ مفہومِ دگر
تم کو فقط سودائے فن — اخلاق سے قطعِ نظر
اخلاق ہی میرے لئے — بالذات مقصودِ ہنر
تم نفس کے ہو مقتدی — میں نفس کا ہوں راہبر
آوارۂ منزل ہو تم — منزل ہے میری ہم سفر
تم کو ترقی کا جنوں — تعمیر پر میری نظر
میں آشنائے زندگی — تم زندگی سے بے خبر
جلوہ گہِ ادراک میں — میری بصیرت معتبر
لیکن تمھاری چشم وا — لے حق نگر نے خود نگر
گردوں کی جانب پاؤں ہیں — بالائے فرشِ خاک سر

اس ارتقا پر آفریں
اے مدعیانِ ہنر

(بشکریہ "معیار" میرٹھ)

محمد عبید اللہ صدیقی ایم اے

ساحر لدھیانوی

موجودہ اردو ادب کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ بہت سے ایسے ستارے جن کے مستقبل کے درخشاں ہونے کی قوی امیدیں تھیں طلوع ہونے کے کچھ عرصہ بعد ہی پردۂ سیمیں کے پیچھے غروب ہو گئے اور پھر ان کا حاصلِ زندگی کچھ سستے قسم کے گانوں اور مکالموں کے سوا کچھ نہ رہا جنہیں ریڈیو اور سینما عوام تک پہنچا کر ان کی زندگی کا یقین دلاتے رہے۔ اس روش کا اگر ایک بڑا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ اب بھی ہمارے تعلیم یافتہ طبقوں میں ادبی ذوق اور ادب نوازی کی اتنی زبردست کمی ہے کہ ہر شاعر اور ادیب محض شاعر یا ادیب ہو کر آسودہ حال زندگی نہیں بسر کر سکتا تو دوسرا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ موجودہ دور نے ہمیں بڑی حد تک سہل انگار اور فرار پسند بنا دیا ہے اور ہم خونِ جگر پی کر زندہ رہنے کے بجائے اکتسابِ زر کے ہر ممکن طریقے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ انہیں شعرا میں سے ایک ساحر بھی ہے جو ؎

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں

جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

..... کے پیشِ نظر کچھ عرصے تک بہت اچھی نظمیں اور غزلیں کہنے کے بعد اب ؎

نہ یہ چاند ہوگا نہ تارے رہیں گے

مگر ہم ہمیشہ تمہارے رہیں گے

جیسے فلمی گیت لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

ساحر کی تمام شاعری کو بڑی آسانی سے دو موضوعات کے تحت لایا جا سکتا ہے اس کے کلام کا بڑا حصہ ایک مایوس محبت کی داستان ہے۔ جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ محض سنی سنائی باتیں نہیں ہیں بلکہ خود محسوس کیا ہے اور بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔ احساس کی یہ شدت ہی اس کے اس حصۂ کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے اور اسی وجہ سے اس میں بڑی اپیل پائی جاتی ہے۔ اس کے بقیہ کلام کو اس لگاؤ کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے جو اسے ایک زمانہ میں اشتراکیت سے رہا ہے۔ یہاں ہمیں گہرائیوں اور معنی خیزیوں کے بجائے جذبات کا جوش و خروش زیادہ ملتا ہے جس کا کسی بھی نظری تحریک سے متاثر ہونے والے میں ابتداً ملنا ایک فطری بات ہے ـــــ یہاں نہ صرف ایک نو متاثر (Convert) کا جوش و خروش ہے بلکہ اس کی وہ شدت پسندی بھی ہے جس کے سبب سے وہ اکثر متقابل نظریات و اقدار کو بغیر جانچے تولے ہدفِ تضحیک بنا دیتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی شاعری کا یہ حصہ فن و معنی دونوں لحاظ سے کمتر درجے کا ہے۔

ان دونوں موضوعات کے علاوہ ہمیں بعض منفرد نظمیں ایسی بھی ملتی ہیں جو اس نے اپنے دور کے واضح تقاضوں اور حادثات سے متاثر ہو کر لکھی ہیں اس نے کبھی برطانوی سامراج کی ستم شعاریوں کے خلاف آواز بلند کی ہے تو کبھی کالج کی رنگین زندگی کو یاد کر کے نذرِ عقیدت پیش کی ہے۔ کبھی تقسیم ہند کے جلو میں.. جو شرمناک فسادات ہوئے ان پر خون کے آنسو رویا ہے تو کبھی تاج محل اور نور جہاں کے مزار پر اپنے مخصوص تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ان نظموں میں اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی انفرادیت ہے جو احساسات اور تجربات کی انفرادیت جو پچھلے تمام تجربات سے نہ صرف منفرد بلکہ بسا اوقات ممتاز بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً تاج محل کے حسن و جاذبیت پر اردو کے بیشمار شعرا نے کچھ نہ کچھ کہا ہے لیکن ساحر کی نظر میں تاج محل محض مرد کا وہ حسین ترین مرقعِ الفت ہی نہیں ہے جو عجائباتِ عالم میں شمار ہوتا ہے اور جسے دیکھنے کے لئے دنیا جہاں کے سیاح آتے ہیں بلکہ وہ اسے سینۂ دہر پر ایک ایسا ناسور سمجھتا ہے

جس میں موجودہ عوام کے اجداد کا خون جذب ہے۔ وہ اسے دوسرے
شعرا کی طرح شاہجہاں اور ممتاز محل کی بے مثال محبت کی ہی یادگار
نہیں سمجھتا بلکہ سطوت شاہی کا ایک نشان بھی سمجھتا ہے جیسے کہ

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لیکر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

یہ احساس اور بھی شدید ہو جاتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ
دنیا میں بیشمار لوگ محبت کرتے ہیں اور ایسی محبت کرتے ہیں جس میں
جذبات کی صداقت اور بے لوثی پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔
لیکن وہ اپنی غربت کی وجہ سے گمنام رہتے ہیں کہ

اور لوگوں نے بھی دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے انکے
لیکن ان کے لئے تشہیر کا سامان نہ تھا
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

اور پھر کہ

میری محبوب! انہیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے حسن جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

(تاج محل)

یہ نظم ہمیں پہلی بار چونکا کر یہ احساس دلاتی ہے کہ تاج محل کا
ایک رخ یہ بھی ہے۔ تاج محل سے ایک تاثر یہ بھی لیا جا سکتا ہے
اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس زمانے کی بدلی ہوئی اقدار اور انقلاب پذیر
تصورات کے پیش نظر یہ تاثر عوامی جذبات سے قریب تر نہیں ہے
اسی طرح نورجہاں کے مزار پر پہنچکر سب سے پہلے جو بات اس کے دل
میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک دختر جمہور کی قبر ہے جو معلوم نہیں
کن سازشوں کے تحت ایک معمولی سپاہی کے گھر سے نکال کر حرم شاہ
کی زینت بنائی گئی تھی اور پھر پتہ نہیں کہ اس عنایت خسروی پر خود
مہرالنسا کے اپنے جذبات و احساسات کیا تھے۔ ممکن ہے کہ یہ انداز فکر
شاہان سلف کے کردار کے کچھ بدنما داغ اجاگر کر جاتا ہو لیکن یہ دیکھتے

بہرکیف ویسے ہی ہیں اور اس لحاظ سے یقیناً افسوسناک ہیں۔ یہی وجہ
ہے کہ عہد جہانگیر کے متعلق جب وہ کہتا ہے کہ

کیسے ہر شاخ سے منہ بند مہکتی کلیاں
نوچ لی جاتی تھیں تزئین حرم کی خاطر
اور مرجھا کے بھی آزاد نہ ہو سکتی تھیں
ظل سبحان کی الفت کے بھرم کی خاطر

تو یہ بات محض جہانگیر ہی سے نہیں بلکہ اموی دور سے لیکر
اب تک کے تمام بے راہ رو مسلم سلاطین کی ایک کڑی تنقید بن جاتی اور ہمیں
لونڈیوں اور بیگمات سے بھری ہوئی محل سرائیں اسلامی معاشرت
پر ایک بدنما داغ نظر آتی ہیں۔
اسی طرح جب وہ بنگال کی اس سرزمین پر جہاں کی زمین
سنہری ریشے اگلتی ہے جہاں کے کھیتوں میں بے پناہ دھان پیدا ہوتا
ہے اور جہاں کے دریاؤں اور جھیلوں میں مچھلیوں کا کوئی شمار نہیں۔
پچاس لاکھ انسانوں کو فاقے سے تڑپ تڑپ کر جان دیتے ہوئے دیکھتا
ہے تو بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ

زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا
کہ نسل آدم و حوا بلک بلک کے مرے
ملیں اسی لئے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں

اور پھر کہ

زمین کی قوت تخلیق کے خداوندو
ملوں کے منتظمو سلطنت کے فرزندو
پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے
نظام زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں
خموش ہونٹوں سے دم توڑتی نگاہوں سے
بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

(بنگال)

۱۹۴۶ء میں بحریہ کی زبردست بغاوت نے غیر ملکی سامراج
کے استحکام کی آخری چٹان بھی ہلا دی۔ کسی غیر ملک پر اپنی سیادت جمانے

کے لئے سب سے بڑا اعتماد فوج ہی پر ہوا کرتا ہے اور جب فوج میں اس طرح کے احساس سرایت کر جائیں تو پھر یقیناً دو کان بڑھانے کا وقت آجاتا ہے۔ ساحر جیسا نوجوان شاعر اس واقعے پر بجا طور پر فخر محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد یہ دوسرا واقعہ تھا جس میں فوج کے ارکان نے ملک کے عوام کے جذبات کا ساتھ دیا تھا اور انہیں یہ بات بتائی تھی کہ اس جدوجہد میں وہ بھی انہیں کے ساتھ ہیں۔ اور جب اُن حریتِ وطن کے جانثاروں کو غیر ملکیوں نے طرح طرح کے مذموم خطابات دیئے تو وہ مچل جاتا ہے ؎

اے رہبر ملک و قوم بتا! آنکھیں تو اٹھا نظریں تو ملا!
کچھ ہم بھی سنیں ہم کو بھی بتا۔ یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟
کیا قوم و وطن کی جے گا کر مرتے ہوئے راہی غنڈے تھے؟
جو دیش کا پرچم لیکے اٹھے وہ شوخ سپاہی غنڈے تھے؟
جو بارِ غلامی سہہ نہ سکے وہ مجرم شاہی غنڈے تھے؟
(یہ کس کا لہو ہے؟)

اس غیر منصفانہ تقسیم زر کے دور میں بھوک اور فاقے سے مجبور ہو کر بسا اوقات بڑے بڑے باعزت لوگوں کا کردار اور عزتِ نفس آزمائش میں پڑ جاتا ہے فنکار بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے وہ اپنے قلم کے ذریعہ سے اپنے داخلی جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے اور بسا اوقات اس سے اس کا مقصد محض ذاتی آسودگی ہوتی ہے ان تخلیقات میں وہ اپنی آپ بیتی کہتا ہے اور بہت سی ایسی راز کی باتیں بھی بتا جاتا ہے جن کے اشتہار میں اسے یقیناً تکلیف ہوتی ہے لیکن پھر اپنی ضروریات سے مجبور ہو کر وہ انہیں کی سوداگری کرتا ہے اور اس طرح اس تکلیف کو جانتے بوجھتے گوارا کرتا ہے۔ اس سے اس کی عزتِ نفس مجروح ہوتی لیکن وہ مجبور ہوتا ہے۔ ساحر نے اس کش مکش اور مجبوری کو اپنی ایک نظم "فنکار" میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے ؎

میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
آج دکان پہ نیلام اٹھے گا ان کا
تو نے جن گیتوں پہ رکھی تھی محبت کی اساس

آج چاندی کے ترازو میں تلے گی ہر چیز
میرے افکار، میری شاعری، میرا احساس

بھوک تیرے رخِ رنگین کے فسانوں کے عوض
چند اشیائے ضرورت کی تمنائی ہے
دیکھ اس عرصہ گہہ محنت و سرمایہ میں
مرے نغمے بھی میرے پاس نہیں رہ سکتے!

یہ اور اسی طرح کے دوسرے مختلف موضوعات پر ساحر نے چھوٹی چھوٹی نظمیں کہی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موضوعات کے لحاظ سے ساحر اگر بہت وسیع نہیں تو بالکل محدود بھی نہیں۔ ان موضوعات کو اس نے عموماً ایک نئے انداز میں برتا ہے۔ اس کا انداز (approach) قدیم انداز (approach) سے قدرے مختلف ہے۔ اور اسی لئے اس میں ایک نیا پن، ایک ندرت پیدا ہو گئی ہے جو اس کے کلام کو ممتاز کرتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس ندرت کے ساتھ ساتھ اس کی شدت جذبات اور سلیس اندازِ بیان کلام کو کافی جاذبیت بخش دیتی ہے۔

(۲)

اب آیئے ساحر کے کلام کے اس حصہ کو لیں جو محبوب اور اس کے فراق کی حکایات پر مشتمل ہے۔ اس میں ساحر کی چند غزلیں بھی ہیں اور بہت سی نظمیں بھی یہ بات کہ ساحر ایک ناکام محبت تھا کسی تحقیق و تفتیش کی محتاج نہیں ہے۔ خود ساحر ہی نے آپ بیتی کے طور پر بہت ہی سادہ مگر دل نشین انداز میں اپنی نظم "سرزمین یاس" میں بتایا ہے ؎

جینے سے دل بیزار ہے ہر سانس اک آزار ہے
کتنی حزیں ہے زندگی اندوہگیں ہے زندگی
وہ نازنینان وطن زہرہ جبینانِ وطن
جن میں سے اک رنگین قبا آتش نفس آتش نوا
کر کے محبت آشنا رنگِ عقیدت آشنا
داغِ جدائی دے گئی ساری خدائی لے گئی

ان ساعتوں کی یاد میں ان راحتوں کی یاد میں
مغموم سا رہتا ہوں میں غم کی کسک سہتا ہوں میں

ساحر کی ان غزلوں اور نظموں میں سب سے پہلے جو چیز نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ساحر کو جو کچھ بھی کہنا ہوتا ہے وہ صاف صاف اور برملا کہتا ہے۔ غزل میں بھی وہ ابہام سے بالکل کام نہیں لیتا اور پھر اس کی غزلیں چونکہ محض محبوب اور اس سے متعلق واردات کے ذکر تک محدود ہیں اور ان میں کسی دوسرے مسئلہ زندگی وغیرہ کا تذکرہ نہیں ہوتا اس لئے ان پر اکثر نظموں کا گمان ہوتا ہے اور یہی کیفیت نظموں کی بھی ہے۔ دونوں ہی اپنے.... موڈ (Mood) کے لحاظ سے (Sincerity) سے بہت قریب ہیں۔ غزلوں میں بھی نظم جیسا ربط باہم محسوس ہوتا ہے۔ اس کے یہاں ایک شکستہ دل کے درد اور آنسو ہیں لیکن کہیں کہیں اس کے ساتھ ہی شوخی اور شرارت بھی ہے۔ مثلاً ؎

ہم کریں ترک وفا اچھا چلو یونہی سہی ؛ اور اگر ترک وفا سے بھی نہ رسوائی گئی

پھر نہ کیجئے میری گستاخ نگاہی کا گلہ ؛ دیکھئے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

تمہارے عہدِ وفا کو میں عہد کیا سمجھوں ؛ مجھے خود اپنی محبت پر اعتماد نہیں

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید ؛ لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

ساحر کے یہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں اگرچہ دو مستقل حیثیت رکھتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غمِ دوراں کا دباؤ اس نے زیادہ محسوس کیا ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی غمِ جاناں بھول بھی جاتا ہے اور بھول کر اگر یاد بھی آتا ہے تو وہ اس یاد کو اپنے سینے ہی میں دبا دینا زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔ یہ بات اردو شاعری کی روایات کے ممکن ہے بڑی حد تک خلاف ہو لیکن ساحر ہمارے دور کا شاعر ہے اور ہم جس دور سے گذر رہے ہیں اس کا ایک بہت بڑا اختصاص یہ ہے کہ انسانوں کا سوادِ اعظم بھوک فاقے اور بدحالی سے دوچار ہے اور ایک قلیل اقلیت کو چھوڑ کر جو لوگ خوش نصیبی سے اس سے بچے ہوئے ہیں وہ ہر طرح اس سے خائف رہتے ہیں اور اسی لئے ان کا سارا ذہنی سکون ختم ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایک طرف میر غمِ دوراں سے دوچار ہونے کے باوجود شکوہ بیشتر غمِ جاناں ہی کا کرتے ہیں اور اس طرح ان کے لئے غمِ جاناں کی آڑ میں غمِ دوراں سے چشم پوشی کبھی کبھی ممکن نظر آتی ہے یا غالب غمِ عشق کو اس لئے اپناتے ہوتے ہیں کہ ؎

غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

جیسے غمِ عشق کوئی چھوٹی بلا ہے جس کا انتخاب ناگزیر ہو۔ یا اصغر کے لئے یہ بات ممکن ہو جاتی ہے کہ وہ ؎

جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

کی ترکیب سے آلامِ روزگار کو اپنے لئے آسان بنا لیتے ہیں۔ لیکن اب میر و غالب تو کجا اصغر کا بھی زمانہ نہ رہا۔ اب غمِ جاناں سے نگار رہنے کے باوجود زندگی کے تقاضے اس قدر بدل چکے ہیں اور غمِ دوراں کا دباؤ اس قدر بڑھ چکا ہے کہ ساحر جب یہ کہتا ہے کہ ؎

میں اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو ؛ دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے

اے غمِ دنیا تجھے کیا علم تیرے واسطے
کن بہانوں سے طبیعت راہ پر لائی گئی

ان کا غم ان کا تصور ان کے شکوے اب کہاں
اب تو یہ باتیں بھی اے دل ہو گئیں آئی گئی

تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ بات اس دور کا عین تقاضہ ہے جس میں ہم جی رہے ہیں۔ اس میں ہم تمام چیزوں سے پہلو تہی کر سکتے ہیں سوائے غمِ دنیا کے بلکہ بعض اوقات فضا اتنی گھٹی گھٹی اور تنگ ہو جاتی ہے کہ زندہ رہنے کی کش مکش کے علاوہ کسی اور مشغلے کی گنجائش ہی نظر نہیں آتی ؎

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب ؛ ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں
گریز کا نہیں قائل حیات سے لیکن ؛ جو سچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں
یہ کس مقام پر پہنچا دیا زمانے نے ؛ کہ اب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں

اب آپ اسے سائنس اور مادیت کا بڑھتا ہوا اثر کہئے یا اس دور کے بدلے ہوئے تقاضے لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اس دور میں

عشق و محبت بھی ایسے تعیشات معلوم ہوتے ہیں جن کے لئے وقت اور فرصت چاہئیے۔ شیخ سعدیؒ کو تو اس بات پر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ دمشق میں اتنا شدید قحط پڑا کہ یاروں نے عشق ہی بھلا دیا لیکن یہاں انسان اناج کی ڈھیریوں میں رہ کر بھوکا اور کپڑوں کی ملوں میں رہ کر ننگا ہے۔ یہاں زندہ رہنے کی خواہش بلکہ زندگی سے محبت کے باوجود زندگی اتنی کٹھن معلوم ہوتی ہے کہ بعض اوقات موت ایک نعم البدل بن جاتی ہے ممکن ہے کہ اس سے فرار کا پہلو نکلتا ہو۔ زندگی سے فرار کا، شکست کا اور اس انکار کے باوجود نکلتا ہوا جو ساحر نے گریز کا نہیں قائل حیات سے لیکن" کہہ کر کیا ہے لیکن پھر یہ فرار سوادِ اعظم کی ایک دبی ہوئی خواہش ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ساحر نے زندگی کی بازی ہی ہاری ہے۔ نہیں۔ اس کے نزدیک بھی ؎

نفس کے لوچ میں رم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے ؛ حیات ساغرِ سم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

ساحر کے عشق میں وہ روایاتی پیچ و خم اور وہ الجھنیں بھی نہیں ملتی ہیں جنکی وجہ سے فراق محبوب بھی جان لیوا ہوتا ہے اور وصال محبوب بھی اس کا عشق سیدھا سادھا ہمارے زمانے کا عشق ہے جو اپنا ایک مقصد رکھتا ہے۔ یعنی محبوب کو اپنا لینا۔ اس مقصد کے حصول میں ظاہر ہے کہ بہت سی سماجی مشکلات سدِ راہ ہوتی ہیں۔ زمانے کا خیال خاندان کے فرق اور اسی طرح کے دوسرے سلاسل جو آج بھی معاشرے کے قدموں سے چمٹے ہوئے ہیں، یہاں ساحر اپنی محبوبہ کو محض ایک مشورہ دیتا ہے اور وہ یکسوئی کا ہے۔ اس کے نزدیک آہوں، نالوں اور آنسوؤں سے کچھ حاصل نہیں بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ؎

زندگی شعلۂ بیباک بنا لو اپنی ؛ خود کو خاکسترِ خاموش بناتی کیوں ہو
کون کہتا ہے کہ آہیں ہیں مصائب کا علاج ؛ جان کو اپنی عبث روگ لگاتی کیوں ہو
جب تمہیں مجھ سے زیادہ ہے زمانے کا خیال ؛ پھر مری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو

تم میں ہمت ہو تو دنیا سے بغاوت کر لو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہوں شادی کر لو

(یکسوئی)

لیکن ظاہر ہے کہ ساحر کی محبوبہ بھی ایک مشرقی عورت ہے جو دنیا سے بغاوت تو کیا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے انجام ظاہر تھا۔ اس انجام کا ردعمل ساحر کی زندگی پر خاصہ شدید معلوم ہوتا ہے اور وہ اپنے دل کی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کا بری طرح گلا گھونٹنے کی کوشش کرتا ہے جس کی بدولت ان جذبات کو دوبارہ زندہ کرنا خود اس کے لئے بھی ممکن نہیں رہ جاتا خواہ محبوب کی طرف سے کوئی پیام تجدید ہی کیوں نہ ہو ؎

میری محبوب یہ ہنگامۂ تجدیدِ وفا ؛ میری افسردہ جوانی کے لئے راس نہیں
میں نے جو پھول چنے تھے ترے قدموں کیلئے ؛ انکا دھندلا سا تصور بھی مرے پاس نہیں

اور پھر ؎

تیرے عارض پہ یہ ڈھلکے ہوئے سیمیں آنسو ؛ میری افسردگیٔ غم کا مداوا تو نہیں
تیری محجوب نگاہوں کا پیامِ تجدید ؛ اک تلافی ہی سہی میری تمنا تو نہیں

اور یہ محض اس لئے ہے کہ محبت میں مایوس ہو کر اس نے اپنی زندگی کو ہر طرح سے تباہ کر لیا ہے کیونکہ ذہنی طور پر اس نے محسوس کیا ہے کہ زندگی رہے نہ رہے اب کچھ حاصل نہیں ہمیں یہیں ساحر کی زندگی میں بے راہ روی کے نشانات ملتے ہیں۔ اس نے ایک بار اپنی توجہات کو زندگی کے جس نقطے پر مرکوز کیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا جو محور بنایا تھا اس کے کھو جانے کے بعد وہ اپنے کو لا مرکز پاتا ہے جس کی جادۂ منزل کا کوئی پتہ نہ ہو اور پھر اس بگڑے ہوئے نظام میں وہ غم غلط کرنے کے ہر سستے اور ادنیٰ طریقے کو اختیار کرتا ہے۔ اس کی ساری قوتیں اور توانائیاں (energies) جو محبت میں صرف ہو رہی تھیں یکایک بے مصرف (release) ہو جاتی ہیں اور پھر انہیں کسی دوسرے کام میں لگانا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا ہے اسی لئے اپنے سکون گم کردہ کی تلاش میں وہ شراب خانوں میں جاتا ہے اور خود فراموشی میں قرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن موجود حقائق سے چشم پوشی کس طرح ممکن تھی۔ ساحر کے سامنے اس وقت تک زندگی کا کوئی عظیم تصور نہ تھا۔ نوجوانی میں گرفتارِ محبت ہو جانا کوئی عجوبہ نہ تھا۔ یہ عین فطرت تھا لیکن یہاں سے نکل کر وہ یہ بھول جاتا ہے کہ زندگی زلفوں کی نرم چھاؤں اور رخساروں کی ہلکی آنچ سے ماورا بھی ہوتی ہے۔ یہی وہ بھول ہے جو اسے گم کردہ راہ کر کے اس درجہ خراب کرتی ہے کہ پھر ؎

تو نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دوچار ؛ دل کو ہر طرح سے برباد کیا ہے میں نے

اور جب زندگانی کو بادہ و ساغر سے بہلانے کے بعد بھی وہ بہلا نہیں پاتا بلکہ نتیجے میں ایک افسردہ جوانی، ایک یخ بستہ اداسی، سے دوچار ہوتا ہے تو پھر محبوب کی تجدید وفا بھی اس برف کو پگھلا نہیں پاتی جو اس کے دل و روح پر جم چکی ہوتی ہے اور محبوب سے متعلق اس کی ساری شاعری محض گریہ و زاری، اعتراف شکست، پژمردگی اور قنوطیت کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے ؎

میں کہ مایوسی مری فطرت میں داخل ہو چکی ❊ جبر بھی خود پر کروں تو گنگنا سکتا نہیں

میں نے دیکھا ہو شکست ساز الفت کا سماں ❊ اب کسی تحریک پر بربط اٹھا سکتا نہیں

اور پھر ناکامی اور مایوسی کا یہ احساس اسے بالکل دوسری انتہا پر لے چلتا ہے اپنی ایک محبت میں ناکام ہونے کے بعد اسے سرے سے محبت کی افادیت اور ناگزیریت پر اعتقاد ہی نہیں رہ جاتا۔ اسے یہ بات بھی یاد نہیں رہ جاتی کہ محبت اس کائنات کی ترکیب کا ایک لازمی جزو ہے جس کے بغیر اس کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ محبت ہی کے تو مختلف مظاہر ہیں جن کی بنا پر انسانی معاشرت کی تعمیر ہوئی ہے اس جذبے کے مٹ جانے کے بعد اس کائنات کی شیرازہ بندی آخر کس طرح ہو سکے گی۔ لیکن ساحر یہ جاننے کے باوجود کہ ؎

سوچتا ہوں کہ محبت ہے بشر کی فطرت ❊ اس کا مٹ جانا مٹا دینا بہت مشکل ہے

محض اس لئے کہ خود اس کی اپنی محبت بار آور نہ ہو سکی کیونکہ

اس تمدن میں مسرت پہ بڑی شرطیں ہیں

یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ ؎

یہی بہتر ہے کہ بیگانۂ الفت ہو کر ❊ اپنے سینے میں کروں جذبۂ نفرت کی تلاش

اور سودائے محبت سے کنارہ کر لوں ❊ دل کو بیگانۂ ترغیب و تمنا کر لوں

لیکن یہ فیصلہ اول تو ایک غلط فیصلہ تھا اور پھر کوئی آسان فیصلہ نہ تھا۔ اس کے باوجود اسے چھوڑی ہوئی منزلوں کا مستقل اور مسلسل احساس رہتا ہے اور ان کی کھٹک چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ وہ بار بار مڑ کر دیکھتا ہے۔ زندگی کے ان حسین و جمیل لمحات کی یاد تازہ کرتا ہے جو اس کی محبت نے محرومیوں اور تلخیوں کے باوجود اسے عطا کئے ہیں۔ ماضی کے حسین نقوش اتنی آسانی سے بھلائے نہیں جا سکتے جبکہ انھوں نے کبھی کبھی زندگی کو اس کی عام سطح سے بلند ہونے میں مدد دی ہو۔ جبکہ انہیں کو کبھی حاصل حیات سمجھا گیا ہو۔ اسی لئے ان عزائم کے باوجود اسے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ؎

میں نے ہر چند غم عشق کو کھونا چاہا ❊ غم الفت غم دنیا میں سمونا چاہا

لیکن ؎

وہی گیسو مری راتوں پہ ہیں بکھرے بکھرے ❊ وہی آنکھیں مری جانب نگراں ہیں اب تک

کثرت غم بھی مرے غم کا مداوا نہ ہوئی ❊ میرے بے چین خیالوں کو سکوں مل نہ سکا

آہ اس کشمکش صبح و مسا کا انجام

میں بھی ناکام مری سعی عمل بھی ناکام

(ناکامی)

یہ احساس اور کش مکش ساحر کی شاعری میں ابتدا سے لیکر انتہا تک موجود ہے۔ جو چرکا اسے ایک بار لگ گیا تھا اس کا میٹھا میٹھا درد وہ ہمہ وقت محسوس کرتا رہتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہر بار اپنے کو یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ جیسے یہ سب کچھ وہ بھول چکا ہے اور اب اس کا ان باتوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں

(۳)

محبت سے نفرت کی کوشش اور اس کوشش میں پیہم ناکامی کے اس دور میں ساحر کے سامنے ایک نیا موڑ آتا ہے اور وہ اس پر مڑ جاتا ہے، یہ موڑ اس کی اشتراکیت پسندی کا موڑ ہے جہاں اسے یکایک فاقہ زدہ کسانوں، ننگے مزدوروں، لٹتی ہوئی عصمتوں اور اس طرح کی دوسری اندوہناک حقیقتوں کا احساس ہوتا ہے۔ پتہ نہیں یہ موڑ ساحر کی زندگی کا موڑ تھا یا محض اس کی شاعری کا۔ یہ مقصد اس نے زندہ رہنے کے لئے اپنایا تھا یا شاعری کرنے کے لئے اس کی شاعری کی ابتدا، ارتقا اور انجام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبت میں ناکام ہونے کے بعد اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی محض اس لئے کہ وہ ناکامی کی تلخیوں کو بھول سکے۔ پہلے اس نے عام روش پر چل کر شراب وغیرہ سے غم غلط کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے نتیجہ میں دل و روح کے اضمحلال کے ساتھ ساتھ اس کا جسم بھی مریض ہونے لگا۔ ایسی حالت میں اشتراکیت کے بلند بانگ نعرے اسے متوجہ کر گئے۔ لیکن ساحر نے اس موضوع کے تحت جو کچھ کہا ہے اس کی

لہ آئی اور پھر بہت جلد ہی اس سے اکتا کر فلمی گیت وغیرہ لکھنے لگا۔ اس بات کی دلیل ہے کہ اسے اشتراکیت سے محض ایک وقتی اور جذباتی لگاؤ تھا اور جذبات چونکہ ایک ہی طرح کی شدت کے ساتھ کبھی قائم نہیں رہ سکتے خصوصاً جہاں سوال نفس کشی اور پتہ ماری کا ہو اس لئے کوئی ذہنی پختگی نہ ہونے کے سبب یہ رفتہ رفتہ سرد پڑ گئے۔ یہ محض اس کا ایک شاعرانہ فرار تھا یہاں زندگی سخت تھی جسے اس کی سہل پسند طبیعت زیادہ عرصے تک گوارا نہیں کر سکتی تھی اور نتیجتہً وہ بہت جلد ہی یہاں سے بھی بھاگ نکلا۔ بہرحال حقیقت حال خواہ کچھ بھی ہو جب ہم اس کی اس گریز پر نظر ڈالتے ہیں جو محبت سے نفرت اور محبت کے حسین لمحات کی یاد میں وہ اختیار کرتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ محبت جسے وہ اب تک متاعِ زیست سمجھتا رہا تھا بے اثر ہو چلی ہے ؎

مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ ۔ شکست ہو گیا تیرا فسونِ زیبائی
وہ تارے جن میں محبت کا نور تاباں تھا ۔ وہ تارے ڈوب گئے لے کے رنگ و رعنائی
تری نظر، ترے گیسو، تری جبیں، ترے لب ۔ مری اداس طبیعت ہے سب سے اکتائی
(گریز)

اور پھر وہ اس تغیر اور انقلاب کی وجہ ـــــ بیان کرتا ہے۔ اسے یکایک شبہ سا ہو جاتا ہے کہ کہیں وہ محبت محض ایک فریب نہ رہی ہو ؎

تیری سانسوں کی تھکن تیری نگاہوں کا سکوت
درحقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو!
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا تھا
وہ تبسم وہ تکلم تیری عادت ہی نہ ہو!
(ہراس)

اور پھر جب اسے ایک فریب قرار دیا گیا تو ضروری تھا کہ وہ محبوبہ جس نے یہ سارا فریب دیا تھا اس کی شان میں بھی کچھ کہا جائے چنانچہ ؎

اے طرب زار جوانی کی پریشاں تتلی
تو بھی اک بوئے گرفتار ہے معلوم نہ تھا
تیرے جلووں میں بہاریں نظر آتی تھیں مجھے
تو ستم خوردۂ ادبار ہے معلوم نہ تھا!
(ایک تصویر رنگ)

یہ اشعار اگر ایک طرف اس کی بلند بانگ محبت کی نقاب کشائی کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ گریز کی خاطر ناگزیر سمجھتا ہے کہ اس محبت ہی کو ایک فرار قرار دیدے ؎

میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا ۔ کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تری فسوں زائی
(گریز)

اور اب جو چیز اس کے لئے جاذب نظر ہے وہ ؎

وہ پھر کبھی کسی مجبور کی جواں بیٹی ۔ وہ پھر جھکا کسی در پر غرور برنائی
وہ پھر کسانوں کے مجمع پر گن مشینوں سے ۔ حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی

یہ احساسات کم از کم اس تعطل سے زیادہ صحت مند تھے جو ناکامی محبت نے اس میں پیدا کر دیا تھا۔ نظریات و عقائد کی صحت اور عدم صحت سے قطع نظر ایک فرد کے غم کے بجائے تمام انسانیت کے دکھ درد کو محسوس کرنے کا جذبہ یقیناً بہت ہی مستحسن اور بلند جذبہ ہے غم کائنات کو اپنا غم سمجھ کر اس کا اظہار ہی عظیم ادب ہے لیکن اس طرز اظہار کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ شاعر انسانیت کے درد و کرب کو جسم کے ایک ایک ریشے اور خون کے ایک ایک قطرے میں محسوس کرے۔ اس درد کے اظہار کا یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ معاشرے کے کسی طبقے یا گروہ یا فرد کو چند موٹی موٹی خرابیوں کا ذمہ دار ٹھہرا کر انہیں خوب اچھی طرح کوسا جائے اور مظلوم طبقہ کو اس بات کے لئے بھڑکایا جائے کہ بس اگر وہ اسی طبقے، گروہ یا فرد کی بیخ کنی کر دیں تو ان کے سارے آلام و مصائب دور ہو جائیں گے۔ اس طرح کے تیار شدہ (ready made) علاج کبھی بھی کارگر نہیں ہوتے ہیں اور نہ غالباً کبھی بھی کارگر ہو سکیں۔ ساحر کا لگاؤ اشتراکیت سے محض جذباتی تھا۔ اس لگاؤ نے ہنگامی طور پر اس کے لئے ... اشتراکیت میں تھوڑی بہت دلچسپی مہیا کر دی۔ اس کی نہ تو اس پر کوئی گہری نظر تھی۔ نہ اس نے اس کے ہر پہلو کا کوئی تنقیدی مطالعہ کیا تھا۔ چند نعروں سے متاثر ہو کر اس نے اس رنگ میں شعر کہنے شروع کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی شاعری انہیں نعروں کی صدائے بازگشت بن کر رہ گئی۔ اس میں جوش و خروش اور ہنگامہ و ولولہ تو بہت ہے لیکن وہ سوز و گداز نہیں ہے جس سے اندازہ

اور جب زندگانی کو بادہ و ساغر سے بہلانے کے بعد بھی وہ بہلا نہیں پاتا بلکہ نتیجہ میں ایک افسردہ جوانی ۔ ایک یخ بستہ اداسی ، سے دوچار ہوتا ہے تو پھر محبوب کی تجدید وفا بھی اس برف کو پگھلا نہیں پاتی جو اس کے دل و روح پر جم چکی ہوتی ہے اور محبوب سے متعلق اس کی ساری شاعری محض گریہ و زاری ، اعتراف شکست ، پژمردگی اور قنوطیت کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے ؎

میں کہ مایوسی مری فطرت میں داخل ہو چکی ٭ جبر بھی خود پر کروں تو گنگنا سکتا نہیں
میں نے دیکھا ہو شکست سازِ الفت کا سماں ٭ اب کسی تحریک پر بربط اٹھا سکتا نہیں

اور پھر ناکامی اور مایوسی کا یہ احساس اسے بالکل دوسری انتہا پر لے چلتا ہے اپنی ایک محبت میں ناکام ہونے کے بعد اسے سرے سے محبت کی افادیت اور ناگزیریت پر اعتقاد ہی نہیں رہ جاتا۔ اسے یہ بات بھی یاد نہیں رہ پاتی کہ محبت اس کائنات کی ترکیب کا ایک لازمی جزو ہے جس کے بغیر اس کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ محبت ہی کے تو مختلف مظاہر ہیں جن کی بنا پر انسانی معاشرت کی تعمیر ہوئی ہے اس جذبے کے مٹ جانے کے بعد اس کائنات کی شیرازہ بندی آخر کس طرح ہو سکے گی۔ لیکن ساحر یہ جاننے کے باوجود کہ ؎

سوچتا ہوں کہ محبت ہے بشر کی فطرت ٭ اس کا مٹ جانا مٹا دینا بہت مشکل ہے

محض اس لئے کہ خود اس کی اپنی محبت بار آور نہ ہو سکی کیونکہ

اس تمدن میں مسرت پہ بڑی شرطیں ہیں

یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ ؎

یہی بہتر ہو کہ بیگانۂ الفت ہو کر ٭ اپنے سینے میں کروں جذبۂ نفرت کی تلاش
اور سودائے محبت سے کنارہ کر لوں ٭ دل کو بیگانۂ ترغیب و تمنا کر لوں

لیکن یہ فیصلہ اول تو ایک غلط فیصلہ تھا اور پھر کوئی آسان فیصلہ نہ تھا۔ اس کے باوجود اسے چھوڑی ہوئی منزلوں کا مستقل اور مسلسل احساس رہتا ہے اور ان کی کھٹک چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ وہ بار بار مڑ کر دیکھتا ہے۔ زندگی کے ان حسین و جمیل لمحات کی یاد تازہ کرتا ہے جو اس کی محبت نے محرومیوں اور تلخیوں کے باوجود اسے عطا کئے ہیں۔ ماضی کے حسین نقوش اتنی آسانی سے بھلائے نہیں جا سکتے جبکہ انھوں نے کبھی کبھی زندگی کو اس کی عام سطح سے بلند ہونے میں مدد دی ہو۔ جبکہ انہیں کو کبھی حاصل حیات سمجھا گیا ہو۔ اسی لئے ان عزائم کے باوجود اسے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ؎

میں نے ہر چند غم عشق کو کھونا چاہا ٭ غم الفت غم دنیا میں سمونا چاہا
لیکن ؎

وہی گیسو مری راتوں پہ ہیں بکھرے بکھرے ٭ وہی آنکھیں مری جانب نگراں ہیں اب تک
کثرتِ غم بھی مرے غم کا مداوا نہ ہوئی ٭ میرے بے چین خیالوں کو سکوں مل نہ سکا

آہ اس کشمکشِ صبح و مسا کا انجام
میں بھی ناکام مری سعیٔ عمل بھی ناکام
(ناکامی)

یہ احساس اور کشمکش ساحر کی شاعری میں ابتدا سے لیکر انتہا تک موجود ہے۔ جو چرکا اسے ایک بار لگ گیا تھا اس کا میٹھا میٹھا درد وہ ہمہ وقت محسوس کرتا رہتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہر بار اپنے کو یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ جیسے یہ سب کچھ وہ بھول چکا ہے اور اب اس کا ان باتوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں

(۳)

محبت سے نفرت کی کوشش اور اس کوشش میں پیہم ناکامی کے اس دور میں ساحر کے سامنے ایک نیا موڑ آتا ہے اور وہ اس پر مڑ جاتا ہے ، یہ موڑ اس کی اشتراکیت پسندی کا موڑ ہے جہاں اسے یکایک فاقہ زدہ کسانوں ، ننگے مزدوروں ، لٹتی ہوئی عصمتوں اور اس طرح کی دوسری اندوہناک حقیقتوں کا احساس ہوتا ہے۔ پتہ نہیں یہ موڑ ساحر کی زندگی کا موڑ تھا یا محض اس کی شاعری کا۔ یہ مقصد اس نے زندہ رہنے کے لئے اپنایا تھا یا شاعری کرنے کے لئے اس کی شاعری کی ابتدا ، ارتقا اور انجام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبت میں ناکام ہونے کے بعد اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی محض اس لئے کہ وہ ناکامی کی تلخیوں کو بھول سکے۔ پہلے اس نے عام روش پر چل کر شراب وغیرہ سے غم غلط کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے نتیجہ میں دل و روح کے اضمحلال کے ساتھ ساتھ اس کا جسم بھی مریض ہونے لگا۔ ایسی حالت میں اشتراکیت کے بلند بانگ نعرے اسے متوجہ کر گئے۔ لیکن ساحر نے اس موضوع کے تحت جو کچھ کہا ہے اس کی

لہٰذا گئی اور پھر بہت جلد ہی اس سے اکتا کر فلمی گیت وغیرہ لکھنے لگا۔ اس بات کی دلیل ہے کہ اسے اشتراکیت سے محض ایک وقتی اور جذباتی لگاؤ تھا اور جذبات چونکہ ایک ہی طرح کی شدت کے ساتھ کبھی قائم نہیں رہ سکتے خصوصاً جہاں سوالِ نفس کشی اور بیتہ ماری کا ہو اس لئے کوئی ذہنی پختگی نہ ہونے کے سبب یہ رفتہ رفتہ سرد پڑ گئے۔ یہ محض اس کا ایک شاعرانہ فرار تھا یہاں زندگی سخت تھی جسے اس کی سہل پسند طبیعت زیادہ عرصے تک گوارا نہیں کر سکتی تھی اور نتیجۃً وہ بہت جلد ہی یہاں سے بھی بھاگ نکلا۔ بہرحال حقیقت حال خواہ کچھ بھی ہو جب ہم اس کی اس گریز پر نظر ڈالتے ہیں جو محبت سے نفرت اور محبت کے حسین لمحات کی یاد میں وہ اختیار کرتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ محبت جسے وہ اب تک متاعِ زیست سمجھتا رہا تھا بے اثر ہو چلی ہے ؎

مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ ÷ شکست ہو گیا تیرا فسونِ زیبائی
وہ تارے جن میں محبت کا نور تاباں تھا ÷ وہ تارے ڈوب گئے لے کے رنگ و رعنائی
تیری نظر، ترے گیسو، تری جبیں، ترے لب ÷ مری اداس طبیعت ہے سب سے اکتائی

(گریز)

اور پھر وہ اس تغیر اور انقلاب کی وجہ ــــ بیان کرتا ہے۔ اسے یکایک شبہ سا ہو جاتا ہے کہ کہیں وہ محبت محض ایک فریب نہ رہی ہو ؎

تیری سانسوں کی تھکن تیری نگاہوں کا سکوت
در حقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو!
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا تھا
وہ تبسم وہ تکلم تیری عادت ہی نہ ہو!

(ہراس)

اور پھر جب اسے ایک فریب قرار دیا گیا تو ضروری تھا کہ وہ محبوبہ جس نے یہ سارا فریب دیا تھا اس کی شان میں بھی کچھ کہا جائے چنانچہ ؎

اے طرب زار جوانی کی پریشاں تتلی
تو بھی اک بوئے گرفتار ہے معلوم نہ تھا
تیرے جلووں میں بہاریں نظر آتی تھیں مجھے
تو ستم خوردۂ ادبار ہے معلوم نہ تھا!

(ایک تصویر رنگ)

یہ اشعار اگر ایک طرف اس کی بلند بانگ محبت کی نقاب کشائی کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ گریز کی خاطر ناگزیر سمجھتا ہے کہ اس محبت ہی کو ایک فرار قرار دیدے ؎

میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا ÷ کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تری فسوں رائی

(گریز)

اور اب جو چیز اس کے لئے جاذب نظر ہے وہ ؎

وہ پھر کسی کی کسی مجبور کی جواں بیٹی ÷ وہ پھر جھکا کسی در پر غرورِ برنائی
وہ پھر کسانوں کے مجمع پر گن مشینوں سے ÷ حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی

یہ احساسات کم از کم اس تعطل سے زیادہ صحت مند تھے جو ناکامیٔ محبت نے اس میں پیدا کر دیا تھا۔ نظریات و عقائد کی صحت اور عدم صحت سے قطع نظر ایک فرد کے غم کے بجائے تمام انسانیت کے دکھ درد کو محسوس کرنے کا جذبہ یقیناً بہت ہی مستحسن اور بلند جذبہ ہے غم کائنات کو اپنا غم سمجھ کر اس کا اظہار ہی عظیم ادب ہے لیکن اس طرز اظہار کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ شاعر انسانیت کے درد و کرب کو جسم کے ایک ایک ریشے اور خون کے ایک ایک قطرے میں محسوس کرے۔ اس درد کے اظہار کا یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ معاشرے کے کسی طبقے یا گروہ یا فرد کو چند موٹی موٹی خرابیوں کا ذمہ دار ٹھہرا کر انہیں خوب اچھی طرح کوسا جائے اور مظلوم طبقہ کو اس بات کے لئے بھڑکایا جائے کہ بس اگر وہ اسی طبقے، گروہ یا فرد کی بیخ کنی کر دیں تو ان کے سارے آلام و مصائب دور ہو جائیں گے۔ اس طرح کے تیار شدہ (ready made) علاج کبھی بھی کارگر نہیں ہوتے ہیں اور نہ غالباً کبھی بھی کارگر ہو سکیں۔ ساحر کا لگاؤ اشتراکیت سے محض جذباتی تھا۔ اس لگاؤ نے ہنگامی طور پر اس کے لئے ... اشتراکیت میں تھوڑی بہت دلچسپی مہیا کر دی۔ اس کی نہ تو اس پر کوئی گہری نظر تھی۔ نہ اس نے اس کے ہر پہلو کا کوئی تنقیدی مطالعہ کیا تھا۔ چند نعروں سے متاثر ہو کر اس نے اس رنگ میں شعر کہنے شروع کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی شاعری انہیں نعروں کی صدائے بازگشت بن کر رہ گئی۔ اس میں جوش و خروش اور ہنگامہ و ولولہ تو بہت ہے لیکن وہ سوز و گداز نہیں ہے جس سے انداز

ہو سکے کہ بھوک سے مرتے ہوئے کسانوں، سردی سے اکڑتے ہوئے مزدوروں اور لٹی ہوئی عصمتوں کے اسباب و علل کو اس نے کبھی صحیح طور پر سمجھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ یہ باتیں تو ہر فرد کے لئے تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ ہر دل اس پر مجروح ہوتا ہے ہر سینہ اس پر سلگتا ہے محض اس کا بیان کر دینا یا اس طرح بیان کر دینا کہ کچھ لوگوں کو کچھ.. لوگوں سے نفرت ہو جائے شاعری تو نہیں ہے، اپنی نظم "طلوعِ اشتراکیت" میں وہ بڑے زور و شور سے اشتراکیت کے ظہور کا اعلان کرتا ہے

جشن بپا ہے کٹیاؤں میں اونچے ایواں کانپ رہے ہیں
مزدوروں کے بگڑے تیور دیکھ کے سلطاں کانپ رہے ہیں

چوک چوک پر گلی گلی میں سرخ پھریرے لہرائے
مزدوروں کے باغی لشکر سیلِ صفت امڈے آئے

یہ وہ حالات ہیں جن کی ساحر کو ممکن ہے اس دور میں تمنا رہی ہو لیکن ملک کی صورتِ حال یہ نہ تھی۔ یہ کسی اشتراکی کارکن کا حالاتِ واقعی کا مشاہدہ نہیں ہے بلکہ ایک تخیل پسند اشتراکی کا خواب ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے ایک جگہ لکھا ہے: "ساحر کی اٹھان اس کے نہایت درخشندہ مستقبل کی غمازی کر رہی ہے۔ اگر وہ افراط و تفریط سے بچا رہا اور اپنے خلوص کو بے داغ رکھنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ بہت جلد ہندوستان کے ممتاز ترین شعرا کی صف میں شامل ہو جائیگا" ساحر کی اٹھان سے جیسا کہ ابتدا میں کہا جا چکا ہے واقعی ایک روشن مستقبل کی توقعات تھیں لیکن ساحر کی عمر، عشق کی محرومیاں، جنگ کے بعد کے انقلاب پذیر ملکی حالات اور نئی نئی اشتراکیت پسندی، یہ ساری چیزیں مل کر اسے اعتدال سے ہٹا گئیں۔ افراط کے آثار تو ساحر میں ابتدا ہی سے تھے۔ عشق کی ناکامیوں نے مزید جلا رکھ دی۔ اور پھر اشتراکیت کے اثر سے وہ ہر مروج تصور اور عقیدے کا مذاق اڑانے لگا جس سے اسے ٹھیس پہنچی ہو یا جو اس کے اپنے تصور یا عقیدے یا مزاج سے ٹکرایا ہو۔ مثلاً

میں سمجھتا ہوں تقدس کو تمدن کا فریب
تم رسومات کو ایمان بناتی کیوں ہو؟

یا

تم اپنے حسن کی رعنائیوں پہ رحم کرو
وفا فریب ہے طولِ ہوس ہے کچھ بھی نہیں

تقدس کو کسی زمانے میں بھی تمدن کا فریب نہیں سمجھا گیا اور نہ شاید آئندہ کبھی سمجھا جائے۔ اسی طرح وفا کا جذبہ بھی ایک پاکیزہ اور بلند جذبہ ہے جسے طولِ ہوس قرار دینا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح

عقائد، وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی ؛ ابھی تک ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی
مبارک ہو ضعیفی کو خرد کی فلسفہ دانی ؛ جوانی بے نیازِ عبرتِ انجام ہے ساقی

اس میں بھی پہلا شعر پورے کا پورا مذہب سے متعلق مارکسی نقطۂ نظر کی تشریح ہے۔ لینن (Lenin) نے ایک جگہ مذہب کو انسانیت کے لئے افیون قرار دیا ہے۔ دوسرا شعر بھی ——— Soviet Socialism اور اشتراکی سماج Darwinism کا ایک امتزاج ہے جہاں انسان اپنی رہنمائی کے لئے جانوروں کے طرزِ معاشرت اور جبلت و عادات پر نظر ڈالتا ہے۔

اپنے مشرقی سماج و تہذیب میں بڑی خامیاں نظر آتی ہیں اور ان خامیوں سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن یہ خامیاں ان لوگوں کی نظر میں بھی وہی حیثیت رکھتی ہیں جو ساحر کی نظر میں اور اگر کچھ لوگ مشرقی تہذیب کے دلدادہ اور ثنا خواں ہیں تو وہ ان.. برائیوں کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ ان اچھائیوں کی وجہ سے ہیں جن کی مایہ دار یہ تہذیبِ مشرق اب بھی ہے۔ پھر ان برائیوں کو محض اس طرح تو نہیں دور کیا جا سکتا کہ جو لوگ مشرقی تہذیب کو کسی وجہ سے بھی سراہتے ہوں انہیں سے انہیں منسلک کر دیا جائے۔ مثلاً

یہ کوچے یہ نیلام گھر دل کشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں!

اور پھر جن لوگوں نے مشرقی تہذیب کی ثنا خوانی کی ہے یا جو لوگ خودی کے محافظ رہے ہیں ان کی نظر سے بھی دل کشی کے نیلام گھر

پنہاں نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اسی پر اکتفا کیا ہے کہ ان برائیوں کو آشکارا کریں بلکہ ان کے سدباب کے لئے بھی کچھ سوچا ہے۔ ساحر کے اس دور میں اس طرز کے اشعار جابجا ملتے ہیں جہاں بعض کسی چیز سے پڑھ کر اس کا مذاق اڑانے کا جذبہ کار فرما ہے وہ چھپنے دار لینے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ استہزا اور طنز ہی کسی بات کا حل نہیں ہو سکتا اور پھر ساحر اکثر حالات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی تصور یا عقیدہ فنکار کے اپنے عقیدے سے متصادم ہو تو یہ بات کہ اس متقابل عقیدے کے ہر حسن کو بدنمائی سمجھا جائے دیانت اور انصاف کے خلاف ہے۔

جنگ عالمگیر اور اس کے بعد[۴] اگست ۴۷ء تک ساحر کو مستقبل سے بڑی امیدیں وابستہ رہیں چنانچہ وہ اس زمانے کے ہر واقعے کو پرامید نظروں سے دیکھتا ہے اور اس کش مکش کے باوجود جو محبوب اور اشتراکیت کے درمیان وہ محسوس کرتا ہے اور جس کی بنا پر بار بار وہ اسی عالم میں لوٹ جانا چاہتا ہے جس سے وہ نکل کر آیا ہے اس زمانے کے واقعات اسے بہت متاثر کرتے ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں جب روس کی سرخ فوج جرمنی کی سرحد کو عبور کر جاتی ہے تو وہ اپنی نظم "احساس کامراں" میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتے دکھاتا ہے اور چیلنج کرتا ہے کہ

برتر اقوام کے مغرور خداؤں سے کہو ۔ آخری بار ذرا اپنا ترانہ دھرائیں
اور پھر اپنی سیاست پہ پشیماں ہو کر ۔ اپنے ناکام ارادوں کے کفن لے آئیں
سرخ طوفان کی موجوں کو جکڑنے کیلئے ۔ کوئی زنجیر گراں کام نہیں آسکتی
رقص کرتی ہوئی کرنوں کے تلاطم کی قسم ۔ عرصۂ دہر پہ اب شام نہیں چھا سکتی

اسی زمانے میں ماضی کے بار بار آواز دینے کے باوجود وہ ایک بار پھر عزم کرتا ہے کہ وہ زندگی میں اس کی لذتوں کی طرف نہ جھکے گا اور اس کی آسائشوں کو قبول نہ کرے گا اگرچہ

پھر ترے کانپتے ہونٹوں کی فسوں کار ہنسی
جال بننے لگی، بنتی رہی، بنتی ہی رہی
میں کھنچا تجھ سے مگر تو مری راہوں کے لئے
پھول چنتی رہی، چنتی رہی، چنتی ہی رہی

لیکن محبوب کی ان تمام فسوں طرازیوں کے باوجود وہ طے یہی کرتا ہے کہ

آج سے اے مزدور کسانو! میرے راگ تمہارے ہیں
فاقہ کش انسانو! میرے جوگ بہاگ تمہارے ہیں
جب تک تم بھوکے ننگے ہو یہ شعلے خاموش نہ ہوں گے
جب تک بے آرام ہو تم یہ نغمے راحت کوش نہ ہوں گے
(میرے گیت تمہارے ہیں)

لیکن اسے فوراً ہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ راستہ کوئی آسان راستہ نہیں ہے اس راہ کی خارہ شگاف وادیوں اور عمیق و تاریک گھاٹیوں سے گذرتے وقت پرامید رہنا اور حوصلے بلند رکھنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہوا تو ساحر کو ملک کی یہ آزادی بالکل پسند نہ آئی حالانکہ اسی آزادی کا اسے کبھی بڑا زبردست انتظار تھا وہ میدان سیاست کی ہر ہوا میں اس کی خوشبو تلاش کرتا تھا اور جب یہ مہک نہ ملتی تھی تو اسے افسوس ہوتا تھا۔ اسی لئے ۱۹۴۶ء میں شملہ کانفرنس، جس سے آزادی کی بڑی امیدیں تھیں جب ناکام ہو گئی تو وہ چیخ اٹھا

میرے محبوب وطن تیرے مقدر کے خدا
دست اغیار میں قسمت کی عناں چھوڑ گئے
اپنی یک طرفہ سیاست کے تقاضوں کے طفیل
ایک بار اور تجھے نوحہ کناں چھوڑ گئے
(پھر وہی کنج قفس)

لیکن وہ آزادی جس کا اسے انتظار تھا جب اسے ملی تو وہ اسے قبول نہ کر سکا۔ اس کا خیر مقدم اس کے لئے ناممکن ہو گیا۔ آزادی کی یہ "نیلم پری" اس میں شبہ نہیں کہ اپنے جلو میں بے شمار...... بے گناہ انسانوں کا خون بے شمار مجبور عورتوں کی عصمت ریزی اور اسی طرح کی بے پناہ تباہیاں لے کر آئی تھی۔ بلاشبہ ایسے ایسے شرمناک اور انسانیت سوز جرائم اس ملک کے لوگوں نے ایک دوسرے کے ساتھ روا رکھے کہ مہذب انسانیت کی تاریخ میں اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ ہر حساس دل اس پر ملول ہوا۔ ہر دردمند سینے میں اس پر

ہوک اٹھی۔ ہر آنکھ اس پر نم ہوئی اور ہر زبان نے اس کی مذمت کی۔ لیکن تصویر کے اس تاریک رخ کے ساتھ ساتھ اس کا ایک روشن رخ بھی تھا۔ اور وہ روشن رخ سو سالہ غلامی سے آزادی کا رخ تھا لیکن ساحر نے اس زمانے میں جتنی بھی نظمیں لکھیں ان میں اس آزادی کا کہیں بھی خیر مقدم نہیں ہے۔ وہ صرف اس کا ایک ہی رخ دیکھ سکا۔ یہ محض ساحر کے ساتھ کوئی اتفاقیہ واقعہ نہیں ہے بلکہ پورے کا پورا ترقی پسند ادب اسی انداز پر ہے جسے دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت جماعتی پالیسی (Party line) کیا تھی ترقی پسندوں کی اس زمانے کی تمام نظمیں اور افسانے بالاتفاق اس آزادی کی مذمت کرتے ہیں۔ پتہ نہیں انہیں آزادی ہی سے اختلاف تھا۔ یا تقسیم ملک سے یا وہ اس آزادی کے بعد اس ملک میں کسی اور نظام کا خواب دیکھ رہے تھے بہر حال یہ روش کوئی صحت مند روش نہ تھی۔ ساحر کے یہاں ہر ہر قدم پر یہ انداز ملتا ہے مثلاً ؎

یہ جشن جشنِ مسرت نہیں تماشہ ہے
نئے لباس میں نکلا ہو رہزنی کا جلوس
ہزار شمعِ اخوت بجھا کے چمکے ہیں
یہ تیرگی کے ابھارے ہوئے حسین فانوس

(مفاہمت۔ بمبئی ۱۵ اگست)

حالانکہ جہاں تک فسادات کا تعلق ہے وہ بری طرح متاثر ہوا ہے اور اس نے اس رخ کی عکاسی میں اچھی نظمیں کہیں ہیں اپنی نظم 'آج' میں وہ اس قیامت کے نمونے پر ماتم کرتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ بربریت کے ان مظاہروں نے اس کے سارے فن کا خون کر دیا اس کی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ دیا ؎

طرب زار دل پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گذری
دلِ زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گذری
مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے اب تک
مگر اس عالم وحشت میں ایمانوں پہ کیا گذری

(۵)

ساحر کی شاعری کی فضا غم و اندوہ کی فضا ہے۔ اسکا انداز قنوطیت اور یاسیت کا انداز ہے۔ وہ مزاجاً غم پسند ہے۔ وقتی طور پر کہیں کہیں عزم و ہمت کے ایسے چشمے ابل پڑتے ہیں کہ وہ کائنات کا رخ بدلتا محسوس کرتا ہے لیکن اس کی سہل انگار طبیعت زمانے کے بہتے ہوئے دھارے کے مخالف رخ پر کھڑے ہونے اور راڑنے کی تاب نہیں لا پاتی اور بالآخر وہ ذہنی شکست خوردگی کا شکار ہو جاتا ہے وہ غم عشق سے نکل کر غم کائنات میں کھو جانا چاہتا ہے لیکن غم کائنات کی صعوبتیں اسے ڈراتی ہیں اور غم عشق کی لذتیں اسے پکارتی ہیں اور ان دونوں کے سنگم پر کھڑا ہو کر وہ سوچتا رہتا ہے کہ آخر کدھر جائے اس کی رنگا رنگ طبیعت اور نوجوان امنگیں اسے بے قرار رکھتی ہیں وہ شرر کی چمک دیکھ کر اس کی طرف بڑھتا ہے لیکن پھر ستارے اس سے آنکھ مچولی کرنے لگتے ہیں۔ آفتاب کا حسن تاباں بھی اس کے سامنے ہے لیکن قربتیں اسے راس نہیں آتیں اور پھر فاصلوں میں بدل جاتی ہیں ؎

ہر شے قریب آ کے کشش اپنی کھو گئی
وہ بھی علاجِ شوق گریزاں نہ کر سکے

یہ اس کی فطرت کا یہ رجحان مستقلاً اسے آوارۂ منزل رکھتا ہے۔ کامیابی اور کامرانی کا ایسی صورت میں کہاں سوال پیدا ہو سکتا ہے، جبکہ شوق خود گریزاں ہو۔ اسی لئے اگر کبھی اس کا رنگ یہ ہوتا ہے کہ ؎

بہ زعم قوتِ فولاد و آہن دیکھ لو تم بھی
بہ فیضِ جذبۂ ایمانِ محکم ہم بھی دیکھیں گے
جبینِ کج کلاہی خاک پر خم ہم بھی دیکھیں گے

(آوازِ آدم)

تو کبھی نوبت یہ ہوتی ہے کہ ؎

بس اب تو دامنِ دل چھوڑ دو بیکار امیدو!
بہت دکھ سہہ لئے میں نے بہت دن جی لیا میں نے

امید اور ناامیدی کی یہ دھوپ چھاؤں اگر برابر جاری رہتی جب بھی غنیمت تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ مایوسی اس کی فطرت کا رفتہ رفتہ جزو بن گئی۔ یہاں تک کہ وہ محسوس کرنے لگا کہ اب وہ

نعم آرزو کی لو نہیں بڑھا سکتا، وہ منزل کی تلاش کرتا ہے لیکن اس کا تعین نہیں کر پاتا اور نتیجۃً خلاؤں میں بھٹکتا رہتا ہے ؎

نہ کوئی جادہ منزل نہ روشنی کا سراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
انہیں خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر!

وہی ساحر جو ابتداً کائنات کی ہر شے کو قابل توجہ تک نہ سمجھتا تھا اور یہ محسوس کرتا تھا کہ اس دنیا میں کامرانی اور کامیابی کی ضمانت جدوجہد اور قوت میں ہے۔ یہاں بے بسی اور ضعیفی کی سزا عموماً موت ہوتی ہے جو یہ کہہ سکتا تھا کہ ؎

فطرت کی مشیت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

بیگانہ صفت جادۂ منزل سے گزر جا
ہر چیز سزاوار نظارہ نہیں ہوتی

بالآخر سوچنے لگتا ہے کہ ؎

موت آگئی نہ ہو مرے ذوقِ امید کو
محرومیوں میں کیف سا پانے لگا ہوں میں

حیات اک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں شاید
خوشی بھی یاد آتی ہے تو آنسو بن کے آتی ہے

مجھے معلوم ہے انجام رودادِ محبت کا
مگر کچھ اور تھوڑی دیر سعیِ رائگاں کر لوں

یہ محرومیوں میں کیف کی تلاش، یہ احساس کہ زندگی ایک مستقل غم ہے یا یہ اندازِ فکر کہ انجام کار بہرحال ناکامی ہوگی، اس سے بڑھ کر قنوطیت اور شکست خوردگی اور کیا ہو سکتی ہے۔ جہاں ناکامی کا ابتدا ہی سے یقین ہو وہاں خودکشی کے علاوہ اور کیا ممکن ہے اس لئے کہ تمام عمر انسان محض ناکام ہونے کے لئے زندہ نہیں رہ سکتا۔ ساحر بھی اسی انجام سے قریب نظر آتا ہے چنانچہ اپنی نظم "خودکشی سے پہلے" میں کہتا ہے ؎

آہ یہ غار ہلاکت یہ دیئے کا محبس
عمر اپنی انہیں تاریک مکانوں میں کٹی
زندگی فطرت بے حس کی پرانی تقصیر
اک حقیقت تھی مگر چند فسانوں میں کٹی

اور آخرکار ؎

ابھی روشن ہیں ترے گرم شبستاں کے دیئے
آج میں موت کے غاروں میں اتر جاؤں گا

اور دم توڑتی بتی کے دھوئیں کے ہمراہ
سرحدِ مرگِ مسلسل سے گذر جاؤں گا

ساحر کی شاعری کا یہ منتقل رنگ اس کے حزن و یاس شکستگی اور ناامیدی نے اس کے کلام میں درد اور تاثیر کا بے پناہ خزانہ بھر دیا ہے۔ اس کے نغموں میں دل شکستہ اور مایوس انسانوں کے لئے اپنی تسکین غم کا کافی سامان ہے۔ ہاں اس کا دوسرا رخ یہ ضرور ہے کہ اس کے پاس زندگی کی تاریک اور پرہول راہوں سے گذرنے والوں کے لئے روشنی کا کوئی ستارہ یا عزم و ہمت کا کوئی سہارا نہیں ہے۔

(۶)

ساحر کے اسلوب کی دل کشی کا سب سے بڑا سبب اس کی برجستگی اور صاف بیانی ہے۔ غزل ہو یا نظم وہ کہتا وہی ہے جو محسوس کرتا ہے اور پھر اسے صاف صاف اور برملا کہتا ہے اسی لئے اس کے دل سے نکلی ہوئی آواز بیشتر قاری کو اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے اور پھر چونکہ اس کی محبت کوئی روایتی یا تخیلی محبت نہیں ہے بلکہ اسی دور کا ایک حادثہ ہے جس دور سے ہم گذر رہے ہیں اس لئے اس میں ہمیں ممکن ہے کہ بہت سی باتیں اردو ادب کی روایات سے مختلف نظر آئیں۔ لیکن اس دور کے تقاضوں کے عین مطابق نظر آتی ہیں ؎

ہوس نصیب نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں

پھر زندگی کی ناکامیوں اور محرومیوں نے اسے ایک سوز و گداز بھی عطا کیا ہے جو اس کے کلام میں رچا بسا ہوا ہے اور اس بات سے تو شاید کسی کو انکار نہ ہو کہ سوز و گداز ہی میں کلام کی اثرانگیزیوں کی ضمانت ہوتی ہے۔

ساحر کی زبان بھی بڑی پاکیزہ اور شستہ ہے۔ ترقی پسندوں کی صحبت نے اس پر اپنا اثر ضرور چھوڑا ہے اور کہیں کہیں ہمیں ایسی ترکیبیں ملتی ہیں جو بار خاطر معلوم ہوتی ہیں مثلاً ؎

؎ سرد راتوں کی سلگتی ہوئی تنہائی میں
؎ مضمحل راستے سسکیاں لے

۶ یہاں میری بجائے اک جھلکتی کارد کھلا دے
۶ زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے
۶ یہ تم نے ٹھیک کہا ہے تمہیں ملانہ کردں
لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سی نئی ترکیبیں بھی اس نے

اختیار کی ہیں جو خاص حسین اور دلکش ہیں اور جن کا اندازہ اس کے ان اشعار کو دیکھ کر بہ آسانی کیا جا سکتا ہے جو اس سے قبل نقل کئے جا چکے ہیں۔

جگر مرادآبادی

صیاد پہ ظاہر ابھی یہ راز نہیں ہے
پرواز اسیر پر پرواز نہیں ہے

حالانکہ وہ اب مرحمتِ ناز نہیں ہے
خوش ہوں کہ مرا غم نظر انداز نہیں ہے

کیا قحطِ محبت ہے کہ اس دورِ ہوس میں
دل باز بہت ہیں کوئی جانباز نہیں ہے

میں طائر آوارہ و رسوا تو ہوں لیکن
محدود چمن تک مری پرواز نہیں ہے

آجاؤ کہ اب خلوتِ غم خلوتِ غم ہے
اب دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے

آنکھیں ہوں تو وہ کونسا ذرّہ ہے جلائے دوست
خود اپنی جگہ انجمنِ ناز نہیں ہے

ہے گرم سفر کس کے لئے کب سے زمانہ
اس طرح کہ قدموں کی بھی آواز نہیں ہے

… کا ر دکھلا د۔

… روز ہر یہ کبھی پڑا

… ٹھیک کہا ہے تم نے

سکینہ/بلقیس شفقت کاظمی ●

○

مفت اک چاہنے والے سے خفا ہو جانا
راس آئے تجھے مہمان خفا ہو جانا

شوق آوارۂ ہر راہ گذر ہے اب تک
قہر تھا کوچۂ جاناں سے جدا ہو جانا

نگہ یار سے ناکام تمنا ہو کر
وہ مرا اپنے مقدر سے خفا ہو جانا

میری گستاخ نگاہی کا نتیجہ تو نہیں
تیری شوخی کا باندازِ حیا ہو جانا

بارش لطف و کرم غیر پہ کرنے والے
میرے حق سے بھی کسی روز ادا ہو جانا

ذکر آئے میری بربادئ دل کا جو کبھی
کچھ نہ کچھ تم بھی پشیمانِ جفا ہو جانا

شکر صد شکر کہ تاثیرِ وفا کام آئی
حسن بے مہر نے چاہا تھا خفا ہو جانا

مجھ کو نظروں سے گرا کر بھی انہیں صبر نہیں
جانیئے اپنے مقدر میں ہے کیا ہو جانا

تیری آزردہ نگاہی سے نہیں مجھکو گلا
میری قسمت میں تھا برباد جفا ہو جانا

اپنے احساس محبت سے ہیں نادم اب تک
ہم نے چاہا تھا کبھی تجھ سے جدا ہو جانا

تجھ سے ممکن ہو تو اے یار باین بعد کبھی
میری دنیائے تصور میں ذرا ہو جانا

جان دینا تو رہِ عشق میں دینا شفقت
آنے والوں کے لئے نقش وفا ہو جانا

(بشکریہ "ایشیا")

انجم میرزا

نیا حاتم

اقتصادیات کے پروفیسر اہرمن کا تقرر پروفیسر شوکت اور اس کے چند ہم نوا طالب علموں کے سوا باقی سب کے لئے پریشان کن تھا۔ کسی کو بھی امید نہ تھی کہ بورڈ پروفیسر اہرمن کے چناؤ پر یوں بے صبری کا اظہار کرے گا۔ یوں تو پروفیسر ارشد اقتصادیات پر ٹھوس معلومات رکھتا تھا۔ لڑکے بڑی توجہ سے اس کی ہر بات سنتے تھے اس کے لکھائے ہوئے نوٹس بڑی آسانی سے ذہن نشین ہو جاتے تھے۔ مگر بورڈ اس کے پڑھانے کے انداز سے مطمئن نہ تھا۔ اس کے خیالات نئے تقاضوں کا ساتھ نہ دیتے تھے۔ اس کی باتوں سے قدامت کی بو آتی تھی۔ اور بورڈ کی نظروں میں پروفیسر ارشد کا وجود کالج کے وقار کے منافی تھا۔ اور اب اس کا یہ انداز زیادہ دیر تک برداشت نہ کیا جا سکتا تھا۔ لڑکوں کو بھی خبر مل چکی تھی۔ کہ پروفیسر ارشد کو برخواست کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، انھوں نے ایک میٹنگ میں اس پر مکمل اعتماد کا ریزولیشن پاس کیا۔ مگر بورڈ نے لڑکوں کے مطالبے کو طفلانہ جنون سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اور پروفیسر اہرمن نے ارشد کی جگہ سنبھال لی۔ شوکت اور اس کے ہم نواؤں نے پروفیسر اہرمن کا شاندار خیر مقدم کیا۔ اسے ٹی پارٹی دی۔ اس کی آمد کو کالج کے سنہری دور کے آغاز سے تعبیر کیا۔ خوشامدانہ باتوں سے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ کہ اگر وہ بورڈ کی پرخلوص دعوت قبول نہ کرتا تو کالج کے بند ہو جانے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ مخالف گروپ کے لڑکوں کے شور مچانے کے باوجود پروفیسر اہرمن کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اس نازک وقت میں کالج کو واقعی اس کی سخت ضرورت تھی۔ اس جیسا مدبر آدمی ہی کالج کی زندگی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھانپ گیا۔ کہ پروفیسر شوکت اس کے کام کا آدمی ہے ماحول کو سازگار بنانے میں وہ اس سے بہت مدد لے سکتا ہے۔

جوابی تقریر میں اس نے شوکت کی اس عزت افزائی کی بہت تعریف کی۔ اسے اپنے تعاون کا پورا یقین دلایا۔ اور اس پارٹی میں شرکت نہ کرنے والے مخالف گروپ کے لڑکوں کو برا بھلا کہنے کی بجائے پیار بھرے لہجے میں ان شکوک کو مٹانے کی کوشش کی۔ جو اس کے خیال کے مطابق غلط پراپیگنڈہ کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ شوکت اور اس کے ہمنوا بہت خوش تھے کہ پروفیسر اہرمن کی پوزیشن مستحکم ہو گئی ہے اس کے بیداغ کریکٹر کی سند اس کا امن پسند رویہ ہے۔ اس کی عظمت کی نشانی اس کا تعصب سے پاک دل ہے ——

دوسری شام کو کالج میں ایک رنگا رنگ پروگرام تھا۔ اور پروفیسر نے شوکت سے مل کر اپنی مخالفت کا زور کم کرنے کی خاطر ایک کامیاب اسکیم بنالی تھی —— پہلے ایک ایکٹ کا ڈرامہ کھیلا گیا۔ پھر فینسی ڈریس کا مقابلہ ہوا۔ اس کے بعد فلمی گیت گائے گئے۔ پروفیسر اہرمن شوکت کے ساتھ پہلی قطار میں بیٹھا لطف اندوز ہو رہا تھا۔ انعامات تقسیم ہونے کا اعلان ہوا۔ اور لڑکوں کی تالیوں کے شور سے ہال گونج اٹھا —— انعامات تقسیم ہونے کے کے بعد شوکت نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر مائک پر اعلان کیا:۔

"اب پروفیسر اہرمن صاحب اپنی طرف سے انعامات تقسیم کریں گے۔ اس پروگرام میں حصہ لینے والے ہر لڑکے کو انعام پیش کیا جائے گا۔ برائے مہربانی وہ سب اسٹیج کے پاس آجائیں"

پروفیسر اہرمن کی یہ سخاوت حیران کن اور مسرت افزا تھی اپنی فیاضی کا مظاہرہ یوں پہلے کبھی کسی کی طرف سے نہ کیا گیا تھا شوکت نے اسٹیج کی پچھلی طرف کھڑکی میں رکھے ہوئے اٹیچی کیس کو کھولا۔ انعامات تقسیم ہونے لگے۔ یونین کی طرف سے پہلا اور دوسرا انعام حاصل کرنے والے لڑکوں کو کیمرے پیش کئے گئے۔ دوسرے

۔ گار دکھلا دے

۔ روز ہر پہ کبھی

۔ ٹھیک کہا ہے تمہیں

شفقت کاظمی ●

مفت اک چاہنے والے سے خفا ہو جانا ۔۔۔ راس آئے تجھے مہمانِ خفا ہو جانا

شوقِ آوارۂ ہر راہ گذر ہے اب تک ۔۔۔ قہر تھا کوچۂ جاناں سے جدا ہو جانا

نگۂ یار سے ناکام تمنا ہو کر ۔۔۔ وہ مرا اپنے مقدر سے خفا ہو جانا

میری گستاخ نگاہی کا نتیجہ تو نہیں ۔۔۔ تیری شوخی کا بانداز حیا ہو جانا

بارشِ لطف و کرم غیر پہ کرنے والے ۔۔۔ میرے حق سے بھی کسی روز ادا ہو جانا

ذکر آئے میری بربادیٔ دل کا جو کبھی ۔۔۔ کچھ نہ کچھ تم بھی پشیمانِ جفا ہو جانا

شکر صد شکر کہ تاثیرِ وفا کام آئی ۔۔۔ حسن بے مہر نے چاہا تھا خفا ہو جانا

مجھ کو نظروں سے گرا کر بھی انہیں صبر نہیں ۔۔۔ جانیئے اپنے مقدر میں ہے کیا ہو جانا

تیری آزردہ نگاہی سے نہیں مجھکو گلا ۔۔۔ میری قسمت میں تھا برباد جفا ہو جانا

اپنے احساس محبت سے ہیں نادم اب تک ۔۔۔ ہم نے چاہا تھا کبھی تجھ سے جدا ہو جانا

تجھ سے ممکن ہو تو اے یار بایں بعد کبھی ۔۔۔ میری دنیائے تصور میں ذرا ہو جانا

جان دینا تو رہِ عشق میں دینا شفقت

آنے والوں کے لئے نقشِ وفا ہو جانا

(بشکریہ "ایشیا")

انجم میرزا

نیا حاتم

اقتصادیات کے پروفیسر اہرمن کا تقرر پروفیسر شوکت اور
اس کے چند ہم نوا طالب علموں کے سوا باقی سب کے لئے پریشان کن
تھا۔ کسی کو بھی امید نہ تھی کہ بورڈ پروفیسر اہرمن کے چناؤ پر یوں بے
صبری کا اظہار کرے گا۔ یوں تو پروفیسر ارشد اقتصادیات پر ٹھوس
معلومات رکھتا تھا۔ لڑکے بڑی توجہ سے اس کی ہر بات سنتے تھے
اس کے لکھائے ہوئے نوٹس بڑی آسانی سے ذہن نشین ہو جاتے
تھے۔ مگر بورڈ اس کے پڑھانے کے انداز سے مطمئن نہ تھا۔ اس کے
خیالات نئے تقاضوں کا ساتھ نہ دیتے تھے۔ اس کی باتوں سے قدامت
کی بو آتی تھی۔ اور بورڈ کی نظروں میں پروفیسر ارشد کا وجود کالج کے
مفاد کے منافی تھا۔ اور اب اس کا یہ انداز زیادہ دیر تک برداشت
نہ کیا جا سکتا تھا۔ لڑکوں کو بھی خبر مل چکی تھی۔ کہ پروفیسر ارشد کو
برخواست کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، انھوں نے ایک میٹنگ میں
اس پر مکمل اعتماد کا ریزولیشن پاس کیا۔ مگر بورڈ نے لڑکوں کے
مطالبے کو طفلانہ جنون سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اور پروفیسر اہرمن نے ارشد
کی جگہ سنبھال لی۔ شوکت اور اس کے ہم نواؤں نے پروفیسر اہرمن
کا شاندار خیر مقدم کیا۔ اسے ٹی پارٹی دی۔ اس کی آمد کو کالج کے
سنہری دور کے آغاز سے تعبیر کیا۔ خوشامدانہ باتوں سے اسے یقین
دلانے کی کوشش کی۔ کہ اگر وہ بورڈ کی پر خلوص دعوت قبول نہ کرتا تو
کالج کے بند ہو جانے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ مخالف گروپ کے لڑکوں
کے شور مچانے کے باوجود پروفیسر اہرمن کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی
کہ اس نازک وقت میں کالج کو واقعی اس کی سخت ضرورت تھی۔
اس جیسا مدبر آدمی ہی کالج کی زندگی کو برقرار رکھ سکتا ہے اس کے
ساتھ ہی وہ بھانپ گیا۔ کہ پروفیسر شوکت اس کے کام کا آدمی ہے
ماحول کو سازگار بنانے میں وہ اس سے بہت مدد لے سکتا ہے۔

جوابی تقریر میں اس نے شوکت کی اس عزت افزائی کی بہت تعریف
کی۔ اسے اپنے تعاون کا پورا یقین دلایا۔ اور اس پارٹی میں شرکت
نہ کرنے والے مخالف گروپ کے لڑکوں کو برا بھلا کہنے کی بجائے
پیار بھرے لہجے میں ان شوک کو مٹانے کی کوشش کی۔ جو اس کے
خیال کے مطابق غلط پراپیگنڈہ کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے شوکت
اور اس کے ہمنوا بہت خوش تھے کہ پروفیسر اہرمن کی پوزیشن مستحکم
ہو گئی ہے اس کے بیداغ کریکٹر کی سند اس کا امن پسند رویہ ہے
اس کی عظمت کی نشانی اس کا تعصب سے پاک دل ہے ——
دوسری شام کو کالج میں ایک رنگا رنگ پروگرام تھا۔ اور
پروفیسر نے شوکت سے مل کر اپنی مخالفت کا زور کم کرنے کیخاطر
ایک کامیاب اسکیم بنالی تھی —— پہلے ایک ایکٹ کا ڈرامہ
کھیلا گیا۔ پھر فینسی ڈریس کا مقابلہ ہوا۔ اس کے بعد فلمی گیت گائے
گئے۔ پروفیسر اہرمن شوکت کے ساتھ پہلی قطار میں بیٹھا لطف
اندوز ہو رہا تھا۔ انعامات تقسیم ہونے کا اعلان ہوا۔ اور لڑکوں کی
تالیوں کے شور سے ہال گونج اٹھا —— انعامات تقسیم ہونے کے
کے بعد شوکت نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر مائیک پر اعلان کیا:۔
"اب پروفیسر اہرمن صاحب اپنی طرف سے انعامات تقسیم
کریں گے۔ اس پروگرام میں حصہ لینے والے ہر لڑکے کو انعام
پیش کیا جائے گا۔ برائے مہربانی وہ سب اسٹیج کے پاس آجائیں"
پروفیسر اہرمن کی یہ سخاوت حیران کن اور مسرت افزا تھی
اپنی فیاضی کا مظاہرہ یوں پہلے کبھی کسی کی طرف سے نہ کیا گیا تھا
شوکت نے اسٹیج کی پچھلی طرف کھڑکی میں رکھے ہوئے اٹیچی کیس کو
کھولا۔ انعامات تقسیم ہونے لگے۔ یونین کی طرف سے پہلا اور دوسرا
انعام حاصل کرنے والے لڑکوں کو کیمرے پیش کئے گئے۔ دوسرے

ع یہاں میری بجائے اک چمکتی کار دکھلا دے
ع زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا
ع یہ تم نے ٹھیک کہا ہے تمہیں
ملک شفقت کاظمی ●

○

مفت اک چاہنے والے سے خفا ہو جانا ... راس آئے تجھے مہمانِ خفا ہو جانا

شوق آوارۂ ہر راہ گذر ہے اب تک ... قہر تھا کوچۂ جاناں سے جدا ہو جانا

نگۂ یار سے ناکام تمنا ہو کر ... وہ مرا اپنے مقدر سے خفا ہو جانا

میری گستاخ نگاہی کا نتیجہ تو نہیں ... تیری شوخی کا باندازِ حیا ہو جانا

بارشِ لطف و کرم غیر پہ کرنے والے ... میرے حق سے بھی کسی روز ادا ہو جانا

ذکر آئے میری بربادیٔ دل کا جو کبھی ... کچھ نہ کچھ تم بھی پشیمانِ جفا ہو جانا

شکر صد شکر کہ تاثیرِ وفا کام آئی ... حسن بے مہر نے چاہا تھا خفا ہو جانا

مجھ کو نظروں سے گرا کر بھی انہیں صبر نہیں ... جانیئے اپنے مقدر میں ہے کیا ہو جانا

تیری آزردہ نگاہی سے نہیں مجھکو گلا ... میری قسمت میں تھا برباد جفا ہو جانا

اپنے احساس محبت سے ہیں نادم اب تک ... ہم نے چاہا تھا کبھی تجھ سے جدا ہو جانا

تجھ سے ممکن ہو تو اے یار بایں بعد کبھی ... میری دنیائے تصور میں ذرا ہو جانا

جان دینا تو رہِ عشق میں دینا شفقت
آنے والوں کے لئے نقشِ وفا ہو جانا

(بشکریہ "ایشیا")

اخم میرزا

نیا حاتم

اقتصادیات کے پروفیسر اہرمن کا تقرر پروفیسر شوکت اور اس کے چند ہم نوا طالب علموں کے سوا باقی سب کے لئے پریشان کن تھا۔ کسی کو بھی امید نہ تھی کہ بورڈ پروفیسر اہرمن کے چناؤ پر یوں بے صبری کا اظہار کرے گا۔ یوں تو پروفیسر ارشد اقتصادیات پر ٹھوس معلومات رکھتا تھا۔ لڑکے بڑی توجہ سے اس کی ہر بات سنتے تھے اس کے اٹھائے ہوئے نوٹس بڑی آسانی سے ذہن نشین ہو جاتے تھے۔ مگر بورڈ اس کے پڑھانے کے انداز سے مطمئن نہ تھا اس کے خیالات نئے تقاضوں کا ساتھ نہ دیتے تھے۔ اس کی باتوں سے قدامت کی بو آتی تھی۔ اور بورڈ کی نظروں میں پروفیسر ارشد کا وجود کالج کے وقار کے منافی تھا۔ اور اب اس کا یہ انداز زیادہ دیر تک برداشت نہ کیا جا سکتا تھا۔ لڑکوں کو بھی خبر مل چکی تھی۔ کہ پروفیسر ارشد کو برخواست کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، انھوں نے ایک میٹنگ میں اس پر مکمل اعتماد کا ریزولیشن پاس کیا۔ مگر بورڈ نے لڑکوں کے مطالبے کو طفلانہ جنون سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اور پروفیسر اہرمن نے ارشد کی جگہ سنبھال لی۔ شوکت اور اس کے ہم نواؤں نے پروفیسر اہرمن کا شاندار خیر مقدم کیا۔ اسے ٹی پارٹی دی۔ اس کی آمد کو کالج کے سنہری دور کے آغاز سے تعبیر کیا۔ خوشامدانہ باتوں سے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ کہ اگر وہ بورڈ کی پر خلوص دعوت قبول نہ کرتا تو کالج کے بند ہو جانے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ مخالف گروپ کے لڑکوں کے شور مچانے کے باوجود پروفیسر اہرمن کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اس نازک وقت میں کالج کو واقعی اس کی سخت ضرورت تھی۔ اس جیسا مدبر آدمی ہی کالج کی زندگی کو برقرار رکھ سکتا ہے اس کے بہاتھ ہی وہ بھانپ گیا۔ کہ پروفیسر شوکت اس کے کام کا آدمی ہے ماحول کو سازگار بنانے میں وہ اس سے بہت مدد لے سکتا ہے۔

جوابی تقریر میں اس نے شوکت کی اس عزت افزائی کی بہت تعریف کی۔ اسے اپنے تعاون کا پورا یقین دلایا۔ اور اس پارٹی میں شرکت نہ کرنے والے مخالف گروپ کے لڑکوں کو برا بھلا کہنے کی بجائے پیار بھرے لہجے میں ان شکوک کو مٹانے کی کوشش کی۔ جو اس کے خیال کے مطابق غلط پراپیگنڈہ کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے شوکت اور اس کے ہمنوا بہت خوش تھے کہ پروفیسر اہرمن کی پوزیشن مستحکم ہو گئی ہے اس کے بیداغ کریکٹر کی سند اس کا امن پسند رویہ ہے۔ اس کی عظمت کی نشانی اس کا تعصب سے پاک دل ہے ——

دوسری شام کو کالج میں ایک رنگا رنگ پروگرام تھا۔ اور پروفیسر نے شوکت سے مل کر اپنی مخالفت کا زور کم کرنے کی خاطر ایک کامیاب اسکیم بنالی تھی —— پہلے ایک ایکٹ کا ڈرامہ کھیلا گیا۔ پھر فینسی ڈریس کا مقابلہ ہوا۔ اس کے بعد فلمی گیت گائے گئے۔ پروفیسر اہرمن شوکت کے ساتھ پہلی قطار میں بیٹھا لطف اندوز ہو رہا تھا۔ انعامات تقسیم ہونے کا اعلان ہوا۔ اور لڑکوں کی تالیوں کے شور سے ہال گونج اٹھا —— انعامات تقسیم ہونے کے بعد شوکت نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر مائیک پر اعلان کیا:-

"اب پروفیسر اہرمن صاحب اپنی طرف سے انعامات تقسیم کریں گے۔ اس پروگرام میں حصہ لینے والے ہر لڑکے کو انعام پیش کیا جائے گا۔ برائے مہربانی وہ سب اسٹیج کے پاس آجائیں"

پروفیسر اہرمن کی یہ سخاوت حیران کن اور مسرت افزا تھی اپنی فیاضی کا مظاہرہ یوں پہلے کبھی کسی کی طرف سے نہ کیا گیا تھا شوکت نے اسٹیج کی پچھلی طرف کھڑکی میں رکھے ہوئے اٹیچی کیس کو کھولا۔ انعامات تقسیم ہونے لگے۔ یونین کی طرف سے پہلا اور دوسرا انعام حاصل کرنے والے لڑکوں کو کپڑے پیش کئے گئے۔ دوسرے

لڑکوں کو اعلیٰ قسم کے فونٹن پین اور رنگین تصاویر کے البم دیئے گئے۔ سبھی انعام پاکر خوش تھے۔ اور دوسرے لڑکے یوں رشک بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جیسے کسی اگلی تقریب پر کوئی نہ کوئی پارٹ ادا کرنے کا عہد کر رہے ہوں۔ جو لڑکے مخالف گروپ کے نعروں سے مرعوب ہوکر پروفیسر اہرمن کو برا سمجھ رہے تھے۔ ان کے دلوں میں بھی ایک نیا جذبہ کسمسا رہا تھا۔ جو لڑکے محض خود نمائی کی بدولت شہیدوں میں نام لکھوانا چاہتے تھے۔ ان کے ذہن پروفیسر اہرمن کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ اختتام پر پروفیسر اہرمن نے مختصر سی تقریر کی۔ مائیک کو پکڑ کر اس نے ہال کا جائزہ لے کر کہا:۔

"پیارے بچو! یہاں آنے سے پہلے میں نے آپ کے متعلق یہ رائے بھی قائم کی تھی۔ کہ آپ میں ابھی آزادی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا شعور پیدا نہیں ہوا۔ مگر کالج کے نوجوانوں نے میری اس رائے کو بدل دیا ہے۔ میں بہت خوش ہوا ہوں۔ اور آپ کے سنہری مستقبل کے لئے دعاگو ہوں ـــ البتہ ـــ ایک بات مجھے بری طرح کھٹکی ہے۔ اس پروگرام میں کسی لڑکی نے حصہ نہیں لیا آزادی کی راہ میں یہ ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ آپ اگر یونہی ایک دوسرے سے کھچے کھچے رہے۔ تو کبھی بھی آپ منزل تک نہ پہنچ سکیں گے۔ آپ کو تعلیم سے فارغ ہوکر ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ آپ مستقبل کے معمار ہیں۔ امید ہے آئندہ سب لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ پورے تعاون کا ثبوت دیں گی۔"

اس تقریر نے لڑکیوں کے جذبات کو گرما دیا۔ مخالف گروپ کے پراپیگنڈے میں یہ بات بھی شامل ہوگئی۔ کہ پروفیسر اہرمن نے ہماری اخلاقی اقدار کا مذاق اڑایا ہے۔ مگر لڑکیوں کی اکثریت نے تو پروفیسر اہرمن کی عظمت کے قصیدے پڑھنے شروع کر دیئے تھے ان کے دل و دماغ پر بغاوت کے سائے پھیل رہے تھے۔ اور اتوار کی صبح کو سبھی لڑکے حیران رہ گئے تھے کہ وہ لڑکیاں جو ماتھے پر بل ڈال کر غصیلی نظروں سے گھور کر۔ گردنیں اکڑائے ان کے پاس سے گزر جایا کرتی تھیں۔ اب ان کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں ـــ ہفتے کی صبح کو شوکت نے نوٹس بورڈ پر موٹے حروف میں لکھ دیا:۔

"پروفیسر اہرمن صاحب نے پک نک پارٹی کا پروگرام بنایا ہے جو کوئی بھی شامل ہونا چاہے۔ اتوار کی صبح کو کوئین گارڈن میں پہنچ جائے ـــ"

اور اتوار کی صبح کو کوئین گارڈن میں ایک میلہ سا لگ گیا۔ لڑکوں کی تعداد توقع سے بہت زیادہ تھی۔ مخالف گروپ کے کئی لڑکے شامل ہوئے تھے۔ لڑکیاں بھی کافی تعداد میں تھیں۔ اور کالج کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ لڑکیوں نے یوں فراخدلی سے لڑکوں کا ساتھ دیا تھا۔ شوکت نے بسوں کا انتظام پہلے ہی کر رکھا تھا۔ یہ قافلہ شہر سے دور ندی کے کنارے آموں کے باغ میں پہنچ گیا۔ چائے اور کھانے کا انتظام ہوٹل قوس قزح کے سپرد تھا۔ دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ میز کرسیاں سجی ہوئی تھیں۔ اور قافلے کا ہر فرد یہاں پہنچ کر خود کو کسی دوسری دنیا میں پا رہا تھا۔ پکنک کا پروگرام بڑی آزادی اور رنگینی سے منایا گیا تیراکی کے مقابلے ہوئے۔ سازوں کے ریکارڈ پر رقص کیا گیا۔ پروفیسر اہرمن کے لطیفوں سے لطف اٹھایا گیا۔ لڑکیوں نے بھی خوب ادھم مچایا تھا۔ پہلی دفعہ انہیں یوں کھل کر لڑکوں کے ساتھ گھل مل جانے کا موقع ملا تھا۔ اور وہ جی بھر کر اس چانس سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھیں۔ اور پروفیسر اہرمن بے انتہا خوشی محسوس کر رہا تھا۔ کہ پہلے قدم پر ہی راستے کی ناہمواریاں بہت حد تک دور ہو گئی ہیں ـــ البتہ شوکت کو شاہینہ کی کمی بری طرح محسوس ہوئی تھی۔ وہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ دوسری جگہ ایک سوشل تقریب میں حصہ لینے کی خاطر گئی ہوئی تھی۔ اگر وہ یہاں ہوتی تو شوکت ضرور اسے اس پروگرام میں شریک کر لیتا۔ وہ ایک ایسے ہی موقع کا منتظر تھا۔ پروفیسر اہرمن سے اسے متعارف کرا کر وہ چاہتا تھا کہ اپنے باپ کی مخالفت کو ہمدردی میں بدل دے۔ شاہینہ سے بے پناہ محبت تھی۔ شاہینہ بھی اسے چاہتی تھی۔ مگر شوکت اپنے باپ کے دبدبے کی بدولت اس کے سامنے ابھی تک دل کی بات زبان پر نہ لا سکا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ اس کا باپ اس کی شادی اپنے خاندان ہی میں کرنا چاہتا ہے اور اس

نے ایک لڑکی کا انتخاب بھی کر لیا ہے۔ شوکت کسی حال میں بھی ایک گنوار لڑکی کو شریک زندگی بنانے پر تیار نہ تھا۔ اور اس پر بھی اس نے کھل کر اپنے باپ کے سامنے مدعا بیان نہ کیا تھا۔ کالج میں پروفیسر اہرمن کی حکمت عملی سے اسے یقین سا ہو چکا تھا کہ وہ اپنے باپ کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور دن بدن یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور اب پکنک پارٹی پر اسے شاہینہ کی غیر موجودگی میں کوئی خاص لطف حاصل نہ ہوا تھا۔ کالج میں اس پارٹی کا بہت چرچا ہوا۔ جو لڑکے شامل نہ ہوئے تھے۔ انھیں سخت افسوس ہوا۔ مخالف گروپ کی طاقت کمزور ہو گئی۔ مخالف گروپ کے لیڈر ہاشمی کو لڑکوں کی دوغلی پالیسی پر تعجب بھی ہوا اور افسوس بھی۔ اسے لڑکوں کے یوں اتنی جلدی گمراہ ہو جانے کا خیال تک نہ آیا تھا۔ وہ لڑکوں کو ہوشمند اور ہوشیار سمجھتا تھا۔ اور اب لڑکوں کی اکثریت نے بھی چمک سے مرعوب ہو کر پروفیسر اہرمن کے اشاروں پر ناچنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنی مہم تیز کر دی۔ کالج میں ہڑتال کرانے کی خاطر وہ لڑکوں کو اکسانے لگا اور بورڈ نے اس کی باغی سرگرمیوں سے آگاہ ہو کر اسے کالج سے نکال دیا —— شوکت کے لئے یہ کامیابی بہت مسرت انگیز تھی۔

مخالفت کا زور اب بہت کم ہو گیا تھا۔ اس فتح پر اس نے پروفیسر اہرمن کو مبارکباد دی —— اور ساتھ ہی اسے گھر پر کھانے پر مدعو کیا —— پروفیسر اہرمن نے خندہ پیشانی سے اس کی دعوت منظور کر لی، اور پائپ سلگاتے ہوئے کہا:۔

"میں خود تمہارے دولت خانے پر جانے کے لئے بے چین تھا۔ تم سے اس لئے ذکر نہ کیا کہ شاید میرا جانا تمہارے خاندان کے لئے موزوں نہ ہو۔" شوکت جلدی سے بول پڑا:۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کالج کی سرگرمیوں میں اتنی فرصت ہی نہ مل سکی۔ کہ آپ کو گھر پر مدعو کرتا۔ امید ہے میرے متعلق کوئی غلط نظریہ قائم نہ کریں گے۔"

پروفیسر اہرمن نے مسکرا کر کہا:۔

"نہیں بھئی۔ تم تو میرے خاص عزیز ہو۔ بھلا تم سے میں ناراض ہو سکتا ہوں!" —— شام کو غنیمت سمجھ کر شوکت نے اپنی محبت کا تذکرہ شروع کر دیا۔ اپنے باپ کی ضد کا حال بیان کیا شاہینہ کی جدائی میں اپنے بیتاب دل کا قصہ بیان کیا۔ اور پروفیسر اہرمن کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ضرور اس معاملہ میں اس کی مدد کرے گا۔ —— شوکت دعوت تو دے آیا تھا۔ مگر اپنی حویلی کی حالت دیکھ کر اسے ندامت سی محسوس ہونے لگی۔ چھوٹی اینٹوں کی بنی ہوئی ایک پرانی طرز کی حویلی تھی۔ یہ حویلی اسکے بزرگوں کی یادگار تھی اور ان کی اولاد نے کسی دوسری جگہ منتقل ہونے کی کوشش نہ کی تھی۔ اس کی حالت اب پہلے جیسی نہ رہی تھی۔ صحن کی دیواریں شکستہ ہو چکی تھیں۔ مشرقی دیوار میں بڑا سا شگاف پڑ چکا تھا جس کے راستے اندر داخل ہو کر محلے کے کھلنڈرے لڑکے صحن میں ادھم مچایا کرتے تھے۔ اندرونی حالت تو بہت خراب تھی۔ شوکت کا باپ کبھی اس قابل نہ ہوا تھا۔ کہ باقاعدہ طور پر حویلی کی مرمت کرا سکے۔ تمام عمر کلرکی کرنے کے بعد اب اسے چند روپے پنشن میں ملتے تھے۔ روکھی سوکھی کھا کر پھٹا پرانا پہن کر اس نے شوکت کو تعلیم دلوائی تھی۔ اور شوکت پروفیسر بن کر اس حویلی میں رہائش اختیار کرنے سے اندر ہی اندر وہ کڑھتا رہتا تھا۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ مگر بوڑھے ماں باپ اور تین جوان بہنوں کی موجودگی کا احساس اس کے خوابوں کے گل پوش جزیروں میں دھوئیں کے زہریلے بادل پھیلا دیتا تھا۔ وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جہاں دلفریب سیرگاہیں اور دلکش تفریح گاہیں ہوں۔ خوبصورت ہوٹلوں اور حسین رقص گاہوں میں آزادانہ گھومتا پھرے اور غلیظ لوگوں کا عکس تک وہاں نظر نہ آئے۔۔ ایسی دنیا تک پہنچنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ تو شاہینہ تک کو اپنا رفیق زندگی نہ بنا سکتا تھا۔ مگر پروفیسر اہرمن کی آمد کے بعد اس کے چہرے پر ایک مسرور کن مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ جیسے وہ شاہینہ کے بازو میں بازو ڈالے رنگین وادیوں میں گھوم رہا ہو —— چھٹی کے دن صبح سویرے اس کی آنکھ کھل گئی۔ مہتر کو کل ہی اس نے صبح آنے کو کہہ دیا تھا۔ بہنوں کے ساتھ مل کر اس نے کمرے کی ہر چیز کو جھاڑا پونچھا۔ گیلے کپڑے سے پرانے فرنیچر کو چمکانے کی کوشش کی۔ مٹی کے روغنی گلدانوں

میں پھولوں کے گلدستے سجائے۔ پردوں پر استری پھیر کر ان کی شکنیں درست کیں، اور گھر کے ہر فرد کو دھلے ہوئے کپڑے پہننے کا حکم دیکر حویلی سے باہر نکل آیا۔ ہوٹل میں پروفیسر ابر من اس کا انتظار کر رہا تھا۔ شوکت کو دیکھ کر وہ بولا:۔

"بھئی۔ میں تو تمہارے گھر پہنچنے کے لئے بہت مضطرب ہوں کیوں نہ وہیں چل کر گپ بازی کی جائے۔"

شوکت نے سعادتمندی سے گردن جھکاتے ہوئے کہا:۔

"آپ کی ذرہ نوازی کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔"

پروفیسر ابر من نے میز پر رکھا ہوا بڑا سا پیکٹ پکڑ لیا۔ اور دونوں حویلی کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ پروفیسر کی کار چند لڑکے مانگ کر لے گئے تھے۔ اور شوکت کی مرضی بھی پیدل حویلی تک جانے کی تھی۔ پروفیسر کو کار کے بغیر اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی۔ وہ یوں فخر سے قدم اٹھا رہا تھا جیسے وہ کوئی حاتم ہو۔ حویلی کے دروازے پر پہنچ کر پروفیسر ابر من نے بڑے غور سے شکستہ دیواروں اور بڑے دروازے کی خستہ حالت کا جائزہ لیا اور اندر قدم رکھ کر بولا:۔

"ہمارے ہاں ایسی پرانی عمارت کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔"

شوکت دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ پروفیسر ابر من اس حویلی کے متعلق کوئی بری رائے قائم کر کے واپس نہ لوٹے۔ ابتدا خوشگوار تھی۔ کمرے میں پہنچ کر پروفیسر ابر من کرسی پر بیٹھ گیا اور ادھر گرد نظریں گھما کر بولا:۔

"تمہارا خاندان بہت سادگی پسند معلوم ہوتا ہے۔"

شوکت نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی خاطر کہا:۔

"محدود آمدنی۔ آدمی کو سادگی پسند بنا دیتی ہے۔۔۔ ورنہ کس کا جی اچھی زندگی بسر کرنے کو نہیں چاہتا۔"

"ہونہہ۔ یہ بات ہے۔" پروفیسر سر کو معنی خیز انداز سے ہلاتے ہوئے بولا:۔

"مگر تم نے مجھ سے پہلے اس کا ذکر کیوں نہیں کیا۔۔۔ یہ تو معمولی بات ہے۔" کسی نے دائیں طرف کا دروازہ تھپتھپایا۔ شوکت کھڑا ہو گیا۔ چند منٹ کے لئے اندر گیا۔ پھر واپس آکر بولا:

"کھانا تقریباً تیار ہے۔ آپ کو جلدی تو نہیں۔"

پروفیسر نے ہنس کر کہا:۔

"اگر کوئی ضروری کام بھی ہو۔ تو پھر بھی میں کھانا کھائے بغیر نہیں جا سکتا۔ بلکہ میرا جی تو چاہ رہا ہے۔ کہ ہمیشہ کے لئے اسی حویلی میں رہائش اختیار کر لوں۔ ہوٹل کی زندگی مجھے قطعی پسند نہیں۔"

شوکت دفور مسرت سے بول پڑا:۔

"میرے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ کئی کمرے بیکار پڑے ہیں۔ آپ کے آنے سے حویلی کی عزت میں اضافہ ہو جائیگا۔"

پروفیسر ابر من بولا:۔

"بہت بہت شکریہ۔ آج ہی کسی ٹھیکیدار سے مل کر میں حویلی کی مرمت کا بندوبست کروں گا۔۔۔۔۔" کھانا ملحقہ کمرے میں چن دیا گیا۔ پروفیسر ابر من نے پلیٹوں پر نظریں گھماتے ہوئے پوچھا:۔ "شوکت۔ بھئی تمہارے والد صاحب نظر نہیں آئے کیا میرا یہاں آنا انہیں ناگوار تو نہیں گزرا۔" شوکت جلدی سے بول پڑا:۔ "نہیں تو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ میرے معاملات میں بہت کم دخل دیتے ہیں۔"

پروفیسر ابر من نے کہا:۔

"پھر بھی کھانے پر ان کی موجودگی لازمی ہے۔ ان کے بغیر کھانے میں مزہ نہ آئے گا۔"

شوکت نے اپنے باپ کو بلایا۔ پروفیسر نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ اور اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ پلاؤ۔ کوفتے اور بریانی کی کی، اس نے بہت تعریف کی۔ پہلے کمرے میں آکر پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے پروفیسر ابر من نے کہا:۔

"زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا لذیذ کھانا کھایا ہے۔"

پھر وہ شوکت کے باپ سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ شوکت اٹھ کر باہر چلا، اور پروفیسر ابر من نے اس کی شادی کا ذکر

چھیڑ دیا۔ شوکت کا باپ اپنے خاندانی وقار کو بدنام نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔ پروفیسر اہرمن نے اسے مشورہ دیا۔

"آپ اپنی جگہ حق بجانب ہیں۔ پھر بھی زمانے کی رفتار کا ساتھ دینا ہی پڑتا ہے۔ شوکت کوئی بچہ نہیں۔ برے بھلے کو خوب پہچانتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی ضد اسکی زندگی میں زہر گھول دے۔"

مگر شوکت کا باپ اپنی ہٹ کا پکا تھا۔ اسے یقین نہ آرہا تھا۔ کہ شوکت اس کے وعدے کی بے حرمتی کی جرأت کرسکتا ہے! اسے ایک عجیب سی الجھن نے گھیر لیا تھا۔ شوکت زبردستی اپنی بہنوں کو کمرے میں لے آیا۔ وہ آداب بجا لاکر سمٹی سمٹائی ایک طرف کھڑی ہوگئیں۔ پروفیسر نے پرشفقت لہجے میں کہا:۔

"میں تم لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ مجھ سے ڈرو مت۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔ مجھے اپنے خاندان کا ایک فرد ہی سمجھو۔" پھر اس نے پیکٹ کھول کر انہیں تحفے دیئے۔ اور قیمتی تحفے پاکر تینوں بہنیں دل ہی دل میں پروفیسر اہرمن کی فیاضی کی تعریف کرنے لگیں۔۔۔ پروفیسر اہرمن نے حویلی کی مرمت کا ٹھیکہ دیدیا تھا۔ اعلیٰ قسم کا فرنیچر تیار ہو رہا تھا۔ قیمتی ریشمی پردے سل گئے تھے۔ شوکت اب شاہینہ کو حاصل کرنے کے لئے زیادہ بے چین ہوگیا تھا۔ مگر اس کا باپ ابھی تک اپنی ہٹ پر قائم تھا۔ پروفیسر اہرمن کے مشورہ سے اس نے اپنی تنخواہ میں سے ایک پائی تک باپ کے ہاتھ نہ رکھی۔ سبھی پریشان اور حیران تھے۔ شوکت کا باپ راشن کے فکر سے نڈھال ہو رہا تھا۔ پنشن کے چند روپوں سے مہینہ بھر کا خرچ کیسے پورا ہو سکتا تھا۔ پروفیسر اہرمن جب حویلی کا معائنہ کرنے کے لئے آیا۔ تو شوکت کے باپ سے نہ رہا گیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں اس نے شوکت کی گستاخی کا حال بیان کردیا۔ پروفیسر اہرمن بناوٹی استعجاب سے بولا:۔

"بہت بری بات ہے۔ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ خبر کی۔"

اس نے جیب سے سو روپے کے نوٹ نکال کر پکڑا دیئے۔ اور تسلی دی۔ "آپ راشن کا فکر نہ کریں، اور شوکت کو میں راہِ راست پر لے آؤں گا۔"

پروفیسر اہرمن کا پہلے ہی محلے بھر میں چرچا ہو رہا تھا۔ شام کو جب گندم سے بھرا ہوا چھکڑا حویلی کے سامنے رکا۔ تو شوکت کے باپ نے اتنی زور کا نعرہ لگایا۔ کہ حویلی گونج اٹھی ——— شوکت اس نئی پالیسی کو نہ سمجھ سکا تھا۔ پروفیسر اہرمن نے اس کی حیرت کو یہ کہہ کر دور کردیا کہ بڑی عمر کے لوگوں کو پھانسنا آسان کام نہیں۔ اب تم اپنے آپ کو کامیاب ہی سمجھو ——— شاہینہ واپس آگئی تھی شوکت نے جب اسے نئی خوشخبری سنائی۔ تو وہ بھی پروفیسر اہرمن سے ملنے کے لئے بے تاب ہوگئی۔ شوکت اسے ساتھ لے کر ہوٹل میں آگیا پروفیسر اہرمن نے شاہینہ کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے اسے خوابوں کے رنگ محل میں اپسراؤں کی شہزادی کے سامنے کھڑا کردیا ہو۔ وہ پہلی دفعہ یہاں کے حسن سے اتنا متاثر ہوا تھا۔ شاہینہ اس کے یوں دیکھنے سے جھینپ گئی۔ اور شوکت خوشی محسوس کر رہا تھا کہ اس کا انتخاب واقعی لاجواب ہے ——— چائے آگئی۔ پروفیسر اہرمن نے چائے کا کپ یوں شاہینہ کی طرف بڑھایا جیسے زندگی کے ادھورے خاکوں کو پر کرنے کی التجا کر رہا ہو جب تک شاہینہ اس کے سامنے رہی وہ دل میں ایک باکیف گدگدی محسوس کرتا رہا۔ اور جب وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔ تو پروفیسر اہرمن شدت کے ساتھ اس کی کمی کو محسوس کرنے لگا۔

"یہاں پر حسن کے ایسے شہکار چھپے ہوتے ہیں۔ جن کو فرسودہ روایات کے دبیز پردوں سے نکالنے کی میں پوری جدوجہد کروں گا" اس کے چہرے پر عزائم کے نقوش چمکنے لگے ——— حویلی کی کایا پلٹ گئی تھی۔ پروفیسر اہرمن نے ہوٹل چھوڑ دیا۔ اہل محلہ شوکت کے خاندان پر رشک کرنے لگے۔ شوکت کے باپ کی پگڑی کا طرہ اونچا ہوگیا۔ اس کی بہنوں کی اداؤں میں شاہانہ وقار پیدا ہوگیا گھر میں صرف شوکت کی ماں کو پروفیسر اہرمن کی رہائش ناگوار گذری تھی۔ وہ پرانے زمانے کی عورت تھی۔ اور ہر چیز کے اعتدال کی حدود پھاندنے کی مخالف تھی، اور دوسرے اس نے بچپن میں اپنی دادی اماں سے ایک جادوگرنی کی کہانی اتنی مرتبہ سنی تھی۔ کہ اتنی عمر گذر جانے کے بعد بھی اس کا ایک ایک لفظ اسے یاد تھا۔ اور وہی کہانی وہ اپنے بچوں کو بھی سینکڑوں مرتبہ سنا چکی تھی۔ اور پردہ سرکا کر پروفیسر اہرمن

کی شکل دیکھنے کے بعد اسے یونہی وہم سا ہو گیا تھا۔ کہ کہانی کا جادوگر حقیقت کا روپ بدل کر حویلی میں آگیا ہے۔ کہانی کا جادوگر سیر و تفریح کی خاطر اپنے ملک سے دور ایک گل پوش جزیرے پر گیا تھا۔ اور وہاں قدرت کے دلفریب نظاروں اور لوگوں کی معصومیت کو دیکھ کر اس نے وہاں پر اپنی حکومت قائم کرنے کی خاطر آہستہ آہستہ لوگوں کو نشہ آور پانی کا دلدادہ بنا دیا تھا یہ نشہ آور پانی پہلے وہ مفت مہیا کرتا تھا اور جب اس نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ اب اس کے بغیر ایک منٹ نہیں گزار سکتے۔ تو وہ قیمتاً بیچنے لگا۔ لوگ مجبور اور بے لبس بن گئے، اور جادوگر نے اپنی حکومت قائم کر لی اور پھر آزادی کے ساتھ جزیرے کے باشندوں کی کھالوں کی تجارت کرنے لگا جن سے بنی ہوئی چیزیں اس کے ملک کی نازنینیں بڑے شوق سے خریدتی تھیں ——— شوکت کی ماں اپنے وہم کا اظہار کرنے سے گھبراتی تھی گھر میں کوئی بھی اس کا ہمنوا نہ تھا۔ ہر کوئی پروفیسر اہرمن کا قصیدہ خواں تھا۔ اور پروفیسر اہرمن کی فیاضیوں میں سے اب اہل محلہ بھی اپنا حصہ وصول کرنے لگے تھے۔ پروفیسر کے ابھارنے پر شوکت کی بڑی بہن نزہت کالج میں داخل ہو گئی چھوٹی بہن نگہت اور نصرت کانونٹ میں پڑھنے لگیں۔ بڑی بہن کی آزادروی نے چھوٹی بہنوں کے خیالوں میں خوش رنگ پھول کھلا دیئے تھے۔ وہ لڑکیاں جوان کی سادگی اور پردے کی وجہ سے انہیں کوئی وقعت نہ دیتی تھیں۔ اب ان کے بھڑکیلے لباسوں اور میک اپ کی بدولت ان کی طرف کھچی چلی آ رہی تھیں۔ حویلی کے صحن میں بیڈمنٹن کی گراؤنڈ بن گئی تھی۔ بڑے کمرے میں پیانو کی لہریں پھیلتی رہتی تھیں۔ ریڈیو کے نغمے گونجتے رہتے تھے۔ اور پروفیسر اہرمن راجہ اندر بنا حسین شوخ لڑکیوں کے درمیان فتح مندی کے احساس سے جھومتا رہتا تھا۔ کالج کے ہر پروگرام میں لڑکیاں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔ حویلی میں رقص و سرود کی محفلیں جمنے لگی تھیں۔ شاہینہ پروفیسر کے پاس حویلی میں بغیر کسی رکاوٹ کے آنے لگی تھی۔ شوکت اسے ٹھیک حال سمجھ رہا تھا۔ اور پروفیسر شاہینہ کو نت نئے تحفے پیش کر کے اس کے قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔

حویلی میں تین کمروں کے سوا پروفیسر اب ہر جگہ پر قابض ہو چکا تھا۔ اس پر بھی شوکت کا باپ بہت خوش تھا اسے راشن کی فکر اب نہ ستاتی تھی۔ اس کی بیوی اور لڑکیاں باورچیوں کے آنے سے اب چولہا جلانے کی زحمت سے بچ گئی تھیں۔ مگر اس کی بیوی بیکار بیٹھی ہر وقت پروفیسر اہرمن اور کہانی کے جادوگر کے متعلق سوچا کرتی تھی۔ اور کسی آنے والے خطرے سے محفوظ رہنے کی دعائیں مانگا کرتی تھی ——— شاہینہ کے ساتھ زیادہ میل ملاپ سے شوکت کے جذبات بری طرح مچلنے لگے تھے۔ جب کبھی وہ پروفیسر کو اپنے باپ کو راضی کرنے کے لئے کچھ کہتا۔ تو پروفیسر اسے پچکار دیتا شوکت کو کچھ علم نہ تھا کہ پروفیسر اہرمن اپنے دعوے کو نبھانے سے گریز کر رہا تھا۔ ایک شام کو جب کہ نگہت ایک نئے رقص کی ریہرسل کر کے ہال کے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ شوکت۔ پروفیسر اہرمن کو تنہا دیکھ کر اپنی محبت کی قسمت کا فیصلہ کرنے پر تل گیا۔ اس نے بے چین لہجے میں پوچھا۔

"پروفیسر صاحب۔ کب تک میں انتظار کرتا رہوں گا۔ اب زیادہ دیر تک جذبات کو بہلانے کی ہمت نہیں رہی ———"

پروفیسر اہرمن نے پیانو کے قریب رکھے ہوئے برہنہ عورت کے مجسمے پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا:۔

"تم بہت جلد منزل پر پہنچ جاؤ گے۔ تمہاری۔ حویلی۔ محلہ اور شہر اب آزادی کا مفہوم سمجھنے لگے ہیں۔ اب وہ زیادہ دیر تک کہنہ روایات کے غلام بنے نہیں رہ سکتے۔ دوسرے ممالک کے لوگ تمہیں اپنا دوست بنانے پر فخر محسوس کریں گے ـ اور تم بے پناہ بخششیں پا کر ماضی کی تلخیوں کو بھول جاؤ گے" شوکت اس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرنے کی بجائے تڑپ کر بولا:۔

"مگر پروفیسر صاحب۔ شاہینہ کو میں کب تک حاصل کر سکوں گا"

"اوہ۔ شاہینہ!" پروفیسر اہرمن معنی خیز لہجے میں بولا:۔

"شاہینہ تمہارے ساتھ گھومتی ہے۔ رقص کرتی ہے۔ اب

اس کے علاوہ تم اور کیا چاہتے ہو؟" شوکت انتہائی جذباتی لہجے میں بولا:۔

"میں اسے ہمیشہ کے لئے اپنا بنانا چاہتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"شادی!"

پروفیسر اہرمن کے قہقہے نے ہال کو گونجا دیا۔

"شوکت! نادان مت بنو۔ حسن قید کرنے کے لئے تخلیق نہیں کیا گیا۔ ابھی تک تمہاری رگوں میں غلامی کے جراثیم رینگ رہے ہیں۔ میرے ساتھ رہتے ہوئے بھی تم نے ابھی تک جینے کا ڈھنگ نہیں سیکھا۔"

شوکت نے بے تابی سے کہا۔" پروفیسر صاحب! شاید آپ نہیں جانتے مجھے اس سے کتنی محبت ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔" شاہینہ دروازے پر کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اندر قدم رکھتے ہوئے وہ بولی:۔" مسٹر شوکت کوئی کسی کی خاطر زندہ نہیں رہتا۔ بس اپنے مفاد کی خاطر جی رہے ہیں۔"

پروفیسر اہرمن نے مسرورانہ لہجے میں کہا:۔

"بہت خوب۔ دیکھا۔ یہ ہے زندگی کا فلسفہ۔ کوئی کسی کی خاطر زندہ نہیں رہتا۔"

شوکت پھٹی پھٹی نظروں سے شاہینہ کی طرف گھور کر بولا۔

"اف۔ شاہینہ! یہ تم نے کیا کہا ہے۔ تمہاری خاطر میں زمانے کی ہر طاقت سے لڑنے پر تیار ہوں۔ تمہاری محبت میری روح کی گہرائیوں میں بس چکی ہے۔" شاہینہ نے بے پروایانہ انداز میں کہا:۔

"مسٹر شوکت۔ محبت کے متعلق اب میرا نظریہ بدل چکا ہے۔ کاش! پروفیسر صاحب مجھے تمہاری ملاقات سے پہلے مل گئے ہوتے ــــــ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

شوکت کے زبان ہلانے سے پہلے ہی پروفیسر اہرمن بول پڑا:۔

"شاہینہ ڈارلنگ۔ میں نے تمہارے لئے سفید موتیوں کا ایک بیش قیمت ہار منگوایا ہے ــــــ امید ہے تم اسے ضرور پسند کرو گی ــــــ"

دونوں ہال سے باہر نکل گئے۔ اور شوکت کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ارد گرد شعلوں کی سرخ زبانیں ناچ رہی ہیں۔ اس نے برہنہ عورت کے مجسمے کو زور سے دھکا دے کر گرا دیا اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے پیانو کی تاروں کو جھنجوڑ دیا۔

"یہ کیا ہو گیا ہے؟ ــــــ پروفیسر نے یہ کیسے جرأت کی! شاہینہ کی محبت کیسے بے رخی میں بدل گئی! تو کیا مجھ سے سازش کی گئی ہے ــــــ؟ پروفیسر ایسا آدمی نہ تھا شاید مجھ سے مذاق کیا ہو۔ میری محبت کا اندازہ لگانا چاہا ہو۔" اس کی کچھ ڈھارس بندھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا۔ پروفیسر اہرمن کے کمرے میں داخل ہوا۔ شاہینہ کے گلے میں سفید موتیوں کا ہار چمک رہا تھا۔ اور پروفیسر اسے بازوؤں کا سہارا دیئے اس پر جھکا ہوا تھا۔ شوکت چیخ اٹھا:۔

"پروفیسر ــــــ شاہینہ ــــــ دغاباز ــــــ مکار بے وفا۔"

پروفیسر کے بازوؤں کا حلقہ ٹوٹ گیا اس نے آگے بڑھ کر شوکت کو بازوؤں سے پکڑتے ہوئے کہا:۔

"شوکت ــــــ! ہوش کی دوا کرو۔ تمہیں یوں میرے کمرے میں آنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ تمہیں دوسروں کے جذبات کا ذرا بھی احترام نہیں۔"

شوکت دیوانوں کی مانند قہقہہ لگا کر بولا:۔

"تم! مجھے آنکھیں دکھانے لگے ہو۔ میری محبت کے گلشن کو اجاڑ کر اپنی جادوگری سے ڈرانے لگے ہو! میری وجہ ہی سے تم اس مرتبے تک پہنچے ہو۔ میں اپنی حویلی میں یہ ناٹک نہیں کھیلنے دوں گا۔"

پروفیسر نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا:۔

"یہ حویلی میری ملکیت ہے۔ تمہارے باپ کو منہ مانگے

نام دیئے ہیں ــــــ" شوکت کو ابھی تک یقین نہ آرہا تھا کہ حالات اتنی تیزی سے پلٹا کھا گئے ہیں ــــــ چکراتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولا:-

"اف ــــ دھوکا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا"

شاہینہ نے طنزاً کہا:-

"مسٹر شوکت تمہارے پاگل ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی۔"

شوکت نے مٹھیاں بھینچ کر اس کی طرف دیکھا۔ اور پروفیسر اہرمن نے اسے دبوچ کر نیچے گرا دیا۔ تمام حویلی میں مشہور ہو گیا کہ شوکت پاگل ہو گیا ہے۔ شوکت پروفیسر کو گالیاں دے رہا تھا شاہینہ کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اور سب کو یقین ہو گیا تھا۔ کہ وہ اپنے محسن کے خلاف زہر اگل کر اپنے پاگل پن کا ثبوت مہیا کر رہا ہے۔ اسے پاگل خانے بھیجد یا گیا۔

شوکت کی ماں اپنے خاوند سو جو نشہ آور پانی پی کر اوندھا لیٹا تھا سسکیاں بھر کر کہہ رہی تھی "یہ جادوگر۔ جزیرے پر قابض ہو گیا ہے، اب ہماری کھالوں کی تجارت شروع ہو جائے گی"

اور شوکت۔ مخالف گروپ کے لیڈر ہاشمی سے جو اس سے ملنے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا:-

"اچھے ساتھی۔ میں نے پیتل کو سونا سمجھ کر اس کی پرستش کی تھی۔ اور اس کا خمیازہ بھگت رہا ہوں مجھے معاف کر دو۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ پروفیسر اہرمن لٹیرا ہے، اور شاہینہ خود غرض اور اندھی ہے اور میں ان دونوں کی سازشوں کے جال کو توڑنے کی خاطر تمہارا ساتھ دوں گا ــــــ"

ادھر پروفیسر اہرمن اپنے مداحوں کے حلقے میں شاہینہ کی صحت کا جام پی رہا تھا

نعیم صدیقی •

جلال حاجی

میں دیکھتا ہوں ــــــ میں سوچتا ہوں

میں دیکھتا ہوں، مرا پڑوسی، جلال حاجی، وہ کیا تھا، کیا ہے!
یہ ٹھیکہ داری کے وارے نیارے! جو کچھ بھی ہے قدرتِ خدا ہے
حنائی چوڑی سرخ ڈاڑھی! ڈراونی پیچ کھاتی مونچھیں!
گھنی بھنویں! چکنی چکنی چندیا! خمارِ آنکھوں سے گھورتا ہے!
ہمیشہ تسبیح انگلیوں میں! ہمیشہ ہونٹوں پہ گندی گالی
کوکین کی خاص لت کا مارا! جوا بھی راتوں کو کھیلتا ہے!
گھڑی گھڑی ہنس کے چاہتا ہے کہ میرے سونے کے دانت دیکھو
وہ آنکھوں آنکھوں میں نت کہے گا کہ سونا سونے کو کاٹتا ہے
"قسم خدا کی"! "قسم نبی کی"! کلام کا بن گیا ہے تکیہ
مگر وہ کہتا ہے "یہ ہے بزنس"! "نبی نبی ہے، خدا خدا ہے!"
نئی نویلی بڑی سی گاڑی گذرتی ہے آندھیاں اڑاتی
بشر ہے یا کوئی کالا بھینسا جو نیلی بیوک پہ لد رہا ہے
جہاں بجا گونج دار بھونپو لپکتی ہے نوکروں کی پلٹن!
زمین پر پاؤں رکھتے رکھتے خدا کا یہ شیر دھاڑتا ہے

حرم کے پنجرے کی تیلیوں میں جلال کی تین بیویاں ہیں
بہاریں اسّی گذر چکی ہیں ، ابھی کوئی گل نہیں کھِلا ہے!
چڑھاوا نوّے ہزار دے کر لیا ہے "بیرج" کا تازہ ٹھیکہ!
چرا کے سیمنٹ بیچ کھایا ! بِنا میں اب ریت بھر رہا ہے
محلے کی بن رہی ہے مسجد، ہمارے حاجی نے دے کے چندہ
خدا کی جنت کا، لوگ کہتے ہیں، سستا سودا چکا لیا ہے!
کبھی محرّم کی مجلسیں ہیں ، کبھی ہے مولود کی قوالی
کبھی کسی پیر جی کی آمد! کبھی طوائف کا غلغلہ ہے
جلال حاجی کی زندگی میں گلے ملے آ کے دین و دنیا
وزیر بھی خوش، عوام بھی خوش! خدا بھی راضی! اب آگے کیا ہے؟
میں دیکھتا ہوں، میں سوچتا ہوں، جو کچھ بھی ہے قدرتِ خدا ہے

بشکریہ "چراغِ راہ"

• ساقی فاروقی

O

ہم تو خاموش رہے بول پڑی ہیں آنکھیں
دیکھئے خامشی گفتار تک آ پہنچی ہے

اہلِ غم بھی ہوئے تشہیرِ وفا کے قائل
پیار سی چیز بھی بازار تک آ پہنچی ہے

غم کی سوغات نے سمجھائے ہیں جینے کے اصول
زندگی لذتِ آزار تک آ پہنچی ہے

ہم خطاکار ہیں کہ آپ ہی ہرجائی ہیں
بات جو کچھ بھی تھی سرکار تک آ پہنچی ہے

گجندر سنگھ

بندھے ہاتھ

کیا وہ خوبصورت نہ تھی، میرے خیال میں وہ خاصی خوبصورت تھی۔ اس کے حسن میں بڑے شہروں کی آزادانہ کلبوں کی روشنی نہ تھی اس کے حسن میں گاؤں کا سادہ الھڑپن بھی نہ تھا مگر اس کی خوب صورتی کا معیار بالکل جداگانہ تھا۔

جب اس کی شادی ہوئی تو وہ کافی عمر کے باوجود بچوں جیسی معلوم ہوتی۔ وہ گھر سنبھالنے یا رشتہ داروں سے گفتگو کرنے کے مروجہ اصولوں سے آشنا نہ تھی۔ اگر اس کا خاوند اچھا نہ ہوتا۔ اگر وہ اطمینان سے اس کی حرکتوں کو دیکھتے رہنے اور کبھی کبھی سرگوشی کرتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش نہ کرتا۔ بلکہ نفرت کرنے لگتا تو اس بے چاری کا کیا حشر ہوتا۔ لیکن وہ سمجھانے کے قابل نہ تھی۔ اس کا خاوند گم سم اس کی باتوں کو سنتا۔ جہاں تک ہو سکتا۔ ان باتوں کے ردِعمل کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا لیکن اسے کبھی نہ ٹوکتا۔ شاید وہ اس سے ہمدردی کرتا تھا یا اپنا وقت کسی نہ کسی طرح گزارنا چاہتا تھا۔

نئے گھر میں آکر اسے ایک نئی آزادی کا احساس ہوا۔ ان کی رہائش ایک بڑے بنگلے کے احاطے میں نوکر گھروں میں تھی۔ دو کمروں میں وہ اور اس کا خاوند اپنے تمام رشتہ داروں سے الگ رہتے تھے اس کا خاوند سارا دن دفتر میں رہتا۔ وہ گھر میں کچھ نہ کچھ کرتی رہتی وہ سوچ کر ایک کام شروع کرتی پھر اس کے ذہن میں ایک نیا کام اہم تر معلوم ہوتا تو وہ اسے کرنے لگتی۔ اور پھر ایک اور نیا کام...

جب شام کو اس کا خاوند واپس لوٹتا تو سارے گھر میں مختلف چیزیں بکھری ہوتیں۔ وہ سب چیزیں سمیٹنے میں اسے مدد دیتا۔ اور پھر بڑی خاموشی سے وہ دونوں کھانا کھاتے اور سو جاتے۔ ان دونوں کو کبھی کسی دوسری چیز کی ضرورت نہ محسوس ہوتی۔ بلکہ انہیں معلوم نہ تھا کہ بیسیوں قسم کی باتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً انہیں چھوٹے چھوٹے قصوں پر تبادلہ خیال کرنا چاہیئے۔ یا اپنے رشتہ داروں، دوستوں بلکہ ساری دنیا پر بحث کرنا چاہیئے۔ ان کا روز کا معمول محض یہ تھا وہ کام بگاڑ لیتی اور وہ سمیٹ دیتا۔

پھر وہ اکثر مسکرا کر کہتی "اب تو کئی روز سے آپ نے بازار کی سیر نہیں کی۔"

وہ کہتا "بے کار سڑکوں پر کیا گھومنا۔" پھر لیٹنے کی کوشش کرتا

"نہیں، ہم تو سیر کریں گے۔" وہ بچوں کی طرح کہتی۔

سارے دن کا تھکا ہارا۔ وہ گھر واپس آکر کافی دیر کام کرنے کے بعد باہر میلوں بھیڑ کاٹنے کے ناقابل ہوتا۔ لیکن وہ اسے بازو پکڑ کر گھسیٹتی۔ وہ اٹھ بیٹھتا۔ بے حس، بے لگاؤ، جوتے پہن کر وہ ساتھ ہو لیتا۔ راستے میں وہ کتنا ہی بولتی لیکن وہ کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ نیند سے کڑوی آنکھوں کو بمشکل کھول کر وہ راستہ ڈھونڈتا۔ اور جب وہ تھک جاتی تو واپس لوٹ آتا۔ لیکن وہ یہی سمجھتی تھی۔ وہ بڑی خوش قسمت ہے۔ وہ دونوں بڑے خوش بخت ہیں اور ان کی زندگیاں مکمل ہیں۔

یہاں تک تو غنیمت تھا لیکن آہستہ آہستہ اسے رنگی دکانوں میں جھانکنے کا شوق ہو گیا۔ وہ شیشے کے دریچوں میں جھانکتی ہوئی چیختی: "دیکھ رہے ہیں آپ یہ کتنی خوبصورت ہے؟"

اسے ایسی باتوں سے نفرت سی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ سیر کھلی ہواؤں میں کی جائے۔ لیکن وہ کبھی اپنی بیوی کے خیالات میں رائے نہیں دیتا تھا۔ وہ سرگوشی کے انداز میں سمجھانا چاہتا یا پھر مان لیتا۔ لیکن وہ یوں بازاروں میں گھومنے سے قطعی نفرت کرتا تھا کیسے اس سے بے حد کوفت ہوتی۔ چنانچہ وہ کہتا "آؤ آگے بڑھو۔"

"کیوں؟" وہ کہتی "دیکھ رہے ہیں اس میں کیا حرج ہے؟"

وہ کچھ اور کہے بغیر خود آگے بڑھ جاتا۔ وہ اسے کھینچتی: "ذرا سنو تو۔ ایک غضب کی چیز ہے۔"

وہ انکار کر سکتا تھا نہ مان سکتا۔ اس بے چاری کو اپنے خیالات و احساسات کے علاوہ کسی دوسری چیز کا علم ہی نہیں تھا وہ ایک معمولی کلرک تھا۔ صبح وہ کھانا کھا کر جاتا اور شام تک محض دفتر کے کاغذات میں کھویا رہتا۔ وہ دونوں زندگیوں کو ایک انوکھے ڈھنگ سے بسر کر رہے تھے۔ ان میں بظاہر کسی قسم کا تضاد نہ تھا۔ ان کے خیالات میں کوئی خاص رکاوٹ نہ تھی۔ وہ دونوں اپنے اپنے فرائض کے پابند تھے لیکن حقیقت میں وہ ایک دوسرے کو پہچانتے تک نہ تھے۔ وہ پھر بھی تازگی پیدا کرنے کی کوشش کرتی وہ گھنٹوں ایک پہلو پر بحث کرتی۔ وہ سنتا رہتا۔ اسے احساس تھا کہ جواب کی ضرورت نہیں۔

"میری چچی کو بیمار ہوئے چھ برس ہو گئے ہیں۔" وہ کہتی "یہ کیسی بیماری ہے؟"

جواب کی ضرورت نہ تھی۔

"ڈاکٹر ابھی فیصلہ نہیں کر سکے۔ کتنے عرصہ سے وہ اُسے خاص چیزیں کھلانے کو دیتے ہیں۔ فائدہ بھی کچھ نہیں ہوا.... ہم ولیسی گھی کیوں نہ خرید اکریں؟"

وہ اب بھی خاموش تھا۔ پھر وہ اسی سوال کو کئی بار دہراتی "تمہیں معلوم ہے کہ ولیسی گھی بہت مہنگا ہے۔ ہم کیسے خرید سکتے ہیں۔" وہ بڑے آرام سے کہتا۔

"پھر کیا ہوا، میری چچی کوئی امیر تو نہیں" وہ کہتی "وہ تو بیمار ہیں۔"

"اچھا سچ بتائیے۔ آپ کو گوشت پسند ہے۔" وہ یکدم پوچھتی وہ اثبات میں سر ہلاتا۔

"پھر آپ روز کیوں نہیں لاتے۔" وہ پیچھے پڑ جاتی۔ "مجھے چٹ پٹی چیزیں بہت پسند ہیں۔ کل پھل لائیے گا۔"

وہ کھوئی کھوئی نظروں سے اسے گھورتا۔ وہ ہنسنے لگتی۔ وہ بکتا رہتا وہ ہنستی رہتی۔ اسے بڑا اچنبھا ہوتا کہ اتنی دیر تک وہ اس کے چہرے کو کیوں دیکھتا ہے۔ لیکن جواب نہ پا کر وہ یونہی ہنستی جاتی اور اپنی فرمائش کئے جاتی۔ آخر وہ وعدہ کر لیتا کہ کل وہ پھل لائے گا۔

چنانچہ اگلی صبح اس نے پھر وعدہ لیا۔ "پھل" وہ اسی احساس میں مست کتنی دیر تک پھلوں کے مختلف دلکش رنگوں اور الگ الگ خوشبوؤں میں بسی رہی۔ وہ اپنی پیتل کی ایک تھالی میں ان پھلوں کو سجے ہوئے دیکھنے کے شوق میں محو رہی۔ اس نے تھالی اچھی طرح مانجھی۔ صاف ستھرے کپڑے سے اسے پونچھا۔ اسے اپنی شکل اس میں عجیب بے ڈھنگی کہیں پھیلی کہیں سکڑی نظر آئی۔ مسکرا کر اس نے تھالی قریب ہی ٹرنک پر رکھ دیا۔ پیتل کی چمکتی تھالی خالی نہ تھی۔ وہ اسی وقت وہاں پھل پڑے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ ٹکٹکی باندھ کر سوچنے لگی وہ روز پھل کیوں نہیں کھا سکتے، اسے تو پھل بے حد پسند تھے۔ وہ اپنی کئی ضروریات سے اگر اس چیز کا مقابلہ کرتی تو اسے پھل زیادہ پسند تھے۔ اسے گوشت پسند تھا۔ انڈے، گھی، دودھ، مکھن..... کیا کچھ وہ چاہتی تھی۔ شاید اس کا خاوند ایک کنجوس شخص تھا۔

اٹھ کر وہ دوسرے کئی کام کرنے لگی۔ اس کے خاوند کی ایک قمیص بستر پر پڑی تھی۔ اس نے اسے دیکھا۔ جگہ جگہ سلائی کا کام تھا۔ اول تو اسے سلائی کا کام اتنا آتا ہی نہ تھا۔ اور اب وہ ہر روز کام کرتے تھک بھی گئی تھی۔ اس نے قمیص ایک کونے میں رکھ دی۔ اس نے سوچا وہ اس شام کو اپنے خاوند کو کھری کھری سنا ڈالے گی۔

اس نے صفائی کی۔ پھر کافی دیر تک وہ کپڑے دھوتی رہی، دوپہر ہو چکی تھی۔ وہ اتنی دیر میں تھک کر چور ہو گئی تھی اس نے کپڑوں کو باہر چھوٹے صحن میں چارپائی بچھا کر خشک کرنے کے لئے بکھیر دیا۔ وہ کافی دیر تک ایک ایک کپڑے کی سلوٹوں کو دور کرتی رہی۔ اس نے بڑے بنگلے میں جھانکا۔ مکمل خاموشی تھی۔ ایک عورت باغ میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ وہ اس عورت کو غور سے دیکھتی رہی۔ وہ اسے جانتی تھی۔ وہ عورت گھر کی مالکہ تھی۔ اسے اس بنگلے کی ہر چیز بہت بے بہا محسوس ہوتی۔ کم از کم وہ

ما لک میں عجیب کشش کا احساس کرتی، اس کی قیمتی اور خوب صورت ساڑھیاں دیکھ کر وہ دنگ رہ جاتی۔ اس روز پھر وہ بے بس ہو گئی اس نے اپنے کپڑوں کو دیکھا اور یک دم اپنی نگاہیں اس عورت کی پوشاک پر گاڑ دیں۔ اسے دکھ ہوا کہ اتنی اچھی پوشاک اس کے پاس ایک بھی نہ تھی۔ اسے اپنے جہیز کے بے ڈھب سنہری کڑھائی کئے ہوئے کپڑوں سے نفرت تھی۔ وہ کافی دیر تک اس امیر عورت کو اُس کے لباس کو اور اس کی حرکتوں کو گھورتی رہی، اور وہیں کھڑے کھڑے وہ بالکل تھک گئی۔ اس نے دیکھا دن کافی جا چکا تھا۔ ابھی گھر کے سب کام باقی تھے۔ وہ گھر کی مختلف مشقتوں میں کھو گئی لیکن اس کے دماغ میں، اس کی پلکوں کے کسی کونے میں، اس کے خیالات خوب صورت لباس کے متعلق جاگزیں تھے۔ اب وہ اپنے آپ کو اس شوخ رنگ کھردری دھوتی کی جگہ اسی ساڑھی کو پہنے تصور کر رہی تھی

ایسے لمحوں میں وہ بالکل بھول جاتی کہ اس کے گھر کا کام ادھورا پڑا رہے گا۔ وہ اس حد تک اپنی خواہشات میں کھو جاتی کہ اسے اپنے ارد گرد موقع محل یا کام کا احساس ہی نہ ہوتا تھے اور کنکر اس کے ذہن میں بڑی چٹانیں سی معلوم ہونے لگتے۔ گھر کے کام کاج بکھرے پڑے رہتے۔ اور وہ اپنے تخیل کی دلچسپیوں اور مسکراہٹوں میں اپنے وجود کو کھو دیتی۔

وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ وہ اپنی مختلف دھوتیوں کو بغور دیکھتی رہی۔ ان میں گھٹیا صابن کی بو تھی۔ اسی چھوٹے سے گھر کی اس کے شوہر اور اپنی ذات اور ماحول کی ملی جلی بساند تھی۔ ان تہوں میں ان کی زندگی ان کے تخیل، ان کی خواہشوں اور آرزوؤں کا درد تھا۔ وہ ان سب کو دھند میں لپیٹ کر ان کے اوپر اس خوبصورت ساڑھی کو پھیلا چکی تھی۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی!

دروازے پر ایک پرچھائیں رکی۔ ایک منٹ میں اس نے حیرت سے سب طرف دیکھا۔ وہ چونک پڑی۔ وہ دروازے پر جھپٹی اس کا خاوند پہلے ہی اندر آ چکا تھا۔ اس نے کاغذات ایک طرف پھینک دیئے اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ خاموش تھا۔ وہ شرمندہ تھی اس نے بکھرے گھر کو ایک انبار میں سمیٹ کر رکھ دینا چاہا۔ اس کا خاوند چارپائی سے سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی جھکی ہوئی آنکھوں میں دلچسپی اور حیرت تھی۔ اس نے کہا " ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں ابھی سب ٹھیک کر دوں گا۔ ذرا سانس تو لے لوں "

اس نے انبار وہیں چھوڑ دیا اور اس کے نزدیک آکر بیٹھ گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ اپنے نزدیک کچھ ٹٹول رہے تھے، اس نے لفافے سے سنگترہ نکالا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ وہ اچھل پڑی۔

" پھل ..... میں بھول گئی تھی " وہ سنگترے سے کھیلنے لگی

" کھاؤ " اس کی آواز گہری اور سرگوشی میں تھی۔

" ہاں " اس نے نہیں کھایا۔

" کیا کر رہی تھیں ؟ "

" کپڑے ..... آج میں نے ساڑھی دیکھی ہے۔ غضب کی ساڑھی ہے " پھر اس نے ساڑھی کی تصویر کھینچنے کی پوری کوشش کی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ " مجھے ساڑھی لے دو "

" لیکن جو چیز ہم دیکھ لیتے ہیں، کیا خریدنا بھی ضروری ہے " اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا " ہماری آمدنی کا رشتہ ہماری خواہشوں سے ہونا چاہیئے۔ ہماری آمدنی اتنی ہے کیا؟" تھکاوٹ کے باوجود اس کی آواز میں نرمی اور لذت تھی۔

" مجھے نہیں معلوم۔ مجھے یہ لے دو۔ محض یہی صرف ایک "

" پھل۔ سنگترے کھاؤ " اس نے ٹالنے کے لئے کہا۔

اس نے سنگترے بے تابی سے چھیلنے شروع کر دیئے پھر اس نے پھل ایک طرف رکھ دیا۔ وہ اس کے پیچھے ہی پڑ گئی۔ اور وہ حیرت زدہ اسے دیکھتا رہا۔ آخر اسے اقرار کرنا پڑا۔ اس نے ٹھنڈا سانس لیا " لیکن یک دم ساڑھی کیسے خرید سکتا ہوں۔ ہم بچت کریں گے "

پھر اسے ہوش آیا اور وہ رات کا کھانا تیار کرنے کے خیال سے چونک پڑی۔ اور ایک دم کمرے سے باہر چلی گئی۔ پورے جوش سے اس نے کھانا تیار کرنا شروع کیا۔ اسے سنائی دے رہا تھا کہ اس کا

خاوند الجھے ہوئے انبار میں سے ہر شے کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ رات کتنی بیت گئی تھی۔ جب وہ اس سارے کام کاج سے فارغ ہوئے۔

ساڑھی! عجیب و غریب بیل بوٹوں کی چھپائی میں چھپے ہوئے سپید رنگ کی ریشمی ساڑھی۔ مغرور اور امیر عورت کا ایک دلکش لباس پانے کی توفیق انہیں تین ماہ تک نہ ہو سکی۔ انہوں نے سستی غذا کھانی چاہی۔ کم از کم خرچ کی کوشش کی۔ ہر طریقہ سے روپیہ بچا لینے کی خاطر وہ ہر ذریعہ ڈھونڈتی لیکن تین مہینوں تک اس کے پاس اتنا سرمایہ نہ ہو سکا کہ وہ ساڑھی خرید سکتے۔ لیکن کپڑے دھو کر رسی پر ڈالتے وقت جب بھی امیر مالکہ بنگلے کے پائیں باغ میں ہوتی تو اسے دیکھنے میں کافی وقت صرف کر دیتی اسے معلوم ہوتا کہ کام ادھورا رہ جائے گا لیکن وہ بے حس کھوئی ہوئی سی اسے دیکھتی رہتی۔ پھر یا تو وہ مجسمہ وہاں سے غائب ہو جاتا یا وہ کھڑے کھڑے تھک کر چور ہو جاتی اور اس کے سر میں چکر آنے لگتے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا اور وہ لوٹ آتی اور محض ٹکٹکی باندھے غور کرتی رہتی۔ وقت بیت جاتا۔ شام کے وقت اس کا خاوند ہی آکر گھر کو قرینے سے سجانے کی کوشش کرتا وہ کہتا "تمہیں ابھی تک گھر کو سجانے کا طریقہ نہیں آیا"

وہ اسے بار بار پوچھتی "کتنا روپیہ بچا لیا ہے؟"

وہ بے چارا اپنی بیوی کی ایسی خواہشوں سے بے بس ہو گیا تھا۔ ایسی فرمائشیں اس کے ماحول سے بہت دور تھیں۔ لیکن وہ خاموش طبیعت آدمی تھا۔ وہ سکون ڈھونڈتا تھا۔ اگر ایک ساڑھی سے گھر میں چین امن آسکتا تو وہ بخوشی ساڑھی لانے کے لئے تیار تھا۔ لیکن انہیں کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑے گا۔

تین ماہ کے بعد آخر ایک روز وہ ساڑھی لے آیا۔ وہ خوشی سے ناچنے لگی۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے ساڑھی جھپٹ کر اٹھا لی۔ وہ ہنستا رہا۔ اور اس نے ساڑھی کو اپنے پرانے لباس پر ہی لپیٹ لیا۔ اسے اب افسوس اس بات کا تھا کہ ان کے پاس آئینہ بہت چھوٹا تھا۔ تاہم وہ کافی دیر تک اسی خوشی میں ہرشار رہی۔ اس نے ساڑھی اتار دی اور تہہ کر کے اس کے خاوند نے ایک ٹرنک میں ڈال دی۔ یہ اس کی اپنی ساڑھی تھی۔ پہلی قیمتی ساڑھی۔ اسی امیر عورت کی طرح نفیس ساڑھی۔ لیکن امیر مالکہ کے پاس تو بیسیوں لباس تھے۔ سب ہی اسے پسند تھے۔ وہ سب خرید لینا چاہتی تھی۔ اس کی ہوس بڑھ گئی۔ وہ سارا بازار بلکہ فیکٹریاں خرید لینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے خاوند سے پوچھا۔ "آپ نئی ساڑھی تو تین مہینے تک خرید سکیں گے"

وہ بھونچکا رہ گیا۔

آخر اس کی انتہا کیا تھی۔ وہ لباس چاہتی تھی۔ ہر خواہش اسے بے حد ضروری محسوس ہوتی تھی۔ پھل، گوشت، انڈے، مکھن دہی، دودھ..... اس کا خاوند کہتا اسے ان میں سے کوئی چیز پسند نہیں۔ وہ اور کیا کہہ سکتا تھا صرف اس کے لئے پھل، انڈے مکھن آتے جو وہ خود کھاتی۔ خاوند کو یہ چیزیں پسند نہ تھیں لیکن اسے شوق تھا۔ وہ بے بس تھی۔ پھر اسے لباس چاہئے تھا۔ ہر روز نفیس نئے کپڑے۔

اس کا ذہن ایک بڑے فراخ بنگلے کے خواب دیکھنے لگا۔ ایک خوبصورت آراستہ مکان، ان کا اپنا ذاتی مکان۔ غریب کلرک کے لئے یہ باتیں انوکھی ہی نہیں بلکہ دردناک تھیں۔

وقت نے اسے سنجیدگی دی، اس کی عمر کے ساتھ ساتھ اس کے خیالات کسی قدر پختہ ہو گئے۔ اس کے چہرے کی زردی اور جھریوں نے اس کے بچپن اور کھوکھلے پن کو کافی حد تک مٹا دیا لیکن اس کے جذبات اور احساس کا معیار وہی رہا۔ غذا، لباس اور اب سب سے زیادہ مکان۔ کیونکہ مکان ان سب سے زیادہ مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ لیکن وہ جب بھی اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہوتے تو وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتی۔ مکان کے مختلف حصوں کا ذکر اس طرح کرتی جیسے اس نے مکان کو اسی طرح آراستہ کر لیا ہے۔ وہ اب بھی ہنسا کرتا۔ اس کے دل میں اپنی بیوی کے لئے ترس اور ہمدردی تھی۔ اب ان کے پانچ بچے ہو گئے تھے۔ وہ انکی پرورش کے قابل بھی نہ تھا۔ اور ایسی حالت میں اس کی بیوی کے وہ تمام

خیالات بالکل ہل سے۔ لیکن وہ اس کے متعلق کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔
کئی سال گزر گئے اور اب وہ بے چاری بوڑھی نظر آنے لگی
اس کے خاوند نے آخر ساری عمر ایک معمولی کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک موقعہ
پالیا اور ہیڈ کلرک بن گیا۔ یہ ایک نیا سہارا تھا جسے پاکر اس کی
بیوی کا جوش پھر زندہ ہوگیا۔ وہ رقم جوڑنے کی کوشش کرنے
لگی اور اپنے جذبات کو جنون کی حد تک لے گئی۔

پھر اس کے خاوند کے مزاج میں ایک عجیب تغیر ہوا۔ وہ
پہلے سے زیادہ خاموش رہنے لگا۔ اس کے چہرے کی جھریوں میں
ماتھے کی لکیریں زیادہ بل کھانے لگیں۔ وہ کنجوس ہوگیا۔ وہ بچوں سے
سختی سے پیش آنے لگا۔ جب وہ ایسی ہی خواہشات کا اس کے
سامنے ذکر کرتی تو وہ خاموش وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا۔ لیکن وہ
برابر اپنے ارادوں پر قائم تھی۔ وہ مکان بنائیں گے۔ اس مکان
کے نقشہ۔ فرنیچر، قالین، پردے اور دیگر لوازم انوکھے ہوں گے
وہ لوگوں کو اپنے گھر میں اسی طرح مدعو کرے گی جیسے اس کی ہمسائی
امیر عورت کیا کرتی ہے۔ یہ سب خواب اسی کے پیدا کردہ تھے اس
عورت کو دیکھ کر اس کے سینے میں ابال اٹھتے تھے۔ اب اس کے پاس
اڑھیاں تھیں۔ دیسی خوب صورت نہ تھیں۔ نفیس نہ تھیں لیکن
اس کے اپنے طبقے میں بہترین تھیں لیکن ابھی وہ امیر عورت، اس کا
بنگلہ، اس کی رہائش، اس کا رعب، دبدبہ، وقار . . . . .

"میں ساری رات انہیں خیالوں میں کھوئی رہتی ہوں:" اس
نے اپنے خاوند سے ایک روز کہا۔

"پیسہ چاہیئے، مکان پل میں بن جائے گا:" اس نے رکھائی
سے کہا۔

اس نے ٹھنڈا سانس لیا "ہاں، فی الحال تو میرے پاس
پانچ سو روپے ہیں:"

اس نے قہقہہ لگایا "پانچ سو! بہت کافی ہیں:" وہ
رکھائی سے اٹھ کر چلا گیا۔

سے بڑا دھچکہ لگا۔ وہ جانتی تھی پانچسو روپے کچھ بھی نہیں
وہ اداس ہوگئی، اس کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ دوبارہ اندر آیا اس نے

بھاری آواز میں کہا "اپنے مکان کا خیال تو آسان ہے لیکن
اسے پالینا بہت مشکل ہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ ہمارے بچے ہیں
ان کی تعلیم، ان کا مستقبل، ان کی عادتیں خصلتیں اگر یہ اچھی ہوں
گی تو وہ ہماری روحوں کو مطمئن کریں گی۔ وہی ہمارے مکان ہیں
ان کے تن پر اچھے کپڑے وہی ہمارے مکانوں کی سجاوٹ ہیں۔
ہماری ذاتی خواہشوں کو ان میں جذب ہونا چاہیئے:"

اس نے یہ سنا اور جواب میں کچھ نہ کہا۔ وہ خاموش رہ گئی
ایسا معلوم ہوا جیسے اس نے پہلی بار ہوش کے کانوں سے ایسی بات
سنی ہو۔ دراصل اندر ہی اندر وہ ایک مدت سے اپنے خیالات کے
کھوکھلے پن کو محسوس کر رہی تھی لیکن بے جانے بوجھے۔ اب اپنی ذاتی
خواہشات اور اپنے بچوں کے مستقبل کو ٹکراتے ہوئے دیکھ کر جیسے اس
کے دل میں ایک بھونچال سا آگیا۔ وہ کانپ اٹھی لیکن کچھ نہ کہہ سکی

آہستہ آہستہ اس کا ذہنی معیار بدل گیا۔ وہ سنجیدہ اور
خاموش ہوتی گئی۔ اس کے چہرے کی ساخت میں ایک تجربہ کار
بوڑھی عورت کا عکس نظر آنے لگا۔ اس کے خیالات اب بچوں کے
دائرے میں محدود ہو گئے۔ اس کے تخیل نے اب ماتا کی گہری قدریں
اس کو بخش دیں۔ اور گو اب بھی جب وہ کسی بنگلے کو دیکھتی تو اس کا
سارا وجود ابلنے لگتا۔ اور وہ امیر عورت کے ذکر پر چڑھ جاتی۔ لیکن اب
ان کے بچے اسے بیش قیمت نظر آتے۔ آمدنی سے جو بچت وہ کرنا چاہتی
وہ اس کے ہاتھوں میں سے پھسل جاتی۔ اور وہ گویا ہاتھ ملتی رہ جاتی
۔اس کا خاوند اکثر بیمار رہنے لگا۔ وہ اس کی خدمت کرتی
وہ ایک تجربہ کار عورت کے فرائض نبھاتی۔ آخر اس کے خاوند کی پنشن
ہوگئی۔ ان کی دو بیٹیاں ابھی تعلیم پا رہی تھیں۔ دو لڑکیوں کی شادیاں
انھوں نے کردی تھیں، اور ایک ان کا بیٹا سکول میں تعلیم پا رہا تھا

ایک روز اس کے خاوند نے اس کے سامنے ایک کاغذ
رکھا "کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

بوڑھا کانپ رہا تھا۔ اس نے کاغذ کھول کر اسے دکھایا
"کیا ہے؟" اس نے پھر کہا۔

اس کے خاوند کی آواز بھر آگئی "تم کہا کرتی تھیں نا۔

یہ مکان کا نقشہ ہے۔"

"مکان کا نقشہ!" وہ چونکی "نقشے کا کیا کروں۔"

"مکان" وہ کم گو آدمی ضروری الفاظ ڈھونڈنے لگا۔ صاف صاف کہتے اسے ایک عجیب حیا کا احساس ہو رہا تھا۔ "مکان ـــــ ایسا مکان تم چاہتی ہو۔" وہ جھجکا جیسے اس نے کوئی بڑی غلطی کردی ہو۔ پھر اس نے رکھائی سے کہا "میں مکان بنانا چاہتا ہوں۔"

ایک وہ زمانہ تھا کہ وہ مختلف پہلوؤں سے اپنے مجوزہ مکان کا ذہنی جائزہ لیا کرتی تھی۔ لیکن اس مکان کے گرد خوب صورت گھاس کا فرش نہ تھا۔ کیاریاں نہ تھیں۔ جیسے کہ اس نقشے میں تھیں جو اس کے خاوند نے اب پیش کیا۔

عمارت تیار ہو گئی۔ ہر ضروری رسم کے بعد وہ اندر داخل ہوئے۔ باوجود کوشش کے اسے حیرت یا شوق یا پریشانی کا احساس نہ ہو سکا۔ اس نے دیواروں کو چھوا۔ یہ اس کے مکان کی دیواریں تھیں۔ وہ کمروں میں ٹہلنے لگی۔ یہی اس کا مکان تھا۔ وہ اپنے مکان میں کھڑی تھی۔ وہ اس کی ہواؤں میں سانس لے رہی تھی۔ وہ پھر زمین پر بیٹھ گئی۔ اسے اپنی عمارت کا پورا احساس تھا لیکن وہ چاؤ کا احساس نہ کر سکی۔ مایوس ہو کر وہ باہر آ گئی۔

اس کا خاوند اس کے پاس آ گیا "کیسا ہے مکان؟" اس کی آواز مختلف تھی۔

"اچھا ہے۔" جیسے یہ اس کی زندگی کی کوئی ضروری شے نہ ہو۔

"کیوں؟" اس کے خاوند کو اس جواب کی امید نہ تھی۔

"کوئی ایسی ـــــ بات نہیں۔" اس نے خاموشی سے کہا۔

وہ اسے کرخت نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اس کے بچے بہت خوش تھے۔ وہ دوڑ کر ماں سے لپٹ گئے۔ وہ انہیں پچکارتی رہی اس کی آنکھوں میں آنسو ناچنے لگے۔ وہ ایک طرف جا کر بیٹھ گئی۔ "کیا بات ہے؟ تم خاموش کیوں ہو؟" اس کے خاوند نے پوچھا۔

"یونہی" درحقیقت وہ مایوس تھی۔ وہ کیوں اپنی خوشی کا اظہار نہ کر سکتی تھی۔ وہ کیوں ان سب کی طرح مسکرا نہ سکتی تھی؟

وہ خوش نہ تھی۔ اس کا خاوند بہت خوش تھا۔ اس کے بچے بہت خوش تھے۔ لیکن وہ مایوس تھی۔ اسے کوئی چاہت نہ تھی

"کیا تم جانتی ہو؟" اس کا خاوند گرجا۔ "کیا تم جانتی ہو کہ تم نے میری ساری عمر زندگی کو تلخ بنایا۔ میں نے کن مشکلوں سے کن ذریعوں سے پیسے جمع کئے۔ تمام عمر تمہاری خواہشوں کے لئے اپنی تمام امنگیں چھوڑ دیں۔ میں نے کتنے سخت کام کئے۔ میں نے کیسی مشکلیں جھیلیں۔ پھر تم کیوں اداس ہو؟ تم خوش کیوں نہیں؟"

لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی کیونکہ اب وہ صرف چند آنسو بہا سکتی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ بولا کرتی تھی۔ اس کی زبان تالو سے نہ لگتی تھی، اور اس کا شوہر خاموش تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں تھیں جن سے وہ کھلونوں کی طرح کھیلتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دن اس نے محسوس کیا کہ یہ کھلونے اس پر ہنس رہے ہیں، اس پر پھبتیاں کس رہے ہیں۔ آج یہ مکان بھی ایک ایسا ہی کھلونا بن گیا جسے دیکھ کر اسے چپ سی لگ گئی۔

وہ آخر دم تک حیرت زدہ رہی کیونکہ وہ واقعی چاؤ محسوس نہ کر سکی۔ اگر کوئی بتا سکتا تو وہ ضرور شکر گزار ہوتی۔

(بشکریہ "ہمایوں")

اثر لکھنوی •

"مجذوب کی بڑ"

موت سے زندگی کو چھین موت کو زندگی بنا — مرد ہیں ٹلتے یوں نہیں، دورِ مصیبت و بلا

جوش و خروش موج ہو عکسِ تلاطمِ حیات — بحر سے ہمکنار ہو، آئے نہ آئے ناخدا

کوئی پیام تازہ دے جس سے کہ جاگ اٹھے جہاں — دیکھے طلوعِ صبحِ نو، پائے کشادہ فضا

تجکو یہ حق ہے وہ کہے جس کا تجھے یقین ہے — بات مگر وہ چاہیئے جس سے ہو طبع کی جلا

ڈھونڈ نئی حقیقتیں اور ہو اُن کا ترجماں — چاہے قدم قدم پہ ہو خوف و خطر کا سامنا

پرچمِ راستی اٹھا، پیک بھی راستی کا بن — راستی وہ جو ہم سخن تجھ سے ہوئی ہو برملا

فرقہ پرستیوں کا نام رکھا ہے تو نے انقلاب — اس سے کہیں وسیع ہے دائرہ انقلاب کا

میرے لئے جو نیش ہو تیرے لئے وہ نوش ہے — فیصلہ ہو تو کس طرح، کیا ہے بھلا برا ہے کیا

پست کو اس قدر ابھار پست و بلند ایک ہوں — پہلے وہ ذہنیت مٹا جو ہے فساد کی بنا

راحت و عیش کے لئے خون ضمیر کا نہ کر — کام فریب سے نہ لے بہرِ حصولِ مدعا

اپنا حریف آپ بن راز خودی کا ہے یہی — فاتح خود شکن جو ہے معرکہ اس نے سر کیا

نظمِ جہاں کے مدعی پہلے کر اپنی تربیت — دیکھ تو پاس ہے ترے کچھ بھی ہوس کے ماسوا

عزم و ثبات و ولولہ حسنِ عمل، سکونِ قلب — جسکو یہ نعمتیں ملیں، دونوں جہاں وہ پا گیا

کیف تمام چاہیئے، سر خوشیٔ دوام کو — سن کے ترانہ موج کا غرقِ نشاط ہے ہوا

روح میں روشنی جو ہے ماند نہ ہونے دے اثرؔ
اس کی تجلیوں سے ہے فکر و نظر کا ارتقاء

(بشکریہ "تذکرہ")

ماہرالقادری

ان کا کرم بھی آج شریکِ عتاب تھا
اک اور انقلاب پسِ انقلاب تھا

غیرت بھی چشمِ ناز میں رُخ پر نقاب تھا
وہ دن گئے کہ حسن کو پاسِ حجاب تھا

ہر آرزو طلسم، ہر امید اک فریب
عالم تمام شبنم و برق و حباب تھا

شایانِ التفات نہ ہم تھے نہ کوئی اور
یہ ان کی سادگی تھی کہ سب سے خطاب تھا

کتنی شکایتوں کی تلافی تھی اک نگاہ
کتنے گِلوں کا ایک تبسّم جواب تھا

شفیق جونپوری

یہ گردشِ فلکی نے عجیب کام کیا
مرے غریبِ وطن کی سحر کو شام کیا

یہاں پسند نہ تھی خوئے نالہ و فریاد
فلک نے خود مجھے مجبورِ انتقام کیا

حریمِ خاص تک اپنی نظر نے کام کیا
ہزار آپ نے پردے کا اہتمام کیا

جو آج شرم سے اٹھتیں نہیں خدا کی قسم
انھیں نگاہوں نے دنیا میں قتلِ عام کیا

نسیمِ صبح سلامت رہیں ترے جھونکے
کہ بوئے گل سے اسیروں کو شاد کام کیا

درِ حبیب ہے یا مرکزِ حیات اپنا
کہ جب یہاں سے چلے پھر یہیں مقام کیا

تمھیں سے ہو نہ سکی قدرِ شیوۂ الفت
شفیق نے تو محبت کا احترام کیا

(نئی غزلیں)

شوکت تھانوی ●

رخصتِ علالت

سوال یہ ہے کہ اگر آدمی اتنا خوش نصیب نہیں ہے کہ بیمار پڑسکے تو کیا وہ اتنا بدنصیب ہو جاتا ہے کہ رخصتِ علالت بھی نہ لے سکے۔ پھر یہ کہ یہ رخصتِ علالت آخر ہوتی کس دن کے لئے ہے۔ یہی نا کہ دفتر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اس لئے لکھ بھیجی درخواست کہ بخار ہے یا پیٹ میں درد ہے یا اختلاجِ قلب کی شکایت ہے اور دفتر کی حاضری سے معذور ہیں۔

چنانچہ اپنے اسی حق سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت پیش آگئی کہ بجٹ بنانے کا زمانہ تھا اور یہ مصیبت سر آنے والی تھی۔ اس لئے اس مضمون کی درخواست ارسال کردی کہ پیٹ میں شدید درد ہے۔ دو دن کی رخصتِ علالت مرحمت فرمائی جائے اتنی سی بات تھی جس کا بتنگڑ یہ بنا کہ ابھی درخواست بھیجی ہی تھی اور ارادہ ہی کر رہے تھے کہ آج ذرا جمے گی تاش کی پھڑ، کہ ملازم گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور اس نے کہا کہ ڈپٹی صاحب اور دفتر کے کچھ لوگ موٹر پر آئے ہیں آپ کو دیکھنے ساحب یقین جانئے کہ پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ اور گھبرا کر نوکر سے پوچھا:—

"پھر تم نے کیا کہدیا؟"

نوکر نے نہایت سادگی سے کہا: "مجھ سے پوچھا کہ تمہارے صاحب کیا کر رہے ہیں؟ میں نے کہدیا کہ ابھی شیو کیا ہے۔ کپڑے بدل رہے ہیں۔"

میں نے اور بھی پریشان ہو کر کہا: "غضب کردیا کمبخت تو نے میں نے بیماری کی چھٹی لی ہے۔ درخواست میں لکھا ہے کہ پیٹ میں شدید درد ہے۔"

نوکر نے کہا: "بھلا مجھے کیا معلوم تھا؟"

میں نے کہا: "اب جلدی کرو۔ میں بستر پر لیٹتا ہوں مجھے چادر اُڑھا دو۔ اور بلاؤ سب کو۔"

نوکر نے نہ صرف مجھے بستر علالت پر لٹا کر چادر اڑھادی بلکہ اپنی طرف سے ذہانت کا یہ بھی ثبوت دیا کہ بستر کے قریب والی میز پر گویا، دوا کی شیشی کے طور پر سر میں لگانے کا تیل اور ایک پیالی بھی رکھ کر چلا گیا باہر۔ اور میں نے پیٹ کے درد کا کرب اپنے چہرے پر پیدا کرنے کی کوشش شروع کردی اور آنے والوں کے قدموں کی چاپ سن کر کراہنے بھی لگا۔

ڈپٹی صاحب نے کمرے میں داخل ہوکے کہا:—

"ارے بھئی یہ کیسا درد پیدا کرلیا تم نے؟"

میں نے ہاتھ سے سلام کرکے زبان سے کہا: "اُف! توبہ ہے خداوندا۔ شدید درد ہے۔"

ڈپٹی صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "مگر یہ درد شروع کیسے ہوگیا؟ کھا یا کیا تھا رات؟"

میں نے کراہتے ہوئے کہا: "نہ جانے کیا ہوگیا ہے۔ دم نکلا جا رہا ہے۔ معمولی کھانا کھایا تھا۔ پالک کا ساگ اور چاول۔ رات کو دو بجے سے یہ درد اٹھا ہے۔"

ڈپٹی صاحب نے وہ شیشی اٹھا کر کہا: "اور دوا کیا استعمال کر رہے ہو۔ زلفِ بنگال ہیئر آئل؟"

وہاں پڑا ایک قہقہہ۔ اور میں نے کراہتے ہوئے کہا: "یہ تو ابھی میں نے سر میں لگایا ہے۔ اسی حالت میں شیو کیا۔ کپڑے بدلے۔ ارادہ تھا کہ ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔ لیکن ہمت نہ ہوئی پھر لیٹ گیا اس وقت درد کچھ زیادہ ہی ہے۔ کلیجہ منہ کو آرہا ہے میں بیان نہیں کرسکتا اپنی تکلیف"

ڈپٹی صاحب نے بہت تشویش سے کہا: "اس حالت میں ڈاکٹر کے پاس تم کیسے جاسکتے ہو۔ ڈاکٹر کو یہاں آنا چاہیئے۔ ٹھہرو میں انتظام کرتا ہوں۔ مسٹر اسلم! آپ کار لے جائیے، اور ڈاکٹر چیٹرجی کو لے آئیے۔"

مسٹر اسلم تو گویا ادھار کھائے بیٹھے تھے کہ حکم ملے اور وہ ڈاکٹر کو لاکر رکھدیں۔ وہ تو روانہ ہوئے اُدھر اور اِدھر ڈپٹی صاحب میرے ملازم کی خبر لینے لگے۔"یعنی تم بھی عجیب جانور ہو۔ تم سے پوچھا کہ صاحب کا کیا حال ہے۔ تو تم نے یہ نہیں بتایا کہ وہ تڑپ رہے ہیں درد سے رات کو چاول کچے تو نہیں پکائے تھے۔"

نوکر نے بڑی سیاسی بات کہی:" سرکار چاولوں کے کچے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔"

ڈپٹی صاحب نے کہا:"اور تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ صاحب کے لئے کوئی ڈاکٹر لے آتے۔"

نوکر نے کہا:" اس حالت میں صاحب کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جاتا؟"

ڈپٹی صاحب اب دفتر کے لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے:" آپ لوگوں کا خیال تو یہ تھا کہ یہ بجٹ سے جان چھڑا کر بیٹھے رہے ہیں مگر یہ تو واقعی بیمار نکلے۔ ایک ہی دن میں ان کا حال کیا ہو گیا ہے رنگ زرد چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ آنکھوں میں وحشت ہے۔"

حالانکہ رنگ میں زردی اور چہرے پر ہوائیوں کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر آرہا تھا دیکھنے کو، اور یہ طے تھا کہ وہ دیکھتے ہی کہدیگا کہ مریض کو کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں۔ وہ تو کہئے کہ اتفاق سے درخواست میں درد ہی لکھا تھا۔ اور درد کے متعلق ڈاکٹر سے بحث کرنے کی کافی گنجائش ہو سکتی ہے کہ وہ درد کی وجہ نہ سمجھ سکے اور مریض درد پر اصرار کرتا رہے۔ البتہ اگر خدانخواستہ بخار لکھدیا ہوتا تو کیا ہوتا۔ بہرحال اب تو اس درد پر قائم رہنا ہی تھا اور ڈاکٹر کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہی تھا۔

میں اسی طرح کراہتا رہا۔ پیچ و تاب کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب اپنا خوفناک ہینڈ بیگ لئے داخل ہو گئے۔

ڈپٹی صاحب نے انہیں تعظیم دیتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! ذرا ان مسٹر کو دیکھئے۔ رات کے دو بجے سے یہ درد انھیں تڑپا رہا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے بھی وہی سوال شروع کر دیئے:" رات کو کیا کھایا تھا کھانے کے کتنی دیر بعد درد شروع ہوا؟ درد کی نوعیت کیا ہے مسلسل ہے یا دورے کے طور پر اٹھتا ہے؟ متلی تو نہیں ہوئی؟ وغیرہ

یہ سوال ایسے نہیں تھے کہ ان کا معقول جواب نہ دیا جا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس زبانی جمع خرچ کے بعد اب معائنہ شروع کر دیا پیٹ بجا کر دیکھا۔ پیٹ دبا کر دیکھا۔ اور آخر ایک جگہ پیٹ دبا کر پوچھا۔

"یہاں ہوتا ہے درد؟"

میں نے گویا بڑے کرب کے ساتھ کہا:" جی ہاں یہیں ہے۔ للہ نہ دبائیے۔"

ڈاکٹر صاحب نے پھر اسی جگہ ذرا غور سے پیٹ کو کئی زاویوں سے دبا کر اچھی طرح دیکھا۔ اور پھر ایک دم کھڑے ہو کر ڈپٹی صاحب سے کہا۔

"انہیں فوراً ہسپتال لے چلئے۔"

ڈپٹی صاحب نے بڑی تشویش سے کہا:" خیر تو ہے؟ آپ بالکل صاف صاف کہدیجئے۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ مریض کو اپنا مرض ضرور معلوم ہونا چاہئیے۔ تاکہ وہ معالج سے تعاون کر سکے۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا:" یہ اپنڈی سائٹس کا کیس ہے فاضل آنت کا ٹکڑا کافی سوج گیا ہے اور ڈر ہے کہ کہیں پھٹ نہ جائے۔"

لیجئے، یک نہ شد دو شد۔ اس اناڑی ڈاکٹر نے ایسا خوفناک مرض بھی تجویز کر دیا۔ کاش میں کہہ سکتا کہ غالباً آپ کے دماغ کی آنت کا فاضل ٹکڑا سوج گیا ہے جو آپ ایک تندرست آدمی کو اپنڈی سائٹس کا کیس بتائے دیتے ہیں۔ لیکن یہ کہتے کس منہ سے اور نہیں کہتے ہیں تو یہ کمبخت لئے جاتا ہے ہسپتال۔ اور وہاں بلا وجہ پیٹ پھاڑ کر رکھ دے گا۔ مگر اب مرض سے انکار کی بھی گنجائش نہ تھی۔ اس لئے کہ مریض لاکھ فرضی سہی لیکن جب ڈاکٹر نے مرض تجویز کر دیا تو وہ اصلی ہی ہوا۔ پیٹ کی آنت خواہ کسی حالت میں ہو۔ مگر یہاں تو الٹی آنتیں گلے پڑ گئی تھیں اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں ادھر ڈاکٹر صاحب ایمبولینس کار منگانے کے لئے ٹیلیفون تک کر چکے تھے اور اب بیٹھے سمجھا رہے تھے۔

"دیکھئے مسٹر! بالکل گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہماری سرجری نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ آپ لیٹے اخبار پڑھتے رہیں گے اور آپ کو خبر بھی نہ ہوگی کہ کب آپریشن ہو گیا اور کب یہ مصیبت آپ کے پیٹ سے نکل گئی۔ یہ فاضل آنت ہر ایک کے پیٹ میں ہوتی ہے اور اسے کٹوا دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔ ورنہ کبھی نہ کبھی یہ اسی طرح تکلیف دیتی ہے بہرحال

آپ اخبار پڑھتے رہیں گے، اور آپریشن ہو جائے گا۔"

مجھے اخبار میں ابھی سے اپنے بے موت مرنے کی خبر نظر آنے لگی تھی کئی بار ارادہ کیا کہ صاف صاف کہدوں کہ صاحب واقعہ صرف یہ ہے کہ میں نے بہانہ کیا تھا ورنہ بخدا نہ تو پیٹ میں درد ہے۔ نہ میرے پیٹ کی کوئی فاضل آنت سوجی ہے۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ لیکن ذرا غور تو کیجئے کہ یہ اعتراف اب کس قدر مشکل ہو چکا تھا۔ میں ابھی اسی پریشانی اور اسی ادھیڑبن میں تھا کہ ایمبولینس کار آموجود ہوئی۔

جب مجھے ڈپٹی صاحب نے سہارا دیکر اٹھایا تو میں نے جان پر کھیل کر سب کچھ کہدینا چاہا۔ لیکن صرف اتنا کہہ سکا۔

"درد ورد تو اب ہے نہیں۔"

ڈپٹی صاحب نے کہا: "کیا بزدلی کی باتیں کر رہے ہو۔ آپریشن کے ڈر سے کہہ رہے ہو کہ درد ورد نہیں ہے۔ بھلا کوئی بات بھی ہو۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا: "اگر واقعی درد نہیں ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ ورنہ ہمیں آپریشن کرنے کے لئے درد میں کمی کا انتظار کرنا پڑتا اب اگر درد نہیں ہے تو آپریشن فوراً ہو سکتا ہے۔ انہیں لے چلنے میں جلدی کیجئے۔"

اور یہ سنتے ہی ڈپٹی صاحب اور دوسرے ہمدردوں نے مجھے اٹھا کر ایمبولینس کار میں لٹا دیا۔ ڈپٹی صاحب نے اور سب دفتر والوں کو تو رخصت کر دیا۔ صرف مسٹر اسلم کو ساتھ لئے اپنی گاڑی پر ایمبولینس کار کے ساتھ ہسپتال آگئے۔ اب یہ معلوم ہو چکا تھا کہ درد جب تک کم نہ ہو آپریشن نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے راستے ہی سے پھر کراہنا شروع کر دیا تھا اور ہسپتال پہنچکر بھی ڈاکٹر صاحب کو یہی بتایا کہ درد کم ضرور ہو گیا تھا۔ لیکن اب پھر بہت شدید ہے۔"

یہ سنکر ڈپٹی صاحب نے کہا۔

"ابھی کم وم نہیں ہوا تھا۔ آپریشن سے ڈر کر درد کی کمی کا بہانہ کر رہے تھے۔"

کاش! انہیں معلوم ہوتا کہ بہانے کی نوعیت کیا ہی۔ بہانہ تو وہ ضرور تھا۔ لیکن درد کی کمی یا زیادتی کا نہیں۔ بلکہ درد ہی کا بہانہ یہ مصیبت بن گیا تھا۔ دم نکلا جا رہا تھا ہسپتال کی یہ خوفناک فضائیں دیکھ دیکھ کر۔ دواؤں کی بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ شیشے کی الماری میں جو چمکتے ہوئے نشتر اور چاقو رکھے تھے وہ گویا خود ہی اٹھکر پیوست ہوئے جا رہے تھے۔ لیکن اب مفر کی کوئی صورت نہ تھی۔ اگر صاف صاف بھی کہدوں کہ یہ بیماری خود ساختہ ہے اور محض بجٹ کے جھمیلے سے بچنے کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا تو بھی ڈپٹی صاحب کو یقین نہیں آسکتا وہ یہی سمجھیں گے کہ آپریشن سے بچنے کے لئے اب یہ بہانہ تراشا جا رہا ہے لیکن میں نے ایک آخری کوشش کر دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے ہوئے مسٹر اسلم کو قریب بلا کر کہا۔

"ذرا آپ مجھ سے ایک راز کی بات سن لیں۔"

ڈپٹی صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا: "واقعی تم بڑے بودے اور نہایت بزدل ہو۔ اب گویا وصیتیں کرنا چاہتے ہو۔ اچھا خیر تم یہ حماقت بھی کر لو۔ سن لو بھئی اسلم یہ کیا کہتے ہیں۔"

میں نے علی الحساب چند قسمیں کھا کر کہا: "بخدا میں بیمار نہیں ہوں۔ اور تمہاری ہی قسم کہ میں نے بجٹ کے جھگڑے سے گھبرا کر چھٹی لینا چاہی تھی۔ جس کی سزا بھگت رہا ہوں۔ لیکن اب میں اپنی سزا کو پہنچ چکا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے خواہ مخواہ کے آپریشن سے بچاؤ۔"

اسلم نے نہایت مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا اور خاموشی کے ساتھ اٹھکر ڈپٹی صاحب سے رازدارانہ طریقے پر یہ تمام باتیں کہدیں تو وہ پھر نہایت بیہودگی سے ہنسے

"کمال کرتے ہو مسٹر اسلم تم بھی۔ اگر یہ واقعی بہانہ ہوتا تو ڈاکٹر صاحب ابتدائی معائنہ کیسے تجویز کرتے؟ یہ تو صرف آپریشن سے بچنے کی باتیں ہیں۔"

اور ڈاکٹر صاحب نے قریب آکر کہا۔ "اب تو کچھ سکون معلوم ہوتا ہے، اس لئے میں تیاری کروں؟"

میں نے گھبرا کر کہا۔ "ڈاکٹر صاحب سکون کیسا؟ میری تو جان پر بنی ہوئی ہے، آپ خود دیکھیئے کہ وہ فاضل آنت اب کس عالم میں ہے؟"

ڈاکٹر صاحب قریب آکر پھر پیٹ ٹٹولنے لگے، اور خوب اچھی طرح دیکھنے کے بعد کہا۔

"نہیں صاحب! اس حالت میں آپریشن خطرناک ہو سکتا ہے میں ایک دوا دیتا ہوں۔ اگر درد کی شدت کم ہوگئی تو صبح آپریشن کر دوں گا"
اور میں نے اطمینان کی سانس لی کہ شب درمیان است تھوڑی دیر ڈپٹی صاحب بھی ٹھہرے۔ پھر تسلی تشفی دیکر اور صبح آنے کا وعدہ کرکے مع مسز اسلم کے چلے گئے۔
ہسپتال میں جب ہر طرف سناٹا ہوگیا تو میں اپنے بستر علالت سے اٹھا۔ پنجوں کے بل کمرے کے باہر نکلا اور پھر جو سر پر پیر رکھکر بھاگا ہوں تو گھر آکر دم لیا۔ کچھ ضروری سامان لیا اور نوکر کو ہدایت کردی کہ میں اسی وقت جس طرف کی گاڑی مل گئی شہر کے باہر جا رہا ہوں۔
دوسرے دن راولپنڈی پہنچکر میں نے ڈپٹی صاحب کو خط لکھا اور آخر میں یہ بھی لکھ دیا کہ اب میری واپسی کی صرف یہی صورت ہے کہ آپ مجھے معاف فرما کر بواپسی ڈاک یہ لکھ بھیجیں کہ مجھ سے واپسی پر اصرار نہ ہوگا کہ میں بلا وجہ آپریشن ضرور کرا لوں۔
اب تک مجھے ڈپٹی صاحب کے جواب کا انتظار ہے۔
(بشکریہ "بیسویں صدی")

حکیم شادانی

کوئٹہ اور اس کے مشہور شاعر کی ایک جھلک

پردیس سے واپسی پر اپنے پرائے سب وہاں کے حالات دریافت کیا ہی کرتے ہیں۔ میں بھی جب کوئٹہ سے چند روز کے لئے کراچی پہنچا تو کرمفرماؤں نے اپنے اپنے ذوق و رجحان کے مطابق مجھ سے بھی مختلف سوالات کئے۔

کیوں صاحب کہئے کوئٹہ پسند آیا آپ کو؟

میری پسند و ناپسند کا اس میں کیا دخل ہے صاحب۔ بندگی بے چارگی۔

آب و ہوا تو وہاں کی آپ کو ضرور موافق آئی ہے۔ صحت کی حالت ماشاء اللہ پہلے سے کچھ بہتر معلوم ہوتی ہے۔

بیشک آب و ہوا وہاں کی مفید صحت ضرور معلوم ہوتی ہے۔

اب کہئے سردیاں کیسے گذریں؟

سردیاں! معاذ اللہ!

ماجرا اے دوست می پرسی کہ باماں چوں گزشت؟
اے سرت گردم چہ می پرسی؟ بدشواری گزشت

نومبر کے وسط ہی میں جو ایک روز ہم لوگ سو کر اٹھے تو اگناٹی میں اور نالیوں میں پڑا ہوا پانی جما ہوا پایا۔ یہ سردی اور پالے کا پہلا کرشمہ تھا جو ہم نے اس روز وہاں دیکھا۔ اور جب ہمارا نومبر بڑھ کر دسمبر سے مصافحہ کر رہا تھا تو ہوائیں شروع ہو گئیں۔ برف باری ہوئی۔ اور چاروں طرف کی خشک بے رونق پہاڑیاں جلدی جلدی سر سفید ہونے لگیں۔ سردی اس قدر بڑھی کہ دفتر تک جانا آنا بڑا مجاہدہ ہو گیا مسجد تک خاص کر صبح کی جماعت میں حاضر ہو جانا تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ایک مجاہدہ ہو گیا تھا۔ تو خیریت یہ رہی کہ مسجد میں غیر حاضری کے تصور پر دفتر کی طرح کوئی انسان باز پرس کرنے والا نہ تھا اور خدائے تعالے بڑا غفور الرحیم ہے۔

تاہم ذرا غور تو کیجئے کہ یہ انسانی فطرت ہوتے ہمارے ایک خدا کے کسی انسان کو اپنے اوپر حکم کا ذرا سا حق دیدینے سے بھی کس درجہ گھبراتی ہے کہ میں اکثر بجائے مسجد کے اپنے بند کمرہ ہی میں گرم پانی سے وضو کر کے نماز تو پڑھ لیا کرتا تھا کیونکہ مسجد غریب میں پانی گرم کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ مگر دفتر تک یخ بستہ فضاؤں اور ہواؤں کے جھکڑ میں سے گذرتا ہوا بھی روزانہ پہنچ ہی جایا کرتا تھا

کرمفرما۔ تو یہ کہئے۔ بڑی مشقت جھیلنی پڑ گئی وہاں آپ کو۔

میں۔ جی ہاں مشقت ہی کہہ سکتے ہیں اسے۔ چنانچہ ایک روز کا ذکر ہے کہ موسم کی طرف سے جو دل میں ایک اکتاہٹ اور کدورت سی پیدا ہو چلی تھی تو اپنے ساتھیوں سے میں نے پہاڑیوں کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "دیکھئے آپ لوگ تو فرماتے ہیں کہ یہاں کی آب و ہوا بڑی صحت بخش ہے مگر حال یہ ہے کہ آپ کی دعا سے پہاڑیوں تک کو پھپوندی لگ چلی ہے۔ دامن فلک پر بھی چوبیس گھنٹے ابر کی غلاظت بکھری پڑی رہتی ہے۔ پھر یہاں کے ان گنے چنے درختوں کی تو سرسبزی سے یہ محرومی برگ و بار سے یہ تہیدستی اور برہنگی دیکھی نہیں جاتی ——— ہاں کبھی کبھی چاند کی چاندنی میں پہاڑیوں پر برف کا یہ منظر یقیناً بڑا شاندار اور بڑا دلکش ہو جاتا ہے مگر اول تو چاندنی کل چار دن۔ پھر اس حسین منظر سے چند لمحے بھی لطف اندوز ہونے کی تاب یہاں کس میں ہے؟ برف میں ڈوبی ہوئی یخ بردوش ہواؤں کے جھکڑ اور تھپیڑے زندگی کے چراغ پہ پے در پے حملے کرتے رہتے ہیں۔ اور موٹے موٹے لباس اور لبادوں کی حراست و حصار میں بھی اس چراغ تہہ دامن کا ان کی دستبرد سے محفوظ رہنا دشوار ہو جاتا ہے

کرمفرما۔ کہئے وہاں آپ کو کچھ علمی و ادبی ماحول بھی میسر آیا؟

میں۔ علمی و ادبی ماحول! جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو میری وہاں کی

بود و باش ہے۔ کچھ لوگوں سے جان پہچان ہوئی بھی تھی تو یہ سردیاں آگئیں اور وہ ساری ملاقاتیں مختصر کر رہ گئیں۔ نئی پرانی ساری ملاقاتوں کو موسم بہار کے لئے ملتوی کر دینا پڑا۔ البتہ جس وقت تک موسم کہیں آنے جانے کی اجازت دیتا رہا اس زمانہ کا ذکر ہے اور کیا عجب کہ یہ ذکر عبرت و دلچسپی دونوں سے خالی نہ ہو اس لئے اگر اجازت ہو تو کسی قدر تفصیل سے بیان کر دوں۔ کرم فرما۔

"ہاں ضرور"

"جی تو فرمائیے"

"ہاں تو بسم اللہ"

میں نے جی ہاں تو ایام گرما کا ذکر ہے کہ ایک صاحب نے جو وہاں کئی سال سے آباد ہیں میری ایک شام ضیافت کر دی جس میں ان کے کئی دوستوں کے ساتھ ایک ماسٹر صاحب بھی شریک تھے۔ ماسٹر صاحب باوجود اپنی جدید وضع قطع کے بڑے پرانے بزرگ معلوم ہو رہے تھے سر کے بال برف کی طرح سفید ہو چلے ہیں۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ بہت پرانے ایم اے بی ٹی ہیں اور شاعر ہیں مزید یہ بھی کہ مشاعروں میں بڑے دلکش ترنم کے ساتھ غزلیں سنایا کرتے ہیں ـــــ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ پیرے کہ دم ز عشق زند بس غنیمت است۔ اور اسی وقت سے اپنی توجہ اور رخ سخن ماسٹر صاحب کے حق میں قریب قریب محفوظ کر دیا۔ گویا کہ کھانے کی خواہش مجھے اس وقت اتنی نہیں تھی جتنی کسی ادیب یا شاعر سے ملاقات کی بھوک بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ کھانے سے مکمل فراغت کا انتظار کئے بغیر میں نے فرمائش کر ہی ڈالی کہ حضرت یقیناً مجھے قیام گاہ کو واپسی میں بڑی دیر ہو جائے گی اور ظاہر ہے کہ ایک اجنبی کو رات کے وقت پر ہجوم اور معروف گذرگاہ بھی خطرناک معلوم ہوا کرتی ہے تاہم میں یہاں سے آپ کے کلام کا تبرک لئے بغیر تو نہ اٹھوں گا۔ میں سمجھ بیٹھا کہ آج تو آپ کو ایک گرانئے مجرم سے واسطہ پڑ گیا۔

فرمانے لگے کہ کلام تو صاحب ہم کہتے ہی اس لئے ہیں کہ سننے والے سنیں۔ اس کے علاوہ ہمارے کلام کا مصرف ہی کیا ہے لیکن اس وقت تو مجھے معذور رکھا جائے کیونکہ ایک شدید ضروری کام ہے جسے ہمارے یہ میزبان صاحب بھی خوب جانتے ہیں۔ ہاں کسی اتوار کو دوپہر سے پہلے پہلے غریب خانہ تک تکلیف کیجئے تو اس وقت میرے استاد مدظلہ بھی وہاں تشریف فرما ہوں گے پھر جی بھر کے میرا کلام بھی سنئے اور آپ کی خاطر میں ان بزرگوار کو بھی تکلیف دوں گا۔

اس پر ہمارے میزبان صاحب نے بھی ان کی تائید اور سفارش کی اور میں ماسٹر صاحب کے مکان کا پتہ خوب ذہن نشین کر کے قیام گاہ کو واپس آگیا۔ اور ایک اتوار چھوڑ کر اگلی اتوار کو ماسٹر صاحب موصوف کی خدمت میں حاضر ہو سکا۔

وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ واقعی ایک بزرگ اور بھی تشریف رکھتے ہیں جو اتنے سن رسیدہ اور سالخوردہ ہیں کہ اگر ماسٹر صاحب جیسے بزرگ نے انہیں خضر راہ گردان لیا تو کچھ بے جا نہیں کیا۔ ان بزرگوار کے سر اور داڑھی کے بالوں کا رنگ تو غالباً برف اور گالے اور دودھ سے زیادہ ہی سفید ہو چکا ہو گا مگر بعض خانگی یا معاشی مصالح کی بنا پر بزرگوار نے انہیں حنا سے رنگین کر رکھا تھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ دیکھئے ہمارے شعرا حضرات نے اس حنا سے بھی کیسی کیسی شاندار خدمات لی ہیں ـــ رنگ حنا کے فیض سے یہ بزرگوار بڑی آسانی کے ساتھ اپنی عمر کو دس بارہ سال کم فرض کر سکتے ہیں اور غالباً ایسا کر بھی رہے ہیں۔

ماسٹر صاحب نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم فرمایا اور فوراً استاد محترم سے تعارف کرا دیا۔ اس تعارف کے دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ بزرگوار کی قوت سماعت بھی عام سطح سے قدرے بلند ہے۔

پھر چند رسمی باتوں کے بعد بہت جلد شعر خوانی شروع ہو گئی غزلیں ہی غزلیں سامنے آتی رہیں۔ جن کا رنگ خود ان بزرگوں سے بھی بہت زیادہ پرانا معلوم ہوتا تھا۔ زلف۔ کاکل۔ چتون۔ چشم مست۔ مستیٔ شباب۔ لب و رخسار حتیٰ کہ اس سے بھی کھلے کھلے جنسی محرکات و معاملات تغزل کے زیر سایہ بغیر کسی اعلیٰ مقصد کی طرف رہبری کے دہرائے جا رہے تھے اور بعض مقامات پر تو مجھے رسمی داد "واہ وا، سبحان اللہ" پیش کرنے تک میں تکلیف محسوس ہونے لگتا تھا۔ بس یہی سوچ کر رہ جاتا تھا کہ "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو"

اور پھر یہیں تک نہیں بلکہ ان کے بعض اشعار اور مصرعوں پر مجھے ایک اور خطرناک شک بھی گزرنے لگتا تھا جس کا مجھ جیسے ایک غیر شاعر

آدمی کو کسی طرح کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ مگر حضرت استاد آرام کرسی پر لیٹے داد پر داد دیئے چلے جا رہے تھے۔ اور حضرت کے دونوں پاؤں جن میں سے ایک کی پنڈلی دوسرے کے گھٹنے پر رکھی تھی اظہار وجد کے لئے مسلسل جھوم رہے تھے۔

کرمفرما:۔ مگر وہ شک آپ کو کیا گذرا تھا حکیم صاحب؟

میں:۔ بس سنتے جائیے ـــــــ ایک غزل کے خاتمہ پر استاد معظم نے شاگرد دیرینہ سال سے فرمائش کی کہ اس وقت تو وہ غزل سنائیے جو آپ نے فلاں مشاعرہ میں اس روز پڑھی تھی۔ اس پر شاگرد بزرگوار نے استاد کے زانو پر رکھے ہوئے قدم کو عملاً چھو کر مجھ سے فرمایا کہ ہم تو بس ان کی برکت سے آج کچھ ہو گئے ہیں ورنہ بھلا ہمیں کیا آتا جاتا تھا اور اٹھ کر ایک دوسری بیاض نکال لائے جو اتنی ضخیم اور بھاری بھرکم تھی کہ میرا دل اس کے مٹاپے سے گھبرا کر۔ یا اللہ یہ تو کل تک بھی ختم نہ ہوگی۔ کہنے لگا۔

غرض انھوں نے وہ فرمائشی غزل بھی سنا دی جسے سن کر میرے شبہات اور زیادہ صاف اور قوی ہو گئے۔ کاش انکے کلام کا کوئی نمونہ میرے حافظہ میں پڑا رہ گیا ہوتا اور میں اسے یہاں پیش کر سکتا۔

استاد معظم نے غزل سن لینے پر تحسین و آفرین کی بچی کچھی خوراکیں بھی جرعہ جرعہ کر کے شاگرد کو پلا لینے کے بعد فرمایا کہ چلئے اب ہم بھی ان مہمان صاحب کی جو کچھ تواضع کر سکتے ہیں کر دیں آدمی تو سخن فہم معلوم ہوتے ہیں۔ پھر براہ راست مجھ سے ارشاد ہوا کہ چلئے صاحب اب ذرا ہمارے گھر تک چلئے۔

عرض کیا حضرت کیا اچھا ہو ہاتھوں مجھے آپ کا کلام سن لینے کا فخر بھی حاصل ہو جائے۔

میری اس درخواست پر شاگرد صاحب جلدی سے بول اٹھے کہ یہ تو ہمارے استاد محترم کی آن بان کے خلاف بات ہے کہ وہ ادھر ادھر اپنا کلام سناتے پھریں۔ اپنے گھر سے درے پرے وہ کسی کو بھی کہیں اپنا کلام نہیں سناتے۔

میں:۔ تو معاف فرمائیے بالکل لاعلمی میں میری زبان پر یہ استدعا آ گئی (اپنے دل میں) بڑے ضدی قسم کے رجعت پسند معلوم ہوتے ہیں یہ حضرات تو۔ حضرت کی ایک ادا تو سب سے نرالی یہ نظر آئی اور کبھی نہ جانے کن کن خوشگوار اور جائز باتوں کو حضرت نے اپنے لئے ناخوشگوار و ناجائز بنا رکھا ہوگا۔

اب میں ناچار حضرت استاد کے ساتھ ہو لیا اور ماسٹر صاحب اپنی بیٹھک بند کرنے اور لباس مکمل کرنے میں مشغول ہو گئے۔

سڑک پر کھڑے کھڑے میں نے حضرت استاد کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت یہ صنعت ذوبحرین کو تو میں مانتا ہوں کہ بڑی لطیف صنعت ہے مگر معاف فرمائیے یہ ہمارے ماسٹر صاحب نے جو اپنے بعض اشعار اور اشعار کے بعض مصرعوں کے وزن میں ایک شوخ سا تصرف فرما لیا ہے تو بہرحال یہ جناب کی اجازت و نگرانی ہی میں فرمایا ہوگا؟

کرمفرما (چونک کر مسکراتے اور سر ہلاتے ہوئے) اچھا تو وہ خطرناک شک یہ تھا حکیم صاحب آپ کو ماسٹر صاحب کے شعروں پر۔ تعجب ہے کہ پھر بھی آپ یہ سب کچھ بڑے صبر کے ساتھ سنتے رہے

میں:۔ ابھی سنئے تو۔ ابھی سے میرے صبر کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کیجئے۔ ہاں تو میری اس بات پر حضرت پہلے تو کچھ جھینپے۔ گویا ان کے نزدیک میری نگاہ کو ماسٹر صاحب کی شاعری کے ان اسرار تک نہیں پہنچنا چاہئے تھا۔ حالانکہ میں خود ہی حضرت کے قول کے مطابق۔ آدمی تو سخن فہم معلوم ہوتا تھا۔ مگر پھر بڑی دل سوزی کے ساتھ ارشاد ہوا حضرت کیا کیا جائے صاحب ماسٹر صاحب اس معاملہ میں ہماری ایک نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس معمولی سی کمی کو ترنم کے کمال سے بخوبی پورا کر لیتے ہیں۔

میں:۔ ضرور کر لیتے ہونگے حضرت۔ خود میں اتنی دیر تک انکا کلام سنتا رہا اور فیصلہ ہی نہ کر سکا کہ ماسٹر صاحب کو فن شعر میں ید طولیٰ حاصل ہے یا ترنم میں۔ یہ تو اب حضرت کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ ماسٹر صاحب کو ترنم کا کمال اتنا عزیز ہے کہ اس پر اگر وہ اپنا کچھ نہیں تو شاعری کا بہت کچھ قربان کر سکتے ہیں۔ اور میرے نزدیک وہ ایسا کرنے میں حق بجانب بھی ہیں۔

حضرت:۔ وہ کس لئے؟

میں:۔ وہ اس لئے حضرت کہ شعر کو جو یہ تمام زینتیں اور آرائشیں

اوزاں بحور صنائع بدائع وغیرہ نصیب ہوئی ہیں یہ سب آپ ہی جیسے حضرات
کے فیض سے تو نصیب ہوئی ہیں لہذا آپ ہی جیسے بزرگوں کو ان میں
تصرف کا حق حاصل نہ ہوگا تو کس کو ہوگا۔

میرے ان آخری الفاظ میں اپنے مرتبہ کی بلندی کا ایک طرح
کا اعتراف سا معلوم فرما کر حضرت بہت مسرور ہوئے۔ اور واللہ نے
حضرت کی بشریت کا یہ رُخ بھی مجھے دکھا دیا کہ ان حضرت کو تعریف بہت
پسند ہے خواہ وہ تعریف ان کے قریب سے تیزی کے ساتھ گذر ہی کیوں
نہ جائے لیکن وہ ان حضرت کو مسرور کئے بغیر نہیں گذر سکتی چنانچہ اس
مسرت کے اظہار کے لئے جو حضرت کی نگاہوں اور باچھوں سے بھی
ٹپکنے لگی تھی کچھ فرمانا ہی چاہتے تھے کہ ماسٹر صاحب بھی تشریف لے
آئے اور ہمارے قدم اب آگے کو بڑھنے لگے۔ مگر ابھی سو قدم بھی ہم نے
پورے نہ کئے ہوں گے کہ سامنے سے حضرت کے ایک اور شاگرد آگئے اور
ہم سب کو باصرار تمام اپنی دکان میں لے گئے۔

اسی طرح کچھ دیر وہاں شعر شاعری کے بعد دو ایک اور دکانوں
میں بھی کاروبار بڑی دیر تک ہوتا رہا یہاں تک کہ دوپہر ڈھلنے لگی اور
میں اپنی قیام گاہ کو واپسی کا ایک شکی مگر شدید تقاضا محسوس کرنے لگا اور
بڑی کوشش اور حکمت عملی سے حضرت کو ان کی درگاہ کی طرف متوجہ
کر سکا۔ پھر اس کفران نعمت پر کہ اس مرتبہ میں حضرت سے کوئی
استفادہ نہ کر سکا طرح طرح سے معذرتیں اور حضرت کے جوار کے
مختصر سے جغرافیہ کو مفصل طور پر ذہن نشین کر کے خیر سے قیام گاہ
جا پہنچا۔

کرمفرما۔ تو حکیم صاحب پھر تو آپ کبھی ان شعراء یا ان حضرت
استاد کے یہاں نہیں گئے ہوں گے۔

میں۔ نہیں صاحب گیا کیوں نہیں۔ یہ ذرّوں میں آفتاب
کی تلاش کا جو ایک مزمن مرض مجھے لگا ہوا ہے کسی نئی جگہ پہنچ کر تو اس
مرض میں بحران بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ میں وہاں گیا اگرچہ دو ایک
ہفتے ذرا دم لے کر گیا۔ اور سنا ہے کہ میرے چلے آنے کے بعد تھوڑی دیر
بعد قیام گاہ پر ایک صاحب مجھ سے ملنے پہنچے جو بہت عرصہ سے کوئٹہ
میں رہتے ہیں انھوں نے معلوم کرنے کے بعد کہ میں کہاں گیا ہوں فرمایا
"میں تو حکیم صاحب کو وہاں نہ جانے دیتا۔ یا پھر انہیں وہ باتیں بتا دیتا
جو اگرچہ بالکل معمولی ہیں مگر جن سے یہ حضرت استاد خواہ مخواہ چڑ جاتے ہیں

میں اس مرتبہ اپنے ساتھ اپنے ایک دوست میر صاحب کو
بھی لے گیا جو حال ہی میں میری طرح بڑا نسفر پر کوئٹہ آئے ہیں اچھے
علم دوست آدمی ہیں۔

جس وقت ہم دونوں حضرت استاد کے ادب کدے میں حاضر ہوئے
تو کوئی ساڑھے نو بجے ہوں گے۔ مگر زیارت کرنے پر کچھ ایسا معلوم ہوا
کہ جیسے حضرت استاد بیدار تو کبھی کے ہو چکے ہوں گے مگر اٹھ بیٹھنے کی
نوبت ابھی تک نہیں آئی۔

ہم دونوں کو دیکھ کر حضرت استاد بہت مسرور ہوئے بیٹھ کر ہم
سے مصافحہ فرمایا اور دو کرسیوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے پھر لیٹ
گئے۔ اور ہم حضرت کی چارپائی کی برابر اس طرح سے خاموش بیٹھ گئے
جیسے خدانخواستہ ہمیں آج کسی دیرینہ مریض کی عیادت کو آنا پڑ گیا ہو
اس کے بعد کچھ اور لوگ بھی آئے اور اسی طرح اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھ
گئے۔

اب حضرت نے سرہانے سے ایک بیاض اٹھائی مگر اسے اپنے
سینہ پر رکھ لیا اور ہم سے اپنی شاعری کی بلندیوں گہرائیوں اور
وسعتوں کے تعارف میں رطب اللسان ہو گئے۔ چند منٹ تک یہ
خوشگوار فریضہ انجام دے لینے کے بعد بیاض کھولی اور غزل خوانی
شروع کر دی۔ مگر تحت اللفظ میں۔ کیونکہ قدرت کی بے نیازی اور
لاپروائی نے حضرت کو ماسٹر صاحب جیسی سریلی آواز نصیب ہوئی تھی

حضرت کی شعر خوانی میں ایک خصوصیت تو مجھے بڑی کھلی ہوئی
نظر آئی وہ یہ کہ شعر پڑھنے سے بھی پہلے اس شعر کی حد سے زیادہ تعریف
حضرت خود ہی کر لیتے تھے جس سے شعر کے سمجھنے میں بھی لوگوں کو بہت
کچھ مدد مل جاتی تھی کلام کی حقیقی اور مرادی خوبیاں بھی سامنے آ کھڑی
ہوتی تھیں۔ پھر یہ کہ داد و تحسین بھی لوگوں پر بہت کچھ آسان ہو جاتی
تھی بلکہ اس طرح لوگ صحیح داد دینا سیکھ جاتے تھے۔

افسوس کہ حضرت کے تبرکات میں سے بھی میں کچھ یاد نہ رکھ سکا
اور نہ میرے حاشیہ خیال میں بھی اس وقت یہ بات تھی کہ اپنے ان

لمحات کا مجھے کراچی میں یوں حساب دینا ہوگا۔

کر مفرمایا۔ لیکن خودستائی کا یہ افادی پہلو آپ کے سامنے
خوب آگیا حکیم صاحب۔

میں: جی ہاں اسے حسن اتفاق سمجھ لیجئے۔ ہاں تو شعر پڑھ لینے
کے بعد حضرت اپنے سامعین پر ایک طائرانہ سی نظر بھی ڈال لیتے تھے
اور پھر اگلے شعر کی ثنا و صفت شروع کر دیتے تھے کر مفرمایا "بہت خوب
سبحان اللہ۔ واقعی کاش یہاں آپ کوئی نمونہ کلام بھی پیش کر سکتے
تو اس گفتگو کی افادیت میں بڑے اہم اضافات کی توقع تھی۔"

میں: یہ مشغلہ بڑی دیر تک جاری رہا ہم دونوں کے علاوہ
اس عرصہ میں بہت سے لوگ بلا اجازت ہی حاضر بھی ہوتے اور
غائب بھی۔ مگر ہم تھے کہ ڈٹے ہی بیٹھے رہے۔ تاہم تابکے۔ آخرکار
حضرت کے تبرکات کی فراوانی ورنہ ستائی یہ ستم میر سید کی کہانی
ہو کر رہ گئی لہٰذا پہلے تو ہم دونوں نے آہستہ سے رخصت پر آمادگی
طے کر لی پھر میں نے اجازت طلب کرنے سے قبل موضوع کو بدلنے کی
اس طرح کوشش شروع کر دی۔

میں: حضرت یہ آپ کو تلمذ کس بزرگ سے حاصل رہا ہو
دیکھئے میری طرف سے یہ ایک بالکل سیدھا سادا اور معمولی سا
سوال تھا مگر مجھے سخت تعجب اور افسوس ہوا جب اس کے ناگوار و تلخ
اثرات حضرت کے چہرہ پر پھیلتے دکھائی دیے۔

حضرت: (بدمزگی سے) ہائیں۔ تلمذ۔ تلمذ کیا۔ یہ آپ کیوں
دریافت کر رہے ہیں (کچھ تامل کے بعد ذرا جھٹکے سے) جی ناسخ مرحوم سے

میں: (حضرت کی اس صفت کی برہمی کو کم کرنے کے ارادے سے)
بجا ارشاد ہوا حضرت بہت مناسب۔

میر صاحب: (جن سے رہا نہ گیا اور پوچھ ہی بیٹھے) کیا ناسخ
مرحوم آپ کے زمانہ میں زندہ تھے حضرت؟

میں: (مبادا میر صاحب۔ کا یہ سوال کہیں فتنہ نہ بن جائے
جس کی دھمکی حضرت کے تیوروں سے نمایاں ہو چلی تھی۔ جلدی سے)
زندگی اور موت کا اس میں کیا دخل ہے میر صاحب۔ اقبال مرحوم بھی
تو آخر پیر رومی سے بیعت ہو گئے تھے۔

کر مفرمایا۔ بات تو خوب بنائی اس وقت حکیم صاحب آپ نے۔

میں: لیکن صاحب وہ حضرت تو اس بات پر اور زیادہ تلخ
ہونے لگے۔ فرمانے لگے کہ اقبال کا بھلا اس موقعہ پر کیا ذکر یہ بات تو
شعر و شاعری کی چل رہی ہے اور آپ تصوف کے مسائل لے بیٹھے۔
دوسرے اقبال نے جو کچھ بھی نظم و شعر کی صورت میں پیش کیا ہے اس کی
قدر و قیمت وعظ و خطبہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ یا کچھ سیاسی جھمیلے ہیں
شعریت سے جنہیں کوئی لگاؤ بھی نہیں اس پر میر صاحب نے بات کو
ٹالنے کی اس طرح کوشش کی۔

میر صاحب: اچھا حضرت موجودہ بڑے شعرا میں سے آپ کے
رنگ میں کہنے والے بھلا کون کون بزرگ ہیں؟

حضرت: (اسی تلخی کے ساتھ) جی کوئی بھی نہیں۔ میرا رنگ
اتنا ارزاں اور آسان ہی کب ہے کہ دوسرے بھی اسے اختیار کرنے لگیں

میں: (دوبارہ بات بنانے کی فکر میں) اور دوسرے حضرت
ہر شخص کی تخلیقات کے اغراض و مقاصد بھی تو مختلف ہوا کرتے ہیں۔
کوئی اخلاقی شعر کہتا ہے۔ کوئی صوفیانہ۔ کوئی سیاسی تو کوئی دینی۔
بلکہ حضرت (خوشامدانہ مسکراہٹ کے ساتھ) اب تو اقتصادی شعر
بھی مارکیٹ میں آنے لگے ہیں۔

حضرت: (انتہائی خشونت اور چڑچڑے پن کے ساتھ) سب
غلط۔ سراسر غلط۔ بالکل غلط۔ شعر و ادب کا مقصد صرف ایک ہے
اور وہ ہے خدمت زبان۔

اب یہی بات ہے مجھے حضرت کی طرف سے غلط غلط کی منہ توڑ
تکرار بڑی ناگوار گذری۔ کیونکہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ میں تو بار بار
بات کو سنبھالنے ہی کی کوشش کرتا رہا مگر حضرت الٹے بگڑتے ہی
چلے گئے۔ لہٰذا پھر بھی میں نے ایک لطیفے سے انتقام کی نیت کر لی
اور عرض کیا۔ کہ نہیں بزرگوار یہ خدمت زبان تو بڑا ضمنی اور ذیلی سا
مقصد ہے اور یہ تو کلام کی روح یا جوہر بھی نہیں ہوتا بلکہ اس کا عرض
ہوتا ہے اور تقریباً از خود بھی پورا ہوتا ہی رہتا ہے۔ ورنہ تخلیقات
کے قابل لحاظ اور لائق احترام مقاصد وہی ہیں جنہیں یہ خادم ابھی
عرض کر رہا تھا ——— صرف بولی بول لینا تو حیوانات کا مقصد

بھی نہیں ہوتا۔ وہ بھی چھپاتے ہیں منہ نہلتے ہیں۔ دیکھئے رنبھاتے ہیں یا عزلتے ورد کہتے ہیں تو اس سے ان کا مدعا کبھی یہ جتانا تو نہیں ہوتا کہ دیکھو ہم بول بھی تو سکتے ہیں یا دیکھو ہم کیسی اچھی بولیاں بولتے ہیں نہیں بلکہ ان کی کچھ خواہشات ہوتی ہیں۔ داعیات ہوتے ہیں جنہیں وہ پورا کر لینا چاہا کرتے ہیں۔ کچھ جذبات ہوتے ہیں جن سے وہ دوسروں کو آگاہ و متاثر کیا کرتے ہیں ــــــــ بالکل اسی طرح اپنی مختلف آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کے لئے ہمارے ادیب اور شعرا حضرات شعر و سخن پیش کرتے ہیں تاکہ ان کے سامعین اور ماحول میں ان کا کلام حسب مراد بارآور ہو سکے اور ان کی آرزوئیں اور تمنائیں شرف قبول حاصل کر سکیں چنانچہ یہی ان کے مطالبات و مقاصد یا امنگیں اور تمنائیں ہوتی ہیں جن سے انہیں بقدر ہمت و حوصلہ عشق ہوتا ہے یا ان کے ذہن میں منتقش ہو کر مجازاً معشوق و محبوب کہلاتی ہیں۔

اب رہا جنسی جذبہ اور صرف اسی مقصد کے لئے شعر کہنا جسے ملائے عامہ کے دباؤ کے خوف سے تشبیب۔ تغزل اور رومان وغیرہ ناموں سے مشہور کر دیا گیا۔ میں مانتا ہوں کہ یہ بھی ایک اہم مقصد ہے۔ ربنا ما خلقت ھٰذا باطلاً۔ پھر بھی انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کی صف میں اسے کوئی مقام میسر نہیں اور نہ اس کا یہ حق ہے کہ اس کی اشاعت میں اس دھڑلے سے ہمتیں صرف کی جائیں جس طرح اب سے دور کی جاتی رہی ہیں یا بعض بزرگ اس اسلامی شعر و ادب کی تجدید کے دور میں بھی بلند مقاصد ذرائع سے محروم و مایوس ہو کر جنسیت ہی کی لاگ سے کلام کو لذیذ بناتے اور سستی شہرت خریدنے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

حضرت: (میری اس بے باک دراز نفسی سے تنگ آکر۔ بغیر میری طرف دیکھے بڑے غصہ کے ساتھ) اور جب آپ بولنے پر آجاتے ہیں تو خاموشی کا کوئی مفہوم اور کوئی قدر و قیمت آپ کی نگاہوں میں نہیں رہتی۔

میں: (حضرت کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے اپنی اسی دھن میں) بس حضرت ان ہی رنگارنگ مقاصد کے لحاظ اور تقاضے سے ہمارے ادباء و شعراء کے کلام میں حسب ضرورت طرح طرح کی معلومات نئی نئی اصطلاحات۔ انوکھے انداز بیان اور نرالی تشبیہیں استعارات و کنایات وغیرہ استعمال ہوتے رہتے ہیں اور ایک مناسب مدت تک بار بار استعمال ہو کر زبان زد خاص و عام ہوتے ہوتے محاورات یا روز مروں کی صورت میں ہماری زبان کا جزء بنتے رہتے ہیں اور زبان مالا مال ہوتی رہتی ہے۔ یعنی حضرت یہ زبان کی خدمت بھی ضمناً ہو گئی نا۔

حضرت: (جو کلیجہ مسوسے بڑے ہی ضبط و تحمل کے ساتھ میری بے جا جسارتوں کو کمرہ کے ایک گوشہ میں تشکل فرض کر کے بڑی غیظ سے گھور رہے تھے) اور اسی زبان کے زور سے آپ بھی مجھ پر فتح پا گئے انتہائی چرب زبان اور دریدہ دہن معلوم ہوتے ہیں آپ۔

میر صاحب: (بڑی لجاجت کے ساتھ مگر ذرا پھرتی سے) مگر شاعری کی اصطلاح میں تو حضرت یہ چرب زبانی غالباً قادر الکلامی کہلاتی ہے۔

حضرت: (دماغی توازن پر قابو نہ رکھتے ہوئے تیزی سے بگڑ کر) میں ایسے لوگوں سے بات کرنی پسند نہیں کرتا۔ میں نے ایسے بدزبانوں کو کبھی منہ نہیں لگایا (کچھ تامل کے بعد) اب یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں آپ لوگ (پھر تامل) خدا کے لئے یہاں سے چلے جائیے اور جا کر شہر بھر میں اپنی اس فتح کا اعلان کر دیجئے۔

چنانچہ ہم دونوں نے کمرہ سے باہر آکر حضرت کو خاموشی کے ساتھ ایک ایک سلام کیا اور اپنا سا منہ لئے ہوئے چلے آئے یا کم از کم اس وقت تو ہمیں یہی محسوس ہو رہا تھا کہ بس یہ اپنے سے منہ کا ہی ایک تحفہ ہے جسے ہم کونٹہ کی ایک مشہور شعر پناہ بارگاہ سے لیکر چلے ہیں ورنہ اس پر ایک دوسرے افسوس کا اضافہ تو تب ہوا جب ہمیں قیامگاہ پہنچنے پر واقف کاروں سے معلوم ہوا کہ ہم نے بھی اپنی ناواقفیت کی تاریکی میں سے ان حضرت پر ہر وہ تیر سر کر دیا تھا جس کی تاب وہ اس سے پہلے بھی کبھی نہیں لا سکے۔ یہ اپنی اپنی وضع ہے اور بادی النظر میں اس پر تعجب بھی ہوتا ہے۔ تاہم آپ نے دیکھا کہ اظہار تعجب خطرہ سے خالی نہیں۔

گزارش ہے کہ . . . . .

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھئے تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان ہی نہ ہو ــــ (مینیجر)

صہبا جائسی ٥

پیامِ آخریں

خبر نہیں کہ شبِ غم شکستہ کشتی پر
کشاکشوں کے وہ لمحات کس طرح گذرے

خبر نہیں ترے بھوسے سے دل پہ میرے ندیم
امید و بیم کے حالات کس طرح گذرے

مجھے یقین ہے منزل سے جا ملے ہو گے
اگرچہ زخم سے سینہ تمہارا ہو گا فگار

میں سوچتا ہوں وہ نغمے بکھر گئے ہونگے
بسی تھی جس میں دھڑکتے ہوئے دلوں کی پکار

اندھیرا لاکھ سہی پھر بھی تیرگی سے کہو
ابھی ہمارے دلوں کے چراغ جلتے ہیں

کبھی رہا ہے زمانے میں ظلمتوں کا فسوں
کتابِ دہر کا اب ہم ورق الٹتے ہیں

میں مانتا ہوں کہ طوفانِ غم ہے میں ہوں ندیم
قدم قدم پہ مرے ظلمتوں کے سائے ہیں

یہ اور بات ہے منزل نہ پا سکیں لیکن
رہِ حیات پہ ہم سب نکل تو آئے ہیں

میں جانتا ہوں تمہیں میری یاد آتی ہے
مرے بغیر ہے سونا تمہارے دل کا چمن

میں جانتا ہوں مرے ہی لئے ملول ہو تم
اداس آنکھ ہے زلفوں میں پڑ گئی ہو شکن

میں چل پڑا ہوں تمہاری طرف مگر پھر بھی
مجھے امید نہیں ہے پہنچ سکوں گا ابھی

کھڑے ہیں راہ میں اب بھی وہ شاطرانِ کہن
عجب نہیں کہ ڈبو دیں کبھی مری کشتی

جو بڑھ کے لے مجھے حلقے میں موت کا آغوش
تمہیں قسم ہے مری تم ملول مت ہونا

بھری تھی جس میں ہمارے نفس کی آنچ ندیم
تمہارے لب پہ بکھر جائے پھر وہی نغما

زباں پہ خیر کہ طوفاں کی آمد آمد ہے
تمہارے عزم کو آوارۂ وطن کا سلام

وہ باغ جس کو کہ اشکوں نے میرے سینچا تھا
تمہیں بہار ہو جس کے امین چمن کو سلام

انور صدیقی

شکستِ سکوت

جبیں کے داغ پھر اک بار گل فروش ہوئے
پھر ایک بار سکوتِ نگاہ و دل ٹوٹا
پھر ایک بار نسیم و صبا نے کروٹ لی
پھر ایک بار سرِ شاخسار پھول کھلے
پھر ایک بار نقابِ رخِ حیات اٹھی

ہمیں ہے یاد سرِ دامنِ خزاں ہم نے
خرامِ موجِ بہاراں کے گیت گائے تھے
دل و نگاہ میں حرماں کی ظلمتیں لے کر
صباحتِ رخِ جاناں کے گیت گائے تھے
قدم قدم تھے رقیبوں کے ناوکِ دشنام
ہر ایک گام پہ مایوسیاں لرزتی تھیں
قدم قدم پہ بڑے دل شکن مراحل تھے!!
مگر ستارے فلک کے امید تھے اپنی
ہم ان سے اذنِ سفر لے کے آگے بڑھتے رہے

ہر ایک راہ کو گل پیرہن بناتے رہے
ہر ایک خار کی تشنہ لبی مٹاتے رہے
سکوت نیم شبی میں گہر لٹاتے رہے
ہمارے سر میں تھا صبحِ مراد کا سودا
ہم اعتبارِ چراغِ حرم بڑھاتے رہے
جب اپنے پاؤں اٹھے تو بہار دور نہ تھی
چمن سے نکہتِ دشتِ تتار دور نہ تھی
قدم قدم پہ صبا تھی قدم قدم پہ نسیم
حیات پھر سے نئے پیرہن میں آئی تھی
حیات پھر سے نئے پیرہن میں آئی ہے
ہماری پلکوں پہ پھر خواب جھلملاتے ہیں
عروسِ فردا کے گیسو سنورتے جاتے ہیں

جبیں کے داغ پھر ایک بار گل فروش ہوئے
پھر ایک بار سکوتِ نگاہ و دل ٹوٹا

ابوالفضل صدیقی •

دُشمَن

صبح سے بھاگتے بھاگتے دوپہر ہوگئی۔ بہار کی دھوپ میں خاصی تمازت پیدا ہوگئی، پھر کپڑے بھی ذرا بھاری تھے، بار سے ہونے لگے، ستارہ کے بھی پاؤں بھاری اٹھ رہے تھے۔ تھکی تھکی سی چل رہی تھی۔ ایسے میں تو یوں بھی جی چھوٹ جایا کرتا ہے اور ویسے ہی تکان معلوم ہونے لگتی ہے۔ بڑے اچھے چانس ملے اور سب خالی گئے، اور اب تو گرمی کا وقت تھا۔ پیاس لگ رہی تھی۔

جنگل کی بہاریں وسعتیں نیلے شفاف آسمان کے نیچے پوری تابناکیوں سے چمک رہی تھیں، میں دور دور تک نظر کی کمندیں پھینک رہا تھا کہ ساتھیوں کا پتہ چلے تو قریب کے راستہ کا سراغ ملے۔ مگر وہ تو لق و دق میدان سامنے تھا۔ تاحد نظر دریا کی چھوڑی ہوئی نم سیاہ بھربھری مٹی کا میدان، جس پر راستہ کے نشان بن ہی نہ سکے تھے، خود ستارہ کے سموں کے نشان بنتے ہی بھربھری نم مٹی پر بگڑتے جاتے تھے۔ میرے سیدھے ہاتھ اور پشت کی جانب دو سمت موڑ لے کر گنگا جھلملا رہی تھی۔ نئے نئے برف کے پگھلے ہوئے پانی سے لبریز، چال میں موسم بہار کی مخصوص مستی لئے رواں دواں تھی۔ بائیں ہاتھ پر دو تین میل دور قد آدم جھاڑ اور نائی بینی کے گھنے جنگل کی حدود تھیں جو دور تک نہ معلوم کتنے طول و عرض میں پھیلا چلا گیا تھا۔ اور سارے افق سے کنارے ملائے ہوئے میدان تھا میری عقل صحیح راستہ کی تمیز سے قاصر تھی۔ ایسے موقع پر بہترین صورت یہی ہوا کرتی ہے کہ راکب مرکب کی جبلت پر چھوڑ دیتا ہے۔ میں نے بھی راسیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں، اطمینان تھا کہ ستارہ چھوٹے سے چھوٹے فاصلہ پر چل کر جائے قیام پر پہنچے گی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی امید تھی کہ اپنی جبلت اور شامہ سے کام لیتی شاید جنگل میں چھوٹے ہوئے ساتھیوں کا سراغ بھی چلاتی بڑھے گی۔

یہ علاقہ میرے لئے نامانوس تھا۔ یہاں عمر میں پہلی مرتبہ بڑی ہمت کرکے شکار کے بہانے کچھ سیاحت آیا تھا۔ ویسے یہ مجھ کو میرے ایک کئی پشت دور کے رشتہ کے لاولد چچا سے وراثت کی گئی۔ سیڑھیاں پھاند کر پہنچا تھا۔ اور اپنے ساتھ توریث میں نزاع اور مقدمہ بازی بھی لایا تھا۔ مدمقابل سنگھ بابو تھا، اس علاقہ کا ایک دیہاتی زوردار راجپوت جو دریا برار کے ذرائع حق کی آڑ لے کر اس پر قبضہ مخالفانہ جمائے ہوئے تھا اور اپنے اثر اور قابو کے زور سے عدالت دیوانی کے کئی فیصلوں کو اور پیمائش تو وہ بندی کی زد میں تجویزوں کو ٹھکرا چکا تھا، پولیس بھی مدد سے عاجز تھی اور نفاذ نہ کرا سکتی تھی۔ آدمی جھو بند اور قاتل قسم کا تھا شکار کا بڑا شوقین اور اتنا بیباک کہ خلاف قانون بلا لیسنس ہتھیاروں سے دن دہاڑے کھیلتا پھرتا تھا۔ یہاں دور دور اس کے مقابلے پر شہادت ثبوت نہ مل سکتا تھا اس علاقہ بھر میں اس کی مرضی کے خلاف ایسے ویسے سرکاری حکام کے بھی گھستے ہوئے پر جلتے تھے۔ اور ستم تو یہ تھا کہ جواب دہی اور عذر داری کے لئے شاذونادر ہی عدالت آتا۔ البتہ سیدھی کسی دعوے نالش میں وکیل کی معرفت کبھی کرا دی تو کرا دی ورنہ وہ تو موقع پر قبضہ کئے ہوئے تھا کئی مرتبہ عدالت دیوانی سے چچا مرحوم کو باضابطہ دخل ملے مگر قبضہ نہ کر سکے پھر نالش کی ڈگری لی اور پھر یہی ہوا یہاں تک کہ بارہ سال سے اوپر ہوگئے اور اب اس کو قبضہ مخالفانہ کے حق کی ٹیک مل گئی۔ میں نے دو سال کی مقدمہ بازی میں بھی وہی کیا جو چچا نے کیا تھا۔ تین مرتبہ دخل لیا اور جب قبضہ نہ ملا تو چچا کی طرح فوجداری اور فساد لام بندی کر لینے کا انتظام کرنے کے بجائے ایک دوست کی رائے سے دوسری اسکیم بنائی، جس کی پہلی مد تو یہ تھی کہ اس علاقہ کے زرخیز ترین حصہ پر پاسیوں کا ایک گاؤں بسا دیا جائے اور یہ کام کچھ اونٹ کی چوری ہونے کے مصداق

بڑی خوب صورتی اور سکون کے ساتھ انجام دیا جاتے ورنہ گاؤں بساناتو درکنار، وہاں میرے آدمی کا جانا خطرہ سے خالی نہ تھا اور بھلا سیدھے سیدھے وہ گاؤں بسنے ہی کیوں دیتا۔ مگر پاسی نیم خانہ بدوش قوم ہے اور ان کے بہت سے قبیلوں میں شکار کے سلسلے میں میرا رسوخ تھا ان کا رجحان شکار اور صحرائی زندگی کی جانب زیادہ ہے، ویسے انہی سیدھی کھیتی بھی کرتے ہیں، بڑے جفاکش، دلیر اور طاقت ور، اور ذرا سے سہارے پر جرائم کی جانب مائل ہو جانے والے، شکار کھیلنے میں سر دھڑ کی بازی لگا کر نکلتے ہیں، اپنی اور دوسرے کی جان کی شکار سے زیادہ قیمت نہیں سمجھتے، اور میں اس راستے پر چلنے کے لئے مجبور تھا، کیونکہ میرے کان میں اس قسم کی افواہیں آچکی تھیں کہ سنگھ بابو میرے قتل کرانے کی تاک میں ہے۔ میں نے دو ایک مرتبہ کچہری میں کوشش کی کہ کم سے کم سنگھ بابو کی شکل تو دیکھ لوں، پھر ذرا اشتیاق بھی تھا اس کے قابو اور اثر کا تو مجھ کو اپنے مقابلہ پر خوب ہی اندازہ تھا اور سنا تھا کہ بڑا بانکا شکاری بھی ہے، لیکن کچہری خاص مجھ سے مقدمہ بازی کے دوران میں سنا کہ دو ایک مرتبہ یوں ہی ذرا دیر کو آیا اور میں اسے دیکھ بھی نہ سکا۔

اسکیم کے مطابق پاسیوں کا ایک مضبوط اور جیوٹ قبیلہ نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ قبضہ کرنے کے لئے اس علاقہ کے زرخیز ترین حصہ میں اپنے ڈیرے ڈالے جو علاقہ میں جگہ جگہ گنے دن ہر سال نظر آتے رہتے تھے اور سنگھ بابو اس پر کیوں چونکتے۔ اسکیم میں پہلے سال قبضہ اور دوسرے سال سنگھ بابو کا قتل تھا، ایسی خاموشی کے ساتھ کہ کسی کو ہوا نہ ملے، انہیں اور کیا چاہیئے تھا۔ زرخیز زمین اور شکار سے بھرا ہوا جنگل پہلے ہی سال جاڑوں میں ڈیروں کے چاروں طرف چپکے چپکے مٹی کی دیواریں اٹھیں اور سنگھ بابو کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ گرمیاں آتے ہی اور سر کرا خشک ہوتے ہی جھونپڑیاں پڑ گئیں اور سنگھ بابو چونکے ہی تھے کہ برسات ہوتے ہی جھونپڑیوں کے اردگرد بھینسوں کے ہل چلنے لگے اور دوسری بارش پر لہلہاتا گاؤں "پس گنواں" نمودار ہو گیا، مگر نمودار ہونے کے بعد بھی سنگھ بابو خاموش بیٹھے رہے، فصل اٹھنے پر معاملہ اٹھا رکھا۔ لیکن جب دھان اور جوار کی بٹائی کرنے سنگھ بابو کے آدمی پہنچے تو پاسیوں نے دھتکار دیا

اس وقت سنگھ بابو کو پتہ چلا کہ یہ کون سی اسکیم کے تحت گاؤں آباد ہوا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اندیشہ ہوا کہ مقابلہ کر رہا ہے۔ کہیں پانچ ہزار سال پرانی تاریخ نہ الٹ پڑے۔ میرے اور پاسیوں کے درمیان یہ معاہدہ تھا کہ جتنے رقبہ آراضی پر وہ پہلے سال میں قبضہ کریں گے اس پر ہمیشہ کے لئے لگان معاف رہے گا اور اسی عطیہ کے سلسلہ میں سنگھ بابو کے قتل کی خدمت مضمر تھی۔ تیسرا سال لگ گیا، ان تینوں سالوں میں میں نے اپنی جاسوسی تیز کر دی اور مجھکو برابر اطلاعات بھی ملتی رہیں دو ایک موقع پر اندازہ بھی ہوا کہ سنگھ بابو میرے قتل کی سازش کر رہا ہے اور یہ کوئی عجیب بات نہ تھی، فطری امر تھا۔

اگرچہ یہ علاقہ میری جائے رہائش سے سوا سو میل پر تھا اور پختہ سڑک اور ریل سے پندرہ بیس میل دور افتادہ تھا۔ میں قصبہ میں رہتا تھا۔ مگر پھر بھی اپنے گھر پر رات کو اپنی حفاظت کے خاص سامان کرنا پڑتے کیونکہ کبھی کبھی خبریں کچھ ایسی ویسی کان میں آتی رہتی تھیں، لیکن پس گنواں بسنے کے تیسرے سال مجھ کو فصل ربیع کی تیاری کے وقت سیاستاً آنا پڑا، مجھے میرے آدمیوں نے خبر دی تھی کہ پاسیوں نے زمینیں بہت زیادہ آباد کر لی ہیں، ادھر کے دو سال میں بڑی پیداواریں لی ہیں اور ان سالوں میں جتنی زمینیں شاداب کی ہیں ان کا مالیہ وصول ہونا چاہیئے مگر پاسی اس پندار میں ہیں کہ میاں ڈر کے مارے اس علاقہ میں گھس نہیں سکتے اور اسی لئے سنگھ بابو کو قتل نہیں کرتے کہ اس کے بعد میاں بیخوف ہو جائیں گے اور باضابطہ مالیہ بٹائی وصول کرنا شروع کر دیں گے۔ اس طرح انھوں نے پس گنواں اپنی خود مختار "نخرچی" ریاست بنا لیا ہے اور ہر برسات میں حدود پھیلاتے چلے جا رہے ہیں۔ لہٰذا ان کے دل سے صرف یہ بات نکال لینے کے لئے کہ میں اس علاقہ میں سنگھ بابو کے ڈر کے مارے گھس نہیں سکتا میرا یہاں آنا ناگزیر تھا۔ اگرچہ اس میں مجھ کو یک گونہ خطرہ بھی تھا۔ اندیشہ یہ تھا کہ کہیں یہ پاسی ہی دبا کر نہ بیٹھ جائیں چنانچہ پیمائش، پرتال اور وصولیابی کے کام کا بہانہ بنا کر میں یہاں پہنچا اور کئی دن قیام کیا۔ اگرچہ میں سمجھتا تھا کہ سنگھ بابو کے راستہ کا سب سے بڑا کانٹا میں ہوں اور وہ مجھے ہٹا کر بسے بسائے پاسیوں پر بڑی آسانی سے قابو پا سکتا ہے اور وہ تو ویسے ہی ہمیشہ سے صاف کرنے کی فکر میں

بتایا یہ اور بیالا پچ ہوگیا مگر پاسیوں کو بھی تو زیادہ ڈھیل مناسب نہ تھی، معاہدہ کی رو سے دوسرے سال کے اختتام پر ہی وصولیابی ہونی چاہیئے تھی اور یہ تو تیسرا برس تھا۔ جان خطرہ میں ڈال کر مجبوراً آنا ہی پڑا۔ دو ہفتہ قیام کی اسکیم تھی۔ یہاں ان پاسیوں کے درمیان بڑی آؤ بھگت ہوئی اور دوسرے ہی روز میرے دل سے خوف نکل گیا پاسی میری سب سے بڑی کمزوری کے بھی محرم تھے۔ تین سال میں کچھ کاشتکارانہ مزاج بھی مرتب ہوگیا تھا، انہیں خوب علم تھا کہ میاں شکار کے رسیا ہیں۔ پرانے ساتھی ہی جو تھے۔ انھوں نے بڑے فخریہ انداز میں بتایا کہ دو سال سے ہماری حد میں سنگھ بابو شکار کو بھی نہ آپائے ہیں اور پھر مجھ پر روغن قاز ملا کہ دو سال سے میری آمد کے لئے انھوں نے جنگل کے مخصوص قطعے کا شکار رکھا ہے، بڑا کامیاب شکار رہے گا اور میرے پہنچنے کے چوتھے ہی روز مجھ کو شکار کے شوق کی باڑھوں پر رکھ کر جنگل میں دھر دیا۔ یوں تو میں بھی جانتا تھا کہ میرا پگ اسٹکنگ کا شوق یہیں پورا ہو سکتا ہے اور یہ پانچ ہزار سال پرانی چیز ہے جب آدمی نے گھوڑے اور کتے کو مطیع کر لیا تھا اور ہمارے تمدن کا قافلہ گپھاؤں اور جھونپڑوں کے درمیان کا فاصلہ ریوڑ ہانکتا طے کر رہا تھا۔ اور اقتصادیات کا اولین تخیل جانوروں کی ملکیت کی شکل میں رونما ہوا تھا۔ آج بیسویں صدی کے وسط میں ہم تہذیب وارتقا کی مصنوعات سے گریز کر کے پلٹ پڑتے ہیں تو کبھی کبھی فری اسٹائل کشتی اور پگ اسٹکنگ جیسے کھیل کھیلتے ہیں۔ ایک پتلا سا برچھا، ایک سدھا ہوا تیز گھوڑا اور اپنا ہاتھ اپنی ران، اور چیتان جیسے جنگلی سوروں سے جا بھڑتے ہیں ——— پگ اسٹکنگ شکار کے جارحانہ اقدام کی انتہا ہوتی ہے، اور خالص شکار ہی شکار۔

پاسیوں نے ناگ پھنی اور جھاؤ کے جنگل میں سے کئی جگہ سے سوروں کی ڈاریں اٹھائیں اور میدان میں کو نکالیں مگر میرا موقع نہ لگا اور ۶ بجے صبح سے بارہ بجے دن تک مسلسل پشتِ زین پر رہنے کے بعد میری رگ رگ دکھ گئی، ستارہ بھی ہلکان ہوگئی اور پیہم ناکامی نے اور بھی زیادہ گرد کر دیا۔ میلوں ادھر سے اُدھر دوڑنے کے بعد پلٹ رہا تھا، پیاس کی شدت میں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لکڑی کی مینخ حلق سے معدہ تک ٹھکی ہوئی ہے، سر پر بندھے ہوئے رومال میں سے سورج کی کرنیں سوئی کی نوکوں کی طرح کھوپڑی میں نفوذ کرتی معلوم ہو رہی تھیں۔ پہلے ہی روز چار پانچ وار خالی گئے اور اب تو مدتوں کا خاموش جنگل چھڑ گیا تھا۔ کل بہت کم امید تھی، ساتھی گم ہو گئے تھے سمت کی سدھ بدھ بھی بھاگ دوڑ میں مٹ گئی تھی۔ میں ستارہ کی جبلت پر اطمینان کئے ڈھیلا ڈھالا لدا ہوا سا سفر کر رہا تھا۔ اور میں نے نظر اٹھائی تو ماحول بالکل ویران اور قطعاً نامانوس اجنبی سا معلوم ہوا۔ نہ معلوم یہ مجھے کہاں لئے جا رہی ہے، میری طرح اس علاقہ میں یہ بھی تو بالکل نووارد ہے، یہ پاسی کم بخت کدھر رم گئے۔ میں نے پھر اپنے صبح سے اب تک کے چکروں کا نقشہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پس گنواں کی صحیح سمت کا تعین کرنا چاہا، دور و قریب نظر سے پیمائش کی مگر کوئی تخیل قائم نہ کر سکا۔ اب مجھے اپنی تنہائی اور اس نامانوس ماحول میں وحشت سی ہونے لگی۔ اور ہر قدم پر جیسے فضا اور ماحول کی اجنبیت فزوں تر ہوتی محسوس ہوئی "یہ کہاں چلا جا رہا ہوں!؟" جیسے کسی نے اندر سے آواز دی . . . . اور وہ تو اس علاقہ کا شیر ہے، مجھ کو یقیناً پہچانتا ہے، اور میں تو اسے پہچانتا بھی نہیں ہوں کہیں پیچھے نہ لگ جائے، ایک جھرجھری سی میری تمام رگ و پے میں دوڑ گئی اور نظریں دور دور تک چھپنے لگیں سیدھے ہاتھ میں لٹکتا ہوا برچھا مضبوط ہو کر از خود تن سا گیا، راسیں پکڑے ہی پکڑے بائیں ہاتھ کی کہنی نے شکاری کوٹ کی جیب ٹٹولی، جس میں تو فیرا بھرا ہوا طمنچہ پڑا تھا۔ پھر خیال آیا کہ سنگھ بابو بھی تو سنتے ہیں بڑا وحشی شکاری ہے اور اس علاقہ کے چپہ چپہ پر اس کی شکاری مہمات کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں اس کے ساتھ کبھی شکار کا موقع کا ہے کو۔ ہو سکتا اللہ بچائے اس سے تو کبھی مقابلہ ہی ہو سکتا ہے۔ میں نے خیال کیا کہ وہ تو ایک گنوار لٹھ قسم کا شکاری ہے اور میں نے تو باقاعدہ سائنٹفک نشانہ بازی سیکھی ہے مگر بندوق کا مقابلہ بہت ہی بری چیز ہے، اس میں وہی بہادر کہلاتا ہے جس کا ہاتھ ارتجالاً پہلے اٹھ جائے اور اس پھرتی میں مد مقابل کے سینہ پر گولی دے بجائے۔ میں نے نزدیک اور دور پھر نظریں پھینکیں۔ اب کی مرتبہ تو تنہائی اور ویرانی اور بھی زیادہ محسوس

ہوئی؛ ہوں یہ پاسی سالے کا ہے کے لئے ہیں، آج ہی جاکر دونوں سال کا لگان معاف کرنے کا اعلان کروں گا بشرطیکہ وہ اس فصل کے اخیر تک سنگھ بابو کا خاتمہ کردیں۔ اب تو میں یہاں کا دورہ بھی کر چلا۔ ان کی ہمتیں اور بڑھ جائیں گی اور سنگھ بابو کا رہا سہا خوف بھی نکل جائے گا۔ مجھے پتہ تھا کہ میرے اس دورہ کی علاقہ بھر میں خاصی شہرت ہے اور اس سے میرے مدمقابل کے پرسٹیج کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔

میں نے ذرا اطمینان کا سانس لیا تھا کہ یکدم ستارہ کنوتیاں بدلنے لگی، انگ انگ پر چنگاریاں سی چھوٹ اٹھیں۔ اور دور میدان میں نگاہیں پھینکنے لگی، جب میں نے نگاہ ڈالی تو بڑی دور میدان میں ایک سور بڑے اطمینان کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میں نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ "اکرا" ہے۔ سور گلوں میں رہنے والی جبلت کا جانور ہے اور جو اکیلا رہ جاتا ہے وہ بہت ہی پریشان نظر آتا ہے۔ جو سور اکیلا اطمینان کے ساتھ نظر آئے اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ "اکرا" ہے۔ "اکرا" عام سوروں سے علیحدہ اپنے ساتھ منفرد سورپن کا حامل ہوتا ہے۔ ساتھیوں سے لڑنے والا اور سب کا حصہ چھین کرنے والا۔ زیادہ جسیم طاقت ور اور پھرتیلا، شکاری کو پہچاننے والا اور کچھ نہ کچھ ایسی جبلتوں کا حامل جو سور کی جبلت کے منافی ہیں۔ اسے دیہاتی اور جنگلی کسان اور شکاری اپنی اصطلاح میں "اکرا" کہتے ہیں اور ہر جنگل میں ایک دو اکرے ہوتے ہیں جو اپنی اپنی حکومت کی حدود قائم کئے ہوتے ہیں اور ان کے اندر کسی کو پھٹکنے نہیں دیتے ستارہ کی نگاہ بار بار اٹھتے ہی میں نے دیکھ لیا۔ فطری طور پر میں ذرا سنبھلا آسن جما، ستارہ کی نازک کنوتیاں انتہائی تیور اور نے چڑھنے لگے، آنکھیں ہرنی کی سی وحشت کے ساتھ چمک اٹھیں، اور ذرا راسیں سنبھالتے ہی اور آسن جماتے ہی جسم میں بجلی سی لہرا اٹھی۔ پگ اسٹکنگ اور پولو کے گھوڑے بڑے ذکی الحس ہوتے ہیں اور کھیل میں کسی بات سوار سے کم انہماک نہیں رکھتے میں نے آہستہ سے "مفارا" تو ستارہ نے بڑی سریلی ہوں ہوں میں جواب دیا اور جب ذرا برچھا مضبوط کرکے سیدھا کیا تو وہ فوراً شوق میں اچھل کر چوکڑیاں اور دوڑنے کا انداز بنانے لگی، میری اندازہ سے زیادہ ستارہ کی زکان چستی بدل گئی وہی تندی اور خوف ہوتے ہی پسینہ بہ نسبت برچھا رگ رگ پر پھڑک اٹھا، مگر فاصلہ ابھی زیادہ تھا اور سور کو خطرے کا کوئی احساس نہ تھا، بہت ہی سکون سے بڑھ رہا تھا، لہٰذا میں نے راسیں روک لیں اور بدستور ذرا چست شاہ گام چلنے دیا وہ میرے مخالف سمت آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ بائیں ہاتھ پر تقریباً پانچسو گز کے فاصلہ پر محاذ میں آکر گزر گیا۔ میں نے ستارہ کو موڑا، اب سامنے میدان تھا اور سور اور پیچھے پیچھے ستارہ۔ یہ میدان دو جانب دریا کے کناروں سے ملا ہوا تھا۔ سور آہستہ آہستہ زمین سونگھتا بے خبر دریا کی سمت بڑھ رہا تھا۔

میں نے ستارہ کو اشارہ کیا، بجلی کی تیزی سے اچھلی اور آندھی دھاندی سرپٹ چلی، سور نے بھاگنا شروع کیا مگر ستارہ نے اپنی دوڑ میں سور کی دوڑا دی۔ درمیان کا فاصلہ منٹ بھر میں ہڑپ کر لیا اور جیسے چوکڑیوں میں کھوپڑے پر سوار ہوگئی۔ پگ اسٹکنگ کی گھوڑیاں شکار کے وقت شکاری سے زیادہ خون کی پیاسی ہو جاتی ہیں اور شکاری تو ان کا ایک ہتھیار سا ہوتا ہے، درحقیقت شکاری وہی ہوتی ہیں، برچھے کی نوک اور سور کے کھوتے پر باریک میں نظریں جمائے رفتار کو ریگولیٹ کئے چلتی ہیں۔ سور کے ساتھ ساتھ اسی سمت۔ اور کان سوار کے کاشن پر لگائے رہتی ہیں، اور اشارہ سنتے ہی دوڑتے دوڑتے رفتار کو ایک جھٹکے میں تبدیل کر دیتی ہیں، ایک ایسا جھٹکا جس میں پلک جھپکتے رفتار عمل اور ردعمل کی حرکت میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ جاری بھی رہتی ہے۔ جھٹکے کے ساتھ برچھے کی نوک سور کے پہلو میں داخل ہو کر اور قلب کو شکار کرکے باہر آجاتی ہے اور شکاری کو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے گھوڑے کی پوری طاقت اس کے ہاتھ میں منتقل ہوگئی رکاب آسن، اس کا ہاتھ اور لمبا برچھا تک ایک میکانکی انداز میں گھوڑے کے جسم کا جز سا بن جاتے ہیں، ایک عجیب میٹھی میٹھی لہر سی شکاری کے دائیں پہلو سے لیکر بازو، کلائی اور پہنچے تک لہرا جاتی ہے۔ اور صرف یہ محسوس ہوتا ہے کہ گھوڑے کا جھٹکا ہمارے بازو سے بالکل بیچ بدن میں ضم کرکے کام لے رہا ہے اور اس کو علم الحرکت کے ماہر ہی سمجھ سکتے ہیں۔ نہ شکاری نہ گھوڑا، شکاری کو تو کبھی کبھی ایک جادو جیسا عمل معلوم ہوتا ہے جب یہ جھٹکا اوچھا پڑتا ہے۔ اور یہی اس وقت ہوا سور تن کی لڑکھڑاتی ہوئی بھوری چٹان برچھے کی انی سے اچھل کر گھوڑی کے

سامنے چار پانچ گز کے فاصلہ پر جا گری۔ نہ معلوم میں نے کاشن غلط پوائنٹ پر دیدیا۔ ستارہ رفتار اور جھٹکے کا صحیح توازن نہ کر سکی۔ بہر حال یہ تو ظاہر ہے کہ ایسے شدید اور خلاف عقل حادثہ میں نہ تو شکاری کے نحیف ہاتھ کا دخل ہو سکتا ہے نہ پتلے سے نیزہ کا کہ تین من وزن اچھل کر گر جائے، یہ طاقت اور حرکت کا کرشمہ ہوتا ہے اور ہارس پاور سے ہی ایسے شعبدے ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ شاید یہ رفتار اور مخصوص جھٹکے کے عدم ربط ضبط کا کھیل تھا۔

ٹریننگ کے مطابق حملہ کے کچھ دور پر اچھل کر گھوڑا آن کی آن ٹھہر کر حملہ کا نتیجہ دیکھتا ہے اور اگر ضرورت ہوتی ہے تو دوسرا چارج کرتا ہے۔ ستارہ ابھی اچھی طرح ٹھہر بھی نہ پائی تھی کہ اس نے سور کو اپنے اوپر حملہ کرتے پایا، اپنی جبلت کے بالکل خلاف سور پلٹ پڑا، توپ کے گولے کی طرح شعلہ سا لپکتا دوسرے لفظوں میں موت جھپٹی، مجسم قضا مضبوط تھوتھنی اور دھاردار کناریں سیدھی سکتے، اور ستارہ کی اگلی ٹانگوں کے درمیان سینہ پر وار کیا اور کوہ شکن انداز میں تھوتھنی اور کانیں ابھر آئی دیں تھیں مگر ستارہ کمال چابک دستی سے الف ہو گئی ادھر اوار دو فٹ بڑھ کر ستارہ کے پچھلے حصہ پر کیا اور پیٹ پر تار پیڈو مارا۔ اگلی ٹانگوں پر ٹک کر ستارہ نے دولتی جھاڑی اور اس طرح اپنی آنتیں ڈھیر ہونے سے بچائیں اور بیچ مچ کان کی نوکوں سے پچھلے سموں تک بجلی کی طرح لہرا گئی، مگر ان متضاد حرکتوں کی تاب نہ لا کر میں پشت زین سے نیچے آ پڑا۔ ایک قلا بازی اوپر کھائی، دوسری نیچے الٹ دوسری میں کچھ حصہ جسم گھوڑی کے گرد لپٹے ہوئے سور پر آیا۔ "بچ گئے تم تو قضا لوٹ گئی" سور نے ضرور خیال کیا ہوگا کہ شکاری ہے یا بھوت اوپر پھاند پڑا۔ خیریت گزری، تھوڑا سا زخم اور ایک پٹخ کھا کر بھاگ پڑا۔ اور لطف یہ کہ حیوانی جبلت کے بالکل منافی، الٹا ادھر ہی کو جدھر سے میں نے تعاقب کر کے حملہ کیا تھا۔ قلا بازی کھا کر شاید میں اسی تیزی سے کھڑا ہوا جس سے گرا تھا۔ میرے قریب برچھا مٹی میں گڑا ہوا تھا اور ستارہ رفتار میں بھری مجھ سے پچاس ساٹھ گز دور جا پڑی تھی۔ برچھا پکڑا میں ستارہ کی جانب لپکا اور ستارہ میری جانب دوڑی۔ موقع کی نزاکت اور بیتے ہوئے حادثہ کی شدت، ہر

چیز پر ابتدائے آفرینش والا شکاری سوار تھا اور چند سیکنڈ پیشتر والے حادثہ سے بچ نکلنے کی اہمیت کا ذرا سا بھی شائبہ دماغ کے اندر نہ تھا۔ نہ یہی کہ بیسویں صدی میں پگ اسٹکنگ کا اقدام ہزار ہا سال پرانی حماقت ہے۔ سامنے آدھے میل کے فاصلہ پر سور بھاگا چلا جاتا تھا، میں بغیر رکاب میں پاؤں جھلائے ذرا ایال پکڑ کر ایک جست میں ستارہ کی پیٹھ پر لنگور کی طرح جا بیٹھا اور تقریباً دو منٹ کی دوڑ میں ستارہ نے پھر سور کو جا لیا۔ تقریباً ایک فرلانگ برچھا لٹکائے گھوڑی کے آگے آگے کھید پایا ہوں گا اور برچھے کی نوک اور سور کے شانہ سے مخصوص زاویہ بنا کر گھوڑی کو کاشن دینے ہی والا تھا کہ سور پھر پلٹ پڑا اور حملہ کیا۔ مگر اب کی مرتبہ شاید ستارہ پہلے سے چوکنی بھی تھی اور شاید ایسے موقع پر بھی چل رہی تھی۔ پیشتر اس کے سور ٹانگوں تک پہنچ سکے، بڑے فنکارانہ انداز میں رفتار کو جست میں تبدیل کر دیا اور ایک پھرتیلے پٹے باز کی طرح پینترا سا بدل کر سور کے پیچھے جا گری، گویا شکاری کو قاعدہ کے مقام پر پہنچا کر پھر شکار کا خیال باندھا۔ لیکن گر کر سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ سور اس کے ساتھ ہی دوسرے حملہ کے لئے سیدھا ہو گیا۔ اور ستارہ نے پھر اسی داؤ پر حملہ خالی دیا، شاید دوسرے تیسرے حملہ تک میری شکاری اسپرٹ قائم رہی اور میں ہر لحظہ منتظر رہا کہ بھاگتے ہی بھرپور نیزہ جماؤں گا۔

مگر حملہ اور بچاؤ میں میرا جذبہ بہت جلد مدافعانہ شکل اختیار کرنے لگا۔ اگرچہ ستارہ نیولے اور سانپ والے انداز میں کھیل رہی تھی اور ہر حملہ خوب صورت پینتروں سے خالی دے رہی تھی۔ حملوں کی تندی شدید تر ہوتی گئی۔ ستارہ ایک ماہر جوٹ کی طرح دائیں بائیں پیچھے گرتی رہی اور دس بارہ من وزنی جسم کو ہنٹر کی طرح لہرا کر ادھر سے ادھر پھینکتی رہی اور "اکڑا" چٹان سا سور چلتے سانپ کی طرح اچھل اچھل کر حملے ہی حملے کرتا رہا۔

اور اب تو ستارہ مدافعت ہی مدافعت کرتی رہ گئی تھی، شکار بھول سا گئی تھی اور مجھے تو شروع میں ہی اندیشہ ہو گیا تھا کہ آثار اچھے نہیں ہیں۔ اور سور اپنی عافیت تابڑ توڑ حملوں ہی میں سمجھتا ہے اور تین چار منٹ گزر گئے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جنگ بیت گیا۔

اور معلوم ہوا کہ موت و زیست کے میدان میں پٹے کھا رہا ہوں اور وہ
کم بخت پیہم حملوں میں اتنا موقع بھی نہ دیتا تھا کہ پل بھر کے لئے گھوڑی
ذرا کنٹرول کرکے میدان سے فرار ہو سکوں۔ پیہم حملوں کے بچاؤ میں
مسلسل جستیں تھیں۔ دو حملوں کے درمیان میں بمشکل ایک پینترا مدافعت
کر رہا تھا۔ برچھا پھینک کر طنچہ نکالنے کا خیال آیا، مگر وہ بھی بیکار
ثابت ہوتا اور برچھا بھی ہاتھ سے جاتا۔ شدت بڑھتی ہی چلی گئی اور
ہر حملہ میں ستارہ بال بال بچی۔ اور مجھے ستارہ کی آنتیں ڈھیر نظر آئیں
اور پھر اپنا انجام . . . . . . دوسرے تین چار منٹ اور گذر گئے اور ہر
منٹ میں دو مرتبہ موت میرے سامنے آئی اور اب تو ستارہ زمین پر
اچھی طرح آنے بھی نہ پاتی تھی کہ وہ موذی سیدھا ہو جاتا تھا۔ پھر یہاں
پر زمین بھی خشک تھی، سور کے ہر حملے اور ستارہ کے ہر پینترے پر ریت
کا بگولہ سا اٹھتا۔ نہ معلوم کتنی ریت میرے حلق اور ناک کانوں میں
گھس گئی اور بعض مرتبہ یہ گرد مدافعت میں حائل ہوتی۔ اب ستارہ کا بھی
جی چھوٹ گیا، عاجز سی ہوگئی، جستوں میں بدحواسی سی نمایاں ہونے لگی
ایک آدھ مرتبہ تو بالکل دھر ہی لیا تھا نہ معلوم کیسے بچی۔ سور مسلسل حرکت
اور مجسم حملہ تھا، اور ستارہ پینترے ہی پینترے، جستیں ہی جستیں، ہر حملہ میں
موت نظر آتی تھی اور ہر پینترے میں نئی زندگی ملتی تھی، اور ابھی نئی زندگی
پانے کا احساس بھی شعور میں اچھی طرح نہ ابھرنے پاتا تھا کہ نئی موت
سامنے آجاتی تھی۔

نگاہ ہٹنے کا موقع نہ تھا لیکن شاید کسی آواز پر میری اچٹتی سی
نظریں پل بھر کے لئے اٹھیں۔ کچھ دور پر ناگ پھنی کی جھاڑیاں تھیں اور وہاں
کہیں پر مجھے ایک آدمی سا نظر آیا، ایک آواز بہت بلند عالی کان میں
پڑی۔ نگاہ تو خیر اک آن میں موت میں سے زندگی کی راہ ڈھونڈنے
پلٹ آئی مگر کان البتہ اس آواز پر لگ گئے اور شاید حملوں اور بچاؤ کی
دو تین الٹ پلٹ اور ہو پائی ہوں گی کہ کوئی بڑے زور سے دوڑا، ایک
قدآور انسان برچھا سیدھا کرکے ہملانے مجادلہ میں پھاند پڑا اور بڑے
زور سے سور کو ڈپٹا، اس کی للکار سے ستارہ کی ہمت بندھی اور میرا جی
ٹھہرا سا۔ سور نے اس پر بڑے زور سے چارج کیا، اس نے بہت ہی
مختصر سا پینترا کاٹ کر وار خالی دیا اور اب وہ مقابلہ میں نصف کا شریک
ہوگیا۔ مجھے فرار ہونے کے لئے میدان خالی تھا مگر یہ سوال تو اس
موقع پر میرے ذہن میں بھی نہ آسکتا تھا۔ اس کے بشرہ پر اطمینان
تھا۔ دو ایک مرتبہ للکار کر مجھے ہدایت دی، وہ مجھ کو پہچانتا تھا، شور
زیادہ مچا رہا تھا اور سور کو للکار للکار کر اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔
بار بار ستارہ کو ڈپٹ ڈپٹ کر ہدایت اور ڈھارس دیتا جاتا تھا۔ بچاؤ اور
حملہ کی صورتوں سے مجھ کو آگاہ کرتا جاتا تھا۔ مجھے نظر آیا کہ اس کے کندھے
پر رائفل لٹکا ہوا ہے، مگر ایسے موقع پر وہ بھی میرے طنچہ کی طرح بیکار
تھا۔ ستم یہ کہ ایک مرتبہ جب سور مجھ پر حملہ کر رہا تھا۔ اس نے موقع پاکر
اسے زخمی کر دیا۔ مگر برچھا بدن کے پچھلے حصہ پر پڑا تھا اور بھپرے ہوئے
سور پر بے اثر تھا۔ پھر تو سور شعلہ کی طرح لپکنے لگا۔ مگر اس کے اطمینان
اور دم خم میں فرق نہ آیا۔ بار بار جنگل کی جانب بلند آواز دیتا تھا، کسی کو
پکار رہا تھا۔

دور زمین پر پیچھے سے متحرک معلوم ہوئے، اور پلک مارتے کتوں
کی ایک پوری ٹیم نظر آئی۔ تیر کی طرح جھپٹے، اور اس نے بڑی جوشیلی آواز
میں باڑھ دی۔

"واہ بیٹا! مار استاد!"

ایک گرانڈیل کتا بجلی کی طرح ٹوٹا۔ ردعمل میں کالا کالا چیتھڑا
سا اڑا اور لال سفید رسیاں سی پھیل گئیں لیکن پٹخ کھا کر اسی تیزی سے
چت پٹ ہوگیا استاد سیدھا سور کے ٹینٹوے پر چلا تھا مگر سور نے اسے
کانیوں پر رکھ کر اچھال دیا تھا اور آنتیں بکھر دی تھیں، لیکن گرم خون
اور جوش میں آنتیں گھسیٹتے ہوئے استاد نے سور کا ٹینٹوا پکڑ ہی لیا اور
استاد کے مونہہ ڈالتے ہی سب کے سب چھوٹی ہوئی بھڑوں کی طرح
سور کی رگ رگ پر چمٹ ہی گئے، اور وہ آدمی ایک ایک کتے کا نام لیکر
بڑی جوشیلی آواز میں باڑھیں دیتا رہا ایک آن کی آن تو شکنجوں کے درمیان
نظر آیا اور پھر تو گیارہ شکاری کتوں کے دانتوں میں چٹان سا سور روئی
کی طرح دھنک گیا۔

موت کا سناٹا تمام ماحول پر طاری ہوگیا۔ کچھ اور آدمی بھی آگئے
تھے اور ایک گھوڑی۔ کائنات کو اپنے آپے کا ہوش آیا، نئی زندگی میں
ایک نظر پر تالا، میں چوٹی سے ایڑی تک شرابور تھا، ستارہ کے سموں

پسینہ چل رہا تھا اور استاد کی روح تو شاید سور کی پہلی ٹکر پر ہوا میں پرواز کر گئی ہو لیکن خونخوار شکاری جسم، الاماں، اب بھی جہان کا تہاں تھوتے پر جبڑا جمائے چمٹا رہ گیا تھا۔

میں نے جیب سے رومال نکال کر چہرہ پونچھا اور کچھ دور پر کھڑا استاد کی لاش کی جانب دیکھ دیکھ کر رو رہا تھا۔ ڈھیلا ڈھیلا۔ رنج و غم میں زیر و زبر میں اتر پڑا، برچھا پھینک کر اس کی جانب سیدھا بڑھا لیکن وہ وہیں کھڑا رہا اور میری جانب دیکھ کر ترچھا ہو کر تن گیا اور برچھا سنبھالا، تیوروں میں اجنبیت سی پیدا ہوگئی اور انداز جیسے کچھ جارحانہ سا۔ ذرا اور قریب پہنچ کر میں نے دفور جوش میں آغوش پھیلائے بے اختیار جی چاہا کہ اسے کھینچ کر پیار کرلوں، اس کے ہاتھ چوم لوں اس کے خالص شکاری جذبہ اور بہادری کو سراہوں اور جب میں بالکل ہی قریب پہنچ گیا تو وہ ڈھیلا ہوگیا، برچھا لٹک گیا اور جب میں نے شاید مخصوص شکاری اصطلاح میں کوئی توصیفی لفظ منہ سے نکالا تو حالات توقع وہ مڑ گیا اور جیسے حقارت کے ساتھ منہ سا پھیر گیا اور پلٹ کر اپنی گھوڑی پر سوار ہو گیا اور مڑ کر چل پڑا "ٹھہرو بھئی!" میں نے آواز دی۔ مگر جیسے اس نے سنی بھی نہیں۔ آہستہ آہستہ گھوڑی بڑھا دی۔ کیا انداز تھا۔ اس کا ایں!؟" میں دل ہی دل میں متحیر ہو کر رہ گیا۔ میں نے ایک منٹ سکوت کیا مگر وہ چلا ہی گیا۔ پلٹ کر ان آدمیوں نے قریب آیا جو سور کے بچھڑوں کو سنبھال رہے تھے اور پوچھا کہ یہ کون تھا؟

"ایں، آپ نہیں جانتے؟ اور وہ تو آپ کی آواز سن کر آتے تھے۔ سنگھ بابو"

"سنگھ بابو" سنتے ہی یک دم جیسے کائنات ٹھہری، میں دم بخود خلاؤں میں جا پڑا، جیسے کرۂ ارض کی گرمی تھی اور ہوا، سب کچھ شکاری جذبہ کی عظمتوں میں بدل گیا اور جب میں نے دور نظر کی تو اندازہ کیا کہ وہ اپنی گھوڑی پر مجھ سے بہت آگے نکل گیا اور میں اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔ (بشکریہ "ماہ نو")

عبدالحمید عدم ●

جو شخص تری خو سے خبردار نہیں ہے
وہ تیری مروّت کا سزاوار نہیں ہے

تدبیر کا شکوہ ہے کہ ہے رُوٹھی ہوئی سی
تقدیر کا رونا ہے کہ بیدار نہیں ہے

پروانے کے جلنے سے پتہ چلتا ہے کچھ کچھ
کھلنا ترے آغوش کا دشوار نہیں ہے

جیسے تری زلفوں کی ہوا رُوح فزا ہے
ایسا تو کوئی سایۂ گلزار نہیں ہے،

ہم دولتِ دل لیکے بھی آئے ہیں تو کس وقت
بازار میں جب کوئی خریدار نہیں ہے

کانٹے کی جراحت سے بھی ہو جاتی ہے تسکین
بے لوث خوشی کا کوئی معیار نہیں ہے

خنداں ہے عدم غنچہ اس افسردہ دلی سے
ہنستا ہوا جیسے کوئی بیمار نہیں ہے

(جام نو)

رعنا ظفر ●

اہل دل کا سرمایہ سوزِ غم ہی کافی ہے
آرزو مسرّت کی عشق کے منافی ہے

یوں تو غیر ممکن ہے دیکھنا بغور ان کو
جرم یک نظر لیکن ــــ قابلِ معافی ہے

میری عرض غم سن کر مسکرا رہے ہو تم
عمر بھر کے صدموں کی کیا یہی تلافی ہے

جاں نثار کرنے کو سادگی ہی کیا کم تھی؟
زیرِ لب تبسّم تو عشوۂ اضافی ہے

حسن و عشق دونوں میں ربط ہے بہر صورت
مسئلہ بظاہر یہ رعنا اختلافی ہے

بیدل میرٹھی •

هم اہلِ ستم پر یہ کرم کرتے رہیں گے کچھ بھی ہو مگر عذرِ ستم کرتے رہیں گے

بہتے ہوئے اشکوں کو کریں گے نہ کبھی ضبط تاریخِ غمِ عشق رقم کرتے رہیں گے

اے شیخ حرم فائدہ کیا بُت شکنی سے؟ تقلیدِ صنم، اہلِ حرم کرتے رہیں گے

برہم کریں شیرازۂ گیسو بخوشی آپ ہم آپ کی زلفوں کو بہم کرتے رہیں گے

اے دوست نہ تو شیوۂ بیداد سے باز آ باقی رہی فریاد، تو ہم کرتے رہیں گے

تحریرِ محبت سے نہ باز آئینگے ہم لوگ تسلیم، وہ ہاتھوں کو قلم کرتے رہیں گے

امیدِ کرم اور کسی دشمن جاں سے؟
بیدل یہ بہت ہے وہ ستم کرتے رہیں گے

(بشکریہ "لالہ زار" لائلپور)

مسرور قریشی •

یاد....

یاد اُن کی کبھی جو آتی ہے آرزو دل کی مسکراتی ہے

زندگی کو سکون کیا ہو گا پر طبیعت بہل تو جاتی ہے

مشیر کراچی
عبدالحمید، ۔ نبیل فیورہ

نو ــــ بیس!

رات کے دس بجے سلیم نے اپنی موٹی سی طبیعات کی کتاب بند کی اس وقت اس کے چہرے پر انتہائی تھکن کے ساتھ ساتھ کچھ اڈ ان کے آثار بھی تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھے ہوئے لیمپ کا بٹن دبایا۔ لیکن فوراً ہی اسے خیال آیا کہ اس نے گھڑی میں الارم تو لگایا ہی نہیں۔ اس لئے اس نے دوبارہ لیمپ جلایا اور گھڑی میں چابی دے کر اس میں پانچ بجے کا الارم لگا دیا۔ پھر اس نے ایک دفعہ سب طرف نظر دوڑائی اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ اب اس کا کوئی کام باقی نہیں رہ گیا ہے اس نے بتی بجھا دی اور اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس وقت فوراً سو جائے۔ کیونکہ پچھلے تین دن میں وہ بمشکل ہی چند گھنٹے سویا تھا۔ لیکن نیند تو آج کل گویا اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی تھی۔ جب وہ پڑھنے بیٹھتا تو اسے اپنی آنکھیں بوجھل بوجھل سی معلوم ہوتی تھیں۔ اور بعض دفعہ وہ کئی صفحے پڑھ لینے کے بعد محسوس کرتا گویا وہ اتنی دیر پڑھتا نہیں بلکہ سوتا رہا ہے۔ اس کے برعکس جب وہ سونے کے لئے لیٹتا تو نیند اس سے کوسوں دور بھاگ جاتی۔ اس وقت بھی سلیم کی یہی حالت تھی۔ اس نے کئی دفعہ دائیں بائیں کروٹ بدلی لیکن بے کار۔ آخر اس نے اپنا منہ بھی چادر میں چھپا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ خیالات کا تانتا اب بھی نہ ٹوٹا اسے ایسا محسوس ہوا گویا احسن ابھی تک کتاب کھولے پڑھائی کر رہا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں اسے ایک مہذب سی گالی دی اور سوچنے لگا کہ اس مرتبہ میں احسن کو ضرور شکست دوں گا۔ اسے آتا ہی کیا ہے وہ تو چیزوں کو صرف رٹ لیتا ہے عقل تو اس کے پاس نام کو بھی نہیں ہے عملی امتحان میں اس کے نمبر کم آئیں گے۔ اور میں نے تو پچھلے چار مہینے بالکل ٹھوس مطالعہ کیا ہے۔ احسن نے تو سمتھ (Smith) کی طبیعات کی کتاب کا نام بھی نہیں سنا ہو گا ـــــ اور سمتھ کے نام کے ساتھ ہی کمال کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ ایک ڈر سا اس کے دل میں پیدا ہوا کہیں کمال اس کی امید وں پر پانی نہ پھیر دے۔ اس نے تو سمتھ کے صفحے صفحے کو چاٹ ڈالا ہو گا اور پھر جلد ہی اسے غصہ سا آ گیا۔ وہ آہستہ سے بڑبڑایا میں کمال کو ہرگز جیتنے نہیں دوں گا ـــــ وہ کمال جس نے احسن کے سامنے میرا مذاق اڑایا تھا۔ مجھے سنا کر کہا تھا کہ انسان کو کوئی چیز رٹنے کے بجائے اسے سوچ سمجھ کر دماغ میں محفوظ کر لینا چاہیئے ـــــ نہیں نہیں! میں کمال کو ضرور نیچا دکھاؤں گا ـــــ کیا چیز میں نے سوچ سمجھ کر یاد نہیں کی ہے ـــــ مقناطیس۔ مجھے یاد ہے "برق رواں" مجھے بالکل ازبر ہے۔ "انعکاس" و انعطافِ نور" کے تمام قوانین کی میں بخوبی تشریح کر سکتا ہوں۔ اور "نیوٹن کے قوانینِ حرکت"!.... اور جیسے الفاظ اس کے دماغ کی جھلیوں میں پھنس کر رہ گئے ہوں۔ رات وہ "قوانینِ حرکت" کو دہرانا تو بالکل بھول ہی گیا تھا۔ اور الیاس نے کل ہی تو اسے بتایا تھا کہ "قوانینِ حرکت" بہت اہم ہیں اور اسے سو فیصدی یقین تھا کہ اس دفعہ وہ امتحان میں ضرور پوچھے جائیں گے ـــــ قریب ہی تھانے کی چوکی میں تین کا گھنٹہ بجا اور سلیم کی پریشانی میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے فوراً "نیوٹن کے قوانین" کو اپنے دماغ میں دہرانے کی کوشش کی ـــــ پہلا قانون.... کوئی ساکن جسم خود بخود حرکت نہیں کر سکتا.... اور اسے اطمینان ہو گیا کہ پہلا قانون اسے اچھی طرح یاد ہے۔ پھر وہ دوسرا قانون یاد کرنے لگا.... کچھ دیر تو وہ گھڑی کی ٹک ٹک سنتا خاموشی سے آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ پھر اس نے ایک دم سے آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں زور سے بند کر لیں اور اپنے ماتھے پر آہستہ آہستہ اپنے

دائیں ہاتھ سے گھونسے مارنے لگا۔ پھر وہ ایک دم سے چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے لیمپ کا بٹن دبایا۔ گھڑی میں پونے چار بجے تھے۔ اس نے الماری کھول کر اس میں سے ایک موٹی سی کتاب نکالی، اور اس میں قوانین حرکت تلاش کرنے لگا۔ اس نے جلدی جلدی صفحے ادھر سے ادھر پلٹے ——— آخر اس نے فہرست مضامین کا صفحہ کھولا اور اسے بہت ہی غصہ آیا جب اس نے دیکھا کہ وہ طبیعات کی نہیں بلکہ کیمیا کی کتاب تھی۔ اس نے اس کتاب کو زور سے میز پر پھینک دیا۔ اور الماری میں سے دوسری کتاب نکالی اس نے سب سے پہلے اس کتاب کا نام دیکھا اور پھر فہرست مضامین کی مدد سے جلد ہی "نیوٹن کے قوانین" ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا ——— دوسرا قانون ..... اور دوسرے قانون پر نظر پڑتے ہی اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی ——— اس قدر آسان! میں اسے کیسے بھول گیا تھا۔؟ پھر اس نے اس قانون کی تشریح پڑھنی شروع کر دی ——— ٹن ٹن ٹن ٹن۔ چار کا گھنٹہ بجا اور اس نے فوراً کتاب پھینک دی اور لیمپ بجھا کر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ دوبارہ وہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے اپنی آنکھیں زور سے بند کر لیں اور چادر اپنے سر تک تان لی پھر اس نے کروٹیں لینا شروع کر دیں تھوڑی دیر بعد اسکی آنکھوں کے پپوٹے کانپنے لگے۔ گویا کھلنے کے لئے بیقرار ہوں۔ اسے رونا سا آ گیا۔ اس کے سر کے قریب ہی ایک مچھر نے بھن بھن کرنا شروع کر دیا۔۔ اس نے زور سے اپنا ہاتھ اوپر کی طرف مارا۔ گھڑی دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔ اس نے گھڑی اٹھا کر دوبارہ میز پر رکھ دی گھڑی کی بڑی سوئی بارہ سے تین پر پہنچ گئی تھی۔ وہ پھر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس نے سوچا۔ امتحان شروع ہونے میں صرف پونے چار گھنٹے رہ گئے ہیں۔ اور وہ پچھلے تین دن سے قطعی نہیں سویا ہے۔ آخر وہ پرچہ کس طرح کرسکے گا ——— پھر اس نے سوچا۔ اس طرح بیکار لیٹے رہنے سے تو بہتر ہے کہ وہ کچھ پڑھ ہی لے۔ پھر وہ لیٹے لیٹے ہی اپنے دل میں دہرانے لگا۔ "آواز" تو مجھے اچھی طرح یاد ہے ——— اور "حرارت" اس کا تو ایک فارمولا مجھے رٹنا پڑا ہے ——— "حرارت" کا تو کوئی سوال مجھ سے چھوٹ ہی نہیں سکتا ——— اور "قوانین حرکت" تو میں نے ابھی ابھی دہرلئے ہیں ——— پھر احتیاطاً "قوانین حرکت" کو اس نے دوبارہ دل ہی دل میں دہرانا شروع کر دیا لیکن دوسرے قانون پر وہ پھر اٹک گیا۔ اس نے دماغ پر بہت زور ڈالا لیکن ایک لفظ بھی اسے یاد نہ آیا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا۔ گویا وہ سب کچھ بھول گیا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال کھینچنے شروع کر دیئے پھر ایکدم اس نے اپنے ہاتھ ڈھیلے کر دیئے اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اسے دوسرا قانون حرکت یاد آ گیا تھا ——— اس نے دل ہی دل میں دو تین مرتبہ اسے دہرایا اور سوچنے لگا ایسا صرف میرے ہی ساتھ تو نہیں ہوتا۔ سب ہی لڑکے کبھی کبھی بعض چیزیں بھول جاتے ہوں گے۔ مجھے اتنا گھبرانا نہیں چاہئے پھر اس نے آنکھیں بند کر کے بائیں طرف کو کروٹ لی۔ ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن۔ پانچ کا گھنٹہ بجا اور ساتھ ہی ساتھ اس کی گھڑی بھی شور مچانے لگی۔ اس نے اٹھ کر الارم بند کیا۔ اور واپس آ کر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ محلے کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ ——— اس خاموشی میں اسے یہ آواز بہت ہی پیاری معلوم ہوئی۔ اس نے سوچا میری تیاری تو مکمل ہے ہی۔ اگر اللہ میاں کی مدد بھی میرے ساتھ ہو۔ تو میں ضرور اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ لہٰذا وہ اٹھا نہا دھو کر پاک کپڑے پہنے اور مصلّٰی پر کھڑا ہو گیا۔ نماز ختم کر کے وہ بہت دیر تک دعا مانگتا رہا۔ اس نے کہا: "یا اللہ تو میری کوششوں سے واقف ہے۔ میں پچھلے چار مہینے سے محنت کر رہا ہوں۔ اب آگے سب کچھ تیرے ہاتھ میں ہے تو اپنے بندوں کی دعاؤں کو سننے والا ہے۔ تو بڑا رحیم و کریم ہے" ——— آخر میں اس نے اپنے دل میں ارادہ کیا کہ اگر وہ اس دفعہ اول آ گیا تو دس روپے اللہ کی راہ میں خیرات کرے گا ——— لیکن اسی وقت ایک خیال اس کے ذہن میں ابھرا ——— جب آج سے دو سال پہلے وہ میٹرک کا امتحان دینے جا رہا تھا تب بھی اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گیا تو دو روپے خیرات کرے

——— اور پھر وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس بھی ہوگیا تھا۔ لیکن اس کے بعد یہ دعوہ اس کے ذہن سے بالکل اتر ہی گیا تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آج امتحان کے کمرے میں پہنچنے سے پہلے ہی یہ روپے کسی فقیر کو دے دے گا۔

جب وہ مصلّے پر سے اٹھا۔ تو گھڑی میں پونے چھ بجے تھے اس نے سٹوو (سٹوو) جلایا اور اس پر چائے کے لئے پانی رکھ دیا۔ پھر اس نے کپڑے تبدیل کئے ——— اور اس کے بعد ناشتہ کرنے بیٹھ گیا۔ لیکن پوری ڈبل روٹی میں سے وہ ایک توس بھی پورا نہ کھا سکا۔ اور چائے بھی اس نے آدھی سے زیادہ پیالی ہی میں چھوڑ دی۔ جب اس نے ناشتہ ختم کیا۔ تو گھڑی میں ساڑھے چھ بجے تھے۔ اس کا امتحان آٹھ بجے شروع ہونے والا تھا اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سوا سات بجے گھر سے چلے گا پھر وہ چارپائی پر پاؤں نیچے لٹکا کر لیٹ گیا۔ اور اپنی موٹی سی طبیعات کی کتاب کو اپنے سینے پر رکھ کر پڑھنے لگا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اسے اپنے ہاتھوں میں کچھ تھکن سی محسوس ہونے لگی۔ لہٰذا اس نے کتاب کو کرسی پر اس طرح جما دیا کہ وہ لیٹے لیٹے اسے پڑھ سکتا تھا۔ دو تین ہی صفحے پڑھنے کے بعد اسے اپنی آنکھیں بوجھل بوجھل سی معلوم ہونے لگیں۔ اس نے اپنی آنکھیں دونوں ہاتھوں سے ملیں اور سر گھما کر گھڑی کی طرف دیکھا ——— سات بجنے میں دس منٹ باقی تھے ——— وہ پھر پڑھنے لگا۔ اس دفعہ اسے پڑھنے میں ایک قسم کا سرور سا محسوس ہونے لگا ——— پھر وہ خلاؤں میں اڑنے لگا ——— اور جب کافی دیر بعد وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ تو اس نے دیکھا گھڑی میں نو بجکر بیس منٹ ہوئے تھے ——— اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملیں۔ غور سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اپنی ران میں زور سے چٹکی لی، اور جب اسے پورا الیقین ہوگیا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا ہے۔ بلکہ واقعی وہ پچھلے دو ڈھائی گھنٹے سوتا ہی رہا ہے۔ تو وہ اٹھا اور سب سے پہلے گھڑی کو اٹھا کر زور سے زمین پر پٹک دیا۔ اس کے بعد اس نے میز پر رکھی ہوئی طبیعات کی کتاب کو زور سے زمین پر دے مارا۔ پھر وہ پاگلوں کی طرح کمرے میں چکر لگانے لگا پھر کچھ سوچ کر ایک دم...... الماری کی طرف بڑھا۔ اور اس میں سے مصلّٰی نکال لایا اور اسے اپنے دانتوں سے تار تار کر دینے کی کوشش کرنے لگا لیکن جب وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تو اس نے کھڑکی کھول کر مصلّے کو باہر پھینک دیا۔

کچھ عرصہ بعد بعض لوگوں نے سلیم کو کافی ہاؤس میں دیکھا۔ اس کے بال بڑھے ہوئے تھے اور اس کے منہ میں سگریٹ تھا

وحیدہ نسیم •

○

پھر رشتہ ہائے دیر و حرم یاد آ گئے — سجدہ میں سر جھکا تو صنم یاد آ گئے

کچھ تذکرہ تھا ہستیِ ناپائیدار کا — ہم کو تمہارے قول و قسم یاد آ گئے

صحنِ چمن میں دیکھ کے افتادہ برگِ گل — عمرِ رواں کے نقشِ قدم یاد آ گئے

گل پر چھلک رہے ہیں یہ شبنم کے اشک کیوں — شاید بھری بہار کو ہم یاد آ گئے

کچھ اس طرح وہ روٹھ کے ہم سے چلے گئے — ہم کو فلک کے سارے ستم یاد آ گئے

ساغر لیا جو ہاتھ میں آنسو چھلک پڑے — ہمدم ملا تو رنج و الم یاد آ گئے

آنسو ہنسی ہنسی میں نکل آئے کیوں نسیم\
بیٹھے بٹھائے کون سے غم یاد آ گئے

(بشکریہ "ماہِ نو")

عاصی کرنالی •

دو شعر

منصب و جاہ تو اک امرِ اضافی ہے فقط — نہ امارت کو بقا ہے نہ صدارت کو دوام

زندہ رہتی ہے جو شے وہ ہے بشر کا اخلاص — ہے یہی جوہرِ ایماں، یہی روحِ اسلام

اور پھر وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس بھی ہو گیا تھا۔ لیکن اس دن کے بعد یہ دعا اس کے ذہن سے بالکل اتر ہی گئی تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آج امتحان کے کمرے میں پہنچنے سے پہلے ہی یہ روپے کسی فقیر کو دے دے گا۔

جب وہ مصلے پر سے اٹھا۔ تو گھڑی میں پونے چھ بجے تھے اس نے سٹوو (سٹوو) جلایا اور اس پر چائے کے لئے پانی رکھ دیا۔ پھر اس نے کپڑے تبدیل کئے ——— اور اس کے بعد ناشتہ کرنے بیٹھ گیا۔ لیکن پوری ڈبل روٹی میں سے وہ ایک توس بھی پورا نہ کھا سکا۔ اور چائے بھی اس نے آدھی سے زیادہ پیالی ہی میں چھوڑ دی۔ جب اس نے ناشتہ ختم کیا۔ تو گھڑی میں ساڑھے چھ بجے تھے۔ اس کا امتحان آٹھ بجے شروع ہونے والا تھا اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سوا سات بجے گھر سے چلے گا پھر وہ چارپائی پر پاؤں نیچے لٹکا کر لیٹ گیا۔ اور اپنی موٹی سی طبیعات کی کتاب کو اپنے سینے پر رکھ کر پڑھنے لگا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اسے اپنے ہاتھوں میں کچھ تھکن سی محسوس ہونے لگی۔ لہذا اس نے کتاب کو کرسی پر اس طرح جما دیا کہ وہ لیٹے لیٹے اسے پڑھ سکتا تھا۔ دو تین ہی صفحے پڑھنے کے بعد اسے اپنی آنکھیں بوجھل بوجھل سی معلوم ہونے لگیں۔ اس نے اپنی آنکھیں دونوں ہاتھوں سے ملیں اور سر گھما کر گھڑی کی طرف دیکھا ——— سات بجنے میں دس منٹ باقی تھے ——— وہ پھر پڑھنے لگا۔ اس دفعہ اسے پڑھنے میں ایک قسم کا سرور سا محسوس ہونے لگا ——— پھر وہ خلاؤں میں اڑنے لگا ——— اور جب کافی دیر بعد وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ تو اس نے دیکھا گھڑی میں نو بج کر بیس منٹ ہوئے تھے ——— اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملیں۔ غور سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اپنی ران میں زور سے چٹکی لی، اور جب اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا ہے۔ بلکہ واقعی وہ پچھلے دو ڈھائی گھنٹے سوتا ہی رہا ہے۔ تو وہ اٹھا اور سب سے پہلے گھڑی کو اٹھا کر زور سے زمین پر پٹک دیا۔ اس کے بعد اس نے میز پر رکھی ہوئی طبیعات کی کتاب کو زور سے زمین پر دے مارا۔ پھر وہ پاگلوں کی طرح کمرے میں چکر لگانے لگا پھر کچھ سوچ کر ایک دم .... الماری کی طرف بڑھا۔ اور اس میں سے مصلیٰ نکال لایا اور اسے اپنے دانتوں سے تار تار کر دینے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جب وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تو اس نے کھڑکی کھول کر مصلے کو باہر پھینک دیا۔

کچھ عرصہ بعد بعض لوگوں نے سلیم کو کافی ہاؤس میں دیکھا۔ اس کے بال بڑھے ہوئے تھے اور اس کے منہ میں سگریٹ تھا

وحیدہ نسیم

پھر رشتہ ہائے دیر و حرم یاد آ گئے — سجدہ میں سر جھکا تو صنم یاد آ گئے

کچھ تذکرہ تھا ہستیٔ ناپائدار کا — ہم کو تمہارے قول و قسم یاد آ گئے

صحنِ چمن میں دیکھ کے افتادہ برگِ گل — عمرِ رواں کے نقشِ قدم یاد آ گئے

گل پر چھلک رہے ہیں یہ شبنم کے اشک کیوں — شاید بھری بہار کو ہم یاد آ گئے

کچھ اس طرح وہ روٹھ کے ہم سے چلے گئے — ہم کو فلک کے سارے ستم یاد آ گئے

ساغر لیا جو ہاتھ میں آنسو چھلک پڑے — ہمدم ملا تو رنج و الم یاد آ گئے

آنسو ہنسی ہنسی میں نکل آئے کیوں نسیم
بیٹھے بٹھائے کون سے غم یاد آ گئے

(بشکریہ "ماہِ نو")

عاصی کرنالی

دو شعر

منصب و جاہ تو اک امرِ اضافی ہی فقط — نہ امارت کو بقا ہے نہ صدارت کو دوام

زندہ رہتی ہی جو شے وہ ہے بشر کا اخلاص — ہے یہی جوہرِ ایماں، یہی روحِ اسلام

• عمرآن انصاری

سرشارِ جنونِ عشق ہوں میں، مرہونِ مئے اوہام نہیں
یہ خواب سہی دیوانے کا لیکن یہ خیالِ خام نہیں!

مستوں میں نہ حافظ شیرازی، رندوں میں عمر خیام نہیں
ساقی! یہ ہماری مستی ہے تجھ پر تو کوئی الزام نہیں

میخانہ ہستی عام تو ہے، کہنے کو صلائے عام نہیں
کس سمت نہیں ساقی کی نظر کس دل میں طلوعِ جام نہیں

ہر حسنِ گرامی کرتا ہے پرہیز جمال آرائی سے
در پردہ حقیقت کیا کہیئے، کچھ شبہ نہیں، ابہام نہیں

منزل کا پتہ معلوم ہے پھر یہ ترکِ طلب کا وہم ہی کیا
جو راہ طلب میں خود نہ اٹھے وہ سنگ گری ہی گام نہیں

کتنے ہی کتابی چہروں پر مائل ہے دل دیوانہ مگر
افسانۂ عشق کا دنیا میں آغاز تو ہے انجام نہیں

پروانے کے غم میں شمع جلے، یا شمع کے غم میں پروانہ
خود اپنی ہی آگ میں جل جانا اے دوست مذاقِ عام نہیں

وہ وعدہ فراموش آئیگا اے وقت ٹھہر اے وقت ٹھہر
یا گردشِ دوراں سے کہدے اب صبح نہیں، یا شام نہیں

تخئیل کی نازک لہروں پہ یادوں کے کنول جل اٹھے ہیں
لیکن بخیالِ تنہائی، تسکین نہیں، آرام نہیں

خاموش رہوں تو رہ نہ سکوں، کہنے پہ جو آؤں کہہ نہ سکوں
عمرآن مرے دل میں کوئی جذبہ ہے کہ جس کا نام نہیں

قطعہ

• محسن بھوپالی

تلقینِ اعتماد وہ فرما رہے ہیں آج
راہِ طلب میں خود جو کبھی معتبر نہ تھے
نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھئے!
منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

نور صفی ●

ایک چور، ایک معصوم

"یہ سراسر غلط ہے۔"

"اجی یہ تو کسی دشمن کی اڑائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاں! ہاں! یہ جھوٹ ہے۔"

"اجی صاحب! شیخ قمرالدین کے گھر میں ایسی بات تو کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔"

اکثر لوگ اسی قسم کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اور کوئی شخص بھی اس بات کا جو شیخ جی کے گھر میں ہوئی یقین نہیں کر رہا تھا۔ اور پھر کرتا بھی کیسے؟ شیخ جی نماز روزے کے پابند اور متقی پرہیزگار آدمی تھے۔ پڑوسی ان سے خوش اور محلے والے ان سے مطمئن تھے۔ اس کے علاوہ وہ معاملے کے بڑے کھرے اور صاف تھے۔ اپنی دوکان "چیپ شو ہاؤس" پر بیٹھ کر کبھی بھی "کردم" کا بنا ہوا جوتا "سکاف" کا کہہ کر نہیں بیچا تھا۔ اور جائز منافع سے ایک پائی زیادہ لینا ان کے نزدیک ناجائز تھا۔ اسی وجہ سے شیخ جی کی دکان کا گاہک دوسری دکان پر شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا تھا۔

اب ان باتوں کے ہوتے ہوئے کوئی کیسے سمجھ لیتا کہ شیخ جی کے گھر میں اس قسم کی بات ہوئی ہوگی۔ البتہ اتنی بات ضرور تھی کہ شیخ جی کی یہ دوسری شادی تھی۔ مگر دوسری شادی کرنا کوئی گناہ بھی نہیں اور یہ تو ویسے تھے بھی مجبور۔ کیونکہ ان کی پہلی بیوی مر چکی تھی جس کے بطن سے ان کا ایک جوان اور شادی شدہ لڑکا انور اپنے بیوی بچوں اور سالے اکرم سمیت شیخ جی کے پلاٹ ہی میں جو کہ ناظم آباد میں تھا ایک سرے پر اپنا مکان بنا کر رہتا تھا۔ دونوں سالہ بہنوئی جنرل اسٹور کی ایک دکان چلاتے تھے۔ پلاٹ کے دوسرے سرے پر شیخ جی اپنے مکان میں رہتے تھے۔ بیچ کا صحن دونوں کے لئے مشترک تھا۔ شیخ جی کی دوسری شادی ہوئے کوئی سال دو سال نہیں ہوئے بلکہ پورے سترہ سال گزر گئے تھے، ان کی موجودہ بیوی سے ایک جوان لڑکی زرینہ تھی۔ جو کہ ماڈرن ہائی اسکول کی دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ تاہم بیوی اپنی صحت اچھی ہونے کی وجہ سے ان کی نسبت جوان معلوم ہوتی تھی، یہی وجہ تھی کہ ابھی تک اس کی طبیعت میں ایک چھچھورا پن سا باقی تھا۔ اور اسی لئے اس کا دل ہمیشہ اس کو اچھلنے کودنے پر مجبور کرتا تھا۔ اور پھر کرتا بھی کیسے نہ؟ کیونکہ وہ ایک دیہاجو کی بیوی تھی جس کے لئے عام طور پر یہ مشہور ہے کہ

دیہاجو کی بیوی، سوداگر کا گھوڑا
جتنا کودے اتنا ہی تھوڑا

چنانچہ جب شیخ جی اور ان کا لڑکا انور اپنے سالے اکرم کے ساتھ اپنے اپنے کاموں پر چلے جاتے تو اس کی دیورانیوں اور جیٹھانیوں کے نوجوان لڑکے جو ان کے قرب و جوار ہی میں رہتے تھے۔ اس کے گھر پہنچ جاتے۔ بس! پھر خوب ہنسی مذاق ہا ہا! ہی ہی! ہوتا۔ غرضیکہ وہ دھکم پیل ہوتی اور ایسی دھما چوکڑی مچتی کہ توبہ ہی بھلی۔ یہ دیکھ کر زرینہ کا دل بھی چاہتا کہ وہ بھی لعد زور ہنسے اور خوب اچھلے کودے۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی۔ وہ ان لوگوں کے سامنے ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ ناچار ایک کونے میں بیٹھ کر اپنی خواہش کو کسی کتاب کے مطالعہ میں گم کر دیتی اور ساتھ ہی ساتھ کنکھیوں سے دیکھتی بھی رہتی۔

شیخ جی جس چیز کو ناجائز سمجھتے اس کو ان کی بیوی جائز سمجھتی تھی۔ اور جو ان کے لیے حرام تھا۔ وہ اسکے لئے حلال تھا چنانچہ اس کا پیر جھنڈے شاہ کے ہاں بھی آنا جانا تھا جو کہ ایک عربی معلم یوسف بن احمد کے ایجنٹ ہونے کی وجہ سے کئی حج کر چکے تھے۔ جو حج کے لئے اپنے مریدوں سے چندہ بھی حاصل کر لیتے تھے۔ جن کے ڈیرے پر ہر مہینے شام کے وقت گیارہویں شریف کے ختم پر پلاؤ اور زردے کی بڑی بڑی دیگیں دم ہوتی تھیں۔ اور قوالی تو ایسی زوردار ہوتی تھی۔ کہ دور دور سے لوگ سننے کیلئے آتے تھے شیخ جی کی بیوی گھر پہنچ کر ایک ہاتھ کان پر رکھکر

عمران انصاری

سرشارِ جنونِ عشق ہوں میں، مرہونِ مئے اوہام نہیں
یہ خواب سہی دیوانے کا لیکن یہ خیالِ خام نہیں!

مستوں میں نہ حافظ شیرازی، رندوں میں عمر خیام نہیں
ساقی! یہ ہماری مستی ہے تجھ پر تو کوئی الزام نہیں

میخانۂ ہستی عام تو ہے، کہنے کو صلائے عام نہیں
کس سمت نہیں ساقی کی نظر کس دل میں طلوعِ جام نہیں

ہر حسنِ گرامی کرتا ہے پرہیز جمال آرائی سے
در پردہ حقیقت کیا کہیئے، کچھ شبہ نہیں ابہام نہیں

منزل کا پتہ معلوم ہے پھر یہ ترکِ طلب کا وہم ہی کیا
جز راہ طلب میں خود نہ اٹھے وہ سنگ گری ہی گام نہیں

کتنے ہی کتابی چہروں پر مائل ہے دل دیوانہ مگر
افسانۂ عشق کا دنیا میں آغاز تو ہے انجام نہیں

پروانے کے غم میں شمع جلے، یا شمع کے غم میں پروانہ
خود اپنی ہی آگ میں جل جانا اے دوست مذاقِ عام نہیں

وہ وعدہ فراموش آئیگا اے وقت ٹھہرا ے وقت ٹھہر
یا گردشِ دوراں سے کہدے اب صبح نہیں یا شام نہیں

تخیل کی نازک لہروں پہ یادوں کے کنول جل اٹھے ہیں
لیکن بخیال تنہائی، تسکین نہیں، آرام نہیں

خاموش رہوں تو رہ نہ سکوں، کہنے پہ جو آؤں کہہ نہ سکوں
عمرآن مرے دل میں کوئی جذبہ ہے کہ جس کا نام نہیں

قطعہ

محسن بھوپالی

تلقینِ اعتماد وہ فرما رہے ہیں آج
راہِ طلب میں خود جو کبھی معتبر نہ تھے
نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھیئے!
منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

نورصفی •

ایک چور، ایک معصوم

"یہ سراسر غلط ہے!"

"اجی یہ تو کسی دشمن کی اڑائی ہوئی معلوم ہوتی ہے!"

"ہاں! ہاں! یہ جھوٹ ہے۔"

"اجی صاحب! شیخ قمرالدین کے گھر میں ایسی بات تو کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔"

اکثر لوگ اسی قسم کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اور کوئی شخص بھی اس بات کا جو شیخ جی کے گھر میں ہوئی یقین نہیں کر رہا تھا۔ اور پھر کرتا بھی کیسے؟ شیخ جی نماز روزے کے پابند اور متقی پرہیزگار آدمی تھے۔ پڑوسی ان سے خوش اور محلے والے ان سے مطمئن تھے۔ اس کے علاوہ معاملے کے بڑے کھرے اور صاف تھے۔ اپنی دوکان "چیپ شو ہاؤس" پر بیٹھ کر کبھی بھی "کروم" کا بنا ہوا جوتا "کاف" کا کہہ کر نہیں بیچا تھا۔ اور جائز منافع سے ایک پائی زیادہ لینا ان کے نزدیک ناجائز تھا۔ اسی وجہ سے شیخ جی کی دکان کا گاہک دوسری دکان پر شاذونادر ہی دکھائی دیتا تھا۔

اب ان باتوں کے ہوتے ہوئے کوئی کیسے سمجھ لیتا کہ شیخ جی کے گھر میں اس قسم کی بات ہوئی ہوگی۔ البتہ اتنی بات ضرور تھی کہ شیخ جی کی یہ دوسری شادی تھی۔ مگر دوسری شادی کرنا کوئی گناہ بھی نہیں اور یہ تو ویسے بھی مجبور۔ کیونکہ ان کی پہلی بیوی مرچکی تھی جس کے بطن سے ان کا ایک جوان اور شادی شدہ لڑکا انور اپنے بیوی بچوں اور سالے اکرم سمیت شیخ جی کے پلاٹ ہی میں جو کہ ناظم آباد میں تھا ایک سرے پر اپنا مکان بنا کر رہتا تھا۔ دونوں سالہ بہنوئی جنرل اسٹور کی ایک دکان چلاتے تھے۔ پلاٹ کے دوسرے سرے پر شیخ جی اپنے مکان میں رہتے تھے۔ بیچ کا صحن دونوں کے لئے مشترکہ تھا۔ شیخ جی کی دوسری شادی ہوئے کوئی سال دو سال نہیں ہوئے بلکہ پورے سترہ سال گزر گئے تھے، ان کی موجودہ بیوی سے ایک جوان لڑکی زرینہ تھی۔ جو کہ ماڈرن ہائی اسکول کی دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ تاہم بیوی اپنی صحت اچھی ہونے کی وجہ سے ان کی نسبت جوان معلوم ہوتی تھی، یہی وجہ تھی کہ ابھی تک اس کی طبیعت میں ایک چھچھوراپن سا باقی تھا۔ اور اسی لئے اس کا دل ہمیشہ اس کو اچھلنے کودنے پر مجبور کرتا تھا۔ اور پھر کرتا بھی کیسے نہ؟ کیونکہ وہ ایک دیہاجو کی بیوی تھی جس کے لئے عام طور پر یہ مشہور ہے کہ

دیہاجو کی بیوی، سوداگر کا گھوڑا
جتنا کودے اتنا ہی تھوڑا

چنانچہ جب شیخ جی اور ان کا لڑکا انور اپنے سالے اکرم کے ساتھ اپنے اپنے کاموں پر چلے جاتے تو اس کی دیورانیوں اور جیٹھانیوں کے نوجوان لڑکے جو ان کے قرب و جوار ہی میں رہتے تھے۔ اس کے گھر پہنچ جاتے۔ بس! پھر خوب ہنسی مذاق ہاہا! ہی ہی! ہوتا۔ غرضیکہ وہ دھکم پیل ہوتی اور ایسی دھماچوکڑی مچتی کہ توبہ ہی بھلی۔ یہ دیکھ کر زرینہ کا دل بھی چاہتا کہ وہ بھی زور زور ہنسے اور خوب اچھلے کودے۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی۔ وہ ان لوگوں کے سامنے ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ ناچار ایک کونے میں بیٹھ کر اپنی خواہش کو کسی کتاب کے مطالعہ میں گم کر دیتی اور ساتھ ہی ساتھ کنکھیوں سے دیکھتی بھی رہتی۔

شیخ جی جس چیز کو ناجائز سمجھتے اس کو ان کی بیوی جائز سمجھتی تھی۔ اور جو ان کے لئے "حرام تھا" وہ اس کے لئے "حلال تھا"۔ چنانچہ اس کا پیر جھنڈے شاہ کے ہاں بھی آنا جانا تھا جو کہ ایک عربی معلم یوسف بن احمد کے ایجنٹ ہونے کی وجہ سے کئی حج کر چکے تھے۔ جو حج کے لئے اپنے مریدوں سے چندہ بھی حاصل کر لیتے تھے۔ جن کے ڈیرے پر ہر مہینے شام کے وقت گیارہویں شریف کے ختم پر پلاؤ اور زردے کی بڑی بڑی دیگیں دم ہوتی تھیں۔ اور قوالی تو ایسی زوردار ہوتی تھی۔ کہ دور دور سے لوگ سننے کیلئے آتے تھے۔ شیخ جی کی بیوی گھر پہنچ کر ایک ہاتھ کان پر رکھ کر

اور دوسرا ہاتھ ذرا سر سے اونچا کر کے قوالوں کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے ذرا بلند آواز سے "خواجہ نہ دیگا تو اور کون دیگا" یا "آ تجھ بن بھی ہم جاہم" الاپنا شروع کر دیتی جسے سن کر شیخ جی بھی مسکرانا شروع کر دیتے یہی نہیں بلکہ ان کی بیوی زرینہ کو ساتھ لیکر کبھی کبھی سینما بھی دیکھنے چلی جاتی تھی۔ اور اکثر اپنی پسند کا فلمی گیت..... "کاہے جادو کیا مجھکو اتنا بتا جادوگر بالما۔" گاکر شیخ جی کو چھیڑا کرتی تھی اور شیخ جی مارے ہنسی کے دوہرے ہوجاتے تھے۔ دراصل شیخ جی کے خیالات پر، ذہن پر غرضیکہ ان کی پوری زندگی پر انکی بیوی چھائی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دوسرے معاملات میں بہت کم توجہ دیتے تھے۔ اب زندگی کے اس پہلو کا باہر والوں کو کیا علم؟ ایسے میں اگر ان کے گھر میں کوئی بات ہوجائے تو وہ کیسے یقین کرتے؟ کیونکہ وہ تو شیخ جی کو شیخ جی ہی سمجھتے تھے۔ اور ہر بات پرکھنے کے لئے انھیں کو کسوٹی سمجھ رکھا تھا۔ آخر وہ بات بھی کیا تھی؟ معمولی سی بات تھی اور وہ بھی یوں ہی سی........ بہار کی ایک رات کا ذکر ہے۔ شیخ جی کو دکان سے آئے ہوئے کافی دیر گزر چکی تھی۔ سب کے سب کھانے وغیرہ سے فارغ ہوکر سو چکے تھے۔ مگر ان کی بیٹی زرینہ کو کمرے میں گھٹن اور کچھ تلخی سی محسوس ہونے لگی۔ اس لئے وہ اپنی امی جان کی مدد سے چارپائی صحن میں نکلوا کر لیٹ گئی، اسے وہاں بھی نیند نہ آئی یا یہ کہ وہ خود ہی بیدار رہنا چاہتی تھی۔ آخر اس نے آسمان کی طرف دیکھکر دل ہی دل میں باتیں کرنا شروع کیں۔ مگر اسی اثنا میں ایک سایہ آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا اسکے سرہانے آکر رک گیا۔

"آگئے تم......" زرینہ نے پوچھا۔

"ہاں" آنیوالے نے اس کے سرہانے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے آج بہت دیر کردی؟"

"کیا کروں؟ کمبخت موقع ہی نہیں ملتا۔"

"ہاں! ادھر تم موقع کی تلاش میں رہا کرو، اور ادھر میں —"

ابھی وہ جملہ مکمل بھی نہیں کرنے پائی تھی۔ کہ اندر سے بڑے زور سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ جسے سن کر دونوں ایک دم خاموش ہو گئے۔ اور خوفزدہ ہوکر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ چند لمحے اطمینان کرنے کے بعد پھر باتیں کرنے لگے۔

"ہائے اللہ! میرا تو کلیجہ دھک سے ہوگیا تھا۔ کسی دن ہماری ان ملاقاتوں کا اگر کسی کو پتہ چل گیا تو ہماری دونوں کی خیر نہیں۔"

"تم تو یونہی اتنا گھبراتی ہو، بے فکر رہو کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔"

"بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟ بہتر یہی ہے کہ شادی کرلیں کیا خیال ہے تمھارا؟"

"شادی.....؟ میری رائے تو یہ ہے کہ جب ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے آزادانہ طور پر مل لیتے ہیں تو شادی کے جھیلے میں پڑنے کی بیوقوفی کیوں کریں؟"

"مگر شادی سے رشتہ مضبوط ہوجاتا ہے۔"

"خاک مضبوط ہوجاتا ہے، اس میں تو بس یہی رہتا ہے۔ کل گھر میں اس چیز کی ضرورت تھی آج فلاں چیز درکار ہے کل فلاں بچہ کو نزلہ تھا اور آج فلاں کو بخار ہے۔ آج یہ نہیں آج وہ نہیں، سوائے ان باتوں کے ہوتا کیا ہے؟ اچھی خاصی آزادانہ زندگی کو مجبور اور پابند بنا دینا کہاں کی عقلمندی ہے اور پھر میری سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آتی، کہ تمھاری جیسی آزاد خیال لڑکی جو ترقی نسواں پارٹی کی ممبر ہو، جو عورتوں کے حقوق و آزادی کی حامی ہو۔ جس کا مطالبہ یہ ہو کہ مردوں کو ایک سے زائد شادیوں کی اجازت نہیں ہونا چاہئے۔ اور اسی مقصد کے لئے کئے جانے والے ڈراموں میں حصہ لیتی ہو آخر وہ شادی کے لئے اس قدر بضد کیوں ہے؟ میری بات مانو تو فی الحال اس خیال کو ترک ہی کردو۔ کسی مناسب وقت پر یہ بات خود بخود ہوجائے گی۔ مگر اب ٹھیک نہیں، کیوں خواہ مخواہ اپنی پھول سی زندگی کو کانٹوں میں پھنسانا چاہتی ہو؟" —— اس دفعہ اس کی باتوں نے زرینہ کو لاجواب کر دیا۔ وہ خاموش ہوکر سامنے درخت کے پیچھے سے نکلتے ہوئے چاند کو دیکھنے لگی۔

"ناراض ہوگئیں؟"

"نہیں!"

"کیا میری کوئی بات کڑوی لگی؟"

"ہاں"

"ذرا ٹھیک دو۔"

یہ سن کر وہ ہنس پڑی اسے دیکھ کر وہ بھی ہنسنے لگا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد زرینہ بولی۔

"ہم نے اتنا وقت یونہی ضائع کر دیا۔ آؤ کوئی اور بات کریں۔"

"وہ جو تمہارے سکول میں "ایک سے چار" نامی ڈرامہ ہونے والا تھا اس کا کیا ہوا؟"

"وہ عنقریب ہی کھیلا جا رہا ہے اس میں مجھے ہیروئین کی سہیلی کا پارٹ دیا گیا ہے، ویسے تو سب تیاری ہو چکی ہے مگر ابھی تک ہیرو کا انتخاب نہیں ہوا۔ ہماری ہیڈ مسٹریس صاحبہ چاہتی تھیں کہ ان کا بھائی ہیرو بنے، مگر ہم سب نے مل کر اس کالے بینگے جیسے کو ناپسند کر دیا لہٰذا اب انھوں نے ہیرو کا انتخاب ہمارے اوپر چھوڑ دیا ہے میرے خیال میں ہیرو کے رول کے لئے تم سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔" زرینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور ہیروئین کے لئے تم سے زیادہ موزوں کوئی دوسری لڑکی نہیں ہو سکتی۔" اس نے جواب دیا۔

آخر کچھ دیر یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ کہنے لگا۔

"اچھا اب مجھے چلنا چاہیئے کیونکہ رات کافی گزر چکی ہے۔"

"اچھا، خدا حافظ۔" زرینہ نے کہا۔

"خدا حافظ۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ اٹھ کر اس کے سرہانے کھڑا آخری سلام کر کے جا ہی رہا تھا کہ زرینہ کی امی کسی کام کی غرض سے کمرے سے باہر جو نکلیں۔ تو زرینہ کے سرہانے کسی آدمی کو کھڑے ہوئے دیکھ کر چیخ ماری۔ اور "چور چور" کہتی ہوئی اندر کی طرف شیخ جی کو جگانے کے لئے دوڑی۔ شیخ جی نے جب باہر آ کر دیکھا۔ تو انھیں کوئی شخص بھی دکھائی نہ دیا۔ تو بیوی سے کہنے لگے۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے، یہاں تو کوئی بھی نہیں۔"

"ذرا غور سے دیکھو ابھی تو یہیں کھڑا ہوا تھا۔"

شیخ جی نے یونہی ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ تو اچانک انہیں زرینہ کی چارپائی کے نیچے ایک پاؤں ہلتا ہوا نظر آیا۔ بس پھر کیا تھا انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ پاؤں پکڑ کر جو اپنی طرف گھسیٹا تو ان کے سامنے سر جھکائے ہوئے اکرم کھڑا تھا۔ یہ دیکھ کر ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ دانت پیستے ہوئے بولے۔

"ذلیل! کمینے!! تیری یہ جرأت!!!"

"جی...... میں...... مجھے...... تو......"

"میں میں کے بچے میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ بدمعاش!! میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جا...... اسی وقت یہاں سے نکل جا ورنہ سر توڑ دوں گا۔"

شور سن کر انور اور اس کی بیوی بھی باہر نکل آئے۔ شیخ جی کی بیوی دلہن سے کہنے لگی۔

"دیکھ لیا، اپنے بھائی کے کرتوت؟"

دلہن بیچاری شرمندہ ہو کر رہ گئی اور کوئی جواب نہ دے سکی۔

ادھر زرینہ کا یہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ وہ پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر وہ برف کی سِل کی طرح سے کوئی بھی حرکت نہ کر سکی۔ اس نے بولنا چاہا مگر اس کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ وہ حرکت کرتی بھی کیسے جبکہ چور عین موقعہ پر چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا...... وہ بات کرنے کیلئے کونسا منہ لیکر آتی۔ آخر وہ دم سادھے لیٹی ہوئی ایسے دکھائی دے رہی تھی جیسے کسی نے اسے کلورو فارم سنگھا دیا ہو۔

شیخ جی غصہ میں بھرے ہوئے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے کہ کیا کریں آخر وہیں کھڑے کھڑے اپنے بیٹے انور اور اس کی بیوی پر برس پڑے۔

"تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو، جاؤ اپنا کام کرو۔"

وہ بیچارے دونوں وہاں سے چپکے سے کھسک گئے۔ اسی اثنا میں باہر کھڑے ہوئے رشتہ داروں اور ہمسایوں کی آوازیں آئیں۔

"کیوں شیخ جی! چور کہاں ہے؟ کچھ پتہ چلا؟"

"ہاں کمبخت ہاتھ چھڑا کر بھاگ گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کوئی نقصان نہیں ہوا۔"

"چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔"

"ہاں بھئی!" شیخ جی نے "ہاں" کو ذرا لمبا کرتے ہوئے کہا۔

بس اتنی سی بات تھی۔ جو شیخ جی کے گھر میں ہوئی۔ اور جسکا لوگ یقین نہیں کر رہے تھے۔ آخر یقین کرنے کی بات بھی کونسی تھی؟ معمولی سی بات تھی۔ وہ بھی یونہی سی۔ ان کے گھر میں ایک چور ہی تو آیا تھا۔ یہ بھی کوئی انوکھی بات نہیں تھی بہت سے لوگوں کے گھروں میں چور آجاتے ہیں۔

جب سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ تو شیخ جی کی بیوی نے اپنی لاڈلی بیٹی زرینہ پر جو کہ اس کی طرف پیٹھ کئے ہوئے لیٹی تھی نگاہ ڈال کر شیخ جی سے کہنے لگی۔

"بھلا بتلائیے تو، اگر کوئی لچا، لفنگا چوری چھپے یونہی آگھسے تو اس میں اس بچاری کا کیا قصور؟ میں تو اس میں اپنی بیٹی کو تو بالکل معصوم سمجھتی ہوں کیوں ٹھیک ہے نا؟"

شیخ جی نے اپنی بیٹی پر نفرت آمیز نگاہیں ڈالکر اور زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"معصوم؟ ...... ہنھ...."

"خیر جو کچھ ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب اس بات کو ختم ہی کردو، ورنہ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے اور پھر اس کے سرہانے شور مچانے سے کیا فائدہ؟ ..... بے چاری بے آرام ہوگی۔"

یہ سنکر شیخ جی کے جی میں آیا۔ کہ اس عورت کا گلا دبوچ لیں۔ مگر وہ اپنے غصہ پر قابو پاکر اسکی طرف شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جھکتے ہوئے سر کیساتھ کمرے کی طرف چلدیئے، انکی بیوی شیخ جی کو زندگی میں پہلی بار غصہ میں دیکھکر سہم گئی۔

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری جولائی و اگست ۵۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ برائے مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں۔ یا پھر خط کے ذریعے اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی۔ پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ منتظر کرم: منیجر "مشیر" کراچی

جولائی ۵۶ء کے خریداروں کے نام:-

۲۰۰۰ مستری محمد عثمان صاحب، کراچی
۲۰۰۴ عبدالغفور صاحب بھٹی۔ گوجرانوالہ
۲۰۱۰ سیٹھ بشیر احمد صاحب ڈار، گوجرانوالہ
۲۰۲۹ ڈاکٹر عبدالمجید صاحب صدیقی۔ کراچی
۲۱۵۹ محمد رفیق صاحب قریشی۔ لاہور
۲۱۷۶ احمد خان صاحب عباسی، بہاولپور
۲۱۹۴ محمد حنیف صاحب، لاہور
۲۳۶۰ میسرز فوکل الکٹرک ورکس، لائلپور
۲۳۶۶ اللہ دتہ صاحب پہلوان گجرات
۲۵۰۸ محمد سہراب خاں صاحب، میمن سنگھ
۲۰۴۲ عارف سہارنی صاحب، گوجرانوالہ
۲۱۳۴ اسماعیل نواب صاحب
۲۳۷۰ عبدالقیوم صاحب۔ چرکنڈہ
۲۳۷۱ نذیر احمد صاحب، ملتان
۲۳۷۳ محمد اسلم صاحب بہاولپور
۲۳۷۴ بشیر احمد صاحب
۲۳۷۷ ایس۔ ایم۔ اقبال صاحب۔ میمن سنگھ
۲۵۰۹ کے۔ اے۔ قریشی صاحب، کراچی
۲۵۱۱ محمد شمیم انصاری صاحب، دہران
۲۵۱۲ عبدالمجید صاحب حسینی، عمرکوٹ
۲۵۱۳ ناظم دارالمطالعہ جماعت اسلامی، لاہور کینٹ
۲۵۱۴ حافظ محمد ابراہیم صاحب، ہرٹاب گڈھ
۲۵۳۷ شیخ محمد قدیر صاحب۔ پاک پٹن

اگست ۵۶ء کے خریداروں کے نام:-

۲۰۰۵ فرخندہ صاحبہ، کراچی

زکی نزاکانی

○

رشکِ خوں کی ہوئی چشم آرزو سے نمود
جگر کو چیر گیا جیسے نغمہ داؤد

ابھی حیات ہے رقصندہ قاب فطرت میں
یہ انقلاب دمادم اک اضطراب نمود

مئے طلب نے دیا تیرہ مستیوں کو فروغ
اگرچہ آتشِ ہستی تھی آتش بے دود

ہوں مطمئن نہ ابھی دورِ حاضرہ کے خلیل
بہار شعلہ بداماں ہے غیرتِ نمرود

تلاش چھوڑ نہ اے دوست حسنِ معنی کی
اگر نظر سے ہے غائب کہیں تو ہے موجود

حیرت شملوی

○

مے ہی جب تلخ ہے پیمانے کی
مدح کیا کیجئے مے خانے کی

کیسے ممکن ہے کہ رندانِ ازل
نہ کریں بات بھی پیمانے کی

یاس و حرماں کو بیمار ہے ہوتے
کیا ضرورت ہے کہیں جانے کی

بات میں بات نکل آتی ہے
حد نہیں شوق کے افسانے کی

حوصلہ ہے تو کوئی وجہ نہیں
حال و ماحول سے گھبرانے کی

کوئی خوش فہم ہی یکھت ہوگا
ان سے امید صلہ پانے کی

شمع ہے بزم میں جب تک روشن
جان خطرے میں ہے پروانے کی

اللہ اللہ یہ پیچیدہ گیسو
اور کوشش نہیں سلجھانے کی

انکے دل سے کوئی پوچھے حیرت
تھی خوشی جن کو بہار آنے کی

(بشکریہ "فاران")

اقبال سیفی ●

شکایتِ غم لیل و نہار کیا کرتے
یہ راہ تیرے فقیر اختیار کیا کرتے
بتانِ شعبدہ گر تھے جہان کو محبوب
ترے جمال کے آئینہ دار کیا کرتے
نہ کوئی نغمہ نہ آنسو، نہ کوئی قطرۂ خوں
ہم اہتمامِ شگفتِ بہار کیا کرتے
جہاں نے چھین لئے ولولے جوانی کے
بلاکشانِ غمِ روزگار کیا کرتے
مذاقِ چارہ گری شیوۂ جمال نہ تھا
حکایتِ غمِ دل آشکار کیا کرتے
کوئی بھی قدر شناسِ وفا نہ تھا سیفی
کسی سے عہدِ وفا استوار کیا کرتے

قمر جمیل ●

ہمصفیروں نے کھنکتے ہوئے سکوں کے لئے
اپنے دل بیچ دیئے اپنے قلم بیچ دیئے
مجھے کیوں گھور رہے ہیں گل و لالہ کے ہجوم
میں نے کیا غنچۂ نورستہ کے لب چوم لئے
کتنے مہ پاروں کو نظروں سے گرایا میں نے
کتنے مہتاب تیری یاد پہ قربان کئے
کب تک آخر تیری یادوں کے سہارے اے دوست
دل میں ناسور چھپائے ہوئے اک شخص جئے

سید نظر زیدی ●

"فردوس"

مکتبہ "چراغِ راہ" کراچی نے ماہر القادری صاحب کی نظموں کا مجموعہ "فردوس" کے نام سے شائع کیا ہے۔ خود شاعر کے لفظوں میں یہ ان کا سنہ ۴۵ء سے سنہ ۶۵ء تک کا کلام ہے۔ اس لحاظ سے اسے ان کے آج کے ذہنی خد وخال کا عکس سمجھنا چاہیئے۔

ماہر صاحب اردو زبان کے ان شاعروں میں ہیں جنھیں متعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ ادب کے تمام ہی حلقوں میں جانے پہچانے ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ جو لوگ شعر سے معمولی لگاؤ بھی رکھتے ہیں، ان کے شاعرانہ کمالات کے معترف ہوں گے۔ "فردوس" سے پہلے ان کے چار مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں اور تقریباً اٹھارہ کتابیں نثر کی شائع ہو چکی ہیں لیکن اس جان پہچان کے باوجود اپنے نئے ذہنی انقلاب کے باعث کل کے ماہر سے آج کے ماہر کی شخصیت بڑی حد تک الگ محسوس ہوتی ہے، اور ان کا یہی نیا پن ان سطور کی تقریب قرار پا سکتا ہے۔

ہماری شاعری کے موضوعات میں ابتدا ہی سے مذہب بھی ایک جاندار موضوع رہا ہے۔ حسن وعشق کی پربہار وادیوں میں دور تک جادہ پیمائی کرنے والے شاعروں میں سے بھی شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے اس موضوع پر خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ یہ ہمارے ٹھیٹھ ایشیائی مزاج کا تقاضا ہے لیکن مذہب سے اس گہرے تعلق کے باوجود اب سے کچھ عرصہ پہلے تک اس موضوع کا پھیلاؤ صرف چند چیزوں تک تھا... تصوّف کے سلسلے میں بعض تلمیحات و محاکات کے علاوہ حمد، نعت منقبت اور سلام و مرثیہ اس کی کل کائنات تھی۔ اور ہمارے شعراء اسی دائرے میں اپنے جوہر دکھاتے تھے۔ اور اس درجہ محدود ہونے کے باعث کوئی بھی اسے ایک مستقل اور اہم موضوع تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا۔ عالمِ اسلامی اور خصوصاً ارضِ ہند و پاک میں

گذشتہ پچاس برس کے اندر جو نئے اسلامی رجحانات انقلابی جذبے کے ساتھ ابھرے ہیں ان کے زیر اثر ماضی قریب میں حلقۂ ادبِ اسلامی کی داغ بیل پڑ چکی ہے۔ اور اب اس موضوع کو بھی شاعری کے دیگر موضوعات کے برابر پھیلاؤ حاصل ہو رہا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ پرانا نظریہ ٹوٹ رہا ہے کہ اسلامی ادب کا مطلب چند گنے چنے مذہبی جذبات کا اظہار ہے اور اسے زندگی کی عام گہما گہمی سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔

غور کیا جائے تو ہمارے ادب میں یہ ایک بہت بڑی بات ہوئی ہے۔ ایک جاندار موضوع نکھرا ہے، ایک وسیع میدان سامنے آیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حلقۂ ادب اسلامی کے دوستوں پر یہ بہت بڑی ذمہ داری بھی آپڑی ہے۔ کہ وہ جو دعوے لے کر سامنے آئے ہیں، اسے سچ ثابت کر دکھائیں۔ ان کا یہ دعویٰ تسلیم کرنے کے بعد کہ اسلامی ادب کا مفہوم صرف فقہ و حدیث اور روزے نماز کے مسائل نہیں بلکہ نسبتاً صحت مند نقطۂ نظر سے انسانی زندگی کی الجھنوں کا حل سوچنا اور انسان کے اطمینان، اور خوشی میں اضافہ کرنا ہے، دنیا ان سے اس دعوے کا ثبوت چاہے گی، اور ظاہر ہے کہ وہ ان کے پیدا کئے ہوئے ادب کی ہی صورت میں ہو سکتا ہے۔

"فردوس" کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے اور یہ محسوس کر کے حد درجہ خوشی ہوتی ہے کہ ماہر صاحب اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ ایک عام رومانی، انقلابی یا قومی شاعر کے مقابلے میں ان کے قلم کے لئے گوناگوں دشواریاں تھیں۔ وہاں لذتیت کا سہارا بھی ہوتا ہے اور انسان کے ہر قسم کے جذبات کو چھیڑ کر داد حاصل کرنے کی آزادی بھی، لیکن ان کے سامنے اخلاق کا ایک خاص

معیار ہے اور اس معیار کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے قارئین کو متاثر کرنا اور اپنی محنت کی داد لینی ہے۔

غالباً نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر اسلامی ادب کی نئی تعریف کے سلسلے میں چند لفظ لکھ دیئے جائیں۔ ابھی کچھ دن پہلے نعیم صدیقی صاحب نے انجمن آزاد خیال مصنفین لاہور کے اجلاس میں اسلامی ادب کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا اور بحث کے دوران میں یہ بات سامنے آگئی تھی کہ صحت مند قسم کا ادب ہی دراصل اسلامی ادب ہے، کیونکہ اسلام چند گنے چنے اور گھٹے گھٹے نظریات کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ پوری انسانیت کے مسائل حل کرنے کے لئے سب سے بہتر دستور ہے۔ اس تعریف کے مطابق غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں میں بھی ایسے اجزا پائے جا سکتے ہیں جن کو اسلامی ادب کے دائرہ تعریف میں جگہ دی جا سکے۔ اسلام دین فطرت اور نظام انسانیت ہے۔ اس وجہ سے جس طرح اس کے بہت سارے اجزا، دنیا کی ہر قوم اور ہر فرد کی عملی زندگی میں متفرق ملتے ہیں۔ اسی طرح ساری انسانیت کے عالم افکار میں بھی اسکے موتی بکھرے ہوئے پائے جا سکتے ہیں۔

اس وضاحت کی ضرورت یوں پیش آئی۔ کہ ماہر صاحب پہ بعض حضرات یہ اعتراض نہ فرما دیں' صاحب! اس مجموعے کے ایک ایک شعر میں لفظ "اسلام" تو نظر آتا ہی نہیں، پھر آپ اسے... اسلامی ادب کیوں قرار دے رہے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ فردوس کی نظمیں اور غزلیں، رباعیات اور متفرق اشعار بادی النظر میں عام غزلوں اور نظموں کی طرح معلوم ہونے کے باوجود پوری تعریف کیساتھ اسلامی ہیں کیونکہ ان کا ایک خاص اخلاقی ماحول ہے، اور یہ انھیں عام شاعری سے اسی قدر الگ کر دیتا ہے جس قدر ماہر صاحب کا ذہن مختلف ہے۔

اس موقع پر ایک اور شبہ کا ازالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کہیں دوسرے نعرہ بازوں کی طرح ادب میں اسلام پسندی کا دعویٰ بھی ایک نئے نعرے کی حیثیت تو نہیں رکھتا! عین ممکن ہے کہ آگے چلکر یہ صورت بھی پیدا ہو جائے کہ کچھ لوگ ادب کے دوسرے گوشوں میں اپنے لئے جگہ نہ پا کر اسلام پسندی کی پناہ لیں۔ لیکن جہاں تک موجودہ حلقہ ادب اسلامی کا تعلق ہے ایسا سوچنا درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ اب تو اپنے آپ کو اس حلقہ سے وابستہ کرنا اور وابستہ رکھنا خاصا دشوار کام ہے لوگوں نے اس موضوع پر لکھنے والوں کے وجود کا اعتراف تو ضرور کیا ہے لیکن ان کی پذیرائی کسی حلقہ میں بھی نہیں ہوئی۔ ابھی یہاں ایک طرح کے خندۂ استہزاء کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ خاص طور سے ماہر القادری صاحب کے بارے میں تو... وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے مزاج کا یہ تپک کسی فائدے، بہکانے، سکھانے یا وقتی جوش کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ ان کی فطرت کا... حقیقی رنگ ہے۔ "ذکر جمیل" (نعتوں کا مجموعہ) انھوں نے عمر کے اس حصے میں تصنیف کیا جب کہ عقل پر جذبات کا نمایاں غلبہ ہوتا ہے۔ اسی دور میں جذبات ماہر، نغمات ماہر، اور محسوسات ماہر مرتب ہوئیں اور ان تینوں کتابوں میں بھی ان کے ذہن کا یہ رنگ صاف جھلکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جذبات کسی قدر گہرے ہیں، کچھ عرصہ ادھر ادھر نگراں رہنے کے بعد وہ پھر اپنے اصل مقام کی طرف لوٹ آتے ہیں اور اب ان کا لہجہ زیادہ صاف اور پرجوش ہے۔

جذبات ماہر کی نظم "پہلی ملاقات" اور "حسین دوشیزہ" میں انھوں نے یہ شعر لکھے تھے۔ ؎

لبوں پر تبسم کے انوار رقصاں
جبین محبت کی شمعیں فروزاں
وہ ماتھے کی افشاں ستاروں کی دنیا
وہ ہونٹوں کی لالی کہ مہر درخشاں
وہ آنکھوں کے ڈورے گلابی گلابی
وہ زلف معنبر پریشاں پریشاں
وہ گردن کہ سچ مچ بلوری صراحی
وہ شفاف سینہ، وہ سیب زنخداں
وہ چاندی کی ترشی ہوئی صاف بانہیں
وہ دست حنائی، محبت کا عنواں

شانے پہ دوپٹے کا یہ اڑتا ہوا آنچل
بادل ہے سبک چین ہواؤں میں ہے ہلچل

زلفوں کی گھنی چھاؤں میں یہ تابش مکھڑا
آتش کدۂ حسن پہ چھائے ہوئے بادل

اپنی دوسری نظموں :-

عید کے دن کسی کی یاد، (۲) ایک شب حاصل زندگانی،
(۳) ریل کا سفر (۴) پھول والی اور جنبش مینا وغیرہ میں وہ ایک مستقل رومانی شاعر نظر آتے ہیں لیکن فردوس میں جذبات کے یہ سارے انگارے سرد ہو چکے ہیں معقولیت اور اعتدال کی شفاف چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ محبت کے جذبات سے ان کا سینہ اب بھی خالی نہیں، لیکن اب یہ محبت، ایک رند خراباتی کی محبت نہیں، بلکہ ذی شعور انسان کی محبت ہے ـــــ ایک سچے مسلمان کی محبت ہے!
اب ان کی نظروں کے سامنے یہ بے حجابانہ جلوے آتے ہیں تو ان کے جذبات برانگیختہ نہیں ہوتے بلکہ احساس ندامت اور حمیت انسانی سے نظریں جھک جاتی ہیں ؎

یہ تاک جھانک یہ آرائش لب و رخسار
یہ جمپروں کی نمائش، یہ ساریوں کی بہار

یہ قہقہوں کے ترانے یہ چھیڑ چھاڑ کا رنگ
یہ شوخیوں کی ہر اک موڑ پر تیا ہے جنگ

ہوا کی موج سے زلفوں کے پیچ ہیں رقصاں
یہ شوخ و شنگ نگاہوں میں تجربے غلطاں

یہ ڈالیوں کی لچک سی گداز باہوں میں
کہ جیسے رقص ہو پیرتما کی جلوہ گاہوں میں

جبین و عارض کا کل تمام زیبائی
ز فرق تا بہ قدم عالم خود آرائی

خدا بچائے یہ کالج کی تربیت کا اثر
نگاہیں ڈالی جاتی ہیں راہگیروں پر

گلی کے موڑ پہ کاغذ گرے نشانی کے
عجیب مکر ہیں مغرب زدہ جوانی کے

مبنی خوشی کی یہ باتیں ہیں دل لگی کے لئے
کہ خود کشی کے ارادے ہیں زندگی کے لئے

یہ دوڑتی ہوئی لاری نظر جو آتی ہے
وطن کی عزت و غیرت کی لاش جاتی ہے

("گرلز کالج کی لاری دیکھ کر")

نظارۂ رخ زیبا کی طرح ان کی محبت کا تصور بھی بدلا ہے، اپنی محبوبہ کو مخاطب کرکے کہتے ہیں :- ؎

اگلی باتوں کو بھول جا اے دوست
تھا وہ خواب گریزپا اے دوست

وہ ہوسناکیاں خدا کی پناہ!
جیسے طوفاں گزر گیا اے دوست

نرم لہجہ دبی دبی آواز
وہ تبسم رکا رکا اے دوست

منزل ضبط و شوق سے آگے
میں بھی کوسوں نکل گیا اے دوست

حسن اور منتیں محبت کی!
ہائے تو نے یہ کیا کیا اے دوست

اب نہ زلفوں کو دے ہوا اے دوست
بہت کچھ میں بدل گیا اے دوست

اب نہ انگڑائیوں کی زحمت کر
وہ تصور نہیں رہا اے دوست

میری خاطر بوقت خواب نہ رکھ
اپنے چہرے کو ادھ کھلا اے دوست

مری دلچسپی و خوشی کے لئے
بھول کر بھی نہ مسکرا اے دوست

اپنی پرچھائیں سے بھی بچ کر چل
ہے زمانہ بہت برا اے دوست

رکھو نہ شعر و سخن سے دلچسپی
شاعری خود ہے اک بلائے دوست
آدمی کے لئے ضروری ہے
عفت و عصمت و حیائے دوست

جو محبت تھی دو دلوں کی امید
اس محبت کا واسطائے دوست
دیکھتے ہی نظر جھکا لینا
ہو جو میرا بھی سامنائے دوست
(گزارش)

ہوس کا نام محبت رکھا ہے دنیا نے
ہوئی ہے مسخ یہاں تک تو فطرتِ آدم
حیا ہے آنکھ میں باقی نہ دل میں خوفِ خدا
بہت دنوں سے نظامِ حیات ہے برہم

یہ نیم باز سے برقعے یہ دیدہ زیب نقاب
جھلک رہا ہے جھلاجھل قمیص کا ریشم

اسی نظم میں آگے چلکر : ؎

تری حیات ہے کردار رابعہؒ بصری
ترے فسانے کا موضوع عصمتِ مریمؑ
نہ دیکھ رشک سے تہذیب کی نمائش کو
کہ سارے پھول یہ کاغذ کے ہیں خدا کی قسم

وہی ہے راہ ترے عزم و شوق کی منزل
جہاں ہیں عائشہؓ و فاطمہؓ کے نقشِ قدم
(مسلمان عورت سے)

فردوس، چار ابواب — (۱) فردوس (۲) برق پارے (۳) انجمن، (غزلیات) اور خوشہ پرویں — پر مشتمل ہے۔ یہ تخصیص موضوعات اور اصنافِ سخن کی بنا پر کی گئی ہے۔ ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے ماہر صاحب نے زندگی کے تمام پہلوؤں پر نگاہ ڈالی ہے۔ وہ محبِ وطن بھی نظر آتے ہیں، پرجوش قوم پرست بھی ہیں مصوّرِ فطرت بھی ہیں۔ انسانیت کا درد رکھنے والے مصلح بھی اور... جذبات کے تند و تیز دھارے کے ساتھ بہنے والے سادہ سے شاعر بھی اور اس طرح تین پونے تین سو صفحات کی اس کتاب میں ہر ذہن کی تسکین کا سامان فراہم ہوگیا ہے لیکن اس تنوع کے باوجود درست بات یہی ہے کہ یہ ایک پکے سچے مسلمان شاعر کا کلام ہے۔ اگر اس آئینے میں آفاقیت کی جھلکیاں اور ایک ہمہ گیر احساس کی روشنی نظر آتی ہے تو اس کا باعث یہ نہیں کہ شاعر کا ذہن اسلام کی حدود پھلانگ گیا ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے اسلام کی درست تعریف کو اپنایا ہے۔ ثریٰ سے ثریا تک پھیلی ہوئی زندگی کی ان برکتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے جو اس مقدس مذہب نے انسان کے لئے فراہم کی اور جائز ٹھیرائی ہیں۔

درحقیقت آج کے اس عالم فاضل انسان کی یہ بہت بڑی بدنصیبی ہے، کہ اس نے مذہب کو ایک ایسی چیز فرض کر لیا ہے جو سوچ اور قوتِ عمل پر پہرے بٹھا کر اسے ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں بند کر دے۔ دیگر مذاہب کے سلسلے میں یہ نظریہ کسی حد تک درست بھی ہو عین ممکن ہے، لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے، اگر کوئی شخص منصفانہ نقطۂ نظر سے اس مذہب کا مطالعہ کرے، تو اسے تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ اس مذہب کے دامن میں تو اس کے اپنے تصورات سے بھی زیادہ کشادگی ہے، زیادہ نور ہے، زیادہ برکتیں ہیں۔ اسے ماننا پڑے گا کہ اس مذہب نے انسانی زندگی کے لئے جو ضابطہ مقرر کیا ہے اس پر عمل کرنے سے ہماری دنیا میں حقیقی امن انصاف اور مساوات کا ماحول قائم ہو سکتا ہے۔ اس کو اپنانے سے ہم بے یقینی اور بدامنی کی اس تاریکی سے نجات پا سکتے ہیں جس میں آج ہمارا دم گھٹا جا رہا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ مذہبِ اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کے پھیلنے میں غلط کار مذہبی اجارہ داروں کا بھی ہاتھ ہے۔ لیکن اس سے یہ بات تو درست ثابت نہیں ہوتی کہ اس صورتِ حالات کو گوارا کر لیا جائے، انسانیت کا بھلا چاہنے والے ہر انسان پر یہ

فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے
"ورفردوس" کو اس سلسلے کی ایک کوشش کہا جا سکتا ہے۔ اس
ضمن بات میں اتنی احتیاط اور برتی جا سکتی ہے۔ کہ ہم اسے شعر کی
دنیا میں ایک شاعر کی کوشش خیال کریں اور یہ بات مان لیں کہ ...
شاعری کے لوازمات کے طور پر کہیں کہیں جذبات کا رنگ گہرا ہو گیا ہے
مذہبی نقطۂ نظر سے تو اسے شاید بے اعتدالی یا ایک طرح کی خامی سمجھا جائے
لیکن سچ یہ ہے کہ شاعر کو یہ رعایت ملنی ہی چاہیئے، ورنہ اس کا کلام
پڑھنے کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت پیش آئے۔

اس تمہید کے بعد آئیے فردوس پر ایک سرسری نظر ڈالیں اور
دیکھیں، ماہر صاحب اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں۔
ان کے اور ایک عام شاعر کے پیغام میں کیا فرق ہے اور ذہنی فضا یا
موضوع سخن کی اس تبدیلی سے ان کی شاعرانہ حیثیت پر تو کوئی اثر
نہیں پڑا؟

(۱) جیسا کہ گذشتہ سطور میں لکھا گیا ماہر صاحب کے لئے یہ
ایک خاصا دشوار کام تھا۔ کہ کوری جذباتیت اور لذت پرستی سے دامن
بچاتے ہوئے اپنے قارئین کے ذہنوں کو متاثر کریں۔ اور حقیقت یہ ہے
کہ وہ اس مرحلے سے نہایت کامیابی کے ساتھ گزرے ہیں۔ ان کے
لہجہ میں کسی جگہ تذبذب اور دوغلاپن نہیں، انھوں نے وسیع ...
نقطۂ نظر رکھنے والے ایک مسلمان کی حیثیت سے زندگی کے تقریباً
تمام ہی مسائل پر نگاہ ڈالی ہے اور نہایت واشگاف الفاظ میں
اپنی اسی حیثیت کا اعلان کیا ہے، ؎

اسلام کی الفت دل میں ہے ایماں کی حلاوت رکھتا ہوں
بوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ چاروں سے محبت رکھتا ہوں
ایمان چھپا لینا میرا مسلک ہی نہیں مذہب ہی نہیں
چلتی ہوئی تلواروں میں بھی سچ کہنے کی عادت رکھتا ہوں

حمد و نعت اور سلام و منقبت کے علاوہ اس مختصر سے مجموعے میں
ان خاص موضوعات پر بھی کافی کچھ لکھا گیا ہے جنھیں بعض حضرات
بزعم خود خاص اپنی ترقی اور ذہنی جلا کی علامت سمجھتے ہیں۔ یہاں
ماہر صاحب کی کامیابی یہ ہے، کہ ان کا نقطۂ نظر اپنا رہا ہے۔

ہر شریف طبع اور حساس انسان انسانیت کے ایک بہتر مستقبل
کے خواب دیکھتا ہے۔ فردوس کی ایک نظم "صبح سعادت" میں ماہر
نے بھی یہ خواب دیکھا ہے لیکن بے مہار مادی ترقی اور غیر فطری یکسانیت
کی صورت میں نہیں بلکہ کامل ترین روحانی ترقی کی صورت میں، ؎

برباد کیا پامال کیا کمزور کو طاقت والوں نے
جب ظلم و ستم حد سے گزرے تشریف محمدؐ لے آئے
رحمت کی گھٹائیں لہرائیں، دنیا کی امیدیں بر آئیں
اکرام و عطا کی بارش کی، اخلاق کے موتی برسائے
مظلوموں کی فریاد رسی، مجبوروں کی غمخواری کی
زخموں پہ خنک مرہم رکھے، بے چین دلوں کے کام آئے
عورت کو حیا کی چادر دی، غیرت کا غازہ بھی بخشا
شیشوں میں نزاکت پیدا کی کردار کے جوہر چمکائے

ٹھیٹھ سرمایہ دارانہ نظام انسانیت کے لئے تباہی سے کم نہیں۔ اپنی
نظم "انقلاب زندہ باد" میں ماہر اس بدترین نظام کو ہمیشہ کے لئے
رخصت کرتے ہیں۔ ؎

اٹھ گئے راحت و سکوں کے حجاب
اب کہاں دورِ اطلس و کمخواب
قصر و ایواں کی ہل گئی بنیاد
زد میں طوفاں کی آ گئے ہیں حباب
کشتیٔ زر سفینۂ دولت
آ کے ساحل پہ ہو گئے غرقاب
دستِ مزدور میں ہے دامنِ شاہ
جیسے سچ مچ ہے گرم روزِ حساب
کس مپرسی کی کشمکش میں ہیں
صاحبِ امتیاز و اہلِ خطاب
آنے والا ہے دورِ جمہوریؔ[1]
اور شاہنشہی ہے پا بہ رکاب

—— امیر اور ان کے خوشامدی کے عنوان سے ایک
بھرپور چوٹ دیکھئے: ؎

[1] اسلامی جمہوریت

دوسروں کے منھ کی تعریفوں سے دل ہوتا ہے خوش
جب وہ خود ذات پر اپنی کسی کو اعتبار

ہے امیروں کے یہاں ان کے ندیموں کا یہ حال
جیسے سازندے طوائف کو دیا کرتے ہیں داد

اور یہ چند شعر دیکھئے :-

کتنے غریب گھر ہیں اُجالے سے دُور دُور
جتنی بھی روشنی ہے ستاروں سے چھین لوں

دہقاں کے کھیت فصل میں بھی ہیں خزاں نصیب
رعنائیاں تمام بہاروں سے چھین لوں

اتنی تو کم سے کم ہوں مری جرأتیں بلند
شاہوں کے تاج صرف اشاروں سے چھین لوں

سردی میں کتنے جسم ہیں بیگانۂ لباس
جتنی بھی چادریں ہیں مزاروں سے چھین لوں

یہ ایک زندہ و پائندہ حقیقت ہے، کہ نہ صرف برصغیر ہند و پاک میں بسنے والے بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی عزت اور خوشحالی کا انحصار پاکستان کی آزادی اور بقا سے وابستہ ہے لیکن ہماری بدنصیبی اور بعض "اونچے" لوگوں کی بے تدبیری سے یہ صورت پیدا ہوتی جارہی ہے کہ جو لوگ اپنے اس عزیز وطن سے محبت کا اظہار کرتے ہیں انھیں رجعت پسند کہکر چڑانے کی کوشش کی جاتی ہے ماہر صاحب اس عادت سے بالکل ہراساں نہیں۔ اس مجموعے کی کئی نظموں میں انھوں نے نہایت صاف ذہن کے ساتھ اپنے وطن سے محبت کا اظہار کیا ہے۔ اور اسکے شاندار مستقبل کی نوید دی ہے۔ "پاکستان کا مستقبل" کے زیرِ عنوان دو قطعے ملاحظہ فرمائیے :-

"پاکستان کا آئین"

زندہ ہوئیں اسلام کی پائندہ روایات
صد شکر پلٹ آئے ہیں گزرے ہوئے لمحات
قانون کی ہے روحِ محمدؐ کی غلامی
دستور کی بنیاد ہیں قرآن کی آیات

"پاکستانی فوج"

میدان کے غازی ہیں خدا ترس نمازی
ہاتھوں میں ہیں تیغیں تو لبوں پر ہے مناجات
عورت کے نگہبان تو بچوں کے محافظ
اور اس میں نہیں کافر و مسلم کی مراعات
بڑھتے نہیں اللہ کے قانون کی حد سے
گو جنگ میں کتنے ہی ہوں بدلے ہوئے حالات

"جھلکیاں" کے عنوان سے لکھتے ہیں :-

شکستہ دل سے جو آہ نکلی تو فرش کیا عرش کانپ اٹھے گا
درِ قفس وا نہ ہو سکے گا تو ایک دن ٹوٹ کر رہے گا
کسی کے روکے سے حق کا پیغام کب رُکا ہے جو اب رُکے گا
چراغِ ایماں تو آندھیوں میں جلا کیا ہے جلا کرے گا
وہ لاکھ بگڑیں، ہزار روٹھیں، غضب میں آئیں کہ تلملائیں
خدا کی اس پاک سرزمیں پر خدا کا قانون ہی چلے گا

نعتِ رسولؐ ماہر صاحب کا خاص موضوع رہا ہے اور یہ ایک ایسا نازک مقام ہے کہ بڑے بڑے باہوش بدعت اور گمراہی پھیلانے کا ارتکاب کر گزرے ہیں، لیکن فردوس کا شاعر اس مقام پر ع

با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار

کے مترادف اس درجہ محتاط ہے کہ نہ محبت و عقیدت میں کمی محسوس ہوتی ہے نہ جادہ شریعت سے قدم ہٹتے ہوئے ہیں۔

چند متفرق شعر دیکھئے :-

روضۂ سیّدِ ابرار تک آپہنچے ہیں
غم کے مارے ہوئے غمخوار تک آپہنچے ہیں
یا نبیؐ آپ کا دیں اور یہ بدعت کا شکار
امتی جدتِ افکار تک آپہنچے ہیں

کس بیم و رجا کے عالم میں طیبہ کی زیارت ہوتی ہے
اک سمت شریعت ہوتی ہے اک سمت محبت ہوتی ہے

اس دل پہ خدا کی رحمت ہو جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے
اک بار خطا ہو جاتی ہے سو بار ندامت ہوتی ہے
طلبہ کی ہوٹوں کے کانٹے پھولوں سے بھی نازک تر نکلے
تلووں کو بھی لذت ملتی ہے آسودہ طبیعت ہوتی ہے

محو ہے گوش کائنات، گونج رہی ہیں شش جہات
جیسے لب بلال رضؓ پر صبح کو نغمۂ اذاں

جیسے جنت کے دیچوں سے جھلکتی ہو بہار
پہلی منزل ہی کے انوار سحر کیا کہنا؟

---

(۳) فردوس میں جن موضوعات پر لکھا گیا ہے انھیں گنا جائے تو ماہر صاحب اور دوسرے شاعروں میں بظاہر کوئی فرق محسوس نہ ہوگا لیکن اس کے بعد وہ عام شاعروں سے اتنے ہی مختلف نظر آئیں گے جتنا زمین سے آسمان مختلف ہے۔ مسائل اور فکر کے میدان بیشک ایک ہیں لیکن نقطۂ نظر میں بہت بڑا فرق ہے، اور یہ فرق اشاروں کنایوں میں چھپا ہوا نہیں بلکہ نہایت واضح ہے۔ لکھتے ہیں: ؎

اہل دنیا زلف عنبر فام کی باتیں کریں
اور ہم اللہ کے پیغام کی باتیں کریں
وقت کے دھارے کو مڑنا ہے ہمارے ساتھ ساتھ
اس طرح سے گردش ایام کی باتیں کریں
دوستو! آؤ کہ اب کچھ کام کی باتیں کریں
چھوڑ کر ہر ذکر صرف اسلام کی باتیں کریں

اور ہر موضوع پر ان کا یہی نقطۂ نظر حاوی ہے، وہ مزدور اور سرمایہ دار کے مسائل کو بھی اسی ذہن سے سوچتے ہیں۔ انسان کی تہذیب و ترقی کے ضمن میں بھی ان کا نقطۂ نظر خالص اسلامی ہے، اور انسانی زندگی کی عام الجھنوں کے بارے میں بھی ان کا ذہن اسی محور کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو: ؎

ان کی باتوں میں نہ آنا کہ بنام تریاق
زہر کے جام مریضوں کو پلا دیتے ہیں
ان کی دنیا ہے فقط نفس کی خواہش کا ظہور
یہ تو انسان کو حیوان بنا دیتے ہیں
ڈال کر ذہن میں کچھ مبہم و دلچسپ شکوک
کفر و الحاد کے رستے پہ لگا دیتے ہیں
ان کی محفل میں نہ ایمان ملیگا نہ یقیں
ان چراغوں کو تو پہلے ہی بجھا دیتے ہیں
صرف روٹی کے مسائل کو نمایاں کرکے
چشم انساں سے حقیقت کو چھپا دیتے ہیں
ان کا وجدان ہے بیمار تو مدقوق ضمیر
خوب و ناخوب کی تمیز مٹا دیتے ہیں
قدر اخلاق بدلتے ہیں کبھی قدر جمال
زندگانی کو فقط کھیل بنا دیتے ہیں
یہی وہ لوگ ہیں جو صبح سویرے کیلئے
خون مزدور شرابوں میں ملا دیتے ہیں

(مزدور سے)

رقص کے جلسوں کے یہ امام	قوم کو دیں گے کیا پیغام
دل میں بت خانے پنہاں	لب پر ہے اسلام اسلام
روح کہاں بس ڈھانچے ہیں	تیغیں کیسی صرف نیام
بیوی، شوہر کے آگے	نامحرم سے گرم کلام
راج محل میں ناچ اور رنگ	پر جا کے گھر میں کہرام

جام و سبو اور قوم کا غم
پھول کی سیج اور فکر عوام

(ان کو پہچانیئے)

خامہ و قرطاس کی منزل سے اور آگے بڑھو
قصر و ایواں کی بلندی پر کمندیں ڈال دو
احمد حنبلؒ کی حق گوئی کی بن جاؤ مثال
کانپ کانپ اٹھے امیروں بادشاہوں کا جلال
مذہب اسلام ہے پورا نظام زندگی
حق نے فرمایا ہے اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي (علمائے کرام سے)

نمود و نمائش کی شہنائیاں ! — حسین و دل آویز تنہائیاں
بناوٹ کا بیوپار دھوکے کا مول — کہ پیتل کے پیکر پہ چاندی کا خول
زبانوں پہ کچھ اور دلوں میں کچھ اور — زمانے کو احمق بنانے کا طور
مروت سے نفرت، حیا سے گریز — ہوس ہر قدم پر محبت ستیز
شرافت کا معیار دولت کے ڈھیر — تمدن کے دھوکے سیاست کے پھیر
کتابوں کی کثرت مگر علم کم — خوشی کی خبر اور نہ عرفانِ غم

خلوصِ عمل اور نہ سوزِ یقیں
دروں تیرہ ساماں، بظاہر حسیں

(مغربی تہذیب)

چند متفرق شعر :-

ضمیر صاحب ایماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
جو اپنی ذات کا عرفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد تراشی رہی ہے نئے نئے دستور
جو اس میں حکمتِ قرآں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ سینما، یہ کلب گھر، یہ مدرسے یہ چمن
انہی کے بھیس میں شیطان نے لیا ہے جنم
وہی ہے راہ ترے عزم شوق کی منزل
جہاں ہے عائشہ رضؓ و فاطمہ رضؓ کے نقشِ قدم

صرف تقویٰ پر ہو انساں کی بڑائی کا مدار
گلشنِ ہستی میں پھر اگلی سی آجائے بہار
ہم کو وہ قانون اور ایسی حکومت چاہیئے
جس میں اِک بڑھیا خلیفہ کا گریباں تھام لے

اللہ! یہ تمدن و تہذیب کا فروغ
انسانیت ہے خستہ و بیمار آج بھی
زردار کے حضور جبینیں جھکی ہوئیں
دنیا ہے ظالموں کی طرف دار آج بھی
مٹ جائیگا جہاں سے وہ ہو فرد یا کہ قوم
اسلام سے ہے جو کوئی بیزار آج بھی

---

(۳) ماہر جیسے مشاق اور قادر الکلام شاعر کے کلام میں عروض و قوانی کی خامیوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ بات کہے بنا نہیں رہا جاتا کہ اگر محسوساتِ ماہر اور جذباتِ ماہر وغیرہ سے فردوس کا موازنہ کریں تو کچھ نہ کچھ فرق ضرور محسوس ہوتا ہے اور ایسا ہونا ناگزیر تھا جو لوگ شاعری کے اسرار و رموز سے آگاہ ہیں وہ تسلیم کریں گے کہ اگر فکر پر ذرا سی پابندی بھی گوارا کرلی جائے تو کلام پر اس کا نمایاں اثر پڑتا ہے اور انھوں نے تو اپنے لئے اچھی خاصی سنگین قسم کی اخلاقی اور مذہبی حدود پسند کرلی ہیں۔ لیکن، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انھوں نے اپنی شاعرانہ حیثیت کھودی ہے ان کے آج کے اور کل کے کلام کے حسن اور بیساختہ پن میں فرق ضرور ہے لیکن بس انیس بیس کا۔ فردوس میں ایسے اشعار کی تعداد اس تعداد سے کچھ زیادہ ہی نکلے گی جو کسی مجموعے کی کامیابی اور مقبولیت کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے اور یہ بات بھی ایک عام قاری کے ذہنی تقاضوں کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔ حلقۂ ادب اسلامی سے تعلق رکھنے والے حضرات کے لئے تو اس کتاب کا ہر شعر اور ہر نظم قابلِ قدر ہے۔

قرآن کی فریاد، صبح سعادت، اسلامی دستور، نوائے جبریل اور نغمۂ حرم وغیرہ اس مجموعے کی قابلِ قدر نظمیں ہیں۔

چند متفرق اشعار دیکھئے :-

داستانِ غم سن کر کچھ نہ کچھ تو کہہ دیجئے
اتنی دیر تک کوئی سوچتا نہیں رہتا

آپ کے عہد میں کہیں حسن کو لوگ...؟
آپ کو کچھ خبر بھی ہے آپ نے کچھ سنا بھی

دید کے قابل ہے اس گلرنگ ماتھے کی شکن
جیسے برگِ لالہ و گل پر ٹھہر جاتے کرن

مجھے اپنے غم سے مطلب مجھے غم ہے دوسروں کا
ترے سامنے نشیمن، میرے سامنے چمن ہے

اب مرے افسانۂ غم پر ہنسی آتی نہیں
بندہ پرور، آپ کتنے بے مروّت ہو گئے

کون دیتا ساتھ ان کی گرمیٔ رفتار کا
گردشِ ایام تھوڑی دور چلکر رہ گئی

میں نے جن ذرّوں کو ٹھکرایا ستارے بن گئے
میں نے جن تاروں کو چاہا بن گئے ماہِ تمام

زاہدِ خاموش سے ہنگامۂ رندی اچھا
میکدے والوں نے فتنے تو اٹھا رکھے ہیں

پوچھ لیتا ہوں یہ رک رک کے حدی خوانوں سے
کارواں پر اثرِ نالۂ شب گیر بھی ہے

نہ آرزو نہ کشاکش، نہ جذبِ سوزِ دروں
خدا کرے، کہ میں اس حال میں کبھی نہ رہوں

مجاہدوں سے کہو اس قدر نہ ہوں دل تنگ
کہیں کہیں سے ذرا مڑ گئی ہیں شمشیریں

محبت اور ہوس میں کس قدر ہے فرق اے ماہر
مگر یہ بات دنیا کی سمجھ میں آ نہیں سکتی

خود اپنے سازِ دل وجاں سے نغمہ پیدا کر
کہ چنگ و عود کی نغمہ گری میں کچھ بھی نہیں

کچھ اور ہی تھے اب کے تقاضے بہار کے
ہم رہ گئے ہیں پھر بھی طبیعت کو مار کے

دلوں کے واسطے سوزِ یقیں ضروری ہے
فروغِ مہر سے تابندگی نہیں ہوتی

یوں تو ہر قید توڑ دی ہم نے
دامِ امید سے نکل نہ سکے

مجھ کو بھی خود یقین نہیں شوق نے کیسے طے کئے
غم کے ہزار مرحلے ہجر کی ایک رات میں

ہر نظر لطفِ تجلی، ہر نفس پیغامِ دوست
ایسے عالم میں ہے کس کو فرصتِ آوارگی

مصیبت کا بھی اک مقصد ہے دنیا کے حوادث میں
کہ اک ٹھوکر لگے اور آدمی ہشیار ہو جائے

اس سلسلے میں ایک بات یہ کہنے کے قابل معلوم ہوتی ہے، کہ کسی کسی نظم میں اقبال کا رنگ حاوی ہو گیا ہے۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں لیکن اس سے شاعر کی انفرادیت ضرور مجروح ہوتی ہے۔ ابھی ماہر صاحب کو بہت کچھ لکھنا ہے اگر وہ خاص اپنا رنگ ہی قائم رکھنے کی کوشش کریں تو زیادہ موزوں ہوگا — ہاں ایک اور بات، ماہر صاحب کی نظم[1] "اندھی بھکارن" ان کے پہلے مجموعہ جذباتِ ماہر میں بھی شامل ہے اور فردوس میں بھی درج کی گئی ہے۔ بظاہر اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اگر یہ سہو ہے تو آئندہ ایڈیشن میں یہ نظم نکال دینی چاہیے۔ (بقیہ صفحہ ــ پر)

---

[1] جذباتِ ماہر میں ماہر القادری کی نظم (اندھی بھکارن) کے صرف چند اشعار شائع ہوئے تھے۔ اس میں یہ نوٹ بھی شاعر نے دیدیا تھا کہ یہ نظم نامکمل ہے "آنے والے مجموعے میں مکمل شائع ہوگی۔" فردوس میں اس نظم کو مکرر نہیں چھاپا گیا۔ بلکہ نا تمام نظم کو مکمل طور پر شائع کیا گیا ہے۔ (ایڈیٹر)

اس کتاب کا ظاہری حسن قابلِ ستائش ہے، ہمارے ملک کے کتابیں چھاپنے والے اداروں میں مکتبۂ چراغِ راہ اس بات کے لئے یقیناً مبارکباد کا مستحق ہے، کہ اس نے سادگی و پرکاری کے اصول کو اپناتے ہوئے نہایت پاکیزہ معیار قائم کیا ہے۔ فردوس کا سرورق نہایت خوبصورت ہے، کتابت اور چھپائی بھی اچھی ہے، جلد بھی نہایت نفیس لگائی گئی ہے اور سب سے بڑی بات کتابت کی غلطیاں بہت کم ہیں، پوری کتاب میں قابلِ اعتبار ہے۔

میرے نزدیک مجموعی حیثیت سے یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر مکتبِ خیال کے لوگ اپنی لائبریریوں کے لئے خریدیں۔

ماہر الشہاب •

سینے کے زخم دیکھ، دلِ داغدار دیکھ
آ گلستانِ عشق کی فصلِ بہار دیکھ

ہاں! چشمِ التفات دل آزردگاں پہ کر
فریاد بن نہ جائے دلوں کا غبار دیکھ

اے دل شبِ فراق میں یوں مضطرب نہ ہو
سایہ فگن ہے سلسلۂ زلفِ یار دیکھ

یہ ابر، یہ ہوائیں، یہ فطرت کی شوخیاں
اِس کاروبارِ شوق کو دیوانہ وار دیکھ

ہم دشتِ عاشقی میں جنوں کا جلال ہیں!
مت دیکھیو ادھر خردِ ہوشیار، دیکھ

فرقت کی شب میں ضبط کا دامن نہ چھوڑیو
رسوا نہ کیجیو دلِ بے اختیار، دیکھ

اے بادِ غم یہ دل ہے تنِ مردہ کا قرار
جھونکوں سے بجھ نہ جائے چراغِ مزار دیکھ

ہر چیز پر نگاہِ بصیرت سے غور کر!!
ذرّوں کو آفتاب کا آئینہ دار دیکھ

دل چاک چاک، آنکھ ہے پُر اشک اے شہابؔ!
بزمِ چمن میں غنچہ و گُل کی بہار دیکھ

○

وزیر سہسوانی •

نہ دیکھی جا سکی کم ظرفیٔ صیاد گلشن میں
نشیمن مسکرا کر جا پڑا بجلی کے دامن میں

ارادے قیدیٔ زنجیر و زنداں ہو نہیں سکتے
قفس میں بال و پر رہتے ہیں دل رہتا ہے گلشن میں

آسی ضیائی

نمونے کا خط

(جو موجودہ زمانے کے کوئی غالبؔ کسی میر مہدی مجروحؔ کو لکھتے)

برخوردار نیک اطوار، سعادت آثار، میاں طلوع اسلام سلمہٗ
جیتے رہو، صد آفریں، عبارت آرائی اور افترا پردازی کا کیا اچھا ڈھنگ نکالا ہے کہ مجھے رشک آنے لگا۔ سنو، جیراج پور اور فتح پور کی کی تمام مال و متاع اور زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطے میں آئی ہے یہ طرز خاص میری تھی، سو ایک ظالم بٹالوی، کراچی، سول سکریٹریٹ کے محلے کا رہنے والا اسے لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا، اللہ برکت دے۔ آگے میں کہتا تھا کہ میں منفرد اور موجد اس طرز کا تھا، اور اس میں مجھے رتبہ اولیت کا حاصل، بلکہ یہی یکتائی باعث میری تشویش کا بن گئی تھی کہ اللہ اللہ، اس بھرے پرے غدار ملک میں کوئی نہیں کہ میری راہ پر چل سکے! میں مرگیا تو کون اس کا ثواب جاریہ بنائے گا۔ ہو شکر ہے اس پروردگار کا جس نے میرا جانشیں بلکہ نعم البدل یہاں کے عوام کالانعام کو مہیا کردیا۔ کیوں نہ ہو، ہونہاروں کے یہی تیور ہوتے ہیں۔ مملکت خداداد کے پاسے تخت سے نکلنے والے، پانچ دریاؤں کے گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے، کون تم سے سربر ہو سکے! درحقیقت تمہاری جودتِ طبع نے ثابت کر دکھایا کہ پنجاب مرحوم (جو آج مغربی پاکستان کے سمندر میں مانند قطرے کے واصل ہو کر سمندر بن گیا ہے) آج بھی زرخیز اور "ایج دار" دماغ پیدا کرنے میں دوسرے ملکوں سے کم نہیں۔ ہر شمارہ دل کو قوت اور آنکھوں کو بصارت بخشتا ہے۔ اس اعتبار سے تو تمہیں "نصف النہار اسلام" ہونا چاہیئے تھا معارف قرآنیہ و حقائق فرقانیہ کا ایک کنز الدقائق ہے کہ اس کا منہ کھل گیا ہے اور مانند دریا کے بہہ رہا ہے، بہتا جا رہا ہے، اور عجب نہیں کہ جلد ہی بحیرۂ عرب کی دقیانوسی تنگنائے کے بجائے بحر اوقیانوس کی جدید اور اتھاہ گہرائیوں سے اپنا دامن باندھ اور رشتہ جوڑ لے گا۔ تمہارے مولف کی شان میں کیا کہوں زبان توصیف لال و لسان تعریف گنگ ہے ایک طرف اس کے تصنیف شدہ ہزاروں صفحے دیکھتا ہوں کہ کیا کیا، اور کس کس شان سے لکھا ہے۔ مخالفوں کو یارائے دم زدن و مجال جواب نہیں رہا۔ ایسے ایسے دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے لبریز ہیں کہ غالبؔ کا ناطقہ تو سر بگریباں تھا کہ اسے کیا کہئے، مگر مخالفین تنگ ہو کر کپڑے پھاڑ کر نکلنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ درحقیقت علمی و برہانی انداز بیان کی نوعیت ہی یہ ہونی چاہیئے کہ مخالف کے تئیں اشتعال ہو، اور جواب دینے بیٹھے تو گالیاں دے، ورنہ خموشی اختیار کرے۔ دوسری طرف اس ہونہار کو دیکھتا ہوں جو ماہوار سے ہفتہ وار، اور عنقریب روزنامہ بلکہ عجب نہیں، ساعت وار ہو جائے گا، مجھ کو تو ہیچ یہ ہے، رشک آتا ہے کیا وہ فرمایا ابن تیمیہ اپنے وقت میں ہوگا۔ (جس کے تئیں کہتے ہیں کہ مصنف پانچسو کتابوں کا تھا) جیسے صاحب طلوع اسلام ہے! بھلا کیونکر مانئے کہ ابن تیمیہ ایسا ہی تھا۔ بلکہ درحقیقت تھا بھی کوئی شخص اس نام کا یا یونہی "عجمی سازش" نے ایک فرضی شخصیت گھڑ لی ہے، اور عوام میں مشہور کردی ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ کروڑوں آدمی سیکڑوں برس سے جانتے آئے ہیں کہ ابن تیمیہ بھی ایک شخص تھا، اور اس نے یہ کتابیں لکھی ہیں۔ مگر پوچھو، بھلا تم نے اس کو دیکھا تھا؟ شنیدہ کہ بود مانند دیدہ؟ اور کروڑوں کی کہو تو یہ بھی زائد بات ہے آخر شیکسپیئر کے بارے میں بھی تو کروڑہا انسان مثل بھیڑ بکریوں کو سیکڑوں برس یہی یقین دلایا جاتا رہا کہ اسی نے یہ ڈرامے لکھے ہیں۔ پھر آخر عہد جدید کے محققوں نے ثابت کر نہیں دیا کہ یہ انتساب بالکل غلط ہے؟

پس ثابت ہوا کہ آنکھوں دیکھی قابلِ اعتبار ہو سکتی ہے، کانوں سنی کا کیا بھروسہ؟

تم نے مضمون کی مجھ سے فرمائش کی ہے، سو کیا حال بیان کروں۔ ساری باتیں سننے سے تعلق رکھتی ہیں۔ گورنمنٹ انگریزی ... اور اس کی خلف الصدق تمہاری موجودہ حکومت خداداد میں ... پچپن سالہ ملازم کے تئیں از کار رفتہ قرار دے کر پنشن کر دیتی ... ستھ لمبر گردانتے ہیں۔ یہاں تک کہ تم بھی اسی عنوان کے تحت گھر آ بیٹھے ہو۔ مجھے دیکھو۔ لوگ سترا بہترا کہا کرتے ہیں، اور میں اس منزل سے بھی گذر گیا ہوں۔ ہاتھوں سے معذور، کانوں سے لاچار، حرارت غریزی مفقود، تولید دم صالح نہیں کہ قوت آئے۔ کیا لکھوں اور کیونکر کہوں میرا تو بقول طالبؔ آملی یہ حال ہے ؎

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

البتہ حواس میں اس قدر جان باقی ہے کہ تم جیسے ہونہار کو اکھاڑے میں اترتا اور ڈنڈ پیلتا دیکھ کر بڈھے پہلوان کی طرح خوش ہولوں۔ اور ہو سکے تو کبھی کبھی ایک آدھ پیچ بتا دوں۔ غالبؔ کو حاتم علی مہر کی درازیٔ قد یا چمپئی رنگت پر رشک نہ آیا بلکہ انھوں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی خوب گھنی ہوئی تھی۔ میں بھی تمہاری ضخیم تصانیف پر نہیں جلتا کس واسطے کہ میں بھی اپنے عہد میں مصنف تصانیف کثیرہ کا رہ چکا ہوں۔ تمہاری تحریر کی روانی باعث میرے حسد کا نہیں بنتی، کیونکہ میں جب جیتا تھا۔ یعنی جوان تھا تو میری تحریر پڑھ کر بھی دیدہ ور لوگ بطور ستائش کہا کرتے تھے کہ اس میں بغلیں بجا بجا کر بھڑکنے کا سا انداز پلایا جاتا ہے (سو ہی تمہارے ہاں ہے) ہاں مجھکو رشک آیا، اور میں نے خون جگر پیا تو اس بات پر کہ تمہیں ایسا حریف ملا ہے جو مجھ کو نصیب نہ تھا۔ ویسے تو تمہاری تحریریں ہر صاحب علم کا منہ نوچا ہی کرتی ہیں۔ اور کتاب کے شا... سنت پر ایمان رکھنے والے تمہاری اچھالی ہوئی گندگی سے اپنے منہ پونچھتے ہی رہتے ہیں رہا یہ نہ ہوتے اس عہد میں بخاری اور مسلم جیسے دوسرے سازشی، ورنہ قابل دید ہوتا۔ یہ تماشا کہ تمہاری —

— غالبؔ نے یہ لفظ اسی طرح لکھا ہے۔

تحریریں جھاڑ کا کانٹا بن کر ان کے کپڑوں میں الجھ رہی ہیں اور وہ دامن چھڑانے کی بجائے اتنا دامن ہی کاٹے دے رہے ہیں!

(جزاک اللہ) لیکن بالخصوص جماعت اسلامی اور اس کے سربرآوردوں پر تمہارے ہر شمارے میں ایراد ایسے عمدہ اور پاکیزہ ہوتے ہیں کہ روح وجد کر کر جاتی ہے۔ مگر بھئی خدا جانے کس مٹی کے بنے ہوتے ہیں یہ لوگ کہ کیچڑ بھری جھاڑو تمہارے ہاتھوں کھائے پر کھائے جاتے ہیں اور پلٹ کر نہیں پوچھتے کہ تمہارے منہ میں کے دانت ہیں۔ بھلا جب ایک پہلوان اکھاڑے ہی میں نہ اترے تو کشتی کیونکر ہو، اور ہم دیکھنے والے کیونکر حظ اٹھائیں؟ خیر، مگر تم اسی طرح خم ٹھوکے جاؤ۔ خدا کریم ہے، کبھی نہ کبھی تو ان لوگوں کا دل پھیر ہی دے گا کہ تم سے ایک ایک پکڑ پر راضی ہو جائیں۔

اب مجھ بڈھے سے دو ایک داؤں بھی سیکھ لو۔ ویسے تو ماشاءاللہ تم خود اپنے وقت کے پہلوان ہو۔ دلائل سے بڑھ کر افترا پردازی سے کام لینا مجھ سے بھی بہتر جانتے ہو۔ خصوصاً تمہاری اس جدت کا تو جواب نہیں کہ حریف کی تحریروں میں سے بھان متی کا کنبہ جوڑتے ہو ایک جملہ یہاں کا۔ چار لفظ وہاں کے۔ اور لو کام بن گیا۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ یہ عبارتیں مصنف کی نہیں۔ پھر ماشاءاللہ تمہاری طبع جدت طراز ان عبارتوں کے منہ میں اپنا من مانا مطلب جو ڈالتی ہے وہ تو فراست و ذکاوت کی انتہا ہے۔ تس پر مستزاد یہ کہ اس امر میں بعض دوسرے لوگ بھی تمہارے تئیں امام جاننے لگے ہیں اور علی الخصوص اس فرقہ سخت جان اور اس کے بربراہ کے خلاف بالکل تمہارے ہی جیسے اتہامات تراش کر عوام الجہال میں اشتعال اور مخالفت پیدا کرتے اور اس طرح تمہارے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں لیکن تاہم، بعض مجربات ایسے ہیں کہ ہنوز ان کے آثار تمہارے ہاں نہیں۔ حالانکہ ان کا ہونا تمہارے منصوبوں کی تکمیل کے لئے ازبس ضرور ہے۔

اول تو خوب ذہن نشین کر لو کہ۔ ویسے تو تمہاری تحریروں کا اضطراب ادراو بدا او بدا کر یہ موضوع ہر شمارے میں چھیڑنا ہی تمہارے اندیشوں کی غمازی کر رہا ہے کہ تم خود اس بات سے پہلے

یہی واقف ہو ـــــ کہ اصل حریف تمہارا یہی جماعت اسلامی ہے اور اسی کو مطعون کرنا اور رائے عام کو اس کے خلاف اکسانا تمہارا اولین مشن اور مقدس نصب العین ہونا لازم ہے سو سر دست اور تمام مشاغل کے تئیں خیرباد کہو اور اس مقصد نیک کی خاطر مزید کمر کس کر لو۔ اب تک تم نے جو الزام لگائے ہیں، مثلاً یہ کہ اس جماعت کا منتہائے مقصود اور مطمح نظر، ملک میں اپنی آمرانہ حکومت قائم کرنا ہے اور اسی غرض سے یہ سارے پاپڑ بیل رہی ہے، حتیٰ کہ جیل اور پھانسی کی سزائیں بھی ان کو اس سے باز نہ رکھ سکیں، یا یہ کہ اس جماعت کو سرمایہ داروں ـــ جاگیرداروں اور غیر ملکیوں کی امداد معاونت حاصل ہے، تبھی اس کا کاروبار اس قدر پھیلا ہوا ہے۔ یہ سب الزام اپنی جگہ نہایت غلط اور مہمل سہی، اور لوگوں کا ان پر کان نہ دھرنا بھی امر واقعہ سہی، مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم اپنی ناکامی سے کچھ دل برداشتہ ہو کر بیٹھ سے رہے ہو، اور دوسری باتوں میں اپنا وقت عزیز ضائع کرنے لگے ہو۔ سو میرے عزیز، اس میں گھبرانے اور مایوس ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہٹلر اور گوئیلز کا اصول پیش نظر رکھو، کہ جھوٹ بھی دس بار یا سو بار برابر بولتے رہنے سے اپنا اثر دکھاتا ہے، اور لوگ آخر اسے باور کر لیتے ہیں۔ پس تم بھی کوئی شمارہ نہ چھوڑو جس میں کم از کم نصف حصہ مضامین اسی طرح کی افترا پردازی سے بھرا ہوا نہ ہو۔ جماعت اور اس کے امیر کو بطور خاص ہدف بنا لو اور موقع سے شائستہ گالیاں بھی تصنیف کر کر کے درج کرتے رہا کرو (اس سے تمہاری صحت کو بھی خاصا فائدہ ہوگا۔ جگر اور آنتوں کی قوت کے لئے یہ نسخہ بہت نافع ہے) ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ اب تم بڈھے ہوتے جارہے ہو، اور اپنی زندگی میں تمہیں اپنے قرآنی "نظام ربوبیت" کے قیام کی توقع نہیں رہی ہے۔

دوسرا اصول یہ گرہ باندھ لو کہ عوام کالانعام کا حافظہ مطلق نہیں ہوتا۔ پس اگر تم ہر ہفتہ ہی متضاد باتیں لکھ دیا کرو تو کوئی تم سے نہ پوچھے گا نہیں کہ آگے کیا کہہ چکے ہو، بس استقلال سے ہنگامہ آرائی، بہتان طرازی اور اشتعال انگیزی جاری رکھنے کی حاجت ہے۔ پھر دیکھنا کہ جو لوگ تسنیم اور دوسرے فلمی رسالے پڑھتے ہیں کیونکہ تمہاری طرف پروانہ وار ٹوٹتے ہیں۔

تیسرا گر یہ ہے کہ میاں، ابھی سے بعض بزعم خود اہل زبان حضرات کو کہتے سنتا ہوں کہ تمہاری زبان میں "بوسنے کوری" آتی ہے اور شائستہ لوگوں کو ایک وجہ یہ بھی تمہاری طرف سے نفور و استکراہ کی ہے، سو، برخوردار، لکھنے کے بعد اپنی زبان کسی بابائے اردو قسم کے شخص سے درست کرا لیا کرو۔ ابھی تک باوجود ہزاروں ورق سیاہ کرنے کے تم اہل زبان کے نقطہ نظر سے درست عبارت نہ لکھ سکے۔ سو کراچی میں ایسے صاحب زبان لوگوں کا کیا کال، جو کہیں ع

میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے!

اب ایک بات کان، قریب لاؤ تو کہوں۔ جماعت اسلامی والے تمہارے متعلق کہتے ہیں کہ یہ مرد مدمغ یا تو احساس کمتری میں مبتلا ہے یا حکومت کا تنخواہ دار آلہ کار ہے۔ میاں سچ بتاؤ، اب ہم سے کیا پردہ، کیا یہ دونوں باتیں سچ ہیں کہ یہ الزام درست ہی ہو گے اگر یہ بات ہے تو چپکے سے ہمیں بتا دو۔ اس کی بھی "لیپا پوتی" کی فکر کی جائے۔ ہم تو تمہارے دعاگو اور خیر خواہ ہیں کبھی تمہاری امیدوں کے مطابق تمہارا "قرآنی نظام ربوبیت" قائم ہوا تو تم اس کے پہلے ڈکٹیٹر ہو گے ہی، ہمیں بھی کوئی گھر بیٹھنے کا عہدہ دلوا دینا ورنہ "اعزازی تنخواہ" بھی مناسب رہے گی۔ واجب تھا عرض کیا۔

(بشکریہ "ایشیا")

اعتذار

محسن بھوپالی صاحب کی نظم "دور نو" (جو مئی جون ۵۶ء کے شمارہ میں چھپی تھی) کا پہلا شعر حسب ذیل تھا۔ جو شائع ہونے سے رہ گیا ہے ؎

اب تشنہ لبی بزم کا شیوہ نہ رہے گی
رندوں کی زباں واقف شکوہ نہ رہے گی

(ادارہ)

بنتِ حماد، بی۔ اے

آنسو!

"منو" میں نے اپنی کھڑکی کھول کر پکارا۔
تھوڑی ہی دیر بعد میلے کپڑے پہنے گورا سا چھوٹا سا منو دوڑتا ہوا آیا۔
"کیا ہے باجی" وہ کھڑکی کے نیچے آکر بولا
"کیا کر رہے ہو" میں نے پوچھا۔
"کچھ نہیں کھیل رہا تھا" وہ جلدی سے بولا۔
"کیا کھیل رہے تھے" میں نے پھر پوچھا۔
"کوڑیاں" اس نے کہا اور ساتھ ہی اس نے اپنی چھوٹی سی مٹھی کھول دی جس میں تین چار سفید سفید کوڑیاں تھیں، اور پھر جلدی سے اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ پیسے نکالے "اور یہ دیکھئے میں نے راجو سے پیسے جیتے ہیں" وہ پیسے دکھاتے ہوئے بولا
"اچھا تو تم نے پھر سے کوڑیاں کھیلیں۔ جاؤ میں نہیں بولتی" یہ کہہ کر میں نے کھڑکی بند کر لی۔ تھوڑی دیر تک تو باجی باجی کی آواز آتی رہی۔ مگر پھر آواز بند ہوگئی۔ شاید وہ پھر سے راجو سے پیسے جیتنے چلا گیا۔
تو یہ تھا میرا ننھا پڑوسی منو۔ جس سے میری حال ہی میں دوستی ہوئی تھی۔ بھولی بھولی صورت اور گھنگھریلے بالوں والا یہ منو مجھے اپنے دوستوں میں سب سے زیادہ پسند تھا۔ یوں تو اس کی ماں کو میں بہت پہلے سے جانتی تھی۔ وہ اپنے دو اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ میرے پڑوس میں رہتی تھی، اور اس کا باپ کہیں باہر نوکری کرتا تھا۔ اور یہ پورا خاندان صرف ان تھوڑے سے روپیوں پر گزر کرتا تھا جو ہر ماہ اس کے باپ کے پاس سے آیا کرتے تھے۔ کیسے گزر ہوتی تھی یہ تو نہیں معلوم مگر اس کی ماں کی زبانی اس کی تنگی کے قصے میں بارہا سن چکی تھی اور اکثر تو گرمیوں کی لمبی دوپہر وہ اماں سے باتیں کر کے گزار دیتی تھی۔ اور دھوپ ڈھلنے کے بعد جب وہ جانے لگتی تو جھینپتے ہوئے کبھی دال، کبھی چاول اور کبھی آٹا مانگتی جاتی
میں اکثر سوچتی تھی کہ یہ یوں مانگ مانگ کر کیوں گزر کرتی ہے کیوں نہیں۔ کہیں نوکری کر لیتی۔ مگر اس سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی کیونکہ اگر اماں سن لیتیں تو الٹا مجھ پر خفا ہونے لگتیں کہ غریبوں کو دینا نہیں چاہتی۔ مگر ہٹے کٹے لوگوں کو اس طرح بھیک دیتے مجھ کو بہت برا لگتا۔ اور ایک دن حسب عادت وہ کمرے کے فرش پر لیٹی ہوئی اماں سے اپنا رونا رو رہی تھی۔
"یوں روز روز مانگتے شرم آتی ہے مگر کیا کروں" وہ افسردہ سی ہو کر بولی۔
"تو پھر تم کہیں نوکری کیوں نہیں کر لیتیں" میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔
"کیا کروں بی بی میرا مالک بڑا ظالم ہے" وہ بولی "اگر وہ سن لے گا کہ میں نے نوکری کر لی ہے تو گھر ہی سے نکال دے گا"
"یہ آخر کیوں" میں نے پوچھا۔
"کہتا ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں تجھے نوکری نہ کرنے دونگا" اس نے کہا "تو پھر تم اپنے بچوں میں سے کسی کو کہیں نوکر رکھا دو" میں نے رائے دی۔
"منو کو جج صاحب کے یہاں رکھا تھا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد انھوں نے اسے مار کر نکال دیا۔ تب سے وہ ڈر کے مارے کہیں نہیں جاتا" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔
"مار کر نکال دیا تھا" میں نے تعجب سے کہا "اچھا اس کو میرے یہاں بھیج دینا میں رکھ لوں گی"
"اس سے بہتر بات اور کیا ہو سکتی ہے" وہ تشکر آمیز لہجے

ہی واقف ہو ـــــ کہ اصل حریف تمہارا یہی جماعت اسلامی ہے اور یہی
کو ملعون کرنا اور رائے عام کو اس کے خلاف اکسانا تمہارا اولین مشن اور
مقدس نصب العین ہونا لازم ہے سو سردست اور تمام مشاغل کے
تئیں خیرباد کہو اور اس مقصد نیک کی خاطر مزید کمر کس کر لو اب تک
تم نے جو الزام لگائے ہیں، مثلاً یہ کہ اس جماعت کا منتہائے مقصود
اور مطمح نظر، ملک میں اپنی آمرانہ حکومت قائم کرنا ہے اور اسی غرض سے
یہ سارے پاپڑ بیل رہی ہے، حتیٰ کہ جیل اور پھانسی کی سزائیں بھی ان
کو اس سے باز نہ رکھ سکیں، یا یہ کہ اس جماعت کو سرمایہ داروں ـــ
جاگیرداروں اور غیر ملکیوں کی امداد معاونت حاصل ہے، تبھی اس کا
کاروبار اس قدر پھیلا ہوا ہے۔ یہ سب الزام اپنی جگہ نہایت غلط اور
مہمل سہی، اور لوگوں کا ان پر کان نہ دھرنا بھی امر واقعہ سہی، مگر میں
دیکھتا ہوں کہ تم اپنی ناکامی سے کچھ دل برداشتہ ہو کر بیٹھ سے رہے
ہو، اور دوسری باتوں میں اپنا وقت عزیز ضائع کرنے لگے ہو۔ سو
میرے عزیز، اس میں گھبرانے اور مایوس ہونے کی کوئی گنجائش نہیں
ہٹلر اور گوئبلز کا اصول پیش نظر رکھو، کہ جھوٹ بھی دس بار یا سو بار برابر
بولتے رہنے سے اپنا اثر دکھاتا ہے، اور لوگ آخر اسے باور کر لیتے ہیں۔
پس تم بھی کوئی شمارہ نہ چھوڑو جس میں کم از کم نصف حصہ مضامین
اسی طرح کی افترا پردازی سے بھرا ہوا نہ ہو۔ جماعت اور اس کے امیر
کو بطور خاص ہدف بناؤ اور مرقع سے شائستہ گالیاں بھی تصنیف کر
کرکے درج کرتے رہا کرو (اس سے تمہاری صحت کو بھی خاصا فائدہ
ہوگا۔ جگر اور آنتوں کی قوت کے لئے یہ نسخہ بہت نافع ہے) ورنہ لوگ
سمجھیں گے کہ اب تم بڈھے ہوتے جا رہے ہو، اور اپنی زندگی میں کہیں
اپنے قرآنی "نظام ربوبیت" کے قیام کی توقع نہیں رہی ہے۔

دوسرا اصول یہ گرہ باندھ لو کہ عوام کالانعام کا حافظہ مطلق
نہیں ہوتا۔ پس اگر تم ہر ہفتہ یہی متضاد باتیں لکھ دیا کرو تو کوئی تم
سے نہ پوچھے گا نہیں کہ آگے کیا کہہ چکے ہو، بس استقلال سے ہنگامہ
آرائی، بہتان طرازی اور اشتعال انگیزی جاری رکھنے کی حاجت ہے
پھر دیکھنا کہ جو لوگ شمع اور دوسرے فلمی رسالے پڑھتے ہیں کیونکر تمہاری
طرف پروانہ وار ٹوٹتے ہیں۔

تیسرا اگر یہ ہے کہ میاں، ابھی سے بعض بزعم خود اہل زبان
حضرات کو کہتے سنتا ہوں کہ تمہاری زبان میں "بوسنے کوری" آ گئی ہے
اور شائستہ لوگوں کو ایک وجہ یہ بھی تمہاری طرف سے نفور و استکراہ
کی ہے، سو، برخوردار، لکھنے کے بعد اپنی زبان کسی بابائے اردو قسم
کے شخص سے درست کرا لیا کرو۔ ابھی تک باوجود ہزاروں ورق سیاہ
کرنے کے تم اہل زبان کے نقطہ نظر سے درست عبارت نہ لکھ سکے۔
سو کراچی میں ایسے صاحب زبان لوگوں کا کیا کال، جو کہیں ع
میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے!

اب ایک بات کان، قریب لاؤ تو کہوں۔ جماعت اسلامی
والے تمہارے متعلق کہتے ہیں کہ یہ مرد مومن یا تو احساس کمتری میں
مبتلا ہے یا حکومت کا تنخواہ دار آلہ کار ہے۔ میاں سچ بتاؤ، اب ہم
سے کیا پردہ، کیا یہ دونوں باتیں سچ ہیں کہ یہ الزام درست ہی ہو
گے اگر یہ بات ہے تو چپکے سے ہمیں بتا دو۔ اس کی بھی "لیپا پوتی"
کی فکر کی جائے۔ ہم تو تمہارے دعا گو اور خیر خواہ ہیں کبھی تمہاری
امیدوں کے مطابق تمہارا "قرآنی نظام ربوبیت" قائم ہوا تو تم اس
کے پہلے ڈکٹیٹر ہو گے ہی، ہمیں بھی کوئی گھر بیٹھے کا عہدہ دلوا دینا
ورنہ "اعزازی تنخواہ" بھی مناسب رہے گی۔ واجب تھا عرض کیا۔

(بشکریہ "ایشیا")

اعتذار

محسن بھوپالی صاحب کی نظم "دور نو" (جو مئی جون ۵۱ء
کے شمارہ میں چھپی تھی) کا پہلا شعر حسب ذیل تھا۔ جو شائع ہونے
سے رہ گیا ہے ؎

اب تشنہ لبی بزم کا شیوہ نہ رہے گی
رندوں کی زباں واقف شکوہ نہ رہے گی

(ادارہ)

بنتِ حماد، بی۔ اے

آنسو!

"منو" میں نے اپنی کھڑکی کھول کر پکارا۔

تھوڑی ہی دیر بعد میلے کپڑے پہنے گورا سا چھوٹا سا منو دوڑتا ہوا آیا۔

"کیا ہے باجی" وہ کھڑکی کے نیچے آکر بولا

"کیا کر رہے ہو" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں کھیل رہا تھا" وہ جلدی سے بولا۔

"کیا کھیل رہے تھے" میں نے پھر پوچھا۔

"کوڑیاں" اس نے کہا اور ساتھ ہی اس نے اپنی چھوٹی سی مٹھی کھول دی جس میں تین چار سفید سفید کوڑیاں تھیں، اور پھر جلدی سے اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ پیسے نکال لئے" اور یہ دیکھئے میں نے رامو سے پیسے جیتے ہیں" وہ پیسے دکھاتے ہوئے بولا

"اچھا تو تم نے پھر سے کوڑیاں کھیلیں۔ جاؤ میں نہیں بولتی" یہ کہہ کر میں نے کھڑکی بند کر لی۔ تھوڑی دیر تک تو باجی باجی کی آواز آتی رہی۔ مگر پھر آواز بند ہو گئی۔ شاید وہ پھر سے رامو سے پیسے جیتنے چلا گیا۔

تو یہ تھا میرا ننھا پڑوسی منو۔ جس سے میری حال ہی میں دوستی ہوئی تھی۔ بھولی بھولی صورت اور گھنگھریلے بالوں والا یہ منو مجھے اپنے دوستوں میں سب سے زیادہ پسند تھا۔ یوں تو اس کی ماں کو میں بہت پہلے سے جانتی تھی۔ وہ اپنے دو اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ میرے پڑوس میں رہتی تھی، اور اس کا باپ کہیں باہر نوکری کرتا تھا۔ اور یہ پورا خاندان صرف ان تھوڑے سے روپیوں پر گزر کرتا تھا جو ہر ماہ اس کے باپ کے پاس سے آیا کرتے تھے۔ کیسے گزر ہوتی تھی یہ تو نہیں معلوم مگر اس کی ماں کی زبانی اس کی تنگی کے قصے میں برابر سن چکی تھی اور اکثر تو گرمیوں کی لمبی دوپہر وہ اماں سے باتیں کر کے گذار دیتی تھی۔ اور دھوپ ڈھلنے کے بعد جب وہ جانے لگتی تو جھینپتے ہوئے کبھی دال، کبھی چاول اور کبھی آٹا مانگ کر لے جاتی

میں اکثر سوچتی تھی کہ یہ یوں مانگ کر کیوں گزر کرتی ہے کیوں نہیں۔ کہیں نوکری کر لیتی۔ مگر اس سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی کیونکہ اگر اماں سن لیتیں تو الٹا مجھ پر خفا ہونے لگتیں کہ غریبوں کو دینا نہیں چاہتی۔ مگر ہٹے کٹے لوگوں کو اس طرح بھیک دیتے مجھ کو بہت برا لگتا ۔ اور ایک دن حسب عادت وہ کمرے کے فرش پر لیٹی ہوئی اماں سے اپنا رونا رو رہی تھی۔

"یوں روز روز مانگتے شرم آتی ہے مگر کیا کروں" وہ افسردہ سی ہو کر بولی۔

"تو پھر تم کہیں نوکری کیوں نہیں کر لیتیں" میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"کیا کروں بی بی میرا مالک بڑا ظالم ہے" وہ بولی "اگر وہ سن لے گا کہ میں نے نوکری کر لی ہے تو گھر ہی سے نکال دے گا"

"یہ آخر کیوں" میں نے پوچھا۔

"کہتا ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں تجھے نوکری نہ کرنے دوں گا" اس نے کہا" تو پھر تم اپنے بچوں میں سے کسی کو کہیں نوکر رکھا دو" میں نے رائے دی۔

"منو کو جج صاحب کے یہاں رکھا تھا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد انھوں نے اسے مار کر نکال دیا۔ تب سے وہ ڈر کے مارے کہیں نہیں جاتا" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"مار کر نکال دیا تھا" میں نے تعجب سے کہا" اچھا اس کو میرے یہاں بھیج دینا میں رکھ لوں گی"

"اس سے بہتر بات اور کیا ہو سکتی ہے" وہ تشکر آمیز لہجے

میں بولی۔ "میں اس سے جاکر کہوں گی اگر وہ آیا تو رکھ بیٹھے گا۔"
اور پھر ہمیشہ کی طرح وہ پہر ڈھلنے کے بعد وہ چلی گئی۔ مجھ کو تو یقین تھا کہ وہ منو کو کہیں نہیں بھیجے گی۔ اور ہوا بھی یہی میں بھی رفتہ رفتہ اس تذکرے کو بھول گئی۔

تھوڑے دنوں کے بعد ایک بار وہ پھر آئی۔ مگر ہمیشہ کیطرح مسکرائی نہیں بلکہ اس دن ایک عجیب سی گھبراہٹ اس کے چہرے پر تھی آتے ہی اس نے کہا۔

"بی بی مجھ کو تھوڑی سی ہلدی دیدو"

"کیا کرو گی"، میں نے سوال کیا۔

"منو کو چوٹ لگ گئی ہے۔ پیس کر لگاؤں گی" اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"کیسے لگ گئی"

"کیسے بتاؤں" ــــ وہ روندھے ہوئے گلے سے بولی "جب اپنا ہی سونا کھوٹا ہے تو سنار کا کیا دوش" یہ کہتے ہوئے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی چلی گئی۔

تین چار دن گزر گئے۔ ایک دن میں اپنے صحن میں کھڑی ہوئی گلاب کے پودوں کو دیکھ رہی تھی کہ ایک چھوٹا سا لڑکا میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

کون ہو تم اور کیا کام ہے" میں نے اس سے سوال کیا۔

میرے اس سوال پر وہ ایک دم گھبرا گیا۔ اور خاموش کھڑا رہا

"کیا نام ہے تمہارا" میں نے تھوڑی دیر ٹھہر کر پوچھا۔

"منو" اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"اچھا تو تم ہی منو ہو۔ میرے باغ کے پیچھے رہتے ہو نہ؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں" اس نے جلدی سے جواب دیا۔

"کیا کام ہے" میں نے پوچھا۔

"ماں نے یہ بھیجا ہے" یہ کہہ کر اس نے ایک میلی سی پوٹلی میری طرف بڑھا دی "کیا ہے اس میں" میں نے برا سا منہ بنایا۔ گندے کپڑے دیکھ کر مجھ کو گھن آئی۔

مجھ کو اس قدر برا منہ بناتے دیکھ کر اس نے جلدی سے پوٹلی پیچھے کر لی۔ اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھ کو گھور کر دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو میں تو ماں سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ نہ بھیج۔ وہ لوگ بڑے آدمی ہیں۔ بھلا یہ کیا پسند کریں گے۔ ایسی چیزیں تو ان کے یہاں کے نوکر بھی نہیں کھاتے۔ مگر ماں نے ضد کر کے بھیجا۔

"اچھا لاؤ" میں نے مسکرا کر کہا اور اس نے ڈرتے ڈرتے پوٹلی میرے ہاتھوں میں دیدی۔ میلی سی اور کالے کالے دھبوں والی پوٹلی لیکر میں برآمدے میں آگئی۔ میرے پیچھے پیچھے وہ بھی آیا۔

اور پوٹلی کے کھلتے ہی ننھے ننھے گول گول جامن میری گود میں بکھر گئے۔

"ارے اس میں تو جامن ہیں" میں خوش ہوتے ہوئے بولی۔ جلدی سے ایک جامن میں نے منہ میں رکھ لیا۔ اور میٹھے بھی ہیں" میں نے کھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمارے آنگن کے ہیں" اس نے جلدی سے کہا "ہم اس میں روز پانی ڈالتے تھے مگر ماں ہم لوگوں کو کھانے نہیں دیتی کہتی ہے کہ نقصان کریں گے" اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"تو کیا تم جامن نہیں کھاتے" میں نے اس کا مزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں آج کل تو برابر کھاتا ہوں۔ ماں دوپہر کو کھانا نہیں پکاتی۔ تھوڑے سے جامن توڑ کر دے دیتی ہے اور ہم وہی کھا لیتے ہیں"

"کیا پیٹ بھر جاتا ہے" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں" اس نے ہاں کو لمبا کرتے ہوئے کہا "تھوڑے سے جامن کھا لیتا ہوں اور ڈھیر سا پانی۔ بس پیٹ بھر جاتا ہے"

"اچھا تو چلو آج میں اپنے کھانے سے تمہارا کھانا بدل لوں" اور میں اس کو ساتھ لے کر دو تین کمرے پار کرتی ہوئی ایک کمرے میں گئی

"یہ لو" یہ کہہ کر میں نے آٹا اس کے کپڑے میں ڈال دیا "اپنی ماں سے کہنا وہ تم کو روٹی پکا دے گی"

"اچھا" کہہ کر وہ جلدی جلدی آٹا باندھنے لگا۔

"کچا ہی نہ کھا جانا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ بہت زور سے ہنسا اور پوٹلی باندھ کر صحن میں دوڑ گیا۔

"سنو منو" میں نے پھر پکارا۔ قریب آنے پر میں نے ایک چونی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ "یہ پیسے تو تم کو دینا بھول ہی گئی"۔ منو نے اپنی لمبی لمبی پلکیں اوپر اٹھائیں ان آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے جلدی سے مٹھی بند کر لی۔ اور پھر کھول دی اور پھر غور سے چاندی کی چمکتی ہوئی چونی کو دیکھنے لگا۔

"کیا میں اسے لے جاؤں" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں لے جاؤ" اپنی ماں کو دے دینا۔ میں نے کہا اور وہ خوشی میں دوڑتا ہوا چلا گیا۔

یہ تھی میرے ننھے دوست کی پہلی ملاقات۔ اور مجھ کو پہلی بار منو بہت پیارا لگا۔ پھٹے ہوئے گندے کپڑوں میں وہ کتنا اچھا، لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کا بھولا پن اس کے بے بسی کے افسانے پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں تنگدستی کے قصے دہرا رہی تھیں۔ اگر یہ کسی بڑے آدمی کے گھر پیدا ہوا ہوتا تو اس کی کتنی قدر کی جاتی۔ جب یہ اپنے اس پیارے انداز سے باتیں کرتا اور لوگ اس کے بھولے پن کی تعریفیں کرتے تو اس کے باپ کا سر فخر سے اور اونچا ہو جاتا۔ میں بڑی دیر تک منو کے بارے میں سوچتی رہی۔

"بی بی چلئے کھانا کھا لیجئے" اپنی بوڑھی خادمہ کی آواز نے مجھ کو چونکا دیا۔ اور میں بغیر ایک لفظ بولے ہوئے کھانے کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

اماں کھانا لئے ہوئے میری منتظر تھیں۔ بلکہ انھوں نے اپنی پلیٹ میں نکالنا شروع بھی کر دیا تھا۔ "جلدی سے ہاتھ دھو کر آجاؤ" انھوں نے کہا اور کھانا شروع کر دیا۔ میں نے بھی فوراً ہی حکم کی تعمیل کی

آج اماں نے میری پسندیدہ چیزیں پکوائی تھیں۔ اور میں جلدی جلدی اپنی پلیٹ میں کھانا نکالنے لگی۔ مگر جیسے ہی میں نے ایک نوالہ کھایا مجھے منو یاد آ گیا۔ "تھوڑے سے جامن کھا لیتا ہوں اور ڈھیر سا پانی بس پیٹ بھر جاتا ہے"۔ اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ بیچارہ منو صرف جامن اور پانی سے پیٹ بھر لیتا ہے اور میرے دسترخوان پر قسم قسم کے کھانے چنے ہوئے ہیں نہ جانے کیوں میں افسردہ ہو گئی اور باوجود کوشش کے بھی میں دو چار لقموں سے زیادہ نہ کھا سکی۔

"بس کھا چکیں" اماں نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اماں آج بھوک نہیں ہے۔ میں نے جامن کھا لئے تھے" میں نے جواب دیا۔

"ہزار دفعہ منع کر دیا کہ بے وقت کچھ نہ کھایا کرو مگر تم سنتی نہیں ہو" اماں خفا ہوتے ہوئے بولیں۔ "یہ لو تھوڑا سا حلوہ تو کھا لو" انھوں نے پلیٹ میری طرف بڑھا دی۔ میں نے ایک چمچہ حلوہ لے لیا مگر وہ تو جیسے میری حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ وہ سوکھے سوکھے جامن جو روز آنہ منو کھاتا ہے مجھے یاد آ گئے۔ کیسے کھاتا ہو گا بیچارہ میں سوچنے لگی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ خس کی ٹٹیوں کی وجہ سے یہاں خاصی ٹھنڈک تھی اور ایک قسم کی بھینی بھینی خوشبو میرے کمرے کی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں پلنگ پر دراز ہو گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر آج تو جیسے نیند نے آنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ نہ جانے کیوں رہ رہ کر مجھے منو یاد آ رہا تھا۔ اس کے پریشان بال۔ بڑی آنکھیں۔ بھولا چہرا اور پھٹے کپڑے میرے ذہن میں ابھرتے اور ڈوبتے رہے۔ بے چارہ لو کے تھپیڑوں کے درمیان کھیل رہا ہو گا۔ ماں کے پاس کھانا مانگنے گیا ہو گا۔ تھوڑے سے جامن اور ڈھیر سا پانی پی کر وہ پھر کھیلنے چلا گیا ہو گا اور شاید جامن ختم ہو جانے کے بعد اس کو صرف پانی ہی پی کر گھومنا پڑے میں نے بے چین ہو کر کروٹ لے لی۔ "نہیں منو میں تم کو یوں نہیں گھومنے دوں گی۔ میں تم کو اس طرح فاقے نہیں کرنے دوں گی۔ تم اتنی آسانی سے بربادی کی طرف نہیں جا سکتے اور میں بڑی دیر تک اپنے خیالی منو سے باتیں کرتی رہی، نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی سو کر اٹھی تو دن ڈھل چکا تھا۔ آفتاب کی تمازت میں

کی آگئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی تو اماں لسی بنانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نہ؟"

"سر میں ہلکا سا درد ہے" میں نے بہانہ بنا لیا۔

"کچھ کھا لو تم نے کھانا بھی نہیں کھایا" انھوں نے پھلوں کی پلیٹ میری طرف سرکا دی۔

میں نے ایک سیب کا ٹکڑا اٹھا لیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ ذرا باغ میں ٹہل آؤں شاید دل بہل جائے۔ باغ کا خیال آتے ہی مجھے منو یاد آگیا میں نے ایک بڑا سا سیب اٹھا لیا اور صحن پار کر کے باغ میں آگئی۔ یہ باغ میرا ذاتی تھا اس میں میری ہی پسند کے پھول لگے تھے۔ گلابوں کے تختوں کے درمیان ہوتی ہوئی۔ میں باغ کے آخری کنارے پر پہنچ گئی۔ اور دروازہ کھول کر میں نے پکارا "منو" وہ کسی سے لڑ رہا تھا۔ مگر میری آواز سنتے ہی دوڑا ہوا آگیا۔

"کس سے جھگڑ رہے تھے۔ منو" میں نے پوچھا۔

"راموسے" اس نے کہا۔ "اس سے میں نے دو پیسے جیت لئے مگر وہ نہیں دیتا"۔

اور پھر وہ کوڑیاں دکھا کر بولا۔ "یہ دیکھئے روز آنہ کوڑیاں کھیل کر چار پیسے جیت لیتا ہوں"۔

"میرے ساتھ آؤ" میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئی ہم دونوں گلابوں کے تختوں کے درمیان والے چبوترے تک آگئے۔

"تمہیں کوڑیاں کھیلنے کو ماں منع نہیں کرتی" میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا

"ماں کیوں منع کرے گی" اس نے تعجب سے پوچھا اسے میرے سوال پر تعجب ہوا "پیسے لے جا کر روز آنہ ماں ہی کو دیتا ہوں جس سے وہ نمک۔ مرچ۔ پان اور ضرورت کی دوسری چیزیں منگاتی ہے بھلا وہ کیسے کیوں منع کرے گی"۔

"تم آج سے کوڑیاں کھیلنا بند کر دو" میں نے اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو منو اگر تم کوڑیاں کھیلنا چھوڑ دو گے تو سب تم کو پیار کریں گے اور اگر تم کہنا نہیں مانو گے۔ روز آنہ کھیلو گے تو پھر کوئی تم کو اپنے پاس نہیں بٹھائے گا۔ کوئی تم کو چیزیں نہیں دے گا۔ بولو اب سے تو نہیں کھیلو گے" میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا

"نہیں کھیلوں گا" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا لو یہ سیب کھا لو" میں نے سیب اس کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔

ہم دونوں بڑی دیر تک باغ میں ٹہلتے رہے۔ پھولوں کے درمیان وہ آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ اور پھر ہماری دوستی ہو گئی۔ دن چھپنے کے بعد وہ جانے لگا تو اس نے پھر وعدہ کیا کہ وہ اب سے کوڑیاں نہیں کھیلے گا۔ میں نے اس کی گود میں ڈھیر سے پھول ڈال دیئے اور وہ خوش خوش اپنے گھر کو دوڑ گیا۔

اور دوسرے دن جب میں نے کھڑکی کھول کر پکارا تو وہ پھر کوڑیاں کھیل رہا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ جب وہ آئے گا تو میں باتیں نہیں کروں گی، اور پھر میں بیلے کے تختے کی طرف مڑ گئی۔ ابھی حال ہی میں یہ پودے آئے تھے۔ پھولوں سے مجھے عشق ہے اس لئے میں دور دور سے پھول منگاتی ہوں۔ میں وہیں بیٹھ گئی اور غور سے ہر ایک پیڑ کو دیکھ رہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے میری آنکھیں بند کر لیں کون ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ رشید تو ابھی اسکول سے آیا نہیں ضرور یہ منو ہوگا۔

"مذاق نہ کرو منو" میں نے اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

مگر اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی باہیں میری گردن میں ڈال دیں۔

"تم نے کل ہی مجھ سے کہا تھا کہ تم کوڑیاں نہیں کھیلو گے اور آج ہی پھر تم نے کھیلنا شروع کر دیا" میں خفا ہوتے ہوئے بولی۔

"اچھا اب سے نہیں کھیلوں گا" اس نے پھر کہا۔ مگر میں نے سنی ان سنی کر دی اور جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی دو چار ہی قدم بڑھائے تھے کہ وہ ہنستا ہوا میرے سامنے آگیا۔

"ہٹ جاؤ منو" میں نے ڈانٹا۔ اور آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ کھڑا رہا۔ پھر دوڑ کر میرے سامنے آگیا اور ٹانگوں سے لپٹ گیا" باجی اب سے نہیں کھیلوں گا" وہ ایک دم رونے لگا۔

میرے قدم رک گئے، اور وہ میری ٹانگوں سے لپٹا روتا رہا
اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں آنسو برسا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر
کے بعد اس نے اپنی بھیگی ہوئی پلکیں اوپر اٹھائیں اور بولا "آج
کھانے کو نہیں تھا ماں نے کہا کہ جا پیسے لے آیا تو کھانا دوں گی۔"
میں نے اسے جلدی سے گود میں اٹھا لیا۔ وہ اور چمٹ
گیا اور رونے لگا۔ مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ میں اس کے آنسو
نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اور میرا مقصد اس کو رلانے کا تھا بھی نہیں
"اچھا منو بس سارے آنسو آج ہی نہ گرا دو" میں نے اس
کے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے اسے گدگدایا۔ اور وہ ہنس
پڑا۔ اور دوسرے ہی لمحے ہم پھر پہلے کی طرح دوست تھے "سنو
منو اب اگر تم کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو تم سیدھے میرے پاس آجایا
کرو۔ میں تم کو پیسے بھی دیدوں گی اور کھانا بھی دیدوں گی۔" میں
نے اس سے کہا۔ اور اس دن بھی وہ بڑی دیر تک آنکھ مچولی کھیلتا رہا
"آؤ یہاں تھوڑی دیر آرام کر لیں" میں ایک گلاب کی
جھاڑی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔
"میرے پاس رہو گے منو" میں نے اس سے پوچھا کیونکہ
میں اس کو اس راستہ سے ہٹا دینا چاہتی تھی جس پر وہ
فی الحال چل رہا تھا۔
تھوڑی دیر تک تو وہ چپ چاپ گردن جھکائے کچھ سوچتا
رہا۔ پھر بولا "رہوں گا۔ مگر نوکری نہیں کروں گا۔"
"کیوں" میں اس کے بھولے پن پر مسکراتے ہوئے بولی
"جب میں جج صاحب کے یہاں نوکر تھا تو انھوں نے
بہت مارا تھا" وہ افسردہ سا ہو گیا۔
"تم ان کے یہاں کیا کرتے تھے" میں نے پوچھا۔
"بے بی کو کھلاتا تھا۔ جج صاحب کا حکم تھا کہ بے بی رونے
نہ پائے اور میں اس کو گود میں لئے دن بھر گھوما کرتا بیگم صاحبہ
نے اس کے لئے بسکٹ کے ڈبے منگا دئے تھے اور مجھے حکم دیا تھا
کہ دو بسکٹ صبح اور دو بسکٹ شام دیا کرنا۔ مگر بے بی رونے میں
اتنی تیز تھی کہ چپ نہ ہوتی۔ جب تک گود میں لئے پھرتا رہتا اس
وقت تک تو ہنستی اور خاموش رہتی۔ لیکن جب اسے بٹھا دیتا
تو وہ پھر رونا شروع کرتی۔ تمام دن کھڑے کھڑے میں تھک جاتا
آخر میں نے ایک ترکیب سوچ نکالی۔ جب بے بی رونا شروع کرتی
میں جھٹ سے اسے ایک بسکٹ نکال کر دے دیتا۔ پھر ایک گھنٹہ
کی چھٹی ہو جاتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس ڈبے کو ایک مہینے میں ختم ہونا
چاہئے وہ پندرہ ہی دن میں ختم ہو گیا۔ بے بی نے پھر رونا شروع
کیا اور مجبوراً مجھ کو بتانا پڑا کہ بسکٹ کا ڈبہ ختم ہو گیا مگر یہ سنتے ہی
کہ اب ان کو دوسرا ڈبہ منگانا پڑے گا وہ مجھ پر برس پڑیں۔ تھپڑ
اور گالیوں کے درمیان وہ مجھ سے پوچھتی رہیں کہ ڈبہ کیسے ختم ہو گیا
"بھلا باجی میرے پاس اس کا کیا جواب تھا" وہ میرے ہاتھ
پکڑتے ہوئے بولا۔
"اور پھر مجھ پر چوری کا الزام لگایا گیا" اس نے کچھ دیر رک
کر پھر کہنا شروع کیا "یہ خود ہی سارے بسکٹ کھا گیا ہوگا۔ بیگم
صاحبہ نے کہا خیر اس مرتبہ تو تھوڑی سی مار کھا کر بچ گیا۔ اور بے بی
کے لئے دوسرا ڈبہ آگیا۔ اب میں نے بسکٹ دینے بند کر دیئے۔ لاکھ
رونے پر بھی بے بی کو دن بھر میں چار بسکٹ سے زیادہ نہ ملتے۔ اسکے
بسکٹوں میں کمی آگئی اور ساتھ ہی میرے کھانے میں بھی بیگم صاحبہ
نے کمی کر دی۔ مجھے اتنا کم کھانے کو ملتا کہ میرا پیٹ نہیں بھرتا۔ مجھ
سے روز روز بھوک برداشت نہ ہوتی اور ایک دن تو بھوک کے مارے
میں رونے لگا۔" "تو تم نے بیگم صاحبہ سے کیوں نہیں کہا۔" میں نے
اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔
کہا تھا۔ جواب یہ ملا کہ اس سے زیادہ نہیں مل سکتا۔ چوری
بھی کرے گا اور زیادہ کھائے گا بھی۔ پھر ایک دن بے بی کو بسکٹ
دیتے وقت میرا دل چاہا کہ ایک بسکٹ میں بھی کھا لوں۔ دو بسکٹوں
کے درمیان شکر کی ہلکی سی گلابی رنگ کی تہہ کتنی اچھی لگتی تھی۔ میں
نے سوچا کہ جب میں نے بسکٹ نہیں کھائے تھے تب بھی میرا نام
لگا تھا۔ مار بھی کھائی تھی اور کھانا آدھے سے کم ہو گیا تو کیوں نہ اب
کھا لوں۔ اور یہ سوچ کر میں نے جلدی سے ایک بسکٹ منہ میں
رکھ لیا۔ ابھی میں اس کو کھا ہی رہا تھا کہ بیگم صاحبہ نے دیکھ لیا

پھر کیا تھا۔ خوب مارا اور اس پر بھی جب ان کو تسلی نہ ہوئی تو جج صاحب سے کہہ دیا۔ اور انہوں نے اپنا بید جو شاید اس موقع کے لئے رکھا تھا منگوا کر مجھ کو مارنا شروع کیا۔ اور یہ دیکھئے۔ اسی بید کا نشان ہے جو ہلدی لگنے کے باوجود اب بھی باقی ہے اور اس نے اپنی آستین اٹھا کر کہنی کے پاس ایک نیلے سے نشان کو دکھا دیا۔"

" تو یہ تمہاری چوری کا نشان ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ اور اس کا چہرہ اتر گیا۔

" مگر اب سے چوری نہیں کروں گا۔" وہ روتے ہوئے بولا بے چارہ منو۔ میں سوچنے لگی کتنے ظالم ہیں جج صاحب ایک معصوم پر ہاتھ اٹھاتے انہیں برا نہ لگا۔ وہ تو اسے اپنی بے بی کی طرح چمکار کر اور پیار کر کے منع کر سکتے تھے۔ یا زیادہ سے زیادہ ڈرا اور دھمکا کر راہ راست پر لا سکتے تھے۔ اسے اس لئے مارا کہ اس نے بے بی کے بسکٹ کھائے تھے۔ کیا انہوں نے منو کے حق میں صحیح فیصلہ کیا۔ کیا انہوں نے اس بے گناہ کو ٹھیک سمجھا۔ وہ ابھی انصاف نہیں کر سکے کیونکہ وہ خود غلط راستے پر ہیں۔ جو خود گناہ گار ہو وہ بے گناہوں اور گناہ گاروں کو کیسے چھانٹ سکتا ہے۔ میرے ذہن میں منو۔ جج صاحب ان کا بید، اور منو کی ماں۔ دیر تک پھرتے رہے۔ میں اس وقت چونکی جب منو نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا۔

" باجی تم چپ کیوں ہو، تمہارے پاس رہ کر چوری نہ کروں گا کوڑیاں نہ کھیلوں گا۔" اور وہ رو رو کر نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔

" بولو نہ باجی کیا تم پھر روٹھ گئیں۔" وہ مجھ سے چمٹ کر روتے ہوئے بولا۔

اور میں چونک پڑی۔ " نہیں منو میں تم سے خفا نہیں ہوں میں تم کو اپنے ہی پاس رکھوں گی۔" اور میں نے اس کے آنسو چوم لئے کیونکہ یہ میرے معصوم دوست کے پاکیزہ آنسو تھے جو اس نے میری گود میں بہائے تھے۔

(بشکریہ " معیار")

(بقیہ۔ تذکرے اور تبصرے)

ماہنامہ " تذکرہ " کراچی کا سالنامہ
قیمت:۔ اشاعت خاص ایک روپیہ چار آنے
صفحات ۲۱۲، ورق رنگین
سالانہ چندہ:۔ چار روپے

ماہنامہ تذکرہ کا سالنامہ بڑے آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس کا ہر مضمون اور ہر نظم اصلاحی اور تعمیری رجحان کی حامل ہے۔ مقالات میں غلام یعقوب انور کا " سائنسداں اور خدا " خوب ہے ماہر القادری نے " شاعری کا دوسرا رخ " کافی خوب صورتی سے پیش کیا ہے، عبید اللہ قدسی، سعد حسن یوسفی، علامہ تمنا عمادی، نعیم صدیقی اور گوپال متل کی تحریریں خاصی اپیلنگ ہیں۔ حصہ نظم میں اثر لکھنوی ماہر القادری، رشید کوثر فاروقی، تمنا عمادی اور ابو المجاہد زاہد کے نام قابل ذکر ہیں۔ افسانوں میں م۔ نسیم کا افسانہ " صدقہ " اچھا ہے م۔ نسیم کا یہ افسانہ پڑھنے کے بعد ان کے دوسرے افسانے پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ (م۔ ح)

التماس ہے کہ.....

(۱) اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا پورا پتہ لکھنا نہ بھولئے۔ بغیر پتہ کے کوئی نگارش قابل قبول نہ ہوگی۔

(۲) ادارہ " مشیر " ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کا ذمہ دار نہیں ہے اس لئے مضامین وغیرہ بھیجنے سے پہلے ان کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں

(۳) خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور بھیجئے

(منیجر)

شاہدہ جعفری •

سویرا

مجھ پہ الزام ہے رجعت کا پرستار ہوں میں
چند موہوم عقیدوں میں گرفتار ہوں میں
یعنی پابندئ مذہب کا طلبگار ہوں میں
مۓ توحید سے مخمور ہوں، سرشار ہوں میں
کیوں مرے لب پہ نہیں سرخ سویروں کا پیام
آتشیں کیوں نہیں پہلے کی طرح میرا کلام
اب بھی دُنیا پہ مسلط ہے وہی کہنہ نظام
محفلِ عیش میں اب تک ہے وہی بادہ و جام
ذہن و ادراک بدستور ہیں خواہش کے غلام
عقل و دانش پہ ہیں چھائے ہوئے مغرب کے امام
ظلم کا دور ہے نکبت کی گھٹا چھائی ہے
ناتوانوں پہ قیامت سی اُمنڈ آئی ہے
عصمتیں اب بھی بکا کرتی ہیں بازاروں میں
عدل پامال ہے انصاف کے درباروں میں

خونِ مزدور کی بس مانگ ہے زرداروں میں
آندھیاں ظلم کی چلتی ہیں چمن زاروں میں
مشغلہ عیش کا حکام سے کب چھٹتا ہے
لاکھ مزدور کی آہوں کا دھواں اٹھتا ہے
ہے درست آپ کی بات آپ کا ارشاد بجا
صبحِ مزدور پہ چھائی ہے فلاکت کی گھٹا
پھر بھی بیچارا ہے زردار کے کھونٹے سے بندھا
تاکہ مل جائے اسے پیٹ کے دوزخ کی غذا
فرقِ افلاس سے نکبت کی بلا ٹل جائے
کامرانی کا کسی طرح فسوں چل جائے
اپنے گلشن میں بھی اے دوست بہار آئے گی
غم نہ کھا وقت کی رفتار بدل جائے گی
نُور برسے گا، کلی عیش کی کھل جائے گی
آئے گی ایسی گھڑی اور ضرور آئے گی!

شبِ تاریک پہ انوار کا ڈیرا ہوگا
سُرخ ظلمات* نہیں سبز سویرا** ہوگا

فاطمہ صدیقی •

حمّام میں!

ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھلی۔ چادر سے منہ نکال کر دیکھا ٹرین بدستور ایک شور بے ہنگام کے ساتھ لڑکھڑاتی ہوئی چل رہی تھی۔ گھڑی پر نظر ڈال کر دیکھی آٹھ بج چکے تھے۔ گویا میں ڈھائی گھنٹے سویا۔ کل سارے دن اور رات کی دوڑ دھوپ کے بعد ٹرین میں ذرا آرام سے کمر ٹیکی تھی کہ نیند آگئی۔ نیچے نظر ڈالی سامنے دائیں طرف کی برتھ پر ایک صاحب بہادر سگار منہ میں دبائے انگریزی کے باتصویر رسالے دیکھنے میں منہمک تھے۔ دوسری برتھ پر ایک صاحب کھڑکی سے سر لگائے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اور ان کے نزدیک ہی داروغہ صاحبان (جو یقیناً سکنڈ کلاس میں بغیر ہی ٹکٹ بک تھے) بیٹھے سگریٹ پی پی کر گپیں لڑا رہے تھے۔

گو نیند ٹوٹ چکی تھی مگر طبیعت اٹھنے کو بالکل نہیں چاہ رہی تھی۔ ایک بازو کو تکیہ بنا کر دوسرا ہاتھ منہ پر رکھ کر میں نے نیند کو پھر بلانا چاہا۔ مگر داروغہ صاحبان کی اونچی آواز میں گفتگو یا بحث نے اس کو نہ آنے دیا۔ مجبوراً آنکھیں بند کئے بیٹھے بیٹھے ان کی گفتگو کا مزہ لینے لگا۔

ایک صاحب فرما رہے تھے "ارے یار کل کا اخبار دیکھ کر تو میرے ہوش اڑ گئے۔ مولویوں کی تقریریں سن کر میں مذاق اڑایا کرتا تھا۔ مگر اب تو واقعی حکومت نے بھی مان لیا۔"

"کیا؟" دوسرے نے پوچھا۔

"ارے تم کو خبر نہیں؟ کل کا اخبار نہیں پڑھا۔ توبہ توبہ اگر سچ مچ ہو گیا تو ہم لوگ کیا کریں گے؟"

"آخر کچھ منہ سے پھوٹو گے بھی۔ کیا چیز؟" دوسرے نے اکتا کر کہا۔

"ارے بگڑتے کیوں ہو۔ یہی یار کہ یہ اسلامی ملک ہوگا اور یہاں قرآن اور سنت کے مطابق قوانین بنیں گے۔ یار اسلامی قانون تو بڑا سخت ہے۔ جانے کون کہہ رہا تھا کہ چوری کی سزا ہاتھ کاٹ دینا ہے۔ میں نے تو جب سے یہ خبر پڑھی ہے بخار سا چڑھا ہوا ہے۔ اپنی تو مٹی پلید ہو جائے گی یار!"

"توبہ۔ توبہ۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ خدا جانے کوئی سخت آفیسر آگیا ہے۔ ابھی تو صرف مسودہ پیش ہوا ہے۔ تو ابھی سے ڈر گیا۔" دوسرے نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"اگر پاس ہو گیا تو؟" پہلے نے اور سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ایسے ہی پاس ہو جائے گا جو ممبر پاس کریں گے وہ خود کب اپنی رنگ رلیوں کو چھوڑنا پسند کریں گے۔ دیکھ لیجو کس کر مخالفت ہوگی اور خدانخواستہ اگر پاس بھی کر دیا تو میرے یار صرف لوگوں کو دکھانے کا پاس ہوگا۔ ورنہ کوئی اس پر عمل درآمد کرتا ہے۔ ایک بہانہ تراش کر اس کو ہمیشہ کے لئے کھٹائی میں ڈال دیں گے۔"

"نہیں یار تم ان مولویوں کو نہیں جانتے۔ تقریریں کر کے پھر اسلامی قانون کا بھی مطالبہ کر دیں گے۔!" میں نے ذرا سا ہاتھ سرکا کر دیکھا اس کا چہرہ بری طرح لٹکا ہوا تھا۔

"اگر کریں گے تو دیکھ لیجو سب بڑے گھر میں ہوں گے"! اس نے جوش میں ایک لمبا سا کش لے کر سگرٹ نیچے ڈال کر پاؤں سے مسلتے ہوئے کہا۔ "اور پھر اگر بن بھی گیا تو ہم کو کیا؟"

"کیوں؟ ارے یار پھر کہیں رشوت وشوت چلے گی؟" وہ مجسم سوالیہ نشان بن گیا۔

"نہ چلے میری بلا سے، میں نے تو ابھی سے بندوبست کر کے دو مکان شہر میں خرید لئے ہیں مجھے ان کا کرایہ ہی کافی ہے۔" اس نے بے اعتنائی سے کہا۔

"دو مکان" پہلے نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا: "اتنا کہاں
سے مار لیا؟"

"یہ کون سا ایسا زیادہ ہو گئے۔ ایک تو فسادات کے زمانے
میں کچھ رقم مل گئی تھی اس سے خرید لیا اور دوسرا یوں ہوا کہ ایک شخص
کے لونڈے کو ایک کیس میں پھنسوا دیا تھا۔ کچہری میں جب دوڑتے
دوڑتے پسینہ نکل گیا تب پہنچے میں نے کہا رشوت کی ایسی کی تیسی مجھے
ایک مکان کی اشد ضرورت ہے، تمہارے پاس دو دو ہیں بیچنا چاہو
تو خرید سکتا ہوں پہلے تو حامی نہ بھری مگر جہاں چھ مہینے تاریخوں پر
تاریخیں پڑوا کر دوڑانا شروع کیا تو اونے پونے بیچنا پڑا۔ ارے یار
ایک سے ایک ترکیب ہے اگر تم دارو غہ ہو کر بھی نہیں جانتے تو پولیس
کی نوکری چھوڑ کر کہیں ڈاکخانہ میں کر لو" وہ ہنسا۔

اس پر ان کو بھی تاؤ آگیا۔ بولے "ابھی تم مجھے کیا سکھاؤ گے
میں تو ایسی ایسی "ٹرک" جانتا ہوں کہ سن کر تمہارے منہ میں پانی
بھر آئے۔ ابھی پرسوں تھانے میں چار کنستر تیل ضبط ہو کر آیا تھا۔
سب گھر بھجوا دیا سوراخ کروا کر خالی کنستر رکھوا دوں گا اور لکھ دوں گا
بہہ گیا..... " چاول تیل تمہاری دعا سے آج تک نہیں خریدے
مگر ہاں کبھی کبھی خیال آجاتا ہے کہ بیٹا پکڑے گئے تو کیا ہوگا؟

"کون مائی کا لال پکڑے گا" اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑتے
ہوئے جواب دیا۔ ایس۔پی سالا خود بڑی بڑی مچھلیاں بغیر
ڈکار لئے ہضم کر جاتا ہے۔ ——"

"سنبھل کر" دوسرے نے ٹوکا "کسی نے سن لیا تو آفت
آجائے گی۔ آج کل چھپکلیوں کا زور ہے"

جو صاحب اخبار لئے بیٹھے تھے وہ خود ہی بولنے کے لئے
بیتاب تھے اس جملہ کو سن کر انہیں شبہ ہوا کہ شاید اشارہ انہیں
کی طرف ہو جھٹ سے بولے "جی میری طرف سے بے فکر رہئے میں
خود ..... کے آفس میں ملازم ہوں۔ میرے ہاں خود دن رات
یہی سلسلہ رہتا ہے۔ دلال۔ سیمنٹ۔ ادویات۔ لوہے وغیرہ کے
پرمٹ کی وجہ سے بس سمجھئے خود گھر پر آکر دے جاتے ہیں"

"اوہو۔ تو یوں کہئے کہ آج کل تو پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں
مگر سر بچا کر رکھئے گا" ایک نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہو ہو ہو" دوسرے صاحب نے بھی قہقہہ لگایا۔

"وہ صاحب تو خیر سو رہے ہیں مگر یہ کون ہے؟" میں نے
خاموش پڑے رہنا ہی بہتر سمجھا، دوسرا اشارہ صاحب بہادر کی
طرف تھا۔

پرمٹ والے صاحب بولے: "دیکھنے میں تو بنگالی معلوم
نہیں ہوتے"

ایک دارو غہ صاحب اٹھتے ہوئے بولے: "میں پوچھے
لیتا ہوں" پھر ذرا آگے بڑھ کر انھوں نے بڑے ادب سے پوچھا

"جناب کا وطن؟"

صاحب بہادر نے سگار سمیت ایک دفعہ منہ اٹھا کر دیکھا
پھر بڑے زور سے غرائے۔

"What ?"

دارو غہ صاحب کے لئے یہ جواب غیر متوقع تھا جھٹ پیچھے
ہٹ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

دوسرے دارو غہ شاید کچھ بلند ہمت تھے وہیں سے بیٹھے
بیٹھے زور سے چلا کر پوچھا۔

"Do You Know Bengali Sir?"

"No." صاحب بہادر نے دھوئیں کا ایک بڑا سا گولا اگلتے ہوئے
جھنجھلا کر جواب دیا۔

اطمینان کا سانس لے کر دونوں دارو غاؤں نے پھر اپنی
لامتناہی باتوں کا ذکر چھیڑ دیا۔

مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ میرے ایک بچپن کے ساتھی نے
پولیس میں ملازمت کر لی تھی۔ بہت دنوں کے بعد ایک دن جب
اس سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا۔ میاں یہ پولیس میں
بھرتی ہونے کے بعد تم لوگوں کی شرافت، اخلاق میل محبت
سب کہاں چلی جاتی ہے۔ تھانہ میں تم لوگوں کا برتاؤ دیکھ کر اچھا
خاصا آدمی پناہ مانگتا ہے۔ اس نے مجھے بڑی سنجیدگی سے بھلاتے
ہوئے جواب دیا تھا "تم نہیں سمجھتے یار۔ پولیس کا کام بڑی ——

مراد بنگلہ میں طنزاً مخبر کو "ٹکٹکی" یعنی "چھپکلی" کہتے ہیں۔ مجھے بھی یہ لفظ پسند آیا)

ذمہ داری کا ہوتا ہے۔ اگر عوام سے اس طرح کا برتاؤ نہ کیا جائے تو ان کے دلوں سے پولیس کا خوف ختم ہو جائے۔ جتنے چور بدمعاش ہیں سب سر پر چڑھ آئیں اگر لوگوں کے دلوں سے پولیس کا خوف اتر گیا تو سمجھو سرکار کا رعب داب ختم۔ کسی کسی ضلع مثلاً فلاں جگہ تو ہم نے یہ اصول بنا لیا تھا کہ جب تھانہ میں کسی اجنبی کو آتا دیکھو فوراً کسی کام میں لگ جاؤ۔ اور کچھ نہ ہو تو پرانا اخبار ہی اس طرح پڑھنے لگو جیسے تعزیرات ہند کے کسی خاص باب کا مطالعہ کر رہے ہیں اور سر اس وقت تک نہ اٹھاؤ جب تک اجنبی ایک پیکٹ سگرٹ میز پر نہ رکھ دے اور اگر کسی نے بغیر کچھ لئے دیئے ہی کام نکالنا چاہا تو بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ اگر عقلمند ہے تو پھر کبھی تھانہ کا رخ نہ کرے گا، اور نہ وہاں کے آدمی خیال کرتے ہیں کہ دارو غہ ڈرپوک اور بزدل ہے وغیرہ وغیرہ۔

دارو غاؤں نے گفتگو بھی کچھ اسی قسم کی تھی۔ دونوں اپنی اپنی ہانک رہے تھے۔ کس نے کتنے کا داؤ کا مارا۔ کتنوں کو بڑے گھر کی سیر کرائی، کون، کتنے چوروں سے حصہ طے کئے ہوئے ہے کس ڈکیت نے کتنا نذرانہ دیا۔ گفتگو اپنے شباب پر پہنچی ہوئی تھی کہ ٹرین کی رفتار آہستہ ہونی شروع ہوئی۔ پرمٹ والے بابو نے باہر جھانک کر دیکھا اور دارو غہ صاحبان سے کہا۔۔۔ "لو آگیا۔ آپ لوگوں کو یہیں اترنا تھا؟" "ارے" ایک صاحب جلدی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور سامان ٹھیک کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے نے کہا "ارے اتنی جلدی بھی کیا ہے جنکشن ہے اطمینان سے اتریں گے۔

جب گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچ کر رکی اور دارو غہ صاحبان اترنے لگے تو صاحب بہادر نے چرٹ منہ سے نکالتے ہوئے صاف بنگالی میں پوچھا "آپ لوگ یہیں اتریں گے؟"

جی ہاں۔ ایک نے جواب دیا۔ مگر آپ نے تو کہا تھا کہ آپ بنگلہ نہیں سمجھتے؟"

سمجھتا نہ سمجھتا۔ ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ انھوں نے کڑے تیوروں سے دونوں کو گھورتے ہوئے جواب دیا "میں۔۔۔۔ فلاں ایس۔ پی ہوں" آپ لوگ اس بیان پر دستخط کرنے سے قبل نہیں اتر سکتے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بیگ میں سے ایک صندوق ایک سفید کاغذ نکالا اور پانچ منٹ میں گھس گھس کرتے ہوئے ایک لمبا چوڑا بیان لکھ کر دارو غاؤں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ لو دیکھو جو کچھ اپنی کارستانیاں اتنی دیر سے سناتے رہے ہو اس کو میں نے اختصار سے لکھ دیا ہے۔ پڑھ کر جھٹ پٹ دستخط کر کے آپ لوگ جا سکتے ہیں۔

دونوں دارو غاؤں کا چہرہ فل اسکیپ کاغذ کی طرح سفید ہوتا جا رہا تھا جس پر چیچک کے داغ اور دھبے زبان حال سے بیان دیتے ہوئے محسوس ہوتے تھے دونوں کچھ دیر دم بخود کھڑے رہ گئے

ایس۔ پی صاحب نے پھر کرخت آواز میں کہا: "جلدی کرو میں اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں۔ توبہ توبہ آپ لوگوں کو شرم نہیں آئی۔ ملک کے امن و امان کی ذمہ داری آپ اس طرح لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔ تمہاری بدولت کتنے آج در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ کتنے شریف آدمی مر گئے کتنے ذلیل ہو کر زندگی گزار رہے ہیں۔ کتنوں گھر جلوا دیئے۔ ان کی آواز اور گرجدار ہو گئی۔ "تم جیسے لوگوں کی وجہ سے سارا محکمہ پولیس بدنام ہو گیا ہے۔ عوام چوری کی رپورٹ تک درج کراتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ تم جیسے لوگوں کو تو گولی سے اڑا دینا چاہئے۔

دونوں دارو غاؤں نے بھوں بھوں کرتے ہوئے ان کے پاؤں پکڑ لئے۔

سسکیاں لیتا ہوا ایک بولا۔ بچائیے حضور نوکری چلی گئی تو بیوی بچے بھوکے مر جائیں گے۔ ہم لوگوں کو معاف کر دیجے۔

"حضور!" دوسرے نے بلکتے ہوئے کہا "سب پولیس والے ہی ایسا کرتے ہیں غلطی سے آپ کے سامنے یہ باتیں منہ سے نکل گئیں"

"چپ رہو۔ صاحب دھاڑے" میں ایک لفظ سننا نہیں چاہتا۔ کیوں اس بیان پر دستخط کرتے ہو یا نہیں ورنہ پھر مجھے بھی یہیں اترنا پڑے گا۔ دوسروں پر ظلم ڈھاتے وقت یہ خیال نہ آیا کہ آگے کو اپنے بھی اولاد ہے۔ چور۔ بدمعاش، کمینے ۔۔۔ میں

تم لوگوں کو برخاست کروا کر چھوڑوں گا۔"
دھمکی کھا کر دونوں دارو غہ جلدی سے دستخط کر کے منہ لٹکائے نیچے اتر گئے۔
میں نے دیکھا پرمٹ والے صاحب کے چہرہ کا رنگ بھی فق ہے شاید اب ان کی باری آئے۔
یکا یک پھر دونوں دارو غہ اندر آئے۔ ایک نے ہاتھ جوڑ کر بڑی لجاجت سے کہا "حضور ہم غریب آدمی ہیں معاملہ آگے بڑھانے سے کیا فائدہ۔ اینٹی کرپشن والے تک حصّہ مانگتے ہیں ہمیں کیا بچتا ہے۔ پھر بھی پان سگرٹ کے لئے نذرانہ حاضر ہے۔۔۔۔"

یہ کہہ کر اس نے دوسرے کو اشارہ کیا۔ جس نے جلدی سے جیب کے دس کے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر بیگ کے نیچے کو رکھتے ہوئے کہا "اس وقت یہی قبول فرمائیے پھر کبھی خدمت کریں گے"
دارو غاؤں کی یہ جسارت دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ میں نے خیال کیا کہ اس مرتبہ پٹ کر جائیں گے۔ اور میں ایک گرجدار آواز کا منتظر تھا کہ یکا یک صاحب بہادر مسکراتے ہوئے بولے "اچھا جاؤ"
اور دوسرے لمحہ اس طویل بیان کے چھوٹے چھوٹے پرزے پلیٹ فارم پر ناچ رہے تھے۔ (ملک آفتاب مدنی)

تذکرے اور تبصرے

ماہنامہ "نئی نسلیں" لکھنؤ کا "خاص نمبر"

قیمت خاص نمبر۔ آٹھ آنے
سالانہ چندہ :۔ تین روپے۔

ماہنامہ "نئی نسلیں" لکھنؤ نے بہت ہی جلد تعمیری ادب کے حلقوں میں ایک مقام پیدا کر لیا ہے۔ اس پرچے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اسے تقریباً تمام فنکاروں کا تعاون حاصل ہے۔ پرچے کی ترتیب اور تزئین میں سلیقہ بدرجہ اتم جھلکتا ہے زیر تبصرہ شمارہ اس کا خاص نمبر ہے جس میں تعمیری ادب کے ممتاز اہل قلم کی نگارشات شامل ہیں۔ افسانوں کے حصے میں قیصر تمکین کا افسانہ "ہرڈنگی ہنرمینڈ" اور ابن فرید کا افسانہ "سانتا کلاز" بہت خوب ہیں۔ ان دونوں افسانہ نگاروں نے مقصد اور فن کے حسین امتزاج سے جو افسانے پیش کئے ہیں ان کی وجہ سے ہمیں ان فنکاروں کے مستقبل (اور ساتھ ہی ساتھ مقصدی افسانے کے مستقبل) سے بہت امیدیں وابستہ ہو گئی ہیں۔ لیکن ہمیں اسعد گیلانی صاحب سے کسی بہتر چیز کی توقع تھی "مساوات" کا پلاٹ ایک لطیفہ سے ماخوذ ہے جو کم از کم کراچی والوں کیلئے تو بہت پرانا ہو چکا ہے۔ مقالات میں شمسی فاروقی صاحب کا مقالہ "ذوق کا مسئلہ ادب میں" اچھا مقالہ ہے اگرچہ کہیں کہیں ان سے اختلاف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ دوسرا مقالہ "ماہر اپنی نظر میں" ہے۔ ماہر صاحب نہ صرف ہمارے حلقے کے بلکہ ہند و پاکستان کے چوٹی کے شاعروں میں ہیں ان کی شاعری پر اعتراضات کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا ہے جب سے انہوں نے اسلامی ادب کی ترجمانی شروع کی ہے اصل میں یہ کام تو ہمارے تنقید نگاروں کا تھا کہ وہ ان اعتراضات کی حقیقت کو واضح کرتے اور بتاتے کہ ان میں سے کتنے اعتراضات وزن دار ہیں اور کتنے بے بنیاد لیکن یہ حقیقت افسوسناک ہے کہ ہمارے نقادوں نے اس سلسلے میں اپنے فرائض کماحقہٗ سرانجام نہیں دیئے۔ اس مقالے میں ماہر صاحب نے خود ان اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ "فردوس" کی اشاعت کے بعد ہمارے نقاد اپنے فرائض سے مزید کوتاہی نہیں برتیں گے۔ نظموں اور غزلوں کا حصہ بہت جاندار ہے تقریباً تمام قابل ذکر شعرا کا کلام پرچے کی زینت ہے (عرشی بھوپالی اور شمیم جادید البتہ نہیں ہیں) سالنامے کی ایک خصوصیت "آوارہ گرد بچے" ہے۔ یہ ایک انگریزی کتاب کی تلخیص ہے اور سالنامے کے بائیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ امریکہ کی شہری زندگی کا یہ مسئلہ صرف امریکہ ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ ہر جگہ "جرائم پیشہ در اصل پیدا نہیں ہوتے بلکہ بنتے ہیں" آخر میں۔ ڈیڑھ صفحات پر مشتمل "مختصر تاریخ پاکستان" کے عنوان سے ایک دلچسپ فیچر پیش کیا گیا ہے بحیثیت مجموعی سالنامہ پیش کرنے پر ادارہ "نئی نسلیں" مبارکباد کا مستحق ہے۔

(ن۔ ع)

"الاعتصام" کا "حجیت حدیث نمبر"

قیمت خاص نمبر۔ ڈیڑھ روپے۔
سالانہ چندہ۔ چھ روپے۔
صفحات۔ ۹۶۔ سرورق رنگین۔

منکرین سنت رسولؐ احادیث نبوی کے خلاف جن ریشہ دوانیوں میں مبتلا ہیں ان کا اثر جدید تعلیم یافتہ افراد کے لئے سخت نفرت کا باعث ہو رہا ہے کیونکہ بالعموم ہمارے نوجوان صحیح مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ ایسے موقع پر جو شخص یا ادارہ منکرین سنت کے خیالات کا انسداد کرتا ہے وہ اصل میں فریضہ جہاد انجام دے رہا ہے

اس سعی و جہد کو واقعی خلوص نیت کے ساتھ انجام دینا ایک ایسی سعادت ہے کہ جس مومن کے حصہ میں آئے گی وہ انشاء اللہ آخرت میں رضائے الٰہی اور رسول اکرمؐ کی خوشنودی سے سرفراز ہوگا۔

جماعت اہل حدیث اپنی ابتدا ہی سے نیچریہ، چکڑالویہ، قادیانی منکرین حدیث وغیرہ کے خلاف جہاد کرتی رہی اور آج بھی — پرویزیت کے قلع قمع کی مہم میں یہ پیش پیش ہے۔

جریدہ "الاعتصام" کا یہ حجیت حدیث نمبر ان کوششوں کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور بلاشبہ بڑے سائز کے ۹۶ صفحات میں کافی ٹھوس مواد فراہم کر دیا گیا ہے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا مقالہ "حدیث نبوی کی تدوین اور حفاظت" اور مسند امام احمد بن حنبلؒ پر تمنا عمادی صاحب کے اعتراضات کے جواب میں مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف کا مضمون اعلیٰ تحقیقی معیار اور ریسرچ کے درجے تک پہنچے ہوئے ہیں آسٹریلین نومسلم محمد اسد کا مضمون کافی مدلل ہے اور انشاء اللہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے مفید ثابت ہوگا بقیہ مضامین بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں اور ان کو پڑھنے کے بعد کسی دیانتدار آدمی کے لئے منکر حدیث رہنا ناممکن ہوگا۔ (غ۔ع)

سالنامہ "تعمیر انسانیت" لاہور

قیمت سالنامہ:۔ دو روپے

سالانہ چندہ:۔ چھ روپے

مختلف جگہوں کے ادیبوں اور فن کاروں کی رنگا رنگ کاوشوں اور جگر سوزیوں کے بوقلموں گلدستہ کو بڑے قرینے سے سجایا گیا ہے۔ یہ وہ ادیب ہیں جو اخلاقی اقدار کے قائل اور مذہب کی راہنمائی کو انسانیت کے ارتقاء اور دنیا کی بھلائی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ کوثر نیازی اور عبد الحمید قابل مبارکباد ہیں ایک بہت ہی نمایاں چیز پر توجہ نہیں دی گئی وہ یہ کہ اس شگفتہ گلدستہ کو جس کاغذ میں لپیٹ کر لوگوں تک پہنچایا گیا وہ اس کے شایان شان نہیں۔ پہلی نظر میں تو یہ گمان ہوتا ہے کہ کوئی بہت پرانی شے ہے لیکن اس کی تازگی اس خیال کی تردید کر دیتی ہے پھر بھی یہ شبہ باقی رہ جاتا ہے — کہ دعائے گنج العرش قسم کی کوئی نئی طبع شدہ چیز ہے۔ درصل سرورق اس روح کی نمائندگی کرتا ہے جو کسی پرچہ میں جاری و ساری ہوتی ہے۔ تعمیر انسانیت کے ٹائیٹل پیج میں یہ بات بالکل نہیں پائی جاتی

مقالات کا حصہ سب سے اچھا ہے۔ نعیم صدیقی کا مضمون ہمارا ادب خوب ہے۔ اس مضمون میں (mind) کے لئے لفظ مواد کا انتخاب اور اس کا بار بار استعمال کھٹکتا ہے۔ عبد الحمید صدیقی، سید اظہار حسن اور محمد عثمان رمز کے مضامین اچھے ہیں۔ مغربی تہذیب اپنے آئینہ میں، اسلام کا تصور رزق اور صحت ابراہیمی اقتباسات کی بدولت معلومات سے پر ہیں۔ اس حصہ میں ہمیں سب سے زیادہ جس چیز پر تعجب ہوا وہ کوثر نیازی صاحب کا زر گل لے دیباچہ کو ان ہی کے ترتیب دیئے ہوئے شمارہ میں شائع کروانا ہے اور یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی جیسے بزرگ کو ان کانٹوں میں گھسیٹا جائے۔

دوسرے درجہ پر نظموں کا حصہ ہے۔ نعیم صدیقی عارف عبد المتین اور مظہر الدین کی نظمیں اچھی ہیں۔ "ایسا نہ کرو" طویل میں ہونے کی وجہ سے اس کے مصرعوں میں موسیقی کے گیتوں کی سی ہم آہنگی ہے۔ نظم کے ارتقاء کی فنی خوبی، اس کا نقطہ عروج (جس پر نظم ختم ہوئی) ہے جو اس نغماتی زیر و بم سے مل کر دوہرا شدید تاثر پیدا کرتا ہے۔ گوپال متل نے آنند نرائن ملا کے شعر پر خوب تضمین کی ہے۔

غزلوں کے حصہ کی کوئی نمایاں خصوصیت نہیں، احسان دانش نیر واسطی اور انور صدیقی غنیمت ہیں۔ افسانوں اور ڈراموں کا حصہ بالکل سپاٹ ہے سب سے پہلے افسانہ سنجوگ، کے بارے میں ایک ادارتی نوٹ ہے جس کا اولین جملہ ہے "زیر نظر طویل مختصر افسانہ لالہ صحرائی کا "نقش شہ پارہ" ہے" قاری اس ادارتی تحریر پڑھنے کے بعد اس طویل مختصر افسانہ کو پڑھنے کا بیڑا اٹھاتا ہے مختلف (Loose Connected) بیانات بعض لطیفوں اور کہانی کے مصنوعی ارتقاء کے ریگزاروں میں سے گذرتے ہی اسے اس "شہ" کی کا بڑا شدید احساس ہوتا ہے ———— اس حصہ میں ام نسیم کا افسانہ "لطیف احمد شیرازی" بہت اچھی چیز ہے۔

(ج س)

"ماہنامہ" حریم " لکھنؤ

ماہنامہ "حریم " لکھنؤ ـــــ چندہ سالانہ پانچ روپیہ

مدیر:۔ بیگم سلیم انہونوی اور عزالہ بیگم نسیم انہونوی۔

ماہنامہ "حریم " پڑھی لکھی خواتین کا محبوب ماہنامہ ہے۔ سالہائے گزشتہ کی طرح امسال بھی ادارہ حریم نے حریمی بہنوں کی خدمت میں سالنامہ حریم ۵۶ء ایک تاریخی ناول کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ناول "نواب قدسیہ بیگم" خان محبوب طرزی صاحب کی تازہ ترین تصنیف ہے جسے انھوں نے کافی تحقیق اور مطالعہ کے بعد تحریر فرمایا ہے۔ یہ ناول ایک ایسی وفا پرست خاتون کی داستان حیات ہے جس نے سلطنت کو بھی ہیچ سمجھا۔ اور وہ کارنامے انجام دیئے جو تاریخ اودھ کے صفحات پر ہمیشہ روشن رہیں گے۔ ناول کے پلاٹ اور انداز بیان کے سلسلے میں طرزی صاحب کا نام ہی کافی ہے۔

ٹائیٹل پیج اگر بالکل سادہ ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔

خاص نمبر کی قیمت تین روپیہ ـــــ (ف۔ س)

کیا جماعت اسلامی حق پر ہے؟

از عبدالرحیم اشرف۔

ضخامت ۴۴۴ صفحات۔ کتابت، طباعت، اور گردوپیش بہت دیدہ زیب۔

قیمت مجلد دو روپے بارہ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ تہذیب ملت۔ لائل پور۔

زیر تبصرہ کتاب مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ ابتدأ اس میں جماعت اسلامی کے خلاف سابقہ اور حالیہ مخالفتوں کا تجزیہ کیا گیا ہے اور اس کے نتائج پر گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں تفصیل کے ساتھ مسئلہ زیر بحث پر گفتگو کی گئی ہے اور جو اعتراضات دستور جماعت اسلامی پر کئے گئے تھے ان کا تحقیقی جواب دیا گیا ہے۔ اس حصہ میں جماعت کے عقائد اور اس کے نصب العین پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جماعت اسلامی کا مقصد بعینہ وہی ہے جس کی تکمیل کے لئے انبیا علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات تشریف لائے تھے۔ کتاب کا تیسرا جز علمائے حجاز، فلسطین، مراکش مصر اور دمشق کے نامور علمائے کرام کے فتاویٰ پر مشتمل ہے، یہ فتاویٰ اس سوالنامہ کے سلسلہ میں موصول ہوئے ہیں جو مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور بعض دوسرے حضرات کے فتاویٰ سامنے آنے کے بعد ترتیب دیا گیا ہے۔ اس سوالنامہ میں وہ عبارت بجنسہ، درج کی گئی تھی جسے مولانا مدنی نے اپنے مکتوب گرامی میں جماعت اسلامی کے کفر تک پہونچانے والے عقیدے کی ثبوت کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ ان علما نے نہایت صفائی کے ساتھ اپنی رائے پیش کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی پر عائد کئے گئے الزامات سراسر لغو اور بے بنیاد ہیں۔ چوتھے حصے میں ہندوستان کے علماء کرام کے فتاویٰ ہیں اور پانچواں حصہ علمائے پاکستان کے فتاویٰ پر مشتمل ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں "اتمام حجت" کے عنوان سے وہ جوابات پیش کئے گئے ہیں جو ادارہ "تہذیب ملت" کے مرتب کردہ سوالات کے جواب میں ان حضرات نے دیئے ہیں جنہوں نے جماعت اسلامی کا دستور مرتب کیا تھا۔ اور جماعت کی پالیسی کو بنانے میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان جوابات میں یہ بات صاف بیان کردی گئی ہے کہ جماعت کا عقیدہ احترام رسالت اور اکرام صحابہ و علماء سلف کے بارے میں بعینہ، وہی ہے جس پر تمام امت متفق ہے۔ ان تصریحات کے بعد کسی بھی دیانتدار، خدا ترس اور عنداللہ مسئولیت پر یقین رکھنے والے شخص کے لئے اس امر کا امکان باقی نہیں رہ جاتا کہ وہ جماعت اسلامی کے دستور کے وہ معنی بیان کرے جن سے انکار انبیاء اور توہین صحابہ کا کوئی پہلو نکلتا ہو ہم ایسے تمام افراد سے جو جماعت اسلامی کی صحیح پوزیشن کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ پرزور گذارش کریں گے کہ وہ اس کتاب کو حاصل کر کے ضرور مطالعہ فرمائیں۔ انشاءاللہ اس کے بعد وہ کسی آخری فیصلہ پر آسانی سے پہنچ سکیں گے۔

(ف۔ س)

(باقی صفحہ ۸۸ پر دیکھیے)

1956 Phone 7... Regd. No. S. 1375

Monthly "MUSHIR" Karachi

Printed at Mashhoor Press, McLeod Road, Karachi.

بلند معیاری
ی کے سبب حاذق دواخانہ کی تیار کردہ یونانی ادوی
مشہور اور مقبول عام
ہیں
MAZMEE
حاذق کا
مفرح فولادی
نیا اور تازہ خون پیدا کرتا ہے۔ وزن
بڑھاتا ہے اور ہڈیوں کو مضبوط
کرتا ہے۔ قوت اور طاقت بخشتا ہے
کھانا ہضم کرکے بھوک بڑھاتا ہے
(خوراک)
کھانیکا ایک چمچہ روزانہ دو تین دفعہ
کھانا کھانے کے بعد استعمال کیجئے
بچوں کے لئے نصف خوراک۔
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی پاکستان
منیجر
حاذق دواخان
بندر روڈ۔ کراچی نمبر

محمد عمر برنی •

پتھر کا سفر

(چیخوف کے ایک افسانے کا بالکل دوسرا تعمیری پہلو جو اسے نظر نہ آسکا)

پتھر سڑک پر پڑا تھا۔ ایک لڑکا آیا اور اس نے اسے دور پھینک دیا۔ "پڑے پڑے تکلیف ہوتی تھی۔ میں نے اڑنا چاہا سو اڑ گیا" پتھر نے دل ہی دل میں سوچا۔ کھٹ، کھٹاک .... اور پتھر ایک کھڑکی کے شیشہ سے ٹکرا گیا۔ "سو رکھیں کا۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا" شیشہ نے کہا اور چور چور ہو گیا۔ پتھر بڑبڑایا "میرے راستہ میں آنے کا نتیجہ" اور وہ کمرہ کے اندر ایک بستر پر جا گرا۔ "اوہ! کتنا تھک گیا ہوں میں۔ آخر اتنے لمبے سفر کے بعد آرام کی بھی ضرورت ہے" وہ خوش ہو کر بولا۔

گھر کی ماما تھوڑی دیر بعد کمرہ صاف کرنے آئی۔ اس نے پتھر کو باہر پھینک دیا اور وہ باہر پتھروں کے ڈھیر پر جا گرا۔

"دوستو! میں نے ایک طویل سفر کیا ہے اور اپنے ہمجنسوں کو دیکھ کر خوش ہوں" یہ کہہ کر وہ مسکرا دیا۔

اتنے میں کچھ مزدوروں نے اسے دوسرے پتھروں کے ساتھ سیمنٹ بنانے کی مشین میں ڈال دیا۔

"ارے میں اب پس جاؤں گا" اور وہ رو پڑا

"کیوں کیا ہوا، بھلائی کی خاطر قربانی بھی تو کرتے ہیں" اس نے کہنے والے کو تعجب سے دیکھا

کھٹ، کھٹ، کرا، کریک، کر، اور وہ سب پیس دیئے گئے + ("معیار")

اصلاحی ادب کا ڈائجسٹ

(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ماہنامہ مُشیر کراچی

ٹیلی فون: ۷۹۲۳

جلد: ۷ — شمارہ: ۹

ستمبر ۱۹۵۶ء

مرتبہ
عبدالغفور بیگ

فی پرچہ: آٹھ آنے
سالانہ: پانچ روپے

بھارت میں ترسیل زر کا پتہ: سہ روزہ "الحسنات" رام پور (یوپی) بھارت

(پرنٹر پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ "مشیر" بندر روڈ، کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا۔ (کتابت: عابد سعید)

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مصری آمریت کا ایک اور شکار

مفسرِ قرآن عبدالقادر عودہ شہید کے غم میں ابھی آنکھیں خشک بھی نہ ہوئی تھیں کہ "التصویر الفنی فی القرآن"، "فی ظلال القرآن" اور "العدالتہ الاجتماعیہ فی الاسلام" کا مصنف بھی زندان مصر کی سلاخوں کے پیچھے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گیا۔ اس مترجم قرآن اور صاحب عزم اللسان کو اخوان المسلمون کے اور دوسرے مجاہدوں کے ساتھ نعرۂ حق کی پاداش میں جن سنگین مظالم کا شکار ہونا پڑا اس کی تفصیل سنگریزوں کا جگر آب کر دینے کے لئے کافی ہے۔ وہ سر جو ذاتِ باری کے سوا کسی ہستی کے سامنے جھکنے پر راضی نہ تھا اسے سفاک نوجیوں کے جوتوں کا نشانہ بننا پڑا، وہ ہاتھ جنھوں نے تبلیغ حق کے لئے درود جن کتب تصنیف کی تھیں، انھیں بازوؤں تک مروڑ کر ناکارہ کر دیا گیا؛ وہ قدم جو راہ حق کے علاوہ کسی بھی جادہ پر مڑنے سے منکر تھے، انھیں سدھے ہوئے شکاری کتوں نے منہ میں دبا کر جیل کی پوری چہار دیواری میں گھسیٹا؛ وہ فاقی جسم جوان مظالم کا ہدف بن کر بخار سے تپنے لگا تھا، اسے پگھلے ہوئے برف سے لبریز حوض میں دبا دیا گیا اور جب اس سلوک نے اس مردِ مجاہد کے پھیپھڑے چھلنی کر دیئے تو اسے سِل کے مریض کی حیثیت سے صرف چند دن جیل کے ہسپتال میں رکھ کر دوسرے رفقائے سفر کے ساتھ سیوہ کے دشتِ بے آب وگیاہ میں منتقل کر دیا گیا جہاں اس داعیٔ حق نے جان شیریں جان آفریں کے سپرد کی اور جانشینانِ فرعون کی کم مائگی اور بے بضاعتی پر مسکراتا ہوا رحمتِ الٰہی کی آغوش میں جا پہونچا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ سید قطب کی شہادت راہ حق کے تمام سپاہیوں کے جوش ولولے کیلئے ایک تازیانہ ہے اور تمام دنیوی آرام و آسائش سے منہ موڑ کر حیاتِ ابدی کا سکون و اطمینان تلاش کرنے کی دعوت ———— خود مصر کے موجودہ خودکار آمروں کے لئے ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ بادشاہوں سے چھینی ہوئی جاگیروں کو تقسیم کرکے مصر کے تمام "فلاحین" کو جاگیردار کیوں نہ بنا دیں، رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لئے مصر کے ہر گھر کو بادشاہ کے خزانہ سے کیوں نہ پاٹ دیں، نہر سویز پر دائمی قبضہ حاصل کرکے تمام عرب والشیائی ممالک کی ہمدردیاں کیوں نہ حاصل کرلیں، اسلحہ اور فوجی ساز وسامان فراہم کرکے مصر کو ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ کیوں نہ بنا دیں، اُنکے یہ تمام اقدامات ان مظالم کا کفارہ نہیں ہو سکتے جو انہوں نے اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے پیش کرنے والی جماعت اخوان المسلمون کے ساتھ عبدالقادرؒ کی شہادت سے اب تک دو سال کے عرصہ میں کئے ہیں خدا کے دربار میں ان کا حشر چنگیز، ہلاکو اور خود مصر کے سابق شاہ فاروق سے مختلف نہ ہوگا، کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ:

"اگر ایک مسلمان کے خون میں صرف دنیا ہی نہیں آسمان کی مخلوق بھی شریک جرم ہو، تو
غیور و قہار خدا اس تمام مخلوق کو اوندھے منہ جہنم میں گرا دیگا اور اس بات کی ذرہ برابر بھی
پروا نہیں کریگا کہ وہ سب کے سب آگ میں جل رہے ہیں اور انھیں نجات حاصل نہیں ہوگی"

علامہ رضا علی وحشت مرحوم

گزشتہ ماہ کے پرچہ میں ہم نے علامہ وحشت کلکتوی کی علالت پر تشویش کا اظہار کیا تھا۔ پرچہ ابھی پریس ہی میں تھا کہ ڈھاکہ سے علامہ کی رحلت کی اطلاع موصول ہوئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ علامہ کی وفات اُردو اور اس کے ساتھ پاکستان کے لئے ایک ناقابلِ تلافی قومی حادثہ ہے۔ اس غم والم کے موقع پر یہ امر اطمینان کا موجب ہے کہ حکومت مشرقی پاکستان نے مرحوم کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کو وظیفہ دینے کا فیصلہ کیا تھا — جس کا اعلان ان کی زندگی میں نہیں ہو سکا تھا اُمید ہے کہ یہی رقم اب مرحوم کے پسماندگان کی اعانت پر صرف کی جائیگی۔ نیز حکومت ادبی حلقوں کے اس مطالبہ پر بھی توجہ دیگی کہ ڈھاکہ میں علامہ کی یادگار کے طور پر اُردو کا کوئی بڑا مرکز قائم کیا جائے تاکہ پاکستان کے اس حصہ میں مولانا نے زبان وسخن کی جو قندیلیں روشن کر رکھی تھیں۔ ان کی روشنی مدھم نہ ہو۔

شمیم جاوید •

زندگی سے

(انیس نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی زندگی کے بارے میں کچھ لکھوں۔ میں نے اپنے تنہائی کے لمحات میں زندگی کو آواز دی ——— اور وہ میرے سامنے تھی)

اے مری زندگی! میں نہیں جانتا
میرے پیکر میں تو کس طرح ڈھل گئی
جسم میں روح تحلیل کیوں کر ہوئی؟
میری ہیئت کی تشکیل کیوں کر ہوئی؟
ہم کہاں پر ملے اور کیسے ملے؟
بطنِ مادر میں یا آسماں سے پرے؟
چیستاں ہے ابھی تک یہ میرے لئے؟

•

زندگی ——! وہ ترا الھڑا اوّلیں
کھو گیا ہے کہیں —— یاد آتا نہیں

•

ہاں مگر ——— عہدِ طفلی کی پرچھائیاں
حلقۂ احساس پر جھلملاتی تو ہیں ——
دھندلے دھندلے مناظر ابھرتے تو ہیں
کچھ حسیں صورتیں یاد آتی تو ہیں ——

•

"وہ ہوائیں" جو کرتی تھیں سرگوشیاں
آج تک اُن ہواؤں کا احساس ہے
خوشنما پھول! اُڑتی ہوئی تتلیاں
اُن کا رنگیں تصور مرے پاس ہے
لہلہاتی ہوئی دھان کی بالیاں
گنگناتی ہوئیں! مُسکراتی ہوئیں
چاند ——— مجھ کو تھپک کر سلاتا ہوا
صبح ——— سُورج کی کرنیں جگاتی ہوئیں

•

..... ہاں مگر ——— لمحے زنجیر بنتے گئے
میں حسیں "خُلد" سے دُور ہوتا گیا!
وقت نے میری معصومیت چھین لی ——
اجنبی رہگزاروں میں کھوتا گیا!

•

یاد ہوگا ابھی تک تجھے ——— زندگی!
جب روپہلی محبت نے انگڑائی لی
آرزوؤں کے غنچے چٹکنے لگے ——
دو نگاہیں ملیں —— دل دھڑکنے لگے
مجھ پہ جیسے مسرت کے در کھل گئے
جیسے ماحول عنبر فشاں ہوگیا

جیسے کون و مکاں رنگ میں گھل گئے
اور تو "خواب آسا حقیقت" ۔۔۔ بنی
اپنی ہستی پہ خود پیار آنے لگا
میری دنیا ۔۔۔ مسلسل محبّت بنی

●

ایک بے نام سی جستجو تھی مجھے ۔۔۔
ذہن ۔۔۔ رنگین سپنوں سے معمور تھا
اب یہ احساس ہوتا ہے اکثر مجھے
اپنی منزل سے میں کس قدر دُور تھا

●

ایک بے نام سی جستجو تھی مجھے
جستجو ۔۔۔ جو مجھے کُو بہ کُو لے گئی
دشت و صحرا میں، وادی میں، کہسار میں
شرق میں، غرب میں، چارسُو لے گئی

●

سیم و زر کے خداؤں کے دربار میں
تنگ باہوں میں اور گرم آغوش میں
زلف کی چھاؤں میں، عکسِ رخسار میں
صحبتِ مے کشانِ بلانوش میں

●

...... الغرض زندگی ہم عناں تُو رہی
تلخ و شیریں زمانہ کے حالات میں
عمر کی منزلوں سے گزرتے رہے
ہم، یونہی ہات ڈالے ہوئے ہات میں

.... اور پھر ۔۔۔ تُو نئے موڑ پر آگئی!
وقت کے بہتے پانی کے آئینے میں
مسخ چہرے کو دیکھا ۔۔۔ تو شرما گئی
اور مرے ذہن میں جیسے گونجی صدا
(تیرا قاتل ہوں میں ۔۔۔ تیرا قاتل ہوں میں)
میں نے تجھ کو ہوس کے کھلونے دیئے
مرمریں بازوؤں کے بچھونے دیئے!
تجھ سی ۔۔۔ انمول شے کو لٹاتا رہا ۔۔۔
زہر کو شہد کہہ کر پلاتا رہا ۔۔۔
رُوح زخمی رہی، جسم رقصاں رہا
میں اندھیری فضاؤں میں پرّاں رہا!

●

...... اور میں نے سُنی پھر اذانِ سحر
وہ اذاں ۔۔۔ جس سے ہلتے ہیں کوہِ گراں
وہ اذاں ۔۔۔ جس سے لرزاں ہیں کون و مکاں
وہ اذاں ۔۔۔ جس میں تعمیر کا راز ہے
جو محمّد کے سینے کی آواز ہے
وہ اذانِ سحر ۔۔۔ میں نے آخر سنی
اور ترے رُخ پہ جیسے نکھار آگیا
وقت لے کر پیامِ بہار آگیا
اس طرح تُو نیا موڑ اک مڑ گئی

●

اے مری زندگی! میں نہیں جانتا
میرے پیکر میں تو کس طرح ڈھل گئی

ہم کہاں پر ملے؟ اور کیسے ملے؟
چیستاں ہے ابھی تک یہ میرے لئے!
ہاں! مری زندگی! میں نہیں جانتا
(جانتا ہوں مگر ـــ ہے جدائی اٹل
چھین لے گی تجھے ـــ مجھ سے آکر اجل
اور میں ـــ سرد سی لاش ہو جاؤنگا)

●

میں نہ دیکھوں گا شاید، جہانِ سحر
اک بشارت ہے جس کی، اذانِ سحر
یوں اجل کے اندھیروں میں کھو جاؤں گا

●

اے مری زرد رُو! خستہ جاں زندگی!!
اپنے دامن میں بڑھ کر چھپالے مجھے

چند لمحے اجل سے بچالے مجھے
ہاں! میں اس وقت مرنا نہیں چاہتا
یوں مجھے تجھ سے کوئی محبت نہیں
موت سے بھی مجھے کوئی نفرت نہیں
پھر بھی ـــ اس وقت مرنا نہیں چاہتا!

●

دل میں اک آرزوں کا طوفان ہے
منتظر ہیں نگاہیں بہت دیر سے
صبحِ نَو کی حسیں روشنی کے لئے
رُوح سے اُٹھ رہی ہے مُسلسل صدا
"اس سے پہلے کہ میں آخری سانس لوں
اس سے پہلے کہ دامن ترا چھوڑ دوں
کاش! وہ آنے والی سحر دیکھ لوں"

(چراغ راہ)

اکبر زمزم بی۔اے●

حریم دل پہ نگاہوں کا وار کیا ہوگا
یہ حوصلہ اب انھیں بار بار کیا ہوگا

کلی میں رنگ گلوں پر نکھار کیا ہوگا
مٹے بغیر نظامِ بہار کیا ہوگا

یہ اور بات ہے اندازِ جور بدلا ہو
ستم شعار، تغافل شعار کیا ہوگا

گلوں کے ذوقِ تبسم کو چھیڑنے والو
یہ زرد پڑ گئے تو رنگِ بہار کیا ہوگا

وہ ہیں شعائرِ گلچیں سے بے خبر شاید
جو کہہ رہے ہیں ستم بار بار کیا ہوگا

جب انقلاب کی شورش ہو اس زمانے میں
گلوں کو نظمِ چمن میں قرار کیا ہوگا

ہوا و حرص کے ناپاک دور میں زمزم
مسرتوں سے کوئی ہمکنار کیا ہوگا

نجات اللہ صدیقی •

سید قطبؒ

مصر کی ناصر حکومت نے آج ایک اور سیاسی حریف کو شکار کر لیا لیکن اس کے شکار کا طریقہ وہ نہیں تھا جو پہلے پانچ شکاروں کے بارے میں اختیار کیا گیا۔ ان پر عدالت میں مقدمہ چلا کر پھانسی دی گئی تھی۔ سید قطب کو جیل میں طرح طرح کی اذیتیں دیکر مار اگیا اِنّا للہ وَاِنّا الیہِ راجعون۔ ناصر حکومت نے یہ راہ غالبًا اس لئے اختیار کی ہوگی کہ اس طرح "مرنے" والوں سے دنیا بے خبر رہے گی ——— اور حکومت مصر بدنامی سے بچ جائیگی لیکن ظلم خود اپنی زبان سے بولتا ہے ——— آستین کا لہو خود گواہی دیتا ہے۔ کاش ناصر حکومت اپنے حقیقی خیرخواہوں اور بدخواہوں میں تمیز کر سکتی!

برسردار جام شہادت نوش کرنے والے عبدالقادر عودہ کے غم سے ابھی دنیائے اسلام فارغ بھی نہ ہوئی تھی کہ فراعنہ کے جیل سے سید قطب کی روح بھی اپنے رب کی طرف پرواز کرتی نظر آئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سید قطب کی شخصیت، ان کی خدمات اور جن حالات میں ان کی وفات ہوئی کوئی ایسے موضوعات نہیں جن پر کوئی رسمی مضمون لکھا جا سکتا ہو۔ تحریک اسلامی کے کارکنوں کے لئے وہ ایک بےمثال رفیق تھا ہم ہی میں سے ایک اور ہمارا جس کے دل کی دھڑکنوں کو ہم عرصہ سے محسوس کرتے رہے ہیں جس کے جذبات کا وفور جس کے شوق کی شدت جس کے عشق کی گہرائی اور سوز و گداز کی بے پناہی ہمارے لئے ہمیشہ نمونہ رہی ہے جس کی تحریروں نے ہمیں اسلام کا حقیقی فہم عطا کیا ہے اس کی زندگی نے ہمیں ہمیشہ اخلاص کا درس دیا ہے۔ ایسا شفیق استاد ایسا متاثر کن مربی آج ہم سے جُدا ہو گیا۔ اسے باور کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

لیکن یہ صحیح ہے۔ فرعونی مصر میں آہنی سلاخوں کے پیچھے سید قطب کا انتقال ہو چکا ہے ہمیں سید قطب کی وفات کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کر لینا ہے یہ جانتے ہوئے کہ سید قطب کون تھا

سید قطب کے حالات زندگی ہمیں پوری صحت اور تفصیل کے ساتھ نہیں معلوم۔ تحریک اسلامی کے لکھنے والوں کو ابھی نئی اسلامی شخصیتوں کی طرف اتنی توجہ کا بھی موقع نہیں ملا ہے کہ ہم انکے لٹریچر اور ان کے اخبارات سے اس سلسلہ میں ضروری تفصیلات جمع کر سکیں۔ خوش قسمتی سے سید قطب اخوان المسلمون کی ان شخصیتوں میں سے تھے جن کی بیشتر تصانیف ہم تک پہنچ چکی ہیں اور جن کی بات ہندوستان سے مصر جا کر آنے والوں سے ہم تھوڑی بہت معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ انتظار ہے کہ ان سے قریبی ربط رکھنے والے اصحاب تفصیل سے ان کے حالات زندگی سامنے لائیں۔

سید قطب کا سن ولادت ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ ہے۔ اس طور پر انھوں نے تقریبًا ۵۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔ والد کا نام بھی قطب تھا۔ آباؤ اجداد اصلًا مصر کے رہنے والے نہ تھے۔ بلکہ چار پانچ پشت پہلے باہر سے ہجرت کر کے یہاں آبسے تھے ایک روایت کے بموجب ان کے آباؤ اجداد کا تعلق پنجاب سے تھا اور دوسرا خیال ہے کہ وہ انڈونیشیا سے آئے تھے۔ البتہ آپ کی والدہ عربی النسل تھیں۔

آپ اپنے والد کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔ جہاں تک ہماری معلومات ہیں آپ کے صرف ایک بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ بھائی

محمد قطب آپ سے عمر میں دس سال چھوٹے ہیں علم وادب خاندانی ورثہ معلوم ہوتا ہے۔ استاذ محمد قطب بھی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سب سے مشہور کتاب "الانسان بین المادیۃ والاسلام" ہے جس کا موازنہ سید قطب مرحوم کی العدالۃ الاجتماعیۃ سے کیا جاتا ہے۔ بہنیں بھی صاحب قلم ہیں اور اسلام سے گہرا تعلق رکھتی ہیں

سید قطب مرحوم ابھی مجرد ہی تھے

سید قطب کو بہت بچپن ہی میں قرآن شریف حفظ کرادیا گیا تھا۔ غالباً ان کے چھوٹے بھائی بھی حافظِ قرآن ہیں۔ اپنے بچپن کے ایک واقعہ کے ضمن میں اپنی والدہ کی شفقت اور دینی شغف کا خاص طور پر ذکر کیا ہے[1]۔

مختلف تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں ابتدا ہی سے قرآن سے شغف تھا۔ بالخصوص ادبی لحاظ سے' ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بارے میں اور معلومات نہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے انھوں نے کلیہ دارالعلوم قاہرہ میں داخلہ لیا اور یہیں سے بکالوریہ (B. A.) کی ڈگری حاصل کی۔ یہ کالج لادینی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ کرتا ہے اور اب قاہرہ یونیورسٹی (سابق جامعہ فواد) سے متعلق ہوگیا ہے۔ تعلیم کا سلسلہ غالباً یہیں پر ختم ہوگیا۔ اس کے بعد آپ انسپکٹر آف اسکولس کی حیثیت سے حکومت مصر کی ملازمت میں آگئے اور سنہ ۴۸ء و سنہ ۱۹۴۹ء میں طریقۂ تعلیم کے مطالعہ کے لئے حکومت مصر کی جانب سے امریکہ تشریف لے گئے اور غالباً دو سال وہاں قیام رہا۔ آپ کی تصنیفی صلاحیت' شعر وادب کی طرف قوی رجحان۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں ابھر کر سامنے آچکا تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانہ سے ہی صحافت اور شاعری کے میدان میں کافی سرگرم نظر آتے ہیں۔ امریکہ سے واپسی پر ملازمت سے آپ کا تعلق کب تک قائم رہا۔ یہ ہمیں نہیں معلوم لیکن العدالۃ الاجتماعیہ کے سن تصنیف (۱۹۵۰ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو زیادہ تر شغف تحقیق وتصنیف سے ہی رہا۔ اخوان المسلمون اور فی الجملہ اسلامی تحریک سے سرگرم تعلق کا زمانہ آغاز بھی یہی ہے اخوان المسلمون کے باقاعدہ رکن آپ غالباً سنہ ۱۹۵۴ء میں ہوئے ہیں اور رکن ہوتے ہی مسلسل آزمائشوں میں مبتلا ہوتے رہے۔ پہلی بار ۱۴ جنوری سنہ ۵۴ء سے مارچ سنہ ۵۴ء تک اور اب اکتوبر سنہ ۵۴ء سے وفات تک (۲۰ ماہ) جیل میں رہے۔ انتقال کی خبر قاہرہ سے ۲۹ جون کو چلی ہے۔ انتقال غالباً اس سے چند روز قبل ہوا ہے۔

شعر وادب اور فکری ارتقاء

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے آپ صحافت اور شاعری کے میدان میں زمانہ تعلیم ہی سے سرگرمی دکھانے لگے تھے۔ اساتذہ کو اس غیر معمولی صلاحیت کے طالب علم کے کیریر (Career) کا بہت خیال رہتا تھا کبھی ایسا بھی ہوا کہ صحافت اور شعر وادب کی دنیا میں محو ہو کر یہ امتحان کو بھلا بیٹھے۔ حاضری بہت کم ہوگئی۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار اور ہمدرد اساتذہ کو تلاش وجستجو کے بعد انہیں برآمد کرنا پڑا اور زبردستی ان سے علالت کا سرٹیفکیٹ داخل کرا کے انھیں امتحان سے نجات دلانی پڑی۔

ابتدائی دور کی زیادہ تر تصانیف شعر وادب سے متعلق ہیں ایک دیوان اور بعض دوسرے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن ہم تک نہیں پہنچے۔ قریبی ربط رکھنے والو کا بیان ہے کہ متعدد دیوان غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ لیکن موصوف نے ان کے فکر سے عدم اطمینان کے باعث ان کو شائع کرانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ کیوں کہ کالج کے دور میں اور اس کے فوراً بعد فکر پر اسلامیت کی چھاپ اتنی گہری نہ تھی جتنی امریکہ جاکر اور وہاں سے واپسی کے بعد میسر آئی۔ ادب میں آپ کا خاص موضوع تنقید تھا اور التنقید الادبی اپنے موضوع پر ایک بہت اونچی کتاب قرار دی جاتی ہے۔ الاخوان المسلمون سے دلچسپی امریکہ جانے سے پہلے ہی پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن اس حد تک نہیں کہ پورا اطمینان ہو جائے۔ خاص کر آپ کو حسن البنا مرحوم کی شخصیت پر ابتداءً اطمینان نہ تھا۔ چنانچہ ایک روایت ہے کہ اخوان سے ہمدردی کے باوجود جب استاذ حلمی المنادی نے جو اخوان سے متعلق تھے ایک رسالہ جاری کرنے کا ارادہ کیا اور ان سے اس کی ادارت کی درخواست کی تو انھوں نے اسے اس شرط پر قبول کیا کہ حسن البنا کی شخصیت سے اس میں کوئی چیز نہ شائع کی جائے گی۔

---

[1] التصویر الفنی فی القرآن

آپ پر مغربیت کے جو کچھ بھی اثرات ابتداءً نظر آتے ہیں ان کو زائل کرنے اور خالص اسلام سے آپ کی فکری وابستگی کو درجۂ کمال تک پہنچانے کا شرف زیادہ تر خود "مغربیت" کو حاصل ہوا یہ تبدیلی وقت اس وقت تکمیل کو پہنچی جب کہ آپ کو مغربیت کے مرکز جدید امریکہ میں جاکر مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آپ نے اس دور کے تاثرات پر ایک کتاب "امریکا التی رایت" (امریکہ جسے میں نے خود دیکھا) لکھی ہے لیکن وہ ہم تک نہیں پہنچ سکی ہے اور یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ شائع ہوئی یا اس عام ابتلا کی نذر نذر ہوگئی جس میں مصر کی اسلامی تحریک۔ اس کے افراد، ان کی علمی خدمات سب مبتلا ہیں۔ بہرحال سید قطب جیسی صلاحیت کے آدمی کے بارے میں جو کچھ تصور کیا جاسکتا ہے۔ وہ یہی کہ انھوں نے وہاں زندگی کو بھی دیکھا ہوگا اور اصحاب فکر سے بھی تبادلۂ خیال کیا ہوگا۔ سید قطب نے امریکہ سے جو اثر قبول کیا۔ اس پر ہمیں بے اختیار اپنا اقبال یاد آجاتا ہے۔ یہی بچپن، اسی قسم کی جوانی، اسی طرح ایک فلسفی شاعر کے وجدان سے تہذیب حاضر کی مزاج شناسی اور یہی مغربیت کے گہوارے سے اسلام میں پختگی لے کر لوٹنا۔

سید قطب کی تصانیف سے بھی اندازہ ہوتا ہے اور ان سے ملنے والے بھی بتاتے ہیں کہ مغربی تہذیب خصوصاً امریکہ کے موجودہ حالات کے بارے میں ان کے تاثرات بہت شدید اور بہت پرسوز ہیں۔

چنانچہ امریکہ سے لوٹنے والا سید قطب ہم کو مغرب کے فکر و فلسفہ، اس کے معاشی اور سیاسی نظاموں اور اس کے نظام تربیت سے سخت نالاں نظر آتا ہے۔ اب وہ اسلام کا داعی ہے اور نئی نسلوں کے لئے ایک نذیر۔ ان رجحانات کے ساتھ سید قطب کے عنفوان شباب ہی سے ایک دوسرا رجحان بھی کافی شدت کے ساتھ ابھرتا ہوا نظر آتا ہے اور وہ ہے استعمار کے خلاف اعلان بغاوت برطانوی امپیریلزم ہو یا شاہ فاروق کا فاسقانہ استبداد سید قطب کے دل میں ان کے لئے کسی رواداری کی مطلق گنجائش نہ تھی ان کی تصانیف ان جذبات سے بھری پڑی ہیں۔

سید قطب ایک بلند پایہ ادیب، فن تنقید پر ایک اتھارٹی اور ایک ممتاز شاعر ہونے کے ساتھ ابتدا ہی سے ایک بہت اچھے خطیب بھی تھے۔ ان صلاحیتوں کے ساتھ جب یہ اخوان کی طرف مائل ہوئے تو ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ چنانچہ ان کی باقاعدہ رکنیت سے قبل ہی ان کی تصانیف بالخصوص "العدالۃ الاجتماعیۃ" کو اخوانی حلقوں میں بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی اور اسے جماعتی لٹریچر کے طور پر پڑھا اور پڑھایا جانے لگا۔ تاآنکہ کتاب کا تیسرا ایڈیشن سنہ ۵۲ء میں خود اخوان نے اپنے مکتبہ سے جماعتی لٹریچر کے طور پر شائع بھی کر دیا۔

ہفت روزہ الدعوۃ اور ماہنامہ المسلمون کا شاید ہی کوئی شمارہ آپ کی نگارشات سے خالی رہتا۔

اخوان کے باقاعدہ رکن آپ اواخر سنہ ۵۳ء یا ابتدائے سنہ ۵۴ء میں ہوئے تھے۔ رکنیت کے فوراً بعد ہی آپ کو اخوان المسلمون نے اپنے شعبۂ نشر و اشاعت کا سکریٹری بنادیا۔ آپ نے ایک نہایت ہی اچھے منصوبے کے تحت کام شروع کیا جس میں تصنیف کے ساتھ اخوان کے رسائل کے اردو (انگریزی، فرنچ اور انڈونیشین وغیرہ زبانوں میں ترجمے کا اور ان زبانوں سے اسلامی لٹریچر کے عربی میں منتقل کرنے کا پروگرام بھی شامل تھا۔ اس ذمہ داری کے پہلو بہ پہلو آپ نے جماعت کی تنظیم کے سلسلہ میں تقریباً سارے مصر کا دورہ بھی کیا۔ ابھی اس منصوبہ پر عمل شروع ہی ہوا تھا کہ ۱۴ جنوری سنہ ۵۴ء کو اخوان المسلمون کی تنظیم خلاف قانون قرار دے دی گئی۔ اسارت کا یہ دور بھی ہر طرح کے تشدد اور بہیمانہ سلوک سے پر تھا۔ سید قطب کی شخصیت چونکہ اخوان المسلمون کی تنظیم میں ایک مرکزی شخصیت بن چکی تھی لہذا ان کے ساتھ ارباب جیل کا سلوک بھی خصوصی تھا۔ جیل خانہ میں ان کے ساتھ جس قسم کا سلوک ہوا ہے اس کی تفصیلات بعض اردو جرائد بالخصوص المنیر لائلپور میں آتی رہی ہیں۔

دوسرا زمانۂ اسارت بھی اکتوبر سنہ ۵۵ء سے شروع ہوجاتا ہے اور یہ اسی دور کے بہیمانہ سلوک کا نتیجہ معلوم

ہوتا ہے کہ مشیت ایزدی نے ان کو عمر طبعی پوری کرنے سے بہت
پہلے دنیا سے اٹھالیا۔

دوران جیل میں سید قطب پر کتے چھوڑے گئے۔ بجلی کے
کرنٹ کے ذریعہ عذاب میں مبتلا کیا گیا۔ پہلے ہی دن اتنی زدوکوب
کی گئی کہ بدحال ہو گئے۔ آخر شدائد کی تاب نہ لاکر بیمار پڑے تو
اسپتال میں داخلہ ہوا جو جیل کا سب سے بدترین دار العذاب ثابت ہوا

کسی طرح وہاں سے نجات ہوئی تو العدالۃ الاجتماعیہ کے
مصنف اور قرآن کریم کے مفسر کو سڑک پر پتھر کوٹنے کی مشقت میں مبتلا
کیا گیا کہا جاتا ہے کہ اپنے دور اسارت کا یہی زمانہ سید قطب کے لئے
سب سے زیادہ سکون و آرام کا زمانہ تھا لیکن جب کارکنوں کو ان کے
اس تاثر کا علم ہوا تو انھوں نے وہاں سے لاکر پھر جیل اور دوبارہ
اسپتال میں پہنچا دیا۔

آگے کی روداد ہمیں نہیں معلوم! ایک بار خبر آئی تھی کہ سید قطب
کو شتوہ میں بھیج دیا گیا تھا لیکن دوبارہ اس کی تحقیق نہیں ہو سکی۔

اخوان المسلمون اور اس کے بعض افراد کے خلاف بیانات
دلوانے کے لئے سید قطب کو سخت ترین سزائیں دی گئیں لیکن وہ
ثابت قدم رہے۔

سید قطب مرحوم کو عالمی اسلامی تحریک سے بڑا تعلق تھا
اور ایک زمانے میں آپ موتمر عالم اسلامی برائے فلسطین کے
سکریٹری بھی رہ چکے ہیں

سید قطب مرحوم نے اپنے پیچھے دو درجن کے قریب تصانیف
چھوڑی ہیں۔ شعر و ادب سے متعلق تصانیف کے علاوہ ان کی مشہور
تصانیف یہ ہیں۔

التصویر الفنی فی القرآن
مشاهد القیامۃ فی القرآن فی ظلال القرآن
العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام
اسلام والسلام العالمی
معرکۃ الاسلام والراس مالیہ وغیرہ ....

جگہ کی قلت کے سبب ہم یہاں صرف تین تصانیف کا تعارف
کرا سکیں گے۔

التصویر الفنی فی القرآن اپنے موضوع پر اپنی نوعیت
کی پہلی کتاب ہے جس میں ایک بلند پایہ ادیب نے جدید فنون لطیفہ کے
نقطۂ نگاہ سے قرآن کی بلاغت کے ایک خاص پہلو کا مطالعہ کیا ہے
یہ پہلو قرآن کی تمثیلات متشابہات اور استعاروں سے متعلق ہے
ابتدائی صفحات میں مصنف نے عبدالقاہر جرجانی کی اسرار البلاغۃ جیسی اعلیٰ درجہ کی
کتاب پر تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے اپنا (approach) واضح
کیا ہے پھر منظر کشی، پیکاری اور imagination وغیرہ
قدروں کے معیار پر قرآنی تمثیلات کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ قدیم عربی
درسگاہوں کے فارغین کو شاید یہ انداز کچھ زیادہ پسند نہیں آیا لیکن
جو لوگ جدید لٹریچر اور آرٹ کے میدان میں جدید معیار نقد سے لگاؤ
رکھتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کی افادیت، اس کی لذت میں
ہمارے لئے ایک نئی کشش پیدا کرنے کی صلاحیت کے بارے
میں ہم بہت اونچی رائے قائم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ توقع ہے
کہ ایک نہ ایک دن اسلامی ادب کے شیدائی اس دوشیزۂ عرب کو
محل سے نکال کر ترجمے کے زیور سے آراستہ کر کے ناظرین کے سامنے
لائیں گے اور انھیں خود کوئی رائے قائم کرنے کا موقع دیں گے۔

مشاهد القیامۃ۔ اس مختصر سی کتاب میں قرآنی قصص
پر بھی گفتگو کی گئی ہے اور ایسے انداز میں یوم آخرت کے ان مناظر کا مطالعہ
پیش کیا گیا ہے جو قرآن سامنے لایا ہے ___ فی ظلال القرآن اصطلاحی
معنی میں کوئی تفسیر نہیں ہے۔ مصنف نے اسے دعوے کے ساتھ
پیش کیا ہے۔ مصنف اپنے وہ تاثرات سامنے لانا چاہتا ہے۔ جو
مطالعہ قرآن کے دوران اس پر طاری ہوتے رہے تھے! اسے اپنے
جیسے ذہنوں کی رہنمائی کے لئے قرآن سے جو رہنمائی ملتی ہے اسے
اس نے اپنے ہمعصروں تک منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی
ان خصوصیات کے ساتھ فی ظلال القرآن (قرآن کے سایہ تلے۔)
کتاب بھی ہے اور قرآن کی ترجمانی کرنے والوں کے لئے ایک نمونہ بھی
بالخصوص "دعوت" کا پہلو اس میں جس خوبصورتی سے نمایاں ہوا ہے
اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ "ہم تک" فی الظلال القرآن" کے

صرف دس پارے پہنچ سکے ہیں اور معلوم نہیں یہ کتاب پوری مکمل ہو کر شائع ہو چکی ہے یا نہیں۔

اسلامی تحریک اور اسلامی فکر اور اسلامی نظام کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے مصنف کی سب سے بڑی خدمت العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام ہے۔ پونے تین سو صفحات کی یہ کتاب زندگی کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نگاہ اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی عدل کے بارے میں اس کا مزاج سامنے لانے میں پوری طرح کامیاب کہی جا سکتی ہے۔

سید قطب کے نزدیک اسلام ایک قانونی ضابطہ کا نہیں بلکہ اصلاً ایک مخصوص مزاج اور ایک مخصوص اسپرٹ کا نام ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اسلامی قانون کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اس کتاب میں بھی ان کی زیادہ تر توجہ اس اسپرٹ کی وضاحت پر مرکوز رہی، قانون کی طرف ان کی توجہ سرسری ہے اور اسی حد تک جس قدر کہ عملی حالات کا تقاضہ ہے۔ پھر ان کی توجہ کا دوسرا بڑا مرکز آج کے حالات میں اسلامی نظام کے قیام کے امکانات ہیں، چنانچہ العدالۃ الاجتماعیہ میں ایک طویل باب کے ذریعہ اُنھوں نے ہمیں یہ باور کرایا ہے کہ اسلامی اسپرٹ صرف کسی کتاب کی زینت بن کر یا کسی مخصوص عرصۂ تاریخ کا طرۂ امتیاز بن کر محدود نہیں ہو گئی ہے بلکہ تاریخ اسلامی پر مسلسل اپنا گہرا اثر مرتب کرتی رہی ہے۔ آج کے حالات ان کے نزدیک اسی اسپرٹ کے متلاشی ہیں۔ اور وہ اسلامی تحریک کے علمبرداروں کی طرف سے بھی مایوس نہیں انکے بنیادی عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ دنیا کا مستقبل اسلام کے ہاتھوں میں ہے۔

اس مفید تصنیف کا انگریزی ترجمہ چار سال ہوئے American Council of learned Societies Washington شائع کر چکی ہے اور اردو ترجمہ بھی مکتبہ جماعت اسلامی ہند رامپور جلد ہی ناظرین کے سامنے پیش کرنے والا ہے۔

عظیم مصنف بہت گذرے ہیں۔ لیکن وہ داعی اور تحریک اسلامی کے پرجوش کارکن بھی رہے ہوں۔ ایسا کم ہوتا رہا ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی ایک بہترین انسان بھی ہونا ایک کمیاب قدر ہے۔

سید قطب سے ملنے والے ان کی خوش خلقی اور ملنساری سے بیحد متاثر ہوئے ہیں۔ ان سے ملاقات کے ایک تمنائی نے ان کی سب سے اچھی تصنیف کے ترجمے کے سلسلے میں ان سے اجازت طلب کی تھی جس کی غیر مشروط، فوری اور "پرجوش" اجازت کے ساتھ اُنھوں نے اپنی ایک دوسری تصنیف بھی ہدیۃً بھیجی اور اس کے ترجمہ کی بھی اجازت دیدی۔ (بشکریہ "دعوت")

رضا علی وحشت

○

لبِ خاموش کا کیا انکشافِ مدعا ہوتا
کوئی صاحب نظر ہوتا کوئی دردآشنا ہوتا

سرِ سودا طلب ہوتا دِل دردآشنا ہوتا
تو کچھ اس وادیٔ غربت میں جلنے کا مزا ہوتا

نظر آتی مبدّل نور سے ظلمت زمانے کی
دِل تاریک گر خود مائلِ صدق وصفا ہوتا

مقام بندگی کے عیش اگر مطلوب تھے تجکو
تجسّس ترک کرتا، وقفِ تسلیم ورضا ہوتا

لرزتا ہے مرا دل حسن کی رنگیں ادائی پر
خروشِ قلبِ مضطر کاش یا رب نارسا ہوتا

بُرا ہو رشک کا ورنہ تقاضا تھا محبت کا
کہ ہم اُس پر فدا ہوتے کہ جو تجھ پر فدا ہوتا

تغافل تو قیامت ہی ترے ایذا پسندوں کو
جفا کرتا اگر تو واقفِ رسمِ وفا ہوتا

شکارِ شوق مرتا تیرِ حسرت کا ہدف بن کر
جو تیرا تیر اے صیادِ بے پروا خطا ہوتا

ہماری فکرِ دور اندیش نے کھویا ہمیں ورنہ
جنونِ عشق تیری جستجو میں رہنما ہوتا

شکارِ اہلِ غرض ہی کا رکھا تجھکو مروت نے
بھلا ہوتا جو اے جانِ وفا تو بے وفا ہوتا

تری ہر ہر ادا مصروف تھی عاشق نوازی میں
ترے عاشق سے حقِ آشنائی کیا ادا ہوتا

خموشی سے نہ لیتا کام اگر وحشت تو کیا کرتا
مرا مطلب نہ تھا ایسا جو لفظوں میں ادا ہوتا

("ساقی")

———•••———

علی احمد شاہدی

کھوٹا روپیہ، سچا انسان

فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے سگرٹ فروش کو پیسے دے کر جب میں آگے بڑھا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرے قریب کوئی رو رہا ہو۔ لحہ بہ لحہ یہ آواز تیز ہوتی گئی، میرے کانوں میں، میرے اپنے وجود کے اندر اور پھر جیسے میری روح کی گہرائیوں میں گونجنے لگی اور دل و دماغ میں جذبے و احساس کا جو طوفان بپا تھا وہ اور بڑھ گیا۔

لوگ کہتے ہیں میں بڑا نیک آدمی ہوں۔ میرے ایک دوست کا خیال ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں کردار و عادات کے لحاظ سے مجھ جیسے ستھرے انسان بہت کم دیکھے ہیں۔ میری سادہ لوحی اور سادگی کے وہ بڑے مدّاح ہیں کیونکہ ان کے خیال میں جب بھی کسی نے مجھ سے کسی قسم کی مدد طلب کی ہے میں بغیر کسی ردّوکد کے آمادہ ہو گیا ہوں خواہ دوستوں کو سگرٹ آفر کرنے کا معاملہ ہو یا کسی واجبی رقم کے قرض دینے کا دفتر کے چپراسی، اردلی اور دفتری وغیرہ میری تعریف کرتے نہیں تھکتے کہتے ہیں آپ سا غریب پرور اور رحمدل انسان نہیں دیکھا۔

میں نہیں جانتا کہ یہ سب اپنے خیالات میں کس حد تک حق بجانب ہیں۔ البتہ اپنی ایک کمزوری کا مجھے بخوبی احساس ہے اور وہ یہ کہ میری طبیعت ضرورت سے زیادہ دردمند، حساس اور رقت پذیر ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں بندر روڈ پر جا رہا ہوں، قریب سے کوئی گداگر غمناک آواز لگاتا نکل گیا۔ اور میرا دل رونے لگا اور آنکھوں میں آنسو آگئے کسی اپاہج کو دیکھا اور دل نے کہا کاش ممکن ہوتا تو میں اسے اپنے سالم ہاتھ پیر دے دیتا جن میں ابھی چلنے پھرنے کی سکت باقی ہے۔ کوئی ضعیف ڈگر ڈگر کرتا میرے سامنے سے گذرا اور انسان کے عبرتناک انجام کے خیال نے میری روح کو تڑپا دیا۔ کسی اندھے پر نظر پڑی اور غم سے میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ اے خدا! انسانیت کی یہ توہین! دنیا جور و ستم کے سوا کچھ نہیں۔ تیرے اس بندے کے لئے اندھیری ہے اور میں روتا چلا گیا ہوں۔ میرے آنسوؤں کو میری آنکھوں کے سوا کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ میرے دل کی غمناک پکار میرے ضمیر کے سوا کسی نے نہیں سنی ہے اور میں سوچتا رہ گیا ہوں کہ کیا یہ میرے دل کی کوئی بیماری ہے۔

اور اس روز میں سارا دن کراچی کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ ماری پور واپس جانے کو جی نہ چاہا۔ پھر ماری پور جیسی دور افتادہ بستی سے کراچی آنا بھی کبھی کبھار ہوتا ہے۔ صبح کے شو میں ایک انگریزی فلم دیکھی کبھی کسی پُرشور ہوٹل میں بیٹھا کہیں کسی خاموش کیفے کی ویرانی کا لطف اٹھایا چلتے چلاتے کسی جانے پہچانے سے ملاقات ہو گئی تو پھر چائے کا ایک دور چل گیا حتیٰ کہ دوپہر کا کھانا بھی بندر روڈ پر ایک ہوٹل میں کھا لیا ذرا گاندھی گارڈن کی سیر کی۔ وہاں سے بندر روڈ پر واپس ہوا تو شام ہو چلی تھی اور مجھے یہ خیال ستانے لگا تھا کہ ماری پور کی بس اتوار کی شام کو جیسے شیر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مجھے شام کے کھانے کی بھی فکر ہوئی میں نے ایک سستے سے ہوٹل پر بھوک بھری نگاہ ڈالی اور اس طرف بڑھ گیا۔ پیالیوں کی کھنک، کھانوں کی مہک اور تلتے ہوئے کبابوں کی سوندھی خوشبو نے میری اشتہا اور بڑھا دی میں کاؤنٹر تک گیا اچانک خیال آیا کہ پیسے دیکھ لوں۔ پینٹ کا جیب ٹٹولا۔ ایک روپیہ پڑا تھا کئی گھنٹوں کی تھکن کے نتیجے میں بڑھتی ہوئی بھوک نے کھانے کو اور بھی زیادہ لذیذ بنا دیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے سگریٹ کے دو چار سرور انگیز کش لئے اور سرمست سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کاؤنٹر پر آتے ہی ویٹر نے آواز لگائی

"باؤجی سے دس آنے"

میں نے پینٹ کی جیب سے وہ ایک روپیہ نکال کر کاؤنٹر پر بے نیازی سے پھینک دیا۔ منیجر روپیہ لے کر کیش بکس میں رکھتے رکھتے رک گیا اور پھر عقابی نظروں سے پرکھ کر میری جانب رکھائی سے پھینک دیا۔

"روپیہ کھوٹا ہے"

"کھوٹا ہے" میں نے تعجب کا اظہار کیا۔

"آپ خود دیکھ لو" منیجر نے جواب دیا
میں نے روپے کو یوں الٹ پلٹ کر دیکھا جیسے جعلی نوٹوں اور کھوٹے سکوں کا سراغ لگانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے
"مجھے تو کوئی خرابی نہیں معلوم ہوتی" میں نے اپنی مایوسی کو چھپاتے ہوئے کہا
"کوئی خرابی نہیں معلوم ہوتی؟ کیا کہتے ہو آپ۔ یہ روپیہ کھوٹا نہیں تو اور کیا ہے" منیجر نے روپیہ میرے ہاتھ سے لیکر کاؤنٹر پر پٹختے ہوئے کہا۔
ہوٹل کے اور لوگ بھی ہماری طرف دیکھنے لگے۔ انکی آنکھوں میں تمسخر کی جھلک تھی۔ میں خاموش ہوگیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔
روپیہ کاؤنٹر پر پڑا میرا منہ چڑا رہا تھا۔
"آپ اسے اٹھا لو اور پیسے نکالو" منیجر درشت ہوگیا۔
میں خاموش رہا۔ لوگوں کی نگاہیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔
"اپنے پاس وقت نہیں ہے جلدی کرو"
"مگر میرے پاس اور پیسے نہیں ہیں" میں نے جھنجھلاہٹ سے کہا
"تو ایسا بولو نا۔ پیسے نہیں ہیں۔ پیسے نہیں ہیں تو ہم کیا کریں"
وہ جان بوجھ کر زور زور سے بول رہا تھا اور میری پیشانی شرمندگی کے پسینے سے شرابور ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں نے بڑی لجاجت سے کہا
"میرا مطلب ہے یہ روپیہ رکھ لو میں پیسے کل دیدوں گا"
"کیا کہتے ہو کل دے جاؤں گا" وہ اور زور سے بولنے لگا۔
"ارے بابا یہ کلٹی نہیں چلے گا۔ ہمارے پاس تمہارے جیسا نوجوان بہت آتا ہے ——— پرس گم گیا ——— پیسے بھول آیا۔ جیب کٹ گیا ہم سب کی سنے گا تو ہمارا دیوالیہ پٹ جائے گا"
میں رسوائی کے احساس سے ڈوبا جا رہا تھا۔ اب تقریباً سارا ہوٹل میری طرف متوجہ تھا اور مجھ میں نگاہ اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔
میں نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا "آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے میں کل پیسہ لاکر دیدوں گا۔ اتفاق ہے جو یہ روپیہ کھوٹا نکل گیا"
چند آدمی اٹھ کر کاؤنٹر پر آگئے۔ منیجر نے ان کے سامنے اور چیخنا اور چلانا شروع کر دیا۔ میں کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ ایک احساس تھا۔ گویا سر بازار بے عزت کیا جا رہا ہوں۔ دو تین آدمیوں نے بڑھکر سمجھایا تب اس نے نہایت کرختگی سے کہا
"اچھا جاؤ بابا جاؤ۔ پر دیکھو کل کی بات کا ہم بھروسہ نہیں کرتا پیسہ ابھی دو گھنٹہ کے اندر پہنچاؤ۔ اگر سچا بابو ہے تو"
میں ہوٹل کے منیجر سے جان چھڑا کر فوراً باہر سڑک پر آگیا اور ہوٹل کی گھٹی گھٹی فضا کا احساس مجھے سڑک کی کھلی فضا میں آکر ہوا۔ ایک لمحے کے لئے ذہن میں ایک ٹھیراؤ ایک جمود سا طاری رہا۔ اور پھر بھیانک خیالات بھناتے شور مچاتے میرے ذہن میں پھڑپھڑانے لگے اب کیا ہوگا۔ مجھے اب کیا کرنا چاہیئے۔ ایک کھوٹا روپیہ ہے ماری پور کی آخری بس چھوٹنے کا وقت قریب ہے اور میں ہوٹل والے کو اپنی شرافت کی کسوٹی دے آیا ہوں۔ اسے دو گھنٹے کے اندر پیسے پہنچانے ہیں۔
میں بغیر کچھ طے کئے چل پڑا۔ میرے پیر زمین پر پڑ رہے تھے لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ کدھر جا رہا ہوں۔ بس یہی ایک تکلیف دہ خیال ذہن میں کروٹیں لے رہا تھا کہ پیسے کس طرح حاصل کروں۔ راہ چلتے لوگوں سے مانگنا کتنی بڑی رسوائی ہے۔ کوئی جان پہچان والا مل بھی جائے تو زبان نہ ہلے گی۔ میرا دماغ معروف تھا اور میں چل رہا تھا یوں جیسے میرا سارا جسم سوچ رہا ہو اور میرے قدم بھی متفکر ہو رہے ہوں۔ اچانک خیال کی ایک لہر نے امید کی ایک رمق ہونے سے بھینکی اور میں چلتے چلتے ٹھہر گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ امید اور خوشی کا یہ دیا بھی بجھ گیا۔ میرے دل نے کہا تمہارے ذہن میں جو تدبیر ابھری ہے وہ دھوکا ہے۔ فریب ہے۔ بے ایمانی ہے لیکن دماغ نے سمجھایا تم بے بس ہو۔ لاچار ہو۔ میرے دل و دماغ میں یہ کھیل جاری تھی اور میں چل رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ واضح نہ تھا کہ کیا کر رہا ہوں۔ کیا کرنا چاہتا ہوں۔ سامنے ایک پھل والے کی دوکان تھی۔ دو آنے کا ایک سنگترہ اور میں ——— لیکن نہیں وہاں بڑی تیز روشنی ہے روپیہ کا کھوٹ کھل جائے گا۔ آگے ٹھیلے والا کھڑا ہے مونگ پھلی لئے۔ ایک آنہ کا صرفہ ہے اور ——— مگر اس کے پاس گیس کی روشنی نہ سہی۔ وہ خود بہت چالاک معلوم ہوتا ہے۔ کہیں

یہاں بھی وہ رسوائی نہ اٹھانی پڑے میں اپنے خیال میں گم سڑک پر چل رہا تھا —— یہ اب پان کی دوکان سامنے ہے اور یہاں کام بن جانا مشکل نہیں لیکن اس دوکان پر وہ جو چار آدمی کھڑے ٹھٹھے لگا رہے ہیں۔ بڑے کائیاں معلوم ہوتے ہیں۔ وہاں سے سرکنے کا نام نہیں لیتے اور مجھے یوں گھور رہے ہیں۔ جیسے میرے دل کا راز جانتے ہوں —— اور میں آگے بڑھ گیا —— سڑک کے اس حصے پر دونوں طرف بڑی عمارتیں سر اٹھائے کھڑی تھیں اور دائیں طرف ان عمارتوں کے سایہ میں ایک بوڑھا سگرٹ کی چند ڈبیاں لئے بیٹھا تھا میری نظر اس پر جا پڑی اور اسے دیکھ کر دفعتاً ایسی مسرت ہوئی جیسی شاید شکاری کو شکار —— جال میں پھنسا دیکھ کر ہوتی ہوگی۔ دوسرے لمحے میں بوڑھے کے پاس کھڑا تھا "کیپسٹن کے دو سگرٹ دینا بڑے میاں"

اس نے ڈبی کو ٹٹول کر دو سگریٹ نکالے اور مجھے معلوم ہوا کہ اس کی بینائی بھی کمزور ہے۔ روپیہ میں نے اس کے ہاتھ پر رکھ دیا جسے اس نے دیکھنے سے زیادہ محسوس کرنے کی کوشش کی اور اس کے جھریوں دار چہرے سے ایسی خوشی کا اظہار ہونے لگا جیسے کسی بچی کی ہتھیلی پر چلغوزہ رکھ دیا جائے اور وہ مسرت سے کھل اٹھے یا جیسے کسی بھکارن کے ہاتھ میں چاندی کی انگوٹھی۔

"روپیہ ہے میاں؟" اس نے پوچھا۔

میں نے کہا "ہاں"

اس نے روپیہ تہمد میں اڑس لیا اور آنے آنے دو دو آنے کی ریزگاری نکال کر مجھے واپس کر دیا۔

روپیہ کی ریزگاری ہاتھ آتے ہی میں ہوٹل کی طرف بھاگا گیا جہاں میں اپنی شرافت و دیانت کا سرمایہ رہن رکھ آیا تھا۔ ہوٹل والے کو پیسے دیکر میں نے سوچا کہ اب شاید میرا ضمیر ہلکا ہو جائے گا اور ذہن و دل جس کرب انگیز کیفیت میں مبتلا رہے ہیں اس سے نجات نصیب ہوگی۔ میں نے ان سب واقعات کو دل سے بھلانے کی کوشش کی لیکن مجھے محسوس ہوا کہ کوئی خیال آسیب کی طرح میرا پیچھا کر رہا ہے جسے میرا دماغ قبول کرنے سے گریزاں ہے۔ لیکن دل نے اپنے دامن میں پناہ دی ہے۔ جہاں ایک کسک سا ایک ایسا درد جنم لے رہا ہے جو گناہ کی لذت کے بعد پیدا ہو کے روح کو مسوستا ہے اور دل میں یہ درد یوں پھیلنے بڑھنے لگا جیسے کسی بیوہ کے دل میں شوہر کی موت کا خیال۔ میں نے چاہا کہ یہ کسک، یہ درد، یہ خیال میرے دل سے چند لمحوں، چند ساعتوں کے لئے فرد ہو جائے۔ مجھے ایک لحظہ سکون کا میسر آئے لیکن یہ درد تھما نہیں بڑھتا رہا جیسے کوئی المیہ کہانی اپنے عروج کو پہنچ رہی ہو جیسے کوئی غم نصیب ماں اپنے اکلوتے ننھے کی موت پر بین کر رہی ہو۔

میں دیوانہ وار بس اسٹاپ کی طرف بڑھا اور خود کو بس کے انتظار اور تجسس میں یوں غرق کر دینا چاہا کہ —— میرا سارا وجود نگاہیں بن کر رہ جائے لیکن میرا دل ایسا پھوڑا بن گیا تھا جس میں ٹیس اٹھتی ہے۔ درد کی لہریں جنم لیتی ہیں اور جی چاہتا ہے کہ نشتر لگا کے درد کو نکال پھینکو لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پھوڑا ابھی کچا ہے۔

بس آئی اور میں اس میں لپک کر چڑھ گیا لیکن درد کا وہ آسیب بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے بس کے اندر بس کے باہر گھبرا گھبرا کے دیکھا کہیں سے کسی خیال کسی جذبہ کی تحریک نہ ہوئی جو مجھے اپنی پناہ میں لے۔ جو مجھے اس کرب سے فرار کی راہ بتلائے بس چل پڑی۔ ایک ہیولیٰ سا میری نگاہوں میں ابھرنے لگا۔ جیسے بس میں میرا ساتھی ہو میں ڈر گیا —— یہ بوڑھا ہے —— وہی سگرٹ والا بوڑھا —— مسکرا رہا ہے —— میرا خوف، میرا درد بس کی رفتار کے ساتھ شدید تر ہوتا گیا۔

بس راؤنڈ اباؤٹ کے پاس رک گئی میں اتر گیا۔ وہ بوڑھا وہ ہیولیٰ، وہ درد سب میرے ساتھ تھے۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن دل کے پھوڑے میں جیسے درد کا مواد پھوٹ بہنے کی راہ ڈھونڈتا رہا۔ میں رات گئے تک سویا نہیں جانے کب میری آنکھ لگی اور خواب میں بھی وہ بوڑھا دبے پاؤں چلا آیا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ اُف میرے خدا —— یہ سب مجھے کیا ہو رہا ہے۔ یہ درد کب کم ہوگا۔ میری روح میں یہ سب کیا شور ہے۔ کیسا ماتم ہے۔

دوسرا دن میں نے جیسے تیسے دفتر میں گذارا اور مجھے میرا دل آواز دیتا رہا۔ اس بوڑھے کے پاس چلو۔ اس لاچار نابینا بوڑھے

کے پاس اور میں اس قاتل کی طرح جس کا ضمیر بار بار اسے مقام قتل کی طرف کھینچ لے جاتا ہے کہ وہاں اس کے روحانی کرب کو سکون ملتا ہے، ماری پور سے شہر پہنچا۔ اسی سڑک پر، ان ہی اونچی عمارتوں کے سائے میں وہ بوڑھا تنہا خاموش بیٹھا۔ اس کے سامنے سے کئی بار گذرا۔ عمارتوں نے مجھے حقارت سے دیکھا۔ ان کے لمبے لمبے سائے مجھے لعنت و ملامت کرنے لگے ——— میں جھلا اٹھا ——— مجھے اقرار کر لینا چاہیے مجھے کہہ دینا چاہیے کہ وہ روپیہ میں نے ہی اسے دیا تھا لیکن بوڑھے کے پاس پہنچ کر میری زبان گنگ ہو گئی۔ اس نے سر اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا "کیا چاہیئے میاں؟"

"کیپسٹن کے دو سگرٹ" میں نے چونی نکال کر اس کے ہاتھ میں دیدی جسے اس نے ٹٹولا ——— "میاں یہ چونی کھوٹی تو نہیں ہے"

میں نے کہا "نہیں"

اس نے مجھے دو سگرٹ دیئے ——— "برا نہ ماننا میاں"

اس نے کہا "میں نے اس لئے پوچھا کہ کل کسی بھلے مانس نے مجھے بڑا دکھ دیا" میرا دل یوں دھڑکا جیسے کسی قاتل کے سامنے اس کے مقتول کا ذکر ہو۔

بوڑھے نے کہا "میاں وہ کل دن بھر کی کمائی تھی جو شام کو میں نے کھوٹے روپے کی ریز گاری میں دیدی"

"میرا دل اور تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں خاموش رہا

"جانے کون بھلا مانس تھا میاں جو کھوٹا روپیہ دیکر میرے سارے دن کی کمائی لے گیا اور میرے پاس اس روز صرف دو آنے باقی رہ گئے"

میں خاموش رہا۔ میرے سینے میں ہیجان بڑھنے لگا

"آپ سمجھئے میاں، اس دن میں بھوکا سویا اور دو آنے کی روٹی اپنی بیٹی کو کھلا دی جس کو کوڑھ کی بیماری ہے۔ میں اسی کی خاطر یہ چھوٹا موٹا دھندا کرتا ہوں"

میں اب بھی خاموش کھڑا اپنے دل کی دھڑکنیں سن رہا تھا جن میں درد کی پکار تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ بوڑھے کی آواز میں رقت بھر رہی ہے اور میں ڈرا کہ کہیں وہ رونے نہ لگے کہ آنسو دیکھ کر شکست کھا جانا میری فطرت کی کمزوری ہے۔ میرے دل نے مجھ سے جرم کا اقرار کرا لینا چاہا لیکن میرے ہونٹ یوں پیوست ہو گئے جس طرح کسی سنگین گناہ کا اعتراف کرنے سے پہلے کسی کنواری دوشیزہ کی زبان بند ہو جاتی ہے۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد میں نے سنا کہ میں کہہ رہا ہوں

"بڑے میاں وہ روپیہ مجھے دیدو"

"آپ کو دے دوں" بوڑھے نے حیرت سے مجھے دیکھا

"ہاں" میں نے اسی کھرڑے لہجے میں کہا ——— "مگر کیوں میاں؟" بوڑھا حیرت زدہ سا مجھے دیکھتا رہا "وہ روپیہ تم کو میں نے دیا تھا" "آپ نے" بوڑھا متحیر ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر تک مجھے خاموش نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر جذبات بھرے لہجے میں بولا۔

"مجھے قسم اس پیدا کرنے والے کی میاں! وہ روپیہ آپ نے مجھے نہیں دیا وہ اور کوئی تھا۔ آپ ہوتے تو مجھ سے اس کا اقرار نہ کرتے"۔ بوڑھے کی آواز میں مسرت بھرے جذبات کی گونج تھی ایسی مسرت جو حقیقت کی تلاش میں کامیابی کے موقع پر ہوا کرتی ہے "میاں آپ بڑے سچے انسان ہیں خدا کی قسم آپ بڑے سچے انسان ہیں" اس کے گلے میں مسرت کے آنسو بھر رہے تھے ——— "میاں یہ سچ ہے کہ آج وہ سچے انسان نہیں رہے جب سچے سکے چلتے تھے۔ اب تو میاں جھوٹے لوگ ملتے ہیں۔ کھوٹے سکے چلاتے ہیں۔ پھر میاں ظلم یہ ہے کہ سچے سکے جو ہوتے ہیں وہ بھی ان کھوٹوں میں رلے ملے پھرتے ہیں" ——— اس کی آواز میں آنسو چھلکنے لگے ——— "میں جانتا ہوں میاں وہ روپیہ مجھے کس نے دیا تھا۔ میری تہمد سے وہ روپیہ اسی وقت گر پڑا تھا اور اس کی آواز سے اس کا کھوٹ کھل گیا تھا۔ روپیہ دینے والا دور نہیں گیا تھا۔ مگر میاں خدا جانتا ہے میں نے اسے آواز نہیں دی اسے نہیں بلایا ——— کیونکہ اسے اس وقت جو شرمندگی ہوتی۔ وہ مجھ سے دیکھی نہ جاتی"

اب شاید اس کے آنسو اس کی آنکھوں میں تھے میں آنسوؤں کی تاب نہیں لا سکتا یہ میری فطرت کی کمزوری ہے میں بوڑھے کے پاس سے چلا آیا کچھ دور آیا تھا کہ میں نے سنا جیسے میرے قریب کوئی رو رہا ہے لحظہ بہ لحظہ یہ آواز تیز ہوتی گئی، میرے کانوں میں میرے اپنے وجود کے اندر اور میری روح کی گہرائیوں میں گونجنے لگی ——— جانے یہ کیسی آواز تھی ——— خدا جانے یہ کون رو رہا تھا ——— ("الحمرا")

جگر مُرادآبادی

دُنیا کے ستم یاد، نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبّت کے سوا یاد

میں شکوہ بہ لب تھا مجھے یہ بھی نہ رہا یاد
شاید کہ مرے بھولنے والے نے کیا یاد

کیا جانئے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو
جینے کی ادا یاد، نہ مرنے کی ادا یاد

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرمِ نوازش
اس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

میں ترکِ رہ و رسمِ جنوں کر ہی چکا تھا
کیوں آ گئی ایسے میں تری لغزشِ پا یاد

مدّت ہوئی اک حادثۂ عشق کو لیکن
ابتک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

کیا لطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں
کیجیے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

(سنگیت)

شفیق جونپوری ●

○

عشق سے محروم ہے انساں توکس قابل بنا
دل کے خالق تو مجھے سر سے قدم تک دل بنا

ناخدا پیدا ہوئے کشتی بنی ، ساحل بنا
پھر بھی یہ عالم نہ اطمینان کے قابل بنا

مجھے وہی لگے مجاہد ارتقا کے راز دار
آگے بڑھنا ہے تو ماضی ہی سے مستقبل بنا

کون اے ساقی ترے ایثار کا قائل نہیں
لیکن اپنے پینے والے کو بھی دریا دل بنا

مرگ ہستی ہے مجاہد کے لئے عیشِ سکوں
زندگی خود ایک طوفاں ہے تو کیوں ساحل بنا

حریت، ایثار، استقلال، ہمت، معرفت
جب یہ چند اجزائے ترکیبی ملیں تو دل بنا

روشنی آنکھوں کی تا حدِ نظر جاتی ہی جب
کیوں وطن اپنا بقیدِ جادۂ و منزل بنا

شکوۂ بیگانگی خامی ہے اپنے ظرف کی
کیوں نہ بزمِ غیر کو بھی اپنی ہی محفل بنا

ہوگا اے شانِ کریمی تیری غیرت کے خلاف
کیوں مجھے بندہ بنا کر غیر کا سائل بنا

لوگ کہتے ہیں کنارے کی طرف کشتی کو موڑ
دامنِ گرداب خود ہی دامنِ ساحل بنا

او دلِ دیوانہ خود داری کہاں تک عشق میں
پھر اسی روٹھے ہوئے کو رونقِ محفل بنا

نکتہ چیں ہیں دیکھنے والے نگاہیں بے ادب
چھپنے والے پھر وہی ناقہ وہی محمل بنا

اک مکمل روشنی ہے اتحادِ حسن و عشق
دو گریبانوں کے حلقے سے مہِ کامل بنا

جس سے برسوں وادیٔ ایمن دہکتا ہی رہا
پھر اسی جلوے کو وجہِ رونقِ محفل بنا

کعبہ و بت خانہ کی بحثیں کہاں تک اے شفیق
اور بھی اونچی ذرا سطحِ حق و باطل بنا

———•••———

قیصر قصری ●

ہرڈنکی ہزبینڈ

دونوں لڑکیوں نے ایک شرارت آمیز قہقہہ لگایا۔ اس کی طرف گھوم کر دیکھا۔ اور قریب کی گلی میں مڑ گئیں۔ شرارت آمیز قہقہہ گولی کی طرح سنسناتا ہوا عزیز کے پاس آیا، اس کے کانوں کے قریب ناچنے لگا۔ اور بولا:۔ "تم کون ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ گدھے ہو نا تم؟"

بہت دیر سے عزیز کی دماغ کی کھڑکیاں بند تھیں۔ اچانک کھل گئیں۔ گھبرا کر اس نے اپنے پیروں پر نظر ڈالی کہ کہیں جلدی میں وہ ساجدہ کے سلیپر پہنے ہوئے تو باہر نہیں چلا آیا ہے۔ پھر اس نے اپنی کنپٹی کے بالوں پر آہستہ آہستہ انگلی پھیری اور بولا:۔ "واقعی میں کہاں جا رہا ہوں؟ میرا نام کیا ہے؟"

ابوالفتح اس کا نام تھا۔ بچپن میں اردو مڈل تک اس کے ساتھ پڑھتا رہا تھا۔ میٹرک کے پرائیوٹ امتحان میں اس کے ساتھ شریک ہوا تھا۔ اور ساتھ ہی فیل ہوا تھا۔ اب اس کے ساتھ ہی مون لائٹ نائٹ کالج میں میٹرک کے لڑکوں کو پڑھاتا تھا۔ جس گلی میں وہ شریر لڑکیاں غائب ہوئی تھیں۔ وہاں سے ابوالفتح برآمد ہوا اور عزیز نے فوراً پہچان لیا کہ یہ ابوالفتح ہے۔ ابوالفتح۔ ابوالفتح کے بچے۔ میں کون ہوں میرا نام کیا ہے۔

یہ سب کچھ اس نے اپنے دل میں کہا اور ساتھ ہی اپنی پیٹھ بھی ٹھونکی کہ اس ابوالفتح کے بچے کو اس نے فوراً پہچان لیا ہے ——

ابوالفتح کے ہاتھ میں پانچ سیب تھے۔ تین ایک ہاتھ میں، دو دوسرے ہاتھ میں۔ اور ان میں سے کم از کم چار سیب وہ خود کھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ پانچواں سیب اس نے اپنی بیوی کو کھلانے کے ارادہ سے خریدا ہوگا۔ یہ سارے سیب اس نے اسی گلی سے خریدے ہیں۔ وہاں ضرور کوئی سیب والا ٹھیلہ لئے کھڑا ہے۔ کیا وہ دونوں لڑکیاں بھی سیب دیکھ کر اس گلی میں مڑی ہیں؟ لعنت ہو ان لڑکیوں پر۔ سیب دیکھ کر قہقہے لگاتی ہیں اور سننے والا شبہ میں پڑ جاتا ہے۔ شبہ میں؟ شبہ میں پڑنے کی تو ایک خاص عمر ہوتی ہے!

"میرا نام تو بتا یار" اس نے ابوالفتح کے سر کے اشارہ کا جواب سر کے اشارہ سے دے کر کہا۔

"اہلیہ کے لئے خریدے ہیں" ابوالفتح نے کہا۔ "کیا بتاؤں ڈاکٹر نے اسے بتا دیا ہے کہ صرف سیب کھایا کرو۔ خریدنا پڑتے ہیں۔"

خریدنا پڑتے ہیں۔ چار اپنے لئے اور ایک گھر کے لئے۔ سڑک پر چلتے ہوئے۔ یہ ابوالفتح اپنا منہ اس طرح چلائے گا کہ دیکھنے والوں کو اس کے جبڑوں پر حرکت کا کوئی شبہ نہیں ہو سکے گا اور مون لائٹ نائٹ کالج کے لڑکے (آج اتوار ہے اور نائٹ کالج کے لڑکے تو بغیر اتوار کے بھی دن بھر اور رات بھر سڑکوں پر گھومتے ہیں) اسے دیکھیں گے تو یہی سمجھیں گے کہ اس نے عادتاً منہ میں پان دبا رکھا ہے اور خلاف عادت اسے چبانے میں مصروف ہے۔ اور جب یہ اپنے مکان میں داخل ہوگا تو اس وقت تک چار سیبوں کے بارے میں اسے یقین ہو چکا ہوگا کہ اس نے نہیں خریدے تھے اور پانچواں سیب یہ بڑی محبت کے ساتھ اپنی اہلیہ کے حوالے کرے گا۔ کیونکہ اسے اپنی جاہل، کوڑ مغز، اور بخزدں والی اہلیہ سے بے حد ہمدردی ہے۔ دونوں میاں بیوی تھوڑی دیر تک بڑھتی ہوئی گرانی کا شکوہ کریں گے، کم تنخواہ کا رونا روئیں گے، اور مون لائٹ کالج کے مالک کو کوسیں گے (یہ کالج کے ساتھ ملکیت کا تصور بھی عجیب چیز ہے) پھر اس کی جاہل کوڑ مغز بیوی، ترکاری کاٹنے کی چھری سے سیب کو چار ٹکڑوں میں تقسیم کرے گی جس میں سے دو ٹکڑے وہ اپنے عزیز از جان شوہر کو کھلا دے گی اور باقی دو ٹکڑے کسی اور وقت کے لئے احتیاط کے ساتھ الماری میں بند کر دے گی کیونکہ وہ سخت جاہل کوڑھ مغز اور بخزدں والی بیوی ہے اور اپنے شوہر کی پسند اور ناپسند کا احترام کرتی ہے اور یوں ابوالفتح اگلے دن پھر

پانچ سیب خریدے گا چار اپنے لئے اور ایک گھر کے لئے کیونکہ اس کی بیوی بے حد نخرے کرتی ہے اور ڈاکٹر نے اسے سیب کھانے کا مشورہ دیا ہے۔ یہ ابوالفتح کا بچہ۔

"میرا نام کیا ہے یار" اس نے ابوالفتح کو ایرانی کے ہوٹل میں گھسیٹتے ہوئے پوچھا۔

"نام!" کسی قدر مشتبہ نظروں سے ابوالفتح نے اسے گھورا "حسینہ کیوں؟"

حسینہ اس کی بیوی کا نام ہے اور ہر وقت یہ بلا تکلف اس نام کو اپنے دوستوں کے سامنے دہراتا رہتا ہے لیکن اس وقت اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے ہیں۔ جیسے اس کی بیوی اچانک گھر کی چار دیواری سے نکل کر ایرانی کے ہوٹل میں آ بیٹھی ہے۔ اور اب کبھی لوٹ کر گھر کی چہار دیواری میں واپس نہیں جائے گی۔ پھر اب تیری پیشانی پر بل کیوں پڑ گئے ہیں ابوالفتح یہی تو تیری خواہش تھی۔

عجیب بات ہے یار میں آج اپنا نام ہی بھول گیا ہوں" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ابوالفتح اس سے پہلے ہی کرسی پر بیٹھ گیا تھا

"دو چائے" ابوالفتح نے اس کی طرف سے خود ہی ویٹر کو آرڈر دے دیا اور انتظار کا وقت کاٹنے کے لئے حسب عادت حسینہ کے موضوع پر تقریر کرنے لگا "عجیب کوڑھ مغز اور جاہل بیوی ہے یار، ہمیشہ بیمار رہتی ہے اور ڈاکٹر اسے پھل کھانے کے مشورے دیتے ہیں۔ اپنا پیٹ کاٹتا ہوں اور اس کے شوق پورے کرتا ہوں۔ کیا کروں۔ پرسوں دو چار بید مار دیئے تھے۔ ابھی تک اس کے ماتھے سے نیلا نشان دور نہیں ہوا۔ اب کروں تو کیا کروں۔ مالک تنخواہ نہیں بڑھاتا گھر میں طرح طرح کی پریشانیاں رہتی ہیں اور سیب خریدنا پڑتے ہیں۔ وہ الگ۔ تمہاری بیوی کی طرح پڑھی لکھی بھی نہیں ہے کہ کسی سے میل جول کر کے اونچی سوسائٹی میں جگہ بنا لے اس قابل بھی نہیں ہے کہ مالک کے پاس جا کر میری سفارش ہی کر دے دو چار دفعہ کہا تو کہنے لگی مالک سے تو نہیں ملوں گی اگر آپ کہیں تو مالکن کے پاس ہو آؤں۔ اب بتاؤ ایک ٹیچر کی بیوی اور مالک کی بیوی کو مالکن کہتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ گلا گھونٹ دوں۔ اس کا بھی اور اپنا بھی بتاؤ کیا کروں؟"

یہی کر دو ابوالفتح کے بچے۔ گلا گھونٹ دو۔ اپنا بھی اور اس کا بھی کیونکہ تم میری بیوی سے شادی سے نہیں کر سکے جو انگریزی کی آٹھ جماعتیں پڑھی ہے اور انگریزی کے کئی جملے روانی کے ساتھ بول سکتی ہے اور میرا گلا گھونٹ دو کیونکہ میری بیوی مالک سے ملتی ہے اور اس کی بیوی سے ملنا نہیں چاہتی اور اسے مالکن بھی نہیں کہتی ——— اور نصیر شیخ کا گلا گھونٹ دو کیونکہ اس سے مجھے بیحد نفرت ہے اور غالباً تمہیں بھی بے حد نفرت ہو۔

ایک بار پھر اس نے دل ہی دل میں اپنی پیٹھ ٹھونکی کہ شیخ نصیر کا نام بھی اسے بغیر کوشش کئے یاد آگیا ہے حالانکہ وہ اس وقت یہاں موجود نہیں تھا۔ اور نہ اس کا کوئی تذکرہ تھا۔ اور نہیں یاد آتا تو صرف اپنا نام جسے بھول جانا اول درجہ کی حماقت ہے۔ واٹ این آفل آس آئی ایم! اپنا نام یاد کرنے کی کوشش کرتے ہی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی گدھا دماغ میں گھس گیا ہو اور دولتیاں چلا رہا ہے۔ نہ جانے یہ گدھا اس کے دماغ سے کب نکلے گا۔

"اب یہی سب باتیں شیخ نصیر سے کہوں گا تو وہ پھر حسینہ کی حماقت میں ایک لمبا چوڑا لیکچر دینے بیٹھ جائے گا" ابوالفتح کہہ رہا تھا اور ایک سیب کو پتلون کی سیدھی جیب سے نکال کر الٹی جیب کی طرف لے جا رہا تھا۔ دونوں جیبوں میں اس نے دو دو سیب ٹھونس رکھے تھے اور ایک سیب کو بار بار ایک جیب سے نکال کر دوسری جیب میں ٹھونسنے کی کوشش کر رہا تھا" پتہ نہیں کس قماش کا آدمی ہے یہ شیخ نصیر باتیں کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بڑا ہمدرد کوئی نہیں ہے۔ جہاں اسے گھر کے کسی نئے جھگڑے کا حال سناتا ہوں فوراً ہی مشورے دینے بیٹھ جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ گھریلو زندگی خوشگوار بنانی ہو تو شوہر اور بیوی کو آپس میں سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے کچھ عادتیں چھوڑنا پڑتی ہیں۔ کچھ نئی عادتیں ڈالنا پڑتی ہیں۔ قاضی بنتا ہے لیکن خود حسینہ کے سامنے آنا نہیں چاہتا۔ حسینہ سے زیادہ خود پردہ کرتا ہے کبھی کبھی اپنی پردہ نشین بیوی کو حسینہ کے پاس بھیج دیتا ہے۔ عجیب و غریب بیوی اسے ملی ہے۔ میٹرک پاس ہے اور دنیا بھر کی جاہل عورتوں سے اس کا میل جول ہے کسی کی بیماری کی حال سن لیتی ہے تو فوراً برتن مانجھنے اور کھانا پکانے کے لئے اس کے یہاں پہنچ جاتی ہے۔ حسینہ نے اس سے اردو کی پہلی کتاب بھی پڑھ لی ہو

اب بتاؤ۔ میٹرک پاس ہے کسی اسکول میں ہی لگ جاتی تو نصیر کی آمدنی دگنی ہو جاتی۔ دونوں میاں بیوی ایک جیسے ہیں۔ نصیر ہمیشہ میرے اور تمہارے لئے دن کی کوئی ملازمت تلاش کرتا رہتا ہے لیکن خود نائٹ کالج کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ کہتا ہے اس طرح مجھے دن میں کام کرنے کے لئے وقت مل جاتا ہے سنا تم نے یوں میرے اور تمہارے اور ہر ایک کے کام کو وہ اپنا کام سمجھتا ہے اور بعض باتیں اتنی دلچسپ کرتا ہے کہ بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے کہتا ہے اگر ایک شوہر کی پسند اس کی بیوی کی پسند نہیں ہے اور بیوی کی پسند کو اس کا شوہر ناپسند کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں نے کسی تیسری بڑی طاقت یعنی اس کی پسند کا خیال نہیں رکھا ہے۔ یعنی اب میں نے سیب خریدے ہیں تو مجھے اللہ میاں سے پوچھنا چاہیئے تھا کہ انہیں سیب پسند ہیں یا چائے۔"

اور اس نے میز سے چائے کی پیالی اٹھائی جو ویٹر اس کے سامنے رکھ گیا تھا اور دوسری پیالی عزیز نے اٹھائی جو ویٹر اس کے سامنے رکھ گیا تھا اور دونوں اللہ میاں والے مذاق پر ہنسے۔ اللہ میاں یہاں ہوتے تو وہ بھی شاید ان غریب ٹیچروں کی اس زندہ دلی پر ہنستے۔ یا شاید یہاں ہوں اور ہنستے ہوں۔ البتہ شیخ نصیر کے بارے میں یہ بات اتنے یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ وہ یہاں ہوتا تو نہ معلوم کیا کرتا۔ شاید حادثاً زیر لب مسکراتا اور اپنے وہی پرانے جملے دہرانے لگتا۔ "تم لوگ تو بس قہقہوں کے لئے انہی کھوکھلے سبب تلاش کر لیتے ہو ورنہ اللہ میاں کی پسند اور ناپسند تو ایک کتاب میں محفوظ ہے۔ جس کا ہر وقت مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔" گویا اللہ میاں کی کتاب نہیں ہے جام جہاں نما ہے کہ آسام کے کھیت اور کشمیر کے باغ اس میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ایک بار پھر اسے مسرت ہوئی کہ اس وقت اس کا دماغ بالکل مشین کی طرح کام کر رہا ہے اور نہ صرف شیخ نصیر کے جملے اسے یاد آ رہے ہیں بلکہ ان جملوں پر ایک دلچسپ سی تنقید بھی اس نے کر ڈالی ہے اور ساتھ ہی ابوالفتح کے اور اس کی گھریلو زندگی کے بارے میں اس نے جو اندازے لگائے تھے۔ وہ بھی سب صحیح تھے کیونکہ ابوالفتح نے واقعی ایک سیب پر آہستہ سے دانت گاڑ دیئے ہیں اور اب اس طرح اس کے چھلکے کو آہستہ آہستہ چبا رہا ہے گویا یہ کام بے خیالی میں خود بخود اس سے سرزد ہو گیا۔

دھیان دراصل ان ڈاکٹروں کی طرف تھا جو بلاوجہ غریب ٹیچروں کے گھر میں بد ذائقہ سیبوں کی سفارش کر دیتے ہیں۔ پھر یہ غریب ٹیچر اپنا پیٹ کاٹ کر ان سیبوں کو خریدتا ہے اور بے خیالی میں انہیں اپنے پیٹ کی نذر کر دیتا ہے اور یوں اس ٹیچر کے وزن میں کوئی کمی نہیں ہو رہی ہے لیکن ایک دوسرا ٹیچر ہے جو بغیر کھائے اس سیب کی تلخی کو محسوس کر سکتا ہے۔ کر رہا ہے۔ ہر چیز میں اس وقت اس دوسرے ٹیچر کو تلخی محسوس ہو رہی ہے ان سیبوں میں جو ابھی ابوالفتح کی جیبوں سے باہر نہیں نکلے ہیں اور اس گفتگو میں جو ابوالفتح یہ پہلا سیب ختم کرنے کے بعد شروع کرے گا اور ہوٹل کے اس ماحول میں جہاں لوگ چھ پیسے کی چائے میں اپنا غم ڈبونے کے لئے آتے ہیں یا اپنا نام یاد کرنے کیلئے آتے ہیں اور بیڑیوں کے اس دھوئیں میں جسے ہوٹل کے بہائی مالک کا ٹیبل فین گاہکوں کی طرف واپس کر رہا ہے ماحول میں تلخی ہے اور خیالات پریشان ہو گئے ہیں۔ ماحول میں گھٹن ہے اور دماغ کا گلا نہیں گھٹتا۔

"یار یہ بہائی لوگ چائے میں پوست تو نہیں ڈالتے؟" اس نے ابوالفتح سے پوچھا۔

ابوالفتح مسکرا دیا۔ اس ابوالفتح کے بچے کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ دوسرا کیا سوچ رہا ہے۔ اور کیوں سوچ رہا ہے۔ اسے دوسروں کی ہر بات پر ہنسی آتی ہے اور اپنی ہر بات پر رونا آتا ہے۔ لیکن اس کے رونے میں بھی ایک مسرت شامل ہوتی ہے۔ ایک اعتماد۔ گویا وہ اس مجرم کو پہچانتا ہے جس نے اس کی مسرتوں پر ڈاکے ڈالے ہیں۔ یہ مجرم اس کی بیوی ہے حسینہ۔ جسے وہ جب چاہتا ہے بید سے مارتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اس نے اپنی غربت کا انتقام اس شخصیت سے لے لیا ہے جو اس غربت کا اصل سبب تھی۔ یہ حسینہ میٹرک پاس نہیں ہے جو کسی اسکول میں ٹیچر ہو سکے اور آٹھواں پاس نہیں ہے جو کسی اونچی سوسائٹی میں شامل ہو سکے۔ اور اوپر سے پردہ کرتی ہے۔ مالک کی بیوی کو مالکن کہتی ہے حسینہ بالکل فضول سی عورت ہے اور یہ ابوالفتح بالکل فضول سا آدمی ہے میرا نام کیا ہے ابوالفتح کے بچے۔

لیکن یہ بات بھی اس نے اپنے دل میں کہی کیونکہ وہ ابوالفتح کے انہماک میں مخل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ ابوالفتح کی پیالی خالی ہو چکی

تھی اور سیب پیٹ کے اس حصہ میں پہنچ چکا تھا جہاں سے کاٹ کر اسے کشمیر کے باغ میں اگایا گیا تھا۔ اور اس کا ہاتھ میز کے پتھر پر آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اس کنارے کی طرف جا رہا تھا جس کے نیچے اس کی ٹانگیں ہیں یا اور پتلون کی جیبیں ہیں۔ اور سیب کے ٹکڑے ہیں جنہیں اس نے ابھی کچھ دیر پہلے ٹھیلے والے سے خریدا ہے ——— ان دونوں شریر لڑکیوں نے بھی سیب خریدے ہوں گے۔ پتہ نہیں انہوں نے قہقہہ کیوں لگایا تھا۔ سیبوں کا ٹھیلہ دیکھ کر یا اسے گدھا سمجھ کر۔

"اوہ" ڈونٹ کیئر فار دیٹ ڈنکی۔"

ساجدہ سلطانہ شاید فلم دیکھنے کے لئے جانا چاہتی تھی۔ مالک ہچکچا رہا ہوگا۔ آقا اور ملازم میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اور خاص طور سے نائٹ کالج کے میٹرک فیل ٹیچر کو مالک کے سامنے دم مارنے کی ویسے بھی جرأت نہیں ہو سکتی۔ لیکن مالک کو شاید جرأت نہیں ہو رہی تھی ضرور اس نے کوئی اندیشہ ظاہر کیا ہوگا۔ مالک کی بات وہ سن نہیں سکا تھا۔ جس وقت وہ کمرے کے دروازہ پر پہنچا ہے اس وقت مالک کی بات ختم ہو چکی تھی اور ساجدہ نے بولنا شروع کیا تھا۔

"اوہ" ڈونٹ کیئر فار دیٹ ڈنکی۔ میں تو کبھی اس گدھے کی پروا نہیں کرتی۔"

ساجدہ انگریزی کی صرف آٹھ جماعتیں پاس تھی لیکن انگریزی کے کئی جملے روانی کے ساتھ استعمال کر لیتی تھی۔ اونچی سوسائٹی کی کئی پڑھی لکھی اور بغیر پڑھی عورتوں سے اس کی دوستی تھی جو اردو بھی مغربی لہجہ میں بولتی تھیں۔ ساجدہ ان کے ساتھ مغربی فلمیں دیکھتی تھی، مغربی فلموں پر گفتگو کرتی تھی، اور عنقریب مغربی طرز پر اپنے بال کٹوانے والی ہو رہی تھی، مغربی لباس البتہ اسے پسند نہیں تھا۔ کیونکہ مغربی عورتیں دوپٹہ جیسی کوئی چیز گلے میں نہیں لٹکاتیں جس کا عورت کے گلے میں لٹکنا انتہا ضروری ہے۔

لیکن اس کے لئے ڈنکی کا لفظ ساجدہ نے آج سے پہلے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ اور نہ اس سے پہلے اس نے کسی غیر مرد کے ساتھ سینما دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اب سے چند ماہ قبل اس کے اندر یہ جرأت نہیں تھی۔ کیونکہ اب سے چند ماہ قبل جب وہ مالک کو ٹی پارٹی کے بہانے پہلی بار اپنے گھر لایا تھا اور کسی دوسرے بہانے سے اسے ساجدہ کے ساتھ چائے کی میز پر تنہا چھوڑ کر خود باہر چلا گیا تھا تو بھی ساجدہ مالک سے مطلب کی ایک بھی بات نہیں کہہ سکی تھی اور اس کی تنخواہ میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکا تھا۔ آج تک نہیں ہوا ہے۔

اور ان مصیبتوں کا ذمہ دار یہ ابوالفتح ہے۔ یہ ابوالفتح کا بچہ روزانہ یہ کالج میں اپنی بیوی کی شکایتیں کرتا تھا اور کہتا تھا کہ کاش میری بیوی پڑھی لکھی ہوتی اور مالک سے میری تنخواہ میں اضافہ کرنے کی سفارش کر دیتی جیسے کہ اشرف کی بیوی نے اشرف کی سفارش کی اور وہ ٹیچر سے پرنسپل بنا دیا گیا۔ اشرف انٹرمیجیٹ تھا۔ انٹر پاس اور میٹرک فیل میں کوئی بڑا فرق نہیں ہوتا لیکن اسّی روپے کی تنخواہ اور ڈیڑھ سو روپے کی تنخواہ میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ ابوالفتح ہمیشہ اس قسم کی باتیں کرتا تھا اور دوسروں کے جذبات بھڑکاتا تھا۔ پس مجبوراً وہ ایک دن چائے کی دعوت کے بہانے سے مالک کو اپنے گھر لے گیا جس طرح کہ ایک مرتبہ اشرف لے گیا تھا، اور کسی دوسرے بہانے سے اسے ساجدہ کے ساتھ چائے کی میز پر تنہا چھوڑ کر خود باہر چلا گیا۔ لیکن ساجدہ اس پہلی ملاقات میں کام کی کوئی بات نہیں کر سکی۔ اور جب بعد کی چند ملاقاتوں میں اس کی جھجک نکل گئی تب بھی وہ اس کا کوئی کام نہیں بنا سکی کیونکہ اسے آج بھی کالج سے اسّی روپے ماہانہ ملتے ہیں جن میں سے ہمیشہ کی طرح پچھتر روپے ساجدہ وصول کر لیتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہوا ہے کہ پہلے کبھی کبھی وہ اپنی عزت کے حوالے کہ اس کی شاپنگ یا سینما کا کوئی پروگرام ملتوی کرا لیا کرتا تھا اور کبھی کبھی سخت سست بھی کہہ لیا کرتا تھا اب الٹی ساجدہ اسے سخت سست کہہ لیتی ہے اور اگر کبھی وہ کچھ کہنے کی جرأت کرتا ہے تو فوراً مالک کا حوالہ دیتی ہے اور دھمکیاں دیتی ہے۔ ساجدہ کے اپنے پاس البتہ اب کئی اچھے کپڑے ہیں۔ بندے ہیں۔ اور ایک ایسی قیمتی انگوٹھی ہے جیسی کہ وہ شادی کے دن بھی اسے نہیں پہنا سکا تھا۔ لیکن یہ سب چیزیں ساجدہ کی ذاتی ملکیت ہیں جیسا کہ مون لائٹ نائٹ کالج کے مالک کی ملکیت ہے ان چیزوں میں اس کا اپنا حصہ صرف اتنا ہے جتنا کہ دھوبی کے گدھے کا کپڑوں کی لادی میں ہوتا ہے۔

"اوہ، ڈونٹ کیئر فار دیٹ ڈنکی۔"

کافی دیر تک ادھر ادھر گھومنے کے بعد وہ واپس آیا تھا۔ مالک کے گھر میں داخل ہوتے ہی اس کے اوپر ایک عجاب ساطاری ہو جاتا تھا جیسے وہ اب تک کسی دوسرے کے گھر میں بیٹھا رہا ہے اور اس کے قدم خود بخود باہر کی طرف اٹھ جاتے تھے۔ تنخواہ میں اضافہ کی اسے اب کوئی آرزو نہیں تھی۔ وہ اب صرف اپنی لگی لگائی ملازمت کو بچانے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ اور اسی لئے وہ اپنے آپ کو اور اپنی ملازمت کو ساجدہ اور مالک کے راستہ سے حتی الامکان دور دور ہی رکھتا تھا۔ کافی دیر تک وہ گھر سے دور دور گھومتا رہا اور جب واپس آیا اور کمرہ کے اندر داخل ہونے لگا تو اسے ساجدہ کی آواز سنائی دی۔

"اوہ، ڈونٹ کیر فار دیٹ ڈنکی۔"

جواب میں مالک نے کچھ کہا لیکن اس کی آواز دروازہ کے باہر نہیں آسکی، یا وہ اسے سن نہیں سکا کیوں کہ اس کے دماغ میں ڈنکی گھس گئے تھے اور دولتیاں چلا رہے تھے۔ اور اس کے دماغ میں تالے پڑ گئے تھے اس لئے یہ ڈنکی کسی طرف سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اسے بالکل پتہ نہیں چل سکا کہ پھر اس نے کیا کیا اور اس کے دماغ نے دل نے ضمیر نے کیا کیا کرنے کا مشورہ دیا۔ ممکن ہے وہ کمرے کے اندر گھس گیا ہو اور اس نے ساجدہ کو اور مون لائٹ کالج کے مالک کو قتل کر دیا ہو۔ لیکن اتنا خوفناک کام وہ کس طرح کر سکتا تھا۔ دماغ میں تالے پڑے ہوں تب بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر کیا اس نے ان دونوں کو صرف گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکال لی اور مالک کے سامنے ہی ساجدہ کے منہ پر بید کے نشان ڈال دیئے۔ یہ حرکت بھی اس کے اختیار سے باہر تھی کیونکہ اسے اپنی ملازمت عزت سے زیادہ پیاری تھی اور کیونکہ اسے ان دونوں چیزوں کے بازار کے بھاؤ معلوم تھے۔

پھر اس نے کیا کیا؟ کیا کیا ہوگا؟ اس کا اپنا دماغ گنگ تھا اور اگر وہ کمرے کے اندر گھسے بغیر چلا آیا ہے اور ساجدہ اور مالک کا مقابلہ کئے بغیر چلا آیا ہے تو پھر دنیا میں کوئی خود نہیں بتا سکتا کہ اتنی دیر وہ کیا کرتا رہا۔ صرف ان دو لڑکیوں کا شرارت آمیز قہقہہ سن کر اسے معلوم ہوا کہ وہ سڑک پر چل رہا ہے۔ اور اس ابوالفتح کو دیکھ کر اس کا گنگ دماغ بھی چلنے لگا ———— چل گیا۔ اب حالت یہ ہے کہ اسے اپنا نام تک یاد نہیں آرہا ہے۔ میرا نام کیا ہے ابوالفتح؟

یہ آخری جملہ اس نے بلند آواز سے کہا اور فوراً ہی اسے ہنسی آگئی کیونکہ ابوالفتح کی کرسی خالی تھی۔ پتہ نہیں وہ کس وقت اٹھ کر چلا گیا۔ عجیب و غریب آدمی ہے یہ ابوالفتح۔ صرف اس وقت تک کسی جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ جب تک کوئی دوسرا اس کی بیوی کا شکوہ اس کی زبانی سنتا رہے اور لالچی اتنا ہے کہ کسی کو اس کا نام تک نہیں بتائے گا چھ پیسے کی چائے پی اور چپکے سے نکل گیا۔ ساجدہ مہینہ بھر خرچ کرنے کے لئے صرف پانچ روپے دیتی ہے ان میں سے تین آنے اس ہوٹل کی نذر ہوگئے اور ایک یہ ابوالفتح ہے جو سیب کھاتا ہے اور حسینہ کو مارتا ہے۔

ایک بار پھر اسے ہنسی آگئی کیونکہ وہ خود ابوالفتح کی طرح ٹھیک نہیں تھا ساجدہ کو بید سے مارنے کا اس نے کبھی ارادہ نہیں کیا تھا اور نہ کبھی اس نے اپنی زندگی کے اندھیرے کسی غیر کے سامنے نمایاں کئے تھے۔ لیکن اگر کر دے۔ اگر ایک بار۔ صرف ایک بار۔ وہ شیخ نصیر کو اپنا دکھ درد سنائے یا صرف اسے یہ بتا دے کہ آج وہ اپنا نام بھول گیا ہے یا صرف اس کے کاندھے پر سر رکھ دے اور روئے .... اور روئے۔

چائے کی خالی پیالی کے قریب ہی اس نے میز پر اپنا سر ٹیک دیا اور رونے لگا۔ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے شیخ نصیر کے کاندھے پر سر رکھ دیا ہے اور رو رہا ہے۔ شیخ نصیر مسکرا رہا ہے اور اس کی مسکراہٹ میں ہمدردی ہے۔ اور شیخ نصیر کچھ کہہ رہا ہے اور اس کے لہجہ میں ہمدردی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے "رو نہیں میرے عزیز .... رو نہیں ......"

فوراً ہی اس نے میز سے اپنا سر اٹھا لیا۔ میرے عزیز؟ میرے عزیز! لاحول ولا قوۃ۔ یہی تو اس کا نام ہے مسٹر عشرت عزیز۔ ٹیچر مون لائٹ نائٹ کالج ٭ (بشکریہ "انی نسیں")

التماس ہے کہ ....

- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے۔
- جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور رکھیے۔
- اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا پورا پتہ لکھنا نہ بھولئے (منیجر)

فیض احمد فیض •

○

گرمیٔ شوقِ نظارا کا اثر تو دیکھو
گل کھلے جاتے ہیں وہ سایۂ در تو دیکھو

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پند گرو، راہ گزر تو دیکھو

وہ تو وہ ہے، تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو

وہ، جواب چاک گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو کبھی اُن کا جگر تو دیکھو

دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اک دن، دلِ پُرخوں کا ہنر تو دیکھو

صبح کی طرح جھمکتا ہے شبِ غم کا اُفق
فیضؔ تابندگیٔ دیدۂ تر تو دیکھو!

(بشکریہ نیا دور)

عبدالرؤف عروجؔ •

۲ دو شعر

نقش کتنے منزل کے مسکرائے تھے لیکن — گردِ راہ میں گم ہے راہبر بھی راہی بھی
ناخداؤں کا احساں کیسے بھول سکتا ہوں — غرق بھی کیا مجھکو مجھ سے داد چاہی بھی

(ھمایوں)

لالہ صحرائی

سنجوگ

(ایک طویل کہانی)

ایجاب

رات بھر وہ ایک لحظہ کے لئے بھی نہ سو سکا۔ رات بھر اس کا ذہن نئے نئے آتشیں خیالات کے فلیتوں کے ساتھ دھڑا دھڑ جلتا رہا۔ اور رات بھر اس کا دل نئے نئے احساسات کی دستک سے دھک دھک بجتا رہا.....

اپنے رگ پٹے میں ایک ایسا میٹھا زہر جاری و ساری پاتا تھا، جس میں بیک وقت زندگی کی حدت اور موت کی ٹھنڈک گھلی ہوئی تھی، اس کا دل کسی طور اس واضح حقیقت کو قبول کر لینے کے لئے آمادہ نہ تھا، کہ نگہت اسے دغا دے چلی ہے۔ لیکن ادھر اس کا ذہن برابر اس کی روح میں گذری ہوئی شام کی اذیت ناک یاد کے ڈنگ چبھوئے جاتا تھا۔ ان لمحوں کی یاد کے ڈنک، جب اس نے پہلے اپنے کانوں اور پھر اپنی آنکھوں کے سامنے نگہت کو اس کی پاک محبت کی اہانت کے قبیح فعل میں مشغول پایا تھا اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی دو سال پرانی محبت کی پاک و مقدس وادی اب ایک، ایسی گہری متعفن اور مکروہ کھائی میں تبدیل ہو گئی ہے، جس میں اس کی زندگی کی تمام مسرتوں کا کارواں اوندھے منہ گر کر تباہ ہو چکا ہے! وہ اب اپنے آپ کو ایک ایسے قلاش اور نادار کی مانند محسوس کر رہا تھا، جو گھر سے لاکھوں میل دور کسی اپنے ہی مہربان عزیز کے ہاتھوں مکمل طور پر لٹ چکا ہو، اور خود کو اس اجنبی دیس میں بھیک مانگنے کے طریقہ سے بھی بے خبر پا رہا ہو.......... تمام شب کے رتجگے کی وجہ سے اس کے منہ کا ذائقہ بے حد کسیلا ہو رہا تھا جیسے کسی نے بہت سا صابن گھول کر اسے پلا دیا ہو، اور اس کا بدن یوں بوجھل کسل مندہ، ھنچا گھٹا اور سوزاں سوزاں تھا جیسے کسی آتش زدہ مکان میں پہروں جلتے رہنے کے بعد کسی نے اسے مردہ سمجھ کر منوں مٹی تلے داب دیا ہو.......... اس نے پلنگ پر لیٹے لیٹے اپنے بدن کی ایک ایک رگ سے توانائی سمیٹ سمیٹ کر اپنے اندر اٹھنے کی سکت جمع کی، اور پھر ایک دھیمی سی کراہ کے بعد ایک طویل جھٹکا کھا کر اٹھ بیٹھا، کمرے کے اندر چاروں طرف اس کے سرہانے رکھے ہوئے ٹیبل لیمپ کی تیز اور بھرپور روشنی پھیل رہی تھی، آج اسے تمام شب لیمپ بجھانے کا خیال بھی نہ آیا تھا، سامنے کھڑکی پر گہرے قرمزی رنگ کے دبیز پردے پڑے تھے، جو اس کے جسم کے جھٹکے اور پلنگ کے لرزہ کی وجہ سے ایک خفیف سے ارتعاش کا شکار ہو گئے نہ جانے کیوں اسے پردوں کے اس ارتعاش سے ہول سا آنے لگا، اور اس نے ہاتھ بڑھا کر انہیں ایک طرف کھینچ دیا۔ کھڑکی کے باہر کا منظر اسے اب صاف نظر آنے لگا۔ سامنے پائیں باغ کے وسیع لان میں صبح کاذب کے ادھ کچرے اجالے تاریکیوں کے ایلوں میں نئی دنیائیں بسا رہے تھے، کھڑکی سے کچھ دور ہٹ کر پھولوں کی روشوں سے پرے کھٹیول کے چند نالے" قد اور گھنے سبز رنگ کے پیڑ اندھیروں میں ایسے یوں لگے جیسے باغ کی سرزمین پر چند پست قامت سیاہ چٹانیں جا گری ہوں!.......... تاہم اس کے ذہن سے پیڑوں کا چٹانیں بن کر نظر آنے کا تصور، ان نرم و گداز اور دودھ کی مانند سپید شگوفوں پر نگاہ پڑتے ہی ہوا ہو گیا۔ جو اوائل بہار کی شہ پاکر ان پیڑوں کے تاریک اور گھنے چھتناروں پر چاندی کے ٹکڑوں کی مانند لس لس کر رہے تھے ایک لمحہ کے لئے اسے یوں لگا۔ جیسے پیڑوں کی چھتریوں کا یہ جھنڈ زمین پر کی کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ سطح آسمان کی کوئی مدور قوس ہے، اور یہ سپید شگوفے پھول نہیں۔ بلکہ درخشاں ستارے ہیں، ستاروں کا خیال آتے ہی اس کی نگاہیں آپ سے آپ آسمان کی سمت اٹھ گئیں

اور وہاں اُسے ان گنت ستارے بالکل شگوفوں کی ہی مانند چمکتے اور ٹمٹماتے
نظر آئے آسمان کی نعمتوں سے اس کی نگاہیں پھسل کر پھر پیڑوں کے شگوفوں
پر آن ٹکیں، اور یہاں سے ابھر کر پھر ٹمٹماتے ستاروں سے جا الجھیں، اور پھر
تادیر وہ ستاروں اور شگوفوں کو اپنے رشتۂ نگاہ سے ایک ہی سلک میں
پرونے کا دلچسپ کھیل کھیلتا رہا۔ بالکل اس معصوم اور انجان بچے کی مانند
جو دنیا و مافیہا سے غافل بیٹھا اپنی ننھی مالا کے بکھرے موتیوں کو یکجا پرونے
کی سعی لاحاصل میں مشغول ہو ــــــــــ ستاروں اور خوشوں کو ایک
ہی لڑی میں پرونے کی سعی جب اسے بھی لاحاصل معلوم ہوئی، تو اس نے
بڑی ہی حسرت کے ساتھ ایک ٹھنڈی آہ بھری، آہ بھرتے وقت ان کا
سارا اندرونی وجود جیسے خوشبوؤں کے سمندر میں غرق ہو گیا، تب اسے
پہلی مرتبہ کھڑکی کے راستے کمرے میں بہہ کر آنے والے ان تیز تیز خوشبوؤں کے
کے ریلوں کا احساس ہوا جو نہ جانے کب سے ان کھیتیوں کے شگوفوں کے
قرالوں سے امنڈ امنڈ کر فضا کو بڑی فراوانی کے ساتھ معطر کئے جا رہے
تھے، لیکن خوشبوؤں کا یہ سحر دوسرے لمحے ہی ٹوٹ کر رہ گیا، اور ان سے لطف
اندوز ہونے کی بجائے اسے ابکائیاں سی آتی محسوس ہوئیں، وہ اپنی ہی
طبیعت کے اس الٹے ردعمل پر از حد متحیر ہوا۔ جیسے زچ سا ہو کر اس نے
پیچھے کی طرف جھک کر اپنا سر زور سے تکیہ پر دے مارا، اور پھر اس ٹھوکے
کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں ماضی کے فلم کی ساری ریل کھل گئی،
جیسے یادوں کی پراسرار بتیاں اجالنے لگیں۔.........

سب سے پہلے اسے وہ منظر یاد آیا، جب آج سے ٹھیک دو برس
پہلے، نگہت کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی، یہ اوائل بہار کی
ایک سانولی سلونی شام تھی، ہمیشہ کی طرح اس روز بھی وہ یہ شام منانے
کے لئے لارنس گارڈن گیا.......... اسے سورج کی روشنی، کھلی
فضاؤں اور فطرت کے واشگاف نظاروں کے ساتھ شروع ہی سے بے حد
پیار تھا۔ جب سے اس کی تقرری لاہور میں ہوئی تھی، ہر شام لارنس
میں گزارنا اس کا ایک ایسا معمول تھا، جس میں شاید ہی کبھی ناغہ ہوتا،
وہاں پہنچ کر اپنی کار کو کلب کے پورچ کی طویل قطاروں میں شامل کر کے
وہ باغ کی دلکشا۔ فضاؤں میں نکل جاتا۔ اور جب تک باغ کے مناظر
پر دن کی روشنی کی ڈھلک قائم رہتی، وہ برابر وہاں کے طویل و رعنا اشجار،
حسین و دلکشا۔ روشوں، معطر و گل پوش کیاریوں سیماب پاش و گہر ریز
فواروں اور سریلی و نشیلی ہواؤں سے لطف اٹھاتا رہتا، پھر جب سورج
غروب ہو جاتا، دن کی تابانیاں ماند پڑ جاتیں، اور باغ کی فضاؤں
پر ہولے ہولے تاریکی کی سیاہ اور پراسرار ردائیں چھانے لگتیں، تو وہ
کسی خوب صورت پیڑ، کسی شاداب روش یا کسی پری چہرہ پھول پر آخری
حسرت بار نگاہیں ڈال کر پلٹتا، اور پھر کلب میں واپس آ کر اپنے دوسرے
بے شمار ہم رتبہ رفیقوں کے ساتھ وہاں کے ہنگاموں میں کھو جاتا
چنانچہ اس روز بھی اپنی کار ہال کے باہر کھڑی کر کے، اور ہال کے اندر
ایک سرسری چکر کاٹ کر، اپنے دو ساتھیوں کو فلش کے چند لقمے دیتے
وہ کلب کے کمپاؤنڈ سے نکل کر جلد ہی باغ کے وسیع احاطے میں داخل
جونہی اس کے قدم وہاں کی پہلی روش پر پڑے، اسے اپنی آنکھوں
سامنے ایک برق سی کوندتی نظر آئی۔ جب اس نے ذرا نگاہیں جما
تو دیکھا۔ کہ یہ جوت ایک لڑکی کے چہرے سے پھوٹی تھی، جو اپنے سیاہ
کی نقاب لٹے اس کے سامنے سے ہنستے ہوئے گزر رہی تھی، لڑکی کے
تین چار اور عورتیں بھی اسی طرح اپنے برقعوں کی نقاب الٹے چلی جا
تھیں، اور سب کی سب بے طرح ہنسے جا رہی تھیں۔ یکایک لڑکی
نگاہیں اس سے چار ہوئیں، اور ساتھ ہی اسے یوں محسوس ہوا،
اس کا آدھا جسم ٹھٹھر کر رہ گیا ہے، اور آدھا جھلس کر،.........
اپنی جگہ پر بت بن کر کھڑا ہو گیا، اور یونہی بے جانے بوجھے، ایک
عالم بے اختیاری میں عورتوں کے اس قافلے کی طرف دیکھنے لگا۔ جو
اس سے کافی دور جا چکا تھا.......... کچھ اور آگے جا کر
نے ایک مرتبہ پھر پلٹ کر اس کی جانب دیکھا وہ ہنستی، اور پھر
ہمجولیوں کے ساتھ باغ کی ایک روش پر مڑ کر اس کی نگاہوں سے
ہو گئی، اس کے اوجھل ہو جانے کے بعد وہ تادیر بدستور بت بنا کھڑا
آخر کار اس نے اپنے پیروں میں پھر سے توانائی آتے محسوس کی، اور
دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا چل دیا، اس کی نگاہیں باغ
نگار خانہ کی بجائے اب اپنے آپ پر تھیں، جیسے وہ اپنے اندرونی
میں کوئی نگار خانہ ڈھونڈ رہا ہو یا پا چکا ہو، ادھر اس کا دماغ یہ
میں مشغول تھا، کہ آخر اسے ایک ہی لمحہ پہلے کیا ہو گیا تھا؟ اس

کسی لڑکی کو بے نقاب دیکھنے کا یہ پہلا موقعہ نہ تھا۔ کالج میں اور اس کے بعد اپنی ملازمت کے دوران میں اسے یہ موقعہ کوئی سینکڑوں ہی مرتبہ حاصل ہوا تھا، اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ ایسے بعض مواقع پر اچھا خاصا متاثر بھی ہو چکا تھا، لیکن اب کی مرتبہ اس کے تاثر کی کیفیت ایک بالکل ہی انوکھے طرز کی تھی، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس لڑکی کو دیکھتے ہی کسی غیر مرئی طاقت نے اس کا اندرونی وجود بالکل کھرچ کر نکال لیا ہو۔ اور اب وہاں ایک ہولناک خلا کے سوا کچھ بھی موجود نہیں ہے، جیسے ساری کائنات پر فنا کی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ اور وہ سینۂ گیتی پر بالکل یکہ و تنہا، حیران و سرگشتہ پھر رہا ہے جیسے اس کی ہستی ایک مٹھی بھر غبار بن کر آسمان کی عظیم پہنائیوں میں معدوم ہو کر رہ گئی ہے۔ جیسے اس کا احساس، اسکے جذبات، اس کی بصارت، اس کی سماعت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں سوچ سکتا، بس چاروں طرف ایک پر ہول ویرانی محیط ہے۔ جس میں وہ سر کے بل لڑھکتا ہوا پاتال کی سمت چلا جا رہا ہے!

سخت بدحواس ہو کر اس نے اپنی آنکھیں ملیں، اور پھر حیرت کے مارے ادھر اُدھر دیکھا، بے خیالی میں چلتے چلتے اب وہ ایک فوارے کے قریب پہنچ چکا تھا جس کے چاروں طرف بے فکروں کی ٹولیاں بیٹھیں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ فوارے کے پہلو میں پھولوں کا ایک حسین و شاداب قطعہ آرمیدہ تھا، جس میں چمن بندی کی تمام صناعی کو کام میں لاکر بے حد عجیب اور دلآویز انداز میں گل کھلائے گئے تھے، لیکن ناگہاں اسے یہ دیکھ کر سخت کوفت ہوئی۔ کہ پھولوں کے اس رنگین دلآویز قطعے کو ایک بدذوق ماں اپنے بچوں کے ہمراہ چلغوزوں کے پس خوردہ کا تختۂ مشق بنا رہی تھی چلغوزوں سے اسے ویسے ہی سخت نفرت تھی۔ چنانچہ اس نے مارے کراہت کے ادھر سے منہ پھیر لیا۔ اور پیچھے کی سمت دیکھنے لگا۔ معاً اس کی نگاہیں دوسری طرف کے لان میں بچھے ہوئے بنچ پر پڑیں، اور اس بنچ پر اسے عورتوں کی وہی ٹولی بیٹھی نظر آئی جسے اس نے اس سے پہلے روش پر دیکھا تھا، بنچ سے ذرا ہٹ کر ہری ہری دوب کے فرش پر وہی لڑکی بدستور نقاب الٹے بیٹھی تھی، اس کے چہرے پر پچھلے پہر کے خنک سورج کی نارنجی شعاعیں بکھر کر اسے عجیب ملکوتی حسن بخش رہی تھیں، اور اس کے لبوں پر بدستور قہقہوں کے دلکش رقصاں تھے، وہ ایک لمحہ کے لئے پھر سن ہو کر رہ گیا، اور اس کی نگاہیں آپ سے آپ پھر لڑکی کی نگاہوں سے جا ٹکرائیں۔ تب لڑکی نے جیسے بوکھلا کر پرلی سمت منہ پھیر لیا۔ اور پھر دوسری عورتوں کی آواز میں آواز ملا کر بلند آواز سے ہنسنے لگی، اس کے چند ہی ثانیے کے بعد لڑکی نے پلٹ کر دیکھا، اور ایک مرتبہ پھر ان دونوں کی نگاہیں آپس میں ٹکرائیں اب کی مرتبہ لڑکی نے نگاہیں پھیرنے میں خاصہ توقف برتا۔ اور پھر جب اس نے اپنا منہ دوسری جانب پھیرا۔ تو اس کی ہنسی میں پہلے کی نسبت زیادہ کشادگی اور زیادہ بلند آہنگی آ چکی تھی۔

لان کے کنارے پر وہ کھڑا تادیر لڑکی کے اس التفات اور اعراض کو پاگلوں کی مانند ملکر ملکر دیکھتا رہا، بالآخر اپنے آپ پر قابو پاکر وہ عورتوں کی سمت بیگانگی کے ساتھ چل دیا، عورتوں کے بنچ سے کچھ دور درے پہنچکر وہ ان کی جانب ترچھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں لڑکی کے چہرے پر تھیں، اور کان اس کی آواز پر............ قریب کے پھولوں بھرے تختہ سے اس نے ایک پھول توڑا، اور پھر اسے یونہی ہوا میں اچھال دیا، اس کے بعد اس نے دوسرا پھول توڑا، اور اسے بھی ہوا میں اچھال دیا، پھر وہ مڑا اور لڑکی کی سمت دیکھنے لگا۔ سورج جب مغربی افق کی سمت کافی ڈھلک چکا تھا۔ اور چاروں طرف ایک شفق رنگ اندھیرا پھیلا رہا تھا۔ اس رنگین اندھیرے میں اسے باغ کی دلکش فضائیں پہلے کی نسبت زیادہ طلسماتی اور جادو بھری نظر آنے لگیں۔ باغ کے درخت، روشیں کیاریاں، فوارے، گھاس کے تختے اور ان پر چلنے پھرنے والے تماشائی سب کے سب ایک گلابی رنگ کے شفاف غبار میں ملبوس نظر آتے تھے، اس غبار کی دلکش اوٹ میں سے لڑکی کا چہرہ اور بھی دلکش معلوم ہوا۔ جیسے گلاب کے تختوں میں ہو جیسے کسی جھیل پر ڈوبتے ہوئے سورج کا سونا ڈھلک رہا ہو! اور وہ بڑے اشتیاق سے اس کی سمت دیکھنے لگا۔ ناگہاں ساری عورتیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور ان کے ساتھ ہی وہ لڑکی بھی، پھر وہ منٹگمری ہال کی سمت چل دیں۔ وہ بھی کشاں کشاں ان کے پیچھے ہو لیا۔ لڑکی بار بار پلٹ کر اس کی سمت دیکھتی جاتی تھی۔ ہال کے قریب پہنچکر وہ پورچ کے سامنے رک گئیں، اتنے میں کاروں کی لمبی قطار میں سے ایک کار آہستہ سے کھسک

کران کے قریب آئی. اگلی سیٹ سے شوفر نے اتر کر کار کا دروازہ کھولا، اور عورتیں ایک ایک کر کے کار میں بیٹھ گئیں، سیاہ برقعہ والی لڑکی سب کے بعد کار میں بیٹھی، اور اس پر ایک نگاہ واپسیں ڈال کر ساتھ ہی ان کی کار چل دی، معاً وہ بھی اپنی کار میں جا کودا اور پھر اس نے اپنی کار سٹارٹ کر کے آن کی آن میں اسے عورتوں والی کار کے پیچھے سڑک پر لا ڈالا۔ سلیٹی رنگ کی کشادہ سڑک اس وقت بہت حد تک ویران اور سنسان تھی، اور سڑک کے فراخ سینے پر ان کی کاریں کسی آہستہ خرام مست ندی کی مانند تھرکتی اور اٹھلاتی ہوئی جا رہی تھیں، شام کے جھٹپٹے میں دونوں کاروں کے ماتھے کی تیز روشنیاں پھیل کر فضا میں اندھیروں اور اجالوں کا ایک عجیب روپ چھل پیدا کر رہی تھیں، اس مکر چاندنی میں اس نے تھوڑی دور آگے جا کر دیکھا. کہ لڑکی نے اگلی کار پر اب عقبی شیشے کے عین پاس جگہ حاصل کر لی ہے، اور وہ بار بار گردن گھما کر اس کی سمت مشتاق نظروں سے دیکھتی جاتی ہے. معاً اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا، اور پھر وہ فی الفور اپنا ایک ہاتھ سٹیرنگ سے اٹھا کر ماتھے کی سمت یوں لے گیا جیسے سلام کر رہا ہو.......... لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا، اس نے دوسری مرتبہ سلام کیا! پھر بھی اسے کوئی جواب نہ ملا، اس نے تیسرا سلام کیا، اور اب کی مرتبہ لڑکی کی انگشت شہادت ایک لمحہ کے لئے عقبی شیشے کے قریب لہرائی، اور پھر اس نے بس ایک ہی لمحہ کے لئے اس کی سرخ پور کو اپنے ماتھے سے چھوا کر تیزی سے گردن موڑ لی، لیکن دوسرے ہی لمحہ لڑکی پھر اس کی سمت پلٹی، اس نے اب کی بار پھر سلام کیا، لڑکی اس کے جواب میں پوری کشادگی کے ساتھ مسکرادی ساتھ ہی اس کی کار کی تیز روشنی سامنے والی کار کے عقبی شیشے پر نور کی پھوار بن کر پڑی، جس کی دودھیائی شعاعوں میں اسے لڑکی کا سنہری چہرہ لوح فلک کا کوئی درخشاں نقش بنکر نظر آیا، اور وہ اپنی جگہ بے خود ہو کر رہ گیا، قریب تھا. کہ کار کا سیرنگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا کہ معاً سامنے لڑکی نے اسے پھر سلام کیا، اب کی اس نے ایک کی بجائے دو انگلیاں اٹھا رکھی تھیں، اور اس کا چہرہ پہلے کی نسبت زیادہ سنہری زیادہ روشن، اور زیادہ دلکش نظر آ رہا تھا. یکایک عورتوں کی کار سڑک کے کنارے ایک کوٹھی کی سمت گھوم گئی، پھاٹک کے راستے کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو کر ان کی کار کچھ دور سیدھی چلتی رہی، اس کے بعد وہ دائیں سمت گھوم کر کوٹھی کی فصیل کی اوٹ میں چھپ گئی۔

اس نے اپنی کار کو فوراً بریک لگائی. کار ایک کراہ کے ساتھ رکی اور ساتھ ہی بے اختیار اس کے منہ سے ایک آہ نکل گئی، اور وہ گم سم ہو کر سامنے تاریکی آمیز خلاؤں میں گھورنے لگا. پھر معاً اسے احساس ہوا. کہ اس ویران سڑک پر رات کے وقت یوں کار روک کر دیر تک کھڑے رہنا مناسب نہیں، چنانچہ اس نے کار کے دروازے سے گردن نکال کر سڑک کے گرد و پیش کا جائزہ لیا، اور اسے یہ معلوم کر کے کافی اچنبھا ہوا، کہ یہ عین وہی مقام ہے، جہاں پہلو والی کوٹھی میں اس کے ایک رشتہ کے ماموں رہتے ہیں. اس کے یہ ماموں دیر سے اپنے گاؤں سے لاہور اٹھ آئے تھے اور یہاں اچھی خاصی دولت پیدا کر کے بڑے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہے تھے، جب اسے لاہور میں تقرری کا پروانہ ملا، تو گھر سے چلتے وقت اس کی امی نے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ وہ وہاں اپنے ان ماموں سے ضرور ملے. بلکہ یہی بہتر ہے کہ وہ انہی کے پاس جا کر قیام کرے. اس کی امی نے اسے بتلایا تھا. کہ اس کے ماموں کے پاس ایک بہت ہی وسیع و کشادہ اور عظیم الشان کوٹھی موجود ہے. لیکن بدقسمتی سے ان کی کوئی اولاد نہیں چنانچہ وہ اپنی بیگم سمیت اس وسیع کشادہ کوٹھی میں تن تنہا رہ رہے ہیں لہٰذا اس کا وہاں جا کر رہنا، کسی صورت میں بھی ان میاں بیوی کے لئے تکلیف کا باعث نہ ہوگا. لیکن چونکہ وہ نیا نیا ملازم ہوا تھا، اور وہ اپنی ملازمتی زندگی کے آغاز کو کسی رشتہ دار کے ہاں قیام سے داغدار کر کے اپنے اعلیٰ عہدہ کے وقار کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا، لہٰذا اس نے امی سے وعدہ کرنے کے باوجود اپنے ماموں کی کوٹھی میں مستقل قیام کو پسند نہ کیا، اس کی بجائے اس نے اپنے لئے سول لائنز کا ایک الگ تھلگ بنگلہ منتخب کیا. اور والدہ کو لکھ دیا، کہ چند دفتری مجبوریاں ماموں جان کے ہاں قیام کے آڑے آ رہی ہیں، تاہم ایک مرتبہ وہ اپنے. ماموں کے ہاں گیا ضرور، وہاں اگرچہ اس کے ماموں اور ممانی نے اس کی خوب آؤ بھگت کی، اور اصرار کے ساتھ اپنے ہاں مستقل قیام کی دعوت بھی دی، لیکن نجانے کیوں، اسے ان دونوں سن رسیدہ میاں بیوی کے وجود بے حد ٹھنڈے ٹھنڈے محسوس ہوئے، اور ان کی کوٹھی کا سارا ماحول اسے

ایک عجیب افسردگی اور اضمحلال کا شکار رہا۔ جس کا اس کے دل پر کچھ ایسا اثر ہوا، کہ وہ اپنی طبیعت کو دوسری مرتبہ وہاں جانے کے لئے کسی صورت آمادہ نہ کر سکا۔ اس دوران میں اس کے ماموں تین چار مرتبہ کوئی نہ کوئی سفارش لے کر اس کے دفتر میں ملاقات کے لئے آئے۔ اور ہر مرتبہ انہوں نے ایک خفگی آمیز پیار کے ساتھ اسے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی لیکن وہ ہر بار وعدہ کر کے توڑ دیتا۔ البتہ وہ اپنی والدہ کو بڑے التزام کے ساتھ ہر خط میں یہ خوش کن اطلاع ضرور تحریر کر دیتا۔ کہ وہ ماموں جان کے ہاں اکثر آیا جایا کرتا ہے اور وہ اس پر بڑی شفقت فرمایا کرتے ہیں، حالانکہ یہ قطعی جھوٹ تھا، اور وہ صرف ایک مرتبہ کے علاوہ ماموں کے گھر تو کجا، ان کی کوٹھی کی سمت بھی نہیں گیا تھا، اور اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اول روز ہی سے اپنے ماموں اور ان کی کوٹھی کے ماحول سے خواہ مخواہ متنفر ہو چکا تھا، لیکن ——— اس شام جب وہ اپنے ماموں کی کوٹھی کے سامنے ویران سڑک کے سناٹے میں اپنی کار روکے کھڑا تھا تو اسے یکایک یہ احساس ہوا۔ کہ اس کا تنفر بڑی تیزی کے ساتھ اندر ہی اندر تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ برف کی اس ننھی سی قاش کی مانند جو عین گرمیوں کے ایام میں دھوپ تلے پڑی ہو، اور شعلہ رو سورج کی نگاہِ گرم کی تاب نہ لا کر اندر ہی اندر گھلی جا رہی ہو.......... وہ بے حد حیران تھا، کہ اس کے اندرونی وجود کو یوں بے دردی کے ساتھ گھلانے اور پگھلانے والا یہ شعلہ ساماں سورج کہاں سے اور کیسے طلوع ہو گیا، اس نے دوسری مرتبہ ایک طویل سرد آہ بھری، جیسے اپنی آہوں کی پھونک سے اس سورج کی لَو کو بجھانا چاہتا ہو، اور پھر اپنی کار موڑ کر واپس چل دیا.......... فضا میں اب کافی اندھیرا پھیل چکا تھا، جس کی سیاہیوں میں سڑک کے کناروں پہ ایستادہ پیڑوں کے سایوں نے مزید اضافہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے وجود میں بے حد تھکن اور شکستگی محسوس کر رہا تھا، اور شاید اسی نسبت سے اس نے اپنی کار کی رفتار بھی خاصی دھیمی کر رکھی تھی، ایک مرتبہ جب کار دو درپر پیڑ کے جھنڈ سے برآمد ہوئی تو وہ سامنے سے آتے ہوئے ایک سائیکل سوار کے ساتھ بمشکل ٹکراتے ٹکراتے ہوئے بچا، کار کی روشنی میں جب اس نے سائیکل سوار کے چہرے پر خوف کی سپیدیوں کے ساتھ ساتھ غصہ کی سرخیاں بھی غلطاں و پیچاں دیکھیں تو اسے بھی بے حد غصہ آ گیا، لیکن صرف اپنی ہی ذات پر، اس نے سیٹرنگ پر سے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر زور سے دانتوں کے ساتھ کاٹا، اور پھر سوچنے لگا، کہ آخر اسے کیا ہو گیا ہے؟

وہ ایک شستہ و مہذب نوجوان ہے، حکومت کا ایک ذمہ دار افسر اعلیٰ دل و دماغ کا مالک انسان ہے، اس نے اب تک اپنی زندگی میں ہزاروں نہیں تو سینکڑوں لڑکیوں کو ضرور دیکھا ہو، ان لڑکیوں میں سادہ مزاج الھڑ دیہاتی دوشیزائیں بھی تھیں اور شہروں میں پلی ہوئی الٹراماڈرن قسم کی شوخ و شنگ سوسائٹی گرلز بھی ان میں سے کئی کی قربت میں گھنٹوں بیٹھ چکا ہے۔ اور ان سے ہر قسم کی باتیں کر چکا ہے پھر آخر آج ایک عام سی سادہ سی، حسین سی، اور دلچسپ سی، لڑکی کے اندر کون سی ایسی انوکھی بات تھی کہ وہ خواہ مخواہ اس کے پیچھے رستوں اور سڑکوں پر اس اندھیری اور سنسان رات میں مارا مارا پھر رہا ہے: اور بالکل دیوانوں اور احمقوں کی سی حرکات کر رہا ہے، جوں جوں وہ یہ باتیں سوچتا جاتا اس کا غصہ اور اسی نسبت سے اس کے کار کی رفتار بڑھتی جاتی، آخر غیظ و غضب کے پیہم جھکولوں سے اس کا سارا بدن بری طرح لرزنے لگا۔ سیٹرنگ پر رکھے ہوئے ہاتھ کانپنے لگے، اور کار بے قابو ہونے لگی۔

"نان سنس!" وہ اپنے ہونٹ چباتا ہوا جیسے اپنے آپ سے بولا جونہی یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے، اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے کسی نے ایک زناٹے کا تھپیڑا اس کے منہ پر رسید کر دیا ہو، اس کا سارا بدن ٹھٹھر کر رہ گیا، اس کی نگاہیں جھک گئیں، اور اس کا غصہ دھیما پڑ گیا، اور ساتھ ہی اس کی کار کی رفتار بھی مدھم ہو گئی، معاً اس کے سامنے کار کے شیشے پر اسی لڑکی کا سنہری چہرہ اسی طرح لوحِ آسمانی کا کوئی طلائی نقش بن کر ابھرا، اور کبھی مشتاق نگاہوں، کبھی ایک انگلی کے سلام اور کبھی دو انگلیوں کے سلام کے ساتھ، اس کو اپنی مسکراہٹوں کی زد میں لے کر پے بہ پے اس کے ہوش و حواس پر وار کرنے لگا، اس سنہری چہرے کے تصور سے اب اسے بے حد لذت محسوس ہونے لگی، اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ وہ غصہ جو ابھی ایک لمحہ پہلے اس کے دل و دماغ پر بے طرح مسلط تھا۔ اب ہوا ہو چکا ہے اور شاید ہمیشہ کے لئے......

اس کی نگاہوں کے سامنے کار شیشے پر پیڑوں کے سایوں اور اوائل شب کے سرمئی اجالوں میں مسلسل کشمکش جاری تھی، لیکن لڑکی کا سنہری چہرہ اندھیرے اجالے کی اس کشمکش سے کوئی اثر لئے بغیر بدستور ایک سی آب وتاب کے ساتھ شیشے پر ایک منور قرص بن کر ٹکا ہوا تھا اور مسلسل جگمگائے جارہا تھا، اس چہرے کو کبھی وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا کبھی دیوانوں کی مانند گھورنے لگتا، اور کبھی اس کی طرف دیکھتے دیکھتے بے اختیار مسکرا دیتا، اپنی ان دیوانگی آمیز حرکات پر اب اسے ہرگز کوئی غصہ نہ ہوتا تھا بلکہ .... اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ ایک سراسر انوکھے، ان جانے اور نہایت ہی عجیب اور پراسرار احساس سے آشنا ہو رہا ہے، یہ احساس جو بیک وقت کئی متضاد کیفیتوں کا مجموعہ تھا جس میں آگ کی جان سوز تپش بھی تھی، اور شبنم کی روح پرور ٹھنڈک بھی. جس میں نوشگفتہ پھولوں کی تازگی بھی تھی، اور محبوس فضاؤں کی دل دوز گھٹن بھی، جس میں بہار کی جانفزا شگفتگی بھی تھی، اور خزاں کی روح فرسا پژمردگی، اور پامالی بھی .... وہ خود کو ایک ایسی وادی میں رواں دواں پاتا تھا، جس کے چاروں طرف رنگا رنگ پھولوں کی پریاں، بہشتی حلے پہنے کھڑی تھیں، جس میں جابجا کلکاریاں مارتے ہوئے چشمے موجزن تھے، اور جس کی فضاؤں میں سریلی و نشیلی ہوائیں موسیقی کے دریا بہا رہی تھیں. لیکن عین اس وادی کے سر پر ایک نہایت ہی غضبناک اور شعلہ نشاں سورج دہک رہا تھا، اور وہاں کی ہر ہر شے پر آگ برسا رہا تھا! .... اسے زندگی بھر ایسے جذبے سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا، چنانچہ وہ اس کے تجزیہ سے یکسر قاصر تھا تاہم اپنی اس معذوری پر اسے جو احساسِ محرومی ہوتا تھا، اس کی لذت پر وہ اس وقت عرفان و آگہی کے سارے لشتاروں کو قربان کرنے کے لئے تیار تھا .... انہی خیالات میں غرق جب وہ دوبارہ منٹگمری ہال کے قریب پہنچا، تو اسے ہال کی کھڑکیوں کے پردوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی روشنیوں کی موجیں بڑی پیاری لگیں، فضاؤں کے دوش پر ہال سے آنے والے نغموں کی مدھم مدھم گونج سوا تھی، اس نے اپنی کار ایک مشینی سے قصد کے ساتھ ہال کی سمت موڑنا چاہی. لیکن عین اسی لمحے، سامنے، کار کے شیشے پر وہی سنہری چہرہ پھر تڑپا، مسکرایا، اور اسے دیوانہ بنا گیا، تیزی کے ساتھ اس نے سٹیرنگ موڑا اور پھر کار کو گھر جانے والی سڑک پر ڈال دیا.

گھر پہنچ کر اس نے موٹر گیراج میں کھڑی کی، ملازموں کے کوارٹروں سے اس کا بوڑھا اور سادہ لوح خانساماں دوڑتا ہوا آیا، جسے دیکھ کر وہ غصے سے بولا: "آج ہم کھانا نہیں کھائیں گے"! اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا، سامنے مینٹل پیس پر دیوار گیر بلب تلے اس کی ایک تصویر رکھی تھی، وہ اس کے قریب جاکر رکا، اور اسے کچھ دیر دیکھتا رہا. پھر اس نے سیدھا اپنی خوابگاہ کا رخ کیا، اور کپڑے اور جوتے اتارے بغیر وہ اپنے بستر پر دراز ہو گیا.

اس رات بھی وہ ایک لحظہ کے لئے نہ سو سکا.

صبح اٹھ کر اس نے پانی کے چند چھینٹے منہ پر ڈالے، ناشتے کی میز پر کچھ لقمے نگلے، اور پھر موٹر نکال کر اپنی کچہری چلا گیا، کچہری میں اس روز جو بھی مقدمہ اس کے سامنے پیش ہوا، اس نے بلا سوچے سمجھے سب کی دوسری تاریخ لگا دی، اس کے بعد اس نے پیش کار کو کچھ الّم غلّم دفتری ہدایات دیں، اور خود کچہری کے ریٹائرنگ اپارٹمنٹ میں گھس کر ایک آرام کرسی پر دراز ہو گیا، اور سگریٹ پہ سگریٹ پھونکنے لگا. جوں توں کر کے کچہری کا وقت ختم ہوا اور وہ گھر لوٹا. گھر آکر اس نے خانساماں کے محنت سے بنائے ہوئے لنچ کے چند لقمے منہ میں ٹھونسے، اور پھر جاکر خوابگاہ میں پلنگ پر گر پڑا اور یونہی خواہ مخواہ کروٹیں بدلنے لگا، سرہانے پڑے ہوئے ریڈیو کی سوئی گھمائی، لیکن جلد ہی دق ہو کر اسے بھی بند کر دیا. آخر جب گھڑی نے چار بجائے تو وہ اٹھا. غسل کر کے اس نے کپڑے بدلے. پھر سگریٹ سلگا کر وہ کچھ سوچتا ہوا گیرج کی سمت گیا، اور موٹر سٹارٹ کر کے باہر نکل گیا.

اپنے ماموں جان کی کوٹھی کے پورچ میں پہنچ کر اس نے کار کا ہارن بجایا، ایک نوکر اندر سے برآمد ہوا. اس نے نوکر کو اپنا کارڈ دیا، تھوڑی دیر کے بعد کوٹھی کے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا. اور

اس میں سے اس کے ماموں جان، تیزی کے ساتھ آتے دکھائی دیئے
انہیں دیکھ کر اس نے اپنی کار کا دروازہ کھولا، پھر کار سے اتر کر ہولے
ہولے قدم اٹھاتا اپنے ماموں کی پیشوائی کو چلا۔

"ارے! تنویر بیٹا! تم کدھر راستہ بھول گئے؟" اس کے ماموں
اسے دیکھتے ہی بلند آواز سے بولے:۔

"بس یونہی آگیا ہوں ماموں جان۔ میں نے سوچا کہ آج ذرا
گرمی ہے، اس لئے کیوں نہ ماموں جان کی آئس کریم کا مزا چکھا جائے
اور ہاں سلام عرض کرتا ہوں"!

اس کے ماموں اس کی اس سراسر غیر متوقع بے تکلفی پر پہلے
تو کچھ بھنائے، اور پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولے ——— "جیتے
رہو بیٹا، بھئی آئس کریم کی دعوت کی بو تم نے خوب سونگھی!" اور
اس کے ساتھ انہوں نے بڑھ کر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔

ڈرائنگ روم میں اس وقت ایک صوفے پر اس کی ممانی جان
دراز تھیں، وہ بھی اس کی غیر متوقع آمد پر بڑی بوکھلاہٹ کے ساتھ
اٹھ بیٹھیں، اور بولیں:۔ "اوہو، تنویر بیٹا تو آج پھر لاہور آگئے!"

"صاحبزادے آئس کریم کھانے آئے ہیں" اس کے ماموں نے
کیس نکال کر کہا اور پھر باہر نکل گئے، اس نے اپنی ممانی کو ادب سے
سلام کیا، اور پھر سامنے صوفے پر بیٹھ گیا،

"بھئی خوب وقت پر آئے" اس کی ممانی اپنے خضاب زدہ بالوں
کو بڑی آن بان کے ساتھ دوپٹے کے پلو سے ڈھانپتے ہوئے بولیں "ہم
نے بھی آج پڑوس والوں کی آئس کریم کی دعوت کر رکھی ہے۔ بس وہ
لوگ آیا ہی چاہتے ہیں، بہت اچھا کنبہ ہے۔ تم ملو گے تو بے حد خوش
ہو گے، جانو، بالکل اپنے گھر ہی کے آدمی ہیں، ہو بہو تمہارے ننھیال والوں
کی مانند ہیں، صورت شکل، تہذیب سلیقہ تو بس ان پر ختم ہے، اس
کے علاوہ اللہ نے سب کچھ ہی دے رکھا ہے، یعنی دولت بھی ہے اور
حکومت بھی۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں، لے لو! ستیاناس نگوڑے حافظ
کا، میں تو باتوں ہی باتوں میں سب کچھ بھول گئی، ارے او شبو، اری
او شبن، افوہ، نہ جانے سب کہاں مر گئے نوکر کیا ہیں، چھلاوہ ہیں
چھلاوہ، ذرا آنکھ جھپکی اور میاں بیوی سٹکے، بس حرام کی روٹیاں کھانے
کو مل رہی ہیں اور یہ دونوں نابکار مزے سے نوابی کا کھیل کھیل رہے
ہیں۔ موئے چوٹے کہیں کے!" ممانی اسی طرح بے تحاشا بولتی اور
بڑبڑاتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھیں، اور پھر عقبی دروازے کی سمت
بڑھیں، اور وہ یہ سوچنے لگا۔ کہ اپنی ممانی اور ماموں کے متعلق اس نے
جو نظریہ پہلی ملاقات میں قائم کیا تھا، اس پر فوری نظر ثانی کی ضرورت
ہے۔ خصوصاً اس کی ممانی تو ہرگز کوئی ٹھٹھرا ہوا وجود نہیں ہے یکایک
باہر برآمدے میں بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی، اور اس کے
ساتھ ہی کچھ مہین اور مسرور آوازیں اور چند نقرئی قہقہے بیرونی دروازے
کے دبیز پردوں سے کھیلتے ہوئے ہوا کے جھونکوں پر سوار اندر آگئے۔ اس
کی ممانی تیزی کے ساتھ واپس پلٹیں، اور پھر بولیں "لو وہ آگئیں!"
ادھر دروازے کے پردے تیزی کے ساتھ تڑپے اور اکٹھی تین چار بے پردہ
عورتیں، بے باکانہ ہنستی کھیلتی، ہوئی اندر گھس آئیں اس کا دل سینے
کے اندر بری طرح دھڑکا، اس معصوم پنچھی کی مانند جو حلقہ دام میں
پہلی مرتبہ پھنس رہا ہو.......... اس نے آنے والیوں کی
سمت غور سے دیکھا، تو اسے سب کے آخر میں کل والی لڑکی بھی نظر
آئی، جونہی لڑکی کی نگاہیں اس کی نگاہوں سے ٹکرائیں، لڑکی کے
منہ سے بے اختیار "اوئی" نکل گیا، اور وہ منہ پھیر کر تیزی کے ساتھ
پیچھے کی سمت پلٹ گئی ——— اس موج کی مانند جو ساحل
کے آغوش میں آکر پھر گہرے پانیوں کی سمت لوٹ جائے!

اس کی ممانی نے لڑکی کو واپس لوٹتے دیکھ لیا، اور وہ تیزی
سے بولیں:۔ "ارے رے رے، نگہت بیٹا شرماؤ مت ——— بھئی
یہ تو اپنا ہی لڑکا ہے، یعنی تمہارے خالو کا بھانجا اور بالکل تمہارے
شمیم کی مانند"

"اجی واہ خالہ جان! آپ بھی کمال کرتی ہیں، ماشاءاللہ
یہی تو شرمانے کے دن ہیں، ہماری نگہت دلہن کے!" ان میں سے
ایک نسبتاً بڑی عمر کی مگر بے حد شوخ و شنگ لڑکی آنکھیں نچا کر
بولی۔ اور دلہن کا لفظ سیدھا اس کے قلب میں تیر بن کر ترازو ہو گیا

"ہٹو بھئی طلعت، تم تو ہر وقت بیچاری کے پیچھے ہاتھ دھو کر
پڑی رہتی ہو" اس کی ممانی نے آگے بڑھ کر نگہت کا ہاتھ اپنے ہاتھ

مین لے لیا، اور پھر بولی، "آخر ایسا بھی کیا، بچاری کو خواہ مخواہ کبھی دلہن بنا دیتی ہو، کبھی کچھ اور کبھی کچھ، اونہہ! آخر ایسا بھی کیا!" اور اس کو دل میں کھبا ہوا تیر یک بیک لسے ربڑ کا بنا ہوا محسوس ہونے لگا ———

پیوستِ جان، مگر بے ضرر!

"بہت شریر لڑکی ہے!" آنے والیوں میں سے ایک بڑی عمر کی مگر کافی بنی ٹھنی خاتون بولیں،

"شریر کیا، شرارت کی پتلی کہا ہوتا خالہ جان" ایک سب سے کم سن لڑکی بولی۔

"بجا ارشاد ہوا۔ محترمہ گڑیا جان" طلعت نے اس کے سامنے مصنوعی آداب بجا لاتے ہوئے کہا۔ اور یہ سن کر سب بلند آواز میں ہنس دیئے اس کی ممانی نگہت کا ہاتھ پکڑ کر اسی صوفے تک لے آئیں جس پر وہ بیٹھا تھا، اور پھر بولی:۔ "لو نگہت، آج تم ہمارے شرمیلے مہمان کے ساتھ بیٹھو" ——— ادھر طلعت نے تقریباً ترنم سے کہا:———

"خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے شرمیلے دو!" اور پھر خود سامنے والے صوفے پر دھم سے بیٹھ گئی، باقی دونوں عورتیں جن میں ایک خاص بڑی عمر کی تھی، اور اب تک بالکل خموش تھی۔ طلعت کے ساتھ ہی بیٹھ گئیں، طلعت کا یہ فقرہ سن کر اس نے اور نگہت نے بیک وقت طلعت کو بڑی غصیلی نظروں کے ساتھ گھورا، اس کا غصہ بالکل خالص تھا لیکن نگہت کی نظروں میں غصہ کے ساتھ ذرا سے پیار کی ملاوٹ بھی موجود تھی، طلعت ان دونوں کو یوں اپنی سمت تکتے دیکھ کر بڑی ہی بے نیازی کے ساتھ مسکرا دی۔ عین اسی لمحے اس کی اور نگہت کی نظریں باہم ٹکرائیں، اور ساتھ ہی طلعت کے خلاف دونوں کا مشترکہ غصہ اس ٹکراؤ میں پس کر ہوا ہو گیا۔

"لیکن خالہ جان، آپ نے ہمارے شرمیلے مہمان کے ساتھ ہمارا کوئی باقاعدہ تعارف تو کرایا نہیں"، طلعت بولی۔

"ارے ہاں، یہ تو میں بھول ہی گئی!" اس کی ممانی ناک پر مخصوص نسوانی ادا کے ساتھ انگلی جماتے ہوئے بولی:۔

"لو جی یہ ہے آپ کے خالہ جان کا بھانجا اور ہمارا بھانجا، نام ہے سید تنویر احمد، بیرسٹری پاس ہے اور خیر سے ابھی چند ہی ماہ پہلے لاہور میں اول درجہ کا مجسٹریٹ بن کر آیا ہے۔ لیکن شرمیلا اتنا ہے کہ کوئی وضعدار ملزم بھی اپنی جگہ پر کیا ہوگا، چنانچہ یہ ملزم شاید اسی لئے اپنے قیام لاہور کے چار ماہ میں آج دوسری مرتبہ ہمارے ہاں آیا ہے حالانکہ نہ تو ہم نے اس پر کوئی مقدمہ دائر کر رکھا ہے، اور نہ ہی ——— "دائر کرنے کا کوئی ارادہ ہے" یہ نگہت تھی۔

اسے نگہت کی زبان سے پہلی مرتبہ چند الفاظ سن کر یوں محسوس ہوا، جیسے یہ سادہ سے الفاظ نگہت نے نہیں، بلکہ زبانِ ہاتف نے ادا کئے ہیں، بڑی بے قراری کے ساتھ اس نے صوفے پر پہلو بدلا، اور مسکرا کر بولا:۔

"لیکن حضرات، کسی ملزم پر کوئی مقدمہ دائر کرنے سے پہلے واقعات کی بھی ضرورت پڑتی ہے، اور یہاں ——— "

"اس کا آپ فکر نہ کریں" طلعت بات کاٹتے ہوئے بولی:۔ "واقعات آپ سے آپ رونما ہو جایا کرتے ہیں۔ لیجئے عرض کرتی ہوں، اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر اپنے ایمان کی رو سے محترمہ خالہ جان کی عدالت کے روبرو سچ سچ بیان کرتی ہوں، کہ ہم نے کل شام آپ کے ان ملزم نما مجسٹریٹ صاحب کو لارنس گارڈن میں پھولوں کی چوری کرتے ہوئے پایا، حالانکہ وہاں اس کی صاف ممانعت موجود ہے"۔

"اور میں اس واقعہ کی گواہ نمبر ۲ بن کر حاضر ہوں" ———

یہ پھر نگہت تھی!

"اور میں گواہ نمبر ۳ بن کر" تیسری اور سب سے کم سن لڑکی بولی۔۔

وہ ایک لمحہ کے لئے سخت بوکھلا گیا۔ لیکن پھر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا:۔ "میں گواہوں کی اس معنی خیز سازش پر احتجاج کرتا ہوں کہ وہ عدالت کی طلبی کے بغیر از خود گواہیاں لکھواتے جاتے ہیں، محترم عدالت اس جانب توجہ کرے"۔

"عدالت مقدمہ خارج کرتی ہے"۔ اس کی ممانی ہنس کر بولیں اور پھر اس کے ساتھ ہی فضا قہقہوں سے گونج اٹھی،

قہقہے ختم ہوئے، تو اس کی اور نگہت کی نگاہیں پھر آپس میں ٹکرائیں،

"دیکھئے حضرات، قہقہے لگانے کی بہترین جگہ لان کی کھلی جگہ اور

آئس کریم کی میز ہے، لہٰذا باہر تشریف لے چلئے اور اپنے پھیپھڑوں کی طاقت کو وہیں آزمائیے۔" اس کے ماموں اندر داخل ہوتے ہوئے بولے،
اس پر پھر ایک فرمائشی قہقہہ لگا، اور سب اٹھ کر باہر کی سمت چل دیئے اٹھتے وقت نگہت اپنا پرس صوفے پر سے اٹھانا بھول گئی، جسے بڑھ کر اس نے اٹھا لیا، اور پھر نگہت کو پیچھے سے مخاطب کر کے بولا: "گویا نمبر ۲ صاحب، آپ کا پرس!" نگہت ایک دم پلٹی، اور پھر اس نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے اپنا پرس لے لیا، پرس لیتے وقت اس کی انگلی کی پور اس کے ہاتھ کے ساتھ ذرا سی چھو گئی، اور اسے یوں محسوس ہوا، جیسے اس کے ہاتھ کے ساتھ کوئی چنگاری لپٹ گئی ہو۔ بوکھلا کر اس نے اپنا ہاتھ منہ میں داب لیا، اور پھر سب کے ساتھ وہ بھی.. باہر نکل گیا۔

باہر لان میں ایک کنارے پر ایک گھنے سرسبز پیڑ کے سایہ تلے چند چمنستانی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، جن کے آگے سپید براق چادریں اوڑھے چند پست قامت میز دراز تھے، میزوں پر قسم قسم کے پھل بڑی بڑی طشتریوں میں سجے ہوئے تھے، وہ سب کرسیوں پر جا بیٹھے، اور پھر فوراً ہی اس نے اپنی ممانی کو مخاطب کر کے یہ سوال کیا۔

"بھلا ممانی جان، یہ یک طرفہ تعارف کرانے کا فن آپ نے کہاں سے سیکھا ہے؟"

"یک طرفہ ڈگری کے طریقہ سے!" طلعت نے لقمہ دیا۔

"لیجئے، آپ شاید بن بیٹھے۔ کی وکیل ہیں!" نگہت نے فوراً کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں، مجسٹریٹ کے لئے کسی وکیل کی ہر بات، فی الفور تسلیم کر لینا نہایت ہی غیر ضروری قسم کی چیز ہوتا ہے!" اس نے تابڑ توڑ جواب دیا۔

اتنے میں نوکروں نے معطر و خوش رنگ آئس کریم کے کپ سامنے لا کر رکھنا شروع کر دیئے، نگہت اس کے دائیں ہاتھ بیٹھی تھی، لہٰذا پہلا کپ اسی کے سامنے رکھا گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر یہ کپ اپنی جانب کھسکا لیا،

"لیجئے، مجسٹریٹ صاحب نے دوسرا مرتبہ فرمایا، انصاف، انصاف! خالہ جان کی عدالت انصاف فرمائیے" طلعت نے تقریباً چیخ کر کہا، اس پر ایک فلک شگاف قہقہہ پڑا، اور وہ اپنی جگہ سخت کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ بالآخر موضوع کو ٹالتے ہوئے بولا:۔

"ممانی جان، وہ میں نے تعارف کے لئے جو کہا تھا؟"

"ہاں ہاں بیٹا، واقعی یہ میں پھر بھول گئی ——— سنو، یہ ہیں ہمارے پڑوسی میرزا رفعت بیگ کی بڑی صاحبزادی مس طلعت پروین جو کافی بڑ بولی ہیں، اور جنہوں نے پچھلے سال بی اے کیا ہے، یہ ہیں ان کی مجھلی صاحبزادی مس نگہت پروین جو آج کل بی اے میں پڑھتی ہیں اور کافی شرمیلی ہیں، اور یہ ہیں ان کی چھوٹی صاحبزادی مس نزہت پروین، جو دسویں میں ہیں، اور خاصی ——— ش"

"منجھولی ہیں" طلعت بات کاٹتے ہوئے بولیں۔ جس پر پھر قہقہہ پڑا۔

"اور یہ ہیں، ہماری پڑوسن، بیگم پروین رفعت ——— اس کے علاوہ ان کے گھر کے ایک فرد مسٹر شمیم رفعت بھی ہیں، جو ———"

"اپنے مستقل مرض کے ناگہانی دورہ کے باعث آج اس مجلس میں تشریف نہیں لا سکے" طلعت نے پھر بات کاٹی۔

"خیر باشد، کیا مرض ہے ان کو؟" اس نے انداز و تشویش پوچھا

"سینما بینی اور مٹینی شو کی عاشقی" طلعت نے جواب دیا۔

"اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی" نزہت نے چہک کر آوازہ کسا، اس پر وہ اپنی "سیادت" کو ذہن میں لا کر خواہ مخواہ جھینپا، تو نگہت نے تنک کر چھوٹی بہن کو ڈانٹ پلائی "چپ کر دی غالب کی جیبی ایڈیشن ———" اور یہاں پھر ایک قہقہہ پڑا۔

اب آئس کریم کا دور باقاعدہ شروع ہو چکا تھا اور ان میں سے ہر ایک قہقہوں، آئس کریم کے پیالوں، اور پھلوں سے پورا پورا انصاف کئے جا رہا تھا، اس کی نگاہیں بار بار نگہت کی نگاہوں سے ٹکرا جاتی تھیں اور اس ٹکراؤ سے ہر بار اس کے ذہن میں ایک نیا عالم کھل جاتا تھا، اگر کبھی اتفاق سے اس کا ہاتھ یا پیر نگہت سے چھو جاتا تو، اس کا سارا بدن جیسے کسی برقی رو کے لمس سے بری طرح جھنجھنا اٹھتا، وہ تیزی کے ساتھ اپنی کرسی پر پہلو بدلنے لگتا۔

بالآخر کھانے کا دور ختم ہوا، اور پھر وہی خوش گپیاں چل نکلیں

"تنویر بیٹا، تم نے تو صبح کچھ بھی نہ کھایا" اس کی ممانی بولیں

"No Auntie, I have done full justice." اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"Well done, Mr. Justice."

———— یہ نگہت تھی، اور اس کے ساتھ ہی ایک قہقہہ بلند ہوا، اس نے گھوم کر دیکھا۔ تو اسے نگہت کے چہرے پر ایک بھرپور بہار کا منظر نظر آیا ہرے بھرے پیڑ کے پس منظر میں اس کا سنہری چہرہ یوں نظر آتا تھا، جیسے صرافوں کے سبز کاغذ پر سونے کا کوئی عزارضی پھول

ان کی یہ خوش گپیاں کافی دیر تک اسی طرح جاری رہیں تاآنکہ شام کے سائے لان اور کوٹھی پر رینگنے لگے۔ تب نگہت بولی۔

"خالہ جان، تنویر صاحب نے آج جس طرح کم کھایا ہے، اس کا کفارہ وہ اس طرح ادا کریں، کہ کل شام ہماری آئس کریم سے بھی انصاف فرمائیں"

"ہیر، ہیر" طلعت بلند آواز میں بولی "انصاف، انصاف!"

"عدالت انصاف فرمانے کی دعوت کو بصد خوشی قبول کرتی ہے اور وکیل کی وکالت سے کوئی اثر لئے بغیر براہِ راست سائل کے بیان پر قبول کرتی ہے" وہ مسکرا کر دھیمے سے بولا، اور سب نے مل کر طلعت کو اپنے قہقہہ کی زد پر لے لیا، پھر جب وہ رخصت ہوئے، اور اس نے سب کے ساتھ ساتھ نگہت سے بھی مصافحہ کیا۔ تو ہمت کر کے اس نے اس کے ہاتھ کو زور سے دبا دیا، نگہت ذرا سا کسمسائی اور پھر جواباً اس نے بھی اپنی انگلیوں کی گرفت اس کے ہاتھ پر سخت کر دی، جب ان کے ہاتھ علیحدہ ہوئے، تو اسے یوں محسوس ہوا، جیسے وہ دوسرا علیحدہ ہونے والا ہاتھ۔ نگہت کا نہیں بلکہ اس کے اپنے ہی جسم کا ایک حصہ تھا، جو اب کٹ کر دور جا پڑا ہے۔ نگہت نے پیچھے ہٹ کر اسی کل والے طریقہ سے انگشت شہادت ماتھے پہ لے جا کر اسے سلام کیا، اور پھر اپنی امی اور بہنوں کے ساتھ مل کر اپنی کوٹھی کی سمت چل دی، اس نے بھی جلدی سے ایک دوست کے ہاں جانے کا بہانہ بنایا، اپنے ماموں اور ممانی سے اجازت لی۔ اور پھر موٹر میں بیٹھ کر گھر کی سمت چل دیا۔

آج بھی واپسی پر نگہت کے سنہری چہرے کی شبیہہ کل ہی کی مانند اس کی کار کے شیشے پر نمودار ہو کر تھرکنے لگی، جسے دیکھ کر وہ کبھی مسکراتا، کبھی ہنستا، اور کبھی آہ بھر دیتا، جب اسے نگہت کے ساتھ اپنے مصافحہ کی یاد آتی، تو یوں محسوس ہونے لگتا جیسے اس کا ہاتھ کسی مخملیں گدے تلے آسودہ پڑا ہو، بار بار وہ سٹیرنگ پر سے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر کار کی نرم گداز سیٹ تھپتھپاتا، اور اسے اپنے بدن پر پھیرنے لگتا۔

اس روز گھر پہنچ کر وہ بڑی ترنگ کے ساتھ سیٹی بجاتا ہوا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، تا دیر مینٹل پلیس کے سامنے کھڑا ہو کر اپنی تصویر کو دیکھتا رہا۔ اور مسکراتا رہا۔ تاآنکہ خانساماں نے آ کر اسے کھانا رکھنے کی اطلاع دی، اور آئس کریم اور پھلوں سے لدا پھندا ہونے کے باوجود اس نے کافی پیٹ بھر کر کھانا کھایا، اور پھر بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں جا کر سو گیا۔

اگلے روز شام کو اس نے نگہت کے ہاں جو آئس کریم پارٹی کھائی وہ بعد میں، ایسی ہی مزید کئی پارٹیوں کا حرف آغاز بنی، اور وہ مہینوں تک ان کے ہاں باقاعدہ آتا جاتا رہا۔ آئے دن وہ لوگ اس کی پارٹیاں کرتے اور وہ بھی انہیں کسی نہ کسی روز مقامی ہوٹل میں دعوت دے ڈالتا، ادھر نگہت کے ساتھ اس کے تعلقات اب کئی رسمی حدود کو تیزی کے ساتھ پھاندتے چلے جا رہے تھے۔

پورا ایک سال اسی طرح گذر گیا!

———— اور پھر ایک شام جب وہ سہ پہر کی ایک ہلکی پھلکی ضیافت کھانے کے بعد نگہت کی کوٹھی کے لان میں بیٹھا حسب معمول نگہت کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا، وہ دونوں تنہا تھے، اور فضا میں آہستہ آہستہ شام کی سیاہی گھلتی جاتی تھی۔ اور جھٹپٹے میں لان کے پیڑ یوں لگتے تھے، جیسے پاکبازی کا دعویٰ رکھنے والے منافق نیکی کے اجالے اور بدی کے اندھیرے کے درمیان نعشوں کی مانند معلق ہوں، تو ———— اس نے آہستہ سے نگہت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں جما کر ایک آتشیں لہجے میں بولا۔

"نگہت ———— میری روح ———— کیا میری ساری زندگی محرومی میں کٹے گی؟"

"محرومی کا لفظ عدالتی زبان میں شاید الٹے معنی رکھتا ہے" نگہت نے

مسکرا کر جواب دیا۔

"نہیں، نگہت خدارا اسے مذاق نہ سمجھو۔ میں گھر سے یہ طے کرکے آیا ہوں، کہ اپنی زندگی کے بارے میں تمہاری زبان سے آخری فیصلہ آج سن کر ہی جاؤں گا ——— کیا تم نہیں جانتیں، کہ مسلسل ایک برس سے میں امید و بیم کے کس عذاب میں گرفتار ہوں ——— زندگی اور موت، جنت اور جہنم، عرش اور فرش، نور اور تاریکی کے درمیان ہر وقت معلق رہنے کی اذیت اب مجھ سے نہیں سہی جاتی نگہت! خدارا آج مجھے پہلی اور آخری بار یہ بتلا دو، کہ کیا تم زندگی بھر میرا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو؟"

جواب میں نگہت بت بنی اسے دیکھتی رہی،

اس نے اپنے دونوں ہاتھ نگہت کے شانوں پر رکھ دیئے اور پھر اسے ہلکا سا جھنجھوڑتے ہوئے بڑی بے تابی کے ساتھ بولا۔

"بتلاؤ نگہت، خدارا جلد بتلاؤ، کہ میرے تاریک مستقبل میں کیا تم ایک ضوفشاں سورج بن کر چمکو گی۔ یا اس کو جلا دینے والی بجلی ہو میری زندگی کی اجاڑ وادی میں تم ایک دوامی نگہت بن کر سماؤ گی یا یادوں کی ہولناک گراہ بن کر؟ ....

..........بتلاؤ نگہت، خدارا کچھ تو منہ سے بولو"

"تنویر! میں اس بات کا جواب بھلا تنہا کیونکر دے سکتی ہوں جس کا تعلق میرے سارے کنبہ سے ہے" نگہت جیسے کچھ سوچتی ہوئی بولی ———

"نہیں، اس کا تعلق تمہارے اور میرے کنبوں سے زیادہ میری اور تمہاری روحوں سے ہے، میری اور تمہاری زندگیوں سے ہے۔ اور میں خوب جانتا ہوں، کہ تم اتنی بیوقوف ہرگز نہیں ہو، کہ اپنی زندگی کے اہم ترین فیصلہ کو دوسروں کی مرضی کے تابع کر دو"

"پھر بھی ———"

"نہیں، نگہت" وہ بچوں کی طرح ٹھنک کر اور نگہت کی بات کو تیزی کے ساتھ کاٹتے ہوئے بولا۔

"میں دوسروں کے ٹھونسے ہوئے خیالات کو تمہارے منہ سے سننے کے لئے یہ جھک نہیں مار رہا، مجھے تو صرف یہ بتلاؤ، کہ اس قصے کو آخر تم کیا سمجھتی ہو"

"اس قصے کو میں بھی اپنی زندگی کی اصل داستان ہی سمجھتی ہوں تنویر! ایسی داستان جو میری موت کے ساتھ ہی انجام کو پہنچے گی!" نگہت خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔

"آہ نگہت، میری نگہت" وہ وارفتہ ہو کر جھومنے لگا، اور پھر نگہت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دیوانہ وار اسے چومنے لگا۔

"تنویر! میں اپنے مستقبل کا ایسا کوئی تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتی جس میں تمہاری ذات کا پرتو یا عکس موجود نہ ہو" نگہت بولی۔

"تو پھر کیا مجھے اپنے مستقبل کے بارے میں مطمئن ہو جانا چاہئے؟"

"بالکل مطمئن!"

اور اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ نگہت کے گرد اور زیادہ پھیل گئے۔ اور پھر تاریکی نے بڑھ کر دونوں کو ڈھانپ لیا، ادھر شیر بر طلعت نے کوٹھی کے برآمدے سے ہانک لگائی۔

"کیوں جی، ہے کوئی تنویر بنام نگہت ——— مہربانی کرکے ملزم اور مدعی دونوں جلد از جلد محترم ڈیڈی کی عدالت میں حاضر ہوں ———"

اور وہ دونوں ہنستے ہوئے کوٹھی کی سمت چل دیئے۔

آرسی

اگلے دن جب شام ہوئی، تو وہ بجائے سیدھا نگہت کے ہاں جانے کے پہلے اپنے ماموں کی کوٹھی پر پہنچا، اس وقت گھر میں اس کے ماموں تو موجود نہ تھے۔ البتہ اس کی ممانی ڈرائنگ روم میں بیٹھی حسب معمول ملازموں کو ڈانٹ پلا رہی تھی، اسے آتا دیکھ کر اس کی ممانی کے غصے میں حسب معمول کچھ کمی آ گئی۔ ساتھ ہی ملازم چھوکرے آنکھ بچا کر وہاں سے کھسک گئے۔ اتنے میں اس کی ممانی چہرے پر بشاشت پیدا کرتے ہوئے بولی

"اخاہ! میرا بیٹا، آج پھر راستہ بھول گیا"

"سلام عرض کرتا ہوں ممانی جان" وہ کچھ کھسیانا سا ہو کر بولا۔

"واقعی میں کئی روز سے آپ کے ہاں نہیں آ سکا اور اس کی میں معافی چاہتا ہوں، تاہم آج میں آپ کے ہاں ایک بے حد اہم ضرورت سے آیا ہوں"

"ارے۔ اتنا سنجیدہ مت بنو، اس عمر میں" اس کی ممانی سنجیدہ ہو کر بولیں۔

"نہیں ممانی جان، اس بات میں سنجیدگی کے بغیر چارہ نہیں"

"خیر باشد، آخر قصہ کیا ہے؟"

"قصہ تو یہ اتنا ہی پرانا ہے ممانی جان' جتنی پرانی آدم کی ذات، البتہ میں اس کی ذرا تجدید کرنا چاہتا ہوں۔"

"بھئی ذرا کھل کر بات کہو، پہلیاں نہ بجھواؤ —— لو میں نگوڑی پھر بھول گئی —— اری او شبن، ذرا جھپاک سے صاحب کے لئے چائے بنا لاؤ، عمدہ سی —— ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"ممانی جان میں تو آپ ہی سے کچھ کہلوانا چاہتا ہوں۔" وہ منہ بھینچ کر بولا۔

"توبہ اللہ، کیا کہلوانا چاہتے ہو مجھ سے؟" اس کی ممانی نے جیسے زچ ہو کر کہا۔

اتنے میں شبن کی بجائے بیرا شبلو، چاندی کا ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا، اور ان کی گفتگو کچھ دیر کے لئے رک گئی، بیرے نے ٹرے کو اس کے سامنے ایک چھوٹی سی تپائی پر رکھا، اور پھر پرے جا کر مودب کھڑا ہو گیا، اس کی ممانی نے بیرے کو چلے جانے کا اشارہ کیا............

.... بیرے کے جانے کے بعد تا دیر خموشی طاری رہی، جس کے دوران میں اس نے چائے بنائی، سگرٹ نکال کر سلگایا، اور پھر چائے کی چسکیوں کے ساتھ آہستہ آہستہ سگریٹ کے کش لیتا ہوا بولا:۔

"ممانی جان، میں آج کل اپنی زندگی کے ایک بڑے نازک دور سے گزر رہا ہوں۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ یہ دور کب اور کیسے ختم ہو گا، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں، کہ اس کے انجام کے ساتھ میری تمام آئندہ زندگی کا ایک ایک لمحہ وابستہ ہو چکا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ، یہ تم کسی ناٹک کے فقرے تو نہیں دہرا رہے ہو؟" اس کی ممانی مزید زچ ہو کر بولی۔

"ہاں، یہ ایک ناٹک ہی ہے ممانی جان۔" وہ بولا "میں آج کل ایک ناٹک ہی کھیل رہا ہوں، لیکن اب میں اس ناٹک کو اپنی حقیقی زندگی کی داستان بنانا چاہتا ہوں، اور مجھے اس سلسلہ میں آپ کی مدد درکار ہے۔"

"لڑکے! آخر بات کیا ہے؟" اس کی ممانی نے متحیر ہو کر پوچھا

"بات یہ ہے، ممانی جان، کہ نگہت کے ساتھ میرا انس اب اس حد تک بڑھ چکا ہے، کہ وہ اور میں دونوں ہی اپنی آئندہ زندگی ایک دوسرے کے بغیر قطعی حرام سمجھتے ہیں!" اس نے یہ جملہ اس تیزی سے ادا کیا، جیسے کوئی کمسن طالب علم اپنا دن بھر کا رٹا ہوا سبق فر فر سنا رہا ہو۔

"قہ، قہ، قہ، قہ" اس کی ممانی بے اختیار قہقہے لگانے لگی "بس اتنی سی بات تھی؟ قہ۔ قہ۔ قہ۔ قہ۔" پھر وہ سکون سے بولی: "میاں صاحبزادے، ہم لوگ بھی آنکھیں رکھتے ہیں، تو تمہارا اور نگہت کا جوڑ ایک عرصہ سے ہماری نظر میں ہے۔ اس کی تجویز میں اور تمہارے ماموں نہ صرف بیگم پروین کو بلکہ تمہاری امی کو بھی خط کے ذریعہ پیش کر چکے ہیں اور ہمیں دونوں جگہوں سے حوصلہ افزا جواب ملا ہے۔ تاہم اسے اب تک تم سے پوشیدہ اس لئے رکھا، کہ جی چاہتا تھا، کہ کسی روز تمہیں چپکے سے بلا کر سہرا باندھا جائے ——"

اپنی ممانی کی یہ باتیں سن کر اسے یوں محسوس ہوا، جیسے اس کا بدن کسی سبک و لطیف غبارے کی شکل اختیار کر کے اوپر ہی اوپر آسمان کی سمت اٹھتا چلا جاتا ہے، اور وہ ستاروں کے تابناک خوشوں، اور چاند کے منور قرص کی بھید وں بھری روشنیوں کی موجوں پر ہلکورے کھاتے رواں دواں ہے۔ مسرت کے ایک ناگہانی احساس سے اس کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ اور اس کی آنکھیں ان مصفا جھیلوں کی طرح چمک اٹھیں، جو یکبارگی بہت سی سرچ لائٹوں کی زد میں آگئی ہوں۔ اس نے اپنے سگریٹ کو ایش ٹرے میں پھینکا۔ اور پھر مسکراتے ہوئے اپنی ممانی سے بولا:۔

"سمجھ میں نہیں آتا۔ ممانی جان۔ کہ آپ کی اس مہربانی پر میں خود کو مبارکباد دوں، یا آپ کو؟"

"ایسے معاملوں میں مبارکباد تو ہمیشہ بڑوں کو ہی دی جاتی ہے، میاں صاحبزادے۔" اس کی ممانی ہنس کر بولیں۔

"تو لیجئے آپ کا بھانجا تہ دل سے آپ کی خدمت میں مبارکباد عرض کرتا ہے۔"

"اور تمہاری ممانی اسے دل و جان سے قبول کرتی ہے اور دعا کرتی ہے، کہ خدا اس سنجوگ کو رہتی دنیا تک قائم رکھے!"

عین اس وقت دروازہ کھلا، اور نگہت کمرے میں داخل ہوئی

وہ اور اس کی ممانی کچھ دیر کے لئے حیران رہ گئے۔ نگہت بھی پہلے حیران سی ہوئی پھر بولی:۔ "اخاہ، تو ہمارے ملزم یہاں تشریف فرما ہیں۔ کیوں جی ہماری چائے نے آپ کا کیا قصور کر رکھا ہے، جو آپ اس طرح یہاں بیٹھے اس کی بیدردی سے گت بنا رہے ہیں"۔

"چھوڑو نگہت بیٹی، یہ تو یہاں ابھی آکر بیٹھا ہے"۔ اسکی ممانی نے تکلف سے کہا۔

"خالہ، بس آپ بھی ہمیشہ انہی کی سائڈ لیتی ہیں"۔ نگہت نے بن کر کہا۔

"بہت اچھا، بھائی، ہم آئندہ ان کی سائڈ نہیں لیں گے، بلکہ ان کے لئے اب کوئی اور مستقل سائڈ صاحبہ ڈھونڈ نکالیں گے"۔ اس کی ممانی بولی۔

نگہت ذرا سی دیر کے لئے جھینپی، اور پھر جلدی سے موضوع پلٹ کر بولی:۔ "ہاں تو چلئے ناں تنویر صاحب، ہماری چائے بے چاری آپ کی یاد میں آہیں بھر بھر کر ______"

"دھواں ہوتی جا رہی ہے"۔ اس نے ہنستے ہوئے نگہت کا فقرا پورا کیا، اس کی ممانی بھی ساتھ ہی ہنس دیں،

"خالہ جان آپ بھی چلئے"۔ نگہت بولی۔

"نا بیٹی، میں تو ابھی نہیں جا سکتی، تمہارے خالو جان بس آیا ہی چاہتے ہیں"۔

"تو انہیں بھی ساتھ لے چلیں گے"۔

"نہیں بھئی، آج نہیں ______ آج تم ہم سب کی جگہ بس تنویر ہی کو لے جاؤ"۔

"تو چلئے تنویر صاحب، آج آپ کو سب کی جگہ مختلف کرسیوں پر باری باری بٹھلایا جائے گا"۔ نگہت نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی دونوں ہنستے ہوئے باہر نکل گئے۔

نگہت کی کوٹھی تک آتے آتے اس نے اپنی اور اپنی ممانی کی آج والی ساری گفتگو اس کے سامنے دہرادی، نگہت اس کی باتیں سن کر مسکرایا کی!

جب وہ کوٹھی پر پہنچے، تو کھانے کے کمرے میں ان کا بڑی شدت کے ساتھ انتظار کیا جا رہا تھا۔ ہال میں نگہت کے گھرانے کے تمام افراد کے علاوہ آج دو اور اجنبی نوجوان بھی بیٹھے تھے، وہ ان اجنبیوں کو وہاں دیکھ کر کچھ متعجب سا ہوا، ان دونوں کے اندر داخل ہوتے ہی سب کھڑے ہو گئے اور اس کے دیر سے آنے پر اسے پیار بھرے انداز میں لتاڑنے لگے۔ بیگم پرویز نے لپک کر اس کا اجنبی نوجوانوں سے تعارف کرایا:۔ "یہ ہیں مسٹر فرحت مرزا، جو ہمارے آبائی گاؤں کے ایک ہونہار نوجوان ہیں، آپ انگلینڈ ریٹرن ہیں، اور حال ہی میں یہاں سول انجینیر بن کر آئے ہیں۔ اور یہ ہیں ان کے چچا زاد بھائی مسٹر فرحت مرزا، جو ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کر چکے ہیں، اپنے بھائی کے ساتھ آئے ہیں، اور یہیں لاہور میں پریکٹس کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اور برخوردار یہ ہیں ہمارے مہمان عزیز، مسٹر تنویر احمد مجسٹریٹ، جن کا ہم عرصہ سے انتظار کر رہے تھے، اور جو نہ جانے اب تک کس حوالات میں بند تھے!"

قہقہوں سے ڈائننگ ہال گونج اٹھا، اور ساتھ ہی "خوب، خوب" کہکر دونوں نوجوانوں نے اس کے ساتھ ایک گرمجوش مصافحہ کیا، لیکن نجانے کیوں، ان دونوں کے ہاتھ چھوتے ہی اس کے بدن میں برف کی ایک لہر دوڑ گئی، پھر جب وہ کھانے کی میز پر بیٹھے، تو اس نے دیکھا، کہ راحت مرزا کو طلعت کے ساتھ جگہ ملی ہے، اور اسے حسب معمول نگہت کے ساتھ لیکن جب اس نے اور آگے کی سمت دیکھا، تو اس نے نگہت کے دوسرے پہلو میں فرحت مرزا کو بیٹھے پایا۔ چائے پر حسب معمول طلعت خوب چہکی لیکن آج اس کا رخ زیادہ تر اپنے پڑوسی راحت کی جانب تھا۔ ہاں وہ سارا عرصہ چپ چپ بیٹھا رہا، کھانے کے بعد نگہت آج خلاف معمول خود ہی اسے ہمراہ لے کر دو ان کی سمت چل دی، وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چلتا رہا، جب وہ دوسروں کی نگاہوں سے دور ہو گئے، تو نگہت اسکی طرف دیکھ کر مسکرائی، اور پھر بولی۔

"جناب چپ شاہ کی خدمت میں اطلاعاً گزارش ہے کہ میاں فرحت بھی خود کو بندی کے امیدواروں میں شامل کرتے ہیں"۔

"مجھے یہ معلوم کر کے ہرگز کوئی اچنبھا نہیں ہوا، مس نگہت! امیدواری آخر کسی امید پر ہی ہوا کرتی ہے"۔ اس نے طعن آمیز رکھائی سے جواب دیا۔

"بے وقوف مت بنو، تنویر!" نگہت تڑپ کر بولی،

"محبت اور وقوف دو متضاد باتیں ہیں ——— اور پھر ہر شخص کو یہ حق پہنچتا ہے، کہ جس کو جی چاہے، اپنانے کی کوشش کرے"

"تم غلط کہہ رہے ہو، تنویر، نگہت کو اپنانے کا اب کسی اور کو ہرگز حق نہیں پہنچتا"

"کیا یہ سچ ہے؟"——— اس نے لڑکپن سے پوچھا،

"بالکل سچ ——— بالکل سچ ہے، حضور مجسٹریٹ صاحب ابھی کل ہی شام میں نے جناب کی خدمت میں کیا کیا نہ عرض کیا تھا—— تنویر تم تو بالکل ہی بھولے ہو"

"ہاں میں بھولا ہوں، میں بھولا ہوں نگہت، اور یہی بھولپن میری زندگی کا سرمایہ ہے، نگہت! سچ جانو، جب سے تمہارے ساتھ ملا ہوں، میں ایک کھلونا بن کر رہ گیا ہوں ایک بے دست و پا، کل کا کھلونا جس کی کلید تمہارے ہاتھ میں ہے، جس طرح چاہو مجھ سے کھیلو، جب تک جی چاہے کھیلو، اور جب جی بھر جائے تو توڑ دو، پھوڑ دو، واللہ میں ہرگز اپنے آپ پر کوئی اختیار نہیں رکھتا"

"اختیار کے معاملہ میں تو میں بھی بے بس ہوں تنویر! میں بھی زندگی میں پہلی مرتبہ ایک نئی قسم کی محبت کا تجربہ کر رہی ہوں ایسی محبت کا تجربہ جو میرے روئیں روئیں میں نشہ بن کر سما چکی ہے، اور میرے بدن کے رگ و ریشہ میں خون کی بوندیں بن کر رواں دواں ہے——— دیکھو چھوٹی چھوٹی بے حقیقت باتوں پر بدگمان نہ ہو جایا کرو، نگہت نے تمہارے ساتھ عمر بھر کا پیمان وفا باندھ رکھا ہے اور نگہت اپنا یہ پیمان ضرور نبھائے گی ——— تاہم تم بغیر شہادت کے نہ مانوگے آخر مجسٹریٹ ہو ناں، تو پھر بتلاؤ کہ اپنے اس دعویٰ کی شہادت کے طور پر کیا شے پیش کروں، اپنی جان، اپنی زندگی، یا ———"

"بس بس خدارا آگے کچھ نہ کہنا" اور نگہت کے ننھے دہن پر اپنا قوی ہاتھ رکھتے ہوئے بولا:"نگہت! مجھے معاف کر دو کہ میرے دل میں یہ واہمہ گزرا" اور اس نے چلتے چلتے نگہت کا ہاتھ زور سے دبا دیا، نگہت لان کے ایک بنچ پر بیٹھ گئی، یہ بنچ تنہائیوں میں ان دونوں کی مخصوص نشستگاہ تھی باغ کے کسی ویران گوشے سے الو کی آواز سنائی دی، دونوں اس بے ہنگم اور سراسر غیر رومانی آواز پر پہلے بدحواس ہوئے اور پھر مسکرا دیے لگے، پیپل کا ایک سرسبز پیڑ ان کے سامنے چاندنی میں نہایا ہوا الیستادہ تھا۔ اور فضا میں چاروں طرف حسین و مصفا شب مہتاب نے خنک نور کے دریا بہا رکھے تھے، اسے اپنے پاس کی ہر شے بے حد دلکش نظر آنے لگی، اور ساری کائنات پر خواہ مخواہ پیار آنے لگا۔ نگہت نے اس کی طرف اپنی نگاہوں سے پیار کے ہزاروں سمندر انڈیلتے ہوئے دیکھا۔ اور.......... پھر ہولے سے بولی:"تنویر! ایک بات مانوگے؟"

"یعنی مجھ سے سرتابی کی توقع بھی ہے!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا:-

"نہیں ایسا تو نہیں" نگہت نے اسے بدستور پیار بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے کہا:- "بات صرف اتنی ہے، کہ چند دنوں سے امی پر نہیں، البتہ اباجان پر فرحت مرزا کی چکنی چپڑی باتوں کا اور تم سے زیادہ تنخواہ پانے کی لاف زنی کا خفیف سا اثر ہو رہا ہے اور پھر اسے ہمارے ساتھ رشتہ داری کا بھی زعم ہے، جسے میں تو بہر حال کوئی وقعت نہیں دیتی۔ کیونکہ تم جانو اب اپنی زندگی کی میں خود مالک ہوں، تاہم میں مصلحت اسی میں سمجھتی ہوں کہ چند روز کے لئے ——— اور بس چند ہی روز کے لئے ——— تم ہمارے ہاں ذرا آنا جانا کم کر دو——— دیکھو تم پھر بگڑنے لگے۔ تنویر! میں اپنے گھر کی سیاست کو تم سے بہتر سمجھتی ہوں۔ اگر تم میری یہ التجا قبول کر لو تو جس آخری فیصلے پر ہم دونوں پہنچ چکے ہیں، اسے عمل میں لانے کے لئے مجھے بہت مدد ملے گی"

"نگہت تمہاری ہر بات مجھے دل و جان سے منظور ہونی چاہئے چنانچہ یہ بات بھی مجھے دل و جان ہی سے منظور ہے۔ خواہ یہ کیسی ہی عجیب اور تکلیف دہ ہی کیوں نہ ہو، کچھ اور ارشاد؟" وہ بولا

"اور ارشاد یہ ہے۔ کہ اباجان کے دل سے ان صاحب کی خرافات کا اثر دھونے کے لئے کوئی تین ماہ کا عرصہ درکار ہوگا"

"یہ بھی منظور ہے" اس نے خادموں کی طرح سر جھکا کر کہا۔

"اور یہ، کہ بہتر ہوگا کہ تم فی الحال ہفتے میں دو ہی بار مثلاً ہر

بدھ اور اتوار کی شام کو ہمارے ہاں آیا کرو۔"

"یہ بھی منظور ہے۔"

"اور یہ کہ ہر بدھ اور اتوار کی شام کو ہمارے ہاں ضرور آنا ہوگا۔ ضرور آنا ہوگا۔ ضرور آنا ہوگا۔ اور ہرگز کسی مجبوری دجبوری کا بہانہ نہیں سنا جائے گا۔"

"یہ یک طرفہ ڈگری بھی منظور ہے۔"

"اب یہ گزارش ہے کہ رات گذرتی جاتی ہے، آپ کے جانے اور میری واپسی کا وقت قریب ہے، لہذا ـــــــ مجھے جانے دیجئے"

"یہ بھی منظور ہے"ـــــــ اس نے پھر ایک بار کسی کل کے کھلونے کی مانند سر ہلا کر کہا۔

اور اس کے بعد عین چاندنی کے ہجوم میں تاریکی نے ان دونوں کو پھر اپنی آغوش میں لے لیا۔

ـــــــ اور پھر پورے دو ماہ اس نے نگہت کی عائد کی ہوئی ان پابندیوں کی مکمل اطاعت کے ساتھ گزار دیئے، ہفتہ میں مسلسل تین دن وہ اپنی شامیں ضبط کرکے اور صبر کی کٹاریوں کے ساتھ قتل کرتا رہتا تاہم جب وہ وعدے والے دن نگہت سے جا کر ملتا، تو اس کے دل و دماغ سے جدائی کا ان تینوں دنوں کا غبار، نگہت کے لطفِ فراواں سے حل کر دیتا، اور وہ قطعاً بھول جاتا۔ کہ نگہت اور اس کے مابین اب چوبیس گھنٹوں کی بجائے بہتر گھنٹوں کا اذیت ناک فاصلہ حائل ہو چکا ہے

اور پھر کل صبح اسے اپنے مقدمہ کا ایک موقعہ ملاحظہ کرنے کی خاطر بامرِ مجبوری بدھ کے دن لاہور سے باہر جانے کا پروگرام بنانا پڑا، اس نے یہ پروگرام ملتوی کرنے کی خاطر کافی ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن وہ کیا کرتا، مقدمہ کے کوائف ہی کچھ ایسے تھے، کہ اسے بدھ کی محبوب شام کو لاہور سے باہر تباہ کرنے کے سوا ہرگز کوئی دوسرا چارہ کار نظر نہ آتا تھا۔ اور اسے ایسا ہی کرنا پڑا، یہ پروگرام بناتے وقت اس کے دل میں خیال آیا، کہ وہ نگہت کے ہاں وعدہ سے ایک روز قبل آج ہی شام کو ہو آئے۔ لیکن اسے نگہت کے کہے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دل میں بڑا ہول آتا تھا۔ وہ نگہت کو اپنے دل میں ایسا اونچا مقام دے چکا تھا۔ کہ اس کی کسی ادنیٰ سی بات کی خلاف ورزی بھی اسے بے حد شاق گزرتی تھی، لیکن پھر اس نے سوچا۔ کہ اس میں قباحت کیا ہے وہ جائے گا تو وہاں ہفتہ میں دو ہی بار، بدھ نہیں، تو منگل ہی سہی، اور یہ سوچ کر اس نے فوراً طے کر لیا، کہ وہ آج شام نگہت کے ہاں ضرور جائے گا، پھر وہ جی ہی جی میں اس طلسمی تصور سے لطف اٹھانے لگا کہ نگہت اس کی خلاف توقع آمد پر کس قدر مسرور اور کس قدر حیران ہوگی

کچہری سے فارغ ہو کر وہ گھر پہنچا۔ کھانے کے بعد حسبِ معمول اپنی خوابگاہ میں جا لیٹا۔ اور تادیر تصوّر کے اڑن کھٹولے پر سوار ہو کر نگہت سے متوقع ملاقات کی حسین وادیوں پر اڑتا رہا۔ جب چار بجے، تو دفعتاً اس کی آنکھ لگ گئی۔ اور پھر جو وہ اٹھا۔ تو شام کے سات بج رہے تھے۔ وہ اپنی اس غفلت پر بے حد سراسیمہ ہوا، تاہم وہ نگہت کی ملاقات کو ٹالنا کسی صورت برباد کرنے پر تیار نہ تھا۔ جلد جلد اس نے ہاتھ منہ دھویا، کپڑے بدلے، تھوڑی سی چائے پی، اور پھر موٹر لے، نگہت کی کوٹھی کی سمت چل دیا۔

کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے شام زیادہ گہری ہو گئی، اور اسے یاد آیا کہ یہ تو عموماً اس کی وہاں سے واپسی کا وقت ہوا کرتا ہے، اس اندیشہ سے، کہ نہ معلوم نگہت موجود بھی ہوگی یا نہیں، اور اس کا اس تنگ وقت میں ان کے ہاں جانا بقولِ نگہت اس کے والد کے لئے کوئی شبہ پیدا نہ کر دے، اس نے اپنی کار کا رخ اپنے ماموں کی کوٹھی کی طرف کر لیا، اور پھر کار کو آہستہ سے پورچ سے دور کھڑی کرکے وہ چپ چاپ نگہت کی کوٹھی کی سمت پیدل چل دیا۔ راستے میں اس نے سوچا کہ نگہت کے کسی خادم سے اس کی گھر میں موجودگی کا حال معلوم کرکے وہ اسے باہر بلوا لے گا، اور پھر گھڑی دو گھڑی لان میں اس کے ہمراہ بیٹھ کر واپس چلا آئے گا۔

جب اس نے دونوں کوٹھیوں کے وسیع احاطوں کو تقسیم کرنے والی چھوٹی سی فصیل کا شگاف پار کیا۔ تو شام باقاعدہ رات کی شکل اختیار کر چکی تھی، اور اوپر آسمان پر چودھویں کا چاند پوری شان و شوکت سے روشن تھا، جس کی مصفا کرنوں کی مسلسل پھواروں سے چار سو کے مناظر دھلے دھلائے دکھائی دیتے تھے، نگہت کی سپید کوٹھی چاندنی کے نور میں براق ابرک سے بنے ہوئے محل کی مانند نظر آتی تھی

اوراس کے لان کا سبزہ دور دور تک ہری مخمل کی طرح بچھا ہوا دکھائی دیتا تھا، لان کے پرے اوراس کے کنارے اگی ہوئی باڑھ کے آس پاس البتہ کہیں کہیں تاریکی کے دھبے نور کے بے پناہ سیلاب کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ایک ایسی ہی جگہ اس کا وہ محبوب بنچ پڑا تھا، جس کے اوپر اس نے نگہت کے پہلو میں بیٹھ کر ماضی کی کئی حسین شامیں بسر کی تھیں، بے اختیار اس کا جی چاہا، کہ وہ نگہت کے ساتھ ملاقات سے پہلے اس بنچ کو ایک نظر دیکھے، اسے چھوئے اور اس پر بیٹھنے کا لطف حاصل کرے........ یہ بنچ باڑھ کی تاریکی کی اوٹ میں تھا، اور اسی واسطے اسے نگہت نے تنہائی کی ملاقاتوں کے لئے منتخب کیا تھا۔ لان کی ایک روش سے نیچے اتر کر وہ دبے پاؤں اس بنچ کی طرف بڑھا، لان کنارے کی اونچی باڑھ اب خاصی دبیز ہو چکی تھی اور اس کے سایے بھی اب سطح زمین پر پہلے سے گہرے ہو چکے تھے۔ ان سایوں کو گہری نگاہوں سے کھنگالتے ہوئے اس نے بنچ پر بھی دو سائے سے متحرک دیکھے، اس خیال سے کہ وہ کہیں گھر کے کسی فرد کی طرف سے اس بے وقت آوارہ گردی پر نہ پکڑا جائے، وہ تیزی سے پلٹا، لیکن عین اس وقت اس کے کانوں میں ایک لفظ کی صدا تیر بن کر پیوست ہو گئی:

"نگہت!" کوئی دھیمے پراسرار لہجہ میں کہہ رہا تھا۔ "نگہت! تم کتنی حسین ہو، سچ جانو، میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی عورت سے اتنی شدت کے ساتھ پیار کیا ہے!" یہ فقرہ سن کر اسے یوں معلوم ہوا جیسے اس کی روح قبض کر لی گئی ہے، اس کا بدن بالکل مٹی کا تودہ بن کر رہ گیا ہے اور وہ ایک نعش کی شکل اختیار کر چکا ہے........

پھر جیسے کسی نے اس کی نعش کو آگے بنچ کی سمت سرکا دیا۔ اور اس نے پھر سنا، کوئی کہہ رہا تھا۔

"بالکل یہی حال میرا ہے فرحت، میں بھی زندگی میں پہلی مرتبہ ایک نئی قسم کی محبت کا تجربہ کر رہی ہوں، ایسی محبت کا تجربہ جو میرے بدن کے رگ و ریشہ میں خون کی بوندیں بن کر رواں دواں ہے!"

اور پھر ان دونوں سایوں پر تاریکی کی ایک گہری لہر بکھر گئی!

وہ اس کی سمت پیٹھ کر کے بیٹھے تھے، لیکن اب کے جو ہوا کے ایک جھونکے سے ان پر سے شاخوں کا سایہ ہٹا تو اس نے دیکھا کہ ان میں سے ایک چہرہ فرحت مرزا کا تھا، اور دوسرا چہرہ، دوسرا چہرہ، دوسرا چہرہ ——— نگہت کا!

یکایک اسے یوں محسوس ہوا، جیسے اس کی آنکھوں نے جیتے جی اسے دغا دی ہے، جیسے وہ بھی بصارت کی بجائے فریب نظر اور سراب نگاہ کا آلہ کار بن کر رہ گئی ہیں........ اس نے زور سے اپنی گردن اور اپنے سر کو جھٹکا دے کر آنکھوں کے نظام کو بحال کرنے کی کوشش کی، اور پھر نگاہیں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ فرحت مرزا کے آغوش میں یقیناً ایک لڑکی کا بدن سمایا ہوا تھا۔ اس نے اس لڑکی کے بالوں کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل نگہت کے بال تھے، اس نے اس لڑکی کے ماتھے کی طرف دیکھا، وہ بالکل نگہت کا ماتھا تھا، اس نے اس لڑکی کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل نگہت کی آنکھیں تھیں، اس نے اس لڑکی کے لبوں کی طرف دیکھا، وہ بالکل نگہت کے لب تھے۔ آخر میں اس نے اس لڑکی کے سراپا کی سمت دیکھا۔ وہ بالکل نگہت کا سراپا تھا——— ہاں وہ نگہت ہی تھی، وہی نگہت جس نے اس کے ساتھ عمر بھر کا پیمان وفا باندھا تھا، جس نے اس کی زندگی پر کوئی جاں سوز بجلی بن کر گرنے کی بجائے حیات بخش سورج بن کر چمکنے کا وعدہ کیا تھا، وہی نگہت جس نے اس کی مستقبل کی وادی میں دوامی خوشبو بن کر سما جانے کا عہد کیا تھا ——— تب یکایک اسے یوں محسوس ہوا، جیسے وہ کسی سنڈاس کے دھانے پہ کھڑا ہے بڑی کراہت کے ساتھ اس نے اپنی پشت پھیری، اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا، وہ اپنی ممانی کی کوٹھی کی سمت لپکا، صدر دروازے کے قریب اس کی کار دم بخود کھڑی جیسے اس کی راہ تک رہی تھی۔ تڑاق سے اس نے کار کا دروازہ کھولا، اور پھر دھم سے اس کے اندر کود کر اس نے کلچ دبا دیا۔ اور سیدھا گھر آ کر دم لیا۔ گھر آ کر وہ خواب گاہ میں پہنچا اور پھر پلنگ پر نیم جان سا ہو کر گر گیا، خانساماں نے حسب دستور آ کر اسے کھانا رکھنے کی اطلاع دی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد وفادار خانساماں پھر آیا اور اس سے کھانے کے متعلق حکم طلب کیا، لیکن اس نے پلنگ پر لیٹے لیٹے اسے کچھ ایسی بے بسی، حرماں نصیبی، اور مظلومی کے ساتھ دیکھا، کہ سادہ لوح ملازم کو دوبارہ اپنے آقا کے سامنے آنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

خانساماں کے جانے کے بعد اس کی خواب گاہ پر مکمل سکوت
چھا گیا۔ اور ساتھ ہی نہ جانے کہاں سے اس کے ذہن میں ایک عجیب قسم
کی گفتگو کا خریطہ کھل گیا۔ اس کا ذہن اور اس کا اندرونی وجود ایک
دوسرے کے ساتھ تابڑ توڑ کئی قسم کی باتیں کئے جاتے تھے۔ لیکن اس
کے لب بالکل جامد اور خاموش تھے۔ کسی مرقد کے پرسکون بالائی حصہ کی
مانند جس کے اندر ایک ہنگامہ خیز عالم برزخ تخلیق پا چکا ہو!
—— یہاں پہنچ کر اس کے ماضی کے فلم کی وہ ریل جو اس کے ذہن میں
کھلی تھی، ختم ہو گئی!

ساعت

اس نے اپنے بوجھل سر کو بڑی مشکل کے ساتھ تکیے پر سے اٹھا کر
کراہتے ہوئے کروٹ بدلی۔ اور پھر رات بھر میں پہلی مرتبہ اس کی آہیں
نکل گئیں، اور ساتھ ہی بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے
اس وقت وہ اپنی مردانگی، اپنی اعلیٰ تعلیم، اپنا اعلیٰ عہدہ وغیرہ سب
کچھ بھول چکا تھا، اور یوں زار و قطار روئے جا رہا تھا، جیسے کوئی ننھا
بچہ اچانک کسی گندی نالی میں گر کر روئے! .... وہ تادیر اسی
طرح عالم بے اختیاری میں روتا رہا، روتا رہا، روتا رہا، حتیٰ کہ اس کی
آنکھوں سے آنسو خشک ہو گئے، تب وہ اٹھ بیٹھا۔ ہچکیوں اور سسکیوں
کے مارے اس کا برا حال ہو رہا تھا، چنانچہ بستر سے اتر کر وہ خواب گاہ سے
ملحقہ غسل خانے میں گیا۔ اور نل کی ٹونٹی کھول کر پانی کے چھینٹوں سے
منہ دھونے لگا۔ معاً اسے پھر رونے کا دورہ پڑ گیا۔ جیسے آنسوؤں کی خشک
شدہ ندی کو نل کے پانی سے پھر سیرابی کا موقعہ مل گیا ہو! اور آہستہ آہستہ
آنسو پھر اس کی آنکھوں سے بہنے لگے .... عین اس وقت اسے
باہر سے فجر کی اذان سنائی دی!

صبح کا اثر انگیز سناٹا، تنہائی، رات بھر کے ذہنی عذاب، اپنے
رنجیدہ دل اور اشک فشاں آنکھوں کے سبب، اسے اذان کا ترانہ کوئی
بہت ہی درد بھرا نغمہ معلوم ہونے لگا، چنانچہ اس کی آنکھوں سے ٹپکنے
والے آنسوؤں کے جھالے اور زیادہ شدت اختیار کر گئے، اور وہ اسی نسبت
سے بالکل غیر شعوری طور پر زیادہ تیزی کے ساتھ اپنے ہاتھ منہ اور پیر
دھونے لگا۔ جب یہ سب کچھ دھو چکا، تو اسے احساس ہوا کہ وہ تو
بے خبری ہی میں پورا وضو کر چکا ہے!

اذان اب ختم ہو چکی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا، کہ اس کے
پڑوس والی کوٹھی کے خادموں والے کوارٹروں میں اردگرد کے بیروں
خانساموں اور دوسرے معمولی ملازموں نے مل کر ایک مختصر سی کچی مسجد
بنا رکھی ہے، جس میں وہ لوگ باقاعدہ نمازیں ادا کیا کرتے ہیں، اور
یہ اذان وہیں سے آئی ہے۔

اپنے آپ کو باوضو پا کر اس کے ذہن میں جیسے ایک تسکین سی،
ایک سکون سا نمودار ہوا، ایک ٹھنڈک سی پڑ گئی، اور وہ جا کر پلنگ
پر بیٹھ گیا .... کچھ دیر وہ پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھا رہا
پھر آپ سے آپ اس کے قدم زمین پر ٹک گئے، وہ اٹھ کھڑا ہوا، بستر
پر سے ایک شال لے کر اس نے اپنے سر اور منہ کے گرد لپیٹی، اور پچھلے
پاؤں کوٹھی سے باہر نکل گیا ....

باہر آ کر اسے دور ایک سمت میں روشنی کا ایک نقطہ سا تھرتھراتا
نظر آیا، اس نے غور سے اس نقطہ کو دیکھا، اور پھر اس کی طرف چل دیا
روشنی کا یہ تھرتھراتا نقطہ اسی بیروں خانساموں والی کچی مسجد کے ٹمٹماتے
ہوئے دیئے کی روشنی تھی۔

جب وہ مسجد کے صحن میں داخل ہوا، تو وہاں تیل اور کلونت
سے اٹے ہوئے طاق میں مٹی کا ایک چراغ روشن تھا۔ جس کی آسیبی
روشنی میں دو تین میلے سے شخص سنتیں پڑھنے میں مشغول تھے، وہ بھی سنتیں
ادا کر کے ایک کونے میں منہ سر لپیٹے جا بیٹھا .... اسے یہ
محسوس کر کے بے حد حیرانی ہو رہی تھی، کہ اس کا ذہن پہلے کی نسبت
کافی تسکین محسوس کر رہا ہے، وہ اپنی جگہ گم سم بیٹھا اس تسکین کا
لطف اٹھاتا رہا .... اس دوران میں مسجد میں چند
نمازی اور بھی آ گئے، اب ایک شخص نے اٹھ کر بلند آواز میں تکبیر اقامت
کہنی شروع کی، اور دوسرے سب اس کے ہمراہ صف باندھ کر کھڑے
ہو گئے۔ وہ بھی نمازیوں کی صف کے ایک کنارے جا کھڑا ہوا۔ امام نے
تکبیر کہی۔ اور سب کے ساتھ اس نے بھی نماز کی نیت باندھ لی۔
برسوں کے بعد وہ نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تھا، اور وہ بھی اس
حال میں، کہ اس کے بدن کا رواں رواں ایک شدید احساس مظلومی

درد اور وقت سے سرشار تھا، چنانچہ جب امام نے قرأت شروع کی، اور اس نے کالج کے زمانے میں سیکھی ہوئی عربی کے سہارے امام کے کہے ہوئے الفاظ کے معنی اخذ کرنا شروع کئے، تو اس کے دماغ سے جلیسے کئی تودے سرکنے لگے، سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد جب امام نے سورۂ نور سے رکوع کو پڑھنا شروع کیا، تو یکایک اس کے ذہن پر یہ آیات ہتھوڑے بن کر برسنے لگیں:-

الزانی لاینکح الّا زانیۃً او مشرکۃ
وّالزانیۃ لاینکحھا الّا زان او
مشرک..........
الخبیثٰت للخبیثین والخبیثون
للخبیثٰتِ الطیبت للطیبین و
الطیبون للطیّبٰت.........

اوہ! کس قدر ہولناک صداقت مستور تھی ان الفاظ میں....
اس کے قدم لڑکھڑانے لگے، اور بے اختیار اسے محسوس ہوا، کہ اگر وہ اور کھڑا رہا، تو یقیناً منہ کے بل زمین پر آرہے گا، تیزی کے ساتھ اس نے اپنے جھولتے ہوئے جسم کو زمین پر دے مارا، اور پھر باقی نماز بیٹھ کر ادا کرنے لگا.......... ان آیات کے بعد امام صاحب نے جو کچھ پڑھا، وہ اسے مطلق نہیں سن سکا، اور بس ایک مشین کی مانند دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ نماز کے ارکان ادا کرتا رہا..........
اور ادھر اس کے ذہن میں سارا وقت قرآن کے یہ الفاظ مسلسل گونجتے رہے

الخبیثٰت للخبیثین والخبیثون للخبیثٰت
الطیبت للطیبین والطیبون للطیبٰت۔

آہ! کتنی بے رحم صداقت تھی ان الفاظ میں!
نماز کے بعد وہ بغیر دعا مانگے جھٹ وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر لڑکھڑاتا ہوا مسجد سے باہر نکل گیا۔ مسجد کے نمازی اپنے اس نئے اور عجیب قسم کے ساتھی کو بڑی حیرت اور تجسس کے ساتھ دیکھ رہے تھے..
مسجد سے نکل کر وہ سیدھا اپنی خواب گاہ میں آیا، اور پھر تھر تھر کانپتے ہوئے بدن کے ساتھ بستر پر بیٹھ کر اور اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہ تادیر یہ سوچتا رہا، کہ کیا کل شام والے واقعہ کے بعد بھی نگہت اس کی باقی عمر کے لئے ایک موزوں ترین سنجوگ نہیں ہے؟

(بشکریہ تعمیر انسانیت)

"لالہ صحرائی کے گلپاش قلم نے "سنجوگ" کے زیر عنوان ہمارے ایک خاص طبقے کی زندگی سے حقیقت کا ایک بڑا ہی تاریک پہلو اخذ کر کے جوں کا توں ہمارے سامنے آراستہ کر دیا۔ فنی لحاظ سے یہ افسانہ صف اول کی چیز ہے اور دو چار مقامات تو اس میں ایسے آتے ہیں جہاں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مصنف نے ادب کو کچھ متاع نو دی ہے۔ مقصد کے لحاظ سے دیکھیں تو بھی یہ نگارش ایک اچھی مثال ثابت ہوئی ہے لیکن موضوع ایسا ہو کہ عریانی سے بچ بچا کر نکلنے کے باوجود کچھ ناگوار چیزوں کو لائے بغیر فنی تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ حقیقت نگاری کی یہ خاص مجبوریاں ہیں۔ ہمارے بالائی طبقہ کی زندگی در اصل ایک ایسے بیت الخلاء کی طرح کی ہے جو کسی سہ منزلہ عمارت کی چوٹی پر بنایا گیا ہو یعنی دور سے دیکھو تو سب سے بالا قریب جاؤ تو بدبو آئے۔ معاشرے کے اس بیت الخلاء کی حقیقت نگاری کی جائے گی تو ایک مسلم ذہن کی نفاست ذوق کی خیر نہیں۔ کہانی کا خاتمہ بڑا جذباتی ہے۔ ایک نفسیاتی انقلاب کا آئینہ دار ——— اس مصرعہ کی عملی تصویر:-

"جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا"

(نعیم صدیقی)

اسد ملتانی

کہیں تسکین مرے شوقِ فراواں کی نہیں
خلد میں بھی وہ فضا کوچۂ جاناں کی نہیں

آج مصروف ہیں وہ لوگ چمن بندی میں
جن کو پہچان گل و سنبل و ریحاں کی نہیں

اپنے ہم جنس کے آئین کا پابند رہے
کیا یہ توہین خود آزادیٔ انساں کی نہیں؟

کی مسلماں نے ترقی جو فرنگی بن کر!
وہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

سر و ساماں ہے عمل ہی سے عمل ایماں سے
صرف ایماں کی کمی ہے سر و ساماں کی نہیں

دل میں ہو اور عمل پر اثر انداز نہ ہو
بات ایماں کی یہ ہے بات یہ ایماں کی نہیں

زیست اس طرح بسر کرتے ہیں اہلِ ملت
جیسے کوئی بھی ضرورت انھیں قرآں کی نہیں!

(تعمیرِ انسانیت)

احسان دانش

کبھی فلک پہ کبھی زیب طور ہوتا ہے
کہاں کہاں ترا نور و ظہور ہوتا ہے

خودی کا جب کسی دل میں سرور ہوتا ہے
بہر نگاہ چراغانِ طور ہوتا ہے

پئے مفاد بہاروں کی راہ مت روکو
کوئی اصولِ چمن بھی ضرور ہوتا ہے

بچا بچا کے نہ رکھ برقِ حسن سے دل کو
کہ اس کی زد میں جو آجائے طور ہوتا ہے

کہیں شرارتِ گلچیں کہیں تجارتِ گل
یہ کیا تماشا چمن میں حضور ہوتا ہے

جنوں جنوں ہے تو ترکِ ادب کے کیا معنی
مذاقِ عشق، مذاقِ شعور ہوتا ہے

ابھی نہیں ہیں ابھی ان کی بارگاہ کہاں
جو چل رہا ہے وہ منزل سے دور ہوتا ہے

فغاں فغاں کہ وہی پاسبانِ گلشن ہیں
جنھیں گلوں کے عرق سے سرور ہوتا ہے

یہ خد و خال کے پردے اٹھے تو کیا احساںؔ
حجاب خاص تو دراصل نور ہوتا ہے

(پرچم)

فضل احمد کریم فضلی

اور ہو گئے گہرے زخمِ دل چھپانے سے
"کیا برا تھا رو لینا ایسے مسکرانے سے"

دیکھ لے وہ پہلے سے صرف چند تنکے ہیں
دشمنی جسے بھی ہو میرے آشیانے سے

لاکھ آندھیاں آئیں، لاکھ بجلیاں گر جائیں
آشیاں نہ چھوڑینگے ہم ہیں کچھ دوانے سے

آزمائشیں میری ہیں، نوازشیں اُنکی
کچھ نہ کچھ تو مطلب ہے میرے آزمانے سے

کس غریب کی کشتی غرق کی ہے موجوں نے
بج رہے ہیں طوفاں میں آج شادیانے سے

ہو وہ گریۂ شبنم یا نسیم کی شوخی!
پھول مسکرائیں گے اک نہ اک بہانے سے

دیکھتے نہیں مڑ کر حال پائمالوں کا
سیکھ لی ہے کیوں تم نے یہ روش زمانے سے

ہم بھی نقشِ پا سے ہیں رہگزارِ ہستی میں
کام ہے زمانے کو نقشِ پا مٹانے سے

تنگ آ کے دنیا سے ہم یہاں پہ آئے تھے
اٹھ کے اب کہاں جائیں تیرے آستانے سے

زندگی میں پہلے تھی کس قدر گراں جانی
روح ہو گئی ہلکی بارِ غم اٹھانے سے

دیکھ تو چکے اتنا اب چلو بھی اے فضلیؔ!
جب وہ خود نہ پہچانیں فائدہ بتانے سے؟

(ماہِ نو)

مسعود جاوید

کوثر نیازی کی شاعری

—— "زرِ گل" کے آئینہ میں

سنہ ۵۳ء کے موسم بہار میں جب کوثر نیازی کو زنداں کے حوالے کر دیا گیا تھا تو نہ جانے کیوں ان پر لکھنے کو جی چاہا تھا —— اور آج "زرِ گل" پڑھنے کے بعد پھر کچھ اسی قسم کی کیفیت میں اپنے آپ میں پا رہا ہوں. جو خیالات میں نے اس وقت ظاہر کئے تھے، "زرِ گل" کے مطالعہ سے ان میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔

کوثر نیازی نے سنہ ۵۰ء سے لکھنا شروع کیا ہے جبکہ ان کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ "زرِ گل" ان کی ۵-۶ سالہ کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس سے لازمی طور پر یہ سوال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ کیا واقعی اس ابتدائی کوشش کو مجموعہ کی صورت میں پیش ہونا چاہیے تھا، کیا تشنگان ادب اس سے کچھ حاصل بھی کر سکیں گے؟ اس نقطۂ نظر سے "زرِ گل" کا جائزہ لینا 'غیر افادی' نہ ہوگا۔

کوثر نیازی کا نظریۂ ادب واضح اور معروف ہے۔ وہ اسی نظریہ کے علمبردار ہیں جس کی تبلیغ حالی نے کی ہے اور جسے اقبال نے انتہائی چابکدستی سے برتا ہے۔ روزِ اوّل ہی سے کوثر کی شاعری افادی رہی ہے اور ان کے نزدیک سلام' زندگی کے متعلق ایک نقطۂ نظر ہے، ایک نظامِ زندگی ہے، ایک معاشرہ ہے۔ اس لئے جب ان اعتقادات کو تسلیم کرنے والا لکھے گا تو بلاشبہ اس کا نقطۂ نظر اور اسکے عقائد اس کی تخلیقات میں شامل ہوں گے۔ وہ یہ تو نہیں کر سکتا کہ اپنی ساری زندگی میں اسلام کو برتے مگر اپنی تخلیقات میں بالارادہ نظر انداز کر دے —— وہ یہ نہیں کر سکتا۔ وہ بے بس ہے کہ اپنے عقائد کو اپنی تخلیقات میں شامل ہونے دے۔ اس کی تخلیقات میں لازماً ایک خدا کا تصوّر ہوگا جس کے آگے وہ جواب دہ ہے' اس کی تحریروں میں یہ احساس بھی کارفرما ہوگا کہ خدا جو قادرِ مطلق ہے' انسانوں کی رہنمائی کے لئے انسانوں ہی میں سے بعض کو منتخب کرتا رہا ہے اور جس کے ذریعہ انسان کی فطرت اور کائنات سے ہم آہنگ ہوکر زندگی بسر کرنے کے لئے اصول دیئے ہیں۔ ان اصولوں کی تکمیل محمد رسول اللہ نے کی اور وہ ہمیں قرآن کی صورت میں ملتے ہیں۔ انھیں اصولوں پر کاربند ہوتے ہوئے ایک ادیب استبداد کا دشمن ہوگا. انسان پر انسان کی حکومت کا باغی اور علاقائی، نسلی اور طبقاتی امتیازات کا مخالف —— امن، خوشحالی، ترقی، تناسب، حسن اور پاکیزگی کا حامی ——

جہاں تک فکر کا تعلق ہے، کوثر نیازی کی شاعری اسلامی ادب کی اس وضاحت کی آئینہ دار ہے —— مگر ادب میں صرف فکر ہی نہیں ہوتی' فن بھی ہوتا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی "زرِ گل" کے "تعارف" میں' جو سراسر 'تعریف' ہوکر رہ گیا ہے' فرماتے ہیں کہ "میرے نزدیک کوثر صاحب کے کلام کا یہ مجموعہ اسلامی ادب کا ایک نہایت عمدہ نمونہ ہے" اگر مولانا نے یہ فقرہ محض شاعر کی ہمت افزائی کے لئے لکھا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن یہ تنقید کی کوئی عمدہ مثال نہیں۔ [مولانا نے ادب کی وضاحت کرتے ہوئے یہ کہنے کے لئے کہ ادب بھوک و جنس کی ترجمانی کے لئے نہیں ہے۔ جنس کا مفہوم ادا کرنے کے لئے جو مجموعی لفظ استعمال کیا ہے' وہ بھی انتہائی غیر ادبی ہے۔ معلوم نہیں کیوں مولانا کو اس لفظ کی رکاکت کا احساس نہیں ہوا۔ اس ایک لفظ کو تین مرتبہ دہرایا گیا ہے]

اس میں کوئی شک نہیں کہ کوثر کے ہاں ایک نقطۂ نظر ہے' جوش ہے' عزم ہے' خلوص ہے اور اس دنیا کو جنت بداماں بنانے کی آرزو ہے:

پہرے تو بٹھا دوگے مگر، میرے قلم سے
اسلام کا پیغام رقم ہو کے رہے گا

نظامِ کہنہ کی قدروں کا خاتمہ سمجھو
ہمارے ہاتھ میں نیزے بھی ہیں قلم بھی ہیں

وہ کم سواد مسرت کے راز کیا جانے
جسے نشاطِ غمِ دیگراں نصیب نہیں

——

گلچیں کا خوف، ولم کا خطرہ قفس کا ڈر
کیا گل کھلے ہوئے ہیں بہار کی گود میں

منزلِ عشق وہ منزل ہے کہ جس میں کوثر
غمِ آغاز نہیں، خطرۂ انجام نہیں

وطن کی ثروت کی داستانیں مجھے سُناؤ نہ ہم نشینو!
میں جانتا ہوں کہ کتنے انساں وطن میں پاتے ہیں آب و دانہ

فریاد ہے اے خالقِ غم! اے زمانہ!
دنیا میں کسی کا کوئی غم خوار نہیں ہے

قفس میں رہ کے بھی دل سے نہ جا سکی کوثر
یہ آرزو کہ چمن میں کبھی بہار آئے

یہ تو غزل کے اشعار تھے، اس سے کہیں زیادہ وضاحت کے ساتھ کوثر کا ذہن نظموں سے مترشح ہوتا ہے: "اے مری رفیقِ حیات" ۔ "رات تاریک ہے فضا چپ ہے"۔ "مقبرے" اور "رسولِ عربی" میں کوثر نے اپنے نقطۂ نظر کو کھل کر پیش کیا ہے۔

لیکن "زرِ گل" کے مطالعہ سے ایک شدید احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ شاعر کی فکر میں عمق اور وسعت کی کمی ہے۔ ایک ہی قسم کی باتوں سے طبیعت کچھ اکتانے لگتی ہے۔ اسلام کا نام بار بار لینا، انقلاب کی رٹ لگانا اور بہار کے ذکر سے دل کو تسلی دینا، ایک کامیاب پیامی شاعر کے لئے کافی نہیں ہے اسلام میں بے شمار موضوعات ہیں، حیات و کائنات کے مسائل کے تعلق سے اس کے نقاطِ نظر ہیں ـــ یہ تمام مسائل ایک اسلامی شاعر کو طبع آزمائی کی دعوت دیتے ہیں ـــ نہ جانے کیوں "زرِ گل" کے مصنف نے اپنی فکر میں ہمہ گیری کا ثبوت نہیں دیا۔ حالانکہ اس کے سامنے اقبال کی مثال موجود تھی۔ تا وقتیکہ انسان وسعتِ نظر کے ساتھ حیات و کائنات کا مطالعہ نہ کرے اور ان کے مسائل کو نہ سمجھے، اپنے نقطۂ نظر کے صحیح ہونے کا یقین دنیا کو نہیں دلا سکتا ـــ کبھی تو وہ قنوطی ہو جاتا ہے اور کبھی جھنجلانے لگتا ہے:

تھوڑی ہی کسر بس باقی ہے دنیا کے جہنم بننے میں
ماحول گواہی دیتا ہے، حالات اشارا کرتے ہیں

غمِ حیات میں کیسے کٹے گی اے کوثر
تمام عمر ہے ایک دو نفس کی بات نہیں

اسلام کو جب تیری فضا راس نہ آئے
اے میرے وطن! تجھ کو کوئی آگ لگائے

یہ کس مقامِ ہلاکت پہ آ گئی دنیا!
کہ میرے ہونٹوں پہ اس کے لئے دعا بھی نہیں

عشق خود دار نہیں، حسن طرحدار نہیں
اب زمانے میں کہیں زیست کے آثار نہیں

غزل کے صرف دو اسلوب ہیں ـــ ایک تو میر کا انداز ہے اور دوسرا، غالب کا ـــ میر کا انداز' دراصل جذبات اور قلبی واردات کی شاعری ہے' اور غالب کا اسلوب' فکری شاعری سے تشکیل پاتا ہے' "زرِ گل" کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ یوں تو کوثر نے دونوں اسلوب میں کہنے کی کوشش کی ہے مگر وہ صرف میر کے انداز میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یعنی وہ جذبات اور قلبی واردات ہی کو پیش کر سکے ہیں۔ وہ اشعار جن میں کچھ فکر ملتی ہے بے کیف ہیں ـــ اس کی وجہ پہلے بیان کر چکا ہوں۔ یہ انداز اسی کو نصیب ہو سکتا ہے۔ جو صرف دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر شعر نہ کہتا ہو بلکہ اسکے شعر گہری سوچ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اشعار جن میں دل کی لرزشیں ملتی ہیں، ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، ایسا نہیں، میرے نقطۂ نظر سے تو اصلی شاعری یہی ہے۔ کوثر نے اس رنگ میں بعض بہت ہی اچھے شعر پیش کئے ہیں جن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا مستقبل درخشاں ہے ـــ

اس خطا پر ملی سزائے قفس
کیوں بہاروں کے گیت گاتے ہیں

جب کسی نے مجھے پکارا ہے
میں یہ سمجھا کہ آپ آتے ہیں

جیتے ہیں اسی آس پہ ناکامِ محبت + اک روز وہ مائل بہ کرم ہو کے رہیگا

دنیا مرے حالات بگاڑے کہ بنائے
اللہ کرے تجھ پہ بُرا وقت نہ آئے

کوثر رضائے دوست کے احساس کے طفیل
فردوس بن گیا ہے یہ زنداں کبھی کبھی

کیا اب حیات و موت کی قدریں بدل گئیں
کچھ لوگ زندہ ہیں غمِ جاناں ترے بغیر

اللہ کی رحمت کا سزاوار نہیں ہے • وہ دل جو محبت کا گنہگار نہیں ہے

کائناتِ حسن ہے کوثر یہ حسنِ کائنات

جی میں آتا ہے کہ سرتاپا نظر ہو جائیے

اُدھر سے اُن کا اشارہ بھی ہے پئے اُلفت

ادھر سے ہم بھی کچھ ایسا ارادہ رکھتے ہیں

کہاں کے جام و سبو اور کہاں کے پیمانے

تری نگاہ سے پیدا ہزار میخانے!

کچھ تو ملحوظ رہے خطرۂ بدنامیٔ حُسن

شیوۂ عشق نہیں چاک گریباں ہونا

ہم نشینو! مجھے بتلاؤ یہ آزار ہے کیا

ہر گھڑی ایک حسیں نام کی یاد آتی ہے

یہ کیا مرض ہے بتاؤ تو خردمندو

نہ مجھکو دل کی خبر ہے نہ دل کو مری خبر

اُنکی زلفیں بکھری ہونگیں

اے لوگو یہ رات نہیں ہے

کیا ارادے ہیں قافلے والو

دُور منزل ہے رات کالی ہے

ہر وہ لمحہ ہے مرا کفر میں شامل اے دوست

دل تری یاد سے جس میں ہوا غافل اے دوست

یہ اشعار بلاشبہ ادب میں ایک بہترین اضافہ ہیں۔ ان اشعار میں کوثر کی تشکیل پاتی ہوئی انفرادیت جھلکتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ان کا اصلی رنگ یہی ہوگا۔ ابتدا میں ہر شاعر اپنے سے بہتر شعراء سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس میں کوئی آنچ ہے تو بہت جلد وہ اپنا ایک علیحدہ مستقل اسلوب تشکیل دے لیتا ہے ـــــ کوثر نیازی بھی معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مختلف وادیوں میں بھٹکتے رہے ہیں۔ چنانچہ انکے ہاں ایسے بھی شعر دکھائی دیتے ہیں۔ جو صرف متقدمین کہہ سکتے تھے ۔

ڈھیر دکھلا کے وہ کہنے لگے پروانوں کا

حشر ایسا ہی ہوا کرتا ہے دیوانوں کا

ترے بیمار کی حالت بھی عجب ہے اسکو

ہر دوا موجبِ آزار نظر آتی ہے

یہ بات طبیبوں نے بڑی دیر میں سمجھی

آزارِ غمِ دوست سا آزار نہیں ہے

پیمانِ وفا لے کے وہ شوخ یہ کہتا ہے

اس عہد پہ اب تم کو گردن بھی کٹانی ہے

تیرے بیمار کو دیکھا تو طبیبوں نے کہا

جُز غمِ دوست ہر اک دکھ کی دوا ملتی ہے

لیکن ایسے اشعار کوثر کی شاعری کی نمائندگی نہیں کر سکتے۔ اسلوب ایک بہت ہی پیچیدہ شے ہے۔ یہ دراصل کسی شخصیت کا پرتو ہوتا ہے۔ اسلوب میں شاعر کا ماحول، ذہنی پس منظر، نقطۂ نظر، افتادِ طبع سبھی کچھ ہوتا ہے۔ اس لئے اسلوب کا تجزیہ کرنا انتہائی مشکل کام ہے، میرا خیال ہے کوئی شاعر کسی اور کا اسلوب مستقل طور پر کامیابی کے ساتھ اختیار نہیں کر سکتا ـــــ جب شخصیتیں مختلف ہیں تو اسلوب کو مختلف ہونا چاہیئے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کوثر کی شاعری میں محمد علی جوہر کے جیسے جذبات پائے جاتے ہوں مگر یہ صحیح نہیں کہ ان کا انداز حسرت موہانی جیسا ہے۔ حسرت موہانی کی زمین میں غزل لکھنا اس بات کی دلیل نہیں ۔

رنگِ حسرت میں آج اے کوثر!

خوب تو نے غزل سرائی کی!

لیکن بعض شعر ایسے ہیں جن سے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ کہیں کوثر نیازی فیض سے تو مسحور نہیں ہیں!

جو جرمِ محبت کا چلن عام کریں گے

وہ لوگ زمانے میں بڑا کام کرینگے

خدا گواہ کہ اُن کے فراق میں کوثر!

جو سانس آئی ہے وہ سوگوار آئی ہے

حرم کے گوشۂ خلوت سے تابہ دار آئے

کہاں کہاں تجھے اہلِ جنوں پکار آئے

آہ پر نگرانیاں، فریاد پر پابندیاں • بے زبانی اب چمن بھر کی زباں ہونے لگی

کلی کلی سے شراروں کے پھول جھڑتے ہیں

بہار ہے کہ خزاں ہم بتا نہیں سکتے

سوئے مقتل چلے ہیں آج شاید تیرے دیوانے
سُنائی دے رہا ہے نغمۂ زنجیر اے ساقی

اس انداز میں اور بھی اشعار ہیں۔ ان اشعار کا جب فیض کے اشعار سے تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔ فیض کے اشعار میں ان اشعار سے کہیں زیادہ داخلیت، وقار، رچاؤ اور توازن ہے ـــــ بظاہر جو تھوڑی سی ہم آہنگی کی جھلک نظر آتی ہے اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں، دو فعال تحریکوں سے وابستہ ہیں، دونوں ایک ہی مستبد نظام کے ستائے ہوئے ہیں، اور دونوں ایک ہی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں ـــــ اس لئے کوثر نیازی کے ان اشعار کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فیض سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہیں یا اُن کا انداز فیض کا انداز ہے ـــــ کوئی کسی کا انداز اختیار نہیں کر سکتا یوں ناپختگی فکر و فن کے سبب دو چار شعر کہہ لینا اور بات ہے

یہاں تک تو غزل کی بات تھی۔ "زرگل" میں نظمیں بھی شامل ہیں۔ ان نظموں میں شاعر کا نقطۂ نظر اور سوز جگر بھی ملتا ہے مگر یہ مقصدیت سے بوجھل ہیں اور ان میں موضوع کی یکسانیت اور بھی گراں گزرتی ہے۔ ان نظموں میں راست تبلیغ ہے اس لئے فن بُری طرح مجروح ہے ـــــ اور پھر یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر کا اپنا رنگ کونسا ہے ـــــ ہر نظم ایک مختلف انداز میں کہی گئی ہے۔ البتہ "نذر" خوب ہے۔ اس میں ندرت بھی ہے اور غزل کی سی کیفیت بھی۔ کوثر نے ایک جگہ کہا ہے:

یہ شاعری بہ تقاضائے فرض ہے کوثر!
وگرنہ میں کوئی شاعر نہیں ادیب نہیں

جو شاعر اس نقطۂ نظر کا حامل ہو، اس پر فن کی عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ اس کی شاعری کا مقصد محض ذہنی عیاشی یا داد حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ وہ شعر کے ذریعہ دلوں میں اترنا چاہتا ہے۔ اس لئے شاعر کا مقدس فرض ہے کہ وہ بات دل موہ لینے والے انداز میں کہے اور یہ انداز اسی وقت نصیب ہو سکتا ہے جبکہ وہ فن کو میرؔ کی طرح اہمیت دے ؎

مصرع کبھو کبھو موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

دلوں میں اترنا کوئی آسان کام نہیں ـــ اس کے لئے جگر خوں کرنا پڑتا ہے۔ اسی صورت میں بات بنتی ہے ـــــ جب اس نقطۂ نظر سے "زرگل" کا مطالعہ کرتے ہیں تو مایوسی ہوتی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کوثر نیازی میں حسن کا شعور پوری طرح نہیں ابھرا ہے۔ اسی لئے وہ فن کا اہتمام نہیں کرتے اشعار کی اکثریت روکھی پھیکی نظر آتی ہے ـــــ شاید اسلئے کہ وہ تلمیح، تشبیہ، استعارہ وغیرہ سے کلام کو نہیں آراستہ کرتے۔ غیر مانوس اور ثقیل الفاظ کو برتنے میں احتیاط نہیں برتتے۔ تقدیم و تاخیر جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں جوش و جذبہ تو ہے لیکن حسن و مستی کی کمی ہے۔ یہ تو تسلیم ہے کہ اردو کوثر نیازی کی مادری زبان نہیں ہے لیکن جب وہ اس زبان کو اپنا چکے ہیں اور خود ان کے ہموطن شعراء آج اہل زبان کو شرمار ہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بھی صحیح زبان لکھنا نہ سیکھیں ـــــ انھیں تو اسکی اور زیادہ ضرورت ہے، کیونکہ وہ ایک پیام دینا چاہتے ہیں ـــــ اس طرح تو وہ اپنے مقدس مقصد کے ساتھ انصاف نہ کر سکیں گے۔

زنداں کے اندر کہی ہوئی غزلیات اور زنداں کے باہر کہی ہوئی غزلیات میں فنی اعتبار سے نمایاں فرق ہے۔ کوثر نیازی غالباً تین چار ماہ زنداں میں بندر ہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے اچھی خاصی تعداد میں غزلیں کہی ہیں اس لئے ان میں کچھ رواروی کا سا انداز ہے۔ ان میں وہ بات نہیں جس کا متقاضی اصغرؔ ہے ؎

اصغرؔ غزل میں چاہیئے وہ موجِ زندگی
جو حُسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

زنداں کی "دال"

[اسی سے ملتا ہے گر مجھ کو گوہرِ مقصود
بڑی خوشی سے میں زنداں کی دال کھاؤنگا]

زنداں کے اندر تو گوارا کی جا سکتی تھی۔ مگر زنداں کے باہر پیش کرتے ہوئے یہ سوچ لینا چاہیئے تھا کہ یہاں "پلاؤ" بھی دستیاب ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے زنداں کے باہر لکھی ہوئی غزلیں بہت خوب ہیں اور فنی لغزشوں سے بڑی حد تک پاک ہیں۔ ایک ایک غزل میں دو دو تین تین شعر ایسے مل جاتے ہیں کہ آدمی سر دھنے لگتا ہے مخصوصاً وہ غزل جس کا مطلع ہے ؎

ہر وہ لمحہ ہے مرا کفر میں شامل اے دوست
دل تری یاد سے جس میں ہوا غافل اے دوست

لاجواب ہے۔ اس غزل کا ہر شعر دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتا ہے۔

کوثر نیازی کی فنی لغزشوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مجھے دکھ ہوتا ہے
لیکن محض اس خیال سے کہ شاید انھیں حسن کے عناصر ترکیبی کو سمجھنے میں مدد ملے
چند ایک سرسری اشارہ کردوں گا۔

فصاحت یہی ہے کہ شعر عام بول چال سے قریب تر ہو، الفاظ کی ترتیب
ایسی نہ ہو کہ اس میں غیر معمولی پن آجائے۔ مگر ان اشعار کو دیکھئے ؎

زندانیو! گھبراؤ نہ اس جور و جفا سے
سر جبر کا اکڑا ہوا خم ہو کے رہے گا

دوستو دیکھو بھال کر چلنا!
سخت منزل ہے آشنائی کی

بدتر ہے سنگ و خشت سے کوثر خدا گواہ
جو دل اسیر گیسوئے جاناں رہا نہ ہو

پہلے شعر میں "سر" کی صفت "سر" سے دور جا پڑی ہے جو ناگوار گذرتی ہے۔
یہی کیفیت دوسرے شعر کی ہے، تیسرے شعر کا پہلا مصرع تو مضحکہ خیز ہو گیا ہے۔
"بدتر ہے سنگ و خشت سے کوثر خدا گواہ"

کوثر کے ہاں ایسے بھی شعر ہیں۔ جن میں ایک جملہ پہلے مصرع میں پورا نہیں ہوتا
بلکہ یہ اپنی تکمیل دوسرے مصرع میں کرتا ہے۔ یہ بات ذوق پر گراں گزرتی ہے

وہ مقامات ہیں اس میں کہ محبت کوثر
نور ہو کے بھی مجھے نار نظر آتی ہے

وہ وقت بھی آئے گا کہ مظلوم پہ کوثر
جو ہاتھ بھی اٹھے گا قلم ہو کے رہے گا

تیرے بیمار کی حالت بھی عجب ہے اسکو
ہر دوا موجبِ آزار نظر آتی ہے!

یہ تو بیان میں لغزشیں ہوئیں —— اب ذرا زبان کی فروگذاشتیں بھی دیکھئے

وہ خود جس کی رونق ہوں محفل وہی ہے
وہ خود جس کی زینت ہوں بس دل وہی ہے

دونوں مصرعوں میں "خود" کا استعمال زائد معلوم ہوتا ہے۔

خزاں کو بھی گلہ پائمالی گل ہے
چمن میں اب کے کچھ ایسی بہار آئی ہے

یہاں "گلہ" کا موقع نہیں "غم" کا موقع ہے اور پہلے مصرع میں ردیف
بھی آگئی ہے۔

ایسا نہ ہو کہ زیست میں کوئی مزا نہ ہو
اے فکرِ دوست مجھ سے کبھی تو جدا نہ ہو

پہلے مصرع میں "مزا نہ ہو" کی جگہ "مزا نہ رہے" ہونا چاہیئے تھا۔

جب اک عروج پہ ہوتی ہے ظلمتِ زنداں
ہم اُن کی یاد کی شمعیں جلانے لگتے ہیں

پہلے مصرع میں "اک" خواہ مخواہ استعمال ہوا ہے۔ اور دوسرے مصرع
میں "اُن کی یاد کی" دو دو ہندی اضافتیں ناگوار صوتی کیفیت پیدا
کررہی ہیں۔

یہ بن گیا ہے طبیعت کا رنگ اے کوثر
کہ دل کو اب نئے غم بھی پرانے لگتے ہیں

پہلے مصرع میں "بن گیا" کی جگہ "ہو گیا" زیادہ صحیح ہے۔

ہمیں زباں پہ قابو نہیں رہا اکثر
جب ان کو حالِ غمِ دل سنانے لگتے ہیں

پہلے مصرع میں "رہا" کی بجائے "رہتا" استعمال ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ
دوسرے مصرع سے ظاہر ہے کہ ایک عادت بیان کی جارہی ہے۔

تو اُن کا حال لے دلِ بے آسرا نہ پوچھ
توڑا ہے دم جنھوں نے سہاروں کی گود میں

"دلِ بے آسرا" کی ترکیب محلِ نظر ہے۔

ایک وہ ہیں کہ جو میخانہ لنڈھا دیتے ہیں
ایک ہم ہیں کہ جنھیں دردِ تہہِ جام نہیں

دوسرے مصرع میں "دردِ تہہِ جام بھی حاصل نہیں" کے بغیر بات نہیں بنتی

اک طرف نالہ وشیون کی صدائیں کوثر
اک طرف ذکر کھنکتے ہوئے پیمانوں کا

"نالہ وشیون" کہنا کافی تھا۔ "نالہ وشیون کی صدائیں" کچھ عجیب معلوم ہوتا
ہے اور پھر دوسرے مصرع میں "ذکر" کی کیا ضرورت تھی۔ "کھنکتے ہوئے پیمانوں"
سے بات پوری ہو جاتی ہے۔

چند کلیاں ہیں مگر وہ بھی ہیں مرہونِ خزاں
دیکھ نقشہ ہے یہ دنیا کے گلستانوں کا ـــ

یہاں "مرہون خزاں" غور طلب ہے۔ غالباً یہ "مجروحِ خزاں" کا موقع ہے

مہرباں وہ بتِ بے پیر نہیں ہے نہ سہی

مجھ سے راضی مری تقدیر نہیں ہے دہی

"بتِ بے پیر" کی ترکیب نادر معلوم ہوتی ہے۔ نہیں معلوم اس سے شاعر کی کیا مراد ہے۔

کیوں نہ اس بے کسی عشق پہ رونا آئے

لاکھ دشمن ہیں کوئی یارِ وفادار نہیں

"لاکھ دشمن ہیں" صحیح نہیں "لاکھوں دشمن ہیں" ہونا چاہیئے تھا۔

روشنی کا کسی عنوان بھی ساماں نہ ہوا

اک ستارہ شبِ فرقت میں فروزاں ہوا

دوسرے مصرع میں "اک ستارہ بھی" سے بات پوری ہوتی ہے۔

میں نے لغزشوں کی چند نمایاں مثالیں پیش کی ہیں۔ کوثر کے کلام میں تاثر کی کمی کے اور بھی اسباب دکھائے جا سکتے ہیں۔ کاش ابھی فروگذاشتوں کو "زرگل" کی اشاعت سے پہلے دیکھ لیا جاتا۔ زبان وبیان کی لغزشوں، حسن ومستی کی کمی، موضوع کی یکسانیت اور انفرادی رنگ کی ناپختگی کے باوجود میں یہ تو نہیں کہونگا ؎

نالہ لے بلبلِ شیدا ہے ترا خام ابھی

اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تھام ابھی

البتہ اتنا ضرور کہوں گا ع

"بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی"

کوثر میں لامحدود تخلیقی صلاحیت ہے، اُمنگ ہے، جوش وجذبہ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک پیام رکھتے ہیں۔ اس لئے اگر وہ جگر خون کرنا سیکھ لیں تو انکی شاعری لاکھوں زخمی دلوں کا مرہم بن سکتی ہے۔ "زرگل" نسیم بہار کا پہلا جھونکا ہے، خود بہار نہیں ہے۔ "زرگل" کے مطالعہ سے میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں۔

(حلقہ ادب اسلامی کراچی میں پڑھا گیا)

حفیظ میرٹھی

○

اثر کیا خاک ہوگا اس کی باتوں کا زمانے پر
جو خود ایک مستقل تنقید ہو اپنے فسانے پر

کہاں کے ناخدا، کس کے سفینے، دست و بازو کیا
خدا ہی یاد آتا ہے سہارے ٹوٹ جانے پر

ہزاروں ٹھوکروں میں جستجوئے مرگ کرتے ہیں
وہ جن کو زندگی ملتی ہے تیرے آستانے پر

مسلسل نامرادی کا نتیجہ اور کیا ہوتا!
محبت طنز بن کر رہ گئی آخر زمانے پر

معاف اے نوگرفتارو! مرے پر نوچنے والے
مجھے مجبور کرتے تھے قفس کا در سجانے پر

میں کیوں اہل جہاں کی ترش روئی کا برا مانوں
گراں خوابی میں جھنجھلا ہی کرتے ہیں جگانے پر

حفیظِ بے نوا سے پرسشِ احوال مت کرنا
وہ دکھیارا نہ آجائے کہیں رونے رلانے پر

("معیار")

محسن بھوپالی

○

منصور کی روایتِ دار و رسن سے دور
اک اور بھی ادا تھی ترے بانکپن سے دور

ق

تیشہ بدوش تھی کبھی صحرا نورد تھی
کوہ و دمن میں تھی کبھی کوہ و دمن سے دور

تکلیف یک نگاہ اے آسودۂ بہار
دستِ خزاں نہیں ہے گلِ خندہ زن سے دور

ہے انتہائے شوق کہ معراجِ جذبۂ دل
ہیں انجمن میں رہ کے تری انجمن سے دور

اے نازشِ بہار اسیروں پہ اک نظر
پابستہ اور بھی تو ہیں سرو و سمن سے دور

ہے باغباں کی یہ بھی روش داخلِ کرم
شیریں دہن ہیں آج حدودِ چمن سے دور

محسن ہمارے جذبۂ تعمیر کی ہو خیر
کچھ روشنی سی آئی نظر میں چمن سے دور

اسماعیل ادیب •

شریف آدمی

اس رات سلطانہ کئی گھنٹے میرے پاس رہی ——— عظیم اس بات کو میرے جاننے والوں میں سے ہر کوئی مجھ پر بہتان ہی سمجھتا رہا۔ اور آج تک بیسیوں آدمی مجھ سے حقیقت حال پوچھنے آتے ہیں اور میں جب بڑے اطمینان سے ساری تفصیل بتاتا ہوں تو وہ حیرت سے میرا منہ یوں تکنے لگتے ہیں جیسے میرے چہرے پر جو بھی خاصی نمایاں ناک ہو وہ سرے سے غائب ہو گئی ہے اور ماتھے پر کوئی سیاہ تلک جیسی غیر معمولی چیز نے جنم لیا ہے۔ اسی لئے میں اس جھنجھٹ سے آزاد ہونے کی خاطر اس بات کے لئے مجبور ہو گیا ہوں کہ جو کچھ مجھ پر بیتی اسے صاف الفاظ میں سب کے سامنے پیش کر دوں کہ جو کچھ ہوا ہے اور جس طریقے سے ہوا ہے وہ اس قدر ڈرامائی اور خلاف امید تھا کہ میں تو میں سلطانہ بھی سوچ نہیں سکتی تھی کہ مستقبل قریب میں ایسا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ میں سید ہوں اور میرے سلسلۂ نسب میں بڑے پہنچے ہوئے بزرگ موجود ہیں۔ اور تو اور میری پردادی کی مزار پر اب تک پانی کا چراغ جلتا ہے اور میرے جدامجد خدائے پاک کی قسم کامل ولی تھے۔

لیکن آپ لوگ جو انگریزی کی تھوڑی بہت کتابیں پڑھ کر ہمیشہ گٹ پٹ کیا کرتے ہیں کیا خاک اس رمز کو سمجھ سکیں گے خیر ——— میرا تو ادھر یہ حال ہے۔ ادھر سلطانہ کی حقیقت دیکھئے کہتے ہیں کہ اس نے اپنی جوانی کے پانچ قیمتی سال جسم بیچتے ہوئے گزارے تھے وہ جسم غلہ منڈی کے ڈھیروں کی طرح نہیں بیچتی تھی بلکہ اس میں کسی فیشن ایبل دوکان کی طرح باضابطگی تھی۔ میرے محلے یعنی اس پاکستان چوک میں آنے سے پہلے اُسے صدر کے ایک شاندار فلیٹ سے اس لئے نکالا گیا تھا کہ وہاں اس نے اپنی حرکات کی وجہ سے جو ہر اعتبار باضابطہ سہی مگر شرافت سے گری ہوئی یقینی تھیں اپنے پڑوسیوں میں بیزارگی پھیلا دی اور ایک روز تو اسے اس کے شکار چور بازاریئے سیٹھ کے ساتھ پولس نے مع ثبوت کے پکڑ لیا! آس پاس والوں نے تو سزا اس قدر دی کہ اسے محلے سے نکلوا دیا۔ لیکن جس کے ہاں روپیہ ہو اس کے لئے میرے پڑوس میں فلیٹ حاصل کرنا کوئی مشکل نہ تھا۔ یہ تو ٹھیک ہوا کہ میرے ایک مرید نے مجھے سارے حالات سے باخبر کر دیا۔ ورنہ اگر میں خدانخواستہ خلوص میں اس سے گفتگو کر بیٹھتا تو نہ جانے وہ کتنی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتی۔

یقین مانئے، جب سے میں نے یہ سنا کہ وہ طوائف زادی ہے اس وقت سے میری نظر میں وہ اس بھنگن سے بھی گئی گذری تھی جس نے زندگی میں کبھی کسی سید زادے کی غلاظت صاف کی ہو، چہ جائیکہ میں جس کے مریدوں کی تعداد سینکڑوں ہو۔ اور جس کے خاندان کو لوگ ولیوں کا خاندان کہہ کر انتہائی تعظیم سے پکارتے ہوں، اس نیچ عورت سے بات بھی کرے جو اسلام کے بنیادی ارکان کو بھی نہ سمجھ سکتی ہو جس نے تاجرانہ ذہنیت میں اور وہ بھی گھٹیا قسم کی تاجرانہ ذہنیت میں زندگی گذاری ہو، آہ! ——— اس بات کو تو بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ میں نے سیٹھ خادم علی کی دعوت صرف اس لئے نامنظور کر دی تھی کہ ان کے نجیب الطرفین ہونے کے متعلق کافی لوگوں کو اطمینان نہیں تھا۔

ویسے سلطانہ میرے پڑوس میں آنے کے بعد برقعہ پوش بن گئی تھی لیکن یہ کون نہیں جانتا کہ اس برقعہ کی آڑ میں آج کل کیسے کیسے کام ہوتے ہیں۔ خدا جانے یہ اتفاق ہی تھا یا سلطانہ کی اضطراری حرکت جو اس نے اپنا چہرہ دکھلانے کے لئے کی ہو، خیر جو کچھ بھی ہو۔ میں نے اس روز اس کا چہرہ دیکھا ضرور ہے وہ منزل کی سیڑھیوں سے نیچے جانے لئے اتر رہی تھی اور میں اوپر چڑھ رہا تھا

اس کی نقاب ہٹی ہوئی تھی ایسے محسوس ہوتا تھا، جیسے روایتی بدر النساء نے سلطانہ کا روپ دھار لیا ہو۔ اللہ اکبر، کیا صورت تھی، کیا آنکھیں تھیں، کیا لچھے، کیا پلکیں تھیں۔ ہر چیز مناسب و موزوں، آنکھوں میں غمگین چمک، یاقوت سے ترشے ہوئے ہونٹوں پر پھیکا تبسم گلاب جیسے رخسار شرم سے بھیگے ہوئے۔ ہر چیز کی تراش خراش مکمل اور موزوں یعنی جسے دیکھ کر استغفر اللہ، ایمان ڈانواں ڈول ہونے لگتا تھا۔ اس وقت دل میں عجیب اوٹ پٹانگ خیالات آئے تھے مثلاً یہ کہ خدا جانے اللہ میاں کو کیوں ان طوائفوں پر اتنی ہمدردی ہے کہ وہ تو انکو اتنی اچھی اچھی شکلیں دے دیتے ہیں کہ بس دل الٹ آتا ہے اور ایک ہم ہیں کہ ہم کو ڈھنگ کی بیویاں نصیب نہیں۔ ان خیالات کے ساتھ ہی دل نے پکارا تھا کہ "اے خداوند کریم! اگر جنت میں کم از کم ایسی حوریں مل جائیں تو تیری کبریائی کی قسم میری خاطر ایکبار جناب عزرائیل کو بھیجدے تاکہ وہ میری روح قبض کرلیں پھر اسرافیل سے کہدے کہ وہ صور پھونک دیں تاکہ مجھے قبر میں جنت کا انتظار کرنے کی اکتاہٹ محسوس نہ ہو۔ مگر یہ بڑی لمبی چوڑی ترکیب تھی، آسان اور فوری طریقہ تو یہ تھا کہ لپک کر اس کا دامن تھام لوں اور کہدوں "سلطانہ بیگم، اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے" لیکن یہ طریقہ، مجھے فوری یاد آگیا کہ میرے لئے، میری عظمت اور پاکدامنی کیلئے موت کے مترادف تھا۔ کیونکہ یہ سلطانہ طوائف زادی تھی، غلاظت کی روٹی کھانے والی تھی۔ اور میں ......؟

بروقت احتیاط نے اس معاملہ کو تو ختم کردیا۔ ساتھ ہی میں نے اپنی بیوی اور بچوں کو بھی سمجھا دیا کہ سلطانہ سے بات کرنا بہت بری بات ہے۔ اس لئے تم میں سے کوئی اس کے یا اس کے فلیٹ کے قریب بھولے سے بھی نہ جانا کیونکہ بدبو کے قریب رہنے سے بعض دفعہ خوشبو کا تصور مرجاتا ہے۔

ابھی سلطانہ کو آئے پندرہ دن بھی نہیں گذرے تھے کہ نچلی منزل والے کارخانہ دار کو شکایت ہوگئی کہ سلطانہ اچھے کردار کی نہیں وہ اسے آتے جاتے چھیڑ کر ہنسی مذاق کرنے کی کوشش کرتی ہے شکایت معقول تھی میں نے اس شکایت کو اسی روز بالائی منزل والے پارسی ڈاکٹر کے سامنے رکھدیا تاکہ وہ اور ہم دو چار آدمی مل کر سلطانہ کے بائیکاٹ کی تدبیریں سوچیں کیونکہ میں بھی اس قلیل عرصے میں اسے ایکبار کسی اجنبی کی موٹر سے اترتے دیکھ چکا تھا لیکن چونکہ پارسی ڈاکٹر نے شکایت سنی اس نے جھٹ سے کہدیا کہ غلطی سلطانہ کی ہرگز نہیں ہوسکتی کیونکہ اس نے دو تین روز پہلے خود کارخانہ دار کو اس پر آوازے کستے سنا جس کا ایک جملہ تو سوچ ہوں اور حج کے متعلق تھا اور جس کے جواب میں سلطانہ نے کچھ بھی نہیں کہا تھا "معلوم ہوتا ہے کوئی موٹی مرغی پھانسی ہے" میرے دل کے اندر سے کوئی بولا "ورنہ کارخانہ دار بھی کوئی گیا گذرا آدمی نہیں"

پندرہ دن اور گذر گئے۔ اس دوران میں مجھے یہ اعتراف ہے کہ میں نے کبھی بھی اس بات کی سنجیدگی اور غیر جانبداری سے ٹوہ لگانے کی جستجو نہیں کی کہ سلطانہ در اصل کیا معمہ ہے وہ کرتی کیا ہے یہ تو معلوم تھا لیکن اس کے طریقۂ کار کا علم نہ تھا نہ ہی اس کے ناپسندیدہ کردار کی ایک بھی جھلک دیکھنے میں آئی تھی۔ آخر کار وہ رات آہی گئی جس رات یہ معمہ اس شدت سے حل ہوا کہ جس کی شدت کی وجہ سے میرے ذہن کے گوشے گوشے میں لاتعداد چنگاریاں پھوٹ نکلیں۔

اس رات میری بیوی کو میکے گئے ہوئے دو روز ہو رہے تھے اور میں دعوت کھا کر گھر واپس ہو رہا تھا۔ میرے ایک معتقد نے نیاز دلوائی تھی۔ کھانا بڑا ہی لذیذ تھا۔ پھر نیاز کے کھانے سے ہاتھ کھینچ لینا صریحاً بے ادبی تھی۔ اس لئے مقدار سے کچھ زیادہ ہی کھا گیا۔ گھر پہنچتے پہنچتے ہی پیٹ میں کئی مرتبہ الٹ پھیر ہوگئی۔ یہی سمجھا کہ معدہ غذا پیس رہا ہوگا۔ ذرا دیر بعد تکلیف کم ہوجائے گی۔ لیکن درد نے شدت اختیار کرلی اور مجھ میں اتنا حوصلہ نہ رہا کہ لپک کر ڈاکٹر کے ہاں پہنچوں ناچار پیٹ کو دبائے پڑا رہا۔

اس کے بعد قے اور پاخانہ کی حاجت ہوئی۔ دو بار تو فارغ ہوا لیکن تیسری بار احتیاط نہ ہوسکی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کھردرے ہاتھ نے معدہ کی تھیلی کو مٹھی میں دبوچ رکھا ہے۔ پاؤں لڑکھڑا گئے چوتھی قے، اور پاخانے سے کمرے کا وسطی فرش گندہ ہوگیا۔

ساتھ ہی ایسا محسوس ہوا جیسے نخنوں نلیوں اور سر کی کھوپڑی سے کسی نے مغز نکال لیا ہو۔ آنکھوں کے ڈھیلے بجھنے لگے۔ دلیں بھولا سا بھر گیا۔ بوسیدہ بت کی طرح اپنی ہی غلاظت میں دھڑام سے گر پڑا گرتے گرتے آواز بھی دی لیکن آواز کیا تھی ددبھری آہ تھی جو سناٹے میں گونج کر رہ گئی۔ رات بھیگ چکی تھی۔ اور بھیگی رات کے اس حِصّہِ خواب حصہ میں جبکہ تارے بھی سکڑ کر اونگھنے لگے تھے۔ دل نے سوچا، اب کون ہے جو خبر گیری کرے گا۔ ہائے تقدیر، کیا موت حصہ میں آئی ہے کل لوگ مجھے، میری لاش کو غلاظت سے اٹھائیں گے۔ اس کے بعد مجھے علم نہیں۔ ہاں بے ہوشی کا سکون بخش احساس ضرور ہے۔

میں نے ڈپٹی صاحب کی "توبۃ النصوح" بچپن میں ہجے کر کے پڑھی تھی لیکن یہ خدا کا فضل ہے کہ اس وقت کے لفصوح جیسا ایمان سے بے بہرہ نہیں ہوں۔ اس لئے آنکھ کھولنے سے لمحہ بھر پہلے یہ اطمینان ہی رہا کہ بندے حساب کتاب کی فکر نہیں۔ تو سادات ہے۔ اور سادات کا معاملہ خدا اور بندے کا ذاتی معاملہ ہے۔ پھر بھی رضوان نے اگر جنت میں جانے سے روکا تو کہدیں گے کہ بھئی رضوان زندگی میں دو چار، لغزشیں ہوئی ہیں۔ میں عورتوں کے بارے میں تو کہوں گا نہیں کہ کیا لغزش کی، ہاں اگر یہ پوچھو کہ اپنے پڑوسی ہندو کو کیوں مار ڈالا تھا تو کیا یہ جواب کافی نہیں کہ تمہارا ایک مسلمان بھائی اس کا مقروض تھا اور کیا کوئی مسلمان یہ برداشت کر سکتا ہے کہ کوئی اسے کافر کا مقروض کہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی تم چاہو میرے نامۂ اعمال سے دیکھ لو۔ سزا دینا چاہتے ہو تو میری طرف سے میرے حصے کی نہر کے دودھ میں کچھ پانی ملا دو۔ یہی میرے لئے بہت ہوگا۔

لیکن جب آنکھ کھلی تو عجیب منظر تھا۔ میں صاف ستھرے کپڑے پہنے اپنی ہی مسہری کے اجلے بستر پر آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ فلیٹ کے باہر کسی کے زور زور سے جھگڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ شاید صبح ہو رہی تھی کیونکہ پیلی پیلی دھوپ مشرقی سمت کھلنے والی کھڑکی کی جالی سے چھن چھن کر آرہی تھی۔

باہر جو شور ہو رہا تھا لمحہ بھر کے لئے دھیما ہوا۔ پھر میرے فلیٹ کا دروازہ زور سے کھلا اور چند آدمی اندر گھس آئے۔ وہ بلڈنگ کے معززین تھے جن کے ساتھ ایک پولیس انسپکٹر اور دو کانسٹیبل بھی تھے میں نے انھیں دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن نہ اٹھ سکا۔ نقاہت نے کمر توڑ کر رکھدی تھی۔

نچلی منزل کے کارخانہ دار نے آگے بڑھ کر مجھ پر طنز کرتے ہوئے کہا۔ "اٹھئے مولانا، کیا رات کا خمار اب تک باقی ہے" میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ میں نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر گر پڑا۔ میری یہ حالت پارسی ڈاکٹر سے چھپی نہ رہ سکی، اس نے آگے بڑھ کر میرا معائنہ کیا پھر گھبرائے ہوئے لہجہ میں بول اٹھا "ارے، یہ تو ہیضہ کا مریض ہے"

سب پر اس جملے نے جیسے سحر کر دیا۔ وہ چپ چاپ دروازے کی طرف بڑھے۔ پولس انسپکٹر جھلائے ہوئے لہجہ میں کہنے لگا لیکن آپ میں سے اکثر صاحبان نے حلفیہ کہا تھا کہ کل رات سلطانہ نے مولانا کے کمرے میں گذاری اور علی الصبح آپ میں سے اکثر نے اس فلیٹ سے باہر نکلتے دیکھا۔

مجھے اب بھی یہ کہنے میں باک نہیں کہ میں سید ہوں، میری پردادی کے مزار پر بدستور پانی کا چراغ جل رہا ہے۔ سارے لوگ جانتے ہیں کہ میرے دادا کامل ولی تھے۔ لیکن جب سے مجھے یہ معلوم ہوا سلطانہ نے پیشہ کرنے کے بجائے زنانہ ٹیلرنگ فرم میں کٹنگ کا کام شروع کر رکھا ہے۔ میرے ذہن کی نیچی نیچی دیواروں سے کوئی غیر مانوس ہاتھ کوئی چیز کھرچنے لگا ہے اور میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اس سلطانہ کمبخت کا اس رات والا برتاؤ مجھے بدل کر نہ رکھدے۔

(بشکریہ "فانوس")

احمد نسیم مینانگری

بتاؤ اے دہر کے نظارو!

یہ گل یہ غنچے یہ گلستاں کیا! — یہ چاند سورج یہ آسماں کیا
کہیں یہ پانی کے بہتے چشمے — یہ سبز گلشن یہ خشک صحرا
کہیں چرندوں کے غول رقصاں — کہیں پرندوں کی نغمہ خوانی

فضا میں موسم کے تازہ جلوے — برس رہے ہیں خیال بن کر
نسیمِ صبحِ چمن کے جھونکے — کہیں گلوں کو ہنسا رہے ہیں
ہر ذرّے ذرّے میں ایک عالم — نہاں نہاں بھی عیاں عیاں بھی
زمین گردش بھی کر رہی ہے — ہے گرم بھی کارزارِ ہستی
میں سوچتا ہوں یہ بات کیا ہے؟ — یہ نظم و ضبطِ حیات کیا ہے؟
ہے کون خلّاق زندگی کا؟ — ہے کس کی تخلیق کارفرما؟
یہ کس کی قدرت کے ہیں کرشمے؟ — یہ کون جلوے دکھا رہا ہے؟
یہ کس کی توحید کے اُجالے؟ — مری نظر میں سما رہے ہیں!
یہ دعوتِ فکر دے رہے ہیں — کسی کی حکمت ہے کارفرما!

یہ کارخانہ عبث نہیں ہے!

چراغ اک دل میں جل رہا ہے
مزاجِ ہستی بدل رہا ہے
نئے اُجالوں کو دیکھتا ہوں
میں سو رہا ہوں کہ جاگتا ہوں

بتاؤ اے دہر کے نظارو!

(نئی نسلیں)

منظر حسین

سرکار کی خدمت میں

پہلی درخواست

جنابِ عالی!

مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ دفتر میں ایک ہیڈ کلرک کی جگہ خالی ہونے والی ہے لہٰذا میں بصد ادب اپنے کو ایک امیدوار کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں۔

جہاں تک تعلیم و تجربہ کا تعلق ہے گذارش ہے کہ میں نے سنہ ۱۹۳۳ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے پاس کیا تھا۔ اور مختلف اہم جگہوں پر کام کرنے کے بعد اب تقریباً چھ سال سے حضور کے زیرِ سایہ ایک سینیئر کلرک کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ اور بفضلِ خدا آج تک حضور کو اور نہ ہی حضور کے ماتحت افسروں کو میرے کام کے بارے میں کسی قسم کی کوئی شکایت ہوئی۔

میری عمر اس وقت چالیس سال ہے۔ سارٹیفکٹ کے مطابق ہے۔ (جس کی ایک نقل منسلک ہے) اور میرے متعلقین کی تعداد بارہ ہے جن کے بنیادی حقوق موجودہ تنخواہ میں کماحقہ ادا کرنے کے قابل نہیں۔

امید ہے سرکار میری درخواست پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے جس کے لئے میں ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ اور سرکار کے اقبال کی بلندی کے لئے ہمیشہ دعا گو ـــــــ آپ کا فرمانبردار خادم

احمد اللہ نجاشی

مورخہ ۳ فروری سنہ ۱۹۴۸ء — سینیئر کلرک سیکشن

(۲)

مسٹر احمد اللہ نجاشی کی درخواست پیش کی جاتی ہے اور ان کے کیس کی پُرزور سفارش۔

آئی۔آئی۔ برنی

مورخہ ۱۰ مارچ سنہ ۱۹۴۸ء — ہیڈ کلرک

(۳)

لیکن تم نے اس کے کام کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ تمہاری سفارش کی بنیاد کیا ہے؟

ایچ۔جی۔ رولر

مورخہ ۱۲ اپریل سنہ ۱۹۴۸ء — آفس سپرنٹنڈنٹ

(۴)

مسٹر نجاشی ایک بہت اہم کام پر لگے ہوئے ہیں۔ پورے برانچ میں ان کی ٹکر کا کوئی آدمی موجود نہیں۔ انھیں جو کام دیا جاتا ہے اسے سلیقے سے کرتے ہیں اور اسکا حق ادا کردیتے ہیں مجھے ان سے بہت مدد ملتی ہے اور میں ان کے کام سے بہت خوش ہوں اور مطمئن۔

آئی۔آئی۔ برنی

مورخہ یکم مئی سنہ ۱۹۴۸ء — ایچ۔سی

(۵)

ہیڈ کلرک! مجھ سے ملو۔

ایچ۔جی۔ رولر

مورخہ ۱۰ مئی سنہ ۱۹۴۸ء — او۔ایس

(۶)

درخواست ضروری ایکشن کے لئے پیش کی جاتی ہے۔

ایچ۔جی۔ رولر

مورخہ ۸ جولائی سنہ ۱۹۴۸ء — او۔ایس

(۷)

او۔ایس! یہ درخواست کس غرض کیلئے پیش کی گئی ہے؟

ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ جوزف

مورخہ ۴ اگست ۱۹۴۸ء — (ڈپٹی اسسٹنٹ ڈائرکٹر)

(۸)

یہ مسٹر نجاشی (سینیئر کلرک) کی درخواست ہے۔ ہیڈ کلرک کی

خالی جگہ کے لئے۔ اگر اجازت ہو تو اے۔ او (O - A) کو ضروری ایکشن کے لئے بھیج دی جائے۔ ایچ۔ جی۔ رولر

مورخہ یکم ستمبر ۱۹۴۸ء او۔ ایس

(۹)

بھیج دی جائے۔

مورخہ ۱۰ راکتوبر سنہ ۴۸ء ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ جوزف

(۱۰)

مسودہ

نمبر ۴۵ بی (۲۱) ۵۳ —— بنام :۔ ایڈمنسٹریٹو آفیسر ——

موضوع —— ہیڈ کلرکی کے لئے درخواست

مسٹر احمد اللہ نجاشی (سینیئر کلرک) کی درخواست برائے ہیڈ کلرکی ضروری ایکشن کے لئے بھیجی جاتی ہے۔

ڈی۔ اے۔ ڈی ——

حسب حکم مورخہ ۱۰ راکتوبر سنہ ۴۸ء مسودہ برائے منظوری پیش کیا جاتا ہے۔ آئی۔ آئی۔ برنی

مورخہ ۱۶ راکتوبر سنہ ۴۸ء ایچ۔ سی

ایچ۔ جی۔ رولر

مورخہ ۲۸ راکتوبر سنہ ۴۸ء او۔ ایس

(۱۱)

ٹائپسٹ ! صرف ایک کاپی

آئی۔ آئی۔ برنی

مورخہ ۳۱ راکتوبر ۴۸ء ایچ۔ سی

(۱۲)

برائے دستخط پلینر —— آئی۔ آئی۔ برنی

مورخہ ۱۵ رنومبر سنہ ۴۸ء ایچ۔ سی

ایچ۔ جی۔ رولر

مورخہ ۱۸ رنومبر سنہ ۴۸ء او۔ ایس

(۱۳)

مسٹر نجاشی کو بھیجو۔ میں ان سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

مورخہ ۲۰ رنومبر سنہ ۴۸ء ڈبلیو۔ ڈبلیو جوزف

(۱۴)

دفتر —— صاحب بہادر

نمبر ۴۵ بی (۲۱) ۵۳/۲۵۱۵ بنام :۔ ایڈمنسٹریٹو آفیسر صاحب بہادر ——

مورخہ یکم دسمبر سنہ ۱۹۴۸ء

موضوع ہیڈ کلرکی کے لئے درخواست

مسٹر احمد اللہ نجاشی سینیئر کلرک کی درخواست ضروری ایکشن کے لئے بھیجی جاتی ہے۔ (دستخط) ڈبلیو۔ ڈبلیو جوزف

ڈپٹی اسسٹنٹ ڈائرکٹر

دوسری درخواست جناب عالی

میں نے مورخہ ۳ رفروری سنہ ۱۹۴۸ء کو آپ کی خدمت میں ایک درخواست اس مضمون کی پیش کی تھی۔ کہ دفتر میں ایک ہیڈ کلرک کی جگہ خالی ہونے والی ہے۔ مجھے اب پتہ چلا ہے کہ وہ جگہ خالی ہو کر بھر بھی گئی ہے (اگرچہ وہ شخص جسے ہیڈ کلرک بنایا گیا ہے میٹرک بھی پاس نہیں اور نہ ہی وہ کچھ زیادہ تجربہ کار ہے) اب کچھ اور جگہیں عنقریب ہی خالی ہونے والی ہیں۔ لہٰذا میں ان میں سے ایک کے لئے پھر درخواست پیش کرتا ہوں۔ اس گزارش کے ساتھ کہ گرانی کی وجہ سے موجودہ تنخواہ میں میری اور میرے بال بچوں اور دیگر متعلقین کی گذر بسر نہیں ہوتی ہے میرے متعلقین کی مجموعی تعداد اب تیرہ ہے۔ جس میں سے چھ (۶) مستقل طور پر بیمار رہتے ہیں۔ مگر ان کا علاج نہیں ہو سکتا۔ میری بیوی سخت بیمار ہے اور اس کے علاج کے لئے مجھے روپیوں کی سخت ضرورت ہے۔ امید ہے سرکار میرے حال پر رحم کریں گے۔

آپ کا وفادار خادم

احمد اللہ نجاشی

سینیئر کلرک سیکشن ——

مورخہ ۲۰ رجنوری سنہ ۱۹۴۹ء

(۲)

مسٹر نجاشی کی درخواست پیش کی جاتی ہے۔ کچھ دنوں سے انکا کام خراب ہو رہا ہے انھوں نے مختلف درخواستوں میں بیوی کی علالت کا بہانہ بنا کر بہت سی چھٹیاں لے ڈالی ہیں۔

آئی۔ آئی۔ برنی

مورخہ ۳ر مارچ سنہ ۴۹ء ایچ۔ سی

(۳)

کیا مسٹر نجاشی نے اپنی بیوی کی علالت کا سارٹیفکٹ دیا ہے؟

ایچ۔ جی۔ رولر

مورخہ ۱۲ر اپریل سنہ ۴۹ء او۔ ایس

(۴)

جی نہیں ...... مسٹر نجاشی سے ان کی بیوی کی علالت کا سارٹیفکٹ مانگا جائے۔ آئی۔ آئی۔ برنی

مورخہ ۲۰ر اپریل سنہ ۴۹ء ایچ۔ سی

(۵)

مسٹر نجاشی ــــ سارٹیفکٹ دو۔

ایچ۔ جی۔ رولر

مورخہ یکم مئی سنہ ۴۹ء او۔ ایس

(۶)

مسٹر نجاشی ــــ! بیوی کی بیماری کے ثبوت میں ایک ہفتہ کے اندر سارٹیفکٹ دیجیے۔ آئی۔ آئی۔ برنی

مورخہ ۱۲ر مئی ۴۹ء ایچ۔ سی

(۷)

ہیڈ کلرک! جناب میری بیوی سخت بیمار ہے لیکن میرے پاس روپیہ نہیں کہ اس کا علاج کراؤں۔ جب علاج نہیں ہوتا تو ــــ سارٹیفکٹ کہاں سے ملے گا؟ مجھے افسوس ہے آپ نے میری درخواست پر اچھے کلمات نہیں لکھے ــــ حالانکہ آپ میرے حالات کا پورا پورا علم رکھتے ہیں۔ میں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ ان حالات کے تحت ایک عام انسان کا دماغ کام نہیں کر سکتا۔.... میرا کام صرف اسی لئے خراب ہو رہا ہے کہ مجھے دماغی سکون اور جسمانی راحت میسر نہیں۔

آپ کا خادم

احمداللہ نجاشی

مورخہ ۱۳ر مئی سنہ ۴۹ء سینیر کلرک

(۸)

مسٹر نجاشی کا جواب پیش کیا جاتا ہے۔ انھیں اپنی بیوی کو سرکاری ہسپتال میں فوراً داخل کر دینا چاہیئے، جہاں اس کا باقاعدہ معائنہ کیا جاسکے۔ آئی۔ آئی۔ برنی

مورخہ ۲۴ر جون ۴۹ء ایچ۔ سی

(۹)

مسٹر نجاشی اپنی بیوی کو فوراً ہسپتال میں داخل کردیں۔

ایچ۔ جی۔ رولر

مورخہ ۲۸ر جون سنہ ۴۹ء او۔ ایس

(۱۰)

مسٹر نجاشی ــــ نوٹ کیجیے۔

آئی۔ آئی۔ برنی

مورخہ ۳۰ر جون سنہ ۴۹ء ایچ۔ سی

(۱۱)

ہیڈ کلرک ــــ! جناب گزارش ہے کہ میں اپنی بیوی کو..... ہسپتال میں داخل کردوں تو میرے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کون کریگا؟ میرے بوڑھے والدین یہ کام نہیں کرسکتے۔ کہ بچوں کو روٹی پکا پکا کر دیں وہ پلنگ سے اٹھنے کے قابل ہی نہیں۔

آپ کا خادم

احمداللہ نجاشی

مورخہ ۳۰ر جون سنہ ۴۹ء سینیر کلرک

(۱۲)

مسٹر نجاشی کا جواب پیش خدمت ہے۔ مسٹر نجاشی اپنی بیوی کے میڈیکل انسپکشن سے گریز اختیار کر رہے ہیں

آئی۔ آئی۔ برنی

مورخہ ۱۴ر جولائی سنہ ۴۹ء ایچ۔ سی

(۱۳)

مسٹر نجاشی — مجھ سے ملو

ایچ۔ جی۔ رولر

مورخہ ۲۶ جولائی سنہ ۴۹ء — او۔ ایس

(۱۴)

مسٹر نجاشی اپنی بیوی کو سرکاری ہسپتال میں بھیجنے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کی تمام پچھلی چھٹیاں جن میں بیوی کی علالت کا ذکر ہے نامنظور کی جائیں — اور ان دنوں میں "غیر حاضر" قرار دیکر ان کی تنخواہ کاٹ لی جائے ایسی صورت میں ان کی درخواست مورخہ ۲۰ جنوری سنہ ۴۹ء فارورڈ نہیں کی جا سکتی۔

ایچ۔ جی۔ رولر

مورخہ ۳۰ جولائی سنہ ۴۹ء — او۔ ایس

(۱۵)

مسٹر نجاشی — مجھ سے ۱۴ اگست کے بعد ملو۔

مورخہ ۴ اگست سنہ ۴۹ء — ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ جوزف

(۱۶)

مسٹر نجاشی اپنی بیوی کے میڈیکل انسپکشن کے لئے راضی ہوگئے ہیں چیف میڈیکل آفیسر کے نام ایک خط بھیجدو۔

مورخہ ۲۶ اگست سنہ ۴۹ء — ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ جوزف

(۱۷)

دفتر — صاحب بہادر

نمبر ۴۵ بی (۲۱) ۵۳/۵۱۰۲

۲۲ اکتوبر سنہ ۴۹ء — بنام: چیف میڈیکل آفیسر

موضوع: مسٹر احمد اللہ نجاشی کی بیوی کا ڈاکٹری معائنہ

براہ کرم مسٹر احمد اللہ نجاشی (سینیئر کلرک) کی بیوی کا ڈاکٹری معائنہ کرکے جلد از جلد اپنی رپورٹ پیش کیجیے۔

معاملہ اہم ہے — (دستخط) ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ جوزف

ڈپٹی اسسٹنٹ ڈائرکٹر

(۱۸)

دفتر چیف میڈیکل آفیسر —

نمبر ۳۰۴ الف/۱۱ ن/۹۵۱ د ۱۴ — بنام

مورخہ ۹ دسمبر سنہ ۴۹ء — ڈپٹی اسسٹنٹ ڈائرکٹر —

موضوع: میڈیکل انسپکشن رپورٹ

میں نے مسز احمد اللہ نجاشی (عمر ۳۰ سال) کا بغور معائنہ کیا۔ میری رائے میں وہ "ٹی بی" میں مبتلا ہیں۔ دونوں پھیپھڑے متاثر ہو چکے ہیں۔

(دستخط) جی۔ او۔ برینڈلے

برائے چیف میڈیکل آفیسر

(۱۹)

چیف میڈیکل آفیسر کی رپورٹ مسز نجاشی کے متعلق پیش ہے۔ میری تجویز ہے کہ مسٹر نجاشی کا بھی ڈاکٹری معائنہ کرایا جائے تاکہ یہ اطمینان ہو سکے کہ وہ خود اس مرض میں مبتلا نہیں — چند دنوں سے وہ آفس میں بری طرح کھانس رہے ہیں۔

آئی۔ آئی۔ برنی

مورخہ ۸ دسمبر سنہ ۴۹ء — ایچ۔ سی

(۲۰)

فوراً — انھیں اب ایک ماہ کی "ارنڈ لیو" اور پندرہ دن کی آدھی تنخواہ پر "میڈیکل لیو" دی جا سکتی ہے

ایچ۔ جی۔ رولر

مورخہ ۹ دسمبر سنہ ۴۹ء — او۔ ایس

(۲۱)

ہاں — چھٹی کی درخواست کہاں ہے؟

مورخہ ۱۰ دسمبر سنہ ۴۹ء — ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ جوزف

(۲۲)

مسٹر نجاشی — چھٹی کی درخواست دیجیے اور اپنا ڈاکٹری معائنہ کرائیے۔ خط ایشو کیا جا رہا ہے۔

آئی۔ آئی۔ برنی

مورخہ ۱۱ دسمبر سنہ ۴۹ء — ایچ۔ سی

(۲۳)

درخواست حاضر ہے جناب۔ مگر میری درخواست مورخہ ۲۰ جنوری سنہ ۴۹ء پر بھی غور فرمائیے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس کا حشر بھی ویسا ہی نہ ہو جیسا کہ میری پچھلی درخواست کا ہو چکا ہے۔

اگر میں ہیڈ کلرک بننے میں کامیاب ہوگیا تو آپ کا بیحد مشکور ہوں گا اور اس قابل ہو جاؤں گا کہ اپنے قرضے وغیرہ چکا دوں۔ پندرہ دن کی آدھی تنخواہ پر "میڈیکل لیو" میرے لئے مزید قرضے کا باعث ہوگی۔ میرے حال پر رحم کھاکر مجھے پوری تنخواہ دیجئے گا ــــ ایک خاص کیس کی حیثیت سے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ کا خادم

مورخہ ۱۱ر دسمبر سنہ ۴۹ء — احمداللہ نجاشی (سینیر کلرک)

(۲۴)

چھٹی منظور کی جائے۔ سردست ایک ماہ کی رخصت کافی ہوگی "میڈیکل لیو کے لئے چیف میڈیکل آفیسر کی رپورٹ چاہیئے ......
ابھی مسٹر نجاشی کی بیماری کا کوئی ثبوت نہیں اس لئے چھٹی انھیں صرف اس غرض کے لئے دی جاسکتی ہے کہ وہ اس دوران میں اپنی بیوی کا.... خاطر خواہ علاج کراسکیں جیسا کہ انھوں نے خود اپنی درخواست میں لکھا ہے

آئی۔ آئی۔ برنی

مورخہ ۱۲ر دسمبر سنہ ۴۹ء — ایچ۔ سی

(۲۵)

مجھے مندرجہ بالا سے کامل اتفاق ہے۔

ایچ۔ جی۔ رولر

مورخہ ۱۳ر دسمبر سنہ ۴۹ء — او۔ ایس

(۲۶)

چھٹی منظور کی جاتی ہے۔

مورخہ ۱۵ر دسمبر سنہ ۴۹ء — ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ جوزف

(۲۷)

مسٹر نجاشی ــــ آپ کی چھٹی د صرف ایک ماہ کے لئے) منظور ہوگئی۔ اگر ضرورت ہو تو میڈیکل لیو کے لئے دوسری درخواست چیف میڈیکل آفیسر کی رپورٹ کے ساتھ دیجئے گا۔ چیف میڈیکل آفیسر کے نام خط لے لیجئے۔ — آئی۔ آئی۔ برنی

مورخہ ۱۶ر دسمبر سنہ ۴۹ء — ایچ۔ سی

آخری درخواست

جناب عالی

گزارش ہے کہ آپ کا خط نمبر ۴۵ بی (۲۱) ۵۳/۸۱۱۵ مورخہ ۵ رمئی سنہ ۵۰ء ملا۔ آپ کی مہربانیوں کا کہاں تک شکریہ ادا کروں پہلے آپ نے مجھے ایک ماہ کی رخصت مع تنخواہ کے دی۔ پھر آپ نے پندرہ دن کی چھٹی آدھی تنخواہ پر دی۔ پھر آپ نے تین ماہ کی رخصت بغیر کسی تنخواہ کے دی۔ اور اب آپ نے میرا پتہ ہی کاٹ دیا۔ کیونکہ اس سے زائد آپ کے بس میں نہ تھا........ لیکن سرکار گستاخی معاف کریں۔ آپ کے بس میں ابھی بہت کچھ ہے۔ میں دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ جہاں آپ نے اتنے کرم کئے ہیں وہاں ایک کرم اور کیجئے۔
"مجھے اور میرے متعلقین کو گولی سے اڑا دیجئے"

آپ کا فرماں بردار خادم
احمداللہ نجاشی

مورخہ ۱۵ر مئی سنہ ۵۰ء — (ایکس سینیر کلرک)

"معیار"

جن کی مدت خریداری ستمبر ۵۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہوگئی ہے۔

۲۰۵۲ محترمہ شاہدہ نسرین محفوظ صاحبہ، کراچی
۲۰۵۳ جناب عبدالرؤف صاحب علوی، حیدرآباد
۲۱۸۸ غلام رحمانی صاحب، مردان
۲۲۱۳ سجادہ نشین صاحب، مکھڈ شریف (کیمبل پور)
۲۳۶۲ محمد نواز ملک صاحب، منتگری
۲۳۸۸ محمد کامل صاحب اخلاقی، بنارس
۲۳۹۶ محترمہ عابدہ سلطانہ صاحبہ، کراچی۔
۲۴۰۴ جناب میسرز فاروق احمد برادرز، خیرپور
۲۴۰۵ مسز الیف، شوکت صاحبہ، جہلم
۲۵۱۵ محمد صدیق صاحب، سیالکوٹ
۲۵۱۶ جناب محمد حنیف فتح سکندر صاحب۔ جلگاؤں۔
۲۵۱۷ جناب عبدالغفور صاحب، لاہور۔
۲۵۱۸۔ جناب ماسٹر محمد سلیمان صاحب گلسی بانگر ننہ

کوثر نیازی•

باوجودِ رازِ بے چینی عیاں ہونے لگی
چشمِ ناخفتہ ہی دل کی ترجماں ہونے لگی

خیر مجھ پر تو رہی تھی آپ کی مشقِ ستم
ساری دنیا آپ سے کیوں بدگماں ہونے لگی

جب جوانی تھی امنگوں پر بڑھاپا آگیا
اب بڑھاپا ہے تو ہر خواہش جواں ہونے لگی

اللہ اللہ تیرے دیوانوں کی راحت کا خیال
ریگِ صحرا بھی حریر و پرنیاں ہونے لگی

آہ پر نگرانیاں فریاد پر پابندیاں
بے زبانی اب چمن بھر کی زباں ہونے لگی

طبع نازک کو رہِ الفت میں جانے کیا ہوا
ہر مصیبت باعثِ آرامِ جاں ہونے لگی

کیا دیارِ دوست اے کوثر قریب آنے کو ہے
دل کی ہر دھڑکن خوشی سے نغمہ خواں ہونے لگی

(زرِ گل کی ایک غزل)

قمر جمیل•

میری کہانی کا انجام
جیسے خون آلودہ شام

شوق کے عالم میں گم ہوں
پوچھ رہا ہوں اپنا نام

فکر کو جب بھی قید کیا ہے
فکر بھی ہے لفظ کے دام

خواب میں بھی ہم جاگ رہے ہیں
نیند میں بھی ہے نیند حرام

تنہائی میں ان کی یاد
ویرانہ میں جیسے شام

جنت ان کے روز و شب
دوزخ میرے صبح و شام

اب بھی قمر یاد آتی ہے
ایک تمنائے ناکام

مکرمی تسلیم

تعمیری ادب کا ڈائجسٹ "مشیر" اکثر و بیشتر میرے پاس آتا رہا ہے۔ چنانچہ اگست کے مشیر میں بھی میری ایک نظم شائع ہوئی "ماہِ نو" کے حوالے سے "مشیر" کے اکثر مضامین افسانے مجھے اسی لئے پسند ہیں کہ بہت سے ادبی رسالوں کا نچوڑ ہیں۔ اس سلسلے میں آپ سے ایک گذارش ہے وہ یہ کہ اگست ۵۹ء کے ماہِ نو (استقلال نمبر) میں جو نظم "نوحہ برگ تنبول" کے نام سے شائع ہوئی ہے وہ نہ صرف مسخ شدہ ہے بلکہ ادارہ ماہِ نو نے اس میں اٹھارہ شعروں کا اضافہ بھی کیا ہے۔ میں یہ نظم بقلم خود نقل کر کے اصلی حالت میں ارسال کر رہی ہوں تاکہ میری پوزیشن صاف ہو جائے اور پڑھنے والے خود اس نظم کا موازنہ اس "خرافات" سے کر سکیں جو میرے نام سے زبردستی موسوم ہے

وحیدہ نسیم

وحیدہ نسیم ●

نوحۂ برگِ تنبول

داستانِ بلاکشاں نہ سنو
نہ سنو میری داستاں نہ سنو

پان افسوس اب نہیں ملتے　　منہ میں غنچے کہیں نہیں کھلتے
کشتیاں پان کی ہیں نوحہ کناں　　خاصداں اب ہے گنبدِ ویراں
پیک دانوں کی بزم برہم ہے　　پاندانوں میں اب محرم ہے
پان اے پان اے بہشت بریں　　کیا ہوئے منہ کے آسمان و زمیں
یوں تو ہر حال میں ہمیں ہو عزیز　　پانداں میں مگر تھے اور ہی چیز
پانداں میں ترا جو تھا رہنا　　تجھ سے دل باغ باغ تھا اپنا
تجھ سے کٹتا تھا رنج تنہائی　　تجھ سے پاتا تھا دل شکیبائی
تو حسینوں کے منہ کی لالی تھا　　تو ضعیفاؤں کی جگالی تھا
دانت باغی نہ تھے ذرا تجھ سے　　منہ تھا سارا ہرا بھرا تجھ سے
سادگی گھر پہ ہو گئی طاری　　اب کہاں پیک کی وہ پچکاری
ختم خاطر ہے میہمانوں کی　　گود خالی ہے پاندانوں کی
"یاد اپنی انہیں دلائیں کیا"　　"پان کل کے لئے لگائیں کیا"
ہو اکتھے کا جب جہاں سُونا　　اپنی ڈبیہ میں جم گیا چُونا
نہیں آتا ہے رُخ ترا جو نظر　　ٹکڑے ٹکڑے ہے چھالیہ کا جگر
پھول مرجھا گئے ہیں لونگوں کے　　دانہ ہائے الائچی سوکھے
راحتِ دل نہیں قوام کی بُو　　عالم ہُو ہے ایک تمباکو
دلی والوں کے منہ پہ ہیں تالے　　ہاتھ ملتے ہیں لکھنؤ والے
دل پہ تیرے بغیر کیا گذری　　پوچھے اہلِ طلب سے جا کے کوئی

منہ ہے کھلتا جماہی آتی ہے
سانس ایک اک تجھے بلاتی ہے

تذکرے اور تبصرے

"ماؤزے تنگ کے دیس میں"

تصنیف :- کارلوسا ئگو ۔ ترجمہ :- جیلانی بی۔ اے
ضخامت :- ۲۵٦ صفحات ۔ قیمت :- دو روپے آٹھ آنے
ناشر :- مکتبہ چراغِ راہ لاہور

یہ کتاب ایک اطالوی پادری کی یادداشتوں کا ذخیرہ ہے جسے میلان کے تبلیغی ادارہ کی جانب سے ۴۸ء میں چین بھیجا گیا تھا۔ ۲۹ جون ۵۰ء کو ماؤزے تنگ کی سرخ فوج نے اسے سوئرے کے مقام پر گرفتار کرلیا اور ۲۸ جنوری ۵۲ء تک وہ اس خوفناک اذیت بخش ماحول میں صرف اس لئے زندہ رہا ـــــــــ رکھا گیا کہ وہ دواؤں کا استعمال جانتا تھا اور آتشک زدہ کمیونسٹوں کو دواؤں کی ضرورت تھی۔ امید و بیم، اور ہراس و انتظار کے ان مہینوں میں جب قیدی، ہر روز کسی فیصلہ کن مرحلے کے منتظر رہتے تھے یہ حساس پادری روزآنہ کے واقعات فوری طور پہ ڈائری کی شکل میں کاغذ پر اتارتا رہا اور اس کے لئے ایک دن اس نے ماؤزے تنگ کی تصویر تک پھاڑ ڈالی۔ اس کتاب کو پڑھتے وقت اگر روس کے مفرور کمیونسٹ کرام چودکی کی کتاب "آزادی یا موت" کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ سرخ انقلاب چاہے دنیا کی کسی مہذب و نیم مہذب ملک میں برپا ہو یا صدیوں کی روایات میں جکڑے ہوئے قدیم ترین تمدن کی سرزمین پر اس کا استبدادی نتیجہ ایک ہی انداز سے عوام کے حلقوم کو کستا ہے کارلوسائگو کی یہ کتاب سرخ چین کے جہنم زار کی ایک ہلکی سی جھلک ہے لیکن اس سے اس تام نہاد غیر طبقاتی نظام اور عوامی عدل و انصاف پر مبنی سوسائٹی کا بھی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے جو دائمی خوف و ہراس، شک و شبہات، ظلم و جبر، نفرت اور کینہ کے عناصر سے مل جل کر تشکیل پاتی ہے یہ سوسائٹی جہاں ہر شخص کو دوسرے پر جاسوس ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ جہاں رجعت پسند خاندانی زندگی کو ڈائنامائٹ کرنے کے لئے بچوں سے والدین کے منہ پر طمانچے لگوائے جاتے ہیں جہاں غیر ترقی یافتہ جاہل عورتوں سے حیا و شرم کی چادر چھین کر انہیں ترقی کا سرٹیفکٹ عطا کیا جاتا ہے۔ جہاں عوامی عدالتوں کے انصاف سے بچنے کے لئے نوجوان بیٹا اپنی ماں کی چھاتی میں لوہے کی گرم سلاخ بھونک دیتا ہے۔ جہاں پارٹی کے ساتھ اپنا خلوص ثابت کرنے اور کوئی اونچا منصب حاصل کرنے کے لئے بعض خباثت پسند اپنے کل عزیز و اقارب کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ جہاں عوام میں سیاسی سوجھ بوجھ اور اپنا برا بھلا سوچنے کی عقل پیدا کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ایک مسلسل دہشت اور خوف میں مبتلا کر کے انکی ساری ذہنی صلاحیتیں ہی مفلوج کر دی جائیں

کارلوسائگو نے اس سوسائٹی سے یہ تمام مشاہدات اپنا کر خلوص اور اس عالمگیر جذبہ انسانیت کے تحت لکھے ہیں جو صرف ایک خدا پرست اور انسان کو مادی مظہر سے برتر چیز سمجھنے والے کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے کہ روزآنہ کے واقعات کے علاوہ بعض دوسرے متعلقہ تفصیلات اور کہیں کہیں اپنی ذاتی رائے پیش کرتے وقت بھی اس کے قلم نے خطابت کا انداز اختیار نہیں کیا۔ اس لئے کتاب کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے مترجم نے بھی تصنیف کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ زبان شروع سے آخر تک شگفتہ ہے اور رواں ۔

(ق۔ ق)

کمندیں

مصنف علی سفیان آفاقی۔
ضخامت :- ۲۵٦ صفحات ۔ قیمت :- تین روپے
ناشر :- مکتبہ چراغ راہ لاہور

اردو کے نوعمر و اولوالعزم ادیب علی سفیان آفاقی کے تیرہ مزاحیہ و طنزیہ مضامین اس مجموعے میں شامل ہیں۔ کسی صحت مند تحریک کے ادبی گوشوں کی نشوونما کے لئے طنز و مزاح کی ضرورت و افادیت محتاج

تعارف نہیں۔ مکتبہ چراغ راہ نے اس کتاب کو شائع کرکے ایک بڑے خلا کو پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے چند مضامین مثلاً "ایک فسطائی" "بے چارے ایڈیٹر" "میں ذاتی دوست ہوں" وغیرہ اردو کے بہترین طنزیہ مضامین وافسانوں کی صف میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں۔ ان مضامین میں قاری جہاں مصنف کے لطیف وہمہ گیر طنز سے متاثر ہوتا ہے وہاں اس کی خداداد فنکارانہ صلاحیتوں کا بھی قائل ہوجاتا ہے لیکن افسوس ہے کہ ملی سفیان آفاقی جیسا فنکار بھی اپنے لئے کوئی مستقل رنگ اختیار نہیں کرسکا۔ اسی مجموعے کے چند دوسرے مضامین میں مصنف اردو کے کئی دوسرے طنز نگاروں اور مزاح نویسوں سے اس حد تک متاثر نظر آتا ہے کہ اس کی اپنی انفرادیت بالکل گھائل ہوکر رہ گئی ہے۔ مثلاً راوی لکھتا ہے، کامریڈ سندباد کا آٹھواں سفر، اور تنقید کا فن، شفیق الرحمٰن کے اسی قبیل کے مضامین کی صدائے بازگشت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کہیں کہیں قاری کو ہنسانے کی ایک جبریہ کوشش بھی مضمون کا نقص بن گئی ہے۔ بعض جگہ زبان کی طرف سے بھی عدم توجہی اختیار کی گئی ہے مثلاً انقلاب کے بعد راوی عام طور پر چین لکھا کرتا تھا لیکن لوگوں نے اس پر سخت احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ روس وامریکہ لکھا جائے گا یہاں مصنف نے چین — (چ بالفتح) کو چین (چ بالکسر) سمجھا ہے۔

کئی طنزیہ ومزاحیہ مضامین اور پیروڈیز کے علاوہ دہلی کے فسادات سے متعلق ایک سنجیدہ مضمون بھی تاریک اجالے کے نام سے اس مجموعہ میں شامل ہے۔ کتاب اچھی ہے اور کاغذ، ٹائٹل اور گرد وپوش کے سلسلہ میں ناشرین نے اپنی اعلیٰ روایات کو برقرار رکھا ہے۔ (ق۔ق)

انقلابی مصر

مصنف۔ محمد حسن الاعظمی

قیمت:۔ چھ روپے

ملنے کا پتہ: پاکستان عرب کلچرل ایسوسی ایشن، مرکزی کراچی

مصر مشرقی تہذیب کا قدیم وارث اور ایک دلچسپ ملک ہے اور اسلامی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت کا مالک ہے۔ پیش نظر کتاب مصر کے متعلق ایک معلوماتی ڈائری اور یادداشت کی حیثیت رکھتی ہے۔ مصنف نے جو اسلامی ملکوں کے اتحاد اور عربی زبان کی ترویج میں خاصی شہرت رکھتے ہیں کوشش کی ہے کہ مصر کی تاریخ تہذیب وتمدن اور تعلیم وسیاست کے متعلق تمام ضروری تفصیلات ایک جگہ جمع ہوجائیں اور پڑھنے والے ایک چھوٹے سے مجموعہ میں مصر کے ہر رخ اور ہر پہلو سے واقف ہوجائیں۔ یہ ایک مفید خیال تھا لیکن اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جس تصنیفی ترتیب کی ضرورت تھی اس کو مصنف برقرار نہیں رکھ سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب کے مختلف اجزاء بے ربط اور مضامین ادھورے ادھورے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اکثر واقعات کے تذکرہ اور حوالہ جات میں بڑی ناگوار سی تکرار ہوگئی ہے اور بعض غیر ضروری تفصیلات بھی شامل ہوگئی ہیں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بہت سارے اخبارات کے تراشے اور تحریری — یادداشتوں کو جلدی میں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر شائع کردیا گیا ہے اور جس محنت اور توجہ کی ضرورت تھی وہ نہیں کی گئی۔

دوسری بات جو محل نظر ہے وہ یہ ہے کہ مصنف کے ہاتھ سے تصنیفی دیانت کا دامن بری طرح چھوٹ گیا ہے خصوصاً اخوان المسلمون کے حق میں تو یہ کوتاہی انتہائی زیادتی معلوم ہوتی ہے چنانچہ کتاب میں مغنیہ ام کلثوم تک کا ذکر ہے اور وہ دو تین صفحات میں ہے لیکن حسن البناء شہید عبدالقادر عودہ، یوسف طلعت اور دوسرے اخوان کے شہداء کے تذکرہ سے قصداً وارادتاً اجتناب برتا گیا ہے اور مصر کے نئے حکمرانوں کے لئے جنہوں نے شقاوت وبربریت کا ایک انمٹ نقش تاریخ کے صفحات پر ثبت کیا ہے۔ قصیدے تحریر کردیئے ہیں۔ اور اس واقعاتی حقیقت کو بھی نظر انداز کیا گیا کہ فاروق کو ہٹانے اور نئے انقلاب کے سازوسامان میں اخوان کا سب سے زیادہ حصہ اور اشتراک تھا۔ دراصل مصنف کا ذہن اس دور کا ساختہ وپرداختہ ہے جبکہ مصر میں قدامت وجدیدیت کی کشمکش برپا تھی اور جدیدیت کے حامیوں نے اپنی انتہاپسندی میں اعتدال کا دامن چھوڑ رکھا تھا۔ اور اسلامی نظام کا صحیح شعور ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اسی زمانہ کے اثرات سے ابھی تک مصنف کا ذہن نجات نہیں پاسکا ہے۔ اور اسی لئے وہ مصر کے حالات میں اسلامی تحریک کے اثر وعمل کو اہمیت نہیں دے سکے۔ (م۔ ف)

ساون کی مدبھری فضاؤں میں
جوانی کی امنگیں اور
خوشی کے جھولے
فیملن
حاذق دواخانہ

کراچی
ماہنامہ

بُلند معیاری

ہی کے سبب حاذق دواخانہ کی تیار کردہ یونانی ادو

مشہور اور مقبولِ عام

ہیں

منیجر

حاذق دواخان

بندر روڈ۔ کراچی نمبر

منظر حسین •

ابنِ آدم کا مرض!

ابنِ آدم سخت بیمار تھا۔ اور اس کے علاج کے لئے دنیا کے بہترین معالج اکٹھے تھے۔

ڈاکٹر دل نے، جو دلوں کا ماہر (Specialist) تھا، تجویز کیا کہ ابنِ آدم کا دل بجید رنجیدہ معلوم ہوتا ہے اور اس رنج کی وجہ سے اسے "دلورا" ہو گیا ہے، جس کا علاج بنتِ حوا کی رفاقت کے سوا اور کچھ نہیں۔

ڈاکٹر معدہ نے، جو معدوں کا ماہر تھا، کہا کہ اسے ڈاکٹر دل کی تجویز سے اتفاق نہیں کیونکہ ابنِ آدم کی اصلی شکایت یہ ہے کہ وہ بھوک اور فاقہ کا شکار رہا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ "فاقو پیر" میں مبتلا ہو گیا ہے ــــ اور اس مرض کا علاج روٹی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ڈاکٹر دماغ نے، جو دماغوں کا ماہر تھا، ان دونوں تجویزوں سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ "میری رائے میں ابنِ آدم کو "مالیخولیا" ہو گیا ہے اور اس کا علاج صرف دماغی امراض کے اسپتال ہی میں ہو سکتا ہے۔"

ڈاکٹر آنکھ نے، جو آنکھوں کا ماہر تھا، کہا۔ "یہ سب بکواس ہے۔ ابنِ آدم تو "یرقان" کا مریض ہے کیونکہ اس کی آنکھوں میں بے پناہ زردی موجود ہے اور اس کا علاج......"

ڈاکٹر ناک نے، جو ناکوں کا ماہر تھا، ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔ "سب غلط۔ ابنِ آدم کی ناک میں ایک بال بڑھ گیا ہے جسے کاٹ کر پھینک دیا جائے تو وہ ابھی اچھا ہو جائے گا۔"

اور ڈاکٹر کان نے جو کانوں کا ماہر تھا، کان کھڑے کرتے ہوئے کہا۔ "Nonsense ـــ آپ لوگوں کو اتنا نظر نہیں آتا، کہ ابنِ آدم کے کان میں ایک پھوڑا ہو گیا ہے۔ جس کا آپریشن بہت ضروری ہے۔"

ابنِ آدم نے ماہرین کی رائیں سنیں تو کہا۔ "حضرات! آپ سے بڑھ کر قابل اور معتمد معالج اس دنیا میں موجود نہیں۔ خدا کیلئے آپ کسی ایک نتیجہ پر پہنچ کر میرا علاج کیجئے۔"

ماہرین نے ابنِ آدم کی اس اپیل پر ہمدردانہ غور کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ چونکہ وہ کسی ایک تشخیص پر متفق نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ابنِ آدم کا علاج ہر ڈاکٹر باری باری کرے اور انجام کا انتظار کرے۔

چنانچہ پہلے ڈاکٹر دل نے علاج شروع کیا ــــ لیکن ابنِ آدم کی حالت اس سے اور خراب ہو گئی۔

پھر ڈاکٹر دل کو ہٹا کر ڈاکٹر معدہ نے علاج شروع کیا ــــ ابنِ آدم کی حالت مزید خراب ہو گئی۔

ڈاکٹر معدہ کو دھکا دے کر ڈاکٹر دماغ آگے بڑھا ــــ مگر انجام بُرا ہی نکلا۔

غرضکہ ڈاکٹر آنکھ، ڈاکٹر ناک اور ڈاکٹر کان نے بھی اپنی اپنی قسمت آزمائی لیکن ابنِ آدم کو نہ اچھا ہونا تھا نہ وہ اچھا ہوا۔

ماہرین نے ایک بار پھر سر جوڑ کر ابنِ آدم کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ اور سوچتے سوچتے وہ پہلی بار اس متفقہ فیصلہ پر پہنچے کہ "ابنِ آدم کو ٹی۔بی ہو گئی ہے" ــــــــ اور ابنِ آدم کو ایک "ٹی۔بی۔ سینی ٹوریم" میں داخل کر دیا گیا۔

ابنِ آدم اب ٹی۔بی سینی ٹوریم کے ایک بستر پر پڑا ہوا سسک رہا ہے اور اس معالج کا انتظار کر رہا ہے، جو اس کے مرض کی صحیح تشخیص کر سکے ــــ ایسا معالج ــــ ایسا معالج کون ہو سکتا ہے؟

(بشکریہ "معیار")

اصلاحی ادب کا ڈائجسٹ

(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ماہنامہ مُشیر کراچی

ٹیلی فون : ۷۹۲۳۰

جلد : ۷ شمارہ : ۱

اکتوبر ۱۹۵۶ء

مرتبہ
عبدالغفور بیگ

فی پرچہ : آٹھ آنے
سالانہ : پانچ روپے

بھارت میں ترسیلِ زر کا پتہ : پندرہ روزہ "الحسنات" رام پور (یو۔پی) بھارت

(پرنٹر پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ مشیر بندر روڈ کراچی سے شائع کیا۔ (کتبہ : عابد سعید)

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نہر سوئز کا مسئلہ

اس وقت نہر سوئز کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر چکا ہے اور اندیشہ یہ ہے کہ مغربی استعماری طاقتیں، جو اب تک مظاہرۂ قوت اور شور و غل کی "تکنیک" پر اکتفا کر رہی ہیں، کہیں جنگ نہ شروع کر دیں۔ ان طاقتوں نے نہر سوئز کے استعمال کرنے والوں کی ایک نام نہاد انجمن بنانے کا جو منصوبہ دوسری سوئز کانفرنس منعقدہ لندن میں پیش کیا ہے، وہ یقیناً شر انگیز ہے اور مصر کی خود مختاری پر جارحانہ حملہ کے مترادف ہے۔ طاقت اور بالادستی کے نشہ میں تو ایک ہٹلر پورے یورپ کو کھا سکتا ہے، مگر اس کے لئے کوئی معقول دلیل نہیں پیش کی جا سکتی۔ اگر یہ طاقتیں مصر کی ایک ملکیت پر اپنا ناجائز قبضہ خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو، رکھنے پر مصر رہیں تو پھر اس کا انجام جنگ کے سوا اور کیا نکلے گا اور کون جانتا ہے کہ اس جنگ کے شعلے اڑ کر کہاں کہاں پہنچیں گے۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ایک بین الاقوامی کانفرنس کے ذریعہ جو کسی مخصوص دھڑے کی ساختہ و پرداختہ نہ ہوتی بلکہ سب قوموں کی مرضی سے بلائی گئی ہوتی، ۱۸۸۸ء کے معاہدے کی طرح ایک نیا معاہدہ طے ہو جاتا، جس میں مصر خود اپنی مرضی سے شریک ہوتا۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ "امن و انصاف" کے علمبرداروں نے اپنے لئے دوسری راہ منتخب کر رکھی ہے۔

اس نازک موقع پر ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان اس نام نہاد "انجمن استعمال کنندگانِ نہر سوئز" سے کسی صورت میں وابستہ نہ ہو اور کسی ایسی تجویز کو قبول نہ کرے جس سے مصر کی خود مختارانہ حیثیت مجروح ہوتی ہو۔ دوسری طرف ہم اپنے مصری اور دیگر عرب بھائیوں سے یہ گذارش کریں گے کہ وہ اس مسئلہ میں اس قدر نہ کھو جائیں کہ اپنے حقیقی دوست و دشمن کو بھی نہ پہچان سکیں۔ انھیں ان سامراجی طاقتوں سے بھی ہوشیار رہنا چاہیئے، جو اس وقت مسلمان قوموں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہی ہیں۔ حالانکہ ان کا دامن لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کے خون سے آلودہ ہے ——— اس ضمن میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ "عرب قومیت" کا نعرہ بلند کیا جائے۔ اس "نعرہ" پر صرف عرب ہی جمع ہو سکتے ہیں، دوسرے لوگ نہیں۔ پھر یہ کہ "گھر میں ظلم" روا رکھ کر "باہر انصاف" کی دہائی دینا بھی کسی طرح درست نہیں۔ اگر آپ باہر کے لوگوں سے انصاف کے متقاضی ہیں تو پہلے آپ اس انصاف کو اپنے گھر میں غالب کیجئے۔ آپ اس کی ابتدا ان مظلوم و بے کس بھائیوں کی جیلوں سے فوری رہائی کی شکل میں کر سکتے ہیں، جنھیں "اخوان المسلمون" کہتے ہیں اور جن کا جرم صرف یہی ہے کہ جس وقت آپ کے ہاں کا ایک بااقتدار شخص یا گروہ مصر کو برطانیہ اور امریکہ کے "گھڑے کی مچھلی" بنانے کے لئے تیار ہو رہا تھا تو انھوں نے سختی سے اس کی مخالفت کی تھی اور ان کی اس "مسلمان کش" پالیسی کو بے نقاب کر دیا تھا۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ یہ اخوان ہی تھے جنھوں نے برطانوی اقتدار اور ناجائز قبضہ کے خلاف سب سے پہلے آواز بلند کی تھی۔ اور پھانسیوں اور جیلوں کی سرحد میں پہنچنے تک انگریزوں کے خلاف برابر جہاد کرتے رہے تھے ——— آج اگر وہ رہا ہو جائیں، تو اس سے آپ کو تقویت پہنچے گی، البتہ "اقتدار کے حریص" اور "بے یقینی کی راہ" پر چلنے والے اسے اپنی موت سے تعبیر کریں گے۔ ایک اور بات کہنے کی ہے وہ یہ کہ اگر آپ اپنے معاملہ میں دیگر مسلمان ممالک کی پوری ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ ان کے مسائل میں بھی دلچسپی لیجئے، ان کے دکھ درد میں بھی شریک ہوئیے، ان کی بھی تائید و حمایت کیجئے اور حتی الامکان ان کی امداد کیجئے تاکہ وہ آپ کو اپنا حقیقی بھائی اور غمخوار سمجھیں۔ یہ صورت حال کہ آپ ان سے کوئی واسطہ نہ رکھیں بلکہ الٹا ان کے دشمنوں سے محبت کی پینگیں بڑھائیں، آپ کے موقف کو کمزور کرنے والی ہے، اسے ضرور بدلیں۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے ایک ہاتھ سے نہیں۔ اس سلسلہ میں شام (دمشق) کی "اخوان المسلمون" جو کام کر رہی ہے، وہ ہر طرح سے سراہے جانے کے قابل ہے اور ہم امید رکھتے ہیں کہ اس عظیم کوتاہی کی جلد ہی پوری پوری تلافی کر دی جائے گی۔

وطنی قومیت

اس راہ طریق انتخاب کا فیصلہ ہو جائے گا۔ کچھ لوگ "جداگانہ انتخاب" جو کہ ہماری آئیڈیالوجی کے عین مطابق ہے اور جسکے ذریعہ خود پاکستان وجود میں آیا، کے کٹر مخالف ہیں۔ ایسے لوگ اتفاق سے اس وقت برسرِ اقتدار بھی ہیں ان کی مخالفت کی اصل بنیاد وہ ہے جسے مسلمانوں کی اکثریت نے پاکستان بننے سے قبل رد کر دیا تھا یعنی "یک قومی نظریہ" ـــــ یہ نظریہ کہ "مذہب ہر شخص محض انفرادی معاملہ ہے" اور یہ کہ اس پہلے سے آقلیت واکثریت کا قصہ ختم کر کے، وطنیت کی بنیاد پر تمام باشندوں کو ایک قوم بنا دیا جائے" ـــــ سوال یہ ہے کہ جو لوگ آج وطن کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کے لئے پہلا قدم "مخلوط انتخاب" کی صورت میں اٹھانا چاہتے ہیں، انھیں ملک کے کتنے لوگوں کی حمایت حاصل ہے؟ کیا وہ یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انھیں اس مسئلہ میں اکثریت کا اعتماد حاصل ہے؟ کیا وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ عوام کی اکثریت ان کے ساتھ ہے؟ ممکن ہے قومی اسمبلی میں کسی گٹھ جوڑ کے نتیجہ میں یہ لوگ ایک "مصنوعی اکثریت" پیدا کر لیں (اور یہ چیز موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے بعید نہیں) مگر ایسی اکثریت کے فیصلہ کا حشر معلوم ہے ـــــ ہم ایسے تمام لوگوں سے گزارش کرینگے کہ وہ قوم کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کی بجائے خود کو اس کی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ اگر انھوں نے ہماری اس تنبیہہ پر دھیان نہ دیا تو اگلے انتخابات میں یہی مسئلہ ایک "انتخابی مسئلہ" بن جائیگا اور اس وقت قوم کے جذبات اور قومی اسمبلی کے فیصلہ کی حقیقت واضح ہو جائے گی، بشرطیکہ دھونس، دھاندلی اور دھوکہ سے کام نہ لیا گیا۔

"مذہبی رہنما"

یہ ایک کتاب کا نام ہے، جو سب سے پہلے امریکہ میں چھپی اور پھر بھارت میں ـــ اس کے اندر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک اور حضور صلعم کے خاندان وصحابہ رض کے بارے میں ایسی رکیک، اخلاق سے گری ہوئی اور بے ہودہ باتیں منسوب کی گئی ہیں کہ کوئی مسلمان جس میں شرم ہے اور غیرت، اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں بھارت کے غیور مسلمانوں نے اس کے خلاف متحدہ احتجاج کیا، تو کوئی جرم نہیں کیا، مگر یہ احتجاج انھیں بہت مہنگا پڑا اور بھارت کی "سیکولر" ریاست میں ایک بار پھر بے بس اور نہتے مسلمانوں کے خون سے "ہولی" کھیلی جا رہی ہے۔

ناموسِ رسول صلعم پر جان دینے والے اپنی جانیں دے رہے ہیں اور ہم امن وچین سے بیٹھے ہوئے وزارتوں کے ردوبدل کا تماشہ دیکھ رہے ہیں ـــــ کیا ہمارے اربابِ اقتدار کو اتنی فرصت ہے کہ وہ ان "خونیں حادثات" کو رکوانے کے لئے مناسب اقدام کر سکیں؟ کیا انہیں اس کا ہوش ہے کہ یہ طوفان جس کتاب سے اٹھا ہے وہ امریکہ سے چھپکر بھارت پہنچی ہے ـــــ امریکہ، جہاں ایسی گندی مطبوعات آئے دن چھپتی رہتی ہیں، جنھیں یہاں [illegible] کرنا پڑتا ہے؟ اگر انھیں فرصت ہو اور ہوش بھی، تو ہم درخواست کرینگے کہ وہ اپنی پارٹی پالیٹکس وغیرہ کو کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر کے اس مسئلہ کی طرف فوری توجہ دیں۔ (مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۹۵۶ء)

تلخ وترش

● ایک خبر:- "مذہب کے نام پر انتشار پھیلانے کی اجازت ہرگز نہیں دی جائیگی"۔ شیخ مجیب الرحمٰن، وزیر حکومت مشرقی پاکستان ـــــ کیونکہ اس سے بہت بڑا ـــ بہت ہی بڑا ـــ ہمالیہ جیسا "انتشار" پیدا ہوگا، یعنی قوم عوامی لیگ، ری پبلکن پارٹی، کمیونسٹ، سرمایہ دار، بنگالی، پنجابی، مہاجر، غیر مہاجر، پٹھان، شیخ وغیرہ کی بجائے "مسلم" اور "غیر مسلم" میں بٹ جائے گی!

● دوسری خبر ـــ "نہر سوئز پر قبضہ کرنا ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے" فرانسیسی وزیر اعظم ـــــ کیونکہ یہ بیسویں صدی ہے، انیسویں نہیں (جبکہ الجزائر پر فرانس نے قبضہ کیا تھا)

● تیسری خبر ـــ "نہر پانامہ اور نہر سوئز میں بہت فرق ہے"۔ امریکی ترجمان ـــــ یعنی پہلی سفید (white) ہے دوسری سیاہ (black)

زکی زاکانی •

پُرانی عمارت

پُرانی عمارت گرا چاہتی ہے
گرا چاہتی ہے پُرانی عمارت
نہ آئے گی آندھی نہ اٹھے گا طوفاں
نہ برسیں گے بادل نہ چمکے گی بجلی!
نہ آئے گا جھٹکا کوئی زلزلے کا
اچانک سنا جائے گا ایک دھماکہ
دہل جائے گا جس سے دل زندگی کا
زمیں کانپ اٹھے گی جس کے اثر سے
فلک جس سے لرزہ براندام ہوگا
گھڑی آن پہنچی قیامت کی سر پر
اچانک زمیں ایک بدلے گی کروٹ
بس اک ثانیئے ایک ہی ثانیئے میں
اچانک گرے گی پُرانی عمارت
نکل جاؤ لوگو! نکل جاؤ لوگو!
اِدھر بھاگ جاؤ، اُدھر بھاگ جاؤ
پُرانی عمارت یہ انسانیت کی!
گرا چاہتی ہے، گرا چاہتی ہے
گرا چاہتی ہے پُرانی عمارت
پُرانی عمارت گرا چاہتی ہے

یہ شہتیریاں کرم خوردہ پُرانی!
جنھیں گھیر رکھا ہے چمگادڑوں نے
یہ سبزہ سا اُگتا ہوا چار جانب
ہیں جس میں چھپی کھڑکیاں ٹوٹی پھوٹی
شکستہ در و بام بوسیدہ چھپّر!
یہ بنیادیں اکھڑی ہوئی شور خوردہ
ہزاروں برس جن میں مرتا رہا ہے
غلاظت سے بھرپور ناپاک پانی!
کہاں تک کھڑی رہ سکیں گی زمیں پر
اچانک زمیں ایک بدلے گی کروٹ
اچانک اکھڑ کر گریں گی کچھ اینٹیں!!
پھر اک دم سنا جائے گا اک دھماکہ
نکل جاؤ لوگو! نکل جاؤ لوگو!
مبادا کوئی دب کے رہ جائے نیچے
اِدھر بھاگ جاؤ اُدھر بھاگ جاؤ
پُرانی عمارت یہ انسانیت کی!
گرا چاہتی ہے گرا چاہتی ہے
گرا چاہتی ہے پُرانی عمارت
پُرانی عمارت گرا چاہتی ہے

یہ اُدھڑی ہوئی چھت
شکستہ منڈیریں
یہ دیواریں کائی میں لپٹی ہوئی سی
کمر جن کی ہے سو جگہ سے خمیدہ

ہوا کا بس آئے گا اک تیز جھونکا
لرز کر زمیں پر گرے گا پلستر
پلستر کہ جس نے ہزاروں برس تک
چھپایا ہے اینٹوں کی عریانیوں کو!

یہ چونے کا غازہ روپہلی ملمع
چھپائے ہوئے ہے جو اینٹوں کا چہرہ
لٹکتا ہوا سا لرزتا ہوا سا
بس اب آ رہے گا زمیں پر اچانک
یہ سب بیل بوٹے اکھڑ جائیں گے اب
جھلک جن میں ہے خونِ انسانیت کی
پرانی عمارت کے تاریک گوشے
جہاں مچھروں، کھٹملوں، پسّوؤں نے
حکومت بنا رکھی ہے اپنی اپنی
بس اب خاک میں دب کے رہ جائینگے سب
یہ شہتیریاں جن کے دامن میں چھپ کر
بہت چین پایا ہے چمگادڑوں نے
الٹ کر گریں گی زمیں پر اچانک
یہ کیڑے مکوڑے، یہ مچھر، یہ کھٹمل
یہ چوہے
یہ چمگادڑیں
اور یہ پسّو
یہ چھتے بھڑوں کے یہ سانپ اور بچھو
اچانک ہی نابود ہو جائیں گے سب
نہیں کوئی طاقت بچا سکتی ان کو!
نشانے سے اب موت کے شش پروں کے
ہے چاروں طرف ایک ہنگامہ برپا!
گھڑی آن پہنچی قیامت کی سر پر
کوئی رو رہا ہے کوئی چیختا ہے
بہت ہو رہی ہے دہائی دہائی!
مگر ہنس رہے ہیں
ذرا دور ہٹ کر
جو مشتاق ہیں آج تعمیرِ نو کے

بہت دیر سے منتظر تھے جو اس کے
کہ گرتی ہے کب یہ پرانی عمارت
وہی اب کھڑے دور سے کہہ رہے ہیں
نکل جاؤ لوگو! نکل جاؤ لوگو!
پرے بھاگ جاؤ، پرے بھاگ جاؤ
پرانی عمارت یہ انسانیت کی!
گرا چاہتی ہے، گرا چاہتی ہے
گرا چاہتی ہے پرانی عمارت
پرانی عمارت گرا چاہتی ہے

اٹھائی گئی تھی عمارت یہ جس دم
بہت اس کے نقشے بنائے گئے تھے
زمیں کہہ رہی ہے کہ معمار اس کے
بہشتِ بریں سے منگائے گئے تھے
بہاروں سے رنگینیاں دام لے کر
در و بام اس کے سجائے گئے تھے
ڈبو کر قلم رنگِ انسانیت میں
کئی بیل بوٹے بنائے گئے تھے!
اسے ظلمتوں سے بچانے کی خاطر
دیئے ہر دم کے جلائے گئے تھے
مکمل ہوئی تھی عمارت یہ جس دم
ترانے مسرت کے گائے گئے تھے
شراب آدمیت کی بانٹی گئی تھی
محبت کے ساغر لنڈھائے گئے تھے
بکھیرے گئے تھے ستاروں کے مو[illegible]
خزانے فلک پر لٹائے گئے تھے
تراشا گیا تھا جو بت زندگی کا!
بہت پھول اس پر چڑھائے گئے تھے

اُصولِ آدمیت کے ملحوظ رکھ کر!
اہم فیصلے کچھ سنائے گئے تھے
مگر آہ!
اس کے مکینوں نے اب تک
نہ جانا کسی فیصلے کو نہ جانا
نہ سمجھا کسی نے غمِ زندگی کو
نہ پایا کسی نے ابھی رازِ ہستی
بس اپنی تمناؤں کی کج روی سے
ہر اک شے کو زیر و زبر کر دیا ہے
مٹا کر بہاروں کی تابانیوں کو
ستاروں کو داغِ جگر کر دیا ہے
پلا کر ہر اک چیز کو جامِ مستی!
ہر آواز سے بے خبر کر دیا ہے!
ہر اک حسن میں بھر دیا رنگِ آتش
ہر اک درد کو دردِ سر کر دیا ہے
ہیں ڈھلے عمارت میں انسانیت کی
ہزاروں غمِ خود پرستی نے رخنے!
غلاظت اسی میں ڈالے ہیں بدکاریوں نے
یہ درزیں یہ خم دے رہے ہیں گواہی
کہاں تک کھڑی رہ سکیں گی زمیں پر
یہ بنیادیں اکھڑی ہوئی شور خوردہ
ہزاروں برس جن میں مرتا رہا ہے
غلاظت سے بھرپور ناپاک پانی
یہ اُدھڑی ہوئی چھت

شکستہ منڈیریں

یہ دیواریں کائی میں لپٹی ہوئی سی
کہاں تک کھڑی رہ سکیں گی زمیں پر
اچانک زمیں ایک بدلے گی کروٹ
بس اک ثانیے ایک ہی ثانیے میں
اچانک گرے گی پُرانی عمارت
اور اک پھوٹ نکلے گا
چشمہ لہو کا
لہو!
ہاں لہو!
جو ہزاروں برس سے
پیا جا رہا تھا بہانے بہانے
اور اب!
جب گرے گی یہ کہنہ عمارت
تو ہر اینٹ اس کی
اگل دے گی سارا
لہو جو ہزاروں برس تک پیا ہے
نکل جاؤ لوگو! نکل جاؤ لوگو!
اِدھر بھاگ جاؤ، اُدھر بھاگ جاؤ
مبادا کوئی دب کے رہ جائے نیچے
پُرانی عمارت یہ انسانیت کی!
گرا چاہتی ہے، گرا چاہتی ہے
گرا چاہتی ہے پُرانی عمارت
پُرانی عمارت گرا چاہتی ہے

(بشکریہ چراغِ راہ)

قطعہ

محسن بھوپالی

وہ رند حاصلِ میخانہ ہائے فطرت ہے
بقدرِ ظرف جسے اذنِ جام مل جائے
وہ زندگی بھی حقیقت میں زندگی ہے جسے
فنا کے ہاتھوں بقائے دوام مل جائے

محمد حمید اللہ صدیقی

میرا پیغام محبّت ہے جہاں تک پہنچے!

کسی افسانہ نویس کے افسانوں پر اس عنوان کے تحت گفتگو ممکن ہے کہ عام روایات کے خلاف ہو لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ جب میں ابوالخلیب کے افسانے دیکھتا ہوں تو جگر کا یہی مصرع یاد آتا ہے اس لئے میرے نزدیک اس سے بہتر موضوع اور کیا ہو سکتا ہے جس کے تحت ابوالخلیب کے افسانوں پر گفتگو کی جائے۔ اگر اس کے باوجود کسی کو اطمینان نہ ہو تو یہ محض ذوق کا فرق ہے اور جہاں ذوق کا فرق ہو جائے وہاں مجبوری ہے۔

یہ بات کہ ادب کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری اب خاصی پرانی ہو چکی ہے۔ یوں تو ہر دور اور ہر زمانے میں کچھ لوگ ادب کی تخلیق محض تفنن طبع کے لئے کرتے ہیں اور اگر نہیں تو کم از کم ان کا اصرار ضرور رہا ہے کہ ان کا مقصد تفنن طبع کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے لیکن گزشتہ ایک صدی سے اردو ادب کسی نہ کسی تحریک کا رہین منت ضرور رہا ہے اور بیشتر فنکار شعوری یا غیر شعوری طور پر اس تحریک سے متاثر ہو کر اس کے افکار و نظریات اپنی نگارشات کے ذریعہ پیش کرتے رہے ہیں۔ سر سید اور ان کی تحریک نے نشاۃ الثانیہ (Renaissance) کا آغاز کیا اور اس زمانے سے اب تک پورے ایک سو سال کے عرصہ میں مختلف تحریکیں ہمارے ادب کو پروان چڑھاتی رہیں۔ انہیں تحریکوں میں ایک تحریک اسلامی بھی ہے۔ یوں تو اسلامی افکار و نظریات ہر دور کے اردو ادب میں ایک (Under Current) کی حیثیت سے موجود رہے ہیں لیکن ان افکار و نظریات کو مثبت اور شعوری طور پر پیش کرنا زمانہ حال کی بات ہے۔ اسلام چند مذہبی رسومات کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور انسانیت کی فلاح اسی ضابطۂ حیات کو اپنانے میں مضمر ہے۔ اس تصور کو لیکر ہر دور میں چھوٹی بڑی کوششیں کہیں نہ کہیں ہوتی رہی ہیں اور یہ کوششیں جہاں کہیں بھی ہوئیں زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہوا ہے۔ ان میں سے ایک شعبہ ادب بھی رہا ہے۔ آج بھی دنیا کے اکثر مسلم ممالک میں اسی نہج کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اسی نظریئے کو لیکر پاکستان میں بھی ایک تحریک چل رہی ہے۔ اس تحریک نے زندگی کے اور شعبوں کے ساتھ ادب کو بھی متاثر کیا ہے۔ کچھ عرصہ قبل اردو ادب میں اقبال کی آواز ایک تنہا آواز تھی جو پکار پکار کر اسی چیز کو پیش کر رہی تھی۔ آج اس تحریک کے اثر سے ادیبوں اور شاعروں کا ایک گروہ اسے پیش کر رہا ہے۔ ابوالخلیب بھی انہیں فنکاروں میں سے ایک ہے جس نے اسلام کے اس نظریئے کو شعوری طور پر قبول کیا ہے اور اس کا ادب بھی انہیں نظریات کا آئینہ دار ہے۔

نظریات کو ادب کے ذریعہ پیش ضرور کیا جا سکتا ہے مگر ادب محض نظریات کے پیش کر دینے کا نام نہیں۔ ادب پہلے ادب ہے پھر کچھ اور۔ اور اسی لئے جہاں محض نظریات کی خاطر ادب کو قربان کر دیا جاتا ہے وہاں ادب ادب نہیں رہتا ایک وعظ یا پروپیگنڈہ ہو جاتا ہے۔ ادیب کی ساری زندگی مشاہدات و تجربات کی ایک داستان ہوتی ہے یہی مشاہدات و تجربات اس کے جذبات و احساسات کو متحرک کرتے ہیں۔ اس کے تخیلات کو ہوا دیتے ہیں اور پھر شعر، افسانے اور ناول وغیرہ کا روپ دھار کر اس کے فن کی نمود کرتے ہیں۔ جب کوئی فنکار نیا نیا شعوری طور پر کسی نظریئے کو اپناتا ہے تو ایک بڑے ہی نازک دور سے گذرتا ہے۔ اس کے دل میں ایک نو متاثر (Convert) کا جوش ہوتا ہے اور دماغ میں ان نئے نظریات کے پر شور طوفان جو اپنے اظہار کے لئے مچلتے رہتے ہیں۔ مگر اس کے پاس نظریاتی مناسبت سے وہ مشاہدات و تجربات نہیں ہوتے جن کی بنا پر وہ ایسا فن پیش کر سکے جو فن بھی ہو اور مقصدی بھی۔ جس میں ان دونوں کا ایسا حسین امتزاج ہو کہ کہیں سے آورد کا گمان نہ ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ فنکار کے اپنائے ہوئے نظریات رفتہ رفتہ اس کی رگ و پے میں سما جائیں یہاں تک کہ اس کے فکر و عمل کے ہر انداز

میں مکمل ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہو۔ جب تک یہ نظریات اس کے لئے محض اضافی حیثیت رکھیں گے اس کی فنکارانہ مقصدیت بھی اضافی ہوگی۔

(۲)

ابو الخطیب کے افسانوں کو جاننے اور سمجھنے سے پہلے خود ابو الخطیب کو جاننا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ افسانوں کو دیکھ کر افسانہ نگار کی شخصیت کا اندازہ لگا لینا ایک عام بات ہے کیونکہ فنکار اپنے فن کے ذریعہ اپنے کو کسی نہ کسی حد تک آشکارا ضرور کر دیتا ہے مگر ابو الخطیب کو جان کر اسکے افسانوں کا بھی بڑی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ بات کچھ عجیب سی ضرور ہے۔ مگر انجو کی شاید صرف اسکے نئے پن میں ہے پھر بھی بات تشریح طلب ضرور ہے اور اگر تشریح نہ کی گئی تو تشنگی باقی رہ جائے گی۔

زندگی سے متعلق ابو الخطیب کا اپنا تجربہ بہت وسیع ہے اس کی پیدائش اور نشو و نما ایک معمولی گھرانے میں ہوئی جو معاشی نقطۂ نظر کے علاوہ معاشرتی اعتبار سے بھی ادنیٰ سمجھا جاتا رہا ہے۔ ہماری مسخ شدہ تہذیبی روایات کچھ ایسی رہی ہیں کہ معاشی بدحالی کو اتنا برا نہیں سمجھا گیا جتنا معاشرتی اور نسلی پستی کو۔ یہ ہمارا اسلام کے ساتھ ایک دلچسپ مذاق رہا ہے کہ اسلام رنگ و نسل کے جن امتیازات کو مٹانے کے لئے آیا تھا ہم نے اپنے دورِ عروج میں معاشرے کی تعمیر انہیں امتیازات پر کی۔ جہاں امتیازات ہوں وہاں انسانی سلوک میں فرق ناگزیر ہے اور جہاں انسانی سلوک اور برتاؤ میں محض حادثۂ پیدائش کی وجہ سے تفریق ہو وہاں ایک حساس دل یقیناً مجروح ہوتا ہے اور عموماً اس کلب و لہجہ اور سارا برتاؤ ایک احتجاج ہوتا ہے ایک فریاد اس ظلم کے خلاف جس کے لئے کوئی جواز نہیں جس میں مظلوم کی کوئی خطا نہیں۔ اور پھر ابو الخطیب نے اپنی مختصر سی زندگی میں اس دہائی کی دو سب سے زیادہ جاندار تحریکوں کو بہت ہی قریب سے دیکھا ہے۔ میری مراد اشتراکیت اور اسلام سے ہے۔ اس کا ان دونوں تحریکوں سے متاثر ہو کر ان پر لبیک کہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ انسانیت سے اسے بڑا گہرا لگاؤ ہے۔ یہاں متاثر ہونے اور لبیک کہنے کے فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے متاثر ہونا محض فیشن کے لئے بھی ہو سکتا ہے لیکن لبیک کہنے کے لئے محبت اور لگاؤ ایمان و ایقان ضروری ہے کیونکہ پھر سوال قربانیوں کا پیدا ہوتا ہے اور قربانیاں بغیر محبت کے ناممکن ہیں۔ یہ انسانی محبت اس کی پوری زندگی سے اجاگر ہے بلکہ کبھی کبھی اس محبت میں بہیمیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے ڈر لگتا ہے لیکن محبت پھر بھی محبت ہے خواہ اس کا روپ کوئی بھی ہو۔ تاثر بہرحال پیدا ہوگا۔ بہیمیت شاید اس تاثر کو اور شدید کر دیتی ہے۔

ابو الخطیب کے نظریات و افکار اور مقصدی وابستگی کی بدولت یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کے یہاں کوئی فلسفۂ حیات یا نظریات کا اسٹاک ملے گا۔ جو لوگ ابو الخطیب میں اس کی تلاش کریں گے انہیں مایوسی ہوگی وہ ایک افسانہ نگار ہے مصلح یا فلسفی نہیں۔ فلسفۂ حیات دینا اس کا کام نہیں۔ البتہ انسانی ضمیر کی ایک جاندار آواز ضرور ملے گی۔ یہ ضمیر کی کھٹک اس کے اکثر افسانوں میں نمایاں ہے اور صحیح طور پر سوچنے پر مجبور کرتی ہے اور یہی کھٹک بتلاتی ہے کہ زندگی کے دوراہے پر کون سی راہ صحیح اور قابلِ اختیار ہے۔ اس کا ہر افسانہ بالعموم ایک تجربہ ہے جس میں اس کھٹک کو ایک بڑا سوال بنا کر ابھارا گیا ہے۔ اور اسی سوال میں مضمر ایک آدرش ایک پیغام ہے۔

اس کے افسانے واضح طور پر دو طرح کے ہیں۔ بعض افسانوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تانہ بانہ واقعتاً کسی مشاہدے اور تجربے پر بُنا گیا ہے اور یہاں وہ ہر لحاظ سے کامیاب نظر آتا ہے۔ یہاں جذبات اور احساسات بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں اور اس طرح ان افسانوں میں ایک اپیل appeal پیدا ہو گئی جو بہت جاندار ہے۔ یہ افسانے فن و مقصد کا ایک خوشگوار امتزاج پیش کرتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی اس پر نومتاثر کا جوش حاوی آجاتا ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ پیش نظر محض تبلیغ اور پروپیگنڈہ ہے جو فنکار کی خواہش ضرور ہے اس کا تجربہ نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہر چیز فنکار کا تجربہ نہیں بن سکتی لیکن ہر فنی پیشکش کے پیچھے کوئی نہ کوئی خیال ضرور کار فرما ہوتا ہے اور جب تک یہ خیال خود بخود فنکار کے ذہن میں ایک تجربہ کی شکل نہ اختیار کرے فنی پیشکش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی اس کی بڑی واضح مثال ابو الخطیب کا افسانہ "انتظار ان کا یا سحر کا" ہے یہاں اس نے ایک المیے کو اپنے افسانے کی بنیاد بنا دیا ہے جس کی رپورٹ اس نے محض اخبار میں پڑھی تھی۔ یہ واقعہ اپنی جگہ خود اتنا اثر انگیز تھا کہ ہر وہ دل جس میں اسلام اور اس کے جانثاروں کی محبت تھی خون کے آنسو رو دیا ہے۔ مصر کے اخوان لیڈر حضرت عبدالقادر عودہ کو جمال عبدالناصر

کی فوجی حکومت نے جس اسلام پسندی کے جرم میں سزائے موت دی۔ اس پر کون سا دل ہے جو متاثر نہ ہوا ہوگا۔ فنکار اس المناک واقعہ کو اپنا خون جگر پلا کر ایک عظیم فن پارے میں ڈھال سکتا تھا مگر یہاں۔ ابوالخطیب ایک فنکار کے بجائے ایک عقیدت مند ہو جاتا ہے۔ اس کے دل کو چوٹ لگی ہے لیکن اس نے اس چوٹ اور درد و کرب کو فوراً کاغذ پر منتقل کر دیا نتیجتاً افسانہ واقعات کے لحاظ سے ایک رپورتاژ بن گیا اور خیر و شر کی عظیم کشمکش جو اس واقعہ میں مضمر ہے فنکار کی کم توجہی کی وجہ سے کوئی اثر نہ دکھلا سکی۔ ہمیں منعم کے روپ میں عبدالقادر کی شخصیت نظر آتی ہے۔ یہ شخصیت اپنے صبر و استقامت اور للّٰہیت کے لحاظ سے بے مثال بھی معلوم ہوتی ہے لیکن اتنا تاثر تو اخبار کی رپورٹ میں بھی تھا۔ اسے فن میں ڈھالنے سے کیا ملا۔ اسی طرح منعم کی بیوی عائشہ ایک بے جان سی عورت معلوم ہوتی ہے۔ یہ عورت گوشت و پوست کی عورت نہیں معلوم ہوتی بلکہ مرد حُر کی بیوی کا ایک آئیڈیل کردار ہے جو بشری کمزوریوں سے بالاتر ہے کم و بیش یہی حال منعم کے بچوں کا ہے جو محض منعم کے بچے ہونے کی وجہ سے عام بچوں سے بہت مختلف ہیں اور ان میں سے بعض عمر کی غیر شعوری منزل میں ہونے کے باوجود شعور سے زیادہ شعور کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ یہ آئیڈیل ضرور ہو سکتا ہے لیکن حقیقت پسندی بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور حقیقت پسندی کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ انسان کو انسان بنا کر پیش کیا جائے۔ اگر اسے فرشتہ بنا دیا گیا تو وہ انسان سے کم ہوگا یا زیادہ ہوگا مگر انسان کے برابر نہ ہوگا۔

(۳۰)

ابوالخطیب ہمارے افسانہ نگاروں میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ذاتی اعتبار سے بھی اور بحیثیت ایک فنکار کے بھی۔ رہنے سہنے عادات و اطوار، بات چیت میں اس کا انداز عام انداز سے ذرا مختلف ہے مزاج کی یہی خصوصیت اس کے فن میں بھی نمایاں ہے۔ اس کی راہ عام ڈگر سے ہٹ کر ہے۔ تجربات و مشاہدات ہی میں نہیں اسلوب و بیان میں بھی اس کا انداز جداگانہ ہے۔ یہ انفرادیت خوشگوار ہے مگر کہیں کہیں غیر مانوس ہو جاتی ہے خصوصاً زبان کے معاملے میں جہاں وہ مستقل نئے تجربات کا قائل ہے ان تجربات نے اگرچہ اضافے کئے ہیں تو کہیں کہیں طبیعت کو بری طرح مکدر کیا ہے اور اس کا سبب میری دانست میں یہی ہے کہ اس کا سوچنے کا انداز کچھ مختلف ہے اگر اس کے پس منظر کو نظر میں رکھا جائے تو اس اختلاف کی وجہ بہ آسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اس کی نشوونما اور اٹھان ایسے ماحول میں ہوئی ہے جہاں مارکسیت اور سوقیت زندگی کا مستقل جزو تھے۔ اس ماحول سے نکل کر اس کی زندگی کا خاصہ حصہ آگرہ کی سڑکوں، گلیوں، اور تفریح گاہوں میں اپنے اشتراکی رفقا کے ساتھ گذرا ہے۔ اشتراکیت میں قول و عمل کے لحاظ سے ایک زبردست تضاد رہا ہے اور ہے۔ یہی تضاد ہمیں اشتراکیوں میں بھی ملتا ہے۔ ابوالخطیب غالباً اسی تضاد سے گھبرا کر اسلام کی طرف آیا ہے۔ مگر اس کے اثرات اس میں اب تک کبھی کبھی نظر آ جاتے ہیں۔ اسلام سے قریب آ کر اسے اپنی زندگی کو از سرِ نو ترکیب و ترتیب دینے کی ضرورت محسوس ہوئی مگر یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ دل و دماغ کے پرانے سانچوں کو توڑ کر بالکل نئے سانچے بنانا کوئی مذاق نہیں۔ ابتدائی نشوونما نے اس کے اندر پھکڑپن پیدا کر دیا تھا اپنی اشتراکی زندگی میں اس پھکڑپن کو ختم کرنے کی اسے کوئی ضرورت نہ محسوس ہوئی کیونکہ وہاں اس کے گوارا ہونے میں کوئی قباحت نہ تھی۔ بلکہ اسے اور ہوا ملی۔ اسلام سے قریب آ کر اسے گہری سنجیدگی (seriousness [illegible]) کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہاں ایک ایسا تہذیبی معیار اس کے سامنے تھا جس میں زور سے قہقہہ لگانا اور ناشائستہ الفاظ میں گفتگو کرنا بھی وقار کے منافی تھا۔ نتیجۃً اس کا مزاج پھکڑپن اور سنجیدگی کا ایک عجیب مرکب بن گیا جو بعض اوقات دلچسپ اور کبھی کبھی ([illegible]) معلوم ہوتا ہے۔

ہاں تو بات ابوالخطیب کی انفرادیت کی ہو رہی تھی۔ یہ انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ سب سے پہلے اس کے افسانوں کے عنوانات ہی کو لے لیجئے۔ عنوانات کے انتخاب میں اس کا رویہ عام روئیے سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے عنوانات لاتا ہے جس میں نیاپن ہو۔ افسانوں میں ہمارے یہاں عام طور سے عنوانات پر کوئی خاص توجہ نہیں کی جاتی۔ عنوان افسانے کا کوئی کردار ہوتا ہے یا اس کی کوئی صفت یا چند الفاظ جو موضوع کی نشاندہی کرتے ہوں۔ ابوالخطیب نے اس کے برعکس ایسے عنوانات اختیار کئے جو چونکا دیتے ہیں۔ اگر چونکا نہیں دیتے تو کم از کم

تجسس کی ایک لہر ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔ شاید وہ قاری کی نفسیات کے لحاظ سے یہ ضروری سمجھتا ہے کہ اس کے تجسس کو اپنے افسانے کی سرخی ہی سے بیدار کر دے۔ "محبت کا ایک اور روپ" "جب دہشت کا جگر چیرا" "انتظار ان کا یا سحر کا" "کب تک سحر نہ ہوگی" "یہ موت کس کی ہے" یہ اور اسی طرح کے دوسرے عنوانات خود اپنے اندر تجسس پیدا کرنے اور چونکا دینے کی خاصی صلاحیت رکھتے ہیں۔

پھر موضوعات کے لحاظ سے بھی وہ عام ڈگر سے مختلف راہ پر چلتا ہے۔ وہ محبت کا اگر کوئی روپ دکھاتا ہے تو اس میں بہمیت پیدا کر کے اسے اظہار محبت کے عام طریقوں سے بالکل مختلف بنا دیتا ہے اسی محبت کو اجاگر کرنے کے لئے وہ دہشت کا جگر بھی چیرتا ہے جہاں پتھر کے دل میں چھپے ہوئے پانی کی طرح محبت کے سرچشمے ملتے ہیں۔ موضوع کی ندرت کے لحاظ سے اس کا کامیاب ترین افسانہ "یہ موت کس کی ہے" ہے۔ یہ ایک ادیب کی کہانی ہے۔ ادیب کا دل بڑا حساس ہوتا ہے۔ اسے انسانیت کے دکھ درد سے بڑا لگاؤ ہوتا ہے۔ اس میں انسانی ہمدردی اور انسان دوستی کا جذبہ بدرجہ اتم ہوتا ہے۔ انہیں جذبات کو ابھارنے کے لئے وہ ادب کی تخلیق کرتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں اسے اپنے فنی تجربات سے کتنا لگاؤ ہوتا ہے۔ دونوں میں سے کون اس کے لئے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ کیا وہ فن کا تجربہ مکمل کرنے کے لئے انسانیت کا خون کر سکتا ہے۔ عظیم فن کار بڑا ہے یا عظیم انسان۔ یہ اس کہانی کا بنیادی مسئلہ ہے۔

"عبید اس وقت ایک افسانوی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اسے اپنے آئیڈیل کے لئے ایک کردار کی ضرورت تھی۔ ایسے کردار کی جس کی شریف فطرت ایک متحرک قوت کی صورت میں اس میں موجود ہو۔ یہ تو اس کا صرف آئیڈیا تھا لیکن ابھی تک اس کے مشاہدے میں اس قوت کے شعوری اور غیر شعوری مظاہرے نہ آسکے تھے .... وہ سمجھتا تھا کہ اگر آرٹ زندگی کا رہنما ہے تو انسانی زندگی سے اسے دوستانہ حیثیت سے پیش آنا چاہئیے .... لیکن اگر آرٹ نے زندگی میں یہ حیثیت اختیار نہ کی تو صفحۂ ہستی سے وہ بھی اسی طرح مٹ جائے گا جس طرح اور اوہامی علوم و فنون جو انسان کی بعض کمزوریوں کا سہارا لے کر پروان چڑھے تھے۔"

مدت کے بعد ملی ہوئی مرغ پلاؤ کی پلیٹ کو باوجود سخت بھوک کے سردی سے کانپتی اور بھوک سے نڈھال بڑھیا کو کھلا دینے کے بعد عبید سوچ رہا تھا۔ آرٹ۔ انسانیت۔ اس انتہائی سرد رات میں بڑھیا کے لئے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اس نے مجبوراً ٹھیں سے بندھی ہوئی ممیاتی بکری کی پیٹھ سے ٹاٹ کا ٹکڑا اٹھا کر اوڑھ لیا تھا اور وہیں لیٹ کر سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس انتہائی سرد رات کی صبح دیکھنے کے لئے بوڑھی ماں کو ایک کمبل کی شدید ضرورت تھی۔ عبید محسوس کر رہا تھا کہ بغیر کمبل کے اس کا سوکھا جسم صبح تک اکڑی ہوئی لاش میں تبدیل ہو جائے گا بوڑھی کو کمبل اوڑھانے کے انتہائی انسانی جذبے سے مجبور ہو کر وہ گھر کی طرف لپکا کہ اپنا کمبل لا کر اوڑھا دے۔ لیکن :۔

"اس جذبۂ عمل کو لے کر وہ اپنی نیم تاریک کوٹھری میں آیا تخلیق اس پر نشے کی طرح چھائی ہوئی تھی اور بوڑھی ماں اس کے ذہن میں احتجاج بنکر فن میں ڈھل چکی تھی۔ اس کیفیت میں اس نے ماں کو دوبارہ دیکھا تو اس کا ذہن اور دل کسی نہ معلوم درد سے بوجھل ہو گیا اور اس وقت اس کی وہی حالت ہو گئی جو بچے کی پیدائش سے قبل درد سے ایک حاملہ عورت کی ہوا کرتی ہے۔"

تخلیق کی یہ کسک اس کے جذبۂ عمل پر غالب آگئی۔ عبید فن کی تخلیق کر رہا تھا اور بوڑھی ماں اکڑتی چلی جا رہی تھی۔

"کیا میں اس فن کاری میں ایک بڑا انسان بن سکوں گا آخر میری زندگی کس لئے۔ صرف فنی تجربوں کے لئے ہے۔ میں فن کاری کے صرف تجربے ہی کرتا مر جاؤں گا میرے اندر کے انسان کا کیا ہوگا۔

عبید ڈھلتی ہوئی رات میں افسانہ لکھتے لکھتے اس خیال سے چونک اٹھا۔ وہ کمبل لے کر پہنچا۔ بکری ممیانا بند کر چکی تھی۔ بوڑھی ماں سردی سے اکڑ کر ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

"ارے بڑھیا مر گئی" اس مرتبہ اس کا اندرونی کرب اس لب و لہجہ میں لپٹ کر باہر آگیا۔ "اچھا تو اب اس کے کفن کا انتظام کر دو" سعید کو پھر کچھ خیال آیا ——— "ہاں یہ کام اب ہمارا نہیں

صبح ہوتے ہی اس نیک کام کو کوئی انجمن انجام دے گی ——— اور اگر نعش کو پڑے پڑے زیادہ دیر ہو گئی تو پھر حکومت صحت عامہ کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے اس نعش کو کہیں لے جائے گی۔ غالباً ہسپتال میں تاکہ میڈیکل کالج کے طلباء اس پر تجربہ کر کے انسانوں کی جسمانی بیماریوں کو سمجھ سکیں۔ مسٹر عبید اس نظام زندگی میں انسان کا یہ انجام دھرتا ہے۔ لیکن ہاں تم نے اتنی دیر کہاں لگائی۔

عبید اس سوال پر آبدیدہ ہو گیا۔"

کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے لیکن عنوان باقی رہتا ہے "یہ موت کس کی ہے؟" بڑھیا کی یا عبید نامی فنکار کی۔ واقعاتی نوعیت سے اس سوال کے جواب میں اختلاف ہو سکتا ہو لیکن جن کی نظروں میں انسانی اقدار کی اہمیت ہو ان کے نزدیک اس سوال کا صرف ایک جواب ہے اور اس جواب سے عبید بخوبی واقف ہے۔ عبید کا ضمیر اس پر آبدیدہ ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ضمیر کی آواز ان سنی کی جا سکتی ہے مٹائی نہیں جا سکتی

ابوالخلیب کے کردار عموماً سماج کے گرے پڑے اور کچلے ہوئے لوگ ہیں لیکن منٹو کے بھڑووں اور لفنگوں اور دلالوں کی طرح ان کے اندر کوئی (abnormality) یا (Perversion) نہیں ہوتا۔ بشیرا حلوائی، حمیدن دھوبن اور اس کی بچی نوری۔ فتح علی ہوٹل والا۔ فنکار عبید اور اس کا ساتھی سعید، شیخ عنایت اور ان کے بھتیجے شیخ کرامت، یہ سب ہمارے معاشرے کے ایسے کردار ہیں جو آئے دن ہمارے مشاہدے میں آتے رہتے ہیں بظاہر ان کی زندگیوں میں کوئی خاص بات نہیں۔ کوئی کہانی نہیں۔ لیکن درحقیقت ان میں سے ہر شخص کی زندگی ایک کہانی ہے۔ بشرطیکہ سوسائٹی کے ان گرے پڑے اور کچلے ہوئے دل کو ذرا غور سے سمجھا جائے۔ "جب وحشت کا جگر چیرا" میں حمیدن دھوبن کی آٹھ یا نو سالہ بچی نوری مستقل پٹتی ہے اس لئے کہ اس کا چھوٹا بھائی کلو ہمیشہ اسے ستاتا رہتا ہے اور جب کلو کی شرارتوں سے عاجز آ کر نوری اس کے کچوری جیسے گالوں کو ربڑ کی طرح کھینچ کر ایک دو دھول لگا دیتی ہے تو ماں ہمیشہ کلو کی طرفداری کرتی ہے اور نوری کو کوٹ کر رکھ دیتی ہے اور پھر نوری کی درد بھری آنکھیں ماں کو دیکھ کر جیسے فریاد کرتی ہیں۔

"بتا اب تیرا انصاف کہاں ہے۔ لڑکے پر تیرا انصاف کیوں نہیں چلتا اس لئے کہ وہ تجھے کما کر کھلائے گا اور میں بڑی ہو کر تیرے گھر سے چلی جاؤں گی۔"

لیکن ماں سے جب اس کی آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے کہا۔

"چل چھنال۔ تو ہے اس کابل (قابل)"

یہ گھر کے اندر کا ماحول تھا جہاں کلو کو نوری پر اس لئے "فوقیت" ہے کہ وہ لڑکا ہے۔ گھر کے باہر نوری محض ایک دھوبن کی بیٹی ہے جو محلے کی سیدانیوں اور پٹھانیوں کے ساتھ کھیل بھی نہیں سکتی کیونکہ وہ نیچ اور کمین ہے۔ لیکن یہی نیچ اور کمین ذات نوری جب ندی کنارے سے کانچ کے رنگ برنگ کے ٹکڑے چن کر لاتی ہے تو سارے سید اور پٹھان زادے اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور آن کی آن میں اس کی مشقت لٹ جاتی ہے۔ اپنی محنت سے جمع کی ہوئی پونجی کو اس طرح لٹتے دیکھ کر نوری اس کے بچاؤ کے لئے پتھر چلاتی ہے جو کستاک سے زبیر کے سر پر بیٹھتا ہے اور زبیر کے سر سے خون بہنے لگتا ہے۔ خالص سادات کا خون۔ اور پھر پورے محلے کی شرافت کو غیرت آ جاتی ہے۔ جمعیت انتقام کا مطالبہ کرتی ہے نوری پٹتی ہے۔ زبیر کی ماں تو اسے پیٹتی ہی ہے لیکن اس کے تھک جانے کے بعد نوری کی اپنی ماں بھی اسے پیٹنے لگتی ہے۔ یہ مار درحقیقت اپنی بچی کے فعل کے خلاف غصہ کا اظہار نہیں بلکہ انسانیت کے خلاف ایک احتجاج ہے جو ایک معصوم بچی کے بیدردی سے پٹنے کا تماشہ دیکھ رہی ہے مگر یہ نہیں کہتی کہ خطا درحقیقت سید زادے کی تھی کیونکہ کانچ کا ٹکڑا اس نے لوٹا تھا۔

"نوری کی ماں کے طمانچے پوری قوت سے اس کے گال پر پڑ رہے تھے اور سارا انسان زادوں کا ہجوم کھڑا اس ختم نہ ہونے والی مار کو تک رہا تھا۔ اس انسانی بے حسی پر نوری کی ماں کو اور غصہ آ گیا۔ اس نے اور طاقت سے اس کے گالوں کو پیٹنا شروع کر دیا جیسے وہ اس آدمیت کو مار مار کر جگا رہی ہو جو ظلم کے خلاف احتجاج بھی نہ کر سکے جس میں انسانیت کا احترام نہ ہو۔ وہ پاگلوں کی طرح اس کو پیٹتی رہی اور اس مہذب کالونی کے انسان یونہی کھڑے اس لمبی مار کو دیکھتے رہے۔"

لیکن یہ انسانیت سوز معاشرہ اس پر بھی بس نہیں کرتا بلکہ:-

"بس بوا جی اب تو آپ معاف ہی کردو۔ دیکھو میں نے لونڈیا کا چرا کر دیا۔ کیا کروں باج (زبان) نہیں آتی۔" مارتے مارتے جب اس کے بھی ہاتھ دکھ گئے تو اس نے زبیر کی ماں سے بہت للک کر معافی مانگی کیونکہ وہ ان کے کپڑے دھوتی تھی۔

"کیا معاف کر دوں —— وہ خون تو نہیں ملا؟"

"تو میں کیا اس کا خون بھی۔ دوں —— کیا کروگی اس کے خون کا۔"

"کروں گی کیا —— اس خون کو پیوں گی۔"

"پیوگی۔" حیرت سے نوری کی ماں کی آنکھیں پھٹ گئیں جس میں نفرت اور انتقامی جذبہ عود کر آیا تھا۔

"ہوں۔" زبیر کی ماں نے اس آخری وار کو نوری کی ماں پر کیا اور ایک قہر آلود نگاہ ڈالتے ہوئے اپنے کوارٹر کی طرف چلدی۔

ابوالخطیب کے ہاں یہ احتجاج جگہ جگہ ملے گا کیوں کہ اس کا اپنا ماحول اس دم گھٹا دینے والے کچلے ہوئے ماحول سے بہت قریب رہا ہے۔ انسانی سلوک اور برتاؤ میں اس طرح کے امتیازات اس کے اپنے مشاہدے اور تجربے میں آئے ہیں۔ ان مشاہدات اور تجربات نے اسے مجبور کیا ہے کہ وہ مادی دنیا کی ان غلط اور قابل مذمت اقدار کے خلاف ماتم واحتجاج کرکے انسانی ضمیر کو ایک بار پھر چونکائے اس لئے کہ انسانی ضمیر ہی اس کی آخری امید ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ضمیر قدرت کا وہ عطیہ ہے جس کی آواز دبانے اور مٹانے اور نظر انداز کرنے کے باوجود بہت عرصہ تک انسانی دل و دماغ کے تاروں کو جھنجھناتی رہتی ہے اور ایک مستقل خلش سے دوچار رکھتی ہے۔ اصلاح کی ساری امید اس کی نظر میں اسی خلش، اسی ہلکی سی، ڈوبتی ہوئی آواز میں مضمر ہے۔ جو شاید کبھی اندر کے انسانوں کو ابھر اور غالب آنے کا موقع فراہم کرسکے۔ نظری طور پر ابوالخطیب کے سامنے انسانی سلوک اور برتاؤ کا وہی معیار ہے جسے انبیاء نے برتا ہے جن کی نظر میں انصاف کے اصول رنگ و نسل، سماجی اور معاشی امتیازات سے بدلا نہیں کرتے۔ ان اصولوں کی حیثیت ایک میزان جیسی ہے جس میں، افعال کے ناپنے اور تولنے کے اوزان اور پیمانے ہمیشہ ایک ہی رہیں گے خواہ افعال کسی سے بھی سرزد ہوں۔ زمانہ آج بھی نظری طور پر انصاف کے انہیں اصولوں کو مانتا ہے مگر نظریات اور عمل میں ایک زبردست اختلاف واقع ہو چکا ہے اور جب تک اس اختلاف کو دور کرکے ان میں ہم آہنگی نہ پیدا کی جائے ایک متوازن اور خوشگوار معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا۔

یہی احتجاج ایک دوسرے انداز میں اس کی ایک اور کہانی "محبت کا ایک اور روپ" میں بہت کھل کر سامنے آیا ہے۔ یہ بالو نامی کتے کی کہانی ہے جس نے اپنی جوانی علی ظہیر صاحب کے بنگلے پر گذاری ہے اور شام کی ہواخوری میں ان کا شریک رہا ہے مگر اب محض بڑھاپے کے جرم میں کوٹھی سے نکالدیا گیا ہے اور بشیرا حلوائی کی دوکان کے سامنے نالی میں پڑے سکوروں میں بچی ہوئی بالائی اور دودھ چاٹ کر گذر کر رہا ہے۔

"الو کے پٹھے۔ بابو بنے پھرتے ہیں۔ پالنے کو تو پال لیا اور جب بڑھاپے کی اس پر مصیبت پڑی تو کوٹھی سے باہر پھینک دیا۔ مطلبی۔ کمین کہیں کے۔ اپنے کو پڑھا لکھا کہتے ہیں۔"

یہ بشیرا کے تاثرات ہیں۔ بشیرا جو محض ایک جاہل حلوائی ہے۔ اس خود غرض انسانیت کے ایک مہذب اور امیر انسان کے متعلق، لیکن یہاں بشیرا کو علی ظہیر کی امارت سے کوئی پرخاش نہیں ہے بلکہ علی ظہیر کا یہ برتاؤ اس لئے اس کی نظر میں کمینگی کے مترادف ہے کہ وہ اپنے کو پڑھا لکھا کہتے ہیں تعلیم جو کبھی تہذیب سکھاتی تھی اور تہذیب جو کبھی انسانیت سکھاتی تھی۔ اب تعلیم کا نتیجہ نہ تہذیب ہے نہ انسانیت۔

ابوالخطیب کے اس سب سے مختصر افسانے میں انسانی محبت اپنی پوری بہیمیت کے ساتھ ظاہر ہوئی ہے اور یہ بہیمیت اس احتجاج کو اور تند و سخت بنا دیتی ہے۔ جب شام کو علی ظہیر اپنی کوٹھی سے نئے بلڈاگ کو ساتھ لے کر تفریح کے لئے نکلتے ہیں تو پہلے بشیرا خود انہیں پکار کر اس مظلوم کتے کی طرف متوجہ کرتا ہے مگر وہاں اب نفرت اور حقارت کے سوا اس کے لئے اور کیا تھا۔ علی ظہیر دور ہوتے چلے جاتے ہیں اور بشیرا ان سے مایوس ہو کر بالو کو اشارہ کرتا ہے۔ بالو انہیں پہچانتے ہی اپنی تین ٹانگوں پر گھسٹتا ہوا ان کی طرف بڑھتا ہے مگر سڑک پار کرتے کرتے ایک کار کی زد میں آکر نیم جان ہو جاتا ہے۔ بشیرا جو اب تک بالو کو پالتا رہا ہے۔ محلے کے خونخوار اور تندرست کتوں سے اسے بچاتا رہا جلتا ہوا

چیلا لیکر جاتا ہے اور تین چار ضرب لگا کر پاتو کو ٹھنڈا کر دیتا ہے "
"مسرے۔ جب تیرا کوئی پلو یا نہیں تو تو جی کر کیا کرے گا"
"اس نے اس حالت میں آسمان کی طرف دیکھا اور گھگھیا کر
رو دیا"

بشیرا کی محبت کا یہ اظہار شاید کچھ عجیب معلوم ہو لیکن اس کے بعد وہ بحیثیت ایک انسان کے ہماری نظروں میں اور اہمیت حاصل کرلیتا ہے اس کا آخری جملہ محض ایک کتے کی موت پر نوحہ نہیں ہے اس جملہ میں کائنات کا سارا درد پنہاں ہے ....

...... سماج کے ان تمام مظلوم اور بے بس انسانوں کی طرف سے ایک دلگداز فریاد ہے جن کا محض اس لئے کوئی پرسانِ حال نہیں کہ وہ تقاضائے عمری کی وجہ سے اپنی قوت کار کردگی ختم کرکے اب معذور ہیں۔ جب تک وہ تندرست اور توانا تھے۔ اس دنیا کو ان کی ضرورت تھی مگر اب جبکہ انہیں دنیا کی ضرورت ہے ان کا کوئی نہیں۔

"کب تک سحر نہ ہوگی" میں بھی یہی احتجاج، یہی فریاد، ضمیر کو جھنجھوڑنے کی یہی کوشش ایک دوسرے انداز میں کی گئی ہے۔ شیخ کرامت علی ایک امیر آدمی ہیں۔ سمینٹ کی بلیک مارکیٹ نے ان کی لاگت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ لیکن اس دورِ تہذیب میں محبت اور خلوص شاید پختہ مکانوں سے نکل کر جھونپڑوں میں پناہ گزیں ہو چکا ہے۔ شیخ صاحب کو ایک چوکیدار کی ضرورت ہے جو ان کے سمینٹ کی رکھوالی کر سکے۔ کراچی کے پٹھان زیادہ پیسے مانگتے ہیں اس لئے شیخ صاحب ہر روز مہاجرین کی اسپیشل جاتے ہیں کہ شاید کوئی غریب رشتہ دار مل جائے جو اس کام کو سستے داموں انجام دیدے اور اسی کاوش میں ان کی ملاقات اپنے چچا شیخ عنایت سے ہوتی ہے۔ جو ہاتھوں ہاتھ گھر لائے جاتے ہیں۔ شیخ عنایت بیچارے اگلے وقتوں کے ایک فرد، اسے بھتیجے کی اقربا پروری اور انسانیت دوستی سمجھ کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ لیکن بھتیجا اپنی انسانیت دوستی کو اپنی بیگم سے ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے۔

"بیگم ہماری عقل کو تم نے کیا سمجھا ہے۔ دنیا داری نبھانی پڑتی ہے باہر خالی دکان میں پڑا رہے گا۔ ایک نوکر کی ضرورت تو تھی ہی۔ آخر اس کو بھی کچھ دینا ہی پڑتا۔ اور یہ بڈھا سب سے کم خرچ پر ہوگا۔ پھر بات کی بات رہ جائے گی کہ بھتیجے نے چچا کو رکھ لیا۔ آخر سوچو اس سالی دنیا کا خیال کریں تو چین سے بیٹھنے دے گی"

سمینٹ کا کاروبار چل رہا ہے اور شیخ عنایت کو معقول کھانا۔ تمباکو اور جیب خرچ مل رہا ہے۔ شیخ عنایت اگلے وقتوں کے وضعدار لوگوں کی طرح حقے ہی کی مدد سے اپنی سوسائٹی جما لیتے ہیں۔ رہ گئے پیسے اس کا ان کے لئے اس کے سوائے اور کیا مصرف تھا کہ بھتیجے کے بچوں کو غبارے اور حلوا خرید کر خوش رکھیں لیکن تایہ کے سمینٹ کا کاروبار مندا ہو جاتا ہے۔ شیخ کرامت علی کا پرمٹ بند ہو جاتا ہے۔ دوکان خالی ہو جاتی ہے۔ اب شیخ عنایت کا کیا مصرف۔ نکالنے میں دنیا کے طعنوں کا ڈر۔ آخر شیخ جی کا جیب خرچ تمباکو بند ہو جاتا ہے ناشتہ اور کھانا بھی ایسا ہی ملتا ہے جو اس بڑھاپے میں ان کے کام و دہن اور جمیعت دونوں پر بار ہوتا ہے۔ اور اس طرح شیخ جی پر اصل حقیقت کھلتی ہے کہ بھتیجے کی یہ مہربانیاں کیوں تھیں!۔

"ان کا وہ معاشرتی تصور جس میں اخلاق سب سے بڑی اہمیت رکھتا تھا آج انکی نظروں کے سامنے دھجیوں کی طرح فضا میں بکھر ا پڑا تھا اور وہ اسے غم زدہ انداز میں دیکھ رہے تھے"

اور سب چیزیں تو بے چارے برداشت کر گئے۔ مگر حقہ۔ عمر بھر کی عادت ایک زبردست کمزوری۔ مجبوراً وہ سگریٹ اور بیڑی کے ٹوٹے چن چن کر پینے لگے۔ ایک دن شیخ کرامت اسے دیکھ کر برس پڑے۔

"یہ کیا کر رہے ہو۔ کیا عقل سٹھیا گئی ہے۔ ہمیں عزت سے بھی رہنے دوگے یا نہیں" منشی جی نے اس سوال پر صرف گردن اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ لیکن تمباکو کا مسلنا بند نہ ہوا۔ شیخ صاحب اور بپھر گئے۔ فوراً جیب سے روپیہ نکالا اور ان کی طرف پھینکدیا۔

منشی جی نے فوراً ہاتھ کا تمباکو پھینکا۔ اس روپیہ کو اٹھا کر اس پر تھوکا اور زور سے اپنے دائیں طرف پھینک دیا۔

"کیا دماغ خراب ہوگیا ہے" شیخ صاحب ابل پڑے

منشی جی پر اس وقت رقت طاری تھی۔ اس آواز پر وہ صرف تلملائے اور گردن ہلا دی۔ جیسے وہ حامی بھر کر کسی کر یہہ چیز کو کھانا چاہتے ہوں"

"لیے لو۔" اب شیخ صاحب کا لہجہ کچھ نرم پڑگیا۔

"اب کیا کروں گا لے کر۔ تو نے اپنے ہوتے ہوئے مجھے در در کی بھیک منگوادی۔ اب تو میں فقیر ہوں۔" آخری جملے پر منشی جی کی چیخ نکل گئی شیخ صاحب لرز گئے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا کہ زلزلے نے ان کے قدموں کے نیچے کی زمین سرکا دی۔ وہ وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ تھوڑی دیر بعد منشی جی نے نظریں اوپر اٹھائیں جیسے وہ اللہ سے کچھ طلب کر رہے ہوں۔ اس کیفیت کو دیکھ کر شیخ صاحب ڈر گئے ان کے قریب آئے اور ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔"

اب پھر منشی جی کو ہر طرح کی مراعات حاصل تھیں لیکن وہ اس کے رموز کو سمجھتے تھے۔ انہیں اب انسانی اخلاق اور محبت سے مایوسی ہو چکی تھی۔ انھوں نے اس مختصر سے عرصہ میں ان تہذیبی روایات کی دھجیاں بکھرتے دیکھ لی تھیں جسے وہ زندگی بھر برتتے رہے تھے انسانوں سے مایوس ہوکر انھوں نے اپنی محبت کا مرکز بے زبان طوطے اور بکری کو بنایا۔ وہ طوطے کو درد زبح پڑھاتے۔ اسے کھانا کھلاتے۔ پانی پلاتے اور باتیں کرتے ایک دن جبکہ اس کا پنجرہ گندہ ہوگیا تھا منشی جی نے اسے صاف کرنے کے لئے اس میں ہاتھ ڈالا تو طوطے نے انکی انگلی بری طرح کاٹ لی۔

"منشی جی تڑپ گئے۔ جلدی سے انگلی باہر نکالی۔ اسے دیکھا تو اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس پر فوراً ہاتھ رکھا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر آہستہ سے کہا: "تو نے بھی دفا نہ کی۔"

محبت اور خلوص کے مارے ہوئے اس ضعیف انسان کے لئے اس دنیا میں اب کوئی آسرا نہ تھا اس لئے اس نے خودکشی کرلی کیونکہ اس نے سوچا۔

"جب میری مٹی اتنی پلید ہوگئی تو خدا نے بھی عزت سے نہ بلایا لیکن اب میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔ میں ایسی دنیا میں رہ کر کیا کرتا جہاں کسی کا کوئی سہارا نہ ہو۔ جہاں پیار نہ ہو۔ دفا نہ ہو۔ مروت و اخلاق نہ ہو، میری موت کے بعد بھی اگر یہ سب کچھ اس دنیا میں نہ ہوا جس کی مجھے ضرورت تھی تو یہ دنیا بھی میری طرح خودکشی کر کے اسی طرح مٹ جائے گی ——— "بدنصیب عنایت علی"

وہی جھنجلاہٹ وہی فریاد۔ وہی ضمیر کو بیدار کرنے کی آخری کوشش ابوالخطیب نے اپنے اسی پیغام محبت کو مختلف رنگ و روپ میں پیش کیا ہے۔ مختلف انداز میں ایسا ہی سبق ایک ہی آدرش دیا ہے اور اس سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ یہ سبق اور یہ آدرش بہت بڑا اور بہت اہم ہے۔ دنیا آج خودکشی سے بہت قریب ہے۔ وہ مرنا نہیں چاہتی لیکن موت کے مہیب غار منھ کھولے سامنے کھڑے ہیں اسے اس وقت اسی آدرش کی ضرورت ہے اسی پیغام کی ورنہ خود غرضی کا ایک ہلکا سا دھچکا اور یہ غار بھر جائیں گے۔

موضوع، مقصد اور آدرش کی اس بحث کے بعد اب فن سے متعلق تھوڑی سی گفتگو رہ جاتی ہے۔ مختصر کہانی کیا ہے؟ اس پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ مختصر کہانی نے مختلف فنکاروں کے توسط سے جو بھی رنگ و روپ اختیار کیا ہو، جتنی بھی شکال بدلی ہوں لیکن اس کے مبادیات ہمیشہ ایک ہی رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی طور پر مختصر کہانی اسے کہتے ہیں جو کہانی ہو اور مختصر ہو۔ کہانی ہونے کے لئے چند باتیں ناگزیر ہیں۔ مثلاً واقعہ اور اس کا عمل جو بتدریج اپنے منتہا کو پہنچکر حل ہو جائے۔ اسی کو دوسرے لفظوں میں پلاٹ کہتے ہیں۔ جہاں واقعہ اور اس کا عمل ہوگا وہاں ایک یا کئی کردار ہوں گے اور کردار کے ساتھ ان کا ماحول خود بخود آجائے گا ان سب کے علاوہ ایک بنیادی چیز یہ بھی ہے کہ تاثراتی وحدت برقرار رہے ورنہ کہانی فنی نقطہ نظر سے ناکام رہ جائے گی۔ جہاں تک کہانی میں اختصار کا سوال ہے اس کی کوئی حد متعین نہیں کی جا سکتی۔ سوائے اس کے کہ اس میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو غیر ضروری ہو۔ یعنی اگر اسے نکالدیا جائے تو کہانی پر کسی پہلو سے کوئی اثر نہ پڑے۔

ان مبادیات کے پیش نظر ابوالخطیب کی کہانیاں سوائے ان کہانیوں کے جن میں اس پر جذبۂ تبلیغ یا پروپیگنڈہ حاوی رہا ہے تقریباً سب کی سب بہت کامیاب ہیں۔ کہانیوں میں لکچر یا وعظ ایک عام روش ہو چلی ہے حالانکہ کہانی پر یہ ایک بڑا ظلم ہے۔ نظریات کے واضح اور تفصیلی اظہار کے لئے ناول زیادہ موزوں ہے اس لئے کہ اس کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے۔ کہانی میں بھی ایسا کیا جا سکتا ہے لیکن محض اشاروں میں یا چند جملوں میں جو تاثر سے بھرپور ہوں اور موقع کے لحاظ سے اس

قدر مناسب ہوں کہ ناگزیر نظر آئیں۔ اس لحاظ سے ابوالخطیب کی مختصر ترین کہانی "محبت کا ایک اور روپ" میری نظر میں ہی اس کی کامیاب ترین کہانی بھی ہے۔ ڈھائی تین صفحات میں زندگی سے متعلق ایک بڑے ٹکڑے کو بڑی فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔ فنکار نے یہاں کہانی کے ماحول سے متعلق کسی بھی ضروری چیز کو نظر انداز نہیں کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کسی بھی غیر ضروری چیز کو جگہ نہیں دی ہے۔ بالو اور بشیرا اس کہانی کے اہم کردار ہیں۔ پردہ ہٹتے ہی اسٹیج پر بالو نظر آتا ہے۔ ایک بوڑھا کھجیلا کتا جو لکڑی کی تپائی کے نیچے منھ ڈالے آنکھیں بند کئے اونگھ رہا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اس کے سارے خدوخال اور اس کا تمام ماحول ابھرنے لگتا ہے۔ بھنکتی ہوئی مکھیاں۔ نالی میں پڑے ہوئے جوٹھے سکورے، ڈھلتی ہوئی دھوپ، جونہی یہ تصویر مع اپنے ماحول کے مکمل ہو جاتی ہے اس کا دوسرا کردار بشیرا سامنے آجاتا ہے اور بشیرا کی اپنی خصوصیت بالو کو دیکھ کر اس کے اندر پیدا ہونے والے ردعمل سے ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ بشیرا کا بالو کی طرف سے تاثر معلوم ہوتے ہی علی ظہیر ایک ثانیہ کے لئے ہماری نظروں کے سامنے سے گذرتے ہیں۔ کہانی میں ان کا ذکر محض ہونے والے حادثہ کے لئے ایک محرک پیدا کرنے کی خاطر کیا گیا ہے۔ صرف چند جملے۔ بشیرا انہیں پکار کر کتے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور بس اب بالو انہیں دیکھ کر دوڑتا ہے اور بیچ سڑک میں ایک گذرتی ہوئی کار کے نیچے آجاتا ہے۔ بشیرا اس کی اس نیم جانی پر جلتے ہوئے چیلے سے چار ضربیں لگا کر اسے ٹھنڈا کر دیتا ہے:۔

"مسسرے جب تیرا کوئی بلویا نہیں تو توجی کر کیا کرے گا ش .... اس نے اس حالت میں آسمان کی طرف دیکھا اور۔۔ کھکھیا کر رو دیا۔

کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ ایک مختصر سے واقعے ایک ادنیٰ سے کتے کی موت پر بشیرا کا یہ جملہ اور یہ ردعمل اس قدر بھرپور تاثر چھوڑتا ہے کہ ہمیں یہاں بے ساختہ موپاساں کی یاد آتی ہے۔ موپاساں جیسے روز مرہ کی زندگی کے ادنیٰ ادنیٰ واقعات کو پیش کر کے آخر میں ایک جملے ایک اشارے میں قاری کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ دینے میں کمال حاصل تھا

یہاں بھی قاری دم بخود ہو کر رک جاتا ہے اور بشیرا کے اس احتجاج اس فریاد کے پورے وزن کو محسوس کرتا ہے۔ اس فریاد پر خود اس کے اپنے دل کے ساز بج اٹھتے ہیں۔ یہ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ علی ظہیر، بالو، بشیرا، خود غرض امارت، مظلوم افلاس، احتجاج کرتی ہوئی انسانیت، کے پرہول ہیولے ہمارے سامنے منڈلانے لگتے ہیں۔

تاثر کی انتہائی شدت کے علاوہ اس کہانی کا پلاٹ اس قدر گندھا اور کسا ہوا ہے کہ کہیں بھی کوئی جھول کوئی ڈھیلا پن نہیں محسوس ہوتا ہے، ہر کردار اقلیدس کے خطوط کی طرح اسی قدر ابھرتا ہے جتنا اسے ابھرنا چاہئے۔

جزئیات نگاری اور تحریر میں مصوری ابوالخطیب کا خاصہ ہے اس مختصر ترین کہانی میں بھی فنکار نے بالو کو محض علی ظہیر کا ریٹائرڈ کتا کہہ کر نہیں پیش کر دیا ہے بلکہ اس کی جسامت، اس کی صحت رنگ و روپ، بال، دم غرض ایک ایک تفصیل کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ بالو مع اپنے ماحول کے سامنے آجاتا ہے۔ یہاں اس کی مثال دینا ضروری ہے ورنہ بات تشنہ رہ جائے گی:۔

"سورج برابر ڈھل رہا تھا۔ بالو کے سنہری بال جو دھوپ میں چمک رہے تھے اب آہستہ آہستہ گہرے بھورے رنگ میں تبدیل ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ڈھلتے سورج کی زرد کرنیں اس کی بوڑھی بیٹھ پر سے کھیلتی کودتی اپنے گھر جا رہی تھیں۔ ہوا جو دوپہر سے شریر بچوں کی طرح محلے کے کوڑے کرکٹ کو ادھر ادھر پھینکتی پھر رہی تھی اب کچھ دیر کے لئے جا کر کہیں خاموش بیٹھ گئی تھی۔ گلی کے دوکانداروں نے ٹاٹ کے پردوں کو باندھنا شروع کر چکے تھے تاکہ شام کے لئے دوکانوں کو پھر سے سجائیں۔ کچھ لوگ اپنی دوکانوں کے سامنے میلے پانی سے چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ جب پانی کے کچھ ٹھنڈے چھینٹے بالو کی پیٹھ اور منہ پر پڑے تو اسے کچھ ہوش آیا۔ چونک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور دم ہلا کر بیٹھ پر سے پانی کو چاٹنے لگا۔"

منظر کشی، پلاٹ کے گندھاؤ اور اس فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ ہی ابوالخطیب چند مختصر جملوں میں بڑا شدید تاثر پیدا کر دیتا ہے

"جب وحشت کا جگر چیرا، میں نوری کو اس کی ماں پیٹ رہی

ہے۔ اس لئے نہیں کہ اسے نوری کی حرکت پر غصہ ہے بلکہ اس لئے کہ اسے
انسانی بےحسی پر شدید غصہ ہے:۔

" نوری کی ماں کے طمانچے پوری قوت کے ساتھ اس کے گال
پر پڑ رہے تھے اور سارا انسان زادوں کا ہجوم خاموش کھڑا اس ختم
نہ ہونے والی مار کو دیکھ رہا تھا۔ اس انسانی بےحسی پر نوری کی ماں
کو اور غصہ آگیا۔ اس نے اور طاقت سے اسے پیٹنا شروع کر دیا جیسے
وہ اس آدمیت کو مار مار کر جگا رہی ہو جو ظلم کے خلاف احتجاج بھی نہ
کر سکے، جس میں انسانیت کا احترام ہی نہ ہو۔ وہ پاگلوں کی طرح
اس کو پیٹتی رہی اور اس مہذب کالونی کے انسان یونہی کھڑے
اس لمبی مار کو دیکھتے رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یہاں حمیدن دھوبن کی نفسیات کا کتنا صحیح مطالعہ ہے وہ
اپنی بچی سے محبت کے باوجود اس کی بےگناہی پر یقین کے باوجود اسے
اس بری طرح پیٹنے پر مجبور ہے کیونکہ وہ ایک دھوبن ہے جس کی روزی کا
دار و مدار انہیں سیدانیوں اور پٹھانیوں کے میلے کپڑوں پر ہے ۔ اسے
بہرحال انکی تسکین خاطر کرنی ہے وہ ظلم کا آلہ کار بن کر خود اپنے اوپر ظلم
کر رہی ہے اور انسان زادوں کا ہجوم یہ تماشا دیکھ رہا ہے ۔ ان چند
جملوں میں تاثر کس قدر بھرپور ہے ۔ فنکاری کتنی حسین ہے یہ چند
جملے ایک احتجاج بھی ہیں۔ کڑی تنقید بھی اور ماتم بھی۔ احتجاج اس
ظلم کے خلاف جو مہذب انسان بےچون و چرا گوارا کر رہا ہے ۔ تنقید اس
مہذب انسان پر جو ظلم کو محض تماشہ سمجھ کر دیکھ رہا ہے۔ ماتم اس سوئی
ہوئی آدمیت کا جو باوجود کوشش کے ابھرنے سے قاصر ہے۔

ابوالخطیب کے ہاں کردار نگاری بہت ہی حقیقت پسندانہ
ہے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ انہیں کرداروں کو منتخب کرتا ہے جو اس
کے ماحول سے قریب تر ہوں اور جن کا مشاہدہ اور تجربہ
نے خود قریب سے کیا ہو۔ جن کے ماحول، بول چال، رہن سہن، عادا
و اطوار اور نفسیات سے وہ پوری طرح واقف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ
شیرا حلوائی، حمیدن دھوبن، منشی عنایت علی اور عبید فنکار بہت
جیتے جاگتے اور زندگی سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں انکے
رول کو قبول کرنے میں ذرہ برابر بھی تکلیف نہیں محسوس ہوتی ان تمام
کرداروں کا تفصیلی ذکر پہلے ہو چکا ہے اس لئے یہاں انکی مزید تفصیل
سے احتراز ہی بہتر ہے۔ ابوالخطیب نے بچوں کی نفسیات کا خاص
مطالعہ کیا ہے اور بچوں کی کردار نگاری میں بھی وہ بہت کامیاب ہے
"جب وحشت کا جگر چیرا" میں آٹھ یا نو سالہ نوری کا کردار ابتدا سے
آخر تک بہت ہی حقیقت پسندانہ ہے۔ اس تمام ظلم و ستم کے
باوجود جس کا وہ ابتدا سے آخر تک نشانہ بنتی رہی ہے اس کی معصومیت
اس کا خلوص اور محبت ہمیشہ غالب رہا ہے۔ چھوٹے بچے خودغرض
ہوتے ہیں اور اس کی مثال کلوا ہے لیکن بچیاں عموماً بےغرض محبت
فطرت سے حاصل کرتی ہیں۔ نوری کو آخر وقت تک اپنی واحد سہیلی
بانو کے حصہ کے کانچ کے ٹکڑے کا خیال پریشان رکھتا ہے آخر تمام ظلم
پٹتے رہنے کے بعد:۔

"اس نے آنکھوں کو پونچھا اور بانو کو بلانے اس کے گھر چلی گئی تھی
اس کا کانچ کا ٹکڑا اسے دیدے، بانو کے گھر جاتے ہوئے اس کی انگلی
برابر سر کے زخم کا جائزہ لینی جا رہی تھی۔"

(۵)

ابوالخطیب زبان کے معاملے میں نئے تجربات کا قائل ہے۔
ان دنوں زبان کے استعمال میں غیر ضروری اور غیر معمولی آزادی کی عام وبا
ہے۔ اس وبا کی ابتدا ہمارے نام نہاد ترقی پسندوں نے کی اور ایسی
نت نئی ترکیبوں، استعارات اور تشبیہات کا استعمال شروع کیا جو بعض
اوقات بھونڈی اور تمسخر انگیز اور انتہائی ناگوار معلوم ہوتی ہیں۔ اس وبا
سے کسی حد تک وہ لوگ بھی متاثر ہوئے جو تعمیر پسند کہلاتے ہیں۔ انہیں
میں ایک ابوالخطیب بھی ہے۔ زبان میں نئے تجربات کا میں مخالف
نہیں۔ زبان کی ترقی اور تنوع کا انحصار اسی پر ہے۔ قدما حرف آخر
نہ تھے کہ ہم ان سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتے۔ ان کی مثال پیران تسمہ پا
کی نہیں۔ انھوں نے خود کتنے تجربات کئے اور زبان کو فروغ دیا لیکن ان
تجربات میں کھلی چھوٹ اور بے لگام آزادی مناسب نہیں۔ زبان ہی
ادب کا ذریعہ اظہار ہے۔ اسی کی پاکیزگی اور حسن پر بڑی حد تک اس
کے حسن کا انحصار ہے۔ ادب سے حسن اگر رخصت ہو جائے یا مجروح
ہو جائے تو ادب گر جاتا ہے۔ اس لئے اس معاملے میں بہت احتیاط

کی ضرورت ہے۔ موضوعات اور ان کا نبھاؤ (Treatment) وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے ماضی کے اکثر ادیب و شاعر اپنی اپیل کھو بیٹھتے ہیں لیکن ان کا اسلوب زندہ رہتا ہے۔ سودا اور ذوق کے قصیدے اس دور کے لئے بالکل ہی غیر مانوس ہیں۔ آئندہ شاید ہمیں نظیر معلوم ہوں لیکن ان کا اسلوب ہمیشہ زندہ رہے گا اور اسلوب کی خاطر ان کا مطالعہ کرنا ہی پڑے گا موضوع بدل جاتا ہے۔ ختم ہو جاتا ہے مگر اسلوب باقی رہتا ہے بشرطیکہ جاندار اور حسین ہو۔

ابوالخطیب کا اس معاملے میں ایک مخصوص رویہ رہا ہے جو اکثر ہٹ دھرمی کو پہنچ گیا ہے۔ ہٹ دھرمی سے انا (ego) کی تسکین تو ہو سکتی ہے مگر اس کے نقصانات مسلم ہیں۔ یہاں میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کروں گا جن میں احتیاط کا دامن چھوٹ گیا ہے اور اجتہاد کا جوش بہت حاوی ہو گیا ہے مشکل یہ ہے کہ تشبیہات و استعارات کے استعمال میں قواعد کے اصولوں کے ساتھ ساتھ بڑی حد تک محسوسات کو بھی دخل ہے ہر دور کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ انسانی نفسیات پیچیدہ اور گنجلک ہوتی جاتی ہے تو اس کے محسوسات میں بھی عجیب پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ حسن کا کوئی خاص معیار کبھی متعین نہ ہو سکا۔ حسن اگر خارج میں ہے (Objective) تو بڑی حد تک داخلیت ——— (Subjectivity) کو بھی اس میں دخل ہے۔ داخلی کیفیات میں فرداً فرداً اختلاف ہو سکتا ہے اور اس لحاظ سے خارجی عوامل کا ردعمل بھی مختلف ہو سکتا ہے۔ جب ردعمل میں اختلاف ہو سکتا ہے تو محسوسات اور ان کے اظہار میں بھی ہو سکتا ہے۔ اب سوال وجدان (Intuition) کا رہ جاتا ہے۔ لیکن وجدان بھی کوئی اتنی قابل اعتبار چیز نہیں اس لئے کہ اس کا کوئی ایک معیار نہیں لطافت (Refineness) کا ذرا ذرا سا فرق مختلف افراد کے وجدان میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔ بہرحال بحث طویل ہے۔ اس پر کوئی وقیع رائے زبان کے مسلم الثبوت اساتذہ ہی دے سکتے ہیں مجھے کہنا صرف یہ ہے اس معاملہ میں نہ تو بہت ہی شدت پسندی مفید ہو گی نہ بالکل کھلی آزادی۔

ہاں تو میں مثالیں دینے کا ذکر کر رہا تھا۔ چند مثالیں یہ ہیں

"بالو کے بھورے بھورے ریشمی بال کیچڑ اور دھول میں چلنے کے باوجود ڈوبتے سورج کی زرد کرنوں میں بھیگنے کے سنہری بالوں کی طرح چمک رہے تھے"

یہاں اگر بالو کے بال کیچڑ اور دھول میں چکٹ نہ گئے ہوتے تو یہ مناسبت ٹھیک تھی مگر کتوں کے بال کیچڑ اور دھول میں چکٹ کر سیاہ ہو جاتے ہیں۔

"مکھیوں کا گچھا" گچھا عموماً بے جان چیزوں کا ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے ملی ہوں۔ خیریت ہے کہ 'خوشہ' نہیں کہا۔

"بھوک بھوک کار بالو کو کچل کر کچھ آگے کھڑی ہو گئی" فوری بریک سے کار کے رکنے کی آواز کو بھوک بھوک کہنا عجیب ہے۔

"بستر پر فکر و جنون کی بہت سی لکیریں الجھی ہوئی ڈور کی طرح بکھری پڑی تھیں"

"اس کے بالوں میں تیل پڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ اس کے سر پر کیلے کے پتوں کی طرح پڑے ہوئے تھے"

"چہرہ بوڑھی شفقت اور سنجیدگی سے چمک رہا تھا"

"کبھی کبھی اس کی چھوٹی چھوٹی بے رونق آنکھیں تڑپتے کیڑے کی طرح جھپکتیں"

"اس کے ذہن کے نگار خانے میں یہ سوال ایک الجھی ہوئی ڈور کی طرح پڑا ہوا تھا جس کی گرہیں اس میں وحشت پیدا کر رہی تھیں"

یہ چند مثالیں ہیں جو صرف دو افسانوں سے لی گئی ہیں اس طرح کی زبان ابوالخطیب نے افسانوں میں عام طور سے استعمال کی ہے جو انتہائی ناگوار معلوم ہوتی ہے۔

روشؔ صدیقی

فکرِ امروز

چاک اندیشۂ باطل کا گریباں کر دے
سینۂ شب سے عیاں صبحِ درخشاں کر دے

روشنئ سرِ ساحل تو ہوئی دُور کی بات
کوئی اس ظلمتِ طوفاں میں چراغاں کر دے

اے نسیمِ سحری توڑ دے زنجیرِ بہار!
آج کانٹوں کو بھی گلشن میں خراماں کر دے

وہی ہم رازِ مشیّت ہے جو، ہر مشکل کو
شانۂ سلسلۂ زلفِ پریشاں کر دے

نہیں شایانِ محبت سر و ساماں کی تلاش
تجھ کو اللہ حریفِ سر و ساماں کر دے

عہدِ حاضر ترے افکار کا زنداں ہی سہی
ہو سکے تجھ سے تو آرائشِ زنداں کر دے

مے نہیں درد سہی، زہر سہی، جھوم کے پی
تیرا انکار نہ ساقی کو پشیماں کر دے

غمِ دوراں، غمِ جاناں سے گزر کر اے دوست
آج ہر غم کو نثارِ غمِ انساں کر دے

امنِ ساحل تری کشتی کے لئے رہزن ہے
جس طرح ہو اسے ساحل سے گریزاں کر دے

شیوۂ اہلِ جہاں، منکرِ احساں ہی سہی
تو ذرا اور بھی شرمندۂ احساں کر دے

عقلِ درماندہ کو ہے شکوۂ آزارِ حیات
ہمتِ عشق کو ہر درد کا درماں کر دے

لالہ و گل میں بھی وہ سوزِ نہاں ہے جو روشؔ
بجلیوں کو بھی گلستاں کا نگہباں کر دے

(نئی انسلس)

سراج لکھنوی •

○

خلوص بندگی ہر جذبِ بے اماں لئے ہوئے کہیں میں اُڑ نہ جاؤں تیرا آستاں لئے ہوئے

نہ پوچھو دم بخود ہوں غم کی داستاں لئے ہوئے چبا رہا ہوں ہونٹ، قدرتِ بیاں لئے ہوئے

بھٹک گئی تیری دُھن مجھے کہاں کہاں لئے ہوئے بھٹک رہا ہوں زندگی کا کارواں لئے ہوئے

ارادۂ بیاں کیا ہی تھا کہ ہونٹ جل اُٹھے نظر میں ہوں تجلیوں کی داستاں لئے ہوئے

بتائے کوئی جائیں اب خرابۂ جہاں کدھر قفس دھواں لئے ہے، آگ آشیاں لئے ہوئے

نشاطِ عہدِ رفتہ، تجھکو بھولنا محال ہے لبِ سحر بھی، شام کی ہر داستاں لئے ہوئے

جو سانس ہے، سنان و تیر کی خلش سے کم نہیں نزاکتیں ہیں غم کی، بارِ امتحاں لئے ہوئے

دعا کرو، کلی کی، پھول کی چمن کی خیر ہو حریفِ برق ہوں، پروں پر آشیاں لئے ہوئے

دلِ شکستہ صبر کر کہ خود کشی ہے بزدلی ہوں اپنے سر بہت سی ذمہ داریاں لئے ہوئے

زبان خشک سی، سلے سلے سے ہونٹ ہیں ابھی تو دل میں ہوں حسابِ دوستاں لئے ہوئے

شکستہ پا ہیں آج رہنے والے اس دیار کے زمیں جہاں کی تھی مزاجِ آسماں لئے ہوئے

یہ فیض ہے سراج کس کی گرمیٔ نگاہ کا

نفس نفس ہے اک حیاتِ جاوداں لئے ہوئے

(بشکریہ الحمراء)

حسین باقر علیم

بھائی جان

میرا بڑا بھائی مجھ سے دو سال بڑا ہے۔ آپ دیکھئے نا، بڑے بھائی کو عمر کے اتنے سے تفاوت کے باعث وہ مقام تو مل نہیں سکتا جو فی الحقیقت والد کے قائم مقام بڑے بھائی کا ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر میں اپنے بڑے بھائی کو نام سے پکارتا تھا تو کوئی خاص جرم تو نہ کرتا تھا مگر میرے بڑے بھائی نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اس کی یہ ضد رہی تھی کہ میں اسے سب چھوٹے بھائیوں کی طرح بھائی جان کہکر پکاروں، اس کا ادب کروں، اس کے احکام بجا لاؤں، یہ کروں، وہ کروں، یہ مقدمہ کتنی ہی مرتبہ والدہ صاحبہ کی عدالت میں پیش ہوا۔

"اختر تم نے باقر کو کیوں پیٹا ہے؟"

"امی سب لڑکوں کے سامنے مجھے اختر کہہ کر پکارتا ہے۔"

چونکہ میں روز زیادہ زور سے رہا ہوتا تھا۔ اس لئے امی ایک ملکا سا تھپڑ بڑے بھائی کو جڑ دیتی تھیں۔ مجھے گود میں لے لیتی تھیں اور اسے دو چار سخت سست لفظ بھی سنا دیتیں۔ پھر مجھے سمجھانے لگتیں: "دیکھو تم سے بڑا ہے۔ تم اس کا ادب کیا کرو۔ ابا جان چھٹی آئیں گے تو کیا کہیں گے؟" میں ذرا غمگین لہجے میں کہتا: "امی بڑا کب ہے۔ میں بھی تو اتنا ہی بڑا ہوں۔"

امی کہتیں "اچھا اچھا روؤ نہیں۔"

میری طبیعت ٹھیک ہو جاتی تو بڑے بھائی کی طرف متوجہ ہوتیں جو ایک چارپائی پر اوندھا لیٹا ہوتا۔ "اختر میرے لال، چھوٹے بھائیوں کو پیٹا نہیں کرتے۔ دیکھو نا وہ چھوٹا ہے تم سے۔ جب ذرا بڑا ہو جائے گا تو سب ادب قواعد سیکھ جائے گا۔ تمہیں بھائی جان کہہ کر پکارا کرے گا۔ تمہارے جوتے اٹھایا کرے گا۔ وہ تو تمہارا غلام" بھلا بڑے بھائی کا غصہ بھی فرد ہو جاتا۔ مگر دو چار دن کے بعد اسی قسم کا ہنگامہ پھر پیدا ہو جاتا۔

کچھ میں شروع ہی سے بھائی کے بارے میں ادب اور آداب کا قائل نہ تھا، کچھ بھائی کا مزاج آمرانہ تھا۔ بس صبح ہوتے ہی لڑائی شروع ہو جاتی۔ میں ابھی سو رہا ہوتا کہ بڑا بھائی ذرا دو منٹ پہلے جاگ اٹھتا۔

"امی باقر کو جگاؤں۔ سکول جانے میں دیر ہو جائے گی۔"

"ہاں بیٹا۔"

اور وہ ایک جھٹکے سے پوری رضائی سر کی طرف سے کھینچ کر پاؤں کی طرف لے جاتا۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ ایک آنکھ دیکھتا کہ کس نے یہ حرکت کی ہے اور پھر رونا شروع کر دیتا۔ امی مصلے سے اسے سخت سست کہتی اتر آتیں۔ انہیں یقین ہو جاتا کہ بڑے بھائی نے جگاتے وقت ضرور کوئی حرکت کی ہے۔ سکول کے راستہ میں البتہ میں پچھتا۔

"آہستہ کیوں چل رہے ہو؟ پہلی گھنٹی ہو چکی ہے۔ بستہ زور سے کیوں گرایا ہے؟ سلیٹ ٹوٹ گئی ہو گی۔" "بستہ سر پر رکھو۔ بغل میں ٹیڑھا کیوں دبایا ہے؟ دوات سے سیاہی بہہ جائے گی۔"

ہمارا اسکول دوسرے گاؤں میں تھا۔ کوئی ایک میل کے فاصلے پر اتنا لمبا راستہ بڑی مشکل سے کٹتا۔ بڑا بھائی مجھے اپنے ہم جماعت لڑکوں کے ساتھ چلنے سے روکتا گھر واپس آ کر میری باری ہوتی۔ میں حویلی کے دروازے میں قدم رکھتے ہی رونا شروع کر دیتا اور بڑے بھائی کو لعنت ملامت شروع ہو جاتی۔

چونکہ دشمنی تو ہو ہی گئی تھی۔ اس لئے میں کوئی موقع بڑے بھائی کو نیچا دکھانے کا ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ میں چھوٹا تھا۔ اس لئے گھر میں میرے وورٹ زیادہ تھے۔ میں جو بات کہتا۔ سچ مان لی جاتی۔

ایک شام ہم سکول سے واپس آئے تو امی جان کو راستے کی ایک لڑائی کا میں نے پورا پورا حال سنایا۔

"امی جب ہم اپنے لنبڑ کے پاس پہنچے تو سب لڑکے دوڑ پڑا

ہر ایک چاہتا تھا کہ میں پہلے پانی پی لوں۔ پیاس سب کو لگ رہی تھی۔ کرمے موچی کا لڑکا دوڑ کر اختر سے پہلے گیا مگر اس نے اسے پانی نہ پینے دیا کہ ہمارا کنواں ہے۔ میں پہلے پانی پیوں گا۔ اس نے لوٹا نہ چھوڑا تو اختر نے تھپڑ مار کر چھین لیا۔ وہ لڑکا سارے رستے ماں بہن کی گالیاں دیتا آیا۔ شام کا وقت تھا۔ بڑا بھائی پٹنے سے تو بچ گیا مگر ڈانٹ ڈپٹ خوب ہوئی۔ کم از کم میری تسلی ہو گئی۔

ایک دن بڑا بھائی ریاضی کا کام کئے بغیر رات کو سو گیا تھا۔ ریاضی کے ماسٹر صاحب سلیپر پہن کر آتے تھے اور کام چوروں کی اس سے مرمت کیا کرتے تھے۔ بھائی کے دو اور ساتھیوں نے بھی کام نہیں کیا تھا۔ ان لوگوں نے سکول سے بھاگنے کا پروگرام بنایا۔ اب چونکہ میں ساتھ تھا۔ اس لئے میرے متعلق بھی کچھ فیصلہ کرنا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ "دیکھو آج تو سکول میں چھٹی ہے۔ ہم تو گھر سے اس لئے آ گئے ہیں کہ اپنے نمبر دار کے پر شہتوت کھائیں گے۔"

میں نے کہا: "میں شہتوت نہیں کھاتا۔ میں تو گھر جاؤں گا۔"

مگر ان تینوں نے چکنی چپڑی باتیں کر کے شہتوت کے درخت کے نیچے میرا بستہ بھی رکھوا لیا۔ ہم جب گھر واپس آئے تو تقریباً وہی وقت تھا جو سکول سے چھٹی کا ہوتا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ سب فریب ہے مگر میں اب تک پٹائی کے ڈر سے خاموش رہا تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے ساری بات الف سے ی تک کہہ دی۔ امی جان نے گاؤں کے ایک دو اور طالب علموں کو بلا کر تصدیق کی اور پھر بڑے بھائی کی وہ گت بنی کہ الامان۔ میرا خیال ہے، اس کا حال دیکھ کر میں بھی رونے لگ گیا تھا۔

اسی طرح ایک دن میرے بھائی اور اس کے دو دوستوں نے اتوار کو چکوال جانے کا پروگرام بنایا۔ ان دنوں وہاں کشتی سینما آیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہاں سینما آیا ہے مگر مجھے چکوال کے پروگرام سے بے خبر رکھا گیا۔ بڑے بھائی نے امی جان سے ہفتہ کی شام کو کہہ دیا: "امی جان! کل ناشتہ ذرا جلد تیار کر دیجئے گا، والی بال کی ٹیم چکوال جا رہی ہے۔"

صبح جب سب تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اور بڑا بھائی دوسرے ساتھیوں کو اکٹھا کرنے گھر سے نکل گیا تو میری آنکھ بھی کھل گئی۔ امی نے ذکر کیا تو میں نے انہیں بتایا کہ سکول کی ٹیم ویم چکوال نہیں جا رہی ہے۔ یہ لوگ سینما دیکھنے جا رہے ہیں۔ امی نے اسی وقت آدمی بھیج کر بڑے بھائی کو گھر بلا لیا اور پھر وہ سب کچھ ہوا جو عموماً ایسے حالات میں ہوتا ہے۔

ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات اکثر پیش آتے رہتے مگر جن دنوں والد صاحب گھر چھٹی پر ہوتے تو صورت حال بڑی خوفناک ہو جاتی۔ ایک شام کا واقعہ تو مجھے کل کی طرح یاد ہے۔ اس شام کو اچانک ابا جان پنڈی سے آ گئے۔ انہوں نے ابھی مشکل سے بوٹ اتارا تھا کہ میں دوڑا دوڑا گیا۔ بڑے بھائی کا بستہ کھولا۔ اس میں سے تاش نکالا اور لا کر ابا جان کے سامنے پیش کر دیا۔ بڑا بھائی گھر میں نہ تھا۔ باہر سے کھیل کر آیا تو پتہ چلا کہ ابا جان آئے ہیں۔ سیدھا ان کے پاس گیا۔ گھٹنے چھونے کے لئے آگے بڑھا تو کمر پر دو کرارا ہاتھ پڑا کہ بے چارہ دوہرا ہو کر رہ گیا۔

ہماری صبح و شام اسی طرح گزرتی رہی۔ حتیٰ کہ دو تین سال کے فرق سے ہم دونوں نے انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا۔ بڑے بھائی کو ابا جان نے پاس ہوتے ہی نوکر کرا دیا۔ تیسرے سال جب میں بھی کامیاب ہو گیا تو ابا جان کی پیشگی کوشش سے مجھے فوراً سی۔ ایم۔ اے کے دفتر میں ایک آسامی مل گئی۔ بڑا بھائی جہلم کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں تھا اور میں راولپنڈی میں۔ اب بھی اگرچہ ہم کبھی کبھار چھٹیوں میں اکٹھے ہوتے تھے مگر پھر بھی ہماری دیرینہ "عداوت" ختم نہ ہوئی تھی۔ چھٹی کا زمانہ بھی نت نئے جھگڑوں میں کٹ جاتا۔ بڑے بھائی کی وہ ضد بدستور تھی کہ میں اسے بھائی جان کہہ کر کیوں نہیں پکارتا۔ اتفاق سے مجھے شروع ہی میں اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ میری تنخواہ بھی بڑے بھائی سے کچھ زیادہ تھی۔ اس لئے میں کچھ اور باغی باغی رہنے لگا۔

ایک دو سال ہی گزرے تھے کہ ہم ابا جان کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ ابا جان دسمبر کی تعطیل میں گھر آئے ہوئے تھے کہ نمونیا میں مبتلا ہو گئے اور دوسرے، تیسرے دن چل بسے۔ میں راولپنڈی سے روتا پیٹتا آیا اور بڑے بھائی جہلم سے۔ ہم چھ سات دن اکٹھے گھر رہے، مگر کچھ حالت ایسی تھی کہ ہم لڑ جھگڑ نہ سکے۔ بڑے بھائی کی چھٹی تھوڑی تھی۔ وہ چھ سات دن رہ کر جہلم چلا گیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے ایک خط ملا۔ بڑے بھائی کا تھا: "تو

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کبھی ہماری خط و کتابت نہ ہوئی تھی ——
لکھا تھا!

"پیارے بھائی، اب تمہاری چھٹی ختم ہونے والی ہوگی اور تم ایک دو دن میں پنڈی واپس چلے جاؤ گے میں نے گاؤں سے آتے ہوئے محسوس کیا تھا کہ تمہاری صحت کچھ خراب رہتی ہے۔ تم اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔ گھر سے کافی گھی ساتھ لے جانا اور پنڈی جاکر دودھ اور پھل کا استعمال بکثرت کرنا۔ میں امی جان کو خط لکھ رہا ہوں۔ تم اب گھر پیسے نہ بھیجنا۔ جب تک تمہاری صحت پوری طرح قابل اطمینان نہ ہو جائے۔

میرے آنے سے دو دن پہلے تم امی جان سے سائیکل کی ضرورت کا ذکر کر رہے تھے۔ میں تمہیں ستّو روپے گاؤں کے پتے سے بھیج رہا ہوں اور اگلے مہینے چالیس اور بھیج دوں گا۔ تم کوئی اچھی سی سائیکل لے لینا۔ —— (تمہارا اختر)

جب یہ خط ملا تو برآمدے میں گھر کے سب افراد اور کچھ رشتہ دار بھی جمع تھے۔ سب پوچھ رہے تھے "کس کا خط ہے؟ کس کا خط ہے؟" مگر میں خط پڑھنے میں کچھ ایسا محو تھا کہ ختم ہونے تک مجھے جواب دینے کا ہوش نہ تھا۔ امی جان نے ایک بار پھر پوچھا: "کس کا خط ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟"

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں سب کو بتایا "بھائی جان کا" اس وقت میں ہنس رہا تھا اور میری آنکھوں میں آنسوؤں کا دریا موجزن تھا۔

امی جان نے سن تو لیا تھا، مسکراتے ہوئے ایک بار پھر پوچھا "کس کا؟"

رقت اور خوشی نے میرا گلا پکڑ رکھا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا "بھائی جان کا!" اور میری آنکھوں سے دو خوشی کے موٹے موٹے آنسو چھلک کر باہر آپڑے۔ سب لوگ حیرت سے میرا منہ تکنے لگے۔

بشکریہ "الحمرا"

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری اکتوبر سنہ ۵۶ء کے اس شمارے کیساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں، یا پھر خط کے ذریعے اطلاع دیں آپکی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی۔ پی (V. P.) مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

منتظر کرم۔ مینجر ماہنامہ شیر کراچی

۲۰۷۹ مسعود الانعام ہاری صاحب کراچی	۲۲۵۴ محمد الٰہی صاحب شہداد پور
۲۲۲۵ مقبول احمد صاحب بھوپال	۲۲۵۹ محمد ناشر صاحب، کراچی
۲۲۳۰ چودھری محمد دین صاحب گوجرانوالہ	۲۳۹۵ محمد احمد خان صاحب راولپنڈی
۲۲۳۷ محمد یونس صاحب کراچی	۲۴۰۰ ایم۔ این نواب صاحب کراچی
۲۲۴۱ خواجہ محمود احمد صاحب لاہور	۲۴۰۲ مسز صفیہ آزاد صاحبہ کراچی
۲۲۴۹ ڈاکٹر قیوم سعادت صاحب کراچی	۲۴۰۶ بیگم روح الامین صاحبہ سیالکوٹ
۲۲۵۱ ہیڈ ماسٹر صاحب لائل پور	۲۵۱۹ زین العابدین صاحب کھلنا

عزیز حمیدی

گُھٹ رہا ہے بلبلِ محزوں کی بے بسی کا پتا
خزاں سے پوچھ رہی ہے وہ زندگی کا پتا

بتاؤں راہ نماؤں کی کج روی کا پتا
سحر ملی، نہ ملا کچھ بھی روشنی کا پتا

ہر ایک رند پکارے گا نام ساقی کا
ہر ایک جام بتائے گا میکشی کا پتا

قفس کی تیلیاں چبھتی ہیں خار بن بن کر
چمن بھی دے نہ سکا مجھکو زندگی کا پتا

ہمیں تمہاری قیادت پہ ناز ہے لیکن
غبارِ راہ بتاتا ہے رہزنی کا پتا

ہماری لاش کو دیکھا تو رو پڑے وہ بھی
اسی ادا سے تو ملتا ہے دل لگی کا پتا

نہ صرف خاکِ شہیداں نے بھید کھولا ہے
قدم قدم پہ ملا شانِ رہبری کا پتا

خزاں کو جس نے بشکلِ بہار دیکھا ہو
نہ پوچھو ایسے شگوفوں کی بے کلی کا پتا

کھلے جو زخم ہمارے تو ہنس پڑی دنیا
اسی سے ملتا ہے اخلاصِ دوستی کا پتا

نسیمِ صبح کے جھونکے ہیں یا کہ بادِ سموم
ملا نہ مجھ کو گلوں کی شگفتگی کا پتا

گلوں کی سیج ہے، ساغر ہیں، دورِ عشرت ہے
لگائے کون گلستاں کی دشمنی کا پتا

بہ پاسِ خاطرِ احباب کتنے ہنستے ہیں
خرد کو مل نہ سکے گا مری ہنسی کا پتا

جنوں نوازیاں جس جا بنیں سکوں کا پیام
بتائے اب ہمیں کوئی تو اس گلی کا پتا

لہو کے چھینٹوں سے دامن ہی آج بھی رنگیں
جفا مٹا نہ سکی میری دوستی کا پتا

ٹھہر جا گردشِ دوراں، ٹھہر جا نبضِ حیات
بہارِ تیغ بتائے گی بے رخی کا پتا

محیطِ ابر ہیں جیسے ہو برق جلوہ فگن
اندھیری شب میں ملا مجھ کو روشنی کا پتا

عزیز ان کے ہی دامن کی بات کہتا ہوں
یہی تو دیں گے شگوفوں کی زندگی کا پتا

کہانی: شیلا کیۓ سمتھ
ڈرامائی تشکیل: جان ہمپڈن
ترجمہ: شفقت تنویر میرزا

مسز ایڈسس

کردار: مسز ایڈس ——
وڈلر ——
پیٹر گرادچ ——
ٹام ایڈس ——
قیمپ ——
ہاڈن ——

منظر:- چھوٹا سا مکان، باہر اکتوبر کی سرد رات، سال کا اوّلیں کُہرا۔ جو نپر ہیی کے اردگرد سوسکس کے علاقہ کے سیاہ اور خاموش چوبی ستون۔ مسز ایڈس کا چولھا گرم ہے۔ میز پر تیل سے جلنے والا چھوٹا لیمپ جل رہا ہے۔ جس کی روشنی چھت اور دیواروں کے بلستر پر بخوبی پڑ رہی ہے۔ کھلے چولھے میں لکڑیاں جل رہی ہیں۔ آتشدان باورچی خانے کی دائیں جانب ہے۔ اس کے ذرا دھر کھلنے والی میز رکھی ہے۔ اردگرد دو کرسیاں .... یونہی رکھی ہیں جیسے ابھی کسی کو کھانا کھانا ہو۔ پچھلی دیوار میں چھوٹی سی کھڑکی ہے جس پر پردہ تو نہیں البتہ ایک انتہائی بوسیدہ سا چیتھڑا لٹک رہا ہے جس سے کھڑکی کا نصف حصہ چھپا ہوا ہے۔ اوپر کے حصہ کے شیشوں میں تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ کھڑکی کی دائیں جانب مکان کا دروازہ ہے جو سڑک کے ساتھ گھاس کی ایک پٹی پر کھلتا ہے ایں جانب کی دیوار میں سے ایک دروازہ لان میں کھلتا ہوا اور دوسرا دروازہ خواب گاہ میں۔ فرش گھسی ہوئی سرخ اینٹوں کا ہے۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو مسز ایڈس ساس پان کو چولھے میں رکھے اس پر جھکی ہوئی نظر آتی ہے۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ چولھے کے پاس رکھی ہوئی تیلیوں کی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ایک ٹکڑے کو کاٹتی ہے۔ اب وہ ہمیں پوری طرح نظر آ رہی ہے۔ اس کا قد چھوٹا۔ رنگ بادامی، چہرا سخت، نظر پریشان، چہرے پر بالوں الیسی لاتعداد جھریاں ہیں عمر بیالیس[۴۲] سے زیادہ نہیں مگر علاقہ سوسکس میں عورتوں کی پریشان حال زندگی کی وجہ سے اس کی کایا پلٹی ہوئی ہے ایڈس عام عورتوں سے بھی زیادہ دکھی اور عمر رسیدہ معلوم ہوتی ہے۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے ایک آدمی کا چہرہ نظر آتا ہے۔ وہ سر کو گھوم پھرا کر دیکھتا ہے کہ مسز ایڈس کے پاس کوئی اور تو نہیں۔ مطمئن ہو کر غائب ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے اور وہی شخص باورچی خانے میں داخل ہوتا ہے۔ دروازے کو بند کر لیتا ہے۔ وہ طویل قامت اور بھرے جسم کا آدمی ہے۔ بال سرخ اور چہرا فدا ہے۔ محنت کش طبقہ کا ناکام فرد معلوم ہوتا ہے۔ اس کے چہرے کی سختی اور افلاس سے اس کی ناکام زندگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ سر ننگا ہے۔

مسز ایڈس اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور بڑی تیزی سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہے۔ انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اجنبی کے آنے سے ناخوش ہے)

مسزایڈس :۔ ارے پیٹر کراؤچ تم ہو! تم نے دروازہ تو نہیں کھٹکھٹایا
کراؤچ :۔ (قدرے گھبرا کر کمرے میں درمیان میں آتا ہے) ہاں .....
میں نہیں چاہتا کہ کھٹکھٹاہٹ کوئی اور سن لے۔
مسزایڈس :۔ مگر کیوں؟
کراؤچ :۔ (اس کے ہاتھ آہستہ سے ہلتے ہیں) میں ایک مصیبت
میں ہوں۔
مسزایڈس :۔ کیا کیا ہے تم نے؟
کراؤچ :۔ ایک شخص کو گولی ماردی ہے۔
مسزایڈس :۔ تم نے؟
کراؤچ :۔ ہاں!
مسزایڈس :۔ یعنی تم نے اسے قتل کردیا ہے؟
کراؤچ :۔ ہاں!
(لمحہ بھر کے لئے خاموشی رہتی ہے۔ اچانک مسزایڈس
کو کھانے کا خیال آتا ہے وہ ساس پان چولھے سے اٹھاتی
ہے اور ایک طرف رکھ دیتی ہے۔ کراؤچ ہاتھوں کو مروڑتا
ہوا بڑی پریشانی سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔ جب وہ
پھر اس کی طرف مڑتی ہے تو بڑی ترشی سے بولتی ہے
مسزایڈس :۔ پیٹر کراؤچ، اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟
کراؤچ :۔ (گڑگڑاتے ہوئے) بس تھوڑی دیر یہاں ٹھہرنے دیجئے
ان کے نکل جانے تک چھپنے کی اور کوئی جگہ نہیں۔
مسزایڈس :۔ کون ہیں وہ؟
کراؤچ :۔ "محافظ"
مسزایڈس :۔ محافظ تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں؟
کراؤچ :۔ ہاں .... سنڈر کے جنگل میں شکار کرنے گیا تھا۔
انھوں نے دیکھ لیا۔ وہ چار تھے ہیں ایک ... میں نے بندوق
داغ دی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اب وہ میرے پیچھے ہیں.......
نزدیک ہی ہوں گے۔
(مسزایڈس تھوڑی دیر خاموش رہتی ہے۔ کراؤچ اسے بڑی
رحم طلب نظروں سے دیکھتا ہے۔)

کراؤچ :۔ ٹام کے صدقہ میں مجھے پناہ دے دو۔
مسزایڈس :۔ تم ٹام کے اچھے دوست نہیں۔ تم نے ہمیشہ اسے گمراہ
کرنے کی کوشش کی۔ اور اس کا باپ اسی غم میں مرگیا۔
کراؤچ :۔ نہیں مسزایڈس .... میں نے کبھی ایسا نہیں کیا
مجھے تو ہمیشہ ٹام کا خیال رہا ہے۔ اسے کوئی غلط راستے پر
نہیں ڈال سکتا.......... ویسے ٹام اسکول کے دنوں سے
میرا اچھا دوست ہے۔
مسزایڈس :۔ تم سے زیادہ یہ اس کی اپنی حماقت ہے۔ خیر عرصہ ہوا
تمہاری کوئی خبر خیریت نہیں سنی۔
کراؤچ :۔ عرصہ سے میرا ستارہ بھی گردش میں ہے۔ تین سال
پیشتر مجھے کام سے جواب مل گیا تھا۔
مسزایڈس :۔ (پُر معنی انداز میں) مگر مسز نکیل نے تمہیں کیوں
نکال دیا تھا؟
(کراؤچ شرم سے آنکھیں نیچی کرلیتا ہے۔ پھر بولنے
کی کوشش کرتا ہے۔)
کراؤچ :۔ اپنی لڑکی کے علاوہ دنیا میں میرا صرف ایک دوست ہے....
اور وہ ہے ٹام .... اس دنیا میں میرا اور کوئی نہیں۔
مسزایڈس :۔ (تیزی سے) کون لڑکی؟
کراؤچ :۔ اینے ونز........ وہ ٹائیس ہسرٹ میں رہتی ہے۔
مسزایڈس :۔ اچھا تو اینے تمہارے ساتھ رہتی ہے؟ (بڑی نرمی سے) اگر
اپنے ماں پر گئی تو تمہیں اب بھی انسان بنا دے گی۔
کراؤچ :۔ ہاں ہاں وہ جتنی پیاری ہے اتنی ہی اچھی بھی ..... وہ ---
(کپکپاہٹ سے رک جاتا ہے۔ اور جلدی سے دروازے
کی طرف جاتا ہے۔ بڑے مضمحل انداز سے کچھ سنتا ہے ---
مسزایڈس بھی سنتی ہے۔ انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ وہ
پھر ایڈس کے پاس آکر پہلے سے بھی زیادہ ملتجیانہ انداز
میں باتیں کرتا ہے)
کراؤچ :۔ وہ ابھی میرے تعاقب میں ہوں گے..... اگر میں اس مشکل
سے نکل گیا تو اینے میرے ساتھ آئے گی..... مادام مجھے یقین

ہے وہ ضرور آئے گی مگر میں آج رات ٹامائیں ہرسٹ نہیں پہنچ
سکتا۔ مجھے یہاں ہی آنا تھا...... ٹام ہوتا تو میری طرفداری
کرتا........

مسز ایڈس:۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ ٹام ایسا نہ کرتا...... وہ ہمیشہ تمہاری
بہتری سوچتا رہا ہے...... اگرچہ تم اس کے مستحق کم ہی ہو۔
ہاں آج رات اس کی واپسی تک تم یہاں ٹھہر سکتے ہو۔ جب وہ
آئے گا پھر دیکھا جائے گا۔

کراوچ:۔ بس مجھے یہی چاہئے...... تقریباً گھنٹے بھر تک وہ آئرن
برج میں ہوگا...... اس وقت ساحل صاف ہو جائے
گا۔ میں یہاں سے بھاگ سکوں گا۔

مسز ایڈس:۔ تم جاؤ گے کہاں؟

کراوچ:۔ میں...... کہیں چلا جاؤں گا...... یہ سوچنے
کے لئے کافی وقت ہے......

مسز ایڈس:۔ (سرد مہری سے) ٹھیک ہے، یہاں بیٹھ کر سوچ لو (بات
ختم کرتے ہی جا کر دالان کا دروازہ کھول دیتی ہے) انہیں سان
گمان بھی نہ ہوگا کہ تم یہاں ہو۔ میں کہوں گی میں نے تمہیں
آج رات دیکھا ہی نہیں...... انہیں یقین آجائے گا...
یہاں بڑا اندھیرا اور گرد ہے۔ مگر چاہو تو دروازے کے سوراخ
سے سب کچھ دیکھ سکتے ہو......

کراوچ:۔ (دروازے کی طرف) مسز ایڈس آپ کتنی اچھی ہیں......
میں جانتا ہوں میں یہاں ٹھہرنے کا مستحق نہیں.... اگر ٹام
کی طرح میری ماں بھی آپ جیسی ہوتی تو میں بڑا مختلف ہوتا۔
میں کبھی نہ بھولوں گا۔

مسز ایڈس:۔ (ہاتھ کھلے ہوئے دروازے پر رکھتے ہوئے) خاموش!

(مدھم مدھم آوازیں آتی ہیں۔ کراوچ اندرونی کمرے میں
گھس جاتا ہے۔ مسز ایڈس دروازہ بند کرکے آتش دان
کے پاس آجاتی ہے، اور سانس روک کر جھک کر آوازوں
کو غور سے سنتی ہے۔ مکان کے سامنے سے آدمیوں کی
باتیں اور قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ لالٹین کی
روشنی کھڑکی کے شیشوں پر پڑتی ہے۔ دروازے پر
دستک نہیں ہوتی آوازیں گذر جاتی ہیں مسز ایڈس
کھڑکی میں جاکر ان لوگوں کو دیکھتی ہے۔ پھر اندرونی
کمرے کے دروازے کو کھول دیتی ہے۔ پیٹر کراوچ کانپتا
ہوا باہر نکلتا ہے۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا ہے)

مسز ایڈس:۔ (تیزی سے) وہی تھے...... قلعے سے آرہے ہیں۔

کراوچ:۔ میں نے ان کی باتیں سنی ہیں۔ آپ کو کھڑکی کی طرف جاتے
بھی دیکھا تھا......

مسز ایڈس:۔ (اسے نظر انداز کرتے ہوئے) ان کے پاس لالٹین تھی..
ساتھ بڈھا کراچ اور دو لوڈن تھے...... بہتر ہے اب بھاگ
کر کنہسر دن چلے جاؤ۔ پھر بچ کر کینٹ پہنچ جاؤ گے..... دس بجے
وہاں سے لندن جانے والی گاڑی پکڑ لینا جو ٹن برج سے آتی ہو

کراوچ:۔ (گھبرا کر) بڑی اچھی تجویز ہے مگر ٹکٹ کے لئے روپیہ.....
نہیں.......

(مسز ایڈس میز کے پاس جاکر دراز کھول کر پیسے نکالتی
ہے..... وہ بھی ہچکچاتے ہوئے اس کے پیچھے
جاتا ہے۔ مگر درمیان میں رک جاتا ہے)

مسز ایڈس:۔ یہ لو سات شلنگ! لندن تک کا کرایہ اور کچھ اوپر

کراوچ:۔ (رقم جیب میں ڈال کر ہکلاتے ہوئے) مادام آپ کا شکریہ
کیسے ادا کروں؟

مسز ایڈس:۔ (اپنے آپ سے ناراض سی ہوکر) نہیں شکریئے کی ضرورت نہیں
میں سب کچھ ٹام کے لئے کر رہی ہوں...... میں جانتی
ہوں اسے تم سے کتنی ہمدردی ہے

کراوچ:۔ مجھے امید ہے آپ خطرے میں نہیں پڑیں گی۔

مسز ایڈس۔ نہیں۔ اتنے ڈر کی کیا ضرورت ہے؟ کسی کو معلوم نہ ہو سکے
گا کہ تم یہاں آئے تھے۔ اسی لئے تو کہتی ہوں ٹام کے آنے سے
پہلے چلے جاؤ....... اس کا دوست اس کے ساتھ آئے
گا۔ راز افشا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ تو نہیں کہتی کہ قانون
سے بھاگنے میں تمہاری مدد کے بعد میرا ضمیر کیا کہتا ہے۔ ہاں

اگر تم نے سپاہی کی بجائے کسی اور کو مارا ہوتا تو زیادہ دکھ ہوتا۔
گو سپاہیوں میں بھی ہر کوئی برا نہیں ہوتا۔ پھر بھی اتنا رنج
نہیں ہوتا۔ میں اس کے متعلق زیادہ نہیں سوچوں گی۔

(دروازہ کھولتی ہے، دہلیز پر پاؤں رکھتے ہی پاس
آتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر پیچھے اچھل پڑتی ہے
اس کے چہرے پر خوف چھا جاتا ہے)

مسز ایڈس :۔ شاید ٹام ہوگا۔

کراؤچ :۔ (آہستہ سے) نہیں زیادہ آدمیوں کی آوازیں ہیں۔

مسز ایڈس :۔ (تیزی سے) جاؤ اسی کمرے میں چلے جاؤ۔ ان کے واپس
جانے کا انتظار کرو۔

(وہ دروازہ بند کر دیتی ہے۔ کراؤچ ناگوار انداز میں
پھر اسی کمرے میں چلا جاتا ہے۔ مسز ایڈس دروازہ
بند کر دیتی ہے۔ لحظہ بھر بعد جب مسز ایڈس چولھے
کے پاس کھڑی ہوتی ہے تو کراؤچ دروازہ کھول کر اسے
بلاتا ہے۔)

کراؤچ :۔ (مدھم اور خوفزدہ آواز میں) اگر وہ یہاں آگئے ....

مسز ایڈس :۔ (غصہ سے) تم اندر ہی رہو!

(وہ دروازہ بند کر دیتی ہے۔ پھر ایک اونچے طاقچے میں
سے ایک کنجی نکال کر دروازے کو مقفل کر دیتی ہے قفل
بند ہوتے ہی بڑا شور ہوتا ہے۔ وہ چابی پیش جامہ
کی جیب میں رکھ لیتی ہے اور چولھے کے پاس آجاتی
ہے۔ قدموں کی بھاری چاپ آہستہ آہستہ مکان
میں آتی ہے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔ پھر
دروازے پر زور سے دستک ہوتی ہے۔ مسز ایڈس
کے دروازہ کھولنے سے پیشتر وڈلر داخل ہوتا ہے اور
تیزی سے دروازہ بند کر دیتا ہے۔ وہ کمرے کے
درمیان میں آتا ہے۔ مسز ایڈس کو دیکھ کر تذبذب
میں پڑ جاتا ہے۔ ٹوپی کو بڑی پریشانی کی حالت میں
ہاتھوں سے مسلتا ہے۔)

مسز ایڈس :۔ (اسے غور سے دیکھتے ہوئے) کیا بات ہے؟

وڈلر :۔ بڑی بی مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے (پھر خاموش ہو جاتا ہے)

مسز ایڈس :۔ (تیزی سے) کہو کیا کہنا ہے؟

وڈلر :۔ بڑی منحوس خبر لایا ہوں!

مسز ایڈس :۔ (چہرے کے تاثرات بدل جاتے ہیں) کیا ٹام کے
متعلق تو نہیں؟

وڈلر :۔ وہ ...... وہ ...... وہ تو باہر ہے۔

مسز ایڈس :۔ کیا مطلب؟ (دروازے کی طرف بڑھتی ہے)

وڈلر :۔ (اسے روکتے ہوئے) نہیں مادام! جب تک میں آپ سے
نہ کہوں آپ نہ جائیں۔

مسز ایڈس :۔ (بڑی مایوسی سے اسے ہٹاتی ہے) مجھے بتاؤ کیا بات
ہے؟ جلدی کرو ...... خدا کے لئے جلدی بتاؤ ....

وڈلر :۔ سنڈر کے جنگل میں کوئی شخص خرگوشوں کا شکار کر رہا تھا
ٹام میں اور بڈھا کراؤچ بھی وہیں تھے۔ ہم نے آواز سنی بندوق
کا دھماکا سنائی دیا۔ تاریکی کے باعث کسی کو نہ دیکھ سکے۔
وہ بھاگ گیا ...... ہم نے تعاقب کیا ...... مگر وہ
وہ ...... اپنی بندوق چھوڑ کر بھاگ گیا۔
(رکتا ہے۔ مسز ایڈس کے چہرے پر اس طرح دیکھتا ہے
جیسے باقی کہانی وہ خود مکمل کر لے گی ...... وہ
اپنے آپ کو بھی بھول سا گیا ہے)

مسز ایڈس :۔ ٹام ......

(وہ دروازے تک پہنچ جاتی ہے اور اسے چوپٹ کھول
دیتی ہے۔ باہر کے آدمی بس اشارے کے منتظر تھے۔ وہ
پھر ان کے پاس سے مڑ کر واپس چولھے کے قریب آجاتی
ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اندر آجاتے ہیں ......
وہ ایک چارپائی پر کوئی شے اٹھائے ہوئے ہیں جسے
کمرے کے درمیان میں رکھ دیتے ہیں۔ یہ ٹام ایڈس
ہے جسم پر ایک پرانا کوٹ پڑا ہے۔ چہرہ ننگا ہے۔
مسز ایڈس تیلیوں کی کرسی پر جھکی ہوئی ہے ......

(تینوں آدمی ..... پاس کھڑے ہو جاتے ہیں)

مسز ایڈس :- (سرد مگر صاف لہجہ میں) وہ مر گیا ہے؟

(آدمی سر ہلاتے ہیں۔ وڈلر اس کے پاس جا کر اسے کرسی میں بٹھاتا ہے۔ قیمپ جیب سے ایک بوتل نکال کر میز پر رکھے ہوئے پیالہ میں کچھ ڈالتا ہے)

قیمپ :- (پیالے کو مسز ایڈس کے لبوں کے پاس لے جاتا ہے) بس ایک گھونٹ پیجئے۔ اس سے جسم میں طاقت آجائے گی.....

(وہ بڑے بے جان انداز میں پی لیتی ہے۔ وہ پیالہ ہٹا لیتا ہے)

ہاپڈن :- ہم آئرن بیچ کا پیچ جا کر مسز گرین کو یہاں بھیج دیں گے

قیمپ :- یہ سب کچھ کتنا خوفناک ہے۔ مگر خدا کی مرضی یہی تھی.... جس آدمی نے یہ فعل کیا ہے ہمیں اس کے متعلق کچھ کچھ اندازہ ہے۔ ہم اسے آخر پکڑ ہی لیں گے۔

ہاپڈن :- اس کا چہرہ تو نہیں دیکھا مگر بندوق ہمارے پاس ہے۔

وڈلر :- وہ بندوق چلا کر گڑھے میں پھینک گیا۔ میں تو قسم اٹھاتا ہوں۔ بندوق پیٹر کرادچ کی ہے۔ جب سے غائب ہے لے کر عرصہ مسٹر سکیل نے اسے نکال دیا ہے۔ وہ مارا مارا پھر رہا ہے۔

قیمپ :- اس وقت اسے خبر بھی کہ یہ ٹام ہے۔ ٹام نے ہمیشہ اس سے دوستی نباہی ہے۔ مگر پیٹر اس قابل نہ تھا۔

(مسز ایڈس ان کی باتیں نہیں سن رہی۔ وہ اپنے پاؤں کے ساتھ جدوجہد کر رہی ہے۔ ہاتھوں میں اسی کمرے کی چابی ہے۔ وہ اس طرف بڑھتی ہے۔ چابی اس کی کانپتی ہوئی انگلیوں سے نیچے پاؤں میں گر پڑتی ہے وہ لپک کر اسے اٹھا لیتی ہے۔ بڑی آہستگی مگر عجیب دلچسپی سے چابی کو دیکھتی ہے۔ پھر پیٹر والے کمرے کے دروازے پر دیکھتی ہے پھر وہ ٹام کے چہرے کو دیکھتی ہے۔ ایک عجیب سنسنی خیز وقفہ ہے۔ ہاپڈن بھی قیمپ اور وڈلر کے پاس کرسی کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ خوفزدہ آنکھوں کے ساتھ مسز ایڈس کو دیکھ رہے ہیں)

وڈلر :- (مزید خاموشی کو برداشت نہ کرتے ہوئے) پورمین کرادچ کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس کا خیال ہے وہ جنگل کے راستہ آئرن بیچ کو بھاگا ہے۔ اس لئے اس طرف آنے کا کوئی امکان نہیں۔ آپ نے تو آج رات اسے نہیں دیکھا؟

مسز ایڈس :- (آہستہ سے) نہیں...... مجھے نظر نہیں آیا... وہ تو بدھ کے دن سے مجھ سے نہیں ملا۔

ہاپڈن :- خیر..... ہم مسز گرین کو آپ کے ہاں بھیج دیں گے.... آپ کو اطمینان رہے گا.....

مسز ایڈس :- (ان کی طرف سے آہستہ سے مڑتے ہوئے مری جنبش سے) پہلے اسے تو اس کمرے میں رکھ دیں (وہ خواب گاہ کی طرف اشارہ کرتی ہے)

(وہ چارپائی اٹھا کر خواب گاہ میں لے جاتے ہیں... وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتی۔ جب وہ واپس مڑتے ہیں تب اس کے ہاتھ کو چھو کر باہر نکل جاتے ہیں جب تک دروازہ بند نہیں ہوتا وہ بے حس و حرکت خاموش کھڑی رہتی ہے پھر وہ پیٹر کے کمرے کے قفل کو کھولتی ہے۔ مضمحل چہرے اور بھاری بھاری بے ترتیب قدموں کے ساتھ خواب گاہ میں جا کر دروازہ بند کر لیتی ہے۔ مکمل خاموشی ہے...... دھیرے دروازہ کھلتا ہے اور پیٹر کرادچ باہر نکلتا ہے۔ وہ خوف سے نڈھال ہو رہا ہے۔ مگر مکان کے صدر دروازے سے باہر نکل کر غائب ہو جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

(بشکریہ "ہمایوں")

> خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے۔ تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان ہی نہ ہو۔ (منیجر)

شاکی ارشدی

فنکار

چھڑا جو ذکر کبھی سیمگوں اجالوں کا
تو بات میری شب تار تک پھر آپہنچی
جو ایک تلخ حقیقت ہے مجھ سے وابستہ
سنو کہ وہ لبِ اظہار تک پھر آپہنچی

بجا کہ اپنی ہی نقد و نظر کی کاوش سے
ملی ہیں ہم کو یہ آزادیاں گلستاں میں
جلا کے غم کی چتائیں امید کی کلیاں
بڑھائی روشنی جمہور کے شبستاں میں

بجا کہ میرا تخیل خرد کا ہے پابند
بجائے ذکرِ مئے نابِ غم کا رونا ہے
کسی کے حسنِ سراپا کی کیا کرے تعریف
نیازِ عشق کو رنج و الم کا رونا ہے

مگر یہ ہم نے اس ایثار کا صلہ پایا
کہ خود ہمیں میں کوئی موج زندگی نہ رہی
نئے چراغ جلانے کے باوجود اے دوست
خود اپنے گھر پہ مسلط ہے آج تاریکی

بہ فیض وقت یہ حالات کا تقاضا ہے
کہ میں خود اپنی ہی آہوں میں گھٹ کے مر جاؤں
سکوں جو مجھ کو میسر ہو نالۂ غم سے
تو کیسے نغمۂ عشرت زباں پہ میں لاؤں

وطن یہ میرا وطن اہلِ فن کا مدفن ہے
بیانِ حق سے وفاؤں پہ حرف آتا ہے
یہ ایک تلخ حقیقت ہے مجھ سے وابستہ
کہ میرا فن مجھے بھوکا کبھی سلاتا ہے

وہ فکر جو مرے گیتوں کی لے میں ڈھلتی ہے
کسی حسین تصور کی ترجمانی ہے
پلٹ کے دیکھئے جو میں نے کتاب دل کے ورق
یہ لوگ سمجھے کوئی اپنی ہی کہانی ہے

مگر یقین ہے اے دوست وقت آئے گا
خوشی کی لے میں مسرت کے گیت گاؤں گا
پھر ایسے حادثے ہونے نہ پائیں گے ہرگز
وطن کی خیر میں فنکار کو جلاؤں گا

(بشکریہ "افروز")

م۔ نسیم

انتہا سے پہلے!

"بیچ لگژری"

"مسٹر آرہن سے بات کرنا چاہتا ہوں"۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔ منیجر اس وقت موجود نہیں۔ میں اسسٹنٹ منیجر آپ کے لئے کچھ کر سکتا ہوں؟"

"اوہ مسٹر مینوسیتا؟ ہاں شکریہ۔ مسٹر ہن سے ۔ لیکن رہنے دیجئے میں خود بات کرلوں گا۔ جب آؤں گا۔ آپ کیا مہربانی سے میرے لئے دو کے ایک ٹیبل کو بک نہ کرسکیں گے؟ آج رات کے لئے؟"

"یقیناً بڑی خوشی سے جناب۔ آپ کا نام جناب؟"

"ٹوانہ۔ اے، ایچ ٹوانہ۔ اور مہربانی سے ٹیبل، رِنگ کے بالکل پاس ہو۔"

"یس سر، یقیناً۔ آپ بالکل یقین رکھیں۔ کیا میں سر آرہن کو آپ کے آنے کی اطلاع کردوں؟"

"نہیں ——— جیسا کہ میں نے کہا، میں خود آکر ان سے ملوں گا۔"

"بہتر جناب ——— اینڈ تھینک یو سر۔"

رسیور رکھ کر اس نے ایش ٹرے سے جلتا ہوا سگریٹ اٹھا لیا اور اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور ذرا سی دیر میں اسے دھوئیں کے بادل نے گھیر لیا۔

آسمان نیلی جارجٹ کے تنے ہوئے دوپٹے کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بادل ان دھبوں کی طرح نظر آرہے تھے جو ننھے ننھے ہاتھوں سے دوپٹے کو سنگھے ہوئے پڑ گئے ہوں۔ ہمیشہ کی طرح مغرب سے آتی ہوئی ہوا کے اثر سے پام کے درختوں کی ڈالیاں ایک طرف کو محبوب کی کاکلوں کی طرح لہرا رہی تھیں سورج کی کرنیں ٹیڑھی ہو کر دیوار پر رینگ رہی تھیں۔ اور سایہ ان کو پکڑنے کے لئے آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ لان میں گول میزوں کے بیچ میں ٹیڑھی کھڑی ہوئی شوخ رنگ چھتریاں، کچھ بیٹھنے والوں کو چھپائے ہوئے تھیں۔ اور کچھ کو سب سے بچا کر اپنی دکھا رہی تھیں۔ وہ ٹیرس پر دیوار کو اس طرح آڑ بنا کر بیٹھا تھا کہ ہوا اس کے پاؤں کے پاس سے گذر جاتی تھی۔ اس کے پاؤں کو اس کی خنکی کا احساس ہوتا تھا مگر برابر کی ٹیبل پر دھرے ہوئے اس کے ہاتھ کو نہیں۔ دن بہت شاندار رہا تھا۔ اور یہ شام، رات کے اور بھی شاندار ہونے کا یقین دلا رہی تھی۔

دھوئیں کے بادل اوپر اٹھنے لگے، مگر اس کی نگاہ آدھ گھنٹہ سے جہاں جمی ہوئی تھی، وہیں جمی رہی۔

لان کے اس سرے پر، ایک آرام دہ کرسی پر ایک کرسچن لڑکی بیٹھی اسپنڈر کی نظمیں پڑھ رہی تھی۔ کتاب پہلے اس کے ہاتھوں میں تھی اور اب اس کی گود میں کھلی رکھی تھی اس کا رنگ روپ یورپ اور مشرق کا ملاپ تھا۔ بہت اچھا ملاپ۔ اسے پہلی نظر دیکھتے ہی اختر نے یہ رائے قائم کی کہ اسے رنگوں کے انتخاب کا بہت اچھا ذوق ہے۔ اور تھوڑی دیر بعد کرسی پر پھر بیٹھ کر، جب اسکوائش کا گلاس اس نے برابر کے ٹیبل پر سے اٹھایا تو اس کے متعلق فیصلہ کرلیا کہ بالکل چڑیل ہے۔

دھوئیں کے بادل گم ہونے لگے۔

اس نے سگریٹ کیس اٹھا کر اسے کھولا۔ سات سگریٹ اس میں تھے اور ابھی ساری شام اور قریباً آدھی رات باقی تھی ایک سگریٹ نکال کر اس نے لبوں میں دبایا اور لائٹر جلا کر۔ لو قریب لاتے ہوئے، باقی سگریٹوں کے استعمال کا ٹھیک ٹھیک وقت طے کرنے لگا۔

اختر حسین ٹوانہ پنجاب کے انتہائی امیر خاندانوں میں سے ایک کا سعادت مند فرد۔ اور کل سے کراچی میں۔ قد پانچ فٹ سات انچ۔

عمر چوبیس سال تعلیم، بیچلر آف آرٹ۔ تجربہ ماسٹر آف لو کا کام۔ بہت اہم یعنی کچھ نہیں۔ مشغلہ، ہر پانچ میں سب سے زیادہ تنک مزاج لڑکی سے دوستی کی کوشش جس کے حسن کے لحاظ سے اسے آدھی یا پوری چڑیل کا نام دے کر متاثر کرنے کے لئے جتن مگر اسے رام کر لینے کے بعد، اب دوسری پانچ........ لڑکیوں میں سے، پھر ایک کا انتخاب۔

پھر ایک دوسرا اختر حسین لوانہ۔ پنجاب کی وجاہت اور خوب صورتی کا مجسمہ پانچ وقت کی نماز کا انتہائی پابند۔ دن بھر میں کسی عالم میں بارہ سے زیادہ سگریٹ نہ پینے والا اٹھانوے فیصد شرابیوں کا دوست ہونے پر بھی شراب سے ناآشنا۔ ننانوے فیصدی تنک مزاج لڑکیوں سے دوستی پیدا کرنے کا چار سالہ تجربہ رکھنے والا۔ مگر دوستی سے آگے ایک لیج کبھی نہ بڑھنے کا سختی سے پابند۔

سگرٹ کی سنہری ٹپ لبوں میں دبائے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی زنجیر کے ادھر سے ادھر بغیر پلک جھپکائے وہ اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا، جو اسپنڈر کی رومانیت میں کھوئی ہوئی تھی۔ آج پورا دن دوستوں کے ساتھ بے حد عجیب گذرا تھا۔ مگر پانچ لڑکیوں کا کوئی گروپ، نہ ملیر جانے میں ساتھ تھا اور نہ وہاں مل سکا تھا اس لئے انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اب یہ لڑکی اکیلی بیٹھی بغیر انتخاب کے اسے یوں چیلنج کر رہی تھی، جیسے دیکھیں تم مجھے کیسے رام کرتے ہو۔ یقیناً یہ پوری چڑیل تھی۔ اور اسے مائل کر لینا ایک شاندار فتح۔ چاہے چار سال کے تجربوں کو نچوڑ ہی دینا پڑے۔

آدھ گھنٹے سے اسے دیکھتے رہنا بیکار نہیں رہا تھا۔ بیٹھنے کے پہلے دس منٹ بعد جب لڑکی نے شاید ایک نظم ختم کر کے نظر اٹھائی تھی تو اس کی نظریں ادھر ادھر گھومتی ہوئی اس پر بھی پڑی تھیں مگر اس نے پہلے ہی نگاہیں دوسری طرف پھیر رکھی تھیں۔ اس لڑکی کی آنکھیں پھر کتاب پر جھک گئیں دوسرے دس منٹ میں جب اس نے بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے اسے دیکھا تو وہ دھوئیں کی چادر کے اس پار اس طرح چھپا ہوا تھا کہ آنکھیں کدھر تک رہی تھیں۔ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا دو تین دفعہ اسی طرح ہونے پر ایک بار دونوں کی نگاہیں ٹکرا گئیں۔ ہلکی بہت ہی ہلکی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی۔ اور سگرٹ کو منہ سے ہٹا کے اس نے پھر دھوئیں کو آڑ بنا لیا مگر اتنی ہی دیر میں لڑکی نے اس کے سراپا

کا جائزہ لے لیا پہلے کلائی تک الٹی ہوئی آستین کے باہر ہلکے بھورے بالوں کے درمیان سنہری گھڑی، پھر اس کے برف کی طرح سفید کلف دار کالر پھر اس کے طلائی بٹن۔ پھر اس کا چہرہ اس کے بال، اس کے موزے اس کے جوتے۔ وہ بے اعتنائی کے ساتھ پھر اسپنڈر پر جھک گئی۔

اختر مسکرا دیا۔

یہ چڑیل واقعی چڑیل ہے۔ نوٹس تک نہیں لیا۔ اسے اس کی اونچائی سے کھینچ لانا، واقعی کمال ہوگا۔ اچھا اچھا۔ سگرٹ آدھے سے زیادہ جل چکا تھا اسے ایش ٹرے میں مسل کر وہ کھڑا ہوگیا۔ اس بار ڈائرکٹ میتھڈ سب سے زیادہ مناسب ہے۔ بیرر کو اشارے سے بلا کر اس نے اسکوائش کا ایک اور گلاس سامنے لان کے ٹیبل پر لانے کو کہا اور خود سیدھا اس لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ میری اس عجیب جرات کو معاف نہ کریں گی مگر میں مجبور ہوگیا۔ آپ پہلی خاتون ہیں جنہیں میں نے پول میں، میں نے ادبی ذوق کا پایا ہے۔ مگر مجھے کہنے دیجئے کہ اسپنڈر سے زیادہ رومانی اداسی تو کیٹس میں ہے۔ دیکھئے۔

The face most fair to our vision allowed,
Is the face we encountered and lost in
the crowd;
The thought that most thrills our existence is one,
Which, before we frame it in language, is gone."

اس کے بولتے ہی لڑکی نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ایک لمحہ۔ بس ایک لمحے کے لئے وہ نگاہیں پھر نیچے آئیں۔ سیاہ پینٹ کے اوپر سفید شرٹ میں جھلکتے ہوئے اس کے ورزشی جسم کا جائزہ لیا اور پھر اوپر آ کر اسے تکنے لگیں۔ پہلے اس کی ابروئیں کھنچی رہیں مگر اسے ٹیز اسنتے ہوئے وہ تناؤ اس کے چہرے سے یوں رخصت ہو گئی جیسے بادل کا سایہ گذر جانے کے بعد فرش پھر چمکنے لگے۔ تبسم اس کے لبوں سے التجا کر رہا تھا مگر وہ مسکرائی نہیں۔ کتاب بند کر کے وہ اس طرح پکڑے رہی کہ انگوٹھہ نشانی کی طرح صفحوں کے بیچ میں رکھا تھا۔

"اور اب چونکہ شاید خوشگوار فضا کو برہم کرنے کی ناشائستہ حرکت

کہنے کے بعد میں آپ کی معافی کا مستحق نہیں رہا۔ اس لئے آپ کی۔۔ اجازت سے واپس لوٹتا ہوں۔"

اتنی شستہ انگریزی سے بھی بظاہر وہ متاثر نہ ہوئی —

مگر پھر......

"کیا آپ مہربانی سے یہاں بیٹھ جائیں گے مجھے خود کیٹس سے دلچسپی ہے مگر اس کی قدیم زبان سے نہیں۔" اس نے یہ بات اس طرح کہی جیسے۔ میں جانتی ہوں کہ تم یہ کہہ کر بھی نہ جاتے مگر پھر بھی اخلاق کوئی چیز ہے۔

"دوسرے لفظوں میں آپ نے میری اس جرأت کو معاف کر دیا میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں —— رہی کیٹس کی زبان، تو آپ ذرا اس کا اسپنڈر سے مقابلہ کیجئے۔"

ایک اور اسٹنز اسن کر اس نے تبسم کی التجا قبول کر لی اور بالآخر مسکرا دی بیرے نے اسکوائش کا گلاس لاکر میز پر رکھ دیا۔ اس نے ایک گلاس اور لانے کے لئے کہا، اور لڑکی کے احتجاج کو صرف "پلیز"! کہہ کر بے اثر کر دیا۔

"میری یہ دوسری جرأت بھی قابل معافی ہے۔ کیا آپ مجھے اجازت دیں گی۔" سگرٹ کیس کھول کر اس کے سامنے بڑھاتے ہوئے وہ بولا:—

"جب کہ مجھے آپ کا نام بھی نہیں معلوم۔ میں ہوں اختر۔"

سگریٹ نکالتے ہوئے لڑکی نے سگرٹ کیس کی طلائی سطح پرلے ایچ کا مونوگرام دیکھا۔

"اور میرا نام مارگریٹ ہے۔ مارگریٹ گرافٹن۔" سگرٹ جلاتے ہوئے اس کی نگاہ ادنسن کے لائٹر پر ایک لحظہ رکی پھر کش لے کر اس نے سر اونچا کر لیا۔ "تھینک یو۔"

اپنا سگریٹ سلگا کر لائٹر جیب میں رکھتے ہوئے اختر نے اس کی مخروطی انگلیوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ناخنوں کو دیکھا۔ چڑیل۔

واللہ چڑیل!

مگر یہ کیا ہوا۔ یہ ابتدا تو اچھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ یوں تو ذرا بھی کوشش نہیں کرنا پڑی۔ اور یہ تو —— یہ تو

وہ باتیں کرنے لگے۔

اب اسے احساس ہوا کہ مارگریٹ اس سے بغیر کسی دلچسپی کے اس طرح باتیں کر رہی ہے جس طرح لفٹ کے دو ساتھی ایک دوسرے کو جلدی میں ٹوپی چھو کر سلام کریں، اور پھر موسم یا خیریت کے متعلق دو ایک مہذب جملے کہیں کہ لفٹ رک جائے۔ اور وہ تیسری، چوتھی یا پانچویں منزل پر الگ الگ چلے جائیں۔

مارگریٹ کے لہجہ میں بھی ایسا ہی یقین تھا جیسے یہ گفتگو ایک متعین وقت تک ہوتی ہے۔ پھر یہ اپولو جیسا جرأت مند نوجوان اس سے رخصت ہو جائے گا۔ تیسری نہیں تو چوتھی۔ چوتھی نہیں تو پانچویں منزل پر یقیناً وہ پہلی بار بھی اسی لئے مسکرائی تھی۔ یہ پاکستانی امیر لڑکے ! ان سونے کے سگرٹ کیسوں طلائی گھڑیوں اور ان عقیق جیسی سیاہ آنکھوں کے بدلے نہ معلوم کیا چاہتے ہیں ان کو کیا مل سکتا ہے۔

مگر اختر کو یقین تھا کہ ان سے بہت کچھ مل سکتا ہے۔ اس نے کبھی بھی، کچھ حاصل کرنے کا خیال نہیں کیا تھا۔ مگر اسے یقین تھا۔

وہ اسپنڈر اور کیٹس کے پاس سے ہوتا ہوا مارگریٹ کو انڈونیشیا سے سماترا اور رجاپان کی خواب آگیں فضاؤں میں لے گیا اس کا تجربہ تھا کہ ننانوے فیصدی یہ باتیں بے اثر نہیں رہتیں جاوا کے خوشبو دار جنگل، ساکن جھیلیں اور شریر آبشار۔ اور رجاپان سرسراتے ہوئے ریشمی کمونو میں ملبوس گیشائیں۔ ٹوکیو، مغرب اور مشرق کا سنگم۔ خود مارگریٹ کی طرح یہ سب کچھ بہت سی لڑکیوں کے لئے بہت کافی تھا جب وہ اپنے سیر کے تذکرے ختم کرتا تو لڑکیوں کی نظروں میں تیرتے ہوئے یہ طلسمی مشرقی جزیرے ان کے وجود کو ان کی بناوٹ کو ان کی مغرور نسائیت کو ڈھک لیتے، اور وہ کچھ دیر بعد اس کی شخصیت کی دل کشی کا اعتراف کر لیتیں —— ہار مان لیتیں —— تب وہ ان کو کچھ عرصہ، بطور اپنی فتح کی نمائش کے، ساتھ رکھ کر، رخصت کر دیتا۔ اور اسی دن یا پھر دوسرے دن، پھر لڑکیوں کا کوئی نیا گروپ ڈھونڈھنے لگتا۔

مگر اس بار۔

اس بار مارگریٹ اس کے ساتھ ان جزیروں کی سیر نہیں کر رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس کے قصوں کو دلچسپی سے سن رہی ہے اور بس۔ جیسے کوئی ماں، بچے سے، اسکول میں جانے سے پہلے باتیں دلچسپی سے سنے اور بس۔ بچہ روز ہی اسکول جائے گا مگر ماں روز تھوڑا

کی پچھلے چار سالو [illegible]
[illegible] نوب
[illegible] دن [illegible] گیا۔ سورج ڈوب گیا اور پٹرول
کی باقی بتیاں بھی روشن ہوگئیں۔

"مس گرافٹن۔ کیا آپ چند منٹ کے لئے مجھے معاف کریں گی
آپ یقیناً ابھی کچھ دیر اور بیٹھیں گی۔"

"خوشی سے —— ہاں، کچھ دیر اور۔" وہ مسکرائی۔

اختر اٹھ کر تیز قدموں سے باہر آیا۔ پیلس کے پاس مڑ کر
فریر گارڈن کی طرف رخ کیا اور آگے جا کر مسجد کے دروازے میں داخل
ہوگیا۔

جب وہ باہر نکلا تو رومال ابھی تک اس کے سر پر بندھا ہوا تھا
دیوار کی لگر پر پاؤں رکھ کر اس نے جوتوں کی لیس باندھی۔ اور رومال سر سے
اتار کر واپس ہوٹل کی طرف چل دیا۔

ہوٹل کے لان سے —— لوگ اٹھ کر اب اندر چلے آئے تھے۔
ہال میں مشرقی جانب مارگریٹ بیٹھی دکھائی دی اس کے برابر ایک اور
لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں بہت گھل مل باتیں کر رہی تھیں۔ اختر کے
قریب پہنچنے پر اس لڑکی نے منہ موڑ کر دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر
حیرت اور خوشی امڈ آئی اس نے اپنا ہاتھ پر اشتیاق طریقے سے اس کی
طرف بڑھایا۔

"کتنا عجیب! اختر ڈیر، تم کہاں؟ لاہور سے کب آئے؟ میں
سمجھی تھی تم ابھی وہیں ہو۔"

اختر نے صاف محسوس کیا کہ مارگریٹ "مسٹر ڈوانہ" کے بجائے
"اختر ڈیر" پر کچھ چونکی ہے۔ مسکرا کر اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ دباتے
ہوئے کہا "ہلو روزی کیسی ہو تم۔ میں مشکل کو یہاں پہنچا اور آج بدھ ہے
اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے آئے ہوئے دو دن ہوگئے۔ مجھے یہاں دیکھ
کر کیا کچھ رنج ہوا؟" اس نے "ہلو روزی" کا رنگ دیکھنے کے لئے مارگریٹ
کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں رضیہ کی طرف تھیں۔

"اوہ —— یو، ویکڈ مین! اچھا مہربانی سے بیٹھ ——
میگی۔ یہ میرے بہت ہی پیارے دوست مسٹر ——"

"ہم اس سے پہلے ایک دوسرے سے مل چکے ہیں۔ مین نا مس
گرافٹن؟" رضیہ کا چہرہ لٹک گیا۔ اس نے مشکوک نظروں سے مارگریٹ
کو دیکھ کر کچھ تعجب سے کہا "کب؟ کتنے دن ہوئے؟"

"ہم کو؟" اختر نے کلائی سامنے کر کے گھڑی دیکھی۔ "ایک دوسرے
سے متعارف ہوئے ٹھیک ایک گھنٹہ اور سولہ منٹ ہو چکے ہیں۔ اور
غالباً میں نے ابھی یہ بتایا کہ میں کل ہی آیا ہوں اس لئے شاید کتنے
دنوں کا سوال قدرتاً پیدا نہیں ہوتا۔"

رضیہ کے چہرے پر اطمینان کے آثار ظاہر ہوئے۔ وہ پھر مسکرانے
لگی

اختر نے بیرر کو بلایا۔

"کیا پیو گی؟ اسکوائش تو تمہارے لئے بے مزہ رہے گا۔ شیری
یا اسکاچ؟ غالباً شیری؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

رضیہ روزی بننے کی انتہائی کوشش کرنے پر بھی رضیہ ہونے
کو کیسے چھپا سکتی تھی۔ جبکہ اس کے بال گہرے سیاہ، آنکھیں گہری سیاہ
اور اینجل فیس کی تہہ کے نیچے گہری ملاحت تھی۔ اختر کو مارگریٹ کی
آنکھوں میں وہ مسکراہٹ نظر آئی جو کوئے کو دیکھ کر ہنس کی آنکھوں میں
پیدا ہوئی ہوگی۔

"ایک چھوٹی شیری۔"

آرڈر دے کر وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ رضیہ
کو دیکھتے ہی اسے یہ امید پیدا ہوئی تھی کہ عورت کی وہ ازلی جلن اب اس
کے کام آجائے گی، جو دوسری عورت کو اپنا رقیب دیکھ کر اس میں پیدا
ہوتی ہے۔ لیکن مارگریٹ کی آنکھوں میں استہزا کی ہنسی دیکھ کر اس امید
پر اوس پڑ گئی۔ ٹھیک تو ہے۔ مارگریٹ کو پریشانی تب ہوتی جب
اس کی برابر کی کوئی رقیب ہوتی۔ یہ معاملہ یوں نہیں چلے گا۔ اختر کے
پیچھے چار سال کے تجربوں کو آواز دو۔

رضیہ سے باتیں کرتے ہوئے کچھ دیر موضوع دلچسپ رہا پاکستان

کو ملازم کا خطرہ یا اس کے سبب بلیک مارکیٹ مہنگائی اور کالے دھن کی نایابی مگر پھر رفتہ رفتہ گدگدانے والے قصے شروع ہو گئے۔ کراچی کے پچھلے تازہ، اور آئندہ کے متوقع معاشقوں کے تذکرے۔ کیپٹن فرید تاب لیفٹیننٹ کرنل ہو گئے (معلوم ہے) ہائے کتنا جولی فیلو تھا۔ ٹرانسفر ہو گیا اب پنڈی میں ہے (یہ بھی معلوم ہے) گڈی اتنی اداس ہے اس کے بغیر۔ بیچاری۔ مگر وہ آیا ہے، ایک بہت ہینڈسم سرٹیے پر۔ وہ اس کی بڑی دلدہی کر رہا ہے۔ شاید اپنا غم بھول جائے۔ ہائے عزیب تم ہوتے اختر ڈیر، تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ واہ نہہ! تم سے وہ اتنی جلد ہل جاتی۔ اور ہاں۔ وہ جادوگرنی یاد ہے۔ وہ درچ؟ وہ ابھی تک اس بیچارے پی، سی، ایس کے پیچھے پڑی ہے۔ تم ہوتے اختر ڈیر، تو دیکھ کر وہ جلتے تمہارے سارے فولادی ارادے اب تک کبھی کے ختم ہو جاتے۔ بالکل ختم۔ اور ہاں، وہ اپوا کی خزانچی ہے نا اختر ڈیر.........

وغیرہ وغیرہ۔

اختر ڈیر، باتیں سننے کے بجائے اپنا قیمتی وقت مارگریٹ کے چہرے کے تاثرات پڑھنے میں گذارتا رہا۔ مارگریٹ انتہائی دلچسپی سے مسکرا کر، ہنس کر، اُف ہائے اچھا! کہہ کر اس کی باتیں سنتی رہی اور اختر اور بھی دلچسپی سے اس کے چہرے کا یہ تاثر پڑھتا رہا کہ وہ باتیں نہیں سن رہی، بلکہ چہرے کو اختر کے لئے مختلف انداز سے زیادہ دلکش، زیادہ غارت گر دین و ایمان بنا دینے کی کوشش کر رہی ہے۔

وہ مارا!

دیکھا۔ عورت پھر عورت ہے۔ چاہے بقراط کی بچی کیوں نہ ہو۔ اچھا مس کرافٹن۔ اب تم جلدی ہی گھٹنوں کے بل گرنے والی ہو۔ اس نے سگریٹ کیس نکال کر دونوں کے سامنے بڑھایا۔ پھر خود بھی ایک سگریٹ نکال لیا۔ بیرے کو۔ اشارے سے بلا کر نائن نائن نائن کا ایک نیا ٹن لانے کو کہا۔ راشن کم ہو رہا تھا۔ اور ان چڑیلوں کی ناز برداری کے بعد اسے اپنا کوٹہ باقی رکھنا تھا۔

رضیہ، خوش قسمتی سے باتیں کرتے کرتے، اب ادھر چند یا صاف افسر دل اور ان کی جواں مزاج بیویوں کی باتوں تک آگئی تھی جس کا مطلب تھا کہ شاید اس موضوع کی تلخی سے، باتیں کچھ خوشگوار ہو جائیں

"تمہارے شوہر کہاں ہیں روزی؟" اختر نے بالآخر دوسرا سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔

"یہیں ہیں، ماری پور میں۔ جہاں پہلے تھے ——— ہائی گاڈ میں تم سے مل کر بالکل بھول گئی۔ مجھے تو چھ تک ان کے پاس پہنچنا تھا۔ شاہ سعود کے لئے دیتے ہوئے ..... بینکوئیٹ میں جانا تھا ———

اور وہ بھی جلد ——— تم تو سمجھتے ہی ہو ——— اچھا۔ میں چلتی ہوں اختر ڈیر۔ کل ملو گے یہاں؟ اچھا میگی ڈارلنگ۔ بائی بائی۔ میرا اولڈ مین انتظار کر رہا ہوگا"

رضیہ چلی گئی۔ اس کے ساتھ لفٹننٹ کرنل فرید چلا گیا۔ وہ ہینڈسم سرٹیے پر چلا گیا وہ جادوگرنی چلی گئی۔ وہ بے بیچارہ پی سی ایس چلا گیا۔ مارگریٹ کی آنکھوں سے استہزا بھی رخصت ہو گیا۔ ! اب وہ تھے ——— دونوں۔ وہ الگ۔ وہ الگ۔

وہ اس طرح چپ چاپ بیٹھی رہ گئی جیسے آرائش کے دوران میں اس کے سامنے سے آئینہ ہٹا لیا گیا ہو۔ اختر کو کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ کون سا موضوع چھیڑنا مفید رہے گا۔ مگر بہر حال کچھ کہنا ضروری ہے۔ لو۔ اس نے پھر کتاب کھول لی۔ یہ کمبخت عجیب لڑکی تو امید سے زیادہ سخت نکلی۔ ابھی کیسی امید ہو چلی تھی۔ اور اب ایسے بیٹھی ہے جیسے ——— جیسے۔

"کیا اب ہم بھی نہ اٹھیں؟" کھلی ہوئی کتاب کو دوبارہ بند کر کے اس نے اس کی طرف منہ کیا، اور مسکرا دی۔ کتاب کے بیچ میں اب اس کا انگوٹھا بطور نشانی کے نہ تھا گویا اس بار اٹھنا، واقعی طے ہے

"صرف دو منٹ اور" اور اختر چاہتا تھا جو سکیم بھی بنے بنی نہیں بن جائے۔

مارگریٹ نے سر کے اشارے سے اچھا کہا۔ اختر نے بیرے سے بل لانے کو کہا۔

ایک سو بیس سکنڈ ——— سینما؟ مگر وقت ٹلتا جا رہا ہے۔ ایک دم سینما ٹھیک نہیں ایک سو دس سیکنڈ ——— اچھا، اور اگر سینما تو کون سا ——— "بیلیں آنا" ریکس، انڈر واٹر" پیرا ڈائز۔ بیڈ لارڈ بائرن" یہ! یہ بائرن ٹھیک ہے۔ (اسکوائش کا ایک گھونٹ) ہی سکنڈ

ہی سے گی۔

اختر کو مبہم سی شکست کا احساس ہوا مگر اس کے پچھلے چار سالوں نے اگر باری باری اس کی ہمت بندھائی۔ اونہہ۔ ابھی تو سورج غروب ہو رہا ہے۔ ساری شام، ساری رات باقی ہے۔

بالآخر اندھیرے نے کرنوں کو جالیا۔ سورج ڈوب گیا اور ٹیڑو پل کی باقی بتیاں بھی روشن ہو گئیں۔

"مس گرافٹن۔ کیا آپ چند منٹ کے لئے مجھے معاف کریں گی آپ یقیناً ابھی کچھ دیر اور بیٹھیں گی۔"

"خوشی سے ——— ہاں، کچھ دیر اور" وہ مسکرائی۔

اختر اٹھ کر تیز قدموں سے باہر آیا۔ پیلس کے پاس مڑ کر فریئر گارڈن کی طرف رخ کیا اور آگے جا کر مسجد کے دروازے میں داخل ہو گیا۔

جب وہ باہر نکلا تو رومال ابھی تک اس کے سر پر بندھا ہوا تھا دیوار کی لگر پر پاؤں رکھ کر اس نے جوتوں کی لیس باندھی۔ اور رومال سر سے اتار کر واپس ہوٹل کی طرف چل دیا۔

ہوٹل کے لان سے ——— لوگ اٹھ کر اب اندر چلے آئے تھے۔

ہال میں مشرقی جانب مارگریٹ بیٹھی دکھائی دی اس کے برابر ایک اور لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں بہت گھل مل باتیں کر رہی تھیں۔ اختر کے قریب پہنچنے پر اس لڑکی نے منہ موڑ کر دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر حیرت اور خوشی امڈ آئی اس نے اپنا ہاتھ پر اشتیاق طریقے سے اس کی طرف بڑھایا۔

"کتنا عجیب! اختر ڈیر، تم کہاں؟ لاہور سے کب آئے؟ میں سمجھی تھی تم ابھی وہیں ہو۔"

اختر نے صاف محسوس کیا کہ مارگریٹ "مسٹر ثوانہ" کے بجائے "اختر ڈیر" پر کچھ چونکی ہے۔ مسکرا کر اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "ہلو روزی کیسی ہو تم۔ میں منگل کو یہاں پہنچا اور آج بدھ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے آئے ہوئے دو دن ہو گئے سبھی یہاں دیکھ کر کیا کچھ رنج ہوا؟" اس نے "ہلو روزی" کا رنگ دیکھنے کے لئے مارگریٹ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں رضیہ کی طرف تھیں۔

"اوہ ——— یو، ویکڈ مین! اچھا مہربانی سے بیٹھو ——— میگی۔ یہ میرے بہت ہی پیارے دوست مسٹر ———"

"ہم اس سے پہلے ایک دوسرے سے مل چکے ہیں۔ مین نا مس گرافٹن؟" رضیہ کا چہرہ لٹک گیا۔ اس نے مشکوک نظروں سے مارگریٹ کو دیکھ کر کچھ تعجب سے کہا "کب؟ کتنے دن ہوئے؟"

"ہم کو" اختر نے کلائی سامنے کر کے گھڑی دیکھی "ایک دوسرے سے متعارف ہوئے ٹھیک ایک گھنٹہ اور سولہ منٹ ہو چکے ہیں۔ اور غالباً میں نے ابھی یہ بتایا کہ میں کل ہی آیا ہوں اس لئے شاید کتنے دنوں کا سوال قدرتاً پیدا نہیں ہوتا۔"

رضیہ کے چہرے پر اطمینان کے آثار ظاہر ہوئے۔ وہ پھر مسکرانے لگی

اختر نے بیرے کو بلایا۔

"کیا پیو گی؟ اسکوائش تو تمہارے لئے بے مزہ رہے گا۔ شیری یا اسکاچ؟ غالباً شیری؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

رضیہ روزی بننے کی انتہائی کوشش کرنے پر بھی رضیہ ہونے کو کیسے چھپا سکتی تھی۔ جبکہ اس کے بال گہرے سیاہ، آنکھیں گہری سیاہ اور ایجل فیس کی تہہ کے نیچے گہری ملاحت تھی۔ اختر کو مارگریٹ کی آنکھوں میں وہ مسکراہٹ نظر آئی جو کہ رضیہ کو دیکھ کر مغنس کی آنکھوں میں پیدا ہوئی ہو گی۔

"ایک چھوٹی شیری۔"

آرڈر دے کر وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ رضیہ کو دیکھتے ہی اسے یہ امید پیدا ہوئی تھی کہ عورت کی وہ ازلی جلن اب اس کے کام آجائے گی، جو دوسری عورت کو اپنا رقیب دیکھ کر اس میں پیدا ہوتی ہے۔ لیکن مارگریٹ کی آنکھوں میں استہزا کی ہنسی دیکھ کر اس کی امید پر اوس پڑ گئی۔ ٹھیک تو ہے۔ مارگریٹ کو پریشانی تب ہوتی جب اس کی برابر کی کوئی رقیب ہوتی۔ یہ معاملہ یوں نہیں چلے گا۔ اختر کے پچھلے چار سال کے تجربوں کو آواز دو۔

رضیہ سے باتیں کرتے ہوئے کچھ دیر موضوع دلچسپ رہا پاکستان

کو ملازم کا خطرہ یا اس کے سبب بلیک مارکیٹ ہنگامی اور کاسمیٹکس کی نایابی مگر پھر رفتہ رفتہ اکتا دینے والے قصے شروع ہو گئے۔ کراچی کے پچھلے تازہ، اور آئندہ کے متوقع معاشقوں کے تذکرے۔ کیپٹن فرید نا اب لیفٹیننٹ کرنل ہو گئے (معلوم ہے) ہائے کتنا جولی فیلو تھا۔ ٹرانسفر ہو گیا اب پنڈی میں ہے (یہ بھی معلوم ہے) گڈی اتنی اداس ہے اس کے بغیر۔ بیچاری۔ مگر وہ آیا ہے، ایک بہت ہینڈسم سر ڈے پر۔ وہ اس کی بڑی دلداری کر رہا ہے۔ شاید اپنا غم بھول جائے۔ ہائے عزیب تم ہوتے اختر ڈیر، تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ واؤ تھیہ! تم سے وہ اتنی جلد ہل جاتی۔ اور ہاں۔ وہ جادوگرنی یاد ہے۔ وہ ورج؟ وہ ابھی تک اس بیچارے پی، سی، ایس کے پیچھے پڑی ہے۔ تم ہوتے اختر ڈیر، تو دھکر وہ جلتے تمہارے سارے فولادی ارادے اب تک کبھی کے ختم ہو جاتے— بالکل ختم۔ اور ہاں، وہ الو کی خزانچی ہے نا اختر ڈیر...........

وغیرہ وغیرہ۔

اختر ڈیر، باتیں سننے کے بجائے اپنا قیمتی وقت مارگریٹ کے چہرے کے تاثرات پڑھنے میں گذارتا رہا۔ مارگریٹ انتہائی دلچسپی سے مسکرا کر، ہنس کر، اُف ہائے اچھا! کہہ کر اس کی باتیں سنتی رہی اور اختر اور بھی دلچسپی سے اس کے چہرے کا یہ تاثر پڑھتا رہا کہ وہ باتیں نہیں سن رہی، بلکہ چہرے کو اختر کے لئے مختلف انداز سے زیادہ دلکش، زیادہ غارت گر دین وایمان بنا دینے کی کوشش کر رہی ہے۔

وہ مارا!

دیکھا۔ عورت پھر عورت ہے۔ چاہے بقراط کی بچی کیوں نہ ہو۔ اچھا مس کرافٹن۔ اب تم جلدی ہی گھٹنوں کے بل گرنے والی ہو۔ اس نے سگریٹ کیس نکال کر دونوں کے سامنے بڑھایا۔ پھر خود بھی ایک سگریٹ نکال لیا۔ بیرے کو۔ اشارے سے بلا کر نائن نائن نائن کا ایک تیا ٹن لانے کو کہا۔ راشن کم ہو رہا تھا۔ اور ان چڑیلوں کی ناز برداری کے بعد اسے اپنا کوٹہ باقی رکھنا تھا۔

رضیہ، خوش قسمتی سے باتیں کرتے کرتے، اب ادھر چند یا صاف افسر دل اور ان کی جواں مزاج بیویوں کی باتوں تک آگئی تھی اس کا مطلب تھا کہ شاید اس موضوع کی تلخی سے، باتیں کچھ خوشگوار ہو جائیں

"تمہارے شوہر کہاں ہیں رضیہ؟" اختر نے بالآخر دوسرا سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔

"یہیں ہیں، ماری پور میں۔ جہاں پہلے تھے— ہائی گاڈنس تم سے مل کر بالکل بھول گئی۔ مجھے تو چھ تک ان کے پاس پہنچنا تھا۔ شاپنگ سودے کے لئے دیئے ہوئے..... بینکویٹ میں جانا تھا— اور وہ بھی جلنا— تم تو سمجھتے ہی ہو— اچھا۔ میں چلتی ہوں اختر ڈیر۔ کل ملو گے یہاں؟ اچھا میگی ڈارلنگ۔ بائی بائی۔ میرا ولادین انتظار کر رہا ہوگا۔"

رضیہ چلی گئی۔ اس کے ساتھ لفٹننٹ کرنل فرید چلا گیا۔ وہ ہینڈسم سر ڈے پر چلا گیا وہ جادوگرنی چلی گئی۔ وہ بے بیچارہ پی سی ایس چلا گیا۔ مارگریٹ کی آنکھوں سے استہزا بھی رخصت ہو گیا۔ ! اب وہ تھے— دونوں۔ وہ الگ۔ وہ الگ۔

وہ اس طرح چپ چاپ بیٹھی رہ گئی جیسے آرائش کے دوران میں اس کے سامنے سے آئینہ ہٹا لیا گیا ہو۔ اختر کو کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ کون سا موضوع چھیڑنا مفید رہے گا۔ مگر بہرحال، کچھ کہنا ضروری ہے۔ لو۔ اس نے پھر کتاب کھول لی۔ یہ کمبخت عجیب لڑکی تو امید سے زیادہ سخت نکلی۔ ابھی کیسی امید ہو چلی تھی۔ اور اب لیے بیٹھی ہے جیسے— جیسے۔

"کیا اب ہم بھی نہ اٹھیں؟" کھلی ہوئی کتاب کو دوبارہ بند کر کے اس نے اس کی طرف منہ کیا۔ اور مسکرا دی۔ کتاب کے بیچ میں اب اس کا انگوٹھا بطور نشانی کے نہ تھا گویا اس بار اٹھنا، واقعی طے ہے

"صرف دو منٹ اور" اور اختر چاہتا تھا جو سکیم بھی بنے نہیں بن جائے۔

مارگریٹ نے سر کے اشارے سے اچھا کہا۔ اختر نے بیرے سے بل لانے کو کہا۔

ایک سو بیس سکنڈ— سینما؟ مگر وقت نکلتا جا رہا ہے۔ ایک دم سینما ٹھیک نہیں ایک سو دس سیکنڈ— اچھا، اور اگر سینما تو کون سا— "پیلیس آنا" ریکس، انڈر واٹر، "پیرا ڈائز" بیڈ لارڈ بائرن" یہ! یہ بائرن ٹھیک ہے۔ (اسکوائش کا ایک گھونٹ) اسی سیکنڈ

اور اگر وقت زیادہ ہو گیا؟ تو پھر کلفٹن۔ سیلوڈرائیو۔ آٹھ دس میل تک نہیں بس دو میل تک۔ ممکن ہے یہ خود چلا سکتی ہو۔ تب واپسی میں یہ اور یہیں ہی تب تک تو؟ دس سات سیکنڈ پھر کیا بچ لگڑری کیفل؟ بائیس بکیا سوچ رہے ہو۔ ہمت مت ہارو۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ دولہ خوب مزہ سہ رہا!) تیس سکنڈ۔

اس کا ہاتھ سگرٹ کیس تک گیا۔ پھر لوٹ آیا۔

پچیس، چوبیس، تیئس، بائیس، اکیس...... چار تین دو ایک سیکنڈ۔

"آیئے چلیں"

وہ دس کے دو نوٹ پلیٹ میں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ جیسا ہوگا وقت پر دیکھا جائے گا

"ایک بات اور پوچھ سکتا ہوں آپ سے" وہ ٹیرلیس پر چڑھتے ہوئے بولا۔ مارگریٹ نے رضامند نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ اب کہاں جائیں گی؟ کوئی پروگرام ہے؟"

"نہیں ———"

نہیں! یعنی وہ اب اس وقت مارگریٹ کو کہیں بھی لے جا سکتا ہے۔

"سوائے اس کے، کہ میں عموماً آٹھ سے زیادہ باہر نہیں رہتی"

تب؟ تب، دو آٹھ تک اس کا کیا کرے گا ——— اچھا چلنے دو۔ اسٹرما آپ ہو۔ (خوب!!)

ایک انگلی سے اس کی کلائی چھوتے ہوئے، یوں اسے روک کر وہ بولا: "ادھر سے چلی چلئے۔ کیا میں اس ملاقات کے بعد اتنا حق نہیں رکھتا کہ آپ کو نیو دیکھ کر چھوڑ آؤں۔ تب آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ نہیں تا اور شاید آپ، اپنی رفاقت کے چند منٹ مجھے اور دیں گی۔ میری مرضی" کچھ تامل کے بعد "اگر آپ چاہتے ہیں" کہہ کر وہ اس کے ساتھ ہولی میٹرپول کا غربی دروازہ کھول کر وہ ایک طرف ہو گیا۔ وہ گذر گئی تو وہ باہر آیا۔ اپنی کنورٹ ایبل کا دروازہ کھولا۔ اسے بٹھایا۔ پھر خود دوسری طرف جا کر بیٹھا، در دروازہ بند کر کے اسٹیرنگ کو پکڑا ہی تھا کہ بیرہ، تیز اور مودب رفتار سے اس کے پاس آیا۔ اور پلیٹ اس کے سامنے پیش کی۔ کچھ ریزگاری اُٹھا کر آنے اور نائن نائن نائن کا کھلا ہوا ٹن اس میں تھا جس میں سے کچھ سگریٹ لے کر اس نے سگریٹ کیس میں لگائے اور پھر بیرے کو پلیٹ کا سب کچھ لے جانے کا اشارہ کر کے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

بیرا، سلام کرنے سے پہلے پیچھے، بہت پیچھے رہ گیا

پھر میٹرپول کا غربی رخ ختم ہوا اور کار، وکٹوریہ روڈ پر مڑ گئی پھر چوراہا گذرا۔ سلام کرتا ہوا سپاہی گذرا۔ وزیر اعظم کی کوٹھی گذری۔ فریرہال گذرا۔ بہت سی کوٹھیاں ایک اور چوراہا ایک اور بغیر سلام کرتا، سپاہی ——— پل شروع ہو گیا۔

اختر نے چڑھائی کے بجائے پل کے ساتھ والی سڑک پر تیزی سے کار موڑ دی اور پھر بڑی آہستہ روی سے چلانے لگا۔

اس کی جھنجھلاہٹ سمندر کے مد کی طرح بڑھتی جا رہی تھی آہستہ آہستہ۔ بغیر کسی واضح تبدیلی کے۔ سمندر کو جوش آرہا تھا۔ یہ شناور اس کے غصے کو چیلنج کر رہی تھی۔ مارگریٹ نے سیٹ پر رکھے ہوئے سگرٹ کیس میں سے سگرٹ نکالا۔ لائٹر کے لئے اختر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سگرٹ سلگایا۔ ایک گہرا کش لیا۔ ہاتھ بڑھا کر لائٹر خود اس کی شرٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ اور بس ——— جب سے اب تک وہ سیٹ پر پچھلی طرف سر لگائے خوابیدہ سی آنکھوں سے اس طرح۔ سامنے سے آتی ہوئی پیچھے بھاگتی ہوئی سڑک کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے یہ کار خود ہی دوڑی چلی جا رہی ہے۔ جیسے اس کے برابر کوئی جاندار، کوئی ایک ذات موجود نہیں ہے۔ یہ بے اعتنائی! سمندر میں اب اُبال آنے لگا۔ مگر کیوں؟ کیا سمندر، اس شناور کو ڈبونا چاہتا تھا۔ نہیں۔ سمندر نے کبھی اسے ڈبونے کا خیال نہیں کیا تھا۔ سمندر نے اب تک کسی کو ڈبویا نہیں تھا تو پھر؟ بس۔ شاید وہ اس شناور سے اپنی اتھاہ گہرائی اپنی بے پایاں عظمت کا اعتراف چاہتا تھا ——— مگر یہ عورت!

اختر نے خود کو ایک جابر و قاہر مرد میں تبدیل ہوتے ہوئے محسوس کیا۔

"شاید میں نے غلط گمان کیا تھا۔ آپ میرا ساتھ دینے کے لئے اپنے آپ پر جبر کر رہی ہیں"

اختر کو اپنے لہجے کی سختی خود کچھ ناگوار گذری۔ مگر اب بات قابو سے

باہر ہو چکی تھی "آپ پسند کریں تو میں آپ کو گھر چھوڑ دوں۔"

"سیونٹی فن، سمرسٹ اسٹریٹ —— اِف یو پلیز۔"

اختر رویا نہیں۔ کیونکہ اختر کبھی نہیں رویا تھا۔ تب سے نہیں رویا تھا جب سے پہلی بار اس نے جانا تھا کہ رونا رنج کی علامت ہے مگر آج۔

کئی چوراہے اور سڑکیں چھوڑنے کے بعد اس نے مارگریٹ کے اشارے پر ایک گلی کے پاس کار روکی انجن بند کر کے اس نے ہیڈ لائٹ بجھائی۔ اور مارگریٹ کی طرف کا دروازہ کھولنے کے لئے اتر کر ادھر جایا ہی چاہتا تھا کہ مارگریٹ نے خود ہاتھ بڑھا کے ہینڈل دبایا۔ دروازہ کھل گیا۔

اختر نے اپنا نچلا لب اس زور سے چبایا کہ اسے خون کی نمکینی خود اپنے منہ میں محسوس ہوئی۔ ایک جنونی خواہش اس کے اندر ابھری کہ اس مغرور لڑکی کے سنہرے بال پکڑ کر اسے بہت مارے۔ بہت مارے اپنی شکست کا انتقام اس شریر بچے کی طرح لے جو کھلونا چھینے کا خطرہ دیکھ کر اسے توڑ ڈالتا ہے۔ اس کا ہاتھ بڑھا اور مارگریٹ کے کھلے ہوئے بازو کو اپنی آہنی گرفت میں لے لیا۔

مارگریٹ اترتے اترتے رک گئی۔ گردن گھما کر اس نے اختر کی طرف دیکھا۔ "اوہ!"

اختر کے ہاتھ میں غصہ کی لرزش تھی، جسے مارگریٹ نے اپنی چاہت کی انتہا سمجھا۔ اختر کی آنکھیں جوش سے دہک رہی تھیں۔ جسے مارگریٹ اپنی غیر معمولی کشش کا سبب سمجھی اختر کی لمس میں تیز حدت تھی جو مارگریٹ کو ہوس کی تپش معلوم ہوئی۔ وہ اس وقت کتنا سفاک کتنا دلربا، وحشیانہ جنس پرستی کا کتنا شاندار مرقع لگ رہا تھا۔

مارگریٹ کو ایسے ہی نوجوان پسند تھے۔

"کیا تم چاہتے ہو میں نہ جاؤں۔" مارگریٹ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لگاوٹ سے مسکرائی۔ وہی قاتل مسکراہٹ۔

"نہیں!"

"اچھا تو میں نہیں جاتی۔ لو۔ اب میرا بازو چھوڑ دو۔" وہ دروازے سے ہٹ کر اس کے قریب کھسک آئی۔

"نہیں۔"

"اچھا۔ جیسا تم پسند کرو۔"

یہ کیا ہوا!

اختر کو ایسا لگا جیسے عین وقت پر اسے چلتی ریل سے کسی نے کھینچ کر اتار لیا ہو اور ٹکٹ لے کر پھاڑ ڈالا ہو۔ یہ کیا ہوا؟ کیا اب تک کی بے اعتنائی "بناوٹ" تھی تو اس کی جاذبیت اس بار بھی بیکار نہیں گئی۔ خدا کا شکر ہے۔ (ہائیں! خدا کا شکر ہے)

اس نے مارگریٹ کا بازو چھوڑ دیا۔ اور موٹر، دوبارہ اسٹارٹ ہوتے ہی سیدھی کلفٹن کی طرف بھاگی۔

بے چارہ مرد — بے چاری عورت۔

اختر ویسا نوجوان نہیں تھا جیسے نوجوان مارگریٹ کو پسند تھے مارگریٹ ویسی لڑکی نہیں تھی، جو اختر کے مونوگرام سے روشن کے لائٹر سے اس کے سماترا اور جاپان سے اس کی کمزور اپیل سے، پگھل جاتی، لیکن اس وقت مارگریٹ کو اختر اپنے خوابوں کا وہ محبوب نظر آیا جو تنہائی زندگی کے ساتھ اس کی بھوکی فطرت کو آسودہ کر سکتا تھا۔ اور اختر کو مارگریٹ میں وہی لڑکی دکھائی دی جو پہلے شرمیلے پن یا بے اعتنائی سے اپنے محبوب کو لبھا کر از خود رفتہ کرتی رہتی ہے لیکن آخر میں عورت پن کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی آغوش میں آگرتی ہے مگر کھلا ہوا اعتراف شکست نہیں کرتی۔ صاف لفظوں میں ہار نہیں مانتی۔ اچھا۔ اب اس رسی کا آخری بل بھی نکل جائے گا۔ ایسے اس فوری تبدیلی سے بڑی امید ہو چلی تھی — دونوں نے ایک دوسرے کو غلط سمجھا تھا۔ دونوں نے غلطی کی تھی، دونوں انسان تھے۔

کلفٹن کی سڑک پر گزرتے ہوئے، دو طرفہ روشنیاں ان کو دیکھ کر زرد ہو گئی تھیں۔ کلفٹن کی اونچائی پر پہنچ کر وہ ایک دم نیچائی میں اترنے لگے۔ کلفٹن کے سفید ریتیلے ساحل پر اس عورت کی نظروں میں تمناؤں کے طوفان دیکھ کر لہریں اپنا سر پٹخنے لگیں۔

اختر کو اب واقعی کچھ تعجب تھا۔ آخر یہ لڑکی کیا ہے۔ میٹروپول اور اس ہوٹل کی مارگریٹ میں سے کون سی مارگریٹ اصلی ہے۔ اس نے عورت کی قربت چاہی ضرور تھی۔ ہمیشہ حاصل بھی کی تھی۔ مگر بس اس سے

آگے کبھی اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ کیوں؟ یہ معلوم نہیں۔ شاید ہر بار نئی نئی لڑکیوں کے گروپ نے اس کا موقعہ ہی نہیں آنے دیا تھا لیکن واقعی اس نے کبھی اس سے آگے نہ سوچا تھا لیکن یہ مارگریٹ۔ یہ تو اسپین کے اس جنگجو کی طرح مارنے مرنے پر تیار نظر آتی تھی جو یا تو ایرینا میں بپھرے ہوئے وحشی سانڈ کو ختم کر دیتا ہے یا پھر خود ختم ہو جاتا ہے ——

شاید ابھی تک اختر کی کسی جنگجو سے مڈبھیڑ نہ ہوئی تھی۔ شاید وہ اب تک سرسبز چراگاہوں میں ہی پھرتا رہا تھا۔

مگر اس مرد کو اس عورت کی برتری گوارا نہ تھی۔ اپنے چٹان جیسے ارادے کے بل پر وہ بالکل مطمئن تھا کہ ایک مارگریٹ نہیں، ان گنت مارگریٹوں کے قطاروں سے گذر کر بھی وہ مڑ کر فخریہ مسکرا سکتا ہے اسی سے بازوؤں سے سر ٹکانے کو بھی اس نے گوارا کر لیا۔ اپنے سگرٹ سے اس کا سگرٹ سلگا دینا بھی اسے ناگوار نہ گذرا اور پھر اس کی یہ سرگوشی بھی اسے عجیب نہ لگی "تم مجھے میگی کہہ کر پکار سکتے ہو"

کلفٹن پھر پیچھے رہ گیا۔ چاندنی سے جگمگاتی ہوئی نقرئی سڑک پر کار تھی اور ساڑھے دس بجے تک وہ بیچ لگژری کے گیٹ میں داخل ہو گئی

اختر نے پیچھے کے سیٹ پر پڑا ہوا ڈریس سوٹ کا سیا کوٹ پہن لیا اور بو لگائی۔ مارگریٹ نے اس کے بازو میں بازو ڈالا اور وہ ہال روم میں داخل ہو گئے۔

اختر کے پاس وجاہت تھی۔ جامہ زیبی تھی، پالش کی ہوئی گفتگو تھی۔ مگر اسے ٹیبل تک آتے آتے پتہ لگ گیا کہ ٹیفنیا کے پھلدار گاؤن اور اسپنڈر کی نظموں کے ساتھ بھی مارگریٹ اس کا بہترین جوڑ تھی۔ اس سے بہتر تھی —— "ہلو اینڈریو اوہ! مسٹر سنتا۔ ہاؤ ڈو یو ڈو؟ مائی ٹیبل؟ تھینک یو۔"

وہ دونوں مقابل بیٹھ گئے۔

پھر آرڈر دیا گیا۔ پائن ایپل جوس۔ چکن نوڈل۔ کولڈ مٹن۔ رشین سلاد (اور مس مارگریٹ کی فرمائش پر ان کے لئے) ایک چھوٹا اسکاچ اور پھر لگژری رائل۔ اس کی پسندیدہ آئس کریم

تھوڑی دیر سے رکا ہوا ڈانس پھر دوبارہ شروع ہو گیا۔ پائن ایپل جوس پی کر وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔ فوکس ٹراٹ۔ مارگریٹ کے تیز قدم اور اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں۔ ناچ ختم ہوا تالیاں۔ موسیقی رک گئی۔ وہ دونوں آکر بیٹھ گئے۔ کھانے کے تعطر سے میز کا مہکتا ہوا ماحول۔ موسیقی پھر شروع، وہ دونوں کھڑے ہو گئے —— مارگریٹ کی سبک چال، اس کی مسرور آنکھیں۔ ناچ ختم۔ تالیاں۔ اب فلور شو۔ لائٹ مدھم ہو گئی۔ ہاتھوں کے بل ناچتا ہوا مرد۔ چمکدار سنہرے گولے پر گھومتی ہوئی عورتیں فلور شو ختم۔ تالیاں۔ اب لائٹ اور مدھم ہو گئی۔ کیبرے شروع ہو گیا۔ دو جگمگاتی ہوئی عورتیں۔ نہیں۔ ہوا میں تیرتی ہوئی دو سنہری، مچھلیاں۔ کیبرے ختم۔ زوردار تالیاں۔ بارہ بج گئے۔ ایک دن مر گیا۔ دوسرا دن پیدا ہوا۔ موسیقی شروع۔ سلو والز ایک چھوٹا سا اسکاچ۔ اور وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔ مارگریٹ کے بہکتے قدم۔ خواب آگیں آنکھیں۔ اختر کے سینے سے لگا ہوا اس کا سر۔

جب مارگریٹ کے اصرار پر وہ دونوں باہر آئے تو چاند نے انہیں دیکھ کر بادلوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔ ہوا ساکت ہو گئی اور بیر زیر مسکرا نے لگے مارگریٹ کے کہنے سے اس نے موٹر اسٹارٹ کی۔ مارگریٹ کے کہنے ہی سے وہ اسے اپنا فلیٹ دکھانے لے گیا۔

جب زینے پر چڑھ کر اس نے دروازہ کھولا اور آگے بڑھ کر سبز روشنی جلائی تو مارگریٹ اس کا ہاتھ چھوڑ کر دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی آدھا جلا ہوا سگرٹ اس کی انگلیوں میں تھا۔ اور اس کے نیم وا لبوں اور خمار آلود آنکھوں سے تعریف جھلک رہی تھی۔

"میگی۔ میرا گھر پسند آیا تمہیں" اسے معلوم تھا کوئی اس کمرے کو دیکھ کر تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

"اوہ۔ اِٹ از جسٹ ونڈر فل!"

وہ اندر آکر لمبے لچک دار سبز کرم کے دیوان پر بیٹھ گئی۔ پھر اس کی نظروں نے دوبارہ کمرے کا جائزہ لیا۔ قائد اعظم کی تصویر کے نیچے ریڈیو گرام پر اس کی نگاہیں آکر رک گئیں وہ اٹھ کر اس کے پاس گئی۔ ریک کھول کر اس میں سے ریکارڈ نکالے۔ اور ایک ایک کر کے ان کو پڑھنے لگی۔ ایک ریکارڈ اس نے لگایا۔ کمرہ بہت دھیمی موسیقی سے معمور ہو گیا اس نے کچھ اور ریکارڈ پسند کئے۔

اختر نے کچن میں جا کر پرکیولیٹر میں کافی تیار کی۔ موسیقی کی

آواز اس نے وہیں سنی۔ کوٹ وہ اتار چکا تھا۔ بولا تار کر اس نے قمیض کے بٹن بھی کھول ڈالے اور سگرٹ جلا کر کھڑکی کے دونوں پٹ دروازے آہستہ سے باہر کی طرف دھکیل دیئے۔ ہوا کا تیز جھونکا سمندر کی نمکینی اور نمی لئے، اس سے ٹکرایا اور اندر چلا گیا۔

کراچی کی پُر شور فضاؤں پرے، روسی سفارت خانے کی بغل میں بلیک اسٹریٹ پر یہ فلیٹ متحیر سا کھڑا تھا۔ اطراف کے سب مکین مو رہے تھے۔ سب طرف کھڑکیاں کھلی تھیں مگر اکثر کمروں میں اندھیرا تھا۔ یا شب کی ہلکی نیلی روشنی ہو رہی تھی وہ ٹمٹماتی ہوئی ایک بتی کسی کی آخری امید معلوم ہو رہی تھی۔ مگر اختر کو اس کے چار سال کے لتنے سارے تجربات یہ بتانے سے عاجز تھے کہ اس کا آہنی عزم بھی اب ٹمٹما ہی رہا تھا۔ وہ کلفٹن سے بیچ لگژری تک اور بیچ لگژری سے یہاں تک، ایک عجیب کیفیت محسوس کر رہا تھا وہ کیفیت جو شکاری کے بجائے شکار کو محسوس ہوتی ہے — مارگریٹ کے لئے وہ ایک ایسا کھلونا تھا جس میں خوب کوک بھری ہوئی تھی۔ وہ دوڑ رہا ہے۔ اور وہ اس کے پیچھے قہقہے لگاتی بھاگ رہی ہے۔ کھلونے کو یقین ہے کہ وہ ایسے ہی دوڑتا رہے گا۔ کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔ مگر کھلونے میں اب کوئی چابی دینے والا نہیں ہے اور اس کی کوک تیزی سے ختم ہو رہی ہے —— کہ اندر سے مارگریٹ کے کھنک دار قہقہے کی آواز آئی۔

شفاف باؤل میں عنابی کافی کھول رہی تھی۔ وہ ہینڈل تھام کر اسے اندر لے گیا اور میز پر رکھ کر کافی سیٹ کا کچھ سامان لایا اسے ایک لمحہ ایک عجیب خلجان ایک عجیب لذت آگیں کرب محسوس ہو رہا تھا۔ دل ڈوبتا محسوس ہوتا اور یہ اسے اتنا اچھا لگتا کہ وہ اسے ڈوبنے دیتا۔ اس کی کشتی ایک ایسے گرداب میں تھی، جو ڈوبنے سے پہلے اسے جھولا جھولنے کا لطف دے رہا تھا۔

"یو سلی مین کیا تم اپنے پرانے، بالکل پتھر کے زمانے کے گانے بھی سنتے ہو" ایک ریکارڈ ہاتھ میں لئے وہ میز تک آئی۔ میز کے کنارے پر بیٹھ کر اس نے وہ ریکارڈ دکھایا اور پھر اسے رکھ کر کافی کی پیالی اٹھا لی اس کا پاؤں موسیقی کی دھن پر ہلکا ہلکا تال دے رہا تھا۔

اختر کچھ بولا نہیں۔ یہ ریکارڈ "مون لائٹ ازفار یو" اس کا اپنا پسند کردہ نہیں تھا۔ یہ ایک لڑکی کا دیا ہوا تھا۔ ایک التجا کے ساتھ "اختر ڈیر اسے کبھی کبھی سننا۔ میں گا نہیں سکتی ورنہ تمہیں خود سناتی۔ شاید میں یوں تمہاری یاد میں باقی رہ سکوں" یہ التجا بڑی اندوہ ناک تھی مگر عجیب نہیں، بلکہ اب۔ وہ لڑکی اس کی یاد میں باقی نہیں رہی مگر یہ ریکارڈ بیک میں رہ گیا۔ اختر چپ چاپ کافی پیتا رہا۔

مارگریٹ نے میز سے اٹھ کر دوسرا دروازہ کھولا۔ یہ بیڈروم تھا اندر کی بتیاں جلاتے ہی سارا کمرہ سُرخ ہو گیا۔ مارگریٹ نے سر گھما کر اختر کی طرف دیکھا۔ پھر مسکرائی۔

"تم عجیب انوکھا سا ٹیسٹ رکھتے ہو۔ مگر بہرحال یہ پسندیدہ ہے" بتیاں کھلی چھوڑ کر............................

...... اس نے دروازہ کو بند کر دیا۔ پھر وہاں سے ریڈیو گرام کے پاس گئی، اور والز کی ایک چھوٹی مدہوش کن دھن کے کئی ریکارڈ چڑھا دیئے۔ دھن بہت طویل تھی اور آٹومیٹک گرامفون پر پانچ ریکارڈ تقریباً ستره منٹ تک بجتے رہے۔

"جانے سے پہلے" مارگریٹ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر کہا: "کیا آج کی ملاقات کی یاد میں میرے ساتھ ناچو گے نہیں؟" پھر وہ مسکرا دی۔ وہی قاتل مسکراہٹ۔

"جانے سے پہلے" کہیں سے اس کے اندر سے ایک ننھی سی آواز آئی "یہ سوچ لو کیا آج کی ملاقات بس یہیں ختم نہیں ہو سکتی؟" "کیوں؟ اگر نہ ختم ہو تو کیا حرج ہے؟" اختر نے اس ننھی سی آواز سے پوچھا۔ ننھی سی آواز جہاں سے آئی تھی، وہیں چلی گئی —— اور اختر نے مارگریٹ کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا چار سال کے نشیب و فراز نے اسے سنگین چٹان بنا دیا تھا۔

"روشنی کم کر دو" اختر نے روشنی کم کر دی۔

دونوں ناچنے لگے۔

کمرہ، موسیقی کی دھن سے معمور، خواب کی دھند میں لپٹا ہوا ایک جزیرہ بن گیا تھا جس کے گرد دیواروں کے بجائے نیلگوں پانی کی ایک وسیع جھیل پھیلتی گئی۔ ٹیفنیا کا پھولدار گاؤن گیشاؤں کا سرسراتا ہوا ریشمی کمونو لگنے لگا اور والز کی دھن شریر آبشاروں کا مدھم شور —— اختر کی آنکھیں بند ہونے لگیں اس کے حواس موسیقی کی لہروں پر بہتے

ہوئے دور نکل گئے۔

لہریں اٹھتی رہیں۔ قدم بڑھتے رہے۔ چٹان جمی رہی۔

لہریں بڑھتی گئیں۔ چٹان جمی رہی۔

لہریں بڑھتی گئیں۔ چٹان گھلنے لگی

لہریں بڑھتی گئیں۔ چٹان بکھر گئی۔

ناچتے ہوئے، دروازے کے پاس پہنچکر مارگریٹ نے ہاتھ بڑھایا اور آہستگی سے ہینڈل دبادیا۔ دروازہ ہلکے ہلکے کسی عفریت کے مہیب منہ کی طرح کھلتا گیا۔ بیڈروم اندر کی سرخ روشنی سے انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ مارگریٹ اختر کی کمر میں بازو حمائل کئے، موسیقی کی لہروں پر قدم رکھتی ہوئی دھیرے دھیرے اندر چلی گئی۔

اور پھر جہنم کا منہ بند ہوگیا۔

دھوئیں کے سیاہ بادل اسے گھیرے ہوئے تھے۔

آسمان پر ملگجے بادل پھٹے ہوئے دوپٹے کے ٹکڑوں کی طرح اڑتے اڑتے پھر رہے تھے۔ ہوا دیوار سے سر ٹکرا کر ہلکے ہلکے سسکیاں بھر رہی تھی۔ بام کی ڈالیاں کسی آبرو باختہ عورت کی الجھی ہوئی زلفوں کی طرح لٹکی جھول رہی تھیں، شوخ رنگ چھتریاں آج دھوپ نہیں نماز نہ ہونے کے سبب کھولی نہیں گئی تھیں۔ وہ ٹیرلیس پر دیوار کو آڑ بنائے اس طرح بیٹھا تھا کہ ہوا کو بھی ڈھونڈے نہیں مل رہا تھا۔ برابر کی میز پر رکھا ہوا ایش ٹرے سگرٹ کے ٹکڑوں اور راکھ سے بھر چکا تھا۔ نائن نائن نائن کا نیا ٹین خالی ہو چکا تھا اور اسپنڈر کی نظموں کا مجموعہ خالی ٹن کے پاس رکھا تھا۔ دن بہت دہشتناک گذرا تھا۔ اور رات اور بھی پرہول ہوتی معلوم ہو رہی تھی۔

دھوئیں کے سیاہ بادل ابھی تک اسے گھیرے ہوئے تھے۔

یہ دھواں اوپر ہی نہیں اٹھا۔ دوسرا بادل بنانے کے لئے اسے سگرٹ کا کش نہیں لینا پڑا۔ آخری سگرٹ وہ کچھ دیر پہلے ہی ایش ٹرے میں مسل چکا تھا۔ یہ دھواں اوپر اٹھنے والا نہیں تھا۔ یہ دھواں اندر سے اٹھتا تھا اندر ہی پھیلتا تھا اندر ہی جما ہوا تھا۔

"کیا ہوا۔ ہائے یہ کیا ہو گیا"

اختر کے بچے۔ بلاؤ اپنے چار سالہ تجربوں کو اور پوچھو ان سے۔ بے ایمانو! کہاں غائب ہو گئے تھے۔ وقت پڑنے پر کیوں کام نہیں آئے۔ نمک حرامو! دفع ہو جاؤ یہاں سے۔

اختر کا حال اس وقت اس شخص کا سا تھا جس نے گرمیوں میں ایک انتہائی شاندار ایک ایسی شاہی پوشاک پہن رکھی ہو جسے دیکھ کر ہر شخص اس کی ستائش کرنے لگے۔ کہ اچانک یہ پوشاک قدیم کرم خوردہ آثار کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر بدن سے گر جائے اور وہ عام انسانوں کی طرح کھڑا رہ جائے ان ہی کی طرح اس بھاری بوجھ سے آزاد، ان ہی کی طرح ہلکا پھلکا۔ ان ہی کی طرح حقیر۔ کبھی اسے یہ بات تسکین دیتی ہو کہ چلو اچھا ہوا گرمی کی جان گسل تکلیف میں اس بے کار سے بھاری بوجھ سے چھٹکارا ملا کبھی اسے یہ خیال اذیت دیتا ہو کہ چار سال تک یہ پوشاک پہننے پر بھی وہ اس کا عادی نہ بن سکا تھا ———— وہ ابھی تک عام آدمیوں کی طرح تھا۔

ان خیالوں سے اوپر ان باتوں سے پرے ایک اور خیال اس کے ذہن میں چوری چوری داخل ہو رہا تھا۔ وہ تھا زندگی میں پہلی بار جنسی تسکین کا احساس۔ ایسے چپکے چپکے یہ خیال اندر آیا تھا کہ وہ اسے ابھی تک پہچان نہیں سکا تھا۔

اور جب یہ خیال اس پر پوری طرح چھا گیا تو وہ چونک پڑا۔

اب اسے صاف نظر آنے لگا۔ کہ آج کا دن دہشتناک اس لئے گذرا تھا کہ صبح اس کی آنکھ کھلنے سے پہلے ہی مارگریٹ رخصت ہو چکی تھی اس پر کھل گیا کہ وہ دن بھر پریشان اس لئے نہیں رہا تھا کہ اس کے ارادے کی سنگین چٹان ایک ہی ہلے میں ختم ہو گئی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ کیا مارگریٹ کا قرب پھر حاصل ہو سکے گا یا نہیں۔ وہ اسپنڈر کی نظموں کا یہ مجموعہ لایا تھا کہ مارگریٹ کو دے کر کہے گا "یہ تم کار میں بھول گئی تھیں" مگر اندر کی ایک ننھی سی آواز نے کسی دریچے سے ابھی منہ نکال کر اسے بتایا تھا "نہیں اختر۔ تم صرف کتاب واپس نہ لوٹاتے بلکہ اس سے جلدی آنے کا شکوہ کرتے۔ اس سے اس کا پروگرام پوچھتے۔ پھر اس سے والز کی دھن پر ایک بار اور ناچنے کی دعوت دیتے۔ پھر ایک بار اور۔ ایک بار اور، ایک بار اور...... یہاں تک کہ تم، ایک نہیں ان گنت،

مارگریٹل کی قطاروں کے ساتھ ناچتے ناچتے بیدم ہو جاؤ۔ تمہاری جنڈیا کے بال بھی صاف ہو جائیں اور تمہاری روزی بھی شاپنگ کرنے کے بجائے اپنے اولڈ مین سے بچ کر کسی ڈولنے سے ملاقات کا وعدہ لینے میٹروپول جائے۔"

صبح سے اب تک اس ننھی سی آواز نے کئی بار یہی بات دہرائی تھی۔ مگر اختر کے اندر بہت سی دوسری باتیں ہو رہی تھیں۔ بہت غل مچ رہا تھا۔ اس لئے وہ اس ننھی سی آواز کو نہ سن سکا تھا۔ مگر اس وقت سب دوسری آوازوں کے گلے بیٹھ چکے تھے۔ اور اختر مجبور تھا کہ دن بھر جاگنے پر بھی، اس آواز کو سن کر دوبارہ جاگ اٹھے۔

اختر نے یہ آواز تو سنی مگر پھر سر کو جھٹکا دیکر اسے یوں ڈانٹ دیا۔ "بہت بری بات ہے بڑوں کے آگے بولا نہیں کرتے" یہ سن کر وہ ننھی آواز جہاں سے آئی تھی، ایک بار پھر وہیں واپس چلی گئی۔

سورج پیلا پڑنے لگا۔

اختر اٹھنے کے لئے کرسی پر کسمسایا۔ اس کے ہاتھوں نے کرسی کے بازو پکڑ کر اسے اٹھانا بھی چاہا۔ مگر اس کے پاؤں دوبارہ پھیل گئے۔ بدن کا تناؤ ڈھیلا پڑ گیا اور کرسی کی پشت پر اس کا سر یوں ٹک گیا۔ جیسے دورہ پڑے ہوئے کسی شخص کو افاقہ ہوا ہو ـــــ اگر مسجد تک آنے جانے کے بیچ ہی میں مارگریٹ آکر چلی گئی تو۔؟

اس نے سگریٹ کیس کھولا۔ ایک سگریٹ بھی نہ تھا۔ ٹن دیکھا وہ بھی خالی۔ سگریٹ کیس رات کو خالی ہوا تھا اور یہ ٹن آج دن میں۔ ایک دن اور ایک رات میں وہ ستاون سگریٹ پی چکا تھا۔ اپنی چار سال کی عفت کا سہاگ اجاڑ چکا تھا، تین نہیں چار وقت کی نماز چھوڑ چکا تھا۔ تو وہ اب گویا اختر نہیں رہا تھا۔ وہ پنجاب لپنے گھر جا کر یہ جواب نہیں دے سکتا تھا "سچ اماں، ایک وقت کی نماز بھی قضا نہیں ہوئی آپا، ابھی میں شادی نہیں کروں گا۔ اظہر میاں، دیکھو، اس عمر میں سگریٹ نہ پینا، میں تم سے بڑا ہو کر بھی دن بھر میں صرف بارہ سگریٹ پیتا ہوں۔"

وہ اب کوئی خاص آدمی نہ رہا تھا۔

مارگریٹ آگئی۔ ارے میگی آگئی! وہی سونے کی طرح جھلملاتے بال، وہی خون میں ڈوبے ہوئے ناخن۔ وہی مخروطی انگلیاں۔ وہی شگفتہ کا پھول لا گاڈن۔ مگر نظموں کا مجموعہ اب اس کے پاس نہیں تھا۔ بیچ کی رومانیت تو اختر کے پاس ہی رہ گئی تھی۔ اور مارگریٹ کا ہاتھ خالی تھا نہیں۔ اس کا ہاتھ ایک دراز قد شکیل امریکن کے بازو میں تھا جس کی آہنی کڑیوں کی طرح ابھری ہوئی مچھلیوں پر ریشمی بش شرٹ کی آستینیں پھنسی ہوئی تھیں۔

مارگریٹ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ اس طرح کہ اس مسکرانے کو مسکراہٹ کہتے ہچکچاہٹ ہو۔ اس کی بھوری آنکھیں اس طرح چمکیں جیسے چنگاریاں ہوا پانے میں راکھ میں سے نمایاں ہو جاتی ہیں۔ اس کے لبوں کے کناروں پر خفیف سا خم پیدا ہوا جیسے تصویر بناتے ہوئے کسی مصور کا موقلم مرتعش ہو جائے۔ اور بس ـــــ یہ مسکراہٹ کسی دوست کسی انسان کسی لولے کے لئے نہیں ہوتی۔ یہ مسکراہٹ پالتو کتے کی پیار بھری نظروں کے جواب میں عنایت ہوتی ہے۔

وہ آئی۔ وہ بیٹھی۔ وہ ہنسی۔ وہ شیری کا گلاس تھامے باتیں کرتی رہی۔ وہ اس امریکن کی باتوں پر قہقہے لگاتی رہی۔ وہی کھنادار قہقہے جن سے اختر کا سبز کمرہ ابتک گونج رہا تھا۔ مگر ایک بار بھی اس نے گردن گھما کر، پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے، دھوئیں کی چادر چاک کر کے، اسے نہیں دیکھا۔

پھر وہ امریکن محبوب کے ساتھ چلی گئی

میگی چلی گئی! کیا میگی آئی تھی؟ کیا یہ لڑکی مارگریٹ ہی تھی؟

تو کیا...... تو کیا وہ اس کی جاذبیت نہ تھی۔ جس سے کل مارگریٹ اپنے گھر پہنچ کر بھی اس کے ساتھ لوٹ آئی تھی۔ اس کے ساتھ پھرتی رہی تھی کھاتی رہی تھی ناچتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ جہنم کا دروازہ بند ہو گیا تھا اور وہ دونوں شعلوں میں گھر گئے تھے۔

اختر زندگی میں پہلی بار تنہا رہ گیا۔ ماں باپ کے بغیر، بہن بھائیوں کے بغیر، دوستوں کے بغیر، پانچ لڑکیوں کے گروپ کے بغیر۔ حد یہ ہے کہ روزی کے بغیر۔ کسی سے اسے چین نہیں مل سکا تھا۔ کوئی اسے وہ آسودگی نہیں دے سکا تھا جو مارگریٹ نے دی تھی۔ اور اگر دے سکا تھا تو مارگریٹ کی طرح نہیں۔ روزی، کب سے آس لگائے ہوئے

تھی۔ مگر جس طرح وہ مارگریٹ کا پالتو کتا بننے کو تیار نہ تھا۔ اسی طرح
کسی بھی روزی کو اس طرح قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا جیسے وہ اس کا
بن داموں غلام ہو۔

اس نے کتاب کے اندرونی صفحے پر لکھا۔

My heart aches, and a drowsy numbness pains
My sense, as though of hemlock I had
drunk,
Or emptied some dull opiate to the drains
One minute past, and Lethe-wards had sunk

کتاب بند کر کے اس نے ایک نائن نائن نائن کا نیا ٹن اور بل
منگوایا اور بیرے کے آنے تک ایک فیصلہ کر لیا۔

دس کے دو نوٹ پلیٹ میں رکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ کتاب اٹھا
کر بیرے کو ہدایت کی۔ دیکھو کل جو میم صاحب ہمارے ساتھ تھیں وہ
پھر آئیں تو یہ کتاب ان کو دے دینا۔ عربی دروازے سے نکل کر اس نے
موٹر کی چھت چڑھائی، شیشے چڑھائے۔ دروازے بند کئے اور تالہ
لگا کر کنجی ہاتھ میں دبائے وکٹوریہ روڈ کی طرف چل دیا۔ اس نے مؤدب
بیرے کی موجودگی کی بھی پروا نہ کی، جو اسے پیدل جاتے دیکھ کر اتنا حیران
ہوا کہ سلام کرنا تک بھول گیا۔ کوئی بات نہیں۔ کوئی پروا نہیں،
وہ آج خود کسی کی پروا نہیں کرے گا۔ کسی نے اب تک اس کی کون سی
پرواہ کی تھی۔

چوراہے سے آگے بڑھ کر وہ ریکس تک تیز چلا گیا۔ جین رسل
کا ہیجان خیز جسم پانی کے اندر تیر رہا تھا۔ انڈر واٹر۔ سینما کے مقابل
دوسری فٹ پاتھ پر رک کر اس نے ایک سگرٹ جلایا اور ہر گزرنے والی
عورت کو ایک خریدار کی حیثیت سے دیکھنے لگا۔

کچھ دہقین کی ٹولیوں میں، کچھ، بچوں اور ادھیڑ شوہروں کے
ساتھ، کچھ برقعوں میں جسم چرائے، مگر چہرے کا صدر دروازہ کھولے
کچھ چھینٹ یا مصنوعی ریشم کے معمولی گاؤنوں میں بہت سی عورتیں
گزر گئیں۔ کسی نے اسے دور سے ایک نظر دیکھ لیا مگر پاس آ کر استغنا
کے ساتھ گزر گئیں۔ کوئی قریب آ کر اس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال
کر سہیلیوں کی باتوں پر ہنستی چلی گئی ــــ کوئی اسے قابل اعتنا بھی
نہ سمجھی اور کسی کو اس کے خریدار ہونے ہی میں شبہ رہا۔ ہر ایک کو وہ اپنی
دسترس سے بہت اونچا نظر آیا۔

ایک عورت نے بھی اسے خریدار نہ سمجھا۔

اختر نے پہلے یہ سمجھا کہ یہ عورتیں مال تجارت نہیں ہیں کیونکہ
ان میں کوئی روزی جیسی نہ تھی۔ پھر اسے خیال آیا۔ مگر روزی تو ان
پیدل نہیں پھرتی۔ ان سڑکوں پر اس کے قدم کہاں پڑیں گے۔ شاید
ان عورتوں میں روزیوں کی برادری کی کوئی لڑکی نہ تھی مگر رکشہ میں کے
پاس سے مینیفیلڈ اور پھر مڑ کر ہلکے قدموں سے پیلس کی طرف واپس جاتے
ہوئے اس نے ان ہی میں سے کئی عورتوں کو اجنبی نوجوانوں کے ساتھ
رکشا میں، موٹر رکشا میں یا پھر پیدل گزرتے دیکھا۔ اب وہ پہچاننے
لگا تھا کہ ان میں سے مال تجارت کون سا ہے اور فروخت شدہ
سامان کون سا ــــ مگر آخر یہ، مجھ سے ان سے، بات کیوں
نہیں ہو جاتی کیا میں نیا گاہک ہوں اس لئے؟

اس نے ایک اور اہم فیصلہ کر لیا۔

سامنے سے آتی ہوئی ایک اینگلو انڈین لڑکی کو اس نے تجربے
کے لئے پسند کیا۔ لڑکی آہستہ خرامی سے بڑھتی آ رہی تھی۔ وہ بائبل
سوسائٹی کے احاطے کے پاس منڈیر کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور
اپنے چہرے کو اپنی خواہشوں کا مرقع بنانے کی کوشش کی، وہ لڑکی اسے
ایک نظر دیکھ کر آگے بڑھ گئی۔ اختر مایوس ہو کر آگے بڑھنے ہی والا تھا
کہ وہ لڑکی رکی اور مڑ کر اسے دیکھا۔ اختر کا دل زور زور سے دھڑکنے
لگا۔ ایک ایسے شخص کی طرح جو خود خریداری کے لئے ایک دوکان پر
جائے اور وہاں کچھ سمجھ میں نہ آئے کہ کیا کرے، وہ کوشش کر کے کچھ مسکرایا
کہ ایک گہرے سانولے رنگ کا نیم انگریز نوجوان تیز قدموں سے اس
کے برابر سے گزرا۔ وہ گھبرا کر مونو شوکیس کی کھلی ہوئی بائبل کو دیکھنے
لگا۔ وہ نوجوان لڑکی کی طرف بڑھتا گیا۔ لڑکی مسکراتے ہوئے
اس نوجوان کو دیکھتی رہی لڑکی اب تک اس نوجوان کو ہی دیکھتی رہی
تھی۔ وہ نوجوان لڑکی کے پاس رک گیا سر کو جھٹکا دے کر خاکستری
بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے اس لڑکی نے نوجوان سے کچھ کہا نوجوان

نے مڑکر اس کی طرف دیکھا۔ لڑکی کچھ کہہ کر زور سے ہنسی اور دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھ گئے۔

وہ نہ معلوم کب تک ایسے ہی کھڑا رہتا۔ مگر بعض دفعہ آدمی بغیر جانے بوجھے بھی راہ پر چلنے لگتا ہے۔ وہ یونہی چلنے لگا۔ وہ بہت دیر سے بکل سے بے جانے بوجھے چل رہا تھا۔ وہ اب کسی کی بھی نظر کرم کا مستحق نہیں رہا تھا۔

تو وہ ایک عام آدمی بھی نہ تھا۔

اختر رویا ——— وہ رونے اس حد تک ناآشنا تھا کہ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ رویا کس طرح جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکلے۔ اس کے لبوں سے آہ نہیں نکلی۔ یہ رونا ایسا تھا کہ جیسے دیمک اندر ہی اندر لکڑی کو کھا رہی ہو۔ اسے صرف دل کی گھٹن سے اس رونے کا اس دیمک کا احساس تھا۔

مگر پیلیس تک پہنچ کر اس نے ذہن کو جھٹکا دے کر ان خیالات کو گرد کی طرح جھاڑ دیا۔ وہ ابھی مایوس نہیں ہوا تھا۔

اس کے دل میں بڑے دردناک انداز سے یہ آواز ابھری۔ ایک صرف ایک لڑکی مجھے مل جائے۔ چاہے وہ ایک ہی لڑکی میری قسمت میں ہو۔ صرف ایک لڑکی۔ ایسی لڑکی جو میرے لئے موزوں ہو، جو مجھے محبوب ہو اور میں اسے محبوب ہوں۔ ..... مگر ——— یہ آرزو کیسے پوری ہوگی؟ یہ ایک آوارہ عورت کی نہیں، ایک بیوی کی، ایک رفیق حیات کی آرزو ہے۔ یہ آرزو کیسے پوری ہو سکتی ہے۔ یہ دعا بھلا کس طرح قبول ہوگی؟

مگر ابھی وہ مایوس نہیں ہوا تھا۔

سورج روز کی طرح آج بھی ڈوب گیا۔ اور اختر کی نظریں دور سے آتی ہوئی ایک لڑکی پر پڑیں۔ جو ہلکے سبز رنگ کی قمیض سفید دوپٹے اور سفید شلوار میں ملبوس تھی۔ اختر کے قدم سست پڑ گئے اور وہ دیکھتا رہا اور وہ قریب آتی گئی اور وہ اسے پسند کرتا گیا اور وہ اسے دیکھنے لگی ——— اسی وقت مسجد سے ایک بردبار آواز نے بلند لہجے میں ایک، بہت بڑی بات کا اعلان کیا۔

اختر کا دل دھڑکتے دھڑکتے ٹھہر گیا۔ اختر کے قدم چلتے چلتے رک گئے۔ جیسے دوراہا آگیا ہو، اور اسے ایک راستے پر یقیناً مڑنا ہو۔ وہ کل رات شروع ہونے سے اب تک کئی بار اس دوراہے پر آکر رکا تھا۔ مگر آج رات ختم ہونے سے پہلے اسے طے کر لینا تھا کہ کدھر جانا ہے۔

وہ لڑکی بالکل قریب آکر آگے بڑھ گئی۔ اختر کا چہرہ پیچھے کی طرف گھوما اس لڑکی نے بھی مڑ کر دیکھا۔ وہ مسکرائی۔ اوہ! یہ مسکراہٹ ـــ مارگریٹ کی مسکراہٹ سے کتنی مختلف مگر ویسی ہی قاتل۔ اس لڑکی نے سر ہلا کر ہلکا سا اشارہ کیا۔ اس نے اشارہ کیا ہے!

اختر کا دل پھر زور سے دھڑکنے لگا

مگر وہ بردبار آواز بار بار اس سے کہہ رہی تھی، دوراہا آگیا ہے جلدی فیصلہ کرو کدھر جاؤ گے۔

دریچہ کھلا۔ اور ننھی آواز نے پکار کر کہا "دیکھو قدم اٹھانے سے پہلے ان دونوں راہوں کی انتہاؤں کو یاد کر لو۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ دیکھو سوچ لو۔ شاید دائیں طرف مڑنے سے تمہاری آرزو کسی اور صورت پوری ہو جائے۔ تمہاری دعا قبول ہو جائے"!

اختر نے ننھی آواز کا کہنا مان لیا۔

جب وہ مسجد سے باہر نکلا تو رومال ابھی تک اس کے سر پہ بندھا ہوا تھا اس نے دیوار کی گگر پر پاؤں رکھ کر جوتے کی لیس باندھی مگر اس کی بے چین نظریں اس لڑکی کو ڈھونڈ رہی تھیں اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اسے ہلکا سا پچھتاوا ہوا۔ پھر غصہ آیا۔ اپنے فیصلہ کی عجلت پر۔ وہ واپس پیلیس کی طرف چل دیا۔

سینما کے سامنے گھاس کے تکونے کے خطے کے پاس ایک درخت کے تنے پر ہاتھ ٹکائے وہی لڑکی کھڑی تھی۔

اختر کو دیکھ کر وہ اس طرح آگے آئی جیسے اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ دونوں قریب آتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے نزدیک آکر اختر بولا "میں ذرا نماز پڑھ رہا تھا"۔ وہ لڑکی بولی "کوئی بات نہیں"! پھر دونوں ساتھ ساتھ وزیر ہال کی طرف چلنے لگے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے اور کوئی بات نہیں کی۔ پھر اختر نے سگرٹ پیش کیا لڑکی نے انکار کر دیا پھر اختر نے چائے پینے کی دعوت دی۔ لڑکی نے قبول کر لی۔

فرییر ہال کی روشوں پر سے گذر کر وہ دونوں وکٹوریہ روڈ پر آگئے وزیر اعظم کی کوٹھی گذری۔ چوراہا اور بغیر سلام کرتا سپاہی گذرا۔ میٹروپول کے مقابل، کیفے گرانڈ میں دونوں داخل ہو گئے۔

کونے کی ایک میز کے گرد دونوں جا کر بیٹھ گئے۔ روشنی یہاں مدھم تھی، چائے آئی، اور گو، وقت نہیں تھا۔ مگر بیرے نے پیسٹری اور سے کی پلیٹیں بھی لا کر چن دیں۔ اختر نے پلیٹ لڑکی کی جانب بڑھائی اور وہ بلا جھجک پیٹیز کھانے لگی۔ اختر کچھ دیر دلچسپی کے ساتھ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ پھر بیرے کو بلا کر کچھ پیٹیز اور لانے کو کہا۔ دوسری پلیٹ آنے پر، اختر نے وہ اس کی جانب کھسکائی، اور خود اس طرح اوٹ کر کے بیٹھ گیا کہ ادھر اُدھر بیٹھے ہوئے کچھ لوگ۔ لڑکی کو اس طرح کھاتے نہ دیکھ سکیں۔

"کچھ اور منگاؤں؟"

"نہیں ——— آپ نہیں لیں گے کچھ؟"

"کیا تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"میرا نام سلمیٰ خاتون ہے ——— دیکھئے میں تو کھاتے چلی جا رہی ہوں اور آپ کچھ نہیں لیتے"

"لے رہا ہوں" اس نے ایک پیسٹری اٹھا کر اپنے سامنے کی چھوٹی پلیٹ میں رکھ لی۔

"بات یہ ہے" لڑکی نے اپنے کھانے کا کچھ عذر پیش کیا "کل دوپہر کے بعد سے اب تک میں نے بس دو دفعہ چائے پی ہے" اختر کو اس عذر کی ضرورت تھی۔ وہ مسکرایا۔ مگر چپ رہا۔ لڑکی کے کھانے میں الہڑپن کے ساتھ گھریلو نفاست تھی۔

مایوس ہو جانے کے بعد جب یہ لڑکی دوبارہ ملی تھی تو اختر کو اپنے پچھتاوے پر پھر اپنے غصہ پر دل ہی دل میں پشیمانی ہوئی تھی۔ مل جانے کے بعد جب وہ اور لڑکی فرییر ہال کی روشوں پر سے گذر رہے تھے تو اختر کو یہ ملاقات برسوں کی جان پہچان کے برابر معلوم ہونے لگی اور یہاں آنے کے بعد اس اجنبی لڑکی کو برابر بیٹھے بے تکلفی کے ساتھ کھاتے پیتے دیکھ کر اس کا سارا جنون سلب ہو چکا تھا۔ اس وقت اس کی ذہنی کیفیت میں ایسا ٹھہراؤ تھا۔ جیسے گھر میں بھائی بہنوں کے ساتھ کھانے پر بیٹھے ہوتے ، ہوا کرتا تھا۔ اس نے کئی بار اپنی مدھم پڑتی ہوئی آتش شوق کو بھڑکا ہے رکھنا چاہا۔ مگر ناکام رہا۔ اسی طرح، جیسے مرتے ہوئے کسی شخص کو انجکشنوں اور آکسیجن سے زندہ رکھنے کی تمام کوششیں رائگاں ہو جاتی ہیں لڑکی کی صورت اس کا الہڑپن اس کی رعنائی۔ سب کچھ ٹھیک تھا، وہ جو لباس پہنے تھی۔ جو کئی دن سے کے بعد بھی میلا نہ ہوا تھا۔ وہ بھی اس لڑکی پر خوب سجتا تھا پھر؟ سب کچھ تو ہے ——— پھر کیا بات ہے؟

چائے کے بعد بھی وہ لڑکی بہت کم بولی۔ وہ اس سے اس طرح بات کرتی جیسے کسی گہرے خیال سے چونک اٹھی ہو۔ مگر جب بھی وہ بولتی اختر کو ایک عجیب سرور ملتا۔ ناقابل بیان۔

وہ اسے لئے ہوئے پھر فرییر ہال آگیا۔ سبز روشوں سے ہٹ کر گھاس کے ایک تنہا گوشے میں وہ دونوں بیٹھ گئے۔ لڑکی کے انداز میں کچھ اضطراب سا تھا پہلے وہ منتظر سی تھی اور اب کچھ کہنا چاہتی تھی اختر کو ڈر تھا کہ کہیں وہ اس بات کو نہ چھیڑ دے۔ وہ اس لڑکی سے وہ بات کہنے سے کترا رہا تھا جس کی خاطر وہ اس سے ملا تھا۔ وہ دعا مانگ رہا تھا یہ خوب صورت سحر نہ ٹوٹے۔ وہ گفتگو کسی طرح ٹل جائے۔

"کیا کہیں چلئے گا نہیں۔ یہاں کب تک بیٹھے رہیں گے؟"

"ہوں؟ ——— ہاں" اختر بولا "اگر یہیں بیٹھے رہیں تو ——— تو کیا حرج ہے؟" اختر نے بات کو اس طرح موڑنا ٹھیک سمجھا۔

"حرج تو کچھ نہیں ——— مگر" وہ کچھ حیران سی ہو گئی "مگر میں ——— تو، کیا آپ یہیں بیٹھے باتیں کرتے رہیں گے؟"

"اگر یہی چاہوں ——— تو؟" اختر کی خوش مذاقی پھر اس کی مدد کرنے لگی۔ ان باتوں سے وہ اسی طرح لطف لے رہا تھا جیسے اپنے بھانجے کو پکڑ کر اس سے کہے: "اور تمہیں نہ جانے دوں امی کے پاس تو؟"

مگر سلمیٰ نے اس کے بھانجے کی طرح یہ جواب سن کر ضد نہیں کی کچھ دیر وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے چہرے کا اضطراب کچھ اور بڑھ گیا۔

"تم کو کچھ فکر ہے سلمیٰ؟" اپنے لہجے کی شفقت سے وہ خود کچھ حیران ہوا

"کیوں۔ آپ کیوں پوچھتے ہیں؟" اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔
"یعنی آپ اس طرح باتیں کرنا چاہتے ہیں تو میں جاؤں۔ خواہ مخواہ آپ میرا وقت بھی خراب کریں گے۔" وہ بگڑ کر اٹھنے لگی۔

"کیا واقعی سلمیٰ میں یہ باتیں کر کے تمہارا وقت ضائع کر رہا ہوں" اختر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پھر بٹھاتے ہوئے ایسے لہجہ میں کہا جیسے "اظہر میاں" کیا تم سمجھتے ہو میں تمہاری بھلائی کے لئے سگریٹ پینے سے منع نہیں کر رہا؟"

اختر کے لہجے کا تیقن اس کی آواز کی مٹھاس اس کا والہانہ انداز سے ہاتھ پکڑ کر پھر بٹھا لینا۔ سلمیٰ بالکل حیران ہوگئی۔ اس کا بگڑنا ختم ہوگیا۔ وہ شرمندگی کے ساتھ بولی: "پھر مجھے ــــــ آپ نہیں جانتے"

"میں جانتا ہوں، تم یہاں میرے ساتھ چند روپوں کی خاطر آگئی تھیں:" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا "اگر تم میرے پاس بیٹھنا، یہاں باتیں کرنا بے کار سمجھتی ہو تو یہ لو" سلمیٰ کا ہاتھ کھینچ کر اس نے چھ سات مڑے ہوئے نوٹ اس پر رکھ کر مٹھی بند کر دی "اب انکار نہ کرنا۔ تم کو قسم ہے۔ میں ناراض ہو کر نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ یہاں بیٹھنے کی قیمت نہیں۔ تم نے کہا تھا نا۔ میں نہیں جانتا، میں جانتا ہوں ــــــ پھر وہی میں نے ابھی کیا کہا؟" اختر نے سلمیٰ کی بڑھتی ہوئی مٹھی پھر واپس دھکیل دی اسے بالکل ایسا ہی غصہ آنے لگا۔ جیسے اظہر میاں عیدی واپس پھیر دیں

"اگر تم کو یہ باتیں پسند نہیں، تو آؤ۔ ہم کچھ اور باتیں کریں۔ بازار کے بھاؤ..... سنو گی؟ ہیں؟" وہ آگے کی طرف جھک کر بولا سلمیٰ کو ہنسی آگئی۔ اس نے گردن ہلا کر نہیں کہا: "اچھا تو پھر میری باتیں سنو۔"

وہ باتیں کرتا گیا اپنے گھر کی۔ اپنی ماں کی۔ اپنے بڑے بھائی کی جو لیڈر تھے۔ اپنی آپا کی جو شادی شدہ تھیں۔ اپنے باپ کی۔ جو آج کے سب سے بڑے آڑھتیے تھے اپنے رشتہ داروں کی، جو ان گنت تھے۔ پھر اپنے دوستوں کی۔ جو بہت جاں نثار تھے مگر ہر وقت ضرورت مند رہتے تھے اور پھر اپنے پنجاب کی۔ ہری بھری جھومتی ہوئی گیہوں کی بالوں کی۔ بھوسہ اڑاتے ہوئے کھلیانوں کی۔ گیہوں سے بھرے ہوئے بڑے بڑے کھتوں اور گوداموں کی۔ معلوم ہوتا تھا۔ رکے ہوئے بند کے تمام دروازے کسی نے کھول دیئے ہیں۔ مگر وہ دروازے بند رہے جن کے راستے سماترا کی جھیلوں اور شریر آبشاروں کو بہہ نکلنے کے موقع ملتے۔ آپا کی گڑیوں جیسی بچیوں کے ساتھ جاپان کی..... گیشائیں بالکل نہ آئیں۔ اختر کو اس وقت کی فضا اور اس کی پاکیزگی کا احساس تھا۔

"تب آپ یہاں ــــــ یوں کیسے پھر رہے ہیں؟" سلمیٰ اس کے متعلق کچھ کہتے ہوئے یوں جھجک رہی تھی جیسے چھوٹے، بڑوں کو ٹوکنا چاہیں مگر ٹوک نہ سکیں۔

"یہ بات بھی عجیب ہے۔ واقعی عجیب۔ مگر میں تم سے چھپاؤں گا نہیں" وہ چاہتا تھا کہ جھیل میں ذرا سا پانی بھی باقی نہ رہے۔ سب بہ جائے لاہور کی رذیلوں کے ساتھ، وہاں کے شرابی دوستوں کے ساتھ اس نے اب تک کیا کیا۔ اس نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ اور اب وہ خود اپنے ساتھ کیا کر رہا ہے۔ اختر نے ایک بات نہیں چھپائی۔ جیسے وہ آپا سے کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔

سلمیٰ اسے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں وہی رحم دل سوزی غمگساری تھی جو ایک لٹے ہوئے مہاجر کی داستان سنتے ہوئے دوسرے مہاجر میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ غریب الوطنی کی الم ناکی سے واقف ہوتا تھا

"تو آپ نے اللہ سے دعا کیوں نہیں کی کہ اللہ میری یہ مصیبت دور کر دے کیا آپ کو دعا پر بھروسہ نہیں؟" اختر جانتا تھا کہ دعا ہی بھروسے کے قابل چیز ہے۔ "مگر سلمیٰ ــــــ میں تو چار وقت کی نماز چھوڑ چکا ہوں۔" اس نے یہ نہیں کہا "پھر دعا کیسے مانگوں۔ سلمیٰ بولی: "اس سے کیا ہوتا ہے۔ آپ ابھی جا کر نماز پڑھئے گا۔ پھر دعا مانگ کر دیکھئے" اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے۔ آپ سمجھتے کیا ہیں! آپ اکنی ڈال کر تو دیکھئے، ابھی ٹکٹ نکلے گا۔ یہ وزن کرنے کی مشین ہے، مذاق تھوڑا ہی ہے۔ اختر یہ سوچ کر حیران ہوا کہ یہ نصیحت اسے وہی لڑکی دے رہی ہے جو ــــــ آگے نہ سوچ سکا۔ وہ خود بھی تو مجرم ہی ہے۔ ناکردہ گناہ کا۔

"سلمیٰ" اس نے سلمیٰ کو تاثر کے اظہار کا اور موقعہ نہیں دیا۔ وہ عورت کی نرم فطرت سے واقف تھا۔ "کیا اب بھی میں تم سے یہ نہیں پوچھ سکتا کہ تمہیں کیا فکر ہے؟"

سلمیٰ اب چپ نہ رہ سکی۔
سلمیٰ ایک مہاجر لڑکی ہے، ایک مہاجر باپ کی بیٹی۔ ماں ہندوستان

میں تقسیم سے بہت پہلے مر چکی۔ اور کوئی نہیں۔ باپ صاحب کی ڈھیلیاں اور پھڈے بنا آتا تھا۔ بیس بائیس دن پہلے تک اسے معلوم بھی نہ تھا کہ دنیا میں باپ کی محبت کے علاوہ، ہوس اور نفس پرستی کے کیا معنی ہیں۔ اور اب بیس بائیس دن بعد وہ بھولتی جا رہی تھی کہ باپ کی محبت کیسی تھی۔ اس کے باپ کے پاس ایک نئے دوست نے آکر بٹن پنچنگ کرنے کی ایک مشین رکھوائی، اور دو تین دن میں اسے اٹھائے جانے کا وعدہ کیا۔ دوسرے دن پولس نے چھاپہ مار کر وہ مشین برآمد کی۔ اور اس کے باپ کو پکڑ کر لے گئی۔ وہ مشین جعلی سکے بنانے کی تھی۔ جعلی سکے بنانے کا مجرم جس کی سزا سات سال کی۔ چھ سات دن تک وہ اپنے گھر میں روتی رہی۔ بند پنچھی کی طرح پھڑپھڑاتی رہی۔ اس کے بعد دوسروں کے ساتھ اس کو باپ کو تین سال کی سزا ہوگئی۔ پرندے کو دانے پانی کی ضرورت تھی۔ مگر وہ بلا قیمت نہیں ملتا۔ قیمت کے بغیر تو باپ دیتا ہے یا پھر شوہر۔ اس نے تین دن تین جگہ آیا۔ خادمہ اور آیا کا کام کیا، اور پھر مایوس ہوگئی، کیونکہ ان تین جگہوں پر آیا، خادمہ، یا آیا کی نہیں، داشتہ کی ضرورت تھی۔ پھر وہ خیر خواہ بڑے دسنوں کی باتیں سن کر کانپتی رہی، جن کا بہترین بے غرض مشورہ یہ تھا کہ ایک جگہ نہیں بلکہ کئی جگہ، اور ایک بار نہیں۔ بلکہ بار بار داشتہ بننے ہی میں دین و دنیا کی بھلائی ہے آخر اس نے ان سب خیر خواہوں سے مدد لینے کے بجائے خود ہی قسمت آزمائی شروع کر دی۔ کوئی دوسرا راستہ تھا ہی نہیں۔ زندگی میں چاہے سارے دروازے بند ہو چکے ہوں مگر ہمیشہ ایک دروازہ چوپٹ کھلا رہتا ہے۔ آج آٹھ دن ہو گئے ہیں۔ وہ زیادہ تجربہ کار نہیں ہوئی ہے۔ تو بھی خدا کا شکر ہے گزارہ ہو ہی جاتا ہے۔ (ہائیں خدا کا شکر ہے)

سلمیٰ کی باتیں سن کر اختر کو افسوس، پھر غصہ، پھر رحم آنے لگا پہلے افسوس ہوا، مگر وہ یہ سوچ کر ختم ہو گیا۔ اختر تمہارا منہ افسوس کرنے کے قابل ہے؟ پھر غصہ آیا، آخر دنیا میں کیا کوئی اور کام یہ لڑکی نہیں کر سکتی تھی۔ اچھا تم ہی بتاؤ کوئی کام اپنے دل کی یہ بات سن کر اس کا سر شرمندگی سے جھک گیا۔ پھر رحم اس طرح بڑھتا۔ آیا جیسے تین سال کا بچھڑا ہوا باپ جیل کے دروازے سے نکلتے ہی، بیٹی کے گلے لگانے کے لئے بیتاب، دوڑا چلا آئے، مگر وہ اس رحم کا کیا کرے۔ وہ باپ کیسے بن جائے باپ کے علاوہ اور کون چڑیوں کو دانہ پانی دیتا ہے!

"سلمیٰ اب کیا تمہارا ارادہ اسی طرح رہنے کا ہی؟"

"اللہ نہ کرے!" وہ جلدی سے بول اٹھی۔ مگر پھر یہ سوال کی حقیقت اس کے سامنے آئینہ ہوگئی "لیکن میں کیا کروں۔ میرا دنیا میں کون ہے آخر۔ ابا کے پیچھے میں جس کے پاس جاتی ہوں، وہ میرا عاشق بننے کو تیار ہے۔ یا اللہ میں کیا کروں!" اختر سے بے نیاز ہو کر سلمیٰ نے جیسے پکارا تھا۔ اس کے حضور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بائیس دن کا رکا ہوا طوفان آخر کار پھٹ پڑا، اختر کو معلوم تھا طوفان رکنے سے رکتا نہیں وہ چپکا بیٹھا رہا، مگر اس کا خیال معلوم نہیں کہاں سے کہاں تک پہنچا آپا بیوہ ہو گئی ہیں، گھر میں کہرام مچا ہوا ہے بچے رو رو کر ہلکان ہو رہے ہیں۔ سوگواری کی تصویر بنی، آپا ایک کونے میں بیٹھی ہیں۔ روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئی ہیں۔ اماں کے پاس رونے کے لئے آنسو بھی نہیں رہے وہ سکتے کے عالم میں بیٹھی بیٹی کو تک رہی ہیں۔ ان کو اپنا قلب الٹتا معلوم ہو رہا ہے مگر آنسو نہیں نکلتے۔ وہ رو نہیں پاتیں۔ یا اللہ! ....

وہ چونک پڑا۔ یہ آپا رو رہی ہیں؟ نہیں یہ سلمیٰ ہے۔ اماں کہاں ہیں؟ نہیں یہ وہ خود سکتے کے عالم میں بیٹھا سلمیٰ کو دیکھ رہا ہے اس کو اپنا قلب الٹتا معلوم ہو رہا ہے۔ اس کے آنسو نہیں نکل رہے۔ وہ رو نہیں پاتا!

طوفان کا زور ٹوٹنے لگا۔ طوفان ہلکا ہوا، طوفان ختم ہوگیا اب بھی کبھی تیز آتے ہوئے ہوا کے جھونکے باقی رہ گئے۔ اب بھی سلمیٰ کی ہچکیاں نہیں تھمی تھیں۔

اختر کا ہاتھ بڑھا۔ اس کے دوپٹے کا پلو تھا۔ اور رخساروں پر جھلملاتی ہوئی موتیوں کی آخری لڑیاں پونچھ دیں۔

سلمیٰ نے ایک بار نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اف! ان میں اس کے لئے کتنی عزت تھی۔ کتنی پرواہ۔ "پرواہ،" جو اس کا خیال تھا کسی کے دل میں اب اس کے لئے نہیں ہے۔ نہیں ہو سکتی۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔

"آیئے اب اٹھیں۔ وہ سامنے دو سپاہی گھوم رہے ہیں..... بیکار آپ کو پریشان کریں گے" سلمیٰ کو اس کی اتنی پرواہ کیوں ہے۔ اس کی عزت کا اتنا خیال کیوں ہے۔ دونوں اٹھ گئے۔ سپاہیوں کے برابر سے گزرتے ہوئے سلمیٰ نے دوپٹے سے سر ڈھک لیا اور اختر کے برابر جھکے چاپ چلتی رہی۔ سپاہی دونوں کو دیکھتے رہے کچھ بولے نہیں۔

سیڑھیوں سے اتر کر اس نے گھوڑا گاڑی روکی۔ دونوں اس میں سوار ہو گئے "کلفٹن چلو"

اختر نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا اور کھول کر اس کی طرف بڑھا دیا سلمٰی نے اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ایک سگریٹ نکال کر اسے دیا اندر باہر سے اسے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ پھر بند کر کے اسے واپس دے دیا۔ اختر کے لائٹر نکالنے پر بھی اس نے ہاتھ بڑھا کر لے لیا۔ بڑی احتیاط اور نزاکت سے اسے جلایا۔ ہوا سے بچانے کے لئے ایک ہاتھ سے اوٹ کر کے اس کی طرف بڑھایا اور جب اس نے سگریٹ جلا لیا تو لائٹر بجھا کر خود اس کی جیب میں ڈال دیا۔

اختر چونک پڑا۔

مارگریٹ نے کل اپنا سگریٹ سلگا کر ایسے ہی لائٹر اس کی جیب میں ڈال دیا تھا۔ تب سمندر میں ابال آ گیا تھا۔ اور اب۔ اب سمندر میں موجیں رقصاں تھیں۔ کتنا عجیب، کتنا عظیم فرق، مارگریٹ کے لئے وہ خوب کوک بھرا کھلونا تھا۔ اور سلمٰی کے لئے .... سلمٰی کیلئے؟ ہاں، مگر سلمٰی کے لئے وہ کیا تھا آخر؟

وہ سوچنے لگا۔

بہت دیر تک دونوں اپنے خیالوں میں غرق بیٹھے رہے۔ وہ الگ وہ الگ۔ اختر نے نظریں چرا کر چاندنی میں نہائی ہوئی سلمٰی کی طرف دیکھا وہ سر جھکائے، ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو تھامے، اور دونوں ہاتھوں کو گود میں رکھے بیٹھی تھی۔ نصف سر تک اس کا دوپٹہ ڈھلکا ہوا تھا۔ اور چہرے کا آدھا حصہ دوپٹے کی اوٹ میں یوں چھپا ہوا تھا۔ جیسے چاندنی چادر بن کر سامنے تن گئی۔ یہ۔ یہ سلمٰی کس طرح بیٹھی ہے، اسے اس طرح دیکھ کر اسے کون یاد آ رہا ہے؟ ہاں آپا۔ اپنی رخصتی کے دن وہ کمپارٹمنٹ میں وہ اسی طرح دلہن بنی بیٹھی تھیں۔ اور وہ پلیٹ فارم پر کھڑا ان کے دولہا سے باتیں کر رہا تھا۔ سلمٰی۔ افسوس۔ تم ابھی تک دلہن نہیں بن سکیں ابھی تک تم کسی دولہا کے ساتھ رخصت نہ ہو سکیں۔ وہ پھر کچھ سوچنے لگا۔

کلفٹن آ گیا۔

اختر اترا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سلمٰی کو اتارا۔ دونوں برج کی طرف بڑھے۔ برج کے غربی طرف پچھلے حصہ میں ساحل کی طرف رخ کر کے اس نے سہارا دے کر پہلے سلمٰی کو بٹھایا۔ اور پھر خود بیٹھ گیا۔ خنک ہوا کے جھونکوں سے دوپٹہ سر سے گر گیا اور اس کے بال پریشان ہو گئے۔

گاڑی میں سے ہاتھ پکڑ کر اتارتے ہوئے اختر کو ایسا معلوم ہوا جیسے سلمٰی اپنی سسرال میں دلہن بن کر اتر رہی ہے۔ یہاں چبوترے پر سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے ایسا لگا جیسے حجلۂ عروسی میں آ کر وہ مسہری پر بیٹھی ہے مگر۔ مگر اس کا دولہا کہاں ہے؟ دولہا۔ بس ایک دولہا چاہیئے۔ جو اس کے لئے موزوں ہو، جو اسے محبوب ہو اور جیسے یہ......

جیسے بجلی چمک گئی۔ ارے! یہ دولہا تو وہ ابھی خود مانگ چکا ہے۔ اپنے لئے۔ ایک لڑکی کی۔ نہیں بلکہ ایک رفیق حیات کی۔ اختر کو در اصل ایک دلہن کی ضرورت تھی سلمٰی کے لئے بر درکار تھا۔

اوہو۔ یعنی اتنی دیر سے اب تک وہ جو کچھ سوچتا رہا تھا وہ یہ تھا۔

اس نے اچانک اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"سلمٰی۔ مجھ سے شادی کر لو"

جملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ مقابل کو ہتھیار اٹھانے کی ہمت نہیں ملی۔ اور پھر فوراً ہی دوسرا۔

"بولو۔ تم کو اللہ کا واسطہ۔ بتا دو۔ کیا مجھ سے شادی کر سکتی ہو"

وہ بے تابی کے عالم میں چبوترے سے اتر کر اس کے سامنے آ گیا۔ جیسے کاسۂ گدائی لئے کوئی فقیر در پر صدا دے رہا ہو۔

سلمٰی کے لب حیرانی کے عالم میں نیم وا تھے۔ اس کی دراز پلکوں کے نیچے پھیلی ہوئی سیاہ پتلیاں جھانک جھانک کر اس عجیب نوجوان کو دیکھ رہی تھیں جو ذرا پہلے سلمٰی کی زندگی میں در آیا تھا اور اب اس کی زندگی میں بس جانے کی التجا لئے کھڑا تھا۔ وہ کیسے یقین کر لے۔ اتنی جلدی یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔ نہیں نہیں۔ یہ سب جھوٹ ہے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ یہ ایک نئی چال ہے ——— مگر کس لئے؟ ہائے۔ یہ کس کس طرح کھیلے جا رہے ہیں!

اختر نے جو کچھ کہنا تھا وہ ایک ہی بار کہہ دیا۔ مگر اس کا دل اسے بار بار یہی کہلوا رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ دل کو بھی یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ اختر ہی کہہ رہا ہو مگر بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ دل کو پتہ بھی نہیں ہوتا اور دماغ بڑے بڑے اہم موڑ مڑ جاتا ہے۔ اختر کی زندگی میں یہ ایک اہم موڑ تھا۔ کل سے اب تک اس کی زندگی میں دو موڑ آ چکے تھے۔ ایک موڑ پر اسے

یہ پتہ لگ گیا کہ وہ کیا نہیں ہے، اور دوسرے پل ابھی ملنے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ کیا ہے ــــــــ وہ اپنی زندگی کے ساتھی کا متلاشی ہے۔

"بولو سلمیٰ۔ میں اتنی دیر سے اتنی بات کے لئے تم سے پوچھ رہا ہوں اور تم چپ ہو؟"

"اسی لئے تو چپ ہوں": سلمیٰ کی آواز کہیں دور سے آئی۔ ایک جھرجھری سی اس کے سارے بدن میں آئی اور گذر گئی۔ وہ جہاں تھی، وہاں سے لوٹ آئی۔ تب وہ سنبھل کر بولی: "آپ یہ کیسی باتیں کرنے لگے۔ آپ جائیے۔ اپنے گھر جائیے۔ ماشاءاللہ آپ کی آپا ہیں۔ آپ کی ماں سلامت ہیں۔ ان سے کہیئے وہ آپ کا بیاہ کریں گی۔ مجھے، کیوں......" اس کا گلا رندھ گیا۔

"مجھے معلوم ہے سلمیٰ اماں میری شادی کہاں کریں گی": وہ کچھ تلخی سے بولا: "جہاں ابا کی مرضی ہوگی۔ اور جانتی ہو ابا کی مرضی کہاں ہوگی۔ ٹوانوں میں سلمیٰ۔ ہم ٹوانوں سے باہر شادی نہیں کر سکتے۔ ہمارا خاندان بہت اونچا ہے ہماری ناک بہت لمبی ہے۔ اور ٹوانوں کی تمام لڑکیاں بے تحاشہ جہیز لے کر آتی ہیں۔ ہیں وہ بھی سب ایک سے ایک اعلیٰ۔ اعلیٰ درجہ کی پڑھی لکھی۔ بالکل روزی کی طرح۔ سلمیٰ کیا میں روزی سے شادی کر لوں؟ بولو۔ کیا مجھے کسی روزی سے شادی کر لینی چاہیئے؟"

"نہیں ــــــــ مگر"

"مگر کیا؟ میں تم کو سب کچھ تو بتا چکا۔ میں ایک اونچے گھرانے میں پیدا ہو گیا۔ کیا یہ بات لعنت بن کر زندگی بھر میرے ساتھ چمٹی رہے گی۔ کیا اسی کی وجہ سے میں تم سے شادی بھی نہیں کر سکتا؟ ــــــــ یا تم ان باتوں کو مکاری سمجھ رہی ہو۔؟ خدا کی قسم سلمیٰ۔ میں مکار نہیں ہوں۔ میں بدمعاش نہیں ہوں۔ مگر میں نہیں جانتا کہ اگر میں ایسے ہی رہا تو کیا ہو جاؤں گا۔ بتاؤ۔ للہ جواب دو"

سلمیٰ جواب کیا دیتی۔ اس کے پاس قدیم صدیوں پرانے زنگ خوردہ ہتھیار تھے۔ ان سے بھلا وہ کیسے لڑتی۔ پھر۔ اس ہار میں بھی تو جیت کی حلاوت گھسی ہوئی تھی۔ وہ ہار مان گئی: "کیا آپ مجھ سے ــــــــ مجھے اپنی کنیز بنانے کے لئے تیار ہیں؟" اس کی بائیس دن کی کجلائی ہوئی حیا پھر دمک اٹھی۔

اختر اور سلمیٰ جب گھوڑا گاڑی میں لوٹ رہے تھے تو چاندان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ستارے سرگوشیاں کر رہے تھے اور اختر اصرار کر رہا تھا کہ ابھی نہیں تو صبح کو وہ اپنے دو تین دوستوں کے ساتھ سلمیٰ کے گھر آ جائے پھر وہیں یا کسی مسجد میں وہ دونوں اس مستحکم رشتہ میں باندھ دیئے جائیں۔ سلمیٰ کو تامل تھا اس کا گھر کہاں ہے۔ وہ ایک جھونپڑی ہے۔ مہاجر کالونی میں۔ کیا اس کی بارات کسی جھونپڑی میں آئے گی۔

"اچھا تو میرے گھر چلی چلو۔ صبح کو میں سب کو وہیں بلا لوں گا ــــ نہیں؟ کیوں۔ شادی سے پہلے اس گھر میں جانا نہیں چاہتیں"

"آہستہ بولئے": سلمیٰ لجا کر بولی: "یہ گاڑی والے کا بھی تو خیال نہیں کرتے۔"

"پھر تو ایک ہی جگہ سب سے مناسب ہے۔ فریگا روڈن میں جہاں ہم بیٹھے تھے۔ وہی جگہ۔ بس وہیں سے ٹھیک آٹھ بجے میں تم کو آ کر لے جاؤں گا۔"

سلمیٰ نے ہلکے سے سر ہلا دیا۔ یہ معلوم اسے اتنی شرم کیسے آنے لگی مگر بات بھی تو عجیب ہے۔ اس کے وہم میں بھی یہ بات آئی تھی کہ وہ خود اپنے دولہا سے، شادی سے پہلے باتیں کرے گی، شادی کا وقت اور جگہ طے کرے گی۔ اور جگہ بھی کیسی ایک پبلک پارک جہاں نہ کوئی دلہن کو رخصت کرنے والا۔ نہ سر پر محبت سے ہاتھ پھیرنے والا۔ باپ جیل میں۔ اس کا بابل سلاخوں کے پیچھے کھڑا رہے گا۔ اور وہ رین بسیرا کر کے اڑ جائے گی۔ ہائے اللہ!

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

میٹروپول کے پاس پہنچ کر اختر نے گاڑی رکوائی۔ اتر کر کرایہ دیا۔ اور گاڑی بان کے سلام کا جواب ہاتھ کے اشارے سے دے کر سلمیٰ کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ اس کا رخ پیلیس کی طرف تھا۔ جہاں دونوں ملے تھے۔ جہاں مسجد تھی۔

"اب۔ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ نماز پڑھنے؟" وہ نظریں جھکائے ہوئے بڑی دقت سے بولی۔

"کیوں۔ تمہیں گھر چھوڑنے نہ چلوں": اختر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اختر کے دل نے اس سے کہا۔ اختر یہ پوری چڑیل ہے بہت ہی پیاری چڑیل۔

"نہیں، میں خود ——— میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ آپ جائیے۔ جاکر نماز پڑھئے اور اپنے لئے اور میرے لئے دعا مانگئے۔" اس نے یہ آخری بات منہ سے نہیں کہی۔ مگر اختر کے دل نے سن لی۔

اختر کے اصرار کرنے پر سلمیٰ نے اونچی نظریں کر کے اسے یوں دیکھا۔ جیسے یہ پہلی بات ہے۔ آج پہلی بات بھی نہیں مان رہے؟ اختر مان گیا۔ کل صبح کا وقت یاد دلاکر میٹروپول کی طرف لوٹ گیا۔ اور سلمیٰ صدر کی طرف۔

کاریڈور پر پہنچ کر ایک بار مڑکر اس نے دیکھا۔ وہ سر پر بہت اہتمام سے دوپٹہ ڈھکے، سر جھکائے، نئی دلہن کی طرح بہت ہلکے قدموں سے فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔ اختر کو اس کی یہ ادا بہت بھائی۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ وہ اس وقت تنہا کیوں جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنے دل کو اس عظیم مگر خوشگوار حادثے کا یقین دلانا چاہتی تھی۔ مگر تنہائی میں۔

وہ مسرور قدموں سے ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اندر جاکر اسکواش کا ایک گلاس پینے کے لئے اس نے بار کا رخ کیا۔ بال روم سے جاز کی موسیقی لہروں کی طرح ہلکورے لیتی دروازے کے پاس پہنچ رہی تھی۔ کاریڈور کے پاس سے گذر کر جب وہ آگے بڑھا تو ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

ایک چھوٹی سی ٹیبل پر اسپنڈر کی نظموں کا مجموعہ رکھا تھا۔

وہ کچھ اور آگے بڑھا۔ اب ٹیبل کے برابر کی آرام کرسی، پشت کے بجائے، پہلو کی طرف سے نظر آنے لگی۔ اس کی نگاہ کرسی کے بازو پر رکھی ہوئی مخروطی انگلیوں کی طرف گئی۔ خون میں ڈوبے ہوئے ناخنوں کی طرف گئی سونے کی طرح جھلملاتے ہوئے بالوں کی طرف گئی۔

مارگریٹ آرام کرسی پر نیم دراز گردن موڑے، اپنی بھوری خمار آلود آنکھوں سے اسے تک رہی تھی۔ وہ آہستہ سے اٹھی۔ اسے دیکھ کر پھر مسکرائی پھیکی مسکراہٹ سے۔ "ہلو اختر"

اختر کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ کیا کرے۔ ہاتھ ملانے کے بعد وہ چپکا کھڑا رہا دور سے ان کو دیکھ کر بیرر بڑھا۔ اس نے دو ادرنج اسکواش کا آرڈر دے دیا۔

"نہیں۔ ایک چھوٹا اسکاچ" مارگریٹ کی آواز میں لرزش کا گمان ہوتا تھا۔

بیرر نے دوسری آرام کرسی قریب کھسکا دی۔ اختر بیٹھ گیا۔ اس کے منہ سے نکلا "تمہارا دوست امریکن۔ کیا وہ چلا گیا؟"

"اوہ۔ وہ سوائن! ——— ہاں وہ چلا گیا۔ بدمعاش مجھے سامنے بٹھاکر جب سے اب تک پیتا رہا میں چپ رہی۔ پھر میرا پرس لے کر اس میں جو کچھ تھا اس کی بھی منگواکر پی گیا۔ پاگل ہو گیا تھا۔ فلور شو شروع ہونے سے پہلے ہی وہ بالکل آف ہو چکا تھا۔ بیررز نے بڑی مشکل سے اٹھاکر اسے ٹیکسی میں ڈالا۔ لوگ ہم پر ہنس رہے تھے۔ میرا موڈ اتنا خراب ہو گیا تھا کہ اسے چھوڑ کر دوسری ٹیکسی میں بیٹھی اور بیچ لگژری سے سیدھی یہاں چلی آئی ٹیکسی ابھی باہر ہی انتظار میں کھڑی ہے۔ کتنے گرے ہوئے ہوتے ہیں امریکن" اس کا آدھا انگریزی خون جوش میں آرہا تھا۔ "اور میں نے خیال کیا تھا میں سمجھی تھی کہ"

مارگریٹ کچھ کہہ نہ سکی۔ مگر اختر سمجھ گیا کہ ——— "میں بھی سمجھی تھی وہ اپنے آہنی کڑیوں سے بنے ہوئے جسم کے سبب تم سے بھی بازی لے جائے گا۔ اور میری آسودگی اپنی انتہا کو پہنچ جائے گی۔ مگر قسمت بری رہی۔ بیڈلک" اختر سمجھ کر بھی کچھ نہ بولا۔

بیرر نے دونوں گلاس ٹیبل پر رکھ دیئے اختر نے تین دس کے نوٹ اسے دے کر کہا "باہر ٹیکسی کھڑی ہے۔ اس کا میٹر دیکھ کر جتنا ہو دے دو اور بل لاؤ" بیرر چلا گیا۔

اختر اسکواش پیتا رہا۔ مگر مارگریٹ نے اپنا گلاس خالی کر کے رکھ دیا۔ "اختر ڈیر" وہ اچانک بولی "کیا مہربانی سے مجھے گھر تک پہنچا دو گے"

اختر انکار نہ کر سکا۔

بیرر نے ایک پلیٹ جس میں ایک نوٹ اور کچھ روپے تھے میز پر لاکر رکھی۔ اور دوسرے پلیٹ میں بل پیش کیا۔ اختر نے پلیٹ ہی میں، بل پر نظر ڈال کر، میز والی پلیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا "ٹھیک ہے"۔

بیرر سلام کر کے ایک طرف ہٹ گیا۔ دونوں کھڑے ہو گئے ——— مارگریٹ نے اپنا پرس اٹھایا اور ٹیبل پر سے اسپنڈر کی نظموں کا مجموعہ اٹھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ پھیکی مسکراہٹ۔ دونوں الگ الگ چلتے ہوئے جونہی دروازے تک آئے اختر نے دروازہ کھولا مارگریٹ گذر گئی تو وہ باہر آیا۔ تالہ کھولا۔ کار کے شیشے اتارے۔ دروازہ کھول کر

مارگریٹ کو بٹھایا اور خود دوسری طرف سے جاکر بیٹھ گیا۔

"تمہارے پاس سگرٹ ہے؟"

اختر نے سگرٹ کیس نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور موٹر اسٹارٹ کر کے چلا دی۔

"یہ کیا ہے؟" مارگریٹ نے کھلے ہوئے سگرٹ کیس کو دیکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ اسپیڈ میٹر کی ہلکی روشنی میں اس نے دیکھا کہ سگریٹ کیس کے اندر کچھ مڑے ہوئے نوٹ ایک طرف لٹکے ہوئے ہیں ـــــ یہ نوٹ اس میں کیسے آگئے؟ ـــــ اوہ! سلمیٰ۔

"کچھ نہیں۔ جلدی میں شاید کہیں رکھ دیتے ہیں۔" اس نے سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اسٹیرنگ پر اس کے ہاتھوں کی گرفت سخت ہو گئی اس کی دلہن نے: اس کی بیوی نے یوں اپنے اعتماد کا ثبوت دیا۔ مارگریٹ نے سگریٹ کیس اس کی طرف بڑھایا اس نے ایک سگریٹ لے کر لبوں میں دبایا۔ بند سگرٹ کیس لے کر اس نے جب جیب میں رکھا تو جذبات کے سبب ہاتھ میں ارتعاش محسوس ہوا، لائٹر نکال کر اس نے مارگریٹ کو دیا۔ اور سلمیٰ کی یاد میں کھو گیا...... زندگی ایک تاریک رات تھی جس کے بھیانک سناٹے میں رو بزیوں کے قہقہے ڈراؤنی چیخوں کی طرح گونجتے تھے۔ کہ سلمیٰ محبت کی شمع جلائے دور سے ایک دمکتے ستارے کی طرح نمودار ہوئی اور قریب آتی گئی، قریب آتی گئی، یہاں تک کہ...... اس کے چہرے کے سامنے ایک ہاتھ سے اوٹ کیا ہوا ایک شعلہ آگیا ـــــ سلمیٰ اس کا سگرٹ جلا رہی تھی۔

مگر یہ مخروطی انگلیاں؟ یہ خون میں ڈوبے ہوئے ناخون؟

اس نے منہ موڑا۔ مارگریٹ دونوں ہاتھوں سے لائٹر کو اس کی طرف بڑھائے جھکی ہوئی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر یہ بناوٹی مسکراہٹ کا غازہ کب سے ملا ہوا تھا۔ کیا یہی مارگریٹ کا اصلی روپ ہے اس نے سامنے کی طرف منہ کر لیا۔ لائٹر کی لو پھر اس کے سامنے تھی۔ نہیں۔ اس شعلے میں وفا کی آنچ نہیں جہنم کی تپش ہے۔ وہ سلمیٰ کی یوں توہین نہ کرے گا۔ کسی کو بھی نہ کرنے دے گا۔

سگرٹ سلگائے بغیر لائٹر کو مارگریٹ کے ہاتھ سے لے کر اس نے بند کر دیا۔ جب جمخانہ کے پاس کار روک دی۔ اور سینما کے مقابل کھڑی ہوئی موٹروں کی طرف منہ کر کے اس نے زور سے آواز دی "ٹیکسی"!

"مارگریٹ۔ خدا کرے یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔ میری اس بدتہذیبی کو معاف کرنا۔ شاید تم ٹیکسی پر جانا ناپسند نہ کرو گی ـــــ یہ لو" سگرٹ کیس اس کے ہاتھ میں دے کر بولا "اچھا۔ بائی۔ بائی۔"

مارگریٹ کے کھلے ہوئے منہ سے صرف اتنا نکلا "اختر ـــــ ڈیئر" کہ ٹیکسی برابر آکر رک گئی "بائی بائی" سن کر وہ ایک لمحہ متامل رہی۔ پھر اس نے کار کا دروازہ کھولا۔ اور اتر کر ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

ٹیکسی چلی گئی۔

اختر نے بغیر ہاتھ اٹھائے ایک دعا مانگی اور پھر اس کی مقبولیت کی خاطر لرزتے ہوئے ہاتھوں اسٹیرنگ پکڑ کر کار بڑھا دی۔ فٹ پاتھ پر اس کی محبس نظریں موٹر کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھیں۔ رکھیں گذرا فٹ پاتھ چلتا گیا۔ ارے! سر پر اہتمام سے دوپٹہ ڈھکے، مرجھکائے نئی دلہن کی طرح بہت ہلکے قدموں سے یہ کون جاتا معلوم ہوتا ہے۔ وہ قریب آیا، موٹر ہلکی ہوئی، موٹر رک گئی۔ اختر کی آواز نکلی۔

"سلمیٰ!"

یہ آواز اس بچے کی پکار تھی جو کوئی ہیبت ناک خواب دیکھ کر چیخ اٹھے۔ اختر دروازہ کھول کر اس کے پاس گیا۔ اس سے کچھ بولا نہیں۔ بس اس کا ہاتھ پکڑ کر اس نے موٹر میں بٹھا دیا بمشکل، اسٹیرنگ تھام کر گاڑی اسٹارٹ کی اور انتہائی تیزی سے موڑ کر کلفٹن کی طرف چھوڑ دی۔ چوراہا رکیس چوراہا میرا دپول چوراہا وزیر اعظم وزیر ہاں چوراہا پل چڑھتی آن واحد میں کلفٹن کی سڑک کا دو طرفہ میدان آگیا۔ سڑک سے اتر کر کار ریس کورس کی طرف بڑھی اور کچھ دور بعد ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔

اسٹیرنگ کی طرف، ہوا کے نرم جھونکے کی طرح اختر کا چہرہ مڑا۔ اور سلمیٰ کو اپنی طرف اٹھی ہوئی آنکھوں میں جھلملاتے آنسوؤں کے طوفان نظر آئے، اس کے لب کچھ کہنے کے لئے وا ہوئے۔ اور اس کا مضطر ہاتھ اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اختر نے سے تھام کر اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

انیس برس کا رکا ہوا سیلاب پہاڑوں کی بیڑیاں توڑ کر ابل آیا تھا۔ اور اب کسی کے روکے نہیں رک سکتا تھا۔ اس سیلاب میں خود جنگل

خاردار درخت جنگلی جھاڑیاں، خس وخاشاک، سب کچھ بہہ گیا۔ چار سال کے تجربوں کی زہریلی گھاس بہہ گئی۔ روزیوں کی لگائی ہوئی آگ کا نام ونشان باقی نہ رہا۔ شراب کے چاروں طرف اٹھتے ہوئے بھبکے ختم ہو گئے۔ اس چٹان کی سیاہی بھی دھل گئی جس پر مارگریٹ بجلی بن کر گری تھی۔

سیلاب ختم ہو گیا۔

تازہ زمین، نئی زرخیز مٹی سے مالا مال، اب اپنی نعمتیں اگلنے لہلہا اٹھنے کو تیار ہو گئی۔۔

تب ایک چھوٹا سا دریچہ کھلا اور ایک ننھی سی آواز نے باہر نکل کر دوسری آواز کو پکارا، ایک دوسرا دریچہ کھلا اور دوسری آواز مسکراتی ہوئی نمودار ہوئی ——— دونوں آوازیں بڑھ کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئیں۔ ایک دوسرے سے تہنیت کے الفاظ کہے ——— اور مسرور قدموں کے ساتھ پھر اپنے اپنے دریچوں کی طرف چلی گئیں۔

(بشکریہ "معیار")

صبا جائسی

آج کی رات

زندگی باندھ لیا رختِ سفر آج کی رات
سازِ دل چھیڑ بہ اندازِ دگر آج کی رات

کیوں سکوتِ شبِ تاریک میں بیٹھی ہو خموش
تیرے در پر کسی سرکش کا ہے سر آج کی رات

یہ تو سچ ہے کہ مری آنکھ ہے اشکوں سے بھری
یاد آتی ہے مجھے "اُسکی" نظر آج کی رات

یہ تو سچ ہے مجھے گھیرے ہیں وہ گذرے لمحے
ذہن میں ہے وہی اب راہگذر آج کی رات

مدتوں جس پہ چلا قافلۂ شوق مرا
جم گئی ہے اُسی وادی پہ نظر آج کی رات

دورِ رفتہ کی حسیں یادوں کا دل میں ہے خمار
کیسے سنبھلے گا بھلا دیدۂ تر آج کی رات

یاد آتے ہیں ان آنکھوں کے لرزتے آنسو
پا نہیں سکتا جن اشکوں کی خبر آج کی رات

درد اٹھتا ہے جو سینے میں تو کہہ جاتا ہے
جشنِ بربادیٔ دل ہے مرے گھر آج کی رات

کون سنتا ہے مری روح کی فریاد مگر
چشمِ گریاں تو ہی اب جام نہ بھر آج کی رات

منتظر ایک طرف موت کا آغوشِ مہیب
چھین لے بڑھ کے مرا ذوقِ سفر آج کی رات

زندگی ایک طرف نغمہ کناں جام بکف
ڈوبتی جاتی ہے اب نبضِ خطر آج کی رات

زندگی میں تری آواز پہ اٹھا ہوں مگر
روکتا ہے یہ مرا دردِ جگر آج کی رات

کش مکش لاکھ رہی فیصلہ کر ہی ڈالا
میری دنیا تو ہوئی زیر و زبر آج کی رات

شمع تھرّائے کہ اک روز تو بجھنا ہی اسے
ہاں سلامت رہے یہ رقصِ شرر آج کی رات

ہاں کچھ اس طرح بڑھے دردِ جگر آج مرا
یاد آئے نہ محبت کی نظر آج کی رات

آج ملجائیں کچھ اس طرح سے یہ زیست و جنوں
عقل حیراں ہو پسِ پردۂ در آج کی رات

ایک اک کر کے بجھے جاتے ہیں یادوں کے چراغ
یہ جنوں خیز ہے طوفاں کا اثر آج کی رات

زندگی دیکھ وہ کانٹے بھی تو اب پھول بنے
کتنا محکم ہے مرا عزمِ سفر آج کی رات

———•••———

قتیل شفائی

یہ اُداس اُداس ٹھنڈک جو اسیر ہے پون میں
کہیں بجلیاں نہ بھر دے کسی گوشۂ چمن میں

یہ عجیب فصلِ گل ہے کہ کسی بھی گل کی رنگت
نہ جچی مری نظر میں، نہ رچی ترے بدن میں

میں طلوعِ صبحِ نو سے ابھی مطمئن نہیں ہوں
ترا حسن بھی تو ہوتا، کسی خوشنما کرن میں

سرِ بام بھی پکارا لبِ بام بھی صدا دی
میں کہاں کہاں نہ پہنچا تری دید کی لگن میں

مری مفلسی سے بچ کر کہیں اور جانے والے
یہ سکوں نہ مل سکے گا تجھے ریشمی کفن میں

میں لئے لئے پھرا ہوں غمِ زندگی کا لاشہ
کبھی اپنی خلوتوں میں کبھی تیری انجمن میں

ترے غم میں بہہ گیا ہے مرا ایک ایک آنسو
نہیں اب کوئی ستارا جو چمک سکے گگن میں

میں قتیل وہ مسافر ہوں جہانِ بے بسی کا
جو بھٹک کے رہ گیا ہو کسی اجنبی وطن میں

(بشکریہ "شمع" لاہور)

ادیب سہارنپوری

کبھی جن کے خواب دیکھے تھے کہاں ہیں وہ سویرے
وہی روشنی کی حسرت وہی تہ بہ تہ اندھیرے

تری جیت ہے نہ میری ترے خواب تھے نہ میرے
یہ لٹی لٹی بہاریں، یہ بجھے بجھے سویرے

بڑے ناز تھے کہ دیکھیں گے بہارِ فصلِ گل کی
مگر آہ پھول مہکے تو اُجڑ گئے بسیرے

نہ غموں کی آبرو ہے نہ بھرم مسرتوں کا
مجھے ایسی روشنی سے تو بُرے نہ تھے اندھیرے

یہ نویدِ قربِ منزل میں خیال ہی نہ آیا
کہ لباسِ رہبری میں ہیں چھپے ہوئے لٹیرے

کڑی دھوپ میں جو نکلے تھے وہ منزلوں پہ پہنچے
وہ ہنوز راہ میں ہیں جو چلے تھے منہ اندھیرے

مرے گیت میرے نغموں کی زباں کہاں سے بدلے
کہ ادیب آج بھی ہیں وہی صبح و شام میرے

(بشکریہ "نیا دور")

مولانا امین احسن اصلاحی

اسلامی ریاست میں عورتوں کے حقوق

اسلامی ریاست میں جس طرح مردوں کو حقوق حاصل ہیں اسی طرح عورتوں کو بھی حقوق حاصل ہیں اور جس طرح مردوں پر فرائض عائد ہوتے ہیں اسی طرح عورتوں پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ بحیثیت شہری کے ایک مسلم اور ایک مسلمہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن دونوں کے حقوق و فرائض کی نوعیت میں کچھ اختلاف ہے اور یہ اختلاف دو اہم حقیقتوں پر مبنی ہے جن کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

اولاً یہ کہ اسلام مساواتِ مرد و زن کے اس مغربی نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا جو عورت اور مرد کی صلاحیتوں میں سرے سے کوئی فرق ہی نہیں کرتا اور دونوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں بالکل یکساں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اسلام اس مساوات کو مساوات قرار نہیں دیتا، بلکہ اس کو ظلم قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اول تو عورت اور مرد کے طبعی رجحانات و میلانات میں بڑا فرق ہے۔ دوسرے خاندان کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا بوجھ پہلے سے عورت کے اوپر لدا ہوا ہے جس کو اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں اٹھا سکتا۔ اس وجہ سے یہ بالکل خلاف انصاف ہے کہ اس کے اوپر ریاست کی ذمہ داریاں بھی بالکل مرد کے برابر لاد دی جائیں۔

ثانیاً، اسلام معاشرہ کے اخلاقی تحفظ کے لئے دونوں صنفوں کو الگ الگ رکھنا چاہتا ہے اور اس کے لئے اس نے نہایت تفصیل کے ساتھ پردہ کے احکام دیئے ہیں اس وجہ سے اسلامی نظام میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ عورت اور مرد دونوں معاشی اور سیاسی سرگرمیوں میں دوش بدوش حصہ لے سکیں بلکہ وہ لازماً دونوں کے لئے الگ الگ دائرہ عمل معین کرتا ہے۔ یہ علیحدگی اخلاقی پہلو سے قطع نظر عورت کے حقوق کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے بھی منصفانہ ہے۔ کیونکہ مشترکہ دائرہ کے اندر یہ لازمی ہے کہ مرد اپنی فطری برتری کی وجہ سے عورت پر حاوی رہے گا، جس سبب سے عورت کے حقوق تلف ہوں گے اور اگر عورت کا دائرہ عمل الگ ہو تو اپنے دائرہ کے اندر اس کو پوری خود مختاری رہے گی۔

ان دو اصولوں کو پیش نظر رکھ کر اب آیئے عورت کے حقوق و فرائض پر غور کیجئے۔

عورت کے حقوق

جہاں تک حقوق کا تعلق ہے اسلامی ریاست عورتوں اور اور مردوں کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں کرتی۔

اسلامی ریاست ہر عورت کے جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لے گی۔

عورت اپنی ملک۔ ذاتی Private Property رکھ سکے گی، اور ریاست اس کے اس حق کی محافظ ہوگی۔

شریعت نے عورت کو جو حقوق دے رکھے ہیں ریاست اس بات کی ذمہ دار ہوگی کہ ان حقوق سے بہرہ مند ہونے کے لئے عورت کو پوری آزادی حاصل رہے۔ رسم و رواج وغیرہ کے قسم کی چیزیں اسکی آزادی اور اس کے حقوق پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔

عورت کو تحریر و تقریر کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ وہ اپنی انجمنیں بنا سکیں گی۔ اپنے اسلامی حقوق کا مطالبہ کر سکیں گی۔ ہر قسم کے عام ملکی مسائل پر آزادانہ اظہار رائے کر سکیں گی۔

عورت کی شخصی آزادی بالکل محفوظ ہوگی۔ شریعت کی مقررہ پابندیوں کے سوا اور کوئی پابندی اس پر عائد نہیں کی جائے گی۔

اسلام کے حدود کے اندر مسلک و مذہب اور رائے و خیال کی جو آزادی مردوں کو حاصل ہو گی وہ عورتوں کو بھی ہو گی۔

عورت کو قانونی مساوات حاصل ہو گی یعنی عزت و امارت اور شرافت و حقارت کی بنا پر قانون ایک عورت اور دوسری عورت میں کوئی فرق نہیں کرے گا۔

نسل و نسب عزت و امارت اور پیشہ وغیرہ کی بنا پر اسلامی ریاست میں کسی کو شریف اور کسی کو کمین نہیں قرار دیا جائے گا

اسلامی بیت المال میں جس طرح مردوں کے حقوق ہونگے اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق ہوں گے۔

ہر حاجت مند عورت کی جملہ ضروریات کی کفالت ریاست کے ذمہ ہو گی۔

جس طرح مردوں کی تعلیم کا ریاست بندوبست کرے گی اسی طرح عورتوں کی تعلیم کے لئے بھی وہ ذمہ دار ہو گی۔

بے لاگ اور بے معاوضہ انصاف حاصل کرنے کا انتظام جس طرح مردوں کے لئے ہو گا۔ اسی طرح عورتوں کے لئے بھی ہو گا

اگر کوئی عورت قرض چھوڑ کر مرے گی اور کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑے گی جس سے وہ قرض ادا کیا جاسکے تو ریاست اس کے قرضہ کی ادائیگی کی ذمہ دار ہو گی۔

کسی عورت کو اطاعت الٰہی کے خلاف کسی بات کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

ہر عورت کو ریاست کے بڑے سے بڑے حاکم سے درخواست و فریاد کرنے اور اس پر اعتراض و نکتہ چینی کرنے کا پورا حق ہو گا۔

عورت کی ذمہ داریاں

ان حقوق کے معاوضہ میں عورتوں پر ریاست سے متعلق مندرجہ ذیل ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

سمع و طاعت: جس طرح مردوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ معروف میں اولی الامر کی پورے خلوص قلب کے ساتھ اطاعت کریں اسی طرح عورتوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ معروف کی حد تک اولی الامر کے احکام کی پیروی کریں۔ اولی الامر کے احکام سے انحراف صرف اسی شکل میں جائز ہے جب ان کا حکم شریعت کے حکم کے خلاف ہو۔

خیرخواہی و ہمدردی: جس طرح مردوں پر ریاست کی ہمدردی و خیرخواہی فرض ہے۔ اسی طرح عورتوں پر بھی فرض ہے۔ اس ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ جو بات ریاست کے مفاد کے خلاف ہو اس سے احتراز کرے۔ جو بات ریاست کے لئے نافع ہو اس کو حسبتہً للہ انجام دینے کی کوشش کرے محض ذاتی اغراض و فوائد کے لئے ریاست کے ساتھ دلچسپی نہ رکھے۔ جو تجویز ذہن میں آئے اس سے کارکنوں کو برابر آگاہ کرتی رہے۔ اس کی قدر کی جائے یا نہ کی جائے۔ جو بات ریاست کے مفاد کے خلاف ہوتی دیکھے اس کو ہاتھ سے نہ روک سکے تو زبان سے روکنے کی کوشش کرے اگر اس کی قابلیت نہ رکھتی ہو تو دل سے اسکو برا جانے۔ اپنی تنقید و احتساب میں بھی پوری مخلص ہو اور اگر ریاست کی کوئی خدمت اس کے سپرد کی جائے تو پوری راستبازی و دیانت کے ساتھ اسے خدا کی عبادت سمجھ کر انجام دے۔

تعاون: عورتوں کے لئے ان حالات کے لحاظ سے کار کنان ریاست کے ساتھ تعاون کی مختلف شکلیں ہوں گی:-

(الف) ریاست کی مجلس شوریٰ میں عورتوں کی خود انکی منتخب کردہ نمائندہ عورتیں ہوں گی جو عورتوں سے متعلق قوانین و اصلاحات کے بارہ میں عورتوں کے نقطہ نظر سے حکومت کو آگاہ کرتی رہیں گی۔ اور حکومت عورتوں سے متعلق مسائل میں ان کی رائے معلوم کرنے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائے گی۔ اسماء بنت یزید انصاریہ کے واقعہ سے ظاہر ہے کہ وہ کس طرح عورتوں کی نمائندہ کی حیثیت سے آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ سے سوالات کئے اور پھر آنحضرت صلعم نے کس طرح ان کو اپنا نمائندہ بنا کر عورتوں کے پاس بھیجا۔ اور انھوں نے عورتوں کو آنحضرت صلعم کے جوابات سے آگاہ کیا۔ اسی طرح شفاء ام سلیمان بن ابی حثمہ کے متعلق روایت ہے کہ:

"کان عمر یقدمها فی الرائے و یرضاها و یفضلها رایها و ولاها شیأ من امر السوق"

حضرت عثمانؓ کو مشورہ میں مقدم رکھتے تھے ان کی رایوں کو پسند فرماتے تھے ان کو ترجیح دیتے اور بعض اوقات بازار مارکیٹ کے بعض معاملات کا انتظام بھی ان کے سپرد کر دیتے تھے۔

(ب) وہ سارے شعبے جو خاص عورتوں سے متعلق ہونگے مثلاً زنانہ کالج اور اسکول، زنانہ ہسپتال، زنانہ پولیس، زنانہ فوجی تربیت کے مراکز وغیرہ کلیۃً عورتوں کی نگرانی اور ان کے اہتمام میں ہوں گے۔ اسلامی نصب العین کے مطابق ان چیزوں کو چلانے کے لئے انہیں خود مختاری حاصل ہوگی۔

(ج) حکومت مذکورہ شعبوں کے سوا دوسرے شعبوں میں بھی عورتوں کی خدمات سے فائدہ اٹھائے گی۔ بشرطیکہ وہ پردے کے حدود کے اندر احترام کے ساتھ انجام دی جا سکتی ہوں جو عورتیں اپنی ذہانت و قابلیت کی بنا پر کسی مخصوص علم و فن میں مہارت اور کسی شعبۂ زندگی کے معاملات میں بصیرت بہم پہنچائیں گی ان کو کام کرنے کا پورا موقعہ دیا جائے گا اور ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے میں بھی کوئی چیز مانع نہ ہوگی۔

فوجی خدمات — فوجی خدمات میں براہ راست حصہ لینے اور فوج میں عملی شرکت کی ذمہ داری عورتوں پر اسلام میں نہیں ہے لیکن ان کا اسلحہ کا استعمال، ہوائی حملہ کی صورت میں بچاؤ، فرسٹ ایڈ اور اس قسم کے دوسرے کاموں سے واقف رہنا ضروری ہے اس لئے حکومت اس امر کا انتظام کرے گی کہ عورتیں اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے ان چیزوں کی ضروری تربیت حاصل کریں۔ تاکہ اگر کوئی ناگہانی صورت پیش آ جائے تو عورتیں بھی ملک و ملت کی مدافعت اور جہاد کے اجر و ثواب میں شریک ہو سکیں۔

یہ سب کچھ اس غرض کے لئے کیا جائے گا کہ عورتیں فی الحقیقت اپنی اور اپنے ملک کی حفاظت کے قابل ہوں نہ اس لئے کہ انہیں بنا سجا کر مہمانوں کے سامنے تحفۃً پیش کیا جائے۔ اگر مقصود صرف ان قومی ضروریات کے تقاضے کو پورا کرنا ہے جو عورتوں سے متعلق ہیں تو اسلام میں انکی پوری گنجائش موجود ہے۔ لیکن اگر مقصود کچھ اور ہے تو پھر کوئی اور راہ دیکھیے اسلام میں اس کی گنجائش نہیں ہے +

تاج الدین احمد اشرف نگری

شاپنگ

دل ربا اور دل نشیں ہوں میں
نازک اندام و مہ جبیں ہوں میں
میں نے خود آئینے میں دیکھا ہے
کس قدر شوخ اور حسیں ہوں میں

اور پھر حسن تو ہے ایسا مال
بانٹئے لاکھ ـــــ کم نہیں ہوتا
کم بھی ہو جائے تو سخی دل کو
مال گھٹنے کا غم نہیں ہوتا

کتنی کاوش اٹھائی ہے میں نے
اپنی زلفیں سنوارنے کے لئے
کس قدر وقت میرا صرف ہوا
روئے زیبا نکھارنے کے لئے

قحبہ خانوں میں کس لئے جاؤ
یہ تو کوئی بجا خیال نہیں
مجھ کو دیکھو ہر ایک بات وہی
پر کسی فیس کا سوال نہیں

اسنو، پوڈر کی ایک تہہ میں نے
اپنے رخساروں پر چڑھالی ہے
سینٹ کی دل نواز خوشبو سے
اپنی پوشاک بھی بسالی ہے

اپنی گاڑھی کمائی کا پیسہ
کوٹھے والی پہ پھینکنا اچھا؟
یا مرے حسن کی شعاؤں سے
اپنی آنکھوں کو سینکنا اچھا؟

دل ربائی کی شاہکار ہوں میں
سربسر پیکرِ بہار ہوں میں
اپنے حسن و جمال کی گویا
چلتی پھرتی اک اشتہار ہوں میں

کچھ پرانے خیال کے انساں
یہ روش ناپسند کرتے ہیں
کوئی پوچھے کہ ہم پہ ناحق آپ
کیوں درِ عیش بند کرتے ہیں

راہ گیرو! تمہیں خدا کی قسم!
اک نظر مجھ پہ ڈالتے جاؤ
ہو اگر دل میں حسرتِ دیدار
آؤ اس کو نکالتے جاؤ

پیاسے انساں کو سیر کردینا
لوگ نیکی کا کام کہتے ہیں
میں بجھاتی ہوں انکے نفس کی پیاس
پھر اسے کیوں حرام کہتے ہیں

گھورو۔ ہاں شوق سے مجھے گھورو
میں ذرا بھی برا نہ مانوں گی
دی ہے قدرت نے مجھ کو دولتِ حسن
کیا میں اس کو چھپا کے رکھوں گی؟

گھر سے میں بن سنور کے نکلی ہوں
ہر ادا میری دلبرانہ ہے
میرا مقصود ہے نمائشِ حسن
ورنہ "شاپنگ" تو اک بہانہ ہے

(بشکریہ عصمت)

فرحت انوار

موذّن مرحبا......

ہماری ایک بہن صاحبہ فرماتی ہیں "اگر کوئی لڑکی شوقیہ لکھنے لگے تو مصیبت آجاتی ہے، دھڑا دھڑ تعریفوں کے خط اور شاباش مبارکباد کے فون آتے ہیں۔" یہ سن کر میرے دل میں بھی گدگدی ہونے لگی اگر میں بھی شوقیہ لکھنے لگوں تو شوق کا شوق پورا ہوگا۔ یہ بڑے بڑے دن آسانی سے کٹنے لگیں گے اور تعریف گھاتے میں ہوگی۔ رہا یہ کہ مصیبت آجائے گی بھئی واہ مصیبت کیسی تعریف سن کر تو راحت ہوتی ہے۔ میں تو آج تک جن اشخاص سے ملی ہوں ان کو اپنی تعریف سن کر خوش ہوتے ہی دیکھا ہے۔ تعریف سن کر خوش نہ ہونے کی شان بے نیازی" تو دنیا کے چند ہی انسانوں میں ہوگی ہاں اگر کوئی تعریف کردے تو اسے خوشی کے گلاگل ہو جاتی ہوں

یہ ہی سوچ کر میں نے بھی ایک افسانہ دے گھسیٹا اور ایک مشہور ماہنامہ کے ایڈیٹر کو بھیج دیا، وہ بیچارے آدمی بامروت ہیں میرا دل رکھنے کو انھوں نے افسانہ شائع کر دیا۔ اب روز صبح اٹھ کر تعریف کے خط کا انتظار کرنے لگی (ہائے افسوس کہ ٹیلی فون میرے گھر میں ہے نہیں) مگر خط نہ آج آتے ہیں نہ کل۔ تعریف تو بڑی چیز ہے کسی نے یہ بھی نہ کہا کہ تمہارا افسانہ برا تھا۔ اللہ کی شان ہے اب ہم ایسے گئے گزرے ہو گئے کہ ہماری تحریر کی برائی بھی کوئی نہیں کرسکتا۔ دل نے تسلی دی۔

"کیا ہوا اگر پہلے افسانہ کی کسی نے تعریف نہ کی اور لکھو شاید دوسرا افسانہ کسی کو پسند آجائے۔"

خیر صاحب ہمت کرکے دوسرا لکھا وہ بھی شائع ہوگیا، اب پھر انتظار تھا اور میں تھی، مگر توبہ کیجئے کسی نے نوٹس ہی نہ لیا۔ میں نے عاجز آکر دعا مانگی۔ سنتی تھی روزہ افطار کرکے جو دعا مانگی جائے وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ چونکہ رمضان شریف ابھی دور تھے اس لئے میں نے نفلی روزہ رکھا۔ "الٰہی تیرے بندوں میں اگر کوئی ایسا نہیں جس کو میری تحریر پسند آئے تو ان کے دل میں میری تحریر سے نفرت پیدا کردے، وہ خوب برائی کریں۔" بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔" بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں چوبیس گھنٹے میں ایک گھڑی ایسی آتی ہے جب اللہ میاں باب قبولیت کھول دیتے ہیں۔ جب میں نے دعا مانگی تھی اس وقت وہی گھڑی تھی۔ اللہ میاں نے کہا۔

"بیوقوف چھوکری اگر تو برائی سننا چاہتی ہے تو سُن۔"

"سنا ہے تم نے افسانے لکھنے شروع کئے ہیں اور شائع کرائی ہو۔"

"جی ہاں۔ آپ نے پڑھا میرا کوئی افسانہ؟"

"میں اتنا مصروف آدمی مجھے پڑھنے وڑھنے کا وقت کہاں ملتا ہے اور اگر ملے بھی تو اردو رسالوں کی خرافات پڑھ کر تضیع اوقات کرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔" دل تو بہت جلا مگر ضبط کرکے کہا۔ "پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں لکھتی ہوں؟"

"کل میرے ایک دوست نے کہا کہ کسی نے ایک افسانہ لکھا ہے جس میں تم پر چوٹ کی ہے۔ میں نے نام دریافت کیا تو پتہ چلا یہ حرکت، تمہاری ہے۔ اس بار معاف کیا آئندہ ایسی حرکت کی تو اچھا نہ ہوگا۔ لکھنے کا اگر شوق ہے تو ذہن پر زور ڈالو جب ذہن میں کوئی پلاٹ آئے تو رنگ آمیزی کرو۔ تم نے لکھنے کو گڑیوں کا کھیل سمجھ لیا ہے۔ لکھنے کے لئے خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے، صاحبزادی یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔"

"معاف کیجئے گا قبلہ میں تو وہی کچھ لکھتی ہوں جو دیکھتی یا سنتی ہوں، اگر اتفاق سے کوئی واقعہ کسی کے حالات کے مطابق ہو تو اس میں میرا کیا قصور، میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ میں نے کس افسانہ میں آپ کے ذاتی حالات لکھے ہیں، مجھے بہت افسوس ہے معافی خواہ ہوں جناب عالی مجھے الہام تو ہوتا نہیں کہ آسمان سے پلاٹ پر پلاٹ اتر رہے ہیں اور میں کھٹا کھٹ افسانے تیار کر رہی ہوں، میں تو بھی دنیا کی

واقعات لیکر کہانیاں لکھ سکتی ہوں، آپ نے درست فرمایا۔ الہامی افسانے لکھنا میرے بس کا روگ نہیں "

"بکو مت فضول، میں تم کو بہت نیک متین اور تمیز دار سمجھتا تھا۔ آج معلوم ہوا کہ تم کو تمیز چھو بھی نہیں گئی۔ تم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ بزرگوں سے کیسے بات کرنی چاہئیے۔ ایک تو الٹی سیدھی حرکتیں کرو اور کوئی اگر نصیحت کرے تو جواب دینے کو تیار، جن بچوں کے ماں باپ بچپن میں مر جاتے ہیں وہ آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتے ہیں۔ کسی کا ڈر دباؤ نہیں رہتا۔"

اچھی مصیبت ہے جن بےچاروں کے ماں باپ مر جائیں ان سے دنیا ہمدردی تو کرنے سے رہی الٹا بدتمیز بنائیں گے بچپن سے ماں باپ کی محبت سے محروم ہو گئی اب جواب دینے سے بھی محروم کی جاتی ہوں۔

"آداب عرض!"

"جیتے رہو۔ تم لوگوں نے آنا ہی چھوڑ دیا۔ اتنا قریبی رشتہ مگر معلوم ہوتا ہے جیسے غیر ہو۔ بیوی کیسی ہیں ان کو لائے کیوں نہیں؟"

"بیوی کو کیسے لاتا۔ آج میں تنہائی میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔ میں کبھی یہ تصور ہی نہ کرتا تھا کہ تمہاری ایسی نیک معصوم دنیا سے بیزار لڑکی ایسا کرے گی۔"

"میں سمجھی نہیں جناب کا روئے سخن میری کس نامعقول حرکت کی طرف ہے جو یہ عتاب نازل ہوا ہے"

"یہ یہ۔ یہ افسانہ کیا تمہارا لکھا ہوا نہیں ہے؟"

"سولہ آنے میرا لکھا ہوا ہے"

"کیوں لکھا؟"

"کیوں نہ لکھتی؟"

"دیکھو یہ بہت بری بات ہے میں اس وقت لڑائی کے موڈ میں نہیں ورنہ لڑائی ہو جاتی۔ تم نے میرا راز فاش کر دیا۔"

"یہ ارمان بھی کیوں رہ جائے لڑائی کا موڈ طاری کر دو میں لڑنے کو تیار ہوں۔ تمہاری رازداری کرنے کا میں نے ٹھیکہ لیا ہے؟ اور پھر تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ افسانہ میں نے تمہارے اوپر لکھا ہے؟ تمہارا نام ہے اس میں؟ اس قسم کا معمولی واقعہ ہر کسی پر چسپاں ہو سکتا ہے۔ اب اگر ہر آدمی اپنے کو میرے افسانہ کا ہیرو تصور کرے تو اس کی ذمہ دار میں نہیں"

"یہ واقعہ معمولی تو نہیں اگر معمولی ہوتا تو تم کو طبع آزمائی کرنے کا کیسے خیال آتا۔ اس کا امکان ہے کہ کسی اور پر چسپاں ہو جائے مگر تم نے ایک جملہ ایسا لکھ دیا جس سے میں صاف سمجھ گیا کہ تم نے مجھے کوٹ کیا ہے۔"

"وہ معمولی جملہ بولنے کا صرف تم کو حق ہے اور کوئی بول ہی نہیں سکتا۔ اب میں یہ تو کرنے سے رہی کہ بیٹھ کر سوچ رہی ہوں کون سا جملہ کس نے کس وقت بولا تھا وہ میں نہ لکھوں۔"

"تم تو نہ الٹی مانتی ہو نہ سیدھی، بحث کرنا بے کار ہے، تم اعتراف کیوں نہیں کر لیتیں کہ تمہاری نظر عنایت مجھ غریب ہی پر ہوئی ہے میں کیا کر لوں گا۔ تم نے واقعات اس طرح توڑے مروڑے ہیں اور نام بھی بدل دیتے کہ قانونی گرفت میں بھی نہیں آ سکتیں، کچھ معلوم بھی ہے کسی کے ذاتی حالات لکھنا جرم ہے۔ یہ بات خلاف قانون ہے۔"

"بحث کرنے میں تو تمہارے پاس گئی نہیں تم ہی چڑھ کر لڑنے آئے ہو، اعتراف کرتے ہوئے کیا میں ڈرتی ہوں، افسانہ لکھتے وقت مجھے تمہارا خیال بھی نہیں تھا لیکن اگر تم کو اصرار ہے تو میں تسلیم کئے لیتی ہوں کہ تم ہی اس افسانہ کے ہیرو ہو، اب تو خوش ہوئے۔ قانون میں بیچاری کیا جانوں گی، تمہاری طرح قانون کی ڈگری تو میرے پاس ہے نہیں۔ کر کیوں نہیں سکتے اس جرم میں تم مجھے سولی پر چڑھوا دو۔"

"تم پتہ نہیں کس بات پر بھری بیٹھی ہو غصہ مجھ پر اتر رہا ہے غصہ تھوک کر ٹھنڈے دل سے غور کرو اگر یہ افسانہ میری بیوی پڑھ لیتی تو پھر کیا ہوتا؟" "ہوتا کیا یہ جو تمہارے سر پر چمک دار بال نظر آتے ہیں یہ غائب ہو جاتے۔"

"خیر بال وال تو کیا غائب ہوتے اب میں ایسا بھی جورو کا غلام نہیں مگر ایسے افسانے لکھنے کا فائدہ کیا؟"

"میں سیٹھ تو ہوں نہیں جو ہر جگہ فائدہ اور نقصان دیکھا کروں۔"

"ایسے افسانے عوام پسند نہیں کرتے۔ الٹی لوگوں کو شکایت ہو جاتی ہے، ایک بزرگ ہیں وہ بھی تم سے اس سلسلے میں خفا ہیں افسانے لکھنے ہیں تو رومانی لکھا کرو جن میں کچھ عشق کی بیقراریاں ہوں۔

کچھ حسن کی بے نیازیاں کچھ رقابت ہوا اور کچھ بدگمانیاں۔ میں تم کو ایسے بہت سے پلاٹ بتا سکتا ہوں تم نمک مرچ چھڑک کر لکھو پھر دیکھنا تمہارے نام کی دھوم مچ جائے گی۔"

"میں افسانے عوام سے پسند کروانے کے لئے نہیں لکھتی، جس دن عوام پسند کرنے لگیں گے اس دن میں خودکشی کر لوں گی سبھے معلوم ہے وہ بزرگ کون ہیں۔ جس کو مجھ سے شکایت ہو وہ اپنی دو روٹیاں زیادہ کھائے۔ مجھے مانگے کے پلاٹ لے کر رومانی افسانے لکھنے کا شوق نہیں یہ حسن اور عشق آپ ہی کو مبارک رہیں۔ جب تمہارے ذہن میں پلاٹ کیڑوں کی طرح بھرے پڑے ہیں تو تم خود کیوں نہیں نمک مرچ چھڑک کر اپنے نام کی دھوم مچوا لیتے؟"

"مذاق کی بات نہیں اگر تم رومانی افسانے لکھو تو میں معقول معاوضہ دلا کر چھپوا دوں۔ ایک پبلشر سے میری دوستی ہے۔"

"چولہے میں جائے رومان اور بھاڑ میں جاؤ تم۔ گھر میں بیوی موجود اور ہر جگہ رومان کی تلاش، مجھے تمہاری بیوی سے کہنا پڑے گا نکیل ڈال کر رکھیں ورنہ تم گئے ہاتھوں سے۔ اور کچھ نہیں تو میری بزرگی کا لحاظ کرتے، بڑی بہن سے رومانی افسانے لکھنے کی فرمائش کرتے ہو، ڈوب مرو جا کر۔ میں نوج تمہارے دوست کو اپنے افسانوں کا مجموعہ دیتی۔"

"میں تمہاری بزرگی تسلیم ہی نہیں کرتا۔ ہمیشہ کی جلد باز ہو۔ وہی تم نے دنیا میں آتے وقت کیا۔ دو دن پہلے جناب تشریف لے آئیں تاکہ مجھ پر اپنی بزرگی کا سکہ بٹھائیں اور مجھے یہ تلخ باتیں سنائیں میں تو ہمیشہ تمہاری شیریں زبانی کی تعریف کیا کرتا تھا مگر آج تو تم نے مجھے کونین کھلا دی۔ اچھا بھئی چلئے۔ مگر وعدہ کرو میری بیوی سے کچھ نہیں کہو گی، وہ پہلے ہی مجھ پر شبہ کرتی ہے اور تمہاری سچائی کا سکہ اس کے دل پر بیٹھا ہے۔ اگر تم نے جھوٹ بھی کہہ دیا تو وہ سچ ہی سمجھے گی۔"

"جاؤ جاؤ کیوں مرے جاتے ہو کچھ نہیں کہوں گی تمہاری بیوی سے۔"

بڑے تو تھے ہی اب چھوٹے بھی منہ لگنے کو آنے لگے کل کے چھوکرے مجھے تلخ کلامی کا طعنہ دیں۔ میاں بیوی میں لڑائی کروانا شیطان کا کام ہے، یہ ذمہ داری میں کیوں لوں۔ ورنہ ان کی سزا تو یہی تھی کہ ان کی بیوی کو یہ افسانہ پڑھوا دیا جاتا اور یہ کہہ دیا جاتا کہ یہ تمہارے میاں پر لکھا ہے۔ پھر وہ ایسا تگنی کا ناچ نچاتی کہ سب رومان دھرا رہ جاتا۔

"ہلو ہلو، کیا ہو رہا ہے؟ اچھا افسانہ لکھ رہی ہو، گویا کہنے جناب کے، گریٹ آتھر بننے کے خواب ہماری دوست دیکھ رہی ہیں۔ میں نے پچھلے مہینے فلاں پرچے میں تمہارا افسانہ پڑھا، بھئی برا مت ماننا۔ مجھے تو پسند نہیں آیا۔ مگر یہ کہانی پڑھ کر آنکھوں کے سامنے وہ دن آ گئے جب ہم دونوں سینی ٹوریم میں زیر علاج تھے۔ ارے ہاں کل بوری بازار میں وہ ملی تھیں۔"

"وہ کون؟"

"ارے وہی جو سینی ٹوریم میں تمہاری پڑوسی تھیں اور ہر وقت تمہارے پاس بیٹھی اظہار محبت کیا کرتی تھیں کل میں نے ان کو بہت خوش ہو کر بتایا کہ تم یہیں ہو مگر انھوں نے پلٹ کر یہ بھی نہ پوچھا کہ تم کیسی ہو کہاں رہتی ہو، کیا تم سے لڑائی ہو گئی؟"

"نہیں بھئی لڑائی کیسی سینی ٹوریم سے آنے کے بعد مجھ سے ان سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہیں ہیں اور زور شور سے شوہر کی تلاش جاری ہے، وہ خود سے آئی نہیں اور میں تو گوشہ نشین ہوں۔"

"ان کے رویہ سے مجھے بہت تعجب ہوا۔ تمہاری تو وہ پڑوسی تھیں سہیلی تھیں، مگر اور سب سے بھی کسی خلوص سے ملتی تھیں، مگر کل اس روکھائی سے پیش آئیں جیسے میرا ملنا ان کو ناگوار ہوا۔ لوگ اتنی جلدی بدل جاتے ہیں، یہ مجھے کل ہی معلوم ہوا۔"

"تعجب کی کیا بات ہے یہ زمانہ ہی جلدی جلدی بدلنے کا ہے۔ سیاست وزارت موسم سیٹھوں کی بیویاں اور موٹریں لڑکیوں کے بال بنانے کا فیشن لڑکوں کی گرل فرینڈ عزاروں کے نمونے اب کہاں تک گناؤں۔ یہ سمجھو کہ دنیا ہی بدل رہی ہے، اگر وہ بدل گئیں تو کیا ہوا مجھے نہیں پوچھا تو اس کا کیا شکوہ، ان کی محبت بھی نفرت سے بدل گئی ہو گی۔ تم سے مل کر کیسے خوش ہوتیں، وہ کسی ایسے شخص سے مل کر

خوش نہیں ہو سکتیں .... جس کو یہ علم ہو کہ وہ دق کی مریضہ ہیں۔"

"یہ کیوں؟ بیمار ہونا کیا عیب ہے، یہ خود اختیاری چیز تو ہے نہیں، میں تو کسی سے نہیں چھپاتی اور تم تو ہر ایک سے کہہ دیتی ہو۔"

"میری بات چھوڑو میری بیماری اپنی نمایاں چیز چھوڑ گئی ہے کبھی کہوں تو لوگ سمجھ جاتے ہیں۔ تم کو چھپانے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ تمہارے منگیتر کا عشق صادق ہے، ان کو تم مع اپنی بیماری کے عزیز ہو۔ وہ صاحبزادی ابھی تک کوئی کا لڑکا اُلّو پھانسنے میں کامیاب نہیں ہوئیں تم کو یاد نہیں سینی ٹوریم میں کہا کرتی تھیں میں تو جس آدمی سے شادی کروں گی اس کو یہ نہیں بتاؤں گی کہ مجھے دق ہو چکی ہے۔"

"اے ہے تو وہ کسی غریب کو فریب دیکر پھانسنا چاہتی ہیں یہ تو خود غرضی ہے میں ان کو اتنا دہ نہیں سمجھتی تھی۔"

"میری جان آجکل دنیا ہی میں فریب چالو ہے۔ بڑے بڑے لوگ اپنے فائدے کے لئے خود غرضی اور ذلالت پر اتر آئے ہیں، اگر وہ اپنے فائدے کے لئے فریب دینا چاہتی ہیں تو کیا حرج ہے۔"

"بھئی میں بھی کیسی عجیب ہوں، بات شروع کی تھی تمہاری کہانیوں کی اور درمیان میں ان صاحبزادی کا قصہ لے بیٹھی۔ میں تم کو یہ مشورہ دینا چاہتی ہوں کہ تم حقیقت نگاری چھوڑ دو، اچھے بھلے برے ہو جائیں گے۔ وہ افسانہ پڑھتے ہی میں سمجھ گئی کہ تمہارا اشارہ کس کی طرف ہے، وہ صاحبزادے نہیں ہیں اور ٹھاٹ سے ایر فورس میں نوکری کر رہے ہیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں کہ ان کو دق ہو چکی ہے۔ اگر افسانہ پڑھ لیں گے تو خفا ہو جائیں گے۔"

"تم لوگ حقیقت سے کیوں آنکھیں چُراتے ہو۔ چاہتے ہو میں جھوٹ لکھا کروں۔ رہا یہ کہ اچھے دل برے ہو جائیں گے تو بہن میرے لئے کسی کے دل میں اچھائی نہیں ہے پہلی بات تو یہ کہ میں نے یہ افسانہ ان صاحبزادے پر نہیں لکھا لیکن اگر ان کو ہیرو بننے کا ارمان ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں خفا وہ ایک بار نہیں دس بار ہو جائیں، میری جوتی کی نوک سے، جب دنیا میری خفگی کا خیال نہیں کرتی تو میں ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کی خفگی کا کیوں خیال کروں۔ ابھی تم اس لڑکی کو برا کہہ رہی تھیں اب یہ فریب نہیں تو اور کیا ہے؟ نوکری کے لئے یہ چھپا ڈالا کہ دق ہو چکی ہے۔"

"تم نے یہ لکھنا شروع ہی کیوں کیا؟"

"تم چاہتی کیا ہو، میں دن بھر پڑی پڑی مکھیاں مارا کروں، تمہاری دنیا نے مجھے عاجز کر کے اس کمرے میں قید کر دیا، اب چاہتی ہو میں اپنا دل بہلانے کے لئے لکھنا پڑھنا بند کر دوں۔ تمہارا مقصد کیا ہے۔ میں یونہی گھٹ گھٹ کر مر جاؤں؟"

"ناراض مت ہو مجھے تو خود ہی اس کا رنج رہتا ہے کہ تمہارا کوئی مشغلہ نہیں۔ اللہ میاں نے اپنی ہر رحمت سے تم کو محروم کر دیا۔ مگر تم نے یہ لکھنا شروع کر کے اپنی جان اور مصیبت میں ڈال لی، ایک ماہر نفسیات نے مجھے بتایا تھا کہ انسان خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ وہی حالت تمہاری ہے۔ تم دل بہلانے کے لئے سوشل ورک کرو، مہاجرین کی خدمت سے ثواب بھی ملے گا ان کا بھی فائدہ ہوگا اور تمہارا دل بھی بہلے گا۔"

"مجھے اللہ میاں سے شکوہ نہیں شکوہ مجھے دنیا والوں سے ہے۔ ان ماہر نفسیات کو کبھی اگر میرے جیسے حالات سے گزرنا پڑے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے، یوں حکم لگانا تو بڑا آسان ہے، سوشل ورک تم نے کمال کر دیا۔ سوشل ورکرز عالی شان بنگلوں میں رہتے ہیں مجھے اگر ایک خدا ترس خاتون نے یہ کمرہ عنایت نہ کیا ہوتا تو فٹ پاتھ پر پڑی ہوتی۔ سوشل ورکرز بڑی بڑی چمکیلی امریکن موٹروں میں بیٹھ کر — نالو کھیت اور ڈرگ روڈ لے جاتی ہیں۔ یہاں گدھا گاڑی رکھنے کی بھی توفیق نہیں۔ سوشل ورکرز پھڑکتے ہوئے غرارے اور چمکتے ہوئے شلوار سوٹ پہن کر اپنی اترن بانٹنے جاتی ہیں اور میں اس فکر میں رہتی ہوں کہ سال اگر تین سوتی ساڑیوں میں نکل جائے تو میں چوتھی ساڑی کی قیمت بچا کر ایک کتاب خرید لوں۔ تم ہی بتاؤ میں اگر سوتی ساڑی پہن کر جوتیاں چٹخاتی مہاجرین کی کالونی میں جاؤں تو مہاجر مجھے گھسنے دیں گے؟ وہ سمجھیں گے یہ بھی ہماری طرح کی ہے کہیں ہماری جھونپڑی نہ ہتیا لے، نکالو اس کو ورنہ ہمارے حصہ کے پرانے کپڑے اور خیرات کی رضائیاں بٹوا لے گی:

"فرحت ڈیر مجھے معاف کر دو اس وقت میں نے یہ قصہ چھیڑ کر تم کو دکھ دیا۔ ٹھیک کہتی ہو اپنا موقع مصلحت ہر آدمی خود ہی سمجھ سکتا

ہے۔ میں آئی ایک ضروری کام سے تھی مگر اب تمہارا موڈ بگڑ گیا ہے پھر کبھی آؤں گی۔"

"تمہیں نہیں کہو کیا کام ہے، موڈ کیا بگڑے گا تقدیر ہی بگڑی ہوئی ہے، تم نے جو کچھ کہا میری ہمدردی میں کہا، ہاں بتاؤ کیا کام ہے؟"

"میرے منگیتر کے لئے پچرنگا پل اُوور بنا کر دو، ان کو بہت شوق ہے اور مجھے کئی اون ملا کر بنانے سے بڑی الجھن ہوتی ہے، تم تو نٹنگ کی استاد ہو، انھوں نے کہا جب تمہاری سہیلی اتنی عمدہ نٹنگ جانتی ہیں تو ہمیں بھی ایک پل اُوور بنوا دو آخر ہماری ہونے والی سالی ہیں ہمارا بھی کچھ حق ہے"

"اچھا بنا دوں گی۔ اون کس کس رنگ کا ملاؤں اور نمونہ بھی تم ہی پسند کر دو اوپر کی دراز میں نمونوں کی کتابیں رکھی ہیں ہیں ذرا دیکھ لو۔"

"اون میں ان سے پسند کروا کر بھیج دوں گی، نمونہ جو تم چاہو ڈال دینا، مجھے تمہاری پسند پر اعتماد ہے، اچھا ڈیر اب چلیں بہت دیر ہو گئی۔ وہ منتظر ہوں گے آج ہم لوگ فلاور شو میں جا رہے ہیں۔ سنا ہے دوسرے ملکوں سے بہت عمدہ عمدہ پھول آئے ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو جاؤ۔"

دل جلا کر خاک کر دیا اور اس کا رنج ہے کہ مجھے خدا نے کچھ نہیں دیا۔ کبھی برسوں آکر جھانکیں گی نہیں، پل اُوور بنوانا تھا تو میں ان کے منگیتر کی ہونے والی سالی بن گئی، کیا دنیا ہے واہ واہ۔

"لیجئے آپ کا خط آیا ہے۔" میں نے لپک کر لفافہ لیا۔ بھارت سے ایک رشتہ دار نے کرم فرمایا ہے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد تان میرے افسانے پر توڑی ہے، فرماتے ہیں:۔

"تم تو چھپی رستم نکلیں۔ تم سے ڈرنا چاہئے۔ کیا خبر کب کس کی پگڑی اچھال دو، یہ بات بہت بری ہے کہ تم نے جہاں کوئی واقعہ دیکھا یا سنا بس اس کا حلیہ بگاڑ کر افسانہ لکھ دیا۔ ماہنامہ ——— دہلی میں تمہارا افسانہ پڑھا۔ مجھے تعجب تو ان ایڈیٹرز پر آتا ہے جو ایسی خرافات چیزیں شائع کرتے ہیں۔ جب میں نے ایڈیٹر سے کہا کہ ایسی چیزیں کیوں شائع کرتے ہو تو فرمانے لگے یہ افسانہ تو بہت خوب ہے۔ آخری پیراگراف تو اتنا دردناک ہے کہ میری آنکھیں بھر آئیں۔

میں نے اپنے دل میں کہا رونے ہی کا مقام ہے، ایسی چیزیں پڑھ کر رونا نہیں تو کیا ہنسی آتی ہے۔ بیٹا اگر لکھنے کا خبط ہے تو پہلے خوش خطی کی مشق کرو، مجھے یقین کامل ہے کہ تمہارے افسانوں کی کتابت کے وقت بیچارہ کاتب دوڑ دوڑ کر تمہارے پاس جاتا ہوگا کیونکہ تمہارا جناتی رائٹنگ پڑھنا اتنا آسان تو ہے نہیں، آج کل فیشن ہو گیا ہے ہر لڑکی افسانہ نویس بننا چاہتی ہے۔ تم کو بھی پاکستان جا کر یہ مرض ہو گیا، اللہ اپنا رحم کرے (آمین) پاکستان میں کیا کم تھے اعتراض کرنے والے جواب یہ ہندوستانی بھی انکی مدد کو دوڑے ہیں۔ ایک اکیلی جان اور یہ چوطرفہ حملے کس کس کا مقابلہ کروں پتہ نہیں وہ کون سی منحوس گھڑی تھی، جب میں نے لکھنا شروع کیا۔ ہر طرف سے لعنت ملامت۔ کہاں تک یہ زہر کے گھونٹ شربت سمجھ کر پیوں۔ جواب دوں تو بدتمیز، آؤٹ آف کنٹرول، تلخ کلام۔ ان روز کے روز کے جھگڑوں سے تو یہ اچھا ہے کہ میں یہ قصہ ہی تمام کر دوں مگر دل نے کہا۔ جب ایک بار میدان میں آگئیں، میدان چھوڑ کر بھاگنا غیرت کی بات ہے، ڈٹ کر مقابلہ کرو فتح تمہاری ہوگی۔

یہ ہمارے دل صاحب بھی عجیب و غریب واقع ہوئے ہیں۔ ان کے بہکانے میں آکر میں نے یہ مصیبت مول لی اور اب توبہ بھی نہیں کرنے دیتے۔ کئی دن دل سے بحث جاری رہی۔ وہ کہے لکھو میں کہوں مجھ میں اب تاب نہیں آخر مجھے ہی ہتھیار ڈالنے پڑے، اور میں نے افسانہ لکھا۔ بالکل حقیقت، نام تک نہیں بدلے۔ افسانہ شائع ہو گیا۔ ایک ہفتہ گذر گیا نہ کوئی گالیوں کا خط آیا نہ کسی نے خود آکر گالیاں دینے کی زحمت گوارا کی۔ دوسرے ہفتہ ایڈیٹر نے ایک لفافہ، یہی معمولی چھ پیسہ والا لفافہ ریڈائرکٹ کر کے بھیجا۔ میں سمجھ گئی کہ اس میں کیا ہوگا، وہی سب کچھ جو ڈیڑھ برس سے سن رہی ہوں، میں نے بے دلی سے لفافہ میز پر ڈال دیا۔ کھانے کا وقت قریب تھا، اگر خط پڑھتی تو پیٹ گالیوں سے بھر جاتا۔ پھر کھانا کیسے کھاتی۔ کھانا کھانے کے بعد بھی لفافہ چاک کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پھر دل کو بولنا پڑا۔

"ارے لفافہ کھولتی کیوں نہیں۔ جب اوکھلی میں سر دیا تو موسل

سے کیا ڈرنا۔ بڑی کم ہمت ہو۔

کم ہمتی کا طعنہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے تاؤ میں آکر لفافہ چاک کیا۔ ارے میری آنکھیں تعجب سے کھلی کی کھلی رہ گئیں، خط ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا، مارے خوشی کے مرتے مرتے بچی فوراً دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔ واہ اللہ میاں واہ! تمہاری رحمت کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ جب دینے پر آتے ہو تو بغیر مانگے چھپر پھاڑ کر دیتے ہو حالانکہ مجھے تو تم وہ بھی دے چکے جو میں نے مانگا تھا مگر جو خوشی بغیر مانگی چیز پا کر ہوتی ہے وہ منہ پھوڑ کر مانگنے میں کہاں۔ دل نے کہا۔ مٹھائی کھلواؤ، یہ سب میری بدولت ہوا تم تو توبہ کرنے والی تھیں۔

آپ سوچتے ہوں گے لونڈیا کا دماغ خراب ہو گیا ہے جو بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔

ابھی نہیں دماغ میرا بالکل صحیح ہے، دل البتہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ لیجئے آپ نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ کیا بات ہے؟ یہ خوشی کیسی ہے؟ کس کا خط ہے؟ کیا لکھا ہے؟

ضروری تو نہیں کہ میں آپ کے سوالوں کے جواب دوں۔ مگر خیر دیئے دیتی ہوں، آپ بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی دل والی سے واسطہ پڑا تھا

بات یہ ہے کہ یہ خط میرے تازہ افسانے کے سلسلے میں آیا ہے۔

خوش یوں ہوں کہ خلافِ توقع ایک صاحب کو میری تحریر پسند آگئی اور انہوں نے ان ہی باتوں کی تعریف کی ہے۔ جن کی اب تک برائی سنتی رہی۔

یہ خط کسی معمولی آدمی کا نہیں مشہور ادیب کا ہے، نام نہیں بتاؤں گی۔ خدا خدا کر کے ایک آدمی ایسا ملا ہے جس نے گالیاں دینے کی بجائے تعریف کی ہے اب کہیں وہ اپنا نام پڑھ کر بگڑ جائیں تو؟ یہ مجھے منظور نہیں۔ ہوں، تو اب آپ کا آخری سوال رہ گیا۔ لکھا ہے۔

"تمہارا افسانہ پڑھا، پسند آیا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ تم کو اس سلسلے میں خط لکھ رہا ہوں۔........

تمہارا نام ایسا ہے جو لڑکوں کا بھی ہو سکتا ہے اور لڑکیوں کا بھی۔ اس لئے یہ سمجھنا دشوار ہے کہ تم لڑکی ہو یا لڑکا مگر اس سے فرق کیا پڑ سکتا ہے، مجھے تو افسانہ کے مصنف کو مدد پہنچانی ہے خواہ وہ کوئی ہو، کالا چور ہی کیوں نہ ہو۔

قصہ مختصر یہ کہ تمہارا افسانہ بہت اچھا ہے۔"

سنا آپ نے یہ مدد مجھے اس لئے نہیں ملی کہ میں لڑکی ہوں اور خیر سے اب میرا شمار بھی ادیبوں میں ہونے لگا۔ یہ خطاب جس نے دیا ہے وہ خود بہت بڑا انشا پرداز ہے، اتنا بڑا ادیب میری تحریر کی تعریف کرے۔ مجھے آپ اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔ اس خط سے مجھے ایسی ہی تقویت پہنچی جیسے امریکی فوجی امداد سے پاکستان کو پہنچے گی۔ میرے حوصلے بلند ہو چکے ہیں اور میں ایک بار پھر ان حضرات کو خفا کرنے پر تیار ہو گئی ہوں، جو پہلے ہی مجھ سے کچھ کم خفا نہیں،

(بشکریہ ساقی)

حاذق ہسٹریا پلز

یہ گولیاں خالص وکمیاب جڑی بوٹیوں سے جدید طبی اصولوں پر تیار کی گئی ہیں۔ عورتوں کی مشہور بیماری ہسٹریا (اختناق الرحم) بچوں کی مرگی (ام الصبیان) کے واسطے لاثانی دوا ہے۔ اسکے علاوہ عام کمزوری، ضعف ہضم، اختلاج قلب، دل کی دھڑکن کے لئے بھی مفید ہے یہ دواخانہ ھٰذا کی ایسی بے نظیر ترتیب ہے جس پر طب یونانی جس قدر بھی فخر کرے بجا ہے۔

قیمت ؛ فی شیشی چالیس گولی پانچ روپے پانچ آنے

حاذق نروائن پلز

یہ ایک جنرل ٹانک ہے جو عصبی اور دل و دماغ کی کمزوریوں کا مجرب علاج ہے یہ گولیاں دماغی کام کرنیوالے حضرات یعنی وکیل بیرسٹر، پروفیسر اور طالب علم صاحبان کے واسطے آب حیات کا کام دیتی ہیں، اور جسم انسانی کی جملہ عصبی کمزوریوں کو بحال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ دواخانہ ھٰذا کے خاص مجربات میں سے ہیں۔

قیمت ؛ چالیس گولی برائے بیس یوم
چار روپے بارہ آنے (اللہ ۱۲ر)

ملنے کا پتہ :- حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی نمبر ا

چھوٹے بچوں کے ذہنوں کو اسلامی سانچوں میں ڈھالنے کے لئے

پندرہ روزہ "نور" رام پور

نہایت کامیاب ثابت ہو رہا ہے اور اس مقصد کے لئے اس کا خاص نمبر تو واقعی نور علیٰ نور ثابت ہوتا ہے۔ "نور" کا تیسرا خاص نمبر نومبر ۵۶ء میں شائع ہو رہا ہے اس کے

• مفید مضامین • اخلاقی کہانیاں • دلچسپ نظمیں اور • اور بہت سی دوسری خوبیاں

بچوں کے لئے بہترین تحفہ

سالنامہ کی قیمت ایک روپیہ ہے جو مستقل خریداروں کو ان کے سالانہ چندے میں ہی دیا جائیگا۔ سالانہ چندہ : چار روپے • پاکستانی خریدار "نور" کا چندہ
• دفتر "چراغ راہ" فیض محمد فتح علی روڈ۔ کراچی ۱ کے پتے پر بھیجکر رسید سے ہمیں مطلع کریں۔ کوپن میں نور کے چندے کی وضاحت ضروری ہے۔

مینجر پندرہ روزہ "نور" رام پور (یو۔پی)

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں (اقبال)

باوقار تنظیم

باہمی بچت کی پرافٹ شیئرنگ سکیم نمبر ۱

پیش لفظ یہ امدادی سکیم ان رسوائے عالم امدادی کمیٹیوں" سے اصولاً بالکل مختلف ہے جو آجکل تقدیر آزمائی، جوا اور لاٹری کی "مہذب" اور ترقی یافتہ صورتوں میں سارے ملک میں شہر بہ شہر ایک لعنت بن کر عوام کے سروں پر مسلط ہیں اور جن کے خلاف آئے دن اخبارات میں احتجاج کیا جاتا ہے۔ ان کے برعکس یہ سکیم تجارت میں "شرکت نفع و نقصان" کے عین اسلامی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر شروع کی گئی ہے جس کے ذریعے اس سکیم میں حصہ لینے والا ہر ممبر صرف پانچ روپے ماہانہ ادا کرتا ہوا مقررہ مدت میں پانچ صد روپے کی کثیر رقم بھی یکمشت حاصل کرتا ہے اور اسکے علاوہ وہ اس بونس کا بھی حقدار ہوتا ہے جو کمپنی ہذا اپنے تجارتی منافع سے اس سکیم میں باقاعدگی سے حصہ لینے والے ممبروں کے درمیان تقسیم کرتی ہے۔ اس سکیم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کسی ممبر کا اقساط کے ذریعے ادا کیا ہوا روپیہ کسی حالت میں بھی ضبط نہیں ہوتا خواہ اس نے ایک ہی قسط ادا کی ہو۔

اس حقیقت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ "سود" خواہ وہ کیسی ہی ترقی یافتہ اور دلفریب صورت میں کیوں نہ ہو۔ اسلام میں قطعی حرام ہے۔ اس لئے ایک مسلم معاشرہ میں ایسے اقتصادی نظام کو جس کی سرگرمیوں کا سارا دارومدار "اصول ربا" پر منحصر ہو جاری نہیں رہنا چاہیئے مگر حالات کی ستم ظریفی یہ بھی ہے کہ عملی طور پر گذشتہ ایک صدی سے ہماری تمام تر اقتصادی اور تجارتی سرگرمیاں جس نظام معیشت کی مرہون منت رہی ہیں اس کی بنیادیں ہی سودی لین دین کے اصول پر قائم ہیں۔ اب جبکہ ہم اپنے ملک کو اسلامی جمہوریہ قرار دے چکے ہیں بہ الفاظ دیگر یہ ضروری ہوگیا ہے کہ جہاں ہم تمدنی زندگی کے دوسرے اہم شعبوں کو اسلام کے تصورات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہے ہیں وہاں اپنے اقتصادی اور تجارتی نظام کو بھی اس برائی سے حتی الوسع پاک کرنے کی کوشش کریں۔ پیش نظر سکیم کے جاری کرنے کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ عملی طور پر ایک ایسے تجارتی نظام کا خاکہ پیش کیا جائے جو موجودہ سودی نظام سے ہٹ کر "شرکت نفع و نقصان" کے اسلامی اصولوں پر قائم ہو۔ اس کے علاوہ دوسرے مقاصد یہ بھی ہیں کہ جہاں ایک طرف ملک کے عوام میں پس اندازی کا جذبہ اور شوق پیدا ہو تو دوسری طرف ان کا پس انداز کیا ہوا سرمایہ ایسے جائز اور معقول طریقوں سے نفع بخش تجارتوں اور صنعتوں میں لگایا جائے کہ ان سے بوقت ضرورت ان کو کثیر رقوم کی صورت میں یکمشت اپنا روپیہ اور اس کا مناسب منافع حاصل ہوتا رہے۔ تیسرے ان چھوٹی چھوٹی بچتوں سے اجتماعی طور پر ملک کی صنعت و تجارت کو فروغ حاصل ہو اور عوام میں تجارتی رجحان پیدا ہو۔

ابتداءً یہ سکیم کمپنی ہذا کے ملازمین، کمیشن ایجنٹس اور اس کے دوسرے شعبوں میں کام کرنے والے کارکنان کے اعزا و اقربا اور دوستوں کے لئے شروع کی گئی ہے۔ مگر اس میں وہ اسلام پسند عوام بھی حصہ لے سکتے ہیں جو نہ تو ان نام نہاد "امدادی کمیٹیوں" میں حصہ لینا چاہتے ہیں جو کہ محض تقدیر آزمائی اور جوئے کے "مہذب اڈے" بن کر رہ گئے ہیں اور نہ ہی وہ ایسے دوسرے اداروں میں شریک ہونا چاہتے

ہیں جنکے کاروبار کا دارومدار دورِ حاضر کے سودی نظام پر منحصر ہے۔ اس سکیم میں ہر وہ شخص جو رضاکارانہ طور پر اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہو اور کم ازکم پانچ روپے ماہانہ بچا سکتا ہو، حصہ لے سکتا ہے۔ یہ دورِ حاضر کی چھوٹی بچت کی پرافٹ شیئرنگ سکیموں Profit sharing schemes کی ایک اسلامی شکل ہے جس کا کامیاب تجربہ زمانہ حال کے اس اقتصادی نظام کو جو سودی لین دین کے بغیر ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ اسلام کے بلاسود نظامِ معیشت میں ڈھالنے کے لئے ایک سنگِ میل ثابت ہوگا۔

اَصَل سِکیم یہ ہے

سکیم اس سکیم کا ہر ممبر صرف پانچ روپے ماہوار ادا کرتا ہوا مقررہ مدت میں پانچ سو روپے کی کثیر امدادی رقم یکمشت حاصل کر سکتا اور اس کے علاوہ وہ اس بونس کا بھی حق دار ہوتا ہے جو کمپنی ہذا اپنے منافع سے اس سکیم میں حصہ لینے والے ممبران کے درمیان تقسیم کرتی ہے۔ بشرطیکہ وہ مقررہ مدت تک باقاعدگی سے اپنی ماہوار اقساط ادا کرتا رہے۔

بونس اس سکیم کے سلسلے میں وصول شدہ رقومات کو کمپنی ہذا کے نفع بخش تجارتی اور صنعتی شعبوں میں لگایا جائے گا اور ان شعبوں سے حاصل شدہ منافع سے اس سکیم اور کمپنی ہذا کے جملہ اخراجات (مع رفاہِ عام اور خیراتی اخراجات اور انکم ٹیکس) وضع کر کے باقی منافع کا ایک نصف حصہ کمپنی ہذا کا حصہ ہوگا اور دوسرا نصف حصہ منافع اس سکیم میں حصہ لینے والے ممبروں کے درمیان بطور بونس تقسیم ہوگا۔ بونس کی تقسیم سرمایہ اور وقت کے معروف اصول پر ہوگی جس کا معیار پانچ روپے فی ماہ فی یونٹ ہوگا۔ بونس کی تقسیم ہر دوسرے سال جس طرح ڈائریکٹران کمپنی ہذا کمپنی کے کاروباری حالات کے پیشِ نظر مناسب تجویز کریں ہوگی۔ کمپنی ہذا کی سالانہ آڈٹ شدہ بیلنس شیٹ میں دکھایا ہوا منافع قانونی منافع متصور ہوگا اور ہر حالت میں "غیر متنازع فیہ" ہوگا۔

ترتیب اس امدادی سکیم کی ترتیب یہ ہے جسے کبھی تبدیل نہیں کیا جائے گا

(۱) مدت ——— ایک صد ماہ
(۲) شرح قسط ——— پانچ روپے ماہوار
(۳) فیس داخلہ ——— ایک روپیہ
(۴) گروپ ——— پانچ صد ممبران

ہر گروپ کی تکمیل کے بعد ہر ماہ اس گروپ کے ایک ممبر کو پانچ سو روپے بطور امدادی رقم تقسیم ہوگا۔ ایک صد ماہ کے عرصہ میں نوّے مہینے عام ماہ ہونگے جن میں ہر مرتبہ ایک گروپ کے صرف ایک ہی ممبر کو پانچسو روپے کی امدادی رقم تقسیم ہوگی۔ مگر مندرجہ ذیل دس مہینے خاص ماہ ہونگے اور ان میں ہر مرتبہ مناسب تعداد میں ممبران کو پانچ پانچ صد روپے کی امدادی رقوم تقسیم کر کے پورے گروپ کے باقی ماندہ ۴۱۰ ممبروں کو امدادی رقوم تقسیم کردی جائیں گی۔ خاص ماہ حسبِ ذیل ہونگے۔

۶۵ ۷۵ ۸۵ ۹۰
۹۵ ۹۶ ۹۷
۹۸ ۹۹
۱۰۰

طریقہ تقسیم امدادی رقوم کے تقسیم کا طریقہ یہ ہے کہ ہر عیسوی ماہ کے تقریباً وسط میں کمپنی ہذا کے صدر دفتر یا کسی دیگر مقررہ مقام پر حاضر ممبران سے

پھر امداد طلب کر کے ان اعداد کی حاصل جمع کو امداد دینے والوں کی تعداد سے ضرب دیکر حاصل ضرب کو ۵۰۱ پر تقسیم کر دیا جائے گا اور جو باقی بچے گا اس رول نمبر والے کو امدادی رقم کا روپیہ تقسیم ہوگا۔ مثلاً پانچ اشخاص نے ۹۷، ۹۱۳، ۴۸۵، ۱۷۲، ۱۳۹۴ دیئے۔ ان کو جمع کیا تو ہوئے ۳۰۶۵ ۔ پھر پانچ سے ضرب دینے کے بعد ہو گئے ۱۵۳۲۵ ۔ ان کو ۵۰۱ پر تقسیم کرنے کے بعد باقی رہے ۲۹۵ ۔ اس طرح جس ممبر کا رول نمبر ۲۹۵ ہوگا اس کو اس ماہ کی امدادی رقم دے دی جائے گی۔ اسی طرح خاص مہینوں میں جتنی امدادی رقوم تقسیم ہوں گی اتنی ہی مرتبہ اعداد طلب کر کے مذکورہ بالا عمل ہوگا۔ اگر کسی مرتبہ کوئی ایسا رول نمبر نکل آئے جو پہلے تقسیم ہو چکا ہو تو اسے منسوخ کر کے یہی عمل دوبارہ کیا جائیگا

قواعد وضوابط

(۱) **گروپ** ہر گروپ میں پانچ صد ممبر ہونگے اور ہر گروپ کا ایک نمبر ہوگا اور وہ اسی نمبر سے پکارا جائے گا۔

(۲) **رول نمبر** ہر ممبر کا ایک رول نمبر ہوگا اور وہ اسی رول نمبر سے پکارا جائے گا اور وہی اس کا کھاتہ نمبر ہوگا ایک گروپ میں ایک سے پانچصد تک رول نمبر ہوں گے۔ صاحبِ استطاعت ایک نام پر ایک سے زائد رول نمبر الاٹ کرا سکتے ہیں ہر رول نمبر ایک ممبر شمار ہوگا اور اس کی اقساط الگ الگ ادا کرنا ہوں گی

(۳) **میعاد ممبری** کسی ممبر کی میعاد ممبری ایک صد ماہ سے زیادہ نہ ہوگی۔

(۴) **شرح قسط، فیس داخلہ** شرح قسط پانچ روپے ماہوار ہوگی۔ مگر ہر ممبر کو صرف پہلی قسط کے ساتھ ایک روپیہ فیس داخلہ فارم ممبری پر کرتے وقت ادا کرنا ہوگی۔ فارم ممبری وغیرہ صدر دفتر کراچی سے مفت حاصل ہو سکتے ہیں۔

(۵) **پاس بک** ہر ممبر کو کمپنی ہذا کی طرف سے ایک پاس بک دی جائے گی جس میں ممبر کا رول نمبر، گروپ نمبر، نام اور پورا پتہ درج ہوگا اگر پاس بک گم ہو جائے تو ایک روپیہ ادا کرنے پر نئی پاس بک حاصل ہو سکے گی۔ ممبر کو اپنے پتہ کی تبدیلی کی اطلاع صدر دفتر کو دینا ضروری ہے۔

(۶) **ابتدائے تقسیم امدادی رقوم** ہر گروپ کے پانچصد ممبران پورے ہونے پر ہی پہلی مرتبہ امدادی رقم تقسیم ہوگی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ آخر تک جاری رہے گا اور ممبروں سے دوسری قسط انکے گروپ کے پہلی ڈرائنگ کے بعد ہی وصول کیجائیگی

(۷) **رسیدات** اقساط کی وصولی پر صدر دفتر سے پکی رسیدیں جاری ہوں گی جن کو اس وقت تک احتیاط سے رکھنا لازمی ہے جب تک کہ ان کا اندراج صدر دفتر سے پاس بک میں نہ کرا لیا جائے۔ کسی پختہ رسید کے ضائع ہونے پر ڈپلیکیٹ رسید صدر دفتر سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

(۸) **وصولی اقساط** اقساط حسب ذیل طریقوں سے وصول کی جائیں گی (الف) براہِ راست صدر دفتر میں جہاں سے پکی رسیدیں جاری ہوں گی۔ (ب) کمپنی ہذا کے مقررہ کمیشن ایجنٹس کی معرفت جن کے پاس باتصویر شناختی کارڈ ہوں گے اور جو مطبوعہ کچی رسیدیں جاری کریں گے۔ پکی رسیدیں بعد میں صدر دفتر سے جاری ہوں گی۔ (ج) بذریعہ منی آرڈر۔ منی آرڈر سے اقساط ادا کرنیوالے ممبر مرسلہ رقم سے فیس منی آرڈر وضع کر سکتے ہیں۔ ایک ہی منی آرڈر سے کئی اقساط کا روپیہ روانہ کیا جا سکتا ہے۔ منی آرڈر کوپن پر صرف اپنا نام، رول نمبر اور گروپ نمبر لکھنا چاہیئے۔ منی آرڈر کی اجرا کی تاریخ قسط کی ادائیگی کی تاریخ متصور ہوگی۔ خواہ منی آرڈر کتنے دنوں بعد صدر دفتر میں وصول ہو۔ منی آرڈروں کی وصولی پر صدر دفتر سے پکی رسیدیں جاری ہوں گی۔

(۹) **مقررہ کمیشن ایجنٹس** اس سکیم کے سلسلے میں کسی ایسے شخص سے لین دین نہ کریں جس کے پاس صدر دفتر سے جاری شدہ باتصویر شناختی کارڈ نہ ہو اور کوئی رقم بغیر مطبوعہ رسید حاصل کئے ادا نہ کریں۔

(۱۰) لیٹ فیس قسط کا روپیہ ہر ماہ کی ۱۲ تاریخ تک ادا ہونا ضروری ہے۔ اس تاریخ کے بعد ادا ہونے والی اقساط پر ۵ آنے فی ماہ لیٹ فیس ادا کرنی ہوگی۔

(۱۱) ضبطی حقوق متواتر تین ماہ تک اپنی اقساط ادا نہ کرنے والے ممبر کے "حصول امدادی رقم" اور "حصول بونس" کے جملہ حقوق بحق کمپنی ہذا ضبط ہو جائیں گے۔ مگر کسی ممبر کی ادا شدہ اقساط کی رقم کسی حالت میں ضبط نہ ہوگی۔ ضبطی حقوق کے بعد جب اس کے نام پر امدادی رقم نکلے گی تو وہ اپنی پاس بک واپس کر کے صرف اپنی ادا شدہ اقساط کی رقم حاصل کر سکتا ہے۔ جو ممبر امدادی رقوم حاصل کر لینے کے بعد اپنی اقساط متواتر تین ماہ تک ادا نہ کرینگے ان کا "حصول بونس" کا حق بحق کمپنی ہذا ضبط ہو جائے گا۔

(۱۲) بحالی ضبط شدہ حقوق جس ممبر کے حقوق مندرجہ بالا دفعہ کے تحت ضبط ہونگے وہ اپنے نام امدادی رقم نکلنے سے پہلے پہلے کسی وقت بھی اپنی بقایا اقساط اور لیٹ فیس ادا کر کے اپنے ضبط شدہ حقوق بحال کرا سکتا ہے۔ امدادی رقم حاصل کرنے کے بعد "حقوق بونس" کی ضبطی بھی اسی طرح بحال کرائی جا سکتی ہے۔ اگر مسلسل آٹھ ماہ تک "حقوق بونس" کی ضبطی بحال نہ کرائی جائے گی تو وہ مستقل ضبطی ہوگی جس کے بعد اسے کسی صورت میں بھی بحال نہیں کیا جائے گا۔

(۱۳) رعایت مجبوری اگر کوئی ممبر کسی خاص مجبوری مثلاً علالت، بے روزگاری یا ناداری کی وجہ سے اپنی ممبری جاری رکھنے سے قاصر ہو جائے تو ایسی حالت میں وجوہات کی تصدیق کے بعد ڈائرکیٹران کمپنی ہذا کو اختیار ہوگا کہ اسکی ادا شدہ اقساط کی رقم پوری یکمشت فوراً ادا کر دیں۔ یہ رعایت صرف اس ممبر کو دی جائے گی جو درخواست دینے کے وقت تک اپنی اقساط پابندی سے ادا کر تا رہا ہو۔ اگر اس رعایت کے مستحق ممبر کے ذمہ کمپنی ہذا کا کوئی قرضہ ہوگا تو وہ اقساط کی رقم سے مجرا کر لیا جائے گا۔ اس دفعہ کے تحت خارج شدہ ممبر کے "حقوق بونس" بحق کمپنی ہذا ضبط ہو جائیں گے۔ یہ رعایت ایک گروپ میں زیادہ سے زیادہ ۱۵ ممبروں کو دی جائے گی اور ایک ماہ میں ایک سے زیادہ ممبروں کو نہ دی جائے گی۔

(۱۴) وفات ممبر اگر خدانخواستہ کسی ممبر کا انتقال ہو جائے تو اس کا جائز وارث متوفی کی ادا شدہ اقساط کی رقم پوری کی پوری یکمشت فوراً واپس لے سکتا ہے۔ اسے متوفی کی پاس بک واپس کرنی ہوگی۔ اگر وفات کے وقت متوفی کے ذمہ کوئی قرضہ ہوگا تو وہ اس کی رقم کی واپسی پر اس سے مجرا کر لیا جائے گا۔ اگر متوفی کا وارث چاہے تو متوفی کے حقوق اور ممبری اپنے نام منتقل کرا کر ممبری جاری رکھ سکتا ہے۔ اسے فیس منتقلی سے مستثنیٰ سمجھا جائے گا

(۱۵) نابالغوں کی ممبری نابالغ بچوں کو اس سکیم کا ممبر اس حالت میں بنایا جائے گا جبکہ ان کے والدین یا سرپرست روپیہ کی ادائیگی اور وصولی اپنے ذمہ لیں گے اور اپنے دستخطوں سے فارم ممبری پر کریں گے۔

(۱۶) اقساط پر قرضہ وہ ممبر جو کم از کم بارہ اقساط ادا کر چکا ہو اپنی ضرورت کے وقت کمپنی سے قرضہ لے سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ قرضہ کی درخواست کے وقت تک اپنی اقساط پابندی سے ادا کر رہا ہو۔ ایسا قرضہ ادا شدہ اقساط کی رقم کے ساٹھ فیصدی سے زیادہ نہیں دیا جائے گا۔ قرضہ کی واپسی بارہ مساوی اقساط میں کرنی ہوگی جو قسط ممبری کے علاوہ ہونگی۔ اگر اس عرصہ میں قرضہ لینے والے ممبر کے نام امدادی رقم نکل آئے گی تو قرضہ کی رقم یکمشت اس سے مجرا کر لی جائے گی۔ ایک گروپ سے زیادہ سے زیادہ بیس ممبروں کو قرضہ مل سکے گا اور ایک ماہ میں ایک سے زیادہ ممبروں کو قرضہ نہ مل سکے گا۔ قرض کی درخواست منظور کرنا یا نہ کرنا ڈائرکیٹران کمپنی ہذا کے اختیار میں ہوگا وہ کمپنی کے کاروباری حالات کے پیش نظر قرض کی درخواست کو منظور یا نامنظور کر سکتے ہیں۔ یہ صرف ایک رعایت ہے، قرض طلب کرنا ممبر کا حق نہیں۔

(۱۷) یکجائی گروپ — اگر کسی وقت کسی گروپ میں ایسے ممبروں کی اکثریت ہو جائے جو اپنی اقساط ادا نہ کر رہے ہوں اور جس کی وجہ سے اقساط ادا کرنے والے ممبروں یا کمپنی ہذا کو نقصان ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اس گروپ کی ڈرائنگ کا سلسلہ بند کر کے اس گروپ کے بقایا ممبروں کو کسی دوسرے گروپ میں منتقل کرنے کا اختیار ڈائریکٹران کمپنی کو حاصل ہوگا! ایسی منتقلی کے بعد کمپنی کا فرض ہوگا کہ منتقل شدہ ممبروں کو ان کے نئے گروپ اور نئے رول نمبر سے مطلع کرے۔ اس صورت میں قسط ادا نہ کرنے والے ممبروں کو ان کی ادا شدہ اقساط کی رقوم اس گروپ کی مقررہ مدت کے اختتام پر ادا ہوں گی

(۱۸) انتقال ممبری — اگر کوئی ممبر اپنی ممبری جاری رکھنا نہ چاہے تو وہ کمپنی ہذا کی منظوری سے اپنے حقوق ممبری کسی دوسرے شخص کے نام منتقل کرا سکتا ہے اور اپنی ادا شدہ اقساط کا روپیہ اس سے وصول کر سکتا ہے۔ ایسی منتقلی کے لئے ایک روپیہ فیس منتقلی ادا کرنا ہوگی اور نئے شخص کو اپنے نام سے نیا فارم ممبری بھرنا ہوگا

(۱۹) واپسی اقساط — کوئی ممبر کسی حالت میں مقررہ وقت سے پہلے اپنی ادا شدہ اقساط کا روپیہ واپس نہیں لے سکتا بجز ان خاص حالات کے جنکا ذکر ان قواعد و ضوابط میں پہلے آچکا ہے۔

(۲۰) تنازعات — اس سکیم کے ممبران اور کمپنی ہذا کے درمیان تمام تنازعات کے فیصلے کا حق ڈائریکٹران کمپنی ہذا ہی کو حاصل ہے جو صدر دفتر میں ہی ہوگا جس کی پابندی ہر ممبر پر ضروری ہے

(۲۱) تبدیلی قواعد و ضوابط — قواعد و ضوابط وغیرہ میں بوقت ضرورت تبدیلی کی جا سکتی ہے لیکن اصل سکیم کو کسی حالت میں تبدیل نہیں کیا جائے گا

(۲۲) پابندی — ہر ممبر کے لئے قواعد و ضوابط سے پورا پورا اتفاق اور ان پر کاربند رہنا ضروری ہے۔ قواعد و ضوابط سے لاعلمی ان سے انحراف کا عذر نہیں ہوگی۔

(۲۳) قانونی چارہ جوئی — کمپنی ہذا اور اس سکیم کے ممبران یا ان کے متعلقین کے درمیان ہر قسم کی قانونی چارہ جوئی صرف کراچی ہی کی عدالت میں ہو سکتی ہے۔

ساون کی مدبھری فضاؤں میں
جوانی کی امنگیں اور
خوشی کے جھولے
فیمیلن
کے شکر گزار ہیں
حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی سے طلب کیجئے

October 1956 Phone 7923 Regd. No. S. 1375

Monthly "MUSHIR" Karachi

Printed at Mashhoor Press, McLeod Road, Karachi.

کراچی

مشیر

ماہنامہ

قیمت آٹھ آنے

November 1956

مرتب

MUSHIR KARACHI

باہمی بچت کی ایک پرافٹ شیئرنگ سکیم ہے

جس میں حصہ لینے والا ہر ممبر پانچ روپیہ ماہانہ ادا کرتا ہوا مقررہ مدت میں پانچ صد روپے کی کثیر رقم بھی یکمشت حاصل کرتا ہے، اور اس کے علاوہ وہ اس بونس کا بھی حقدار ہوتا ہے جو کمپنی ھذا اپنے منافع سے اس سکیم میں باقاعدگی سے حصہ لینے والے ممبران کے درمیان تقسیم کرتی ہے۔

اس سکیم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کسی ممبر کی ادا کی ہوئی اقساط کا روپیہ کسی حالت میں بھی ضبط نہیں ہوتا خواہ اس نے ایک ہی قسط ادا کی ہو۔

عبدالغفور بیگ
مینیجنگ ڈائریکٹر، باوقار کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی ۱

فون نمبر: ۷۹۲۳

منظر حسین •

تصادم

سڑک کے موڑ پر پہنچتے ہی تصادم ہوگیا۔

"کتنا خوبصورت جانور ہے یہ؟" اس نے سوچا لیکن کہا صرف "Sorry" ——— اس Sorry کے جواب میں اسے بھی ایک Sorry ملا، یعنی تصادم کی رپورٹ تھانے میں لکھوانے کی بجائے آنکھوں میں لکھ لی گئی۔

"خوبصورت جانور" چلا گیا لیکن اس کے "دل کا انجن" اسٹارٹ ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔

وہ بہت دیر تک "تصادم کے مقام" پر کھڑا رہا اور اسے بڑے پیار سے دیکھتا رہا "خوبصورت جانور" کے جسم کا ایک ایک عضو ابھر ابھر کر اس کی آنکھوں کے سامنے پھڑک رہا تھا، ناچ رہا تھا، تھرک رہا تھا ——— اور اس کا دل بھی ان کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ کیونکہ کوئی "ڈانس" بغیر ایک ساتھی کے "مکمل" ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا؟

اچانک اس کے سامنے سے ایک "سیاہ برقعہ" بجلی کی سی رفتار کے ساتھ گذر گیا۔ اور اس کا ذہن دفعتاً اپنی بیوی کی طرف مڑ گیا

"لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ ——— اس خوبصورت بلا میں کونسی چیز ایسی ہے جو میری بیوی میں نہیں" اس نے تصادم کے مقام پر تھوک دیا ——— اور تھوک کر وہ آگے بڑھ گیا۔

بشکریہ "معیار"

اصلاحی ادب کا ڈائجسٹ
(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ماہنامہ مُشیر کراچی

ٹیلیفون : ۷۹۲۳

جلد : ۷
شمارہ : ۱۱

نومبر ۱۹۵۶ء

مرتبہ
عبد الغفور بیگ

ترتیب

فی پرچہ : آٹھ آنے ، سالانہ : پانچ روپے
بھارت میں ترسیلِ زر کا پتہ : پندرہ روزہ "الحسنات" رامپور (یو۔پی) بھارت
پرنٹر و پبلشر عبد الغفور بیگ نے شہود آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ مشیر بندر روڈ، کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قومی اسمبلی کا فیصلہ

پاکستان کی قومی اسمبلی نے بالآخر انیس کے مقابلے میں اڑتالیس ووٹوں کی اکثریت سے مشرقی پاکستان کے لئے مخلوط اور مغربی پاکستان کے لئے جداگانہ انتخاب کا طریقہ منظور کرلیا ہے۔ عوامی لیگ کی اسلام دشمنی، ری پبلکن پارٹی کی منافقت اور بے ضمیری اور ہندو کی پختہ زناری کے نتیجے میں اگرچہ بالواسطہ طور پر منتخب ہونے والی ایک اسمبلی میں اس فیصلے کو اکثریت کی تائید حاصل ہو گئی ہے لیکن کوئی شخص جو آنکھیں رکھتا ہو اور جس کے اندر دیانت کی رمق بھی موجود ہو، اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ اس فیصلے کو ملک کے عوام کی اکثریت کی تائید حاصل نہیں بلکہ دونوں صوبوں کی پارٹیوں کے مسلم ارکان بھی اس فیصلے کے خلاف ہیں۔ پاکستان کے دونوں بازوؤں کے مسلم عوام نے اظہار رائے کے تمام طریقے اختیار کرکے کسی اشتباہ کے بغیر یہ بات واضح کردی ہے کہ وہ پاکستان کے بنیادی نظریات اور اس ملک کی سالمیت پر ضرب لگانے والی مخلوط انتخاب کی تجویز کے خلاف ہیں اور ان کے نزدیک اس کو اپنانے کا مطلب خود اس ملک کے شیرازے کو منتشر کرنے کا سامان فراہم کرنا ہے لیکن نہ مشرقی پاکستان کے جمہوریت پرستی کے مدعیوں اور نہ مغربی پاکستان کے عوام کی حاکمیت کو تسلیم کرنے والوں نے ان کی رائے اور خواہش کا احترام کیا۔ بہ حال عوام کے ساتھ غداری کا یہ واقعہ اس ملک کی تاریخ میں محفوظ رہے گا اور جن عناصر نے لوگوں کی مرضی کے خلاف ان پر ایک فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش کی ہے انہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ اگر کوئی گروہ عوام کی رائے کے خلاف جانے کی کوشش کرے اور محض ذاتی اغراض اور مفادات کی خاطر اعلیٰ تر ملکی و قومی مصالح کو قربان کرے تو اسے لازماً اس خود غرضی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

طریق انتخاب پر قومی اسمبلی کے اس فیصلے نے بظاہر ایک مسئلے کو ختم کردیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذریعے اس ملک کے اندر ایک نئی کشمکش کی بنیاد رکھ دی گئی ہے یہ کشمکش اسلام کو اس ملک کی اجتماعی زندگی میں رہنمائی کا مقام دلوانے والوں اور اس کے مخالفین کے درمیان ہوگی۔ طریق انتخاب کا سوال صرف نمائندے منتخب کرنے اور ووٹ ڈالنے کی کسی خاص شکل کا سوال نہیں تھا بلکہ درحقیقت اس کا تعلق اس بات سے تھا کہ عقیدے اور نظریے کو اجتماعی معاملات میں کوئی اہمیت حاصل ہونی چاہیئے یا اسے صرف افراد کی نجی زندگیوں تک محدود ہونا چاہیئے۔ جداگانہ انتخاب کے حامیوں کا موقف یہ تھا کہ چونکہ اسلام کو اس ملک کی اجتماعی زندگی کی بنیاد بننا ہے اور ایک اسلامی معاشرے کو وجود میں لانا یاست کی ذمہ داری قرار دیا مطلوب ہے اس لئے یہاں عقیدے اور مذہب کو افراد کا پرائیویٹ معاملہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مخلوط انتخاب کے حامیوں نے مذکورہ بالا دلیل سے تو کوئی تعرض نہیں کیا کیونکہ اس کو غلط ثابت کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا اور اس کو درست تسلیم کرنے سے ان کے عزائم بے نقاب ہوتے تھے اور ان پر براہ راست اسلام کی مخالفت کا الزام عائد ہوتا تھا اور اس مرحلے پر وہ اس الزام کو اپنے لئے نقصان دہ خیال کرتے تھے۔ اس لئے اس دلیل کا مقابلہ کرنے کے بجائے انہوں نے دوسرے طریقوں سے جداگانہ انتخاب کی مخالفت کی لیکن اس مسئلے کی حقیقت اور اصل اہمیت اس قدر واضح ہو چکی ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اس کے نتائج اور مضمرات کو اچھی طرح جانے بوجھے بغیر مخلوط انتخاب کی حمایت کی ہو چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ طریق انتخاب کے سوال پر اس ملک کے تمام طبقوں میں جو دو گروہ بن گئے ہیں چند مستثنیات کو چھوڑ کر آئندہ کے مراحل میں وہ اپنی اپنی جگہ اس ملک میں اسلام کو اپنانے اور اجتماعی زندگی سے اس کو خارج کرنے کے لئے جدوجہد کریں گے۔ اسلام کی حمایت اور اس کی مخالفت کرنے والے دو گروہ ویسے تو شروع ہی سے اس ملک میں چلے آرہے ہیں لیکن اب تک ان کے درمیان اس قدر واضح اور قطعی تفریق

نہیں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اسلام کے بعض مخالفوں نے نفاق کے لبادے اوڑھ رکھے تھے اور اس کے بعض حامی ذاتی مصلحتوں اور مفادات کی خاطر اس کی مخالفت کرنے والوں کا بھی ساتھ دے رہے تھے لیکن اب صورت حال مقابلتاً زیادہ واضح ہوگئی ہے اور اگرچہ اب بھی بعض عناصر ایسے موجود ہیں جن کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن کم ازکم ایک موٹی سی تقسیم بہرحال ہوگئی ہے اور اس ملک کے تمام قابلِ ذکر افراد اور جماعتوں کے بارے میں اب کہا جاسکتا ہے کہ ان کا وزن کس طرف ہے۔

اسلام کے حامی اور مخالف دونوں گروہوں پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام پسند حلقوں میں اسلام کے شعور، اسلام کے تصور، انفرادی اور جماعتی زندگی میں اس کے ساتھ وابستگی، اس کو اپنانے کی خواہش، اس کے لئے قربانی دینے کی صلاحیت اور اس کو برپا کرنے کے عزم کے لحاظ سے بہت زیادہ فرق ہے اس حلقے میں ایسے افراد اور جماعتیں بھی موجود ہیں جن کو نہ اسلام سے شعوری محبت ہے نہ ان کے افکار و اعمال اسلام کے احکام کے تابع ہیں۔ نہ وہ اسلام کو اس کی اصلی شکل میں نافذ کرنے کی حقیقی خواہش رکھتے ہیں اور زبان سے اسلام کے ساتھ تعلق کا اظہار کرنے کے سوا ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں اسی طرح مخالف اسلام حلقے میں بھی مختلف عناصر جمع ہیں۔ بعض قلب و ذہن کی پوری تائید کے ساتھ اسلام کو ترک کرچکے ہیں اور اس کو ملک کی اجتماعی زندگی سے خارج کرنا ان کا مشن ہے۔ بعض دوسرے کچھ تھوڑی بہت مصالحت کے حامی ہیں اسلام کے بعض ظواہر سے کچھ وابستگی بھی رکھتے ہیں اور اجتماعی زندگی کے بعض شعبوں میں تھوڑا بہت اسلام کا نام رہ جائے تو انھیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

ان دونوں مخالف گروہوں کے درمیان جو کش مکش اس وقت شروع ہوئی ہے آئندہ کے مراحل میں یہ اور زیادہ واضح اور شدید صورت اختیار کرے گی اور ان دونوں میں سے کسی ایک کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ کون اپنے اصولوں کے ساتھ گہری وابستگی کا ثبوت دیتا ہے اور اپنے نقطۂ نظر کی کامیابی کے لئے مخلصانہ جدوجہد کرتا ہے۔ ہم ان تمام عناصر سے جو اس ملک میں اسلام کے احیا اور غلبے کے خواہش مند ہیں اور اس وقت اس کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کررہے ہیں صاف لفظوں میں کہیں گے کہ اگر انھیں اس ملک میں زندہ رہنا ہے تو انھیں اپنے عمل کو اپنے قول کے مطابق بنانا چاہیئے۔ اسلام کے ساتھ کسی کی نیم دلانہ اور منافقانہ وابستگی نہ اسے کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ اس سے اسلام کی کوئی خدمت ہوسکتی ہے۔

(تسنیم)

تلخ و تُرش

"ڈھاکہ میں ہندوؤں اور کمیونسٹوں نے مسلمانوں کی ڈاڑھیاں نوچ لیں۔" (ایک خبر)

——— "اگر عوامی لیگ کی "عوامی حکومت" کچھ دن اور قائم رہی تو مسلمانوں کی ڈاڑھیاں بہت جلد صاف ہوکر "عوامی سطح" پر آجائیں گی۔"

پہلے دن :- "میں اور میری ری پبلکن پارٹی مخلوط انتخاب کی حامی ہے۔" (ڈاکٹر خان)

دوسرے دن :- "ری پبلکن پارٹی جداگانہ انتخاب کی پرزور حمایت کرے گی۔" (ڈاکٹر خان)

——— نتیجہ : مخلوط (جداگانہ) انتخاب

مسٹر سہروردی نے مشرقی پاکستان میں مخلوط اور مغربی پاکستان میں جداگانہ انتخاب رائج کرنے کے سلسلے میں یہ دلیل دی ہے کہ "چونکہ مشرقی پاکستان اسمبلی مخلوط انتخاب کے حق میں ہے اور مغربی پاکستان اسمبلی جداگانہ انتخاب کی قرارداد پاس کر چکی ہے۔ اس لئے قومی اسمبلی کا یہ فرض ہے کہ وہ دونوں بازوؤں کی اسمبلیوں کے مطالبات منظور کرلے"۔

——— پس یہ ثابت ہوا کہ "قومی اسمبلی" نام ہے اس ادارہ کا، جو "مشرق اور مغرب" کے مطالبات منوانے کے لئے وجود میں آیا ہے "قوم" کے مطالبات منوانے کے لئے نہیں۔

"میں نے عہد کرلیا ہے کہ میں اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہوں گا جو قرآن حکیم اور اسلام نے متعین کیا ہے"۔

(مسٹر سہروردی وزیر اعظم پاکستان)

——— اس لئے ضروری ہے کہ "اسلامی جمہوریۂ پاکستان" میں سے "اسلامی" نکال کر "پاکستان" کو "صراطِ مستقیم" پر ڈال دیا جائے۔

"پاکستان میں دو قومی نظریہ ختم ہو گیا مگر بین الاقوامی سطح پر موجود ہے"۔ (مسٹر سہروردی)

——— یعنی نہیں ——— ہے۔

"گزشتہ ماہ "اونچی سوسائٹی" کی نو عورتوں نے شوہروں سے طلاق حاصل کرنے کے مقدمات دائر کئے" (ایک خبر)

——— اسی لئے تو "عائلی کمیشن" کی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔

"بھارتی ہائی کمیشن ڈھاکہ کے عملہ نے قومی اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر پاکستانی نوجوانوں کی رہنمائی کی"۔ (ایک خبر)

——— اسلئے کہ ہمارے دستور کے ہر نازک موڑ پر وہ "رہنمائی کا فرض" انجام دیتے چلے آرہے ہیں۔

"جداگانہ انتخاب مشرقی پاکستان کے خلاف مغربی پاکستان کے لوگوں کی سازش ہے"۔ (عوامی لیگ)

——— بالکل "عجمی سازش" (جو ہمیشہ صدیوں یا سالوں کے بعد ہی بے نقاب ہوتی ہے)

"پنڈت نہرو نے مسٹر سہروردی کے نام ایک چھٹی روانہ کی ہے جس میں انھوں نے الجزائر کے مسئلہ پر فرانس سے سودا بازی کی تردید کی ہے"

——— کیونکہ تردید کر دینے سے "عمل" پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔

پاکستان کے مقابلہ میں بھارت عرب حکمرانوں کو زیادہ عزیز ہے (عام حقیقت)

——— کیونکہ بھارت نے اسرائیلی ریاست کو تسلیم کرلیا ہے اور پاکستان نے اب تک نہیں کیا ہے۔

علامہ سیماب اکبر آبادی ●

حوادث کے بھنور میں بیٹھ جا، سینہ سپر ہو کر — یہی موجیں کبھی ساحل بنیں گی، مختصر ہو کر

ہزاروں سوز در دل لوٹ آئے، طور پر ہو کر — یہ تم نے کیا لگا دی آگ، اک دن جلوہ گر ہو کر

ہنسی آتی ہے مجھ کو اپنے اس سودائے ناقص پر — کہ تیرے دیکھنے کی آرزو ہے خود، نگہ ہو کر

اسی پر بوالہوس کو زعم ہے طوفاں اٹھانے کا — بہت رویا تو دامن رہ گیا اشکوں سے تر ہو کر

تصور کا یہ ادنیٰ کھیل ہے اے حسنِ آوارہ — رہی برسوں تری تصویر پابندِ نظر ہو کر

یہ ہے طُرفہ تصرف بیقراروں کے مزاروں کا — ٹھہر جاتا ہے دم بھر، جو نکلتا ہے اِدھر ہو کر

تمہیں کو مانگتا ہوں تم سے، وہ ضدی بھکاری ہوں — مرے دستِ دُعا میں خود ہی آجاؤ، اثر ہو کر

جو دِل ٹوٹے تو ہر ٹکڑے سے دیکھے پھر بنا اک دل — ہے کیوں رنجِ شکستِ آئینہ، آئینہ گر ہو کر

نہیں جس میں تحمل مشکلاتِ راہِ منزل کا!

وہ پچھتائے گا اے سیماب میرا ہمسفر ہو کر!!

(بشکریہ "فانوس")

فروغ احمد بی، اے

اسعد گیلانی کا فن

اسعد صاحب سے میں واقف اس وقت سے ہوں جب علی گڑھ کی خاک چھان رہا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے، جب دو قومی مہابھارت کا اختتامیہ نقطۂ عروج پر تھا اور...... "پاک قومی وطن" کی تحریک کا سیلاب اپنے پیچھے کٹے پھٹے ساحل، خس وخاشاک اور آدم کے بیٹوں کے ڈھلپنجے چھوڑ گیا تھا" ایک بلال، ایک تارا" تو خیبر کے گردوں پر چمکا" پیچھے تاریکی کا سرمئی پرچم لہرا رہا تھا۔ قوم کا "مرکزِ اعصاب" ماضی قریب کی بوجھل یاد سے دبا ہوا ہونے کے باوجود نت نئی لہر کے لئے بیتاب تھا " چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" "حالی روڈ" سے "وکٹوریہ گیٹ" اور "میرس روڈ" سے "وقار الملک ہال" تک ایک ہی لے تھی۔ قوم کا "مرغ بادنما" قوم کی راہ نمائی کر رہا تھا۔

"وہی رخ قرار پایا جو ہوا دیا ہوا نے"

نوخیز مفکر، نئے ادیب، نئے شاعر اور نئے فن کار ——

نئی فکر، نئے ادب، نئے پیغام اور نئے اسلوب کی رو میں بہتے ہوئے آتے اور اپنی اپنی ترنگ سے اس رو کو تیز اور آگے بڑھاتے چلے جاتے۔

آدم کے تین بیٹوں کو میں نے وہاں بھی دیکھا۔ ایک مر رہا تھا ایک موت کو آواز دے رہا تھا اور ایک ہنوز محوِ خواب تھا — جالیدار پردے سمٹ رہے تھے۔ ایرانی قالین لپیٹے جا رہے تھے! فرنگی صوفے کھسک رہے تھے۔ کمروں کی زینت اب فوجی تربیت کے سامان بھاری بوٹ اور خاکی وردیاں بن رہی تھیں۔ مابعد جنگ کے مسائل پر بحثیں ہوتیں۔ مجاز جعفری، جذبی کے ترانے الاپے جاتے جو حزن و یاس اور جھنجلاہٹ کے آئینہ دار ہوتے۔ عالمی جنگ کا آخری بگل بج رہا تھا لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ "ایک مرگ ناگہانی" اور ہے ——

اس کے مقابلے میں "سنی تھیالوجی" اور "شیعہ تھیالوجی" کے گھنٹے ہنسنے اور اونگھنے کا سامان بہم پہنچاتے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

مشرق بعید کے طالب علم کو چرچل کا مقالہ —— "Twilight of civilization" جو یونیورسٹی میگزین میں شائع ہوا تھا نظام حاضر کی موت کا اتنا ہی مکمل نقشہ تھا جتنی ہلاکت کی صحیح عکاسی " اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں"؟ جیسے وحشت ناک گیتوں سے ہو رہی تھی " جو مشرق کے جوان گرم خون کے لبوں پر جاری ہو رہے تھے۔

دوسری طرف...... فریاد ز تیموری و چنگیزی افرنگ"

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

کا آہنگ کوس رحیل سے زیادہ نوائے خواب تھا جو سہل پسند طبیعت کو تھپکیاں دے رہا تھا۔

لیکن اُنہی دنوں ایشیا کے ایک گوشے سے چونکا دینے والی ایک ہلکی ہلکی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ کوئی ہم سے کہہ رہا تھا، کہ جس دن زندگی کے تمام شعبوں میں سے اہل باطل کو بے دخل کر دیا گیا۔ ان کے تمام فلسفے اور سیاسی و معاشی نظریے آپ کی سچائی اور راست روی کے مقابلے جھوٹے ملمع ثابت ہوں گے اور وہ طائر جو آج انکے کیمپ میں نظر آ رہے ہیں ٹوٹ ٹوٹ کر اسلامی کیمپ میں آتی چلی جائیں گی حتیٰ کہ ایک وقت آئے گا جب کمیونزم خود ماسکو میں اپنے بچاؤ کے لئے پریشان ہو گا۔ سرمایہ دارانہ ڈیموکریسی خود واشنگٹن اور نیویارک میں اپنے تحفظ کے لئے لرزہ براندام ہو گی مادہ پرستانہ الحاد خود لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں جگہ پانے سے عاجز ہو گا........" (مودودی)

ہمارے سامنے انڈونیشیا کے استاذ عمرانیات کا یہ اعلان

Islam is not a spend up force

اسٹریچی ہال میں عبدالوہاب عزام کا عربی لب و لہجہ میں اقبال کا یہ شعر پڑھنا ؎

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

پھر جوانان علی گڑھ کے ہجوم میں اخوانی جوان مصطفےٰ مومن کا یہ دعویٰ کہ۔ "Concentrate the force of Islam at a single focus and it will blow up the entire system of evil."

اور پھر ——— نعرہ ہائے تکبیر سے وجود میں آئی ہوئی ایک نوخیز الشبابیٔ مملکت میں مطالبۂ نظام اسلامی کا عوامی سیلاب بڑی تیزی سے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ قصر و ایوان کانپ رہے تھے اور طوق و سلاسل کی جھنکاریں سنائی دے رہی تھیں۔ آدم کا تیسرا بیٹا جاگ رہا تھا۔

اس وقت کوئی تھا جو اپنی فنکاری کے پورے زور سے کام لیکر ہمیں مسلسل یقین دلا رہا تھا کہ ؎

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

"ذہنی زلزلے" کے عظیم جھٹکے کے بعد جہانِ نو کا یہ روح پرور مشاہدہ عین الیقین سے کم نہ تھا۔ جہانِ نو کے معماروں میں سے ایک معمار اسعد گیلانی بھی ہے۔ "جہانِ نو" اور "اسعد گیلانی" باہم مترادف ہیں۔ یہ "جہانِ نو" پھیلتا گیا اور ہم سب کے سب اس میں سماتے گئے۔

پاکستان میں اسلامی ادب کی تحریک سے باضابطہ منسلک ہو جانے کے بعد جناب اسعد گیلانی صاحب سے میرا تحریکی تعلق پیدا ہوا۔ اس وقت تک "کیڑے مکوڑے"، "اینٹیں"، "مسلم مرگیا" وغیرہ سے میں نے اسعد گیلانی کا جو خاکہ اپنے ذہن میں تیار کیا تھا اسے وہ خاکہ بھی نہ مٹا سکا جو نعیم صدیقی کی شوخیٔ قلم کا نتیجہ تھا۔

سنہ ۱۹۵۴ء میں اسعد صاحب بنگال تشریف لائے تو "آدم کے تین بیٹوں کی" داستان اپنے ساتھ لائے۔ حلقہ ادب اسلامی ڈھاکہ کی ایک نشست میں جب انھوں نے آدم کے بیٹوں کا تعارف کرایا تو ہم نے محسوس کیا کہ ان کا یہ فن پارہ مشاہدہ "انشائیہ اور رجائیت" کے امتزاج کا نادر نمونہ ہے۔ ان کے بنگال آنے سے پہلے تک ان کے جو افسانے ہماری نظر سے گذرے تھے اُن میں سب سے زیادہ گہرا نقش ہمارے ذہنوں پر ان افسانوں نے چھوڑا تھا۔

"مسلم مرگیا"، "مونچھیں"، "مینا بچی امانت"، "ایک عورت دو ملک"، "روشنی اور سائے"، "جہنم کے دروازوں پر" اور "ایک بہتر اشتراکی"۔

ان کے بنگال آنے کے بعد ان کے دو تصوری افسانے "پتھر اور پرند" اور "لاشوں کا شہر" بہت معیاری سمجھے گئے۔ جنسی موضوع پر "کورٹ شپ"، "جیلانی کے خاص آدمی" کا بھی پیش رو ہے۔ لیکن اسے پڑھتے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اسعد صاحب کبھی "اکرم" کو جیل پہنچا کر "خاص آدمی" بنانے کے بجائے اسکے جنون کا علاج رائی کے پلاسٹر سے کرتے ہیں۔

ایک تحریکی اور تنظیمی کارکن ہونے کے سبب اسعد گیلانی اپنے دوسرے ساتھیوں سے ممتاز ہیں۔ ان کے فن کا ارتقاء تحریک کے ارتقاء کے تابع رہا ہے۔ نہ صرف موضوع بلکہ تخیل، فن اور جدت اثر میں بھی اس نے ارتقا کیا ہے۔

اسعد کا اصل فن ہے "اس نے سوچا"، یہی اس کا فن بھی ہے یہی اسلوب بھی۔ مشاہدہ کے قلیل ترین مواد کو وہ اپنی "سوچ" سے نہ صرف مالا مال کر دیتا ہے بلکہ اسے بڑھا چڑھا بھی دیتا ہے۔ جیسے کوئی ہوائی مٹھائی بنانے والا شکر کی ایک ننھی سی گولی کو اپنی مشین میں ڈال کر چرخی گھمائے تو روئی کے بڑے بڑے رنگا رنگ گالے جیسی مٹھائیاں نکلتی چلی جائیں۔ یہ اسعد کا کمال ہے۔ بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ اس کی کہانیوں میں سب کچھ تو ہوتا ہے مگر قصہ پن نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے بوقلموں تخیل سے منفرد مشاہدات کو گوندھ کر ماجرا اور منفرد ماجراؤں کو جوڑ کر داستان کی داستان بنا

لیتا ہے لیکن اصل میں کچھ تلخ حقائق ہی ہوتے ہیں جنہیں وہ ہمارے سامنے لاتا ہے۔ مگر ماجرا سرائی کے سنہری فریم میں اور یہ عکاسی وہ اپنے تخیل کی سطح سے نیچے اتر کر نہیں کر سکتا کیونکہ وہ فوٹو گرافر کالم نویس یا کارٹونسٹ نہیں بلکہ ایک مقصدی ادیب ہے جو زندگی کو ایک مقصد سے وابستہ کرنے کے لئے اٹھا ہے۔

میرا خیال ہے اسعد صاحب کو اپنے ہم مقصد فنکاروں میں جو مقام حاصل ہے اسے سمجھنے کے لئے اس پورے کاروانِ ادب کے رُخ اور رفتار کو سمجھنا ضروری ہے۔ پھر جس منبعِ فکر سے اس نئی لہر کو توت مل رہی ہے اس کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے ورنہ اس خلجان سے مفر نہیں کہ ہمارے گرد و پیش میں عرصہ سے جو طوفانِ ادب برپا ہے اس میں ان اسلامی ادیبوں کا فن اور اسلوب بالکل اجنبی اجنبی اور انوکھا انوکھا سا کیوں معلوم ہوتا ہے؟ کیا ادب کی اس جدید تحریک کو پرکھنے کے لئے مروجہ معیارِ فن کافی ہے؟ کیا اپنی تخلیقات کو مقبولِ عام بنانے کے لئے مقصد کے اچھوتا پن کا خون کئے بغیر مروجہ اسلوب اور تکنیک کو جوں کا توں اپنایا جا سکتا ہے۔ کیا ایک نئی تحریک صرف نیا تخیل دے سکتی ہے۔ اور اس تخیل کے شایانِ شان نیا تکنیک اور نیا اسلوب فراہم نہیں کر سکتی "معاش" اور "جنس" جیسے روزمرہ مسائل کی اسلامی ادب میں کیا حیثیت ہے اور اس کی یہاں کتنی گنجائش ہے؟ یہ اور اس قسم کے بہتیرے سوالات سے اسلامی ادب کے مفکرین دو چار ہیں۔ پرانے "ترقی پسند" اور "قدیم اربابِ ذوق" کو چاہیئے کہ وہ ذرا صبر سے کام لیں۔ جب ایک رجحان پیدا ہوا ہے تو جس طرح اس نے اپنے ابتدائی فن کار پیدا کر لیے، اسی طرح اپنے سارے وسائل، اپنا تکنیک اپنا فارم اپنا سب کچھ پیدا کر لے گا۔ ابھی تو ایک ہیولا سا اُبھرا ہے۔ "جہانِ نو" کی تعمیل ابھی مکمل کہاں ہوئی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسعد گیلانی اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کا مستحق ہے جو ایک نئے رجحان، نئی تحریک اور روبہ ارتقا تعمیر کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے لیکن اتنی بات بہرحال کہی جا سکتی ہے کہ اسعد تخیلی اور صناعی اور مقصدی جارحانہ پن کے اعتبار سے نہ صرف اپنے ساتھیوں میں ممتاز ہے بلکہ دوسرے کیمپوں میں بھی اس سے ملتے جلتے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

ایسے معمولی واقعات و حوادث جو ہمارے ذہنوں پر سادہ اور سپاٹ سا اثر چھوڑتے ہیں۔ اسعد صاحب کے فنِ تخیل (Art of thinKing) سے نہایت باریک اور تفصیلی نقوش کے حامل بن جاتے ہیں۔ ان کا فن جنوبی ہند کے قدیم فنِ سنگتراش سے مشابہ ہے۔ داخلیت عمومی نجی تجربہ کا نام ہے لیکن اسعد گیلانی کی مقصدی داخلیت جب اپنا عمل مکمل کر چکتی ہے تو اس کے فن پارے میں وہی مؤثر یا "(Suggestime)" اندازِ ــــــ (Process) پیدا ہو جاتا ہے جو خارجیت کی حد تک ٹھوس ہوتا ہے حتیٰ کہ عام ناظرین بھی خواہ حیران ہوں یا متاثر، اسے محسوس (Appreciate) کئے بغیر نہیں رہتے۔

آپ اسعد گیلانی کے جس فن پارے کو چاہیں دیکھ لیں آپکو یہ ماننا پڑے گا کہ قلیل سے قلیل خام مواد کو وہ اپنے زورِ تخیل سے دُھنک کر پھیلا دیتا ہے حسنِ بیان سے اسے زرنگار کرتا ہے اور مقصد کی چرخی سے گذار کر اس کے لچھے کے لچھے تیار کر لیتا ہے

اسعد کی تفصیل پسندی الگ ایک موضوع ہے اس کے قلم کی نوک بہت باریک ہے وہ خد و خال اور سلوٹوں کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ اور اسی نوک قلم سے کچھ کے بھی لگا سکتا ہے۔ مدوراء کے قدیم معبد کی باریک صناعی کا خاکہ کھینچتے کھینچتے تاریک جابرانہ نظام میں "روشنی کے دھبے" بھی دکھا سکتا ہے۔ اپنے دوست "اسلم" کی روحانی موت کا سوگ بھی منا سکتا ہے اور وفادار کتے کو ایک اشتراکی سے "بہتر اشتراکی" ثابت کر سکتا ہے۔ وہ ہمیں یہ بھی یقین دلاتا ہے کہ اگر وہ محض ایک بچہ ہوتا تو وہی کچھ کرتا جو "پھوکی" نے سنگین مجسمہ کی نوکیلی مونچھوں کے ساتھ کیا۔ اس کا یہ جارحانہ پن دراصل اس کی تحریکی عزیمت اور مقصدی بے باکی کے سبب ہے وہ اگر چین میں ہوتا جب بھی محض نقاش نہ ہوتا ایک انقلابی دستے کی کمان بھی کرتا۔

اسعد کے نام کا املا اگر غلط (اسد) لکھا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ملٹن کے "فردوسِ گم شدہ" کے بارے میں کسی نے

کہا ہے کہ اس میں جو زور بیان جابجا ملتا ہے وہ اصل میں برطانوی پارلیمان کا پرتو ہے۔ اسعد کے متعلق کبھی یہی کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے تحریک اسلامی کے محاذ پر استدلال اور خطابت کے جس گھن گرج میں وہ خوداد عزیمت دے رہا ہے ممکن... نہیں کہ اس کا اثر اس کے اسلوب پر نہ ہو۔ "آدم کے تین بیٹوں" کی داستان میں جو گھن گرج ہے اس کا یہی راز ہے۔

اس کے اس پیش نظر فن پارے پر کوئی گفتگو کرنے سے پہلے اس کے پس منظر کو سمجھ لینا ضروری ہے مختصر الفاظ میں اس کا پس منظر ہیں مسائل مابعد جنگ۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد جو عالمی مسائل پیدا ہوئے ان سے متاثر ہونے والے اسلامی ادیبوں میں اسعد گیلانی پیش پیش آگے ہیں۔ اس کی تین طویل داستانیں "ایک عورت دو ملک، جہنم کے دروازوں پر" اور "آدم کے تین بیٹے" دراصل ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ عالمی شعور جسے ہمارے تنقید نگار شاید ذات سے تعبیر کریں گے۔ اسعد گیلانی کی ان تینوں داستانوں میں جاری و ساری ہے

اسعد کے ہاں اس عالمی شعور نے ہیگل کی "روح عصر" کی طرح ارتقا کیا ہے اور پہلی سے زیادہ دوسری اور دوسری سے زیادہ تیسری میں پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوا ہے۔ لہذا "آدم کے تین بیٹوں" تک پہنچنے سے پہلے "ایک عورت دو ملک" اور "جہنم کے دروازوں پر" کا جائزہ لے لیا جائے تو سارا پس منظر خود بخود سامنے آئے گا اور مزید کسی تفصیل کی ضرورت باقی نہ رہے گی

"ایک عورت دو ملک" ایک تمثیلی طویل مختصر افسانہ ہے اسے آپ ایشیا میں مغربی سامراج کے دم واپسیں کا روداد یہ کہہ سکتے ہیں مشرق بعید کے بعد جنوبی ایشیا (ہند و پاکستان) سے مغربی سرمایہ داری کے وداع حسرتناک کو "ایک عورت دو ملک" کی تمثیل میں پیش کرنا اور مقصد کے ساتھ ماجرائی کیفیت کو نبھالے جانا ایسے فنکار کے لئے بہت مشکل ہے جو یہ بھی چاہتا ہو کہ لوگ سنیں، متاثر ہوں اور پھر متحرک۔ جب اس نے دیکھا کہ سرزمین افیون کے باشیوں نے مغربی سرمایہ داری کے ناپاک وجود کو اپنے دیس سے نکال باہر کیا لیکن اس کے ملک میں ابھی اس ناپاک وجود کا رقص عریاں جاری ہے تو اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک انقلابی تحریک کا سپاہی ہے اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ تحریک اسلامی کا سیلاب اس ناپاک وجود کو ایک دن یہاں سے بھی خس و خاشاک کی طرح بہا دے گا۔

"جہنم کے دروازوں" کے ابواب بالخصوص "ہنگے سودے" میں آپ کو بھی "کیفیت پراں" نظر آئے گی۔ لیکن یہاں احساس قید زیادہ شدید ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہ کسی "حامد" کی خود نوشت داستان اسیری ہے۔ یہ اسیری سلاخوں کے پیچھے والی اسیری نہیں کشمکش مفاد کی پروردہ عالمی جنگ والے عسکری نظام کی جبری اسیری ہے یہ قید تنہائی نہیں۔ یہاں قدم بہ قدم شانہ بشانہ قطار در قطار" بہت سے اور بھی ہیں مگر "حامد" اپنے ساتھیوں میں تنہا ہے۔ اس کی "سوچ" میں کوئی شریک نہیں "جہنم کے دروازوں پر" ایک مسلسل مختصر افسانہ ہے جس میں "حامد" تو کئی ہیں لیکن ایک حامد منفرد ہے۔

"جہنم کے دروازوں پر" نظام باطل کی ہولناک مشینی جبریت کا خاکہ ہے۔ جس سے "حق کا سپاہی" گلو خلاصی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ دانتے نے اپنے جہنم کے طبقات میں جو تاریخی کردار دکھلائے ہیں ان کے مقامات خود دانتے کے ذہنی منصوبے کے مطابق ہیں اس کے برخلاف اسعد کے متصورہ جہنم کے جس دروازے سے داخل ہوں۔ ہر کردار لیڈر سے لیکر غفار صاحب تک ایک ہی "جرم ضعیفی" کی سزا بھگت رہے ہیں۔ مگر حامد اس جہنم سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے

کرشن چندر زندگی کے جس "موڑ" پر پہنچا تھا وہاں مخملیں سبزہ زار پر شبنم کی طراوت اور رہٹ کے رون رون کا نغمہ تھا۔ اور اسی میں وہ گم ہو گیا۔ مگر حامد کی پشت پر "جہنم کے دروازے" بند ہو رہے تھے اور "ایک بہت بڑا اور سب" ایک نئی دنیا اپنے نئے مسائل کے ساتھ" اس کے سامنے پھیل رہی تھی۔ اس سفرنامے کا آخری جملہ یہ ہے "زندگی کے نئے معرکے اس سپاہی کے منتظر تھے جس نے فرعونوں کی فوجوں میں کرائے کا سپاہی بننے سے انکار کر دیا تھا"

" آدم کے تینوں بیٹوں " کی داستان میں فنکاری کا عالمی شعور بہت واضح ہو گیا ہے۔ خود بقول افسانہ نگار اس افسانے میں بین الاقوامی حالات کے اندر اشتراکیت سرمایہ داری اور اسلام کا جو حال ہے اسے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے " آدم کی وراثت جو یہ زمین ہے اس کی تقسیم کے جھگڑے پر آدم کے دو بیٹے لڑ رہے ہیں تیسرا بے خبر ہے لیکن مستقبل سے مایوس نہیں " ایک خطے ماخوذ کسی علمی یا ادبی کارنامے کی انتہائی توصیف کے طور پر کہا کرتے ہیں کہ ع

این کتاب از آسمانے دیگر است

یہاں معاملہ یہ نہیں ہے " آدم کے تین بیٹے " اس قسم کی " آسمانی " کتابوں سے مختلف " شئے دگر " قسم کی چیز ہے۔ یہ آسمان سے زمین پر نازل ہونے کی بجائے زمین سے آسمان پر نازل ہوئی ہے خالص ارضی حقائق کو زور انشا کے پر وبال عنایت کئے گئے ہیں۔ اپنے مشاہدے کو اپنے فن تخئیل اور زور بیان سے اس نے دو آتشہ سہ آتشہ بنا دیا ہے۔ یہاں وہی گھن گرج ہے جو اسلامی انقلاب کی تحریک کے محاذ پر ہے۔ اسعد گیلانی کے عام تمثیلی نگارشات کی طرح اس میں بھی وہ مانوس قسم کا قصہ پن نہیں ہے جو افسانے کو زندگی سے قریب کرتا ہے۔ لیکن ایک جادو بیان خطیب کی سی روانی ہے جو دوران خون سے ہم آہنگ ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں جہاں قصہ پن ہے، " جہنم کے دروازوں " والے قصہ پن سے کم بھی نہیں لیکن " جہنم کے دروازوں " میں جا بجا ہم جس مقالہ پن سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ خال خال ہی ہے۔ زیادہ تر خطابت والی روانی میں ہم اپنے آپ کو بہتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔

" اشتراکیل آیا اور اپنے ساتھ محنت کشوں، مزدوروں، کسانوں، ادیبوں اور دانش وروں کے لشکر لایا جو پہلے سے اس کی حریت فکر و عمل اور مساوات کے آہنی جال میں اس بیسویں صدی کے روز روشن میں دھات کے زمانے کی سی بربریت کے مزے لوٹ رہے تھے۔ وہ آیا اور اپنے ساتھ ادسکا کو بھی لایا ......" اور پھر ادسکا، اس کے والدین اور خاندان کے دردناک عذاب کا قصہ ہے۔ ادسکا اور اس کا باپ، پروفیسر اور اس کی بیوی سرجی اور بچہ مزدور بڑھیا جس نے انقلاب کے بعد والے قحط میں اپنے پوتے کی لاش کو اپنی بیٹی کے ساتھ بانٹ کر کھا لیا تھا ——— یہ سارے کردار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پھر " روح کائنات " کا خطاب ہے۔ اس کے بعد مغربی سرمایہ داری کا دیوِ استبداد *Marshall* کی سنہری جال لئے آگے بڑھتا ہے۔ سرمائیل اپنے کرایہ کی سپاہ کو اشترکیل کے پالتو پہلوانوں کے سامنے صف آرا کر دیتا ہے " امن " کے نعروں سے فضا گونج جاتی ہے اور طبل جنگ بجنے لگتا ہے، روح کائنات پھر خطاب کرتی ہے۔

آدم کا تیسرا بیٹا اسلامیل، سویا ہوا ہے " پکارنے والے نے چیخ چیخ کر آدم کے بیٹے اسلامیل کو جگانے کی کوشش کی لیکن وہ بیدار نہ ہوا اور اس کا عصائے بے قوت اور اس کا فرمان بے شوکت زمانہ کے ہاتھ میں محض ایک تجویز کی صورت میں پڑا رہا " اور پھر جب صدیاں انسانیت کو تڑپتے تڑپتے اور خون آلود لباس میں ماتم کرتے دیکھتے دیکھتے تھک گئیں تو ایک جگہ سے کچھ لوگ .... اٹھے۔ اسلامیل کے کچھ پروانے اٹھے۔ زندگی کے شکارے اور موت کے کچھ دیوانے اٹھے اور سمٹ سمٹ کر انھوں نے لوہا سمیٹنا شروع کر دیا۔ اسلامیل کے عصائے اقتدار کو " حدید " کی ضرورت ہے ——— ایک پکار اٹھی .... پتے چبا چبا کر اور کوڑے کھا کھا کر انھوں نے لوہا جمع کرنے کی کوشش کی ——— اور روح کائنات کا چہرہ مسرت سے شگفتہ ہوا جا رہا ہے ......"

مقصدی فنکار کا ایک حد تک تصوری *Idealist* ہونا ناگزیر ہے اور یہ چیز بسا اوقات قصہ پن کو ختم بھی کر دیتی ہے جب کسی انتہائی وسیع تصور کو جو آفاقی ہونے کی حد تک وسیع ہو تمثیل کا لباس پہنا کر اسے اجرائی شکل دی جائے تو فنکار کو بیک وقت دو امتحانوں میں کامیاب ہونا پڑتا ہے۔ ایک غیر مقصدی فنکار اپنے افسانوں کے لئے کوئی پسندیدہ اجزا معاشرے سے جوں کا توں لیکر *Phenomena* کر لیتا ہے۔ مقصدی فنکار یہ کر تو سکتا ہے اور کرتا بھی ہے لیکن مانوس کرداروں کے انتخاب

اور اپنے مقصد کے غیر مختتم شعور سے اس کے اندر جو ایک تناؤ (Tension) سا برپا رہتا ہے۔ وہ صرف اسی کا حصہ ہے۔ اسعد جیسے تصوری فن کار کی بھی یہی دشواری ہے اور میرا خیال ہے۔ بیشتر اسلامی فنکار اسی دشواری سے دوچار ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مروجہ تکنیک اور فارم ان کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ اور وہ ابھی "کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیاں کے لئے" کے سراپا مصداق بنے ہوئے ہیں

ابتدائی دور کے مقصدی ادیبوں میں ڈپٹی نذیر احمد اور صاحب "نیرنگ خیال" نے تمثیلات (Allegories) کو زیادہ سے زیادہ زندگی سے قریب کرنے کی کوشش کی لیکن یہ سلسلہ مقصدی فنکاروں کے قحط کے سبب زیادہ آگے نہ بڑھ سکا اسلامی ادب کی جدید تحریک کے ہاتھوں پھر اس کا احیاء ہو رہا ہے اس ہیئت کی کامیابی اور مقبولیت کا راز اسی میں ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ زندگی سے قریب کیا جائے۔ زندہ کرداروں، مکالموں اور ماجرائی واقعیت سے تمثیل کو حقیقت بنایا جا سکتا ہے اور تصور کو واقعہ۔ اس میں زمان و مکان کی قید مانع نہیں آسکتی۔

ادب الرحمن بیان ہے تو "آدم کے بیٹوں" کی تمثیل بہرحال اپنی ادبی قدر رکھتی ہے لیکن اس کا اندازہ اسی وقت ہوگا جب اسے پڑھتے ہوئے اس کے گھن گرج کی صدائے بازگشت آپ کو اپنے اندر سے آتی ہوئی محسوس ہوگی ———

(Literary criticism) کے مصنف (De-Quincy) نے ادب کو بلحاظ افادیت دو انواع میں تقسیم کیا ہے "ادب بالعلم —— (Literature of Knowledge) اور ادب بالقوت —— (Literature of Power) زور بیان اور جادوئے خطابت کے پیش نظر آدم کے بیٹوں کی اس داستان کو آخرالذکر خانے میں رکھا جا سکتا ہے اس کی دلیل ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ آپ اس سے متاثر اور متحرک ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔ بشرطیکہ پوری نیک نیتی سے اپنے آپ کو اس کے آگے ایک عام سامع کی طرح ڈال دیں۔ پھر آپ پگھلے ہوئے اس

لوہے کو اپنی رگوں میں دوڑتا ہوا محسوس کریں گے جس کی "اسلامیل" کو ضرورت ہے۔ (بشکریہ تعمیر انسانیت)

گذارش ہے کہ:۔ اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا مکمل پتہ لکھنا نہ بھولئے بغیر پتے کے کوئی نگارش قابل قبول نہ ہوگی ادارہ "مشیر" ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کا ذمہ دار نہیں ہے اس لئے مضامین وغیرہ بھیجنے سے پہلے ان کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں (منیجر)

سہیل احمد زیدی ●

کنوار کی ایک دوپہر

اونگھتے پودے، دمکتا آفتاب — ٹوٹتے اعضا میں اک کیفِ شراب
ابنِ آدم سے ہَوا بیزار سی — ہر کرن چلتی ہوئی تلوار سی
ایک تیتلی باغ میں اڑتی ہوئی — کارنس میں فاختہ دبکی ہوئی
آسماں میں ابر کے پیوند ہیں — راستے آہِ رسا کے بند ہیں
گرم کپڑے دھوپ میں پھیلے ہوئے — شوخ بچے کھیلتے، ہنستے ہوئے
اور اس ماحول سے بیزار ہم — ڈوبتے دل میں نہ جانے کس کا غم
کوئی صورت سامنے آتی نہیں — یاد بھی تاریخ دُہراتی نہیں
چند ٹکڑے ایک ہی زنجیر کے — مختلف پہلو کسی تصویر کے
بادِ صرصر اور اک رنگین باغ — آندھیوں کی زد میں اک ننھا چراغ
کلمۂ حق سازشِ اغیار پر — چند دیوانے فرازِ دار پر
اک بلا خانہ کسی فرعون کا — یوسفِ کنعاں کی دیرینہ خطا
ایک ننگی پیٹھ پر کوڑوں کے داغ — جانے کیوں جلنے لگا میرا دماغ
نیند نے کرسی پہ سر ڈھلکا دیا — مرغ کی ایک چیخ نے چونکا دیا
سوچتا ہوں کس کو کیا الزام دوں — غیر کو کیا طعنہ و دشنام دوں
یہ غمِ گم نام کچھ دکھلا نہ جائے — موجِ گنگا نیل سے ٹکرا نہ جائے

کوہ، ابر و باد میں تحلیل ہو
آسماں تھرّا کے ہم پر آ نہ جائے

(بشکریہ "نئی نسلیں")

محمد حمید اللہ صدیقی

ایک جوڑا کپڑا!

وہ زیر لب بڑبڑا رہا تھا اور اس کا موڈ بہت ہی خراب تھا۔ ایک پریشانی ہو تو آدمی خوش بھی رہ لے مگر اتنی بہت سی پریشانیاں اور وہ بھی اکٹھی۔ بیس سے اوپر روزے گزر چکے تھے جس کی وجہ سے حال یونہی پتلا ہو رہا تھا۔ اور پھر کراچی کی گرمی جو یا تو پڑتی نہیں ہے یا جب پڑتی ہے تو دم گھٹا دیتی ہے، ہوا بند، دھوپ تیز، زمین سے جیسے بھاپ نکل رہی ہو حبس اور اس کا یہ حال کہ سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ بنیان اور کرتہ دونوں پیٹھ سے چپک کر چپ چپ کر رہے تھے، اور پسینہ ارے توبہ، جیسے گندھک کا تیزاب۔ کل ہفتے کا دن تھا۔ روزہ، افطار، نماز، کھانا، تراویح۔ اس نے سوچا تھا کہ اس کے بعد گھوڑے بیچ کر سوئیں گے اور تمام ہفتہ کی نیند کی کسر پوری کرلیں گے۔ مگر گرمی کو بھی جیسے کل ہی شروع ہونا تھا۔ شام سے دم گھٹنے لگا تھا۔ اللہ اللہ کرکے رات کے گیارہ بجے تھے۔ سونے کا وقت آیا تھا مگر نیند سے غائب۔ ایک تو بیس بائیس روزوں کی خشکی اور پھر یہ گرمی اور اوسان سب سے بڑھ کر کالونی کے دکاندار جنہوں نے کرائے کی خاطر یہ بھی نہ سوچا تھا کہ کرایہ داروں کو ہوا بھی درکار ہوگی۔ سامنے کے چھ فٹ چوڑے برآمدے کو گھیر گھار کر دونوں طرف دو دو کوٹھڑیاں بنا دی تھیں اور انہیں کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔ اب اندر والے کمرے میں ہوا آئے تو کہاں سے آئے۔ سامنے دونوں کوٹھڑیاں اور پیچھے چونکہ مالک مکان کی "فیملی" رہتی تھی اس لئے دروازے کھڑکیاں سب بند رہتیں کہ کہیں ان کی "فیملی" کی بے پردگی نہ ہو جائے۔ دن بھر کا تھکا ماندہ گیارہ بجے رات کو بستر پر لیٹا تو معلوم ہوا کہ ہاتھ نیم برشت کرنے کے لئے توے پر ڈالا گیا ہے۔ لیکن اسے سونا تو تھا ہی۔ لائٹ بجھائی تھی کہ بھن بھن کرتے ہوئے مچھر ہر لحظہ اس کے کانوں میں اذان دینے لگے مچھر دانی اس کے پاس کبھی ہوئی نہیں۔ مجبور ہو کر چادر تانی تو سانس رکنے لگا۔ خدا خدا کرکے جانے دو یا تین گھنٹوں تک کروٹیں بدلنے اور سر ٹپکنے کے بعد کچھ کچی پکی نیند چلی تھی کہ سحری جگانے والے تنگ کرنے لگے، اور اس کی ابتدا ملنگ شاہ نے اس کے مکان کے چبوترے پر بڑے زور سے ڈنڈا بجا کر "اٹھ غافل کیوں سوتا ہے" کا نعرہ لگاتے ہوئے کی تھی، ڈنڈے کا ٹھن سے بجنا تھا کہ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ کچی نیند میں معمولی سی آواز بھی بہت معلوم ہوتی ہو، ہاتھ سینے پر پڑ جائے تو ایسا لگتا ہے کہ من دو من کا بوجھ پڑا ہوا ہے، ملنگ شاہ کے ڈنڈے کا ٹھنا کا جو ہوا تو سب سے پہلے اس نے سمجھا کہ شاید کمرے کی چھت نیچے آ پڑی ہے۔ کمرے کی چھت بڑی مخدوش تھی۔ اس سے وہ ہمیشہ خائف رہتا تھا۔ ایک عرصہ سے وقت بے وقت اس کا پلستر ٹوٹ کر نیچے گر رہا تھا۔ اور اب تو اس کی کڑیاں وغیرہ بھی نیچے جھک چکی تھیں اور وہ ہر رات سوتے وقت سوچتا کہ اگر کبھی رات میں چھت گر پڑی تو پس قبر تک کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ ہاں تو ملنگ شاہ کا ڈنڈا ٹھنکا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ خدا خیر کرے۔ اس کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا اور اسے ملنگ شاہ پر غصہ بھی آرہا تھا اور ہنسی بھی۔ غصہ اس بات پر کہ ایک تو ابھی رات کے محض دو بجے تھے۔ بھلا ابھی سے سحری کے لئے جگانے کی کیا تک تھی، اور پھر آج ہی کی رات اس کے دہلیز کے مقدر میں اس کا ڈنڈا تھا۔ بڑی مشکل سے تو اسے نیند آئی تھی، اور ہنسی اپنے دل کی کمزوری پر آرہی تھی، جو ابھی تک دھڑ دھڑ کئے جا رہا تھا۔ اب جو نیند اچٹی تو پھر صبح تک سونا محال۔ تھوڑی ہی دیر میں اور سحری کے جگانے والے بانسری، نفری، ڈھول اور پاٹ دار آواز سے یکے بعد دیگرے "مدینے والے بلالے ......" وغیرہ گاتے گزرنے لگے تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا، کسی طرح اس نے سحری کھائی اور سگرٹ پی پی کر چار بجائے۔ پھر نماز کا وقت آگیا۔ اور اس نے طے کیا کہ نماز پڑھ کر اطمینان سے جب تک نیند آئے گی سوئے گا۔ آج آخر اتوار ہے۔ آفس بھی نہ جانا تھا، اور کالج وہ تو جب چاہے گول کیا جا سکتا ہے مگر پانچ بجے نماز پڑھ کر وہ ایک گھنٹہ بھی نہ سویا ہوگا کہ سخاوت حسین آگئے

ادھر انھوں نے پہلے تو بڑی دیر تک سائیکل کی گھنٹی بجائی، اور جب اس سے کام نہ چلا تو دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ دروازہ پیٹنے پر اس کی آنکھ پوری طرح کھلی تھی تو پہلے تو اسے بہت تاؤ آیا مگر پھر سخاوت حسین کی آواز سن کر اسے یاد آیا کہ اس نے خود ہی سخاوت حسین کو صبح چھ بجے بلایا تھا اور زندگی میں پہلی بار اسے اپنی اس حماقت پر بڑا افسوس ہوا۔ آخر بال ہی تو کٹوانے تھے۔ لیکن وہ تو پھر بن سکتے تھے۔ اتوار کو صبح چھ بجے بال بنوانا کیا ضروری تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے تو اس نے سوچا کہ اس دفعہ گول کر جائے اور سخاوت حسین کو ٹال دے، نیند بھی ذرا مزیدار آ رہی تھی لیکن پھر اس نے خیال کیا کہ اس سے خواہ مخواہ معمول میں فرق آ جائے گا، اور پھر پتہ نہیں سخاوت حسین کا آئندہ پروگرام کیا ہو۔ ویسے بھی وہ اسکی گلی میں صرف مہینے کے پہلے اتوار کو آیا کرتا تھا۔ کتنی بار لوگوں نے کہا تھا کہ کبھی ایک اتوار ناغہ دے کر آ جایا کرو مگر وہ نہ مانا تھا، اور اب تو کچھ دنوں بعد عید ہے۔ کیا خبر اگر اس دفعہ وہ ٹال دے تو یہ پھر یہ عید کے بعد ہی آ کر خبر لے۔ اور آئے گا بھی تو ہفتہ بھر بعد ہی آئے گا۔ پتہ نہیں آئندہ اتوار کو بھی یہی پوزیشن رہے۔ اور ایک بات اور بھی تو ہے۔ عید سے ایک دن پہلے بال بنوائے جائیں تو عید پر بُرے لگتے ہیں۔ آٹھ دن پہلے ہی بنوا لینے میں ایک فائدہ یہ بھی تو تھا کہ اس کی دبلی پتلی گردن اور کنپٹی کی ہڈیوں پر بال بڑھ کر گھنے ہو جاتے تھے جس سے چہرہ ذرا اچھا لگتا تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اب سخاوت حسین سے بھی نپٹ ہی لے۔ کوئی بندرہ بیس منٹ کی بات ہوگی پھر فرصت ہو جائے گی، اور وہ بادلِ ناخواستہ آئینہ ہاتھ میں لے کر کرسی پر بیٹھ گیا اور سر جھکا کر اونگھنے لگا۔ سخاوت حسین کی قینچی برابر چل رہی تھی۔ چھت چھت، اور بالوں کے بڑے بڑے گچھے کٹ کٹ کر اس کے سامنے گرنے لگے۔ بال بنواتے ہی اس نے جیب سے اٹھنی نکالی اور سخاوت حسین کی طرف بڑھا دی، وہ چاہتا تھا کہ اب کمرہ بند کرے اور سو رہے مگر وہ جو مثل ہے کہ مصیبت جب آتی ہے تو اکیلی نہیں آتی اور بری بات ہونے والی ہو تو شگون پہلے ہی خراب ہونے لگتا ہے۔ اب لو یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ وہی سخاوت حسین جو باہر اٹھنی لے کر ہنس دیتا تھا اور سلام کر کے گھنٹی بجاتا ہوا نکل جاتا تھا آج اٹھنی نہیں لے رہا تھا۔ اس نے بھی جیسے ساری ہمت قدرت آج ہی کے لئے اٹھا رکھی تھی۔ اٹھنی دیکھتے ہی بولا۔

"صاب! آج تو ہم اٹھنی نہیں لیں گے۔"

اب اتنی تو گرمی۔ اتنے بہت سے روزے اور پھر تمام رات کی اچٹی ہوئی نیند اور اس پر یہ سخاوت حسین تھے جو اٹھنی نہیں لے رہے تھے۔ اسے بڑی جھنجھلاہٹ ہوئی لیکن پھر بھی اس نے ذرا ضبط سے کام لیتے ہوئے پوچھا ——— "کیوں؟"

"صاب! عید آ رہی ہے۔ پورے سال بھر صاب کے بال بنائے ہیں۔ اس دفعہ تو صاب ایک روپیہ اور ایک جوڑا کپڑا لوں گا۔"

"اماں لو بھی اور جاؤ جلدی۔ بے کار تنگ نہ کرو۔" وہ ذرا اور جھنجلا کر بولا۔

"صاب تنگ تو نہیں کرتے۔ اپنا حق مانگتے ہیں۔" اس نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا۔

بس پھر کیا تھا، وہ گرم ہو گیا۔ "حق وق کچھ نہیں۔ تم نے بال بنائے۔ یہ اس کی اجرت ہے۔" وہ بپھر گیا۔

"صاب! ہم تو یہ نہیں لیں گے، آپ کی مرضی ہو تو کچھ بھی نہ دیجئے۔" سخاوت حسین پھر اسی طرح ہنستے ہوئے بولا

اور بس بات اس کے اختیار سے باہر ہو گئی اور اس نے اٹھنی بڑے زور سے سخاوت حسین کی طرف پھینک دی اور معلوم نہیں کیا کیا کہہ گیا۔ سخاوت حسین چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر جب دھیرے دھیرے اس کے ہنستے ہوئے چہرے پر ہلکا سا سایہ پھیل گیا تو وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ اس دفعہ جاتے وقت وہ ہنسا بھی نہ تھا۔ اس نے سلام بھی نہ کیا تھا اور سائیکل کی گھنٹی بھی نہ بجائی۔ اس کے جانے کے بعد وہ بڑی دیر تک اسی طرح کھڑا رہا اور پھر دھم سے کرسی پر بیٹھ گیا اور اٹھنی اس کے سامنے کچھ دور پڑی چمک رہی تھی اور اڑوس پڑوس میں سب لوگ سو رہے تھے۔

اب بھلا اتنی بہت سی باتیں جب ایک ساتھ ہو جائیں تو آدمی کا موڈ کیوں نہ خراب ہو۔ اس وقت اس کا موڈ خراب تھا اور وہ زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔

سخاوت حسین کے جاتے ہی پہلے تو اس کا غصہ بہت بڑھا

اور وہ سوچنے لگا کہ بڑا آیا سماحق جتانے والا۔ کپڑے کا جوڑا لے گا۔ ہونہہ۔ بال نہیں بنانا جیسے کوئی احسان کرتا ہو۔ گھر کے نائیوں کی بات اور تھی۔ جو ہر ہفتے آکر پوچھ جاتے تھے۔ ناخن بغل بنا جاتے تھے۔ اور کبھی دھیلے دمڑی کا بھی مطالبہ نہ کرتے تھے۔ پھر انہیں تو تہوار، شادی بیاہ میں جوڑا دیا جاتا تھا۔ یہ لاٹ صاحب جو مہینے مہینے سائیکل کی گھنٹی بجاتے آتے ہیں اور پھر کبھی شکل تک نہیں دکھاتے...... انھیں بھلا وہ کپڑے کا جوڑا کیوں دے، اور خیر..... جوڑا دینا کوئی ایسی بڑی بات نہ ہوتی اگر وہ گھر کا کوئی رئیس ہوتا۔ اب یہاں کونسی ریاست دھری تھی۔ جو زمین زمینداری تھی وہ ہندوستان میں رہ گئی تھی، اپنا کھانا پینا کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ رہنے کو بڑی مشکل سے یہ کمرہ ملا تھا جس کا اتنا بہت سا کرایہ تھا۔ اتنے پیسوں میں تو اس کے وطن میں بڑے بڑے مکان مل جاتے تھے۔ اور پھر پیسے دینے پر بھی تو آرام نہیں ملتا۔ دوپہر بعد کمرے میں دھوپ ہی دھوپ۔ پانی برسے تو معلوم ہوتا تھا کہ چھلنی ٹپک رہی ہے۔ وہ تو شیر کراچی ہے جہاں بھولے سے کبھی ایک آدھ بارش ہو جاتی ہے۔ چھت الگ گری جا رہی ہے۔ فرش کا پلستر ہے کہ جگہ جگہ دانت دکھاتا ہے۔ جھاڑو دو تو گرد ہی گرد نکلتی ہے۔ ہوا اس میں نہیں آتی۔ اور مہینہ بھر نوکری کرنے کے بعد جو دو سو روپے اسے ملتے ہیں وہ دباتے دباتے بھی نہ جانے کدھر کھسک جاتے ہیں۔ پیسوں میں جیسے پر لگے ہوں پر۔ دس کا نوٹ ادھر بھنا دو اور اُدھر صاف۔ پچیس چھبیس تاریخ کو لبوں کا کرایہ تک مشکل ہو جاتا ہے۔ اب کی عید ہی میں دیکھ لو۔ کتنے مہینوں سے اس نے سوچ رکھا تھا کہ کم از کم اس دفعہ ضرور شیروانی، قمیص، پاجامہ، جوتا سب نیا بنوائے گا۔ تین سال سے اوپر گھر سے آئے ہو گئے تھے، چھ عیدیں گذر چکی تھیں اور اس نے نئے کپڑوں کی ایک دھجی بھی تو نہ بنوائی تھی وہ تو بھلا ہو آبا جان کا جنھوں نے چلتے چلاتے نہ جانے کہاں سے جوڑ جاڑ کر بہت سے کپڑے بنوا کر ٹرنک میں بھر دئے تھے جو کام چلتا رہا۔ ورنہ کب کا بھرکس نکل گیا ہوتا۔ لیکن اتنے ارادوں کے باوجود تنخواہ پچھلے مہینے کے ادھار چکاتے چکاتے نکل گئی۔ اب بڑی مشکلوں سے اس نے ایک قمیص اور ایک پائجامہ بنوایا تھا۔ پرانی شیروانی ابھی لانڈری میں پڑی تھی اور جوتے کے متعلق اس نے سوچ لیا کہ صدر میں پالش کرا کے کام چلالے گا۔ اب بھلا کوئی بتائے کہ جب اتنا پڑھ لکھ کر اور مہینہ بھر اتنی محنت مصیبت اٹھا کر وہ عید کے عید بھی اپنی ذات کے لئے ایک جوڑا نہیں بنوا سکتا تو سخاوت حسین کو کہاں سے دے۔ ہونہہ بڑا آیا حجام کی دم۔ جوڑا لے گا۔

پھر اس نے سوچا کہ اٹھ کر سو رہے لیکن کرسی سے اٹھتے ہی اس کی نظر سامنے پڑی ہوئی اٹھنی پر گئی جو اسی طرح دروازے کے قریب پڑی جیسے اس کا منہ چڑا رہی ہے، وہ پھر وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ "چھوڑ کر چلا گیا، اپنی اُجرت، اپنی محنت کی کمائی" اس نے سوچا کہ وہ بھی کسی مہینے اپنی تنخواہ چھوڑ سکتا ہے۔ باپ رے باپ۔ اس تصور ہی سے اس کی روح فنا ہونے لگی۔ ایک مہینہ تنخواہ نہ ملے تو خیر کھانا پینا تو بڑی چیز ہے۔ سب سے پہلے یہ مالک مکان، اخبار والا، دودھ والا، بھنگی، دھوبی، یہ سب اس کا نکلنا دو بھر کر دیں، اور اسے بڑی حیرت ہوئی کہ سخاوت حسین جو ایک غریب آدمی ہے کس طرح اپنی اٹھنی چھوڑ کر چلا گیا۔ سخاوت حسین جو ایک مزدور تھا۔ پھر اس کا خیال اپنے ساتھیوں کی طرف گیا۔ وہ اس کے ہزاروں ساتھی جو سو روپے سے لے کر پانچ پانچسو روپے تنخواہیں پاتے ہیں۔ جن کی بدولت حکومت کا اتنا بڑا کارخانہ چل رہا ہے۔ کتنے عرصہ سے کراچی کی گرانی سے پریشان ہیں۔ گزشتہ پانچ چھ سال میں گرانی بڑھ کر کئی گنا ہو گئی مگر ان سبھوں کی تنخواہ ابھی رہی ہے جو پانچ سال پہلے تھی۔ کتنی مرتبہ انھوں نے سرکار سے تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کیا اور سرکار نے ہمیشہ سُنی ان سُنی کر دی۔ پھر بھی ان میں سے کسی کی بھی ہمت تو نہ ہوئی کہ ایک ماہ تنخواہ چھوڑ کر بیٹھ جاتا۔ حالانکہ ان سبھوں کا مطالبہ واقعی حق تھا۔ جبکہ سخاوت حسین کا مطالبہ محض ایک عادت تھی۔ پھر بھی سخاوت حسین اٹھنی پھینک کر چلا گیا۔ اسے سخاوت حسین کے کیرکٹر پر حیرت ہو رہی تھی۔ کیا سخاوت حسین اس سے اور اس کے ہزارہا کلرک ساتھیوں سے اس لحاظ سے بہتر ہے۔ پھر اسے افسوس بھی ہوا کہ سخاوت حسین عید کے قریب اپنی اٹھنی چھوڑ کر کیوں چلا گیا یہ اٹھنی تو اسے بہرحال ملنی ہی چاہئے، اور کہیں وہ لوٹ کر نہ آیا تو کیا ہوگا۔ عید کے دن کتنے اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ ممکن ہے اس کے بچے اس سے عیدی مانگیں۔ ہو سکتا تھا کہ یہی اٹھنی دو دو آنے کے حساب

سے اس کے بچوں میں عیدی بن کر بٹ جاتی۔ اور اگر ان بچوں کو عیدی نہ مل سکی تو کون اس کا ذمہ دار ہوگا۔ چار ننھے ننھے معصوم بچوں کی تمناؤں کے کچلے جانے کے تصور سے اس کا غصہ کم ہو رہا تھا اور افسوس بڑھ رہا تھا سخاوت حسین کتنا مجبور آدمی ہے بیچارہ۔۔۔۔ .... اسے سیلون میں بال بنوانے سے کس قدر چڑ تھی۔ اپنے وطن میں اس نے ایسا کبھی نہ کیا تھا۔ بلکہ وہاں تو شرفاء میں یہ بات بڑی معیوب سمجھی جاتی تھی اور یہاں اگر شروع شروع میں اسے کتنی کوفت ہوتی تھی۔ دوکان میں جانا پھر اس انتظار میں بیٹھے رہنا کہ نمبر آئے اور پھر دوبارہ ایک نئے حجام سے بال بنوانا۔ پھر گھر آنا۔ نہانا۔ اور پھر کالونی آ کر اس نے سخاوت حسین کو دیکھا تھا۔ کھلتی ہوئی گندمی رنگت۔ سر پر مخمل کی چوڑی دیوار کی ٹوپی جو سالہا سال کے استعمال سے بوسیدہ ہو گئی تھی اور کناروں پر تیل کی دبیز کثافت جم گئی تھی۔ گرد کی وجہ سے پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ ٹوپی جب لی گئی تھی تو اس کا رنگ سرخ تھا یا سیاہ کیونکہ اب یہ بالکل بھوری ہو گئی تھی بدن پر ایک قمیص ایک پتلی دھری کا پاجامہ۔ پیر میں چپل۔ ایک بہت پرانی سائیکل جس میں ایک معمولی سا بیگ لٹک رہا تھا۔ وہ مہینے کے پہلے اتوار کو اس کی گلی میں آیا تھا اور دہلیز پر پیر ٹکا کر ٹن ٹن سائیکل کی گھنٹی بجائی پہلے تو اس نے سمجھا کہ اس کا کوئی ملنے والا آیا ہے۔ مگر جب باہر نکلا تو سخاوت حسین نے سائیکل کی گدی پر بیٹھے بیٹھے اسے ہنس کر سلام کیا تھا۔

"صاب بال بنیں گے؟"

"ہاں" اور وہ فوراً کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ سیلون۔ انتظار۔ ذہنی کوفت۔ سخاوت حسین جیسے ان سب مشکلات کا حل بن کر آیا تھا اس نے کہا: "مگر کیا قاعدے کے بال بنا سکو گے؟ خراب تو نہیں کرو گے؟"

اور اس نے کتنی خود اعتمادی سے جواب دیا تھا "صاب پیسہ نہیں ہے جو دکان کر لوں اس لئے صاب لوگوں کے گھر گھر آتا ہوں ورنہ صاب لوگ خود آتے۔ اور صاب اگر بال خراب ہو جائیں یا آپ کو پسند نہ آئیں تو ایک پیسہ نہ دیجئے گا۔"

بات کی ترشی کے باوجود اسے یہ خود اعتمادی پسند آئی تھی اور اس نے اپنا سر سخاوت حسین کی قینچی کے لئے پیش کر دیا تھا۔ اس دن اس نے سخاوت حسین سے بال بنوائے تھے۔ اس کے ساز و سامان ہی سے اس کے مزاج کی نفاست ظاہر ہو رہی تھی۔ ہر چیز صاف اور ستھری تھی اور پھر سخاوت حسین کی قینچی اس کے بالوں پر بجلی سے چلنے لگی اور بالوں کے بڑے بڑے گچھے سامنے کپڑے پر گر رہے تھے۔

بال بنانا تو خیر سخاوت حسین کا پیشہ ہی تھا۔ آدمی کو اگر اپنے فن پر عبور ہو تو یہ بڑی بات نہیں لیکن جس چیز نے اسے سخاوت حسین کا گرویدہ بنا دیا وہ اس کی گفتگو تھی۔ وہ پہلا دن تھا۔ اس سے قبل اس نے سخاوت حسین کی شکل تک نہ دیکھی تھی لیکن اس نے قینچی ہاتھ میں لیتے ہی باتیں چھیڑ دیں۔ گاہکوں کی باتیں۔ ان کے مزاج، عادات و اخلاق، وہ گاہک جو پیسے ادھار لگا دیتے تھے۔ ان کا رہن سہن، غرض باتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا جسے وہ سن کر ہوں ہاں کئے جا رہا تھا۔ اور جب اس کی قینچی رکی تو اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے سخاوت حسین نے پانچ ہی منٹ میں بال تراش دیئے ہوں، اور اس نے کہا۔

"میاں تم نے بہت جلد کام ختم کر دیا۔"

"نہیں صاب۔ پورے بیس منٹ ہو گئے۔ اور کٹنگ دیکھو صاب کتنی فسٹ کلاس ہو۔ کٹنگ پر کوئی حرف رکھ دے تو ایک پیسہ بھی حرام ہے۔"

اور واقعی جب اس نے آئینے میں کٹنگ کو ہر رخ سے دیکھا تو اسے پورا اطمینان ہوا کہ بیشتر سیلون میں بنانے والوں سے اچھی ہے اور پھر پیسے بھی کم۔ اس نے طے کر لیا کہ آئندہ سخاوت حسین ہی سے بال بنوایا کرے گا۔ مگر اس کے ساتھ بڑا مشکل مسئلہ وقت کا تھا۔ دفتر۔ کالج۔ اور دوسرے دین دنیا کے کام۔ وہ گھر پر تو رہتا ہی نہ تھا۔ آخر بہت سوچ کر اس نے کہا:-

"میاں۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ دن میں میں گھر پر نہیں رہتا۔ تم اگر ہر مہینے کے پہلے اتوار کو صبح چھ بجے آ جایا کرو تو بال تم سے بنوا سکوں گا۔"

اور اس نے بلا کسی تکلف کے کہا تھا "صاب فکر نہ کرو۔ چار بجے بلاؤ گے تو چار بجے آ جاؤں گا۔ اپن تو یہ چاہتے ہیں کہ گاہک خوش رہے۔"

اور اس دن سے سخاوت حسین کی سائیکل کی گھنٹی ہر مہینے کے

پہلے اتوار کو صبح چھ بجے ٹن ٹن بجنے لگتی۔ جاڑہ، گرمی، برسات کوئی موسم ہو وہ وقت پر آجاتا۔ اور جاڑوں میں تو اکثر اسے لحاف سے نکل کر فوراً کٹنگ کرانی پڑتی۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ آٹھ آنے میں سخاوت حسین کی میٹھی میٹھی مزیدار باتیں تھیں۔ ایک دن اس نے محض مذاق میں سخاوت حسین سے پوچھا۔

"میاں تم نے کبھی عورتوں کے بال بھی بنائے ہیں۔ یہاں تو بہت سی عورتیں بھی بال بنواتی ہیں۔"

تو سخاوت حسین پہلے تو جھینپ گیا۔ کیونکہ اس موضوع پر گفتگو کا اس سے پہلا اتفاق تھا۔ مگر پھر جب اس نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تھا تو اس نے رک رک کر کہا۔ "میاں صاحب بہت۔ آپ کی اسی کالونی میں کتنے گھر ہیں جہاں میں جاتا ہوں۔ اب تو یہاں بھی بہت سی لڑکیاں دفتر میں کام کرنے لگی ہیں اور کرسٹانوں کی طرح جب دیکھو گٹ پٹ گٹ پٹ کرتی ہیں۔ جیسے سالی انگریز ہوں۔"

"تو میاں عورتوں کے بال بنانے میں تو بڑے مزے آتے ہونگے"

"نہیں صاحب۔ توبہ توبہ۔ یہ پیٹ کا معاملہ ہے۔ آپ تو صاحب جانتے ہیں کہ جو پیسے دیتا ہے وہ ہزار دماغ دکھاتا ہے۔ پتہ نہیں کب کس بات پر بگڑ جائے تو پیٹ پر آبنے۔ اپنا کام تو صاب بال بنانا ہے۔ اور پھر صاب اپنی ایک عورت اور چار بچے ہیں وہی بہت ہیں"

وہ چپ ہو گیا۔ "جو پیسے دیتا ہے وہ دماغ دکھاتا ہے۔" یہ بات اسے اس وقت بھی کھٹکی تھی اور آج بھی اسے بار بار یاد آرہی تھی۔ کیا اس نے بھی دماغ دکھایا ہے محض اس لئے کہ وہ بھی سخاوت حسین کو پیسے دیتا ہے۔ وہ بڑی دیر تک اس پر سوچتا رہا۔ آخر وہ جو پیسے دیتا ہے وہ کوئی مفت نہیں دیتا۔ کٹنگ کراتا ہے جب دیتا ہے پھر اسے دماغ دکھلانے کا کیا حق۔ اور اس کے ذہن میں بندہ و آقا کی ساری شکلیں ایک ایک کرکے ابھرنے لگیں۔ مل کا مالک اور مزدور۔ زمیندار اور کسان۔ آفیسر اور ماتحت۔ ان میں سے سبھی تو ایک دوسرے کو دماغ دکھلاتے ہیں حالانکہ کوئی بھی پیسے مفت نہیں دیتا۔

یہ نیا موضوع ہاتھ آجانے کے بعد سخاوت حسین نے دوسری بار پھر اسی پر گفتگو کی۔ اس سے قبل رات سخت آندھی آئی تھی۔ دوسرے دن سخاوت حسین نے قینچی ہاتھ میں لیتے ہی کہا۔

"صاب بڑا خیر ہو گیا۔ عورت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ جس سے محبت کرتی ہے اس کے لئے سب کچھ لٹا دیتی ہے۔ اب رات ہی دیکھئے۔ آندھی آئی تو اپنی جھونپڑی پتے کی طرح ہلنے لگی۔ ایک طرف بانس کمزور تھے۔ برابر کھڑکھڑ کر رہے تھے۔ وہیں نیچے بچی سو رہی تھی۔ ایک دفعہ کچھ زور کا کھڑکا ہوا تو اس کی ماں لپک کر اس کے اوپر لیٹ گئی اور پھر ادھر کی جھونپڑی اس کی پیٹھ پر گر گئی۔ صاب بڑا خیر ہو گیا۔ اگر بچی پر گرتی تو وہ غریب تو چل بستی۔" اور اس دن سخاوت حسین بڑی دیر تک عورت کے گن گاتا رہا تھا اور وہ چپ چاپ ہوں ہاں کرتا رہا۔

پھر اسے خاص طور سے وہ دن یاد آیا جب وہ بیمار تھا۔ کئی دنوں سے اسے ہلکا ہلکا بخار آرہا تھا۔ رات بڑی بے چینی سے گزری تھی صبح صبح اس نے گھنٹی کی آواز سنی تو اسے یاد آیا کہ یہ مہینے کا پہلا اتوار ہے اس کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ بھلا اس بخار میں وہ بال کس طرح بنوا سکے گا۔ اس نے لیٹے لیٹے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ بال کانوں کے اوپر آگئے تھے اور گردن پہ بڑی دور تک پھیل گئے تھے۔ گھنٹی کی آواز تیز ہو رہی تھی۔ اس نے بڑی مشکلوں سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سخاوت حسین اسی طرح مسکرا رہا تھا۔

"کیا بات ہے صاب؟" اس نے اس کی شکل دیکھتے ہی کہا تھا

"کچھ بخار آرہا ہے۔"

"بخار صاحب؟" اور سخاوت حسین نے اپنا بیگ سائیکل ہی پر چھوڑ دیا تھا اور دوڑ کر پہلے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تھا پھر نبض پر

"ہاں بخار ہے صاحب۔ کب سے آرہا ہے؟"

"یہی دو تین دن سے۔"

"صاب بال تو بڑھ گئے ہیں۔ آپ تکیہ لگا کر بیٹھ جائیں۔ بس فٹا فٹ بنا دوں گا۔ آپ کو ذرا بھی تکلیف نہ ہوگی صاب۔"

اور وہ واقعی تکیہ لگا کر بیٹھ گیا اور اس کے بال فٹا فٹ بن رہے تھے۔ لیکن اس دن سخاوت حسین کچھ چپ چپ سا تھا۔ جانے کیوں۔ اس دن اسے دوسرے گاہکوں کی باتیں یاد نہ آرہی تھیں۔ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس نے آئینہ ذرا ترچھا کر کے سخاوت حسین کا عکس دیکھنے

کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ اس وقت بہت سنجیدہ اور آنکھیں متفکر تھیں
"کیا بات ہے میاں۔ آج بہت خاموش ہو۔ گھر والی سے لڑ کر آئے ہو؟"
"گھر والی سے؟ نہیں صاحب بس یونہی۔ کیا کہوں؟"
"ارے کچھ تو کہو۔"
"صاب ایک بات کہوں۔ برا تو نہ مانئے گا؟"
"برا۔ نہیں میاں۔ بھلا تمہاری باتوں کا میں نے کبھی برا مانا ہے؟"
"صاب آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ بہت سے دکھ درد دور ہو جائیں گے۔"

"شادی" اور وہ جانے کیوں ہنس دیا۔ "میاں کیا شادی کروں۔ دیکھو نا رہنے کو مکان تک نہیں ہے۔ پیسے اتنے کم ملتے ہیں کہ اپنا خرچ پورا نہیں ہوتا۔ بیوی آ گئی تو بھلا بتاؤ کہ کہاں سے کھائے گی؟"
"سب ٹھیک ہو جاتا ہے صاحب۔ مالک بڑا کارساز ہے۔ ہم کو دیکھو۔ کچھ نہیں پر اس کا شکر ہے سب کچھ ہے۔ گزر بسر ہو جاتی ہے۔ جو منہ بناتا ہے وہ کھانے کو بھی دیتا ہے۔"
اور وہ سوچنے لگا کہ یہ غریب اور جاہل لوگ کس قدر عقیدے کے پختہ ہوتے ہیں۔ ان کی نظر میں مارکس کے معاشی مسائل اور مالتھیوس کی ضبط تولید کی تھیوری سب ہیچ ہے۔ جس نے پیدا کیا ہے وہ کھلائے گا۔ جب کھانے والے بڑھ جائیں گے تو روزی بھی بڑھ جائے گی۔ کتنا سادہ فلسفہ ہے۔ کتنا یقین و ایمان ہے اس میں اور شاید اسی لئے اسے سوچ کر
"چپ کیوں ہو گئے صاحب۔ اپن بات غلط نہیں کہتے۔"
"ہاں میاں تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔" اس نے ذرا لاجواب ہوتے ہوئے کہا۔ اور پھر اسے مذاق کی سوجھی اور اس نے کہا۔ "کون کرے گا شادی۔ یہاں میرا کون ہے۔ تم ہی کہیں بات چیت کرو۔"
"صاب آپ مذاق کرتے ہیں۔ بھلا میری بات کون سنے گا؟"
"ارے تم گھر گھر جاتے ہو۔ عورتوں اور لڑکیوں کے بال بناتے ہو کہیں لڑکی ہی پسند کر دو۔"
"توبہ توبہ صاحب! اپنا جن گھروں میں جانا ہوتا ہے وہاں آپ بھلا کیا کریں گے۔"
"کیوں! کیا وہاں لڑکیاں نہیں ہوتی ہیں؟"
"ہوتی تو ہیں صاب پر....."
"ہاں ہاں کہو۔ چپ کیوں ہو گئے؟"
"صاحب بدگوئی ہوگی۔ خدا معاف کرے۔ وہ کچھ ٹھیک نہیں ہوتی ہیں۔"
"کیوں۔ ان میں کیا خرابی ہوتی ہے؟"
"صاب آپ تو سب جانتے ہیں۔ یہ بال کٹا کر سڑک پر گھومنے والی لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں۔"
"کیسی ہوتی ہیں بھائی۔ میں کیا جانوں۔"
"صاب آپ نہیں جانتے؟"
"نہ میاں یہاں کسے فرصت ہے۔ بتایا تو تم سے کہ دفتر، کالج اور اتنے بہت سے کام۔ سارا وقت اسی میں نکل جاتا ہے۔"
"صاب بس کیا بتائیں۔ کٹی ہوئی پتنگ کا کیا اعتبار کب کس کے ہاتھ پڑ جائے۔ یہ تو انگریز ہیں انگریز۔"
"اچھا میاں تو پھر دیکھا جائے گا جب کبھی موقع آئے گا۔ اس نے کٹی ہوئی پتنگ کا تصور کرتے ہوئے کہا۔
"صاب۔ ہم تو اس لئے کہہ رہے تھے کہ آپ کو تکلیف میں دیکھا نہیں جاتا۔ گھر والی آئے گی تو اس کی قسمت سے نصان بھی آ جائے گا۔ کھانے پینے۔ اٹھنے بیٹھنے کا آرام ہو جائے گا۔ دکھ درد میں عورت ساتھ ہو تو آدھا دکھ ویسے ہی ختم ہو جاتا ہے۔"
اس نے سوچا اس وقت کتنا خلوص تھا سخاوت حسین کی باتوں میں ہے کتنی مٹھاس۔ کتنی انسانی ہمدردی۔ اور پھر اس نے بات ٹالنے کی خاطر کہا۔
"ہاں میاں ٹھیک کہتے ہو۔ مگر ابھی تو میں پڑھ رہا ہوں۔ ذرا فرصت تو ہو جائے۔"
"اچھا صاب۔ جیسی آپ کی مرضی۔"
اور سخاوت حسین ہر بات کو صاحب کی مرضی پر چھوڑ دیتا اس کے میٹھے لہجے میں ہنس ہنس کر باتیں گاہکوں کی نجی زندگی میں دلچسپی اور ان سے ہمدردی، پھر اپنی پیشہ ورانہ چابکدستی، ان سب باتوں نے اسے بڑا

ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب مہینہ میں صرف ایک بار پہلے
اتوار کو صبح چھ بجے اس کی گلی میں آتا تھا۔ اور دو تین گھنٹوں میں سب
گاہکوں کے بال بنا کر لوٹ جاتا تھا۔

اسے سخاوت حسین سے بڑا انس ہو گیا۔ اور ہوتا بھی کیوں نہ۔
خوش اخلاقی اور انسانی ہمدردی چیز ہی ایسی ہے جو من موہ لیتی ہے۔ کچھ
اسی پر بس نہ تھا۔ پاس پڑوس کے دوسرے گاہک بھی اس سے بڑے
خوش رہتے تھے۔ اسی وجہ سے جوں جوں وہ سوچتا اس کا افسوس بڑھتا
جا رہا تھا۔ اب اسے بار بار یہ معلوم ہوتا کہ یہ سخاوت حسین حجام نہیں خفا
ہو کر گیا ہو بلکہ اس کا کوئی دوست روٹھ گیا ہو جیسے منانے کی ذمہ داری بھی اس پر ہو
لیکن وہ کرے تو کیا کرے۔ کہاں سے جوڑا لے دے۔ تین سال اسے
گھر سے آئے ہو گئے تھے۔ ایک ایک کر کے وہاں سے کپڑے پھٹتے جا رہے تھے
ابھی اسے یقین نہ تھا کہ کب تک وطن جانا ہو۔ یہاں کپڑے بنوانا اس کے بس
کی بات نہ تھی۔ جبھی تو بڑی مشکلوں سے اس عید میں وہ ایک قمیص اور ایک
پاجامہ بنوا سکا تھا۔ آخر سخاوت حسین کو کہاں سے دے۔ اٹھنی کے بجائے
ایک روپے کی تو کوئی بات نہ تھی مگر کپڑے کی شرط بڑی ٹیڑھی تھی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے پھر سخاوت حسین کی شکل ابھرنے لگی
اس کا ہنستا ہوا چہرہ، نرم لہجہ، ہمدرد آنکھیں۔ بوسیدہ ساز و سامان
چار بچے، پرانی سائیکل۔ میلی ٹوپی۔ اور ان سب سے بڑھ کر آج جاتے
وقت اس کی غمناک نگاہیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ "صاب آپ سے امید
تھی۔ صاب آپ نے میرا دل توڑ دیا صاب ہم نے کچھ سمجھ کر حق جتایا تھا
صاب ہم سب سے کپڑے کا جوڑا نہیں مانگتے پھرتے"۔

اور اس کے دل میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ لیکن وہ کرے تو کیا کرے
اسے جوڑا مانگنا بھی تھا تو آج ہی کے دن۔ جبکہ وہ ساری رات جاگا تھا۔ ٹیبل
سے اوپر روزے رکھ کر چڑچڑا ہو گیا تھا۔ لیکن سخاوت حسین کو ان باتوں
کا کیا علم کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے۔ اس نے سوچا اور پھر روزے۔ کیا
اس نے اسی لئے رکھے تھے کہ چڑچڑا ہو جائے اور لوگوں سے بد اخلاقی
کرے۔ وہ اسی بات کو ملامت سے ٹال سکتا تھا۔

اخبار والے نے اخبار کی صدا لگائی اور ڈان کا پرچہ اس کے کمرے
میں گرا۔ وہ چونک گیا۔ سامنے رکھا ہوا ٹائم پیس ساڑھے آٹھ بجا رہا
تھا۔ اور یہ اٹھنی اسی طرح پڑی چمک رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ سخاوت
حسین اب تقریباً آدھ گھنٹہ میں گلی کے گاہکوں سے فارغ ہو کر واپس جائے
گا۔ یہ اٹھنی اسے کس طرح لوٹائی جائے۔ اس کے بعد شاید عید تک وہ
نظر نہ آئے۔ یہ اس کا آخری موقع تھا۔ اٹھنی ایک غریب کا حق۔ وہ صحیح
رہا تھا غربت آدمی کو بشیر حساس اور خوددار دونوں بنا دیتی ہے۔ حساس دل
بڑا نازک ہوتا ہے ذرا سی خلاف توقع بات پر اسے ٹھیس لگ جاتی ہے
پھوٹ جاتا ہے۔ اور سخاوت حسین کا کیا۔ وہ خود بھی تو یہاں غریب ہی
تھا۔ دو سو روپوں کی حقیقت ہی کیا۔ اس سے اچھے تو پان بیڑی بیچنے والے
ہیں جو اس سے زیادہ کماتے اور اڑاتے ہیں پھر اس کا اپنا دل کتنا حساس
ہو گیا تھا کس طرح بارہا دوستوں کے نظر انداز کرنے یا خلاف امید کوئی
معمولی سی بات کرنے پر وہ افسردہ رہا ہو اکثر تنہائی میں رو دیا بھی ہے۔
سخاوت حسین کا دل بھی شاید ایسا ہی ہو۔ وہ بھی تو آدمی ہے جو پتہ نہیں
تقسیم ملک سے قبل اس کی حیثیت کیا رہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا
یہ ظاہرا اطمینان و سکون۔ اس کا یہ ہنستا ہوا چہرہ محض ایک نقاب ہو
جس کے پردے میں بہت سے درد و غم پنہاں ہوں۔ آج کل کی ہنسی کا
بھی کیا اعتبار۔ کسے پتہ اس کے پیچھے کتنے آنسو مچلتے رہتے ہیں۔ اس
کی اپنی ہر وقت ہنستے رہنے کی کوشش کتنے غموں، کتنی پریشانیوں کو
چھپانے کے لئے ہوتی ہے۔ اور پھر غریب کا دل۔ کتنی ذرا سی بات پہ
خوش ہو جاتا ہے۔ کتنی ذرا سی بات پہ ملول ہو جاتا ہے سخاوت حسین کا
دل بھی شاید ایسا ہی ہو۔ وہ بھی تو ایک انسان ہے۔ اس جیسا۔ وہ اب
کیا کرے۔ کس طرح روٹھے ہوئے سخاوت حسین کو منالے۔ کس طرح ان
کے چہرے پر جاتے وقت غموں کے جو سیاہ بادل چھا گئے تھے انہیں مٹا
سورج کی کرنیں بکھیر دے۔ اس کے ذہن میں یہ احساس ایک بڑا سوال
بن کر اٹھا۔ ایک روپیہ۔ ایک قمیص، ایک پاجامہ۔ دے ہی دے۔ کیا ہوا
دیکھا جائے گا۔ گذر تو جائے ہی گی۔ وہ اٹھا۔ ٹائم پیس میں نو بجنے میں
دس منٹ باقی تھے۔ اس نے اپنا ٹرنک کھولا۔ سب سے اوپر اس کی نئی قمیص
اور پاجامہ رکھا ہوا تھا۔ اسے ہٹا کر اس نے جائزہ لیا ایک قمیص اور ایک
پاجامہ قمیص مونڈھوں سے پھٹ گئی تھی۔ پاجامہ گھٹنوں سے مسک چلا
تھا۔ اس نے اسے کنارے رکھ دیا۔ دوسری قمیص اس کے کالر کا تار ادھڑ چکا

چلا تھا۔ پاجامہ! اس میں پیوند تھا۔ تیسری قمیص یہ کہنیوں سے جواب دے چکی تھی۔ ایک اور پاجامہ۔ اونہہ...... اس کی حالت بھی خستہ ہوگئی تھی شاید ایک دھلائی بھی نہ چل سکے، کیا دے کیا نہ دے۔ پھٹی قمیص، پھٹا پاجامہ۔ غریب آدمی۔ عید کا موقع۔ کیا سوچے گا۔ لیکن وہ کیا کرے؟ اس کے سارے قمیص پاجاموں کا یہی حال تھا۔ جبھی تو اس نے اس حال میں قمیص پاجامہ بنوا ہی ڈالا تھا۔ ورنہ ہر عید میں محض ارادے ہی کرکے رہ جاتا تھا۔ بڑی مصیبت ہے کیا کرے۔

ٹن تن ٹن

وہ بے ساختہ دروازے کی طرف بھاگا۔ سخاوت حسین سائیکل پہ سوار سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔

"سخاوت حسین!" اس نے آواز دی۔

"جی صاحب!" سخاوت حسین نے سائیکل موڑتے ہوئے کہا۔

"ارے بات تو سنو۔ تم تو خفا ہوگئے میاں۔"

اور وہ نظریں جھکائے۔ سائیکل ہاتھ میں لئے اس کی طرف بڑھا وہ جلدی سے کمرے کے اندر چلا آیا۔ اور سامنے کھونٹی پر ٹنگی ہوئی شیروانی سے ایک روپیہ نکالا۔ مگر کپڑوں کا جوڑا، سامنے اس کا ٹرنک کھلا ہوا تھا ایک طرف نئی قمیص اور پاجامہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی پرانے کپڑوں کا ڈھیر تھا...... سخاوت حسین اب سائیکل کھڑی کرکے کمرے کی طرف آرہا تھا۔ اس نے لپک کر اپنی نئی قمیص اور پائجامہ اٹھالیا اور اسے روپے کے ساتھ سخاوت حسین کو دیتے ہوئے بولا۔

"لو بھئی۔ معاف کرنا۔ روزے میں ذرا پارہ چڑھ گیا تھا اور پھر رات گرمی کی وجہ سے بالکل نہ سویا تھا۔ سمجھے میاں۔ میری بات کا برا نہ ماننا۔ میرا تو سب کچھ تمہارا ہے۔"

اور سخاوت حسین نے کپڑے کا نیا جوڑا لیتے ہوئے بڑے غور سے اسے دیکھا۔ جیسے اُسے یقین نہ آرہا ہو کہ یہ جوڑا واقعی اسی کے لئے ہے۔

"صاحب......" اس کے لب ہلتے رہے مگر وہاں آواز نہ تھی اور آنکھوں میں مسرت کے دو موٹے موٹے آنسو جھلملا رہے تھے۔ اس وقت اس کا ستا ہوا چہرہ بشاش ہو چلا تھا اور جذبات کی شدت کی وجہ سے اس پر اتار چڑھاؤ صاف نظر آرہا تھا۔

"صاحب......" مگر آواز پھر غائب تھی۔ اور اس نے سخاوت حسین کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے اس کا رخ سائیکل کی طرف موڑ دیا اور اسے سائیکل کے قریب چھوڑ کر چلا آیا۔

کمرے میں واپس آکر اس نے ایک نظر کھلے ہوئے ٹرنک پر ڈالی۔ کپڑے اسی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ لیکن رات بھر کی اچٹی ہوئی نیند اب غالب آرہی تھی اور اس نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں

(بشکریہ "ہمایوں")

شاد عارفی ●

عیب جس وقت ہنر بنتے ہیں — ظلم ڈھلتے ہیں شرر بنتے ہیں

حامیٔ امن بشر بنتے ہیں — اسلحہ آٹھ پہر بنتے ہیں

سوچتا ہوں جو اندھیروں کے خلاف — ذہن میں شمس و قمر بنتے ہیں

میکدہ چھوڑ کے جائیں بھی کہاں — آخر، انسان کدھر بنتے ہیں

باغباں لاکھ توجہ برتے — کہیں کانٹے گلِ تر بنتے ہیں

میرے نغمے نہ سمجھنے والے — سب سمجھتے ہیں، مگر بنتے ہیں

جن کو درکار ہیں ٹوٹے ہوئے دل — خیر سے۔ آئینہ گر بنتے ہیں

آنے والی ہے مصیبت کوئی — جام ہاتھوں میں شرر بنتے ہیں

حاصلِ گریۂ محرومی کیا؟ — اشک دامن پہ "صفر" بنتے ہیں

نقصِ انصاف و عدالت کے طفیل — "مجرم والزام" نڈر بنتے ہیں

آپ اندھے تو نہیں ہیں لیکن — آپ "احساس نگر" بنتے ہیں

کسی موقع پہ سنا تھا اُس نے — "ڈھا دیئے جائیں تو گھر بنتے ہیں"

خدمتِ قوم و وطن میں اے شاد
مرنے والے ہی "امر" بنتے ہیں

(بشکریہ "ہمایوں")

محمد ارشاد خاں ●

ایک رات کرسئ وزارت

ہم دن بھر کے تھکے ہوئے تھے۔ شام کو کھانا کھا کر جلد ہی سو گئے تاکہ صبح اٹھ کر جلد ڈیوٹی پر پہنچ جائیں۔ لیکن ابھی ہمیں سوئے ہوئے ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ کسی نے ہماری جھونپڑی کے دروازے پر دستک دی۔ دو تین منٹ تک تو ہم کروٹیں بدلتے رہے۔ لیکن جب ہم نے یہ محسوس کیا کہ یہ بلا ٹلنے والی نہیں ہے تو مجبوراً اٹھے۔ دروازے سے باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی ٹیلیگرام لئے کھڑا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ہمارے پیروں کی زمین نکل گئی۔ کیونکہ ہمارے یہاں جتنے بھی تار آتے ہیں وہ کوئی بری خبر ہی لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ بمشکل تمام کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وصولی کے دستخط کئے۔ اور لالٹین ذرا اونچے کر کے ڈرتے ہوئے ٹیلیگرام پڑھنا شروع کیا۔ اس میں لکھا تھا کہ: "صدارت نے تمہیں نئی وزارت بنانے کی دعوت دی ہے۔" یہ پڑھ کر ہم اس نتیجہ پہ پہنچے کہ غلطی سے کسی اور کا تار ہمیں دیدیا گیا ہے۔ لیکن معاً ہمارے دماغ میں یہ بات آئی کہ لفافہ پر لکھے ہوئے پتہ کو تو دیکھ لیں۔ ہم نے دیکھا تو ہمارا ہی نام اور ہماری ہی جھونپڑی کا نمبر موجود تھا۔ ہمیں بہت تعجب ہوا کہ آخر صدارت کو یہ کیا سوجھی کہ ہمیں ایک کلرک سے وزیر بنا دیا۔ لیکن کچھ دیر بعد یہ شبہ بھی دور ہو گیا اور ہم یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ یہ "دورِ جمہوریت" ہے۔ یہاں ہر شخص وزیر بن سکتا ہے۔ اسی طرح اب ہماری باری آئی ہو گی تو ہمیں وزیر بنا دیا گیا ہو گا۔ بس جونہی یہ اطمینان ہوا ہم نے اپنا "نائٹ ڈریس" جسے ہم نے اب تک "ڈے اینڈ نائٹ ڈریس" بنا رکھا تھا اتارا۔ اور اپنے پڑوسی سے پتلون مانگ کر پہنی۔ اور رکشا پر سوار ہو کر سیدھے ——— گورنمنٹ ہاؤس پہنچے۔ ابھی ہمارا رکشہ دروازے میں ہی داخل ہوا تھا کہ ہمیں "گارڈ آف آنر" پیش کیا جانے لگا۔ اس کے بعد حاضرین سے ہمارا تعارف کرایا گیا۔ جب سب لوگوں سے تعارف ہو گیا تو ہم سے کہا گیا کہ ہم اپنی وزارت کے ارکان کے نام جلد از جلد پیش کر دیں۔ ہم نے اس کام کے لئے دو گھنٹہ کی مہلت مانگی اور ایک تنہا کمرے میں بیٹھ کر ہونے والے وزیروں کے نام سوچنے لگے۔ ہم کرسی پر بار بار پہلو بدل رہے تھے اور کئی زاویوں سے سر کو پکڑ رہے تھے لیکن کسی صورت سے بھی ناموں کا انتخاب نہیں ہو رہا تھا۔ اس کشمکش سے تنگ آ کر ہمارے منہ سے بے اختیار نکل پڑا کہ "میاں وزارت بنانا کوئی مذاق نہیں ہے۔ بڑی دماغ سوزی کرنا پڑتی ہے۔"

ہماری یہ حالت تھی کہ کبھی ہم چچا چمن کو وزیر داخلہ کا عہدہ سپرد کرنے کے بارے میں سوچتے تھے تو ماموں چھکن کا خیال آ جاتا تھا کہ چچا چمن کے وزیر داخلہ بننے سے ناراض ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان دونوں میں بٹیر بازی کی وجہ سے ہمیشہ سے رقابت چلی آ رہی ہے۔ کبھی ہم، عبداللہ کے وزیر صحت بنانے کے متعلق فیصلہ کرتے تھے تو کریم کا خیال آ جاتا تھا۔ کیونکہ وہ بیچارا دو برس سے دق کی بیماری میں مبتلا ہے اگر وہ وزیر صحت بن جائے تو اس کا علاج ضرور ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ دو برس کی طویل بیماری نے اسے کافی تجربہ کار بنا دیا ہے۔ اور بعض مرتبہ وہ ڈاکٹروں سے بھی بہتر طبی مشورہ دیتا ہے۔ اس لئے وہ اس عہدہ کے لئے بہتر رہے گا۔ کبھی ہم رفیق صاحب کو وزیر مہاجرین و آبادکاری بنانے کا عزم کرتے تھے تو ماسٹر بشیر کا خیال آ جاتا تھا انھوں نے بڑی مشکل سے ہمیں پنجاب میٹرک کرایا تھا۔ اور آج کل مکان نہ ہونے کی وجہ سے فٹ پاتھ پر پڑے رہتے ہیں۔ وزیر آبادکاری بننے سے ان کا یہ فائدہ تو ہو جائے گا کہ اور لوگ آباد ہوں یا نہ ہوں لیکن وہ خود تو آباد ہو جائیں گے۔ وزیر تجارت کے لئے ہم نے کلوا کنجڑے کا نام تجویز کر لیا تھا۔ کیونکہ اس کا خاندان ہمیشہ سے سبزی بیچتا ہے اور منڈی سے مال لانے اور فروخت کرنے میں کافی مہارت رکھتا ہے۔ وزیر خزانہ ہم نے خود بننے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ استاد بندو خاں کا کہنا ہے کہ

بیسویں صدی میں پیسہ کے معاملہ میں کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے غرضیکہ جیسے تیسے ہم نے اپنی وزارت کے ارکان کے نام پیش کر ہی دیئے اور تھوڑی دیر میں ریڈیو پر ہماری وزارت کا اعلان کر دیا گیا۔

اس اعلان کے بعد ہمارے اعزاز میں ایک سرکاری ٹی پارٹی دی گئی۔ اس کے بعد ہماری کابینہ نے حلف اٹھایا اور اپنے عہدوں کا چارج لے لیا۔

غالباً اسی روز شام کو ہم نے اپنے سکرٹری سے آفس کے ضروری فائل اور کاغذات طلب کئے کیا دیکھتے ہیں کہ کئی چپراسی اپنے سروں پر ٹوکرے اٹھائے چلے آرہے ہیں ہم نے کہا "بھائی یہ ردّی کیوں لے آئے۔ اسے جونا مارکیٹ میں فروخت کرا دو" سکرٹری نے کہا۔ "حضور یہ ردی نہیں ہے۔ یہ تو مبارکبادی کے پیغامات ہیں" ہم یہ سن کر دنگ رہ گئے کیونکہ ہمارا حلقہ احباب زیادہ سے زیادہ دس بارہ افراد پر مشتمل ہوگا۔ "یہ کتنے تار اور خطوط ہیں؟" ہم نے سکرٹری سے پوچھا۔

اس نے کہا۔ "حضور ان کی صحیح تعداد ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی حالانکہ کئی آدمی انہیں گن رہے ہیں۔ لیکن حضور آپ حیران کیوں ہو رہے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ جب بھی کوئی وزیر بنتا ہے تو اسی طرح مبارکباد کے پیغامات آتے ہیں۔ وزیر صاحب خواہ مبارکباد دینے والوں سے واقف ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن مبارکباد دینے والے تو یہ چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو واقف کرا دیں۔ اور حضور آپ کو آج شام چار سو چالیس جگہ "ڈنر" پر "انوائٹ" کیا گیا ہے۔"

"سکرٹری"! کیا سابقہ وزیر روزانہ اتنے ڈنروں میں شرکت کرتے تھے؟"

"جی نہیں" پچھلے تمام وزیر تو ان دعوت ناموں میں سے صرف ایسے دعوت نامہ کو قبول کرتے تھے جو ان کے لئے "مفید" ثابت ہو سکے"

"سکرٹری! "مفید" سے کیا مراد ہے؟"

"حضور! اس لفظ کے معنی بہت وسیع ہیں۔ آپ ابھی نئے نئے آئے ہیں کچھ روز میں آپ خود اس کے معنی سمجھ جائیں گے۔"

سکرٹری مسکراتا ہوا یہ کہہ کر چلا گیا اور ہم "مفید" کے معنوں پر غور کرتے رہے۔ لیکن جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ہم نے اپنی توجہ "ڈنروں" کی طرف منعطف کر لی۔ اور ہمارے سامنے پلاؤ، زردے، قورمے اور مرغ مسلم کی پلیٹیں رقص کرنے لگیں اور ہمارے منہ سے بے اختیار "واہ واہ" کی آوازیں نکلنے لگیں۔

"یہ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ عجیب عجیب قسم کی آوازیں نکال رہے ہیں۔"

"کون ہے بدتمیز" ہم نے کروٹ بدل کر ذرا سی آنکھ کھولتے ہوئے کہا

"بدتمیز ہو گے تم" ——— ایک کرخت آواز نے ہماری پوری آنکھیں کھول دیں اور ہم نے اپنے سامنے بیگم کو ماتھے پر شکنیں ڈالے کھڑا دیکھا۔ پہلے تو ہمیں یہ یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ہم "منسٹرز ہاؤس" سے "جھونپڑی" میں آگئے ہوں گے۔ لیکن جب بیگم نے یہ کہا کہ "نو بج چکے ہیں۔ کیا ڈیوٹی پر نہیں جاؤ گے" تو ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم ایک رات کے لئے وزیر بنے تھے۔ درحقیقت وزارت ایک خواب ہی تو ہے کوئی ایک سال تک یہ خواب دیکھتا رہتا ہے اور ہم نے ایک رات دیکھ لیا یہ سوچ کر ہم جلدی سے بستر سے اٹھے اور منہ ہاتھ دھو کر بیگم کو اپنی وزارت کا قصہ سنایا۔ تو وہ کہنے لگیں کہ "آیۃ الکرسی" پڑھ کر سویا کرو پھر ایسے خواب نظر نہ آئیں گے۔"

مظہر الدین

رُباعیات

جبریل کی پرواز پہ پابندی ہے
شاعر کے ہر انداز پہ پابندی ہے
شاید یہی مفہوم تھا آزادی کا
اب تک مری آواز پہ پابندی ہے

بجلی کی کڑک قید نہیں ہو سکتی
تاروں کی دمک قید نہیں ہو سکتی
جب فطرتِ آزاد کو غصہ آجائے
شعلوں کی لپک قید نہیں ہو سکتی

ارشاد یہ ہے وقت کی تفسیر نہ کر
جو دیکھا ہے اس خواب کی تعبیر نہ کر
گر شمر کی تعریف نہیں کر سکتا
خونِ رگِ شبیرؓ کی تشہیر نہ کر

ہم کھل کے کوئی بات نہیں کہہ سکتے
جز رمز و کنایات نہیں کہہ سکتے
آفات نے ہر سمت سے گھیرا ہے
آفات کو آفات نہیں کہہ سکتے

یہ دورِ سکوں سوز الٰہی توبہ
ابلیس کا نوروز الٰہی توبہ!
ہر سانس ہے افسانۂ بربادیٔ دل
کیفیتِ امروز الٰہی توبہ!

فریاد کہ فریاد کناں ہے عالم
آتش بجگر شعلہ بجاں ہے عالم
اے ضامنِ تسکینِ دو عالم تسکین
حیرت سے بہر سو نگراں ہے عالم

حالات کی افتاد سے دل زخمی ہے
انسان کی فریاد سے دل زخمی ہے
پہلے غم ملت سے تھا سینہ زخمی
اب اپنی ہی روداد سے دل زخمی ہے

(بشکریہ "تعمیر انسانیت")

ابوالمجاہد زاہد ●

شفیق جونپوری کی شاعری

"فانوس" کی روشنی میں

شفیق جونپوری ملک کے جانے پہچانے کہنہ مشق اور صاحب طرز، اسلام پسند شاعر ہیں ان کی شاعری نے منفرد اسلوب کی بدولت ایک خاص مقام پیدا کرلیا ہے۔ انھوں نے نئی قدروں سے بغاوت نہیں کی اور نہ پرانی قدروں کو قابل گردن زدنی قرار دیا بلکہ ان کے کلام میں قدیم وجدید کا ایک لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔ علامہ سیماب مرحوم نے اچھے شاعر کی پہچان یہ بتائی ہے کہ:-

"جو کانوں سے اتر کر روح کو چھولے وہ شاعر ہے"

اور شفیق کا کلام واقعی کانوں سے اتر کر روح کو چھولیتا ہے اپنی مزاجی مناسبت خلق استعداد اور ذوق شعری کی مدد سے وہ اپنا راستہ خود بناتے ہیں نفس تقلید کو وہ بہت برا سمجھتے ہیں۔ یوں تو وہ علامہ اقبالؒ کے پیرو ہیں اور پیروئ اقبال پر ناز بھی کرتے ہیں اسکے باوجود ان کے کلام میں "سرقہ" اور "توارد" کی مثالیں نہیں ملتیں...... انھوں نے کسی حد تک صرف "اقبالیات" کی روح کو لیا ہے لیکن اس روح پر جو ڈھانچہ اور ڈھانچہ پر جو گوشت پوست ہے وہ شفیق کا اپنا بنایا ہوا ہے اسی لئے وہ اقبال کے مقلد ہوتے ہوئے بھی مجتہد نظر آتے ہیں، اور یہی اُن کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

شفیق جونپوری کے کئی مجموعے شائع ہوکر مقبول عام ہوچکے ہیں "فانوس" ان کا تازہ مجموعہ کلام ہے جس میں "سفینہ" کی طرح غزلیں نظمیں، قطعات و رباعیات سبھی کچھ شامل ہیں لیکن ان کی شاعری کے صحیح خدوخال اور بنیادی احساسات کی نمائندہ غزلیں ہی کہی جاسکتی ہیں۔ وہ غزل زیادہ کہتے ہیں۔ غزل کی "آفاقیت" پر ان کا ایمان ہے اور "فانوس" کی غزلوں میں لوچ، بلند آہنگی اور توازن الفاظ کے ساتھ ساتھ سوز وساز کی دلکش آمیزش پائی جاتی ہے۔ ؎

مسکراتا ہے کوئی پھول تو جی ڈرتا ہے
ڈھونڈتی ہو نہ اسے گردش ایام کہیں

میں نے بھی سارے زمانے کو فراموش کیا
جب سے تو بھول گئی لے نگہ یار مجھے

خوشی گلے سے لگانے کو بار بار آئی
گیا نہ دل سے ترے غم کا احترام کبھی

وہ روشنی دل لے تو گئے تابانی غم ناکام نہیں
ہر چند کہ سورج ڈوب گیا بستی میں ابھی تک شام نہیں

جب سامنے آجاؤ گے کبھی خود داد بصیرت لے لینگے
آوارہ پھریں ڈھونڈیں بھی تمھیں یہ اہل نظر کا کام نہیں

تقدیر کے مالک ہو نہ خفا ناعاقبت اندیشی پہ مری
جس دن سے بھروسہ ہے تجھ پر اُس دن سے غم انجام نہیں

ان کی غزلیں دیکھکر ان کی بالغ نظری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور ان کے اشعار ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ؎

تجھے ہم دوپہر کی دھوپ میں دیکھیں گے اے غنچے
ابھی شبنم کے رونے پر ہنسی معلوم ہوتی ہے

مرے دامن پہ کیا ہنستا ہے اے گل
ذرا اپنے گریباں پر نظر ہو

سحر کے جھونکے ہیں لرزاں کہ دھوپ تیز نہ ہو
کلی کو ناز ابھی میری عمر ہی کیا ہے

ترے غرور کو اے آفتاب کیا معلوم
کہ میری خاک کے ذرّوں میں روشنی کیا ہے

.. ہو تعاونِ شبنم تو اے نسیمِ سحر
تجھے بہار کی خنکی میں دخل ہی کیا ہے

اب اٹھتے جاتے ہیں رخسار و زلف کے پردے
بدلتی جاتی ہے شام و سحر زمانے کی

گلہائے چمن نے چاہا تھا بلبل کے ترنم پر ہنسنا
اپنی بھی قبائیں غارت کیں نکہت کا بھی پردہ چاک کیا

ارے او موت کی دشواریوں کو سوچنے والے
خبر بھی ہے تجھے خود زندگی ہے کتنی پیچیدہ

چند تشبیہیں ملاحظہ ہوں ؎

تصوّر میں ترقی ہے مگر قابو نہیں اپنا
کہ جیسے فلم کے پردے پہ کوئی خوش جمال آئے

زہے تابانیاں اس رخ پہ اشکوں کی لکیروں نے
کہ جلیں میں کوئی خورشید کو آئینہ دکھلائے

وہ گرمیِ ہجراں وہ تری یاد کی خنکی
جیسے کہ کہیں دھوپ میں سایہ نظر آئے

گلِ بہشت کی دو پتیوں کو جنبش تھی
کہ لہر تھی لبِ نازک پہ مسکرانے کی

قدم کیوں سست رکھتے ہو جو نیت ہے عیادت کی
تمہاری چال کیا ہے نبضِ بیمارِ محبت کی!

شفیق جونپوری کی شاعری میں جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے اور صفائی اور بیباکی ان کی فطرت ثانیہ ہے سچائی ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ ان کے حوصلے جاندار اور توانا ہیں۔ ان کے یہاں سیاسی اور عصری رجحانات بھی ملتے ہیں۔ تنقید کے تیز تیز نشتر بھی پائے جاتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ تغزل کا بانکپن کہیں بھی مجروح نہیں ہونے پاتا۔ ہندوستان کی آزادی اور اس سے پیدا شدہ ہلاکت سامانیوں اور گمراہیوں پر شفیق نے بہت کچھ لکھا ہے۔ "فانوس" کے یہ اشعار پڑھیے ؎

تصرّفِ غیر پر گلہ تھا کہ راستہ بے خطر نہیں ہے
اور آج منزل ہوئی ہے اپنی تو قافلوں کا گزر نہیں ہے

کلی کلی کو ستا رہا ہے تمازتِ آفتاب کا قہر
ہمیں گلستاں سے شب کی ظلمت تو اعتبارِ سحر نہیں ہے

خود اپنی شاخوں کو قطع کرنا خود اپنے پھولوں کا خون کرنا
چمن پہ حاصل ہوا ہے قابو تو فاتحانہ نظر نہیں ہے

کچھ پھول کھل گئے ہیں تو خوش ہو نہ باغباں
تقدیرِ اس بہار پہ ہے خندہ زن ابھی

تہذیب شرمسار ہے اخلاق سرنگوں
باقی ہے حریّت کی جبیں پر شکن ابھی

ہرچند آفتاب نمودار ہو چکا
تھرا رہی ہے صبح کی پہلی کرن ابھی

یہ دُھن کسی کو نہیں گل کھلیں بہار آئے
یہ فکر ہے کہ چمن زیرِ اختیار آئے

چمن میں پھر وہی گلچیں ہے پھر وہی صیّاد
خیال تھا کہ اسیری کے دن گزار آئے

پہن لیتا ہے جو کھدر کی ٹوپی
سمجھتا ہے جواہر لال ہوں میں

ہمیں اے موسمِ گل تجھ پہ کیا کیا ناز تھا لیکن
وہ کانٹوں سے نہیں ممکن جو پھولوں نے قیامت کی

چل دینے کا الزام نہ نکہت ہی کے سر ہو
کچھ بے رخئ اہلِ چمن پر بھی نظر ہو

نکہت پہ ہے اتنا ہی بہتان آوارگی و رسوائی کا
جتنا کہ چمن سے دور گئی فیضانِ چمن پہنچانے کو

قسم ہے ایسی بیداری کو بیداری نہیں کہتے
کہ آنکھیں جاگتی ہوں آدمی کی روح سو جائے

"انقلاب زندہ باد" کا نعرہ وہ بھی لگاتے ہیں لیکن اس نعرہ کی وہ پوری اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہیں وہ سطحی اور چھوٹے انقلاب کو پسند نہیں کرتے، وہ سچا انقلاب چاہتے ہیں۔ ایسا انقلاب "جس میں بدن بھی ہو توانا روح بھی سیراب ہو جائے" انھیں یقین ہے کہ بگاڑ اور برائی کی جڑ خدا، مذہب اور اخلاق سے بغاوت و سرکشی ہے وہ انقلاب کا نام "فیشن" کے طور پر نہیں لیتے کہ؂

صورت بھی مسخ ہو تو کہیں لوگ زندہ باد
ایسی ہوا چلی ہے شفیق انقلاب کی

وہ ایسے نظامِ جمہوریت کو بھی "ضمیرِ شیطان کی آگہی" بتاتے ہیں۔ جس میں "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔"

نظامِ جمہوریت کی بنیاد صرف کثرت پہ رائے کی ہے
تو انتخابات کا تصور ضمیرِ شیطاں کی آگہی ہے

وہ انسان کو انسان بننے پر آمادہ کرتے ہیں۔ انھیں افسوس ہوتا ہے کہ اس دورِ ترقیات میں "آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا"۔

تہذیب کا آئینہ اب تک شرمندۂ احساں ہو نہ سکا
کیوں شورِ ترقی ہے یارب انساں ہی جب انساں ہو نہ سکا

فضاؤں میں پرواز کا فن سکھایا
تو دریا کی موجوں کو ساحل بنایا
سمندر کی تہ میں بھی راہیں نکالیں
مگر آدمی بن کے چلنا نہ آیا

وہ انسان کے عناصرِ ترکیبی کی وضاحت بھی کرتے ہیں؂

خود آگاہی و خودداری، خودآرائی و خودفہمی
شفیق اتنے عناصر ہوں تو پھر انسان کہلائے

ان کی انقلابی شاعری اخلاق کی حامی ہے؂

عظمت کا طلبگار ہے انساں تو شفیق آج
اخلاقِ رسولِ عربی پیشِ نظر ہو

نثار اس آنے والے کے کہ جس کی خوش خرامی نے
خس و خاشاک میں بھی زندگی کی روح دوڑا دی

شفیق طاقتِ اخلاق سے وہ ممکن ہے
ہزار سال جو فوج و سپاہ کر نہ سکے

تلوار کی قوت سے بھی شفیق آئین بدل سکتے ہیں کہیں
اخلاق کی طاقت کیا کم تھی تہذیب پہ ایماں لانے کو

عدل و انصاف سے انھیں عشق ہے؂

تاجپوشی اسے زیبا ہے جسے آتا ہو
عدل و انصاف سے دامانِ زمیں بھر دینا

ترقی دے تو فطرت بھی جہاں داری کے قابل دے
خدا بندے کو پہلے امتیازِ حق و باطل دے

اے جنگ کے فاتح کاش تجھے اس بات کا بھی احساس رہے
مقتول سپاہی کی بیوہ محتاج ہے دانے دانے کو

شاہ ہو یا ہو گدا کوئی بھی نہ زوری کرے
کیوں لحاظِ رتبۂ تیموری و غوری کرے

عدل تو یہ ہے کہ قطعاً ہاتھ کاٹا جائے گا
فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی اگر چوری کرے

شفیق زندگی کے ہر گوشہ پر نظر رکھتے ہیں ان کی شاعری میں ساری دنیا کا دل دھڑکتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور ان کے جگر میں سارے جہاں کا درد پایا جاتا ہے ؎

فقط ہندوستان ہی تک نظر محدود کیونکر ہو
خدا نے درد بخشا ہے ہمیں سارے زمانے کا

شفیق اسلام پسند شاعر ہیں۔ اس لئے ان کا عمومی انداز بیان بنام انسانیت یا بنام اسلام ہے۔ اسلام سے زیادہ انسانیت کا دوست کون ہو سکتا ہے وہ اسلام کو "کوئی پرائیوٹ چیز" یا "چنیا بیگم" کا انگلش نہیں سمجھتے وہ خوب جانتے ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا عالمگیر اور حیات آفریں نظام فکر و عمل ہے جس میں بہترین اخلاقی اور روحانی قدریں بھی ہیں سیاست معاشرت اور جمہوریت کے اعلیٰ اصول بھی ہیں اور جو تمام انسانوں کو بلا امتیاز طبقہ و نسل یکساں انصاف و محبت کی نظر سے دیکھتا ہے اور جو انسانی زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرتا ہے وہ انسان پر انسان کی خدائی کو تسلیم نہیں کرتے وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ؎

انسان پہ انساں کی حکومت اگر اے دوست
فردوس بریں بھی ہو تو آرام نہیں ہے

وہ خوب جانتے ہیں کہ ؎

صرف ربانی حکومت سے ہے مومن کی بقا
عشق یزداں ہو تو خوف اہرمن کیا چیز ہے

...... ان کا احساس خودی بیدار ہے وہ بیچارگی و مظلومی کی ذلت کو برداشت نہیں کر سکتے ؎

بیچارگی و مظلومی کی ذلت کو دوامی کون کرے
احساس خودی بیدار ہے اب در در کی سلامی کون کرے
فرعون کا استکبار کہاں اب روس میں دور زار گیا
خالق ہی کا سجدہ مشکل ہے بندوں کی غلامی کون کرے

خودی سے انھیں بہت محبت ہے ؎

خودی سے ہو کے بیگانہ بشر پستی میں رہتا ہے
فرشتوں سے نہیں ہوتا جو آدم زاد کرتا ہے
خودی کا اپنی جو لے سہارا تو ہے وہ نکتہ بھی ہم کو پیارا
ہے جس پہ یہ راز آشکارا کہ ہر تلاطم میں زندگی ہے

وہ بہت ہی خوددار ہیں اور محبت میں بھی خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ہیں ؎

میں عاشق ہوں مگر تجھ سے پرستش کی توقع کیوں
محبت ہے محبت بندگی ہے بندگی ساقی
محبت کا صلہ یہ ہے محبت تو بھی کر مجھ سے
جبیں رکھتا نہیں قدموں پہ جو خوددار ہوتا ہے

اور بڑے پیار سے کہتے ہیں ؎

خفا تو ہو نہ اپنے میکشوں کی خود پسندی پر
یہ تیرے واسطے خود بھی مقام ناز ہے ساقی

وہ زمانے کی ترقی کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے مرد مومن کے منتظر ہیں ؎

زمانہ کی ترقی تشنۂ تکمیل ہے یارب
ابھی اک مرد مومن کی کمی معلوم ہوتی ہے

وہ بندۂ مومن کی پہچان بھی بتاتے ہیں ؎

آ بندۂ مومن کی پہچان بتا دوں میں
اخلاق پیمبرانہ تیور اسد اللٰہی

وہ بربادیٔ ملت اور مسلمانوں کی بے حسی پر تڑپتے بھی ہیں اسباب زوال امت پر ان کی گہری نظر بھی ہے اور مذہب کو دستار و دامن میں الجھانے والوں سے بیزار بھی ہیں ؎

زمانے کے تغیر کی کہانی پوچھتے کیا ہو؟
کہ ہم سے اپنی بھی تصویر پہچانی نہیں جاتی
کہاں چلے گئے طوفاں سے کھیلنے والے
یہ آج کشتی و ساحل کی بے بسی کیا ہے؟
تاج شاہی کو بھی ٹھکرا دیتے تھے ایمان والے
آج ملا کے لئے کیسۂ زر سب کچھ ہے
خانقاہوں میں ہے اب مرغ مسلم کی ہوس
فقرا بھول گئے نان جوین حیدرؓ

روایت ہے نانِ جویں کی لبوں پر
مگر زورِ بازوئے حیدر نہیں ہے
اللہ رے یک رنگی محسوس نہ ہوتا تھا
درویش کی محفل ہے یا انجمن شاہی
وہ میری باہمی وحدت کا رشتہ کیا ہوا یارب
چھٹا کاشانۂ عجم میں تو عرب سے چارہ ساز آیا
دلوں سے ٹوٹتا جاتا ہے رشتہ تیری وحدت کا
چلیں نسل و وطن کی آندھیاں فریاد ہے ساقی
یہ عالمگیر وحدت کا تصوّر یہ جمود اپنا
مسافر خواب میں ہو اور منزل کا خیال آئے

لیکن انھیں یقین ہے کہ حالات ضرور کروٹ بدلیں گے اور نظامِ باطل کی چھائی ہوئی کالی رات کا جادو ٹوٹ کر رہے گا ؎

جن کی مرجھائی ہوئی شکل پہ ہنستے ہو وہی
چاک کرتے ہوئے دامانِ ستم آئیں گے
قافلہ دُور نہیں میرے سحر زادوں کا
لے کے وہ روشنیٔ لوح و قلم آئیں گے
اک ذرا نیند سی آنکھوں پہ ہے طاری ورنہ
آج بھی بندۂ مومن کی نظر سب کچھ ہے

شفیق کو الحاد و بے دینی سے نفرت ہے ان کا ایک بڑا پیارا شعر ہے ؎

یہ ملحدین ندامت کا لطف کیا جانیں
گناہ کر کے جو قدرِ گناہ کر نہ سکے

"شرابِ اشتراکیت" کو بھی وہ اسی لئے پسند نہیں کرتے کہ اس میں تلخیٔ الحاد پائی جاتی ہے اور اثمھا اکبر من نفعھا کی وجہ سے وہ اسے مردود قرار دیتے ہیں ؎

ضرورت اشتراکیت کو بھی ہے ایک رہبر کی
شراب اچھی ہے لیکن تلخیٔ الحاد ہے ساقی

وہ سرخ سویرے کے بھی اسی لئے قائل نہیں ہیں کہ اس میں "بغاوت" کی ہوا کے جھونکے محسوس ہوتے ہیں ؎

میں سُرخ سویرے کا بھی قائل نہیں اے دوست
اس صبح میں جھونکا ہے بغاوت کی ہوا کا

کیا وہ تحریک ہے جس میں نہیں خلاق کی روح
اشرف الخلق ہے انسان تو بغاوت کیسی

آہ انسان کا دل اور بغاوت کی خلش
یہ تو افلاس کی "خارش" کے سوا کچھ بھی نہیں

کہتا ہے بے خبر کہ ترقی پسند ہوں
اور اشتراکیت میں وہی مادمن ابھی

رامپور کے ایک آل انڈیا قسم کے مشاعرے میں رامپور کے ایک شاعر نے ایک ملحدانہ نظم "کہہ دوں تو کفر ہے" [۱] پڑھی شفیق سے نہ رہا گیا، اور انھوں نے فی البدیہہ چند شعر موزوں کر لئے اب جو دیکھتا ہوں تو وہ اشعار "گندم نما جو فروش" کے عنوان سے "فانوس" میں موجود ہیں ؎

ہمیشہ دور عروج و زوال کا ہوگا
یہ آدمی کبھی سُلطاں کبھی گدا ہوگا

یتیم و بیوہ و مزدور کا ہے نام ہی نام
یہ "اقتدار کا فتنہ" ہے جو بپا ہوگا

---

[۱] ایک زمانہ تھا جب میں رامپور میں "حلقۂ اربابِ ادب" کا سکریٹری تھا جو مشہور ترقی پسند شاعر شاد عارفی کی زیر نگرانی قائم تھا۔ اس زمانے میں جناب محشر عنایتی روزنامہ آغاز رامپور کے ایڈیٹر تھے۔ محشر صاحب نے اسی نظم "کہہ دوں تو کفر ہے" پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ یہ نظم حدود عقائد سے کچھ متجاوز ہے نظم چونکہ حلقہ کے ایک شاعر کی تھی اسلئے پورے حلقہ میں کھلبلی مچ گئی اور سکریٹری ہونے کی حیثیت سے میں نے مدیر آغاز کو اخبارات میں خوب بدنام کیا۔ مقدمہ بازی تک کی نوبت آگئی۔ اب جب کبھی مدیر آغاز کی سچی تنقید اور اپنی ہٹ دھرمی پر غور کرتا ہوں تو دل کانپ کانپ جاتا ہے اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ (زاہد)

جو تجھ سے خوش نہیں تیرا نہ ہوسکا یا رب
بھلا اسے ترے مذہب کا درد کیا ہوگا

مزدوروں اور غریبوں کا غم شفیقؔ کو بھی ہے۔ وہ خدا سے بھی فریاد کرتے ہیں ؎

جو تو ہی فریاد رس نہ ہوگا کسے پکاریں گے غم کے مارے
کہ تیری دنیا میں یا الٰہی غریب کی آہ بے اثر ہے

ستایا جا رہا ہے ہر جگہ تیرے غریبوں کو
وہیں نا مطمئن ہے جو جہاں آباد ہے ساقی

اور انھیں یقین ہے کہ کبھی نہ کبھی مذاقِ عام بلند ہو کر رہے گا ؎

زمانہ لے گا غریبوں کا انتقام کبھی
بلند ہو کے رہے گا مذاقِ عام کبھی

اور زمانہ انتقام لے بھی رہا ہے ؎

یہ وقت کا انتقام بھی ہے یہ زندگی کا پیام بھی ہے
کہ آج خسرو کے سر کی ٹوپی کلاہِ مزدور بن گئی ہے

وہ جانتے ہیں کہ پہلا سا دورِ عالم ہے
اور اب غریب کی دنیا بہت منظم ہے

لیکن وہ غریبوں اور مزدوروں کو روس کا ذہنی غلام بنانا نہیں چاہتے نہ مزدور و سرمایہ دار میں بغاوت آمیز تفریق کو پسند کرتے ہیں...... وہ کہتے ہیں اور...... خدا نا آشنا عوامی تحریکوں کا جائزہ لے کر.... بالکل ٹھیک کہتے ہیں ؎

درد مزدوروں کسانوں کی پریشانی کا
اِک نمائش ہے نمائش کے سوا کچھ بھی نہیں

میں خوب سمجھتا ہوں پیارے سرمایہ پرستوں کی چالیں
تنظیمِ غریباں کرنے لگے جب خونِ غریباں ہو نہ سکا

تھی کبھی دَور میں اِک رحمتِ کونین کی ذات
پھر تو آیا نہ غریبوں کا نگہباں کوئی

وہ خود فانوس کے مقدمہ میں اسلام اور اشتراکیت کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"—— اسلام مزدور و سرمایہ دار دونوں کا مصلح و دردمند ہے۔ اور اشتراکیت میں غریب و سرمایہ دار کی بغاوت آمیز تفریق ہے اسلام کی بین الانسانی محبت کمیونزم کو کہاں نصیب ہے؟ اسلام کی دردمندی عالمی ہے اور کمیونزم کی نظر تفریق پسند ——"

ان کی مشہور نظم "سچی اشتراکیت" ان کے خلوص کی آئینہ دار ہے جس میں ایک خلیفۂ اسلام کی زندگی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ نظم طویل ہے، چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

ضرورت اشتراکی دَور کو ہے ایسے رہبر کی
جو سر پر تاج رکھے مشک بھی کاندھے سے لٹکائے
امیری میں بھی ہو جس کے بدن پر ٹاٹ کا کرتہ
جو خود مزدور بن کر قسمت مزدور چمکائے
امیر فوج و لشکر ہو مگر ہو سادگی ایسی
کہ سر پر ٹوکرا رکھ کر بھی چلنے سے نہ شرمائے
غریبوں کو چھڑائے پنجۂ سرمایہ داری سے
مگر شعلے بغاوت کے قبائل میں نہ بھڑکائے
امیروں اور ناداروں میں نفرت کا نہ بانی ہو
مگر ایسا سبق دے قیصریت ختم ہو جائے
نہ ہو محدود روٹی اور بوٹی تک نظام اس کا
بدن بھی ہو توانا روح بھی سیراب ہو جائے
جو مسکینوں میں بیٹھے تو ادا ہو خاکساری کی
چلے تلوار لے کر تو خدا کا شیر کہلائے
ریاکاری کا دھبہ دور ہو جس کے غسالوں سے
جو مذہب کو فقط دستار و داماں میں نہ الجھائے
شکم پر بھوک سے پتھر بندھے ہوں مستقل فاقے
پکارے در پہ گر سائل تو چادر نذر ہو جائے

چلی آتی ہوں جنگی کی صدائیں باب عالی سے
مگر خاتونِ خانہ قوم کی سلطانہ کہلائے
شفیقؔ اخلاق میں انسانیت کے اتنے جوہر ہوں
تو امتِ رحمۃ اللعالمین کی قوم کہلائے

جن لوگوں کو علامہ اقبال رح کی "حجازیت" میں سعی و عمل کی پستی نظر آتی ہے ۔ وہ شفیقؔ کی "حجازیت" پر بھی اعتراض کریں گے ۔ مگر اس قسم کے اعتراضات کو اسلامی بصیرت کا فقدان ہی کہا جا سکتا ہے ۔

شفیقؔ کہتے ہیں ؎

حجازِ ملت کا خاص مرکز ہے منزل و رنگ زہنیں ہے
تصور اپنا ہے کائناتی وطن بحد سفر نہیں ہے
شفیقؔ اپنی نگاہوں میں ہے دنیا بھر کی پیمائش
مگر جغرافیہ کا راز کعبہ کی نگہبانی
ہمارا مستقل اک مستقر ہو مگر پرواز ماحد نظر ہو
چمن کی قید نہ تخصیص آشیانے کی
مرے حدود میں ہیں وسعتیں زمانے کی
زمین اپنی زمانہ اپنا یہ دو جہاں اپنا مستقر ہو
وطن وطن کی پکار کیوں ہے وطن بھی اک منزل سفر ہو
با فیض ہو تو بحثِ مقام و وطن نہیں
خوشبوئے گل کے واسطے قیدِ چمن نہیں
حدودِ گلستاں ہی تک نظر محدود ہو جس کی
بھلا اس پھول کو پروازِ شبنم کی خبر کیا ہو
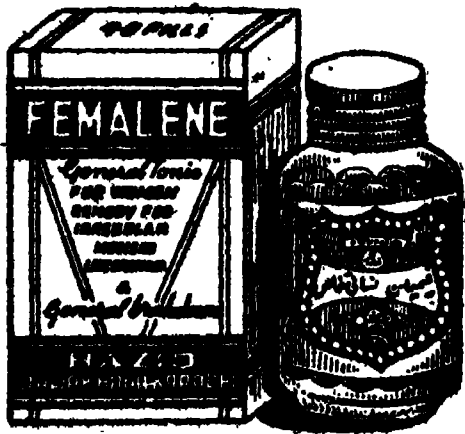
غرض یہ کہ فانوس کا ہر شعر ایک ایسی شمع ہے جس کی روشنی زندگی کے ہر گوشہ پر پڑتی ہے ۔ اسلامی ادب کے مستقبل کو شفیقؔ سے بہت کچھ امیدیں ہیں ۔ فانوس کے شروع میں شفیقؔ کا لکھا ہوا ۴۶ صفحات کا طویل "مقدمہ شعر و ادب" شامل ہے ۔ جو شفیقؔ کو سمجھنے میں کافی مدد دیتا ہے ، فانوس میں کہیں کہیں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جنہیں "شعر جائز" کی حد سے خارج قرار دیا جا سکتا ہے کہیں کہیں قومی ادب کا رنگ بھی نظر آ جاتا ہے لیکن ایسے اشعار کی تعداد بہت ہی کم ہے ۔ (بشکریہ "معیار")

نعیم صدیقی •

لفظ ہونٹوں کے اندر سلے رہ گئے	دل میں احساس کچھ کھولتے رہ گئے
کاروانِ بہاراں تو جا بھی چکا	کتنے غنچے ابھی بن کھلے رہ گئے
ہم نے وہ بات کہہ دی جو تھی ان کہی	کتنے ہی منہ کھلے کے کھلے رہ گئے
زندگی کا مسافر بھٹک بھی گیا	چاند تارے تو بس دیکھتے رہ گئے
جیسے آنسو ہو پلکوں پہ وقتِ وداع	ایسے دہلیز پر وہ کھڑے رہ گئے
آپ کی اس نقابِ ریا کے سبب	شرم سے بارہا ہم گڑے رہ گئے
پہلے خود ہی لٹایا تھا دل کا سکوں	عمر بھر پھر اسے ڈھونڈتے رہ گئے
معرکوں کا بلاوا ہوا تھا، مگر	لوگ سجدوں کے اندر پڑے رہ گئے
عشق ایمان کی بات کہہ کر رہا	اور خنجر فضا میں تنے رہ گئے
آپ کر بھی گئے گل فشانی تو کیا	دل میں کانٹے ہزاروں چبھے رہ گئے
میں نے جب جھوم کر لا الٰہ کہدیا	ان کو دیکھا کر بس بت بنے رہ گئے

دیس بھر میں چراغاں ہوئے بارہا
کیوں دلوں کے دیئے ہی بجھے رہ گئے

(بشکریہ چراغ راہ)

ثریا سلیم

منہ دکھائی

خط پورا کرنے کے بعد ہری ہرناتھ چوپڑہ نے اسے دوبارہ پڑھا پھر اسے چار تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔

ہری ناتھ چوپڑہ، مرکز کے آبادکاری کے محکمے میں ایک کلرک تھا جس کی تنخواہ کا گریڈ تھا ۱۰۰، ۳۰۔ ۴۷، ۳۔ دہلی کے چھ سات لاکھ کلرکوں میں وہ بہترین طبقے کا فرد تھا۔ لودھی کالونی کے نئے فلیٹوں میں سے، ایک میں رہتے ہوئے اسے دو سال ہو گئے تھے۔ اس کی ریلے سائیکل ابھی تک چمکدار تھی۔ گھر کا ریڈیو بھی، جو اس نے قسطوں پر خریدا تھا۔ ابھی تک بغیر کھڑکھڑ کئے، ریڈیو سیلون پکڑ لیتا تھا۔ روز صبح ٹفن کا برتن، کیریئر پر لگا کر، وہ سیکریٹریٹ جاتا اور شام کو خالی برتن کیریئر پر لگائے لودھی کالونی کی طرف چل دیتا۔ اتوار کے دن وہ بیوی کے ساتھ باہر نکلتا اور شام تک گھومتا پھرتا۔ تین سال ہونے اس کی شادی ہوئی تھی۔ جب سے اب تک دونوں میاں بیوی قطب صاحب کی لاٹ سے لے کر، جامع مسجد کے کبابی تک، ہر جگہ ادھر ہر چیز دیکھ چکے تھے، کناٹ سرکس اور کئی جگہوں پہ تو وہ جاتے جاتے اکتا چکے تھے اب ہفتہ کی شام ہی سے ان کو فکر پیدا ہوتی تھی کہ کل کا دن کہاں اور کیسے گذارا جائے، پتھر کی لکیر کی طرح یہ پروگرام ذرا نہ بدلتا۔ اتوار آتا۔ اور یہ لکیر اور گہری ہو جاتی۔

اس نے، پی بلاک سے نکل کر سائیکل اسٹینڈ کی طرف جاتے ہوئے جیب میں رکھے ہوئے خط کو اوپر سے دوبارہ چھوا بے اختیار اس نے، ایک سرد آہ بھرنے کے لئے سانس اندر کھینچی۔ مرطوب گھاس کی ہلکی بو اس کی ناک میں گھسی۔ فوراً اسے جالندھر کا خیال آ گیا اور سرد آہ یونہی رہ گئی۔

تین سال پہلے جب وہ جالندھر میں مقابلے کے امتحان میں پاس ہوا تھا تو فوراً اس کی شادی کی بات پکی کر دی گئی تھی۔ دو ماہ بعد بیوی کو ساتھ لے کر دہلی چلا آیا۔ کیونکہ اس کے سسر نے جہیز میں، ری ہیبلی ٹیشن کے محکمے میں ایک کلرک کی نوکری دلوائی تھی۔ جب سے دہلی اس کا وطن بن کر رہ گئی تھی

اس نئے وطن کو اپنانے کے بعد اسے پہلی بار ان لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا جو دہلی میں رہتے ہوئے بھی، ابھی تک بے وطن تھے۔ جنہیں شرنارتھی کہا جاتا تھا۔ جالندھر میں بھی تقسیم کے بعد بے تحاشہ شرنارتھی آ گئے تھے۔ پورے مشرقی پنجاب کا یہی حال تھا۔ مگر اسے کبھی ان کے اندرونی دکھوں کو جاننے کا موقعہ نہ ملا تھا۔ وہ ان کے کیمپوں اور نئی دکانوں اور نئی بستیوں کو اک ایسے تماشائی کی نظر سے دیکھتا ہوا گذر جاتا، جو سینما کی دیوار پر لگی ہوئی تصویروں سے فلم کی کہانی کا اندازہ کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ لیکن دہلی آ کر اسے پورا فلم دیکھنا پڑا۔ سیکریٹریٹ کے اس محکمہ میں اسے کام ہی ایسا سونپا گیا تھا۔ جیسے وہ سینما ہال کا ٹکٹ چیکر ہو۔ ہر ایک کا ٹکٹ دیکھ کر اسے اندر جانے دینا اس کا کام ہے۔ اور وہ چاہے یا نہ چاہے مگر فلم اسے بار بار دیکھنا ہی پڑتا ہو۔ شرنارتھیوں کو محکمہ آبادکاری کے انتظام سے جو شکایتیں ہوتیں یا ان کو شاہدرے میں جمنا کا پانی گھس آنے سے یا لاجپت رائے مارکٹ سے دوکان ہٹائے جانے سے یا ایک ایک گھنٹہ بعد چلنے والی بسوں سے، جیسی اور جو کچھ بھی تکلیف ہوتی۔ وہ درخواست لکھ کر لاتے اور سب سے پہلی میز پہ ہری ہرناتھ چوپڑہ ان کو دیکھتا۔ واپس کرتا۔ سوالات پوچھ کر بے تکی درخواستوں کو ٹھیک کرتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک صفحہ کی درخواستیں لانے والوں سے سولہ صفحے کے برابر زبانی شکایتیں سنتا۔ یہ حالت تین سال سے تھی۔ اب شام کو دفتر سے جب وقت وہ اٹھتا تو اس کے ہاتھ میں لٹکا ہوا خالی ناشتہ دان جتنا ہلکا ہوتا۔ اس کا دماغ ان شکایتوں کے دفتر سے اتنا ہی بوجھل ہوتا۔

سائیکل اسٹینڈ کے پاس پہنچ کر ہری ہرناتھ چوپڑہ نے اپنی چمکدار سائیکل کے کیریر میں خالی ناشتہ دان لگایا۔ پھر جھک کر پینٹ کا سرا موڑا اور کلپ سے اٹکا دیا۔ اس کے بعد روانہ ہونے سے پہلے وہ کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا کہ پہلے کہاں جائے۔ ہیلا گیندرہ کے دفتر یا سید کے گھر،

تین سال سے ان شکایتوں کا لاوا اس کے ذہن میں کھول رہا تھا
اس نے اس بھرے شہر کے ایک گوشہ میں سکون کی جو دنیا کچھ دن ہوئے
بسائی تھی۔ اسے ابھی پورا آباد ہونے کا موقعہ بھی نہ ملا تھا۔ یہ دنیا ابھی تک
ایک ننھے سے بچے کی رونی آواز اور قلکاریوں کے لئے ترس رہی تھی۔ لیکن
لاوا اُبل اُبل کر بہہ نکلنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ معلوم کب آتش فشاں
ایک دم پھوٹ پڑے۔ بستی خطرے میں تھی۔ ہری ناتھ چوپڑہ کو بہت دن
پہلے ہی اس خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ دفتر میں دوپہر کا، اور گھر میں
رات کا کھانا کھاتا تو اسے ایسا لگتا جیسے چاروں طرف سے بھوکی اور غضبناک
نگاہیں اسے تک رہی ہوں۔" یہ ہے جو ہمارے منہ سے نوالے چھین لیجاتا
ہے۔" وہ اتوار کو صبح سے شام تک بیوی کے ساتھ تفریح کرتا پھرتا۔ لیکن دن
بھر اسے معلوم ہوتا جیسے کچھ لوگ انتقامی ارادے کے ساتھ اس کا پیچھا کر رہے
ہوں۔ یہ جارہا ہے جس نے ہماری خوشیاں لوٹ کر اپنا گھر بسایا ہے۔" اسے
کھانا بے مزہ لگنے لگا۔ اور تفریح بے کار کا کام معلوم ہونے لگی۔ بے چین
ہو کر اس نے دفتر کے ایک بے تکلف ساتھی سے مشورہ کیا۔ پہلے تو اس نے
ہنسی میں ٹال دیا۔ مگر پھر اس کی سنجیدگی دیکھ کر وہ بولا:" اچھا چوپڑہ ایسا
کرو۔ تم کچھ دان کرو۔" اس نے یہ بات بھی بالکل ٹالنے ہی کو کہدی تھی۔ مگر
چوپڑہ کو یہ مشورہ بہت ہی پسند آیا۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسی دوست کے
بتلانے پر، وہ مہیلا کیندر گیا تھا۔ یہ بیرٹ عورتوں کا ایک مرکز تھا جہاں ان
کو سلائی کا کام دلوایا جاتا تھا اور نئی عورتوں کو سلائی کڑھائی سکھائی بھی
جاتی تھی۔ وہاں کے سکریٹری سے مل کر اس نے اپنا ارادہ بتایا۔ سکریٹری نے
یہ مشورہ دیا کہ اگلے مہینے کے شروع میں سلائی کا مقابلہ طے ہوا ہے۔ اگر آپ پسند
کریں تو انعام کے طور پر اس کے لئے کسی چیز کا اعلان کر دیا جائے۔ آپ کا نام
نہ آئے گا۔ سکریٹری نے یہ بات بالکل عام انداز سے کہی تھی۔ تو بھی ہری ناتھ
چوپڑہ کو اس میں بڑی دور اندیشی نظر آئی۔ ایسا بھی اکثر ہوتا ہے۔ اس نے
سکریٹری کا شکریہ ادا کر کے یہ تجویز قبول کر لی پھر کچھ سوچ کر اسے بتایا کہ ایک
بڑھیا بنارسی ساڑی کا انعام ٹھیک رہے گا۔ سکریٹری نے بھی اس بات
کو پسند کیا۔ وہ خوش خوش وہاں سے چلا آیا۔

اس خوشی کا خیال آتے ہی ہری ہر ناتھ چوپڑہ کا سینہ ایک بار پھر
مسرت سے بھر گیا۔ وہ اطمینان سے سائیکل پر بیٹھا اور اسے کرزن روڈ کی
طرف موڑ دیا۔ اس کے پاؤں تیزی سے چل رہے تھے۔ سائیکل اڑی چلی جا رہی
تھی۔ اس دن کی مسرت اس وقت اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔ مگر
جب اسے یہ خیال آیا کہ پہلی کو، تنخواہ والے دن کیا ہوا تھا تو آنکھوں کی چمک
مدھم پڑ گئی۔ چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ اور سائیکل آہستہ ہو کر بالکل رینگنے
لگی۔ وہ ——— دودھ والے اور بنیئے کے لمبے حساب بے باق کر کے
ایک سو چار روپے کی، بنارسی ملیشو کی ایک بہت عمدہ ساری خرید لایا تھا
مگر سائیکل کاندھے پر لٹکا کر جب وہ فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا تو
اسے خیال آیا کہ وہ اس ساری کو رکھے گا کہاں۔ آخری سیڑھی تک، ایسے
ہی پریشانی کے عالم میں وہ چڑھتا چلا گیا۔ فلیٹ کے دروازے پر سائیکل
رکھنے کی آواز سن کر اس کی بیوی نے دروازہ کھولا۔ اسے دیکھ کر مارے اضطراب
کے۔ اس سے سائیکل میں تالا بھی نہ لگ سکا اسکی بیوی کی نظر اس کے
منہ کے بجائے بغل میں دبے ہوئے ڈبے کی طرف گئی۔ اور اس کا چہرہ کھل
اٹھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر ہر مہینے اس کے لئے کوئی نہ کوئی چیز لاتا
ہے۔ تنخواہ اتنی زیادہ تو نہ تھی کہ وہ اسے تحفوں سے لاد دیتا جیسا ہر عورت
چاہتی ہے۔ لیکن وہ نئے قسم کے جرمنی ہار ذن بندوں۔ پلاسٹک اور مخمل
کے پرسوں۔ اور نئی وضع کے سینڈلوں کو بھی غنیمت سمجھتی تھی۔ دو ایک بار سولو
کا کپڑا اور تین چار ساڑھیاں بھی اب تک آ چکی تھیں جن میں سے کئی کی
اس نے خود فرمائش کی تھی۔ لیکن سال بھر سے وہ کوئی بڑی چیز اس کے
لئے بغیر فرمائش کے نہیں لایا تھا۔ آج کئی دن سے وہ اپنے میکے کے آرام یاد
کر کے کچھ افسردہ رہتی تھی۔ شادی کے بعد کی زندگی کے لئے وہ اس سے بھی اونچے
خواب دیکھا کرتی تھی۔ دہلی آ جانے کے بعد اتنے عرصہ میں اس کے کچھ خواب پورے
تو ہوئے مگر سب نہیں۔ اور اس طرح بھی نہیں جیسے وہ چاہتی تھی اسے معلوم
تھا کہ شوہر سے اس کی یہ حالت چھپی نہیں ہے۔ اسی لئے کاغذ کا ڈبہ اس
کے پاس دیکھ کر وہ مسکرا دی تھی۔ نظر اٹھا کر اس نے شوہر کو دیکھا۔ چوپڑہ
نے اس کی آنکھوں کی بات آنکھوں سے پڑھ لی۔ وہ ایسے مسکرایا جیسے کوئی
نادانی میں اپنے ہاتھ گوندھ کے برتن میں ——— ڈال دے اور پھر گوندا اس
سے چھڑائے نہ چھٹے۔ اس کی مسکراہٹ میں پریشانی بھی تھی اور پچھتاوا بھی
مگر اس کی بیوی یہ سب نہ دیکھ سکی۔ اس نے بڑے پیار سے دروازے
کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ اور جب وہ اندر آ گیا تو کوٹ اس کے ہاتھ سے لیکر

ثریا سلیم ●

منہ دکھائی

خط پورا کرنے کے بعد ہری ہرناتھ چوپڑہ نے اسے دوبارہ پڑھا پھر اسے چار تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔

ہری ناتھ چوپڑہ، مرکز کے آبادکاری کے محکمے میں ایک کلرک تھا جس کی تنخواہ کا گریڈ تھا ۱۰۰، ۱۳۰، ۱۷۰۔ دہلی کے چھ سات لاکھ کلرکوں میں وہ بہترین طبقے کا فرد تھا۔ لودھی کالونی کے نئے فلیٹوں میں سے ایک میں رہتے ہوئے اسے دو سال ہو گئے تھے۔ اس کی ریلے سائیکل ابھی تک چمکدار تھی۔ گھر کا ریڈیو بھی، جو اس نے قسطوں پر خریدا تھا۔ ابھی تک بغیر کھڑکھڑ کئے، ریڈیو سیلون پکڑ لیتا تھا۔ روز صبح ٹفن کا برتن، کیریئر پر لگا کر، وہ سیکریٹریٹ جاتا اور شام کو خالی برتن کیریئر پر لگائے لودھی کالونی کی طرف چلا جاتا۔ اتوار کے دن وہ بیوی کے ساتھ باہر نکلتا اور شام تک گھومتا۔ پھرتا تین سال ہونے اس کی شادی ہوئی تھی۔ جب سے اب تک دونوں میاں بیوی قطب صاحب کی لاٹ سے لے کر، جامع مسجد کے کبابی تک، ہر جگہ اور ہر چیز دیکھ چکے تھے، کناٹ سرکس اور کئی جگہوں پہ تو وہ جاتے جاتے اکتا چکے تھے اب ہفتہ کی شام ہی سے ان کو فکر پیدا ہوتی تھی کہ کل کا دن کہاں اور کیسے گذارا جائے، پتھر کی لکیر کی طرح یہ پروگرام ذرا نہ بدلتا۔ اتوار آتا۔ اور یہ لکیر اور گہری ہو جاتی۔

اس نے، پی بلاک سے نکل کر سائیکل سٹینڈ کی طرف جاتے ہوئے جیب میں رکھے ہوئے خط کو اوپر سے دوبارہ چھوا بے اختیار اس نے، ایک سرد آہ بھرنے کے لئے سانس اندر کھینچا۔ مرطوب گھاس کی ہلکی بو اس کی ناک میں گھسی۔ تھا اسے جالندھر کا خیال آ گیا اور سرد آہ یونہی رہ گئی۔

تین سال پہلے جب وہ جالندھر میں مقابلے کے امتحان میں پاس ہوا تھا تو فوراً اس کی شادی کی بات پکی کر دی گئی تھی۔ دو ماہ بعد بیوی کو رخصت لے کر دہلی چلا آیا۔ کیونکہ اس کے سُسر نے جہیز میں، ری ہیبلی ٹیشن کے محکمے میں ایک کلرک کی نوکری دلوائی تھی۔ جب سے دہلی اس کا وطن بن کر رہ گئی تھی

اس نئے وطن کو اپنانے کے بعد اسے پہلی بار ان لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا جو دہلی میں رہتے ہوئے بھی، ابھی تک بے وطن تھے۔ جنہیں شرنارتھی کہا جاتا تھا۔ جالندھر میں بھی تقسیم کے بعد سے بے تحاشہ شرنارتھی آ گئے تھے۔ پورے مشرقی پنجاب کا یہی حال تھا۔ مگر اسے کبھی ان کے اندرونی دکھوں کو جاننے کا موقعہ نہ ملا تھا۔ وہ ان کے کیمپوں اور نئی دکانوں اور بستیوں کو اک ایسے تماشائی کی نظر سے دیکھتا ہوا گذر جاتا۔ جو سینما کی دیوار پر لگی ہوئی تصویروں سے فلم کی کہانی کا اندازہ کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ لیکن دہلی آ کر اسے پورا فلم دیکھنا پڑا۔ سیکریٹریٹ کے اس محکمہ میں اسے کام ہی ایسا سونپا گیا تھا۔ جیسے وہ سینما ہال کا ٹکٹ چیکر ہو۔ ہر ایک کا ٹکٹ دیکھ کر اسے اندر جانے دینا اس کا کام ہے اور وہ چاہے یا نہ چاہے مگر فلم اسے بار بار دیکھنا ہی پڑتا ہو۔ شرنارتھیوں کو محکمۂ آبادکاری کے انتظام سے جو شکایتیں ہوتیں یا ان کو شاہدرے میں جمنا کا پانی گھس آنے سے یا لاجپت رائے مارکیٹ سے دکان ہٹائے جانے سے یا ایک ایک گھنٹہ بعد چلنے والی بسوں سے، جیسی اور جو کچھ بھی تکلیف ہوتی۔ وہ درخواست لکھ کر لاتے اور سب سے پہلی میز پر ہری ہرناتھ چوپڑہ ان کو دیکھتا۔ واپس کرتا۔ سوالات پوچھ کر بے تکی درخواستوں کو ٹھیک کرتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک صفحے کی درخواستیں لانے والوں سے سولہ صفحے کے برابر زبانی شکایتیں سنتا۔ یہ حالت تین سال سے تھی۔ اب شام کو دفتر سے جس وقت وہ اٹھتا تو اس کے ہاتھ میں لٹکا ہوا خالی ناشتہ دان جتنا ہلکا ہوتا۔ اس کا دماغ ان شکایتوں کے دفتر سے اتنا ہی بوجھل ہوتا۔

سائیکل سٹینڈ کے پاس پہنچ کر ہری ہرناتھ چوپڑہ نے اپنی چمکدار سائیکل کے کیریئر میں خالی ناشتہ دان لگایا۔ پھر جھک کر پینٹ کا سرا موڑا اور کلپ سے اٹکا دیا۔ اس کے بعد روانہ ہونے سے پہلے وہ کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا کہ پہلے کہاں جائے۔ ہیلا کینڈ کے دفتر، یا سیدھے گھر،

تین سال سے ان شکایتوں کا لاوا اس کے ذہن میں کھول رہا تھا اس نے اس بھرے شہر کے ایک گوشہ میں سکون کی جو دنیا کچھ دن ہوئے بسائی تھی۔ اسے ابھی پورا آباد ہونے کا موقعہ بھی نہ ملا تھا۔ یہ دنیا ابھی تک ایک ننھے سے بچے کی ردنی آواز اور کلکاریوں کے لئے ترس رہی تھی۔ لیکن لاوا ابل ابل کر بہہ نکلنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ معلوم کب آتش فشاں ایک دم پھوٹ پڑے۔ بستی خطرے میں تھی۔ ہری ناتھ چوپڑہ کو بہت دن پہلے ہی اس خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ دفتر میں دوپہر کا، اور گھر میں رات کا کھانا کھاتا تو اسے ایسا لگتا جیسے چاروں طرف سے بھوکی اور غضبناک نگاہیں اسے تک رہی ہوں۔ "یہ ہے جو ہمارے منہ سے نوالے چھین لیجاتا ہے۔" وہ اتوار کو صبح سے شام تک بیوی کے ساتھ تفریح کرتا پھرتا لیکن دن بھر اسے معلوم ہوتا جیسے کچھ لوگ انتقامی ارادے کے ساتھ اس کا پیچھا کر رہے ہوں "یہ جا رہا ہے جس نے ہماری خوشیاں لوٹ کر اپنا گھر بسایا ہے"۔ اسے کھانا بے مزہ لگنے لگا۔ اور تفریح بے کار کا کام معلوم ہونے لگی۔ بے چین ہو کر اس نے دفتر کے ایک بے تکلف ساتھی سے مشورہ کیا۔ پہلے تو اس نے ہنسی میں ٹال دیا۔ مگر پھر اس کی سنجیدگی دیکھ کر وہ بولا: "اچھا چوپڑہ ایسا کرو۔ تم کچھ دان کرو۔" اس نے یہ بات بھی بالکل ٹالنے ہی کو کہدی تھی۔ مگر چوپڑہ کو یہ مشورہ بہت ہی پسند آیا۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسی دوست کے بتلانے پر، وہ جھیلا کیندر گیا تھا۔ یہ بیزت عورتوں کا ایک مرکز تھا جہاں ان کو سلائی کا کام دلوایا جاتا تھا اور نئی عورتوں کو سلائی کڑھائی سکھائی بھی جاتی تھی۔ وہاں کے سکریٹری سے مل کر اس نے اپنا ارادہ بتایا۔ سکریٹری نے یہ مشورہ دیا کہ اگلے مہینے کے شروع میں سلائی کا مقابلہ طے ہوا ہے اگر آپ پسند کریں تو انعام کے طور پر اس کے لئے کسی چیز کا اعلان کر دیا جائے۔ آپ کا نام نہ آئے گا۔ سکریٹری نے یہ بات بالکل عام انداز سے کہی تھی۔ تو بھی ہری ناتھ چوپڑہ کو اس میں بڑی دور اندیشی نظر آئی۔ ایسا بھی اکثر ہوتا ہے۔ اس نے سکریٹری کا شکریہ ادا کر کے یہ تجویز قبول کر لی پھر کچھ سوچ کر اسے بتایا کہ ایک بڑھیا بنارسی ساڑی کا انعام ٹھیک رہے گا۔ سکریٹری نے بھی اس بات کو پسند کیا۔ وہ خوش خوش وہاں سے چلا آیا۔

اس خوشی کا خیال آتے ہی ہری ناتھ چوپڑہ کا سینہ ایک بار پھر مسرت سے بھر گیا۔ وہ اطمینان سے سائیکل پر بیٹھا اور اسے کرزن روڈ کی طرف موڑ دیا۔ اس کے پاؤں تیزی سے چل رہے تھے۔ سائیکل اڑی چلی جا رہی تھی۔ اس دن کی مسرت اس وقت اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔ مگر جب اسے یہ خیال آیا کہ پہلی کو، تنخواہ والے دن کیا ہوا تھا تو آنکھوں کی چمک مدھم پڑ گئی۔ چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ اور سائیکل آہستہ ہو کر بالکل رینگنے لگی۔ وہ ———— دودھ والے اور بنیئے کے لیے حساب بے باق کر کے ایک سو چار روپے کی، بنارسی ٹیشو کی ایک بہت عمدہ ساڑی خرید لایا تھا مگر سائیکل کاندھے پر لٹکا کر جب وہ فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا تو اسے خیال آیا کہ وہ اس ساڑی کو رکھے گا کہاں۔ آخری سیڑھی تک، ایسے ہی پریشانی کے عالم میں وہ چڑھتا چلا گیا۔ فلیٹ کے دروازے پر سائیکل رکھنے کی آواز سن کر اس کی بیوی نے دروازہ کھولا۔ اسے دیکھ کر مارے اضطراب کے، اس سے سائیکل میں تالا بھی نہ لگ سکا اسکی بیوی کی نظر اس کے منہ کے بجائے بغل میں دبے ہوئے ڈبے کی طرف گئی۔ اور اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر ہر مہینے اس کے لئے کوئی نہ کوئی چیز لاتا ہے۔ تنخواہ اتنی زیادہ تو نہ تھی کہ وہ اسے تحفوں سے لاد دیتا جیسا ہر عورت چاہتی ہے۔ لیکن وہ نئے قسم کے جرمنی ہارون بندوں۔ پلاسٹک اور مخمل کے پرسوں۔ اور نئی وضع کے سینڈلوں کو بھی غنیمت سمجھتی تھی۔ وہ ایک بار سولر کا کپڑا اور تین چار ساڑھیاں بھی اب تک آ چکی تھیں جن میں سے کئی کی اس نے خود فرمائش کی تھی۔ لیکن سال بھر سے وہ کوئی بڑی چیز اس کے لئے بغیر فرمائش کے نہیں لایا تھا۔ آج کئی دن سے وہ اپنے میکے کے آرام یاد کر کے کچھ افسردہ بھی تھی۔ شادی کے بعد کی زندگی کے لئے وہ اس سے بھی اونچے خواب دیکھا کرتی تھی۔ دہلی آ جانے کے بعد اتنے عرصہ میں اس کے کچھ خواب پورے تو ہوئے مگر سب نہیں۔ اور اس طرح بھی نہیں جیسے وہ چاہتی تھی اسے معلوم تھا کہ شوہر سے اس کی یہ حالت چھپی نہیں ہے۔ اسی لئے کاغذ کا ڈبہ اس کے پاس دیکھ کر وہ مسکرا دی تھی۔ نظر اٹھا کر اس نے شوہر کو دیکھا۔ چوپڑہ نے اس کی آنکھوں کی بات آنکھوں سے پڑھ لی۔ وہ ایسے مسکرایا جیسے کوئی نادانی میں اپنے ہاتھ گوند کے برتن میں ———— ڈال دے اور پھر گوند اس سے چھڑائے نہ چھٹے۔ اس کی مسکراہٹ میں پریشانی بھی تھی اور پچھتاوا بھی مگر اس کی بیوی یہ سب نہ دیکھ سکی۔ اس نے بڑے پیار سے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ اور جب وہ اندر آ گیا تو کوٹ اس کے ہاتھ سے لیکر

ثریا سلیم

منہ دکھائی

خط پورا کرنے کے بعد ہری ہرناتھ چوپڑہ نے اسے دوبارہ پڑھا پھر اسے چار تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔

ہری ناتھ چوپڑہ، مرکز کے آبادکاری کے محکمے میں ایک کلرک تھا جس کی تنخواہ کا گریڈ تھا ۵۵-۱۳۰-۷-۳۰۔ دہلی کے چھ سات لاکھ کلرکوں میں وہ بہترین طبقہ کا فرد تھا۔ لودھی کالونی کے نئے فلیٹوں میں سے ایک میں رہتے ہوئے اسے دو سال ہو گئے تھے۔ اس کی ریلے سائیکل ابھی تک چمکدار تھی۔ گھر کا ریڈیو بھی، جو اس نے قسطوں پر خریدا تھا۔ ابھی تک بغیر کھڑکھڑ کئے، ریڈیو سیلون پکڑ لیتا تھا۔ روز صبح ٹفن کا برتن، کیریئر پر لگا کر، وہ سیکریٹریٹ جاتا اور شام کو خالی برتن کیریئر پر لگائے لودھی کالونی کی طرف چل دیتا۔ اتوار کے دن وہ بیوی کے ساتھ باہر نکلتا اور شام تک گھومتا۔ پھرتا تین سال ہونے اس کی شادی ہوئی تھی۔ جب سے اب تک دونوں میاں بیوی قطب صاحب کی لاٹ سے لے کر، جامع مسجد کے کبابی تک، ہر جگہ اور ہر چیز دیکھ چکے تھے، کناٹ سرکس اور کئی جگہوں پہ تو وہ جاتے جاتے اکتا چکے تھے اب ہفتہ کی شام ہی سے ان کو فکر پیدا ہوتی تھی کہ کل کا دن کہاں اور کیسے گذارا جائے، پتھر کی لکیر کی طرح یہ پروگرام ذرا نہ بدلتا۔ اتوار آتا۔ اور یہ لکیر اور گہری ہو جاتی۔

اس نے، پی بلاک سے نکل کر سائیکل اسٹینڈ کی طرف جاتے ہوئے جیب میں رکھے ہوئے خط کو اوپر سے دوبارہ چھوا بے اختیار اس نے، ایک سرد آہ بھرنے کے لئے سانس اندر کھینچا۔ مرطوب گھاس کی ہلکی بو اس کی ناک میں گھسی۔ فوراً اسے جالندھر کا خیال آگیا اور سرد آہ یونہی رہ گئی۔

تین سال پہلے جب وہ جالندھر میں مقابلے کے امتحان میں پاس ہوا تھا تو فوراً اس کی شادی کی بات پکی کر دی گئی تھی۔ دو ماہ بعد بیوی کو ساتھ لے کر دہلی چلا آیا۔ کیونکہ اس کے سسر نے جہیز میں، ری ہیبلی ٹیشن کے محکمے میں ایک کلرک کی نوکری دلوائی تھی۔ جب سے دہلی اس کا وطن بن کر رہ گئی تھی

اس نئے وطن کو اپنانے کے بعد اسے پہلی بار ان لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جو دہلی میں رہتے ہوئے بھی، ابھی تک بے وطن تھے۔ جنھیں شرنارتھی کہا جاتا تھا۔ جالندھر میں بھی تقسیم کے بعد سے بے تحاشہ شرنارتھی آگئے تھے۔ پورے مشرقی پنجاب کا یہی حال تھا۔ مگر اسے کبھی ان کے اندرونی دکھوں کو جاننے کا موقع نہ ملا تھا۔ وہ ان کے کیمپوں اور نئی دکانوں اور بستیوں کو اک ایسے تماشائی کی نظر سے دیکھتا ہوا گذر جاتا۔ جو سینما کی دیوار پر لگی ہوئی تصویروں سے فلم کی کہانی کا اندازہ کر کے مطمئن ہو جاتے۔ لیکن دہلی آکر اسے پورا فلم دیکھنا پڑا۔ سیکریٹریٹ کے اس محکمہ میں اسے کام ہی ایسا سونپا گیا تھا۔ جیسے وہ سینما ہال کا ٹکٹ چیکر ہو۔ ہر ایک کا ٹکٹ دیکھ کر اسے اندر جانے دینا اس کا کام ہو اور وہ چاہے یا نہ چاہے مگر فلم اسے بار بار دیکھنا ہی پڑتا ہو۔ شرنارتھیوں کو محکمہ آبادکاری کے انتظام سے جو شکایتیں ہوتیں یا ان کو شاہدرے میں جمنا کا پانی گھس آنے سے یا لاجپت رائے مارکٹ سے دوکان ہٹائے جانے سے یا ایک ایک گھنٹہ بعد چلنے والی بسوں سے، جیسی اور جو کچھ بھی تکلیف ہوتی۔ وہ درخواست لکھ کر لاتے اور سب سے پہلی میز پر ہری ہرناتھ چوپڑہ ان کو دیکھتا۔ واپس کرتا۔ سوالات پوچھ کر بے تکی درخواستوں کو ٹھیک کرتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک صفحے کی درخواستیں لانیوالوں سے سولہ صفحے کے برابر زبانی شکایتیں سنتا۔ یہ حالت تین سال سے تھی۔ اب شام کو دفتر سے جس وقت وہ اٹھتا تو اس کے ہاتھ میں لٹکا ہوا خالی ناشتہ دان جتنا ہلکا ہوتا۔ اس کا دماغ ان شکایتوں کے دفتر سے اتنا ہی بوجھل ہوتا۔

سائیکل اسٹینڈ کے پاس پہنچ کر ہری ہرناتھ چوپڑہ نے اپنی چمکدار سائیکل کے کیریئر میں خالی ناشتہ دان لگایا۔ پھر جھک کر پینٹ کا سرا موڑا اور کلپ سے اٹکا دیا۔ اس کے بعد روانہ ہونے سے پہلے وہ کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا کہ پہلے کہاں جائے۔ ہیلا گینڈ کے دفتر، یا سیدھے گھر،

تین سال سے ان شکایتوں کا لاوا اس کے ذہن میں کھول رہا تھا اس نے اس بھرے شہر کے ایک گوشہ میں سکون کی جو دنیا کچھ دن ہوئے بسائی تھی۔ اسے ابھی پورا آباد ہونے کا موقعہ بھی نہ ملا تھا۔ یہ دنیا ابھی تک ایک ننھے سے بچے کی ردنی آواز اور کلکاریوں کے لئے ترس رہی تھی۔ لیکن لاوا اُبل اُبل کر بہہ نکلنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ معلوم کب آتش فشاں ایک دم پھوٹ پڑے۔ بستی خطرے میں تھی۔ ہری ناتھ چوپڑہ کو بہت دن پہلے ہی اس خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ دفتر میں دوپہر کا، اور گھر میں رات کا کھانا کھاتا تو اسے ایسا لگتا جیسے چاروں طرف سے بھوکی اور غضبناک نگاہیں اسے تک رہی ہوں۔ "یہ ہے جو ہمارے منہ سے نوالے چھین لیجاتا ہے۔" وہ اتوار کو صبح سے شام تک بیوی کے ساتھ تفریح کرتا پھرتا۔ لیکن دن بھر اسے معلوم ہوتا جیسے کچھ لوگ انتقامی ارادے کے ساتھ اس کا پیچھا کر رہے ہوں۔ "یہ جا رہا ہے جس نے ہماری خوشیاں لوٹ کر اپنا گھر بسایا ہے۔" اسے کھانا بے مزہ لگنے لگا۔ اور تفریح بے کار کا کام معلوم ہونے لگی۔ بے چین ہو کر اس نے دفتر کے ایک بے تکلف ساتھی سے مشورہ کیا۔ پہلے تو اس نے ہنسی میں ٹال دیا۔ مگر پھر اس کی سنجیدگی دیکھ کر وہ بولا: "اچھا چوپڑہ ایسا کرو۔ تم کچھ دان کرو۔" اس نے یہ بات بھی بالکل ٹالنے ہی کو کہدی تھی۔ مگر چوپڑہ کو یہ مشورہ بہت ہی پسند آیا۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسی دوست کے بتلانے پر، وہ مہیلا کیندر گیا تھا۔ یہ پیڑت عورتوں کا ایک مرکز تھا جہاں ان کو سلائی کا کام دلوایا جاتا تھا اور نئی عورتوں کو سلائی کڑھائی سکھائی بھی جاتی تھی۔ وہاں کے سکریٹری سے مل کر اس نے اپنا ارادہ بتایا۔ سکریٹری نے یہ مشورہ دیا کہ اگلے مہینے کے شروع میں سلائی کا مقابلہ طے ہوا ہے اگر آپ پسند کریں تو انعام کے طور پر اس کے لئے کسی چیز کا اعلان کر دیا جائے۔ آپ کا نام نہ آئے گا۔ سکریٹری نے یہ بات بالکل عام انداز سے کہی تھی۔ تو بھی ہری ناتھ چوپڑہ کو اس میں بڑی دور اندیشی نظر آئی۔ ایسا بھی اکثر ہوتا ہے۔ اس نے سکریٹری کا شکریہ ادا کر کے یہ تجویز قبول کر لی پھر کچھ سوچ کر اسے بتایا کہ ایک بڑھیا بنارسی ساڑی کا انعام ٹھیک رہے گا۔ سکریٹری نے بھی اس بات کو پسند کیا۔ وہ خوش خوش وہاں سے چلا آیا۔

اس خوشی کا خیال آتے ہی ہری ہر ناتھ چوپڑہ کا سینہ ایک بار پھر مسرت سے بھر گیا۔ وہ اطمینان سے سائیکل پر بیٹھا اور اسے گھر کی طرف موڑ دیا۔ اس کے پاؤں تیزی سے چل رہے تھے۔ سائیکل اڑی چلی جا رہی تھی۔ اس دن کی مسرت اس وقت اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔ مگر جب اسے یہ خیال آیا کہ پہلی کو، تنخواہ والے دن کیا ہوا تھا تو آنکھوں کی چمک مدھم پڑ گئی۔ چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ اور سائیکل آہستہ ہو کر بالکل رینگنے لگی۔ وہ ——— دودھ والے اور بنئے کے لیے حساب بے باق کر کے ایک سو چار روپے کی، بنارسی ٹشو کی ایک بہت عمدہ ساری خرید لایا تھا مگر سائیکل کاندھے پر لٹکا کر جب وہ فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا تو اسے خیال آیا کہ وہ اس ساری کو رکھے گا کہاں۔ آخری سیڑھی تک، ایسے ہی پریشانی کے عالم میں وہ چڑھتا چلا گیا۔ فلیٹ کے دروازے پر سائیکل رکھنے کی آواز سن کر اس کی بیوی نے دروازہ کھولا۔ اسے دیکھ کر مارے اضطراب کے۔ اس سے سائیکل میں تالا بھی نہ لگ سکا اس کی بیوی کی نظر اس کے منہ کے بجائے بغل میں دبے ہوئے ڈبے کی طرف گئی۔ اور اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر ہر مہینے اس کے لئے کوئی نہ کوئی چیز لاتا ہے۔ تنخواہ اتنی زیادہ تو نہ تھی کہ وہ اسے تحفوں سے لاد دیتا جیسا ہر عورت چاہتی ہے۔ لیکن وہ نئے قسم کے جرمنی ہار، دن بندوں۔ پلاسٹک اور مخمل کے پرسوں۔ اور نئی وضع کے سینڈلوں کو بھی غنیمت سمجھتی تھی۔ دو ایک بار سوتی کا کپڑا اور تین چار ساڑھیاں بھی اب تک آ چکی تھیں جن میں سے کئی کی اس نے خود فرمائش کی تھی۔ لیکن سال بھر سے وہ کوئی بڑی چیز اس کے لئے بغیر فرمائش کے نہیں لایا تھا۔ آج کئی دن سے وہ اپنے میکے کے آرام یاد کر کے کچھ افسردہ بھی تھی۔ شادی کے بعد کی زندگی کے لئے وہ اس سے بھی اونچے خواب دیکھا کرتی تھی۔ دہلی آجانے کے بعد اتنے عرصہ میں اس کے کچھ خواب پورے تو ہوئے مگر سب نہیں۔ اور اس طرح بھی نہیں جیسے وہ چاہتی تھی اسے معلوم تھا کہ شوہر سے اس کی یہ حالت چھپی نہیں ہے۔ اسی لئے کاغذ کا ڈبہ اس کے پاس دیکھ کر وہ مسکرا دی تھی۔ نظر اٹھا کر اس نے شوہر کو دیکھا۔ چوپڑہ نے اس کی آنکھوں کی بات آنکھوں سے پڑھ لی۔ وہ ایسے مسکرایا جیسے کوئی نادانی میں اپنے ہاتھ گوند کے برتن میں ——— ڈال دے اور پھر گوند اس سے چھڑائے نہ چھٹے۔ اس کی مسکراہٹ میں پریشانی بھی تھی اور پچھتاوا بھی مگر اس کی بیوی یہ سب نہ دیکھ سکی۔ اس نے بڑے پیار سے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ اور جب وہ اندر آگیا تو کوٹ اس کے ہاتھ سے لیکر

کھونٹی پر لٹکا دیا۔ مڑتے ہوئے اس کی نگاہ میز پر رکھے ہوئے ڈبے کی طرف گئی پھر شوہر کی طرف اٹھی۔ نگاہیں چار ہوتے ہی وہ مسکرا دی۔ کھڑی ہو کر اس سے کچھ باتیں کیں اور چائے بنانے، کچن کی طرف چلی گئی۔ وہ کھڑکی کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اسے افسوس ہوا کہ وہ سیدھا، پہلے جاکر ساڑی ہیلا کینڈر ہی میں کیوں نہ دے آیا۔ اب وہ کیا کہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ جھوٹ بولنے کی اسے عادت نہ تھی۔ سچی بات بتانا، اس کام میں، اسے بالکل پسند نہ تھا۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے وہ بھوکوں کو کھانا کھلانے کی خبر اخبار میں چھاپ دی جائے کہ شریمان ہری ہر ناتھ چوپڑہ نے آج جنتا کی سیوا کے لئے اپنا پیٹ کاٹ کر دو بھوکے اناتھوں کو بھوجن کرایا۔ اور یوں اپنی پتنی کا من ہر لیا۔ اسے اس خیال سے ہی وحشت ہونے لگی۔ پھر آخر وہ کیا کرے۔ گول مول بات کرنے سے اسے خطرہ تھا کہ بیوی کو کوئی شک نہ ہو جائے۔ عورت کی ذات ہی شکی ہے۔ ایک بار بات بگڑ گئی تو لاکھ جتن کرنے پر بھی کچھ نہ بنے گا۔ بیوی چائے لے آئی وہ چائے پیتے ہوئے بھی یہی کچھ سوچتا رہا۔ بیوی نے پیکٹ کھول کر ساڑی کو دیکھا۔ ہاتھ پر پھیلا کر اس کی چمک کا اندازہ لگایا۔ اور شرمیلے انداز میں اس کی پسند کی داد دی۔ اسے اتنا خوش دیکھ کر ایک بار ہری ہر ناتھ چوپڑہ کے دل میں یہ خیال آیا۔ چلو یونہی سہی ابھی چالیس روپے تو ہیں۔ کم داموں والی کوئی ساڑی ادھر کے لئے لا دو۔ مگر اسے فوراً ہی پشیمانی ہوئی۔ چھی چھی۔ کیسی گندی بات ہے۔ یہ تو پہلے ہی دان ہو چکی اب کیا دان ہوئی چیز بیوی کو پہناؤ گے ــــــــ اس نے بچے ہوئے بیالیس روپوں میں سے پینتیس اُسے دیدیے اور سات خود رکھ لئے تاکہ ایسی بات پھر خیال میں آئے بھی تو وہ کچھ کر نہ سکے ــــــــ بس جب سے آج کے دن تک وہ برابر یہی سوچ کر پریشان تھا کہ کیا کرے۔

کرزن روڈ کے موڑ پر سائیکل گھماتے ہوئے ہری ہر ناتھ کو خیال آیا مگر ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں اس بات کو۔ پہلی کو یہ بات ہوئی تھی اور آج چار ہے یعنی بالکل نرسوں ہی تو یہ سب کچھ ہوا ہے۔ یہ خیال اسے صبح بھی آیا تھا۔ اور ساتھ ہی اس الجھن کو ٹھیک کرنے کا ایک طریقہ بھی۔ اس نے بیوی کو ایک خط لکھا جس میں یہ بتا دیا کہ ساڑھی وہ اس کے لئے نہیں لایا تھا۔ پھر کس کام کے لئے لایا تھا۔ یہ تو اس نے نہیں لکھا۔ البتہ اسے اطمینان دلایا تھا کہ میں بھگوان کو ساکشی کر کے کہتا ہوں کہ کسی برائی کے لئے نہیں لایا۔ اگر تم کو میرے اوپر وشواس ہے تو میری خاطر یہ ساڑھی مجھے لوٹا دو۔ پھر تب بھی موقعہ ہوگا میں تمہیں ایسی ہی ساڑھی اور لا دوں گا۔ خط لکھ کر اس نے دوبارہ پڑھا۔ پھر چار تہہ کر کے جیب میں اس ارادے کے ساتھ رکھ لیا تھا کہ گھر جاکر بیوی کو دیتے ہی وہ کچھ دیر کے لئے کہیں چلا جائیگا۔ ابھی اس وقت وہ ہیلا کینڈر میں سکریٹری سے ملنے جا رہا تھا۔ ان سے کل ہی ملنا طے تھا۔ مگر وہ اس پریشانی میں ادھر بھی نہیں گیا

کینڈر کے دفتر پہنچکر وہ اندر گیا۔ سکریٹری اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دل میں اس نوجوان کی بڑی عزت تھی جو آج کی خود غرض دنیا میں بھی دوسروں کے دکھ کا خیال کرتا ہے۔ ہاتھ ملانے کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کل نہ آنے کی معذرت کی۔ پھر کچھ رک گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیا کہے۔ اور کیسے کہے۔ آخر کچھ تامل کے ساتھ وہ بولا۔ "کیا سات ہی تاریخ کو جلسہ ہے؟" سکریٹری نے ہاں میں سر ہلایا۔ "بات یہ ہے کل میں اس لئے نہیں آسکا کہ کچھ پریشانی تھی۔ اس مہینے کچھ ایسی بات ہے کہ میں اب تک" سکریٹری شفقت کے لہجہ میں بات کاٹ کر بولا۔ "کوئی بات نہیں میں سمجھ گیا۔ شاید اس مہینے کچھ مشکل آگئی۔ یہ تو چلتا ہی ہے۔ آپ چنتا نہ کریں"۔ وہ بولا "مگر سکریٹری صاحب انعام کا اعلان تو آپ نے کر دیا ہے"۔ سکریٹری نے مسکرا کر کہا "اس کی بھی چنتا نہ کیجئے۔ اس بار ایک اور سیٹھ صاحب نے بھی انعام کے لئے کہا تھا۔ دھنپت رائے نام ہے ان کا۔ فیض بازار میں سائیکل کی ہول سیل دوکان ہے چاولہ برادرس۔ اگر آپ کا خیال اگلی بار ہو تو میں ان سے کہدوں۔ وہ ــــــــ" اتنا کہہ کر سکریٹری کچھ رکا۔ "ان کی اچھا ہے کہ ان کا نام جلسے میں لیا جائے اور اخبار میں بھی آئے۔ ویسے مجھے خود ان کی بات ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ اسی لئے میں نے ان سے صاف بات نہیں کی تھی۔ لیکن اگر آپ خود اگیا دیں تو میں ان سے کہوں"۔ وہ کچھ رکا جیسے یہ بات کہتے ہوئے اسے دکھ ہو رہا ہو۔

ہری ہر ناتھ چوپڑہ چپکا بیٹھا رہا۔ پھر اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے آج تو ان سے بات نہ کیجئے لیکن کل تو مجھے تک میں نہ آیا تو سمجھ لیجئے کہ اس بار پرماتما کی مرضی نہیں ہے۔ پھر آپ ان سے بات کر لیجئے گا میں کسی اور دن اگر وہ مرے جلسے کی بات کروں گا۔"

نمسکار کہہ کر جب وہ باہر آیا تو اس نے جیب ٹٹول کر خط نکالا۔ اس کے ساتھ ہی پانچ کا نوٹ بھی نکل آیا۔ اس کے پاس یہی کچھ باقی تھا۔ خط کھول کر اس نے تیسری بار پڑھا۔ اور سائیکل پر بیٹھ کر لودھی کالونی کی۔

طــرف ہولیا۔

نمعلوم کن خیالوں میں گم وہ سڑکیں اور چوراہے پار کرتا رہا۔ لودھی مقبرے کے پاس سے بڑھ کر سیدھی سڑک پر مڑتے ہوئے بے دھیانی میں اس کی ایک آتی ہوئی سائیکل سے ٹکر ہوگئی۔ ٹکر ہلکی تھی۔ وہ پاؤں ٹکاکر اتر پڑا اور معافی کے الفاظ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ سائیکل پر بیٹھنا ہی چاہ رہا تھا کہ سامنے سے آتی ہوئی مہری پر نظر پڑ گئی۔ یہ روز اس کے گھر کا جھاڑو برتن کرتی تھی۔ اور اب شاید کام ختم کر کے واپس جا رہی تھی۔ قریب پہنچنے پر اسے دیکھ کر مہری نے نمستے کیا۔ وہ جواب دے کر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ مگر وہ قدم بڑھتے ہی اسے معلوم کیا دکھائی دیا کہ اس نے پنجہ ٹکاکر سائیکل روک دی اور مہری کو آواز دی۔ وہ مڑکر کچھ گھبرائی ہوئی قریب آئی۔ چوپڑہ نے ذرا سخت لہجے میں اس سے پوچھا بغل میں کیا ہے۔ مہری نے ڈرتے ڈرتے کاغذ کا ڈبہ نکال کر سامنے کر دیا۔ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ یہ ساری والا ڈبہ ہے۔ پلو سے ڈھکا ہونے پر بھی اس کا کنارہ دکھائی دے رہا تھا۔ کیا ہے اس میں۔ کیوں لائی ہو اسے؟ مہری ڈرتے ہوئے اندانستے بولی "ساڑھی ہے بابو۔ بی بی جی نے دی ہے"۔ وہ کچھ حیران ہوا۔ "بی بی جی؟ کیسی ساڑھی ہے دیکھوں تو"۔ اس نے ڈبہ لے کر کھولا۔ بنارسی ٹشو کی ساڑھی جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ "یہ ساڑھی بی بی جی نے تمہیں دی ہے؟" اس نے کچھ شک کے ساتھ پوچھا۔ "ہاں بابو" مہری بولی۔ "بی بی جی نے دی ہے۔ بھگوان آپ کو لاکھوں دے کل میری بیٹی کی شادی ہے۔ اسی کے لئے دی ہے"۔

ہری ہرناتھ چوپڑہ کے چہرے سے غصے اور شک کے بادل دیکھتے دیکھتے غائب ہوگئے مسکراکر اس نے کہا "اوہ!" اس کے لہجہ میں اب درشتی نہ تھی۔ پھر ڈبہ مہری کو لوٹا دیا۔ مہری نے چہرے پر اطمینان برسنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اب ہنس رہا تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے خط نکالا اور اسے پھاڑنا ہی چاہتا تھا کہ مہری نے جلدی سے کہا۔ "بابو نوٹ ہے نوٹ!"

اس نے دیکھا کہ خط کے نیچے پانچ کا نوٹ بھی تھا۔ اور خط کے کھینچنے سے، بیچ میں ذرا سا پھٹ گیا تھا۔ اس نے خط الگ کر کے پھاڑ دیا۔ اور پھر بڑے بشاش لہجہ میں، مہری کو نوٹ دیتے ہوئے بولا۔ "یہ لو ساڑھی مالکن کی طرف سے ہوئی —————— اور یہ منہ دکھائی میری طــرف سے"۔

(بشکریہ نئی نسلیں)

اگرآپکا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری نومبر ۵۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ برائے مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں۔ یا پھر خط کے ذریعہ اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ وی، پی، مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فــرض ہوگا۔ منتظر کرم :۔ مینجر "مشیر" کراچی

۹۴۳ جناب خاں محمد ذوالفقار علی خاں صاحب، ملتان۔
۲۴۱۱ جناب امان اللہ خاں صاحب، نازک آباد۔
۲۴۱۸ جناب چودہری نظام الدین صاحب، لائلپور۔
۲۴۲۰ جناب وسیم الحق صاحب کراچی۔
۲۴۲۴ جناب نیاز محمد صاحب شوق، لاہور۔
۲۴۲۶ جناب سردار احمد خانصاحب، نواب شاہ۔
۲۴۲۹ جناب غلام اسمٰعیل صاحب مجددی، حیدرآباد۔
۲۴۳۰ محترمہ سجیبہ تسنیم صاحبہ، اوکاڑہ۔
۲۴۳۱ جناب جلیل شمسی صاحب، کراچی۔
۲۴۳۵ جناب ناظم اسلامی لائبریری، فیروز آباد (آگرہ)
۲۴۴۲ جناب مستری محمد اسمٰعیل صاحب، سرگودھا۔
۲۴۴۶ جناب محمد حمید صاحب قریشی، کراچی
۲۴۴۷ محترمہ ثریا شمشاد صاحبہ، کراچی۔
۲۴۹۲ جناب ایم۔ اختر امام صاحب۔
۲۵۲۰ جناب محمد احمد صاحب چغتائی، گوجرانوالہ
۲۵۲۲ بیگم الحاج ڈاکٹر ایم ملے، سلام صاحب، کلکتہ
۲۵۲۴۔ ناظم دار المطالعہ، جماعت اسلامی، جھنگ صدر

حفیظ ہوشیار پوری •

سمجھے نہیں مزاجِ ہوائے چمن کئی
اب تک ہیں محوِ جلوۂ سرو و سمن کئی

جو آگ کشتِ گل سے اٹھی اور نہ بجھ سکی
اس آگ نے بھی پھونک دیے ہیں چمن کئی

محشر میں نام تیرے شہیدوں کا آ گیا
اٹھے صلائے شوق پہ رعنا کفن کئی

مخصوص میرے ساقیٔ خلوت کا ہے کرم
کب سے ترس رہے ہیں سرِ انجمن کئی

کنجِ فراق سے تری بزمِ خیال تک
تیرے غریب شہر کے بھی ہیں وطن کئی

خالی رہا نہ بیشۂ غمِ اہلِ درد سے
ہر کوہسار میں ہیں ابھی کوہکن کئی

جو آشیاں خزاں میں لٹے ان کا ذکر کیا
ہوں گے ابھی تو نذرِ بہارِ چمن کئی

رستے میں جو ملے تھے ہم ان سے نپٹ چکے
نکلیں گے کارواں سے ابھی راہزن کئی

کرتا ہے کون ہم سے وفا دیکھنا ہے یہ
سیکھیں گے یوں تو ہم سے وفا کا چلن کئی

رنج و محن کی تہ کو نہ پہنچا کوئی حفیظ
کرتے رہے تلافیٔ رنج و محن کئی

عبدالرؤف عروج

خدنگِ جستہ

میں چاہتا تھا کہ ان تیرہ گوں فضاؤں کو
شفق فروز بہاروں کی روشنی دے دوں
بجھا ہوا نفسِ چنگ تار ہے پھر بھی
سکوتِ بزمِ کواکب کو نغمگی دے دوں

میں چاہتا تھا کہ دنیا کی تلخیوں کا گداز
مرے مہکتے ہوئے خواب سے بدل جائے
یہ روزِ گرم، یہ احساس کی جھلتی دھوپ
فروغِ جلوۂ مہتاب سے بدل جائے

مگر یہ وقت کی جاں سوز خشک تنہائی
شعور اس کے تصور سے کپکپاتا ہے
ستارہ رنگ خیالوں کا آئینہ خانہ
خود اپنے عکس کی حدت سے ٹوٹ جاتا ہے

بہت قریب کی آہٹ پہ کان تھے پھر بھی
شکستِ حسن کا نغمہ سنا نہیں میں نے
خود آفریدہ تخیل کی داستانیں تھیں
زبانِ اختر و انجم سے جو کہیں میں نے

فضائے دشت و چمن ساز گار کر نہ سکا
نہ جہد و عزم سے عاری نہ پر شکستہ ہوں
چڑھائے کون کماں، آہنی مشیت کی
میں صید گاہِ جہاں میں خدنگِ جستہ ہوں

(بشکریہ ماہِ نو)

نورصفی •

دو تصویریں

وہ میز پر کہنیاں ٹیک کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے ہوئے یہ سوچ رہا تھا۔ کہ اب زندگی کا کیا ہوگا؟ یہ کیسے گذرے گی؟ کیا زندگی کے گھنگور اندھیرے میں اجالا ہوگا۔ کیا اس کے ویرانے میں پھول کھلیں گے۔ کیا اس دریا کی سطح کبھی ساکن بھی ہوگی؟۔ اچانک اس کے تصور میں ننھا طاہر مسکراتا، ہنستا اور کھیلتا ہوا آیا۔ اس کے بعد فہمیدہ دبی دبی ہنسی کے ساتھ نمودار ہوئی۔ خالد بھی ہشاش بشاش نظر آیا۔ آخر وہ سب ایک کے بعد ایک پردہ فلم کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے ابھر کر تیزی سے غائب ہو گئے۔ اس خیال سے جیسے اس کی ڈھارس سی بندھ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل کی کلی کھل گئی۔ اور احساس میں چاندنی سی گھل گئی۔ اسے اندھیرے میں جگنوؤں کی چمک سی نظر آنے لگی!

پروین کافی دیر سے آئینہ کے سامنے بیٹھی ہوئی اپنی آرائش و زیبائش میں مشغول تھی۔ اور لونڈر کریم و پوڈر اور "ٹانگی" کا لپ اسٹک اور نیل پالش سب استعمال کر چکی تھی۔ مگر ابھی زلفوں کے پیچ و خم باقی تھے، جس میں وہ خود الجھ کر رہ گئی تھی۔ وہ ایک زلف کو اپنے چہرے پر اس طرح لہرانا چاہتی تھی جیسے وہ قدرتی ہو۔ کیونکہ اکرم کو یہ چیز بہت پسند تھی۔ جب وہ اپنی انگلی سے زلف کو اس کے چہرے سے ہٹا کر یہ شعر پڑھتا ؎

زُلف جو رُخ سے ہٹی ہو گیا روشن عالم
اس اندھیرے میں عجب ہم نے اجالا دیکھا

تو وہ یہ سن کر خوشی سے جھوم جاتی۔ آخر جب کاکلِ سرکش اس کے چہرے پر سرکشی کرنے کے لئے تیار ہو گیا تو وہ مطمئن ہو گئی۔ اس کے بعد اپنے اوپر "سینٹ" اسپرے سے فردوس کا "مدن مست" چھڑکنا شروع کر دیا۔ کمرے کی فضا مہک اٹھی۔ ہر چیز مشکبار ہو گئی۔ اس نے آخری دفعہ قدِ آدم آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھا۔ اس کے سیاہ اور گھنگریالے بال عجیب شانِ بے نیازی کے ساتھ اس کی گردن پر لہرا رہے تھے، اس کا سیفون کا دوپٹہ اس کے شانوں پر بے نیازانہ انداز میں پڑا ہوا تھا البتہ اس کے دونوں پلو ہوا سے یوں لہرا رہے تھے۔ گویا کہ وہ مائل پرواز تھی۔ وہ ابھی باہر جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اتنے میں اس کا شوہر حامد آگیا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی:۔

"آج بہت دیر کر کے پہنچے۔ میں نے تمہارا بہت انتظار کیا"

پیشتر اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتا وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں اپنے بیگ کو گھماتی ہوئی گھر سے ایسے باہر نکل گئی جیسے کمان سے تیر، جاتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ:۔

"میں ذرا ایک تقریب میں اپنی فلاں سہیلی کے ہاں ——— جا رہی ہوں"

حامد نے جیسے یہ سنا ہی نہیں۔ اس کے لئے پروین کی موجودگی اور عدم موجودگی برابر تھی۔ وہ اتنا عاجز آچکا تھا کہ اس نے اس سے جاتے ہوئے یہ بھی دریافت نہیں کیا کہ وہ کب آئے گی۔ کیونکہ یہ پروین کا ہمیشہ کا معمول بن چکا تھا۔ اس کی زندگی گھر سے باہر باغ و بہار اور گھر کے اندر ایک ناقابل برداشت گھٹن تھی۔ اس کے زندگی گھر سے باہر رہنے کے سینکڑوں عذر اور بہانے تھے!

حامد آزاد خیال ضرور تھا۔ مگر تنہا پسند نہیں تھا۔ بلکہ ہر چیز میں اعتدال برتتا تھا۔ حساس اور غیرت مند ہونے کی وجہ سے اسے پروین کی آزاد روی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ مگر جب کبھی وہ پروین کو روکتا تو وہ ٹکا سا جواب دے دیتی۔ مثلاً وہ کہتا کہ "یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قوموں کی تباہی کے وقت عورتیں قومی زندگی میں پیش پیش آجاتی ہیں" وہ اس کا جواب یوں دیتی:۔

"عورتوں کی پیش قدمی، ان کی صحیح یا غلط راہ روی کی تمام تر ذمہ داری مردوں پر عائد ہوتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں مردوں نے کیا کیا۔ مردوں نے ہی عورتوں کو ان کے اصلی مقام سے ہٹا دیا، اور عورتیں بھی اس جال میں پھنس گئیں، آج لاکھوں کروڑوں عورتیں اپنے اولین مقصد سے دور جا پڑی ہیں۔ اور ان کی زندگی ان کے لئے عذاب بن گئی ہے"!

وہ اس قسم کا جواب سن کر دل میں نادم ہو جاتا۔ کیونکہ یہ سب کیا دھرا اسی کا تھا جس کا اسے احساس تھا پہلے پہل اسی نے پروین کو آزادی کے ساتھ گھمانا شروع کیا تھا۔ اگر وہ آج پروین کو سمندر پر لے گیا تو کل سینما لے جاتا۔ اگر کل ایک دوست کی سالگرہ میں اس کے ساتھ تھی۔ تو پرسوں کسی کی شادی میں دونوں موجود ہوتے۔ یہی وہ رویہ تھا جس نے پروین کو آزاد روی اختیار کرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ شروع میں حامد اسی رویہ کو تہذیب جدید کے نام سے یاد کرتا تھا۔ مگر جب پروین کی پرواز اس کی پہنچ سے دور ہو گئی تو اس نے اس چیز کو اپنے لئے تباہ کن سمجھا۔ اور پھر جب اس نے پروین کی ہنسی، اس کا سنگار، اس کی آرائش و زیبائش اور خوشی غرض کہ اس کی ہر چیز دوسروں کے لئے دیکھی، تو اس کی شکل بیزار ہو گئی، اور اس کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی۔ اس لئے اس نے پروین کو اپنے ساتھ لے جانا چھوڑ دیا۔ مگر اب وہ سب لوگوں سے متعارف ہو چکی تھی۔ اس کے دوست اور سہیلیاں بن گئیں تھیں۔ حامد کے ساتھ نہ لیجانے سے اس کا نفسیاتی اثر یہ پڑا کہ وہ بلا جھجک ان کی ہر تقریب میں جانے لگی۔ غرضکہ وہ اس کی دسترس سے بہت دور ہو گئی تھی۔ اس کی زندگی اجیرن ہو چکی تھی۔ اور وہ اس سے مایوس ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ ہاتھی کے دانت ایک مرتبہ باہر نکل کر دوبارہ اندر نہیں جاتے۔ اب اس کو اس کے تصور ہی سے اذیت پہنچتی تھی۔

ہاں تو وہ آج بھی یونہی پروین کے جانے کے بعد سوچنے لگا کہ آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ شوہر کو جب بیوی پر اعتماد نہ رہے اور گھر جہنم نہ بن جائے تو اور کیا بنے، یہ روز روز کی تلخی، بدمزگی، درشت کلامی نوک جھونک، گھریلو تعلقات کے لئے موت کا پیغام ہیں۔ اس زندگی سے آخر کیا فائدہ جس میں سوائے رنج و غم کے مسرت و انبساط کا شائبہ تک نہیں۔ اور پھر ہمارے مزاج اور طبیعتیں الگ ہو گئی ہیں تو راستے بھی الگ ہو جانے چاہئیں۔ مگر جب علیحدگی کا سوال پیدا ہوتا تھا تو اسے اس کا کوئی حل نہیں سوجھتا تھا۔ کئی باتیں اس کے راستے میں حائل ہو جاتی تھیں۔ مثلاً سب سے پہلے تو یہی کہ ایک دفعہ جب اس کا کاروبار فیل ہونے لگا تھا۔ تو پروین نے اپنے باپ سے روپیہ لاکر مدد کی تھی جس سے اس کا کاروبار دوبارہ چمک اٹھا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اس کے بارِ احسان سے دبا ہوا تھا۔ دوسری چیز جو اسے پروین کو ساتھ رکھنے پر مجبور کرتی تھی۔ وہ اس کا حسن اور تعلیم تھی جس سے وہ بے حد متاثر تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر اسے چھوڑ دیا گیا تو کہیں کوئی جاہل اور بدصورت بیوی نہ مل جائے۔ جس کے تصور ہی سے وہ کانپ جاتا تھا۔ پھر وہ اپنی بدنامی سے بھی ڈرتا تھا۔ کہ دشمن ہی نہیں خود اس کے دوست اور عزیز و اقارب اس واقعہ پر نہ جانے کیا کیا رائے زنی کریں گے۔ یہی وہ تصورات، خیالات اور اندیشے تھے جو اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے اور فکر و خیال کی اس کشمکش سے جو ذہنی اذیت اسے پہنچی تھی اسے وہی جانتا تھا!

اس دن بھی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ اس کے جی میں آیا کہ کہیں بھاگ جائے۔ مگر کہاں؟ یہ سوچنے کی بات تھی۔ آخر کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے لاہور اپنے بڑے بھائی کے ہاں کچھ مدت کے لئے چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے خیال کیا کہ وہاں پر اگر اور کچھ نہ ہو سکا تو کم از کم غم تو غلط ہو جائے گا، اور بھائی بھاوج جو اس کے نہ آنے کی ہمیشہ شکایت کرتے رہتے ہیں۔ اس کی بھی اس طرح تلافی ہو جائے گی!

خیر وہ چند روز کے لئے لاہور چلا گیا۔ بھائی اور بھاوج کو چھوٹے بھائی کی اچانک آمد پر بے حد تعجب ہوا۔ مگر ان کی خوشی کی بھی کوئی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے دیدہ و دل فرش راہ کر دیئے۔ مگر پروین کو ساتھ نہ لانے پر شکایت بھی کی۔ تو اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اگر ہم دونوں آجاتے تو گھر اکیلا رہ جاتا۔ وہ پھر کسی موقع پر آجائے گی۔

حامد کے جواب سے اس کے بھائی اور بھاوج مطمئن نہ ہو سکے

مگر انھوں نے بات کی کرید بھی مناسب نہ سمجھی۔ اس لئے خاموش ہوگئے
مگر ایک دن یہ راز کھل ہی گیا۔ ہوا یہ کہ حامد کہیں باہر گیا ہوا تھا اور خالد کے دفتر کی چھٹی تھی۔ وہ گھر پر ہی تھا۔ حامد کے نام ایک تار آیا۔ جس میں لکھا تھا کہ پروین کئی دن سے غائب ہے۔ اکرم کے ساتھ چلے جانے کی خبر مشہور ہے!

دونوں میاں بیوی نے اس تار کو پڑھا تو سکتہ میں آگئے ۔۔۔ سب سے زیادہ دھچکا خالد کے دل کو لگا۔ بھائی کی عزت اور ناموس کا معاملہ تھا۔ ان دونوں نے تار کو چھپا لینے ہی میں مصلحت سمجھی!

ایک دن وہ یونہی لیٹا ہوا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ سامنے پلنگ پر اس کا بھتیجا طاہر سو رہا تھا۔ اس نے اچانک جاگتے ہی رونا شروع کر دیا۔ خالد نے کتاب ایک طرف رکھ کر بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ اور زور سے رونے لگا۔ آخر اس نے بھابی کو آواز دی جو باورچی خانہ میں کام کر رہی تھی۔ اس نے وہیں سے جواب دیا:۔

"خالد بھیا اسے پلنگ پر ہی لٹا دو۔ یہ آپ ہی خاموش ہو جائے گا۔ میں ابھی آ رہی ہوں"

یہ سن کر اس نے روتے ہوئے بچے کو دوبارہ پلنگ پر لٹا دیا۔ اس کی بھابی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ بچہ رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا۔ مگر وہ باورچی خانے میں چولھے کے آگے مونڈھے پر بیٹھی ہوئی پسینہ میں شرابور گوشت بھونے جا رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد چمچہ سے مصالحہ نکال کر سونگھ لیتی تھی کہ کہیں کچا تو نہیں رہ گیا۔ چمچہ اور پتیلی کے ٹکراؤ سے ایسی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسے کوئی "پتی درتا استری" بیٹھی گھنٹی بجا رہی ہو اور ساتھ ہی "پتی چرن کے گن" گا رہی ہو۔ مگر وہ ایسا ہرگز نہیں کر رہی تھی۔ کیونکہ نہ تو وہ پتی کے چرنوں کی دھول کو چندن سے اچھا سمجھتی تھی، اور نہ اس کے چرنوں میں سیس نوانا پسند کرتی تھی۔ وہ تو صرف اپنا فرض ادا کر رہی تھی۔ پھر اس نے یونہی گوشت کے بھونتے بھونتے جب چمچہ میں مصالحہ نکال کر سونگھا تو وہ ابھی کچا تھا۔ اس نے دوبارہ پتیلی میں ڈال دیا۔ اور چمچہ گھمانے لگی۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگی:۔

"یا اللہ! آج کا سالن تو ایسا لذیذ بنا ہے کہ کھاتے ہی ان کا دل باغ باغ ہو جائے اور وہ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔ وہ کئی دفعہ کہہ چکے ہیں کہ کیا سالن پکانا بھول گئی ہو۔ آج کل کھانے میں مزہ بالکل نہیں آتا کبھی مصالحہ کچا ہے تو کبھی نمک تیز"

وہ سوچنے لگی:۔ "وہ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ میں ہی اتنی پھوہڑ ہوں کہ ان کو اچھا کھانا بھی تیار کر کے نہیں دے سکتی۔ اس سے اچھا تو وہ ہوٹل میں ہی کھا سکتے ہیں۔ مگر جب انھوں نے ہوٹل ہی میں کھانا کھا لیا تو ان کے لئے میرا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہیں" ابھی سوچ بچار میں اس نے زرد سے چمچہ گھما کر تھوڑا سا مصالحہ نکالا اور ہتھیلی پر ڈال کر زبان سے چاٹ لیا۔ اور محسوس کیا کہ مصالحہ ٹھیک ہے۔ پھر اس نے ذرا سی بوٹی توڑ کر دیکھا تو گوشت بھی گل چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے فوراً ہی آلوؤں کے چھلے ہوئے قتلے جو کہ اس کے پاس ہی پانی سے بھرے ہوئے پیالہ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ سب کا پانی جھٹک کر پتیلی میں ڈال دیئے اور چمچہ سے اچھی طرح ہلا کر تھوڑا سا پانی ڈال کر دھیمی دھیمی آنچ پر پکنے کے لئے چھوڑ دیا۔

ادھر سے مطمئن ہو کر وہ آٹا گوندھنے کا ارادہ کر نے ہی لگی تھی کہ اس نے ایک دھماکے کی آواز سنی۔ وہ فوراً دوڑی ہوئی آئی تو دیکھا کہ بچہ چارپائی پر سے فرش پر گر پڑا ہے۔ حامد بچے کو اٹھانے کے لئے دوڑا۔ مگر اس کی بھابی نے پہلے بڑھ کر اور ہائے اللہ کہہ کر فوراً اسے گود میں اٹھا لیا اور تھپکنے اور چمکارنے لگی۔ مگر بچہ خاموش ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ حامد نے کہا:۔

"بھابی جان! آپ تو کام کی خاطر بچہ کی بھی پرواہ نہیں کرتیں"

اتنا سن کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہو کر ختم ہو گئی۔ وہ یونہی بچہ کو کاندھے سے لگائے کمرے میں ادھر ادھر پھرتی رہی۔ آخر کافی دیر کے بعد بچہ خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے دودھ پلایا اور ایک چاکلیٹ دے کر فرش پر چھوڑ دیا۔ بچہ فرش پر کھیلتا رہا اور اس وقفہ میں اس نے آٹا گوندھ لیا۔ اس کے بعد ہانڈی دیکھ کر نیچے اتار دی اور چولھے پر توا ڈال دیا۔ آنچ اور تیز کر دی۔ بچہ صحن میں لڑھکتے ہوئے چاکلیٹ چوستا رہا اور وہ روٹی پکاتی رہی۔ ابھی وہ روٹی اور ہانڈی سے فارغ ہونے ہی والی تھی کہ محلہ کی مسجد سے موذن نے اذان بلند کی۔ "اللہ بڑا ہے۔ اللہ بڑا ہے" اس نے

جلدی سے سب برتن وغیرہ سمیٹ کر کمرے کی بتی روشن کی اور کمرے میں نیلگوں روشنی پھیل گئی۔ بچہ خوشی سے ہمکنے لگا۔ اس نے جھٹ پٹ وضو کر کے مصلا بچھایا اور خدا کے حضور میں اپنا سر نیاز خم کر دیا اس کا بچہ بھی لڑھکتے لڑھکتے مصلے پر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے جھٹ سے اسے ایک طرف ہٹا کر دوبارہ اپنے معبودِ حقیقی کے سامنے سر جھکا دیا اس سے فارغ ہو کر اس نے اپنے دل کو پرسکون اور مطمئن سا پایا اس کے بعد اس نے سفید صاف ستھرا مگر سادہ لباس زیب تن کیا۔ جس سے وہ کنول کا پھول سا بن گئی۔ پھر آئینے میں دیکھ کر بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے گنگنانے لگی :۔

"چھیتی چھیتی آ جن دے مینوں تیریاں اُڈیکاں"

(اے ساجن جلد آ میں تیرے انتظار میں ہوں)

اس کے بعد وہ بچے کو گود میں لئے برآمدے میں کھڑے ہو کر اپنے شوہر کا انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد جب اس نے گھر کے سامنے والے پیڑوں کے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی تو اس کا دل دھڑکا جب قدموں کی آہٹ نزدیک آگئی تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آخر قدموں کی آہٹ اور دل کی دھڑکن دونوں ہم آہنگ ہو گئے اتنے میں اس کا شوہر مسکراتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ وہ اس کی طرف شرمائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر مسکرا دی۔

خالد کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے چہرے کی ساری تھکن دھل گئی ہے۔ دل میں خوشی کے کنول کھل گئے ہیں۔ ابھی وہ گھر میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ بچے نے ابا! ابا! کہہ کر دونوں ہاتھ پھیلا دیئے وہ جھٹ اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر ان کے دل مسرت سے بھر گئے اور پھر ہنستے ہوئے کمرے میں پہنچ گئے۔ کچھ دیر ستانے کے بعد خالد نے کپڑے تبدیل کئے اور ہاتھ منہ دھویا۔ اس اثنا میں بچہ سو چکا تھا۔ حامد کی بھابی فہمیدہ نے دسترخوان بچھا دیا۔ اور دونوں بھائیوں کے آگے کھانا چن دیا۔ اور انھوں نے کھانا شروع کر دیا خالد کھانے کے دوران ہی میں فہمیدہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا :۔

"واہ سبحان اللہ! آج کھانا اتنا لذیذ ہے کہ تمہیں انعام ملنا چاہئے۔"

فہمیدہ یہ سن کر، خالد کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ کر مسکرا دی۔ خالد نے حامد کی تائید حاصل کرنا چاہی اور پوچھا۔

"کہو بھئی حامد! تمہارا کیا خیال ہے؟"

"بالکل وہی جو آپ کا ہے۔ آج بھابی جان واقعی انعام کی مستحق ہیں۔ کیونکہ آج انہوں نے کھانے کی خاطر نمک کے رہنے کی بھی پروا نہیں کی۔" حامد نے منہ میں نوالہ رکھتے ہوئے کہا۔

فہمیدہ یہ سن کر حامد کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگی :۔

"بس بس! رہنے دو حامد بھیا! تم بھی اپنے بھائی جان کی طرح لگے بنانے۔"

حامد یہ سن کر مسکرا دیا۔

"ٹھیک ہی تو کہا ہے حامد نے۔" خالد نے جواب دیا۔

اس پر فہمیدہ کہنے لگی :۔

"بالکل غلط۔ کیا تمام عورتیں اپنے گھر کا کام کاج محض انعام حاصل کرنے کی خاطر ہی کرتی ہیں۔ عورت کا اصلی مقام گھر ہے اگر وہی اس کا خیال نہ کرے تو گھر سنوارنے کے لئے کیا کوئی آسمان سے آئے گا؟ خیر میری بات چھوڑیئے۔ آپ اپنی سنائیے۔ آپ صبح سے شام تک محنت کرتے ہیں۔ جان کھپاتے ہیں۔ تب جا کر کہیں پیسوں کی شکل دیکھنا نصیب ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ انعام کے مستحق تو آپ ہیں۔"

"گھر کی دیکھ بھال اور بیوی بچوں کی حفاظت تو مرد کا فرض ہے لہٰذا اس کے لئے انعام کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"تو کیا گھر کی نوک پلک سنوارنا عورت کا فرض نہیں۔ پھر وہ انعام کی خواہش کیوں کرے۔ یہ آخر ہمارا گھر ہے کوئی کارخانہ یا دفتر نہیں جہاں پر کسی معاوضہ یا انعام کی خاطر کام کیا جائے۔ مرد کا کمانا۔ عورت کا اسے صحیح مصرف میں لانا بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک شخص نگینے جمع کرے دوسرا ان نگینوں کو قرینے کے ساتھ جوڑتا چلا جائے۔"

"اچھا بابا اچھا! اب میرا پیچھا بھی چھوڑو۔ تم جیتیں اور میں ہارا۔"

حامد اور خالد کھانا کھا چکے تھے۔ فہمیدہ دسترخوان اور برتن سمیٹ کر باورچی خانے میں رکھنے چلی گئی۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کو دیکھ کر

ہنس پڑے۔

حامد جتنے عرصہ وہاں رہا بہت پرسکون رہا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے بھائی کی اور اپنی زندگی میں بہت تضاد پایا۔ اسکی زندگی میں تلاطم تھا۔ موجیں تھیں اور تھپیڑے تھے۔ اس کی کشتی حیات بھنور میں پھنسی ہوئی تھی لیکن اس کے بھائی کی زندگی صاف شفاف اور ساکن تھی۔ جس پر اس کی تمناؤں کی کشتی بڑے اطمینان کے ساتھ رواں دواں تھی۔ بھائی کی مطمئن اور پرسکون زندگی سے اسے رشک سا آنے لگا۔ میاں بیوی کے اچھے تعلقات دیکھ کر اس کے دل کی چوٹیں ابھر آئیں۔

اب وہ کراچی جانا چاہتا تھا واپس! وہیں جہاں سے وہ اکتا کر اور پریشان ہو کر چلا آیا تھا۔ بھائی کے اصرار پر دو دن اور ٹھہرا۔ آخر ایک دن کراچی کے لئے روانہ ہو گیا۔ مگر یونہی خالی خولی نہیں نئے عزائم کے ساتھ! گھریلو زندگی کی ایک متوازن اسکیم دل و دماغ میں لئے ہوئے!

گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔ اتنی ہی تیزی کے ساتھ حامد بھی خیالات کی رو میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بیٹھا بیٹھا تھک چکا تھا۔ آخر اس نے انگڑائی لی۔ اور سگریٹ سلگا کر کھڑکی کے دور دور تک پھیلے ہوئے سرسبز شاداب کھیت، درخت پودوں اور جھاڑیوں کو دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی نگاہ تار کے کھمبوں میں جم کر رہ گئی۔ جن کا لامتناہی سلسلہ لائن کے ساتھ ساتھ نہ معلوم کہاں تک چلا گیا تھا۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کیا۔ اسے تار سطح زمین سے آہستہ آہستہ بلند ہوتے ہوئے دکھائی دیئے۔ پھر اچانک ایک کھمبا بیچ میں آگیا۔ جو اس تار کو دوبارہ زمین کے ساتھ ملا کر گذر گیا۔ تار نے پھر اسی طرح سے ابھرنا شروع کیا کسی کھمبے نے پھر اسے دبا دیا۔ وہ ایک چیز کو ابھرنے اور دوسری کو اس کے دبانے پر غور کرنے لگا۔ بالکل یہی چیز اسے درپیش تھی۔ اس دفعہ تار نے پھر آہستہ آہستہ ابھرنا شروع کیا۔ اس کے خیالات کے تار بھی ابھرتے رہے!

اس نے پردین کے متعلق سوچنا شروع کیا کہ اس کی تمام رعنائیاں دوسرے کے لئے ہیں۔ وہ مجھ سے بے پروائی برت کر اور نظر انداز کر کے اپنے مہذب ہونے پر فخر کرتی ہے۔ وہ میرے ہوتے ہوئے بھی اوروں کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اس کے بعد ایک کھمبا تار کو دبا کر تیزی سے گزر گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے خیالات کے تار بھی دب گئے۔ اس دفعہ اس کے تصور میں اس کی بھابی آگئی۔ کھمبے نے تار کو دبا دیا۔ بھابی پردین کے تصورات پر غالب آگئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس کی بڑی بہن یا ماں ہے۔ کیونکہ اس کے سلوک میں اس نے شفقت کی جھلک دیکھی تھی۔ اسے وہ خالد کے بھائی کے لئے ہار سنگھار کرتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے کانوں میں بھابی کے وہی الفاظ گونجنے لگے:۔

”عورت کا اصلی مقام گھر ہوتا ہے۔ کیا گھر کی نوک پلک سنوارنا عورت کا کام نہیں؟ یہ آخر ہمارا اپنا گھر ہے۔ کوئی کارخانہ یا دفتر نہیں۔ جہاں پر کسی معاوضہ یا انعام کی خاطر کام کیا جائے۔ مرد کا کمانا، عورت کا اسے صحیح مصرف میں لانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص نگینے جمع کرے دوسرا ان نگینوں کو قرینہ کے ساتھ جوڑتا چلا جائے“

وہ دل میں کہنے لگا۔ بھابی اگر اجالا ہے تو پردین اندھیرا ہے!

وہ انہی تصورات میں ڈوبا ہوا اپنے گھر آ رہا تھا۔ جوں جوں کراچی نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی بے چینی بھی بڑھ رہی تھی۔ اس کے احساسات اور تصورات دل و دماغ پر ایک جال سا بن رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ عورت اگر چاہے تو گھریلو زندگی جنت بن سکتی ہے۔ مگر پردین! (اس کے ہونٹوں کو ہلکی سی آہ نے چھو لیا) نے اپنی تمام رعنائیوں اور دلکشیوں کے باوجود گھر کو دوزخ بنا دیا ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات کو مضبوط رکھنے والی چیز حسن و صباحت نہیں۔ سیرت و کردار کی پاکیزگی اور ایک دوسرے کی غمخواری ہے!

حامد نے قدرے جھنجلاہٹ کے ساتھ بالوں کے پیچ کو زور سے مروڑ دیا۔ وہ دل ہی دل میں پردین سے قطع تعلق کی تدبیر سوچ رہا تھا کہ اچانک اسے بیوی کا ایک ہیولی سا نظر آیا۔ جیسے کہ وہ کہہ رہی ہو ”میں اچھی طرح جانتی ہوں تم مجھے چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ میں تمہارے آڑے وقت کام آچکی ہوں۔ ورنہ آج تم در در ٹھوکریں کھاتے پھرتے۔ اگر تم مجھے چھوڑ دوگے تو لوگ تمہیں ذلیل سمجھیں گے۔ اور

کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گے ...... یہ خیال آتے ہی وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جیسے کسی نے اس کے جذبات میں ایکا ایکی بریک لگا دیا۔ وہ اپنے دل سے باتیں کرنے لگا۔

مگر چھوڑنا تو پڑے گا۔ اور چارہ کار ہی کیا ہے (قدرے تامل کے بعد) مگر لاؤ ایک بار اور کوشش کر دیکھوں۔ شاید پروین — راہ راست پر آجائے — مگر یہ سارا کیا دھرا میرا ہی تو ہے۔ میں نے ہی اسے آزادی دی ہے۔ اگر میں شروع ہی سے ڈھیل نہ دیتا تو ان باتوں کی نوبت کیوں آتی ؟

اپنی خیالات کے طوفانوں میں ہچکولے کھاتا ہوا وہ گھر پہنچا مگر وہاں پہنچتے ہی ملازم کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ پروین تو اکرم کے ساتھ فرار ہو گئی۔ اس کے دل کو زبردست دھچکا لگا۔ وہ صوفے پر اس طرح بیٹھا جیسے کسی نے اسے دھکا دے کر گرا دیا ہو۔

"اوفوہ! یہ کیا ہوا۔ میری اس کوشش کو بھی بروئے کار آنے کا موقع نہ مل سکا۔"

اور وہ بڑبڑا ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو اس کا دوست نعیم مسکرا رہا تھا۔

"...... تم ہو ...... نعیم ...... کہو اچھے تو ہے ......"

حامد نے کہا۔

"جی اچھا ہوں ...... مگر تم اپنی حالت تو دیکھو۔ چہرے پر ہوائیاں چھوٹ رہی ہیں ...... لیکن میں سب کچھ جانتا ہوں۔ تمہاری یہ پریشان حالی بے سبب نہیں ہے۔ میں نے ہی تمہیں تار دیا تھا۔"

حامد اپنے دوست کی بات کاٹتے ہوئے بولا: "مگر مجھے تمہارا کوئی تار نہیں ملا۔"

"شاید تمہارے بھائی اور بھاوج نے اس تار کو چھپا لیا کہ تمہیں صدمہ نہ ہو اور تم کہیں کوئی خوفناک اقدام نہ کر بیٹھو۔ اور ان کا گھر تمہارے غم کی وجہ سے ماتم خانہ نہ بن جائے۔"

نعیم کی گفتگو نے حامد کو اور نڈھال کو سا کر دیا۔ وہ اس کے چہرے کو ایک گونگے کی طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے تمام جذبات اس کی آنکھوں میں کھنچ کر آگئے تھے اور اس کی زبان ان کے اظہار سے قاصر تھی!

"حامد! جو کچھ ہو چکا وہ ہو چکا۔ افسوس کرنے اور پچھتانے سے ہوئی بات اَن ہوئی تو نہیں ہو سکتی۔ افسوس کرنا اب بیکار ہے!"

"تو میں کیا کروں ؟"

"سنو! اکرم اور پروین کے تمام حالات مجھے معلوم ہوتے رہے ہیں۔ اکرم نے پروین کو دغا دی۔ وہ اس کا تمام زیور اور روپیہ پیسہ لے کر چلتا بنا۔ ڈھاکہ جا کر اس نے کپڑے کی دکان کھول لی ہے۔ مگر پروین کو تو اس ظالم نے کہیں کا نہ رکھا۔ شوہر کے گھر وہ واپس نہیں سکتی۔ میکے میں جائے تو کیا منہ لے کر جائے۔ جو کچھ اس کے پاس پلّے تھا وہ اکرم کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس نے مجبور ہو کر ایک ہوٹل میں نوکری کر لی ہے ......"

"ہوٹل کی نوکری میں تو پروین کے اور مزے ہوں گے۔ ہر طرح کی پابندی سے آزاد ......"

(بات کاٹ کر) "یہ نہ کہو حامد! عورت دھوکا کھا کر بہت کچھ سنبھل جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی۔ کہ میں نے یہ کیا کیا؟ اب تم اس کی دستگیری کرو ......"

"میں دست گیری کروں اس کی ...... میری وفا اور محبت کو تو وہ ٹھکرا چکی۔"

"حامد جذبات سے کام نہ لو۔ یہ عقل و ہوش سے کام لینے کا وقت ہے پروین بے سہارا ہے۔ تم اسے سہارا دو مجھے یقین ہے کہ اب وہ اپنے کو بالکل بدل کر زندگی کی کش مکش میں تمہارا ساتھ دے گی۔ پروین اس سلگتی ہوئی لکڑی کی طرح ہے جسے قافلے والے آگ لگا کر چل دیتے ہوں۔ میرا کہا مانو۔ حامد! بھلا دو جو کچھ اب تک ہو چکا ہے یوں سمجھو کہ اب زندگی نئے سرے سے شروع ہو رہی ہے۔"

بہت دیر تک دونوں دوستوں میں گفتگو ہوتی رہی سوال جواب، نرم گرم فقرے، دلیلیں، اندیشے، مگر آخر کار حامد کو نعیم

کی بات مان لینی پڑی۔ اس نے حامی بھرلی پروین کو اپنے گھر لانے کی۔
حامد اور نعیم دونوں ہوٹل پہنچے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پروین فرسٹ فلور پر ہے۔ دو تین منٹ میں فرسٹ فلور بھی آگیا پروین ہوٹل کے بیرے کو ہدایتیں دے رہی تھی۔ حامد کے پاؤں بوجھل سے ہوگئے۔ مگر نعیم کے اشارہ کرنے پر وہ ہمت کرکے آگے بڑھا۔

"پروین!" اس نے آہستہ سے کہا۔ پروین نے مڑکر دیکھا تو حامد پر نگاہ پڑتے ہی اس کا چہرہ فق ہوگیا۔ وہ گھبرا سی گئی۔ رخساروں کی سرخی ایک دم پھیکی پڑ گئی۔

پروین زینہ کی طرف جانے لگی۔

"پروین! جانتی ہو میں یہاں کس لئے آیا ہوں" حامد نے دل گیر ہوکر کہا۔

"ہوٹل میں تو لوگ ٹھہرنے کے لئے آیا کرتے ہیں" پروین نے جواب دیا۔

"میں مسافر نہیں ہوں۔ میں تمہارے لئے آیا ہوں...."

حامد کی بات کاٹ کر پروین بولی "مگر میں اب تمہارے لائق نہیں رہی۔ میرا خیال چھوڑ دو۔ مجھے اپنے کئے کی سزا بھگت لینے دو.... اور....."

پروین زینہ کی طرف الٹی چل رہی تھی۔ نیچے سے ایک اینگلو انڈین اپنے خوفناک کتے کو لئے ہوئے آرہا تھا۔ پروین کا پاؤں کتے کے پنجہ پر پڑے کتے نے اسے زمین پر گرا کر بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ کتا کیا تھا اچھا خاصا شیر تھا۔ لوگوں کے بچاتے بچاتے پروین کا بدن اس کے دانتوں اور پنجوں سے لہولہان ہوگیا۔ اور اٹھنے کی کوشش میں اس کا سر جو زینہ کے پتھر سے ٹکرایا تو خون کے فوارے چھوٹنے لگے؛

"پروین! آنکھیں کھولو......" حامد نے اس کے سر کو زانو پر رکھتے ہوئے کہا۔ مگر اب جواب کون دیتا۔ ایک سرد لاش اس کے سامنے تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

"پروین! میں تو نئی زندگی کا ایک پیغام لے کر آیا تھا دوبارہ ایک نیا سنسار بسائیں گے۔ مگر میری یہ آخری کوشش بھی ناکام ہوگئی۔ تم گھر سے چلی آئی تھیں۔ لیکن میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا۔ مگر اب تم ہمیشہ کے لئے کھو گئیں!"

(حلقہ ادب اسلامی کراچی میں پڑھا گیا)

(بشکریہ "فاران")

نظر خورجوی

جانے والوں کے سرِ راہ نشاں ملتے ہیں — مگر اے دوست بہ طرزِ دگراں ملتے ہیں
بندگی ہے کہ دو عالم کی حکومت یارب — بندگی میں علَم و فوج و نشاں ملتے ہیں
میرے ساقی ترے مستوں کی خودی کیا کہنا — ایسے ہشیار زمانہ میں کہاں ملتے ہیں
مجھے منظور ہے خود معرکۂ رزمِ حیات — ورنہ ملنے کو مکاناتِ اماں ملتے ہیں
کیا قیامت ہے جو کل تک تھے رفیقِ منزل — آج وہ بن کے مجھے کوہِ گراں ملتے ہیں
زندگی تھک کے نہ مایوس ہو کٹ جائیگی رات — کچھ افق پر سحرِ نو کے نشاں ملتے ہیں
اہلِ ہمت کو ہے پایاب سمندر ہر ایک — یوں تو پھر سینکڑوں طوفاں یہاں ملتے ہیں
دور کیوں جائے انھیں دیکھ لے اپنے دل میں — وہ جگہ ہے یہی غافل وہ جہاں ملتے ہیں

اس زمانہ میں کسے چین میسر ہے نظر
سب ہی دنیا میں رواں اور دواں ملتے ہیں

مسرور قریشی

جب کبھی آپ مسکرائے ہیں ! — کتنے دھوکے نظر نے کھائے ہیں
دل کی دھڑکن رکی رکی پائی — جب تصور میں آپ آئے ہیں
کیوں خلش سی جگر میں پاتا ہوں — یاد شاید ابھی وہ آئے ہیں

آئی مسرور کیسی آج بہار
دل پہ بادل غموں کے چھائے ہیں

نظر خورجوی •

کلامِ ذوق میں تصرّف

شیخ محمد ابراہیم ذوق اردو کے انتہائی خوش بخت شاعروں میں سے تھے لیکن مرتے ہی ان کی خوش بختی بدنصیبی سے بدل گئی۔ وہ چار روپے ماہوار پر ولی عہد کو اصلاح دینے کے لئے مقرر ہوئے تھے اور پھر استاد شاہ کے منصب پر فائز ہوئے اور "خاقانی ہند" کہلائے زندگی بھر ان کی جو قدر و منزلت ہوئی اور ان کو جو مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی تھی وہ ان ہی کا حصہ تھی لیکن آج ——— غیروں کا کیا ذکر ذوق کے سلسلہ کے بھی بہت سے ادباء اور شعراء ایسے ہیں جو ان کا نام سن کر ناک بھوں سکیڑنے لگتے ہیں۔ اور ان کو درباری شاعر کہہ کر ٹال دینے پر مصر ہیں۔ اس کی وجہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہی ہے کہ آج ذوق کا صحیح کلام موجود نہیں ہے ان کے اشعار میں نہ صرف لفظی تبدیلیاں کی گئی ہیں بلکہ معنوی تصرف بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ آج دیوان ذوق میں مہمل بے معنی اور غیر موزوں اشعار بھی بکثرت مل سکتے ہیں حالانکہ ذوق کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مصرعہ موزوں نہ کر سکتے ہوں گے اور غیر موزوں اشعار کہتے ہوں گے۔ ذوق پر ہر قسم کے اعتراضات آج کئے جاتے ہیں لیکن کسی نے انہیں مہمل گو نہیں کہا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ دیوانِ ذوق تصرف شدہ ہے۔ ذوق نے ایک شعر کہا تھا ؎

پڑھتا نہیں خط غیر مرا واں کسی عنواں

جب تک کہ عبارت میں تصرف نہیں کرتا

اور یہ خود ان پر حرف بحرف صادق آیا۔ بلکہ اس شعر میں تو "غیر" کی شکایت کی گئی ہے اور ذوق کے کلام میں غیر نے نہیں اپنوں نے (ذوق کے مداحوں سے مراد ہے) تصرف کیا ہے۔

ذوق کے انتقال کو پوری ایک صدی ہو گئی اس عرصہ میں حکومتیں بدلیں زمانہ بدلا اور مختلف قسم کے انقلابات سے ملک دوچار رہا اب انکے اصل کلام کی جستجو کرنا اور اسے منظر عام پر لانا سخت دشوار ہے پھر بھی ہم نے کوشش کی ہے اور اس دیوان کا ایک حصہ ہمارے پاس صحیح صورت میں موجود ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ جن حضرات نے یہ تصرف کیا ہے (عمداً یا سہواً) ان کی حیثیت مسلمہ ہے اور ان کے خلاف باتیں سن کر مان لینا ہر شخص کا کام نہیں لیکن چونکہ واقعہ یہی ہے اس لئے ہمیں مخالفتوں کا زیادہ ڈر نہیں۔

مولوی محمد حسین آزاد نے پہلی مرتبہ دیوانِ ذوق ترتیب دے کر طبع کروایا اور بقول خود اس سلسلہ میں بڑی کدو کاوش اور محنت و مشقت کی وہ ذوق کے ساتھ بچپن سے رہے اور بقول آزاد استاد ان کو بہت عزیز رکھتے تھے ان حالات میں ان کے ترتیب دیئے ہوئے دیوان کو مستند ہونا ہی چاہیئے تھا چنانچہ بعد کے مرتبین نے اسی کو اصل بنا کر نئے نئے دیوان ذوق پیش کئے۔ کاش کوئی مولانا شبلی نعمانی کے اس مقولہ پر بھی توجہ کرتا کہ "آزاد تحقیق کا مرد نہیں۔ .... وہ حکایتیں بھی کہتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ واقعات ہیں"۔ ہم نہیں کہتے کہ مولوی آزاد نے کاوش نہیں کی لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اگر انھوں نے ذاتی تحقیق کی تو کیا وجہ تھی کہ ظفر اور ناسخ کے مطبوعہ دیوان میں لکھے ہوئے اشعار ان کو نہ پہنچ سکے اور انھوں نے ان کو ذوق کی طرف منسوب کر دیا بالخصوص اس وقت جبکہ بقول آزاد کتب خانۂ آزاد میں دیوان ظفر اور دیوان ناسخ موجود تھے۔ مولوی آزاد نے دیوان ذوق کے لئے اشعار کن ذرائع اور وسائل سے حاصل کئے اس کا اندازہ ان کے تحریر کردہ شذرات اور حواشی سے ہو جاتا ہے کہ کسی فقیر سے سن کر لکھ لئے کسی نوکر نے سنا دیئے آپ نے ان کو سند سمجھ لیا اور شریک دیوان کیا وغیرہ وغیرہ .... مولوی آزاد کا علم و فضل مسلم ہے وہ شاعر بھی تھے چنانچہ ایک دیوان چھوڑا وہ موزوں اور غیر موزوں اشعار کا اندازہ تو کر سکتے تھے؟ پھر دیوان ذوق میں غیر موزوں مصرعوں کی موجودگی سے کیا نتیجہ نکالا جائے؟

ہمارا خیال ہے کہ مولوی آزاد نے جو غزلیں اور قصائد غیر معتبر ذرائع سے حاصل کئے یا جن پر خود ذوق نے نظر ثانی نہیں کی تھی ان کے نتائج کو (بہ زعم خود) دور کرنے کی کوشش کی تھی ذہن منظر میں ان کی حد سے بڑھی

ہوئی استاد پرستی ہی کارفرما رہی ہوگی، پھر بعد میں خیال آیا استاد کی باقی غزلیں بھی دیکھ ہی ڈالیں چنانچہ دیوانِ ذوق میں کئی چنی غزلوں کے علاوہ تمام کاوشات ذوق پر مولانا آزاد کی صلاح موجود ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذوق بیچارہ کی مقبولیت اس منزل کو پہنچ گئی جو آج ہمارے سامنے ہے۔ یہیں پر اگر بات ختم ہو جاتی تو بھی خیریت تھی۔ مولانا نے غالباً طباعت و کتابت کے وقت بھی خاطر خواہ نگرانی کی زحمت گوارا نہ کی نتیجہ یہ ہوا کہ کاتب صاحب نے بھی جی کھول کر صلاحیں فرمائیں۔ اور غیر موزوں اشعار وجود میں آئے۔

مولوی آزاد (محمد حسین) کے بعد دوسرے مرتبین نے بھی تصرف کیا یہ حضرات مجبور تھے۔ مہمل اور غیر موزوں اشعار، نسخے کتے ہوئے مصرعے بلکہ اشعار دیکھ کر خود رائے زنی نہ کرتے تو کیا کرتے۔ کچھ اضافہ کرنے کا شوق بھی اس سلسلہ میں معاون ہوا۔ اس طرح دیوانِ ذوق پر نہ صرف مولوی آزاد کا تصرف رہا بلکہ تقریباً ہر مرتب نے اس سلسلہ میں تھوڑا بہت کام کیا ہے۔ منشی نولکشور کے مطبع سے کیسری داس سیٹھ کے زیر اہتمام دیوانِ ذوق شائع ہوا دو ایک غزلیں کیسری داس سیٹھ صاحب کو صحیح مل گئی تھیں چنانچہ انہوں نے ان کو شریک دیوان کیا لیکن چونکہ اس دیوان پر دیباچہ نہیں لکھا گیا ہے اور نہ حواشی درج ہیں اس لئے ان کو لوگوں نے کچھ زیادہ اہمیت نہ دی۔ یوں بھی مولوی آزاد کے مقابلہ میں کسی اور کو اہمیت دینا۔ کارے دارد۔۔۔۔

کیسری داس سیٹھ نے جہاں یہ غزلیں درست کی ہیں وہیں دوسری غزلیات پر کاتب و مرتب صاحب کو اصلاح کا موقع بھی دے رکھا تھا چنانچہ اس عیب نے ان کی کاوش پر جو یقیناً قابل قدر تھی، پانی پھیر دیا۔

اس تصرف نے ذوق کے متعلق عجیب عجیب بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پیدا کر دیں مثلاً یہ کہ ذوق دو تین مصرعہ کہہ لیتے اور پھر یہ فیصلہ نہ کر پاتے تھے کہ کس کو رکھیں۔ چنانچہ حواشی پر دوسرے مصرعے بھی لکھ دیتے یا یہ کہ ذوق کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کے اچھے اشعار کا انتخاب کیجئے تو مطلع زیادہ ہونگے اور ذوق کے یہاں سوز و گداز نہیں ان کے اشعار میں موسیقیت نہیں وغیرہ وغیرہ فراق گورکھپوری صاحب نے اپنی کتاب "اندازے" میں ذوق پر بیاد رسی نوعیت کے دوسرے اعتراضات کئے ہیں اب ہم ذوق کے صحیح اشعار مع تصرف نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین ذوق کی شاعرانہ حیثیت کا صحیح اندازہ کر سکیں۔

غزل نمبر ۱

(۱) پاک رکھ اپنا دہاں ذکر خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

یہ مطلع دیوانِ ذوق میں بجنسہٖ موجود ہے اور صحیح ہے۔ یہ غزل ذوق کی آخر عمر کی تخلیقات میں سے ہے۔

(۲) جس طرح دیکھے قفس سے باغ کو مرغ اسیر
جھانکتا ہے یوں تجھے دل سینۂ صد چاک سے

دیوان ذوق مرتبہ آزاد کیسری داس سیٹھ اور مرتبہ پروفیسر ملک عنایت اللہ وغیرہ میں "تجھے" سے پہلے "دل" لکھا ہے اور "یوں" بعد میں درج ہے جو سلاست کے خلاف ہے۔

(۳) تیرے صید نیم جاں کی جاں نکلتی ہی نہیں
باندھ رکھا ہے اسے بھی تو نے کیا فتراک سے

تینوں دیوان میں یہ شعر اس طرح ہے ؎
تیرے صید نیم جاں کی جان نکلے کس طرح
یہ تو وابستہ ہے تیرے دامنِ فتراک سے

خوبی بیان پر یہ تبدیلی خاصی ضرب ہے پھر موجودہ صورت میں جان کا فتراک سے تعلق اس قدر واضح نہیں جتنا اصل صورت میں تھا۔ خود وابستہ ہونے سے وہ قید عائد نہیں ہوتی جو باندھ رکھنے میں ہو۔

(۴) مجھ کو دوزخ رشک جنت ہو اگر میرے لئے
واں بھی آتش ہو کسی کے روئے آتشناک سے

جنت کی سب سے بڑی نعمت "لقاء اللہ" ہے۔ اسی کی اہمیت کو شاعر نے اس طرح واضح کیا ہے۔ مگر دیوان میں اس طرح لکھا ہے ؎
بیٹھا دوزخ میں بہاریں خلد کی دیکھا کروں
واں کی آتش ہو جوان کے روئے آتشناک سے

دیکھئے شعر کتنا پست ہو گیا۔ جو مزا "کسی کے روئے آتشناک" میں ہے وہ "ان کے" میں کہاں؟ "بہار خلد" سے "رشک جنت" کی ترکیب زیادہ زور دار ہے۔

(۵) آفتاب حشر ہے یا رب کہ نکلا گرم گرم
کوئی آنسو دل جلوں کے دیدۂ نمناک سے

اور دیوانِ ذوق میں مرتبین نے اس طرح لکھا ہے ؎

آفتاب حشر ہے یارب کہ نکلا گرم گرم
اشکِ خونیں دل جلوں کے دیدۂ نمناک سے

"اشکِ خونیں" کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی آنسو سے بھی مطلب واضح ہو جاتا ہے گویا "خونیں" کا لفظ زائد میں آگیا اور یہ فنی عیب ہے جو مولوی آزاد کے کلام میں عام ہے۔

(۶) چشم کو بے پردہ ہو کس طرح نظارہ نصیب
جب کہ وہ پردہ نشین پردہ کرے ادراک سے

مرتبین نے دوسرے مصرعہ کو یوں بدل کر لکھا ہے ع

گر تا وہ پردہ نشین پردہ تو ہے ادراک سے

اس طرح تعقید کا عیب پیدا ہو جاتا ہے جو مولوی آزاد کے کلام کی خصوصیات میں سے ہے۔

(۷) بیت ساقی نامہ کی لکھو کوئی جائے دعا
مے پرستوں کے کفن پر چوب کلک تاک سے

دیوان میں "چوب کلکِ تاک" کی جگہ "کلک چوب تاک" لکھا ہے۔ کلک (قلم) خود چوب ہوتا ہے اس لئے "چوب کلک" کی ترکیب درست تھی کلک چوب کی ترکیب میں کوئی بات نہ ہوئی۔

(۸) عیب ذاتی کو کوئی کھوتا ہے حسنِ عارضی
زیب بد اندام کو ہو ذوق کیا پوشاک سے

پہلا مصرعہ اس طرح بدل دیا گیا ہے ع

عیب ذاتی کو چھپائے گا نہ حسن عارضی

لیکن "کوئی کھوتا ہے" میں جو زور تھا وہ "چھپائے گا" میں نہیں۔ شاید مولانا محمد حسین آزاد کو "کوئی کھوتا ہے" خلاف محاورہ معلوم ہوا ہے۔ لیکن ذوق کے زمانہ میں یہی فصیح تر اور صحیح تر تھا۔ اس زمانے کی زبان کا لحاظ بھی ضروری ہے۔

ان آٹھ اشعار کے علاوہ ایک مطلع اور ہے وہ درست ہے۔ مولانا آزاد کے مرتب کردہ دیوان میں تصرف ہوا جس کو تمام مرتبین نے اپنے یہاں جگہ دی۔ البتہ کتابت کی بعض غلطیاں اور ملتی ہیں جو کچھ اہم نہیں بعض غزلیات میں تصرف کی مقدار کم ہے مثلاً ع

مرا گھر تیرا منزل گاہ ہو ایسے کہاں طالع
خدا جانے کدھر کا چاند آج اے ماہرو نکلا

آزاد کے دیوانِ ذوق میں یہ شعر اسی طرح لکھا ہے اور یہ صحیح ہے لیکن کیسری داس سیٹھ اور پروفیسر عنایت کے مرتب کردہ دیوان میں مصرعۂ اولیٰ میں "منزل گاہ" کی مناسبت سے "تیرا" کی جگہ "تیری" لیکن تیرا ہی "گھر" کی مناسبت سے درست ہے۔

اسی طرح ع

گھسے سب ناخنِ تدبیر اور ٹوٹے سر سوزن
مگر تھا دل میں جو کانٹا نہ وہ ہرگز کبھو نکلا

یہ صحیح ہے اور آزاد نے بھی یونہی لکھا ہے البتہ کیسری داس اور پروفیسر عنایت نے پہلے مصرعہ میں "سب" کی جگہ "جب" لکھا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔

(۳) مئے عشرت طلب کرتے تھے ناحق آسماں سے ہم
کہ آخر جب اسے دیکھا فقط خالی سبو نکلا

مولوی آزاد نے اس کو اس طرح بدل دیا ہے ع

مئے عشرت کا تھا خمخانۂ افلاک پر دھوکا
کہ تھا لبریز غم اس خم کدہ سے جو سبو نکلا

اور دوسرے مرتبین نے ان کی اتباع کی ہے۔ باقی اشعار درست ہیں۔

غزل نمبر ۱۳

۱۲۳۶ھ کی ایک اور غزل ہے اس کا ایک شعر ہے ع

کشتی سوار عمر ہے بحرِ فنا میں جسم
جس دم بہا کے لے گیا طوفان بہہ گیا

دیوانِ ذوق میں مولوی آزاد مصرعۂ اولیٰ اس طرح لکھتے ہیں۔

ع "کشتی سوار عمر ہیں بحر فنا میں ہم"

"جسم" ہی مناسب تر ہے۔ اسی طرح مقطع تھا ع

پنجاب میں بھی وہ نہ رہی آب و تاب حسن
اے ذوق پانی اب تو وہ ملتان بہہ گیا۔

اور دیوانِ ذوق میں اس طرح لکھا ہے ع

تھا ذوق پہلے دلی میں پنجاب کا سا حسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہہ گیا

(باقی صفحہ ۵۹ پر دیکھیے)

ایک مزاحیہ رزمیہ (mock - heroic) مثنوی

رزم نامہ

نجم الاسلام

'محبت بھی کیا چیز ہے دیکھنا' — قیامت یہ نا چیز ہے دیکھنا[1]
زرا بات کی چشم تر ہو گئی — نہ ہی تھی جن کو خبر ہو گئی
کہیں قیس کو دشت دکھلا دیا — کہیں کوہ کا کوہ کٹوا دیا!
نہیں اس کے کاٹے کا کوئی علاج — کہ جس نے تاراج کتنے ہی راج
جو سر چڑھ کے بولا یہ جادو کبھی — تہ و بالا دنیا کی دنیا ہوئی
اسی سے وہ جنگیں ہوئیں خوفناک — کہ دامنِ ضبط سننے سے چاک

سناؤں تمہیں بات اک روز کی — جو اک کافی ہاؤس میں واقع ہوئی
ہوا یوں کہ آتی تھی کملا یہاں — وہ دوشیزۂ ہند، شیریں زباں
گلابوں سے گالوں کے باعث جسے — دیا نام روزی کا ماں باپ نے
یہ اک باخبر حلقے کا ہے بیاں — کہ مرتے تھے سب اس پہ پیر و جواں
بہت اس کی دلی میں تشہیر تھی — اک عالم کے خوابوں کی تعبیر تھی
وہ امریکی شیروں میں کھیلی ہوئی! — وہ سونے کے ڈھیروں میں کھیلی ہوئی
وہ آنکھوں کی ٹھنڈک وہ دل کا سُرُور — جوانی کے بدمست نشے میں چُور!
جوانانِ کالج کے قصوں کی ہیر — کلرکوں کی اک حسرتِ دل پذیر
ادیبانِ نوخیز اس کے غلام — لٹاتے تھے دل شاعرانِ کرام
بہت شور تھے اُردو بازار میں — نکلتی تھی اکثر ادھر کار میں

دوکانوں پہ دانشوروں کے گروہ — کو رہتی سرِشام روزی کی ٹوہ
کوئی فیض کے شعر پڑھتا ہوا — ترقی کے زینے پہ چڑھتا ہوا

---

[1] ملاحظہ ہو پوپ کی مزاحیہ رزمیہ نظم "ریپ آف دی لاک" (Rape of the Lock) کا ابتدائیہ

What dire offence from amorous causes springs,
What mighty contests rise from trivial things.

کوئی فلم کے گیت گاتا ہوا | کوئی نظم تازہ سناتا ہوا!
ادب اور سیاست کی چالوں میں گم | نگاہیں سڑک پر خیالوں میں گم
کوئی مفتخر فکر چالاک پر | کوئی مفتخر طبع بیباک پر
دلوں میں خوشی، لب پہ آہ و فغاں | غرض اک نئی روح سی تھی رواں

انہی نوجوانوں میں اک مرد تھا | جو اُلفت کے ہر کھیل میں فرد تھا
بہت ذہن چلتا تھا رومان میں | محبت کے فیضان و عرفان میں
بفضلِ خدا اس میں جرأت بھی تھی | محبت میں مرنے کی ہمت بھی تھی
اسی سے وہ کچھ سب میں ممتاز تھا | اسے اپنی جرأت پہ خود ناز تھا
چڑھاتے تھے کہہ کر اسے شیر دل | چکاتا تھا اکثر وہی سب کے بل
دل اس کا بھی روزی پہ مائل ہوا | کیوپڈ کے تیروں سے گھائل ہوا
خیالی پلاؤ پکانے لگا—! | تعاقب میں پاؤں اٹھانے لگا
نئی دلی تک دوڑ ہونے لگی | محبت کی دُھن عقل کھونے لگی

پھر اک روز ایسا خدا نے کیا | مرادوں کو پہونچا وہ مردِ خدا
ملاقات کیفے میں ہو ہی گئی | پریشانیاں دل سے دھو ہی گئی
شریفانہ باہم تعارف ہوا | درِ گفتگو دونوں جانب کھلا
بہت خاکساری دکھائی گئی— | بوائے سے کافی منگائی گئی!
کبھی بات موسم کی ہونے لگی | تو لفظوں کی بارش سی ہونے لگی
کبھی فلم انگریزی پر تبصرے | کبھی یوتھ کنٹیسٹ[1] کے تذکرے
کبھی شکسپیئر اور ملٹن کی بات | کبھی جارجٹ اور ساٹن کی بات
'یولوجی'[2] کبھی حسنِ پوشاک کی | کبھی اپنے پاپا کی املاک کی!
غرض گفتگو یوں ہی چلتی رہی | محبت زبانوں میں پلتی رہی

اثر اپنا کافی[3] دکھانے لگی—! | سیاست کے نکتے سجھانے لگی!
برا اس نگوڑی سیاست کا ہو | گئی بیج جو تلخ کامی کا بو
ادھر عشق کٹر ترقی پسند—! | اُدھر حسن سرمائے میں مست مند
ادھر عشق کی روسیت جوش پر | اُدھر طرزِ جمہوریت جوش پر

---

۱ Youth contest مقابلہ حسن و شباب ۲ Eulogy مدح سرائی

۳ Coffee (which makes politician wise,
And see through all things with his half shut eyes).
"POPE" (The Rape of the Lock)

ادھر اشتراکی خیالوں کا زور — اُدھر خاص امریکی چالوں کا زور
صدائیں بلندی پہ جانے لگیں — ترقی پسندی دکھانے لگیں!
دلائل کے انبار ہونے لگے — لڑائی کے آثار ہونے لگے

اٹھے چھوڑ کر لوگ میزوں پہ جام — ہوئے جمع آ کے سب خاص و عام
سٹائر[1] کا ایکس چینج[2] ہونے لگا — ایموٹیشن[3]، لے رینج[4] ہونے لگا

"یہ انداز میڈم! دکھاتی ہو کیوں — مجھے دھونس دے کر ڈراتی ہو کیوں
تمہی کیا فقط اک زمانے میں ہو — جو مشغول یوں آزمانے میں ہو"
"کوئی زوج ایسا بھی عاشق ہوا — الجھتا ہے یہ عورتوں سے مُوا
جوانی کے یہ زور یارب! گھٹیں — ٹھہر مردوئے، تیری مونچھیں کٹیں"

غرض ایک گھمسان کا رن پڑا — بڑا سخت ہنگامہ برپا ہوا
کوئی شیر دل کو بچانے لگا — کوئی رن زدی کا دل بڑھانے لگا
پٹیٹو[5] کے ویفر[6] برسنے لگے — بم ایٹم کے کانوں میں بسنے لگے
ہر اک سمت کانی بکھرنے لگی! — محبت بلا موت مرنے لگی!
پیالی کے گولے سے پھٹنے لگے! — جیالے جواں دور ہٹنے لگے
کسی نے لی ہاتھوں میں ساسر[7] کی شیلڈ[8] — کسی کو بنی چھوڑتے وار فیلڈ[9]
پڑی ہے جو پھر چاکلیٹوں کی مار — دیا نشہ عشق سب کا اُتار
ٹرے[10] ایش کی سر پہ توڑی گئی — "ٹیر گیس[11]" اس طرح چھوڑی گئی
اب لو وہ "کمبیٹ[12]" ہونے لگا — لڑائی میں رنگ آ گیا ناچ کا
چلے بے تکلف وہ نینوں کے بان — نئے ہنر کے وار مینوں[13] کے بان
پڑے کچھ کے پنج کے قبضوں پہ ہاتھ — کسی نے دی دشمن کو جوتوں سے مات
کہیں تیر مژگاں کے چھوڑے گئے — کہ پھولے جلے دل کے پھوڑے گئے
ہوا میں وہ بازو تھرکنے لگے — وہ مژگاں کے خنجر چمکنے لگے
عجب گرم بازار مستی ہوا — گراں سخت سودائے ہستی ہوا
چھڑا ہر طرف آہ و نالہ کا راگ — اُجڑنے لگے، ہونے والے سہاگ

---

[1] Satire طنز [2] Exchange تبادلہ [3] Ammunition گولہ بارود [4] Arrange منظم
[5] Potato آلو [6] Wafer ورق [7] Saucer طشتری [8] Shield ڈھال
[9] War-field میدانِ جنگ [10] Ash tray خاکدان [11] Tear gas اشک آور گیس
[12] Combat دست بدست مقابلہ [13] Warmen جنگ باز

بہت امنِ عالم کو خطرہ ہوا
کہ اک کوریا اور پیدا ہوا
گئے بھاگے ڈیٹر[۵۱] میجر کے پاس
مینجر کے غائب ہوئے سب حواس
کیا فون عجلت میں یو۔این۔او[۵۲] کو
کہ حل اس کا شاید یو۔این۔او ہی ہو
خبر اس کی اخبار کو لگ گئی
جہاں سے پھر اغیار کو لگ گئی
چلے سب کے دیکھیں تماشا ذرا
تماشا پھر اس پر تماشا نیا

حکومت کو بھی سخت تشویش تھی
"یہ ہے داخلی جنگ یا خارجی"
نوعیت تھی پیچیدہ کچھ اس قدر
پہنچنی تھی دشوار تہ تک نظر
ابھی فیصلہ کرنے پائے نہ تھے
اُڑان ایک بھی بھرنے پائے نہ تھے
کسی نے خبر دی کہ لو آ گئے
نمائندے یو۔این[۵۳] کے بھیجے ہوئے

سناؤں تمہیں ان کے حالات بھی
مناسب ہے ہو جائے یہ بات بھی
وہ اربابِ خوش فکر عالی مقام
فراست کا جن کی زمانے میں نام
فلاطون بھی جن کو سجدہ کرے
ارسطو بھی جن کی سمجھ پر مرے
لسانی طلاقت میں ملتے ہوئے
زبانی رفاقت میں ملتے ہوئے
سیاسی مسائل میں وہ سوجھ بوجھ
کہ تھے سب نشینانِ بامِ عروج
جو ناقدری کا چاہے گھر میں شکار
مگر دوسرے ملک میں تیس مار
جو دکھ درد میں خلق کے پیش پیش
لبوں پر شکر آستینوں میں نیش
کوئی روس کا سچا خدمت گزار
کسی پر یو۔ایس۔اے[۵۴] کا فینٹم[۵۵] سوار

حکومت کو کیا کم تھے پہلے ہی کام
بچاری کو تھا چین لینا حرام
جدھر دیکھو اخبار رکھے ہوئے
بلاؤں کے انبار رکھے ہوئے
کسی شے کا ٹائم نہ کوئی مقام
فقط کام سے دُھن کے پوروں کو کام
کبھی غور حالات کے موڑ پر
کبھی پاک امریکی گٹھ جوڑ پر!
کبھی ایشیا کو جگانے کی دُھن
کبھی دشمنوں سے بچانے کی دُھن
وہ اُدگھاٹنوں[۵۶] کے جھمیلے کہ بس
وہ جلسوں کے ریلے کہ ڈھیلے ہوں کس
اِدھر غم ہی غم تا حدودِ نگاہ!
اُدھر ننھی جانیں! خدا کی پناہ
نہ کھانے کی فرصت نہ پینے کا ہوش
نہ مرنے کی مہلت نہ جینے کا ہوش

---

۵۱ Waiter خدمت گار ۵۲ U.N.O. مجلس اقوام متحدہ
۵۳ U.N. اقوام متحدہ ۵۴ U.S.A. امریکہ
۵۵ Phantom بھوت ۵۶ افتتاحی تقریبات

مزید اب غمِ میزبانی ہوا — رسپشن[1] کیا، چائے پانی ہوا
کہا چار و ناچار خوش آمدید — یہ دن ہے ہمارے لئے روزِ عید
زہے آمدِ صاحبانِ شرف — توجہ کریں آؤ حل کی طرف
عجب کیا کہ یوں عقدۂ دل کھلے — رکاوٹ جو ہے آج حائل، کھلے

بچھایا گیا ہر طرف دامِ سخت[2] — سجایا گیا چودھراہٹ کا تخت
بٹھائے گئے اس پہ مہماں تمام — بصد شان و شوکت بصد اہتمام
پئے مشورت مجلس آراستند — نشستند و گفتند و برخاستند
طبیعت تو ہر چند بیکل رہی! — مگر خاصی اُس روز ہل چل رہی

وسائل تھے کم اور حالات سخت — پھنسا تھا مصیبت کی موجوں میں بخت
کسی کی سمجھ کام دیتی نہ تھی — گرہ کھلنے کا نام لیتی نہ تھی
بہت آ رہے تھے بھیانک خیال — بُرا جنگ کے ڈر سے تھا سب کا حال

الٰہی میں صدقے تری شان کے — جو لے کام نادان انسان سے
تری قدرتوں کا ٹھکانا نہیں! — کسی نے ترا بھید جانا نہیں
جسے چاہے تو، کیوں نہ ہو سرفراز — بنیں کیوں نہ نادان دانائے راز
نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار — تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار

اٹھا شخص اک ایسے حالات میں — کہ تھا ایک ہی جملہ حضرات میں
مخاطب ہوا اہلِ مجلس سے یوں — "اجازت اگر ہو تو میں کچھ کہوں
اہنسا پہ باپو جی عامل رہے — سدا قول میں اپنے کامل رہے
یہی راہ اک امنِ عالم کی ہے — یہی راہ اک ربطِ باہم کی ہے
اگر جنگ جُو اپنے ہتھیار لیں — اور ان کو سمندر میں جا پھینک دیں
تو یوں صورتِ امنِ عالم کھلے — کہ در جیسے کہتے ہی سم سم کھلے"

نہایت ہی معقول تجویز تھی! — جو بے چوں چرا سب نے منظور کی
مگر پھر عمل کا جو آیا سوال — تو سب ہوش اپنے گئے بھول بھال
بالآخر لگی ہونے پھر سے سپیچ[3] — یہ سوچا گیا اہلِ دانش کے بیچ
"سیاست میں ہے آج نازک وہ موڑ — کہ موسیقی ہے صرف ایٹم کا توڑ"
بُلائے گئے نامور اہلِ فن —! — بڑے خوش گلو اور نازک بدن
خیال' اور 'دُھرپد' کے مشاق سب — یہاں تک کہ دیپک میں بھی طاق سب

---

[1] Reception استقبال [2] پہرہ [3] Speech تقریر

الاپوں کے سب دل پہ چھانے ہوئے
ستاروں پہ تانیں اڑاتے ہوئے
پئے صلح نکلے کچھ اس شان سے

زمانے میں استاد مانے ہوئے
محبت کے نغمے سناتے ہوئے
کہ سنتے ہی جائے بشر جان سے

وہ نغمہ محبت کا گایا گیا!!
کہ اک بے خودی سب پہ چھانے لگی
فضاؤں سے نغمے برسنے لگے!
'رہا کوئی دانتوں میں انگلی کو داب'
'کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی'

فن اتنی بلندی پہ لایا گیا
لڑائی کی باتیں بھلانے لگی
خیالات پھولوں میں بسنے لگے
کہ جیسے نظر آئے تصویرِ خواب
رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی'

عجب عالمِ کیف پیدا ہوا!
ہوئے خوش فریقین ذیشان سب
گئی پٹ خلیج اختلافات کی —!

لبوں پر تبسم ہویدا ہوا!
کیا ایک "ناجنگ اعلان" تب
گھٹائیں چھٹیں ساری آفات کی!

خدا سارے عالم کو یہ دن دکھائے
ہر آغازِ بد، نیک انجام پائے

(بشکریہ "معیار")

نعیم قیصر

مانولاگ

شام کے دھندلکے!

گرمی کا ابتدائی مہینہ ہے۔ شام کے چار بج رہے ہیں۔ فضا نہایت ہی خوشگوار ہے۔ دو منزلہ پر نکہت کا کمرہ ہے۔ جو نہایت قرینے سے سجا ہوا ہے۔ کمرہ میں مغربی سمت ایک دریچہ ہے۔ جس کے قریب ایک مسہری بچھی ہے اس پر نکہت اور اس کی ایک سالہ بچی نزہت پہلو بہ پہلو سوئی ہوئی ہیں۔ کمرہ میں ہر طرف سکوت مسلط ہے۔ دفعتاً نکہت نیم وا آنکھوں سے کمرہ کا جائزہ لیتی ہے۔ پھر مسہری کی "چوں" کی بے ہنگم آواز کے ساتھ اٹھ بیٹھتی ہے۔ اپنی آنکھوں کو، ہاتھ سے مل کر اپنی متحیر نگاہ سے ایک دفعہ پھر کمرہ کا جائزہ لیتی ہے۔ اور زیر لب بڑبڑاتی ہے جس سے کمرہ کے پرسکوت ماحول میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔

"ارے میں یہ سب کیا دیکھ رہی تھی؟ —— خواب —— آگے آگے سفید گھوڑے پر.... سوار ایک حسین نوجوان جس کے لباس سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وہ دولہا ہو۔ ہاں! ہاں! وہ دولہا ہی رہا ہوگا۔ کیونکہ اس کے چہرے پر سہرے کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ اور ہاں! میں نے اس کے پیچھے ایک ڈولی دیکھی تھی جس میں ایک خوبصورت دلہن تھی —— بالکل نزہت سی حسین —— نہیں وہ نزہت ہی تھی"! ایک لمحہ رک کر نزہت کو مخمور آنکھوں سے گھورتی ہے۔ اور یوں گویا ہوتی ہے۔ "لیکن مری نزہت خلوص محبت کا پھول تو یہاں سو رہی ہے" —— خفیف وقفہ —— "شاید وہ اسکے مستقبل کا کوئی سہانا خواب رہا ہوگا" —— چھت کی طرف دیکھتے ہوئے۔ "خدا کرے ایسا ہی ہو —— اس کی زندگی اس قدر دراز ہو کہ میں اس کے سہرے کی کلیاں کھلتے دیکھوں" —— خفیف وقفہ

"مری گڑیا!" نکہت نزہت کے گال پر ایک شفقت آمیز بوسہ دیتی ہے —— "صرف ہاتھ پیر مارنے والی گڑیا! کچھ عرصہ بعد بیٹھنے لگے گی پھر کھڑی ہونے لگے گی۔ شاہد صاحب تجھے لبسکٹ دکھا دکھا کر چلانا سکھائیں گے۔ جب تو اچھی طرح چلنے لگے گی تو میں روزآنہ شام کو تیرا ہاتھ منہ دھلا کر کپڑے بدل دیا کروں گی۔ اور مری نزہت پھر شاہد صاحب کی انگلی پکڑ کر پارک میں گھومنے جایا کرے گی" —— خفیف وقفہ۔

"جب تو پڑھنے کے قابل ہوگی تو میں تجھے پڑھانے کے لئے بیٹھاؤں گی کبھی کبھی ایسا بھی ہوگا کہ تو پڑھنے سے انکار کرے گی تو میں تجھے مارونگی" ایک ہلکی سی چپت نزہت کے گال پر رسید کر دیتی ہے —— "تو روتی ہوئی شاہد صاحب کے پاس جائے گی۔ وہ بیٹی بیٹی کہکر تجھے گود میں اٹھالیں گے اور تجھے پیار کرنے لگیں گے۔ اور جب تجھ سے پوچھیں گے کہ بیٹی تجھے کس نے مارا؟ تو تو اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے میری طرف اشارہ کرے گی۔ اس طرح کبھی کبھی مجھ سے اور شاہد صاحب سے ہلکی سی نونک جھونک بھی ہو جایا کرے گی۔ کچھ عرصہ بعد تیرا داخلہ کسی گرلز اسکول میں کرا دونگی۔ تیری.... تعلیم کے بعد میں تجھے کسی اچھے گھر بیاہ دونگی" خفیف وقفہ —— "ہاں نزہت! برات لیکر ایک حسین دولہا آئے گا —— بالکل چاند سا حسین دولہا۔ ویسا ہی جیسا کہ میں نے ابھی خواب میں دیکھا ہے —— سفید گھوڑے پر سوار ایک حسین نوجوان" طویل وقفہ —— "ارے میں یہ سب کیا بک رہی ہوں یہ سب محض میرا خیال ہے"! —— خفیف وقفہ —— "کاش! آج شادی کا مسئلہ اتنا ہی آسان ہوتا جیسا کہ میرا حسین تصور لیکن نہیں! یہ تو صرف ایک حسین تصور ہے۔ یا ایک سنہرا سپنا جسے ہندوپاکستان میں لڑکی رکھنے والی ہر ماں دیکھا کرتی ہے لیکن ان کے سنہرے تار آج کے دقیانوسی رسوم کے تصور ہی سے ٹوٹ جاتے ہیں ....

....

....

—— —— .... —— اور یہ سب لڑکوں

کی بڑھتی ہوئی قیمت کا نتیجہ ہے " طویل وقفہ ——— " اُف! خود میرے ساتھ کیا کیا نہ ہوا ——— میں بھی تو اس سے دوچار ہو چکی ہوں ——— جب میں آٹھ سال کی تھی تو میری منگنی فہمین خالہ کے اکلوتے لڑکے سے کر دی گئی " ——— خفیف وقفہ ——— " اس وقت اماں کی کیا کیا آرزوئیں تمنائیں رہی ہونگی۔ ہمارے مستقبل کے متعلق انھوں نے کیسے سنہرے خواب دیکھے ہوں گے ———— ہماری یہ منگنی انھوں نے اپنی خلوص محبت کی یادگار قائم کرنے کے لئے کی تھی۔ اور اسی مناسبت سے میں اپنی منزہت کو خلوص محبت کا پھول کہتی ہوں "

——— وقفہ ——— " فہمین خالہ امی کی عزیز ترین سہیلی تھیں گویا ایک جان دو قالب۔ شاید انھوں نے دوستی کے رشتہ کو مستحکم ہی کرنے کے لئے اپنے اکلوتے لڑکے کے ساتھ میرا رشتہ طے کیا ——— ادھر اماں کی بھی یہی دلی خواہش تھی کہ ان کی دوستی انہی دونوں تک محدود نہ رہے بلکہ ان کی اولاد کے درمیان اور مستحکم ترین صورت میں رونما ہو۔ چنانچہ ایک دن فہمین خالہ نے امی سے کہا :- " بہن! میں یہ چاہتی ہوں کہ ہمارا رشتہ رفاقت اور مستحکم ہو جائے "

اس پر امی نے کہا تھا ——— " تو کیا تم کو ہماری دوستی کے استحکام میں شک ہو چلا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ایک دفعہ پھر ہم عہد وفا کریں " اس پر فہمین خالہ نے دل کی بات کہدی " بہن نہیں! یہ بات نہیں ہے۔ میں یہ سوچتی ہوں کہ زندگی کا کیا اعتبار اور ہماری دوستی بھی تو ہماری زندگی ہی تک ہے نہ۔ اللہ تعالےٰ نے ہم کو ایک لڑکا اور تم کو ایک لڑکی دی ہے تو کیوں نہ ہم ان کو ایک رشتہ میں منسلک کر کے اپنے خلوص اور محبت کی یادگار چھوڑ جائیں ؟"

اماں نے بھی جھٹ کہدیا ——— " بہن! میری بھی یہی خواہش تھی لیکن اس کے اظہار میں تم مجھ پر سبقت لے گئیں۔ لیکن اتنی جلدی کیا ہے "

اس پر فہمین خالہ نے کہا :- " یہ تو اچھی رہی۔ میں تو اسی ہفتہ منگنی کروں گی۔ اور ضرور کروں گی " ——— اور ایک ہفتہ بعد ہماری منگنی ہو گئی ——— وقفہ ——— " ابھی۔ ہماری منگنی کو مشکل سے ڈیڑھ سال گذرے ہوں گے کہ بربریت نے جنم لیا انسانیت نے خبیثیت کا روپ دھارا ننھی ننھی جانوں نیزے پر پرچم بنا کر لہرایا گیا .... ماں بہن بہو بیٹیوں کے ناموس لوٹے گئے اور یہ سب کچھ مذہب کی آڑ لے کر ہوتا رہا۔

پٹنہ بھی فساد کے شعلہ کے لپیٹ میں آ گیا " ——— خفیف وقفہ معصوم بچوں کو ان کی ماؤں کے سامنے بیدردی کے ساتھ شہید کیا گیا۔ عفت مآب عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ بوڑھے باپ کے سامنے جوان بیٹوں کو شہید کیا گیا۔ رحمت خالو بھی شہید کر دیئے گئے " خفیف وقفہ ——— " جب قدرے سکون ہوا تو جس کے ادھر سینگ سمائی ادھر کو ہو لیا۔ ہم لوگ بھی اپنے پیارے وطن کو خیرباد کہکر کلکتہ چلے آئے " وقفہ ——— " اس درمیان میں اعلان آزادی ہو گیا۔ اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس درمیان میں اماں کو اپنی عزیز ترین سہیلی کی برابر جستجو رہی " ——— خفیف وقفہ ——— " تحقیقات کے بعد صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ انھوں نے رحمت خالو کی شہادت کے بعد پٹنہ چھوڑ دیا اور وہ اپنے لڑکے کے ساتھ پاکستان میں ہیں لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ پاکستان کے کس حصہ میں ہیں۔ اسی چھان بین میں چار سال بیت گئے لیکن مزید کچھ پتہ نہ چل سکا " وقفہ ——— " اب میں جوان ہو چکی تھی ——— یعنی وہ مستقبل قریب آ چکا تھا جس میں بہن کے بیاہ کے تصور ہی سے بھائی کی کمر قبل از وقت بوجھل معلوم ہوتی ہے جس کے احساس سے باپ متفکر رہتا ہے اور قبل از وقت ضعیف بھی ہو جاتا ہے ——— اور یہ سب لڑکوں کے بڑھتے ہوئے بھاؤ کا نتیجہ ہے "

خفیف وقفہ ——— " ہاں تو اب میں جوان ہو چکی تھی۔ ادھر باوجود جستجو کے فہمین خالہ کا کچھ پتہ نہ چل سکا تو ابا اور امی نے مایوس ہو کر کئی جگہ باتیں کیں ——— بات چلتی رہی۔ کئی جگہوں سے خطوط آئے سبھوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رقم طلب کی "

وقفہ ——— " خود میری سگی چچی نے اماں کو لکھا تھا کہ بھابی! تم نے رفیع سے نکہت کے رشتہ کے بارے میں لکھا ہے تو یہ نہایت ہی نیک

ارادہ ہے، اس سال رفیع نے بی. ایس سی پاس کیا ہے۔ اور وہ انجینئرنگ پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کی خواہش ہے کہ اس کا رشتہ ایسی جگہ طے کیا جائے۔ جہاں سے اس کی تعلیم کا خرچ مل سکے یہ رشتہ سب کو پسند ہے لیکن لڑکے کی شرط کا ابھی تو سوال ہے۔؟"

خفیف وقفہ ——— "سعید خالو نے تو اپنے لڑکے رشید بھائی کے متعلق صاف لکھدیا تھا کہ رشید نے پچھلے سال بی اے کیا ہے اور ان دنوں ڈھاکہ سیکریٹریٹ میں نوکری کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی شادی کے لئے دس ہزار روپیہ کی شرط لگا رکھی ہے اگر آپ لوگوں کو منظور ہو تو تحریر فرمائیں۔"

طویل وقفہ ——— "نذیر احمد نے تو ٹھیک ہی کہا کہ شادی نام ہے میاں بیوی کو دنیا کی گاڑی میں جوتنے کا ———"

خفیف وقفہ ——— "ابھی اس قسم کے خطوط کا سلسلہ جاری ہی تھا اور ہر طرف سے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر "ڈاک" طلب کی جارہی تھی کہ ایک دن تار آیا۔ سب لفظ "تار" سن کر پریشان ہو گئے کیونکہ تار پیام مسرت سے زیادہ پروانۂ رنج والم ثابت ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ امی بے اختیار کہہ اٹھیں "اللہ خبر بد سے بچائے"۔

ابا نے لرزتے ہاتھوں سے تار لیکر پڑھا اور بے اختیار کہہ اٹھے۔

"شاہد؟"

"اجی کون شاہد؟" امی نے استفسار کیا "خدا خیر کرے" ابا نے کہا "وہی اپنا.......... یعنی تمہاری سہیلی فہمین کا اکلوتا لڑکا۔ شاہد"

"اجی ہاں! تو اس بچارے کو کیا ہوا" امی نے گھبرا کر پوچھا۔

ابا نے جواب دیا "ہوگا کیا؟ وہ لوگ چاٹگام میں ہیں اور شاہد کل یہاں آرہا ہے"

یہ سن کر سبھوں کے چہرے سے تفکرات کے بادل چھٹ گئے۔ میں یہ سن کر باورچی خانہ کی طرف ابا کے لئے چائے لانے چلی گئی جب وہاں سے چائے لے کر واپس آئی تو اماں کہہ رہی تھیں "تم اسے چھیڑنا" ابا نے چائے کی پیالی لیتے ہوئے کہا:-

"تم بھی عجیب ہو! اس دوران میں اس نے بی اے ایم اے کرلیا ہوگا۔ تو پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ ——— دس بارہ ہزار لئے بغیر شادی کرے ایسی حالت میں میں کیوں اپنی زبان خالی کروں۔ مان لو کہ میں تمہاری پسند اور اس کے مطالبہ کے مطابق اتنی رقم بھی کسی طرح قرض وغیرہ ملا کر دے بھی دوں تو اور جو تین لڑکیاں ہیں ——— ؟ ——— رفعت ——— عفت ——— اور عصمت"

دوسرے دن شاہد صاحب آئے اور ان کا دس دنوں تک قیام رہا۔ ان کی آمد سے جس قدر اماں کو خوشی ہوئی اتنا ہی فہمین خالہ کی موت کی خبر سن کر غم بھی ہوا ——— مجھے بھی اس کا صدمہ تھا کیونکہ وہ مجھے بہت عزیز رکھتی تھیں۔

اب تو فہمین خالہ کی موت کی خبر نے مایوس کر دیا تھا یہی وجہ تھی کہ شاہد صاحب سے رشتہ کے سلسلہ میں کسی قسم کی ابتدا نہ کی گئی چلتے ——— وقت شاہد صاحب نے اماں کو ایک خط دیا جس نے ان کی امیدوں کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ یہ خط فہمین خالہ نے بطور وصیت چھوڑا تھا

خفیف وقفہ ——— "اس میں لکھا تھا کہ بہن! میرے بعد تم ہمارے خلوص محبت کی یادگار رقائم کرنا ——— جس کی ہم لوگوں نے کبھی تمنا کی تھی" جب شاہد صاحب سے اس سلسلہ میں ان کے خیالات دریافت کئے گئے تو انھوں نے یہ جواب دیا کہ "ایک سعادت مند اولاد کی حیثیت سے ماں کے ہر عہد کا پورا کرنا میرا فرض ہے"

طویل وقفہ ——— "ان کی رضامندی تو ظاہر ہو چکی تھی۔ لیکن اب یہ سوال تھا کہ انہیں "کتنے" کی ضرورت ہے۔ کیونکہ رضامندی تو کتنوں کی طرف سے ہو چکی تھی۔ مگر انکی رضامندی ہمیشہ "حلقہ زر" میں محبوس رہتی۔ ادھر امی، ابا کا بھی ارادہ تھا کہ وہ شاہد صاحب کی ہر مانگ پورا کرینگی۔ چنانچہ جب ان سے یہ دریافت کیا گیا تو انھوں نے امی جان کو لکھا "خالہ جان! کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ میں بھی ایسی مذموم حرکت کر کے ایسے لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد میں ایک کا اور اضافہ کر دوں؟ میں تو انسانیت کے جسم پر ابھرتے ہوئے ایسے پھوڑوں کے لئے نشتر بننا چاہتا ہوں۔ میں آپ کے اور اماں کے خلوص محبت کی یادگار ان ذلیل رسوم کے گارے سے قائم نہیں کرنا چاہتا ———" اور دوسری نزہت! اسی خلوص محبت ——— کا پھول ہے ———"

نکہت سوئی ہوئی نزہت کو اپنے گود میں لیکر ——

"میری نزہت! تو بہت سو چکی۔ اٹھ۔ تجھے توان اونگھتے لوگوں کو بیدار کرنا ہے۔ آ! میں تجھے اپنی چھاتی سے لگالوں۔ تجھے اپنا دودھ پلا پلا کران رسوم سے ٹکرانے کے قابل کردوں"۔ نکہت نزہت کو دودھ پلانے لگتی ہے ——

—— اس وقت اس کی نگاہ دریچہ سے پار مغربی سمت افق پر ہے جہاں سورج غروب ہو رہا ہے۔ اس کی تابانیاں ماند پڑتی جا رہی ہیں اور وہ شفق کی سرخیوں میں تحلیل ہو رہا ہے۔ شام کا سرمگیں دھندلکا آہستہ آہستہ گہرا ہو رہا ہے۔ اس درمیان میں کمرہ میں بالکل سکوت چھایا رہتا ہے۔ جیسے نکہت کی سریلی آواز توڑ دیتی ہے "یہ رسم بھی بالکل شام کے دھندلکے کی طرح ہے جو آہستہ آہستہ گہرا ہوتا جائے گا —— پھر کائنات پر یکدم تاریکی مسلط ہو جائے گی اور پھر سورج کی پہلی کرن ......"

(حلقۂ تعمیر پسند مصنفین میمن سنگھ کی ایک نشست میں پڑھا گیا)

بقیہ مضمون صفحہ : ۴۹

اس تصرف کے بعد فنی عیب تنافر سو تی کا دکا سا) پیدا ہو گیا ہے خواہ مخواہ دلی سے مقابلہ کرنا کچھ مناسب نہیں اور نہ ضرورت ہے۔ شاعر نے پنجاب کا حسن بیان کیا ہے اور اس کا مقصد پورا ہو گیا۔

(۳) دریائے عشق سے دم تحریر حال دل
کشتی کی طرح میرا قلم داں بہہ گیا

دیوان ذوق میں آزاد نے یوں ہی لکھا ہے اور یہی صحیح ہے پر ضیر عنایت اور کیسری داس کے دیوان میں "عشق" کی جگہ "اشک" لکھا ہے "دریائے اشک" درست ضرور ہے لیکن وجہ اشک غیر واضح ہے "عشق" کا لفظ زیادہ بامعنی ہے۔ باقی اشعار درست ہیں.....

لیکن سب غزلیں ایسی ہی نہیں ہیں آئندہ کچھ ایسی غزلیں بھی آئیں گی جن میں بے طرح اور بے حد تصرف کیا گیا ہے÷

(باقی آئندہ)

باوقار تنظیم کی پہلی پرافٹ شیئرنگ سکیم

کیا ہے؟ یہ ایک باہمی بچت کی پرافٹ شیئرنگ سکیم ہے جس کا کوئی تعلق "طالع آزمائی" جوئے یا لاٹری جیسے غیر اسلامی اور ناجائز طریقوں سے قطعاً نہیں ہے جس کی وجہ سے آجکل کی عام "امدادی کمیٹیاں" بدنام ہیں۔ بلکہ یہ سکیم عام کاروبار کی طرح "شرکت نفع و نقصان" (اصول مضاربت) کے عین اسلامی اصول کے تحت جاری کی گئی ہے اور اسکے متعلق اہل الرائے اور مقتدر علمائے کرام سے تسلی کر لی گئی ہے۔

اغراض و مقاصد اچھے کام جب برے طریقوں اور برے ذرائع سے سرانجام دیئے جائیں تو وہ کبھی بھی اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتے اچھے کاموں سے اچھے نتائج پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ طریقے اور وسائل اچھے اختیار کئے جائیں۔ باہمی بچت کو اجتماعی صورت دیکر بوقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کرنا اور فالتو روپیہ کو نفع بخش تجارت میں جائز طور پر لگا کر اس کے شرکار کو فائدہ پہنچانا کسی طرح بھی معیوب نہیں ہو سکتا۔ مگر آج کل کی نام نہاد "امدادی کمیٹیوں" نے ایسی اچھی اجتماعی سکیموں کو بھی بدنام کر کے رکھدیا ہے۔ باوقار تنظیم کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ اس اچھے کام کو اچھے طریقے اور جائز ذرائع سے کیا جائے تاکہ اس میں حصہ لینے والے اسکے اچھے نتائج سے کماحقہٗ صحیح فائدہ حاصل کر سکیں۔ پس امداد کی عادت بلاشبہ ایک نیک عادت ہے۔ ایک دوسرے کی بوقت ضرورت مدد کرنا جذبۂ اخوت کا سرچشمہ ہے۔ سود سے بچ کر شرکت نفع و نقصان کے اصول پر تجارت کرنا اسلام کے اصول مضاربت کے عین مطابق ہے۔ ایسی اجتماعی چھوٹی چھوٹی بچتوں سے ملک کی صنعت و حرفت کو فروغ دینا، غریب اور نادار صنعتکاروں کو گھریلو صنعتیں قائم کرنے کے لئے سرمایہ فراہم کرنا سارے ہی بہترین سماجی کام ہیں۔ اس سکیم کے یہی چیدہ چیدہ اغراض و مقاصد ہیں۔

چیدہ چیدہ فوائد

- اس سکیم میں آپ پانچ روپے ماہانہ بچاتے ہوئے مقررہ مدت میں پانچ سو روپے کی کثیر امدادی رقم ایک دفعہ ضرور حاصل کرتے ہیں۔
- اس کے علاوہ آپ کو وہ بونس بھی ملتا ہے جو کمپنی لہٰذا اپنے منافع سے اس سکیم میں باقاعدگی سے حصہ لینے والے ممبران کے درمیان تقسیم کرتی ہے۔
- اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ کا ادا کیا ہوا روپیہ کسی حالت میں ضبط نہیں ہوتا۔ خواہ آپ نے ایک ہی قسط ادا کی ہو وہ بہرصورت وقت مقررہ پر ادا ہوتا ہے۔
- اشد مجبوری یا ناگزیر حالات میں آپ کا ادا کیا ہوا روپیہ پورے کا پورا یکمشت واپس بھی کیا جا سکتا ہے۔
- بوقت ضرورت آپ اپنے ادا کئے ہوئے روپیہ پر قرض حسنہ بھی لے سکتے ہیں۔
- اگر آپ چاہیں تو اپنے حقوق ممبری کسی دوسرے شخص کے نام منتقل کر کے اس سے اپنا ادا کیا ہوا روپیہ وصول کر سکتے ہیں۔

ایسا طریق کار، اتنی سہولتیں اور ایسی رعایتیں آپ کو "امدادی کمیٹیوں" میں نہیں مل سکتیں۔

انتباہ: مگر یاد رکھیئے کہ پانچ سو روپے کی امدادی رقم وصول کرنے کے بعد اگر آپ عہد شکنی کریں اور اپنی ماہانہ اقساط ادا کرنا بند کر دیں تو آپ کے تمام حقوق ممبری مستقل طور پر ضبط ہو جائیں گے۔

تفصیل کے لئے صدر دفتر سے قواعد و ضوابط اور فارم ممبری مفت حاصل کیجئے۔

نوٹ: کراچی اور دوسرے شہروں میں ایسے محنتی، دیانت دار، تعلیم یافتہ اور بارسوخ مردوں اور عورتوں کی ضرورت ہے جو بطور کمیشن ایجنٹ باوقار تنظیم کی اس سکیم کیلئے معقول معاوضہ پر ابتدائی ممبر سازی اور گروپ آرگنائزنگ کا کام کر سکیں تفصیلات صدر دفتر سے مفت حاصل کریں!

صدر دفتر: باوقار کمپنی لمیٹڈ۔ بالمقابل ماما پارسی گرلز ہائی اسکول بندر روڈ، کراچی

(فون نمبر:- ۷۹۲۳)

تذکرے اور تبصرے

کتاب :- پلاننگ پر ایک تنقیدی نظر ۔
مصنف :- عظمت اللہ خاں ایم ۔ اے (عثمانیہ)
ناشر :- مکتبہ سین نو ۔ جدید آغا پورہ ۔ حیدر آباد دکن
صفحات :- ١٣٦
قیمت :- ایک روپیہ

ہندوستان نے اپنے نئے معاشی منصوبہ میں سوشلسٹ معیشت کو اپنی منزل مقصود قرار دیا ہے اور ساری منصوبہ بندی اسی مقصد کے حصول کے لئے کی جا رہی ہے ۔ اس فیصلہ نے سوچنے سمجھنے والے ذہنوں کے سامنے کچھ نئے سوال ابھار دیئے ہیں ۔ آیا پلاننگ ناگزیر ہے ؟ کیا یہ مطلب ہے ؟ مغربی ممالک کے تجربات میں چیز کی نشاندہی کرتے ہیں ؟ پلاننگ اگر ہو تو اس کی نوعیت کیا ہو ؟ کس طرز کی پلاننگ ہو ——— اشتراکی یا جمہوری ؟ پھر کیا پلاننگ جمہوری اور اشتراکی ہو بھی سکتی ہے ۔ یا اس کی کچھ ناگزیر خصوصیات ([illegible]) ہیں جو ہر حالت میں ظہور پذیر ہوں گی اور محض جمہوری یا اشتراکی لیبل حقائق کو سرِ مو تبدیل نہ کر سکے گا ؟

یہ وہ سوالات ہیں جو جدید ذہن کو پریشان کر رہے ہیں ۔ یہ مسئلہ صرف ہندوستان کے سامنے نہیں ہے ۔ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک اس سے دوچار ہیں ۔ پیش نظر کتاب میں عظمت اللہ صاحب نے انہی سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے ۔

عظمت صاحب نے نظری حیثیت سے پلاننگ کی تعریف اس کے لوازمات اور نتائج کو پیش کیا ہے ۔ کتاب آٹھ ابواب میں بٹی ہے ۔ آخری دو ابواب میں اسلامی نظام معیشت کی بنیادی اقدار اور اس کے اہم خدوخال پیش کئے ہیں ۔ اسی ضمن میں ماڈل پلان کا ایک نقشہ بھی پیش کیا گیا ہے ۔

محترم مصنف پلاننگ کو ناگزیر نہیں سمجھتے ہیں اور پلاننگ کے جدید رجحان کو خطرناک تصور کرتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے پلاننگ محض ایک ([illegible]) ہے بے قید معیشت کی بے اعتدالیوں اور قباحتوں کے خلاف ۔ اور ایک ایسا ہی غیر متوازن اقدام ہے جیسا خود سرمایہ داری کا نظام تھا ۔ عظمت صاحب کا حاصل فکر یہ ہے کہ :- "اصل وجہ یہ ہے کہ انسانی ذہن جب خود نظام حیات تیار کرنے بیٹھتا ہے اور حالات مجبور کرتے ہیں کہ اجتماعی فلاح کو پیش نظر رکھا جائے تو سوشلزم جیسے نظام کی تخلیق ہی تک انسانی ذہن کی رسائی ہو سکتی ہے " اس چیز کو وہ سرمایہ داری اور پلاننگ دونوں کی ناکامی کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں اور اسلام کی آسان اور غیر پیچیدہ معیشت کی طرف دنیا کو دعوت دیتے ہیں ۔

کتاب ایک نہایت کامیاب کوشش ہے لیکن محترم مصنف کے نقطہ نظر میں (Brilliant One-sidedness) پائی جاتی ہے ۔ پلاننگ کو جن دلائل کی بنا پر وہ بالکل رد کرتے ہیں ۔ وہ محل نظر ہیں ۔ خود اسلامی نظام میں پلاننگ کے مقام پر ان کی بحث تشنہ اور غیر تسلی بخش (unconvincing) ہے ۔ جو حقوق اسلام دیتا ہے وہ بالکل absolute نہیں ہیں ۔ انصاف کے قیام کے لئے حکومت کی ضروری مداخلت اسلام نہ صرف جائز قرار دیتا ہے بلکہ اس کو حکومت کی ذمہ داری متصور کرتا ہے ۔
آج کی معیشت کے متعلق بھی بہت سے مقامات پر عظمت صاحب کا تجزیہ غیر حقیقت پسندانہ معلوم ہوتا ہے ہر وہ شخص جس نے معاشیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے یہ جانتا ہے کہ پلاننگ ایک ([illegible]) نہیں ہے لیکن اسکو ([illegible]) سمجھنا حد درجہ کی سادہ لوحی ہوگی نقطہ نظر کے ان اختلافات کے باوجود ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کتاب اس حیثیت سے نہایت کامیاب ہے کہ کچھ اہم مسائل کو نہایت خوبی سے ذہین طبقہ کے سامنے رکھتی ہے ۔ اگر اس سے پلاننگ کا موضوع سوچنے سمجھنے والے احباب کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے اور طلبہ کو مزید جستجو اور تحقیق کیلئے تحریک ہوتی ہے ، اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نتائج اس سے ضرور نکلیں گے ، تو یہ کتاب ایک نہایت

کامیاب [illegible] ہے۔

کاش چھپائی اور کتابت موضوع کے معیار کے مناسب ہوتی کتابت کی اغلاط کافی ہیں اور کچھ مقامات پر تو وہ بحث کی دلکشی کو داغدار کر دیتی ہیں۔ انگریزی الفاظ کی ([illegible]) میں بھی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے صرف کنیز کا نام ہی دو مقامات (صفحہ : ۹۱ ، ۹۶) پر مختلف [illegible] سے پیش کیا گیا ہے اور اسے کیا کہیئے کہ دونوں جگہ ہجے غلط ہیں!

(ا۔ ن)

کنیز (ناول)

تصنیف :- سید نظر زیدی

مطبوعہ :- ادارہ خواتین اچھرہ لاہور

صفحات :- ۳۰۸

قیمت :- تین روپے آٹھ آنے

سید نظر زیدی کی شخصیت پاکستان کے ادبی اور صحافتی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، خصوصیت کے ساتھ اسلام پسند تحریک کو اپنانے کے بعد انھوں نے کئی اچھے مضامین افسانے اور ڈرامے تصنیف کئے ہیں لیکن ناول کے میدان میں کنیز غالباً ان کی پہلی پیش کش ہے اور اس لحاظ سے زیدی کو بجا طور پر مبارکباد کا مستحق کہا جا سکتا ہے کہ ادب کے اس گوشہ میں بھی ان کی کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ "عورت پر اسلام کے احسانات" یہ اس ناول کا موضوع ہے اور اس موضوع کو اجاگر کرنے کے لئے زیدی نے تاریخ عرب کے اس دور کے پس منظر کا کام لیا ہے جب عورت کو گھوڑوں اور اونٹوں کے ساتھ فروخت کیا جاتا تھا اور گھوڑوں اور اونٹوں سے کم درجہ دیا جاتا تھا۔ جب باپ کی وفات کے بعد ماں بیٹے کو ترکہ میں ملتی تھی اور جب بیٹی کی پیدائش پر جھوٹی غیرت کا مدعی باپ اپنے ہاتھ سے اسے زندہ دفنا کر دیا کرتا تھا۔ اس تاریک ماحول میں جب اسلام کا آفتاب طلوع ہوا تو عورت کس مقام پر نظر آنے لگی۔ یہی بات نظر زیدی نے اس سادہ سی کہانی میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے ــــ ناول کی داستان میدان عکاظ کے میلے سے شروع ہوتی ہے اور غزوہ خندق پر انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ ناول کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا پیرایۂ بیان ہے جس کی نظر زیدی سے بہرحال توقع کی جا سکتی تھی۔ اس مختصر سی داستان میں مصنف نے جگہ جگہ منظر نگاری کا کمال اوج کو پہنچا دیا ہے اور زمانۂ جاہلیت کے عرب کی طرز معاشرت اور تہذیب کی تصویریں کھینچ دی ہیں۔ کردار نگاری میں بھی عربوں کے مخصوص طرز فکر، عادات و خصائل اور غیرت و شجاعت کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ مکالموں میں عربوں کا روایتی انداز خطابت اور طنز و تعلی سے لبریز گفتگو خاص طور سے ناول کی دلکشی کا باعث بن گئی ہے۔

ان خوبیوں سے قطع نظر ناول کو فن کے نقطۂ نظر سے اور زیادہ مکمل کئے جانے کی گنجائش باقی رہ گئی ہے۔ کہانی کی سادگی کو پس منظر کی دلکشی نے بہت حد تک چھپا لیا ہے پھر بھی پلاٹ میں تھوڑی سی کڑیوں کا اضافہ داستان میں مزید حسن پیدا کر سکتا تھا۔ عکاظ کے میلہ سے لے کر جنگ خندق تک کے طویل عرصہ نے ناول کے ایک نمایاں کردار سردار ابوخالد کے علاوہ اور دوسرے کرداروں کی نشوونما اور ترقی پر بہت کم اثر ڈالا ہے ــــ

ناول کا ہیرو زید ہماری نیم تاریخی داستانوں کا روایتی ہیرو ہے جس کی تلوار دوسری تمام تلواروں سے زیادہ تیز اور جس کا بازو دوسرے تمام بازوؤں سے زیادہ مضبوط ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابرین اسلام کے احترام کا تقاضا تھا کہ ان مقدس ہستیوں کا ذکر اس خیالی داستان میں براہ راست نہ کیا جائے۔ چنانچہ مصنف نے بڑے سلیقہ کے ساتھ جنگ خندق تک کے واقعات اس طرح بیان کر دیئے ہیں کہ سوئے ادب کا کوئی احتمال باقی نہیں رہا لیکن مسلمانوں کے شہر مدینہ سے ایک کافر لڑکی کا کافروں کے ہاتھوں اغوا ہونا جبکہ وہ ایک مسلمان کے یہاں مہمان تھی۔ حیرت کا باعث بن جاتا ہے اور یہ حیرت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب ہم اس لڑکی کی تلاش میں ناول کے ہیرو کے ساتھ صرف ایک مسلمان کو جاتے ہوئے دیکھتے ہیں جو اس لڑکی کا میزبان تھا ــــ جنگ خندق کی تیاریاں اس کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتیں ــــ اسلام کی نمائندگی کے لئے مصنف نے صرف دو کردار چنے ہیں اور ان میں بھی بوڑھا ہشام ایک مسلمان کی جگہ اپنے گمشدہ اکلوتے بچہ کا باپ زیادہ معلوم ہوتا ہے موضوع کے ([illegible]) میں بھی جہاں ناول ایک طرف زمانہ جاہلیت کی عورت کی بے بسی اور بے چارگی کی پوری پوری تصویر کھینچ دیتا ہے وہاں اسلام کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا ایک ہلکا سا تصور دیتا ہوا گزر

جاتا ہے اور پڑھنے والا محسوس کرلیتا ہے کہ وحشی قبائل کی تاریک بستیوں سے آگے مدینۃ النبی میں کوئی امن و مساوات کی جنت تعمیر ہو رہی ہے۔ لیکن اس جنت کی واضح تصویر نظر کے سامنے نہیں آتی نہ ہی قاری کو کافروں کی ستائی ہوئی عورت کے مقابلہ میں سایۂ اسلام میں پرورش پائی ہوئی کسی عورت کے کردار اور اس کے آرام و آسائش و آزادی کو جانچنے کا موقع ملتا ہے۔ اسلوب بیان میں معلوم ہوتا ہے کہ نظر زیدی نسیم حجازی سے بہت زیادہ متاثر ہیں چنانچہ جملوں کی ساخت اور انداز خطابت میں نسیم حجازی کا رنگ بہت زیادہ نمایاں ہے ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اردو تاریخی ناول کو نسیم حجازی نے اب اس معراج پر پہنچا دیا ہے کہ حسن بیان میں دلکشی پیدا کرنے کے لئے تاریخی ناول کے مصنفین کو ان کا تتبع کئے بغیر چارہ نہیں رہتا۔

بحیثیت مجموعی یہ ناول اگر اردو ادب کو کوئی نئی راہ نہیں دیتا تو مگر انکم ادب میں ایک اضافہ ضرور قرار دیا جاسکتا ہے۔

(ص۔ ش)

ماہنامہ "عفت" لاہور کا "سالگرہ نمبر"

قیمت سالگرہ نمبر:۔ ایک روپیہ آٹھ آنے

سالانہ چندہ:۔ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ:۔ آٹھ آنے۔

صفحات:۔ ۱۵۲

ادارہ خواتین کا ترجمان ماہنامہ عفت گزشتہ ایک سال سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور کوئی شک نہیں کہ اس قلیل عرصہ میں اس نے اپنے لئے پاکستانی جرائد میں ممتاز مقام حاصل کرلیا ہے عام ادبی اور اصلاحی مضامین اور نظموں کے علاوہ مستقل عنوانات مثلاً "معیاری خاتون" "عورتوں کی تحریکیں" "مشاہدات" "خوان رنگارنگ" "کشیدہ کاری" "پسند اپنی اپنی" کے تحت پاکستانی خواتین کا یہ محبوب جریدہ اب تک بہت سی معیاری تخلیقات پیش کرچکا ہے۔ زیر نظر شمارہ ادارہ نے سالنامہ کی حیثیت سے شائع کیا ہے ——— لیکن افسوس یہ خصوصی نمبر وہ تمام توقعات پوری نہیں کرسکا جو عفت کے گزشتہ عام پرچوں کو دیکھتے ہوئے قائم کی جاسکتی تھیں سالنامہ کے بیشتر مضامین اس احساس کے تحت لکھے گئے ہیں کہ وہ عورتوں کے لئے لکھے جا رہے ہیں جنہیں ادب سے کوئی مس نہیں ہوتا۔ ابن فرید کا نفسیاتی مطالعہ "گھریلو جھگڑے" "لالہ صحرائی کے مشاہدات" "دو نیلہ" وغیرہ اور اسعد گیلانی کا "مضمون نما افسانہ" اس کی مثالیں ہیں۔ نعمان صاحب کا افسانہ "سرگزشت" پڑھ کر سخت حیرت ہوئی کیونکہ موصوف نے ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کے مشہور ناول "پتھر سے ہیرا" کی تلخیص کرکے اسے افسانہ کی شکل عطا کردی ہے مگر انہوں نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا ———

ڈراموں میں نظر زیدی کی پیشکش "سزا" کو فن اور مقصد کے غیر متوازن امتزاج نے ڈرامہ کی بجائے ایک تبلیغی تمثیل بنا دیا ہے اور سلطان احمد صاحب کی تمثیل "چوراہا" ان کے ایک کیرکٹر دھوبی کی وجہ سے انتہائی مضحکہ خیز ہوگئی ہے نیر بانو کا مکالمہ "بلائے جان" ہر اس کی ہر ایک بات فن اور مقصد کے لحاظ سے ایک کامیاب تخلیق ہے۔ اس کے علاوہ "مسلم معاشرہ میں عورت کا اعزاز و احترام" "اسلامی ریاست میں عورتوں کے حقوق" "شادی کمیشن کی رپورٹ" "بچوں کی اسلامی تربیت" وغیرہ بھی چند معیاری اور قابل قدر مضامین پرچہ میں شامل ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اردو کے بیشتر اچھے شعرا کا تعاون حاصل ہوتے ہوئے بھی پرچے میں حصۂ نظم بے جان اور سپاٹ ہے ان چند خامیوں کے باوجود پرچہ کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ امید ہے کہ ادارہ آئندہ اس سے بہتر اور معیاری نمبر پیش کرے گا۔

(ص۔ ش)

"بچے کی تربیت" (از ابن فرید بی۔ اے)

صفحات ۲۰۸، قیمت:۔ ایک روپیہ بارہ آنے۔

شائع کردہ مکتبہ الحسنات رامپور۔

اسے کون تسلیم نہیں کرتا کہ آج کے بچے ہی کل اپنے ملک و قوم کی باگ ڈور سنبھالیں گے، لیکن اس حقیقت کے باوجود بہت کم افراد ایسے ملتے ہیں جنہیں اپنے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی خاص خیال ہوتا ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ "جھاڑ جھنکار" کی طرح یہ بچے بڑھتے ہیں...... اور پھر بڑے ہو کر وہ

گل کھلاتے ہیں جس کی جانوروں سے بھی توقع نہیں کی جاسکتی ..... یہ تو عام بچوں کا حال ہے آپ مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کی اہمیت کا اندازہ کیجئے اس لئے کہ ان نونہالوں کو نہ صرف اپنی ہی دنیا بنانی مقصود ہے بلکہ ان پر ایک اور بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خود راہِ حق پر گامزن ہو کر بھٹکی ہوئی انسانیت کی صحیح رہنمائی کریں .... اس اہم فرض کو صرف وہی افراد بخوبی انجام دے سکتے ہیں جن کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت شروع ہی سے ایسی بنیادوں پر کی جائے جس کے نتیجہ میں ایسی نسل پروان چڑھے جس سے دکھی دنیا کو سکھ چین اور شانتی نصیب ہو! ——— زیر نظر کتاب میں بچے کی تربیت کے اسی نفسیاتی پہلو کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ موضوع نیا نہیں ہے۔ انگریزی اور اردو میں اس انداز پر متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں، لیکن اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اور زبان کچھ اس قدر سلیس اور عام فہم استعمال کی گئی ہے کہ کم تعلیم یافتہ خواتین بھی اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ یہ کتاب ان والدین کی بہترین رہنمائی کر سکتی ہے جو اپنے نونہالوں کی صالح تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور جن کی یہ آرزو ہے کہ ان کی آغوش سے وہ نسل پروان چڑھے جو زمین پر بسنے والوں کے لئے باعث رحمت ثابت ہو اور جن کی کوششوں سے یہ جہنم نما دنیا ایک بار پھر رشک جنان بن سکے۔ (ف۔س)

---

(۱) "نوری نغمے"

صفحات ۴۸۔ قیمت چھ آنے

چھوٹے بچے ہلکی پھلکی اور مزیدار نظمیں بہت پسند کرتے ہیں۔ خوبصورت و رنگین ٹائیٹل اور بلاک کی چھپائی کے ذریعہ یہ ننھی سی کتاب ان بچوں کے لئے ترتیب دی گئی ہے جو بڑے ہو کر شمع کے مانند اپنے ملک پر چھائی ہوئی برائیوں کے اندھیرے کو دور کرنا چاہتے ہیں۔

---

(۲) "پھر پھر"

صفحات ۴۴۔ قیمت چھ آنے

تین لمبی، مزیدار اور چٹپٹی کہانیوں کا مجموعہ جسے نہ صرف بچے بلکہ بڑے بھی اگر پا جائیں تو بغیر ختم کئے "کھانا" نہ کھائیں۔ ٹائیٹل بھی اس قدر خوب صورت ہے کہ وہ بچے بھی اس کتاب پر دل و جان سے فریفتہ ہو سکتے ہیں۔ جنہیں کتابوں سے نفرت اور مطالعہ سے ازلی دشمنی ہوتی ہے۔ اور پھر سائز کچھ اس قدر مختصر اور چھپائی اس قدر دیدہ زیب ہے کہ بچے کسی قیمت بھی اسے اپنے سے جدا نہ کرنا چاہیں گے۔

---

(۳) "ایک تھا بادشاہ"

صفحات ۴۸۔ قیمت چھ آنے

ننھی منی آٹھ مزیدار کہانیاں، جنہیں پڑھ کر بڑے سے بڑے بچے کے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ کاش وہ بھی ایک اچھا بچہ بن سکے۔ خوب صورت رنگین ٹائیٹل۔ بلاک کی چھپائی۔

---

(۴) "گھمنڈی گرگٹ"

صفحات ۳۲۔ قیمت چار آنے

ابن فرید صاحب بی۔ اے کی لکھی ہوئی تین عجید دلچسپ کہانیوں کا مجموعہ۔ زبان بہت ہی آسان ہے۔ جسے ننھے بچے جنہوں نے صرف اردو کی پہلی کتاب ختم کی ہو۔ شوق سے پڑھ سکتے ہیں۔

(۵) "منے کی نماز"

صفحات ۴۰۔ قیمت پانچ آنے

ایک دینی ماحول میں ڈیڑھ دو سال کے معصوم بچے نے کس طرح نماز سیکھنا شروع کی؟ یہ بات "منے کی نماز" میں بہت ہی دلچسپ طریقے سے، کہانی کے انداز میں واضح کی گئی ہے، جسے پڑھ کر کہانی کا لطف تو خیر ملتا ہی ہے، نماز کا طریقہ بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ جس کا جاننا ہر مسلمان بچے کے لئے ضروری ہے۔ ٹائیٹل بہت خوب صورت، کتابت و طباعت عمدہ ہے۔

مندرجہ بالا کتابیں مکتبہ الحسنات، رام پور (یوپی) کی شائع کردہ ہیں۔ (ف۔س)

بلند معیاری

ی کے سبب حاذق دواخانہ کی تیار کردہ یونانی ادویہ

مشہور اور مقبول عام

ہیں

منیجر

حاذق دواخانہ

بندر روڈ - کراچی نمبر ۱

Printed at Mashhoor Press, McLeod Road, Karachi.

محمد ارشاد خان ●

"سارٹیفکٹ"

"نور..........." واہ۔ واہ۔

"نورانی........." اے سبحان اللہ۔

"نورانی ٹوتھ........." قربان جاؤں کیا بات پیدا کی ہے ظالم نے۔

"نورانی ٹوتھ پیسٹ......" مار ڈالا، مار ڈالا۔ واہ، واہ۔ سبحان اللہ۔

"تو حضور........." کیا کہنے ہیں اس "حضور" کے۔

"تو حضور یہ نورانی ٹوتھ پیسٹ کا قصیدہ ہے" ———— قصیدہ؟ غضب ہے غضب۔

———— اور دوسرے دن "شاعر" نے، جو "آسمان کی گردش" کے باعث نورانی ٹوتھ پیسٹ بنانے والی کمپنی کا "سیلز مین" بن گیا تھا، یہ قصیدہ اپنے Boss کی خدمت میں پیش کر کے صلہ (جسے آجکل تنخواہ کہتے ہیں) مانگا، تو اسے ایسا "سارٹیفکٹ" ملا جسے آج کل وہ سینے سے لگائے "بے روزگار" کے چکر لگاتا رہتا ہے اور اس کی زبان پر اکثر یہ مصرع رہتا ہے ؎

اے غم دوراں، اے غم جاناں

———— ●● ————

اصلاحی ادب کا ڈائجسٹ
(ممبر انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ماہنامہ مشیر کراچی

ٹیلیفون : ۷۲۲۳۹

جلد : ۷

شمارہ : ۱۲

دسمبر ۱۹۵۶ء

مرتبہ
عبدالغفور بیگ

فی پرچہ : آٹھ آنے + سالانہ : پانچ روپے
بھارت میں ترسیلِ زر کا پتہ : پندرہ روزہ "الحسنات" رام پور (یوپی) بھارت

ترتیب

پرنٹر پبلشر عبدالغفور بیگ نے [illegible] پریس سے چھپوا کر دفتر رسالہ مشیر بندر روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک لمحہ فکر

اشتراکی نظام سے عوام وخواص نے کیسی کیسی توقعات قائم تھیں !! انہی عوام اور خواص میں شاعروں اور ادیبوں کی بھی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ کتنے ہی ادیب اور شاعر خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ کمیونزم کو انسانیت کے تمام امراض کا ایک ہی علاج اور جملہ مسائل حیات کا واحد حل سمجھنے لگے۔ مقالات کے ذریعہ مارکس کے فلسفہ کو ادب اور تنقید کی بنیاد بنانے کی کوششیں کی گئیں طبقاتی کش مکش بڑھانے والے افسانے، ڈرامے اور ناول لکھے گئے۔ غزلوں اور نظموں میں "نئی سحر" اور "سرخ سویرے" کی آمد آمد کے گیت گائے گئے اور اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے اشتراکیت ادب کا نصب العین بن گئی۔

ادب پر اشتراکی اثرات کے اس قدر جلد چھا جانے کی سب سے بڑی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اشتراکیت کے علمبرداروں نے اُسے نہ صرف ایک اقتصادی نظام بلکہ مکمل نظام حیات کی حیثیت سے پیش کیا اور کسی ایک فرقہ، ملک یا قوم کے لئے فائدہ بخش قرار نہیں دیا بلکہ اسکے برعکس یہ بتایا کہ ہم جغرافیائی اور نسلی حد بندیوں سے آگے بڑھ کر پوری انسانیت کے لئے ایک پروگرام رکھتے ہیں۔ ہمارے اس نقشے کے مطابق اگر انسانی سماج کی تعمیر نو عمل میں آئی تو ہر طرف امن وسکون ہوگا۔ راحت اور مسرت ہوگی اور انسان کو وہ اطمینان قلب حاصل ہو جائیگا جس کے لئے وہ نہ جانے کب سے بیچین ہے۔

اس آواز میں چونکہ ایک آفاقیت تھی اس لئے ذاتی قومی اور ملکی مفاد سے بالاتر ہو کر انسانیت کے لئے سوچنے والے دماغ اور دھڑکنے والے دل اس سے متاثر ہوئے بعض لوگ ترقی پسندوں سے اس لئے ناراض ہیں کہ انھوں نے ادب کو نظریہ سے متعلق کر دیا۔ ہمارے نزدیک یہ کوئی معقول اعتراض نہیں ہے۔ اگر کچھ ادیبوں نے کسی مخصوص نظریہ زندگی کو انسانیت کی فلاح کا ضامن سمجھا تو اس کو فروغ دینے کی کوشش کرنا ان کے علم اور ضمیر کا فطری تقاضہ تھا۔

البتہ اس اعتبار سے کلام کرنا صحیح ہو سکتا تھا کہ اشتراکیت انسان کو جو کچھ دینے کا وعدہ کرتی ہے وہ فی الواقعہ اسے دے بھی سکتی ہے یا نہیں۔ پہلے بھی اس پہلو سے اشتراکیت زیر بحث آتی رہی ہے اور اس کا موقع آج بھی موجود ہے۔ بلکہ یہ بحث جتنی نتیجہ خیز آج ثابت ہو سکتی ہے اتنی پہلے نہیں ہو سکتی تھی۔ چونکہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے اشتراکی نظام کی تجربہ گاہ سویٹ روس کے حالات سے باخبر ہونا مشکل تھا اشتراکیت کے حامی کہتے تھے کہ نتائج انتہائی کامیاب اور حد درجہ اطمینان بخش ہیں اور فریق مخالف کا بیان تھا کہ معاملہ اس کے برعکس ہے اب خوش قسمتی سے صورت حال بالکل بدل گئی ہے اور یہ ممکن ہو گیا ہے کہ واقعات کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کر کے اس نظریہ حیات کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کی جا سکے جو ترقی پسند ادب کی بنیاد ہے اور ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکیں کہ جو توقعات شروع میں اس نظریہ سے قائم کی گئی تھیں ان کے پورا ہونے کے امکانات پہلے سے کچھ زیادہ نظر آتے ہیں یا اور کم ہو گئے ہیں۔

اس جائزہ کا خیال آتے ہی ذہن مسٹر خروشیف کی اس تاریخی تقریر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو خروشیف نے پچھلے دنوں بیسویں کمیونسٹ کانگریس کے موقع پر کی تھی۔ دل ودماغ پر تالے چڑھا لئے جائیں تو اور بات ہے ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اس طویل تقریر میں جو

انکشافات روس کے سب سے بڑے کمیونسٹ لیڈر نے کئے ہیں وہ ان لوگوں کو چونکا دینے کے لئے کافی سے زیادہ ہیں جو اشتراکیت کو برحق ثابت کرنے کے لئے سوویٹ روس کی طرف اشارہ کردینا کافی سمجھتے تھے جس نظام نے اپنے انتہائی عروج کے دور میں "خود غرض" "ظالم" اور "سفاک" شخصیت کو کروڑوں انسانوں کی زندگی پر اس طرح مسلط ہو جانے کا موقع دیا ہو کہ اس کے جیتے جی اس کی غلط کاریوں پر تنقیدی اشاروں تک کی جرأت ایک عظیم انقلابی قوم کو نہ ہوسکی تو ایسے نظام سے انسانیت کا مستقبل کس طرح وابستہ کیا جاسکتا ہے ؟

اس اعتراض کا جواب اشتراکی حلقوں کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ اس واقعہ سے کمیونزم کے اصولوں کی سچائی پر کوئی حرف نہیں آتا اتفاق سے ایک شخص پارٹی پر حاوی ہو کر غلط راہ پر چلا گیا تھا آئندہ احتیاط رکھی جائے اور ایسا نہیں ہوسکے گا ۔ نیز یہ کہ اشتراکیت ہی آج بھی انسانیت کی منزل مقصود ہے اور وہ اس کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے ۔ اپنے اس خیال کی تائید میں یہ لوگ بعض ان ممالک کے نام گنا دیتے ہیں جنھوں نے سوشلزم کے نظریہ کو اپنا لیا ہے ۔ اس جواب کے باوجود ہمارا اعتراض اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے ۔ جو چیز مقبول ہو رہی ہے درحقیقت وہ کمیونزم نہیں ہے بلکہ نیشنل سوشلزم ہے جو زیادہ سے زیادہ متعلقہ ملکوں میں بے روزگاری کا مسئلہ حل کر سکتا ہے اور وہ بھی انفرادیت روحانیت اور اخلاق کو بھینٹ چڑھا دینے کے بعد دنیا کے تمام ممالک بھی اگر نیشنل سوشلزم اختیار کرلیں تو "وحدت انسان" کا شعور بیدار نہیں ہوسکتا جس طرح شخصی حکومت کی بجائے جمہوری حکومت کا رواج ہو جانے سے انسانی تعلقات پہ کوئی صحت بخش اثر نہیں پڑا اور بادشاہوں کی لڑائیوں کے بجائے قومی جنگیں شروع ہو گئیں اسی طرح ملکوں میں سوشلسٹ حکومتیں بن جانے سے بھی انسانیت کے حق میں کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوگا ۔ اب اگر اشتراکی بلاک اور غیر اشتراکی بلاک کی چپقلش ہر وقت امن کو چیلنج کرتی رہتی ہے تو آئندہ سوشلسٹ ممالک کے مابین اسی طرح کے جھگڑے شروع ہو جائیں گے بلکہ شروع ہو گئے ہیں ۔ پولینڈ کا روس کی مرکزیت کو تسلیم کرنے سے انکار کرنا اور اس کے بعد ہنگری کی بغاوت اور اس کے نتیجہ میں روس کی فوجوں کا ہنگری کی فوجوں سے تصادم اور بڈاپسٹ کی سڑکوں پر بہتا ہوا انسانی خون یہ سب کیا ہے ؟ کیا ان تازہ واقعات سے ہمارے خیال کی تائید نہیں ہوتی ابھی تو ابتدا ہے انتہا نہ جانے کیا ہو ۔ اپنے ترقی پسند دوستوں کی خدمت میں ہم نے یہ چند سطریں پیش کردی ہیں ۔ وہ انھیں پڑھیں ٹھنڈے دل سے سوچیں اور اپنے ضمیر سے دریافت کریں کہ اس کا فیصلہ کیا ہے ۔

(حفیظ میرٹھی)

تلخ و ترش

- ... "معاہدۂ بغداد کے چار مسلم ممالک کی کانفرنس کی وجہ سے مصر میں جنگ بند ہو گئی" ۔ (مسٹر سہروردی)

  ——— پس یہ ثابت ہوا کہ دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے ان "چار بڑوں" کی کانفرنس ہی کافی ہے ۔

- ... "پاکستان کبھی اسرائیل کو تسلیم نہیں کرے گا " (وزیر اعظم پاکستان)

  "اسرائیل کو دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کرسکتی یہ ملک ہمیشہ قائم رہنے کے لئے بنا ہے" ۔ (وزیر خارجہ پاکستان)

  ——— اسی کو تو عوامی ری پبلکن " خارجہ پالیسی " کہتے ہیں ۔

جگر مرادآبادی ●

پہلے تو حسنِ عمل حسنِ یقیں پیدا کر پھر اسی خاک سے فردوس بریں پیدا کر

یہی دنیا کہ جو بت خانہ بنی جاتی ہے اسی بت خانے سے کعبے کی زمیں پیدا کر

روحِ آدم نگراں کب سے ہے تیری جانب اٹھ اور اک جنتِ جاوید یہیں پیدا کر

حسن و خاشاکِ توہم کو جلا کر رکھ دے یعنی آتشکدۂ سوزِ یقیں پیدا کر

غم میسر ہی تو اس کو غمِ جاوید بنا دل حسیں ہے تو محبت بھی حسیں پیدا کر

آسماں مرکزِ تخئیل و تصور کب تک آسماں جس سے خجل ہو وہ زمیں پیدا کر

دل، ہر قطرہ میں طوفانِ تجلی بھر دے بطن، ہر ذرہ سے اک مہرِ مبیں پیدا کر

بندگی یوں تو ہے انسان کی فطرت لیکن ناز جس پر کریں سجدے وہ جبیں پیدا کر

پستیٔ خاک پہ کب تک ہے یہ بے بال و پری پھر اسی خاک سے فردوس بریں پیدا کر

عشق ہی زندہ و پائندہ حقیقت ہے جگر
عشق کو عام بنا ذوقِ یقیں پیدا کر

(بشکریہ "ایشیا")

ماہرالقادری •

بصد ادائے دلبری وہ جانِ جاں بدل گیا
کبھی نگاہ پھیر لی، کبھی زباں بدل گیا

یہ انقلاب تھا تو پھر عجیب انقلاب تھا
کہ آگ تو وہی رہی مگر دھواں بدل گیا

وہی ہے دام افگنی وہی خلوصِ دشمنی
یہ کیا ہوا برائے نام آشیاں بدل گیا

ہمیں تھے راہِ عشق میں جو صاحبِ وفا رہے
کوئی یہاں بدل گیا، کوئی وہاں بدل گیا

خوشی کی چھاؤں ہی نہیں غموں کی دھوپ بھی تھی جب
ذرا ذرا سی دیر کے لئے سماں بدل گیا

(بشکریہ "تعمیرِ انسانیت")

انور صدیقی ●

سَیرُ ـــــــــ ایک تنقیدی جائزہ

اگر تعمیری نظم نگار شعراء کی تمام نظمیں میرے سامنے رکھ دی جائیں اور مجھ سے چار بہترین نظموں کے انتخاب کو کہا جائے تو میں بڑی بے تکلفی کے ساتھ اعظم ادیب کی "چاندنی رات"، نعیم صدیقی کی "اگر میں چاہوں"، ابوالمجاہد زاہد کی "عالمی حکومت" اور رشید کوثر فاروقی کی "سیر" کو اٹھالوں گا۔ اس وقت اس کا موقعہ نہیں کہ ان تمام نظموں پر اظہار خیال کروں۔ رشید کوثر فاروقی کی نظم "سیر" میرا موضوع ہے۔ لہٰذا اسی پر اپنی رائے ظاہر کروں گا۔

مجھے جولائی ۱۹۵۶ء کی وہ رات ابھی اچھی طرح یاد ہے جب "ادارہ تعلیمات اسلام" کی بالائی منزل پر ادارۂ ادب اسلامی کا ہفت روزہ اجتماع ہو رہا تھا۔ رشید کوثر فاروقی بڑی بلند آہنگی سے اپنی نظم "سیر" اپنے مخصوص انداز میں پڑھ رہے تھے۔ ان کی آواز میں تیزی بھی تندی بھی، دفور تھا ـــــــ ایک شعلۂ نوا مطرب کے گلے کا وفور! رہ رہ کر ان کی آنکھوں میں چاندنی چمک اٹھتی تھی۔ میں دم بخود ان کی نظم سن رہا تھا۔ جیسے کسی نے مجھ پر تنویم کا عمل کر دیا ہو۔ زاہد صاحب مجھ سے بھی زیادہ از خود رفتہ ہو رہے تھے۔ کوثر صاحب بڑی بے نیازی سے اپنی نظم پڑھ رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کمزور اور ناتواں جسم میں کتنی قوت حیات ہے۔ کتنا پختہ شعور ہے۔ کتنا اضطراب ہے، کتنی سوزش ہے، ان کی آواز کا سیماب مضطرب تھا ـــــــ اور ہم سب مضطرب تھے۔ تعمیر پسند حلقہ کی چیزوں کے سننے میں آج سے پہلے اتنا لطف نہ آیا تھا یہ اس وجہ سے کہ اس حلقہ کا مجموعی ادبی مزاج مبلغانہ اور واعظانہ تھا ـــــــ اور اب بھی بڑی حد تک ہے۔ میں ادب میں غایتی میلان کا سختی سے قائل ہونے کے باوجود ادبی تقاضوں کا التزام بہت ضروری سمجھتا ہوں۔ میرا یہی رجحان کبھی کبھی مجھے اب بھی مایوس کرتا رہتا ہے۔ میں شروع سے ادب میں اوّل درجے کی چیزوں کا جویا ہوں۔ دوسرے اور تیسرے درجہ کی چیزیں میری نظروں میں ذرہ برابر بھی نہیں جچتیں۔ اور ظاہر ہے کہ ہر ادبی تحریک میں کثرت ایسی ہی چیزوں کی ہوتی ہے۔ رشید کوثر صاحب کی نظم "سیر" سے میری بڑی تسکین ہوئی اور میں نے یہ محسوس کیا کہ اب ہمارے حلقہ میں ایسے لوگوں کی آمد شروع ہو گئی ہے جو اپنے پچھلے ادبی ورثہ پر فخر کا جذبہ رکھتے ہوئے بھی ادب کو ارتفاع (Sublimation) کی منزل پر پہنچا سکتے ہیں۔ رشید کوثر صاحب ابھی چند سال پہلے ہمارے ادبی حلقے میں آئے ہیں۔ اس سے پہلے وہ مختلف کوچوں کی سیر کرتے رہے ہیں۔ کبھی وہ کانگریسی بنے، کبھی وہ کمیونسٹ ہوئے اور کبھی لایقینیت اور عدمیت (Nihilism) کے اندھیروں میں بھٹکتے رہے۔ شعری اسالیب کے سلسلے میں انھوں نے لکھنؤ اسکول سے بہت زیادہ اثر قبول کیا ـــــــ وہ لکھنؤ اسکول جس میں ہیئت پرستی اور الفاظ کی بناوٹ بہت مقبول ہے۔ کوثر صاحب بھی عرصہ تک لفظی پینترہ بازی کرتے رہے ہیں ـــــــ "نگار معنی" کو انھوں نے دوسرے بہت سے لکھنوی شعراء کی طرح نظر انداز کیا، غالباً یہ تمام چیزیں ان کے اندر جعفر علی خاں اثر کی شاگردی کی وجہ سے آگئی تھیں اب بھی کبھی کبھی ان کے یہاں لکھنؤ کا یہ انداز جھلک اٹھتا ہے۔ ان کی نظم "سیر" ان اثرات سے پاک ہے۔ لیجئے تھوڑی دیر ہم ان کی نظم "سیر" کے ساتھ تخیل کے شہپر کھول دیں اور دیکھیں کہ کوثر صاحب ہمیں زندگی کائنات اور سماج کے کن گوشوں کی سیر کراتے ہیں۔

تعمیری تحریک شعر و ادب میں انفرادی کوششوں کو جانچنے اور پرکھنے کی روایت ابھی بہت پیچھے ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بہت سی چیزیں ـــــــ اچھے معیار کی آتی ہیں مگر ان کا کوئی نوٹس ہی نہیں

لیا جاتا۔ لوگ صرف زبانی طور پر داد شجاعت دے کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ صحیح تنقید اور پرکھ ہماری تحریک میں ابھی بہت فقدان ہے رشید کوثر فاروقی کی نظم کا تجزیہ امید ہے کہ انفرادی کوششوں کے جاننے کی روایت کو ہمارے یہاں آگے بڑھانے میں محرک ثابت ہوگا۔

"سیر" میں بائیس بند ہیں۔ کوثر نے ان کی ترتیب بڑے سلیقہ سے کی ہے۔ ان میں فطری تسلسل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوثر کو نظم کی ہیئت (Architectonics) پر کتنی قدرت ہے نظم کی ابتدا بڑے ہی فکر انگیز انداز سے ہوتی ہے۔

"دوست، اے دوست! اُدھر دیکھ وہ تارا ٹوٹا"

مصرع سنتے ہی سامع چونک اٹھتا ہے۔ اس کے ذہن میں بجلیاں کوندنے لگتی ہیں۔ وہ فکر و جذبے کا عجیب پیکر بن جاتا ہے۔ اس کے تخیل میں دور تک ایک روشن لکیر کھنچ جاتی ہے ——— وہ پیرا صحراب بن کر شاعر کے ساتھ آمادہ سفر ہو جاتا ہے۔ سامع شاعر کا ہم سفر تو ہوتا ہے مگر اس کا تعلق شاعر سے "مرید ہندی" اور "پیر رومی" والا نہیں ہوتا۔ اس کے دل کی دھڑکن شاعر کے دل کی دھڑکن کی طرح تیز ہو جاتی ہے۔ دونوں سیر کو نکل جاتے ہیں۔ سماج کی تلخ حقیقتیں، سماج کے مظالم، سماج کی بے انصافیاں، اس کا جبر، اس کا استبداد اس کی ناہمواری اور اس کا عدم مساوات، سب کے سب، تخیل کے آئینہ خانہ سے ٹکرانے لگتے ہیں۔ خارجی حالات کی یہ پراگندگی، شاعر اور سامع کو بہت متاثر کرتی ہے۔ وہ ان تلخ حقائق سے آنکھیں ملاتے ہیں۔ کبھی طنزیہ ہنسی ہنستے ہیں اور کبھی آنسو بہاتے ہیں۔ طربیہ اور المیہ کا ایک عجیب امتزاج اور سنجوگ پوری نظم میں نظر آتا ہے۔ شاعر و سامع پراگندہ حالات سے متاثر ہو کر کائنات کی رعنائیوں پر نظر دوڑاتے ہیں تو ان میں انہیں ایک "شعور ترتیب اور توازن" نظر آتا ہے۔ کائنات کے یہ مظاہر انہیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس کا سکون، خرام نما، اور اعتدال ان کے لئے ایک درس بصیرت رکھتے ہیں ——— آسمان پر پھیلی ہوئی بساط کو کب دعوت لے کے دامن فکر و نظر کو کھینچتی ہے۔ شاعر فطری طور پر یہ سوچنے لگتا ہے کہ اس کائنات کا خالق کوئی ضرور ہے جس کے شعور کا یہ کرشمہ کائنات کے نظم و توازن کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ ادب کی مادی توضیح کرنے والے، یہاں شاعر پر فراریت کا الزام لگا دیں گے۔ مگر میرے خیال میں یہ فرار نہیں ہے بلکہ عرفان ہے۔ اگر اسے فرار ہی پر محمول کیا جائے تو اس فرار کی نوعیت ہی دوسری ہوگی۔ (Robert Lynd کے الفاظ میں یہ زندگی سے فرار نہیں ہے بلکہ زندگی میں فرار ہے۔ زندگی اور کائنات کی حقیقتوں سے فرار واقعی مذموم ہے مگر ایسا فرار جو زندگی کو اور زیادہ بھرپور اور معنی خیز بنائے مستحسن ہے۔

رشید کوثر فاروقی نے کائنات کی غایتی تخلیقات پر ہی زور دینے کے لئے یہ نظم لکھی ہے مگر اسے سمجھانے کے لئے۔ قاری اور سامع کے ذہن میں اتار دینے کے لئے انہوں نے بڑا ہی نفسیاتی انداز اختیار کیا ہے، انہوں نے ایسی فضا تیار کر دی ہے جس سے آدمی وہی کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو شاعر کے لاشعور و شعور کا جزو ہے بقول غالب تقریر کی لذت بھی اسی میں ہے۔

ادب و شعر کا حسن اور اثر انگیزی اسی میں ہے کہ وہ ایک آفاقی حقیقت بن جائے۔ جو کچھ شاعر و ادیب کے ذہن و دماغ میں ہے وہ پورے طور پر قاری اور سامع کے ذہن میں منتقل ہو جائے ترسیل (Communication) میں ادب کا بہت بڑا حسن ہے ہمارے اکثر ادیب اس طرح کی بلند حقیقتوں کو سمجھانے کے لئے صرف اصطلاحات اور نعروں کا سہارا لیتے ہیں۔ ان اصطلاحات اور نعروں کی روح سے انہیں کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ حق و باطل خیر و شر قسم کے الفاظ کے استعمال ہی سے پوری حقیقت کو سامع کے دل میں اتار دینا چاہتے ہیں ——— اس کے لئے وہ واقعاتی بنیادوں پر کوئی اثر انگیز فضا نہیں تیار کرتے۔ رشید کوثر نے بہت ہی تلخ حقیقتوں پر سے پردے اٹھائے ہیں اور اس فن کاری سے اٹھائے ہیں کہ آدمی کائنات کے پیچھے ایک باشعور ہستی کے ادراک پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ بند اپنے اندر کتنا اچھا استدلال رکھتا ہے

غایت الفس و آفاق، تقاضائے حیات
ہے سہی کوئی۔ مگر علم گوارہ بھی تو ہو

اک توازن کی جھلک ایک شعور ترتیب
ذرّے ذرّے میں ہے، توفیق نظارہ بھی ہو

——— سچ بتا ہو کہ نہیں؟

اس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہمارے سماج کے ہر ادارے پر بڑے بے لاگ طریقے سے تنقید کی گئی ہے مگر اس بے لاگ تنقید میں بے رحمی نہیں ہے۔ کوثر اس دور کے دوسرے شعراء اور افسانہ نگاروں کی طرح تنقید کرتے کرتے کسی قسم کی سفاکیت (sadism) میں مبتلا نہیں ہو جاتے انھیں ہر وقت ہمارے مریض سماج سے ہمدردی ہے۔ انکی تنقیدوں میں ہمدردی کا بھرپور احساس انگڑائیاں لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ سماج کے مظالم کو دیکھ کر مضطرب ہو جاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام جس طرح چند لیس ہاتھوں کے لوچ سے کھیل رہا ہے انہیں کسی طرح بھی گوارا نہیں ہے ۔

دیکھ! یہ طنطنہ، دبدبہ، رامش و رنگ
سیٹھ صاحب کی حویلی یہی کہلاتی ہے
کیسی فریاد کی آواز، یہ آئی سُن تو
میری عصمت مرے اللہ، لٹی جاتی ہے

——— ابتلا ہے کہ نہیں؟

یہ بند اپنی جگہ پر ایک مختصر افسانہ ہے۔ وہ افسانہ جو اپنے اندر بڑی تلخ حقیقت رکھتا ہے۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام جو بڑی تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہے کس قدر لذتیت کا شکار ہے یہ بند اس حقیقت کی ترجمانی کے لئے کافی ہے۔ کوثر نے بڑی فن کاری کے ساتھ اس حقیقت کو آشکارا کیا ہے کہ اس میں ذرا سی بھی لذتیت نہیں آنے پاتی، ہماری تحریک کے دوسرے فن کار بھی ایسی جگہوں پر ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ مفلسی کس طرح آجکل عصمت فروشی پر ہماری "نازنینان حرم" کو مجبور کر رہی ہے اس کی ایک اور حقیقت آمیز تصویر ملاحظہ ہو ۔

دیکھ اس غمزدہ مجبور بھکارن کی طرف
سہمی سہمی سی ہے برقع سے نکالے ہوئے ہاتھ

صحنِ زیرلبی کیا ہے، سنا کچھ تو نے
بخشئے آپ مرے گھر کو شرف آج کی رات

——— بے حیا ہے کہ نہیں؟

یہ پورا بند اپنے اندر بڑی محاکاتی کیفیت رکھتا ہے۔ غمزدہ مجبور بھکارن کی پوری تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ شاعر کے ذہنی پردے (mental Plate) پر مرتسم ہونے والی تصویر پورے طور پر قاری کے ذہن میں منتقل ہو جاتی ہے، یہ کوثر کے معجز نگار قلم کی قوت ہے۔

آج ہمارے ملک میں اشتراکی طرز کے سماج کی نعمتوں کے بڑے تذکرے ہو رہے ہیں۔ اسے ایک مثالی سماج کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔ ہمیں اس کے رنگین اور التباس انگیز خواب دکھائے جا رہے ہیں۔ اس سماج کی ایک خیالی تصویر (utopia) پیش کی جا رہی ہے، جن ذہنوں پر تصوریت کا غلبہ ہے اور جو زندگی کے تلخ حقائق کی تاب نہیں لا سکتے وہ اس خوابِ فردا سے پورے طور پر مطمئن ہیں، اور نہ صرف یہ کہ مطمئن ہیں بلکہ اس سے ایک طرح کی لذت حاصل کر رہے ہیں ——— کوثر کو اس خواب کی بے حقیقتی کا یقین ہے، انہیں اس بات کا پورا احساس ہے کہ یہ خواب ایک دن کابوس بن کر بہت سی حسین آرزوؤں کی نکہت آفریں وادی کے دامن میں شرارے بھر دے گا۔ دیکھئے کتنی بیباکی سے کہتے ہیں ۔

چپکے چپکے کہیں ہوتا ہے مرتب وہ نظام
زہر تو ہوگا مگر خیر سے میٹھا ہوگا
نہ تو قرنا ہی پھُنکے گی نہ کماں کڑکے گی
چلتی پھرتی ہوئی لاشوں کا تماشا ہوگا

——— مانتا ہے کہ نہیں!

کوثر فلسفۂ تغیر پر بھی بڑی اچھی نظر ڈالتے ہیں انہیں ان اقدار کا پورا شعور ہے جو اپنے اندر ابدیت رکھتی ہیں۔ جن پر تغیر کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ وہ سدا بہار تازگی اور رعنائی رکھتی ہیں۔ یہ بند اپنے شعور اور حسن کی وجہ سے ہمارے دامنِ نگاہ کو کھینچتا ہے ۔

ہر نئی چیز پر اب راں ٹپک پڑتی ہے
لیکن آتی ہے قامت کے تصور پہ ہنسی
قرنہا قرن ہوئے چاند جواں ہے اب تک
اور آکاش پہ تاروں کی کلیسیں بھی وہی
ــــــــــ واقعہ ہے کہ نہیں

میں نے اب تک بڑے اجمال و اختصار سے اس نظم کے موضوعات کا تجزیہ کیا ہے۔ اب مجھے یہ دکھانا ہے کہ اردو ادب کے سماجی پس منظر میں اس نظم کی کیا اہمیت ہے۔ اردو میں اس طرح کی نظمیں مجھے بہت کم ہی نظر آتی ہیں۔ صرف ایک ہی نظم ہے وہ ہے مجاز کی "آوارہ" اس میں اس دور کے خواب اور ان کی پائمالی پورے طور پر نظر آتی ہے۔ مجاز کی "آوارہ" میں بھی سماجی استبداد پر بڑی حساس تنقید ملتی ہے۔ مجاز ہمیں احساس کی شدت کے ہمارے بہت سارے گوشوں سے آگاہ کر دیتے ہیں جہاں سے وہ شعلے لپکتے ہیں جو ہمارے خوابوں اور آرزوؤں کو خاکستر میں تبدیل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ مجاز کی نظم میں جو بنیادی خامی رہ گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ آخر میں ایک شدید (sentimentalism) کے بعد تخریبی لہجہ اختیار کر لیتے ہیں اس لہجے نے اس نظم کو حد درجہ جذباتی بنا دیا ہے۔ نظم کے اسی حصہ میں مجاز کا فکری توازن رخصت ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کوثر کی نظم مجاز کی "آوارہ" سے ممتاز ہو جاتی ہے۔ کوثر مظالم کو محسوس کرتے ہیں۔ مگر وہ جذبات میں بہہ کر کف در دہاں نہیں ہو جاتے، وہ ان مظالم کو دیکھ کر سوچنے لگتے ہیں۔ وہ ان کے اسباب و علل کا تجزیہ کرنے لگتے ہیں۔ اس کے لئے وہ ایک حساس شاعر کی طرح کائنات کے مظاہر کی طرف دیکھتے ہیں انھیں پوری کائنات میں ایک نظم و توازن نظر آتا ہے برخلاف اس کے وہ انسانی معاشرے میں عدم توازن دیکھتے ہیں۔ یہ فرق (contrast) ان کے احساس کو تیز تر کر دیتا ہے وہ کائنات کی غرض و غایت کا تجزیہ کرنے لگتے ہیں۔ وہ کائنات جو گوئٹے کے الفاظ میں ایک سربستہ راز (open secret) ہے۔ کوثر کا فکری توازن ہر جگہ قائم رہتا ہے ــــــــــ ان کی فکری پختگی ہی انہیں دوسرے معاصر شعراء کی انتہا پسندی (Bohemianism) سے ممتاز کرتی ہے ــــــــــ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک تعمیری فنکار کے اندر ایسا ہی توازن ہونا چاہیئے اس نظم میں ایک طنزیہ انداز بھی کارفرما ہے یہ طنز بڑا ہی زود اثر ہے۔ مگر رشید کوثر نے اس طنزیاتی انداز کو آخر تک قائم نہیں رکھا ہے یہ اس نظم کی ایک اہم خامی ہے۔ نظم کے آخری حصہ میں یہ انداز بالکل ختم ہو گیا ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آخری حصہ میں فلسفیانہ تفکر کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اگر اس حصہ میں تفکر کے ساتھ طنز کو ہم آہنگ کر پاتے تو یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہوتا۔ پھر بھی ان کے اثر انگیز طنز کی ایک مثال بہت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

شاہ صاحب بڑے پہنچے ہیں ادب سے انھیں دیکھ
سندِ خلد مریدوں کے لئے لائے ہیں
ان کے اللہ نے انہیں خلد کی زحمت بھی نہ دی
حور و غلماں یہیں خلوت میں اتر آتے ہیں
ــــــــــ معجزہ ہے کہ نہیں!

مذہبی ریاکاریوں کے خلاف کتنا زبردست طنز ہے!

کوثر کی یہ نظم فنی اعتبار سے بھی بڑا حسن رکھتی ہے، مختلف بندوں کی ترتیب میں انھوں نے بڑی مہارت دکھائی ہے، یہ ترتیب قاری کو بڑی فطری معلوم ہوتی ہے۔ اگر بند اِدھر اُدھر کر دیئے جائیں تو وحدت تاثر میں کمی آجائے۔ ابتدا، وسط اور انتہا کا پورا افسانوی ربط اس نظم میں موجود ہے۔ اس نظم کی تکمیل خصوصیت کے ساتھ بڑی ہی فن کارانہ ہے۔ نظم کا آخری بند اپنے اندر بڑی بلیغ ایمائیت (suggestiveness) رکھتا ہے۔ جعفر علی خاں صاحب اثر نے اس نظم کو پڑھنے کے بعد نظم کے آخر میں یہ نوٹ لکھ دیا تھا کہ جوش ایسی جگہ مار کھا جاتے ہیں لیکن کوثر بڑی کامیابی کے ساتھ اس مرحلہ سے مسکراتے ہوئے گذر گئے۔ آخری بند آپ بھی سنئے اور کوثر کی فنکارانہ چابکدستی کی داد دیجئے ؎

دیکھتے دیکھتے کھلا گئی تارے کی لکیر
دہشت کا بار بہ اندازِ سپر ڈال دیا

پڑگئی جاگتی کلیوں کی تمناؤں پہ اوس
شانۂ شاخ پہ ہر پھول نے سر ڈالدیا
دیکھتا ہو کہ نہیں !
اس بند میں شدت احساس بھی ہے اور فن بھی۔
اس نظم کے مطالعہ کے بعد مجھے احساس ہوا کہ کوثر کے اندر
حیرت انگیز شعری صلاحیتیں پوشیدہ ہیں اگر وہ ان صلاحیتوں کو
بروئے کار لاسکے تو مستقبل کے ایک بڑے شاعر ہوں گے ——
ایسے شاعر جن کا دامن، دامنِ ابد سے بندھ جائے گا۔
(بشکریہ "نئی نسلیں")

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری دسمبر ۵۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہِ مہربانی آئندہ کے لئے اپنا سالانہ چندہ پانچ روپے بھیجکر ممنون فرمائیں۔ یا پھر خط کے ذریعہ اطلاع دیں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ دی، پی مطلوب ہے اور ایسی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ مینجر "مشیر" کراچی

۹۶۸ جناب ایس رحمٰن صاحب کراچی۔
۹۷ جناب ڈاکٹر کل احمد صاحب برنی کراچی۔
۹۸۱ جناب عقیل صدیقی صاحب، ملتان شہر۔
۹۹۲ مس کے۔ ایچ۔ خالد صاحب جالنوی کراچی
۹۹۵ شیخ عبدالحمید صاحب، عبدالغنی صاحب منٹگمری
۹۹۹ بیگم شجاع الرحمٰن صاحب، کراچی۔
۱۰۵۰ م، ع۔ صاحب۔ گجرات۔
۲۰۶۹ حفیظ الرحمٰن صاحب کراچی۔
۲۰۸۳ کوہ نور آپٹیکل ایجنسی، ممین سنگھ۔
۲۰۹۱ جناب چودہری فضل حق صاحب، بی اے (آنرز)
۲۱۵۰ جناب باقر احمد صاحب صدیقی کراچی
۲۲۳۴ جناب نور محمد خانصاحب، حیدرآباد دکن۔
۲۲۹۱ جناب میر غلام رسول صاحب، لاہور۔
۲۲۶۳ جناب حاجی ابراہیم عبدالستار صاحبان گوجرانوالہ۔
۲۲۶۷ جناب مولوی راحت الرحمت صاحب ایم اے گلگت
۲۳۰۱ جناب ڈاکٹر زین العابدین صاحب، سوات۔

۲۴۲۳ جناب سید علی حسین صاحب ہاشمی، شکارپور
۲۴۵۴ جناب سید احمد اللہ صاحب کراچی
۲۴۵۷ اے۔ ایچ۔ اے۔ رزاق صاحب، مارٹیمس۔
۲۴۶۰ جناب شیخ کریم بخش صاحب۔ بہاولپور۔
۲۴۶۹ جناب سکریٹری سپورٹس کلب، کالاکنڈہ
۲۴۷۰ جناب محمد یحییٰ صاحب، شاہ آباد۔
۲۴۷۱ جناب ایم اے، منصوری صاحب، کراچی۔
۲۴۷۸ جناب عبداللطیف صاحب ارائین، کراچی
۲۵۰۱ جناب محمد شمیم انصاری صاحب سعودی عرب
۲۵۲۳ جناب محمد عبدالرحمٰن صاحب کاظمی، جمشید پور
۲۵۲۴ محترمہ رقیہ سلطانہ، بیگم صاحبہ، ملتان شہر
۲۵۲۸ عبدالعزیز صاحب نعیم، گجرات
۲۵۲۹ سٹیٹ سنٹرل لائبریری، حیدرآباد دکن۔
۲۵۳۰ جناب رضی الدین صاحب صدیقی، بڑودہ۔
۲۵۳۱ محترمہ صدر صاحبہ فیض عام نسواں سکول، کانپور
۲۵۳۴ دوست محمد صاحب نمبردار، بہاولپور شہر

۲۴۱۹ محمد فاضل صاحب چودہری، راولپنڈی

آباد شاہ پوری •

عصرِ حاضر

دگرگوں ہوتا جاتا ہے کچھ ایسا کاخِ مینائی
مَلک بھی عرشِ اعظم پر ہیں حیرت سے تماشائی

ہوا عشاق میں پیدا یہ اندازِ جنوں کیسا
سمجھتے ہیں رگِ لالہ کو نوکِ خارِ صحرائی

ہزاروں بار کی گو آدمِ خاکی نے غواصی
نہ پائی اس نے لیکن قلزمِ فطرت کی گہرائی

فرنگی میکدے آباد ہیں رندانِ مشرق سے
زلالِ مغربی میں گرچہ مستی ہے نہ رعنائی

باایں صد ادّعائے حریتِ انساں کی محکومی
ہے ابلیسی سیاست کی یقیناً کار فرمائی

وہی لعنت ہے طاری خواجگی و حکمرانی کی
وہی جمہور کے پردے میں چنگیزی و دارائی

قبائے لالہ و گل چاک ہے دستِ جفا جو سے
گلستاں کا گلستاں ہے شکارِ ناشکیبائی

مسلط فہم و دانش پر خرد کی ہے فسوں کاری
کہ خاکستر میں اس کو ہے تلاشِ سوزِ سینائی

حدِ ادراک سے باہر ہوا جاتا ہے اب انساں
پئے عالم تہہ کن ہے نظر کی آشکارائی!

جمود کے لرزہ براندام تھے جن شہسواروں سے
طریقِ خانقاہی نے سکھا دی ان کو تنہائی

وہ مردِ حق لرز اٹھتا تھا جس سے عالمِ باطل
درِ اغیار پر کرتا ہے روز و شب جبیں سائی!

ہے شرق و غرب میں ہر سو جہادِ زندگی برپا
مسلماں کی زباں پر ہے حدیثِ جام مینائی

نظر کی تنگ دامانی مذاقِ صوفی و مُلّا
طریقِ ابلہ افرنگ غیروں سے شناسائی

مذاقِ گرم رفتاری سے جا پہنچے وہ منزل تک
یہاں گونجی نہیں اب تک اذانِ جادہ پیمائی

نوا سنجی میں شاعر نے جگر بھی خون کر ڈالا
نہیں ٹوٹا مگر اب تک طلسمِ خال زیبائی

ضمیرِ خار خس کو آرزو ہے شعلہ باری کی
مگر خاکِ فسردہ سوزِ نغمہ سے نہ گرمائی!

غلام آباد عالم میں مذاقِ فقر پیدا کر
جلالِ فقر ہے مرگِ کلاہِ تختِ کسرائی

کبھی وہ عصرِ حاضر میں پنپ سکتا نہیں ناداں
عطا جس کی نظر کو ہو نہ سوزِ برقِ سینائی

(بشکریہ "تسنیم")

ابنِ فرید

گیارہ آدمی —— ایک جزیرہ

اونچی اونچی لہریں سر پٹخنے لگیں۔ میل ڈیڑھ میل چوڑے پاٹ کے دریا میں چھوٹی سی کشتی ڈگمگانے لگی۔ دور، دور، وسعتِ نظر تک پانی اور آسمان کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ ان سب کے دل گم ہوئے —— شمع کی لو کی طرح تھرتھرانے لگے۔ زندگی کی اس مختصر سی کتاب کا آخری ورق اختتام کے قریب آچکا تھا۔ گھبراہٹ میں وہ سب کشتی میں کھڑے ہوگئے ان کے قدم ڈگمگانے لگے اور وہ ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ انھوں نے ایک دوسرے کا سہارا لینا چاہا، لیکن خوف اور گھبراہٹ نے ان کی عجیب کیفیت بنا رکھی تھی۔

ملاح چپو کو اپنی پوری قوت سے حرکت دیتے ہوئے چیخا۔

"بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ، کشتی الٹ جائے گی!"

اس کے گلے کی رگیں پھول رہی تھیں اور پسینے سے پیشانی شرابور ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کے پٹھے بری طرح پھڑک رہے تھے۔ لوگ ہراسانی کے عالم میں بیٹھنے لگے، لیکن موت کے شدید خطرے نے ان کے اس فعل سے بھی ملاح کو خوفزدہ کر دیا۔ وہ چلا اٹھا۔

"کیا کر رہے ہو؟ کشتی ڈبو کر چھوڑو گے کیا؟"

اور لوگ جیسے کچھ نہ سمجھ کر اس کا منہ تکنے لگے۔ پھر کشتی میں قدرے سکون پیدا ہوا۔ ملاح نے اپنے آبنوسی بازوؤں کو تیزی کے ساتھ حرکت دینی شروع کر دی اور طوفانی موجیں جھاگ اڑانے لگیں۔

پھر ایک ریت کا ٹاپو نظر آیا، جو غم آلود جزیرے کی طرح عین دریا میں ابھرا ہوا تھا۔ اور جس پر زندگی کے کسی امکان کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسے ٹیلے جن کو تیز بہتا ہوا پانی کچھ عرصے کے بعد فنا کر دے، ان پر سبزہ بھی اگنا پسند نہیں کرتا، لیکن اس لمحے گیارہ انسانوں سے لدی ہوئی کشتی اس کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ محض زندہ رہنے کی تمنا کے ساتھ! مسافروں میں ایک امید کی رمق پیدا ہوئی اور وہ ایک بار پھر منمنانے لگے۔ ملاح بڑی تیزی کے ساتھ کشتی کا رخ جزیرہ کی طرف موڑ رہا تھا اور مسافر بار بار گردنیں اونچی کر کے جزیرہ کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ اور بے چینی کے عالم میں پہلو بدل رہے تھے اور ملاح کی ہر حرکت پر وہ اس قدر مرعوب انداز میں نظر جمائے ہوئے تھے، جیسے وہ کوئی سانولا فرشتہ ہو، جس کے چنگل میں ان کی جانیں ہوں۔ اگر وہ چاہے تو یہی کشتی عفریت کا منہ بن جائے، ورنہ پھر اس پُرشور اور مواج دریا میں زندگی کا آخری سہارا۔

کشتی بدقت تمام جزیرہ یا ٹاپو سے آلگی۔ ملاح نے پھرتی کے ساتھ چپو پھینک دیا اور کشتی سے کود پڑا۔ پنڈلیوں تک اس کے پاؤں پانی میں غرق ہوگئے۔ پھر اس نے جھپٹ کر کشتی کا ایک سرا تھاما کھینچ کر نم اور دھنستی ہوئی ریت کے ٹاپو کے کنارے کشتی لگا دی اور چیخا۔

"بس جلدی سے اتر پڑو، کشتی کی خیر نہیں!"

لوگ مبہوت سے اپنی جگہ پر جمے رہے جیسے انھیں جزیرہ کے جزیرہ ہونے پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ملاح کا دل بہت تیزی کے ساتھ دھڑک رہا تھا اور اس کی سانس پھول رہی تھی اس پر بری طرح گھبراہٹ سوار تھی۔ وہ ایک بار پھر چلایا۔

"تم لوگ اترتے کیوں نہیں؟"

.........؟

"اترو، ورنہ میں کشتی چھوڑ دوں گا سب کے سب ڈوب مروگے۔"

مجبوراً ایک چھریرے بدن کے نوجوان نے کشتی کے باہر پیر نکالا اور ٹھنڈی اور بھیگی ہوئی ریت پر قدم رکھا۔ لیکن اس سے قبل کہ اس کا پورا پیر ریت پر پڑتا۔ وہ چیخ اٹھا۔ پانی کی نمی اس کے تلووں کے ذریعہ اس کے دماغ تک چڑھ گئی۔ اس نے اپنا پیر پھر کشتی میں کھینچ لیا۔ اور ملاح اس ہراس کو دیکھ کر پھر چیخ اٹھا۔

"تم لوگ نہ اترو گے؟ اچھا میں چھوڑتا ہوں کشتی"

اس آخری دھمکی کو سن کر سب نے یکے بعد دیگرے کشتی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ سرد بھیگی ہوئی ریت نے خوف سے ان کے دلوں کی حرکت کو بے انتہا تیز کر دیا۔ ان کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ اپنے گرد و پیش عجب بیچارگی کے عالم میں دیکھنے لگے۔

طوفانی دریا، بھیگی ہوئی ریت، نم آلود ہوائیں، وسعتِ نظر تک پانی، نیلا آسمان اور بادل　　جیسے ہر ایک چیز میں ان کے لئے خوف اور ہراس چھپا ہوا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے خلا میں تکتے رہے، کچھ تلاش کرتے رہے، شاید کوئی سہارا　!

لیکن جیسے اس موہوم خواہش کے عبث ہونے پر خود ان کو بھی یقین تھا۔ مگر وہ کیا کرتے، ایسی خواہش اگر اس وقت بھی نہ ابھرتی تو وہ کون سا وقت ہوتا جب وہ کسی ان ہونی بات کے منتظر ہوتے، مگر آہستہ آہستہ دن ڈھلنے لگا۔ روشنی ماند پڑنے لگی۔ افق کی سیاہی گہری پڑنے لگی اور ٹاپو کے کناروں پر موجوں کی پُرشور یورش نے سارے ماحول کو بے حد ڈراؤنا بنا دیا۔ ان کے مولوں جیسے دل اور بھی زیادہ دھڑکنے لگے، اور اب وہ کسی آنے والی کشتی یا انہونی بات کا انتظار کرنے کے بجائے اپنی اس بزدلی کو باتوں اور ہنسی کے ذریعہ شکست دینے کی کوشش کرنے لگے۔ ویسے بھی سارا دن بھیگی ہوئی ریت پر کھڑا رہنے کی وجہ سے ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے وہ انسان ہونے کے بجائے برف رکھنے کی تھیلیاں ہیں۔

ملاح نے اپنی کشتی کو ریت میں چھوٹا گاڑ کر باندھ دیا تھا۔ اور رسی کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے غمزدہ سا سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔

مسلسل تیز لہریں کشتی کے ساتھ کش مکش کر رہی تھیں اور ملاح کشتی کو ان سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر تیز تھپیڑے پر وہ رسی کو مضبوطی کے ساتھ اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ لیکن اس زور آزمائی نے اس کے ہاتھوں کو سرخ کر دیا تھا۔ اس کے پٹھے دکھنے لگے تھے اور اس کی ہتھیلیاں ورم کر آئی تھیں۔ اس نے کتنی ہی بار نظر اٹھا اٹھا کر ان لوگوں کی طرف دیکھا جسے اب تک سا نولا فرشتہ سمجھتے رہے تھے کہ وہ اس کی مدد کریں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک نے دور افق میں کسی اور سہارے کی تلاش کو ہی زیادہ اہمیت دی۔ آخر وہ اب اسے اہمیت بھی کیوں دیتے؟ اس کی اہمیت تو ختم ہو چکی تھی، پر شور دریا کے سامنے تو وہ بھی بے بس تھا۔

مگر جب اس کی آنکھیں بھیگ گئیں (شاید آنسوؤں سے) تو ان لوگوں میں سے ایک نوجوان نے خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ کر کشتی کی رسی کو تھام لیا۔ ملاح نے اس کی طرف بڑی ملتجیانہ نظروں سے دیکھا۔ جیسے وہ اس کی اس امداد کے لئے مدت دراز تک کا خوگر ہو۔

"تم تھک گئے ہو، ذرا آرام کر لو" نوجوان نے کشتی کی رسی کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

ملاح نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔

"اندھیرا بڑھ رہا ہے اور طوفان کے رکنے کی کوئی امید نہیں"

"طوفان؟ طوفان تو اب کتنے ہی دنوں کی خبر لے گا؟"

ملاح نے بڑے حزنیہ لہجے میں کہا۔

نوجوان نے اپنی چوڑی پیشانی پر حیرت اور استعجاب کے آثار پیدا کرتے ہوئے ملاح کی طرف دیکھا۔ دو چار پاس کھڑے ہوئے لوگ ان کی گفتگو سن کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لیکن تیز ہوا اور پر غضب موجوں کا شور کانوں کو بے کار کئے دے رہا تھا۔ ٹھنڈک، نمی اور گیلی ریت نے ان کے جسموں میں تھرتھراہٹ پیدا کر دی تھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو بازوؤں میں کسنا چاہا مگر سردی کی شدت میں کمی نہ ہوئی۔

"اف بے پناہ ٹھنڈک ہے! میرے بچوں کا کیا حال ہوگا؟"
نوجوان نے پھر ملاح کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھا اور
کشتی کو موجوں کی مزاحمت سے بچانا چاہا۔
"اگر مجھے خبر ہوتی تو میں آج بھوکوں سو رہنا گوارہ کر لیتا۔"
ملاح گلوگیر آواز میں بولا اور اپنے گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا
نمی نے اس کے جسم کو یخ بستہ کرنا شروع کر دیا۔ ملاح بڑبڑاتا رہا
"آہ میرے بچے، میرا گھر...... !"

چند جیں آئیں اور انھوں نے ٹاپو کے کناروں سے سر ٹکرا کر
دور تک چھینٹوں کی بوچھاڑ کر دی۔ تاریکی میں سکڑے ہوئے انسان
چونک پڑے۔ جیسے کوڑوں کی ضرب سے ان کے بدن دکھ اٹھے ہوں
"منشی جی، کیا تم میرا دوشالہ بھی نہیں لائے تھے؟"
ایک تھلتھلے بدن والے شخص نے اپنے پاس کھڑے ہوئے
نحیف و نزار شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے سے
خوف اور ہراس کے ساتھ تحکمانہ شان ٹپک رہی تھی۔
نحیف و نزار آدمی خاموش رہا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔
تم نے مجھے دالکھانا تو تجوری میں بند کر دیا تھا نا؟"
دوسرا آدمی پھر بھی خاموش رہا اور تاریکی میں گھورتا رہا۔
"اور تجوری کی کنجی؟" اس نے اپنی جیبوں کو ٹٹولتے ہوئے
نحیف و نزار آدمی سے پوچھا۔
"جہنم میں گئی ۔۔۔ سیٹھ چپ رہو!" منشی بگڑ گیا
"نہیں نہیں، منشی جی، جلدی ڈھونڈو۔ میں نے جیب ہی
میں رکھی تھی۔ مگر...... مگر وہ کیا ہوئی؟ منشی جی بتاؤ دیکھو کشتی
میں تو نہیں گر گئی۔"
وہ گھبراہٹ کے عالم میں بسورنے لگا۔
"سیٹھ میں تمہیں دھکیل دوں گا پانی میں، ورنہ چپ رہو"
سیٹھ خوف سے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے روہانسی آواز میں
چیخ اٹھا
منشی جی میں تم کو نکال دوں گا۔ ورنہ فوراً ڈھونڈ لاؤ میری
کنجی! میری ساری پونجی لٹی جا رہی ہے، ساری پونجی!"
کہاں ہے تمہاری پونجی؟ کس کام کی ہے تمہاری پونجی؟ وہ
نہ لٹ رہی ہوتو بھی تمہارا کون سا دکھ دور ہو رہا ہے؟ اب نام نہ لینا
اپنی پونجی اور کنجی کا!"
سیٹھ زیر لب بڑبڑانے لگا۔ تاریکی میں ستارے خوفناک
آنکھوں کی طرح چمکنے لگے، اور بادلوں نے ان کو بھی نگلنا شروع کر دیا
ٹھنڈک اور شور اور بھی بڑھتا گیا۔ منشی کسی فکر میں کھویا رہا۔ شاید
اپنی ساری زندگی کی ذلت و خواری میں۔

اندھیرا بڑھنے کے ساتھ ان کے دلوں میں ہراس بھی بڑھتا
چلا جا رہا تھا۔ اس قدر شدید خنکی اور گیلی ریت میں۔ ان کے لئے
اب مزید کھڑا رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ایک نوعمر مگر خوش وضع نوجوان
نے اپنا کوٹ اتار لیا۔ ٹھنڈک اس کی نس نس میں چبھنے لگی لیکن اس
نے کوٹ کو تہہ کر کے ریت پر ڈال دیا اور اس پر بیٹھ گیا پھر وہ پاس
کھڑے ہوئے نوجوان سے بولا۔
"بیٹھ جاؤ یار۔ اب تو کھڑا بھی نہیں رہا جاتا۔"
پاس کھڑے ہوئے نوجوان نے مڑ کر دیکھا اور اس آرام کے
نئے طریقے کو پسند کر کے کوٹ تہہ کر کے فرش پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ لیکن وہ
دونوں پھر افق کی تاریکی میں گھورنے لگے۔
"وہ یقیناً آج پارک آئی ہوگی۔" پہلے نوجوان نے سکوت توڑا۔
دوسرا نوجوان خاموش رہا۔
"میں نے اس کے ساتھ کتنا اچھا پروگرام بنایا تھا۔"
دوسرا نوجوان پھر بھی خاموش رہا۔
دوست اگر آج میں پہنچ گیا ہوتا تو......"
دوسرا نوجوان مسکرایا۔
"ہونہہ۔ اب اپنی خیر مناؤ، اور اسے بھول جاؤ۔"
پہلے نوجوان نے ٹھنڈی سانس بھری اور خلاؤں میں تکنے
لگا۔ اس کی کنپٹیاں جلنے لگی تھیں۔ لیکن پھر اس کے دل نے سمجھایا
یہ وہ خود بھی سمجھ نہ سکا۔ اس کا دماغ تو کمی اور ٹھنڈک کی وجہ سے

مادف ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اندھیرا اور بھی زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اسے پاس کھڑے ہوئے انسانوں کی شکلیں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ صرف ایسے دھندلے خطوط جو سائے کی طرح کسی وجود کی نشاندہی کر رہے ہوں دکھائی پڑتے تھے اور تیز ہواؤں کے تمانچے غضبناک انداز میں لرزا دے رہے تھے۔ خوفناک موجیں بھپر بھپر کر جزیرہ کے چاروں طرف سر ٹکرا رہی تھیں۔ جھاگ اڑا رہی تھیں گیارہ آدمی زندگی سے مایوس ٹھٹھرے ہوئے کھڑے تھے۔

کاش اس دریا کے کنارے سمٹ آتے، اور وہ ریت کا ٹاپو ساحل سے جا لگتا۔

بڑا ہی بچکانہ سا خیال تھا۔ لیکن یہ اس مہیب تاریکی میں اس ادھیڑ عمر شخص کے ذہن میں ابھر رہا تھا جو اس شام سے پہلے اپنی بیوی سے یہ کہہ کر نہیں آیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور اس غم میں بے حال سا ایک طرف بیٹھا ہوا اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔

رہ رہ کر اس تاریکی، خنکی اور شور میں اس کی نگاہوں کے سامنے اس کی بیوی اور بچوں کے پیکر رقص کر رہے تھے۔ اُف رات اس قدر گزر چکی ہے وہ اب تک میرا انتظار کر رہی ہوگی اس نے کھانا بھی نہ کھایا ہوگا۔ یہاں کیسی تڑپا دینے والی ٹھنڈک ہے۔ ریت کی نمی کی وجہ سے خون جما جا رہا ہے معلوم نہیں اس نے بچوں کو ٹھیک سے بستروں پر اڑھا سلایا ہوگا۔ یا میرے انتظار میں اس نے بچوں کی فکر بھی نہ کی ہوگی۔ لیکن نہیں بچوں نے تو شاید ابھی کھانا بھی نہ کھایا ہو۔ وہ کہیں اس سے میرے بارے میں سوال نہ کر رہے ہوں، اور وہ ان سوالوں سے پریشان ہو کر کہیں اپنے پلو میں منہ چھپا کر سسکیاں نہ بھرنے لگی ہو۔ اسے کیا خبر میں کہاں ہوں۔ یہاں موجوں کا شور کتنا ہیبت ناک ہے۔ اُف میرے مالک میرا جگر پانی ہوا جا رہا ہے کہیں وہاں ایسی ٹھنڈک تو نہ ہوگی؟ اس نے کمروں کی کھڑکیاں ٹھیک سے بند کر لی ہوں گی یا ۔۔۔۔۔؟

اگر میں نے اس کو بتا دیا ہوتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں تو شاید لیکن اس سے کیا ہوتا؟ ــــ کسی کو کیا گمان ہو سکتا ہے کہ آنے والی گھڑی اس پر کیوں کر گزرے گی۔ آج رات آنکھوں میں گزار کر وہ میرا انتظار کرتی رہے گی۔ لیکن صبح؟ ــــ صبح اس کے لئے کس قدر مایوس کن ہوگی۔ آخر وہ ساری ذمہ داریاں جو میرے کندھے پر تھیں اس کے لئے پوری کرنا کیسے ممکن ہو جائیں گی؟۔۔۔۔۔۔۔

اسے اپنے بغیر سارا گھر شکر کے کھلونے کی طرح پگھلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے انتہائی غم اور یاس کے عالم میں اپنے ہاتھ زمین پر ٹیک دیئے لیکن نمی اور ٹھنڈک نے اس کے بازوؤں میں ڈنک سا مار دیا۔ اس نے گھبرا کر اپنے ہاتھ آپس میں رگڑنے شروع کر دیئے اس کے کولھے اور پیر پہلے ہی بیٹھے رہنے کی وجہ سے یخ بستہ ہو گئے تھے۔ اس نے اندھیرے میں ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی طرف عجیب بے چارگی کے عالم میں دیکھا۔ جیسے وہ خود کوئی ننھا سا بچہ ہو۔

اس تاریکی میں تین دیہاتیوں کو اکڑوں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اور اب درد سے ان کے گھٹنے چٹخنے لگے تھے انھوں نے غیر ارادی طور پر اپنے پیروں کو سیدھا کیا اور پھر اسی طرح بیٹھ گئے۔ وہ تینوں اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے وہ کسی برف کی الاؤ کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے ہوں۔ ان کے ہاتھوں میں اس وقت کچھ بھی نہیں تھا جس سے ریت کے سینے پر آڑی ترچھی لکیریں بناتے، نہ وہ بس خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ بالکل خاموش! اور اب تو ان کے دلوں میں بھی بے حد خوف بیٹھ گیا تھا۔ اور وہ ٹھنڈک سے تھر تھرا رہے تھے

جب تک ان کے وزنی دیہاتی جوتوں نے نمی جذب نہیں کی تھی انہیں دوسروں کے مقابلے میں بڑا اطمینان سا تھا مگر جب ان کے جوتے بھی بھسی ریت میں دو دو انگل دھنس گئے اور نمی نے ان کے تلوؤں پر برف کی سی مالش کرنی شروع کر دی تو پہلے وہ کافی دیر تک اپنے بھدے جوتوں کے اندر انگلیوں کو حرکت دیتے رہے مگر جب پیر اور زیادہ بھیگنے لگے تو وہ کسمانے لگے، انھوں نے ایک دوسرے کی طرف کئی بار مایوسی کے عالم میں نظریں اٹھا اٹھا کر

دیکھا مگر ان میں سے ہر ایک سمجھتا تھا کہ اس آفت سے ان میں سے
کوئی بھی کسی کو چھٹکارا نہیں دلا سکتا۔

ان میں سے ایک دیہاتی نے کھنکھناتے ہوئے اپنا گلا صاف
کیا، اور پھر کوئی گیت گانا چاہا، ویسا ہی گیت جو جاڑوں کی ٹھٹھرا
دینے والی سردیوں میں کھیتوں پر ان کے جسم کے اندر آگ بھر دیتا ہے
اور وہ موسم کی شدت سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں ـــــ لیکن اس
وقت اس بے ہنگم شور اور نم آلود ٹھنڈک کی وجہ سے اس کی آواز
اس کے حلق ہی میں اٹک کر، الجھ کر رہ گئی۔ اور اس کی بھرائی ہوئی
آواز نے اس کے پھولے ہوئے گلے کو اس قدر بدنما بنا دیا کہ اگر تھا یہ
تاریکی نہ ہوتی تو اس کے ساتھیوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔

آخرکار گیلی گیلی ہواؤں اور بھیگی ہوئی ریت نے اپنا اثر دکھانا
شروع کر دیا۔ ان گیارہ آدمیوں میں سے ایک بری طرح چھینکنے لگا۔
موجوں کی سرسراہٹ کے باوجود اس کی چھینکیں آس پاس کے لوگوں کے
کانوں میں بیکسانہ فریاد کی طرح گونجنے لگیں۔ وہ سب خوف کے
عالم میں چونک پڑے اور اپنے اردگرد دیکھنے لگے۔ لیکن وہ بے چارہ
شاعر اس وقت تخیل کی پرواز سے محروم ہو کر زندگی کے بڑے ہی
ہیبت ناک رخ کو دیکھ رہا تھا۔ جب سے وہ کشتی سے اس ٹاپو
پر اترا تھا اس نے کتنے ہی شعر موزوں کرنے کی کوشش کی تھی لیکن
وہ خود بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے اس کے
دماغ کو بالکل ناکارہ کر دیا تھا اور وہ بے حد مبہوت سا کھڑا ہوا پھٹی
پھٹی آنکھوں سے پرشور پانی کو تک رہا تھا۔

اور اب اس وقت اس کو ان سب لوگوں میں سب سے
بڑا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس کی نسیں کھنچ رہی تھیں، کنپٹی
پھٹی جا رہی تھی اور چھینکیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مگر تمام لوگ
جیسے اپنی جگہوں پر جم کر رہ گئے تھے۔ ان کے لئے جنبش کرنا بھی
ممکن نہیں ہو رہا تھا۔

پھر اس نوجوان نے ـــــ جو اب تک کشتی کی رسی
تھامے بیٹھا تھا۔ آہستگی کے ساتھ رسی ملاح کے ہاتھ میں دے
دی اور خود اٹھ کر شاعر کے پاس آیا اندھیرے کی وجہ سے وہ کچھ بھی
دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے شاعر کے بدن کو ٹٹولا۔

"کون؟" شاعر تھرتھرائی ہوئی آواز کے ساتھ بولا۔

"تمہارا ساتھی، مگر تمہارا سر کھلا ہوا معلوم ہوتا ہے" کشادہ
پیشانی والا نوجوان بولا۔

شاعر اس ہمدردانہ برتاؤ کی وجہ سے اب اپنی تکلیف شدت
سے محسوس کرنے لگا

"تم میری چادر اپنے کانوں پر لپیٹ لو"

کشادہ پیشانی والے نوجوان نے اپنی چادر اس کے کانوں
کے گرد لپیٹ دی۔ اور شاعر کا دل بیٹھنے لگا۔ اف وہ اپنے محسن
کے لئے شکریہ کے طور پر دو شعر بھی نہیں کہہ سکتا؟ اسے مسلسل چھینکیں
آرہی تھیں اور اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا اس گیلے
فرش پر سے اپنے پیر اٹھانے، مگر مشکل تو یہ تھی کہ وہ انہیں پھر
کہاں ٹکاتا۔

اس نے بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ ہی نوجوان کا شکریہ ادا
کرنا چاہا لیکن اسی لمحہ کوئی بے طرح چیخ اٹھا۔ سب کے دل
سینوں میں بری طرح دھڑکنے لگے جیسے کسی بہت بڑی بلا نے
گوشت کے اس لوتھڑے کو ان کے اندر ہی مسل کر رکھ دیا ہو۔
کشادہ پیشانی والا نوجوان آواز کی طرف لپکا۔ اس نے کسی طرح
پہچان لیا تھا، یہ چیخ ملاح کی تھی۔

"کیا ہوا؟" اس نے ملاح کے پاس پہنچ کر پوچھا۔

"کشتی چھوٹ گئی۔ پتوار ریت سے اکھڑ گیا، اور میں رسی
تھام نہ سکا" ملاح بسورنے لگا۔

سب ایک دم چونک پڑے جیسے ٹھنڈک کے باوجود
ان کے پیروں میں کیل لگ گئی ہو۔ وہ سب سمٹ کر ملاح کے
گرد جمع ہو گئے، اگر اندھیرا نہ ہوتا تو ان کی مایوسی اور حیرت سے
خود آنکھیں ان کی بے چارگی کا کھلا ہوا مظاہرہ کرتیں، لیکن تاریکی
میں صرف ان کی ٹھنڈی سانسیں ہی سنائی دے رہی تھیں
اور ملاح بسور رہا تھا۔

"میری ہتھیلیاں سوج گئی ہیں میں لہروں کا تھپیڑا برداشت نہ کر سکا۔"

"اب کیا ہوگا؟" کسی نے ایک سوال بھیانک اندھیرے میں اچھال دیا۔

"ایک آخری سہارا بھی گیا۔" کوئی ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔

"آخری سہارا کب تھی وہ؟ وہ تو پہلے ہی ناکارہ ہو چکی تھی۔" کشادہ پیشانی والا نوجوان مسکراتے ہوئے بولا۔

رات بڑی الم انگیز حالت میں گزری۔ موجوں کا شور، نمی اور تاریکی کی وجہ سے انجانے خوف نے ان کو بدحال کر دیا۔ اور صبح جب بادلوں کی پھٹی ہوئی چادر میں سے روشنی جھلکنے لگی تو وہی موجیں جو ان کی بے بسی پر غراتی رہی تھی اب اپنی ہیبت بلندی اور خوفناکی دکھا کر ان کے رہے سہے حواس بھی گم کرنے لگیں۔ وہ سہاروں کی تلاش کرنا چاہتے تھے لیکن نم ریت ان کے اندر اور بھی زیادہ برفیلی ٹھنڈک بھرتی جا رہی تھی۔ وہ بے انتہا مجبوری کی حالت میں دس بار دگز چوڑے جزیرے میں ادھر اُدھر پھرنے لگے۔ کچھ تلاش کرنے لگے اپنی بھوک مٹانے کے لئے۔ لیکن وہاں گیلی ریت، اونچی اونچی موجوں اور ان کی ہنسی اڑاتے ہوئے بادلوں کے اس پار چمکنے والے سورج کے سوا تھا ہی کیا۔ دن بڑھتا رہا اور نقاہت سے ان کے قدم بوجھل ہوتے رہے، اور طوفانی موجیں بے رحمانہ شور کے ساتھ ان کی مجبوری پر ہنستی رہیں۔ قہقہے لگاتی ہیں۔

شاعر کی حالت متغیر ہو گئی وہ شام ہوتے ہوتے نڈھال ہو کر گر پڑا، سیٹھ لرز اٹھا۔ دونوں خوش وضع نوجوان سہم گئے۔ دیہاتیوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ملاح کی سوجی ہوئی ہتھیلیاں دکھنے لگیں۔ ادھیڑ عمر آدمی کے سانس رکنے لگی اور کشادہ پیشانی والا نوجوان مضطرب ہو گیا۔ اس نے لپک کر شاعر کو ہوش میں لانے کی کوشش کی لیکن یہ اب آسان نہ تھا۔

اندھیرا پھر بڑھ گیا۔ برفیلی ٹھنڈک کا احساس اور بڑھ گیا جسم یخ بستہ ہونے لگے، نسیں چبھنے لگیں، خوف میں زیادتی ہونے لگی۔ اب زندگی کی کیا امید تھی؟ اب زندگی کی کوئی امید نہیں تھی!

سیٹھ بھی بے ہوش ہو کر گر پڑا، موجوں نے بھیانک قہقہہ لگایا۔ سیٹھ تمہاری کیفی؟ کشادہ پیشانی والے نوجوان نے پھر اپنی سی کوشش کی لیکن کوئی مدد نہ کر سکا۔

بادلوں کی درزوں سے ستاروں نے موت کے خنجروں کی طرح چمکنا شروع کر دیا۔ ہوا میں تباہی کا راگ گانے لگی، اور ہڈیوں کو برفیلی نمی کا گھن لگنے لگا۔ دونوں خوش وضع نوجوان بے ہوش ہو گئے، منشی بے ہوش ہو گیا۔ موجیں غرانے لگیں۔ کہاں گئے تمہارے رومان؟ — کہاں ہے تمہارا سیٹھ، کہاں ہے تمہارا آقا؟ —

کشادہ پیشانی والے نوجوان نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یوں دبایا۔ جیسے شدت کا درد ہو رہا ہو۔ تاریکی میں ساتھیوں کی کراہیں بڑھ رہی تھیں اور پھر غائب ہو رہی تھیں، لوگ بے ہوش ہو رہے تھے اور نوجوان کا دل رو رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیئے۔

"میرے رب میری مدد کر، مجھے قوت دے، میں اپنے ساتھیوں کی خدمت کر سکوں۔"

رقت سے اس کا گلا رندھ گیا۔ اور تاریکی اور موجوں کے دل ہلا دینے والے شور میں وہ ریت کی ناقابل برداشت نمی کی پرواہ کئے بغیر اپنے بے ہوش ہونے والے ساتھیوں کو اس طرح لٹاتا رہا کہ ایک دوسرے کے جسم کی گرمی ان میں سانس کی آمد و رفت کو باقی رکھ سکے، اور خود تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ان کے حلق میں پانی ٹپکاتا رہا۔ اس کے پیروں کی انگلیاں اور ہاتھ پانی میں بھیگنے کی وجہ سے کٹے جا رہے تھے لیکن ایک خواہش تھی جو اس کے اندر سے اس طرح کے تمام احساسات کو زائل کر رہی تھی، وہ اندھیرے میں بے سدھ جسموں کو ٹٹولتا رہا اور ریت میں ٹھوکریں کھا کر گرتا رہا اور دیہاتی اور ادھیڑ عمر والا شخص اور ملاح اس کے گرد یوں سمٹنے لگے جیسے وہ سب اس ناگہانی آفت سے بے حد خوفزدہ ہوں اور ان کا تحفظ صرف وہی کر سکتا ہے وہ جدھر جاتا وہ سب اس کے پیچھے جاتے۔

"اف اب کیا ہوگا؟" ادھیڑ عمر والا شخص بیوی بچوں کو بھول کر اب صرف اپنی زندگی کے لئے متفکر تھا۔

"گھبرایئے نہیں، ہمت سے کام لیجئے" نوجوان نے ہمت بندھائی۔

لیکن ملاح بھی اپنی کشتی اور گھر کے غم کو ترک کر چکا تھا اب تو اسے اپنی جان کا خوف ستا رہا تھا۔

"ہمت کہاں؟ اب تو کسی طرح نہیں بچ سکتے" ملاح بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ بولا۔

"اگر مرنا ہی ہے تو بزدلوں کی موت نہ مرو" نوجوان بڑے مستحکم لہجے میں بولا۔ تاریکی میں اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک کو کوئی نہ دیکھ سکا۔

"پھر ہم کیا کریں؟" ـــــ تینوں دیہاتیوں نے ایک ساتھ عجیب ملتجیانہ انداز میں سوال کیا۔

"مصیبت کو جھیلنے کی قوت پیدا کرو۔ اور اپنے مصیبت زدہ ساتھیوں کی مدد کرو یہاں تک کہ تمہارے ہاتھ پیر تمہیں جواب دے جائیں" نوجوان نے بڑے عزم کے ساتھ کہا۔

اس کے عزم کے نیچے موجوں کا شور دب گیا۔ لیکن ادھیڑ عمر شخص چکرا کر گر پڑا۔ سارے خاندان کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے والا زندگی کے اس بوجھ کو نہ اٹھا سکا۔ نوجوان نے بڑی شفقت کے ساتھ اسے اٹھا کر ایک طرف لٹا دیا۔ اور چاروں باقی سب کی خدمت کرنے لگے۔

تیسرا دن شروع ہو گیا۔ تاریکی چھٹنے لگی۔ روشنی بڑھنے لگی، لیکن اس روشنی کو دیکھ کر ملاح ایک دم چیخ اٹھا۔ اس کے یخ بستہ ہاتھ پیر لرزنے لگے اور اس کی آواز میں لکنت پیدا ہونے لگی۔ نوجوان اور تینوں دیہاتی چونک پڑے۔

"کیا ہے؟" ـــــ ایک دیہاتی نے ملاح کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"وہ ـــــ وہ" کہتے ہی ملاح کا اشارہ کے لئے اٹھا ہوا ہاتھ جھول کر گر گیا۔ اس کے ہونٹ بند ہو گئے، گردن ڈھلک گئی، اور وہ غش کھا کر لڑھک گیا۔

دیہاتی دوڑ کر اس طرف گیا جدھر ملاح نے اشارہ کیا تھا۔

"اف، موجیں جزیرہ کاٹے ڈال رہی ہیں"۔ وہ چیختا ہوا نوجوان کی طرف دوڑا۔

نوجوان نے اس کو اپنے نحیف اور نڈھال بازوؤں میں لے لیا۔

"گھبراؤ مت ہم اب بھی محفوظ ہیں۔ آؤ ہم دعا کریں کہ ہمارا رب ہمیں اس مصیبت سے نجات دے"۔

اور ان چاروں نے اپنی پیشانی بھیگی ہوئی ریت پر رکھ دی۔

دن گزرتا رہا، جزیرہ گھٹتا رہا، رات گھٹتی گئی، زمین کٹتی گئی، موجیں غراتی رہیں اور چار بے حد کمزور اور یخ بستہ جسم، دلوں سے مدد کے لئے دعا کرتے رہے اور ہاتھوں سے اپنے طویل وقفوں تک اپنے ساتھیوں کی مدد کرتے رہے۔ اندھیرے نے ان کے دلوں کو خوفزدہ کرنا چاہا، تنہائی نے انہیں ناکارہ بنانا چاہا، موجوں نے ان کے لئے زمین تنگ کرنی چاہی لیکن انھوں نے کسی کی پروا نہ کی۔ نوجوان اپنے ساتھیوں کی ہمت بندھاتا رہا، اور وہ سب شدائد سے ٹکر لیتے رہے۔

صبح ہوئی تو دس بارہ گز چوڑے جزیرے کے بجائے ان کے لئے صرف اتنی زمین باقی رہ گئی تھی کہ ان کے بے ہوش ساتھی ایک طرف پڑے تھے اور کبھی کبھی کوئی موج بڑھتی ہوئی ان کے پیروں کو تر کر جایا کرتی تھی اور وہ سب بری طرح کپکپا جایا کرتے تھے، لیکن طوفان گزر چکا تھا۔ دریا کا پانی پرسکون ہو چکا تھا البتہ اس قید تنہائی سے نجات کا اب کوئی امکان نہ تھا۔ بھوک، نقاہت ـــ اور ناقابل برداشت ٹھنڈک نے انہیں ناکارہ بنا رکھا تھا۔ وہ مسلسل نظریں جمائے ہوئے دور دور تک پھیلے ہوئے پانی پر کسی گذرنے والی کشتی کی تلاش کرتے رہے لیکن دن گزر گیا اور انہیں کامیابی کی کوئی صورت نہ نظر آئی۔ ان کے دل

مایوسی کے عالم میں بیٹھے جا رہے تھے لیکن ایک مخفی قوت تھی جس
نے انہیں اب تک سہارا دے رکھا تھا۔ دن ڈھلتا جا رہا تھا
اور انھیں مایوسی ہوتی جا رہی تھی۔

"طوفان تو ختم ہو گیا مگر اب تک کوئی کشتی گزرتی ہوئی نظر
نہیں آ رہی ہے؟" ایک دیہاتی بولا۔

"شاید اب چھٹکارا نصیب نہ ہو" دوسرا مایوس کن لہجہ
میں بولا۔

"اوہ تم اتنی جلد مایوس ہو گئے! جس نے ہمیں اتنے بڑے
بڑے خطرات سے نجات دلائی کیا وہ اب ہم سے نظریں پھیر
چکا؟" نوجوان نے کچھ اس طرح سوال کیا کہ سب کے دل،
جیسے بول اٹھے ——— نہیں وہ ہم سے بالکل نہیں!

وہ سب پھر دریا کی سطح پر دور دور نظریں دوڑانے
لگے اور پانی ان کے تلووں کو چھو کر بہنے لگا اور ان کے بدن میں
کپکپی پیدا کرنے لگا۔

"وہ کیا ہے؟" ایک دیہاتی چلایا۔

سب اس رخ پر متوجہ ہو گئے، دور ایک کشتی کا بادبان
سا نظر آ رہا تھا۔

ان کے دل ایک بے نام سی مسرت سے دھڑکنے لگے۔

"کشتی بہت دور معلوم ہوتی ہے" دوسرا دیہاتی بولا۔

"اس کو اپنی طرف بلانا بھی ممکن نظر نہیں آتا" تیسرا
دیہاتی بولا۔

"پھر بھی ہم اپنی سی کوشش کریں"

اور وہ اپنی پوری قوت سے چیخنے کی کوشش کرنے لگے، ہاتھوں
سے اشارے کرنے لگے۔ ہوا میں کپڑے اچھالنے لگے لیکن کشتی اپنا
بادبان پھیلائے ہوئے اسی بے اعتنائی سے بڑھتی رہی۔ وہ
اشارے کرتے رہے اور کشتی دور ہوتی گئی۔ ان کے دل بیٹھنے لگے۔

"کشتی والوں کو اب تک ہماری خبر نہیں ہو سکی ہے"

"کیا کریں کچھ سمجھ میں نہیں آتا؟"

"نوجوان کی آنکھیں مسرت سے ایک دم چمک اٹھیں۔

"اپنی چادر لاؤ" اس نے ایک دیہاتی سے کہا۔

چادر پھیلا کر اس نے گیلی ریت سے اس پر "بچاؤ" لکھا۔ اور
وہ سب اس چادر کو پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے دل دھڑک
رہے تھے، ان کی سانسیں اضطراب کی وجہ سے گرم ہو رہی تھیں
اور مسلسل چادر کے کونے پکڑے رہنے کی وجہ سے ان کے بازو شل
ہو گئے تھے لیکن کشتی اپنے رخ پر آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔

"اب کیا امید ہو سکتی ہے کشتی آنے کی؟" ایک دیہاتی
مضمحل ہو کر بولا۔

لیکن اسی لمحہ کشتی کے بادبان نے اپنا رخ بدل دیا۔

"معلوم نہیں یہ کشتی کدھر جا رہی ہے؟" دوسرا جھنجھلا کر
بولا۔

"کیا معلوم؟ اب تو اس نے رخ بھی پھیر لیا" پہلا
دیہاتی بولا۔

"خدا کرے ہماری طرف ہی آ رہی ہو" تیسرا عجب حسرت
کے عالم میں بولا۔

اور سب ٹکٹکی لگائے ہوئے کشتی کی طرف دیکھتے رہے۔
نوجوان مسکراتا رہا، اور کپڑے کے سرے کو اس طرح پکڑے رہا۔
جیسے وہ اپنے باقی تینوں ساتھیوں کے دلوں کو سہارا دے رہا ہو۔

جب ان کے دل ڈوبنے لگے، ان کے بازو شل ہونے لگے
ان کی آنکھیں دھندلانے لگیں تو انھوں نے محسوس کیا کہ کشتی کا
فاصلہ کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ ان کے سینوں کے اندر ایک دم
خوشی کے سوتے پھوٹنے لگے، ان کے مرجھائے ہوئے چہروں پر
مسرت کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے اپنے شل بازوؤں میں رہی
سہی قوت بھی مجتمع کرنی شروع کر دی، یہاں تک کہ کشتی ان سے
بالکل قریب ہو گئی، اور انھوں نے چادر کو ہاتھوں سے گرا دیا
نوجوان انتہائے مسرت میں زمین بوس ہو گیا۔ تینوں
دیہاتیوں نے بھی اپنی پیشانی زمین پر رکھ دی۔ ان کے پاس ہی
ناخدا ناکارہ پڑا ہوا تھا۔

قارون بے بس پڑا ہوا تھا۔
سرپرست بے دست و پا پڑا ہوا تھا۔
رہنما بے اثر پڑے ہوئے تھے۔
آرٹ مجبور پڑا ہوا تھا۔
رب اس سادہ دل اور واحد سہارے کے متلاشی انسان

کے رحم و کرم پر تھے جس کی پیشانی اس وقت سرد بھیگی ہوئی
ریت پر تھی، اور اسی حفاظت میں لے کشتی میں رکھ دیا گیا تھا

(ادارۂ ادب اسلامی کی ماہانہ نشست میں پڑھا گیا)
(بشکریہ تعمیر انسانیت)

اثر لکھنوی •

دیدار کہاں ممکن آہوش ہیں دیوانے — حیرت نے سجائے ہیں ہر سمت پری خانے

میخانۂ ہستی میں رندی اسے کہتے ہیں — خود اپنی ہی مستی کے دل آپ ہوں پیمانے

شعلے ہیں کہ رقصاں ہیں اک وجد کے عالم میں — شمع پہ جلنے کو بیتاب ہیں پروانے

ہشیاری و مدہوشی ہیں ایک ہی درجے میں — اس چشم خماری نے کھولے ہیں وہ میخانے

یاد آتے ہی راتوں کی اب نیند اڑاتے ہیں — وہ نیند بھری آنکھیں کہتی تھیں جو افسانے

للہ نہ ہنس ان پر جو آپ سے باہر ہیں — کیا جانیئے کیا سمجھیں دیوانے تو دیوانے

جو آگ کے شعلوں کو گلزار بناتے ہیں — اس شمع تجلی کے ایسے بھی ہیں پروانے

جب نفس کا اپنے ہی انسان پجاری ہو — تعمیر نہ ہوں کیونکر پندار کے بت خانے

کیا دورِ ترقی بھی کیا دورِ ترقی ہے — بیگانے ہوئے اپنے اور اپنے ہیں بیگانے

افسانۂ دافسوں ہیں ہمدردی و غمخواری — تڑپاتے ہیں یاد آکر گذرے ہوئے یارانے

کیا پیش کوئی پائے ایسے سے کہ جب پوچھو — کیا جانے کا کیا مطلب فوراً کہے کیا جانے

سب درس ہیں عبرت کے دیکھ آئے اثر ہم بھی
ہو مارتے وہ گھر جو عشرت کے تھے کاشانے

(بہ شکریہ "ماہِ نو")

اسمٰعیل ادیب ●

تین غلام ایک شہزادی

پہلا بولا: "آہ اس کا حسن جہاں سوز ہے، اس کی زلفیں ناگن ہیں اس کی مدھری آنکھوں میں اپسراؤں کی سی چمک ہے۔"

دوسرے نے کہا:۔ "اس کے جسم کے روئیں روئیں سے شباب پھٹا پڑتا ہے اس کے چہرے کے نقوش بلا کے جاذب نظر ہیں۔"

تیسرا مسکرایا: "اس کے لہجہ میں شیرینی ہے، وہ ہمیں بچوں کی طرح چاہتی ہے اس کا پیار انمول ہے۔"

تینوں مزدور نئی کوٹھی کے لمبے سائے میں بیٹھے چلم پی رہے تھے دوپہر کا وقت تھا چلچلاتی تیز دھوپ کے باعث ہر چیز چمک رہی تھی اس کی چمک کے ناخوشگوار اثرات کے باعث آنکھیں چندھیا سی جاتی تھیں۔ کوٹھی کا برآمدہ اداس تھا۔ سمنٹ کے چکنے فرش پر خزاں کی نذر ہوتے ہوئے پتوں کے لاشے پڑے سسک رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ صحراؤں کا سا سناٹا۔ ویسی ہی ہمی۔ یہ تین پیاسے ـــــ جنہیں حادثات زمانے نے بری طرح پیاس میں مبتلا کر رکھا تھا۔ کوٹھی کو رنگتے، رنگتے تھک کر سائے میں آ بیٹھے تھے چلم پیتے جاتے تھے حسرت مندانہ نگاہوں سے سوکھے اور اداس درختوں کو دیکھے جاتے تھے۔ چلم پیتے پیتے کچھ دیر کے لئے رک کر تینوں کوٹھی کی حسین مالکہ کے بارے میں آہستہ آہستہ دبے لہجے میں اظہار خیال کرنے لگے تھے کوٹھی کی مرمت کا کام شروع کئے تین دن ہو چکے تھے ان تین دنوں میں انہیں اس کوٹھی۔ ان سوکھے خزاں کے مارے درختوں اور مہربان مالکن سے شدید قسم کا انس سا ہو گیا تھا۔ وہ شہر کے ایک بہت بڑے رئیس کی بیوی، ایک حسین کار کی مالک، ایک پرشکوہ کوٹھی کی شہزادی اور حسن کی ملکہ تھی!

تینوں میں سے ایک قدرے بیزاری سے دہیں مٹی پر ہی دراز ہو گیا اور بولا:۔

"دوستو ـــــ ہمیں اپنی مالکہ کے متعلق ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں یہ سراسر غداری ہے۔ ہم غریب سہی، مزدور سہی، لیکن نمک حرام نہیں ہیں۔ وہ خواہ پری ہو یا شہزادی، ہماری مالکن ہے، وہ ہماری ماں کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ہم سے ہنس ہنس اس لئے نہیں باتیں کرتی کہ ہم اس کے پیچھے ایسی باتیں کریں۔"

دوسرا بھی اس کے قریب ہی لیٹ گیا۔ سر کے نیچے ہاتھ کا تکیہ بناتے ہوئے اس نے اپنے ساتھی کی تائید کی:۔ "ہاں یار ـــــ تم سچ کہتے ہو، مالکہ ہم چند سال پہلے ایک اچھے گھرانے کے فرد تھے، ہم ایک نہیں چار شادیاں کر سکتے تھے، اس سے زیادہ کھل کر کسی کے متعلق بات چیت کر سکتے تھے۔ لیکن اب ہم ایک معمولی مزدور ہیں، غلام ہیں۔ ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ اس کوٹھی کو نیا رنگ میں ڈبو دیں اپنی اس اجرت لیں اور چلتے بنیں۔ ہمیں اس سے کیا ــــ کہ مالکن کا شباب کہاں سے کہاں پھٹا پڑتا ہے اس کی زلفیں ناگن صفت کب بن جاتی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں.. چمک کس کے لئے ہے؟ وہ ہمیں بچوں کی طرح اس لئے چاہتی ہے کہ ہم اس کا کام دل لگا کر کریں اور اس کے اچھے برتاؤ کے جواب میں ہماری طرف سے ذرا بھی کمی واقع نہ ہو۔!"

تیسرا مزدور جو نسبتاً کم عمر تھا، اور کافی اچھی شکل و صورت کا مالک تھا۔ جھجک کر بولا:۔ "لیکن اس میں برائی کیا ہے اچھی کو اچھی کہنا، پھول سے محبت رکھنا۔ ہیرے کی تعریف کرنا بری بات کیسے ہو سکتی ہے؟ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم اس سے کچھ چاہتے ہیں۔ ہم اس سے کوئی ناپاک امید نہیں رکھتے پھر ضرور کہتے ہیں کہ وہ حسین ہے۔ لیکن وہ ہماری محبوبہ نہیں بن سکتی وہ تو اس بوڑھے آقا کی چوتھی بیگم ہے۔ جو شہر کی دو فیکٹریوں اور کئی عمارتوں کا مالک ہے

جس کے ہاں روپیہ مٹی کی قدر و قیمت رکھتا ہو۔ جس نے آج کی جدّت ایجادات کے بل بوتے پر ایک خوب صورت جوانی کو اپنے قبضے میں کر رکھا ہو۔ تم نہ کہو تو میں ضرور کہوں گا کہ وہ بہت پیاری ہے۔ بیحد حسین ہے۔ اسے ہم سے ہمدردی ہے۔ وہ ہماری دوست ہے۔"

تینوں کی عمریں تیس سال سے زیادہ نہ تھیں تینوں کے کپڑے بوسیدہ اور میلے تھے۔ پہلے نے ڈاڑھی نہیں بنائی تھی اس لئے اس کا چہرہ بارعب تھا۔ اس نے سر پر پگڑی کے نمونے کا کپڑا باندھ رکھا تھا۔ تاکہ سر دھوپ سے محفوظ رہ سکے، دوسرا سر سے ننگا تھا۔ لیکن اس کے بال سلیقے سے ترشے ہوئے تھے ماتھے پر بکھری ہوئی بالوں کی ایک لٹ بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی اس کی چھاتی کافی چوڑی چکلی تھی۔ جس کے باعث وہ ایک صحت مند چست و توانا فرد دکھائی دیتا تھا۔ تیسرے کا رنگ بھی گورا تھا۔ وہ دونوں سے نسبتاً کمزور تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور رنگین تھیں چہرے کے نقوش اس کے متمول خاندان کے چشم و چراغ ہونے کے ضامن تھے۔

تینوں کنوارے تھے، تینوں کے چہروں سے شرافت مترشح تھی۔ صبح سے دیواروں کو رنگتے رہنے کے باعث ان کے کپڑوں پر نیلے سفید رنگ کے بڑے بڑے دھبے پڑے ہوتے تھے کوٹھی کا بیرونی حصہ آگے سے سارے کا سارا دلفریب نیلے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف پچھواڑے کا کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا۔ جو دن ڈھلتے ڈھلتے تک بآسانی سے رنگا جا سکتا تھا۔ صبح سے کام کرتے کرتے وہ تھک گئے تھے۔ اب سستانے کے لئے مٹی پر پڑے تھے مٹی ان کا بستر تھی دوپہر شباب پر تھی لیکن دھوپ درختوں سے چھن چھن کر آنے کے باعث اتنی گرم معلوم نہیں ہو رہی تھی۔

تینوں کو اس وقت امید تھی کہ مالکن انہیں ضرور پکارے گی کہ اتنے میں برآمدے کی طرف سے ایک سریلی آواز سنائی دی۔

"جھونپڑوں کے شہزادو ــــــ یہاں آؤ"

وہ ایسے ہی چونک کر اٹھ کھڑے جیسے حاتم طائی کے ہاتف نے "کوہ ندا" کی آواز نے انہیں بلایا ہو۔ تینوں نے ایک لمحے تک ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں، "دیکھو۔ دیکھو وہ ہمیں بلاتی ہے!"

پھر وہ تیزی سے برآمدے کی طرف لپکے: "آ رہے ہیں۔ مالکن آ رہے ہیں"

تھوڑی دیر بعد وہ نیم دراز مالکن کے پاس ڈرائنگ روم میں کھڑے تھے۔ مالکن نہا کر غسل سے ابھی ابھی آئی تھی، اس کے براق سے سفید لباس پر شوخی کا ہلکا سا شائبہ تک بھی نہ تھا وہ اپسراؤں کی ملکہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے بھورے بال ڈھیلے بندھے ہوئے تھے۔ گلاب کی پتی سے بھی نازک ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ وہ صوفے پر ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ۔ ایسے نیم دراز تھی کہ جیسے وہ ان مزدوروں کو غیر نہیں سمجھتی ہو۔ اس کی میٹھی اور التفات آمیز نظریں ان تینوں دست بستہ مجسّموں، تین غلاموں کو دیکھ رہی تھیں جو دم بخود نظریں نیچے کئے چور نگاہوں سے اسے کبھی کبھی دیکھ لیا کرتے تھے۔

"نوجوانو! ــــــ کیا تم نے اپنا کام ختم کر لیا" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

سب سے شکیل مرد بولا ــــــ "نہیں مالکن، کچھ باقی ہے۔ دن ڈھلنے سے پہلے ختم ہو جائے گا"

اس نے دوبارہ پوچھا: "تم اتنی دیر سے کہاں لیٹے تھے؟ کیا اس سائے کی مٹی میں کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اس بانس کے سائبان میں بیٹھ رہنا جہاں کا فرش نرم گھاس کا بنایا ہوا ہے جس کے چاروں طرف بیلیں ہی بیلیں ہیں۔ وہاں کافی ٹھنڈک رہتی ہے۔ تم وہاں کیوں نہیں لیٹے؟"

ڈاڑھی والا مزدور جس کا چہرہ بارعب تھا ڈرتے ڈرتے بولا "لیکن وہ تو آپ کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ ہم ــــــ ہم" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کی گرفت میں لے لیا اور انگلیاں چٹخانے لگی۔

لیکن تم سے یہ کس نے کہا کہ تم وہاں نہیں بیٹھ سکتے۔ وہاں کی گھاس اتنی حساس تو نہیں کہ تمہارے بیٹھنے سے سوکھ کر رہ جائیگی

یہ سب تمہارے بیجا اندیشے ہیں۔ مجھ میں کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے ہوئے ہیں۔ میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں! ہم سب ایک ہیں۔ میرے سینے میں پتھر کی جگہ دل ہے۔ سنو —— جس چیز کو تم پا سکتے ہو، تم اس کے لئے جھجکو نہیں، جبکہ تم سمجھتے ہو کہ تم اس کے قابل ہو تو تم اس کو ضرور حاصل کر سکتے ہو۔ یہ بندشیں یہ پردے سب مصنوعی ہیں۔"

پھر مالکن نے نوکر کو آواز دی تاکہ وہ ان کے لئے کچھ پھل مٹھائی اور کیک لائے نوکر آیا تینوں نے دیکھا۔ نوکر کی آنکھیں کہہ رہی تھیں "اوہ —— تم لوگ آگئے اس کے حسن کے چکر میں —— لو خوب کھاؤ —— تم غلام ہو ۔۔۔ اس کے حسن کے غلام یہ تمہیں چوس کر رکھ دے گی۔ یہ ناگن ہے ناگن!"

وہ چپ چاپ کھانے لگے۔ لیکن ان کے دلوں میں عجیب قسم کے خیالات کروٹیں لے رہے تھے ان کی نگاہیں بھی اب بیباک تھیں، ان کے ارمان بھی اب کچھ غیر ذمہ دار سے ہو رہے تھے۔

جب کھا چکے تو وہ مالکن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، پچھلی طرف کی دیوار رنگنے چلے گئے۔ دیوار رنگتے ہوئے پہلے مزدور کو اپنا پچھلا زمانہ یاد آگیا۔ بولا: "یار —— ایک وہ بھی زمانہ تھا۔ کہ میرے کپڑے کی دکان تھی۔ ملازم کام کرتے تھے۔ شام ہو جاتی گھوڑا گاڑی آجاتی۔ بیٹھ کر گھر چلا جاتا۔ نئی نویلی بیوی دروازے پر مسکراتی ہوئی ملتی۔ —— چار سال ہی تو ہوئے گھر بار لٹے۔ ورنہ ہم کہاں ہوتے اور کوٹھے رنگنے کا کام کدھر سے آتا۔ بیوی کو غنڈے لے گئے جانے زندہ ہے یا مر گئی —— ہم کو قسمت نے دربدر ٹھوکریں کھلوائیں —— مر ہی جاتے تو اچھا ہوتا۔ کہاں کی یہ زندگی ہے آہیں ہی آہیں ہیں —— غم ہی غم ——!

دوسرا بولا: "یہ ہاتھ جواب بالٹی اٹھاتے ہیں۔ کبھی اپنی، ذاتی کار کی اسٹرینگ گھمایا کرتے تھے۔ ٹھیکیداری بھی کیا نمود دار تھی، ورنہ پیسہ ہاتھ کا میل تھا۔ یہ مت پوچھو کہ کس دل گردے سے جلتا گھر دیکھا۔"

تیسرا جیسے بولنا ضروری تھا۔ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا: "کیا روشنی ملے گی چراغ مزار سے"

پہلے نے کہا: "یار جو بیت گئی سو بیت گئی اب ہمیں اس پچھلے خوشحال زمانے کو بھلا دینا چاہئیے مالکن کو ہم نے خواہ مخواہ اپنی تباہی کی داستانیں سنائیں۔"

کوئی کچھ نہیں بولا۔ تینوں چپ چاپ اپنے کام میں لگ گئے شام کو کام ختم کر کے تینوں نے ہاتھ منہ دھوئے۔ میلے اور بوسیدہ کپڑوں کو اتار کر انھوں نے ستھرے کپڑے پہنے اور مالکن کے پاس پہنچے۔ وہ اس وقت کھڑی کسی سے فون پر بات چیت کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جو لگا تھا وہ پوچھ رہی تھی تو آج نہیں آئیں گے آپ۔"

شاید وہاں سے اثبات میں جواب ملا ہو۔ اسی لئے اس نے مسکراتے ہوئے کہا: "کل ضرور آئیے گا جی تو چاہتا ہے کہ آپ ابھی چلے آئیں، لیکن خیر آپ کی مرضی!"

تینوں سوچنے لگے "کون ہوگا؟" ایک برا سا خیال ان تینوں کے دل میں آیا۔ کوئی —— کوئی آشنا ——"

ان کو دیکھ کر وہ مسکرائی: "وہ آج نہیں آئیں گے" تینوں بوکھلا کر حیرت سے ایک ساتھ بولے: "کون —— ؟ کون مالکن ——"

"وہی ہمارے شوہر —— ایسے ہی کیا کرتے ہیں وہ —— چار بیویاں جو ہیں —— دیکھا —— یہی ہے بڑے لوگوں کا دستور —— وہ کیا سمجھتے ہیں ہمیں جانتے ہو، زرخرید ——!"

آج اس کے شوہر نہیں آئیں گے" تینوں نے سوچا "لیکن اس کی اطلاع کیوں دی جا رہی ہے"

تم لوگوں نے کام ختم کر لیا" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
"ہاں مالکن" ایک بولا۔ "دیکھئے بنگلہ کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے"

"بھلا" —— وہ ہنسی: "بھلے لوگوں کا ہر کام ہی بھلا ہوتا ہے۔ یہ لو اپنی اُجرت" مزدوری پاکر تینوں دوستوں کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے۔

"اندر قلعی گردانی ہو تو ہم ——" ایک جھجکتا ہوا بولا: "یہ دیواریں"

بھی کالی کالی ہو رہی ہیں ۔"

"جب جی چاہے آجانا ـــــــ اب تم غیر تھوڑی ہو۔"

"جب جی چاہے ـــــــ"

"ہاں ہاں جب جی چاہے ـــــــ لیکن آنا ضرور چاہیے کل ہی کل میں تمہارے لئے ـــــ" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ شاید اس لئے کہ قبل از وقت کوئی بات کہہ دینا اچھا نہیں۔

تینوں مزدور جب اپنے مشترکہ جھونپڑے کی طرف چلے۔ تو ان کے ذہن میں مالکن کی شیریں باتیں گونج رہی تھیں۔ "میرے سینے میں پتھر نہیں دل ہے" "جس چیز کو تم پا سکتے ہو اس کے لئے کبھی نہ جھجکو۔ جبکہ تم سمجھتے ہو کہ تم اس کے قابل ہو! تم اسے ضرور حاصل کر سکتے ہو! یہ بندشیں یہ پردے سب مصنوعی ہیں۔ وہ آج نہیں آئیں گے ـــــ وہ اسی طرح کرتے ہیں ـــ بھلے لوگوں کا ہر کام بھلا ہی ہوتا ہے ـــــ تم جب چاہے آ سکتے ہو ـــــ کوئی غیر تھوڑی ہو ـــــ لیکن آنا ضرور ـــــ میں تمہارے لئے ـــــ"

تینوں نے بیک وقت سوچا۔ "اس سے آگے بس سمجھ لو میں تمہارے لئے کے آگے ـــــ سمجھ جاؤ۔"

جھونپڑے تک پہنچتے پہنچتے ان کے ذہن بغاوت سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ کوٹھی کا ہر حصہ ان کے ذہن میں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ خواب گاہ کی کونسی کھڑکی محفوظ ہے۔ کون سا راستہ بے خطر ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی خطرہ بھی پیش آگیا۔ تو ان کے بچاؤ کی ممکن صورت بھی ان کے سامنے تھی۔ ان کے جسم چست و توانا تھے۔ ڈر ان میں نام کو بھی نہیں تھا۔ اس سے زیادہ اطمینان بخش خود مالکن کا حسین پیکر تھا اس کے کہے ہوئے وہ الفاظ تھے۔ تینوں نے آپس میں سمجھوتہ کر لیا۔ وہ مدت سے پیاسے تھے۔ انھوں نے طے کر لیا۔ کہ آج رات ان تینوں میں سے کوئی ایک اپنی پیاس بجھا کر افتتاح کرے گا، اور دو دونوں اس کی حفاظت کریں گے

گھپ اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہوا کے خنک جھونکوں کے باعث رات بہت خوشگوار تھی۔ دروازے کے قریب کمرے میں چوکیدار اونگھ رہا تھا۔ ملازموں کے کوارٹروں میں اندھیرا تھا۔

"سب سو چکے ہیں" پہلا بولا۔ وہی آج کی رات کا حقدار تھا۔ "کتنی حسین اور خوشگوار ہے آج کی رات! وہ اکیلی ہے! وہیں دیکھ کر کوئی اعتراض نہ کرے گی۔ آہ خواب گاہ کی کھڑکی سے جھانکیں

شور مت کرو   سرگوشی   خاموش"

تینوں نے کھڑکی کی سلاخیں پکڑیں، اور اندر جھانکنے لگے۔ اور نیلے رنگ کے بلب کی ٹھنڈی روشنی کے باعث ہر شے سوئی سوئی سی دکھائی دے رہی تھی، اور مالکن؟ مالکن بھی بے خبر سو رہی تھی۔

بکھرے بالوں کی لٹوں کے درمیان اس کا خوبصورت چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔

پہلے نے آہستہ سے کہا: "حسن جہاں سوز سو رہا ہے۔ لیکن امنگیں شاید جاگ رہی ہیں"

دوسرا مسکرایا ـــــــ "کتنا مدہوش کن شباب ہے۔ جوانی بھی بڑی ہوتی ہے!"

تیسرا ابھی نہیں رہ سکا ـــــ "بڑھاپا خاوند اسے مطمئن نہیں کر سکا۔ اسی لئے شاید یہ دوسروں کی دست نگر ہے ـــ یہ شفقت کے بدلے جوانی کی بھیک مانگتی ہے۔ یہ دیوانی ہو گئی ہے!

پھر تینوں خاموش ہو گئے۔ شاید انھیں یاد آگیا تھا کہ انھوں نے اسے ماں کہا تھا۔ تینوں گم صم ہو گئے ایک ثانیے کے بعد پہلے نے کہا" دیکھو خواب گاہ کا دروازہ کھلا ہے شاید وہ ہماری ہی منتظر ہے۔ اسے یقین ہو گیا ہو گا کہ ہم نے اس کی باتوں کا مطلب سمجھ لیا ہے، اس کا شوہر نہیں آئے گا۔ آؤ اسی طرح بیوقوفوں کی طرح کب تک کھڑے رہو گے"

لیکن وہ آگے بڑھنے بھی نہیں پائے تھے، کہ انھوں نے کسی موٹر کے رکنے کی آواز سنی۔

وہ وہیں دبک گئے۔ برآمدے میں کسی کے جوتے چرچرائے تینوں کی نظریں خواب گاہ کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ کون ہے؟ دوسرے لمحہ ان پر جیسے برف کا تودہ گر پڑا اور وہ ٹھنڈک میں دفن

ہو کر رہ گئے۔

آنے والا دراز قد انسان مالکن کا شوہر تھا۔ اس کے بال برف کے مانند سفید تھے، اور چہرہ انار کی طرح سرخ، ہاں پاؤں سخت مضبوط ——— چال میں مردانگی کی تمکنت ———

مالکن اُٹھکر بیٹھ گئی: "اوہ ——— آگئے آپ خوب انتظار کروایا۔"

مجھے افسوس ہے بیگم! ——— آ تو نہیں سکتا تھا لیکن تمہارا کبھی حکم ٹالا بھی تو نہیں جا سکتا "اس نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔

"اگر کوئی ضروری کام تھا تو میں نے ناحق آپ کو تکلیف دی" بیوی بولی: "آپ سفر پر جا رہے تھے میں چاہتی تھی کہ جانے سے پہلے آپ مل لیں ———"

"تو اسی لئے دوبارہ فون کیا تھا؟"

"جی ہاں ——— آپ کی مصروفیات کا مجھے سکریٹری سے پتہ چلا تھا اسی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ آپ دورے پر جا رہے ہیں ——— اگر میں نہ بلاتی تو آپ شاید ہی آتے۔"

"ہاں ٹھیک کہتی ہو بیگم ———!" بوڑھے شوہر نے حریص نگاہوں سے پھول سی بیوی کو دیکھا۔

"لیکن کہو کیا کام تھا؟"

"کام ——— کوئی خاص کام نہیں بالکل معمولی سا کام ہے۔"

"آخر ———"

"گذشتہ تین دنوں سے کوٹھی کی مرمت کروا رہی تھی۔ تین مزدور کام پر لگے تھے۔ یقین جانئے اتنے شریف اور سمجھدار آدمی میں نے بہت کم دیکھے ہیں ان کی تباہی کی داستانیں سن کر دل بھر آتا ہے۔ کیا تھے کیا ہو گئے وہ اگر اپنا آپ چھپائیں تو بھی انکے چہروں سے انکی پچھلی خوشحال زندگی چھپ نہیں سکتی۔ ان کے چہرے ہی پچھلی زندگی کا حال بتا دیتے ہیں۔ آپ انہیں کہیں نوکر رکھوا دیجئے۔ کوئی کوارٹر ہوں تو انھیں الاٹ کروا دیجئے۔ نئے سرے سے زندگی شروع کریں گے۔ درازیٔ عمر کی دعا کریں گے۔ ٹوٹے ہوئے دل کی آواز بڑی پر اثر ہوتی ہے۔ کر دیجئے نا آپ اتنا سا کام۔"

"بیگم ———!" لکھ پتی شوہر کا گلا بھر آیا۔ شدت تاثر سے اس نے گہری سانس لی اور کہا: "تم کتنی نیک، کتنی ہمدرد، کتنی غریب نواز ہو۔ تمہیں دیکھ کر میرا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے۔"

"تعریف رہنے دیجئے ——— وعدہ کیجئے۔" وہ شرما گئی۔

"وعدہ۔" شوہر کی آواز گونجی۔ "کہو تو ابھی سکریٹری کو ہدایت کر دوں تم کہو اور نہ ہو سکے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

باہر ہوا اچانک گرم ہو گئی تھی، زمین سے شعلے ابل رہے تھے، درختوں نے قہقہے لگانے شروع کر دیئے تھے، آسمان پر تارے ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نظام شمسی میں افراتفری پھیل گئی تھی اور گھپ اندھیرے میں کھڑے ہوئے تینوں مزدور ایک دوسرے کو اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ دیکھ نہیں رہے تھے نظریں چرا رہے تھے۔

(بشکریہ "باغ و بہار")

● عالم اکبر آبادی

معاشرہ

اے غمِ دل کیا کروں تیرے لئے میں کیا کروں
زندگی نے مسکرا کر غم دیئے میں کیا کروں
رات کی بھیگی فضاؤں نے کیا پھولوں کو تر
صبح سورج کی کرن شبنم پیئے میں کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں تیرے لئے میں کیا کروں

کیا نمودِ لالۂ و گل کیا بہاروں کا وجود
لوٹ لیتی ہے خزاں دلکش نظاروں کا وجود
اک سویرے کا اُجالا جن کا کر دیتا ہے خوں
میں بچا سکتا نہیں ان چاند تاروں کا وجود
اے غمِ دل کیا کروں تیرے لئے میں کیا کروں

لوگ خودداری تو کیا ہے عظمتیں تک بیچ دیں
پستیوں کے ہاتھوں اپنی رفعتیں تک بیچ دیں
میں نے دیکھی ہیں ہزاروں وہ حسیں شہزادیاں
پیٹ کی خاطر جو اپنی عصمتیں تک بیچ دیں
اے غمِ دل کیا کروں تیرے لئے میں کیا کروں

زندگی کا لطف میں ہر چند پا سکتا نہیں
قوتِ سرمایہ پر ایمان لا سکتا نہیں
غیرت و ایماں کی لاشیں ناچتی ہیں ہر طرف
تیری خاطر میں طرب زاروں میں جا سکتا نہیں
اے غمِ دل کیا کروں، تیرے لئے میں کیا کروں

مجھ سے اور الزام آئے آدمی کے نام پر
بھوکا مر جاؤں گا میں اپنی خودی کے نام پر
بے ضمیری میرا شیوہ ہو نہیں سکتی کبھی
بیچ دوں انسانیت کیا زندگی کے نام پر
اے غمِ دل کیا کروں تیرے لئے میں کیا کروں

سرنگوں کر دے جو اک دن پرچمِ امید و بیم
سوچتا ہوں کب جنم لے گا وہ انسان عظیم
وہ زمانہ جانے کب تک آئے دنیا میں کہ ہو
مطمئن حالات سے ہر صاحبِ تاج و گلیم
اے غمِ دل کیا کروں تیرے لئے میں کیا کروں

نظیر خورجوی ●

کلام ذوق میں تصرف

(قسط دوم)

غزل نمبر ۲ ۔ یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

یہ مطلع درست ہے لیکن اس غزل کے بعض اشعار میں خاصا تصرف ہے۔
مثلاً ع ۲ تپ دل شمع کی جب کم نہیں ہوتی ناچار
اس کو کا نور سفیدیٔ سحر دیتی ہے

یہ شعر پروفیسر عنایت اور کیسری داس سیٹھ (مطبع نولکشور) کے مرتب کردہ دیوانِ ذوق میں بجنسہ موجود ہے اور صحیح بھی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اس کی جگہ یہ شعر لکھا ہے ؎

شمع گھبرا نہ تپ غم سے کہ اک دم میں ابھی
آکے کافور سفیدیٔ سحر دیتی ہے

اصل شعر میں اور اس میں فرق ملاحظہ فرمایئے۔

دیوانِ ذوق کی تقریباً تمام ترتیبوں میں تقریباً اسی مضمون کا ایک شعر اور بھی ملتا ہے ؎

۳ رات بھاری تھی سرِ شمع پہ سو ہو گزری
کیا طباشیر سفیدیٔ سحر دیتی ہے

لیکن اس شعر کی تحقیق نہ ہو سکی، قیاس غالب یہی ہے کہ یا تو ذوق نے پہلے یہ شعر موزوں کیا ہوگا اور پھر اسے درست کرکے اوّل الذکر صورت دے دی ہوگی یا پھر یہ مولانا آزاد کی عنایت ہوگی کہ انھوں نے اس غزل میں ایک شعر کا اضافہ کیا۔ بہرحال یہ بات کسی طرح سے قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتی کہ ذوق نے یہ دونوں اشعار کہے ہوں، اور دونوں شریکِ غزل بھی کئے ہوں۔ ؎

۴ بڑھتی جاتی ہے جو مشقِ ستم اس ظالم کی
کچھ محبت مری اصلاح مگر دیتی ہے

صحیح شعر یہی ہے اور پروفیسر عنایت اور کیسری داس نے بجنسہ اسکو لکھا ہے لیکن مولانا آزاد اس کو اس طرح لکھتے ہیں ؎

ناز و انداز تو ہیں کر چکے سب مشقِ ستم
کچھ محبت مری اصلاح مگر دیتی ہے

اس صورت میں تعقید کا عیب کتنا نمایاں ہے اور یہ مولانا آزاد کے کلام کی خصوصیات میں سے ہے۔

۵ دمبدم زخم پہ اک زخم ہے دم لینے کی
مجھ کو فرصت تری کب تیغِ نظر دیتی ہے

پروفیسر عنایت اور کیسری داس نے یہ شعر بجنسہ لکھا ہے لیکن مولینا آزاد نے اسکو اس طرح لکھا ہے ؎

کیا کرے حسرتِ دیدار کہ دم لینے کی
دل کو فرصت نہیں وہ تیغِ نظر دیتی ہے

اصل صورت میں تخصیص کا جو لطف تھا وہ اب نہیں۔ اس غزل کے باقی اشعار بیشتر صحیح ہیں لیکن بعض کے متعلق تحقیق نہیں۔

غزل نمبر ۵ ۔ سنہ ۱۸۴۵ء میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا۔ جس میں اس وقت کے تمام اساتذہ نے شرکت کی تھی۔ حسب ذیل غزل ذوق نے اسی مشاعرہ کے لئے کہی تھی۔

۱ نہیں ثبات بلندیٔ عز و شاں کیلئے
کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کیلئے

مصرعہ اولیٰ کو مولانا آزاد اس طرح لکھتے ہیں ع

ثبات کب ہے زمانہ میں عز و شاں کیلئے

قیاس ہے کہ مولانا نے ذوق کے شعر کو اس لحاظ سے نامکمل سمجھا۔ کہ اس میں بے ثباتیٔ عز و شاں کے لئے جگہ کی تخصیص نہیں چنانچہ انھوں نے

"بلندی" کی جگہ "زمانہ" موزوں کردیا لیکن "آسمان" کی مناسبت سے "بلندی" زیادہ مناسب اور بہتر ہے۔ ساتھ ہی "زمانہ" کا ہونا یا نہ ہونا شعر کے مفہوم پر کچھ بہت زیادہ اثر بھی نہیں ڈالتا۔ گویا اسے زوائد میں شمار کیا جاسکتا ہے جس سے ذوق ہمیشہ احتراز کرتے تھے۔ آج بھی ذوق کے سلسلہ کے شعراء اپنے کلام میں حشو و زوائد کو جہاں تک ممکن ہوتا ہے جگہ نہیں دیتے۔ ؎

۱۲ مزے یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زباں کے لئے
سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کیلئے

مولانا محمد حسین آزاد نے اس کو اس طرح بدل دیا ہے ؎

مزے تو دل کو ملے تھے ہوئے زباں کے لئے
یہ ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کیلئے

اصل شعر کے مقابلہ میں اس صورت میں شعر کو مہمل کہا جاسکتا ہے صرف چند الفاظ کی ترمیم نے شعر کو کتنا گرا دیا ہے۔ ؎

۱۳ فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کیلئے
یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لئے

مولانا محمد حسین آزاد نے مصرعہ ثانی میں "یہی چراغ" کی جگہ "کہ یہ چراغ" دیوانِ ذوق میں لکھا ہے چنانچہ شعر کا تمام زور ختم ہوگیا۔ ؎

۱۴ صبا جو آئے خس و خار گلستاں کے لئے
قفس میں کیونکہ نہ پھڑکے دل آشیاں کیلئے

اس شعر میں ذوق کے زمانہ کی زبان "صبا جو آئے" اور "کیونکہ نہ پھڑکے" شاید مولانا کو کھٹکتا تھا چنانچہ انھوں نے اپنے دور کے مطابق اس کو بدل لیا ؎

صبا ہے آئی خس و خار گلستاں کے لئے
قفس میں لوٹ رہا ہے دل آشیاں کے لئے

لیکن اس طرح شعر میں وہ لطف جاتا رہا جو اصل صورت میں تھا۔ یعنی یہ کہ اس میں ایک عام بات بیان کی گئی تھی۔ اور اس تصرف کے بعد زمانہ کی قید ہوگئی پھر یہ کہ شعر میں شاعر کے زمانہ کے محاورہ اور روزمرہ کی موجودگی عیب ہرگز نہیں ہے بلکہ اس سے شاعر کے دور کے ارتقائے زبان و ادب کا پتہ چلتا ہے چنانچہ اس کی بھی خاص اہمیت ہے۔

+ + + + + +

۱۵ حجر کے چومنے ہی پر ہے حج کعبہ اگر
تو بوسے ہم نے بھی اس سنگِ آستاں کیلئے

سادگی اور سلاست ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا کو غالباً لفظ "حجر" کے اس طرح استعمال پر اعتراض رہا ہوگا اور "چومنا" بھلا نہ لگا ہوگا۔ چنانچہ اسکو اس طرح بدل دیا۔ ؎

جو سنگِ کعبہ کے بوسہ میں حج کعبہ ہے صحیح
تو بوسہ ہم نے بھی اس سنگِ آستاں کے لئے

اچھا خاصا شعر کتنا غیر سلیس ہوکر رہ گیا کہ پڑھنا بھی مشکل ہوگیا ہے۔ پھر یہ "سنگِ کعبہ" پر گویا طنز ہوا۔ جو بہت غلط ہے۔ اور ذوق سے ہرگز متوقع نہیں۔ ذوق اس سلسلے میں انتہائی محتاط ہیں۔

۱۶ نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کیلئے

اور مولانا آزاد کی اصلاح ملاحظہ فرمائیے ؎

نہ دینا ہاتھ سے تم راستی کہ عالم میں
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کیلئے

لفظ "عالم" کا اصل شعر میں بہت مناسب استعمال ہوا تھا۔ اور موجودہ صورت میں یہ لفظ مذاقِ سلیم پر بھی بار ہو رہا ہے پھر یہ کہ "یہ شے" کے ہٹانے سے جو کمی واقع ہوئی تھی۔ وہ اس شعر میں کسی طرح پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ ذوق کے صرف ایک لفظ "چھوڑ" کے بجائے مولانا آزاد نے "دینا ہاتھ سے" تین الفاظ نظم کئے جو بلاغت پر کاری ضرب ہے۔

۱۷ جو پاس مہر و محبت کہیں یہاں بکتا
تو ہم بھی لیتے کسی اپنے مہرباں کے لئے

دیوان ذوق میں یہ شعر اس طرح لکھا ہے۔ ؎

دکانِ حسن میں رکھتے نہیں متاعِ وفا
دگرنہ لیتے ہم اک اپنے مہرباں کے لئے

جو سادگی اصل صورت میں تھی وہ اب کہاں؟

۱۸ خلش سے عشق کے ہے خار پیرہن تن زار
ہمیشہ اس ترے مجنونِ ناتواں کے لئے

دیوانِ ذوق میں مولانا آزاد نے اس کو یوں بدل کر لکھا ہے ؎

۸ خلش سے عشق کے ہے خار پیرہن اے یار
یہ جان اس ترے مجنونِ ناتواں کے لئے

"تنِ زار" کے لئے "خار پیرہن" کی ترکیب تو سمجھ میں آتی ہے لیکن "جان" کو "پیرہن" کس طرح کہا جائے؟ مولانا آزاد ہی بہتر سمجھتے ہوں گے۔ "ہمیشہ" کو ہٹا دینے کے بعد جو کمی واقع ہوئی۔ وہ کسی طرح پوری نہ ہو سکی۔

۹ تپش سے عشق کی یہ حال ہے مرا ـــ گویا
بجائے مغز ہے سیماب استخواں کے لئے

اس کو دیوانِ ذوق میں مولانا آزاد نے یوں لکھا ہے

الٰہی سوزِ محبت سے اڑتا ہے تنِ زار
کہ لایا عشق ہے سیماب استخواں کے لئے

سلاست زبان اور خوبیٔ بیان کا جو حسن اصل شعر میں تھا اب کہاں؟ اصل شعر میں "سیماب" مغز کے لئے آیا ہے لیکن موجودہ صورت میں یہ بات قطعاً غیر واضح ہے کہ سیماب کس کو کہا گیا؟

۱۰ الٰہی کان میں کیا اس صنم نے پھونک دیا
کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کیلئے

پہلے مصرعہ کو مولانا نے اس طرح درجِ دیوان کیا ہے ع

الٰہی کان میں ہے کیا صنم نے پھونک دیا

لفظ "اس" سے جو تخصیص کا لطف پیدا ہو رہا تھا۔ وہ اب نہیں پھر یہ کہ موجودہ صورت میں "ہے" کی وجہ سے تعقید کا عیب بھی پیدا ہو گیا۔ ان تصرفات نے ذوق کے متعلق اس حد تک غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں کہ فراق گورکھپوری جیسا صاحبِ نظر بھی یہ لکھ گیا کہ تعقید ذوق کے کلام کے محاسن میں سے ہے

۱۱ نہیں ہے خانہ بدوشوں کو حاجتِ ساماں
اثاثہ چاہیئے کیا خانۂ کماں کے لئے

دیوانِ ذوق میں یہ شعر اس طرح لکھا ہے

قدِ خمیدہ یہ اپنے ہیں بال زیب و بال
اثاثہ کچھ تو ہے خانۂ کماں کے لئے

اس تصرف نے شعر کو قطعی مہمل اور بے معنی بنا کر رکھ دیا ہے۔

۱۲ نہ لوحِ گور پرستوں کے ہو نہ ہو تعویذ
جو ہو تو خشتِ خم ہے کوئی نشاں کو

دیوانِ ذوق میں اس کے بجائے یہ شعر لکھا ہے

مری تو گور پہ جام و سبو کی ہو تصویر
کہ یادگارِ زمانہ رہے نشاں کے لئے

دونوں اشعار میں کس قدر فرق ہے، وہ سلیس اور بامعنی ہے اور یہ غیر سلیس اور نسبتاً بے معنی سا۔ "مری" نے تخصیص کر کے شعر کے مفہوم کو محدود کر دیا۔

۱۳ اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس
بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لئے

اور دیوانِ ذوق میں اس طرح لکھا ہے

امید ہو گئی ہمسایہ ورنہ خانۂ یاس
بہشت تھا ہمیں آرام جاوداں کے لیے

فرق واضح ہے۔

۱۴ وہ مول لیتے ہیں جس دم تری نئی تلوار
لگانے پہلے مجھی پہ ہیں امتحاں کے لئے

دیوانِ ذوق میں یہ اس طرح لکھا ہے۔

نگاہِ ناز نے دیکھے تھے جوہر آج اپنے
دل اپنا ہم کو بھی یاد آیا ـــ امتحاں کیلئے

دونوں کا فرق ملاحظہ فرمائیے۔

اس کے علاوہ مولانا آزاد نے ایک شعر تقریباً اسی مضمون کا اس غزل میں اور شائع کیا ہے جو غالباً ان کا ذوق کے نام عطیہ ہے

نگاہِ ناز نے کی دیر ورنہ میں تیار
ہوں کب سے بیٹھا ہوا مرگِ ناگہاں کیلئے

یہ اور اسی قسم کے بہت سے اشعار کا مولانا محمد حسین آزاد نے دیوانِ ذوق میں ذوق کے نام انتساب کر دیا ہے۔

۱۵ صریح چشم سخن گو تری کہے نہ کہے
جواب صاف ہے پر طاقت و تواں کیلئے

اور دیوانِ ذوق میں یہ شعر اس طرح لکھا ہے

۵ تمھاری نرگسِ بیمار نے جو کی تھی نگاہ
وہی جواب ہوا طاقت و تواں کے لئے

دونوں اشعار کا فرق ظاہر ہے۔

۱۳ رہے ہے ہول کہ برہم نہ ہو مزاج کہیں
بجا ہے ہولِ دل ان کے مزاج داں کے لئے

دیوانِ ذوق میں اس کو مولانا محمد حسین آزاد نے اس طرح لکھا ہے ؎

مزاج ان کا نہ بجلی ہے اور نہ ہے سیماب
خطر جو ہے تو یہی ہے مزاج داں کے لئے

دیکھئے شعر کس قدر پست ہو گیا۔

۱۷ مثال نے ہے مرا جب تلک کہ دم میں دم
فغاں ہے میرے لئے اور میں فغاں کے لئے

دیوانِ ذوق میں اس شعر کا مصرعِ اولیٰ اس طرح ہے ؏

نہیں ہوں نے مگر اتنا مجھے بھی ہے معلوم

"مجھے بھی ہے معلوم" کی ضرورت اصل شعر میں محسوس نہیں ہوتی یہ محض زائد ہے۔ شعر میں "دم میں دم" کے فقرہ کی اہمیت اس قدر کم ہرگز نہیں کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔

۱۸ بلند ہووے اگر کوئی میرا شعلۂ آہ
تو ایک اور ہو خورشید آسماں کے لئے

اس کو دیوانِ ذوق میں اس طرح بدل دیا گیا ہے ؎

اڑا کے آہ کا شعلہ کبھی بنائیں گے ہم
شبِ فراق میں خورشید آسماں کے لئے

لیکن وہ بات نہ آسکی جو اصل شعر میں تھی۔ "شب فراق" کی تخصیص کر کے آہ کے اثر کو بھی محدود کر دیا گیا۔

۱۹ چلیں ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم
شکستِ توبہ لئے ارمغاں مغاں کے لئے

دیوانِ ذوق میں "مدت میں" کی جگہ "مدت سے" لکھا ہے جو بے معنی ہے۔

غزل نمبر ۱: پابندِ جوں دخاں ہیں پریشانیوں میں ہم
یا رب ہیں کس کی زلف کے زندانیوں میں ہم

اس غزل کو تقریباً اصل صورت میں ہی مولانا محمد حسین آزاد نے داخلِ دیوان کر دیا ہے پھر بھی بعض اشعار میں تصرف ملتا ہے مثلاً ؎

۱ غم بھی نہیں جگر میں رہا اس قدر رہے
سرگرم سوزِ عشق کی مہمانیوں میں ہم

مصرعۂ اولیٰ دیوانِ ذوق میں اس طرح لکھا ہے ؏

نم بھی نہیں جگر پہ رہی اس قدر رہے

اور یہ مصرعہ مہمل ہے، ممکن ہے کہ یہ اصلاح کاتب ہو۔

۲ پوشیدہ ان نگاہوں میں سرخوش ہے رات دن
شرب الیہود کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم

مصرعۂ اولیٰ دیوانِ ذوق میں اس طرح ہے ؏

پردہ میں چشمِ مست کے سرخوش ہیں جو مدام

"چشمِ مست" اور "ان نگاہوں" کا فرق ظاہر ہے۔ اس حد تک تصرف کاتب نہیں کر سکتا۔

۳ اس خالِ رخ پہ جمع ہوئے قطرۂ عرق
ہندو اسیر دیکھے ہیں ورانیوں میں ہم

دیوانِ ذوق میں یہ شعر بھی اس غزل میں شامل ہے لیکن ذوق کے محرم استاد شاگرد فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ نے اس شعر کو اس غزل میں شریک نہیں کیا ہے۔ غالباً یہ بھی مولانا محمد حسین آزاد کا ہی عطیہ ہے۔

غزل نمبر ۱: کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینہ میں ہوئی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

مولانا محمد حسین آزاد اس غزل کے بارے میں لکھتے ہیں :- "بادشاہ نے اس طرح میں غزل کہی تھی ...... (استاد نے) فرمایا ہم بھی اس طرح میں غزل کہتے ہیں۔" (دیوانِ ذوق ص ۱۱۲)

لیکن حافظ غلام رسول ویران جو ذوق کے ہمہ وقت حاضر باش شاگردوں میں سے تھے۔ اور ذوق کو بہت عزیز تھے مولانا آزاد ہی کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :-

"یہ غزل بادشاہ کی ہے خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے بہ سبب دیوان میں داخل نہ ہونے کے استاد کی بیاض میں لکھ دی ہے، استاد کے خاص کلام میں کہیں نہیں۔"

اس خط کے پیشِ نظر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ غزلِ ذوق کی نہیں

بلکہ ظفر کی ہے مولانا آزاد نے کسی وجہ سے اس کو ظفر سے لے کر ذوق کو دینی چاہی ہے چنانچہ اس کے لئے تاویل کی ہے لیکن استاد اور ذوق جیسے استاد جو بقول آزاد ظفر کو غزلیں دیتے تھے (واللہ اعلم بالصواب) سے اس بات کی ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے شاگرد کی زمین میں غزل کہنا پسند کرتے۔ ذوق پیر استاد تھے اور ظفر بہر صورت ان کے شاگرد تھے شاگرد سے استاد مقابلہ کیوں کرتا؟ اور یہ اس کے لئے کب مناسب ہو سکتا تھا؟ — اگر مولانا آزاد کا کہنا صحیح ہے تو ظفر کے دیوان میں اس زمین میں غزل کی موجودگی بھی ضروری تھی، لیکن دیوانِ ظفر جلد دوم میں اس زمین میں کوئی غزل نہیں ہے چنانچہ ہم مجبور ہیں کہ حافظ ویران کے قول کو ہی درست مانیں۔ رہا اس غزل میں تصرف کا سوال؟ تو اب تک ہمیں اس کی صحت یا عدم صحت کی تحقیق نہیں ہو سکی ہے ... پھر بھی بعض اشعار میں اختلاف ملتے ہیں جس سے تصرف کا گمان ہوتا ہے۔

مثلاً ؎ گر دم کے دم وہ ہم سے ملائم ہوئے تو کیا
کہہ بیٹھیں گے پھر ایک گھڑی دو گھڑی کے بعد

مولانا آزاد نے یہ شعر اسی طرح لکھا ہے لیکن پروفیسر عنایت کو اس سے اختلاف ہے وہ اسے یوں لکھتے ہیں۔ ؎

کوئی گھڑی اگر وہ ملائم ہوئے تو کیا
کہہ بیٹھیں گے پھر ایک کڑی دو گھڑی کے بعد

دونوں میں کس کو صحیح مانا جائے اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ کسی ایک نے تصرف ضرور کیا ہے۔

غزل نمبر ۸: مزا چکھایا ہے کو مَن کر جو کشتی آئے ہے امتحاں پر
کہ لایا تو جو بے شیر لیکن جھپٹ کا دودھ آگیا زباں پہ

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ میرے والد کو یہ غزل پہلے سے یاد تھی دیوانِ ظفر جلد اول میں اسے چھپی دیکھ کر بڑے افسوس سے کہا کہ دیکھو یہ غزل بھی دیدی۔ لیکن مولانا کا صرف اتنا لکھ دینا سند نہیں ہو سکتا بالخصوص اس وقت جبکہ ہمارے سامنے مندرجہ بالا غزل کی مثال موجود ہے، یہ غزل اگر ذوق کی ہوتی تو بھی چونکہ ذوق نے ظفر کو دیدی اسلئے ہمیں اس بات کا حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ ہم اسے اب ذوق کی طرف منسوب کریں یہ انکی آپس کی بات تھی اب اس غزل کو ذوق کی طرف منسوب کرنے کے لئے کوئی مستند قسم کی شہادت درکار ہے۔ تصرف کیلئے ظفر کا پہلا دیوان دیکھنا مناسب ہوگا۔

(باقی آئندہ)

تاج الدین اشعر رامنگری ●

مرے جنوں کو ہنسی سمجھ کر مجھے سرِ راہ یوں نہ چھیڑو
جو میرے ہاتھوں میں آ گیا کوئی سنگ پارہ تو کیا کرو گے؟

بھنور میں کشتی کو ڈال دینا مری حماقت سہی بتاؤ
تمہارے ساحل نے بھی جو طوفاں کا روپ دھارا تو کیا کرو گے؟

مریضِ انسانیت کے چارہ گرو! یہ چارہ گری ہے کیسی؟
نئے نئے دکھ بڑھا رہے ہو تم اس کا چارہ تو کیا کرو گے

جنوں تو بدنام ہے ازل سے نصیب کی نارسائیوں میں
خرد بھی تم کو نہ دے سکی گر کوئی سہارا تو کیا کرو گے؟

مرا نشیمن جلانے والو! خبر ہے انجام پر بھی اس کے
تمہارے خرمن پہ جا پڑا گر کوئی شرارہ تو کیا کرو گے؟

میں خود تو رسوا نہ ہونے دوں گا تمہیں سرِ عرصۂ قیامت
تمہارے دامن سے میرے خوں نے اگر پکارا تو کیا کرو گے؟

ہمارے دم سے ہی رنگِ محفل ہمیں نکالا جو تم نے اس سے
خود اپنی محفل اُجاڑ لو گے زیاں ہمارا تو کیا کرو گے؟

کلیم جاتے ہو سوئے ایمن پئے نظارہ تو جاؤ لیکن
وہاں پہنچ کر جو چھین گئی قوتِ نظارہ تو کیا کرو گے؟

سحر کی آمد کا شور سن کر چراغ محفل بجھانے والو
نقاب ظلمت میں چھپ گئی یہ سحر دوبارہ تو کیا کرو گے؟

وفائے اشعر کو آج بدنام کر رہے ہو مگر کسی دن
ہوا تمہاری جفاؤں کا حال آشکارا تو کیا کرو گے؟

محسن بھوپالی ●
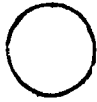
بہر عنوان سنور جائیں گے خم گیسوئے جاناں کے
چلو اہلِ جنوں کام آئیں ہم کچھ زلفِ دوراں کے

ہمیں پر طعنہ زن ہیں کس لئے آسودۂ ساحل
ہماری قوتِ بازو نے رُخ پھیرے تھے طوفاں کے

ہر اک تخریب میں تعمیر کا بھی راز مضمر ہے
بہت ممنون ہیں برقِ تپاں ہم تیرے احساں کے

وہی کانٹے ہیں اور دستِ جنوں کی کارفرمائی
ہمارا جرم ہے کیوں خواب دیکھے تھے گلستاں کے

نجوم سست رو کا قافلہ لُٹنے کو ہے محسن
کہاں تک ظلمتیں روکیں گی جلوے مہرِ تاباں کے

کنھیا لال کپور

دوست، رہنما، فلسفی!

نام ان کا کچھ اور ہے لیکن محلے میں وہ چچا افلاطون کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے سن و سال کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے بہتر لقب ان کے لئے تجویز نہیں کیا جا سکتا تھا محلے میں ان کی حیثیت دوست، رہنما اور فلسفی کی ہے یعنی وہ محلے میں رہنے والے ہر شخص کے دوست ہیں۔ چاہے وہ شخص انھیں دوست سمجھے اور یا نہ سمجھے۔ رہنما ہیں چاہے وہ ان پر ایمان لائے یا نہ لائے، اور فلسفی ہیں چاہے انکی باتوں میں مغز ہو یا نہ ہو۔ دراصل چچا افلاطون اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ دوسرے لوگ ان کے متعلق کیا رائے قائم کرتے ہیں؟ اگر پروا کرتے تو پھر وہ چچا افلاطون نہ ہوتے بلکہ ہماری اور آپ کی طرح "دفتر" میں قلم گھسا کرتے یا دوکان پر سودا سلف بیچا کرتے۔

چچا افلاطون کو جس وقت پتہ چلتا ہے کہ محلے میں کسی شخص پر مصیبت آنے والی ہے یا آئی ہے وہ فوراً اسکے پاس پہنچتے ہیں اور اس کو اپنے مشوروں سے فائدہ اٹھانے کا موقع بہم پہنچاتے ہیں۔

پچھلے دنوں میری نظر کمزور ہو گئی۔ آنکھوں کا معائنہ کرایا، تو ڈاکٹروں نے عینک استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ عینک بنوانے جا رہا تھا کہ راستے میں چچا افلاطون سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے کہا۔

"دماغ چل گیا ہے تمھارا، اس عمر میں عینک لگا رہے ہو تو بڑھاپے میں کیا کرو گے؟"

"بڑھاپے میں؟ ظاہر ہے کہ بڑھاپے میں بھی عینک استعمال ....کروں گا۔"

"میاں ہوش کی دوا کرو۔ اگر جوانی میں عینک لگاؤ گے تو پھر بڑھاپے میں ضرور اندھے ہو جاؤ گے۔"

"تو بتلایئے پھر کیا کروں؟"

"دیکھو عینک لگانے کا خیال ترک کر دو۔ آنکھوں میں صبح شام روغن بادام ڈالا کرو۔ اگر دو ہفتوں بعد دن کو تارے نظر نہ آنے لگیں تو چچا افلاطون نام نہیں۔"

"دن کو تارے نظر نہ بھی آئیں تو کوئی مضائقہ نہیں، رات کو نظر آجائیں تو بھی غنیمت ہے۔"

"نہیں نہیں ایسی قسم دن کو نظر آئیں گے۔ آزمودہ نسخہ ہے۔ بس روغن بادام کے تین قطرے صبح اور تین قطرے شام۔ عینک کی ضرورت نہ رہے گی۔"

دو بلکہ چار ہفتے آنکھوں میں روغن بادام ڈالتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ رات کے وقت جب چاند کی طرف دیکھتے تو وہ ستارہ نظر آتا تھا۔ اور جب ستاروں کی طرف دیکھتے تو مطلع بالکل صاف اور اس کے ساتھ سر میں اس قسم کا درد کہ دھاڑیں مار کر رونے کو جی چاہا دوبارہ آنکھیں ٹیسٹ کرائیں۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ عینک کا نمبر پہلے کی نسبت بڑھ گیا ہے۔ اسلئے عینک لگوانے میں مزید دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ عینک لگوائی۔ لیکن چچا افلاطون اس دن سے ناراض ہیں کہتے ہیں یا تو تم آنکھوں میں روغن بادام ڈالتے نہیں رہے یا وہ روغن بادام گھٹیا درجے کا تھا۔

ہمارے محلے میں ایک بی۔ اے پاس بیکار نوجوان رہتے ہیں چچا افلاطون کو کسی نے بتایا کہ وہ دو سال سے بیکار ہیں، یہ سن کر انھیں بہت افسوس ہوا۔ اسی دن نوجوان کو گھر پر بلا کر کہنے لگے۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ تم اتنے عرصے سے بیکار ہو؟"

نوجوان نے عاجزی سے کہا "غلطی ہوئی معاف کر دیجئے۔"

چچا افلاطون نے الماری سے ایک کتاب نکالی۔ دو چار منٹ اس کے ورق الٹتے رہے۔ اور پھر نوجوان سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"دیکھو برخوردار مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بیکار لوگوں

کے لئے ہزاروں کام اس کتاب میں درج ہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم مچھلیاں پکڑنا پسند کرو گے یا مینڈک؟"

نوجوان نے حیران ہوتے ہوئے کہا "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"

"مطلب یہ ہے کہ اگر تم ہر روز پچاس مچھلیاں یا پچاس مینڈک پکڑ سکو، تو انھیں فروخت کرکے کافی روپیہ کما سکتے ہو۔ مچھلیاں تو وہ لوگ خریدیں گے جنھیں کھانے کا شوق ہے، اور مینڈک تم ان کالجوں میں فروخت کر سکتے ہو جہاں علم حیوانات پڑھایا جاتا ہے۔"

"معاف کیجئے، یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے گا۔"

"خیر کوئی بات نہیں، اچھا نہ کرو..... جنگلی بندر تو پکڑ لوگے؟"

"جنگلی بندر؟" یہ تو اور بھی مشکل کام ہے۔"

"اچھا اسے بھی رہنے دو، تمھارے لئے کوئی اور کام ڈھونڈتے ہیں۔" چچا افلاطون نے پھر کتاب کھولی اور تھوڑے وقفہ کے بعد خوشی سے چلا کر کہا "مل گیا، مل گیا..."

نوجوان نے کہا "فرمایئے۔"

"تم جنگلی شہد اکٹھا کرکے فروخت کیا کرو، معقول آمدنی ہو سکتی ہے۔"

نوجوان نے ڈرتے ڈرتے کہا "لیکن یہ تو ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔"

"ذرا بھی ٹیڑھی نہیں۔" چچا افلاطون بڑے وثوق سے بولے۔

"تم شاید شہد کی مکھیوں سے ڈرتے ہو۔ انھیں بھگانے کی ترکیب تو میں بتائے دیتا ہوں۔ دیکھو خوب ابلتا ہوا پانی شہد کے چھتے پر ڈال دو۔ تمام مکھیاں چھتے سے گر کر ڈھیر ہو جائیں گی۔ اطمینان سے چھتے سے شہد نچوڑ دو اور بوتلوں میں بھر لو۔"

چنانچہ وہ نوجوان شہد کے چھتوں کی تلاش میں روانہ ہو گیا بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ایک جنگل میں اسے ایک بہت بڑا چھتہ نظر آیا۔ وہ درخت پر چڑھ گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ چھتے پر گرم پانی انڈیلتا... کہ سینکڑوں مکھیوں نے مل کر اس پر حملہ کر دیا۔ گھبرا کر نوجوان درخت کے نیچے جو گرا تو ٹانگ ٹوٹ گئی تین مہینے ہسپتال میں پڑا رہا چچا افلاطون بھی حال پوچھنے گئے۔ فرمانے لگے۔

"تم نے غلطی کی کہ چھتے پر گرم پانی پچکاری سے نہیں ڈالا۔ اگر پچکاری استعمال کرتے تو مکھیوں کی کیا مجال تھی کہ تمھیں کاٹتیں۔ خیر آئندہ خیال رکھنا۔"

ہمارے محلے میں ایک خاندانی رئیس بھی رہتے ہیں۔ انھیں جانور پالنے کا بہت شوق ہے۔ ایک دفعہ ان کا ہرن گم ہو گیا۔ وہ بہت پریشان ہوئے کیونکہ ان کے ہاں ہرن اور ہرنی کا ایک جوڑا تھا۔ اور ہرن کی غیر حاضری میں ہرنی اداس اداس دکھائی دیتی تھی۔ انھوں نے ہرن کی بہت تلاش کی۔ اخباروں میں گمشدہ ہرن کی تلاش کے عنوان سے اشتہار بھی دیا۔ ہرن ڈھونڈ کر لانے والے کے لئے انعام مقرر کیا گیا لیکن ہرن نہ ملا۔ چچا افلاطون نے جب سنا تو وہ رئیس کے گھر پہنچے

"آپ کے خیال میں ہرن کے یک لخت چلے جانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" انھوں نے رئیس سے پوچھا۔

"کیا معلوم، کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"آپ نے اسے کبھی سخت سست تو نہیں کہا۔؟"

"میں اسے سخت سست کہتا؟ اجی حضرت! وہ تو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھا۔"

"آپ نے کبھی اسے وہ غذا کھلانے پر تو مجبور نہیں کیا جو اسے ناپسند تھی......؟"

"بالکل نہیں!"

"آپ کبھی اس کے آرام میں تو خلل انداز نہیں ہوئے؟"

"مطلقاً نہیں!"

"آپ نے کبھی اس پر یہ ظاہر تو ہونے نہیں دیا کہ وہ اب بوڑھا ہو گیا ہے......؟"

"نہیں!"

"تو پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"خدا جانے ہماری سمجھ میں تو کوئی وجہ نہیں آتی۔"

"ٹھہریئے میں بتاتا ہوں، معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کسی بات پر ہرنی سے رنجش ہو گئی ہے اور وہ......"

"ہو سکتا ہے!"

"ہوا بھی یہی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ ہرنی سے روٹھ کر چلا گیا ہے؟"

"جی ہاں! بالکل یہی مطلب ہے!"

"اچھا اگر مان لیا جائے کہ آپ کا خیال صحیح ہے تو پھر .... ؟"

"پھر ہرن کے واپس لانے کا ایک ہی طریقہ ہے .... یعنی ...."

"یعنی اسے منانے کے لئے ہرنی کو بھیجا جائے۔"

"جی ہاں، جی ہاں۔"

"لیکن کہاں؟ ہرن کا کچھ اتا پتا بھی تو معلوم ہو؟"

"اس کی فکر نہ کیجئے، یہ سب ہرنی پر چھوڑ دیجئے۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، وہ خود تلاش کر لے گی۔"

رئیس پہلے تو بہت ہچکچایا لیکن جب چچا افلاطون نے اسے بار بار یہ بات ذہن نشین کرا دی کہ اس کا گم شدہ ہرن مل جائے گا تو وہ رضامند ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہرن تو گم ہو ہی گیا تھا۔ ہرنی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا لیکن چچا افلاطون کو اب بھی یقین ہے کہ ایک دن ہرنی بچے ہرن کو ضرور واپس لے آئے گی۔

دو سال کی بات ہے کہ ایک بیوہ کے اکلوتے بیٹے کو باؤلے کتے نے کاٹ کھایا۔ محلے والے لڑکے کو ہسپتال لے جا رہے تھے۔ ادھر کہیں سے چچا افلاطون آ نکلے۔ کہنے لگے۔

"کیوں نازک اندام بچے کو خواہ مخواہ ہسپتال لے جاتے ہو؟ وہ لوگ ٹیکے لگا لگا کر اس کا جسم چھلنی کر دیں گے اسے سخت اذیت ہوگی۔"

کسی نے پوچھا "تو پھر کیا کرنا چاہیئے؟"

چچا افلاطون نے کہا "جس جگہ کتے نے کاٹا ہے اس پر دھتورے کے پتے گرم کر کے باندھ دو، چار پانچ دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

چنانچہ یہی کیا گیا۔ لڑکا بظاہر تندرست ہو گیا۔ ہر شخص نے چچا کی فہم و فراست کی تعریف کی لیکن چند مہینوں کے بعد وہ لڑکا خاص قسم کے پاگل پن میں مبتلا ہو گیا۔ وہ پانی سے ڈرتا۔ کتے کی طرح آوازیں نکالتا۔ اور لوگوں کو کاٹنے کے لئے دوڑتا۔ چچا افلاطون ان دنوں بمبئی گئے ہوئے تھے۔ کسی شخص کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ لڑکے کا بہترین علاج کیا گیا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا۔ بمبئی سے واپس آنے کے بعد جب چچا افلاطون نے اس لڑکے کی وفات کی خبر سنی تو کہنے لگے۔

"صرف ایک مہینے محلے سے غیر حاضر رہا۔ اور میری عدم موجودگی میں تم سب مل کر بھی بے چارے نوجوان لڑکے کی جان نہ بچا سکے۔ مجھے تمہاری بے بسی پر ترس آتا ہے۔"

آج کل دنیا میں جب کہ ہر جگہ نفسا نفسی کا عالم ہے۔ جب کہ کسی شخص کو دوسرے شخص سے بات چیت کرنے کی ضرورت نہیں۔ چچا افلاطون کا دم غنیمت ہے۔ ہم محلے والے کبھی کبھی سوچتے ہیں کہ اگر چچا افلاطون نہ ہوتے تو مصیبت کے وقت ہماری دست گیری اور رہنمائی کون کرتا!

(بشکریہ "ادب لطیف")

شاکی ارشدی •

فرمائش

میں سمجھتا تھا اہلِ سرمایہ
سیم و زر کے حسین پانی سے
گُل ترمیں یہاں بدلتے ہیں
رہتی کے خشک لب کانٹے

ناز تھا مجھ کو ایک شاعر ہوں
یعنی الہامِ غیب کا اک ساز
میرے شاہینِ فکر نورس کی
دوسروں سے بلند ہے پرواز

جانتا تھا اس کی دیوالی
جس کے گھر لکشمی کا پھیرا ہو
من کے دیپک سلگنے لگتے ہیں
چار جانب اگر اندھیرا ہو

آج لیکن شعور چونکا ہے
خواب غفلت سے لے کے انگڑائی
میری کھوئی ہوئی بصارت پھر
یک بیک جیسے لوٹ آئی

ہاں مگر لکشمی کا سایہ بھی
میرے دل کو اسیر کر نہ سکا
ایک شاعر کی طبع سادہ میں
حسن رنگِ بہار بھر نہ سکا

ایک ہی حادثہ سے ریحانہ
ضرب آئی ہے ایسی کچھ کاری
تھرتھرا اٹھا بربطِ ادراک
اور ٹوٹا وہ دامِ خودداری

میرے افکار کی بلندی سے
کوئی کہتا تھا جیسے یہ اکثر
ایک فنکار کا حقیقت میں
اس کا فن ہے متاعِ سیم و زر

زندگی میں ہوا ہے پہلی بار
آج احساس دردِ ناداری
اک انگوٹھی کی تیری فرمائش
آہ، پوری نہ کر سکا پیاری

(بشکریہ "امروز")

اکرم جلیلی

احساسِ فرض

یہ اتوار کا دن تھا۔ ورکشاپ اور دفتر میں خاموشی طاری تھی صرف بارش کے گرنے کی مسلسل آواز اس خاموشی اور سکوت کو توڑ رہی تھی ڈاکٹر ہو فیکٹری کے شفاخانہ میں بیٹھا مزدوروں کی رخصتِ بیماری کے اعداد و شمار کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب وہ "کام پر زخمیوں" کی شق پر پہنچا تو یکدم ایک خیال نے اس کی قوتِ کار کو روک لیا۔ اپنی کرسی کو پیچھے جھکاتے ہوئے وہ ایک نوجوان مزدور کے واقعہ کے متعلق سوچنے لگا۔ یہ مزدور "عمدہ سوت فیکٹری" میں مکنیک تھا۔

ڈاکٹر ہو کی فیکٹری میں آمد کے پہلے روز ہی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا اور وہ "عمدہ سوت فیکٹری" کی ابتدائی امدادی پوسٹ کا معائنہ کر رہا تھا۔ وہ اس سے پہلے فیکٹری کے اندر کبھی نہیں آیا تھا اس نے اپنے اردگرد چرخیوں کی قطاروں اور تیزی سے گھومتے ہوئے پرزوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ مزدور عورتیں مشینوں پر جھکی بڑی پھرتی کے ساتھ ٹوٹتے ہوئے دھاگوں کو بٹنے اور جوڑنے میں مصروف تھیں۔ ڈاکٹر ہو کے لئے یہ انوکھا تجربہ تھا لیکن اس حرکت و شور نے اس پر مدہوشی سی طاری کر دی اور وہ کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ حواس قائم ہونے کے بعد اس نے اپنی عینک کو ناک پر جمایا اور اس چیز کو غور سے دیکھنے لگا۔ جس سے وہ ٹھوکر کھا کر گرا تھا۔ اس کی راہ میں ایک سیاہ ٹیوب پڑا تھا غصے میں اس نے ٹیوب کو پاؤں سے ٹھوکر ماری اور وہ لڑھک کر دور جا پڑا اور دیوار کے کونے کے ساتھ ٹکرا کر تیز چیخ کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ اس وقت ایک کشادہ اور خوبصورت چہرے والا نوجوان آگے بڑھا۔ اس نے پھٹے ہوئے ٹیوب کو اٹھایا اور چند لمحے خاموشی سے اپنے ہاتھ میں تھامے رکھا اور پھر غصہ بھری نگاہوں سے ڈاکٹر ہو کی طرف دیکھا۔

"تمہیں دیکھنا چاہیئے تھا کہ تم کس طرف جا رہے ہو" اس نے ڈاکٹر کو ملامت کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو! یہ عوام کی چیز ہے اور تم نے اسے ضائع کر دیا ہے"

ڈاکٹر ہو محتاط آدمی تھا اور اسے اپنی جلد بازی پر بہت افسوس ہوا تھا مگر ایک مزدور کی ملامت سے اس کے وقار کو ٹھیس پہنچی

"اس چھوٹی سی چیز کے نقصان سے بھلا کیا قیامت آگئی ہے"۔ اس نے مدافعانہ انداز میں کہا۔ "خیر! میں اس نقصان کی قیمت ادا کر دوں گا تم جاؤ اور فورمین کو بتا دو"۔ اور ڈاکٹر بغیر معذرت کئے آگے چل پڑا۔

"یہ اس کی قیمت کی ادائیگی کا سوال نہیں ہے"۔ اس نے غصہ میں کہا۔

اب بھی ڈاکٹر ہو نے جب اس واقعہ کا تصور کیا تو اس پر غصہ اور پریشانی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے ڈبیا سے سگرٹ نکالا اور بے توجہی سے اپنی انگلیوں میں گھما کر پھر ڈبیا میں رکھ دیا۔

تقریباً دو ہفتوں کے بعد ڈاکٹر ہو کی اس نوجوان مزدور سے پھر ملاقات ہوئی۔ ایک دن پہلے اس نے ایک دوست کو کھانے پر بلایا تھا اس لئے وہ جلدی سو نہ سکا جب وہ دوسرے دن فیکٹری پہونچا تو وہ پانچ منٹ لیٹ تھا۔

چوکیدار نے ڈاکٹر کو دروازے پر روک لیا۔ "ذرا ٹھہریئے، ساتھی! آپ پانچ منٹ تاخیر سے آئے ہیں۔ مہربانی کر کے رجسٹر پر دستخط کر دیں"۔

چوکیدار کی خلاف توقع مدافعت نے ڈاکٹر کو بے صبر کر دیا وہ جھلا اور گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"لیکن یہ تو صرف پانچ منٹ کی تاخیر کا معاملہ ہے"۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ صرف پانچ منٹ کا معاملہ ہے" چوکیدار نے کہا۔ "لیکن آپ کو رجسٹر میں تحریر کرنا پڑے گا اگرچہ یہ ایک منٹ ہی ہو۔ یہ قانون ہے۔ یہ اصول کا معاملہ ہے"

رات کی شفٹ کے مزدور ابھی اپنے کام سے فارغ ہوئے تھے اور وہ دروازے میں سے باہر نکلنے شروع ہو گئے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ چوکیدار ڈاکٹر سے الجھا ہوا ہے ان میں سے چند ان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ "آپ کے ڈیوٹی کارڈ کا نمبر کیا ہے؟" چوکیدار نے پنسل پکڑتے ہوئے کہا

"0056" ڈاکٹر نے نمایاں ناخوشی سے جواب دیا۔

"آپ تاخیر سے کیوں آئے ہیں؟"

اس سوال نے ڈاکٹر کو انگیخت کر دیا۔ اس قسم کے معاملہ سے اسے پہلے کبھی دوچار نہ ہونا پڑا تھا۔ وہ اندر ہی اندر غصہ سے پیچ و تاب کھانے لگا ——— یہ توہین! جب کہ فیکٹری سے باہر جانے والے مزدور بھی اسے اس حالت میں دیکھ رہے تھے۔ وہ آخر غصہ کو ضبط نہ کر سکا۔

"دفتر والوں سے کہہ دیجئے کہ میری تنخواہ میں سے جو کچھ کاٹنا ہو کاٹ لیں اور اس قسم کے احمقانہ سوالات سے مجھے پریشان مت کیجئے" ڈاکٹر نے غصہ سے کہا۔

"نہیں کامریڈ، ڈاکٹر، اس کا تمہاری تنخواہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں" چوکیدار نے صبر کے ساتھ کہا۔

"لیکن ہمیں آپ کی تاخیر کی وجہ تحریر ضرور کرنی ہے۔"

"اس کی کوئی وجہ نہیں" ڈاکٹر چلایا۔ "بہتر ہے کہ تم مجھے اندر داخل ہونے دو۔ ورنہ میں واپس گھر چلا جاتا ہوں۔"

ہجوم میں حرکت سی ہوئی اور ایک کشادہ چہرے والا نوجوان ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔

"کامریڈ" نوجوان نے کہا۔ "تم نے معاملے کو غلط انداز سے دیکھا ہے۔ یہ معاملہ اندر داخل ہونے یا واپس چلے جانے کا نہیں ہے۔ یہ نظم و ضبط کا معاملہ ہے اور تمہیں واپس جانے سے پہلے دو مرتبہ سوچنا چاہیئے"

ڈاکٹر ہو نے پیچھے مڑ کر اس نوجوان پر نگاہ ڈالی اور اس نے دیکھا کہ وہی نوجوان مزدور، دوسری بار اس کے معاملہ میں مداخلت کر رہا ہے۔

"سو تم مجھے ایک اور سبق دے رہے ہو۔" ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔ "لیکن اس معاملہ کا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنی رائے اپنے پاس ہی رکھو۔"

وہ غصہ سے کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنا شناختی کارڈ دربان کے سامنے پھینک دیا اور استعفیٰ دیدینے کے ارادہ سے واپس چلا گیا۔

جب وہ گھر پہنچا تو اس کی طبیعت کچھ بجھی بجھی سی تھی۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ پہلی دفعہ فیکٹری میں آیا تھا تو اس کی مخلصانہ خواہش یہ تھی کہ وہ مزدوروں کی خدمت کرے گا لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ مزدور اتنے ناشکرے ہیں وہ معمولی سے ٹیوب کے خراب ہونے اور پانچ منٹ کی تاخیر پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ یہ ناقابل برداشت ہے۔

فیکٹری کی ملازمت اختیار کرنے سے پہلے ڈاکٹر ہو اپنا شفاخانہ چلا رہا تھا۔ آزادی کے بعد اس نے مزدوروں کے متعلق لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا تھا۔ جمہوری حکومت کی پالیسی اور نظم و نسق کے متعلق تقاریر سنی تھیں اور اس نے آزادی، قوم اور ملک میں اپنا مقام جانچنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ڈاکٹر کی حیثیت سے اسے خود غرضانہ عادات کا خاتمہ کر کے مزدوروں کی خدمت کرنے کے لئے کمربستہ ہو جانا چاہیئے اسی وجہ سے اس نے اپنا شفاخانہ بند کر کے فیکٹری کی ملازمت اختیار کی تھی اس بات کو ایک ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔

"کتنا بیتاب تھا میں ان کی خدمت کرنے کے لئے اور یہ ہے ان کا سلوک میرے ساتھ۔" اس نے بڑی تکلیف کے ساتھ سوچا۔ "جہنم میں جائے یہ ملازمت ان کے جو جی میں آئے کریں۔"

لیکن ایک ہفتہ کے بعد ڈاکٹر ہو فیکٹری میں واپس آ گیا۔ مزدور یونین کے کئی برگزیدہ لیڈر اس سے گھر پر ملنے آئے۔ انھوں نے تمام چیزوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا اور واپس کام پر آنے کے لئے مجبور کیا اس دوران میں اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اس نے کس جذبہ کے ساتھ اپنا ذاتی کاروبار چھوڑا تھا اور جی ہی جی میں اس بے صبری اور برے اطوار پر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔

قسمت بھی عجیب ہے کہ جس دن ڈاکٹر ہو دوبارہ اپنے کام پر آیا اسی دن اس کشادہ چہرے والے نوجوان مزدور سے ملاقات ہو گئی۔ نوجوان بخار میں مبتلا تھا اور علاج کے لئے اس کے پاس آیا تھا۔

"تمہیں کیا تکلیف ہے؟" ڈاکٹر نے قدرے سرد مہری سے پوچھا

"سردرد اور بخار" اس نے افسردگی سے جواب دیا اور مضمحل انداز میں بنچ پر بیٹھ گیا۔

ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اس کی حالت زیادہ خراب تھی۔ اسکا
درجۂ حرارت ۱۰۲ تھا۔ اسے فوری آرام کی ضرورت تھی۔
"تمہیں تین دن آرام کرنا چاہیئے"۔ ڈاکٹر نے کہا
مگر مریض کا ردعمل ڈاکٹر کی توقع کے خلاف تھا۔ جب نوجوان
نے یہ سنا کہ اسے آرام کرنے کے لئے کہا جارہا ہے' اس کے چہرے پر مایوسی
کے آثار ہویدا ہو گئے وہ اس طرح چلایا جیسے اسے زبردست ٹھیس
پہنچائی گئی ہو۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے آرام کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ
کچھ نہیں ہے مجھے کسی دوا کی خوراک چاہیئے۔ اس سے آرام آجائیگا"۔
ڈاکٹر ہو یہ سُن کر مبہوت رہ گیا۔ شفاخانہ میں اس کے مریض
آرام کی نوید سن کر اس طرح ہراساں نہیں ہوتے تھے۔
"میں نے تمہیں آرام کرنے کے لئے کہا ہے اور بس یہی تمہارا
علاج ہے' میرے ساتھ بحث کرنے کی کوشش نہ کرو"۔ ڈاکٹر نے درشتی
سے کہا۔
"ایسا نہیں ہو سکتا"۔ نوجوان نے فیصلہ کن انداز میں اُٹھتے
ہوئے کہا۔ "مجھے صرف دوا دیدیجیئے۔ مجھے واپس ورکشاپ میں جانا ہے
وہاں مجھے ضروری کام کرنا ہے"۔
باہر برآمدے میں تیز قدموں اور پکارنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ
اس کے گروپ کا انچارج تھا۔
"کیا بات ہے انچارج صاحب" نوجوان نے آگے بڑھتے ہوئے کہا
"جلدی کرو۔ ۵۰ نمبر مشین خراب ہو گئی ہے"۔
"۵۰ نمبر" نوجوان جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر شفاخانہ سے باہر
چلا گیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ پھر ہسپتال میں آیا۔ اس وقت اس کا
انچارج اسے تھامے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردیاں کھیل
رہی تھیں اور اس نے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی بائیں ہاتھ سے
پکڑی ہوئی تھی۔
"کیا بات ہے؟" ڈاکٹر ہو نے پوچھا
"اس کی انگلی مشین میں آگئی ہے" انچارج نے جواب دیا۔
"مشین میں کچھ خرابی ہو گئی تھی۔ اگر یہ اس وقت اس کو درست کرنے کی
کوشش نہ کرتے تو دو تین دن تک کام بند رہتا۔ اب مشین تو درست
ہو گئی مگر اس کو درست کرنے والے کی انگلی زخمی ہو گئی ہے"
ڈاکٹر نے زخم سے خون کو صاف کیا اور اس نے دیکھا کہ زخم کافی
گہرا ہے۔ یہ کافی لمبا زخم تھا جس نے ہڈی کو بھی متاثر کر دیا تھا۔ نوجوان
اپنی زبان دانتوں تلے دبا رہا تھا اور کراہنے کی آواز نہیں نکال رہا تھا
لیکن ڈاکٹر جانتا تھا کہ اسے کتنی تکلیف تھی اور وہ اسکی ہمت و صبر کو جی
ہی جی میں سراہنے لگا۔ اس لمحے کے لئے وہ اس نوجوان کے سابق رویئے
اور ناخوشگوار مباحثے کو بھول گیا اور اب اچانک اسے وہ واقعہ یاد آگیا
جب وہ اسکے ساتھ ٹیوب کے سلسلے میں جھگڑا تھا تو وہ خود بخود شرم
سی محسوس کرنے لگا اور اسے اپنے طفلانہ رویئے پر ندامت ہونے لگی
اس نے درد کو کم کرنے کے لئے ٹیکہ لگایا اور زخم پر پٹی باندھدی۔
"اب" اس نے ہمدردانہ لہجے میں نوجوان کو کہا۔ "تمہیں
آرام کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا"۔
"آپ ابھی آرام آرام کی رٹ لگا رہے ہیں"۔ نوجوان نے ڈاکٹر
پر بے یقینی کی کیفیت میں نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اس معمولی سے زخم
میں آرام کی کیا ضرورت ہے"۔
"تمہیں ضرور آرام کرنا چاہیئے" ڈاکٹر نے ہمدردی سے کہا۔
"نہیں تو مرض کے پیچیدہ ہو جانے کا خطرہ ہے ورنہ تم کو اس کے علاوہ
بخار بھی ہے اور تمہارے زخمی ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ تم بخار کی
حالت میں مشین درست کرنے چلے گئے تھے تم اپنی تنخواہ کے متعلق
فکر نہ کرو۔ میں تمہیں تین دن کا سرٹیفکیٹ دے دیتا ہوں اور اس میں
تحریر کر دیتا ہوں کہ تم ڈیوٹی پر زخمی ہوئے ہو"۔
"تمہارا اس سے کیا مطلب ہے" نوجوان اپنے قدموں پر اچھلا
اور ڈاکٹر پر نگاہیں گاڑدیں۔ ڈاکٹر حیران ہو گیا۔ یہ کس قسم کا نوجوان
ہے۔
"تم سمجھتے ہو کہ میں اس لئے آرام نہیں کرنا چاہتا کہ میں اپنی
تنخواہ کے بارے میں متفکر ہوں"۔ نوجوان نے کہا۔ "ڈاکٹر! تم اس
معاملہ میں غلطی پر ہو۔ میری عمر اس وقت ۲۳ سال ہے اور میں ۱۲ سال
سے مسلسل کام کر رہا ہوں۔ اگر میں آرام کرنا چاہوں تو پوری تنخواہ پر آرام
کر سکتا ہوں مگر میں کام چھوڑ کر آرام کیسے کر سکتا ہوں۔ فرض کرو۔

مشینوں میں کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر کیا ہوگا؟" اس سے پہلے کہ ڈاکٹر اس کا جواب دیتا اس نے میز سے نسخہ اٹھایا اور ڈاکٹر کو سلام کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

باہر بارش ابھی تیزی سے ہو رہی تھی اور ڈاکٹر سوچوں کے تانے بانے بننے لگا۔ "کتنا نفیس نوجوان ہے یہ!" اس نے سوچا۔ وہ اپنے دل کے عمیق گوشوں میں انقلاب محسوس کرنے لگا۔

نرس ڈاکٹر کے سامنے بیٹھی زخموں پر لگانے والے پلستر کو کاٹ رہی تھی۔ ڈاکٹر کے انقلاب حال کو بغور دیکھ رہی تھی "آپ اتنے اداس کیوں معلوم ہوتے ہیں؟" اس نے تجسس سے دریافت کیا۔

"کیا میں واقعی اداس معلوم ہوتا ہوں"۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ جیسے وہ ابھی خواب سے چونکا ہو۔ اس نے اپنی عینک اتاری اور اپنے رومال سے شیشوں کو صاف کرنے لگا۔ "ہاں! میں اس نوجوان کی دلچسپ داستان پر غور کر رہا تھا"۔

ایکا ایکی ٹیلیفون کی گھنٹی نے ان کے سلسلۂ گفتگو کو منقطع کر دیا نرس نے رسیور اٹھایا۔ یہ ٹیلیفون مزدوروں کی بستی سے آیا تھا! ایک مزدور وہاں شدید بیمار تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسے فیکٹری کے ہسپتال میں دکھانے کے لئے لایا جائے۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ کوئی ڈیوٹی پر ہوگا یا نہیں۔ "ہاں ——— ڈاکٹر ابھی ہسپتال میں ہے لیکن ......"

نرس اپنی گھڑی کو دیکھنے کے لئے ٹھہر گئی۔ "لیکن اب ہسپتال بند ہونے ہی والا ہے"۔

ڈاکٹر ہوتے لفظ ڈاکٹر کو سُن لیا اور نرس سے پوچھا کہ یہ کس کا ٹیلیفون ہے۔

"یہ ایک مزدور کے متعلق ہے جو مزدوروں کی بستی میں رہتا ہے اور اسے شدید بخار ہے۔ وہ اسے یہاں علاج کے لئے لانا چاہتے ہیں مگر اب ڈیوٹی ختم ہونے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں"۔

"شدید بخار" ڈاکٹر ہراساں نظر آنے لگا۔ "انہیں کہہ دو کہ اسے جلدی یہاں لے آئیں میں ان کا انتظار کروں گا"۔ پھر اس نے نرس کو ایک تیز اشارے سے روک دیا۔ "نہیں ایک منٹ ٹھہرو۔ ان سے پتہ پوچھ لو اور ان سے کہہ دو کہ اسے یہاں نہ لائیں میں خود وہاں پہونچ جاتا ہوں"۔

"کیا آپ خود وہاں جائیں گے" نرس نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں" ڈاکٹر نے اپنا طبی سامان درست کرتے ہوئے کہا۔ "بارش ہو رہی ہے اور مزدوروں کی بستی یہاں سے کافی دور ہے' ایک بیمار آدمی کے لئے اس موسم میں باہر نکلنا ٹھیک نہیں۔ ان سے کہہ دو کہ وہ تمہیں اپنا پتہ دے دیں ...."

بارش مسلسل ہو رہی تھی اور بادلوں کے چھٹنے کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ ڈاکٹر ہو نے ایک ہاتھ میں اپنی نیلی چھتری پکڑی اور دوسرے ہاتھ میں طبی سامان۔ نرس اسے کھڑکی سے بارش میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

(ترجمہ)

التماس ہے کہ

اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا پورا پتہ لکھنا نہ بھولئے بغیر پتہ کے کوئی نگارش قابل قبول نہ ہوگی۔

ادارہ "مشیر" ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کا ذمہ دار نہیں ہے اس لئے مضامین وغیرہ بھیجنے سے پہلے ان کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں ——— (منیجر)

قابل اجمیری ●

وہ خیالوں میں کہیں شعلہ کہیں شبنم رہے　　ایک انداز کرم کے مختلف عالم رہے
بات بھی تشنہ رہی الفاظ بھی مبہم رہے　　عہد و پیمانِ نظر لیکن بڑے محکم رہے
سینہ چاکانِ چمن سے پوچھئے شانِ حیات　　مسکرا کر بھی شریکِ گریۂ شبنم رہے
ذرہ نوازی سے آتا ہے ظالم سامنے　　آدمی آخر کہاں تک بے نیازِ غم رہے
ربطِ خاطر کی نزاکت کو سمجھ سکتا ہے کون　　آرزو کی آپ نے، محوِ تجسس ہم رہے
ہر نفس بھی حادثہ، ہر آرزو بھی حادثہ　　حادثے پھر بھی ہمارے حوصلوں سے کم رہے
انقلابوں سے ہماری سخت جانی پوچھئے　　مٹتے مٹتے بھی نشانِ عظمتِ آدم رہے
مجھ سے ہمدردی تو ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو　　میری آنکھیں سوکھ جائیں تیرا دامن نم رہے
جلوہ گاہِ ناز سے بھی تشنہ کام آئے ہیں لوگ　　جانے امیدیں زیادہ تھیں کہ جلوے کم رہے

قابل اپنا دردِ محرومی سمجھ سکتا ہے کون
عمر بھر طوفاں سے کھیلے تشنۂ شبنم رہے

کوثر نیازی ●

فطرت کا وہ پیمانِ وفا یاد نہیں ہے　　فریاد! کہ دنیا کو خدا یاد نہیں ہے
کیا چیز ہے اللہ رے وہ شوخ تبسم　　اب ایک بھی ظالم کی جفا یاد نہیں ہے
اب عشق بھلا بیٹھا ہے اخلاص کا انداز　　اب حسن کو پہلی سی ادا یاد نہیں ہے

صیاد نہ کر نغمہ سرائی کے تقاضے
اب مجھ کو گلستاں کی فضا یاد نہیں ہے

(بشکریۂ "فاران")

عبدالحمید عدمؔ

○

ابھی تو آئی ہے فصلِ بہار ـــــ رہنے دے
لباسِ شاہدِ گل مت اُتار رہنے دے

جگا نہ خوابِ بہاریں سے اہلِ زنداں کو
قفس کو دوشِ صبا پر سوار رہنے دے

عجیب شے ہے فریبِ یقیں کی رعنائی!
اسیرِ سلسلۂ اعتبار رہنے دے

الم کدہ ہے یہ دُنیا برائے اہلِ خرد
مجھے جہان میں دیوانہ وار رہنے دے

عدمؔ خزاں کو نہ آنے دے فکر کے نزدیک
کچھ آبروئے طلسمِ بہار رہنے دے

(جامِ نو)

عبدالرؤف عروجؔ

○

لطیف تر ہے نشاطِ کم کم، نہ شہرِ گل ہے نہ شہرِ شبنم
مگر کہاں تک فریبِ پیہم، نہ شہرِ گل ہے نہ شہرِ شبنم

صبا کے نازک خرام جھونکے بہت مسیحا نفس تھے لیکن
بہار آئی اُجڑ گئے ہم، نہ شہرِ گل ہے نہ شہرِ شبنم

ہوس کی خوش رنگ بستیاں بھی سرابِ فکر و نگاہ نکلیں
نہ عیشِ کَے تھا نہ ساغرِ جم، نہ شہرِ گل ہے نہ شہرِ شبنم

میرے رفیقانِ تیز رو تو گجر کے ہنگام چل پڑے تھے
مگر یہ راہوں کی دھوپ یہ غم، نہ شہرِ گل ہے نہ شہرِ شبنم

وہی فضائیں گھٹی گھٹی سی، وہی بگولے اٹھے اٹھے سے
بہار کیا ہے فغانِ مجسّم، نہ شہرِ گل ہے نہ شہرِ شبنم

غرور جن پر بہار کو تھا، جو نرم پھولوں کی زندگی تھے
ہے آج اُن کا عجیب عالم، نہ شہرِ گل ہے نہ شہرِ شبنم

تراوشِ خونِ دلفگاراں، عروجؔ ضائع نہ ہو سکے گی
نئے خیاباں سجائیں گے ہم، نہ شہرِ گل ہے نہ شہرِ شبنم

(فانوس)

حکیم شادانی

نگار خانۂ چین میں

زمان و مکان ہماری طبیعت و جسمانیت پر کتنے ہی حاوی کیوں نہ ہوں وہ ہماری ذہنی طاقتوں کے کام میں کسی طرح بھی مخل نہیں ہو سکتے۔ یہ طاقتیں صدیوں کی مدت اور کروڑوں میل کے فاصلے اور ایسے ہی دوسرے مادّی موانع کو بڑی آسانی سے عبور کر جاتی ہیں بلکہ آسانی و دشواری کا انکے آگے کوئی سوال ہی نہیں ہوتا انکی کارپردازی کا سلیقہ ایسا پر اسرار اور روحانی ہوتا ہے کہ ہم اس کا کوئی اندازہ تک نہیں لگا سکتے۔

میں تنہا بیٹھا ہوا غالب کا ایک شعر گنگنا کر دل بہلا رہا تھا شعر میں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا نہ جذبات نگاری تھی۔ نہ واردات قلب و معاملہ تھا نہ برجستگی و بے ساختگی اور نہ بظاہر کسی بلند مقصد کی طرف رہنمائی۔ بس یونہی ایک شعر زبان پر آگیا تھا اور میں تنہائی کی پہنائیوں میں آوارہ ہو جانے والے خیالات کو مجتمع رکھنے کے لئے اسے گنگنانے لگا تھا جیسے کہ اس وقت مجھے بس یہ سادہ سا نغمہ ہی درکار تھا

مگر میں گنگناتا رہا اور میری توجہ خود بخود بڑے نامحسوس طریقہ سے تصور کے بحر بے پایاں میں ڈوبتی چلی گئی۔ وہ ڈوبتی چلی گئی تاکہ شاید گہرائیوں میں سے اپنے کام کی کوئی چیز نکال لائے۔ چنانچہ کچھ ہی دیر بعد چپکے سے دل میں طرح طرح کے سوالات کا ایک سلسلہ سا قائم ہو گیا اور نہ معلوم کہیں سے جوابات بھی ملنے لگے۔ سمجھئے میں تو رفتہ رفتہ کسی اور ہی عالم میں جا پہنچا ———— اور دیکھتا کیا ہوں ———— کہ نگار خانۂ چین اپنی مشہور اور قدیم روایات کے مطابق اب تک قائم ہے اور شہرۂ آفاق مصور مانی ایک عملی طنز کا ایسا مرقع تیار کرنے میں ہمہ تن مصروف ہے جسے دنیا جس زاویہ سے چاہے دیکھے طنز ہی سمجھے اور اس طنز کی عبرت انگیز تاثیر ناظرین کے دلوں کو انکے سفلی جذبات اور ذلیل منصوبوں سے حتی الامکان پاک کرتی ہے۔ کیونکہ ایک کامیاب طنز میں بہرحال بڑی قوت ہوتی ہے۔

مانی ایک عرصہ سے اس شاہکار کی تیاری میں لگا ہوا ہے بڑے غور و فکر کے ساتھ چند نقوش مرتب کر لیتا ہے۔ ان میں رنگ بھر لیتا ہے۔ اور پھر مٹا دیتا ہے۔ وہ موقلم پر موقلم نامناسب اور ناکارہ سمجھ کر پھینکتا جاتا ہے۔ از سر نو بار بار محنت کرتا ہے ———— مگر ———— نقش مراد پردۂ تصویر پر جلوہ فرما نہیں ہوتا۔

مجھے تعجب ہوا کہ یہ باکمال شخص اس کام میں آخر کسی سے مشورہ کیوں نہیں کر لیتا؟ کیا مشورہ کو یہ خود اپنی توہین خیال کرتا ہے یا اپنے کمال کی کنظا ہر ہے کہ مشورہ کی مدد سے کمال میں تو چار چاند لگ جانے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ غالباً یہ شخص اپنی ہی توہین خیال کرتا ہے کیا خدا کی قدرت ہے کہ اس "لاشریک" کے بعض بندے بھی اپنی مزعومہ یکتائی اور بڑائی میں کسی کو اپنا شریک سمجھنا نہیں چاہتے

بت کریں آرزو خدائی کی
شان ہے تیری کبریائی کی

یہ شخص اگر کسی مصور کو مشورہ کا اہل خیال نہیں کرتا تو کاش ایسا ہوتا کہ کسی شاعر ہی سے اپنے ذہن کی الجھنوں پر گفتگو کر لیتا......

کیا دیکھتا ہوں کہ ناگہاں چچا غالب بھی کہیں سے اُدھر آنکلے اور دونوں باکمالوں میں اس طرح بات چیت شروع ہو گئی۔

غالب: بلند پایہ مصورا! یہ اسداللہ خاں غالب دہلوی آج ایک تحفہ لیکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہے اور توقع ہے کہ ایک مہمان کا تحفہ آپ ہرگز رد نہ کریں گے ———— وہ مہمان خواہ ناخواندہ اور اس کا تحفہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو۔

مانی: (ایک بے نیازانہ تبسم سے) ایک شاعر کا تحفہ شعر و شاعری کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے مگر میں سے ایک مہمان عزیز کی خاطر ہرگز

رد نہ کروں گا۔ اگرچہ جانتا ہوں کہ ایک مصور کو تحفہ میں شعر سنایا جانا کیا معنی رکھتا ہے۔ ہو نہ ہو۔ اس خیال کا محرک شعراء کا یہ دعویٰ ہے کہ صورتگری پر وہ بھی قادر ہیں ——— میں جانتا ہوں کہ شعراء تصویر کشی کر لیتے ہیں نادیدنی کیفیات و خیالات کی شبیہہ تک دنیا کو دکھا دیتے ہیں۔ ان کے کارناموں کو اندھے بھی اپنے کانوں دیکھ بھال لیتے ہیں مگر ——— یہ بھی تو ایک واقعہ ہے کہ ان کا سارا کام ہلدی پھٹکری تک کا محتاج نہیں ہوتا۔ بس باتوں ہی باتوں میں چل جاتا ہے۔ شعراء کا خون جگر زورِ زبان تن بن کر رہ جاتا ہے۔ زورِ بازو بلنے کی اس میں صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ اتنی بھی نہیں جتنی ایک مصور کے لہو میں۔

غالب: لیکن تصویر تو بہرحال اپنا کام کرتی ہی رہتی ہے۔ وہ ایک شاعر کی تخلیق ہو تب بھی ——— ان تو اجازت دیجئے کہ اپنا تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کردوں۔ ساتھ ہی پہلے یہ بھی عرض کردوں کہ آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ واقعی یہ تحفہ میرا ایک شعر ہے جو اپنی جگہ ایک شاعر اور ایک مصور کے توارُد کی بڑی دلچسپ مثال ہے اور یہی اس میں ایک تیکھا پن ہے۔ مصور عالی قدر میں اس حسن اتفاق پر نازاں ہوں کہ جو کچھ آپ دنیا کی حیرت طلب نگاہوں کو پردۂ تصویر پر دکھا دینا چاہتے ہیں اسی کا ہیولیٰ میں اس شعر کے پیکر میں پیش کرسکا

مانی: (قدرے چیں بجبیں ہوتے ہوئے) مگر میں تو کسی کی تقلید و نقالی کو زندگی کی آزادی و بالیدگی کا دشمن خیال کرتا ہوں لہٰذا آپ کا یہ تحفہ قبول کرکے مجھے اپنے ایک محبوب ارادہ سے دست کش ہو جانا چاہیئے۔

غالب: لیکن جب آپ وہ شعر سنیں گے تو چند محرکات و اشارات کے سوا آپ کو وہاں کچھ بھی نہ ملے گا اور یونہی سے چند محرکات و اشارات کہیں سے لیکر ایک مکمل مرقع پیش کردینے کو تقلید و نقالی کی طرح نہیں کہا جاسکتا۔ ——— یہ راز جس قدر آپ پر آشکار ہے اور کسی پر نہیں ہو سکتا کہ آپکے گذشتہ تمام شاہکاروں کی ابتدا کسی نہ کسی محرک یا اشارہ ہی سے ہوئی ہے۔ وہ اشارہ یا محرک آپ کو کسی انسان کی جانب سے ملا ہو یا کائنات کی طرف سے۔

مانی: خیر اس بات کا فیصلہ کہ میں آپ کے شعر سے کوئی فائدہ اٹھاتا ہوں یا نہیں آپ مجھ ہی پر چھوڑ دیجئے۔ (اور پھر قدرے بے نیازی سے) عنایت فرمادیجئے وہ تحفہ اپنا۔

مانی کی طرف سے اتنی سی رضا پاتے ہی چچا غالب نے اس کو کسی مصلحت سے بڑے رازدارانہ طور پر اپنا شعر سنا دیا جسے سنتے ہوئے مانی اس کے کسی لفظ پر پہلے تو ذرا چونکا، پھر کچھ غور کرنے لگا اور پھر کہا۔

مانی: اس شعر کو اتنی آہستگی اور احتیاط کے ساتھ سنانے کی ضرورت آپ کو کیوں محسوس ہوئی؟ کیا یہ بخیل اپنے مفہوم کی حفاظت آپ سے زیادہ خود نہیں کرسکتا؟ ——— میرا تو خیال ہے کہ آپ اگر پوری بلند آہنگی سے بھی اس شعر کو بار بار پڑھیں تو اس کی پرپیچ اور مضبوط گرفت سے کوئی سننے والا بمشکل ہی کچھ چھین سکتا ہے ——— (مسکراتے ہوئے) آپ بلند آواز سے اسے پڑھئے صاحب۔

چچا غالب نے یہ سن کر ایک اطمینان کا سانس لیا اور اپنے دوسرے قدم کے طور پر بڑی خوش الحانی سے شعر کو بار بار دُہرا کر مانی کی فرمائش پوری کرنے لگے۔ اگرچہ مجبور رہے تھے کہ یہ فرمائش اس نے کس دل سے کی تھی چچا نے نغمہ کی کسی ایک ہی طرز پر اکتفا نہیں کی بلکہ تھوڑی دیر بعد وہ اسی شعر کو بعض دوسری طرزوں میں سناتے رہے تاکہ اس کے مفہوم کا تقریباً ہر پہلو نغمہ کی روشنی میں اجاگر ہو سکے۔ چنانچہ نغمہ نے اپنی تاثیر دکھائی اور مانی جھومنے لگا۔ اس کی رم خوردہ اور پریشان توجہ نغمہ کی طرف سمٹنے لگی اور یہ نغمہ چونکہ شعر کے الفاظ کا پیکر اختیار کئے ہوئے تھا۔ لہٰذا اس کی توجہ الفاظ میں نفوذ کرنے لگی۔ اور شاید میری ہی طرح مانی کو بھی چچا غالب کے اشارات و کنایات میں سے اب کچھ ملنے لگا یعنی اس پر ایک ہلکا سا وجد طاری ہونے لگا اور اس عالم میں وہ بھی اب ایسے ایسے مناظر دیکھ رہا تھا، جن کی اسے اپنے شاہکار کے لئے تلاش تو تھی۔ مگر ان کی دریوزہ گری کے خیال تک سے اس کی غیرت تلملا جاتی تھی۔

وہ مجھ سے کہنے لگا:

مانی: ہمارے محترم شاعر کی سپاہیانہ مگر درد بھری آواز اگرچہ نغمہ کے لئے بہت زیادہ سازگار نہیں ہے۔ پھر بھی نغمہ فی الجملہ ان کے

مطالب کو بے نقاب دکھانے میں بڑی حد تک کامیاب ہے ۔ جن اشارات کو اول اول میں سمجھ بھی نہ سکتا تھا اب ان کے پردہ میں مجھے ایک اور ہی جہان نظر آرہا ہے ۔

تقریر کو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا ۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے سامنے ایک سرسبز و شاداب سا مرغزار ہے اور اس مرغزار میں کہیں کہیں بڑے بڑے کنج اور شاندار جھاڑیاں بھی ہیں ۔ سیہ مست ابر بہار بھی اس پر سایہ فگن ہے ہرن کلیلیں بھرتے پھر رہے ہیں ۔ خوشنما پرندے چہچہا رہے ہیں ، طاؤس جھنکاریں سنا رہے ہیں ۔ اور قریب ہی ایک طاؤس ناچ بھی رہا ہے واہ کیا پر بہار ناچ ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرغزار کا یہ سارا حسین منظر رقص طاؤس ہی کے لئے تیار کیا گیا ہے ۔ مگر ہائیں ! یہ کیا ! یہ کیا غضب ہے کہ یہ رقص جتنا دلکش اور دلربا ہے اتنا ہی دل دوز اور عبرتناک بھی ۔ اف ! فطرت بھی کتنی بے نیاز اور طناز واقع ہوئی ہے اف ایک چھوٹی سی ناچتی تھرتھراتی ہوئی جنت کو دو ایسے کریہہ منظر ستونوں پر قائم کر دیا جن کی بدنمائی کسی جہنم ہی کی تعبیر میں صرف کئے جانے کے لائق تھی ! "

اتنا کہہ کر مانی اپنے تاثرات میں کچھ کھو سا گیا ۔ اور کچھ دیر خاموش رہا ۔ مگر چچا غالب ! اپنے منتر کی جاپ اور الاپ میں اسی طرح تھم تھم کر مشغول رہے ۔

مانی پھر کہنے لگا اور اب کی اس طرح جیسے اس کا تصور کوئی نیا پہلو بدل رہا ہو

"میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک شوخ و شنگ ، شباب کے نشہ میں چور حسینہ ایک بھدے بدشکل سیہ فام اور ادھیڑ شخص کے پہلو میں کھڑی بصد کرشمہ و ناز جتا رہی ہے کہ حقیقی مسرت اسے بس اسی شخص کے پہلو میں نصیب ہوئی ہے ۔ حالانکہ وہ شخص اپنی جگہ پر اتنا بے نیاز اور مطمئن معلوم ہوتا ہے کہ جیسے حسینہ کی اس تمام عشوہ گری اور اداکاری کی اجرت وہ پہلے ہی ادا کر چکا ہے ــــــ ایک پری چہرہ حسینہ اور ایک غول بیابانی کا یہ تناسب ہو بہو مرغزار کے پس منظر میں بالکل ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے ناچتے ہوئے طاؤس کے حسین بال و پر اور بدنما ٹانگوں کے فطری تضاد کا قطعاً منہ چڑایا جا رہا ہو ــــــ فطرت کے طنز کے آگے اداکارانہ طنز اس کا منہ چڑانا نہیں تو اور کیا ہے ؟ ــــــ پھر حسن خداداد کی بے پناہ قوتوں کا یہ ذلیل مصرف خود حسن پر ایک مجرمانہ طنز نہیں تو اور کیا ہے ؟ ــــــ لیکن نہیں ۔ میں یہاں نادیدنی تماشا ایک اور بھی دیکھ رہا ہوں ــــــ ایک نہایت خوش رو اور توانا ہیکل نوجوان ہے ۔ جو ذرا فاصلہ پر ایک جھاڑی کی آڑ سے کھڑا ہے اور اس نام نہاد نازنین اور اس کے خریدار کے ناموزوں اختلاط اور حیا سوز کردار کو دیکھ دیکھ کر رشک و رقابت کی آگ میں بھنا جا رہا ہے ــــــ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں ــــــ اور لب پر آہیں ــــــ آنسو اور آہیں ــــــ اور ایک نوجوان !!! "

چچا غالب کی طرف خطاب کرتے ہوئے جواب تحفۂ نغمہ کی کشتی میں سجا کر اب پیش کر چکے تھے ۔

" ... ایک نوجوان شخص اور اس کی آنکھوں میں نامرادی کے آنسو ۔ ایک جوان مرد اور اس کے لب پر نامرادی کی آہیں !! ہمت و غیرت مردانہ اور اس کا اتنا غلط استعمال ! یہ ہمت و غیرت کے وجود پر بزدلانہ طنز نہیں تو اور کیا ہے ؟ .... کیا واقعی ہمت عالی انسان کو بس جسمی اور جنسی تقاضے پورے کرنے کے لئے ودیعت کی گئی ہے ؟ ..... ایک بے وفا و بے حیا عورت کی چند لگاوٹ بھری اداؤں نے دوسروں کی طرح اس نوجوان کی جنسی تمناؤں کو بھی مغالطہ میں ڈال دیا یعنی تمناؤں کو جن پر نوع انسان کی بقائے دوام کا انحصار ہے ۔ پھر کیا تھا یہ تمنائیں اٹھ کر توقعات بن گئیں ۔ توقعات ایک نامراد زندگی کا منتہا مقرر ہو گئیں اور اب اس سہارے کو ہمارے نوجوان کے زعم خام میں عشق کا مقام حاصل ہے .... میں پوچھتا ہوں فکر و تخیل کے آقا ! کیا یہی وہ حسن ہے ؟ شعرا جس کی ستائش میں ہر وقت رطب اللساں رہتے ہیں .... اور کیا یہی وہ عشق ہے ؟ جس کے تعارف و ترغیب کا حق آپ حضرات سے آج تک ادا نہ ہو سکا ...... میری یہ بے باکی شاید قابل عفو نہ سمجھی جائے ..... اگر میں کہوں کہ مجھے تو آپ کی ساری شاعری حسن و عشق پر مسلسل طنز کا ایک طومار معلوم

ہوتی ہے ——— (بے رخی سے نگاہیں بدلتے ہوئے لیکن سنبھلے والے لہجہ میں) محترم شاعر میں بتائے دیتا ہوں کہ اپنے زیر غور شاہکار کی تیاری کے لئے اب ہرگز مو قلم نہ اٹھاؤں گا ——— (ذرا نرمی سے) اس خیال سے نہیں کہ اپنے مو قلم کا آپ کے دئیے ہوئے اشاروں پر رقص کرنا مجھے گوارا نہ ہوگا ——— نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ہماری معاشرت جس کی رگ رگ میں شاعری کا میٹھا زہر سرایت کر گیا ہے، اخلاقی اعتبار سے اتنی سقیم اور بے جان ہو چکی ہے کہ کسی طنز و طعن کی تریاقیت اس پر اب ہرگز کارگر نہیں ہو سکتی۔

چچا غالب جواب تک بڑے صبر و تحمل سے مانی کی آتش بیانی سن رہے تھے ہنسنے لگے اور ایک تشفی آمیز لہجہ میں یوں گویا ہوئے:

غالب: آپ نے شاید غور نہیں فرمایا۔ ورنہ میرے اس تحفہ میں یہ پیشین گوئی آپ کو ملتی کہ آپ اس طنز کی سوز نگری کرتے کرتے چھوڑ دینگے دوسرے اپنے سارے اعتراض کا جواب بھی آپ کو میرے ایک ہی لفظ میں ملجاتا ——— لیجئے۔ اب میں خود ہی عرض کئے دیتا ہوں ... پہلے اپنے اعتراض کے متعلق سن لیجئے ——— ظاہر ہے کہ پوری شاعری کی طرف سے کوئی سیر حاصل معذرت تو اس وقت مد نظر نہیں ہے ——— دیکھئے۔ میں نے اس شعر میں حسن کو طنزاً بت کے لفظ سے یاد کیا ہے حالانکہ خوب جانتا ہوں کہ حسن در اصل حق و حقیقت کا دوسرا نام ہے۔ نہ کہ موجودات کی خوش نمائی کا۔ جسے مجازاً یا اصطلاحاً حسن کہدیا جاتا ہے اور بت کو مسلمہ طور پر خاص کر ہم مسلمانوں میں۔ نہ تو حق سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے۔ نہ حقیقت سے ....

لاگ ہو کچھ بھی ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکہ کھائیں کیا

بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ ہر وہ چیز جو ماسوائے حق اور ماورائے حقیقت ہو ہمارے یہاں بس وہی بت کہلاتی ہے۔ وہ کتنی ہی جمیل دلربا، یا مفید جسمانیت کیوں نہ ہو۔ اب یہیں سے یہ بات بھی خود بخود سامنے آجاتی ہے کہ کسی شخص کا حق و حقیقت سے بے نیاز ہو کر مادی مرغوبات و مطلوبات کے پیچھے جو زندگی کے ذرائع اور وسائل تو یقیناً ہیں مگر اس کے مقاصد ہرگز نہیں ہیں۔ اندھے بادیوں کی طرح دوڑتے پھرنا ہوس پرستی اور بت پرستی ہوا نہ کہ عشق۔ کیونکہ عشق تو عبارت ہے جاں نثارانہ حق پرستی اور والہانہ جستجوئے حقیقت سے ——— یہی وجہ ہے کہ عشق نے کبھی سرو سامان کو آ کار اور مایۂ نثار سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔

عشق ہر رنگ رقیب سرو ساماں نکلا

ہاں البتہ، اس امر سے انکار ناممکن ہے کہ شاعری کو تشبیہات و استعارات وغیرہ سے گریز و مفر نہیں۔ اور چنانچہ اس غریب کی زبان میں ———

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

پھر یہ بھی تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے اور بڑی ندامت و افسوس کے ساتھ ——— کہ ہمارے اکثر شعراء جو محض تقلیدی شاعر ہیں یا تلمیذ الرحمٰن کے بجائے تلمیذ الانسان ہو کر رہ گئے ہیں اور چنانچہ نہیں جانتے کہ کسی تلمیذ الرحمٰن کی طرف سے لوگوں کو کیا پیغام دیا جاتا اور کیا نہ دیا جانا چاہیئے انھوں نے شاعری کی زن کو واقعتہً بازیچۂ حرص و ہوس بنا کر رکھدیا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ چل کر ان قوتوں سے اور کیسے خطرناک کام لئے جائیں۔ بس اس سے زیادہ اور کیا عرض کیا جائے۔

مانی: (جو تعجب و انتظار بھری نظروں سے چچا کی طرف تک رہا تھا) لیکن آپ کی پیشین گوئی کا تو مجھے اشتیاق و انتظار ہی رہ گیا کہ دیکھوں اپنے پُر اسرار شعر کے دفینوں میں سے آپ اسے کس طرح برآمد کر دکھائیں گے؟

غالب: ہاں! جی ہاں۔ تو دیکھئے شعر کے دوسرے مصرعہ میں عرض کیا گیا ہے کہ اس طنز کا مرقع تیار کرنے کے واسطے آپ کو مو قلم کی جگہ طاؤس کی ٹانگ سے کام لینا پڑے گا ——— اب اس گزارش سے جہاں آپ میری مراد یہ سمجھے کہ میں آپ کو طاؤس کے پروں کی خوشنمائی اور اس کی ٹانگوں کی بدنمائی کے تضاد کا تصور دلانا چاہتا ہوں۔ وہاں ——— میری مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ جیسا جلیل القدر مصور بھی اگر چاہے تو یہ مرقع تیار نہ کر سکے گا۔ بھلا پرند کی ٹانگ سے بھی ایسے دقیق اور نازک شاہکار تیار کئے جاتے ہیں؟

مجھے ان دونوں باکمالوں کی تقریروں میں بے انتہا لطف آ رہا تھا اور اب انتظار تھا کہ دیکھوں چچا کے جواب میں مانی کیا کہتا ہے

(باقی صفحہ ۶۳ پر دیکھئے)

باوقار تنظیم

کے متعلّق چند وضاحتی سوالات اور اُنکے جوابات

ویسے تو "امدادی کمیٹیاں" حشرات الارض" کی طرح ملک کے کونے کونے میں مصروف کار ہیں اور ان میں سے کچھ عام کاروباری حیثیت سے ٹھیک طور پر چل رہی ہیں اور کچھ ایسی بھی ہیں جو محض دھوکے کی ٹٹیاں ہی ثابت ہو رہی ہیں مگر ان سب اچھی اور بُری کمیٹیوں میں ایک اُصول مشترک ہے اور وہ ہے "گیم آف چانس" (Game of Chance) یعنی "طالع آزمائی" کا: یعنی "جب کمیٹی نکلے ممبر فارغ" ـــــ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تقدیر آزما حضرات پندرہ پندرہ بیس بیس روپے جیبوں میں ڈالکر ان کمیٹیوں کے دفتروں میں جاتے ہیں' اور تین تین چار چار کھاتے بیک وقت خرید لیتے ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک تو نکل ہی آئیگا اگر ایک بھی نکل آیا تو -/500 روپے کھرے ہوگئے ورنہ پندرہ بیس ہارے ـــــ اور جب پانچ دس حضرات اس طرح ہارتے ہیں اور کچھ حاصل نہیں کر پاتے ہیں تو جھنجھلا کر ان کمیٹیوں کے خلاف صحیح یا غلط اخباری پروپیگنڈا شروع کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل ان کمیٹیوں کے خلاف عوام میں ایک عام نفرت اور حقارت کا جذبہ پایا جاتا ہے، حالانکہ لاکھوں افراد شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے چنگل میں پھنسے بھی ہوئے ہیں۔ یہ ساری خرابی محض ان غلط اور غیر اسلامی اصولوں کی وجہ سے ہوئی ہے جنھوں نے "پس اندازی" اور "باہمی مدد" کے پاکیزہ جذبات کو پس پشت ڈالکر ان نام نہاد "امدادی کمیٹیوں" کو صحیح معنوں میں جوئے اور لاٹری کے مہذب اڈے بنا کر رکھدیا ہے۔

ان حالات میں جب ہم نے چھ سات ماہ پہلے "باوقار تنظیم" کے شروع کرنے کے ارادہ کا اظہار اپنے قریبی احباب سے کیا تو اکثر ان میں سے چونکے اور اکثر نے اسے محض ایک مذاق تصوّر کیا۔ یہ سب کچھ ابتک زبانی ہی زبانی تھا۔ مگر جب اسے ایک تحریری خاکہ کی صورت میں احباب کی ایک مخصوص مجلس میں پیش کیا گیا۔ تو یہ ایک غور طلب سکیم بن گئی اور طے پایا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اسکے سیاق و سباق کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ جب اس نقطۂ نظر سے ترمیم و تنسیخ کے اس دور سے اسے فراغت حاصل ہوئی تو اس کے شرعی جواز کا سوال پیدا ہوا لیکن خدا کا شکر ہے کہ شرعی جواز کے حصول کے لئے جب یہ سکیم مقتدر اور اہل الرائے علمائے کرام کی باریک چھلنی سے چھن کر باہر آئی تو معمولی ردو بدل کے سوا اُصولی طور پر اس میں کوئی نمایاں تغیر واقع نہیں ہوا۔ اور ہم نے پورے اطمینان اور صمیم قلب کے ساتھ اس سکیم کو جاری کر دیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ہم نے اس سکیم کی ممبر سازی شروع کر دی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ توقع کے مطابق اسلام پسند حلقہ میں اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ اور ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا جا رہا ہے جس کے لئے ہم اپنے حلقۂ احباب کے بے حد مشکور ہیں۔ اور خدا کے فضل و کرم سے توقع ہے کہ ہم ایک دو ماہ میں اپنے پروگرام کے مطابق ۵ گروپوں کی ممبر سازی مکمل کر لیں گے۔

اس سلسلے میں کچھ احباب اور رفقا اس سکیم کے بعض پہلوؤں کے متعلق بذریعہ ڈاک کچھ وضاحت طلب سوالات کر رہے ہیں۔ جنکے فرداً فرداً جوابات ہم نے دیدیئے ہیں۔ یہ سوالات کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ اور ذہنوں میں بھی ایسے سوالات فطرتاً پیدا ہو سکتے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ ایسا ہو رہا ہو۔ اس لئے دو طرفہ طویل خط و کتابت سے بچنے کے لئے ہم نے طے کیا ہے کہ ان جوابات کو "مشیر" میں شائع کر دیا جائے تاکہ دیگر حضرات کے اشکالات رفع کرنے میں بھی یہ جوابات مدد ثابت ہوں۔ آئندہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ ہم "مشیر" کے ان صفحات کے ذریعے اس طرح کے سوالات کے جوابات اور "باوقار تنظیم" کی سرگرمیوں، اس کے مشاغل اور مساعی سے متعلق وقتاً فوقتاً ممبرانِ تنظیم کو آگاہ

کرتے رہیں گے۔

ایک رفیق نے ۳ سوالات وضاحت کے طور پر دریافت فرمائے تھے، جن کے حسب ذیل جوابات ارسال کئے گئے تھے۔

سوال نمبر ۱ :۔ جس شخص کو امدادی رقم تقسیم کی جائے گی اس کو دیئے گئے -/500 روپے کی کیا صورت ہوگی اور بعد ازاں جب وہ -/5 روپیہ ماہانہ واپس کرے گا تو آیا وہ اس کے سرمایہ (Capital) شمار ہوں گے یا اس کو ادا کردہ -/500 روپے کی واپسی کی قسط۔ یکصد ماہ بعد آپ کی کمپنی میں اس شخص کے -/500 روپے جمع ہونگے یا کمیٹی کے ذریعہ دیئے گئے روپے برابر متصور کئے جائیں گے؟

جواب :۔ -/500 روپے کی امدادی رقم کی تقسیم اور اس کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے تمثیلاً اس سکیم کو یوں سمجھئے کہ اس کاروبار میں دو فریق ہیں۔ پہلا پانچصد ممبروں کا گروپ مجموعی حیثیت سے اور دوسرا باوقار کمپنی لمیٹڈ مجموعی حیثیت سے۔ پہلا فریق سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا اسے کاروبار میں لگاتا ہے۔ پہلا فریق یعنی پورا گروپ (پانچصد ممبروں کا) ہر فرد سے -/5 روپیہ ماہوار جمع کرکے ہر ماہ مشترکہ سرمایہ کی ایک رقم یعنی -/2500 روپے فراہم کرتا ہے اور شرط کرتا ہے کہ اس مشترکہ سرمایہ میں سے وہ ہر ماہ باری باری ایک ممبر کو -/500 روپے کی امدادی رقم دیتا جائیگا اور باقی -/2000 روپے ماہوار باوقار کمپنی لمیٹڈ کے ساتھ پرافٹ شیئرنگ (شرکت نفع ونقصان) کے اصول پر کاروبار میں لگاتا جائے گا۔ اس طرح یہ سرمایہ -/2000 روپے ماہوار کے حساب سے پانچ سال اور چار ماہ تک بتدریج لگتا رہے گا اور اس کا کاروباری لوٹ پھیر ہوتا رہے گا۔ اس مدت کے بعد یعنی ۶۵ ویں ماہ میں وہ کمپنی ہذا سے اس مشترکہ سرمایہ اور اسکے کاروباری لوٹ پھیر سے اس سے حاصل شدہ منافع سے -/15,000 روپے یا -/20,000 روپے یا -/25,000 روپے جیسے بھی اس وقت کی کاروباری حالت اجازت دے حاصل کرکے اس ماہ میں ۳۰، ۴۰ یا ۵۰ ممبروں کو پانچ پانچ صد روپے کی امدادی رقوم تقسیم کرے گا باقی مشترکہ سرمایہ ہر ماہ کے جمع شدہ مشترکہ سرمایہ کے اضافہ کے ساتھ پھر کاروبار میں لگا رہے گا۔ علیٰ ہذا القیاس اسی طرح آئندہ خاص مہینوں میں بھی یہی عمل دہرایا جائے گا حتیٰ کہ جب ایک صد ماہ کی مدت ختم ہوگی تو ہر ممبر ایک دفعہ امدادی رقم (-/500 روپے) ضرور حاصل کر چکا ہوگا۔ اس اختتام پر پورے گروپ کا حساب ہوگا۔ ہر ممبر کی اصل رقم مع منافع میں سے -/500 روپے جو کہ وہ امدادی صورت میں حاصل کر چکا ہوگا اس کے علاوہ وہ منافع جو وہ وقتاً فوقتاً حاصل کر چکا ہوگا وضع کرکے باقی اسے ادا کر دیا جائے گا۔ اس طرح یہ ایک صد ماہ کی سکیم ختم ہو جائے گی۔ اس مثال سے -/500 روپے کی امدادی رقم کی نوعیت متعین ہو جاتی ہے۔ اس سارے نظم کو باقاعدگی سے چلانے کا ذمہ باوقار کمپنی لمیٹڈ اپنے ذمہ لیتی ہے۔

سوال نمبر ۲ :۔ لیٹ فیس جو چارج کی جائے گی بعض احباب کو اس پر اعتراض ہے کہ یہ سود کی سی شکل پیدا ہو جاتی ہے کہ ہر ممبر کو -/5 روپے ادا کرنے ہیں۔ اگر وقت پر ادا نہیں کئے گئے تو -/2 کا اضافہ ہو جائیگا۔ کیا آپنے علماء حضرات سے اس مسئلہ پر گفتگو کی ہے؟

جواب :۔ اسکے متعلق عرض ہے کہ سکیم میں نظم وضبط اور ادائیگیوں میں باقاعدگی رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ احتسابی بندشیں رکھنا ضروری ہیں ورنہ نظم قائم نہیں رہ سکتا۔ اور اس سکیم کے کامیابی کے ساتھ چلنے کا سارا دارومدار نظم ونسق کی باقاعدگی پر منحصر ہے۔ ورنہ سارا معاملہ بے سری فوج بن کر رہ جائے گا۔ -/2 لیٹ فیس کے شرعی جواز کے لئے علماء حضرات سے رائے لی گئی ہے۔

سوال نمبر ۳ :۔ بذریعہ منی آرڈر رقم ارسال کرنے والے دراصل آپ کو -/4/1/5 روپے ادا کرینگے

جبکہ مقامی ممبر آپ کو -/۶۰ روپے ادا کریں گے لیکن آپ کے ریکارڈ میں انکے -/4/14 مٹلے اور -/۶۰ روپے کو ایک قیمت دی جائے گی، کیا یہ مناسب ہوگا؟"

جواب :- اسکے متعلق عرض ہے کہ یہاں مقامی طور پر بھی ہمیں اقساط جمع کرنے کے لئے اکثر کمیشن ایجنٹ مقرر کرنے پڑے ہیں جن کو کچھ نہ کچھ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس صورت میں براہ راست باہر سے بذریعہ منی آرڈر اقساط روانہ کرنے والے ممبروں کو بھی اتنی رعایت تو ملنی ہی چاہیئے ہاں اگر کوئی ممبر ازراہِ ہمدردی اس رعایت سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو اس کی اپنی مرضی ہے۔ کم وصول ہونے والی رقم کو یعنی -/2/- فی قسط کو ہم کمیشن کھاتہ میں ڈالیں گے اور ممبر کی پوری رقم جمع کریں گے۔ اسکے متعلق بھی شرعی رائے حاصل کر لی گئی ہے۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ اخراجاتِ فراہمی (Collection charges) تو زکوٰۃ وغیرہ کی فراہمی میں بھی جائز ہیں۔ حتیٰ کہ بقرعید پر جو والے کھالیں جمع کرتے ہیں ان کو بھی ان کی فراہمی پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔

سوال ۱۲ :" آجکل کی بگڑی ہوئی دنیا میں اس بات کا کیا بھروسہ کہ -/500 روپے کی رقم ملنے کے بعد آپ کو اقساط برابر وصول ہوتی رہیں گی۔ آجکل جو اخلاق اور بے ایمانی کا تناسب ہماری سوسائٹی میں پایا جاتا ہے کیا اسکو مدِنظر رکھتے ہوئے کمپنی اور حصہ داروں کو صریح نقصان کا اندیشہ نہیں ہے؟ آپنے اس موضوع پر یقیناً سوچا ہوگا۔"

اسی نوعیت کا ایک سوال ایک اور جگہ سے بھی آیا تھا جسکے الفاظ تو ذرا مختلف ہیں مگر مفہوم کے لحاظ سے ایسا ہی ہے۔ وہ بھی حسب ذیل ہے

"مثلاً میں کسی گروپ کا ممبر ہوں جس کی پہلی دفعہ پوری رقم جمع ہو جانے پر آپ کے طریقہ قرعہ اندازی سے میرا اول نمبر نکلتا ہے۔ مجھے آپ -/500 روپے کی امدادی رقم دیدیتے ہیں۔ میں پانچسو روپے وصول کرنیکے بعد اپنی ماہانہ قسط دینا بھی بند کر دیتا ہوں بلکہ کمپنی ہذا سے تعلق ہی قطع کر لیتا ہوں فرار ہو جاتا ہوں یا ویسے ہی حالت خراب ہو جاتی ہے تو آپ کیا صورت اختیار کرینگے کہ مجھ سے رقم نکالی جائے۔"

ان ہر دو سوالات کا جواب حسب ذیل دیا گیا تھا۔

جواب :- اوّل تو ہم ممبر سازی ہی ایک محدود حلقے میں کر رہے ہیں اور سارے پاکستان مغربی اور مشرقی دونوں حصوں میں صرف ۵ گروپ یعنی ۲۵۰۰ ممبروں کی ممبر سازی کا پروگرام پیشِ نظر ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ہمیں اُمید ہے کہ معاشرے کے اس بگاڑ اور اخلاق و بے ایمانی کے اس تناسب کے باوجود ہماری اس سکیم میں ایسے اندیشے کا احتمال بہت کم رہ جائیگا۔ ہم ایک اچھی مثال قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں مگر اسکے باوجود اگر کچھ ناپسندیدہ عنصر (Black Sheep) ہماری اس تنظیم میں گھس بھی آیا تو اول تو اس کا تناسب بہت کم ہوگا جس سے کسی بڑے نقصان کا احتمال ہو۔ دوسرے اگر کوئی ممبر فوری منفعت کے پیشِ نظر اپنی "عاقبت" کو ہی خراب کرنیکا ارادہ کر لیگا تو ہمیں تو عملی طور یہی ثابت کرتا ہے کہ فی الواقع اس نے اپنی اس حرکت سے اپنے مستقبل کو خراب کیا ہے کیونکہ ہمیں خدائے تعالیٰ کے فضل و کرم کے بھروسہ پر قوی امید ہے کہ ۲۵ یا ۳۰ ماہ بعد جب ہم پہلا منافع تقسیم کریں گے تو ایسے ناپسندیدہ ممبر خود محسوس کر لیں گے کہ فی الواقع انھوں نے کمایا کم اور گنوایا زیادہ ہے یہ کسی خوش فہمی کی بناء پر نہیں کہا جا رہا بلکہ عملی دنیا میں امر واقعی یہ ہے کہ آجکل کی وہ "امدادی کمیٹیاں" (ان کمیٹیوں کو چھوڑ کر جو صریحاً بے ایمانی اور بد دیانتی سے لوگوں سے روپیہ فراہم کرتی ہیں اور کھا پی کر اس کے کارپرداز روپوش ہو جاتے ہیں) جو "جب کمیٹی نکلے تو ممبر فارغ" کے اصول پر چل رہی ہیں (جو شرعاً ناجائز ہے) اور اپنے کاروبار کو ٹھیک طور پر احتیاط کے ساتھ چلا رہی ہیں

دہ کسی نقصان میں نہیں چل رہیں، بلکہ کافی فائدہ حاصل کر رہی ہیں حالانکہ اُنکا ہر ممبر امدادی کمیٹی حاصل کر لینے کے بعد کسی ادائیگی کا ذمّہ دار نہیں ہوتا اور وہ کمپنیاں بھی شرکت کی ہر قسم کی ذمہ داری سے بے نیاز ہوتی ہیں اس کے برعکس ہم شرکت کی ذمّہ داری اپنے ذمّہ لیتے ہیں۔ اب اگر ہمارے ممبر بھی فوری منفعت کے پیشِ نظر اقساط کی ادائیگی بند کر کے ہمیں اس شرکت کے بوجھ سے ہلکا کرتے جائیں تو بتلائیے کمپنی کیلئے مجموعی حیثیت سے مفید ہے یا صریح نقصان کا باعث۔ اگر پوری اسکیم کے ورکنگ اور اسکے سارے سیاق و سباق پر اعداد و شمار کے لحاظ سے پوری مدّت کو پیشِ نظر رکھکر غور کیا جائے تو مالی منفعت کے لحاظ سے دوسری صورت کمیٹی کے لئے قابلِ ترجیح ہے۔ مگر چونکہ وہ شرعی طور پر جائز نہیں اس لئے ہم نے شرکت کی صُورت اختیار کی ہے اور اس کی ذمہ داری ہم نے اپنے اوپر لینے کی بجائے خود ممبر کے صوابدید پر چھوڑ دی ہے کہ وہ اپنی ذمّہ داری پر اگر خود چاہے تو فوری منفعت کے پیشِ نظر اقساط کی ادائیگی بند کر کے کمپنی کو دوسری صورت میں ڈالدے یا اقساط ادا کرتا ہوا اپنے مفید مستقبل کو محفوظ رکھے۔ ہمیں تو یہی دکھانا ہے کہ پہلی صورت ممبر کے لئے مفید بھی ہے اور شرعی طور پر جائز بھی اور دوسری صورت کمپنی کے لئے مفید ہی مگر شرعاً ناجائز ہے۔ پھر اس چیز کو بھی پیشِ نظر رکھیئے، یہ ایک تجربہ ہے جس میں ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ اس کاروبار کو شرعی حیثیت سے اسلام کے قریب تر رکھا جائے اور عملی طور پر اس سُودی لین دین کی مارکیٹ میں جو مشکلات پیش آئیں گی اُن کا عملی حل سوچنے کی کوشش کی جائے گی ؛

مندرجہ ذیل سوال ایک اور رفیق کی طرف سے موصول ہوا تھا۔

سوال:۔ "اگر خدانخواستہ کمپنی ہٰذا کو نقصان ہو تو کیا ممبران نقصان میں حصّہ دار نہ ہوں گے؟"

جواب:۔ اس سوال کے متعلق عرض ہے کہ سکیم کے قواعد و ضوابط کے مطابق دونوں فریق گروپ اور کمپنی نفع و نقصان میں برابر کے شریک ہیں۔ درصل اس قسم کے اداروں کو دو طرح کے نقصانات سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایک عارضی اور قابلِ تلافی نقصان دوسرا مستقل اور ناقابلِ تلافی نقصان ——— ——— عارضی نقصان کو تو ایسے ادارے اس مدت کے دوران میں پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ایک سودے میں نقصان ہوا تو دوسرے میں کما لیا اور اس طرح نقصان پورا ہوتا رہتا ہے مگر دوسرے مستقل نقصان کی صورت میں جسکی تلافی ناممکن ہو جاتی ہے کمپنی (Liquidation) دیوالیئے میں چلی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں نقصان دو طرفہ ہی ہوتا ہے اور یہ احتمال ہر ادارے کے ساتھ لگا ہوتا ہے۔ اسکے ساتھ یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس قسم کے ناقابلِ تلافی نقصان صرف تین صورتوں میں ہوتے ہیں، اوّل یہ کہ کمپنی کے کارپرداز بے ایمانی اور بد دیانتی سے سرمایہ خرد برد کر دیں، دوسرے وہ نااہل اور کاروباری تجربہ سے بالکل ناآشنا ہوں اور غلط سلط طریقوں سے کاروبار میں بھاری نقصان اٹھائیں کہ کمپنی اٹھ ہی نہ سکے تیسرے ناگہانی حادثات یعنی کسی ایسے حادثہ کی وجہ سے بہت بڑا نقصان ہو جائے جو کارپردازانِ کمپنی کے دستِ قدرت سے باہر ہو اور ناقابلِ تلافی ہو۔ پہلی دو صورتوں کے متعلق تو بہرحال ہم بہت محتاط ہیں اور تیسری صورت بہرحال سب کے لئے ناگزیر ہو گی ؛

محمد حمید اللہ صدیقی
اسماعیل ادیب
محمد خالد فاروقی
منظر حسین

چند خاکے

اور بس چلتی رہی!

بس چل رہی تھی۔ بس میں لوگ بھرے ہوئے تھے سیٹوں پر بھی اور سیٹوں کے علاوہ بھی۔ لوگ باتیں کر رہے تھے، ہنس رہے تھے، سگریٹ پی رہے تھے۔ بس جا رہی تھی .... ایک شور۔ بس رک گئی۔ لوگ اتر کر دوڑنے لگے۔ ایک بچہ۔ سات یا آٹھ سال کا سڑک پار کرتے ہوئے ٹرک کی زد میں آ گیا تھا۔ ٹرک رکا کھڑا تھا۔ بچہ بیچ سڑک پر پڑا تھا۔ اس کی انتڑیاں اس کی ٹانگوں سے الجھ کر رہ گئی تھیں۔ اسکے چاروں طرف سُرخ خون بہہ رہا تھا۔ اس کے سرہانے اس کی ماں بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اس کے پیروں کے قریب پولیس کا ایک سپاہی کھڑا بیڑی پی رہا تھا ہر طرف لوگ جمع تھے۔ ہائے ہائے۔ چک چک ... اوہ اُف۔ ہائے ہائے۔

کنڈکٹر چیخا۔ "بابا تماشا کرتا ہے بس کھڑا نہیں رہے گا" لوگ دوڑ پڑے۔ کچھ لوگ بس میں بدستور بیٹھے رہے تھے۔ اپنی سیٹوں سے چپک کر۔ کچھ لوگ جو پہلے کھڑے تھے اس ہڑبونگ میں بیٹھ گئے جو بیٹھے تھے انھیں کھڑا ہونا پڑا۔ بس چل پڑی .... بس جا رہی تھی لوگ لڑ رہے تھے... لسبیلہ .... پرانا لالوکھیت .... بُزن ہٹی....

"یہ ہماری جگہ ہے"

"تمھاری کیسے ہے۔ ہم جب آئے تو یہ خالی تھی"

"ہم اتر گئے تھے"

"تم کیوں اتر گئے تھے"

"ہم نے ٹکٹ لیا ہے"

"ہم نے بھی ٹکٹ لیا ہے"

.... جہانگیر روڈ... سبیل والی مسجد.... لوگ لڑ رہے تھے ..... بس چل رہی تھی ....

"تمہیں اٹھنا ہوگا"

"ہم نہیں اٹھیں گے"

بس پرانی نمائش اور صدر کے بیچ میں چل رہی تھی۔ لوگ لڑ رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے، سگریٹ پی رہے تھے، ہنس رہے تھے ...... اور دور بہت دور گولی مار نمبر ۲ پر ایک بچہ مرا پڑا تھا۔ سڑک کے کنارے اس کی انتڑیاں اسکے پاؤں میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ اردگرد خون جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔ اس کی ماں بلک بلک کر رو رہی تھی۔ لوگ آ رہے تھے جا رہے تھے۔ بسیں۔ موٹریں۔ گدھا گاڑیاں ...... پتہ نہیں سپاہی بیڑی پی چکا یا نہیں؟ .... کون جانے!!

(حمید اللہ صدیقی)

علاج

پہلے نے کہا:

"مجھے اس نے دھوکا دیا۔ اس نے میری وفاؤں کے بدلے بے وفائی کی میں نے اسے اپسرا سمجھا تھا لیکن وہ ایک ذلیل عورت کے سوا اور کچھ نہیں تھی"!

دوسرا بولا:

"میں غم روزگار کا ستایا ہوا ہوں۔ میں نے زندگی میں کوئی سکھ نہیں دیکھا۔ برہنگی اور بھوک نے مجھے مجبور کر دیا ہے"۔

تیسرے نے ٹھنڈی سانس بھری:

"تم عورت کی نفرت کو کوستے ہو، تم روپے کی آرزو میں مرے جا رہے ہو لیکن مجھے بھی تو دیکھو۔ دائم المریض ہوں، میرا غم کتنا

شدید ہے۔"

پہلا عزم سے اٹھا:

"تو آؤ اپنی مایوسیوں، ناکامیوں اور مجبوریوں کو شراب کے جام میں ڈبو دیں۔ اسی میں ہماری بھلائی ہے۔"

اور میں سوچتا رہ گیا۔

کیا ان تینوں کا یہی ایک علاج تھا؟

(اسماعیل ادیب)

فطرت کی آواز

نرس نے کہا۔ "ایک مریض کو تو دیکھتے جاؤ۔" وہ بادلِ ناخواستہ قدم بڑھاتا ہوا نرس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ مریض کے قریب اسٹول پر بیٹھ گیا۔ مریض نے بدقت تمام اپنے نحیف ہاتھ اس کی طرف مصافحہ کے لئے بڑھائے۔ نرس نے اُسکے ملے ہوئے گھٹنوں کو الگ کرتے ہوئے کہا "بے چارا اپنے پیروں کو بھی جنبش دینے کی سکت نہیں رکھتا۔" وہ اس قدر کمزور تھا کہ نرس کے محض چھونے سے اُس کی دردبھری آہ نکل پڑی۔ اس کی ماں حزن و یاس کا پیکر بنی ایک طرف کھڑی تھی۔ اُس نے مریض کے زرد چہرہ کی طرف دیکھا۔ ابھی تو اس کی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں۔ اُف باغِ زندگی کا اس نے ایک پھل بھی تو نہ چکھا ——— "اس کا ایک ہاتھ بھی کاٹ دیا گیا ہے۔ بچپن میں کسی حادثہ کا شکار ہو گیا تھا۔" نرس نے یہ کہتے ہوئے سکوت توڑا اور مریض کے سینے سے چادر ہٹادی اُف! شانے کے پاس سے بازو کٹا ہوا اور نصف سینہ جلا ہوا ——— وہ تاب نہ لاسکا۔ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے اٹھتا دیکھکر مریض نے آخری مرتبہ اُس کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ اُس کی آنکھوں میں اُمید و یاس کا عجیب امتزاج تھا۔ اس نے مریض سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "ہمت نہ ہارو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔" مریض مسکرا دیا۔ ایک پیاری سی مسکراہٹ ——— وہ تیزی سے گھر کی طرف چل پڑا۔ اُس کا دل بھر آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور بے اختیار اُس کی زبان سے نکلا۔ "اے خدا اس کو صحت دے!"

——— اُس کے ذہن میں اُس کے الفاظ "اللہ [پر بھروسہ] رکھو" بار بار اُبھر رہے تھے ——— کیا موت کے کنارے کھڑے ایک شخص کو یہی ایک لفظ "اللہ" تسلی دے سکتا ہے؟ ——— [اس کے] ذہن میں اس کے افکار و نظریات کی عمارت لرزنے لگی ——— آفس میں ہونے والی بحث اور اسکے ساتھی کا آخری جملہ اُس کے کانوں میں گونجنے لگا۔ "میرے دوست خدا ایک حقیقت ہے تم اپنی عقل پر کتنے ہی دبیز پردے ڈال لو۔ تمہاری فطرت کی گہرائیوں سے اس کی آواز اُبھرے گی۔"

(محمد خالد فاروقی)

تصویروں کا البم

تصویر نمبر: ۱

ایک مرد۔ ایک عورت ——— دونوں جوان ہیں اور خوش مرد کا لباس "لنگوٹی" ہے۔ عورت کا لباس ایسا ہے جس سے اس کا پورا جسم ڈھکا ہوا ہے، صرف چہرہ، ہاتھ اور پیر کھلے ہوئے نظر آتے مرد کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ہے اور وہ اپنے دائیں ہاتھ سے عورت کی ایک کلائی تھامے ہوئے ہے اور بائیں ہاتھ سے اس کی آستین اُوپر کی طرف سرکا رہا ہے ——— عورت کا انداز یوں ہے جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہو، جیسے وہ کسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے بے چین ہو رہی ہو۔

تصویر نمبر: ۲

مرد نے ناف سے گھٹنوں تک کا لباس پہن رکھا ہے۔ عورت نے اپنا وہی پرانا لباس، اس فرق کے ساتھ کہ اس میں آستینیں غائب ہو گئی ہیں۔ مرد عورت کی ننگی باہوں پر نظریں جمائے ہوئے ہے اور عورت مرد کے چہرے پر جیسے وہ پوچھ رہی ہو کہ تو خوش ہو میرے آقا؟ ——— لیکن "آقا" کا ایک ہاتھ عورت کی پنڈلی پر ہے۔

تصویر نمبر: ۳

مرد گردن سے گھٹنوں تک کا لباس پہنے ہوئے ہے اور عورت کے لباس کا نچلا حصہ یوں کٹ گیا ہے کہ اس میں سے "سفید چکنی" پنڈلیاں صاف نظر آ رہی ہیں ——— عورت مسکرا کر مرد کی طرف یوں دیکھ رہی ہے گویا کہ وہ پوچھ رہی ہو کہ "اب تو خوش ہو میرے آقا" لیکن "آقائے نامدار" کا ہاتھ عورت کی گردن سے کپڑا نوچنے میں مصروف ہے، اگرچہ آنکھیں پنڈلیوں پر جمی ہوئی ہیں۔

تصویر نمبر: ۴

مرد کا لباس گردن سے ٹخنوں تک ہو گیا ہے اور عورت کا لباس برائے نام رہ گیا ہے کیونکہ اب نہ صرف اس کی باہیں اور پنڈلیاں ننگی ہیں بلکہ اس کی پیٹھ اور چھاتیوں کا نصف حصہ بھی عریاں ہے۔۔ عورت مرد کی طرف کنکھیوں سے دیکھ رہی ہے جیسے پوچھ رہی ہو کہ اب تو خوش ہو میرے آقا" ——— لیکن "آقائے مرد" کی نگاہیں عورت کا جائزہ لے رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

تصویر نمبر: ۵

مرد نے اپنے جسم کے اوپری حصہ کو ایک "اضافی" لباس سے مزین کر رکھا ہے۔ عورت نے اسی مناسبت سے اپنے لباس کو تراش ڈالا ہے۔ جس میں سے اب اس کی کمر نظر آ رہی ہے، پیٹ نظر آ رہا ہے رانیں بھی دکھائی دے رہی ہیں ——— یہ لباس کے پردے میں عریانی کا مکمل نمونہ ہے ——— عورت مرد کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کرتی لیکن اس کی "بے زبانی کی زبان" پوچھ رہی ہے کہ اب تو خوش ہو ——— میرے آقا؟ ——— لیکن "ظالم آقا" اب بھی خوش نظر نہیں آتا۔ اب بھی سوچ رہا ہے کہ

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

تصویر نمبر: ۶

مرد نے اپنے سر کو بھی ڈھک لیا ہے، پیر کو بھی چھپا لیا ہے، غرض اپنے پورے جسم کو یوں آراستہ کر لیا ہے کہ چہرے اور ہاتھ کے علاوہ کسی حصہ پر کسی کی نگاہ نہیں پڑ سکتی ——— اور ——— اور ——— عورت نے اپنے لباس کے بچے کھچے تار بھی نوچ کر پھینک دیئے ہیں۔ اور وہ مادر زاد ننگی ہو گئی ہے ——— مرد مسکرا نہیں رہا ہے، ہنس رہا ہے۔ عورت شرما نہیں رہی ہے، رو رہی ہے اور پوچھ رہی ہے کہ

"اب تو خوش ہو۔ میرے آقا؟"

تصویر نمبر: ۷

مادر زاد ننگی عورت مرد کے قدموں میں پڑی سسک رہی ہے ——— اور مرد ——— ایک دوسری جوان اور خوبصورت عورت کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے، جو اپنے پورے جسم کو ڈھکے ہوئے ہے

(بشکریہ "معیار") (منظر حسین)

شہزادہ نبی خاں ●
(سیکرٹری حلقۂ ادب اسلامی کراچی)

ایک ادبی نشست

حلقۂ ادب اسلامی کا ہفتہ وار اجلاس ۲ ستمبر بروز اتوار ساڑھے چھ بجے شام کو قائد ملت ہاسپٹل نزد پرانی نمائش منعقد ہوا صدارت کے فرائض اولاً ماہر القادری صاحب اور بعد میں ان کے چلے جانے پر حمید اللہ صدیقی صاحب نے انجام دیئے۔

سب سے پہلے اسمعیل ادیب صاحب نے گذشتہ اجلاس کی رپورٹ پڑھ کر سنائی جسے عام طور پسند کیا گیا۔ حمید اللہ صدیقی صاحب نے رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا گذشتہ اجلاس کی کارروائی ایک مقالے پر مشتمل تھی جس پر عام بحث کی تفصیلات دینے سے قبل اگر مرتب نے مجملاً مقالے کے متعلق بھی کچھ کہدیا ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ عمادالحق صدیقی صاحب نے رپورٹ کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ رپورٹ اچھی خاصی ہے مگر بعض مقامات پر گفتگو میں حصہ لینے والوں کا مافی الضمیر پورے طور پر ظاہر نہ ہوسکا۔

اس کے بعد حمید اللہ صدیقی صاحب نے اپنی غزل پیش کی۔ غزل چونکہ بالکل معیاری تھی اس لئے اس پر کوئی خاص گفتگو نہ ہوسکی۔

اس کے بعد اسمعیل ادیب صاحب نے اپنا طویل مختصر افسانہ "بڑا بھائی" کے عنوان سے پیش کیا۔ افسانہ میں دو بھائیوں کے متضاد کردار کو پیش کیا گیا تھا ایک طرف بڑا بھائی حامد تقسیم ملک کے بعد کے بدلے ہوئے خاندانی حالات سے مجبور ہوکر صبح سے رات تک اپنی خاندانی ضروریات کی کفالت کے لئے مشقت کرتا رہتا ہے اور اس کی بدولت اس کی اپنی زندگی کے یادی پروگرام ملتوی ہوتے رہتے ہیں۔ اس صبر آزما صورت حالات میں حامد شرافت اور انسانیت کا ایک مجسمہ نظر آتا ہے۔ دوسری طرف چھوٹا بھائی نواب بالکل ہی مخالف راہ پر بڑھتا ہے جس میں اس کے ساتھی اس کی کافی معاونت کرتے ہیں۔ دونوں کردار انہیں متضاد خطوط پر بڑھتے رہتے ہیں۔ حامد کے لئے نواب کی بے راہ روی ایک پرابلم ہے تو نواب کے لئے حامد کی یہ سیدھی سادھی لیکن بے جان اور بے لطف سی زندگی شک و شبہ کا باعث ہے۔ نواب کی نظروں میں حامد کا کردار مشکوک ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ دونوں اپنی حد کو پہنچکر ایک اتفاقی حادثے کی بدولت یکجا ہوتے ہیں اور یہاں نواب اپنے بھائی کو مجسم شرافت اور انسانیت کے روپ میں پاکر اپنی صحیح پوزیشن کو محسوس کرتا ہے۔

افسانے پر تبصرے کا آغاز کرتے ہوئے سب سے پہلے لبیب صاحب نے فرمایا کہ افسانہ بہت زیادہ شاندار بلکہ (Masterpiece) ہے۔ حقیقت نگاری یہاں اپنی صحیح معنویت کے ساتھ موجود ہے۔ ماحول کی صحیح عکاسی کے ساتھ ساتھ کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ بہت ہی فنکارانہ بلکہ مفکرانہ ہے۔ تاثر کے اعتبار سے بھی افسانہ بے مثال ہے اور انسان کے جذبات و خیالات کو بری طرح جھنجوڑتا ہے۔ افسانے میں تجسس (Suspense) آخر تک باقی رکھا گیا ہے جس سے لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے بھی افسانہ بہت بلند ہے اور موضوع کو بہت اچھی طرح نبا ہا گیا ہے۔ بشیر صاحب نے افسانے کی بعض خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ اس میں حامد کی بڑی بہن کے اغوا کا بار بار ذکر ناگوار معلوم ہوتا ہے پھر حامد کا نواب کے ساتھ اتنا سخت برتاؤ بھی کچھ غیر فطری ہے جس کی وجہ سے حامد کے کردار کے متعلق غلط تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ حامد کے اعلیٰ آفیسر کی طرف سے حامد کے لئے شادی کا پیغام بھی عجیب معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہمارے اعلیٰ افسروں کا طبقہ غریب لوگوں کو محض شرافت کی بنا پر پسند نہیں کرتا ہے۔

مشتاق صاحب نے افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ افسانے کی ابتدا ایک (Flash back) کی حیثیت رکھتی ہے جس میں بعض مناظر مثلاً حامد کے خیالات نواب کے ماحول سے الگ نظر آتے ہیں (Flash back) کو فنی نقطہ نظر سے جہاں سے وہ شروع ہوتا ہے وہیں ختم ہوجانا چاہئے۔ لیکن افسانے میں ایسا نہیں ہے افسانے میں ماحول کا مطالعہ بھی صحیح نہیں ہے ایک کلرک جس پر اتنی عظیم ذمہ داریاں ہوں

ہر صبح ناشتے پر انڈے اور پراٹھے نہیں کھا سکتا۔ نواب کی خرابیوں میں کسی جنسی خرابی کا ذکر نہیں ہے اس لئے جنس سے متعلق ساری تفصیلات بے محل معلوم ہوتی ہیں۔ بعض جگہ جنسیات منٹو یا عصمت سے ادھاری گئی ہیں مثلاً جلالی کی ماں کا مرد بلوانا وغیرہ۔ اس طرح کی جنسیات کا تعمیر پسند ادیبوں کے ہاں کوئی موقع نہیں ہے۔ اس کے علاوہ افسانہ غیر ضروری طور پر طویل ہے جس سے ناول کا گمان ہونے لگتا ہے۔ مختصر افسانہ زیادہ سے زیادہ دو صفحات پر مشتمل ہونا چاہئیے۔ مشتاق صاحب نے افسانے کی زبان کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ اس میں الفاظ بہت ثقیل بلکہ بعض مقامات پر غلط استعمال کئے گئے ہیں مثلاً آدمی منجمد کر دیا گیا۔ سائیکل ہینڈ کر دی۔ وغیرہ وغیرہ۔

جمیل صنعانی صاحب نے افسانے پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ افسانے کے تار و پود کو یکجا کرنے میں کسی چابکدستی کا ثبوت نہیں دیا گیا ہے۔ خارج کی منظر کشی کہیں کہیں بہت اچھی ہے لیکن اس میں بہت ڈھیل ہے جس کی وجہ سے رفتار بہت سست ہو جاتی ہے۔ واقعات بہت ہی بے جان ہو جاتے ہیں اور ایک ٹھہراؤ سا محسوس ہوتا ہے۔ افسانے سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ مصنف کون سا تاثر دینا چاہتا ہے۔ نواب۔ حامد گھر کا ماحول غنڈے سب یکساں طور پر ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ انھوں نے افسانہ نگار کے مشاہدے کی خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ غنڈے کا نوب کے گال چوسنے کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ ایک گھناؤنی چیز ہے لیکن اسے آم چوسنے سے تشبیہ دے کر لذتیت پیدا کر دی ہے۔ پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہی نواب جو اپنی بہن کی پیٹھ کی مالش دیکھ کر لذت محسوس کرتا ہے اس ابھرا ہوا سینہ دیکھ کر گھن کیونکر محسوس کرتا ہے۔

عماد الحق صاحب نے افسانے کو پسندیدہ قرار دیتے ہوئے بعض اعتراضات کا جواب دیا۔ انھوں نے بتایا کہ طویل مختصر افسانے بالعموم پسند کئے جاتے ہیں (؟) ہوتے ہیں اور اس کی طوالت کو محدود کرنا بالکل غلط ہے اس افسانے کو سمجھنے میں بڑی دقت اس کی طوالت اور سننے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے ورنہ اگر کوئی چیز طویل ہو تو تکان اور بوریت محسوس ہوتی ہے جس سے لطف ختم ہو جاتا ہے۔ عماد الحق صاحب نے اس بات پر بھی اظہار کیا کہ بعض احباب اس کا مقصد سمجھ میں نہ آ سکا۔ انھوں نے اس افسانہ میں ایک بہترین کردار سے ایک بدترین کردار کو روشنی دی گئی ہے اور اسے بہت خوبی سے نبھایا گیا ہے۔ افسانے کی جنسیت پر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ جنس اسلام سے خارج نہیں ہے اصل دار و مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اسے کس انداز میں پیش کیا گیا ہے اور سننے والوں پر کون سا اثر مرتب ہوتا ہے۔ اس افسانے کی جنسیت سے تمہیں گھن اور نفرت تو محسوس ہوتی ہے لذت نہیں محسوس ہوتی۔ اور اس طرح کی پیش کش کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں قرار دی جا سکتی افسانہ نگار نے جنسی پہلو کو بہت فنکارانہ انداز میں برتا ہے جسے اگر نکال دیا جائے تو ایک خلا سا محسوس ہوگا انھوں نے بتایا کہ حامد کے افسر اعلیٰ کی یہ خواہش کہ وہ حامد جیسے شریف اور محنتی انسان کو اپنا داماد بنائے بالکل ہی عجیب نہیں ہے اس طرح کے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ زبان پر کئے ہوئے اعتراضات کو مانتے ہوئے عماد الحق صاحب نے کہا کہ کچھ غلطیاں ضرور ہیں مگر بحیثیت مجموعی زبان اچھی ہے۔ انہوں نے حامد کے کردار کو سراہتے ہوئے بتایا کہ اس مخصوص ماحول میں حامد کا نواب کے ساتھ اتنا سخت سلوک ناروا نہیں معلوم ہوتا۔

ارباب محفل کی گفتگو کے اختتام پر جمیل صاحب نے تجاویز مشوروں اور نکتہ چینیوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ افسانے پر نظر ثانی کریں گے اور جہاں ممکن ہوگا اصلاح کریں گے۔ انھوں نے بتایا کہ عماد الحق صاحب نے بیشتر اعتراضات کا جواب دے کر ان کا کام ہلکا کر دیا ہے (Flash back) اور اس سے متعلق تسلسل پر مشتاق صاحب کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ لکھتے وقت اس فنی پہلو کا انہیں مکمل احساس تھا اور انھوں نے اس کا پورا خیال رکھا ہے۔ یہ تاثر غالباً افسانے کی طوالت کے سبب پیدا شدہ اکتاہٹ کا نتیجہ ہے انھوں نے کہا کہ مرد بلانے کا ذکر اگر منٹو یا عصمت نے کیا ہو اور پھر انھوں نے بھی کیا ہے تو اس میں فنی خامی تو کوئی نہیں ہے اور یہ کہ کردار (Develope) نہیں ہوتے میں بڑی عجیب سی بات ہے۔ افسانے کی ضرورت کے لحاظ سے کردار پوری طرح ابھرے ہیں اگر

آخر میں حمید اللہ صدیقی صاحب نے جو صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے روایات حلقہ کے مطابق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ افسانہ اگرچہ شروع میں غیر ضروری طور پر طویل ہے اور اس کا کافی حصہ جو نواب کے ہم شیرہ کی تفصیلات سے متعلق ہے یا گھر کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے حذف

کیا جا سکتا ہے۔ اس غیر ضروری طوالت کے باعث افسانہ میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا
ہے اور جگہ جگہ ذہنی الجھن ادا کرنے لگتا ہے۔ حامد کا نواب کے ساتھ سخت گیر برتاؤ
یقیناً درست ہوتا اگر کبھی کبھی حامد کو ایک مشفق بھائی بنا کر بھی دکھایا ہوتا۔ اس افسانے
میں حامد نواب کے ساتھ سختی تو کرتا ہے پیار کہیں نہیں کرتا۔ بحیثیت مجموعی
انھوں نے بتایا کہ افسانہ موضوع اور اس کے (Treatment) کردار
نگاری مقصدیت اور فن و مقصد کے امتزاج ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔
زبان و بیان کی بعض خامیوں کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے انھوں نے
کہا کہ اندھیری گلی میں کسی کے چہرے پر احساس ندامت کی لکیر ڈھونڈنا ایک
عجیب بات ہے۔ اسی طرح لیمپ مونث نہیں ہے بلکہ مذکر ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔
اس کے بعد آئندہ پروگرام بتا کر محفل کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔

بقیہ مضمون صفحہ ۴۸ سے آگے:-

کہ ناگہاں کمرہ کے اندرونی دریچہ سے ایک جھنجھلائی ہوئی آواز نے در آمد ہو کر
تصورات کا بنا بنایا طلسم یہ کہتے ہوئے توڑ ڈالا "یہ آج جہالت غالب
ہی سے دل بہلاتے رہیئے گا؟ یا دین و دنیا کا کوئی اور کام بھی آپکے
نصیبوں میں ہے؟" ــــــــ اپنے طلسم کے ٹوٹتے ہی پھر مجھے
ہوش اور اس کی ذمہ داریوں سے سابقہ پڑ گیا۔ پھر وہی میں تھا اور
میرا کمرہ۔ نہ کوئی نگارخانہ تھا نہ مانی۔ اور نہ غالب
ہاں غالب کا یہ پس ماندہ اور خشک سا شعر نہ جانے کب سے میری
زبان پر جاری تھا۔

نقشِ نازِ بتِ طنّاز بآغوشِ رقیب
پائے طاؤس۔ پئے خامۂ مانی مانگے

تذکرے اور تبصرے

ماہنامہ "تخلیق" کراچی۔

مرتب۔ خواجہ شفق ۔ صفحات:۔ (۹۶) قیمت
قیمت:۔ فی پرچہ بارہ آنے سالانہ آٹھ روپے۔
پتہ:۔ ۳/۲۲ جہانگیر روڈ کراچی ۵

ماہنامہ تخلیق کا ماہِ اکتوبر کا پہلا شمارہ ہمارے پیش نظر ہے سرورق نہایت دیدہ زیب ہے۔ سرورق کی پشت پر حسن عسکری صاحب کا لکھا ہوا ادب پارہ ہے۔ عسکری صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ہمارے ملک کے نام نہاد نقادوں اور خصوصاً ترقی پسند نقادوں پر بھرپور طنز کیا ہے جنہوں نے "عظمت" اور "تخلیق" جیسے الفاظ کے معنوی حسن کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اس ادب پارہ نے ماہنامہ تخلیق کی زینت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اس کے بعد فنکاروں کے اسمائے گرامی درج ہیں اور ازاں بعد فہرست مضامین دا دیا ہے۔ حرفے چند کے عنوان سے ادارہ نے تخلیق کے مقاصد و شمولہ مضامین پر اجمالی سا تبصرہ کیا ہے۔ نئے اردو پرچوں کے اجراء میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کا تذکرہ کیا ہے اور ساتھ ہی اپنی پالیسی بھی واضح کی ہے کہ تخلیق "کسی ادبی گروہ کا نمائندہ نہیں"۔

تخلیق کے مرتب کا یہ دعویٰ زیر مطالعہ شمارہ کے حق میں، سو فیصدی درست ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ اس قول پر کس حد تک عمل ہوتا ہے۔

مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر یوسف حسین، ڈاکٹر سید عبداللہ، ممتاز حسین، رفیق خاور، شاعروں میں جوش، فراق، حفیظ ہوشیار پوری، ابن انشا، ظہور نظر، ضمیر اظہر، عبدالمجید سالک، شاد عارفی، قتیل شفائی، جعفر طاہر، خلیل الرحمن اعظمی، مصطفیٰ زیدی، سلیم احمد سلیم، منموہن تلخ، کرار نوری، اور نثر نگاروں میں چودھری محمد علی ردولوی، میرزا ادیب، محمد خالد اختر، شوکت صدیقی، دیوندر اسّر اور صادق حسین شامل ہیں۔

کتابوں پر تبصرہ مشہور نقاد ممتاز حسین، باقر مہدی اور خلیق ابراہیم نے کیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین نے خواجہ حسن نظامی کی انشا پردازی کا اجمالی سا جائزہ لیا ہے اور ان کے اسلوب کو آزاد اور غالب کے اسلوب کی ہم آہنگی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

"خیال و تخیل" ڈاکٹر سید عبداللہ کا نہایت ہی ٹھوس، علمی اور نفسیاتی مضمون ہے۔ اس قسم کے مقالات کا اردو ادب میں قحط ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس قسم کے موضوعات پر مسلسل لکھیں تو کیا ہی اچھا ہو۔

ممتاز حسین صاحب کا مقالہ "سیاست اور غزل" کے عنوان سے ہے سیاست اور شاعری کے عنوان سے نہیں۔ اس مقالہ میں ممتاز صاحب نے غزل کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی کی ہے مقالہ کا لب ولباب یہ ہے کہ غزل میں سیاسی جذبہ اسی وقت تغزل پیدا کر سکتا ہے کہ جبکہ "عاشق کا جوش جنوں اس کے سیاسی جوش عمل سے متحد ہو" حقیقت یہ ہے کہ صرف اسی ایک نکتہ کو بھلا دینے کی وجہ سے ہماری جدید غزل کا بیشتر سرمایہ محض پروپیگنڈہ کا انبار ہو کر رہ گیا ہے مجروح سلطانپوری جیسے شاعر جنکی اٹھان خاصی اچھی تھی یہ کہنے پر اتر آئے ہیں ؎

میری نظر میں ہے اب ارض ماسکو مجروح
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

یا

اب زمین گائے گی ہل کے ساز پر نغمے
بن سنور کے نکلے گا حسن کارخانے سے

رفیق خاور صاحب نے مغنی نامہ لکھ کر اردو ادب پر بہت بڑا احسان کیا ہے، اور غالب کے فلسفہ کائنات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ترجمہ نہایت ہی رواں اور ستھرا اور خود غالب کے انداز میں ہے۔ یہ اردو شاعری کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہے۔

جوش کی رباعیات ان کے پراگندہ و آشفتہ خیالات کی غماز ہیں اب ان کی شاعری سے کافور و کفن کی بو آتی ہے۔ فراق کی رباعیاں حظِ نفس پر مشتمل ہیں۔

حفیظ ہوشیارپوری نے درماندہ عشق کے عنوان سے بے بسی یوں کا ایک منظر پیش کیا ہے۔ ابن انشا نے دل موہ لینے والے اور روح میں اتر جانے والے لہجہ میں ایک صدا لگائی ہے ؎

کچھ دے اسے رخصت کر کیوں آنکھ جھکا لی ہے
ہاں در پہ ترے مولا انشا بھی سوالی ہے

ظہور نظر کی نظم "اعتراف شکست" بیکار اور لغو ہے۔ تخلیق جیسے معیاری پرچہ میں اس کا شائع ہونا امر تعجب ہے۔ تعقید لفظی و معنوی سے پر نظم ہے۔ مرکزی خیال نہایت پھسپھسا اور قنوطیت کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ضمیر اظہر کی نظم "یاد" اچھی ہے مگر "صدا الہامی" کا خیال ذرا محل نظر ہے۔

غزلوں میں شاد عارفی، خلیل الرحمن اعظمی، سلیم واحد سلیم اور کرار نوری کی غزلیں خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ خصوصاً اعظمی اور نوری کی غزلوں میں جذبۂ عشق اور جذبۂ سیاسی کی جو ہم آہنگی اور ارتباط ہے اس نے دونوں شاعروں کی غزلوں کو نکھار دیا ہے۔

مشفق خواجہ نے چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط شائع کر کے غالب کی یاد کو تازہ کر دیا ہے۔ خطوط سے چودھری صاحب کی پیرانہ سالی میں بھی زندہ دلی جھلکی پڑتی ہے۔ میرزا ادیب کا ڈرامہ "قندیل" اپنے فن کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ خالد اختر کا طنزیہ "چھتری" جدید امریکی ادب پر اچھا طنز ہے۔ خان بہادر افسانہ کے پس منظر میں وہی سرمایہ و محنت کی کشمکش پیش کی گئی ہے۔ اس موضوع پر اردو ادب میں لاتعداد افسانے لکھے جا چکے ہیں۔ پھر بھی شوکت صدیقی کا اسلوب اپنا ہے۔ مگر بہتر ہے کہ وہ "اُگتے ہوئے لفظوں" کی بجائے دوسرے موضوعات تلاش کریں۔ دیویندر آسر کا افسانہ "دھرتی اور بیج" آفاقی اقدار سمیٹے ہوئے ہے۔ تکنیک نہایت عمدہ اور اندازِ بیان نکھرا ہوا ہے۔

اس شمارہ کا سب سے بہترین افسانہ "مولا پہلوان" ہے۔ اس کا مرکزی خیال خودی (Ego) اور محبت کی جنگ ہے اور آخر فتح خودی کی ہوتی ہے۔ اسلوب نہایت دلکش ہے۔ صاحب افسانہ نے فنِ افسانہ سے حیرت انگیز حد تک واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔

اس پرچہ کی ایک اور اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ مرتب خود پرچہ پر نہیں چھایا ہوا ہے۔ جیسا کہ عام مدیروں کا مقصد ادب پیش کرنے سے زیادہ خود اپنی تشہیر کرنا ہوتا ہے۔

شمیم جاوید

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے (منیجر)

Monthly "MUSHIR" Karachi

Printed at Mashhoor Offset Litho Press, Karachi.